دنیائے کاروبار

نیشنل لیبارٹریز لاہور

میسرز ... برادرز سوداگران ادویات" اس مشہور عالم اور معتبر فرم نے جو ہندوستان میں ترقی کی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں اس کی دیانتداری اور خوش اخلاقی و معاملہ فہمی تمام ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئی ہے نیشنل لیبارٹریز کی تیار کی ہوئی تمام ادویات ۔ عمدگی، صفائی اور قیمت کی کفایت کے لحاظ سے دوسری اشیاء پر سبقت لے گئی ہیں۔ نیشنل لیبارٹریز اس فرم کا ایک صنعتی شعبہ ہے۔ جس کے روح رواں مسٹر ملک رام بالی ہیں۔ جو نہایت معتمد ہوشیار اور با اخلاق ہیں۔

ملک میں روز بروز بڑھتی ہوئی بیکاری سے متاثر ہو کر انہوں نے اس صنعتی شعبے کی داغ بیل ڈالی جو اس وقت سے اب تک نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اس کی تیار کردہ اشیاء۔ مثلاً مونا سنو، مونا کریم، اور سنیچ ... سنو، فیش، عرقیات، عطر، سنٹ، تیل۔ کریم اور ... سپشال سوپ اپنے ملک کے ولایتی مصنوعات سے صفائی اور ہر خوبی سے ہزار درجہ بہتر ہیں اور قیمتیں بھی بالکفایت۔ خصوصاً مونا سنو کے استعمال سے چہرے کی تمام کیل چھائیاں، جھریاں اور ہر قسم کے داغ دھبے دور ہو جاتے ہیں اور چہرہ چاند کی طرح نکل آتا ہے۔

منتھل آئل یہ ایک نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا تیل ہے جس کے لگانے سے دائمی درد سر دور ہو جاتا ہے۔ دماغی کام کرنے والوں کے لئے یہ ایک بے نظیر تحفہ ہے۔

مندرجہ بالا اوصاف کی بنا پر اس دوکان سے تمام معزز دکاندار اس کا سٹاک اپنے یہاں جمع رکھتے ہیں اور اپنے گاہکوں سے ان کے استعمال کی سفارش کرتے ہیں۔

لمٹن واچ کمپنی

عہد حاضر میں سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی میں بھی باقاعدگی پیدا کرنے کے لئے گھڑی کا احساس شدت سے پیدا ہو چکا ہے جس کی وجہ سے گھڑی کا وجود ہماری ضروریات زندگی کے لئے از بس ضروری ہو چکا ہے۔

لمٹن واچ کمپنی ۱۴؍اڈلہوزی اسکوائر کلکتہ۔ انسانی ضروریات کے عین مطابق نہایت اعلیٰ قسم کی پائیدار گھڑیاں فروخت کرنے میں امتیازی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔

لمٹن گھڑیاں شکل و صورت کے اعتبار سے نہایت خوبصورت ہوتی ہیں۔ صحیح وقت دینا، خوشنمائی، دلکشی اور نفاست ان گھڑیوں کی ممتاز ترین خصوصیات ہیں جن کی بنا پر یہ غیر معمولی شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ ان گھڑیوں کی ساخت میں بے نظیر خوبی اور ناقابل انکار امتیاز کے بلند معیار کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ ہر مذاق کے لوگوں کے لئے دلکش نمونوں اور سائزوں میں مل سکتی ہیں۔ قیمتیں نہایت واجبی ہیں اور خریدار کو اس کے روپے کا پورا پورا بدل دیا جاتا ہے۔ ہم ناظرین سے پرزور سفارش کرتے ہیں کہ لمٹن واچ کی گھڑیاں خرید کر اپنے پاس رکھیں۔

مکمل فہرست اس پتے سے طلب فرمائیے۔

لمٹن واچ کمپنی ۱۴؍اڈلہوزی اسکوائر۔ کلکتہ۔

فضل الٰہی

مہتمم اشتہارات ادبی دنیا

بزم ادب

ادبی حلقوں میں یہ خبر رنج اور غم سے سنی جائے گی کہ خواجہ عبدالروف صاحب عشرت کا لکھنؤ میں انتقال ہو گیا۔ خواجہ صاحب مرحوم ہمارے اُن اُدبا میں سے تھے۔ جنہوں نے ترقی دربار داری اور تمدن کی آخری جھلک دیکھی تھی۔ آپ متعدد گراں قدر تصانیف کے علاوہ جن میں سے بیشتر شاعری اور تنقید سے متعلق ہیں۔ آئین کا ایک نادر مجموعہ بھی یادگار چھوڑا ہے جن کو دربار اودھ اور امراء کی معاشرت کے بے نظیر مرقع کہا جا سکتا ہے۔ خواجہ صاحب کی موت سے ہماری محفل میں ایک ایسی نشست خالی ہو گئی ہے جو شاید اب خالی رہے گی۔

بعض مضمون نگار حضرات اور شعراء میں جہاں اور دلچسپ خصوصیات ہیں وہاں یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ اپنی تخلیقات کو لوگوں کے سامنے فرضی ناموں سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ادبی دنیا کا مسلک ایک عرصے سے اس روش کے خلاف تھا۔ ہمارے ہاں کوئی فرضی نام شائع بھی ہوا ہے تو اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ وہ اپنی پرائیویٹ زندگی میں بھی اسی نام سے معروف ہے۔ لیکن بعض اصحاب اپنے فرضی ناموں کی اشاعت پر اصرار کرتے ہیں۔ اس اصرار کی شدت کو دیکھ کر آئندہ کے لئے ہم نے فرضی ناموں کے متعلق یہ اصول ہٹا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کیونکہ آخر یہ مضمون نگار یا شاعر کی اپنی مرضی ہے کہ وہ اپنی تخلیق کسی اور نام سے منسوب کرے۔

اس ماہ کے تینوں مضامین اپنی اپنی جگہ دلچسپ اور خیال افروز ہیں۔ انشائے لطیف (ESSAY) کے سلسلے چند ماہ سے ادبی دنیا میں جاری ہے۔ ممتاز مفتی صاحب کا پیش نظر مضمون خاص طور پر توجہ کے قابل ہے۔ مفتی صاحب نے اپنے شگفتہ انداز میں، جو کبھی بیزار کن نہیں ہوتا، ہماری ایک عجیب سے دلچسپ عادت کا تجزیہ کیا ہے۔ اور ایسے ایسے لطیف نکتے پیدا کئے ہیں کہ آئندہ جھوٹ شاید ہم اس کے نفسیاتی پہلو پر غور کرتے رہ جائیں گے اور بھول جائیں

اقبال اور اس کے نقاد لکھ کر جناب مبشر علی صدیقی نے ایک دلکش انداز میں ان نکات و مسائل پر روشنی ڈالی ہے جو اقبال کی شاعری اور اس کے پیغام سے تعلق رکھتے ہیں۔ مسئلہ زیر بحث اگرچہ خاصہ دقیق تھا۔ لیکن مکالمے کی شگفتگی نے اسے ایک واضح اور عام فہم صورت دے دی ہے۔ امید ہے کہ علمی مسائل کی توضیح و تسہیل کا یہ انداز ناظرین کو بہت پسند آئے گا۔

ترقی پسند ادب اور مزدور ایک بصیرت افروز مقالہ ہے جسے جناب مسعود جالندھری نے، معلوم ہوتا ہے، کہ نہایت غور و فکر کے بعد لکھا ہے۔ یہ بیش قیمت مضمون اُس افراط و تفریط سے قطعاً مبرا ہے جو ترقی پسند ادب کے حامیوں اور مخالفوں کی تحریروں میں عموماً نظر آتی ہے۔ مسعود صاحب نے ترقی پسند ادب کا صحیح مقام واضح کرنے میں اپنے حسنِ مذاق اور دقتِ نظر کا نہایت روشن ثبوت دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اس دلچسپ مسئلے پر آئندہ بھی لکھتے رہیں گے۔

محمد حسن صاحب عسکری کا مطالعہ "گھر سے کالج تک" مزاح نگاری کی ایک کامیاب مثال ہے۔ زندگی کے بعض مسائل ایسے خاردار ہوتے ہیں کہ ہم اپنی سنجیدہ تحریروں میں اُن کے متعلق صاف بیانی سے کام نہیں لے سکتے۔ لیکن مزاح کے پردے میں وہ سب کچھ بلا تکلف "عرض کیا جا سکتا" ہے۔ جو عام طور پر کہنے سے ہم لوگ ہمیشہ ہچکچاتے ہیں۔ زیرِ نظر مطالعہ میں آپ کو صاف بیانی کی چند دلچسپ مثالیں نظر آئیں گی۔

ایشور سنگھ کے نقوش اب مستقلاً ادبی دنیا کی زینت ہوتے جا رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ نقوش اردو دان طبقے کو اپنے ملکی مصوروں میں دلچسپی لینے پر مائل کریں گے۔

صلاح الدین احمد

(۲)

موسموں کے تاثرات یوں تو ہر ملک اور قوم کے لوگوں پر کم و بیش رہتے ہی ہیں لیکن ہندوستان کے ساون کی دلکشی اور "انفرادی" خصوصیات کی وجہ سے ہمارے لئے یہ تاثرات ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ ساون کا موسم جذبات انگیز ہے اور اس دفعہ ساغر جلیلی کی نظم "برسات کا بلاوا" موسم کی ہمنوائی کر رہی ہے۔ اس نظم میں جو نیاز کی باتیں ہیں ان کی کیفیت نزاکت ہلکی ہلکی پھوار کی مانند ہے لیکن بحر کا زیر و بم اور موسیقی یوں ہے گویا لگاتار جھڑی لگ رہی ہو۔ بوندوں کا ساز چل رہا ہو اور دل ـــــ لیکن دل کے متعلق خاموشی ہی بہتر ہے۔

علی احمد ساون کے ماحول سے بے نیاز ہے۔ بلکہ وہ بادِ بہاری کی رخصت اور خزاں کے دورِ حکومت کے تاثرات کا بیان کر رہا ہے جب "دنیا ایک بے لذت راگ" بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسے سمے میں دل میں جو ایک انتشار سا محسوس ہوتا ہے اس کے تاثر میں اپنی محبوب کو بھی ہمنوا بنانا چاہتا ہے۔ اور دلیل یہ دیتا ہے (اگرچہ یہ آواز نہیں کہتا) کہ جس طرح بادِ بہاری رخصت ہو چکی اسی طرح جوانی بھی چلی جاتی ہے اس لئے "عشق و الفت کی صہبا سے حیاتِ کیف آور کے جاموں کو بھر لینا چاہئے" ـــــ اس چھپی ہوئی دلیل کا اشارہ اس نظم کی صرف ایک خوبی ہے اور پھر آخر میں جا کر بھی شاعر ایک دلکش کنائتی انداز اختیار کرتا ہے۔ جب اُسے اپنی محبوب کے عارض پر آنسو دکھائی دیتے ہیں۔ یہ آنسو کیسے ہیں؟ کیا خزاں کے تاثر کی وجہ سے، یا شاعر کی باتوں کے تاثر کی وجہ سے یا . . . . یعنی اس آخری کنائے میں بہت سے امکانات پوشیدہ ہیں اور جس طرح خزاں کے ماحول میں ذہن ایک سکون اور خاموشی میں کھو کر کچھ سوچنے لگتا ہے اسی طرح کا اثر اس آخری کنائے سے ہم پر ہوتا ہے، ہم کچھ سوچنے لگتے ہیں۔

کوکب شادانی اور میراجی کی نظموں میں فنی پہلو کی طرف توجہ کیجئے گا۔ اردو میں لمبی بحروں کو میر تقی کی بحریں بھی کہا جا سکتا ہے لیکن میر تقی کی بحروں میں عموماً ساڑھے سات رکن استعمال ہوتے ہیں ـــ یہاں کوکب کی غزل میں شاعر نے پورے آٹھ رکن استعمال کر کے موسیقی میں ایک تجدید سی پیدا کی ہے اسی طرح ایک گیت کے دو بھاؤ میں آٹھ کی بجائے ساڑھے آٹھ ارکان کے استعمال سے ہیئت میں ایک تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ تبدیلی ابھی محض ایک تجربہ ہے۔

زیرِ نظر شمارے میں احتشام حسین کی نظم خصوصاً توجہ کے لائق ہے۔

اس نظم کی حیثیت انفرادی ہے [illegible] انفرادیت میں [illegible] شاعر نے اجتماعی تفکر کی جانب گریز کیا ہے اس کی بجائے ایک اُفتاں [illegible] اور ڈھیلی سی کیفیت نظر آتی ہے وہ ہماری سماج کے [illegible] سے ہم آہنگ [illegible]۔ آج سے بیس پچیس سال پیشتر جب ابھی بین الاقوامی [illegible] نے بہت سے زاویے ہماری نظروں کے سامنے نہیں پیش کئے [illegible] ہم اپنے خوابوں [illegible] کھوئے ہوئے تھے۔ ماضی کے خوابوں میں اور اب [illegible] راد یوں نے ہمیں [illegible] خواب مہیا کر دیئے ہیں مستقبل کے خواب۔ یہ نظم [illegible] کی حقیقت سے [illegible] ہوئے مستقبل کے خوابوں کا آئینہ ہے اور ظاہر کرتی [illegible] حالات خواہ کتنے [illegible] بدل جائیں انسان بنیادی لحاظ سے ہمیشہ سپنوں [illegible] عادی رہے گا۔

سعید احمد "الفتِ گل" میں صرف [illegible] کی نزاکت ہی کو ظاہر کر رہا ہے لیکن جلد ہی وہ [illegible] کی طرف [illegible] ہے اور [illegible] "تجربۂ ناگوار" اور "واردات" تینوں نظموں میں اُسی کا اظہار کرتا ہے جس [illegible] ہیں" اس درد کی ماری دنیا" میں عموماً دوچار ہونا!

اور سب سے آخر لیکن ہر طرح بہتر اختر شیرانی کا تغزل اس بار ادبی دنیا کے صفحۂ زینت ہے۔

ازلی تصویر | بظاہر دنیا میں [illegible] ہی غم نظر آتے ہیں، غمِ عشق اور غمِ روزگار۔ [illegible] ہے کہ اگر ایک غم نہ ہو تو دوسرے کا ہونا لازمی ہے اور سعدی اس تلخ حقیقت کا اظہار اپنے ایک شعر میں کرتا ہے [illegible] دمشق میں ایک بار ایسا قحط پڑا کہ یاروں نے عشق ہی کو فراموش کر دیا۔ آج کل کی دنیا میں بھی کچھ ایسی "دمشقی کیفیت" ہی چھائی ہے جس کے سب سے بڑے [illegible] ترقی پسند ادیب ہیں۔ اس ماہ کا موضوع بھی انہی کے رجحانات سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ظاہر کرتا ہے کہ رہا ایسی "جاناں" ہے جس کے لئے لوگ جان کی پروا کئے بغیر مصروف تگ و دو [illegible] شاید امیر خسرو کو بھی جب وہ دُھنئے کی دُھن کو لفظوں کی قید میں لا رہے ہے شعوری طور پر اس پیشے کے [illegible] پہلو کا احساس تھا۔ ورنہ ان الیہا معنی کہ "از پئے جاناں جاں ہم رفت"؟

میراجی

آئینۂ عالم

جاپان۔ ہندوستان اور چین

جاپان کے ملک الشعرا کا نظریّہ

جاپان گذشتہ کچھ عرصے سے جہانگیری کا جو عظیم الشان خواب دیکھ رہا ہے اور اُسے شرمندۂ تعبیر کرنے کی جو کوششیں اس نے مختلف صورتوں میں اب تک کی ہیں، وہ ایک ایک کر کے ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ چین پر حملہ بھی اسی خواب کا ایک جزو تھا جسے اب تک جنرل چیانگ کائی شک نے پورا نہیں ہونے دیا۔ جاپان کے مدبّرین کی طرح جاپان کے موجودہ ملک الشعراء "یان نوگئی" نے بھی جاپان کے اس اقدام کو حق بجانب ثابت کیا ہے۔ اور اپنی نئی کتاب "جاپان جدید" میں اسی مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اس وقت ایشیا بھر میں صرف جاپان ہی ایک ایسا ملک ہے جو کسی غیر ملکی اثر و اقتدار سے آزاد ہے۔ اس کے سوا ایشیا کے باقی تمام ممالک ایک ایک کر کے مغربیت کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے اپنی آزادی کھو چکے ہیں۔ اس لئے موجودہ صورتِ حال میں ہم یہ چاہتے ہیں کہ ایشیا میں ایک نیا نظام قائم کریں۔ اور ہم اسی غرض سے چین کی طرف بڑھ رہے ہیں جس میں ہمیں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی ہے اور ہم نے نصف سے زیادہ چین پر قبضہ کر لیا ہے۔ مگر جنرل چیانگ کائی شیک اور اس کے دوسرے ساتھی جو مغربی قوتوں کے آلۂ کار ہیں، ہمارے اس عزم کو پاش پاش کرنے پر تلے بیٹھے ہیں لیکن ہم ان باتوں سے گھبرانے والے نہیں۔ ہم نے ایک عزم کیا ہے اور اُسے پورا کر کے چھوڑیں گے خواہ راستے میں ہمیں کیسے ہی مصائب سے دو چار کیوں نہ ہونا پڑے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس جنگ میں جو ہم نے چین کے خلاف جاری کر رکھی ہے۔ دن رات بہت سی چینی جانیں ضائع ہو رہی ہیں۔ اگر اتلافِ جان کا معیار یہی رہا تو یقیناً ہمارا پروگرام پورا نہیں ہو سکے گا۔ ان کو میرا جواب یہ ہے کہ ایسا صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہماری جنگ چین کے عام لوگوں کے خلاف ہو۔ ہم تو جنرل چیانگ کائی شیک کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ کیونکہ اُس نے اور اُس کے ساتھیوں نے جو ہمیشہ مغربی طاقتوں کے اشارۂ چشم و ابرو پر ناچتے رہے ہیں، جاپان کی مخالف تحریکات میں نہایت سرگرمی سے حصّہ لیا ہے۔"

ہندوستان جاپان اور چین کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے جاپانی شاعرِ اعظم نے کہا کہ کچھ عرصہ ہوا ایک ہندوستانی نوجوان نے بھی اسی قسم کے اندیشے کا اظہار کیا تھا جس کے جواب میں میں نے کہا تھا کہ چین اور جاپان کی مثال انگریزوں اور ہندوستانیوں کی سی نہیں ہے کہ دونوں کی زبان تمدن اور کلچر علیحدہ علیحدہ ہے۔ بلکہ چین اور جاپان تو در اصل ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں ہم دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔ ہمارا ایک جیسا رنگ ہے اور ہم بہت مدّت تک بدھ بادشاہوں کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرتے رہے ہیں اُس زندگی میں ایک سکون تھا، چین تھا، آرام تھا، موجودہ دور کی بے اعتمادی اور بے اطمینانی نہیں تھی۔ اس زمانے میں ہم ایک دوسرے کو بدھ کے مجسّمے بطور تحفہ دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں کئی چینی جاپان میں آئے اور وہیں کے ہو رہے۔ دونوں ممالک کے بادشاہوں نے ایک دوسرے کے ممالک میں بدھ کے مندر بنائے جو آج بھی اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ ہم ایک ہیں۔ اور بدھ مذہب نے تو ہمیں ہندوستان کے قدموں میں بھی لا ڈالا تھا۔ اگر ہم نیرا کے ہوروجی مندر کو دیکھیں تو اُس سے ٹنگ ہنگ کے چینی مندر یاد آجاتے ہیں اور ساتھ ہی ہمارا ذہن اجنٹا کے مندروں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کا یہ عکس معلوم ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں چین اور جاپان میں جو مورتیاں بنائی گئیں وہ شیو جی [illegible] کی شکل

کی تھیں۔

اس سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چینی اور جاپانی مندروں کے تعمیر کرنے والے ہندوستانی تھے۔ اُس وقت ہندوستان جاپان کے کتنا قریب تھا۔ مگر ہمارے یہ دوستانہ تعلقات زیادہ دیر تک قائم نہ رہے۔ ان کو منقطع کرنے کی طرف تیرھویں صدی میں سب سے پہلے مغلوں نے ہاتھ بڑھایا۔ جو جاپان پر حملے کی صورت میں تھا۔ اس واقعے کے بعد ہندوستان۔ چین اور جاپان آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔

ہم پھر انہی پرانے تعلقات کو قائم کرکے ایشیا میں ایک نیا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر مغربی قومیں جو یہ جانتی ہیں کہ اس طرح ان کے تجارتی مفاد کو سخت دھکا لگے گا، اُن کی منڈیاں ماند پڑ جائیں گی اور جاپان کو زیادہ منافع ہوگا، ہمارے اس ارادے کی مخالفت کر رہی ہیں۔ اور جنرل چینگ کائی شیک اُن کی طرف سے اس سلسلے میں ہماری مخالفت کرنے میں پیش پیش ہے۔"

ملک الشعرائے جاپان کے مندرجہ بالا خیالات جاپان کے خوابِ ملوکیت کا صحیح آئینہ ہیں۔ جن کی روشنی میں بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس کی آواز تمام جاپان کے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں کی آواز ہوگی۔

دراصل اس خواب کو جاپان انیسویں صدی کی ابتدا سے دیکھ رہا ہے اسی کی تکمیل کے لئے اس نے پہلے روس سے جنگ چھیڑی، مانچوریا کو اپنے قبضے میں کیا اور پھر چین کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ لیکن کیا اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا؟ اس کے متعلق یقین کے ساتھ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ بین الاقوامی صورتِ حال اس سرعت سے تبدیل ہو رہی ہے کہ کوئی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آج شام کو کیا ہوگا اور کل صبح جب دنیا بیدار ہوگی تو اخبارات کی کونسی خبر ہماری توجہ کو اپنی طرف مبذول کرے گی۔

روس کا نظامِ حفظانِ صحت

روس کی خارجی حکمتِ عملی سے کسی کو اختلاف کیوں نہ ہو اشتراکیوں کے مذہبی تصورات اور ان کے نظامِ حکومت کا کوئی کتنا ہی مخالف کیوں نہ ہو لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کسی کو باک نہ ہوگا کہ دنیا کی کسی حکومت نے حفظانِ صحت کی طرف روس سے [illegible] کر توجہ نہیں کی۔ سوویٹ حکومت نے برسرِ اقتدار آتے ہی مخالفین کے قتل سے فارغ ہونے کے بعد سب سے پہلے جس محکمے کی اصلاح کی طرف قدم اٹھایا وہ محکمۂ حفظانِ صحت [illegible]

زاروں کے زمانے میں روس کو سب سے بڑی تکلیف یہی تھی کہ ملک کی بڑی آبادی کے مقابلے میں ڈاکٹروں کی تعداد بہت کم تھی۔ زار خود تو دن رات عیش وعشرت میں مشغول رہتے تھے۔ اُن کو اپنی رعایا کی تکالیف کا احساس نہ تھا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ سلطنت کا دارومدار رعایا پر ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی ملک میں طاعون یا کوئی دیگر متعدی امراض پھیلے تو آنِ واحد میں بڑے بڑے شہروں کا صفایا ہو جاتا۔ حکومت ان کے انسداد کی طرف توجہ ہی نہ کرتی اور اور اگر توجہ کی بھی جاتی تو اس لئے کہ امراء کے طبقے کو نقصان نہ پہنچے۔ ۱۸۹۰ء میں محکمۂ حفظانِ صحت کے اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ روس جیسے وسیع وعریض ملک میں تمام ہسپتالوں کی تعداد ۱۹۵۹ تھی اس کے علاوہ تعویذ گنڈا کے ذریعے علاج کرنے والوں اور نیم حکیموں کی تعداد تیرہ ہزار تھی اور ایسے معالج طاعون اور دیگر امراض سے بھی زیادہ نقصان کا باعث تھے۔ اُس زمانہ میں چیچک بہت پھیلی ہوئی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہر سال صرف چیچک سے ہی ایک لاکھ آدمی مر جاتے تھے۔

اشتراکیوں کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے ان لوگوں میں ہی شمار ہوتے تھے۔ جن کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ یہ لوگ امراء کو راحت پہنچانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اشتراکیوں نے عوام کی تکالیف کو محسوس کرتے ہوئے حکومت کا نظام ہاتھ میں لیتے ہی بیماریوں کے انسداد کی طرف توجہ کی۔ ملک میں ہسپتال بنائے اور ان میں مفت علاج کیا جانے لگا۔ آج کل اگر کوئی کسی پرانے زار کے زمانے کا روس میں کل آئے اور روس کی حالت کو دیکھے تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آئے گا۔ کہاں وہ روس جب بیمار سسک سسک کر مر جاتے تھے مگر کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا تھا اور کہاں آج کا روس کہ ملک میں ہر طرف ہسپتال کھلے ہیں جن میں ہر بیماری کا علاج مفت ہوتا ہے۔

سنہ ۱۹۱۴ء تک روس میں جتنے ہسپتال تھے ان میں بیک وقت چھ لاکھ پچاس ہزار مریضوں کے علاج کا انتظام تھا اور آج کل تو اور بے شمار ہسپتال بھی بن چکے ہیں۔ اشتراکیوں نے اپنے ہی ملک میں ہسپتالوں کا جال نہیں پھیلایا بلکہ اپنی نو آبادیوں کو بھی ان سے مالامال کرنے کی کوشش کی ہے۔ زاروں نے اپنے ملک میں ہسپتال بنا دیئے تھے مگر نو آبادیوں میں کئی کئی سو میل کے فاصلے پر کوئی ہسپتال نہیں ملتا تھا۔ مگر اشتراکیوں نے اپنی نو آبادیوں کی ضروریات کو محسوس کرتے ہوئے اُنہیں پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

زاروں کے روس میں عورتوں کے بھی بازار دلّی میں بہت زیادہ تھے۔ یہ عورتیں بھی نوجوانوں کی صحت کو خراب کرنے کا باعث بنتی تھیں اور بہت لوگ خفیہ امراض کا شکار ہوا کرتے۔ اشتراکی آتے ہی عورتوں کے اڈّے بازاروں سے اٹھوا دیئے۔ ان عورتوں کو جو روزی کمانے کے لئے یہ پیشہ اختیار کرتی تھیں۔ کارخانوں اور لوگوں کے کاموں میں لگا دیا۔ تاکہ یہ افعالِ شنیعہ ان سے چھوٹ جائیں اور مردوں کو ان کی پالی ہوئی بیماریوں سے امان ملے۔ یہی وجہ ہے اب روس میں پہلے کی نسبت امراض پندرہ گنا کم ہیں۔

حفظانِ صحت کے چند وسائل پیدا کرنے اور ہسپتال بنانے کے بعد اشتراکیوں نے تپ دق کے انسداد کی طرف۔ زاروں نے اسے بھی پھلنے پھولنے کے لئے چھوڑ رکھا تھا۔ ان کے زمانہ میں صرف چند ہی تپ دق کے ہسپتال تھے اور وہ حکومت کی طرف سے نہ تھے بلکہ ملک کے چند اداروں نے انہیں قائم کیا ہوا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ تپ سے اموات کی تعداد برابر بڑھ رہی تھی۔

اشتراکیوں نے نظامِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اس لعنت کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت روس میں ہزاروں ایسے ہسپتال قائم ہیں۔ جن میں بیک وقت بیس لاکھ مریضوں کی رہائش ہو سکتی ہے۔ تپ دق کے مریضوں کے لئے صحت افزا مقامات بھی ہیں جہاں دس ہزار بیک وقت ٹھہر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ماسکو میں ۱۹۳۶ء میں ۱۹۱۳ء کی بہ نسبت کہ روس پر زار کی حکومت تھی۔ تپ دق کے مریضوں کی تعداد پہلے کی بہ نسبت ۵۰ فی صدی کم تھی۔ ابھی حکومت نے اس کی روک تھام کی تدابیر ختم نہیں کیں ابھی تپ دق کے علاج کے مزید مؤثر اور سہل طریقے معلوم کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس کام کے لئے اٹھارہ بڑے بڑے ادارے قائم ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے ۱۹۱۴ء میں زار کی حکومت سارے محکمۂ حفظانِ صحت پر بارہ اسی لاکھ خرچ کیا کرتی تھی مگر آج کل صرف تپ دق کے انسداد پر دس ارب خرچ کئے جاتے ہیں غالباً اتنی بڑی رقم دنیا کی کوئی حکومت حفظانِ صحت کے کسی شعبے پر خرچ نہ کرتی ہوگی۔

چونکہ سوویٹ نظام مزدور طبقہ کے بل پر قائم ہے اس لئے ان کی صحت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ کارخانوں اور فیکٹریوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے شفاخانے بنے ہوئے ہیں جہاں حادثات کا اور ہر بیماری کا علاج ہوتا ہے۔ ان کے کام کرنے کے اوقات مقرر ہیں۔ آرام کے لئے بھی ان کو چھٹی دی جاتی ہے ہر کارخانے کے ساتھ کلب ہیں اور ان میں تفریح کا سامان بھی موجود ہے۔ علاوہ ازیں ان کے لئے آرام گاہیں بھی بنی ہوئی ہیں۔ زاروں اور اُمراء کے محلّات کو ایک فرمان کے ذریعے ریسٹ ہاؤس میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

بچّوں اور صنفِ نازک کی صحت پر جتنا روپیہ یہاں خرچ کیا جاتا ہے اتنا یورپ کے کسی ملک میں خرچ نہ کیا جاتا ہوگا بیان کیا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ برطانیہ فرانس امریکہ اور جرمنی سے بھی بڑھا ہوا ہے جتنے زچہ خانے اور بچہ خانے اور عورتوں کے لئے مشورہ گاہیں یہاں ہیں اتنی تمام ممالک میں بھی نہ ہوں گی۔

جب عورت کے وضع حمل کا وقت قریب آتا ہے تو اُسے زچہ خانے میں لے جاتے ہیں جہاں بچہ پیدا ہونے کے کچھ دنوں کے بعد عورت کو معمول کے کام پر روانہ کر دیا جاتا ہے اور بچے کی حفاظت اور نگہداشت حکومت اپنے ذمّے لے لیتی ہے اس سے عورت کے روزانہ کام میں بھی حرج نہیں ہوتا اور بچے کی نگہداشت بھی اچھی طرح ہو سکتی ہے۔

آخری زار کے زمانے میں عورتوں کے علاج کی مشورہ گاہیں صرف نو ۹ تھیں اور بچہ گاہوں میں صرف ۵۵۰ بچّوں کی نگہداشت کا انتظام تھا اور وہ بھی امراء کے بچّوں کے لئے۔ مگر آج کل ان بچّہ گاہوں میں جو شہروں میں ہیں ستّر لاکھ بچّوں کی بیک وقت نگہداشت ہو سکتی ہے علاوہ ازیں تینتالیس ہزار مشورہ گاہیں بھی ہیں اور ہر سال ان کو اور وسعت دی جا رہی ہے۔

ان بچّہ گاہوں میں اعلیٰ درجہ کی دائیاں ملازم ہیں۔ بچّوں کو جو دودھ پینے کے لئے دیا جاتا ہے وہ سائنٹیفک طریقوں سے صاف کیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۴ء کی تمام زچہ گاہوں میں ۶۸ ہزار عورتوں کے لئے انتظام تھا مگر ۱۹۳۷ء میں ایک لاکھ نو ہزار عورتوں کے واسطے انتظام کر دیا گیا اور ۱۹۳۷ء میں حکومت نے جدید وضع کے زچہ خانوں پر پچاس کروڑ روبل خرچ کئے۔

روس کو بچّوں کی صحت کا بہت زیادہ خیال ہے۔ "سب کچھ بچّوں کے واسطے" اشتراکیوں کا نعرہ ہے۔ اسی واسطے زچہ خانوں اور بچّہ خانوں کے علاوہ ایسے بھی بہت سے مرکز بنائے گئے ہیں جہاں صرف بچّوں کے امراض کا علاج کیا جاتا ہے اور حکومت نے بچّوں کو سرکاری خرچ پر دیہات اور صحت افزا مقامات پر بھیجنے کا انتظام کر رکھا ہے .... ۱۹۳۷ء میں ترسٹھ کروڑ ساٹھ لاکھ روبلز بچّوں کو صحت افزا مقامات پر بھیجنے میں خرچ کئے گئے تھے۔

ان ہی حالات کے پیشِ نظر آج کل طبّی سائنس کو بھی بہت زیادہ ترقی دی جا رہی ہے۔ زاروں نے اس کی طرف سے بھی غفلت برتی تھی اور ایک بار تو ایک ڈاکٹر کو دماغی امراض کے متعلق ایک کتاب لکھنے کے جرم میں قید کر دیا تھا۔

اور اس طرح اس کو اس کی خدمات کے باوجود جو اس نے طب کے شعبے میں سرانجام دی تھیں ان کو میڈیکل اکیڈیمی کا ممبر بھی نہیں بننے دیا گیا تھا۔ مگر موجودہ حکومت اس سے قطعاً بےپرواہ نہیں ہے بلکہ حکومت ڈاکٹروں کی ہمت افزائی کر رہی ہے اور میڈیکل ریسرچ کا کام اعلیٰ پیمانہ پر ہو رہا ہے اور اس پر حکومت پانی کی طرح روپیہ خرچ کر رہی ہے اور لیبارٹریوں کو جدید ساز و سامان سے آراستہ کر رہی ہے مثلاً ۱۹۳۷ء میں حکومت نے پانچ کروڑ روبلز کے خرچ سے ماسکو میں ایک تجربہ گاہ بنائی تھی جس میں چھ ہزار پانسو کمرے ہیں اور جہاں روس کے بڑے بڑے ڈاکٹر دن رات تجربے کرتے رہتے ہیں اور ۱۹۲۶ء میں ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا جہاں خون کے متعلق تجربے کئے جاتے ہیں۔ روس میں آج کل دو سو سے زیادہ ریسرچ گاہیں ہیں، جہاں نئی نئی باتیں اور بیماریوں کے نئے نئے علاج معلوم کئے جاتے ہیں اور ان کو عملی طور پر اختیار کیا جاتا ہے تاکہ قوم کی صحت کا معیار بلند کیا جائے۔

صحت کا معیار بڑھانے کے لئے فلموں کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ مسرت کی بات یہ ہے کسی شخص کو شراب خانوں سے باہر شراب پینے کی اجازت نہیں ہے اور نوجوانوں کو خاص طور پر اس لعنت سے بچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

غرضیکہ حفظانِ صحت کے سلسلے میں اس وقت روس دنیا کے تمام ممالک سے بڑھا ہوا ہے اور اس سلسلے میں اس نے جو ترقی کی ہے وہ دیگر ممالک کے لئے مشعل راہ کا کام دے گی۔

تابش صدیقی

دو شعر

کسی کا کون رہا ہوں تو عمر بھر — پھر بھی!
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب — مگر پھر بھی!

ہزار بار ادھر ہی سے لوگ گذرے ہیں
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی

فراق گورکھپوری

برسات کا بلاوا

آکاش پہ اودی اودی اور سرمست گھٹائیں تیرتی ہیں
ساون کے جھولوں پر بھیگی بھیگی سی ہوائیں تیرتی ہیں
ان کالی کالی راتوں کو فردوسِ نور بنا دونا!
سلمیٰ! وہ حسیں، مہتاب آلودہ جبیں اک بار دکھا دونا!!

اک کیف جہاں پر طاری ہے اک سکر فضا میں ساری ہے،
اک بزمِ رامش و رنگ بپا، اک جشنِ مسرت جاری ہے
میرے بھی دلِ غمدیدہ کو مرہونِ کیف بنا دونا!
ان مست گھٹاؤں کے سایوں میں چھپ کر اک جام پلا دونا!

وہ دن بھی کیسے رنگین تھے جب مدہوشِ عشق جوانی تھی!
جب دورِ زمیں افسانہ تھا، اور گردشِ چرخ کہانی تھی!
سلمیٰ! پھر پریم کے وہ بہکے بہکے سے گیت سنا دونا!
پھر آرزوؤں کی سوئی ہوئی دنیا میں حشر اٹھا دونا!

کچھ شغل نہیں، کچھ کام نہیں، اب ہر دم یاد تمہاری ہے!
دن بیت رہے ہیں ساون کے، آنکھوں سے برکھا جاری ہے،
ایسے میں تو اے سلمیٰ! آ کر وہ سندر روپ دکھا دونا!
اک غم کے تلاطم میں جشنِ الفت کی نوید سنا دونا!!

ساغر جلیلی

غزل

نہ سازو مطرب، نہ جام ساغر، وہ بہار و چمن ہے باقی
نگاہِ شمعِ سحر کے پردے پہ نقشِ انجمن ہے باقی

زمانہ گذرا، وہ یاسمن تو، ہوئی ہمکنار رہ کر
مگر ابھی تک ہمارے پہلو میں نکہتِ یاسمن ہے باقی

بھلا چکی دل سے شامِ غربت ایک نقشہ ہر ایک صورت
ہماری آنکھوں میں لیکن اب تک فروغِ صبحِ وطن ہے باقی

حباب آسا محیطِ ہستی جو ہے، مٹنے کو بن رہا ہے
ہے انقلاب اک نمود ایسی جو زیرِ چرخِ کہن ہے باقی

مٹا دئیے بے ستونِ چرخِ کہن نے شیریں لقا ہزار دل
مگر محبت کے لب پر اب بھی ترانۂ کوہ کن ہے باقی

زمانہ بدلا، مٹی جوانی، وہ محبت، نہ زندگانی
بس ایک بھولی سی یاد ہے جو برنگِ داغِ کہن ہے باقی

غمِ زمانہ کی تلخیوں سے ہوئی ہے پامال طبعِ اختر
نہ وہ نشاطِ کہن ہے باقی، نہ وہ مذاقِ سخن ہے باقی

اختر شیرانی

بیماری کی خبر

جب خط میں تم لکھ دیتی ہو کچھ حال اپنی بیماری کا
میں بیٹھ کے تنہائی میں نہ جانے کیا کیا سوچا کرتا ہوں

کچھ اندھے، کوڑھی، دیوانے، آنکھوں میں سمانے لگتے ہیں
کچھ قحط زدہ بھوکے پیاسے، جاں دے دے کر خاموشی سے
دنیا میں مفلس ہونے کی تعزیریں پانے لگتے ہیں!
کٹتے ہیں جن کے شام و سحر اک قابلِ نفرت خواری سے
جو مرتے ہیں آسانی سے اور جیتے ہیں دشواری سے
خوں چوس لیا ہے غیروں نے بیمار بھی ہیں، نادار بھی ہیں
جینے کی تمنا ہے دل میں اور جینے سے بیزار بھی ہیں

اس درد کی ماری دنیا میں ایسے انساں کیوں بستے ہیں
جو ساری عمر ضرورت کی چیزوں کے لئے بھی ترستے ہیں؟
گو ایسے لوگ بھی ہیں جن کو آسائش ہی آسائش ہے
وہ سب ہے مہیا ان کے لئے جس چیز کی ان کو خواہش ہے
جن کے لئے سونا مٹی ہے جن کے لئے موتی سستے ہیں

لیکن مجبور انسانوں کو حق کیوں نہیں حاصل جینے کا؟
طوفاں ہی کے قبضے میں کیوں پتوار ہے ان کے سفینے کا؟
کب تک بے بس انسان یونہی تقدیر کا رونا روئے گا
کب تک بے کچھ بھی پائے ہوئے اپنا ہی سب کچھ کھوئے گا؟
کب تک اندھی بھیڑوں کی طرح یہ اپنی راہ نہ پائے گا؟
کب تک یہ موت کے آگے سے پیچھے ہی ہٹتا جائے گا؟

پھر خود ہی دل بول اُٹھتا ہے اب وقت بدلنے والا ہے
ذرّے سورج بن جائیں گے وہ دور بھی آنے والا ہے
امیّد کی اک ننھی سی کرن مایوسی پر چھا جاتی ہے۔
اور اس کی ضو میں ایک نئی دنیا بازو پھیلاتی ہے
سوئی سی رگوں میں چبھتی ہے آنکھوں میں آنسو آتے ہیں
دل بے قابو ہو جاتا ہے جینے کی ہوس بڑھ جاتی ہے
جاں وقفِ تپش ہو جاتی ہے اور عزم بغاوت کرتی ہے
اُس وقت اک سیلِ ارادوں کی سینے سے ہو کے گذرتی ہے
دنیا کو خلد بنانے کا جو دھیان سا دل میں آتا ہے
ایسی خبروں کے سننے سے وہ اور قوی ہو جاتا ہے
جب خط میں تم لکھ دیتی ہو کچھ حال اپنی بیماری کا
میں بیٹھ کے تنہائی میں نہ جانے کیا کیا سوچا کرتا ہوں
ہم جنگ کریں گے فطرت سے فطرت پر قابو پائیں گے
اور فطرت پر قابو پا کر اک روز امر بن جائیں گے۔

رشید احتشام حسین

اقبال اور اُس کے نقّاد

(ایک ادبی مکالمہ)

افراد:۔ اقبال۔ ماہر تعلیم۔ علامہ۔ پروفیسر۔ طالب علم۔

وقت:۔ آج کل کا زمانہ۔

(اقبال اپنے کچھ اشعار گنگنا رہے ہیں)

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ — سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

نہ بادہ ہے نہ صراحی نہ دورِ پیمانہ — فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزمِ جانانہ

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

کلی کو دیکھ کہ ہے تشنۂ نسیمِ سحر — اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ

مقامِ عقل سے آساں گذر گیا اقبال — مقامِ شوق میں کھو یا گیا وہ فرزانہ

ماہر تعلیم:۔ آخری شعر آپ نے بہت خوب کہا۔

مقامِ عقل سے آساں گذر گیا اقبال — مقامِ شوق میں کھو یا گیا وہ فرزانہ

آپ کی شاعری کا مقصد اس شعر سے خوب واضح ہو جاتا ہے۔ آپ نے عقل و عشق کا مقام کس خوبی سے سمجھایا ہے۔

علامہ:۔ آج کل فلسفے کا زمانہ ہے۔ ہر چیز اور ہر شخص کا فلسفہ نکالا جاتا ہے حتیٰ کہ اقبال کا شیطان، اقبال کا انسان، ان سب کا فلسفہ نکالا گیا ہے۔ اور اِن ماہرِ تعلیم نے تو غضب ہی کر دیا۔ اقبال کے کلام سے تعلیم کا ایک فلسفہ اخذ کر کے پوری ایک کتاب لکھ ڈالی۔ حیران ہوں یہ فلسفے اقبال کے ہیں یا ان حضرات کے؟ دیکھئے پروفیسر صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں۔ انہوں نے اقبال کے شیطان کا فلسفہ مرتّب کیا ہے۔

پروفیسر:۔ علامہ۔ اس میں آخر کیا مضائقہ ہے کہ اقبال کے کلام سے چند فلسفے مرتّب کر لئے جائیں۔ انہوں نے سوائے فلسفۂ خودی کے اور کسی فلسفہ کا گو صریح اظہار نہیں کیا لیکن ان کے کلام میں بعض دوسرے فلسفوں کے متعلق اشارے ملتے ہیں۔ اگر ماہرِ تعلیم نے اور میں نے ایک نیا فلسفہ اقبال کے کلام سے مرتب کر لیا تو کیا غضب ہُوا؟ بہتر ہوگا اگر اقبال خود اس مسئلے پر روشنی ڈالیں۔ وہ یہاں موجود ہیں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

اقبال:۔ معاف فرمائیے۔ آپ حضرات میرے گنگنانے میں خلل انداز ہوئے۔ یہ سلسلہ تو خیر اب منقطع ہو گیا لیکن آپ کی بحث بہت دلچسپ ہے۔ میں اپنا اظہارِ خیال سب سے آخر میں کروں گا۔

طالب علم:۔ دنیا کہتی ہے کہ اقبال ایک فلسفی شاعر ہے۔ فلسفہ اور شاعری تو متضاد چیزیں ہیں۔ بھلا یہ دونوں ایک جگہ کیسے جمع ہو سکتی ہیں۔

پروفیسر:۔ آپ غلط سمجھے۔ اقبال کا کلام تو آبِ حیات ہے جس سے ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق زندگی حاصل کرتا ہے۔ وہ تو امرت ہے جس سے روح کو بالیدگی اور دل کو توانائی ملتی ہے۔ اُن کا کلام فلسفیانہ اس نقطۂ نظر سے ہے کہ وہ زندگی کا ایک مکمل تصوّر پیش کرتا ہے۔ وہ پڑھنے والے کو الفاظ کی بھول بھلیاں یا تخیّل کی بلند پروازی میں نہیں چھوڑ جاتا بلکہ وہ اُسے زندگی کے حقائق سمجھاتا ہے۔ اقبال کو ہم فلسفی شاعر اس نقطۂ نظر سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے سامنے زندگی کے متعلق چند نظریے پیش کرتے ہیں اور ان کا ایک مخصوص پیغام ہے

طالب علم:۔ ان کے نظریے کیا ہیں۔

پروفیسر:۔ ہر بڑے شاعر کی طرح اقبال بھی اپنے زمانے کا ترجمان ہے۔ حالی نے قوم کا مرثیہ پڑھا، وہ وقت مرثیہ خوانی ہی کا تقاضا تھا۔ ظرافت و طنز نے اکبر کو نقیب اور نقاب دونوں کا کام دیا۔ وہ اس پردے میں سیاست و تہذیب پر بڑی بڑی چوٹیں کر گئے۔ یہ بھی ان کے زمانے کا تقاضا تھا۔ اقبال نے عمل اور جد و جہد کی تعلیم دی۔ انہوں نے "دوش" کے "آئینے" میں "فردا" کو دیکھ لیا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حالی ماضی کے شاعر ہیں، اکبر حال کے اور اقبال مستقبل کے۔ خود اُن کا کلام اس کی ترجمانی کرتا ہے۔ حالی کہتے ہیں

ہیں یہ باتیں بھول جانے کی مگر کیونکر کوئی
بھول جائے صبح ہوتے ہی وہ سب شب کا سماں
بزم کو برہم ہوئے مدت نہیں گذری بہت
اُٹھ رہا ہے گل سے شمع بزم کے اب تک دھواں

اکبر کا خیال ہے۔

نظم اکبر کو سمجھ لو یادگارِ انقلاب یہ اُسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

اور اقبال فرماتے ہیں:۔

"من صدائے شاعر فردا ستم" یا
"دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں"

طالب علم:۔ اچھا پروفیسر صاحب۔ یہ تو بتلائیے ان تینوں کے مخصوص پیغامات کیا ہیں۔

پروفیسر:۔ مختصر طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ حالی کا پیغام تھا "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" اکبر قدیم چیزوں کی طرف لوٹنے کی تلقین کرتے تھے اور اقبال ماضی و حال کے امتزاج سے ایک نئی چیز اسلامی حقائق کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ ہمارے علامہ نے تو اقبال کے علم الکلام پر ایک بسیط مضمون بھی لکھا ہے۔

علامہ۔ جی ہاں مضمون تو میں نے لکھا ہے لیکن میں کوئی فلسفہ مرتب نہ کر سکا۔ ماہرِ تعلیم کو دیکھو۔ پہلے تعلیم کے متعلق ایک فلسفہ مرتب کیا اور پھر اس پر ایک نئی کتاب انگریزی میں لکھ ڈالی۔ تعریف یہ ہے کہ اپنے دلائل کے ثبوت میں خود اقبال کے اشعار پیش کرتے ہیں۔ فرمائیے حضرت دراصل آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

ماہرِ تعلیم:۔ اس سے تو غالباً کسی کو انکار نہ ہوگا کہ اقبال کی شاعری کا نچوڑ اُن کا فلسفۂ خودی ہے۔ ان کے اور چیزوں کے متعلق مختلف نظریے ہیں لیکن وہ سب اسی محور کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ وہ فرد کی صلاحیتوں کو اُبھارنا چاہتے ہیں۔ وہ اسے جد و جہد اور حرکت کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ اسے زندگی سے نفرت نہیں بلکہ محبت کرنا سکھاتے ہیں۔ لفظ "خودی" ہمارے یہاں عموماً نخوت و غرور کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ خودی سے مراد خودداری نہیں بلکہ خود پسندی لی جاتی ہے۔ لیکن اقبال کے یہاں یہ لفظ ایک مخصوص معنی میں استعمال ہوا ہے۔ وہ اس سے مراد فرد کی پوشیدہ قوتوں کو ابھارنے کی لیتے ہیں۔ خودی کی تکمیل کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں یعنی اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہیہ۔ فرد کی خودی جب جماعت کی خودی میں ضم ہوتی ہے تو اس کا دوسرا نام بے خودی ہو جاتا ہے۔ بے خودی بھی دراصل خودی کی ایک کیفیت ہے اور ایک حد تک مکمل۔ میں نے اس خودی کے تصور کو تعلیم کا ایک اہم جزو قرار دیا ہے اور مثال میں اقبال کے اشعار پیش کئے ہیں کیونکہ میرا خیال ہے

رائی زورِ خودی سے پربت پربت ضعفِ خودی سے رائی

اگر ملک کے بچے اس صحیح تعلیم سے جس کا ایک اہم جزو "خودی" بھی ہے آراستہ ہو کر نکلیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اُس کے دن پھر جائیں گے۔ غرض میں نے اپنی کتاب اس نظریے کے ماتحت مرتب کی ہے۔

علامہ:۔ آپ ماہرِ تعلیم بھی ہیں اور ایک حد تک فلسفی بھی۔ لیکن ان پروفیسر صاحب کو دیکھئے کہ یہ ماہرِ تعلیم تو خیر ہو سکتے ہیں لیکن فلسفی ہرگز نہیں۔ پھر بھی انہوں نے اقبال اور ابلیس کا فلسفہ مرتب کر ڈالا۔ میں نے ابلیس کے اس نئے تصور کے متعلق اُن کا مضمون پہلی مرتبہ رسالہ "ہندوستان" میں دیکھا۔ واقعی انہوں نے کمال کر دیا۔ خواہ مخواہ بال کی کھال نکال کر ایک نیا فلسفہ مرتب کر لیا۔ کیا آپ اپنے فلسفے کی وضاحت کریں گے۔

پروفیسر:۔ کیا آپ کے نزدیک یہ فلسفے اقبال کے نہیں ہیں؟ ہم لوگوں نے محض مرعوب کرنے کے لئے گھڑ لئے ہیں؟ شاید آپ کو نہیں معلوم کہ اقبال کے یہاں شیطان کا ایک مخصوص تصور ملتا ہے۔ وہ اسے محض بدی کی قوت نہیں سمجھتے۔ وہ اس میں جوش و حرکت پاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک شیطان ہمیشہ ترقی کی طرف گامزن رہتا ہے۔ لیکن اس کی خودی تعمیری نہیں بلکہ تخریبی ہے۔

وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک گیا ہے۔ جمود و سکون شیطان کے لئے بے معنی لفظ ہیں۔ اکثر بڑے شاعروں کے یہاں شیطان کا ایک مخصوص تصور ملتا ہے، کیا آپ کو نہیں معلوم کہ ملٹن کی "فردوس گم شدہ" کا اصل ہیرو آدم نہیں بلکہ شیطان ہے۔ گوئٹے کے "فاوسٹ" میں بھی شیطان کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ غرض شعر و ادب کا شیطان مذہب کے شیطان سے بالکل مختلف ہے۔ اقبال کے یہاں پہلی مرتبہ شیطان کا تصور "پیامِ مشرق" کی ایک نظم میں ملتا ہے۔ اس کے بعد "جاوید نامہ" میں "نالۂ ابلیس" کے نام سے فلک مشتری کے آخر میں جو نظم ہے، اُس کے مطالعہ سے یہ نظریہ اور واضح ہو جاتا ہے۔ "بالِ جبریل" میں ہمیں دو نظمیں ابلیس کے متعلق ملتی ہیں یعنی "ابلیس کی عرضداشت" اور "جبریل و ابلیس" آخر الذکر نظم کا شمار اقبال کی بہترین نظموں میں ہوتا ہے۔ "ضربِ کلیم" میں بھی ابلیس کے متعلق دو نظمیں ہیں یعنی "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" اور "تقدیر، ابلیس و یزداں"۔ لیکن ابلیس کے متعلق ان کی معرکہ کی نظم "ارمغانِ حجاز" میں ہے اس کا عنوان ہے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" یہ نظم بہت رنگین و مرصّع ہے۔ اس میں ابلیس اپنے مختلف مشیروں سے گفتگو کرتا ہے۔ مشیر اپنے شیطانی نظام کے متعلق مختلف خطرے ظاہر کرتے ہیں آخر میں ابلیس اپنا خطرہ ظاہر کرتا ہے وہ کہتا ہے۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمّت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

اس سلسلے میں جمہوریت، الٰہیات، کارل مارکس اور دیگر سیاسی رجحانات کی طرف جو لطیف اشارے کئے گئے ہیں وہ بہت دلچسپ ہیں۔ غرضکہ ہمیں اقبال کے ابلیس میں اور دوسرے شعرا کے ابلیس میں فرق کرنا چاہئے۔

طالب علم:۔ ابلیس کی بحث کو اب ختم کیا جائے تو بہتر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اقبال نطشے اور برگساں سے زیادہ متاثر ہوا ہے۔

پروفیسر:۔ رومی سے بھی ـــــ رومی کا ایمان اور نطشے کا کفر اقبال کے لئے ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں اقبال رومی کو اپنا پیر و مرشد سمجھتا ہے اور نطشے کے متعلق اس کا خیال ہے کہ اس کا دماغ کافر کا ہے اور قلب مومن کا۔ نطشے کا فوق البشر اقبال کے یہاں خیر البشر ہو گیا ہے۔ نطشے و اقبال دونوں خودی کی نشو و نما کے قائل ہیں اور عیسائیت سے بیزار ہیں۔ نطشے خدا کا منکر ہے اور اقبال اس کا قائل، وہ نطشے سے خطاب کرتا ہے۔

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانہ میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے۔

رومی اور اقبال دونوں اسلامی شاعر اور مفکر ہیں۔ دونوں ارتقاء کے قائل ہیں۔ دونوں وحدت الوجود کے نظریے کے خلاف ہیں۔ دونوں کے یہاں سکون اور جمود موت کے مترادف ہے دونوں فرد کی خودی کو ابھارنا چاہتے ہیں۔ اقبال رومی سے بہت متاثر ہوا ہے اور ہر جگہ اس کا ذکر بڑے ادب سے کرتا ہے۔ برگساں کا زمان و مکان کا نظریہ بھی اقبال کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن صحیح طور پر یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے کہاں تک متاثر ہوئے ہیں اقبال یورپ کے قیام میں برگساں سے فرانس میں ملا اور اس بڈھے فلسفی نے اقبال سے اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا۔ برگساں بذاتِ خود اقبال سے بہت متاثر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے تخیل کی بلند پروازی معلوم کرنے کے لئے ہمیں بعض دوسرے فلسفیوں پر بھی نظر ڈالنا پڑے گی۔

طالب علم:۔ لیکن اُن کا اثر اقبال پر کچھ زیادہ نہیں ہوا۔

پروفیسر:۔ اثر تو کچھ زیادہ نہیں ہوا۔ لیکن اقبال کی نظر ان فلسفیوں کے فلسفہ پر بھی ہے۔ وہ ان کے فلسفوں کی خوبیاں اور خامیاں اچھی طرح سمجھتا ہے۔ ہم اس سلسلے میں کانٹ، ہیگل، شوپنہار وغیرہ کا نام لے سکتے ہیں۔

علامہ:۔ آپ دونوں حضرات رومی کو چھوڑ کر بقیہ مشرقی مفکرین کو بالکل نظر انداز کر رہے ہیں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ مجدد الف ثانی۔ محی الدین ابن عربی اور ابن خلدون کے فلسفے بھی اقبال کی نظر میں تھے۔ ہم مغربی فلسفہ کے جوش میں اُن کے نام بالکل بھول جاتے ہیں۔

پروفیسر:۔ آپ نے درست فرمایا۔ "ضربِ کلیم" میں تقدیر پر جو نظم ہے۔ وہ محی الدین ابن عربی سے ماخوذ ہے۔ ان مفکرین کے علاوہ کچھ شاعروں کا بھی اقبال پر اثر پڑا ہے۔

طالب علم:۔ کن شاعروں کا اقبال پر اثر پڑا ہے؟

پروفیسر:۔ یہ اثر دو طرح کا ہے۔ ایک اسلوبِ بیان پر اور دوسرا تخیل پر۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ داغ اور غالب کا اثر ایک حد تک اقبال

کے اسلوب پر پڑا اور گوئٹے، رومی، غنی کاشمیری کا اُن کے تخیّل پر۔ لیکن نظم میں اسلوب اور تخیّل کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ کرنا مشکل ہے۔

طالب علم:۔ کیا اقبال حالی اور اکبر سے متأثر نہیں ہوئے ہیں۔

پروفیسر:۔ حالی و اکبر سے متأثر ضرور ہوئے ہیں لیکن یہ امر دائمی نہ تھا۔ ڈاکٹر عبداللطیف کا خیال ہے کہ اقبال نے "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" حالی کے مسدّس سے متأثر ہو کر لکھے ہیں۔ "بانگِ درا" کے آخر میں جو ظریفانہ کلام ہے کیا وہ اکبر کے زعفران زار کی خوشہ چینی نہیں؟ لیکن یہ اثرات پیدا ہوئے اور ختم ہو گئے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ داغ اور غالب کا اثر بھی "بانگ درا" کے بعد ختم ہو گیا غنی کاشمیری بھی کچھ زیادہ دور تک ساتھ نہ دے سکے۔ گوئٹے "پیامِ مشرق" ہی تک اقبال کے ہم سفر رہے۔ البتہ رومی وہ شاعر ہے جس نے اقبال کا کبھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ رومی کے متعلق جو اشعار "جاوید نامہ" اور "بالِ جبریل" میں ہیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

علامہ:۔ رومی اور نطشے کا اثر اقبال پر نمایاں ہے۔ لیکن میرے خیال میں رومی کا اثر اقبال پر "اسرارِ خودی" کی اشاعت کے وقت سے شروع ہُوا ہے اور نطشے کا اثر تو یقیناً اُن کے قیامِ ولایت کی پیداوار ہے۔

پروفیسر:۔ مناسب ہو گا اگر ہم اقبال کے ذہنی ارتقا پر ایک اجمالی نظر ڈال کر اُن کی شاعری کے ادوار مقرر کر لیں۔ تمام مفکّرین اور شعرا کے اثرات کا زمانہ خود بخود واضح ہو جائے گا۔ لیکن یہ مسئلہ ذرا پیچیدہ ہے۔ بہت ممکن ہے یہاں ہم میں سے ہر ایک اقبال کی شاعری کے مختلف دور قائم کرے۔ ان ماہرِ تعلیم نے اقبال کی شاعری کا عمیق مطالعہ کیا ہے میں ادوار کے متعلق ان کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

ماہرِ تعلیم:۔ جہاں تک میں نے اس مسئلے پر غور کیا ہے میرا خیال ہے کہ اقبال کی شاعری کو پانچ دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ابتدا سے ۱۹۰۵ء تک جیسا کہ "بانگ درا" میں ہے۔ دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک۔ یہ اُن کے قیامِ ولایت کا زمانہ ہے۔ تیسرا دور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۳ء تک سمجھنا چاہیئے۔ اُن کی مشہور نظمیں شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع و شاعر، والدہ مرحومہ کی یاد میں، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام اور فارسی مثنویاں اسرار و رموز اسی دور کی پیداوار ہیں۔ چوتھا دور ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۵ء تک ہے۔ اس دور کا بیشتر کلام فارسی میں ہے اور اردو کے مجموعۂ کلام یعنی "بالِ جبریل" میں بھی فارسی نظموں اور غزلوں کا چربہ اتارا گیا ہے۔ اقبال کا خیال دوسرے مفکّرین کے متعلق اور مغربی سیاست کے متعلق اُن کی رائے ہمیں پہلی مرتبہ واضح طور پر اسی دور کی نظموں سے معلوم ہوتی ہے۔ پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، مسافر اور بالِ جبریل اس دور کی اہم تصانیف ہیں۔ شیطان کا نظریہ بھی پہلی مرتبہ اِسی دور میں ملتا ہے۔ پانچواں دور ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء تک ہے۔ اس میں ہمیں اقبال کے تھکے ہوئے دماغ کے چند نقوش ملتے ہیں۔ وہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح جو ایک مرتبہ گولی کھا چکا ہو اپنے دشمن یعنی مغربی تہذیب و معاشرت پر حملہ کرتا ہے اور اس کی دھجّیاں اُڑاتا ہے۔ ضربِ کلیم کی نظموں میں وہ ہمیں بنی اسرائیل کے کسی پیغمبر کی طرح دکھائی دیتا ہے جو اپنی گمراہ قوم کو نصیحت کر رہا ہے۔ اس دور کی تصانیف ضربِ کلیم، پس چہ باید کرد اور ارمغانِ حجاز ہیں۔

علامہ:۔ مجھے اس تقسیم سے اتّفاق نہیں۔

پروفیسر:۔ میں نے اسی لئے کہا تھا کہ ہم میں سے ہر ایک اقبال کی شاعری کے مختلف دور قائم کرے گا۔ اچھا آپ کی رائے میں کتنے دور ہونا چاہئیں۔

علامہ:۔ کیا ضرورت ہے کہ "بانگ درا" کے تینوں دوروں کو برقرار رکھا جائے۔ ہم ابتدا سے ۱۹۰۸ء تک پہلا دور قائم کر سکتے ہیں۔ اس دور کی ممتاز خصوصیّات وطنیّت اور منظر نگاری ہیں۔ "نیا شوالہ" "تصویرِ درد" اور قیامِ ولایت کی تمام نظمیں اس کی ترجمانی کرتی ہیں۔ دوسرا دور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۲ء تک قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس دور کی مشہور نظمیں شکوہ، جوابِ شکوہ اور شمع و شاعر ہیں۔ اُن کے تصوّرِ خودی کا آغاز "شمع و شاعر" سے جو ۱۹۱۲ء کی تصنیف ہے ہو جاتا ہے۔ تیسرا دور میرے خیال میں ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۲ء تک قائم ہونا چاہیئے۔ اس دور کی اہم خصوصیّت اُن کا تصوّرِ خودی ہے۔ وہ محدود وطنیّت کے بجائے ایک عالمگیر اسلامی تصوّر کے قائل ہو جاتے ہیں۔ ان کی مشہور مثنویاں اسرار و رموز اس دور کی پیداوار ہیں۔ چوتھا دور ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۵ء تک

ہونا چاہئے۔ اس دور میں ہمیں اقبال کی بعض اہم تصانیف ملتی ہیں مثلاً خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، مسافر اور بالِ جبریل۔ یہ اقبال کی شاعری کے شباب کا زمانہ ہے۔ اُن کے بعض اہم نظریے ہمیں اسی دور میں ملتے ہیں۔ ان کا شاہ کار "جاوید نامہ" بھی اسی دور کی پیداوار ہے۔ اس دور میں گیارہ سال کے بعد اقبال کا دوسرا اردو مجموعۂ کلام بالِ جبریل منصّۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ اردو دان حضرات کو پیامِ مشرق اور زبورِ عجم کا لطف بالِ جبریل کی نظموں میں آگیا۔ پانچواں دور ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۶ء تک ہونا چاہئے۔ دراصل یہ ضربِ کلیم اور فارسی مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق کا دور ہے۔ مغربی تہذیب کے خلاف اعلانِ جنگ کیا گیا ہے۔ چنانچہ "ضربِ کلیم" کے سرورق پر یہ اشعار درج ہیں۔

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

"پس چہ باید کرد" میں بھی مغربی تہذیب کی خامیاں اُجاگر کی گئی ہیں۔ چھٹا اور آخری دور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء تک ہے۔ اس دور کو صرف "ارمغانِ حجاز" کے لئے قائم کرنا پڑا۔ یہ کتاب اقبال کی آخری یادگار ہے اور اپنے رنگ میں بھی اُن کی دوسری تصانیف سے مختلف ہے۔ وہ اسے ساتھ لے کر حج بیت اللہ کو جانا چاہتے تھے لیکن بیماری نے اس کی اجازت نہیں دی۔ کتاب کا بیشتر حصّہ فارسی میں ہے اور آخر میں سو صفحات کے قریب متفرق اردو نظمیں ہیں۔ فارسی میں رباعی کا پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ اردو کے حصے میں اُن کی بعض نظمیں اردو داں طبقہ کو ہمیشہ یاد رہیں گی مثلاً ابلیس کی مجلس شوریٰ، مسعود مرحوم، ملّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض، سر اکبر حیدری کے نام، حسین احمد وغیرہ وغیرہ۔

پروفیسر:۔ میرے خیال میں آپ نے بہت زیادہ دور قائم کر دیئے۔ ہم اقبال کی شاعری کو صرف تین دوروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ کیا مضائقہ ہے اگر ایک دور میں متعدد خصوصیات موجود ہیں۔ ان کے ذہنی ارتقا اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے یہ دور مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں پہلا دور ابتدا سے ۱۹۱۲ء تک ہونا چاہئے۔ اس دور کی خصوصیات وطنیت، منظر نگاری اور لفظ تراشی ہیں۔ وطنیت پر ہمالہ، کنار راوی، نیا شوالہ، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت اور تصویرِ درد ان کی بہترین نظمیں ہیں منظر نگاری اور لفظ تراشی کے نمونے اس دور کی تقریباً ہر ایک نظم میں کچھ نہ کچھ مل جاتے ہیں۔ دوسرا دور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۳ء تک ہے۔ اس دور کی ممتاز خصوصیات اُن کا تصوّرِ خودی اور ان کا مستقل طور پر فارسی میں اشعار لکھنا ہے۔ ان کی تمام اہم فارسی تصانیف اس دور کی پیداوار ہیں۔ ۱۹۱۲ء سے انہوں نے مثنوی "اسرارِ خودی" لکھنا شروع کر دی تھی۔ ۱۹۱۵ء میں یہ مثنوی پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ "رموزِ بے خودی" ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔ پیامِ مشرق ۱۹۲۴ء میں، زبورِ عجم ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۷ء میں جاوید نامہ ۱۹۳۲ء میں اور مسافر ۱۹۳۳ء کی پیداوار ہے۔ تیسرا دور ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۸ء تک سمجھنا چاہئے۔ اس دور میں اقبال نے "بانگِ درا" کی اشاعت کے گیارہ سال بعد پھر اردو کی طرف رُخ کیا۔ بالِ جبریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ ضربِ کلیم ۱۹۳۶ء میں اردو دان طبقہ کے ہاتھوں میں پہنچی۔ لیکن فارسی کلام کا سلسلہ اب بھی منقطع نہیں ہوا تھا۔ مثنوی "پس چہ باید کرد" اور "ارمغانِ حجاز" اقبال کی آخری فارسی تصانیف ہیں۔ شاعر کہیں مغربی تہذیب کی دھجیاں اُڑاتا ہے۔ اور کہیں ابلیس کی مجلس شوریٰ منعقد کر کے مغربی سیاست پر رائے زنی کرتا ہے۔ بالِ جبریل کی غزلیات اس کی شاعری کا نچوڑ ہیں۔ ارمغانِ حجاز میں اگر ایک طرف وہ مسعود مرحوم کا مرثیہ لکھتا ہے تو دوسری طرف کشمیر پر اُس کے اشعار پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ غرض یہ دور اپنی گوناگوں رنگینیوں کی وجہ سے آپ اپنی نظیر ہے۔ میرے خیال میں اقبال کے ذہنی ارتقا کی یہ تینوں ادوار اچھی طرح ترجمانی کرتے ہیں۔

طالب علم:۔ جہاں تک اقبال کے ذہنی ارتقا اور ان کے کلام کے ادوار کا تعلق تھا میرے خیال میں سیر حاصل بحث ہو چکی۔ اب اس سلسلے میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن مجھے ابھی اقبال کے متعلق چند اور باتیں کرنا ہیں۔

ماہرِ تعلیم:۔ فرمائیے، لیکن بحث طویل ہوتی جاتی ہے۔

علّامہ:۔ اعتراضات بہت سے ہو سکتے ہیں۔ آپ صرف اہم اعتراضات

بیان کیجئے۔

پروفیسر:۔ جواب نہایت مختصر دیئے جائیں گے۔

طالب علم:۔ اقبال ایک اسلامی فاشسٹ ہے۔

علامہ:۔ یہ بالکل غلط ہے، وہ دنیا کے تمام امراض کا علاج اسلام میں پاتے ہیں۔ وہ اسلامی جمہوریت کے قائل ہیں۔

طالب علم:۔ وہ وطنیت کے دشمن ہیں۔

ماہرِ تعلیم:۔ محدود وطنیت کبھی اچھے نتائج نہیں پیدا کرسکتی۔ اقبال جغرافیائی حدود، وطن، رنگ اور نسل کا قائل نہیں۔ لیکن اُسے اپنے وطن سے محبت ضرور ہے۔ بانگِ درا کی نظموں سے قطع نظر، ضربِ کلیم میں "شعاعِ اُمید" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے وہ وطن سے اُس کی محبت کو اچھی طرح ظاہر کرتی ہے۔

طالب علم:۔ ان کے بعض اشعار میں زبان کی غلطیاں ملتی ہیں۔ چند نئے الفاظ انہوں نے وضع کر لئے ہیں اکثر جگہ محاورات کا خیال نہیں رکھا اور بعض جگہ کلام میں رنگینی بالکل مفقود ہے۔ اُن کے کلام میں بعض جگہ تضاد پایا جاتا ہے۔

پروفیسر:۔ ہر بڑے شاعر کے یہاں افکار زبان پر غالب آجاتے ہیں۔ وہ زبان کا محکوم نہیں ہوتا بلکہ زبان اس کی محکوم ہوتی ہے۔ نئے الفاظ وضع کرنے سے زبان کو وسعت ہوتی ہے۔ محاورہ اور بندش پر اعتراض کرنے کا زمانہ اب ختم ہوگیا۔ اقبال کے کلام میں رنگینی ملتی ہے۔ لیکن یہ رنگینی نگاہ پر اثر کرنے کے بجائے دل اور دماغ پر اثر کرتی ہے۔ اگر ان کے کلام کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ محض سطحی طور پر دیکھنے والوں کو تضاد ملتا ہے ورنہ دراصل تضاد نہیں۔ بالِ جبریل میں وہ مسولینی کی شخصیت کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن ضربِ کلیم میں حبشہ کے فتح کرنے پر وہ اُسے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ ایک جگہ وہ مسولینی کو بحیثیت انسان کے پیش کرتے ہیں اور دوسری جگہ بحیثیت فاتح کے۔ ہمیں ان دونوں باتوں میں امتیاز کرنا چاہیئے۔

طالب علم:۔ میرے ابھی چند اعتراض اور باقی ہیں لیکن بہتر ہے کہ اقبال اب کچھ فرمائیں۔

اقبال:۔ میں نے آپ حضرات کی گفتگو غور سے سنی۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ نے میرے کلام کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں جیسا کہ آپ حضرات نے فرمایا کہ میرا خاص نظریہ خودی کا تصوّر ہے۔ میں نے اپنے اس نظریے کی مختلف جگہ پر وضاحت کی ہے آپ اُسے ملحوظ رکھئے۔ اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن کا دیباچہ دیکھئے۔ پیامِ مشرق کا دیباچہ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خودی کا تصوّر مجھے اس درجہ عزیز تھا کہ میں نے بیشتر اپنے اشعار میں اُس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ اگر فرد اپنی خودی پہچان لے تو وہ کل کائنات کو تسخیر کرسکتا ہے۔ لیکن یک جہتی و اتفاق بھی اُس کے ساتھ اہم ہے۔ اور فرد قطرے کی طرح دریا کے باہر کچھ نہیں کرسکتا۔ اس کا قوم میں ضم ہوجانا نہایت ضروری ہے۔ اس طرح بے خودی بھی خودی کی ایک شکل ہوجاتی ہے مجھ پر بہت سے اعتراضات کئے گئے ہیں بعض کا جواب آپ حضرات نے دے دیا ہے۔ میں اس سلسلے میں صرف اس قدر کہوں گا کہ اگر لوگ میرے خطبات اور ان خطوط کو جو میں نے بعض اصحاب کو ان کے سوالات کے جواب میں وقتاً فوقتاً لکھے تھے اور جو اب مختلف رسالوں میں شائع ہوگئے ہیں نظر میں رکھیں تو پھر یہ اعتراضات پیدا نہیں ہوتے۔ میں نے اس خوابیدہ قوم کو اپنے اشعار سے جگانے کی کوشش کی اور تھوڑا بہت کامیاب بھی ہوا۔ لیکن ابھی اُس نے اپنی خودی کو نہیں پہچانا ہے اور جد و جہد اور حرکت میں زندگی کے راز کا پوشیدہ ہونا نہیں سمجھا ہے۔ جس وقت اُس نے یہ سمجھ لیا میرا کام پورا ہوجائے گا۔ آپ حضرات نے جو تعلیم اور شیطان کے متعلق فلسفے وضع کئے ہیں گو میں نے صریحاً اس کا اظہار کہیں نہیں کیا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان چیزوں کے متعلق میرا نظریہ تقریباً یہی تھا جو آپ پیش کرتے ہیں۔ آپ نے اچھا کیا کہ ان کو واضح طور پر بیان کردیا۔ دنیا ہر چیز کو دیکھتی ہے، سوچتی سمجھتی ہے، اور تنقید کے آئینے کے سامنے اس کے اصل خد و خال دیکھنے کے لئے مضطرب رہتی ہے۔ لیکن ایک کامیاب موجد یا شاعر اکثر اپنا کام کرجاتا ہے۔

(ریڈیو)

مبشّر علی صدیقی

چار نظمیں

شگفتِ گُل

دخترِ صبحِ بہار ہو کے چندے ہمکنار
قُربِ غنچہ سے اُٹھی کیا خبر کیا کہہ گئی ؟
غنچہ کچھ کہنے کو تھا
مُسکرایا، کھِل پڑا !

شُکر

جب کھینچ کے آہِ سرد، کہتا ہے کوئی بندہ
"جس حال میں بھی رکھے، سو شُکر ہے اللہ کا!"
میں سوچنے لگتا ہوں
یہ شُکر کیا اِس نے یا طعنہ دیا اِس نے
رزّاقِ دو عالم کو!

تجربۂ ناگوار

مجبور کیا میں نے! اک بوسہ لیا میں نے!
ایسی مرے ہونٹوں کو محسوس ہوئی خُنکی
گویا مری عذرا تھی
مُورت کوئی پتھّر کی !!

واردات

کیا کہوں تم سے میں اپنی واردات !
بارہا ایسا ہوُا،
میں نے کی ہنسنے کی کوشش اِس قدر
چیخ کر میں رو پڑا !!

سعید احمد اعجاز

انتشار

بادِ بہاری ہو گئی رخصت   اب ہے خزاں کا دورِ حکومت
موت کا ہر سُو ہے سنّاٹا   اک بے لذّت راگ ہے دنیا
آؤ میرے محبوب آؤ   میرے دل کے مطلوب آؤ
ہم تم ویراں باغ میں چل کر
سوگ کریں گے اس کا دن بھر
آؤ میری رانی! آؤ   عمر ہے تھوڑی جلدی آؤ
آؤ کہ ہم تم اپنے اپنے   جامِ حیاتِ کیف آور کے
عشق و الفت کی صہبا سے
پُر کر لیں جتنا جی چاہے
آؤ کہ مل کر اب ہم اور تم   راہِ طلب میں ہو جائیں گم
دن جا کر جب رات آتی ہے   اور جب ظلمت چھا جاتی ہے
تب سطحِ بامِ گردوں پر   آتا ہے مہتابِ منوّر
آؤ میرے دوست کہ باہم
آج کریں حل راز یہ تم — ہم
مہرِ عالمتاب کی کرنیں   اور مہ کی رنگین شعاعیں
آپس میں کیوں ملتی نہیں ہیں   وہ جو کہیں ہیں تو یہ کہیں ہیں
آؤ میرے دوست کہ باہم   آج کریں حل راز یہ تم — ہم
لیکن اے محبوب تمہارے
عارض پر یہ آنسو کیسے؟

علی احمد بی اے

کھلونے

تاریکی

شام کے دھندلکے میں کسی نے کسی کے شانے کو چھوا تو کوئی چونک کر مڑا۔

"تم!"

"جی! — خاکسار!"

"تم یہاں کیوں آئے؟"

"آپ اس قدر پریشان کیوں ہوگئیں؟ چلئے۔ بنچ پر تشریف رکھئے باتیں اطمینان سے ہوسکتی ہیں"۔

"میرے سوال کا جواب دو"۔

"کیا میرے آنے سے آپ کے کسی پروگرام میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ہے"؟

"میں پوچھ رہی ہوں تم یہاں کیوں آئے؟"

"کیا مجھے اب اتنا بھی حق حاصل نہیں رہا؟"

"کیسا حق؟"

شاید آپ بھول چکی ہیں اور گواہ چاہتی ہیں۔ تو لیجئے۔ ذرا ان خاموش درختوں ہی سے پوچھئے۔ جنہوں نے آپ کو بنفس نفیس میری معیت میں اکثر یہاں دیکھا ہے۔ اس گھانس ہی سے دریافت کر لیجئے جس کے اوپر آپ کے اور میرے پاؤں کئی بار گذر چکے ہیں، جب آپ اپنے حسین جسم کی رعنائیوں کو مجھ ناچیز کا سہارا دے کر چلا کرتی تھیں! یہ بھی نہیں تو اس آسمان سے ہی پوچھئے جس کے نیچے آپ نے صدہا بار اسی بنچ پر بیٹھ کر اپنی گداز باہوں کو میری گردن میں ڈال کر میٹھی میٹھی سرگوشیاں کی ہیں اور یہ تاریکی جو لحظہ بہ لحظہ گہری ہوتی جا رہی ہے، یہ بھی تو شاہد ہے! اور سب سے بڑھ کر یہی وقت جس کے سینکڑوں لمحات نے آپ کو اور مجھے ......"

"یہ سب فضول باتیں ہیں اور بالکل مہمل۔ کیونکہ ان کا اس ماضی سے تعلق ہے۔ جب میں نیک و بد میں تمیز کرنے کے قابل نہ تھی۔ میں تو صرف یہ پوچھتی ہوں کہ تم آج اس وقت یہاں کیوں آئے ہو جب کہ میں نے تمہیں کئی بار — کئی بار —"

"کئی بار کیا، ہزار بار ہزار طریقوں سے ظاہر کیا ہے کہ آپ کو میری حقیر ہستی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی! یہی کہنا چاہتی ہیں نا آپ؟ مگر ذرا سوچئے تو سہی۔ کیا شمع کی بھسم کر دینے والی آنچ سے ڈر کر پروانے شمع کے پاس جانا چھوڑ دیتے ہیں؟"

"پھر وہی بے معنی الفاظ!"

"بجا فرمایا آپ نے۔ شمع کے نزدیک پروانے کی تڑپ اور بے قراری بے معنی ہی ہوا کرتی ہے۔ اتنی بے معنی کہ وہ بے چارہ وہیں جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے"۔

"کیوں مجھے ناحق حیران کرتے ہو؟ آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"اُف! کتنی بے خبری! مگر میں گلہ کیوں کروں۔ شکر نہ کروں کہ آخر آپ نے یہ پوچھنا گوارا کر ہی لیا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ آپ کے دہنِ شیریں سخن سے یہی الفاظ سننے کے لئے تو میں بے تاب تھا۔ مگر آپ نے اب بھی ایک چیز سے مجھے محروم ہی رکھا"۔

"کیا مطلب؟"

"کیا خاکسار کا نام آپ کے لبوں پر ایک بار بھی نہ آئے گا؟ ایک وہ زمانہ تھا جب آپ ہی کے قول کے مطابق یہ نام آپ کے ہر سانس کے ساتھ وابستہ تھا۔!"

خاموشی۔

"تو میں یہ سمجھ لوں کہ اس کی حسرت ہی رہے گی؟!"

خاموشی۔

"کم از کم مجھے اتنی تو اجازت مل جائے کہ میں آپ کا محبوب نام اپنے لبوں تک لے آؤں!"

"فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل! جو کچھ کہنا ہو کہہ ڈالو تاکہ قصہ پاک ہو۔"

"کتنی بے رحم ہو زاہدہ! بالکل ویسے ہی جیسے پہلے تھیں ایک رتی بھر بھی تو نہیں بدلیں۔ کیا اُس بے چارے پر بھی یوں ہی ستم ڈھایا کرتی ہو؟"

"کس پر" (غصے سے تڑپ کر)

"اب جو میں مطلب کی بات کرنے لگا ہوں تو آپ بالکل انجان بن رہی ہیں آپ ہی بتائیں اس صورت میں کیا خاک عرض کروں؟"

"میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے اور میں یہاں کھڑے ہو کر لغویات نہیں سن سکتی۔"

"درد سر تو صرف ناولوں کی ہیروئنز کو ہوا کرتا ہے۔ آپ کیوں خواہ مخواہ اپنے آپ کو غلط فہمی میں مبتلا کرتی ہیں؟ باقی رہیں میری لغویات، تو یہ ممکن ہے کہ میرا قیاس یا اندازہ غلط ہو اور آپ ستم ڈھانے کی بجائے اُس پر نظر کرم رکھتی ہوں مگر سچ پوچھیں تو مجھے یہ کھیل پسند نہیں۔ کیا آپ اپنا دل بہلانے کے لئے کوئی اور کھلونا تلاش نہ کر سکیں گی؟"

"کھلو ---- نا!"

"زاہدہ! کیوں بنتی ہو؟ میں ہوش میں ہوں۔ کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہا جو تم نہ سمجھ سکو۔ غور سے سن لو۔ شاہد سے مجھے ایک خاص قسم کا لگاؤ ہے۔ وہ ابھی تک دنیوی آلائشوں سے پاک ہے اور اپنی خوبیوں سے بے بہرہ۔ اسی لئے گھمنڈ کا اس میں شائبہ بھی نہیں، میں جانتا ہوں۔ اور شاید تم بھی ---- کہ اس میں وہ تمام جوہر موجود ہیں جو اس کی آئندہ زندگی کو شاندار بنا سکتے ہیں۔ صرف ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ اس کی زندگی کا نازک پودا جو آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے ابھی سے نہ کچلا جائے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا جادو اس پر نہ ڈالو۔ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اُس کا ابھی کچھ زیادہ بگڑا نہیں اگر تم اس کا خیال ترک کر دو تو . . . . . ."

"بس۔ بس۔ تم حد سے بڑھتے جاتے ہو۔ بات کرنے کا موقع دیا تو اپنے آپ کو بھول گئے اور میرے ہی سامنے کھڑے ہو کر اتنی جرأت کہ میرے نام، بلکہ میرے خاندان کے نام پر بٹہ لگانے لگے۔ اتنی جرأت کہ مجھے ایک عام . . ."

"توبہ۔ توبہ۔ یہ آپ کیا فرما رہی ہیں؟ قطع کلامی معاف۔ بھلا میں اور ایسی بے ادبی؟ میری کیا مجال کہ آپ کی شان میں ایسے گستاخانہ خیال کو بھی اپنے دماغ میں جگہ دوں اور پھر آپ کے در دولت پر کھڑے ہو کر! دیکھئے میں اس کمپاؤنڈ سے آپ کے عالی شان بنگلے کے دروازوں اور کھڑکیوں کے بیش قیمت اور رنگین پردے بخوبی دیکھ سکتا ہوں۔ وہ کونے والا کمرہ جس کی کھڑکیوں پر انگاروں کی طرح چمکتے ہوئے سرخ رنگ کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور جن میں سے روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی ہے، میں جانتا ہوں وہ آپ ہی کا کمرہ ہے، مطالعے کا کمرہ، جہاں کچھ عرصے سے میرے دوست شاہد ایک معلم کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہے ہیں ----"

"آپ کی معلومات واقعی وسیع ہیں۔ مگر آپ میرے حال پر کرم فرمائیے اور آپ تشریف لے جائیے۔"

"یعنی اپنا مدعا بیان کئے بغیر؟"

"تو گویا آپ کی یہ تمام باتیں محض تمہیدی جملے تھے اور مدعا ابھی باقی ہے!"

"آپ برہم نہ ہوں۔ لیجئے میں مختصراً کہے دیتا ہوں۔ آپ نے فلسفے کے مضمون میں رہبری کے لئے ایک معلم کی خدمات حاصل کیں۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ مگر آپ کی نظر انتخاب شاہد پر کیوں پڑی، یہ مسئلہ ذرا غور طلب ہے!"

"تمہیں دوسروں کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کا کیا حق ہے؟"

"وہی جو آپ کو کسی ناتجربہ کار انسان کی پرسکون زندگی میں ایک عارضی جذبے کی تکمیل کے لئے ہلچل پیدا کرنے کا!"

"یہ سراسر جھوٹ ہے۔"

"زاہدہ! ذرا میری آنکھوں سے آنکھیں ملاؤ۔ میرا نام عاقل ہے۔ تم عاقل کی آنکھوں میں دھول نہیں ڈال سکتیں۔ تم فلسفے کا مطالعہ نہیں کرتیں۔ تم فلسفۂ عشق کا سبق دے رہی ہو!"

"یہ بہتان ہے! تم اس کے لئے پچھتاؤ گے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ چلے جاؤ پیشتر اس کے کہ ----"

"کہ آپ اپنے وفادار کتوں کو بلا کر میری تواضع کریں یا کسی شہ زور ملازم کو دروازے تک میری رہنمائی کے لئے میرے ساتھ بھیجیں! مگر مجھے یقین ہے کہ آپ کی تہذیب آپ کو ایک مہمان کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کی کبھی اجازت نہ دے گی اور پھر شاہد کی کہانی تو کتوں کے بھونکنے یا دو انسانوں کے چند نازیبا حرکتیں کرنے سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔"

"کہانی! ---- نہیں۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔ جاؤ۔ چلے جاؤ!"

"دیکھا میں جانتا تھا کہ جوان عورتوں کو کہانیوں میں حصّہ لینے کے بعد کہانیاں سننے کا بہت شوق ہوتا ہے تو آپ کیوں اپنے آپ کو اس کہانی سے جبراً محروم رکھنا چاہتی ہیں! چلو۔ میرے کہنے سے ہی سُن لو۔ زاہدہ! میں سچ کہتا ہوں شاہد کی تخلیق کا قصّہ نہایت دلچسپ ہے"۔

"تخلیق؟"

"ہاں تخلیق! کیا تم یہ سمجھے بیٹھی ہو کہ وہ شاہد جسے آج کل اپنی قسمت پر ناز ہونا چاہیئے ہمیشہ ایسا ہی تھا جیسا تم اُسے اب پاتی ہو؟ زاہدہ! تمہیں جانتے ہوئے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر تم اس کو ایک سال پہلے دیکھ پاتیں تو اُسے راستے میں پڑے ہوئے سنگ ریزے سے زیادہ قابلِ التفات نہ سمجھتیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت ایک سنگتراش ایسا مجسمہ بنا ڈالتا ہے جس کی تمام تر خوبیاں اُس کی نکتہ بیں نگاہیں بھی نہیں دیکھ سکتیں!"

اِس میں سنگتراشی کا کیا دخل ہے؟ کیا تم مجھے اِدھر اُدھر کی باتیں بنا کر قصداً یہاں روکنا چاہتے ہو؟ میں اب ——"

"کتنی بے صبر ہو تم۔ زاہدہ؟ جب کہانی میری توقعات سے بھی بڑھ کر دلچسپ ہونے لگی تو تم ایسے بے بنیاد وہم میں مبتلا ہو گئیں۔ ذرا سنو تو سہی! سنگ تراشی کا ذکر یہاں ناگزیر ہے۔ جب آج سے ایک سال قبل شاہد سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو وہ دیکھنے میں بالکل ایک گنوار معلوم ہوتا تھا۔ مگر مجھے جلد ہی محسوس ہونے لگا کہ اُس سنگ ناتراشیدہ میں کئی جوہر چھپے ہوئے ہیں میں اس کی ذات میں دلچسپی لینے لگا۔ اس دلچسپی کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ اُس زمانے میں میں برنارڈ شا کا مطالعہ کر رہا تھا اور اُس کا ڈراما "پگمیلین" پڑھ چکا تھا۔ شاید تم نے بھی پڑھا ہو۔ نہیں؟ خیر۔ کوئی مضائقہ نہیں، تو اس ڈرامے میں ایک شخص، غالباً ایک پروفیسر، ایک ایسی لڑکی کو جو جاہلِ مطلق تھی اور شہر کے گلی کوچوں میں مختلف قسم کی اشیاء فروخت کر کے گذر اوقات کرتی تھی مہذب بنانے کا تہیہ کرتا ہے۔ اس پروفیسر کا دعوٰے تھا کہ وہ ایک قلیل عرصے کی محنت کے بعد اُس لڑکی کو اونچے سے اونچے طبقے کی سوسائٹی کا ایک درخشاں رکن بنا ڈالے گا۔ یہ دعوٰے یہاں تک سچ ثابت ہوا کہ ایک وقت وہی جاہل لڑکی غلطی سے ایک نواب کی بیگم سمجھی گئی۔ میں اس ڈرامے سے کچھ ایسا متاثر ہوا کہ میں نے پوشیدہ طور پر خود ایک تجربہ کرنے کا ارادہ کر لیا یہی وجہ تھی کہ میں شاہد میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگا۔ میرا کام پروفیسر کی نسبت آسان تھا کیونکہ شاہد میں قابلیت تو پہلے ہی تھی۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ خارجی طور پر بھی مجھ جیسا ہی بن جائے۔ رفتہ رفتہ میری صحبت نے رنگ لانا شروع کیا۔ ایک ایک کر کے اُس میں تبدیلیاں ظاہر ہونے لگیں۔ اُسے لباس پہننے کا ڈھنگ آ گیا۔ اُس کی حرکات میں وہ پہلی جھجک جاتی رہی۔ تہذیب یافتہ سوسائٹی میں وہ نہ صرف گفتگو کرنے کے قابل ہو گیا بلکہ اُس کے طرزِ کلام میں ایک دلکش بے تکلفی اور بے باکی پیدا ہو گئی اور لطف یہ کہ اُس کی جیب پر کوئی ناخوشگوار اثر نہ پڑا۔ میں خود حیران رہ گیا۔ ایک بے ڈھب پتھر میں سے ایک خوبصورت مجسّمہ نکل آیا۔ میرا تجربہ کامیاب رہا۔ مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کامیابی اتنی عظیم الشان ہے اس کا ثبوت تم نے دے دیا!"

"میں نے؟ کس طرح؟"

"جان بوجھ کر بھولی نہ بنو زاہدہ! تم ہی نے تو آخر اس مجسّمے میں وہ خوبیاں پائیں جنہیں اُس کے بنانے والے کی آنکھیں نہ دیکھ سکیں۔ لیکن جن کی تم پرستار بن گئیں۔ مگر اُس میں ایک خامی باقی ہے جو تمہاری نگاہوں سے بچ گئی۔ اس خامی کا صرف سنگتراش ہی کو علم ہے!"۔

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ اس مجسّمے سے آپ کے ہر اشارے کی تعمیل نہ ہو سکے گی۔ بلکہ —— معاف کیجئے —— آپ کے ایک ادنیٰ انداز کی بھی اُس طور سے داد نہ ملے گی جو ایک سیم و زر سے کھیلنے والی عورت کے دل کو مرغوب ہے۔ کیونکہ یہ مجسّمہ اندر سے کھوکھلا ہے۔ اس مسئلے پر غور کر لیجئے۔ اور یہ غضبناک نگاہیں مجھ پر نہ ڈالئے۔ میں اپنا فرض ادا کر چکا۔ یہ لیجئے میں جاتا ہوں۔ آداب عرض!"

زاہدہ غصّے سے بید مجنوں کی طرح کانپتی ہوئی ابھی وہیں کھڑی تھی کہ بڑے دروازے سے آواز آئی۔

اور ہاں! ایک بات تو میں بھول ہی گیا۔ اگر آپ کبھی اس بچارے کے ساتھ بھلائی کرنے کے خیال سے یا اِک کھوکھلے مجسّمے کی بجائے کسی ٹھوس چیز پر نظر التفات ڈالنے کی غرض سے اُسے آزادی دینا چاہیں تو خاکسار کے حقوق کو نظرانداز نہ کیجئے گا۔

. . . .

روشنی

کسی نے اُس کی پکار نہ سُنی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا دن کے وقت رات ہو گئی ہے اور سب گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے ہیں۔ شاہد نے آخری

دفعہ دروازے کی چٹخنی کو پکڑ کر دروازہ اندر کی طرف کھینچنے کی کوشش کی، مگر بے سود دروازہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ ستم ظریفی کسی کی!

شاہد نے تنگ آ کر اپنے آپ کو زور سے آرام کرسی کے سپرد کر دیا۔ اور غصے میں ٹائی کی گانٹھ بھی کھول ڈالی۔ جہنم میں جائے یہ سوٹ اور ٹائی جب دروازہ ہی ——

باہر سے ایک قہقہہ سنائی دیا۔ دوسرے لمحے دروازہ کھلا اور ساتھ ہی قہقہہ ہاتھوں میں ایک بنڈل تھامے اندر داخل ہوا۔

"بھئی۔ میں اس جبری قید کے لئے معافی چاہتا ہوں لیکن اگر یہ تجویز عمل میں نہ لاتا تو تم اس وقت خدا جانے کہاں پہنچ چکے ہوتے اور ایک نہایت ضروری کام رہ جاتا۔ اسی لئے میں ادھر اُدھر ہدایات بھی دیتا گیا تھا کہ اگر کوئی قیدی شور مچائے یا دروازے پر تشدد کرے تو کان نہ دھرنا!"

شاہد حیران ہو کر عاقل کے چہرے کا مطالعہ کر رہا تھا۔

"تو گویا یہ شائستہ حرکت جناب نے کی تھی۔ آخر وہ کونسا ایسا ضروری کام تھا جس نے آپ کے دماغ کو مجھے محبوس کرنے کی یہ انوکھی ترکیب بتائی؟ دیکھئے۔ یہاں ہم نے ٹائی کی ناٹ کا بھی، جو بحیثیت آپ کا شاگرد ہونے کے نہایت خوبصورتی سے لگائی گئی تھی، قلع قمع کر ڈالا"

"پروا نہ کرو دوست! ٹائی کی ناٹ دوبارہ بھی ایسی ہی خوبصورتی سے لگائی جا سکتی ہے۔ آخر ہم کس لئے ہیں؟ مگر یہ کام کل تک ملتوی نہ کیا جا سکتا تھا!"

"اوہو! اتنا اہم!"

"بالکل۔ کیا جناب کو یاد ہے آج کیا تاریخ ہے!"

"کیوں، آج بارہ نومبر ہے"۔

"گھن چکر! بارہ نومبر تو مجھے بھی معلوم ہے۔ مگر —— آخر تمہارے دماغ کو ہوا کیا ہے جو ایسی معمولی بات بھی ——"

"ٹھہرو! ٹھہرو! یاد آ گیا۔ آج ہماری پیدائش کا دن یعنی برتھ ڈے ہے۔ یہی تھا نا تمہارا مطلب؟"

"اور کیا میں کوئی آسمانی مطلب تھوڑے ہی کہہ رہا ہوں۔ سنبھالو یہ اپنا بنڈل!"

"برتھ ڈے کا تحفہ! یہ قید تو بہت مفید رہی!"

"جی! کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم کسی کو اذیت پہنچانے کے لئے قید کریں گے!"

"ذرا کھولو تو اسے!"

"اے ہے سوٹ! اچھا کس نے یہ تمہیں کیا سوجھی؟"

"کیا آپ کو ساڑھی کی توقع تھی؟"

دو قہقہے۔

"ارے! یہ اس کے اندر کیا ڈال لائے ہو؟"

"ایک موٹے لٹھے کا پاجامہ اور ایک کھدر اسلیبے کالر کرتہ۔ سوٹ سمیت آپ کے کہنہ مشق درزی کے ہاتھوں سے سِلے ہوئے!"

"اس مذاق کا مطلب؟"

"مذاق! کیا آپ کو اپنے "زمانۂ سلف" سے کوئی دلچسپی نہیں رہی!"

"بہ الفاظِ دیگر ان کو بھی برتھ ڈے کا تحفہ سمجھوں!"

"ٹھیک سمجھے آپ! مگر دونوں تحفوں میں سے انتخاب کرنا ہو گا!"

"انتخاب! بھئی خوب سوجھی اور ہم نے بھی انتخاب کر لیا!"

"تو سوٹ لو گے یا ——"

"بس! بس! ہمارے انتخاب میں یا کے لئے جگہ ہی نہیں۔ ہم دونوں لیں گے!"

"بہت سیانے ہو۔ اور کیا پہنو گے بھی دونوں! پاجامے کے اوپر پتلون اور ——"

"جی نہیں! پہنا جائے گا صرف سوٹ!"

"اور یہ بچارا کرتہ اور پاجامہ؟"

"انہیں نہایت احترام و احتیاط کے ساتھ طے کر کے ایک بکس کی گہرائیوں میں جو پہلے سے معطر کر لی گئی ہوں گی لٹا دیا جائے گا اور وقتاً فوقتاً یعنی جب کبھی ہمیں اپنے زمانۂ سلف، کی یاد بہت ستائے گی تو دل کو ڈھارس دینے کے لئے ان کی زیارت کر لی جایا کرے گی۔ کیوں کیا خیال ہے؟"

"خیال قابلِ داد ہے۔ بتوں کا ذکر بھی اور خدا کی یاد بھی۔ دونوں باتیں ہو جائیں گی! مگر آج یہ نیا سوٹ ہی پہن کر نکلنا۔ خصوصاً جب شام کے وقت پڑھانے جاؤ!"

"یہ تخصیص کس لئے؟"

"تمہارے بھلے کی بات کہتا ہوں"۔

"اجی جناب! میں ٹھہرا موٹی عقل کا آدمی اور آپ باتیں کرنے لگے معمول ہیں۔ ذرا سمجھائیے تو سہی کہ وہاں یہ سوٹ پہن کر جانے میں میری کیا بھلائی ہو گی اور کیونکر؟"

"خدا کسی کو موٹی عقل نہ دے! لو! ہم چلتے ہیں اور آپ بھی جہاں جانا چاہتے تھے تشریف لے جائیں۔ مگر ایک بات یاد رکھنا کبھی کبھی معمے

حل کرنے میں بڑا لطف آتا ہے اور مزیدار نتائج برآمد ہوا کرتے ہیں!"

. . . .

پھر تاریکی

"کاش آج چاندنی رات ہوتی!"

"پھر کیا ہوتا؟"

"ہم دونوں اس سنسان کوٹھی سے بہت دور دریا کی رقص کرتی ہوئی نقرئی لہروں پر ایک چھوٹی سی ہلکی پھلکی کشتی میں بیٹھے کسی سمت بہے جا رہے ہوتے اور چاند کے سوا ہمیں کوئی اور دیکھنے والا نہ ہوتا!"

"دیکھنے والا تو یہاں بھی کوئی نہیں۔ سب پکچر دیکھنے گئے ہیں اور نوکروں کو میں نے باہر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ البتہ چاند نہیں!"

"ہے تو، مگر صرف ایک! چاندنی رات ہوتی تو دو ہوتے اور میں اُس آسمانی چاند سے مخاطب ہو کر کہتا کہ دیکھ۔ ذرا زمین کے چاند کی طرف دیکھ! کیا اب بھی تجھے اپنی تابانی پر ناز ہے؟"

"پھر لگے شاعروں کی سی باتیں بنانے؟"

"یہ تو آپ ہی کا تصور ہے! آپ کیوں مجھ پر مہربان ہوئیں؟"

"تو لو میں الگ منہ موڑ کر بیٹھ جاتی ہوں!"

"نہیں! نہیں! یہ ظلم نہ کرو زاہدہ! خدا جانے کتنی صدیوں کے بعد مجھے یہ لمحات نصیب ہوئے ہیں! میرے قریب ہی رہو تاکہ مجھے پختہ یقین ہو جائے۔"

"یقین؟"

"ہاں یقین! مجھے اب تک شبہ ہے کہ میں عاقل نہیں اور نہ تم زاہدہ ہو۔ بلکہ ہم دونوں کوئی اور ہستیاں ہیں جنہیں میں کسی بھولے بسرے مگر شیریں زمانے کے زاہدہ اور عاقل سمجھ رہا ہوں!"

"یہ کیا فلسفہ ہے!"

"فلسفہ نہیں۔ زاہدہ! میری قلبی کیفیت کی ایک جھلک۔ میں اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مجھے ایک کھوئی ہوئی عزیز چیز واقعی واپس مل گئی ہے۔ زاہدہ! ایک بار مجھے عاقل کہہ کر تو پکارو تمہارے لبوں سے یہ لفظ سن کر میرا شک رفع ہو جائے گا۔"

خاموشی۔

"زاہدہ!"

"عاقل!"

تاریکی کا پردہ تاریک تر ہو گیا۔ مگر یہ دونوں وقت کی رفتار سے بے خبر بنچ پر پہلو بہ پہلو بیٹھے رہے۔ اس طرح کہ زاہدہ کا سر عاقل کے شانے کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

"کیا یہ واقعی سچ ہے زاہدہ؟"

"بالکل!"

"اور تم اب ——— اُس کی طرف کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو گی؟"

"پرانی باتوں کا ذکر کیوں چھیڑتے ہو؟"

"مگر کم از کم مجھے ایک بات تو بتا دو"

"کیا؟"

"تم شاہد سے یکایک کنارہ کش کیوں ہو گئیں؟"

"تم نے جو کہا تھا کہ وہ مجسمہ اندر سے کھوکھلا ہے!"

"تمہیں کیونکر معلوم ہوا؟"

"مجھے اس کا ثبوت مل گیا۔"

"وہ کیسے؟"

"ایک شام وہ ایک بالکل نیا سوٹ پہن کر آیا۔ بہت خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔"

"زاہدہ ———!"

"یعنی اُس وقت!"

"تم نے کیا کیا؟"

"میں نے سنگتراش کے شاہکار کا اندرونی حصہ دیکھنے کا ارادہ کر لیا۔"

"اور کامیابی ہوئی!"

"ہاں! میں نے کہا مجھے اسی وقت دس دس کے دو نوٹ درکار ہیں۔ کسی وجہ سے ابا سے نہیں مانگ سکتی۔ ایک ہفتے تک واپس کر دوں گی!"

"خوبصورت عیارہ!"

"محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ پسینہ پونچھنے لگے اور کہا۔ کاش کہ میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کر سکتا۔ مگر یہاں تو تن کے کپڑے بھی تحفہ پائے ہیں۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ مجسمہ واقعی کھوکھلا ہے۔ میں نے یہ بھی پوچھنے کی ضرورت سمجھی کہ وہ تحفہ کس کی فیاضی کا ثبوت تھا!"

"اس کے بعد؟"

"چند ہی دنوں میں مجھے فلسفے کے مضمون سے کوئی دلچسپی نہ رہی اور اسی لئے مجبوراً معلم کو بھی زیادہ تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا۔"

"بیچارا۔ خوش قسمت شاہد!"

"یہ انوکھی ترکیب ذرا تشریح طلب ہے۔"

"بیچارا اس لئے کہ اُسے اب ایک معمّے کی بجائے دو معمّے حل کرنے ہوں گے! جس روز اُسے دو نیا سوٹ ملا میں اتفاقاً اس کے پاس پہنچا اور میں نے یوں ہی ایک پُراسرار انداز میں اُسے کہا کہ جب وہ آپ کو پڑھانے جائے تو وہی سوٹ پہن کر جائے کیونکہ اس میں اس کی بھلائی ہے۔ میرا یہ کہنا اُس نے ایک معمّہ سمجھا۔ دوسرا معمّہ یہ ہے کہ ابھی تک اس کی عقلِ سلیم یہ ماننے کے لئے آمادہ نہیں ہوتی کہ کوئی خاتون جس کو فلسفے یا کسی اور مضمون سے گہری دلچسپی ہو یکایک اس مضمون سے قطعی متنفر ہو سکتی ہے۔"

"اور خوش قسمت کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ اسیری جس سے اب اُس کو اپنی جدا دنیا بنانے کی مکمل آزادی مل چکی ہے اُس کے موافقِ حال نہ تھی۔ ایسی اسیری کے لئے قدرت نے مجھ جیسے لوگ خاص طور پر وضع کئے ہیں!"

"یعنی میں جیلر ہوئی اور آپ میرے قیدی! دلچسپ کھیل ہے!"

"نہیں۔ یہ لفظ تو میں نے محض تشریح کے لئے استعمال کئے تھے۔ درحقیقت آپ اس دور کی ایک شمع ہیں اور خاکسار اس عہد کا ایک حقیر پروانہ!"

"پھر وہی بے تکی باتیں!"

"بے تکی نہ کہو زاہدہ۔ یہ تو میرے دل سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں اور اتنے ہی سچے جتنی یہ حقیقت کہ تم اب نیک و بد میں تمیز کرنے کے قابل ہو۔"

"یہ آخری الفاظ تو شاید میں نے پہلے بھی کہیں سنے ہیں!"

"سنے ہوں گے! مگر ہم کیوں ان بے کار باتوں کے چنگل میں پھنس کر وقت گنوائیں۔ یہ لمحات تو بہت قیمتی ہیں!"

اور رات کی بے پناہ تاریکی میں دو چہرے ایک ہی چیز کی تلاش میں ایک دوسرے کی طرف جھکے۔ . .

. . . .

انور اعجاز قیصر

غزل

اب کے جنوں میں چاکِ گریباں نہ ہو سکا
کچھ اہتمامِ جشنِ بہاراں نہ ہو سکا

جینا طویل خوابِ پریشاں نہ ہو سکا
خوش ہوں کہ دل کے درد کا درماں نہ ہو سکا

راہِ درازِ عمر اسیری میں کٹ گئی
لیکن دماغ عادیِ زنداں نہ ہو سکا

حق بینیٔ نگاہ کے قربان جائیے
خاشاک پر گمانِ گلستاں نہ ہو سکا

شکرِ جفائے یار سے فرصت نہیں ملی
دل وقفِ شکوہ سنجیٔ دوراں نہ ہو سکا

سکندر علی وجد

ایک گیت کے دو بھاؤ

ایک ہلکی جھلک ہی نظر آئی تھی دُور سے جس کی من موہنی ہو گئی ہے،
رات چھائی ہوئی تھی اندھیری مگر چاند نکلا ہے اور چاندنی ہو گئی ہے؛
دل کے آکاش پر کالی، کاجل سی کالی گھٹا نے ہی قابو جمایا ہوا تھا،
چھٹ گئی ہے گھٹا، ہٹ گئی ہے گھٹا، نور چھننے لگا، روشنی ہو گئی ہے۔
دل میں سویا تھا احساس جو روپ کا جاگ کر پریم کا راگ بننے لگا ہے،
آج تک آگ دل میں دبی تھی مرے، آج سے درد کی راگنی ہو گئی ہے۔

(۲)

کیسی دنیا ہے! سُکھ سیج سپنا بنی، سیج کانٹوں کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی،
دل میں راحت کی اُمید کیسے پلے! زندگی بھی مجھے جانکنی ہو گئی ہے۔
ایک چاہ ہے، نہ چاہ ہے اُسے دوسرا، اِس کا انجام نفرت میں ظاہر ہوا ہے،
وہ محبت بھی اب تو بدل ہی گئی، کب محبت رہی؟ دشمنی ہو گئی ہے۔
زہرِ غم کو یہ ہر کوئی کہتا تھا رگ رگ میں نشتر کی مانند جا کر بسے گا،
روگ چاہت کا میٹھا ہے کیسا کہ تلخی بھی اب شہد کی چاشنی ہو گئی ہے۔
جی میں کہتے تھے تم سے ملیں گے کبھی، دل پہ گذری ہے جو وہ کہیں گے سبھی ہم
گفتنی تھی، مگر اب کہیں تم سے کیا، اپنی حالت ہی ناگفتنی ہو گئی ہے۔

میراجی

جھُوٹ

میں نے اظہر کو بلا کر کہا۔ "اظہر تمہارے ابا شکایت کرتے ہیں کہ تم بہت جھوٹ بولتے ہو"۔ اظہر کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے اپنی حیران سی ڈری ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اور کہنے لگا "نن نہیں جی میں تو جھوٹ نہیں بولتا ——— پر ابا جی مارتے ہیں"۔ ان مختصر الفاظ میں اس چھوٹے سے لڑکے نے جھوٹ کا تمام فلسفہ بیان کر دیا یعنی مخصوص حالات میں جھوٹ ایک کار آمد چیز ہے جو زیادہ تر اپنے بچاؤ کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ جس طرح طفلی میں بچوں پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ماں کی محبت کو حاصل کرنے کے لئے رونا، روٹھنا، ضد کرنا اور بیمار پڑ جانا بہت مفید ہے۔ اسی طرح کسی روز اُن پر یہ انکشاف بھی ہو جاتا ہے کہ ابا کی گھڑکیوں اور ماسٹر کی مار پیٹ سے بچنے کے لئے جھوٹ بولنا بہت ضروری ہے یعنی جھوٹ ایک آرام دہ اور کار آمد ایجاد ہے جو عام لوگوں کے لئے بے حد ضروری ہے۔

حسین عورتوں اور بڑے سیاست دانوں نے جھوٹ کو آرٹ کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ غالبًا اس لئے کہ انہیں جھوٹ بولتے ہوئے اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ عورتوں کے لئے گھر گرہستی کی زندگی میں جھوٹ ایک ایسی ہی آرام دہ چیز ہے جیسے خانہ داری کی اور چھوٹی موٹی چیزیں مثلاً چوکی، چمچہ، پیالہ یا دست پناہ وغیرہ اس کے علاوہ نمائشی جھوٹ بھی ہوتے ہیں جو اُن کے لئے ایک خوبصورت ساڑی یا کاجل اور پاؤڈر کا کام دیتے ہیں۔ وہ جھوٹ کی مدد سے صرف اپنا بچاؤ ہی نہیں کرتیں بلکہ دوسروں کو مغلوب کرنے کے لئے بھی کئی دلچسپ اور انوکھے جھوٹ ایجاد کرتی رہتی ہیں۔ میرا اپنا اندازہ ہے کہ جھوٹ سی دلچسپ اور رنگین ایجاد کے لئے ہم سب کسی عورت کے مرہونِ منّت ہیں۔

اتنا جھوٹ بولنے کے باوجود بھی مرد ابھی تک اپنی دروغ گوئی میں وہ لطافت نہیں پیدا کر سکے جو ایک چھوٹی سی لڑکی اپنے ایک سرسری جھوٹ میں پیدا کر لیتی ہے۔ شاید اس لئے کہ مرد بہت سوچ بچار کے بعد جھوٹ بولتا ہے حتیٰ کہ اُس کے جسم کا بند بند یہ جان لیتا ہے کہ ابھی ایک جھوٹ بولا جائے گا۔ اس طرح یہ راز اُس کے تمام جسم میں مشتہر ہو جاتا ہے اور عورت پر جھوٹ بولتے ہوئے ایک بے خودی کی سی کیفیت چھا جاتی ہے جیسے وہ کوئی شعر کہہ رہی ہو۔ اس لئے اُس کے جھوٹ کو سوچ بچار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

شاید آپ نے بھی کبھی جھوٹ بولنے کی کوشش کی ہو اور یہ محسوس کیا ہو کہ بولتے ہوئے دل یوں دھڑکنا شروع کر دیتا ہے جیسے وہ کہہ رہا ہو "بھئی تم جانو تمہارا کام میں اس بات میں دخل نہیں دیتا"۔ آنکھیں یہ قطعی بھول جاتی ہیں کہ ان حالات میں انہیں کس قدر کھلا رہنا چاہیئے اور کدھر دیکھنا چاہیئے ہاتھ حیرانی میں شانوں سے نیچے یوں آوارہ لٹکتے ہیں گویا وہ کسی لامتناہی خلا میں آویزاں ہوں۔ اُس وقت آواز بھی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کا ساتھ نہیں دیتی۔ گویا کوئی درد بھرا گیت رُکتے ہوئے سروں میں گایا جا رہا ہو اور جسم کی نس نس ہم کو جھٹلانا شروع کر دیتی ہے۔ "جھوٹ! جھوٹ!" اس کے باوجود اگر کوئی ہمارے جھوٹ کو سچ مان لے تو یہ اُس کا حسنِ اعتقاد ہے۔

شاید آپ نے بھی یہ محسوس کیا ہو کہ ہم صرف زبان ہی سے جھوٹ بول سکتے ہیں اور وہ بھی صرف لفظوں کی مدد سے۔ ہمارے باقی اعضا اُس وقت ہمارے الفاظ کا ساتھ نہیں دیتے۔ اکثر تو وہ زبان کی اس دیدہ دلیری سے پریشان ہو جاتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی نیکی یا بزدلی سے زبان کو جھٹلانا شروع کر دیتے ہیں۔

میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ جھوٹ بولتے ہوئے مجھے اس قدر پریشانی اور پشیمانی ہوتی ہے کہ معًا میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر اب کے اس خفّت سے بچ جاؤں تو اپنے گذشتہ گناہوں سے توبہ کر لوں اور باقی عمر اللہ کی یاد میں بسر کر دوں۔ شاید اسی ڈر کے مارے میں زیادہ تر جھوٹ بولنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ یعنی راست گوئی میرے لئے ایک ناخوشگوار مجبوری ہے اور اس لئے زندگی ایک خشک اور پھیکی سی حقیقت۔

اس کے برعکس کسی کے جھوٹ پر ایمان لانے کے متعلق ——— آپ مجھ سے کتنا بڑے سے بڑا جھوٹ بھی بولیں۔ میں آپ کی بات پر سچے دل سے ایمان لے آؤں گا۔ بولتے ہوئے چاہے آپ کا دل اپنی دھکا دھک سے کچھ ہی کیوں نہ کہے۔ منہ پر ایک رنگ آئے اور ایک رنگ جائے،

آنکھیں بھینچی رہیں یا کھلی ہوئی ہیں آپ کی بات تسلیم کرلوں گا۔ چونکہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور کرنے کی مجھے عادت ہی نہیں ہے۔ پھر کبھی کسی وقت بیٹھے بٹھائے میرے دل میں یکلخت یہ خیال آئے گا کہ اُس روز آپ نے میرے روبرو جھوٹ بولا تھا۔ صریحاً جھوٹ تھا یعنی بالکل جھوٹ۔ سفید جھوٹ۔ اس وقت میرا جی چاہتا ہے کہ اُٹھ کر ٹوپی سر پر رکھوں، گھر سے نکلوں اور آپ کو کان سے جا پکڑوں اور صاف صاف کہہ دوں۔ "اس روز آپ نے مجھ سے سفید جھوٹ بولا تھا۔ شاید آپ کا خیال ہے کہ میں ابھی بچّہ ہوں اور جھوٹ سچ کو سمجھ نہیں سکتا۔"—— پھر اُٹھنا ٹوپی سر پر رکھنا اور اتنی دور چل کر جانا یہ تمام کام محض اپنی فہم رسا کے ثبوت اور آپ کو ہدایت دینے کے لئے۔ اِس خیال کے آتے ہی پھر بیٹھ جاتا ہوں اور سب بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔

اگر جھوٹ بولنے اور جھوٹ پر ایمان لانے میں لوگ مجھی سے واقع ہوئے ہوں۔ تو یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم سب فطری طور پر راست گو ہیں۔ البتہ ہم جھوٹ پر ایمان لا سکتے ہیں۔ یعنی انسان فطرتاً کافر نہیں بلکہ مومن جانور ہے اور ہماری منجملہ مشکلات کی وجہ ہماری دروغ گوئی نہیں بلکہ خوش اعتقادی ہے۔ اس کے باوجود ہمیں ہمیشہ سے یہی تلقین کی گئی کہ جھوٹ نہ بولو۔ یہ نہیں کہ جھوٹی باتوں پر ایمان نہ لاؤ۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ہر ریفارمر کو جس نے انسان کو جھوٹ سے پرہیز کی تلقین کی بذاتِ خود لوگوں کے حسنِ ایمان یا خوش اعتقادی کی ضرورت تھی یا شاید اس لئے کہ اُس کا خیال تھا کہ اگر سب لوگ جھوٹ بولنا چھوڑ دیں تو جھوٹی بات کا وجود ہی نہ رہے گا۔ اور جھوٹ پر اعتقاد کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا بہر صورت انہیں یہ خیال نہ آیا کہ یہ بات ایک اگر پر موقوف ہے اور ہر حرفِ شرط ایک نہ سلجھنے والا تانا بانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ قطعی بھول گئے کہ جھوٹ نہ بولنے کی تلقین سے پیشتر یہ اشد ضروری ہے کہ لوگوں میں سچی بات سننے اور برداشت کرنے کی ہمت پیدا کر دی جائے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ ہم سب بے حد خوش اعتقاد واقع ہوئے ہیں تو ظاہر ہے کہ خوش اعتقادی ہمارے لئے مفید ہے۔ کیونکہ یہ بات قرینِ قیاس نہیں کہ انسان سا عقلمند جانور کسی غیر مفید بات کو پلّے باندھ لے یعنی ہم صرف اُن باتوں پر ایمان لے آتے ہیں جن سے ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے یعنی اعتقاد یا ایمان بنفسہٖ ہمیں قبول نہیں جب تک کہ وہ ہمیں خوشی نہ بخشے یعنی ہم کسی کی بات پر اعتبار نہیں کرتے بلکہ خوش کن اعتباروں کو اکٹھا کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ہم صرف وہی جھوٹ بولتے ہیں جو ہمارے لئے خوش کن ہوں۔ اس لئے عام طور پر اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ میرے روبرو جھوٹ بول رہے ہیں تو میرا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کی بات مجھے اچھی نہیں معلوم ہو رہی یعنی میرے اکٹھے کئے ہوئے اعتقادات کو جھٹلا رہی ہے یا میرے مطلب کے مطابق نہیں۔

اگر آپ مجھ سے کچھ کہیں تو میرا اُسے تسلیم کر لینا یا نہ کرنا آپ کے بیان کی سچائی یا جھوٹ پر مبنی نہیں۔ اگر آپ کوئی جھوٹ بول کر مجھے خوش کر دیں تو میرے نزدیک آپ ایک راست گو ہوں گے یعنی جھوٹ اور سچ بذاتِ خود ہمارے نزدیک دو غیر ضروری اور مہمل باتیں ہیں۔

مجھے اکثر اپنے بزرگوں کی کئی ایسی باتیں سننی پڑتی ہیں جو میرے اپنے خیالات کے بالکل برعکس ہوتی ہیں اور میں اُن باتوں کے دوران میں "جی ہاں ٹھیک ہے، بالکل درست" کہنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ اُس وقت میں وہ باتیں انہیں کے نقطۂ خیال سے سنتا ہوں۔ یعنی اگر بات سننے والا سنانے والے کے نقطۂ خیال سے سُنے تو جھوٹ کا وجود ہی نہیں رہتا اور یہ دنیا اور زندگی چند ساعت کے لئے جھوٹ اور سچ کی مصنوعی بندش سے بلند ہو جاتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس وقت بیٹھے بٹھائے مجھے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ درحقیقت میں اُن بزرگوں کے نقطۂ خیال سے قطعی بیگانہ ہوں اور وہ خوش کن جملے "ٹھیک ہے۔ بالکل سچ" صرف اس لئے میری زبان سے نکل جاتے ہیں کہ اُن کی مدد سے میں اپنے بزرگوں پر واضح کر سکوں کہ دیکھا میں کیسا سمجھدار آدمی ہوں!

عام طور پر چار قسم کے جھوٹ بولے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ جنہیں بولتے ہوئے بولنے والے کو واضح طور پر اس کا احساس ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ایسے جھوٹ اکثر اپنے بچاؤ، مطلب براری، اپنی آن قائم رکھنے کی غرض سے یا کسی ذاتی فائدے کے لئے بولے جاتے ہیں۔ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ سب باتیں حقیقتاً اپنے بچاؤ ہی کے لئے ہوتی ہیں۔ یہ جھوٹ مرد عام طور پر زیادہ بولتے ہیں۔ دوسرے وہ جھوٹ جو تفریحاً بولے جاتے ہیں اور بولنے والے کو قطعی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا اگر ہو بھی تو ایک دھندلا سا شک ہوتا ہے جو اُس کی نفسی کیفیت پر کوئی اثر نہیں رکھتا۔ ایسے جھوٹ صرف عورت ہی بول سکتی ہے۔ اور صرف یہی جھوٹ آرٹ کے درجے تک پہنچ سکتے ہیں۔ عورتوں کے علاوہ شاعر، مصوّر اور دیگر آرٹسٹ بھی اس قسم کے جھوٹ بولنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے ان لوگوں میں عورت کا عنصر غالب

ہوتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہر جسم میں عورت اور مرد خلط ملط ہو رہے ہیں۔ اور اکثر ایسے مرد دیکھنے میں آتے ہیں جن میں پگڑی اور مونچھوں کے باوجود ایک عورت جی رہی ہوتی ہے۔

"تیسری قسم کے جھوٹ وہ جھوٹ ہیں جنہیں بولتے ہوئے ہمیں پختہ یقین ہوتا ہے کہ ہم حقیقت کو بے نقاب کر رہے ہیں اور ہمیں حیرانی ہوتی ہے کہ ایسی سیدھی بات سننے والے کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ اس قسم کے جھوٹ بولنے سے بیشتر یہ لازم ہے کہ وہی جھوٹ ہم اپنے آپ اتنی بار بول چکے ہوں کہ وہ ہمارے لئے جھوٹ ہی نہ رہیں۔ ایسے جھوٹ عام طور پر جاہل لوگ، سپاہی، سیاست دان اور فلسفی بولتے ہیں۔

چوتھی قسم کے وہ مہذب جھوٹ ہوتے ہیں جو ہم لوگوں کو خوش رکھنے کے لئے مروجہ تہذیب اور اخلاق کے مطابق بولتے ہیں۔ یہ جھوٹ اپنے متعلق پروپیگنڈا ہونے کے علاوہ اجتماعی زندگی میں بے حد ضروری ہیں۔

ان کے علاوہ ہم بسا اوقات تنہائی میں یا جب ہمیں کوئی کام نہ ہو بیٹھے ہوئے اپنے آپ سے جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ مجھے بھی اس کی عادت ہو چکی ہے۔ صبح دفتر کو جانے کے لئے جب میں اپنی بائیسکل پر پاؤں رکھتا ہوں تو معاً میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں وہ مشہور ہوا باز ہوں جسے لندن سے سڈنی تک کا سفر چوبیس گھنٹے میں طے کر کے ریکارڈ قائم کرنا ہے۔ پھر میری سائیکل ہوائی جہاز بن جاتی ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ نیچے دنیا بھر کے لوگ منہ اٹھا اٹھا کر میری طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں اور شہر بھر میں اس ہندوستانی ہوا باز کی ریکارڈ توڑنے والی پرواز کی خوشی میں موٹریں لاریاں اور تانگے چلتے پھرتے ہیں۔ لوگ یوں خوش نظر آتے ہیں گویا وہ کسی بیاہ پر آئے ہوئے ہوں۔ تانگے والے بچ جانا بھائی۔ ہٹو ہٹو چیخ چیخ کر میرا راستہ صاف کرنے میں مصروف ہیں...... اکثر میں جاگ پڑتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کسی دن یہ ہوائی سواری مجھے کسی لاری کے نیچے نہ کچل دے لیکن آپ جانتے ہیں کہ لندن سے سڈنی تک پرواز کرنا آخر خطرے سے خالی تو ہے نہیں البتہ مجھے اس خیال سے بے حد دکھ ہوتا ہے کہ کسی روز اگر میں مر جاؤں تو لوگ سمجھیں گے کہ ایک سائیکل سوار اپنی حماقت کی وجہ سے لاری کے نیچے آ کر مر گیا۔ بے چاروں پر کوئی اس حقیقت کے ظاہر کرنے والا نہ ہو گا کہ وہ بظاہر سائیکل سوار درحقیقت وہ مشہور ہوا باز ہے جو چوبیس گھنٹے میں لندن سے سڈنی تک پرواز کرتے ہوئے اپنے مہماتی جذبے کی نذر ہو گیا۔

یہ میں نہیں جانتا کہ اپنی اس ریکارڈ توڑنے والی ہوا بازی سے میرا مطلب کیا ہوتا ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ میری سائیکل اتنی پرانی ہے کہ چلتے ہوئے اس میں سے کئی ایک دلچسپ قسم کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ خود یوں جھولتی ہے کہ اس پر بیٹھ کر لوگوں کو اپنی طرف دیکھنے اور گھورنے سے باز رکھنا ممکن نہیں اور چونکہ مجھ میں ایسی نگاہوں کے برداشت کرنے کی ہمت نہیں اس لئے میں نے خیال ہی خیال میں اسے ایک ہوائی جہاز بنا رکھا ہے۔ یا یوں کہئے کہ میں اس سائیکل پر بیٹھنے سے بچنے کے لئے ہوا بازی کا عادی ہو چکا ہوں یعنی اپنے بچاؤ کے لئے میں اپنے آپ سے یہ معصوم اور خوش کن جھوٹ بولتا ہوں جب کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے اس بات کا خیال آتا ہے۔ تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ دنیا میں سب جھوٹ بولنے والے لوگ کس قدر ترس کے قابل ہیں۔ گویا وہ سب لولے لنگڑے اپاہج ہیں جو اپنے ہونے، جینے یا چلنے پھرنے کے لئے سہارا ڈھونڈتے پھرتے ہیں، جو ان سہاروں کے بغیر ہل جل بھی نہیں سکتے۔ اس وقت مجھے اُن لوگوں پر بے حد غصہ آتا ہے جنہوں نے ہمارے دل میں جھوٹ اور جھوٹوں کے لئے اس قدر نفرت پیدا کر دی ہے۔

میری اس اوپر کی مثال سے ثابت ہوا کہ اکثر ہمیں اپنے آپ سے بھی جھوٹ بولنے کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا حقیقت میں ایک ایسی ٹیڑھی کھیر ہے جس کا نہ سر نہ پیر اور جس میں ہماری کوئی وقعت ہی نہیں تو ہمارا دل یوں بیٹھ جاتا ہے جیسے لامحدود گہرائیوں میں ڈوب رہا ہو۔ اُس وقت اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہمیں چند ایسے خوش کن اعتباروں کی ضرورت پڑتی ہے جو ہمیں تسلی دے سکیں اور جن کے سہارے سے ہماری اپنی شخصیت کی اہمیت پیدا ہو۔ اُنہی خوش کن اعتقادوں سے جنہیں عام طور پر ذاتی لاگ لگا کہا جاتا ہے ہماری دنیا قائم ہے۔ اور انہیں کی مدد سے ہم میں احساسِ انفرادیت پیدا ہوتا ہے یعنی ان کو اکٹھا کر لیا جائے تو یہ ایک "میں" بن جاتے ہیں۔ اگر "میں" کا احساس نہ ہو تو دنیا بکھر کر اک طوفان بدتمیزی ہو جائے۔ فطرت نے ہمیں یہ "میں" کا احساس دے کر زندگی کو زندگی بنا دیا ہے۔ یعنی اس "میں" کے پردے میں فطرت خود چھپی بیٹھی ہے اور ہماری فطری جھوٹ نوازی ہی کی وجہ سے ہمارے لئے اندھیرا اندھیرا اور اجالا اجالا ہے تو ظاہر ہوا کہ ہماری خوش اعتقادی ہماری مشکلات کی وجہ نہیں بلکہ ہمارے لئے زندگی ہے! "میں" ہے!

یہ اتنے عالی شان فلسفے کے خیالی ایوان جو انسان نے تعمیر

کئے ہیں۔ یہ مصوری کے شاہ کار یہ حسین مجسمے یہ سب رنگین جھوٹ نہیں تو کیا ہیں؟ اور وہ دو رنگین ستون جن پر ہماری زندگی کا انحصار ہے یعنی عورت اور تخیل وہ بھی تو محض رنگین جھوٹ ہیں اور اس لامتناہی کائنات کے دیوانہ کن پھیلاؤ میں خدا کا تخیل جو اسے محدود کر کے اس کی ابتدا اور انتہا کو قائم کرتا ہے اور اس نفسانفسی اور بے ترتیبی میں نظام پیدا کر کے ہمارے لئے ایک تسلی کا باعث ہے وہ؟ —— !

ممتاز مفتی

بیٹے کی موت

چشمِ معصوم طلبگارِ مدد تھی ہم سے
ہائے ہر موئے بدن چیخ اُٹھا اس غم سے

پھینک دیتی ہیں دوزخ میں قضا اس کے عوض
ہم کو مقبول تھا ہر درد و سزا اس کے عوض

بے بسی! حیف یہ انسان کا انساں ہونا
دی جو توفیق تو اتنی کہ پریشاں ہونا

درد ہی درد ہے اب درد کا یارا نہ رہا
ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا نہ رہا

غم یہ وہ غم ہے کہ جس غم کی کوئی تھاہ نہیں
اس کی گہرائی سے خود ڈوب کے آگاہ نہیں

دل کو ٹھہراتے ہیں مدہوش کہ ٹھہرے بارے
اضطراب اور بڑھا سعیِ سکوں کے مارے

سنت پرشاد مدہوش

نامعلوم سرزمین کا سفر

مسکراتے ہوئے تاروں کے شبستانوں سے
کس نے جھانکا ہے مجھے رات کی خاموشی میں
کروٹیں لیتی ہوئی دل میں تمنّائے حسیں
یاس کے خواب کی آغوش سے بیدار ہوئی
حسرتِ مردہ میں جاں پڑنے لگی
روح پرنُور کی نیندوں کا سماں طاری ہے

مسکراتے ہوئے تاروں کے شبستانوں سے
کس نے جھانکا ہے مجھے رات کی خاموشی میں
بربطِ کاہکشاں پر کس نے
غم میں ڈوبا ہوا اک نغمۂ اُلفت گایا
اور غمِ عشق کو بیدار کیا
ایک عرصہ ہوا دل جس کو بھلا بیٹھا تھا
اور مرے وہم و گماں میں بھی نہ تھا
اُن کی جانب سے مجھے دعوتِ عشق آئے گی

سسکیاں بھرتے ہوئے جس کے شبستانوں سے
بارہا لذتِ دیدار سے ناکام پھرے
اور اُسے اپنی جوانی کے حسیں خوابوں میں
یہ بھی معلوم کبھی ہو نہ سکا
اس کے ایوان کے تاریک و جواں سائے میں
سسکیاں بھرتا ہوا شاعرِ غمگین و نزار
اپنی ناکام جوانی کو لُٹا بیٹھا ہے،
آج اُسی نے مجھے پیغامِ وفا بھیجا ہے۔

مسکراتے ہوئے تاروں کے شبستانوں سے
اُس نے دزدیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا ہے۔
میں ہوں کہ جوششِ مستی میں سراپا کھو کر
دوشِ پرمست ہواؤں کے اُڑا جاتا ہوں۔
کسی گمنام سی اقلیمِ مسرت کی طرف

تابش صدیقی

کالج سے گھر تک

میرا کالج تین بجے بند ہوتا ہے۔

دس بجے سے اِس وقت تک کلاسوں میں لیکچر سننا، اور خالی گھنٹوں میں بنچوں پر پہلو بدلنا، ہاتھوں سے چہرہ رگڑنا، ماتھا سہلانا، انگڑائیاں لے لے کر کوفت دور کرنے کی کوشش کرنا ہی کچھ کم تھکا دینے والا نہیں ہوتا، اور اوپر سے آخری گھنٹے میں اقتصادیات کی خشکی، اور لیکچرار صاحب کی بھدی، موٹی اور تھکی ماندی آواز اس احساس کو اور بھی تیز کر دیتی ہے۔ کلاس سے نکل کر قدم آہستہ آہستہ بے ترتیبی سے پڑتے ہیں، سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوتا ہے، اور کتابیں نیچے ہاتھ میں لٹکی جھولتی رہتی ہیں۔ سڑک پر پہنچ کر اس خستگی میں کچھ کمی ہوتی ہے، اور پہلی دفعہ محسوس ہوتا ہے کہ اب کل دس بجے تک کے لئے آزادی ہے۔ یہاں میں ہلکا سا سانس لیتا ہوں، اور پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں۔ وہ سامنے اقتصادیات کا کمرہ نظر آرہا ہے۔ میں فوراً گزرتے ہوئے یکوں اور سائیکلوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔

مجھے جانا تو ہوتا ہے ڈیڑھ میل، اور گرمی کا گرم سورج میرے ننگے سر کے ساتھ کچھ بہت زیادہ خوش سلوکی سے پیش نہیں آتا۔ مگر پھر بھی میں قدم بڑھانے کی کوشش نہیں کرتا —— نہیں کرنا چاہتا۔ آخر چوبیس گھنٹے میں یہی تو وقت ہوتا ہے جب سکون کے ساتھ کسی بات پر غور کیا جا سکے۔ صبح سے اُٹھ کر پڑھنا اور پڑھنا لگا ہی رہتا ہے۔ کالج جاتے ہوئے یہ بے چینی ہوتی ہے کہ کہیں گھنٹہ نہ بج جائے —— بس بھاگم بھاگ اور شام کو ٹہلنے میں ہلکی ہلکی ہوا کم بخت دماغ کو پتھر کا بنا دیتی ہے، نہ کچھ سوچ سکو اور نہ کچھ..... بس جوتا پھٹ پھٹاتے جاؤ اور آکر پڑ رہو۔ رات کا وقت تو خیر بنا ہی ناول پڑھنے کے لئے ہے پھر آپ ہی بتائیے کہ کالج سے آنے کے وقت کے علاوہ اور کون سا وقت فرصت کا رہ گیا۔ آخر گھر ہی پہنچنا ہے نا! پہنچ ہی جائیں گے۔ اپنے آہستہ آہستہ! پھر جلدی کا ہے کی؟

ذرا آگے چل کر تراہا آجاتا ہے۔ یہاں سے اس سڑک پر میرے سوا کالج کا کوئی لڑکا نہیں ہوتا، اور تانگوں وغیرہ کی آمد و رفت بھی معمولی ہی سی ہوتی ہے، اس لئے مجھے سوچنے کے لئے اور بھی اچھا موقع مل جاتا ہے۔

میرے ڈھیلے بد قطع کپڑوں اور چال ڈھال سے لڑکے مجھے نرا گاؤدی سمجھتے ہیں۔ میں جو خواہ مخواہ دخل درمعقولات نہیں کرتا، اور اخباروں کے شذرات پڑھ پڑھ کر سیاسیات پر انٹ سنٹ بحث کرنے کو بے کار خیال کرتا ہوں، تو وہ لوگ سمجھ بیٹھے ہیں کہ میں کچھ جانتا ہی نہیں۔ جب وہ نئے قانونوں، اسمبلی کی تقریروں، یا شاعروں کی قدر و قیمت کے متعلق سرگرمی سے بحث کرتے ہوتے ہیں تو میری طرف پیٹھ کر لیتے ہیں جیسے یہ معاملات مجھ سے بالاتر ہیں۔ اچھا پھر سمجھتے ہیں تو سمجھا کریں، میرا ہی کون سا بڑا حرج ہو رہا ہے۔ آخر اور بھی تو بہت سے بڑے بڑے آدمیوں کو اُن کے زمانے والے بے وقوف سمجھتے رہے ہیں۔ ہے تو یہ ٹھیک، مگر اُن لوگوں کے سامنے مجھے یہ محسوس ہونے لگتا ہے جیسے مجھ میں کوئی چیز کم ہے، اور میں بار بار اپنے آپ کو اوپر سے نیچے تک دیکھتا ہوں، لیکن یہاں سڑک پر...... یہاں کون بیٹھا ہے جو مجھے کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر مسکرائے گا۔ یہاں تو میرا جس طرح جی چاہے چلوں، مُنہ بناؤں، ہاتھ ہلاؤں! بے چارے راہ گیروں کو کیا پڑی ہے کہ کسی پر ہنستے پھریں.....

اور آخر میں اُن سے کسی بات میں کم بھی تو نہیں ہوں۔ سیاست..... بین الاقوامی معاملات..... ادب..... کیا نہیں آتا مجھے! بڑے آزاد خیال بن کر چلے ہیں وہاں سے —— مجھے دیکھیں: میں تو خدا کو بھی نہیں مانتا۔ وہ تھے نہ مولانا جواد علی، جو جمعیتہ العلما کی طرف سے تبلیغ کے لئے آئے تھے اور ہمارے ہی محلے میں ٹھیرے تھے۔ کیسے کیسے میرے پیچھے پڑے ہیں، مگر میں نے ہی نہ دی حضرت کو پڑھ کر نماز۔ کہیں یہ لوگ ہوتے تو دم سادھتے ہی بنتی۔ اور ہاں پھر میرے کمیونسٹ خیالات!

ایسے موقعوں پر اگر میں اپنی کھدر کی سفید شیروانی پہنے ہوئے ہوں. اور اُس کے دامن ہوا سے دونوں طرف اُڑ رہے ہوں تو میں محسوس کرنے لگتا ہوں گویا میں ایک سفید پروں والا فرشتہ ہوں، اور سڑک پر چلنے والے

آدمیوں سے اونچا ہوگیا ہوں۔ ہوا جب میرے بالوں اور کانوں کے بیچ سے گذرتی ہے تو میری کن پٹیوں کو آہستہ آہستہ سہلاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے میں اپنا قد سپاہیوں کی طرح سیدھا کرلیتا ہوں، اور شیروانی کا دامن ایک ہاتھ سے پکڑ کر تھوڑی دیر تک ذرا تیز چلتا ہوں۔

لیکن مجھے یہ بھی تو چاہیئے کہ ان لوگوں پر اچھی طرح واضح کردوں کہ میں اُن سے کچھ ہیٹا نہیں ہوں۔ اچھا تو آنے دو اب کی ڈیبیٹ.... مگر..... نہیں مذاق اڑائیں گے سٹر پر کہیں کے ..... پھر کالج کے میگزین ہی میں ایک مضمون لکھ ڈالوں لیکن اگر نہ لیا میرا مضمون تو.... ؟ کیا کرنا چاہیئے ..... کیا.... کرنا.... ٹھیک، ٹھیک! اب کے چھٹیوں میں جو گھر جانا ہو تو اپنے پرانے اسکول میں ایک تقریر کر ڈالوں۔ یہ لوگ تو واقعی میری تقریر نہ سن سکیں گے، مگر خیر مجھے تو تسلی ہو ہی جائے گی کہ میں کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں.... بس تو یہی طے ہے..... ہاں پھر تقریر کا مضمون کیا رہے گا۔

میں ذرا دیر اپنا چہرہ کھجاتا ہوں، اور پھر تقریروں کے عنوان اور اُن کے متعلق فقرے ذہن میں چکر لگانے لگتے ہیں.... موجودہ بین الاقوامی صورتِ حالات.... فش.... روس کی معاشری حالت ...... ہوں، ہوں ـــــ لینن، ٹراٹسکی، اسٹالن ـــــ کوئی دوسرا.... وردس ورتھ کی شاعری ..... نہیں نہیں ـــــ "آج روس میں ہر ایک کسان....." مگر اس بات کا تعلق تو پہلے مضمون سے ہے..... اچھا پھر..... ادب اور زندگی ...... یہ ٹھیک رہا۔ آخر جاننا چاہیئے کچھ بے چارے ان اسکول کے لڑکوں کو بھی۔ انہیں پڑھایا ہی کیا جاتا ہے، بس وہی غالب..... شمارِ سبحہ مرغوب بُتِ مشکل.... بھلا یہ بھی کوئی شاعری ہوئی..... ہونہہ..... تو بس یہ مضمون ٹھیک رہا۔

اچھا اب اسے شروع کس طرح کیا جائے گا؟..... پہلے تو اپنی کم استعدادی کا اعتراف، اور پھر معافی کا مطالبہ وغیرہ..... معزز اساتذہ اور بھائیو"...... انگریزی میں کہتے ہیں لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ مگر عورتیں تو ہوں گی نہیں..... تو پھر یوں.... "غیر حاضر خواتین اور حاضر اصحاب"..... اس سے ایک ہنسی کی بات تو کہہ دی گئی نا..... "آپ سب مجھے جانتے ہیں..... میں اسی اسکول میں پڑھا ہوں..... میں کچھ زیادہ تو جانتا نہیں مگر آپ کی خدمت کے شوق میں حاضر ہوگیا ہوں..... میری غلطیاں معاف کریں گے" ..... اب کوئی لطیفہ یا شعر.... شعر ہی سہی..... یہ مصرع مناسب ہوگا۔

یہی زندگی حقیقت یہی زندگی فسانہ.... پڑھ کر دیکھ لینا چاہیئے...... میں چاروں طرف نظر دوڑاتا ہوں۔ لوگ آ جا رہے ہوتے ہیں۔ میں اپنا ہاتھ مُنہ پر اس انداز سے رکھ لیتا ہوں کہ ہونٹوں کے ہلنے کو کافی جگہ رہے، اور ہلکی آواز میں پڑھتا ہوں۔

یے ہی زن..... دگی حقی قت..... یہی زندگی..... فس آنا۔

آپ لوگ غالب کا کلام پڑھتے ہیں، قصیدے پڑھتے ہیں، غزلیں پڑھتے ہیں۔ کیوں پڑھتے ہیں؟ لکھنے والا کیوں لکھتا ہے؟ کبھی آپ نے سوچا! بتلایئے..... آپ اس لئے..... یہاں میری مُٹھی بندھ جاتی ہے، اور ہاتھ اوپر اُٹھنے لگتا ہے، مگر میں شرما کر اسے جلدی سے نیچے کھینچ لیتا ہوں۔ ....."آپ اس لئے پڑھتے ہیں شعر کہ آپ زندگی..... ہاں ہاں اس ظالم زندگی..... کہ آپ زندگی کے متعلق جاننا چاہتے ہیں، اس کے گہرے رازوں کو سمجھنا چاہتے ہیں، ان سمندروں کی تھاہ لانا چاہتے ہیں۔ اور شاعر کا بھی....."

گھوڑے کے ٹاپوں کی زوردار آواز مجھے مڑکر دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے ..... ہاں، وہی ہے۔ یہ لڑکیوں کا تانگہ مجھے اکثر ملتا ہے۔ ان میں سے ایک لڑکی مجھے بہت پسند ہے۔ وہ ہمیشہ ایک ہی انداز سے بڑی تمکنت کے ساتھ بیٹھتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ہمیشہ کھلی رہتی ہیں، اور وہ کبھی مجھ سے نگاہیں چرانے کوشش نہیں کرتی، بلکہ میری طرف دیکھتی رہتی ہے۔ اس کا چہرہ بیضوی، سفید، اور بھرا ہوا ہے، اس کے ہونٹ خوب سُرخ ہیں۔ اور ہمیشہ بند رہتے ہیں۔ میں سوچا کرتا ہوں، کاش! مائیکل اینجلو اس کا مجسمہ بناتا.... لیکن مجسمہ پھر بھی بے جان ہی معلوم ہوتا ہے۔ آنکھیں تو خصوصاً مجسمہ میں پتھرائی ہوئی سی نظر آتی ہیں۔ مونالیزا کا مصوّر ہی کچھ اس کی نقاشی کرے تو کرے۔ خاص طور سے اس کا سینہ تو مجھے بے حد پسند ہے۔ اس کی سفید جالی دار ساڑھی اور ہلکے ہمپر میں سے اچھی طرح اندازہ کرسکتا ہوں.... سفید، ملائم، سڈول کاش میں چھو سکتا! اگر کہیں وہ بھی میری تقریر سن سکے تو مزا ہی آجائے..... ممکن تو ہے..... ابھی تو چھٹیوں میں بہت دن پڑے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس عرصے میں میری اُس سے ملاقات ہو جائے اور اتنی راہ و رسم بڑھ جائے کہ میں اُسے اپنے ساتھ لے جاسکوں۔ پھر تو مجھے دوسری طرح شروع کرنا پڑے گا۔ میں کہوں گا: "اکیلی خاتون اور بہت سے حضرات" سب ہنس پڑیں گے۔ میرے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھ کر کیسا کیسا رشک ہوگا لوگوں کو اور میں خوشی سے دیوانہ ہو ہو جاؤں گا۔

اپنے پرانے انگریزی کے ماسٹر صاحب سے ضرور تعارف کراؤں گا اس کا، ..... تانگہ گذر بھی چکا ہے، اور میں اسی کے خیال میں غرق، اپنے پچھلے ہونٹ کو اوپر کے ہونٹ سے رگڑتا ہوا، سر لٹکائے، بائیں ہاتھ سے کتابیں دل کے قریب جائے ہوئے، اور داہنے ہاتھ کے انگوٹھے سے برابر والی انگلی کو ملتا ہوا، آہستہ آہستہ لڑھکتا رہتا ہوں۔

سورج کی گرمی سر کو جھلس کر رکھ دیتی ہے، بدن میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگتی ہیں، اور چہرہ پسینے میں ڈوب جاتا ہے۔ بے قرار ہو کر میں یکایک تیز چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ آگے درختوں کا سایہ آتا ہے جو کافی دور تک چلا گیا ہے۔ اسے دیکھ کر میں لپکتا ہوں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سر کو چکرا دیتی ہے، اور میرا دماغ تیز لہروں کی دھار پر گھومتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت ہر قسم کے خیالات میرے ذہن سے نکل جاتے ہیں، اور میری رفتار بہت دھیمی پڑ جاتی ہے۔

درختوں کے اختتام کے قریب سڑک کے کنارے ایک کمہار کا گھر ہے۔ درختوں کے سائے میں اس کی لڑکی اپنا چاک رکھے آبخورے بنایا کرتی ہے۔ وہ گھٹنوں سے اوپر تک کا پھٹا سا لہنگا اور آدھی باہوں کا دھاری دار کرتا پہنے رہتی ہے اور اس کی اوڑھنی ڈھلک کر کندھے سے نیچے گر جاتی ہے اُسے اپنے تندرست اور نیم رس سینے کو ڈھکنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوتی جس کا کافی حصہ گریبان میں بٹن نہ ہونے سے راہ گیروں کی نظروں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس کے سوکھے ہوئے سخت بالوں کے گچھے اور لٹیں بن گئی ہیں جن میں سے اکثر اس کے تانبا جیسے اور جابجا مٹی سے سنے ہوئے چہرے پر لٹکتی رہتی ہیں۔ جب وہ اپنے ڈنڈے سے چاک کو گھماتی ہے تو اس کے بازوؤں کی مچھلیاں گردش کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی ٹانگیں بے پروائی سے چاک کے دونوں طرف پھیلی رہتی ہیں، اور اُس کی برہنہ چکنی پنڈلیوں پر نیلی نیلی رگیں اُبھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے اپنی تقریر پھر یاد آجاتی ہے، اور میں سوچنا شروع کر دیتا ہوں، میری بھنویں چڑھ جاتی ہیں اور میں بمشکل اپنے لفظوں کو ہونٹوں تک آنے سے روکتا ہوں۔

"آپ نے اپنی شاعری میں قوس قزح کی رنگینی اُڑائی، اُسے گل و یاسمن میں لبسا دیا، موجِ نسیم کے گہوارے میں پالا، بادۂ ناب اور مئے انگوری کی کیفیتیں اس میں بھر دیں، اور طور کی تجلیوں سے اسے ضیا بخشی ..... لیکن ۔۔۔ آپ نے زندگی سے کیا لیا ۔۔۔ زندگی ..... میرا مقصد ہے زندگی ..... کیا آپ نے کبھی خونِ گرمِ دہقان کی جھلک دکھائی! کیا آپ نے مزدور کی کمر کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی! کیا آپ نے ..... اُن مضبوط لیکن فاقہ کش اور بدحال مزدوروں کی جفاکشی کے گن گائے؟ ..... اگر نہیں تو آپ بے خبر سوتے رہے ..... آپ نے آنے والے انقلاب کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں ..... ہوشیار ..... بیدار ہو جائیے ..... اٹھئے اور اپنے ادب کا .....!"

موٹر کے ہارن کی متواتر آوازیں مجھے جگا دیتی ہیں، اور میں ایک طرف ہٹ جاتا ہوں۔ یہ موٹر میری کلاس کے ایک کالے اور بدشکل لڑکے کا ہے۔ وہ میرے سامنے ہی بیٹھتا ہے، اور مجھے ضرور پہچانتا ہوگا، مگر اپنی موٹر میں گزرتے ہوئے جب وہ مجھے دیکھتا ہے تو ناک سیکڑ کر دوسری طرف منہ کر لیتا ہے۔ کرتا ہے تو کرلے، مجھے کیا۔ ایسا کہاں کا لاٹ صاحب ہے بڑا۔ اور ہو بھی تو کیا ہے۔ انقلاب بھی تو نزدیک آرہا ہے اور تھوڑے دن میں کیسے اُسے پھر کُھل جائے گی حقیقت! ..... اپنے منتقمانہ ارادوں کے پورا ہونے کی اتنی قریب اُمید پر ایک رمزیہ مسکراہٹ میرے ہونٹوں تک آجاتی ہے۔ اور اس طرف سے مطمئن ہو کر میں اپنی تقریر سوچنے لگتا ہوں۔ اس وقت مجھے سلسلے کی کچھ زیادہ فکر نہیں ہوتی۔ کیونکہ ابھی تو خیالات کو جمع کرنا ہے، اُن کی مناسب ترتیب تو موقع پر ہوتی رہے گی۔

کسی مشہور انگریزی مصنف کا قول بھی آنا چاہئے تقریر میں، آخر لوگوں کو یہ معلوم تو ہو کہ ہم نے بھی انگریزی ادب کا مطالعہ کیا ہے۔ اچھا تو پھر کون سا مصنف ..... میتھیو آرنلڈ ..... ادب تنقیدِ حیات ہے ..... مگر نہیں، چھوڑو۔ بہت پامال ہے یہ ..... شیلی کا وہ شعر ایسی ایسی شکلیں جو بقا کی پروردہ ہیں ..... لیکن یہ تو میرے مقصد کے خلاف ہے گا! مجھے تو زندگی کے متعلق کہنا ہے ..... پھر؟ ..... شاید لینن نے کہا تھا کہ یہ سر ہلانے کا وقت نہیں ہے بلکہ سر توڑنے کا ..... لیکن کوئی ٹھوس چیز ہونی چاہئے ..... کس نے لکھا ہے وہ! ..... والٹر پیٹر ..... بینٹ ..... فرائی ..... خیر کوئی بھی سہی۔ یوں کہا جاسکتا ہے "کتنی اچھی بات کہی ہے ایک انگریز نقاد نے کہ ادب زندگی سے پیدا ہوتا ہے، زندگی سے نشو و نما پاتا ہے، اور زندگی پر ہی اثر انداز ہوتا ہے"۔ اپنے میں یورپ کے مصنفین کے اقوال نقل کرنے کی صلاحیت پاکر مجھے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ میں اپنی تقریر کو بھول کر کچھ دیر اسی خیال سے لطف اٹھاتا رہتا ہوں، اور بار بار مسکراتا ہوں، میں اُس دن کا تصور کرتا ہوں جب میں اپنی تقریر میں یہ اقوال دہرا رہا ہوں گا ..... لڑکے میری قابلیت پر تعجب کریں گے۔ فارسی

کے ماسٹر صاحب گردن بڑھا بڑھا کر مجھے گھوریں گے۔ مرعوب تو وہ بھی ہو رہے ہوں گے، مگر اس پر جھنجلا رہے ہوں گے کہ میں نے ابھی تک فارسی کا ایک شعر بھی نہیں پڑھا۔ اور آخر میں کیوں پڑھوں صاحب۔ بھلا کہاں انگریزی کہاں فارسی! ...... گھر جا کر بھی تو لڑکے ——

"ارے، ہٹتے بھی ہو آگے سے کہ نہیں" ایک پسینے میں شرابور اور سر سے پیر تک سیاہی سے پُتا ہوا مزدور کوئلے کی بوریوں سے لدے ہوئے چھکڑے کو کھینچتے ہوئے پیچھے سے پکار کر کہتا ہے، اور ساتھ ہی زیرِ لب ایک غیر شگفتہ اصطلاح کا اضافہ بھی کرتا ہے ...... ان لوگوں کی ایسی باتوں سے میرے دل کو ایک دھکا سا لگتا ہے ..... ہمارا تو یہ حال کہ ہم اُن کی حمایت میں تقریریں سوچیں، ان کی خاطر سرمایہ داری کے خلاف دانت پیسیں، اُن کی حالت پر افسوس کریں ...... اور ان کا ایسا سلوک ہمارے ساتھ؟ ..... کیا حالت ہے دنیا کی بھی ...... اپنے ہمدردوں کا بھی تو لحاظ نہیں کرتے یہ لوگ ...... نہ جانیں، نہ پہچانیں، ...... جانور کہیں کے۔ میں ارادہ کر لیتا ہوں کہ اب اپنی تقریر کا موضوع بدل دوں گا۔ اور اقبال کے فلسفۂ حیات پر بولوں گا ...... مگر پھر مجھے خیال آتا ہے کہ کچھ ایسا فلسفہ اور بھی تو نہیں ان بے چاروں کا ...... جاہل ہی نہیں تو آخر ...... چھوڑو بھی، اپنی تقریر دیکھو۔ ہاں تو ...... وہ ادب جو زندگی سے رشتہ منقطع رکھے، جو زندگی کی ترجمانی کرے ...... جو ...... زندگی ......" زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب۔ اور ساتھ ہی ایک میل گھوڑے پر یکّے والے کے چابکوں کی سٹراسٹر۔ —— "ایک مرتبہ یونانیوں نے اپنے ایک شاعر کو اس لئے سزا دی تھی کہ وہ ان کی زندگی کے مصائب اپنے شعروں میں بیان کیا کرتا تھا ...... زندگی مصائب سے پُر ہے ...... مصائب ...... ظلم ...... بے انصافی ...... اور یہ مزدور ......"

میرا خالی ہاتھ کبھی اوپر آتا ہے، کبھی نیچے جاتا ہے، اور کبھی گھونسے کی شکل اختیار کر کے ہوا کو مارتا ہے، میرے ہونٹ بھی کچھ ہلتے ہوتے ہیں۔ مگر مجھے اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب دو اسکول کے لڑکے اپنی سائیکلوں پر میرے پاس سے گذرتے ہیں اور مجھے دیکھ کر قہقہہ مارتے ہیں۔ میرے خون کی گردش رُک سی جاتی ہے، اور کن پٹیاں بھاری اور گرم ہو جاتی ہیں لیکن میں آہستہ آہستہ اپنے بدن کو دوبارہ ڈھیلا کر لیتا ہوں۔ اور پھر ...... "آپ لوگ اب بڑے ہونے والے ہیں۔ آپ کو اپنے فرض کا احساس ہونا چاہیے ...... بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے ...... اب آپ لوگوں کے ہاتھ بات ہے، آپ کو نیا ادب پیدا کرنا ہے ...... زندگی سے باہر آپ کہاں جا سکتے ہیں۔ زندگی ایک چیتا ہے ...... غور سے، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیے زندگی کو ...... ایک شاعر ہے آج کل انگریزی کا۔ وہ کہتا ہے کہ میں محبت کرتا ہوں چائے کی پیالیوں سے، کمبلوں سے، ریل کے ......"

"چھوٹے نہ دیبے ننندی" —— پگلا نندو چیخ چیخ کر گا رہا ہے، اور ساتھ ہی سڑک پر ناچتا بھی جاتا ہے۔ لڑکے اُسے چاروں طرف سے گھیرے رہتے ہیں، اور خود بھی چلّاتے جاتے ہیں: "کیا کہنے ہیں بجرو بٹیا کے"۔ پُوسا پکوڑی والا دو دو بیٹھا لڑکوں کو شہہ دیتا رہتا ہے۔ یہ پوسا پنواڑی کی دکان کے قریب پیپل کے نیچے چبوترے پر بوری بچھائے بیٹھا کڑوے تیل میں پکوڑیاں پکایا کرتا ہے جس کی چراند دور دور پھیلی رہتی ہے۔

اب گھر اتنا نزدیک آ جاتا ہے کہ تقریر کے متعلق کچھ اور سوچنا مشکل معلوم ہونے لگتا ہے۔ باقی حصے پر کل غور کرنے کا ارادہ کر کے میں چال کو تیز کر دیتا ہوں۔

بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ مجھے بارش آ گھیرتی ہے۔ ایسے موقعوں پر اکثر بادل گھنٹہ ختم ہونے پر اٹھنا شروع ہوتے ہیں۔ لیکن میں ان کی دہشت ناک شکل کو ذرا خاطر میں نہیں لاتا۔ سورج کی جھلسن کا پتہ بھی نہیں ہوتا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی ہوتی ہے۔ ایسے میں طبیعت کی روانی کا کیا پوچھنا —— جیسے چلے جا رہے ہوں ہلکے ہلکے اڑتے ہوئے۔ اور پھر یہ کوئی لازمی تھوڑی ہے کہ بارش ہو، میں اپنی تقریر سوچتا ہوا چلا جاتا ہوں —— اور دونوں سے بھی آہستہ خطرے کے نزدیک ہونے کا احساس مجھے اس وقت ہوتا ہے جب یکّے اور تانگے پوری رفتار سے گھڑ گھڑاتے ہوئے دوڑنے لگتے ہیں، سائیکلوں کی گھنٹیاں بے تابانہ زور زور سے بجتی ہیں، اور گھاس والیاں ایک ہاتھ سے اپنے لہنگے سنبھالتے ہوئے یہ کہہ کہہ کر بھاگنا شروع کر دیتی ہیں کہ "بھاگو بھئی، پانی آ لیو"، میں بھی گھبرا کر جلد جلد قدم بڑھاتا ہوں —— موٹی موٹی بوندیں پڑتی ہیں۔ اب میں بھاگنے کی تیاری کرتا ہوں مگر بارش ایک ساتھ آ جاتی ہے ...... یوں ہونے کو تو میں حاجی غلام رسول ٹرنک ساز کی دکان میں پناہ لے سکتا ہوں اور ایک دفعہ میں نے کیا بھی یہی تھا۔ بارش جو آئی تو میں سیدھا حاجی جی کی دکان پر چڑھ گیا۔ حاجی جی لکڑی کی کرسی پر دونوں پیر اوپر رکھے بیٹھے تھے، اور حقہ پیتے ہوئے کسی سے باتوں میں مشغول تھے میں بھی کھڑا ہو کر سننے لگا۔ اسکول کی لڑکیوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ حاجی جی نے اپنے مخاطب کی طرف جھک کر میری طرف مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے، رازدارانہ لہجے میں کہا: "ارے بھئی بیسیوں واقعے تو خود مجھے معلوم ہیں۔ جب بورڈنگ کی لڑکیوں کے بچے پیدا ہوئے ہیں آخر کچھ حد ہے بے حیائی

کی۔"

میں بھی بول اٹھا۔ "لیکن جب آپ کی بھینس بچہ دیتی ہے تو اُسے بے حیا کیوں نہیں کہتے؟"

حاجی جی نے اس غیر متوقع جارحانہ حملے کو جس نے انہیں ہڑبڑا دیا تھا کچھ زیادہ پسند نہیں کیا۔ لیکن جلد ہی انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا، اور داڑھی کو اس طرح اوپر اٹھاتے ہوئے بولے گویا وہ بھی ان کی دلیل کا ایک حصّہ ہے۔ "تو آدمی اور بھینس کی کیا مثال؟"

"بھینس آدمی نہیں ہوتی کیا؟" میں نے بغیر سوچے جواب دیا۔

"بھینس آدمی؟" حاجی جی کے حقّے کی نے نیچے گر پڑی۔

"ہاں آدمی، یعنی یہ کہ۔ ۔ ۔ ۔ جاندار تو ہوتی ہے!"

میری اور حاجی جی کی خاصی جھڑپ ہو گئی جس کے دوران میں انہوں نے میری ذات کے متعلق کچھ بہت اچھے خیالات کا اظہار نہیں کیا حالانکہ انہیں میرے وہاں کھڑے رہنے پر فی الحال کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر میں بارش کے باوجود وہاں سے چل دیا۔ جب سے میں کبھی ان کی دُکان میں نہیں جاتا، چاہے کتنے ہی زور کی بارش کیوں نہ آجائے اور پھر بارش ہمیشہ اُس وقت آتی ہے جب میرا ایک تہائی کے قریب راستہ رہ جاتا ہے۔ اس لئے میں سیدھا بھاگ ہی لیتا ہوں۔ بارش کا زور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ بوچھاڑ آنکھوں کو بند کئے دیتی ہے کتاب کا رنگ چھوٹ چھوٹ کر کپڑوں پر ٹپکنے لگتا ہے۔ مگر میں بھاگے ہی چلا جاتا ہوں۔ بارش کے وقت پوسا پکوڑی والا اپنا سامان ہواڑی کے تخت کے نیچے سرکا دیتا ہے، اور چبوترے پر پیر نیچے لٹکا کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ کبھی ایک دھوتی کے سوا اور پہنتا ہی کیا ہے، اس وقت تو وہ دھوتی کو بھی اوپر چڑھا لیتا ہے اور ران پر ہاتھ مار مار کر زور سے گاتا جاتا ہے۔ "برسو رام جھڑا کے سے۔ بڑھیا مر گئی پھاکے سے"

جب میں بھاگ رہا ہوتا ہوں تو اُس کی آواز ایک عفریتانہ تمسخر کے ساتھ، تُند، کرخت، ایک دھمکی سی لئے ہوئے بارش کی دھار کو چیرتی پھاڑتی میرے تعاقب میں دوڑی چلی آتی ہے ـــ برسو رام جھڑا کے سے۔!

میں اپنے مکان کے سامنے کے میدان کو گھوڑوں کی لید اور کیچڑ میں پھنسے ہوئے اور پرنالوں کے پانی میں چھپ چھپ کرتے ہوئے طے کر کے سر سے پیر تک پانی میں ڈوبا ہوا زینے کے دروازے تک پہنچتا ہوں۔ جیب سے چابی نکالنا چاہتا ہوں تو جیب ایسی چپک جاتی ہے کہ چابی بڑی مشکل سے ہاتھ لگتی ہے۔ پھر تالا بھی کھلنے میں دقت پیدا کرتا ہے۔ جلد جلد اوپر پہنچ کر میں کتابوں کو چارپائی پر پھینک دیتا ہوں۔ شیروانی کو آہستہ آہستہ اُتارتا ہوں، اور اُسے اُلٹ پلٹ کر نہایت غور سے دیکھتا ہوں گویا میری نگاہ کی گرمی سے وہ خشک ہو جائیگی یا اُس کی رگڑ سے کتاب کا بہا ہوا رنگ چھوٹ جائے گا۔ پھر میں اسے نہایت احتیاط سے کواڑ پر ٹانگ دیتا ہوں، اور بغیر کپڑے اتارے، بالوں کو تولئے سے سکھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اتنے میں چھدن بکے والا اوپر چڑھ آتا ہے، اور کواڑ سے لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر تو وہ تیز نظروں سے حالات کا جائزہ لیتا ہے، اور پھر چونکتے ہوئے مسکرا کر کہتا ہے۔

"کہو بابو جی، بھیگ گئے آج؟" اور ساتھ ہی اس کے دھکے سے شیروانی کواڑ پر سے نیچے کچی زمین پر گر پڑتی ہے، اور مٹی میں سن جاتی ہے۔

اور یہ وہی میری کھدّر کی سفید شیروانی ہوتی ہے۔

. . . .

اگلے دن میں دنیا کے آئندہ نظام کے متعلق تقریر سوچتا ہوں۔

محمد حسن عسکری

غزل

جو کچھ چاہیں وہ فرمائیں، اُن کو تم فرمانے بھی دو
میرے دل کی حالت دیکھو، اُن کو قسمیں کھانے بھی دو

خشک ہوا ہے نخلِ تمنا، پھلنے کی امید نہیں ہے
باقی ہیں جو پھول کہیں پر اُن کو اب مرجھانے بھی دو

جینا کیا، جینے کی خوشی کیا، دل ہے جب بربادِ تمنا
جاؤ اب آنسو نہ بہاؤ، مجھ کو تم مر جانے بھی دو

ناز و ادا سے کام رکھو تم، جور و جفا کی مشق کرو تم
کوئی اگر مٹتا ہے جہاں میں اُس کو تم مٹ جانے بھی دو

رگ رگ میں اک آگ لگی ہے، دل ہے تیرِ غم کا نشانہ
رونے دو، رونے دو مجھ کو، آنسو کچھ بہہ جانے بھی دو

ختم نہ ہوگی غم کی کہانی، نیند تمہیں جھٹ آجائے گی
چھوڑو بھی اس افسانے کو، جانے بھی دو جانے بھی دو

عہدِ وفا کو کب ادھوکا ہے، کوئی کسی کا کب ہوتا ہے
غم نہ کرو اگلی باتوں کا، یاد آئیں یاد آنے بھی دو

کوکب شادانی

اچھی کتابیں زندگی کو اچھا بناتی ہیں

لیکن ہر شخص کو اچھی اور بُری کتابوں میں تمیز کا موقعہ حاصل نہیں۔ خصوصاً آج کل کے تیز رفتار زمانے میں جب کہ ہر بری چیز اپنا ظاہری دلکش لباس پہنے نگاہوں کو دھوکا دینے کے لئے ہر طرف موجود رہتی ہے۔ اس دھوکے سے بچنے کے لئے سکون اور دقت کی ضرورت ہے۔ ان وجوہات کے مدنظر کتب خانہ ادبی دنیا لاہور نے فیصلہ کیا ہے کہ ادبی دنیا کے پڑھنے والوں اور عام پبلک کے لئے وقتاً فوقتاً چنی ہوئی کتابوں کی مختلف فہرستیں شائع کی جائیں اس انتخاب کی ضمانت صلاح الدین احمد اور میراجی مدیران ادبی دنیا کا نام ہے انہوں نے نہایت محنت اور وقت صرف کرنے کے بعد یہ انتخاب کیا ہے اور جو بلند نظری اور معیار کی خوبی ادبی دنیا کے مضامین میں دکھائی دیتی ہے۔ اُسی کا لحاظ ان فہرستوں میں بھی رکھا ہے۔ ناظرین کی آسانی کے لئے یہ تمام کتابیں کتب خانہ ادبی دنیا میں فراہم کر لی گئی ہیں تاکہ ایک ہی جگہ سے بغیر کسی دقت کے آپ کو یہ چنی ہوئی کتابیں مل سکیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہر ماہ ناظرین ان فہرستوں کا مطالعہ کر کے ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔

افسانے

کتاب	مصنف	قیمت
فردوس خیال	منشی پریم چند	ہہ
پریم بتیسی حصہ اول و دوم	〃	ہے
نظارے	کرشن چندر	ہ
منٹو کے افسانے	سعادت حسن منٹو	عہ
سحر فرانس	طاہر قریشی	ہہ
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	ہہ
باسی پھول	سید علی عباس حسینی	عہ
شعلے	پروفیسر احمد علی ایم اے	عسہ
سوز ناتمام	عاشق حسین بٹالوی	عہ
چغتائی کے افسانے	مرزا عظیم بیگ چغتائی	ے
صنوبر کے سائے	حجاب امتیاز علی	عہ
میری ناتمام محبت	〃	ہہ
طلسم خیال	کرشن چندر	ہہ
اندھی دنیا	اختر انصاری	عہ
ڈاچی	اپیندر ناتھ اشک	ہہ
پس پردہ	چندر بھوشن سنگھ	۱۲
ساز فطرت	حسن عزیز جاوید	ہہ
محبت اور نفرت	اختر حسین رائے پوری	ہہ
ہیبت ناک افسانے	امتیاز علی تاج	ہہ

مزاحیہ

کتاب	مصنف	قیمت
پطرس کے مضامین	احمد شاہ بخاری	ہہ
حاجی لق لق کے افسانے	حاجی لق لق	۱۱
سطائبانہ	سندباد جہازی	عہ
جدید جغرافیہ پنجاب	〃	عسہ
دنیائے تبسم	شوکت تھانوی	ہہ
مضامین فلک پیما	فلک پیما	ع
روح لطافت	مرزا عظیم بیگ چغتائی	ہہ
روح ظرافت	〃	ہہ
کولتار	〃	عا

ڈرامے

کتاب	مصنف	قیمت
انارکلی	امتیاز علی تاج	ہہ
ریڈیو ڈرامے	فضل حق قریشی	عہ
منتوش	حکیم احمد شجاع ۸، مینا، حکیم احمد شجاع	۱۲
ہملٹ	مترجمہ عنایت اللہ دہلوی	عہ
فاوسٹ	گوئٹے	ہہ
چند لوپیاں	نورالٰہی محمد عمر	۸
چند ڈرامے	〃	۸

منظومات

کتاب	مصنف	قیمت
بانگ درا	اقبال	ہہ
نقش و نگار	جوش ملیح آبادی	ہہ
فکر و نشاط	〃	ہہ
بہارستان	مولانا ظفر علی خاں	للعہ
سوز و ساز	حفیظ جالندھری	ع
نغمہ زار	〃	ہہ
گیت مالا		۶
چراغاں۔ احسان دانش عا آتش خاموش احسان دانش		ہہ
نغمہ حرم۔ اختر شیرانی ہہ نقش دوام عبدالحمید عدم		ع

ملنے کا پتہ: کتب خانہ ادبی دنیا۔ دی مال۔ لاہور

کشمیر کا ایک آوارہ نغمہ

سرِ بازار رسوائی پھری میری گنہگاری
نہ کی لیکن کسی نے جنسِ ارزاں کی خریداری

وہ آئے کارواں امّید والوں کے لبِ منزل
نہیں یہ اہلِ غفلت کے لئے ہنگامِ بیداری

تجھے اے چشمِ حیرت کس نظارے کی تمنّا ہے
کہ یہ پتّھر کا بتخانہ ہے دردِ شوق سے عاری

حذر اے بزمِ فطرت! میں وہ میخوارِ محبت ہوں
مری آنکھوں میں لُٹتی ہے بہارِ ابرِ آذاری

تجھے بامِ ہمالہ سے صلائے شوق دیتا ہوں
سبق آموزِ عالم ہے مرا ذوقِ وفاداری

قسم ہے مجھ کو اپنے دیدۂ خونیں کے اشکوں کی
نہیں منظور مجھ کو دامنِ فطرت کی گلباری

حقیقت تیرے غم کی کوئی افسانہ نہیں بنتی
فسانہ کوہکن کا اب بھی اس وادی میں ہے جاری

بہا لے جاؤ اے لمبودری کی تُندرَو لہرو!
پریشاں ہے مری خاکِ فسردہ کی سبکساری

دعا دیتے ہیں مجھ کو عارفانِ عشق اے تائب
لبِ عرشِ خدا تک ہے مری دنیائے غمخواری

یہ نظم شاعر نے وادیٔ لدّر (کشمیر) کی ایک بلند چوٹی پر کہی تھی۔ (ادارہ)

مراتب علی تائب

کیلی

یہ ذکر ۱۹۳۷ء کا ہے۔

صفدر بھائی اور میں مئی کے آغاز ہی میں بٹوت کی سرسبز وادی میں پہنچ گئے۔ پہلا دن تو خیمہ لگانے اور سامان درست کرنے میں گذر گیا۔ دوسرے دن ناشتہ کے بعد دودھ مکھن کی فکر دامنگیر ہوئی۔ بازار کی جانب قدم اٹھایا ہی تھا کہ شاہ صاحب مل گئے۔ وہ تجربہ کار بٹوتی ہیں۔ اس لئے یہ مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا۔ حسب عادت بزرگانہ لہجے میں فرمانے لگے۔ تم خواہ مخواہ پریشان کیوں ہو رہے ہو۔ گوجر جو مغربی پہاڑیوں سے آکر بازار میں دودھ مکھن بیچتے ہیں یہیں سے ہو کر گذرتے ہیں۔ بس اُن کے بٹوت پہنچنے کا وقت ہوا ہی چاہتا ہے۔ میں ابھی انتظام کر دوں گا۔ ابھی وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ بگو نالے کے پل پر گوجر آتے دکھائی دیئے۔ شاہ صاحب نے کہا لو وہ آگئے۔ جب وہ قریب پہنچے تو اکثر نے شاہ صاحب کو سلام کیا اور مزاج پرسی کی۔ یہ مختصر سی ہی کچیلی جماعت چند مرد اور عورتوں پر مشتمل تھی۔ شاہ صاحب تو مکھن اور دودھ کے قضیے میں اُلجھ گئے اور ہماری حسن بین آنکھیں گجریوں کا جائزہ لینے لگیں۔ ان میں سے اکثر کو میں پہچانتا تھا۔ شاہ صاحب کی مخاطب وہی پچھلے سال والی قوی ہیکل مردنما عورت آشنا تھی۔ کم بخت کس قدر جوان تھی۔ جوانی تھی کہ پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی، چہرہ گل انار کی مانند سرخ، آنکھوں میں ایک سمندار چمک۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور سلام کہا۔ میں نے بھی مزاج پرسی کی۔ اس کے قریب فردوزی تھی۔ ڈھلتی ہوئی جوانی بھی بعض اوقات کس قدر حسین ہوتی ہے۔ لانبی لانبی پلکیں، سرمئی آنکھیں، شرمیلی نگاہیں، بھولی صورت، سادہ چتون ——! ایک گجری اپنا آپ ہماری نگاہوں سے چھپائے اور سر جھکائے شاہ صاحب کے دیو قد کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہی تھی۔

میں اس کو دیکھنے کے لئے کسی بہانے سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ میری اس حرکت پر جھینپ سی گئی۔ جھکی ہوئی نگاہیں اور بھی زمین میں پیوست ہو گئیں۔ وہ دوسروں کی بہ نسبت قدرے صاف کپڑوں میں ملبوس تھی۔ گہرا سبز چوڑی دار پاجامہ اور اسی رنگ کا لانبا ڈھیلا کرتہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہرا بھرا تر و تازہ نوجوان بانکا پیڑ اگ رہا ہے۔ سڈول اعضا اور مناسب قد۔ بھری بھری باہیں۔ طاؤسی گردن! میں نے پہلے اُس کو بٹوت میں گوجروں کے ہمراہ نہ دیکھا تھا۔

اس عرصے میں شاہ صاحب دودھ اور مکھن کے متعلق آشاں سے طے کر چکے تھے۔ انہوں نے اس کے متعلق کچھ کہا بھی۔ مگر میں اپنی بدحواسی میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ شاید وہ کہہ رہے تھے۔ "لو بھائی۔ تازہ مکھن کھاؤ اور خالص دودھ پیو اور موٹے ہو جاؤ۔" شاہ صاحب بھی بڑے ظریف طبع واقع ہوئے ہیں۔ اتنا کہہ کر وہ تو اپنے خیمے کو چلے گئے اور گوجر بازار کی جانب لانبے لانبے ڈگ بھرتے رخصت ہوئے۔ مجھ کو محسوس ہوا کہ ان میلے کچیلے گوجروں کے ننگے قدموں سے مجھ میں سے کوئی چیز نکل کر لپٹ گئی ہے۔ صفدر بھائی سے میں نے کہا کہ آپ خیمے میں چلیں میں ذرا ڈاک دیکھ آؤں۔ مگر وہ کب میرا پیچھا چھوڑنے والے تھے۔ ایک بے معنی سی مسکراہٹ کے ساتھ میرے ساتھ ہی چل دیئے۔

بازار میں حلوائیوں کی دکانوں پر گوجر دودھ مکھن بیچ رہے تھے۔ میری آنکھیں اس حسن مجسم کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ اچانک وہ مجھے گردھاری کی دوکان پر نظر آئی۔ گردھاری مجھ سے اچھی طرح سے واقف تھا۔ میں نے صفدر بھائی کو ڈاک خانے کی جانب رخصت کیا اور خود تیزی سے گردھاری کی دکان کی جانب مڑا۔ اس نے مجھے خوش آمدید کہا۔ اور آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے کہا تم ذرا گوجروں سے فارغ ہو لو تو بات کروں۔ وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

میری نگاہیں اس شرمیلے چہرے پر جم گئیں۔ اس کی آنکھیں بہت کم اُٹھتی تھیں اور وہ ایک کونے میں خاموش بیٹھی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک سنگ مرمر کا بت ہے جس کو پہاڑی بوسیدہ لباس پہنا دیا گیا ہو جس خاموش

بھی کسی قدر اظہار سے لبریز ہوتا ہے۔ اس کی پر اسرار خاموشی کہہ دیتی تھی کہ وہ میری گستاخ نگاہوں کو قطعاً پسند نہیں کرتی۔ میں اس کی جانب لگا تار دیکھا کیا اور وہ لگا تار نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ اتنے میں گردھاری نے اس کا دودھ ناپ کر اُس کو آواز دی "کیلی!" اُس آواز نے حُسن کو اپنے لطیف اور پُر کیف خواب سے چونکا دیا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور اپنے برتن اٹھا کر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ رخصت ہو گئی۔

گردھاری میرا پرانا رازدار تھا۔ اس کے قریب بیٹھ کر میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا "اس کا نام کیلی ہے؟"

اُس نے متعجب ہو کر کہا "ہاں! —— کیوں؟"

"کیلی! —— کیلی!! کس قدر انگریزیت تھی۔ اسی نام کے ایک دستخط ہمارے کرنسی نوٹوں پر بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان کی کچھ قیمت ہوتی ہے اور وہ انمول تھی۔

"خیر تو ہے؟"

"کیا تمہاری اس کے ساتھ لاگ، (معاہدہ) ہے؟"

"جی ہاں!"

"دیکھو گردھاری" میں نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا" بس اُس سے دودھ اور مکھن لینا چاہتا ہوں۔ تم اس کی لاگ ترک کر دو"۔

"بابو۔ وہی پرانی عادت!" گردھاری نے قہقہہ لگایا۔

"چُپ —— بھئی دو مٹکیاں تو ہمارے خیمے میں بھجا دو اور یہ لو دو مہینے کا پیشگی کرایہ"۔ کرایہ لیتے ہوئے گردھاری مسکرایا اور بولا "بابو جی ہم تمہاری کھاتر لاگ بھی چھوڑ دیں گے"۔

صفدر بھائی سے میں بہت بے تکلّف ہوں۔ خیمے میں واپس آ کر میں نے اُن سے صاف صاف کہہ دیا وہ مذاقاً کہنے لگے "تم بھی عجیب دل پھینک واقع ہوئے ہو۔ جہاں کوئی جوان لڑکی دیکھی اُسی کو آسمانی حور سمجھ بیٹھے۔ ارے بھائی یہ سب جوانی کے کرشمے ہیں۔ جب تم میری طرح اس طوفانی عمر سے گذر جاؤ گے تو طبیعت صاف ہو جائے گی"۔

میں نے عرض کیا "مولانا وعظ و پند کا شکریہ! آپ غالباً انگلینڈ میں بھی درس و تدریس کا شغل رکھتے ہوں گے۔ وہ جینی والاقصہ، وہ فرانسیسی لڑکی والا معاملہ اور وہ سکاچ حسینہ کے خطوط اور تصویریں تو غالباً اسی واعظانہ طرزِ کلام ہی کی وجہ سے ہیں"۔

وہ زور سے ہنس دیئے اور کہا "بھائی خواہ مخواہ خفا کیوں ہو رہے ہو؟

تم جوان ہو۔ ابھی ان باتوں کی عمر ہے۔ کوشش کئے جاؤ۔ خدا کارساز ہے۔ ہماری بزرگانہ دعائیں تمہارے شاملِ حال تو ہیں ہی —— بس!" اس کے بعد بھی وہ دیر تک مذاق کرتے رہے"۔ حیرانی ہے کہ تمہیں عشق بھی ہوا تو ایک میلی کچیلی گجری سے"——

پھر شرارتاً "تمہیں تو آشاں اچھی لگتی ہے۔ پہلوان کا پہلوان اور عورت کی عورت۔ یار بڑی جوان ہے۔ کم بخت خون کی جھیل ہے"۔

رات کو جب میں چارپائی پر لیٹا تو دل بے چین تھا اور طبیعت مضطرب، آدھی رات گئے آنکھ لگ گئی۔ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر سڑک پر اُترا تا کہ کیلی کو ایک نظر دیکھ سکوں۔ گھنٹہ بھر انتظار کے بعد گوجر آئے۔ میں نے ان کو روکا اور دودھ مکھن کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ کچھ تو گذر گئے باقیوں کو میں نے روک رکھا۔ آشاں دودھ دینے ہمارے خیمے کو چلی گئی۔ میں مُصر تھا کہ تم مکھن لاتے ہو اور چُھپا لے جاتے ہو، وہ بے چارے انکار کرتے جاتے تھے اور میں اُن کے سروں سے برتن اُتروا اُتروا کر ان کی تلاشی لے رہا تھا۔ جن کے برتن میں دیکھ چکا وہ بازار کو چلے گئے۔ باقی کیلی، ایک ادھیڑ عمر گوجر اور ایک چھوٹا لڑکا رہ گئے۔ نہ جانے کس قدر کوشش کے بعد میں کیلی سے نظریں ملائے بغیر بولا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہارے پاس مکھن ضرور ہے!"

وہ خاموش تھی۔ مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اس کے ساتھ دوسرے گوجروں کا سا سلوک کرتا اور اس کی بھی تلاشی لیتا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھ کر دوبارہ کہا۔

"کیلی تمہارے پاس مکھن ضرور ہے!"

وہ بدستور خاموش تھی۔ اتنے میں وہ گوجر بولا۔

"کیلی بولتی کیوں نہیں۔ اگر تیرے پاس مکھن ہے تو بتا دے۔ بابو جی سے دام بھی زیادہ ملیں گے، اور نقد بھی ملیں گے"

میں نے جرأت کر کے کہا۔ "اگر آج نہیں تو کل ضرور لانا۔ تم جس قدر بھی مکھن یا دودھ لاؤ گی۔ میں خرید لوں گا"۔

اس نے نہایت آہستہ آواز میں کہا "جی میری لاگ، گردھاری شاہ سے ہے"!

میں نے کہا "میں گردھاری سے دام زیادہ دوں گا۔ تم لاگ چھوڑ دو"۔

وہ بدستور نگاہیں زمین پر گاڑے خاموش کھڑی تھی میں دھڑکتے

ہوئے دل سے اس کے زیادہ قریب ہو گیا اور یقین دلاتے ہوئے کہنے لگا "میں واقعی اُس سے دام زیادہ دوں گا"۔

وہ شرما گئی اور پہلی بار اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ میرے بدن میں بجلی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"میں کبھی کبھی آیا کرتی ہوں" اُس نے قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جب بھی تم آؤ ہمیں دودھ دیا کرو" میں مُصر تھا۔ ساتھ ہی میں نے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کے سامنے پھینک دیا۔ میرا خیال تھا کہ گوجر بہت لالچی لوگ ہوتے ہیں۔ اور پیشگی ہی ایک ایسی چیز ہے جو ان کو لاگ ترک کرنے پر اکسا سکتی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ کیلی ضرور اس جال میں پھنس جائے گی۔ مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب معاملہ قطعاً اس کے برعکس ہوا۔ اس کا چہرہ غصّے سے تمتما اٹھا۔ اور اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"میں دودھ نہیں لایا کرتی"، وہ جانے لگی۔

"تو اور جو کچھ بھی لاتی ہو وہی سہی" میں نے اس کا راستہ روک کر کہا۔

"میں کچھ بھی نہیں لایا کرتی اور میں کبھی نہیں آیا کرتی"۔ اس نے چیں بجبیں ہو کر تنفّر میں ڈوبے ہوئے یہ الفاظ کہے۔ ادھیڑ عمر گوجر بار بار کیلی کو سمجھا رہا تھا۔ کہ نوٹ لے لو ——— جب گردھاری شاہ سے دام بھی زیادہ ملتے ہیں اور روپے بھی پیشگی ملتے ہیں تو تمہیں اور کیا چاہیئے! اس پر کیلی ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اُس سے مخاطب ہوئی۔

"گلا بُو تمہیں میرے معاملے میں دخل دینے کا کیا حق ہے!" اتنا کہہ کر وہ غصّے میں چل دی۔

اس سے پیشتر میرا خیال ان غریب گوجروں کے متعلق کچھ اور ہوا کرتا تھا۔ مگر اس واقعے نے مجھے بتا دیا کہ ان میں حقیقی معنوں میں اخلاق موجود ہے۔ کیلی واقعی ایک با اخلاق اور با عصمت گجری تھی۔ گو اس کے اس رویّے پر مجھے رہ رہ کر غصّہ آ رہا تھا۔ مگر اس کی سچی قدر میرے دل میں مستحکم ہو گئی۔

ہر صبح اور دوپہر کو سڑک پر جا کر گوجروں سے باتیں کرنا میرا معمول ہو گیا تھا۔ کیلی ہمیشہ نظریں جھکائے خاموشی سے گذر جایا کرتی تھی۔ شاید میں اسے ناپسند تھا۔

ایک دن شام کے قریب میں آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آہیں بھرتے معلوم ہوتے تھے۔ میری روح پر ایک عجیب سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ سورج دور پہاڑ کے پیچھے ڈوبا ہی چاہتا تھا۔ شام کا پہلا ستارہ افق پر نمودار ہو چکا تھا۔

کیلی کا خیال میرے دل و دماغ پر مسلط تھا۔ باوجود ہزار کوشش کے اس روز کا اداس کرنے والا واقعہ میری نگاہوں کے سامنے پھر جاتا تھا۔ آخر کیلی جیسی غریب لڑکی میلے کچیلے گوجروں کے ساتھ رہنے والی اس قدر مغرور کیوں ہے؟ اگر اس کی زندگی کا واحد مقصد دودھ مکھن بیچنا ہی ہے تو پھر وہ خصوصاً میرے پاس دودھ بیچنے سے کیوں انکار کرتی ہے؟ ..... میں انہیں خیالات میں غرق تھا کہ معذر بھائی ڈاک لے کر آئے۔ ڈاک دیکھ کر کھانا کھایا اور کچھ دیر گپ شپ کے بعد چارپائی پر پڑ کر سو رہے۔

دوسرے دن میں حسب معمول گوجروں کے انتظار میں سڑک پر جا کھڑا ہوا۔ گوجر آئے تو آشتاں نے اشارے سے مجھے علیحدہ بلایا میں اُس کے اس غیر معمولی رویّے پر بہت حیران ہوا۔ علیحدگی میں اُس نے مجھ سے کہا۔

"بابو جی ایک بات مانئیے گا؟"

"ضرور" میں نے بے تاب ہو کر کہا۔

"گردھاری نے کیلی کی لاگ چھوڑ دی ہے"۔ اس نے افسوس کے لہجے میں کہا۔

"تو پھر ——— میں ——— کیلی!" میں حیران تھا کہ کیا کہوں۔

"اگر آپ مہربانی کریں تو کیلی کا دودھ بھی خرید لیا کریں"۔

"اور مکھن بھی اور لسّی بھی۔ اور ——— جو کچھ بھی وہ لایا کرتی ہے"۔ میں جذبات کی رَو میں بہہ گیا۔

وہ حیران ہو کر میرا منہ تک رہی تھی۔ میں نے جذبات پر قابو پا کر کہا۔

"ضرور۔ ضرور ہمیں پہلے ہی زیادہ دودھ کی ضرورت تھی"۔

"وہ بے چاری غریب ہے۔ اس کا بھلا ہو جائے گا!"

"تو وہ آج بھی دودھ لائی ہے؟"

"وہ آج نہیں آئی۔ اس کا دودھ میں لائی ہوں۔ وہ خود آپ کے پاس آتے ہوئے شرم محسوس کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ میں نے ان کے اصرار کے باوجود دودھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اب کس منہ سے یہ درخواست لے کر جاؤں"۔

"بھلا اس میں شرمانے کی کونسی بات تھی ——— چلو اس کا دودھ نوکر سے تلواؤ۔ کل اس سے کہنا کہ خود آئے اور جس قدر دودھ مکھن ہو لے آئے ——— پیسے نقد ملیں گے ——— پیشگی چاہیئے؟"

"اگر آپ چاہیں تو دے سکتے ہیں"!

میں نے جھٹ ایک روپیہ نکال کر اس کو دے دیا۔ وہ مجھے کل کے انتظار میں چھوڑ کر چلی گئی۔

صفدر بھائی اپنے خیمے سے چلا چلا کر کہہ رہے تھے۔ "ارے بھائی اتنے دودھ کی کیا ضرورت ہے؟"

میں جھٹ ان کے پاس گیا اور خوشی سے ناچتے ہوئے کہا۔ "کیلی ــــ! اب کیلی دودھ دینے آیا کرے گی۔" انہوں نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔ "تم بڑے بدمعاش ہو۔ آخر تم ضد کے پکے نکلے۔ (پھر انگڑائی لے کر) تو لو بھائی آج منہ میٹھا تو کرا دو۔ آج تو تمہاری عید ہے نا؟"

رات بھر کیلی کے خیال میں نیند نہ آئی۔ صبح ناشتے کے بعد ڈاک دیکھنے گیا۔ واپسی پر گوجر ملے آج کیلی بھی ان کے ہمراہ تھی۔ مگر اس کے سر پر کوئی برتن نہ تھا۔ خیمے میں پہنچنے پر نوکر نے کہا۔ "بابو جی آج تو بہت سا مکھن مل گیا ہے۔"

وہ کیسے؟

"آشاں اور اس کے ساتھ والی۔ آج دونوں مکھن لائی ہیں۔"

"ساتھ والی ــــ ساتھ والی کون؟"

"بابو جی وہی جوان سی خوبصورت گجری۔" پھر رک کر "جس کو آپ غور سے دیکھا کرتے ہیں۔"

میں بظاہر سنجیدگی سے کرسی پر کتاب لے کر بیٹھ گیا۔ مگر دل کو ہر ہر لمحہ انتظار قیامت نظر آ رہا تھا۔ اتنے میں صفدر بھائی بھی انگڑائیاں لیتے پاس ہی آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئے اور لگے اونچے سُروں میں گانے۔

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں"۔

اُن کی آنکھوں میں شرارت آمیز چمک تھی اور وہ بار بار کنکھیوں سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ بظاہر میں اُن کی جانب سے قطعاً بے خبر تھا۔ مگر ان کی موجودگی کا ہر لمحہ مجھ پر شاق گذر رہا تھا۔ میں نے وقت کاٹنے کو کہا۔

"بھائی جان ہم جب سے آئے ہیں۔ ایک دفعہ بھی تو پکنک پر نہیں گئے۔"

"بھائی جان آپ جب بھی چاہیں ہم جا سکتے ہیں۔" وہ طنزاً کہنے لگے۔ "مگر مشکل تو یہ ہے کہ آپ کو عشق کے دھندوں سے ہی فرصت کم ملتی ہے۔ پکنک کے لئے کیا خاک وقت نکلے؟"

اتنے میں باہر آشاں کی آواز آئی۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو اس کے ساتھ کیلی بھی تھی۔ وہی خاموش، حسین اور مغرور کیلی۔ صفدر بھائی نے بھی جھانکا۔ اور کچھ کہے بغیر باہر نکل آئے۔ میں بھی اٹھ کر ان کے پیچھے باہر آ گیا۔ کیلی نے مجھے دیکھ لیا۔ مگر تجاہل سے نگاہیں پھیر کر باورچی خانے کے پاس بیٹھ گئی۔ جب تک وہ بیٹھی رہی اس نے شاید ایک بار بھی نگاہ اُٹھا کر نہ دیکھا۔

اب کیلی آشاں کے ہمراہ ہر روز آیا کرتی۔ میں ذرا محتاط ہو گیا تاکہ کیلی کا حجاب آہستہ آہستہ اٹھایا جا سکے۔ دو ایک دفعہ میرے اشارے پر باورچی نے انہیں کھانا بھی کھلا دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایک دن باورچی خانے میں مرغ بھن رہا تھا۔ اُس کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ کیلی کی پیاری پیاری آنکھیں بے اختیار باورچی خانے کی جانب اُٹھ گئیں۔ میں نے باورچی کو آواز دے کر کہا کہ ایک بڑی پلیٹ میں مرغ نکال کر لائے۔ پہلے تو انہوں نے کچھ جھجک محسوس کی پھر میرے ــــ اور صفدر بھائی کے بزرگانہ اصرار پر انہوں نے نوالے اٹھائے۔ میں جان بوجھ کر خیمے میں چلا گیا تاکہ وہ حجاب محسوس نہ کریں۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا تو دونوں کمال اشتہا کے ساتھ کھا رہی تھیں۔ میرے دل کو ایک گونہ مسرت حاصل ہوئی۔ شاید ان بے چاریوں نے زندگی میں پہلی بار مرغ کھایا ہوگا۔

کیلی اور آشاں کو پیسے ہم پیشگی ہی ادا کر دیا کرتے تھے اور دام بھی قدرے بازار سے زیادہ دے دیا کرتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اکثر گوجر دودھ اور مکھن ہمارے پاس فروخت کرنا بہتر خیال کرنے لگے۔ ہم بھی جس قدر مکھن ملتا خرید لیتے۔ کیونکہ اب کئی ہمارے دوست اور واقفکار ہم سے مکھن خریدا کرتے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ مکھن کا ذخیرہ ہمارے ہاں سے ہی ملے گا۔ دوپہر کے وقت ہمارے خیموں کے سامنے بعض وقت بیس بیس پچیس پچیس گوجر اور گجریاں بیٹھی ہوتیں۔

ہم اُنہیں مختلف چیزیں کھانے کو دیتے۔ پھل وغیرہ کھلاتے ــــ یہ سب کیلی کی بدولت تھا۔ آتے جاتے ہمارے ہاں رُک جانا اب گوجروں کا معمول ہو چکا تھا۔ ہم مذاق سے ان کو اپنی برادری کہا کرتے تھے۔ گلابو، للو، آشاں، شاہی، درمیراں، رجیا، روزی اور ــــ کیلی کیا مرد اور کیا عورتیں۔ سب کے سب ہمارے حلقۂ احباب میں شامل ہو گئے۔ وہ ہم سے کچھ اس طرح بے تکلف ہو گئے کہ بے دھڑک ہمارے ساتھ چارپائیوں پر اور ہمارے برابر کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ خود بخود باورچی خانے میں گھس کر کھانا نکال لینا تو شاید ان کے لئے کوئی بات ہی نہ تھی۔ دو ایک دفعہ باورچی بھی ان سے بگڑا مگر میں نے اس سے کہہ دیا کہ وہ آئندہ اُن سے کوئی تعرض نہ کیا کرے۔

باوجود ان تمام باتوں کے کیلی کو مجھ سے نہ کھلنا تھا نہ کھلی۔ میں جس قدر اس کی طرف جھکتا اسی قدر وہ مجھ سے کھنچی رہتی۔ وہ عام گوجروں سے بھی بے تکلف نہ تھی۔ صرف درمیراں ہی ایک ایسی عورت تھی جس سے وہ ذرا

بے تکلف تھی۔ اس کے ساتھ میں نے اس کو دو ایک بار ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے دانت کس قدر پیارے تھے!

لالو ایک ایسا مرد تھا جو مجھ سے دوسروں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گیا۔ وہ ایک اونچا لانبا وحشی سا انسان تھا جسم پر میلا سا کرتہ اور کمر میں لنگوٹ باندھے رکھتا۔ وہ مجھ سے مذاق کرتا ہاتھ پر ہاتھ مارتا۔ اگر میں خیمے میں لیٹا ہوتا تو چارپائی پر پاس آ کے بیٹھ جاتا۔ اور بڑے عاشقانہ انداز میں مزاج پرسی کرتا۔

ایک دن میں یوں ہی کیلی کے خیال میں لیٹا ہوا تھا اور باہر گوجر کشتی لڑ رہے تھے۔ لالو اندر آیا اور چارپائی پر بیٹھ کر کہنے لگا۔

"آپ اداس کیوں رہتے ہیں؟" میں نے اُسے ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ کسی طرح ٹلتا نظر نہ آتا تھا۔ میں نے کہا "تمہیں اس سے کیا مطلب"؟

"بابوجی ایک بات کہوں؟" اس نے نہایت معصومانہ انداز میں پوچھا۔

"کہو!"

"آپ یقین کریں گے؟"

"کیوں نہیں؟"

"مجھے آپ بہت اچھے لگتے ہیں"، اس نے اپنے کانپتے ہوئے موٹے موٹے ہونٹوں سے اظہار محبت کیا۔ اس کی آواز میں جو لرزش تھی وہ کہے دیتی تھی کہ وہ سادہ، گنواروں والے الفاظ واقعی اس کے پاک دل کی عمیق گہرائیوں سے نکلے ہیں۔ میں نے اس کا چوڑا کرخت ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ وہ میرے اعتراف کو سمجھ گیا۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"آپ کی کیلی پر دلیل ہے —— مجھے معلوم ہے"۔ اس پر تہذیب حاضرہ کا وہ رنگ جس کو ریاکاری کہتے ہیں ابھی نہ چڑھا تھا۔ سادگی اس کا جسم تھا اور سادگی ہی اس کی روح۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بہت ہنسا اور میرے لئے کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔

دوسرے روز اس نے مجھے سکھایا کہ آپ لدھے کی دھار دیکھنے کے بہانے ہمارے ہمراہ چلیں۔ راہ میں ملاقات کا موقع پیدا کروں گا۔ اُسی وقت میں نے چلا کر گوجروں سے کہا۔ "سنا ہے تمہاری دھار بہت خوبصورت جگہ ہے۔ اگر دکھا دو تو مہربانی ہوگی۔"

لالو نے چلا کر کہا "آپ ہمارے ساتھ ابھی چلیں۔ ہمارے ہاں چل کر مہمان رہیں۔ ہم آپ کے بستر اٹھا لیں گے"۔ "ضرور چلئے قطعاً کوئی تکلیف نہ ہوگی"۔ سب گوجر متفق تھے۔ صرف ایک کیلی تھی جس نے مسرت کا اظہار نہ کیا وہ بدستور خاموش تھی۔ چونکہ اب تک کیلی کے متعلق میری کیفیت سے تمام گوجر آگاہ ہو چکے تھے اس لئے میں نے جرأت کر کے کہا "اگر کیلی کی خوشی نہیں تو ہم نہیں جائیں گے"۔

آشاں اور درمیراں نے کیلی سے رائے پوچھی، اس نے بے پروائی سے مختصراً کہا۔

"مجھے نہیں معلوم"۔

کیلی کی اس بے رخی نے مجھے رنجیدہ کر دیا۔ مگر لالو کے اصرار پر ہم دوسرے روز جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ دوسرے دن تمام گوجر بازار سے واپسی پر ہمارے خیمے میں پہنچ گئے۔ مختصر بستر، کیمرہ اور دوربین لے کر ہم اُن کے ساتھ ہو لئے۔

قریباً دو میل چلنے کے بعد ہم جنوبی پہاڑ سے مغربی پہاڑ پر پہنچے۔ جہاں سے بہت گھنا جنگل شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں پر ایک تو کچی سڑک محکمۂ جنگلات کے زیر اہتمام ہے اور دوسری پگ ڈنڈی ہے جو گوجروں کے ننگے پاؤں کی مرہون احسان ہے۔ یہ پگ ڈنڈی گو نسبتاً جنگلات کی سڑک سے مختصر ہے۔ لیکن اُس سے کہیں زیادہ غیر ہموار اور دشوار گذار ہے۔ دس میل تک برابر چڑھائی ہی چڑھائی ہے۔ اکثر جگہ پگ ڈنڈی اس قدر تنگ ہے کہ مشکل سے ایک آدمی ایک وقت میں گذر سکتا ہے۔ چنانچہ اس پر گوجر لوگ قطار باندھ کر چلتے ہیں۔

لالو نے پہلے ہی یہ انتظام کر دیا تھا کہ کیلی اور میں آگے پیچھے چلیں۔ بھائی صفدر میرے پیچھے پیچھے تھے۔ ہم انگریزی میں باتیں کرتے جاتے تھے۔ لالو میرا ہیبٹ یعنے ہماری نقل اتارتا جاتا تھا۔ کیلی خاموش چلی جا رہی تھی میں نے اس سے بات چیت کرنے کی بہت کوشش کی مگر سوائے گاہے گاہے مسکرانے کے اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ دوسرے گوجروں کی طرح نہایت تیز رفتار تھی۔ چند میل چلنے کے بعد میرا تھکن سے یہ حال تھا کہ پنڈلیاں مارے درد کے پھٹی جا رہی تھیں۔ بہت جی چاہا کہ راہ میں دم لینے کو بیٹھ جاؤں۔ مگر ہیکڑی کی وجہ سے بے چون و چرا چلا جا رہا تھا۔ کم بخت کیلی ایک ہی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔

یکایک پگ ڈنڈی کی بائیں طرف قدرے ایک فراخ جگہ پر یہ مختصر سا قافلہ رُک گیا۔ یہاں ایک صاف شفاف پانی کا چشمہ اُبل رہا تھا۔ یہ گوجروں کی عارضی آرام گاہ تھی۔ سب نے برتن اتار کر رکھ دیئے اور سستانے بیٹھ

گئے۔ ہماری بھی جان میں جان آئی۔ لالو مسکراتا ہوا میری جانب آیا اور میری ٹانگیں دبانے لگا۔ صفدر بھائی پسینہ پونچھتے ہوئے بولے۔ "لالو ابھی کتنے میل اور باقی ہیں؟"

"بس دو چار میل!" اس نے جواب دیا۔

سب گوجروں نے چشمے سے پانی پیا۔ ایک ہی برتن تھا کیلی کا بچا ہوا پانی لالو نے مجھے بھی تبرکاً پلا دیا۔ کیلی بدستور خاموش تھی۔

یہاں پر ہم نے کیلی کی بے خبری میں اس کی ایک تصویر بھی اتار لی۔ اس کے بعد سب گوجروں کی تصویر اتاری جس میں کیلی نے شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ لالو میرا ہیٹ پہنے درمیان میں کھڑا تھا۔ جب گوجر آگے جانے کو تیار ہوئے تو میں نے بڑھ کر کیلی کے برتن اٹھا لئے۔ کیلی نے بہت اصرار کیا مگر میں نے کہا۔

"تمہیں کیا حق ہے کہ تم اکیلے ہی ان کو اٹھاؤ"۔ اس پر وہ مسکرا کر خاموش ہو گئی اور اس نے زمین پر سے میری دوربین اٹھالی اور سب گوجروں سے آگے نکل گئی۔ میں بھی ہمت کر کے اس کے پیچھے جا پہنچا۔ اس نے ہنس کر کہا۔ "آپ مجھے بہت ستاتے ہیں"۔ میں دل میں کہہ رہا تھا "کیلی اور مجھ سے مسکرا کر بات کرے"!

میں نے محسوس کیا کہ اب کیلی پہلے کی طرح مجھ سے گریزاں نہیں۔ میں اس سے کھلم کھلا اظہار محبت کرتا جاتا تھا۔ اور وہ مسکراتی جاتی تھی۔ وہ منہ سے کچھ نہ کہتی تھی۔ شاید وہ کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ کچھ دیر چلنے کے بعد میں نے سب گوجروں کو آواز دے کر کہا۔ "آؤ تمہیں انگریزی سکھائیں"۔

"جرور جرور!!" کئی آوازوں سے جنگل گونج اٹھا۔

"گڈ مارننگ" میں نے ان کو اپنے پیچھے کہنے کو کہا۔

"گڈ مارنی" سب بہ یک آواز بولے۔

"مائی ڈارلنگ"

"مائی ڈارلیں"

"کس می"!

"کسیں"!

"گڈ مارننگ۔ مائی ڈارلنگ کس می"!

"گڈ مارنی۔ مائی ڈالیس کس ہیں"!

میں نے کیلی کی طرف کان لگائے۔ اللہ اکبر! وہ بھی وہ کچھ کہہ رہی تھی جسے اگر وہ سمجھتی تو شاید کبھی نہ کہتی۔ اب میں نے کہا۔

"تم میں سے بعض غلط کہتے ہو۔ سب علیحدہ علیحدہ سناؤ"۔ سب نے میرے حکم کی تعمیل میں باری باری سے اپنا سبق سنایا۔ اب کیلی کی باری آئی اس نے چلتے چلتے میری جانب مڑ کر دیکھا۔ اس کے سرخ ہونٹوں پر ایک حسین مسکراہٹ کھیل رہی تھی، ایک نہایت سریلی اور شرمیلی آواز سے میرا سازِ دل گونج اٹھا۔

"گڈ مارننگ۔ مائی ڈارلنگ۔ کس"! کس کے بعد اس نے میری جانب استفسارانہ نگاہوں سے دیکھا میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "کس می"!

"کس می"! ایک بار پھر میرے دل کے تار لرز اٹھے۔ میں نے اس سے بار بار سنا۔ اس نے مجھے بار بار سنایا۔ جنگل کی فضا لہراتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جب اس کے ہونٹوں سے کس می نکلتا تھا تو میرا جی چاہتا تھا کہ بے اختیار ہو کر اس کے رس بھرے ہونٹ چوم لوں ——— میں نے اس سے کہا کہ وہ ہر روز مجھے یہ سبق سنایا کرے۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر خاموش ہو گئی۔

گوجر لگاتار سبق دہراتے رہے۔ کیلی بھی کبھی کبھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی۔ آخر وہ مقام آ گیا جہاں سے ہمارے راستے علیحدہ علیحدہ سمتوں میں جاتے تھے۔ اس جگہ ہم سب ٹھہر گئے۔ کیلی نے مجھ سے برتن لے لئے اور دوربین میرے حوالے کر دی۔ دوربین نکال کر میں نے سب کو دکھائی۔ بٹوت اس جگہ سے صاف نظر آ رہا تھا۔ سب نے بڑے اشتیاق سے اس عجوبے کو دیکھا۔ کیلی نے بھی دوربین ہاتھ میں لی۔ جونہی وہ دوربین کو آنکھوں کے نزدیک لے گئی۔ اس نے فوراً ڈر کر ہٹالی۔ میرے کہنے پر اس نے پھر آنکھوں سے لگائی۔ اس دفعہ اس کے پیارے پیارے ہونٹوں پر ایک حسین مسکراہٹ اس آلے کے موجد کی ذہانت کی داد دے رہی تھی۔ دوربین میں وہ کوئی چیز تلاش کر رہی تھی۔ اچانک ایک جگہ دوربین رکی اور اس نے کہا۔ "وہ آپ کا خیمہ" میرا دل چاہتا تھا کہ وہ یوں ہی کہتی رہے اور میں یوں ہی سنتا جاؤں۔ وہ یونہی دوربین دیکھتی رہے اور میں یوں ہی اس کو دیکھتا رہوں۔

چونکہ تاریکی پھیل رہی تھی اس لئے گوجر جانا چاہتے تھے۔ ہم ان سے صبح سویرے دھار پر آنے کا وعدہ کر کے سناسار کی جانب رخصت ہوئے ابھی چند ہی قدم چلے تھے کہ کیلی کی آواز آئی۔

"ڈارلنگ کس می"! تلفظ بلا کا صاف تھا۔ صفدر بھائی نے میری جانب مڑ کر دیکھا تو میری آنکھوں میں مسرت کے آنسو چھلک رہے تھے۔

سناسار پہنچنے پر ہم تکان سے چور تھے۔ ڈاک بنگلے میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ کھانا جو ساتھ لائے تھے۔ کھایا اور نیند کے غلبے نے چارپائی پر ڈال دیا۔ صبح آنکھ کھلی تو نو بج چکے تھے دل کا خون ہو گیا۔ میں نے حیرت سے کہا۔ "گوجر تو کب کے دھار سے چل چکے ہوں گے۔ صفدر بھائی کی منتیں کر کے بٹوت کو واپس ہوئے۔ آتی دفعہ اُترائی کی وجہ سے مسافت بہ آسانی طے ہو گئی۔ بٹوت پہنچنے پر نشیبر سے معلوم ہوا کہ کیلی نہیں آئی تھی اور آشاں اس کا مکھن اور دودھ لائی تھی۔ دوپہر کو جب گوجر حسبِ معمول ہمارے خیمے میں آئے تو درمیراں جو اب میری رازدار بن چکی تھی۔ میرے پاس آ کر کہنے لگی۔

"کیلی تو آپ کے لئے نہیں آئی۔ ہمارے آنے تک وہ آپ کی منتظر تھی۔ وہ کہتی تھی وہ ضرور آئیں گے کیونکہ انہوں نے وعدہ کیا تھا۔ اگر ہم سب چلے گئے تو ان کو پوچھنے والا کون ہو گا۔

"کیا یہ سچ ہے؟" میں نے از حد حیران ہو کر اُس سے پوچھا۔

وہ کہنے لگی۔ "وہ تو آپ کو بہت اچھا سمجھتی ہے۔ اور بہت یاد کرتی ہر اکثر آپ کی تعریف کرتی ہے۔ رات کو میرے قریب ہی تو سوتی ہے۔ رات گئے تک آپ کی باتیں کرتی رہتی ہے"۔

مجھے ان میں سے ایک بات کا بھی یقین نہ آسکتا تھا۔ کیونکہ کیلی کا طرزِ عمل ان باتوں کے قطعی برعکس تھا۔

• ایک دن درمیراں نے مجھ سے علیحدگی میں کہا۔

"کیلی آپ سے الگ ملنا چاہتی ہے!"

"کیا وہ کیلی جو لدھے کی دھار کی شہزادی ہے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"جی ہاں وہی کیلی، جس کو آپ سے بہت محبت ہے۔ جو آپ کو دل سے چاہتی ہے" اُس نے جواب دیا۔

"اور میراں جو کچھ تم کہہ رہی ہو خود بھی سمجھ رہی ہو؟"

"اگر آپ کو یقین نہیں تو آج ہی اس سے مل کر دیکھ لیں"۔

"آج ہی!!!"

"ہاں آج ہی" اس نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"کب؟"

"واپسی پر"

"۔۔ کیسے ــــــ ؟ گوجر تمہارے ہمراہ ہوں گے"۔

"آپ ایسا کیجئے۔ ہمارے آنے سے پہلے ہی ہماری راہ میں جنگل میں جا بیٹھئے۔ ہم آج دوسروں سے پہلے ہی آجائیں گی اور آپ سے آ کر مل جائیں گی"۔

میں مبہوت اُس کی ناقابلِ یقین کرنے والی باتوں کو سن رہا تھا۔ میں نے اپنی بیداری کا اپنے آپ کو یقین دلانے کے لئے اس سے پوچھا

"تو کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ کیلی بھی آئے گی"؟

"آپ اس قدر حیران نہ ہوں۔ میری بات پر عمل کیجئے اور پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے"۔

اُس دوپہر کو ہمارے ہاں کچھ مہمان کھانے پر مدعو تھے۔ میں اُن کے آنے سے قبل ہی کھسک گیا۔ صفدر بھائی اپنے خیمے میں "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" الاپ رہے تھے۔

میں ایک میل کے فاصلے پر جنگل میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس جگہ سے سڑک صاف نظر آ رہی تھی۔ یکایک وہ مجھے آتی ہوئی دکھائی دیں۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ جوں جوں قریب آتی جاتی تھیں میرا اشتیاق بڑھتا جاتا تھا میں دل میں سوچ رہا تھا۔ جب مجھے کیلی ملے گی تو میں اس سے کیا کہوں گا اور کیا وہ سچ مچ آئے گی۔

اچانک مجھے ان کے پیچھے پیچھے ایک گوجر بھی آتا دکھائی دیا۔ نالے کے پُل پر پہنچنے تک وہ کیلی اور درمیراں سے آگے نکل آیا۔ میں اس کی نگاہوں سے چھپنے کے لئے پگ ڈنڈی کے نیچے کی جانب اتر گیا۔ مگر وہ بہت قریب آچکا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا۔ میں نے اب چھپنا بے کار سمجھا اور واپس چڑھنا شروع کیا۔ اس کو کچھ شبہ ہوا اور وہ قریب ہی درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ مجھے اس کی یہ حرکت سخت ناگوار گذری۔ میں چاہتا تھا کہ ان کے آنے سے قبل ہی اس کو وہاں سے بھگا دوں۔ میں نے اُسے کرخت آواز میں پوچھا۔

"تم اتنے جوان ہو کر اس قدر جلدی تھک گئے۔ دھار تک کیسے پہنچو گے"؟

"اور تم نہیں تھک گئے ہو کیا؟" وہ گستاخ لہجے میں بولا۔

اتنے میں کیلی اور درمیراں آ پہنچیں۔ وہ اٹھا اور ان کو ساتھ چلنے کو کہا۔ درمیراں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم چلو ہم ذرا سستا لیں"۔ مگر اس کے اصرار پر مجھے غصہ آگیا اور میں کہنے سے نہ رہ سکا۔

"تم جاؤ تمہیں ان سے کیا؟"

"اور تمہیں ان سے کیا؟" وہ آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

میں نے غضب ناک ہو کر زور سے اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا۔ اس نے اپنی چھڑی مجھے مارنے کو اٹھائی۔ میں نے وہی چھڑی چھین کر دو تین اس کے جما دیں۔ کیلی اور درمیاں یہ دیکھ کر گھبرا گئیں۔ کیلی نے زور سے رونا شروع کر دیا۔ گوجر مار کھا کر بھاگا۔ میں نے اس کا تعاقب کیا تا کہ اس کو دور تک پہنچا آؤں۔ جب واپس آیا تو کیلی رو کر کہہ رہی تھی۔

"آپ نے میرے بھائی کو کیوں مارا؟"

"تمہارا بھائی؟" —— میں نے حیرانی سے کہا

"اگر آپ کو کوئی مارے تو؟" وہ اسی رونی آواز میں کہہ رہی تھی۔

میں نے خاموشی سے وہی چھڑی اس کے ہاتھ میں دے دی اور کہا "لو تم مجھے اُس سے بھی زیادہ مار لو"

اس کی سُرمگیں آنکھیں نم تھیں۔ اس کے دنداسے سے سُرخ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کے کپڑے میں نے کبھی اتنے صاف نہ دیکھے تھے۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ بنی سنوری ہوئی تھی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ہو نہ ہو یہ سب اہتمام میری ملاقات کی وجہ سے ہے۔ اُس وقت عجیب سماں تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو۔ اس کے ہونٹوں میں بھرّ بھرّا ہٹ۔ درمیراں اس کو بار بار چمکار رہی تھی۔

"چُپ ہو جا بیٹی۔ آخر اس نے بھی تو بابو کو گالیاں دی تھیں —— اور بابو کو اب معلوم تھا کہ وہ تمہارا بہنوئی ہے۔ کل شام ہی تو وہ جموں سے آیا تھا۔"

کیلی نے جب مجھے مار کھانے پر مصر دیکھا تو وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کی نم آلود آنکھیں وہ پیغام دے رہی تھیں۔ جس کو میرا رُواں رُواں سننے کے لئے عرصے سے بے تاب تھا۔

درمیراں نے اس کے برتن اٹھاتے ہوئے کہا "جاؤ بگ ڈنڈی سے پرے ہٹ کر بات چیت کر لو۔" وہ چلتے چلتے رُک کر کہنے لگی ——

"کیلی اب راتوں کو کبھی شکایت نہ کرنا کہ بابو سے ملنے کا موقع نہیں ملتا۔ لو میں چلتی ہوں۔" کیلی نے خاموشی سے پگڈنڈی کو چھوڑ کر اوپر کی جانب چڑھنا شروع کر دیا۔ میں بھی اُس ساحرہ کے پیچھے پیچھے ایک سحر زدہ کی طرح چلنے لگا۔ تھوڑی دور پگ ڈنڈی پر چلنے والوں کی نظروں سے اوجھل وہ ایک بڑی چٹان کے قریب رُک گئی۔ میں اُس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اس کا تنفّس تیز تھا، اور اس کا چہرہ سُرخ —— وہ نظریں جھکائے خاموش کھڑی تھی۔

وہی صبر آزما خاموشی اُن قیمتی لمحوں میں بھی اُس پر طاری تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے بلائے بغیر نہ بولے گی۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "کیلی!"

وہ خاموش تھی۔

"کیلی!!" میں نے دوبارہ اس کو مخاطب کیا۔

وہ سر جھکائے بدستور خاموش تھی۔

"کیلی!!!" میں نے مرتعش ہاتھ سے اس کی چاند جیسی ٹھوڑی کو چھوا، اس نے نگاہ اٹھائی۔ گویا ایک بجلی کوند گئی وہ ایک حسین مجسّمے کی طرح بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ میں بے خود ہو کر اُس سے لپٹ گیا۔ اور اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر مُہرِ محبت ثبت کر دی۔ وہ بید مجنوں کی طرح کانپنے لگی۔ اس کی نگاہوں میں غایت درجہ کی حیرت لبس رہی تھی۔ اس کی آنکھیں زبانِ خاموشی سے کہہ رہی تھیں۔ "اُس پُر سرور اور پُر کیف چیز کا نام کیا ہے؟"

کیلی کے بہنوئی کی کرخت صلواتوں نے مجھے اس رنگین خواب سے چونکا دیا۔ وہ سامنے کھڑا یہ تمام نظّارہ دیکھ رہا تھا۔ اور مجھے بے طرح کوس رہا تھا۔ میں نے جوش میں آ کر کیلی سے کہا۔

"اُس سے کہہ دو کہ چلا جائے۔"

آہ! وہ کس طرح کہہ سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے اس کی بے چارگی اور مجبوری عیاں تھی۔ وہ عورت تھی۔ وہ بغاوت کے لئے نہیں فرمانبرداری کے لئے پیدا کی گئی تھی —— دو رسڑک پر گوجر آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں موقع کی نزاکت کو بھانپ گیا۔ میں نے خاموش و مبہوت کیلی سے کہا "تو میں چلتا ہوں"۔ میں نے جب جانے کو قدم اٹھایا تو اس نے میری جانب حسرت بھری نگاہ اٹھا کر کہا۔

"بابوجی —— ! نہ جائیے!"

اس کے لہجے میں ایک دردناک استدعا تھی۔ اس کے انداز میں ایک دبی ہوئی گذارش۔ وہ محسوس کرتی تھی مگر اپنے احساسات کا اظہار نہ کر سکتی تھی۔ وہ فطرتاً خاموش تھی اور محبت کی سُلگتی ہوئی آگ بھی خاموش ہوتی ہے۔

میں بزدلوں کی طرح چمپت ہونا چاہتا تھا۔ میں نے جاتے ہوئے مڑ کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں برسات کی جھڑی لگ رہی تھی، اس نے بے بسی کے عالم میں میری جانب ہاتھ پھیلا کر کہا۔

"مجھے بھی ساتھ لے جائیے —— بابوجی!"

مگر میں اس شخص کی طرح بھاگ رہا تھا جس کے تعاقب میں موت ہو۔ میں دل و دماغ کی کھڑکیاں بند کر کے سرپٹ جا رہا تھا۔ بدنامی۔ رسوائی

سماج۔ گو جربہ سب بھوت چیختے ہوئے میرا پیچھا کر رہے تھے اور میں اُن سے رہائی پانا چاہتا تھا۔

میں نے سڑک پر آکر دم لیا۔ جب خیمے میں پہنچا تو مہمان جا چکے تھے۔ اور صفدر بھائی میرے منتظر تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ بے طرح بگڑے اور سخت سست کہنے لگے میں کچھ جواب دئے بغیر چارپائی پر جا لیٹا وہ خاموش ہو گئے

دوسرے روز صبح گوجر آئے۔ مگر کیلی نہ آئی اور نہ آشاں کے ہاتھ اس کا مکھن یا دودھ تیسرے روز بھی میں بے سود منتظر رہا کیلی کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ دن ہفتوں میں تبدیل ہو گئے۔ مگر کیلی نہ آئی۔ میری امید یاس میں بدل گئی۔ ایک دفعہ میں نے جرأت کر کے آشاں سے پوچھا تو اس نے مختصراً جواب دیا۔

"کیلی نہیں آئے گی!"

درمیراں، لالو، گلابو، سب کا یہی جواب تھا۔

"کیلی نہیں آئے گی!"

"کیوں؟" کا جواب ان کی دردناک خاموشی ہوا کرتی تھی۔

ستمبر کا اختتام آگیا۔ اکثر مسافر جا چکے تھے۔ صفدر بھائی بھی رخصت ہوئے۔ میں اکیلا اداس اور غمگین خیمے میں رہ گیا۔ میرا معمول تھا کہ ہر صبح گوجروں کو گذرتے دیکھتا۔ کیلی کو ان کے ہمراہ نہ پا کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ بے جان جسم ہیں۔ اُن کی روح پرواز کر چکی ہے۔ اب وہ اداس نظر آتے تھے۔ ان کی خوشی ان سے چھن چکی تھی۔ وہ میری جانب دیکھتے اور کچھ کہے بغیر پاس سے گذر جاتے۔

وسط اکتوبر تک ایک بھی مسافر بٹوت میں نہ رہا۔ مگر میں کسی گم شدہ بچے کی طرح سڑک پر گھومتا پھرتا تھا۔ میری آنکھیں کیلی کی منتظر تھیں۔ جنگل میں ہوا کی سائیں سائیں یہی کہتی معلوم ہوتی تھی۔

"کیلی نہیں آئے گی"۔

مسعود شاہد

غزل

بھول سکتی نہیں وہ بزمِ شبینہ ساقی
ہم کو جب آیا ہے پینے کا قرینہ ساقی

سر جھکاتے ہی یہاں کھلتے ہیں اسرارِ وجود
درِ میخانہ ہے یا عرش کا زینہ ساقی

زندگی تلخ مصائب کا رواں دریا تھی
دلِ مرحوم تھا نازک سا سفینہ ساقی

تیرے رندوں نے بڑھایا جو سفینہ ہنس کر
پھٹ گیا وحشتِ گرداب کا سینہ ساقی

ہم نشینی پہ اضافہ ہے ترا لطفِ نظر
رند رکھ سکتا ہے کب رند سے کینہ ساقی

تیرے ساغر سے جو ٹکرا گیا ساغر میرا
ہنس پڑی گویا کوئی شوخ حسینہ ساقی

ذرہ ذرہ نگہِ شوق کی رہ میں حائل
توبہ توبہ ترے پردے کا قرینہ ساقی

شکوۂ کم نگہی تجھ سے ؟ مگر کیا کیجے
تجھ کو آیا نہ محبت کا قرینہ ساقی

شوقِ نظارۂ فطرت ہے نہایت بے تاب
اشک خونیں ہیں نگاہوں کا پسینہ ساقی

عبدالعزیز فطرت

وقت کا راگ

مارچ میں جبکہ جواں کیفِ سحر ہو ہویدا — اس سے پہلے کہ بہاراں ہو چمن سے رخصت
سادگی شوخ ہوا سے گُلِ تر سے رونق — نکہت و ناز ہو ریحان و سمن سے رخصت
مست بھونروں کے جِلو میں ہو صبا محوِ خرام — اوس نے لی نہ ہو غنچوں کے دہن سے رخصت
پیشتر اس سے کہ ہو آگ بگولہ سورج — اور نادیدہ صباحت ہو کرن سے رخصت
پیشتر اس سے کہ سو جائے محبت میری — اور مایوس تمنا ہو وطن سے رخصت

مارچ میں ایسے ہی وقت، اے مرے دیرینہ ندیم
اے مرے دوست! مجھے رنج و محن سے دے رخصت

(۲)
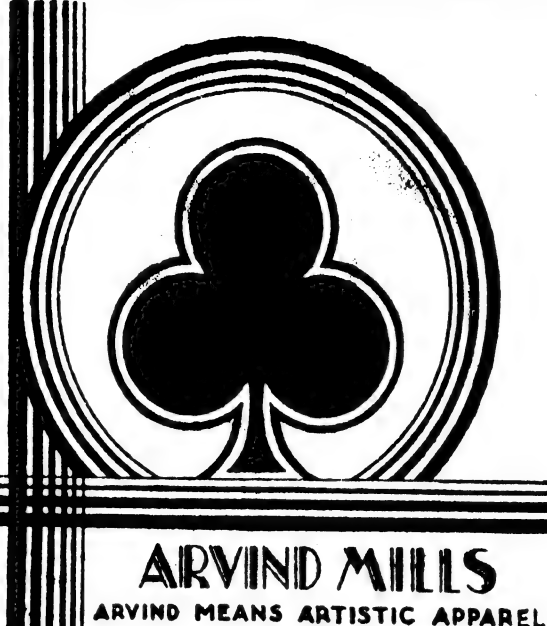
جون میں جب شبِ تاریک کا آنچل لے کر — مسکراتے ہیں مہکتے ہوئے تارے شب بھر
گدگداتی ہیں سیہ فام فضا کو کرنیں — کروٹیں لیتے ہیں بیتاب نظارے شب بھر
بھیگ جاتی ہے سکوں ریز خموشی سے ہوا — جاگتے رہتے ہیں دریا کے کنارے شب بھر
جب گھنے کھیتوں سے اگتے ہیں خموشی کے درخت — اور ہوتے ہیں محبت کے اشارے شب بھر
یا شبِ مہ میں کہ پانی میں مزا دیتا ہے — عکس ٹھہرا ہوا موجوں کے سہارے شب بھر

جون میں ایسے ہی وقت، اے مرے دیرینہ ندیم
ہم جئیں عشق کی مستی کے سہارے شب بھر

(۳)

اور ستمبر میں کہ بدلا نہ ہو گرما کا لباس — لامکاں چاندنی راتوں کی ہو وسعت جس وقت
بھیگے بھیگے سے ترانے ہوں فضا میں رقصاں — عشق کو ہو غمِ ماضی کی نہ فرصت جس وقت
بیخودی جھومتی پھرتی ہو چمن زاروں میں — اوس کے ساتھ بکھرتی جاتی ہو راحت جس وقت
جب فرشتوں کے پروں سے ہو رواں موسیقی — ساغرِ نور میں ڈھلتی ہو محبت جس وقت
ایک سا حال ہو سب کا ہو جمادات کہ خلق — رونق آرائے دو عالم ہو مسرت جس وقت

ہاں ستمبر بھی میں آ۔ اے مرے دیرینہ ندیم
آ! تجھے کھینچ کے لائے مری الفت جس وقت

(۴)

پھر دسمبر میں کہ انگڑائیاں لیتا ہو شباب — آگ فرقت کے مصائب کو دکھائیں دونوں
اونگھتی ہوں شبِ تاریک کی لمبی گھڑیاں — بخت خوابیدہ مقدر کو جگائیں دونوں
مسکراتے ہوں در و بام قمر کی صورت — فرطِ احساس سے جب اشک بہائیں دونوں
بیٹھ کر گرم لحافوں میں اُٹھا کر ساغر — اپنی دنیا کو ہواؤں میں اُڑائیں دونوں
پیار کی باتیں ہوں جب ساز نہ دھارا جائے — سرد مہری کو زمانے سے مٹائیں دونوں

ہاں دسمبر میں بھی آ اے مرے دیرینہ ندیم
آج کے کام کو کل پر نہ اُٹھائیں دونوں

یوسف ظفر

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

ساقی افسانہ نمبر۔ جولائی۔

ٹوٹے ہوئے تارے۔ اس حیرت انگیز مطالعے کو اگر کردار نگاری کا اعجاز کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ کرشن چندر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں فرد کی نفسیات کو سب سے اہم درجہ دیتے ہیں۔ اور اپنے بیان کی سب لطافتیں اور شوخیاں اسی عنصر کی تحلیل میں صرف کر دیتے ہیں۔ "کہانی پن" ان کے ہاں ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی کے عام واقعات اور معاشرت کے معمولی حادثے جنہیں ہم ایک سرسری نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ اُن کے اظہارِ فن کے لئے بہت کافی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تخلیق میں کسی ڈرامائی تکمیل کے جویاں نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنے فن کو کردار کے نقوش ابھارنے اور پڑھنے والے کو افسانے کے ماحول میں غرق کر دینے میں بروئے کار لاتے ہیں اس لئے اُن کے کارناموں کی ادبی حیثیت بسا اوقات بہت بلند ہو جاتی ہے۔

زیرِ نظر افسانے میں نازک ترین نفسیاتی کیفیتوں کے ایک لطیف اظہار کے علاوہ فنکار نے ایک علامتی اثر بھی پیدا کیا ہے۔ علامیت SYMBOLISM، جدید افسانہ نگاری کا ایک دلچسپ پہلو ہے افسانہ نگار بعض اوقات غیر شعوری طور پر کسی منظر یا صورت سے متاثر ہوتا ہے اور وہ منظر اُس کے شعور پر چھاتے ہی چند خاص کیفیتیں یا تاثرات کے چند خاص سلسلے پیدا کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک خالص مادی اور خارجی صورت ایک مکمل نفسیاتی کیفیت کی کلید بن جاتی ہے۔ "ٹوٹے ہوئے تارے" کا پس منظر اسی قسم کی صورتوں اور ان کے نفسیاتی تاثرات سے معمور ہے۔ وادیٔ کشمیر کی سڑک جو دیو زاد سیاہ پہاڑوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی جاتی ہے۔ افسانہ نگار کے شعور پر وہی اثر پیدا کرتی ہے جو زبیدہ کے گھنے اور رچے ہوئے سیاہ بالوں کے عین درمیان نکلی ہوئی سیدھی مانگ یہ دونوں اس "نقرئی تار" کی مثیل ہیں جو ایک امیر کی جیب کا سلسلہ دوسرے امیر کی جیب سے ملاتا ہے، اور جو پہاڑوں، ڈاک بنگلوں، زلفوں اور دلوں کی تاریکیوں میں یکساں طور پر چمکتا ہے۔

افسانہ نگار کی روح پر اس دنیا کے اندھیرے نے ایک ناقابلِ بیان بوجھ ڈال رکھا ہے، وہ اس کے تلے دبی جا رہی ہے اور اس عالم میں وہ اپنا بے کیف اضطراب، اپنا یاس انگیز درد و کرب اس پتلے میں منتقل کر دیتا ہے۔ جو آگے چل کر اُس کے افسانے کا کردار بنتا ہے اور جو پھر اپنے ماحول کو اپنی ہر جنبش سے پھوٹنے والی ظلمتوں سے تیرہ و تار کر دیتا ہے۔

افسانے کا افسانہ فقط یہ ہے کہ ایک رئیس زادہ جو اپنے طبقے کا مثالی نمائندہ ہے کشمیر کو جانے والی سڑک پر اپنی خالی، بے کیف اور اُداس زندگی میں رنگینی پیدا کرنے کی ناکام کوشش میں معروف ہے اور بلکہ وہ اپنے زہر کا تریاق زہر ہی میں ڈھونڈتا ہے اور سراب کو آبِ حیات سمجھ کر اس کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتا ہے، اس کی سعی لاحاصل خبر نہیں کب تک یونہی جاری رہے گی۔ افسانہ نگار نے اس عالمِ اضطراب کی تمام بے قراریوں کو اپنی نادرہ کاری سے یوں اسیر کیا ہے کہ افسانے کی ہر سطر ایک مچلتی ہوئی موج بن گئی ہے۔ دیکھئے:-

"جب وہ چومیل کے ڈاک بنگلے پر پہنچا تو ہر طرف شام کی اُداسی چھا رہی تھی سامنے کا سیاہ پہاڑ کسی دیو قامت قلعے کی دیوار معلوم ہو رہا تھا، اور درختوں کی چوٹیاں پہرے داروں کی بندوقیں۔ اب وہ پھر اکیلا تھا؛ اسے اپنے آپ سے قلعے کی دیواروں سے پہرے داروں کی بندوقوں سے، فضا کی تنہائی سے ڈر محسوس ہوا۔ اپنے آپ

سے ڈر، اُس تیرگی سے ڈر، جو اُس کی روح پر چھائی ہوئی تھی، رات کے گہرے سایوں کی طرح، جیسے وہ اس افسردگی کے دلدل میں اندر ہی اندر دھنسا جا رہا ہو۔ اُس نے ڈاک بنگلے کے بیرے کو آواز دے کر کہا۔ "ایک وائٹ ہارس" ...... اور پھر اس نے دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جانِ عزیز کے مقابلے میں دس روپے کے نوٹ کی کیا اہمیت تھی۔ کاغذ کا حقیر ٹکڑا۔ بوتل کو اپنے سامنے دیکھ کر اس نے سوچا، اب میں بچ جاؤں گا۔ اب اس دلدل میں نہیں دھنسوں گا، اور پھر اس نے بوتل کو زور سے گردن سے پکڑ لیا، شاید کہیں وہ اس کا دامن چھڑا کر نہ بھاگ جائے ...... اس نے بیرے کو آواز دی۔

"جی سرکار"

"ایک مرغی بھون لو۔ دیکھو دُبلی پتلی نہ ہو"

"بہت اچھا سرکار"

"اور ہاں دیکھو" اُس نے بیرے کے ہاتھ میں پانچ کا نوٹ دے کر کہا۔ "ایک ــــــ ے آؤ۔ دیکھو۔ دبلی پتلی نہ ہو....."

اور وہ پیتا گیا، اور اس کے دل کی اُداسی بڑھتی گئی، ڈاک بنگلے میں اُس وقت کوئی نہ تھا اور اس نے سوچا کہ وہ اسی وقت گیرج میں جا کر اپنی موٹر سے لپٹ جائے، اور آنسو بہا بہا کر کہے "میں اکیلا ہوں، میری جان، میں اکیلا ہوں، مجھے تم سے محبت ہے ....." بوتل خالی ہو گئی اور وہ میز پر جھک جانے کو تھا کہ یکایک کسی نے اس کے شانے کو ہلایا۔ بیرا اُس کے پاس کھڑا تھا اور اُس کے پاس ایک عورت کھڑی تھی

"تم کون ہو؟" اُس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"میرا نام زبیدہ ہے۔" عورت نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ کرسی کا سہارا لے کر اُٹھا اور کمرے کے اندر جانے کے لئے مڑا۔ بیرے نے اُسے سہارا دینا چاہا، لیکن اُس نے اُسے جھڑک کر کہا "ہٹ جاؤ، میں کمرے میں خود چلا جاؤں گا۔" وہ اس وقت اس جری سیاح کی طرح محسوس کر رہا تھا، جو کسی دشوار گذار ریگستان میں سفر کر رہا ہو۔ ایک سیاہ کھائی سی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، صرف کمرے میں ایک کونے پر ایک چھوٹا سا لیمپ جل رہا تھا، روشنی چاروں طرف تاریکی کا سمندر اور بیچ میں روشنی کا مینار ..... وہ اس روشنی کی طرف بڑھتا گیا۔ شاید وہ اب بھی بچ جائے گا۔

یکایک اُس نے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ اور وہ رُک گیا۔ بیرے نے عورت کو اندر دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا، عورت دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"آؤ ..... آؤ ....." اُس نے عورت کی طرف ہاتھ ہلا کر جھومتے ہوئے کہا "ادھر آؤ۔ روشنی ادھر ہے۔"

عورت ہولے ہولے قدموں سے قریب آ گئی تھی۔ اس کے بالوں میں عین درمیان سے ایک سیدھی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ چاندی کے تار کی طرح ....."

آپ نے دیکھا! اضطراب، مایوسی اور روحانی تاریکی کی یہ کیفیت جب خارجی دنیا میں اپنے وجود کا اظہار کرتی ہے تو اُسے نمایاں کرنے کے لئے تمام شرابوں میں سے فقط "وہائٹ ہارس" کی بوتل اندھیرے کمرے کے گوشے میں رکھا ہوا چھوٹا سا فانوس، اور زبیدہ کے گھنے بالوں میں کھچی ہوئی چاندی کے تار کی سی مانگ کس طرح فن کار کی مدد کو آ پہنچتی ہے۔ اور پھر دل کی خلا میں جب "وہ" کوئی زندہ صنم موجود نہیں پاتا تو انتہائے یاس میں اپنی موٹر کار ہی کو اپنی مردہ تمناؤں کا مرکز بنا لیتا ہے۔ اعجازِ تجزیۂ جذبات کی اس سے نازک تر مثال شاید ہی کہیں ملے۔ افسانے کا ہیرو دراصل ایک "ٹائپ" ہے، نمونہ ہے، اس ذہنی مفلسی کا، اس جذباتی خام کاری کا، جو ہمارے متمول طبقے کے ایسے افراد میں عام طور پر پائی جاتی ہے، جن کی جنسی آرزوئیں پیدا ہونے سے پہلے پوری ہو جاتی ہیں۔ جن کی روحانی تمنائیں قبل اس کے کہ کسی مرکز کے گرد گھومنے پائیں، سیم و زر کے ذلت آمیز دباؤ سے ایسی منتشر ہوتی ہیں کہ پھر اُن کا سراغ تک نہیں ملتا۔ اور جن کے لئے ایک بھُنی ہوئی مرغی اور ایک محبوبِ شبانہ میں کوئی نمایاں فرق نہیں اور جن کے نزدیک مرغی کا دُبلا پتلا ہونا ویسا ہی گھاٹے کا سودا ہے جیسا کرائے کی عورت کا دُبلا پتلا ہونا۔ اس "ٹائپ" کی جنسی بھوک "جوع الکلب" بن کر رہ جاتی ہے، وہ طلب کی بلندیوں سے کبھی آشنا نہیں ہوتی، اس کے دل میں ہمیشہ ایک مبہم سا خلا پایا جاتا ہے جو کبھی مہر و محبت کا طالب، کبھی لطفِ رفاقت کا جویاں کبھی سکونِ خاطر کا خواہاں رہتا ہے مگر اس سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ آگے دیکھئے:۔

"اُس نے عورت کے شانے پر جھک کر رازدارانہ لہجے میں کہا "کیوں؟ تم اُداس ہو ..... تمہارا نام کیا ہے؟"

"زبیدہ" اس نے بے جان سے لہجے میں جواب دیا۔

"شبیدہ ..... شبیدہ ....." اس نے ہنس کر کہا۔ "شبیدہ ....

ہوں ..... کیا خوب ....." اُس نے اُس کے چمکیلے بالوں پر

ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا" یہ کیا ہے..... شبیدہ..... پیاری
ش..... ش..... شبیدہ.....؟"
"یہ ستھا ہے۔ یہ موم اور جگن کے جگن سے بنتا ہے اس سے بال
خوبصورت..... ؟"
"خوت شورت؟..... خوب شورت شبید آ..... آ..... آ"
اُس نے ہنسی اور ہچکی کے بیچ کے لہجے میں کہا" تم بہت خوبصورت
ہو شبیدہ.....؟" اُس نے زبیدہ کے صاف اور گلابی رخساروں
پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور
انگلی سے اُس کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا" تم..... تم.....
شبیدہ ہو.....؟..... نہیں تم میری ماں ہو! ہی ہی ہی!"
اور وہ اس کے قریب گیا۔
عورت نے یکایک اُس کے بازوؤں کو جھٹک دیا، جیسے اُسے
کسی سانپ نے ڈس لیا ہو" ماں..... ماں.....!" وہ چلا کر
بولا" ش۔ ش۔ شبیدہ ماں ہے۔ شبیدہ میری بہن ہے
..... ش ش شبیدہ میں گناہ گار ہوں۔ شبیدہ تم یہاں کیوں
آئیں..... آخ..... ہیں!
"میں غریب ہوں" زبیدہ نے آہستہ سے کہا۔
"غریب! ہی ہی ہی"
"میرا بچہ بیمار ہے! جرا، میرا ننھا سا جرا! ڈاگ دار (ڈاکٹر) نے
کہا اُسے نمونیا ہو گیا ہے۔ وہ چار روپے فیس مانگتا ہے، نہرے
نے مجھے صرف تین روپے دئیے ہیں، خدا کے لئے مجھے ایک
روپیہ اور دے دو"
"نمونیا! ہی ہی ہی..... اُسے خ..... خ..... خیراتی
ہسپتال لے جاؤ نا..... نمونیا..... ننھا جرا.....؟"
"یہاں ایک ہی تو ہسپتال ہے" عورت نے اداس لہجے میں
کہا" اور وہ بھی خیراتی..... میرے اللہ..... میں کیا کروں...
میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں..... خدا کے لئے مجھے ایک
روپیہ اور دے دینا..... صرف ایک روپیہ"
"بش..... بش..... فکر نہ کرو..... نہ..... نہ.....
ننھی زبیدہ" اس کی گردن سے لپٹ کر کہنے لگا" میں تم پر مرتا ہوں
خوبصورت شبیدہ ــــ میں اکیلا ہوں..... میں اکیلا ہوں...
مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے بچاؤ شبیدہ..... اس نے
اس کے شانے پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔
وہ سویا پڑا تھا، عورت کے گلے میں اس کے بازو حائل تھے، جیسے
فاؤنٹ ہارس کی بوتل پر اُس کی انگلیاں.....
جب وہ جاگا تو خمار اتر چکا تھا، روشنی بجھ گئی تھی، سائے غائب ہو
چکے تھے..... اور وہ ابھی تک اس کے آغوش میں مدہوش
پڑی تھی، برہنہ،..... اور سپید گردن کے اُن حصوں پر سرخ سرخ
نشان تھے جنہیں وہ بار بار چومتا رہا تھا۔ اُس نے نیم وا آنکھوں
سے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا، سڈول، گداز سانچے میں
ڈھلا ہوا جسم، وہ آہستہ آہستہ اس کے بینڈے پر انگلیاں
پھیرنے لگا۔ عورت کے سارے جسم میں ایک لرزش سی پیدا ہوئی
جیسے سوئے ہوئے سمندر کی لہریں بیدار ہو جائیں..... اس کے
رخساروں پر گری ہوئی پلکیں کانپیں، اس کے لبوں سے اک آہ
سی نکلی اور اُس نے آہستہ سے اُسی مدہوشی کے عالم میں کہا! جرے
..... پیارے ننھے جرے.....؟" اور پھر اُس کے نیم وا لب
اسی طرح آپس میں ملے جیسے ماں اپنے پیارے بیٹے کو چوم رہی
ہو..... ننھا جرا!..... یکایک وہ چونک پڑا، گذری ہوئی
رات کے موہوم سے سائے اس کی آنکھوں کے آگے آنے گئے
..... ننھا جرا..... نمونیا..... ڈاگ دار..... وہ کانپنے
لگا..... تین روپے..... چار روپے..... صرف ایک روپیہ
..... اُس نے فوراً اپنے بازو اُس کی گردن سے ہٹا لئے۔ ننھا
جرا..... اور اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اپنی ماں سے.....
اور وہ یکلخت بستر سے اچھل کر زمین پر کھڑا ہو گیا اور پھٹی پھٹی نگاہوں
سے اُس عورت کی طرف تکنے لگا جو اب جاگ گئی تھی اور برہنہ تھی
اور ساری رات اس کی آغوش میں رہی تھی۔
وہ چیخ کر کہنے لگا" چھپا لو۔ چھپا لو اپنے آپ کو اس کمبل میں.....
دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے۔۔ کیوں اس طرح پریشان نگاہوں
سے میری طرف دیکھ رہی ہو..... سنتی نہیں ہو کیا؟..... میں
کہتا ہوں، اُٹھو، اُٹھو..... میرے بستر سے..... یہ لو.....
یہ لو..... ایک روپیہ۔ دو روپے تین روپے۔ چار روپے۔
یہ سب لے لو، بھاگو یہاں سے بھاگو! بھاگو! بھاگو!!"

اور اس نے عورت کو کمبل اُڑھا کر اُس کے کپڑے اس کے ہاتھ میں دے کر اسے کمرے سے باہر نکال دیا۔"

اس اقتباس میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ چیز محبت کا وہ غیر جنسی یعنی مادری تصور ہے جسے خام کار جنسی شکاری اُس مرکزی جذبے کی جگہ دینا چاہتا ہے جو جنسی ہونے کے باوجود منقل، لطیف اور بلند ہو سکتا ہے۔ مگر اُسے اس جذبے سے کیا واسطہ۔ زرداری اُسے حصولِ حسن کا سیدھا راستہ دکھاتی ہے اور جب مادی حُسن اپنے جلوۂ شبانہ سے اس کی روح کی تسکین نہیں کر سکتا، اور ظاہر ہے کہ حسین زبیدہ کی تمام روحانی رعنائیاں محض اس کے بچّے کے لئے وقف تھیں، تو وہ ایک زبردست ردِّ عمل میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اور وہ حُسن کی اس لاش سے یوں بھاگتا ہے جیسے اُس نے کوئی آسیب دیکھ لیا ہو۔ مگر آہ ستم بر فطرت! تو نے بے چارے انسان کے لئے کیسے کیسے دام بچھا رکھے ہیں۔ دیکھئے:۔

"بہت دیر تک وہ بستر پر سر پکڑے بیٹھا رہا۔ دل و دماغ پر ایک مبہم سی اُلجھن ایک مکڑی کے جالے کی طرح تنی ہوئی تھی جو اُسے بار بار پریشان کر رہی تھی اور وہ کچھ سوچ نہ سکتا تھا۔ وہ بار بار اپنے اُلجھے ہوئے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیر کر اس مکڑی کے جالے کو دور کرنے کی کوشش کرتا رہا، آخر جب بیرے نے آکر اُس سے کہا "صاحب غسلخانے میں گرم پانی دھرا ہے" تو وہ بے دلی سے اُٹھا اور پوٹاشیم پرمینگنیٹ کی پچکاری اٹھا کر غسل خانے میں گھس گیا۔ طبیعت بے مزہ سی ہو گئی تھی اور منہ کا کڑوا کسیلا ذائقہ ہوش آنے پر بھی دور نہ ہوا تھا۔ شانے بوجھل سے تھے۔ نہا کر وہ برآمدے میں میز پر کہنیاں ٹیک کر ناشتے کا انتظار کرتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا۔ ہوشیار بیرے نے ناشتے پر بیئر کی بوتل حاضر کر دی تھی۔ بیئر کے خوش رنگ سیّال نے آہستہ آہستہ اُس کے خیالات کی رو کو بدل دیا.... وہ آہستہ آہستہ گنگنانے اور سیٹیاں بجانے لگا۔ بیتی ہوئی راتوں کے لمحے خوشگوار اور دلکش بنتے چلے گئے۔ ستھے سے چمکتے ہوئے بال.... سیاہ قمیص پر چھاتیوں کے اُبھرے ہوئے خم..... نہالو کا غیر فانی حُسن، بلبل کا نغمہ، پپیہے کی پی پی، اور سیب کے پھول چاندنی میں ہنستے ہوئے، یکایک کسی راستے میں چمکتے ہوئے چشمے کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی اُس کی آنکھوں کے سامنے خوشی سے اچھلنے اور اُبل اُبل کر قہقہے لگانے لگا اور ا سے اپنی کار یاد آئی جو گیرج میں پڑی اُس کی راہ تک رہی تھی۔ اور وہ کھڑا ہو گیا اور اُس نے بیرے کو انعام دے کر پوچھا "گڑھی کا ڈاک بنگلہ یہاں سے کتنے میل دور ہوگا؟"

ہمارا ہیرو جب صبح کے ناشتے اور خوش رنگ بیئر کی مدد سے وہ دماغی اُلجھنیں دور کر لیتا ہے، جو کبھی کبھی اُس کے معمولات میں بیزاری کے اثرات پیدا کر دیتی ہیں تو وہ سرشاری اور مدہوشی کے کم از کم ایک اور دن رات کے لئے نشاطِ حواس کا سامان بہم پہنچانے کی خاطر کمر ہمت باندھ کر اُٹھتا ہے اور گڑھی کا ڈاک بنگلہ اُس کے تخیل پر ایک پرستانی قلعے کی طرح چھا جاتا ہے، جہاں حسین نہالو، سیاہ قمیص پر چھاتیوں کے اُبھرے ہوئے خم والی محبوبہ جس کا میکہ ایک چشمہ اور سسرال دوسرا چشمہ تھا، یا ستھے سے چمکتے ہوئے بالوں والی کوئی زبیدہ اس کا انتظار کر رہی ہوگی اور وہ ایک اور حسین شب اُس کے پہلو میں بسر کرے گا اور صبح پھر اُس کے منہ کا ذائقہ کسیلا ہوگا اور اس کے شانے بوجھل سے محسوس ہوں گے.....

اور پھر

"ڈاک بنگلے کے قریب ایک موڑ کاٹتے ہوئے اسے ایک نیلے رنگ کی کار مل گئی جو ڈاک بنگلے کی طرف آ رہی تھی۔ ایک بھاری جسم اور دُہری ٹھوڑی والا آدمی جس نے سیاہ پھندنے والی رومی ٹوپی پہن رکھی تھی، کار چلا رہا تھا، اُس کی بغل میں ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ نیلی سوسی کی شلوار، سیاہ قمیص پر چھاتیوں کے اُبھرے ہوئے خم، اور آنکھوں میں عادی مجرموں کی سی بے جان اُداسی، اور وہ دل ہی دل میں مسکرایا، محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز۔ ...."

مگر اس منظر کا پورا لطف اٹھانے کے لئے آپ کو ایک شب پیچھے جانا پڑے گا۔ جب ہمارا ہیرو خوبصورت شبیدہ سے لذّت یاب ہونے سے پہلے صبح صبح تریٹ کے ڈاک بنگلے سے روانہ ہوا ہے:۔

"اور اب تو وہ ڈاک بنگلہ بھی میلوں پیچھے رہ گیا تھا..... رات کی تنہائیوں میں نہالو کا حُسن غیر فانی اور غیر زمینی معلوم ہوتا تھا...... اس کے لب، اس کی آنکھوں کی نرمی، اس کے بال سیاہ گھنے اور ملائم جیسے رات کی بھیگی ہوئی خاموشی اور پھر ان بالوں میں سیب کے چند چٹکتے ہوئے غنچے، جیسے رات کی بھیگی ہوئی خاموشی میں بلبل کے میٹھے نغمے، اور وہ یہ معلوم نہ کر سکا کہ یہ خاموشی کہاں شروع ہوتی ہے اور یہ موسیقی کہاں ختم ہوتی ہے...... اور اس کے تخیل میں نہالو کے لب اور جیگن کی مہک اور بلبل کا نغمہ اور بیئر کا سنہرا رنگ چاندی کی تار کی

طرح چمکتی ہوئی سڑک پر اُلجھتے گئے۔ نیچے جہلم کا پانی وحشی راگ گانے لگا اور فضا میں سیب کے لاکھوں پھول آنکھیں کھول کر جھپلنے لگے اور اُس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ اپنی موٹر کو اسی کھائی کی وسیع خلا پر ایک بے فکر پرندے کی طرح اڑا کر لے جائے۔ یہ خیال آتے ہی اُس نے اپنے جسم میں ایک سنسنی سی محسوس کی اور اس کی نیم وا آنکھیں کھُل گئیں

راستے میں ایک چشمے کے کنارے اُس نے اپنی کار ٹھہرالی اور دیر تک ہاتھ پاؤں دھوتا رہا آنکھوں کو چھینٹے دیتا رہا،

.... اُس نے اپنی اوک میں چشمے کا صاف و شفاف پانی پینے کے لئے بھرا اور رُک گیا، خاموش قدموں سے ایک عورت اس کے قریب آگئی تھی، نوجوان سی اور کچھ کچھ فربہ اندام، اس نے نیلے پھولوں والی سوسی کی ایک بھاری شلوار پہن رکھی تھی اور اُسے سیاہ قمیص پر اس کی ابھری ہوئی چھاتیوں کے گول خم نظر آئے اور چشمے کا صاف و شفاف پانی اس کی اوک میں چھلکنے لگا.....

عورت چشمے میں سے اوک بھر بھر کر اپنی پیاس بجھاتی رہی اور اُس کی پیاس تیز ہوتی گئی.....عورت کے لب اور گال گیلے ہو گئے اور کانوں کے قریب بل کھاتی ہوئی زلف بھی، اور پھر یکایک دونوں کی نگاہیں ملیں۔ عورت نے مسکرا کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دینے شروع کئے۔

اُس نے پوچھا "تم کہاں جا رہی ہو؟"

عورت نے کہا "میں نگر میں اپنے میکے گئی تھی۔ اب بلند کوٹ اپنے خاوند کے پاس جا رہی ہوں۔"

"بلند کوٹ کدھر ہے"

عورت نے کہا "یہاں سے سات آٹھ کوس تک تو میں اسی سڑک پر چلوں گی....."

اُس نے بات کا رُخ بدل کر کہا "کیا تم نے کبھی موٹر کی سواری کی ہے؟"

"ہاں ایک بار لاری میں بیٹھی تھی جب میری شادی ہوئی تھی۔"

"کتنا عرصہ ہوا"

"دو سال"

وہ اپنا رخت سفر باندھنے لگا۔ عورت کی ناک پر پانی کی دو بوندیں ابھی تک لگ رہی تھیں اور گیلی زلف داہنے گال سے چپک گئی تھی اُس نے کہا "تمہاری ناک پر پانی کی دو بوندیں ہیں۔"

اور پھر یکایک دونوں ہنسنے لگے۔ دو بوندیں، دو سال، دو گولائیاں اور اُس نے آہستہ سے کہا، "آؤ تم میری کار میں بیٹھ جاؤ، کم از کم سات آٹھ کوس تک تو میں تمہیں ساتھ لے جا سکتا ہوں۔

پھر کیا یہ موٹر بھی دو آدمیوں کے سفر کے لئے نہ بنائی گئی تھی! ایک مرد اور غالباً ایک عورت، اور اس نے غیر شعوری طور پر اپنا ایک ہاتھ اس کی کمر پر رکھ دیا۔ عورت کے جسم میں ایک خفیف سی جھرجھری پیدا ہوئی جیسے سوئے ہوئے سمندر کی لہریں بیدار ہو جائیں موٹر بھاگتی گئی اور اس کا ہر نفس آتشیں ہوتا گیا۔ آگ اور سمندر جن میں بلند کوٹ کی رفعتیں غرق ہو جاتی ہیں اور وقت مٹ جاتا ہے......"

اب اس منظر کا سلسلہ پہلے منظر سے ملائیے اور آگے چلئے:۔

"ہاں تو وہ دل ہی دل میں مسکرایا، محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز..... غریب عورتوں نے اپنی خیالی عصمت کی خاطر پہاڑوں پر بلند کوٹ بنائے تھے، لیکن حقیقت یہ تھی کہ اُن کے میکے اور سسرال ایک میٹھے چشمے سے دوسرے میٹھے چشمے تک اور ایک ڈاک بنگلے سے دوسرے ڈاک بنگلے تک محدود تھے۔ اُس نے دل ہی دل میں خداوند لایزال کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا جس نے ان لوگوں کو غریب بنا کر اس کے لئے دلکش راہیں مہیا کی تھیں۔ زبیدہ، وائٹ ہارس، اور بھٹا ہوا مرغ..... الٰہی کیسی کیسی نعمتیں تو نے بنائی ہیں...... اس کے تخیل میں گڑھی کا ڈاک بنگلہ ایک پرستانی قلعہ نظر آنے لگا اور اس نے اپنی کار کی رفتار تیز کر دی ——"

معلوم نہیں کہ ہمارے ہیرو کی کار آمد محبوبہ نے جس کا نام موٹر کار تھا — کتنے اور پرستانی قلعے سر کرنے میں مدد دی۔ بہر حال آپ ذرا دیر کے لئے انہیں وہیں چھوڑیئے اور ذرا ہم سے مل کر فن کار کی اُن منظر نگاریوں کا لطف اٹھائیے جو کہانی کے دامن پر بہار کے پھولوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔

اس کے بال سیاہ گھنے اور ملائم! جیسے رات کی بھیگی ہوئی خاموشی اور پھر اُن بالوں میں سیب کے چند چمکتے ہوئے غنچے، جیسے رات

افسوس ہے کہ اس بے مثال مطالعے میں زبان اور کتابت کی چند غلطیاں بھی نظر آئیں جو اس بات کی شاہد ہیں کہ مصنف اور مدیر دونوں کو نظرِ ثانی کی فرصت نہیں ملی یا شاید افسانے کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے انہیں درست نہیں کیا گیا۔ . . . .

صلاح الدین احمد

حصّہ نظم

انسان نے تخلیقِ انسانی سے لے کر اب تک اس قدر ترقّی کی لیکن آج بھی وہ زمان و مکان کا ویسا ہی قیدی ہے جیسا روزِ اوّل کو تھا۔ مکان کی قید پر تو اس نے کرۂ ارض کی حد تک کافی قابو پا لیا ہے لیکن زمان کا مسئلہ ابھی اُس کے بس میں نہیں آیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وقت ایک اضافی تصوّر ہے۔ اگرچہ علم و تہذیب کے موجودہ دور میں وقت کے متعلق جدید ترین نظریے قائم ہوئے ہیں لیکن ذہنِ انسانی اب بھی ماضی حال اور مستقبل کے سلسلے میں ماضی ہی کا پابند ہے اور فنونِ لطیفہ کے لحاظ سے فن کاروں کے ذہن تو خصوصاً ماضی ہی کے شیدا ہیں۔ اور شعراء کے ذہن اس اعتبار سے اکثر رجعت پسند ہیں۔

سعیٔ خام

• چاندنی کے ساز پر — ہے مجسّم نغمہ گر
میرے دل کا اہتزاز — بن گیا ہے روحِ ساز
راگنی کو لے کے دُور — جا رہی ہے موجِ نور
• بھیجتا ہوں تیرے نام
موجِ سیمیں پر پیام
آہ لیکن سعیٔ خام
جس طرح بچّہ کوئی — ناؤ اپنی کاغذی
آبجو میں چھوڑ دے — اور توقع یہ کرے
ناؤ اس کی جائے گی — اور کھلونے لائے گی
مادرِ مرحوم سے — شہرِ نامعلوم سے
پھر کنارِ جوئبار — وہ سراپا انتظار
کشتیوں کو دور سے — دور سے آئے ہوئے
دیکھتا ہو تا بہ شام — سید احمد اعجاز

ندیم بہار نمبر ۱۹۷۰ء

سید احمد اعجاز کی نظم "سعیٔ خام" جہاں منظر نگاری اور تصوّرات کی مثال ہے وہیں اس سے اردو شاعری پر انگریزی شاعری کے اثر کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے دو مناظر سے اپنی دلی کیفیت کو ظاہر کیا ہے۔ بظاہر اس نظم میں صرف چاندنی کا تأثر ہے۔ لیکن اس تأثر سے زیادہ دلچسپ وہ تسلسلِ خیال ہے جس کو چاندنی کے منظر سے تحریک ہوتی ہے۔ نظم کے دو حصّے ہیں، اور دوسرے حصّے میں پہلے حصّے کی تشبیہ پیش کی گئی ہے لیکن تشبیہ شاعر کے ذہن میں یونہی نہیں پیدا ہو گئی۔ وہ چاندنی سے لبریز فضا میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی نظروں میں اونچا نیلا صاف ساگر پھیلا ہوا تھا، جس میں نور کی موجیں تھیں، چاند تھا، ستارے تھے۔ اس من موہن منظر کو دیکھنے سے اُس کے سازِ دل کے خوابیدہ تار سوئے ہوئے تھے وہ جاگ اُٹھے۔ اُسے تنہائی محسوس ہوئی، اُس کا جی چاہا کہ کوئی محبوب ہستی ان لمحوں میں اُس کی ہم جلیسی میں اس منظر کے حسن سے متاثر ہو، اس کے اپنے کیف میں حصّہ بٹائے۔ لیکن وہ تنہا تھا، ہاں ماضی میں ایک محبوب ہستی اُس کے پاس ہوا کرتی تھی یا کم سے کم ایک محبوب ہستی ایسی ہے جس سے اس منظر کے کیف کی حصّہ داری میں اُسے مسرّت حاصل ہو سکتی ہے۔ اُس کا خیال آتے ہی اس تک پہنچنے کی مجبوری کا احساس بھی ہوا اور اس لئے "موجِ سیمیں پر پیام" بھیجنے کی تحریک ہوئی۔ لیکن اس پیام کا پہنچنا بھی ویسا ہی ناممکن نظر آیا جیسی کہ یہ کوشش خیالی کہ وہ ہستی یہاں آن موجود ہو۔ اور پھر اس مجبوری کے متواتر احساس نے غیر شعوری طور پر شاعر کے ذہن کو گریز پر مائل کیا تاکہ یہ المناک احساس دور ہو سکے اور یوں وہ تشبیہ کی طرف راغب ہوا۔ لیکن یہ رغبت بھی کچھ زیادہ کارآمد ثابت نہ ہوئی۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ وہ اپنے احساسِ مجبوری کو کسی اور کا احساس بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ یعنی مجبوری اور سعیٔ خام کی کیفیت کے متعلق اُسے یوں محسوس ہوا کہ یہ کیفیت تو اس بچّے کی ہوا کرتی ہے جو "اپنی کاغذی ناؤ کو کھلونوں کی توقع میں آبجو کے سپرد کر دے" —— یوں شاعر کا دل ہلکا ہو گیا۔ کیونکہ اُس کا بارِ الم ایک اور شخص کا بارِ الم بن گیا اور اُس کے اپنے دل میں اُس بچّے کے لئے ہمدردی کا احساس پیدا ہو گیا۔

لیکن تشبیہ کے لئے یہ بچّہ اور اس کی ناؤ شاعر کے ذہن میں کیوں آئی؟ اُس کی اپنی مجبوری سے ملتی جلتی کیفیتیں تو کئی اور بھی ہو سکتی تھیں — شاعر کی نظروں میں اونچا نیلا، صاف ساگر پھیلا ہوا تھا جس میں نور کی موجیں تھیں، چاند کی کشتی تھی، ستاروں کے بجرے تھے، شاید کہکشاں کی آبجو کے کنارے پر اُسے چاند کی کاغذی کشتی کا دھیان آیا۔ آخری مصرعوں کے

تصوّر میں رہ رہ کر کنارِ جوئبار، وہ سراپا انتظار، کشتیوں کو دور سے، دور سے آتے ہوئے دیکھتا ہوتا ہے شام) شاعر نے اُس سکون کو اس دل کے ہلکا ہونے کو ظاہر کر دیا ہے جو اُسے اس تشبیہہ سے ملا۔

اور اس نظم میں جوشؔ بھی ماضی ہی کی طرف رجوع کر رہا ہے، اگرچہ اُس کے تخیّل کی بنیاد حال پر ہے۔

پرانا باغ

آم کا باغ جو ہے پیشِ نظر یہ مرے باپ نے لگایا تھا
یاد ہے، خوب یاد ہے کہ یہاں ایک روز اُن کے ساتھ آیا تھا
باغ کے پاسباں نے بہرِ سلام ہاتھ اُٹھایا تھا، سر جُھکایا تھا
کس قدر دلنواز شاخیں تھیں کس قدر دلفریب سایا تھا
پتّے پتّے پہ نوجوانی تھی ذرّے ذرّے پہ رنگ چھایا تھا
خستہ چڑیوں کے چہچہانے سے شام کا وقت گنگنایا تھا
میرے اک بار مسکرانے سے باغ سو بار مسکرایا تھا
دل پہ اب تک خراش باقی ہے دو گھڑی کو وہ لطف آیا تھا

اور آیا ہوں میں جو آج یہاں باغ ہنستا نہ مسکراتا ہے
کل تو گاتا تھا، گنگناتا تھا اب نہ گاتا نہ گنگناتا ہے
ذرہ ذرہ مری طرف صد حیف آنکھ بیگانہ وار اٹھاتا ہے
باغ کب کا بُھلا چکا ہے جو دور اس لئے مجھ کو یاد آتا ہے
یادِ ماضی! ارے معاذ اللہ! دل تڑپتا ہے، بیٹھ جاتا ہے
آہ! بیتے دنوں کی یاد کا درد زندگی کو لہو رُلاتا ہے
صرف اِک بار مسکرا دینا دل پہ سو بجلیاں گراتا ہے
کیا کہوں کس قدر مرے دل کو نوعِ انساں پہ رحم آتا ہے

جانتا ہے، فریب ہے ہستی،
پھر بھی ناداں فریب کھاتا ہے

زمانہ جون ۱۹۴۷ء — جوشؔ ملیح آبادی

اس نظم کے عنوان ہی سے وہ فضا قاری کے ذہن میں قائم ہو سکتی ہے جہاں پہنچ کر شاعر اس نظم کی خود کلامی شروع کرتا ہے۔ اس لئے عنوان کے بعد نظم کی طرف حبہ بدر رجوع ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ عنوان کے انجام اور نظم کے آغاز میں ایک وقفہ درکار ہے" تاکہ جہاں شاعر کھڑا ہے وہیں ہم بھی جا کھڑے ہوں اور اُس کی بات کو پورے طور پر سمجھ سکیں۔ باقی نظم میں بیان اور بے ساختگی کی جو خوبیاں ہیں اُن کے اظہار کے لئے مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

ہماری سوسائٹی

حوصلے سرنگوں، اُمیدیں شل
آرزو بار یاس سے بوجھل

نشہ، بجھتا ہوا سا ایک شرار
کیف گرتی ہوئی سی اک دیوار

ہر لطیفے کی تہ میں رنج و محن
ہر ظرافت میں ایک پھیکا پن

شرم سے آب آب جولانی
ہر ہنسی شرمسار، کھسیانی

خال و خط پر دھواں بناوٹ کا
کرب بالقصد مسکراہٹ کا

ماہنامہ اضطراب لکھنو جولائی ۱۹۴۷ء — جوشؔ ملیح آبادی

جوشؔ کی دوسری نظم ماضی کی طرف نہیں لے جاتی بلکہ جس "حال" سے گریزاں رہنے کی کوشش میں ہم ہمیشہ مصروف رہتے ہیں، وہی اس کا موضوع ہے۔

اردو میں اگرچہ ہجو ایک قدیم صنفِ سخن ہے۔ لیکن جدید مفہوم کے لحاظ سے طنزیہ نظموں کی ابھی بہت کمی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ طنزیہ نظم کی تخلیق آسان کام نہیں کیونکہ طنز کے ساتھ ساتھ شعریت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دینا ایک ایسی مہم ہے جو ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اس خیال کی روشنی میں یہ نظم خصوصاً قابلِ غور ہے۔ ایک اور نکتہ اس میں یہ ہے کہ شاعر نے طنز کرتے ہوئے سماج کی سطحی اور بیرونی باتوں کا ذکر نہیں کیا بلکہ سماجی روح اور کردار کی خامیوں اور پستی کی طرف توجہ دلائی ہے

میری رانی

پہلے پیکانِ محبت سے تھا دل پہلو میں،
خون کی گنگا بہا یا تو بنا رنگ محل
چپکے چپکے کوئی اس رنگ محل میں آیا
بجلیاں کانوں میں، سینے پہ وہ آدھی ہیکل

آتشِ حُسن سے گلنار، بھبھوکا چہرا
عید مِلتا ہُوا آنکھوں سے وہ کافر کاجل
بول اُٹھے چمنِ داغ میں خوش رنگ کنول رخ کے پرتو سے چھپے نور کا لے کر آنچل
غم نے بڑھ کر اسے پہنا دیا ان پھولوں کا ہار
نازنیں فرق پہ اک تاجِ زرافشاں رکھا
حسرتیں آ کے حضوری میں زمیں بوس ہوئیں
نازک ارمانوں نے داماں نہ گریباں رکھا
یاس نے آ کے سلامی دی بڑی شوکت سے
اُس نے اُس کے حضور آپ نمکداں رکھا
راج کرنے لگی اقلیم جنوں پر رانی ــــ
میری بلقیس نے اندازِ سلیماں رکھا
کم نظر تو اسے کہتے ہیں فغاں کی بانی وہ ہے فی الاصل مرے رنگ محل کی رانی
(رہے باقی و ماہتاب باقی)

سب رس حیدرآباد جولائی ۶۷ء ــــــــــــــــ مختار صدیقی

اس نظم میں رانی کا پربت بنا ہے لیکن اس پربت کی چوٹی پر پہنچ کر شاعر نے دیکھا کہ ایک مندر ہے اور اس مندر میں کسی دیوی کی مورتی۔ دنیا میں کئی مندر ہیں اور ان میں کئی مورتیاں لیکن جب تک کسی مورتی کا نام ہمیں معلوم نہ ہو ہماری نظروں میں اُس مورتی کے مندر کی کوئی اہمیت نہیں پیدا ہوتی۔ شاعر نے بھی پربت پر پہنچ کر جب مندر میں دیوی کی مورتی کو دیکھا تو اس کا ایک نام رکھ دیا اور اس نام رکھنے ہی سے اس نظم کے مندر کی اہمیت ہماری نظروں میں پیدا ہو گئی۔ اگر شاعر اُس مورتی کو پریم کی دیوی پکارتا تو یہ ایک عام سی بات ہوتی۔ شعرا اور خصوصاً نوجوان ہر مورتی کو پریم کی دیوی ہی سمجھنے لگتے ہیں اور یہی اُن کی غلطی ہے۔ لیکن یہ شاعر عوام کی طرح غلط نظری کا مرتکب نہیں ہوتا۔ یہ اس دیوی کو "فغاں کی بانی" کہتا ہے اور اپنے رنگ محل یعنی دل کی رانی سمجھتا ہے۔ دل کی رانی سے مراد یہاں محبوبہ نہیں ہے۔ بلکہ اس نظم کا بنیادی موضوع اصل میں غم کی پوجا ہے۔ رانی کا مفہوم اُس تلازمِ خیال کی وجہ سے آ گیا ہے جس کی وضاحت ابھی کی جائے گی، اگر وہ تلازمِ خیال پیدا نہ ہوتا تو شاعر اس مورتی کو "فغاں کی بانی" کہہ کر ہی بات کو ختم کر دیتا۔

میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ہمارے اردو شعرائے جدید عموماً نظم کے شروع ہی سے تلازمِ خیال کا اظہار نہیں کرتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آغاز میں شدتِ احساس اُن کے ذہن کو باقاعدہ چال سے نہیں چلنے دیتی۔ لیکن جب وہ دو چار شعر کہہ کر اظہارِ نفس کے ابتدائی اظہار کی کسی حد تک تسکین کر لیتے ہیں تو ان کے ذہن میں آسودہ تصور جاگتے ہیں اور تلازمِ خیال بھی بیدار ہو جاتا ہے۔ اس نظم کا بھی یہی حال ہے۔

شاعر کو چپ چاپ بیٹھے ہوئے اچانک خیال آتا ہے کہ اب تو دل کی حالت ہی بدل گئی۔ اب تو یہ دل ہی نہ رہا محبت کا تیر لگنے سے پہلے یہ دل تھا، تیر لگا، خون نکلا، دل خون میں نہا گیا، خون کی گنگا نہا لی...... گنگا کا تصور آتے ہی شاعر کی زبان بدل گئی۔ اور وہ "پیکانِ محبت" اور "پہلو" جیسے فارسی الفاظ سے ہٹ کر خالص ہندوستانی الفاظ کی طرف راغب ہو گیا۔ لیکن آگے چل کر پھر وہی فارسی الفاظ والی زبان جاری ہو گئی کیونکہ وہ شاعر کی اصل زبان ہے۔ "خون کی گنگا" کے خالص ہندوستانی استعارے سے "رنگ محل" کی آمد ہوئی اور پھر اس میں "کوئی آیا"۔ یہاں شاعر نے آنے والے کی تخصیص نہیں کی۔ قاری آپ ہی سوچے کہ کون آیا، شاعر آخر میں چل کر بتائے گا۔ یوں ایک دلچسپی پیدا ہو گئی۔ قاری کا ذہن بیدار رہا اور اُس نے اپنے دل میں سوچا کہ شاعر کی محبوبہ رنگ محل میں آئی تھی لیکن آخر میں جا کر جب قاری کو معلوم ہُوا کہ وہ آنے والی شاعر کی محبوبہ نہ تھی بلکہ "فغاں" تھی تو اُسے یہ ایک غیر معمولی بات معلوم ہوئی کیونکہ یہ بات اس کی اپنی سوچ کے خلاف تھی۔

اس نظم کے دوسرے بند میں بہت سے شاہی سے تعلق رکھنے والے لوازم ہیں: تاج زرافشاں، حضوری، زمیں بوس، سلامی دی، شوکت سے، راج کرنے لگی، رانی، بلقیس، اور اندازِ سلیماں ــــ یہ سب چیزیں رنگ محل کے تصور کی پیدا وار ہیں۔

بیان کی خوبی کے لحاظ سے دو مثالیں "عید ملتا ہُوا آنکھوں سے وہ کافر کاجل" اور "چمنِ داغ میں خوش رنگ کنول نور کا آنچل لے کر چھپے"۔

آخری ٹکڑا جو خطوطِ وحدانی میں ہے اُس کا مطلب میں نہیں سمجھ سکا آپ خود کوشش کیجئے:۔

اس نظم میں بھی شاعر ماضی ہی کے دلکش زمانے کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ اور ذیل کے منتخب اشعار میں اختر شیرانی بھی ماضی ہی کا نغمہ خواں ہے:۔

فراق

حیراں ہے آنکھ جلوۂ جاناں کو کیا ہُوا
ویراں ہیں خواب گیسوئے رقصاں کو کیا ہُوا
قصرِ حسیں خموش ہے ایوان پُرسکوت آوازۂ پائے سروِ خراماں کو کیا ہُوا

پردوں سے روشنی کی کرن پھوٹتی نہیں
اُس شمعِ رنگ و بوکے شبستاں کو کیا ہُوا

دنیا سیاہ خانۂ غم بن رہی ہے کیوں
اللہ میرے ماہِ خراماں کو کیا ہُوا

طوفاں اٹھا رہی ہیں مرے دل کی دھڑکنیں
اس دستِ نرم و ساعدِ لرزاں کو کیا ہُوا

نادان آنسوؤں کو ہے لذّت سے جستجو
آرام گاہِ گوشۂ داماں کو کیا ہُوا

سیراب کاری لبِ گلگوں کدھر گئی
ہیں تشنہ کام ساغرِ جاناں کو کیا ہُوا

کشتِ مرادِ ہوچلی نذرِ سمومِ غم
یارب نمودِ ابرِ خراماں کو کیا ہُوا

روتا ہے بات بات پہ یوں زار زار کیوں
اختر خبر نہیں دلِ ناداں کو کیا ہُوا

میراجی

شعر

شام بھی تھی دھواں دھواں حُسن بھی تھا اُداس اُداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

فراق گورکھپوری

نقد و نظر

اندھی دنیا

(مختصر فسانوں کا مجموعہ از اختر انصاری بی اے آنرز)

حجم ایک سو ساٹھ صفحے لکھائی چھپائی اچھی۔ کاغذ خاصا قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ: مکتبہ جہاں نما، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔

تہذیب و تمدن کا مصنوعی ماحول انسان کی جنسی جبلت میں گمرہی اور تخریب کا باعث بنتا ہے اور لازیسکہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہے اس لئے اس گمرہی یا تخریب کے نمایاں نقوش ہمیں ادب ہی میں ایک محفوظ صورت میں مل سکتے ہیں بعض اوقات تو ان نقوش کی نوعیت واضح ہوتی ہے۔ لیکن کہیں کہیں اور کبھی کبھی یہ نقوش عجیب پیچ در پیچ راستوں سے گذر کر اپنی ظاہری صورت سے اپنی اصلی نوعیت کو چھپا لیتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہم تجزیۂ نفسی کی مدد سے ادب کا جائزہ لے کر اس کی تہ کو پہنچ سکتے ہیں۔ اردو زبان کے شعراء تو ابتدا ہی سے فارسی ادب کے اثرات کی وجہ سے اذیت پرست رہے ہیں اور دنیا میں انہیں رنج و محن کے سوا اور کوئی بات کمتر ہی نظر آتی ہے لیکن نثر نگاروں میں بھی مسرت کا ادب ہمیں کم ہی ملتا ہے۔ نثر میں غم و الم کے ادب کی پرانی نشو و نما کی انتہائی بلندی راشد الخیری کی تصانیف ہیں لیکن گذشتہ پندرہ سال میں مغربی اثر سے جو نئی تحریکات ہمارے ادب میں آئیں اور جو نئے رجحانات پیدا ہوئے انہوں نے ہمارے فن کاروں کی تخلیقات میں بعض دلچسپ اور قابلِ تحقیق پہلو نمایاں کر دیئے ہیں۔ خصوصاً ترقی پسند ادب کی تحریک نے ایک نئی قسم کا اذیت پرستانہ ادب پیدا کرنے میں ہمارے مصنّفین کی بہت مدد کی۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر شعراء عموماً اور افسانہ نگار خصوصاً زندگی کے مصائب ہی کا راگ الاپنے لگے ہیں۔ اور چونکہ پہلے زندگی کے مصائب سے لبریز پہلو پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی اور صرف عشرت و مسرت کو ہی سراہا جاتا تھا اس لئے ردِّ عمل کے طور پر ان نئے رجحان والے مصنّفین کو پہلے عشرت پرستانہ تصوّرات ہی سے نفرت ہو گئی اور وہ جہاں ادب میں ایک اصلاح اور وسعت کا موجب بنے وہیں ایک غلط نظری کے بھی مرتکب ہوئے۔ اختر انصاری کے افسانوں کے مجموعے کے شروع میں ایک صفحے پر جو فقرے لکھے ہوئے ہیں۔ وہ اوپر کے خیال کی دلیل ہیں۔ ان فقروں میں ظاہر کیا گیا ہے کہ — یہ افسانے ہجر و وصل اور بوس و کنار کی "غلیظ داستانیں" نہیں ہیں۔ ان میں انفرادی جذبات کی "کیچڑ" نہیں اچھالی گئی۔ یہ افسانے ہماری اجتماعی زندگی کے "ناسوروں" کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اور سماج کے "ٹیکے ہوئے پھوڑے" اور تہذیب کے سڑے ہوئے اعضاء پر ایک بے درد نشتر کے کچوکے ہیں۔ موجودہ نظام کا "جنازہ" اپنے کاندھوں پہ لئے ہوئے ہیں اور ایک مظلوم لیکن بیدار ہوتی ہوئی انسانیت کی حشر انگیز پکاریں"۔

یہ کلمے اُس مصنف (اور شاعر) کے افسانوں کے مجموعے سے پہلے تمہیدی طور پر لکھے ہوئے ہیں جو اپنی ابتدائی ادبی زندگی میں صرف محبت ہی کے لطیف جذبے کا نغمہ خواں تھا لیکن اب عشق و محبت کو کیچڑ بلکہ غلاظت سے تعبیر کرتا ہے۔ زندگی کے متعلق اُس کے اندازِ نظر میں یہ تبدیلی کیونکر ہوئی! ——— اس سوال کا سراغ ان تمہیدی فقروں میں ہے جو میں شروع میں لکھ آیا ہوں۔ اختر انصاری اپنی شعری تخلیقات میں ایک داخلی فن کار تھا نہ صرف یہ بلکہ اس داخلی پہلو کو اُس کی انفرادیت نے ایک نمایاں اور ممتاز رنگ بخشا ہوا تھا۔

اور میرے خیال میں وہ اب بھی ایک داخلی فن کار ہی ہے۔ اگرچہ اُس کے یہ افسانے ایک عام قاری کے ذہن پر اپنا اجتماعی پہلو ہی واضح کر سکیں گے یا اقتصادی مسائل کی اُن اُلجھنوں کو ہی ظاہر کر سکیں گے جن سے دو چار ہو کر اس سرمایہ دارانہ دور میں ہر ہوشمند اور بے غرض انسان کے دل میں موجودہ نظام کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، لیکن ہمیں ان افسانوں کے نفسیاتی تجزیئے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ افسانہ نگار ان افسانوں میں

آئینہ دیکھ رہا ہے وہ پہلے ہر افسانے کے خاص کردار کی شخصیت میں اپنے آپ کو کھو دیتا ہے اور پھر اُسی کی نظر سے سماج کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا ہے۔ یہ شخصیت کا تبادلہ اُس کی گویا فطرتِ ثانی بن چکا ہے اور اسی لئے بعض افسانوں میں جب وہ خاص کردار کو واحد متکلم سے نجات بھی دے دیتا ہے تو اُس کی کہانی اپنی نہیں بلکہ اُسی کردار کی ہوتی ہے۔ لیکن یہ صورت کم ہی پیش آتی ہے کیونکہ اس مجموعے کے چوبیس افسانوں میں سے تین چار افسانے ہی ایسے ہیں جن میں وہ واحد متکلم کو افسانے کا خاص کردار نہیں بناتا۔ اور اجتماعی حالات کو اس طور پر انفرادی لحاظ سے دیکھنے میں ایک فائدہ ہوتا ہے افسانہ ہمیں جگ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی معلوم ہوتا ہے اور ہمیں بھی اس بغاوت میں اپنا ہمنوا بناتا ہے جو مصنف کے مفکر قلب و دماغ میں پیدا ہوتی ہے۔

ترقی پسند ادب میں ایک نقص عام ہے، اس سے مصنف کی محدود نظری کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اختر انصاری کے افسانے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سماجی مظلوموں میں سے صرف ایک ہی طبقے یا ایک ہی قسم کے افراد کو اپنا موضوع نہیں بناتا۔ وہ بجائے اس کے کہ مظلوم افراد کو اپنے افسانوں کا کردار بنائے، سماج کے غلط اور نقائص سے لبریز پہلوؤں کو ان میں زیرِ بحث لاتا ہے۔ اور اس لئے نہ صرف محدود نظری کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ زندگی کی وسعت کا آئینہ دار رہتا ہے۔ اس کی تحریر حقیقت اور خلوص کا اظہار کرتی ہے اور وہ قاری کی نظروں میں ایک عصبی مریض کی بجائے (جو مظلوم کرداروں میں محض غیر شعوری جنسی تسکین کو ڈھونڈتے ہیں) ایک تندرست مصلح بن جاتا ہے۔ مثلاً "میں نے ایسا کیوں کیا"۔۔۔ اس افسانے کا موضوع وہ مصیبت زدہ یتیم لڑکا نہیں ہے جس کا ظالم اور خود غرض چچا اُسے ایک لاوارث ظاہر کر کے دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے بلکہ ہمارے ملکی اور سماجی نظام کا وہ افسوسناک پہلو ہے جس میں یتیموں اور غریبوں کی تعلیم کا بندوبست اُن کے زیادہ خوش قسمت ہم وطنوں کے دوش بدوش نہیں کیا جاتا۔

اسی طرح "خام مواد" اگرچہ بظاہر دو دوستوں کے تعلقات کا ایک دلچسپ نقشہ ہے لیکن حقیقتاً اس میں بھی بہت لطیف انداز میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ملک میں اکثر بلکہ بیشتر ایسے نوجوان ہیں کہ اپنی عمر کے اس دور میں جب انہیں تعلیم حاصل کرنا چاہیئے اور ملک کے لئے اپنی ہستی کو مفید بنانا چاہیئے۔ حالات کی مجبوری کی وجہ سے فکرِ معاش کے سلسلے میں انہیں وہ کام کرنے پڑتے ہیں۔ جن کی مشقت ان کی روحِ حیات کو کچل دیتی ہے بلکہ اُن کے حواس تک کو معطل کرنے کا باعث بنتی ہے۔ اس افسانے کا نوجوان ایک پنکھا قلی ہے جسے گرمیوں کی راتوں میں اس لئے جاگنا پڑتا ہے کہ سونے میں ایک ایسے انسان کی مدد کرے جسے آرام سے سونے کا حق اس لئے زیادہ ہے کہ اُس کے پاس چار پیسے ہیں۔ اس کہانی کو پڑھ کر ہمارے دل میں یہ خیال ضرور آتا ہے کہ ایسے نظام کو بدل دینا چاہیئے اور اقتصادی مساوات کو اصولِ حیات بنانا چاہیئے لیکن ہمیں اس شخص پر غصہ نہیں آتا جو ساری رات پنکھے کی ہوا کے نیچے چین سے سویا رہتا ہے۔ اور یہ اختر انصاری کے افسانوں کی ایک اور خوبی ہے۔ اُس کا مقصد سرمایہ داروں کی سیاہ کاریاں اور اُن کے ظالم کرداروں کی رسوائی نہیں ہے، اُسے اُن کی ذات سے دشمنی نہیں، اُسے اُس نظام سے نفرت ہے جس کی وہ پیداوار ہیں۔

"اندھی دنیا" میں (جس کے نام پر کتاب کا نام رکھا گیا ہے) اسی تعلیم اور غربت کے مسئلے کو باقاعدگی سے زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے اپنے اندازِ نظر کو خارجی رکھا ہے۔ حمید ایک چھوٹا سا لڑکا ہے جس کے دل میں اُمنگیں ایک شدت اختیار کر لیتی ہیں، جب وہ دیکھتا ہے کہ امتحان میں اول آنے پر اسے دو روپے ماہوار وظیفہ ملتا ہے تو اس وظیفے کو قائم رکھنے اور آئندہ زیادہ انعامات پانے کی دُھن میں وہ انہماک سے پڑھتا ہے لیکن گھر میں صرف ایک مٹی کا دیا ہے۔ چاندنی راتوں میں کھیتوں کی منڈیر اس کا مسکن ہوتی ہے اور چاند کی دھندلی روشنی علم کا نورانی بادل، لیکن یہی بادل اُس کے لئے غم کی گھٹا ثابت ہوتا ہے جب اس طور کے مطالعے سے اُس کی پہلے ہی کمزور آنکھوں کی بینائی مستقل طور پر جاتی رہتی ہے اور اُس کی دنیا ہمیشہ کے لئے اندھی ہو جاتی ہے۔

ان افسانوں میں ایک اور خصوصیت بھی نمایاں ہے ان میں کوئی فالتو یا فضول بات نہیں بیان کی جاتی اور یوں وحدتِ تاثر قائم رہتی ہے۔ البتہ بعض دفعہ افسانہ نگار کی انفرادیت اُس کے افسانے کو کہانی سے ہٹا کر انشا پردازی کا ایک نمونہ بنا دیتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑھ کر قابلِ ذکر وہ "مضمون" ہے جسے "ڈپٹی صاحب" کا عنوان دیا گیا ہے ایک صاحب، ڈپٹی صاحب قاضی عبدالغفار کے "لیلےٰ کے خطوط" کے عاشق ہیں اسی کتاب کے خیالات کا پرچار وہ ہر وقت کرتے رہتے ہیں اور ہر جگہ یہی رونا روتے رہتے ہیں کہ ہماری سماج میں مرد عورت پر لگاتار بے انتہا مظالم کئے جا رہا ہے۔ لیکن آخر کار جب ان کی بیوی مر جاتی ہے تو وہ بھی اپنی عمر کی زیادتی کے باوجود ایک نوعمر بہاری دوشیزہ سے نکاحِ ثانی کر لیتے ہیں۔ اس

انشاء میں یہی آخری نکتہ ایسا ہے جس سے اس میں کہانی کا انداز پیدا ہو جاتا ہے اگر ان آخر کی چند سطروں میں افسانہ نگار پلٹا نہ لیتا تو یہ افسانہ (؟) محض تبلیغی خیالات کا ایک مرقع بن کر رہ جاتا لیکن مختصر افسانے کی ٹیکنیک کے لحاظ سے ایسی خام چیزیں اختر کے افسانوں میں شاذ ہی نظر آ سکتی ہیں اور غالباً اُس کی افسانہ نگاری کے دور میں یہ ابتدائی کوششیں ہیں جب ابھی اُس کے ذہن پر نئے خیالات کا اثر زیادہ تھا اور اُس نے ابھی افسانے کے فنّی پہلو پر قابو نہ پایا تھا۔ بعد کی چیزوں میں اگر اُس کی کہانیوں کا فنّی پہلو بھی اپنی بلندی کو اُسی زور کے ساتھ ظاہر کرتا ہے جس زور کے ساتھ وہ مصنّف کے خیالات کو ہمارے نوٹس میں لاتا ہے۔

ہر افسانے کے متعلق علیحدہ علیحدہ کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں اور اس سے وہ صحیح تاثّر بھی نہیں پیدا ہو سکتا جو اختر انصاری کی خصوصیّت ہے یہ افسانے نپے تُلے لفظوں میں صرف اپنے تاثّر کے متعلقہ الفاظ ہی سے تیار کئے گئے ہیں اور اس لئے اقتباس سے اِن کی خوبیوں کا اُس قدر اندازہ نہیں ہو سکتا جس قدر انہیں پڑھنے کے بعد۔

اندازِ بیان کے متعلق بھی صرف اسی قدر کہنا کافی ہے کہ وہی اختر انصاری جو اپنی شاعری میں سادگی، خلوص، بے ساختگی اور اختصار کی مثال تھا یہاں بھی اپنی اُنہی خصوصیّات کو لئے ہوئے ہے۔ آخر میں ایک بات کا جتانا میں ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ کتاب کے شروع میں جو تمہیدی فقرے درج کئے ہوئے ہیں وہ نہ صرف فالتو ہیں بلکہ افسانہ نگار کے اندازِ نظر کو متعصّبانہ ظاہر کرتے ہیں۔ اُن کے بغیر بھی "مقصدی" ادب کا کام بخوبی چل سکتا ہے۔ اور ترقی پسند ادب کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ در پیش نہیں آ سکتی۔

میرا خیال ہے کہ مختصر افسانوں کے اس بیش قیمت مجموعے کے صحیح درجے کو جانچنے میں ملک کبھی غلطی نہ کھائے گا اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے اردو جاننے والے ادیب اس کے ترجمے کی طرف بھی رجوع ہوں گے۔

فضائی حملہ سے بچاؤ مؤلفہ خاں صاحب چودھری بشیر احمد خاں اے، آر، پی، انسٹرکٹر۔ ناشر پبلشرز عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور۔ قیمت آٹھ آنے سائز درمیانی صفحات ۱۱۸۔

یہ چھوٹی سی کتاب وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتی ہے اور اسی لئے اور کتابوں کا حق مار کر اس پر تبصرہ کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ اس سے پیشتر آپ انہی صفحات میں گیس کے دفاع کے متعلق ایک کتاب کا ذکر پڑھ چکے ہیں۔ لیکن یہ کتاب اسی موضوع کو زیادہ وسعت کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ اس میں نہ صرف گیسوں کے اثرات اور اُن کے فوری علاج کے متعلق ابتدائی معلومات تفصیل کے ساتھ دی گئی ہیں۔ بلکہ ہوائی جہازوں اور بموں کی پہچان اور فضائی حملے کی صورت میں عوام اور متعینہ افسروں کے فرائض سے بھی آگاہ کیا گیا ہے۔ فضائی حملے کی صورت میں جس خوف و ہراس اور بدنظمی کے پھیلنے کا اندیشہ ہوا کرتا ہے۔ اُس کو دُور کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ اس کتاب کو نہایت غور کے ساتھ پڑھا جائے اور اس میں جو باتیں لکھی ہوئی ہیں اُنہیں یاد رکھا جائے تاکہ خدانخواستہ اگر بین الاقوامی صورتِ حالات کے مدِ نظر ہندوستان کو بھی براہِ راست جنگ سے دوچار ہونا پڑے تو پبلک کے جان و مال کا کم سے کم نقصان ہونے پائے۔ ضرورت ہے کہ اس لٹریچر کو زیادہ سے زیادہ اشاعت دی جائے۔

مؤلف کا اندازِ بیان سیدھا سادہ اور سلجھا ہوا ہے اور زبان بھی آسان ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ کتاب اپنے مقاصد کو مدِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ فنّی لحاظ سے اس میں جو معلومات ہیں اُن کے معیار کے لئے یہی کہنا کافی ہو گا کہ مؤلف نے اے آر پی (ہوائی حملے کی مدافعت) کا باقاعدہ امتحان پاس کیا ہوا ہے۔

اس کے علاوہ کتاب میں جگہ جگہ نقشوں اور لتھو تصاویر کے ذریعے سے تمام مسائل کو آسان سے آسان بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ موجودہ وقت میں یہ کتاب ہر ہندوستانی گھر میں پہنچنی چاہیئے۔

ڈاک کے ڈاکو ادبی دنیا ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک خریداروں کے پاس پہنچ جاتا ہے اگر اس تاریخ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقے کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں: تاکہ پرچہ آپ کو دوبارہ بھیجا جائے اور محکمۂ ڈاک کے دروازے پر ایک اور دستک دی جائے۔ مینیجر

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۴۱ء

جلد ۱۹ — تصویر: آئندہ نسلیں — نمبر ۲

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا ۲۰ مال لاہور سے شائع ہوا

دنیائے کاروبار

حصۂ فلم

راج نرتکی

واڈیا مووی ٹون کا تازہ ترین کارنامہ راج نرتکی فلمی باتوں سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے کئی پہلوؤں سے لائق توجہ ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ غالباً ہندوستانی صنعت فلم سازی میں پہلا موقعہ ہے کہ ایک ہی کہانی کو بیک وقت تین زبانوں (ہندوستانی بنگالی اور انگریزی) میں پیش کیا جا رہا ہے، اس کے علاوہ اگر ایک طرف مادھو بوس جیسا تجربہ کار فن کار ڈائرکشن کے لحاظ سے فلم کی خوبیوں کا ذمہ دار ہے تو دوسری طرف اس کے اداکاروں کا اجتماع بھی بہت پر زور ہے، اداکاروں میں سب سے پہلا نام بین الاقوامی شہرت کی رقاصہ سادھنا بوس کا ہے جس نے پردۂ سیمیں پر اس سے پیشتر کُم کُم رقاصہ نامی کھیل میں اپنے رقص کے کمالات دکھا کر فلم کے متوالوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ اور اپنے آپ کو ایک رقاصہ کے علاوہ ایک لائق اداکار بھی ثابت کیا ہے۔ دوسرا نام پرتھوی راج کا ہے جس کی اداکارانہ صلاحیتوں کے متعلق کچھ کہنا لاحاصل ہے۔ کیونکہ خاموش فلموں کے زمانے سے لے کر اب تک اُس نے بے شمار فلمی افسانوں میں اپنی بے نظیر اداکاری سے اپنے فن کی دھاک بٹھا رکھی ہے۔ اس کے علاوہ بنگال کے مشہور کیرکٹر ایکٹر ارین چودھری بھی ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان تین درخشاں ستاروں کے علاوہ ذیلی کردار بھی کچھ کم نہیں نیام ملی فلم کا پرانا آدمی ہے، اور پرتما داس گپتا اور بنیتا دو دلکش صورتیں فلم کی خوبیوں میں چار چاند لگا رہی ہیں۔ اس کے مکالموں کی خوبیوں کے لئے جناب وحید الدین احمد کا نام کافی ضمانت ہے جنہوں نے کُم کُم رقاصہ میں اپنی صاف اور رواں زبان سے لوگوں کو اپنے حُسنِ تحریر کا قائل کر لیا تھا۔

نہایت مسرت کی بات ہے کہ یہ قابلِ ذکر فلم عنقریب لاہور کے رٹز سینما میں شائقین کے لئے دلچسپی کا باعث بنے گی،

سوہنی مراد

پنجاب کی رومان نواز سرزمین شاید عشق و محبت کے افسانوں کے لحاظ سے خصوصاً زرخیز معلوم ہوتی ہے۔ نظم ہو، طبقہ اس سے بیشتر پر لکھے اور جیسا کہ ہر پنجابی جانتا ہے۔ پنجابی کے سب سے بڑے شاعر وارث شاہ کی لافانی نظم ہیر ہی کے دو کردار ہیں لیکن وارث شاہ کی "ہیر" میں سوہنی اور مراد کا قصہ ذیلی حیثیت رکھتا ہے۔ اب شائقین کو موقعہ ملا ہے کہ وہ اس ذیلی قصے کو ایک اہم افسانے کی صورت میں دیکھ سکیں، اُمید کی جاتی ہے کہ پنجابی میں یہ فلم ایک خاص درجہ حاصل کر کے رہے گا۔

خزانچی

یہ فلم پنچولی پکچرز کا تازہ ترین کارنامہ ہے اور اس کی زبان اردو ہے۔ پنچولی پکچرز نے پنجاب کی صنعت فلم سازی کو جو بے حد غیر نمایاں تھی اپنے پہلے دو پنجابی فلموں کے ایک دو سالوں ہی میں تمام ہندوستان کی نظروں میں ممتاز بنا دیا ہے۔ اب تک یہ کمپنی صرف پنجابی کھیل ہی تیار کرتی رہی لیکن اردو کا یہ تازہ کارنامہ اُن کی بڑھتی ہوئی ہمت اور بلند ارادوں کا بین ثبوت ہے۔ کہانی کے لحاظ سے جہاں تک ہمیں معلوم ہوا ہے یہ فلم ایک مؤثر تصویر ثابت ہو گی اور انسانی جذبات کی نیرنگیوں کو ظاہر کرے گی۔ اداکاروں کے لحاظ سے صرف دو نام ہی اس کی خوبیوں کی کافی سے زیادہ ضمانت ہیں۔ ایم اسمٰعیل جو پنجاب کا سب سے بڑا فلمی کیریکٹر ایکٹر ہے۔ اس کھیل کے ایک اہم کردار کی نمائندگی کر رہا ہے۔ دوسرا وہ چنچل صورت جس نے تھوڑے ہی دنوں میں اپنی شوخ اور دلکش اداکاری کا کمال دکھا کر لوگوں کے دلوں کو لبھا لیا ہے۔ اس فلم کی ایکٹرس ہے۔

پوجا

"فرزندِ جہاں ہونا کسبِ کمال" کا ثبوت ہے۔ اور اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں کہ نیشنل سٹوڈیوز بمبئی کا تازہ ترین کارنامہ پوجا بمبئی میں ڈھائی ماہ سے خراج تحسین حاصل کر رہا ہے اور یہ قبولیت عام ہر روز بڑھتی ہی جاتی ہے تو ہمیں یقین کرنا پڑتا ہے کہ ضرور اس کھیل میں فن کی خوبیاں اور دوسری دلچسپیاں موجود ہوں گی۔ اس کھیل کی کہانی کا موضوع دو بہنوں کا باہمی افسانۂ کشمکش ہے چھوٹی بہن کی بیٹی کو بڑی بہن متبنّیٰ بنا لیتی ہے اور یوں دونوں اس لڑکی سے ایک گہری وابستگی محسوس کرنے لگتی ہیں۔ اُن کا یہ جذبۂ محبت ہی باہمی نزاع و کشمکش کا باعث بنتا ہے ایک طرف بیٹی ایک طرف بہن — اس الجھن کے متعلق

تو سمجھتے ہیں کہ ان دونوں کا یہ پارٹ اُن کے زمانۂ فلم کا کامیاب ترین پارٹ ہے۔ بیٹی کا پارٹ جیوتی نے ادا کیا ہے جو ایک ہونہار ایکٹرس ہے ڈائرکٹر کاردار ایک کہنہ مشق ڈائرکٹر ہے اور جب سے وہ اپنے ابتدائی ہنگاموں سے رہائی حاصل کر چکا ہے ہر تازہ کھیل میں اس کا قدم ترقی ہی کی طرف بڑھ رہا ہے اور یہ کھیل اس نظریے کی تازہ ترین مثال ہے۔ اس کی کہانی اور مکالمے ایم صادق نے لکھے ہیں جو اس سے پہلے ہولی اور ٹھوکر کے ذریعے سے روشناس ہو چکا ہے اور گیت شاطر غزنوی کی تخلیق ہیں۔

امید ہے کہ بمبئی ہی کی طرح ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی "پوجا" کو قبولیت حاصل ہوگی۔

شکی شوہر

ملی موریا، ہادی، جال مرچنٹ آسمانِ فلم کے قدیم ستاروں میں سے ہیں اور یہی بھگت اور مدراندیل کے مصنف کے تازہ افسانہ شکی شوہر میں یک جا ہو رہے ہیں اس کا افسانہ نفسیاتی ہے اور ایک جج کی زندگی سے متعلق جو عدالت میں اگرچہ اپنے فرض یعنی انصاف کو بھول جاتا ہے لیکن قدرت اس سے اس کوتاہی کا انتقام اس صورت میں لیتی ہے کہ اُسے اپنی بیوی پر اعتماد نہیں رہتا سلتا پوار کلیانی اور شمیم نسائی کرداروں کے حسن و خوبی کے ذمہ دار ہیں۔

پیر ملن

بمبئی ٹاکیز کا تازہ ترین فلم ہے جو کشور ساہو اور سنیہ پربھا پردھان کی دلکش جوڑی کو لئے ہوئے رقص و نغمہ کے ذریعے سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر رہا ہے۔ کہانی سیدھی سادی سماجی سی چیز ہے لیکن گیتوں کی دلکشی اور خصوصاً تلکی موہنی اور ہربات کو نظروں سے اوجھل سا کر دیتی ہے۔ سنیہ پربھا اپنی درخشانی سے ظاہر کر رہی ہے کہ آئندہ چل کر بہت جلد وہ اپنے آپ کو ایک ستارہ بنا لے گی کشور ساہو اپنی آواز اور سادگی سے بھرپور شخصیت کے باعث ایک خاص اپیل رکھتا ہے۔

"ہرجائی"

آئندہ نسلیں

بزمِ ادب

سالنامہ اس دفعہ جنوری کا پرچہ تھا اور اسے جنوری کے آغاز ہی میں شائع ہو جانا چاہیئے تھا لیکن ادبی دنیا کے مخصوص سائز اور وزن کا کاغذ بازار میں نایاب ہو گیا ہے۔ اس تکلیف کے باعث چھپائی بیس بائیس دن تک ملتوی رہی اور پرچہ جنوری کے آخر میں تیار ہوا۔ جن خریداروں اور احباب نے ہماری درخواست پر متوجہ ہو کر رجسٹری کے ٹکٹ ارسال کر دئیے تھے انہیں پرچہ بھیج دیا گیا ہے۔ اور باقی حضرات کی خدمت میں ارسال ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ موجودہ نمبر کے پہنچنے سے پہلے سالنامہ ہر جگہ پہنچ گیا ہوگا۔ جن اصحاب کو نہ ملا ہو وہ رجسٹری کے ٹکٹ بہت جلد بھیج دیں۔ دفتر محصول ڈاک ادا کرنے کا ہر حال میں ذمہ دار ہے لیکن ہزاروں رجسٹریوں کا بار اس پر ڈالنا زیادتی سی ہے اور رجسٹری کے بغیر سالنامہ بھیجنا اسے صریحاً موت کے منہ میں ڈالنا ہے۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ سالنامہ اپنے مضامینِ نظم و نثر اور تصاویر کے لحاظ سے کامیاب رہا یا ناکام۔ ابھی نہ معاصرین نے اس پر رائے کا اظہار کیا ہے اور نہ احباب نے۔ شاید اگلے ماہ تک ہمیں اُن کی آرا موصول ہو جائیں۔ بہر حال ہمیں اتنا اطمینان ہے کہ ہماری بہترین مساعی رائگاں نہیں جا سکتیں۔ ہم اس سالانہ مجلس میں اردو کے بہترین جواں فکر ادیبوں اور شاعروں کو یکجا کرنے کی پُرخلوص کوشش کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ وہ کون ہیں بلکہ اس پر نگاہ رکھتے ہیں کہ وہ کیا لے کر آئے ہیں۔ اور اس طرح ہمارے ہاں سالِ رواں کی ادبی ترقیوں اور رجحانات کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

ہمارے فاضل دوست ملک عطاء اللہ صاحب کلیم ایم اے اس سال بھی سالنامے کے بہترین علمی مضمون پر منصور گولڈ میڈل مرحمت فرما رہے ہیں۔ یہ اُن کی طرف سے چوتھا طلائی تمغہ ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس بار بہترین مضمون کا انتخاب پڑھنے والوں کی رائے کے مطابق کیا جائے۔ اس لئے تمام ناظرین کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ اس بارے میں ہمیں اپنی قیمتی رائے سے بہت جلد مطلع فرمائیں تاکہ اپریل کے پرچے میں اُن کے فیصلے کا اعلان کیا جا سکے۔

اشاعت زیرِ نظر کے مضامین کو سالنامے کا تتمہ سمجھنا چاہیئے جیسا کہ ہم اعلان کر چکے ہیں مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کا قیمتی مضمون اردو کی شاہی سرپرستی، شاہد احمد صاحب ایڈیٹر ساقی کا افسانہ کھڑکی اور جناب کرشن چندر کا طویل مختصر افسانہ گرجن کی ایک شام درحقیقت سالنامے کی چیزیں ہیں جو ہماری مجبوریوں اور کوتاہیوں کے باعث کسی طرح شاملِ اشاعت نہ ہو سکیں۔ البتہ محترمہ عصمت چغتائی کا مطالعہ **بیمار** اور علی احمد صاحب کا قابلِ قدر مضمون یوکرائنوں کے گیت فروری ہی کے لئے مخصوص تھے۔ بعض کیا اکثر پڑھنے والوں کا خیال ہوتا ہے کہ سالنامے کے مضامین اپنے معیار کے اعتبار سے عام پرچوں کے مضامین سے بہت بلند ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہماری ناقص رائے میں یہ خیال خالی از مبالغہ نہیں، لیکن موجودہ اشاعت کے متعلق تو ہم نہایت وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک مختصر سالنامہ ہے جو بڑے سالنامے کے عین بعد آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

گرجن کی ایک شام افلاطونی محبت کا ایک گہرا نفسیاتی تجزیہ ہے اور کرشن چندر نے اس کی جمال افروزیوں میں وہ تمام کوہستانی رعنائیاں صرف کر دی ہیں جو اُن کے دل آویز تخیل اور رومانی مشاہدات کی تخلیق ہیں۔ انجام حسبِ معمول الم ناک ہے اور فن کار کی روحانی ترقیوں سے ہم آہنگ۔ اس افسانے میں ہم کرشن چندر کو فن کے ایک ایسے موڑ پر پاتے ہیں جہاں سے اُن کی آئندہ روش کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے وہ مبہم رومانیت کے دھندلکوں میں کھو جائیں، ممکن ہے وہ حقیقت نواز ترقی پسندی کی دھوپ میں واپس آ جائیں۔ فی الحال ہم انہیں خدا حافظ ہی کہہ سکتے ہیں۔

عصمت چغتائی نے بیمار میں اپنے بے رحم نفسیاتی تجزیے کو جاری رکھا ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ وہ اس سرحدی مقام پر آ پہنچی ہیں، جہاں سے فی الحال انہیں ایک قدم بھی آگے نہیں اٹھانا چاہیئے۔ اور اپنی رفتار کو ذرا سنبھالنا چاہیئے۔ شاید اس طرح وہ لوگوں کی ذہنی سرحد کو کچھ اور آگے بڑھا سکیں۔

صلاح الدین احمد

(۲)

زندگی کے ہنگاموں میں ایک اور دلچسپ ہنگامے کا اضافہ ہوا۔ سالنامہ تکمیل کو پہنچا اور یہ نئے سال کا دوسرا شمارہ اب پیشِ نظر ہے۔ گذشتہ سال میں محبوبِ شعر نے جو ادائیں دکھائیں اُن کا منتہا سالنامے میں ظاہر ہو چکا اور سالِ رواں میں جو جلوے دکھائی دیں گے اُن کی امید افزا جھلک اس شمارے میں موجود ہے۔

آج سے پہلے کی اردو شاعری میں کردارنگاری، مثنوی، مرثیئے اور ہجو تک محدود تھی، غزل کے کردار مثلاً عاشقِ زار، محبوبِ جفا کار، رقیبِ ناہنجار، واعظِ ریاکار، یا زاہدِ شب زندہ دار اپنے آپ میں زندگی کا چلتا پھرتا عکس نہیں رکھتے تھے، یہ سب کردار محض محدود و مخصوص رجحانات کے مجموعے تھے جن سے ایک معین موقعے پر معین چلن ہی کی توقع کی جا سکتی تھی۔ گویا یہ مشینیں تھیں بلکہ ریل کے انجن تھے جو شاعرانہ محکمے کی ساختہ پٹڑیوں پر ہی چل سکتے تھے۔ اپنے آپ میں آ کر کسی نئی ڈگر پر چلنا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن نئی شاعری میں جب شاعروں کو غزل کی یک رنگ ہیئت سے چھٹکارا نصیب ہوا اور وہ اس تنگنائے سے ہٹ کر بہنے لگے تو جہاں اُن کی اپنی انفرادیت نے نت نئے رنگ نمایاں کرنے شروع کئے وہاں شعر میں شخصیت اور کردار کے نئے امکانات بھی پیدا ہو گئے۔ آج اردو کے نوجوان شعرا کے کلام میں جہاں اُن کی اپنی انفرادیت کے مختلف رنگ موجود ہیں وہاں اُن کے اپنے کئے ہوئے مطالعے بھی کردار کے تنوّع میں اضافہ کر رہے ہیں۔ راشد کی نظم "خودکشی" کو بھی اسی نقطۂ نظر سے دیکھئے۔ میں کسی اور مقام پر لکھ چکا ہوں کہ راشد کی نظموں میں یہ بات اکثر موجود ہے کہ وہ ایک جھجکتے ہوئے تھکے ماندے انسان کا تصور پیش کرتا ہے جس کے ذہن پر تہذیب و تمدن کی الجھنوں کا اثر ذرا حد سے زیادہ ہوا ہو جو کسی بات سے جی بھر کر پورے طور پر لطف اندوز نہ ہو سکتا ہو، ایک نقطے سے ہٹ کر دوسرے نقطے تک جاتا ہو اور پھر دوسرے سے تیسرے تک، راشد کی اس نظم کا انسان بھی کچھ اسی قسم کا انسان ہے۔ راشد نے اپنے نظم سے منسلک خطیں بھی میرے اس نظریے کی تائید کی ہے —— "اس میں ایک ایسے آدمی کے خیالات کا عکس آپ کو ملے گا جو زندگی کے (یکساں بہاؤ) اور (بیزار کن کیفیت) میں شب و روز گرفتار ہے۔ ہر روز اپنے زعم میں یہ سمجھ کر دفتر یا دکان سے اٹھتا ہے یا اپنے ہل کو خیرباد کہتا ہے کہ شاید کل اس زندگی کی یک آہنگی میں کوئی کمی واقع ہو جائے لیکن دوسرے دن وہی دفتر کی فائلیں، وہی سودے اور گاہک اور ناپ تول، وہی ہل اور وہی کھیتی۔ آخر وہ زندگی کی عشوہ کار محبوبہ کے قدموں میں لہو، تازہ اور چمکتا ہوا لہو دیکھ پاتا ہے، مسرتوں میں غم کی آمیزش کا دفعتاً احساس کر لیتا ہے۔ چنانچہ عزم کرتا ہے، آخری عزم کہ مسرتوں اور امیدوں کی انتہائی بلندیوں سے کود جائے تاکہ زندگی کے حجابِ اکبر سے ہمیشہ کے لئے نجات پا لے۔"

سمندر پار کے ایک ملک میں صدیاں گذریں ایک ایسا جوہر پیدا ہوا جس کی قربانی شہادت بن کر لہو کا ایک ایسا چمکتا ہوا نشان بنی کہ آج بھی ہر سال کرۂ ارضی کے لاکھوں انسانوں کے لئے رنج اور جوش کا باعث ہوتی ہے۔ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جن کے لئے نغمۂ شادی ہو یا نوحۂ غم —— گھر کی رونق ہی ہوتا ہے بنفسہٖ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن احمد پوری کا نوحۂ غم اُس صحیح عقیدت اور خلوص کا حامل ہے جو اپنی لذت و کیفیت سے نامحرم کو بھی محرم بنا لیتی ہے۔ "سانس کی بیاکل ایری پھیری رٹے حسین حسین" کے لفظوں میں سازِ دل کا ایک ایسا تار گونج رہا ہے جس کی صدا سننے والے کو بے اختیار سر دھننے پر مجبور کر دیتی ہے۔

عبدالحمید عدمؔ ایک سچا فن کار ہے اور جب وہ اپنے گرد و پیش ادب میں ریاکاری کی "اچھوت خصوصیت" کا غلبہ دیکھتا ہے تو اُس کا ضمیر جھلّا اٹھتا ہے۔ اور اُس کی ذہانت گمراہوں کو تنبیہہ کرنے پر بیدار ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ محض ہجو پر نہیں اُتر آتا کیونکہ اس کا جوہرِ شعری ایک نفاست سے پُر طنز پر حاوی ہے اور یوں احتیاط سے اُس کا نظریہ زیادہ مدلّل دکھائی دیتا ہے۔ ادب اور آرٹ کے تماشے میں یہ مسخرا پن اُسے اچھا نہیں لگتا اور اُس کے بیان میں جو زور ہے وہ ہمیں بھی اُس کا ہمنوا بنا دیتا ہے۔

قیوم نظرؔ بھی ایک تماشائی کا ذکر کر رہا ہے، لیکن اس ڈرامے کی اسٹیج تماشاگاہِ ہستی ہے۔ شام سے رات اور رات سے صبح تک بہت سی بدلتی ہوئی کیفیات نمودار ہوتی ہیں۔ اور شاعر کے دل پر اثر کرتی ہیں لیکن شاعر دیکھتا ہے کہ منظر کی اس "بِن" کے مقابل میں جھینیں بھی ہیں، یہ جھینیں ستارے ہیں، جن پر رات کی بدلتی ہوئی کیفیتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا، وہ مسلسل ایک ہی رنگ میں جھلملاتے رہتے ہیں۔ شاید غیر شعوری طور پر شاعر اپنی بدلتی ہوئی اثر انگیزی سے تنگ آیا ہوا ہے اور ان ستاروں کی بے حسی پر اسے رشک آتا ہے۔

روشن دین تنویر اب تک اکثر آپ کی نظروں میں ایک نظم نگار ہی کی صورت میں آتا رہا ہے لیکن اس دفعہ اُس کی "دو غزلیں" ظاہر کر رہی ہیں کہ وہ جتنا اچھا نظم نگار ہے غزل گوئی میں بھی اس سے کچھ کم نہیں۔ اگرچہ پہلی غزل بھی خوب ہے لیکن دوسری غزل کے تو ہر شعر میں ایک کیفیت ہے۔ ایک نفاست ہے، بات کا ایک سلیقہ ہے۔

"ناگ سبھا کا ناچ" —— ایک نوجوان عورت کا نفسی مطالعہ ہے جب جسم کے بعض غدودوں کی تبدیلی نئی کیفیت، نئے میلان اور نئی آرزوؤں کا باعث بنتی ہے۔ ناگ، سنکھ اور بعض دوسری چیزیں استعارے ہیں۔

میراجی

آئینۂ عالم

بحری جنگیں

مردِ میدان اور تلوار کا دھنی ایسے محاورے اب گئے گذرے زمانے کی بات ہیں۔ ایک وقت تھا کہ باوجود سپہ سالار کے حکم پر اندھا دھند عمل کرنے کے ہر سپاہی اپنی ذاتی عقل و دانش سے بھی میدانِ جنگ میں کام لے سکتا تھا لیکن آج کل میدان سے ہٹ کر جنگی کارناموں کا ماحول سطح سمندر اور فضائے بے پایاں سے متعلق ہو گیا ہے اور اس ماحول میں جنگ کی کامیابی کا انحصار زیادہ تر سائنٹیفک آلات کی برتری پر ہے۔ یہ مانا کہ سپاہیوں کی ہمت اور چابکدستی کو بھی اس میں کافی دخل ہوتا ہے لیکن اُن کی کارگذاری سائنس ہی کی محتاج رہتی ہے۔

موجودہ بحری جنگوں میں میدانِ جنگ کا قدیم تصور تو قائم ہی نہیں رہ سکتا کیونکہ عرصۂ کارزار یا نسات میل کا معاملہ نہیں ہوتا۔ عموماً بڑے بڑے جہاز اس قدر فاصلے سے سرگرم جنگ ہوتے ہیں کہ اُن کے کارکنوں کو ایک دوسرے کے جہاز کا صرف بلند ترین حصہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ماہرین نے ایسی توپیں بھی تیار کر لی ہیں جن کے ذریعے سے بارہ سے لے کر بیس میل تک نہایت صحیح اور تباہ کن نشانہ کیا جا سکتا ہے ان توپوں کے لحاظ سے میدانِ جنگ کا رقبہ تقریباً ساٹھ ہزار مربع فٹ ہو جاتا ہے۔

ایک بڑا جنگی جہاز عموماً طول میں چھ سو فٹ اور عرض میں نوّے فٹ ہوتا ہے۔ لیکن اتنے بڑے جہاز کو بھی جسے ایک طرح سے ایک آہنیں جزیرہ کہا جا سکتا ہے۔ اُس کے پہلو بہ پہلو ایک اور جہاز لا کر پسپا کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ جنگ میں ہی ایسی ایک دو مثالیں قائم ہو چکی ہیں کہ جرمن جہاز برطانوی جہاز سے زیادہ بڑی توپیں رکھنے کے باوجود فرار پر مجبور ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بحری جنگ میں سائنس کی برتری کے باوجود توپوں کے استعمال کی قابلیت اور چابکدستی کو اب بھی کافی دخل ہے۔

جس وقت دو جہاز باہم جنگ کے لئے تیار ہوتے ہیں تو آنکھ جھپکتے میں وہ ایک دوسرے سے نہیں جُٹ جاتے بلکہ سب سے پہلے انہیں اپنے قیام کے لئے خاص جگہ کا تعین ضروری ہوتا ہے اور اس تعین ہی میں گھنٹوں صرف ہوتے رہتی ہے۔ اس عرصے میں بہت دیر تک کوئی گولہ نہیں پھینکا جاتا۔ اور اگر ایک دو بار توپ چلائی بھی جائے تو درمیانی وقفہ کافی دیا جاتا ہے۔ لیکن جگہ کے تعین کے بعد جب جہاز ایک مقررہ مقام پر جم جاتے ہیں اور جنگ باقاعدہ شروع ہو جاتی ہے تو ہنگامۂ کارزار اُسی وقت ٹھنڈا پڑتا ہے جب طرفین میں سے ایک فاتح اور دوسرا مفتوح ثابت ہو جائے۔

برطانوی جہازوں کا طریق کار یہ ہے کہ دشمن کے جہاز کو دیکھتے ہی لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے سے تمام متعلقہ جہازوں کو عمل کے لئے تیاری کا حکم دے دیا جاتا ہے اور ہر جہاز پر ایک ہزار انسان پل کے پل میں سرگرمِ عمل ہو جاتے ہیں۔

بڑے بڑے مہیب گولے جن میں تین سو ہنڈریڈ ویٹ بارود ہوتا ہے۔ بارود خانے سے توپوں تک لے جاتے ہیں۔ آگ بجھانے والے اور جہاز کے بڑھئی لکڑی کے شہتیروں کے انبار لگائے تیار رہتے ہیں تاکہ جہاں کہیں سے جہاز کے تختے ٹوٹ جائیں اُن کی مرمت کی جا سکے۔ لوہار اُن گولوں کی حفاظت کے لئے جو ضروری مقامات پر رکھے ہوئے ہوں لوہے کی چادریں لگانے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ ہسپتال کا حصہ صاف کر دیا جاتا ہے اور ڈاکٹر اپنے کام کے انتظار میں رہتے ہیں۔ اس دوران میں سب سے اوپر کے کارکن دشمن کی گھات میں لگے رہتے ہیں، اور اس سلسلے میں اکثر ہوائی جہازوں کی مدد بھی لی جاتی ہے۔ لیکن ہم اس وقت یہی فرض کرتے ہیں کہ دشمن کے جہازوں کے مستول دکھائی دے رہے ہیں۔ نشانچی اپنی سیدھ باندھنے میں مصروف ہیں اور جہاں اُن کے نشست بیٹھ گئی، انہوں نے نشانہ تاک لیا۔

کمرۂ مہمات میں ایک اطلاعِ برقی دی جاتی ہے جس میں ہوائی رفتار۔ برطانوی اور دشمن کے جہازوں کی رفتار اور اُن کا رُخ، ٹمپریچر، ہوا کا دباؤ، دھوپ کی

مقدار وغیرہ کا اعلان ہوتا ہے۔ یہ تمام معلومات بہت ضروری ہوتی ہیں۔

خاص شمار یہ مشینیں توپوں کے مصالح کے اعداد کا شمار کرتی ہیں اور ہر ایک توپ کے لئے صحیح اعداد کا شمارہ اس میں شامل کر لیا جاتا ہے۔

توپیں ایک ہی طرح کی نہیں ہوتیں۔ ہر ایک کی جداگانہ تخصیص ہوتی ہے وہ ہوائیں جو بلند فضا میں ہوتی ہیں اور جن میں بموں کو گزرنا ہوتا ہے۔ اکثر پہلے چند گولوں کو اُن کے نشانے پر ٹھیک نہیں پڑنے دیتیں۔ کئی ایک اِدھر اُدھر فائر کرنے کے بعد نشانچی "بزن" کا سگنل دیتا ہے اور پھر دشمن پر بے بھاؤ کی پڑتی ہیں۔ یہ اِدھر اُدھر کی بم باری بہت مؤثر ثابت ہوتی ہے تین یا چھ بم جہاز کے اوپر پھٹ کر اتنا کام نہیں کر سکتے جتنا اتنے ہی بم کچھ فاصلے پر گر کر جہاز کے لئے مصیبت ڈالتے ہیں،

جب نشانہ لگایا جا رہا ہوتا ہے تو توپوں کو "شروع کرو" کا حکم دے دیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ توپوں کے دہانوں کے پاس بم رکھ دیئے جاتے ہیں۔ اور بجلی کے مصالحہ گیر ایک ٹن کے بموں کو اُن کی جگہوں پر پہنچا دیتے ہیں اور توپخانہ "تیار" کا سگنل دے دیتا ہے۔ پھر کمرۂ مہمات، سے سگنل دیا جاتا ہے۔ توپوں کا رُخ سیدھا کیا جاتا ہے۔ آخر کار ایک اور حکم منتظم خانہ سے ملتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ توپوں کے پاس تیار رہو۔

اِس وقت شخص منتظر رہتا ہے۔ دشمن کی حرکات کا جائزہ لیا جا رہا ہوتا ہے۔ نشانہ اور سمندر کے بہاؤ کا بار بار جائزہ لیا جاتا ہے کہ کہیں ایک غلط وقت پر لہر کا اُبھار توپوں کے نشانے کو خطا نہ کر دے۔ رفتہ رفتہ دشمن کے جہاز کا سامنا حصہ منتظم خانہ والوں کو دکھائی دیتا ہے۔ انگریزی جہاز لہروں کے ساتھ جھکولے کھاتا ہے اور بر وقت "کمرۂ اختیار" میں چابی دبائی جاتی ہے اور ———— "اڑاڑا دھم" تمام جہاز توپوں کی حرکت سے لرزنے لگتا ہے۔

دس یا اس سے کچھ زیادہ سیکنڈ گزرتے ہیں جب بم فضا میں چیختے سنائی دیتے ہیں، کئی اور لمحات اسی طرح بے قراری میں صرف ہوتے ہیں جبکہ نشانچی دشمن کو اپنی دُوربینوں سے تاکتے رہتے ہیں۔ بالآخر پانی کے تودے اُٹھ کر گرے ہوئے بموں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان سے نشانے کو جانچا جاتا ہے۔ اور ضروری تبدیلیاں عمل میں لائی جاتی ہیں۔

ایک مرتبہ پھر توپیں گونجتی ہیں۔ ممکن ہے کہ پہلی بار کا نشانہ خطا ہو گیا ہو۔ دوسری بار خطا ہونے کے بھی امکان ہیں لیکن اگر نشانچی اور خبر گیروں نے صحیح تخمینہ لگایا ہو تو تیسری بار کا نشانہ ضرر کاری ثابت ہو گا۔

چند منٹوں کے لئے توپیں بڑی تیزی سے گرجتی رہتی ہیں۔ پھر جہازوں کا تناسب انداز بدل جاتا ہے نئے تخمینے لگانے پڑتے ہیں۔ دشمن کا ایک بم بار جہاز دھوئیں کا ایک پردہ پھیلا دیتا ہے۔ ہوائی جہاز حملہ کرتے ہیں اور جہاز کو اپنا رستہ چھوڑ دینا ہوتا ہے۔ جنگ کا طریقہ کار پھر بدلنا پڑتا ہے۔ دوبارہ پیمائش، نشانہ بندی اور مرکز طلبی کے لئے بم برسائے جاتے ہیں۔ اور پھر وہی تمام کارروائی دہرائی جاتی ہے۔

بڑے جنگی جہازوں کی بم باری بغیر التوا کے جاری نہیں رہتی خاموشی کے کئی طویل وقفے جہازوں کو اپنی جگہ قائم کرنے کے لئے درمیان میں آ جاتے ہیں۔ اکثر یہ خاموشی چوبیس یا اس سے بھی زیادہ منٹ کے عرصے تک جاری رہتی ہے حتّٰی کہ جہاز اپنے دوسرے جہازوں کے سلسلے سے علیٰحدہ ہو جاتا ہے جس کا باعث یا تو دھند ہوتی ہے یا طوفان باراں۔

اختیار گاہ کے کارکن دشمن کی نشان دہی میں لگاتار مصروف رہتے ہیں۔ ہوائی جہاز بھی اس تلاش میں رہتے ہیں کہ وہ نشانہ فاصلہ اور رُخ کی اطلاع دے سکیں اور جو مدد اُن سے بن پڑے کر سکیں۔ بڑی توپیں اس دوران میں بھری پڑی رہتی ہیں۔

آہستہ آہستہ وہ اپنا رُخ جہاز کے رُخ کے ساتھ ساتھ رُخ بدلتی رہتی ہیں اور اسی رفتار سے وہ ان احکام کی تعمیل کرتے رہتے ہیں جو افسروں سے انہیں ملتے رہتے ہیں۔ افسر جہاز کی سب سے نچلی منزل میں ہوتے ہیں۔ اور یوں اوپر کے حکم بجا لانے والے کارکن ہر وقت نشانے کی زد میں ہوتے ہیں۔

اس دوران میں اوپر کی منزل والے کارکنوں کو ایک دھندلا قسم کی نقلی سی توپ دکھائی دیتی رہتی ہے جو انہیں اپنی اصلی توپوں سے گولہ پھینکنے کے لئے نشانے بتاتی ہے۔ جب حکم کی تعمیل کا لمحہ آتا ہے تو اس اشارتی توپ کو چلانے کے انداز میں قائم کر دیا جاتا ہے۔ جہاز حرکت میں نہیں ہوتا۔ دشمن کا مقام معین ہوتا ہے توپوں کے گولوں کو اُس تک پہنچنے کے لئے صرف دس سیکنڈ درکار ہوتے ہیں اور اس مختصر عرصے میں گولے بارہ میل کا فاصلہ طے کر کے بہت آسانی سے وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ بٹن کے دبتے ہی حملہ آور جہاز کی توپیں دشمن کی تباہی کا سامان مہیا کرنا شروع کر دیتی ہیں۔

ایم اے جاوید بی ایس سی

خودکشی

کرچکا ہوں آج عزمِ آخری؛
شام تک ہر روز کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند،
رات کو جب گھر کا رُخ کرتا تھا میں
تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں
مُنہ بسورے، رہگذاروں سے لپٹتے، سوگوار،
گھر پہنچتا تھا میں انسانوں سے اُکتایا ہُوا۔

میرا عزمِ آخری یہ ہے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے بھی!
آج میں نے پالیا ہے زندگی کو بے نقاب
آتا جاتا ہوں بڑی مدّت سے میں
ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ کے پاس
اُس کے تختِ خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ و رخشاں لہو!
بوئے مے میں بوئے خوں اُلجھی ہوئی
وہ ابھی تک خوابگہ میں لوٹ کر آئی نہیں
اور میں کر بھی چکا ہوں اپنا عزمِ آخری،
جی میں آتی ہے لگا دوں ایک بےباکانہ جست
اِس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئے بام کو!
شام تک ہر روز کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک یہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
آج تو آخر ہم آغوشِ زمیں ہو جائے گی!

ن۔م۔ راشد

حُسین حُسین!

انگ میں آگ سلگتی دُکھ کی، رُوم رُوم بے چین
گُھل گیو جیون، نیر بھیو مَن، ڈُوب گئے دو نَین
سانس کی بیاکُل ایری پھیری رَٹے حُسین حُسین!

آپ کا دُکھ من کیسے سموئے جس کا اُور نہ چھُور
تج نہیں دیتا تن کی مایا، جیون بَڑا کٹھور
سانس کی بیاکُل ایری پھیری رٹے حسین حسین!

تن پنجرا اور جیون پنچھی، پڑی آتما دور
اس اندھکار بھری مایا نے پھانس لیا بھرپور
سانس کی بیاکُل ایری پھیری رٹے حسین حسین!

آپ کا چاکر احمدپوری دُکھی رہے دن رین
اپنے بھکاری کو اب دیجے آتما کا سُکھ چین
سانس کی بیاکُل ایری پھیری رٹے حسین حسین!

سیّد مقبول حسین احمدپوری

یوکرائنا کے گیت

یوکرائینوں کے گیت ــــــ لیکن آپ جانتے ہیں یوکرائنا کیا ہے؟

جہاں ــــــ بہار کے موسم میں گرم خوشگوار ہوا سانسیں لیتی ہے اور اپنے ساتھ مصر کے بے شمار جنگلی مرغ اور دوسرے پرندوں کو اڑا لاتی ہے۔ جہاں کے جنگلوں کی زمینیں نیلے بنفشوں اور سرخ گلابوں سے پٹی رہتی ہیں جہاں موسم بہار کی ندی "دسنیا لکا" دوسری معاون ندیوں کے ساتھ مل کر سبز گھنے جنگلوں سے گنگناتی ہوئی گزرتی ہے اور جس کے پیہم ترنم سے دور دور تک فضائیں گونج اٹھتی ہیں۔ جہاں سورج اپنی پوری تمازت کے ساتھ ضیا پاشی کرتا ہے۔ جہاں بید کے زرد جھنڈ اور طویل قامت شاہ بلوط ہمیشہ فضا میں سبزی بکھیرتے ہیں۔ جہاں کے باغ شاہ دانوں کی فراوانی سے سفید ہیں۔ جہاں لاکھوں کی تعداد میں بلبلیں ساری رات گاتی رہتی ہیں اور جہاں پیٹردس نٹالکا سے سچی محبت کرتا ہے۔

وہاں ہے یوکرائن ــــــ جہاں موسم گرما میں ڈنائیپر اپنے دامن کو زر دہانی کی موجوں سے خالی کرنے کے لئے بحرِ اسود کی نیلی موجوں کی طرف بھاگتی نظر آتی ہے اور جس کے وسیع ــــــ وسیع ساحل پر اونچے فلک بوس پہاڑ "اہرام مصری" کی طرح خاموش اور سنجیدہ کھڑے ہیں۔ پکے ہوئے گندم کے سنہرے میدانوں کو دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔ جہاں دیہاتیوں کی سفید چھوٹی جھونپڑیاں گلناری سیبوں، پیلی ناشپاتیوں، اغوانی آلو بخاروں اور بھوبڑوں کی ان تھک تانوں میں خود کو چھپا لیتی ہیں۔ جہاں بید کے تلے چوڑی سڑک کے کنارے بوڑھا فقیر بیٹھا کھوئی ہوئی آزادی کے گیت گاتا ہے۔ جہاں ماضی کے آزاد دور کے پوتے اب دھوپ میں چمکتی ہوئی درانتیوں سے گھاس کاٹتے ہیں ــــــ اسی کھیت میں جہاں اُن کے آباؤ اجداد کی تلواریں چمکا کرتی تھیں۔

وہاں ہے یوکرائن ــــــ جہاں خزاں کے موسم میں دریائے دونائی کے فرحت پاش کناروں پر "تلخ ہوپ" کی سنہری اور پتلی بیل بید مجنوں کے عریاں درختوں کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے۔ جہاں کرونڈے کی جھاڑیوں پر سرخ خوشے خزاں کے سورج کی تپتی ہوئی دھوپ میں یاقوت کے مالے کی طرح چمکتے ہیں، جہاں مرد سیناگوندنی کے جنگل میں بیر چنتی ہوئی اپنے محبوب کی جدائی کے گیت گاتی ہے۔ جہاں چوپایوں کے گلے گہرے بادامی رنگ کے کھیتوں میں صبح سے شام تک چرتے ہیں۔ جہاں چنار اپنے نئے ہرے پتّوں کے ساتھ کسی تنہا قبر پر کھڑا اس طرح سرسراتا ہے جیسے کوئی بدقسمت دوشیزہ اپنے بھولنے والے کے لئے رو رہی ہو۔ جہاں جب پتے گرتے ہیں اُس وقت رات کا آسمان بہت نیلا اور ستارے بہت روشن ہوتے ہیں۔

یہ ہے یوکرائنا ــــــ جہاں سردی کے موسم میں بطوں کی طرح سفید برف کھیتوں کو ڈھانک کر انہیں ایک بیکراں سفید سمندر بنا دیتی ہے۔ جہاں گرتی ہوئی گھنی برف کا جادو کہر کو اولوں اور ژالوں میں بدل دیتا ہے اور سارا جنگل سمندر کی تہہ کے رو پہلے مونگوں کے جنگلوں کی طرح نظر آنے لگتا ہے۔ جہاں لوگ یہ جانتے ہیں کہ موسم سرما کو بے فکر دیہاتیوں کی صحبت میں کس خوشی سے بسر کیا جا سکتا ہے۔ جہاں کرسمس کے دنوں میں "بت پرستوں" کی دیوی "لاڈا" کے بھجن دن رات سنائی دیتے ہیں۔

جہاں سرخ لومڑیاں دلدلی گھاس کے سایوں میں پناہ ڈھونڈتی پھرتی ہیں اور خاموش پہاڑیوں کے دامن میں پڑے ہوئے خرگوش گھوڑوں کی ٹاپ، شکاری کتوں کی بھونک اور ربگلوں کی اچانک صدا پر چونک پڑتے ہیں۔

وہاں ہے یوکرائنا ــــــ جہاں کارپتھین کی چوٹیوں پر بوڑھے شاہ بلوط اور صنوبر کے درخت گنگناتے ہیں اور جہاں کے ملکی باشندے سفید نقش دار قمیصوں اور سرخ پاجاموں میں پہاڑی وادیوں کے اندر

اپنے گلّوں کے ساتھ "تر بیتا" کھیلتے ہیں۔ جہاں رات کی تاریکی میں بادل گرجتا ہے اور بجلی چکنے ہچال اور چمکدار پتوں والے "بیچ" درختوں کے سفید سینے پر کھیلتی ہے۔ جہاں دوبافن اپنے آپرشکی قزاقوں کے ساتھ چٹانی غار میں چورنا ہورا کے نیچے سوتا ہے ——— اس انتظار میں کہ اشارہ پاتے ہی یوکرائن کے دشمنوں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہو۔

وہاں ہے یوکرائن کا کوہستانی سطح مرتفع جہاں گھاس کے جنوبی بڑے میدان بحر اسود کی لہروں سے جا ملتے ہیں اور بھورے رنگ کے چیل بھیڑوں کے بے شمار گلّوں کو دیکھنے کے لئے آسمان پر حلقے بنا لیتے ہیں۔ جہاں ڈنائپر کے آبشار خور تتسا کے جزیرے سے ٹکرا کر غرّاتے ہیں اور پوچھتے ہیں "ہمارے اسلاف کے پرچم اور اُن کی بندوقیں کیا ہوئیں"؟ وہاں ——— جہاں بادل کا ایک سیاہ ٹکڑا ڈنائپر کے پہاڑ لاتمن پر اس طرح چھا جاتا ہے جیسے پریوں کی کہانیوں کا کوئی بڑا اژدہا۔

وہاں ہیں ریپورونین کے روسی میدان!

اور یوکرائن پر سے صدیاں گزر گئیں ——— پہلے پہلے تو سیاہ بالوں والے سیتھی آرستان سے اپنے گلّوں کے ساتھ یوکرائن آئے۔ بعد میں نیلی آنکھوں اور سفید بالوں والے فنس نے ان کی جگہ لے لی۔ تب دونوں کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ گیا اور پھر طویل قامت سیاہ بھوری آنکھ اور حسین چہروں والے یوکرائنوں نے اس سرزمین کو بسایا جبکہ "پورن" اور "لاڈا" جیسے مہربان خدا ان کی سرپرستی کر رہے تھے۔

منگولی ایشیا سے آئے اور چنگیز خاں نے انسانوں کی کھوپڑیوں سے اپنا مخروطی مینار بنوایا اور راسٹیپس کے میدانوں میں بہادر داوسیچی نے پولووٹس کو کالکا ندی پر روک کر اپنی مادر وطن کو بچا لیا۔ اب بھی یوکرائنی چٹانوں پر سے بہتی ہوئی منگولی لہریں یورپ کو غارت کرنے کے ناقابل تھیں۔ "خان" واپس ہو گئے۔ تہذیب محفوظ رہ گئی لیکن یوکرائن لاشوں سے پٹ گیا ——— انہیں کی ہڈیوں پر روس کی بہادر قوم کوسیک (COSSACK) نے جنم لیا اور تاتاریوں سے مقابلہ کیا۔ یوکرائن میں آزادی کے علمبردار یہی زیپوروغی کوسیک تھے جو نیلی قمیص اور سرخ پائجامے پہنے بھورے گھوڑوں پر سواری کرتے تھے۔

تب ——— پول، ترک اور مسکو دیئون نے اس کو اپنی ہوس کی آماجگاہ بنایا تاکہ ایسے ملک کو جہاں دودھ اور شہد کے دریا بہتے تھے اپنی سیادت میں لے لیں۔ کوسیکوں کی تلواریں صدیوں تک دنیا کے ہر حصہ کے حملہ آوروں کا سر قلم کرتی رہیں۔ آخر کار اس جنت نظیر خطے کا شیرازہ بکھر گیا۔

یوکرائنا کی اب کوئی چیز باقی نہیں، لیکن ان گیتوں میں وہ اب تک جیتی ہیں جو لوگوں کے دلوں پر نقش ہیں۔ یہ گیت یوکرائنا کی مردہ صدیوں کی یادگار ہیں۔ یوکرائن کے لوگ اب بھی جب "کولادی"، "وسینانکی" اور "کوپالنی" گیت گاتے ہیں تو اُن کے سورج اور بادلوں کے دیوتا پھر زندہ ہو جاتے ہیں جو عیسائیت کے دشمن تھے۔

دلہنیں شادی کے گیت گاتی ہیں اور بیتے ہوئے دن واپس آ جاتے ہیں جبکہ ایک منچلا نوجوان اپنے قبیلے کے لوگوں کو جمع کر کے اپنی محبوب دوشیزہ کو اڑا لینے کے لئے ہمسایہ گاؤں پر شب خون مارتا ہے۔ لڑکی کے تمام رشتہ دار اُس کو بچانے کے لئے اٹھتے ہیں اور بسا اوقات کسی خونی لڑائی کے بعد دولہا اپنی دلہن کو بغیر کسی ضرر کے اڑا لے جاتا ہے ——— ایک ہزار سال گزر گئے لیکن گیت یہ ظاہر کرنے کے لئے باقی رہ گئے کہ کبھی ایسی ناشائستگی کے بھی دن تھے۔ یوکرائن کی خانہ جنگی کے دنوں میں ایسا ہوا کرتا تھا جس وقت کہ کوسیک یوکرائنا کی زمین کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندا کرتے اور "آزادی" کے گیت گایا کرتے تھے۔ وہ گیت اب بھی بدن میں خون کی روانی کو تیز کر دیتے ہیں۔

ماسکو، تاتاری، لیتھونیا، پولینڈ، ترکی اور ہٹس من ——— جنگیں بغاوتیں ——— اور آخر کار یوکرائنوں کی آزادی کے آخری مقام "قلعہ سیچ" کے زوال کے بعد کوبزاروں کے گیت میں یوکرائنوں کی تاریخ منتقل ہو گئی۔ اور اب جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یوکرائن کی کوئی تاریخ اُس کے گزشتہ دورِ عظمت کو دہرانے کے لئے موجود نہیں تو ان تاریخی گیتوں کی عظمت بہت بڑھ جاتی ہے۔

غلامی اور جاگیرداری طریقے کا آغاز ۱۷۸۳ء سے ہوا۔ کوسیک اس وقت تک غائب ہو چکے تھے اور اُن کی جگہ یوکرائنی "ژاین ہڈ"، "ہیدوموکی" اور "آپرشکیون" نے لے لی۔ اُن کے کارنامے بھی یوکرائنی گیتوں کا جزو بن گئے۔ نظام جاگیرداری کے غلاموں کی شکستہ حالی اور بے بسی یوکرائنی عورتوں کے گیتوں میں آہ بھرتی ہے۔ آزاد کوسیک اب اُن کے شوہروں کے غلام تھے۔ "بیکس عورتوں کے گیت" بالخصوص درد اور غم سے لبریز ہیں۔ کوسیک کی نسل سے چونکہ اور خانہ بدوش ہوئے انہوں نے اپنے گیت اپنے ٹوٹے ہوئے دلوں پر لکھے ——— "پریم کے گیت" سدا بہار ہوئے۔ یہ گیت بلبلوں کے نغمے اور شاہ دانوں کے پھولوں کی طرح ہمیشہ تازہ، جوان، دلکش اور غیر فانی ہیں۔

"اطالوی گیت" بھی اچھے ہیں لیکن یوکرائنوں کے گیت کے گانے کی انوکھی طرزوں نے ان کا درجہ سب سے الگ اور سب سے بلند کر دیا ہے۔ یہ یوکرائن

کے حُسن سے پیدا ہوئے اور اس لئے حسین ہیں۔ یہ اسٹیپس کے روسی میدانوں میں اُگے اس لئے انہیں کی طرح وسیع ہیں۔ انہوں نے جنگلوں کی آزاد فضا میں جنم لیا اس لئے "آزاد" ہیں۔ یہ مغموم اور بیکس دوشیزاؤں کے آنسوؤں سے پیدا ہوئے، اس لئے پُر درد ہیں۔

یہ ہیں یوکرائنوں کے گیت

لیکن افسوس کہ اصل زبان سے ان کے ترجمے ان کو اپنی اصلیت سے بہت دور کر دیتے ہیں اور یوکرائنوں کے یہ حقیقی وطنی نغمے ہمارے کانوں تک پہنچتے پہنچتے مدھم اور کہیں کہیں بے سُرے بھی ہو جاتے ہیں۔

پولینڈ اور روس کی سرحدوں کے درمیان رہنے والے یہ گلاکی انیسویں صدی میں اپنے فنی کمالوں کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتے تھے۔ آگے چل کر یہ یورپ کے سب سے اچھے گانے والے سمجھے جانے لگے۔ روس کی بہترین موسیقی یوکرائنی موسیقی ہے۔ روس کا مشہور ادیب گوگول در اصل یوکرائنی ہی ہے جس نے رومان نگاروں کے لئے ایک نئی راہ کھولی۔ روسی مصنفوں میکسی موف، ڈریگومانوف، سسنوسکی اور زرتیلیف وغیرہ کے یوکرائنی گیتوں کے مجموعے ۱۸۳۳ء سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر تک شائع ہوتے رہے۔ "رومانی" شاعروں نے بہت جلد اس اثر کو قبول کیا۔ ۱۸۴۰ء کے قریب شیوچیوف جیسے بڑے شاعر نے اس قسم کی شاعری کو کمال کے آسمان تک پہنچا دیا ــــ اس شاعر اعظم کا نام تمام یوکرائنوں کے نزدیک اب بھی مقدس سمجھا جاتا ہے۔

فلورنس رینڈل لیبور سے لکھتا ہے ــــ مجھے یاد ہے میں جس زمانے میں "ونی پیگ" میں تھا روسالکا نامی ایک گانے والی نے مجھ سے ایک مقامی شاعر کے ایک گیت کی روداد بتائی تھی ــــ ایک بے وفا دلہن اپنے ایک چاہنے والے سپاہی کے ہاتھوں قتل کر دی گئی تھی ــــ اناستاسیا تین سال اُس کا انتظار نہ کر سکی لیکن سپاہی اُس کی شادی ہوتے وقت آیا۔ گیت یہ ہے:-

"پہاڑ کے دوسری جانب سے طوفانی ہوا چل رہی ہے۔
"کاش مجھے معلوم ہو سکتا کہ میری محبوبہ کیا کر رہی ہے۔
"میری جان! کیا اب تو یہ چاہتی ہے کہ تو میری ہو جائے!
"آ ــــ تاکہ ہم کسی دن شادی کے بندھنوں میں خود کو باندھ لیں۔
لیکن سب سے پہلے تجھے آئندہ ہفتے تریز بلی کے زہریلے پھول لانے ہوں گے
"تیرے کے پاس میرے اصطبل میں ایک ذہین دار گھوڑا ہے ــــ میں اُس پر سوار ہو کر ضرور پھول لانے جاؤں گا۔

"ان کا پانا بہت دشوار ہے ــــ وہ دور ــــ بہت دور، جنگل کے راستے میں اُگتے ہیں لیکن میں گھوڑے کو تیز دوڑاتے ہوئے جاؤں گا اور اپنی پیاری کے لئے لاؤں گا۔

"میں جنگل پہنچا اور دو چیکلی درختوں کے درمیان "زہلی" کو پایا۔ میں گھوڑے سے اُتر گیا اور اُسے اکھاڑنے لگا۔ ٹھیک اس وقت "زوزولا" قریب اُڑتے ہوئے گایا:-

"نوجوان سپاہی اتنی تکلیف نہ اٹھا۔ پودے کو نہ اکھیڑ۔ تیری محبوبہ تجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔

"وہ کل دوسرے سے شادی کرے گی،

"تب میں جلدی سے پلٹا اور اُس کے گھر پہنچا ــــ اس کے دوست مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے گھوڑے کو اصطبل میں باندھ دیا۔ مجھے دعوت اور شادی کے ناچ میں شریک ہونے کو کہا۔

"میں نے ناچ کی محفل اور شراب نوشی میں شرکت نہیں کی۔ میں اپنی بے وفا سے صرف دو باتیں کرنا چاہتا تھا۔

"میں نے اپنے دائیں ہاتھ سے دلہن کا ہاتھ پکڑا اور بائیں ہاتھ سے اس کے سینے میں گولی مار دی۔

اس طرح اُس کی محبوبہ اپنی دو سہیلیوں کے درمیان گر پڑی جیسے کوئی تارا دو سورج سے روشن بادلوں کے درمیان سے پلا پڑ جاتا ہے۔" یوکرائنوں کے اکثر گیت ہمیں پوئٹ لورر (بوسٹن)، "پوئٹری" (شکاگو)، "دی کرٹیفیشن" (نیویارک) "یوروپین" (ڈاڈنبرا) کنیڈا (لندن اونٹیریو)، "یونیورسٹی میگزین" (مونٹریل) سے حاصل ہوئے۔ بالخصوص "فلورنس رینڈل لیبور سے" اور "پال کراتھ" کا انگریزی ادب پر بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اپنی زبان میں انہیں منتقل کر کے ایک بڑی کمی کو پورا کیا۔

ا۔ بت پرستوں کے گیت

کو پا لو

بت پرستوں کے یہ قدیم گیت اب مشکل سے اپنی اصلی حالت میں ملتے ہیں۔ پرانی کتاب "کولاڈکا" میں اُن کے متعلق صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ جنگل میں شاہ بلوط کے تلے بیج بوئے جاتے ہیں۔ ان بیجوں پر نوجوان

مرد اور دوشیزائیں بیٹھتی ہیں اور سب مل کر "کولادی" گیت گاتے ہیں۔ ڈھوروں کے نیچے آگ جلتی ہے اور ایک بوڑھا شخص ایک بکری کو ذبح کرنے کے لئے چاقو تیز کرتا ہے"۔

"کو" کے لئے کے معنی دیتا ہے یعنی نوجوان مرد اپنی محبوب دیوی لادی کے لئے بھجن گاتے ہیں۔ بوڑھا شخص پجاری ہوتا ہے جو بھینٹ چڑھانے کی رسم ادا کرتا ہے۔

"کوپالو" یا "موروز" یا "کوشیف" تینوں سے مراد کہر کا اژدہا ہے۔ وہ مر گیا اور یخ کے پانی کی طرح نہروں میں بہہ گیا۔ یوکرائن کے "کوپالو ڈے" منانے کے دن اس بت کا عکس پانی میں ڈالتے ہیں۔ دوشیزائیں ندیوں میں اپنے ہار ڈالتی ہیں اور ان ہاروں کے تیرنے کی رفتار سے اپنی قسمت کا اندازہ لگاتی ہیں۔

(۱)

"کوپالو ڈے" منانے کے دن
ایک حسین دوشیزہ نے اپنی قسمت آزمائی۔
وہ اپنا ہار بنانے کے لئے پھول توڑ لائی: ——
"مالوا" کے پھول اور "لیولسٹوف" کی کلیاں ——
اور انہیں دریا کے سینے پر بکھیر دیا۔
"بہے جا میرے ہار موجوں کی دھیمی رفتار کے ساتھ بہے جا سیدھا میرے محبوب کے دریچے کی طرف۔
اس کے دل تک جس سے میں محبت کرتی ہوں۔
اور —— اپنے ساتھ میری خوش قسمتی لے کر آ"۔
پھولوں کا ہار بہہ رہا ہے۔
اور اپنے ساتھ
دوشیزہ کا دل بھی لئے جا رہا ہے
ندی کے موڑ پر
ایک موج نے اس کو پلٹ دیا۔
کوپالو —— کوپالو —— نے
اس کی نذر ٹھکرا دی
اس رات وہ دوشیزہ
"تریزیلی" کا زہریلا پودا لائی
آدھی رات کی تاریکی میں
اس نے انہیں اکھیڑا تھا
پھر جب رات بھیگ چکی
اُن کا عرق نچوڑا
اور زہریلا شربت پی گئی۔

(۲) وسنیانکا —— بہار کی دیوی

اے بہار کی دیوی وسنیانکا!
تو نے سرما کی رُت کہاں گزاری؟
"جنگل میں شاہ بلوط کے اوپر
میں ایک قمیص کے لئے تاگا کات رہی تھی"!
اے بہار کی دیوی حسین وسنیانکا!
سورج کی کرنوں کو لے کر جلد ہمارے پاس آ جا۔

(۳) ہائی وکا —— جنگوں کا گیت

بہار کی دیوی ہمارے لئے کیا لائی؛
خوبصورت زلفیں، دوشیزہ کا حسن ——
دوشیزہ کا حسن گرما کے موسم کی شبنم ہے
بہار جسے دھو کر بھٹی میں خشک کرتی ہے
پھر کاغذ میں لپیٹ کر میز پر جا دیتی ہے۔
بہار کی دیوی اب ہمارے لئے کیا لائی ہے۔
ہمارے لئے قوت، لڑکوں کے لئے حُسن
لڑکوں کا حسن گرما کے موسم کی شبنم ہے۔
بہار کی دیوی جسے بارش کے چشموں میں دھوتی ہے، باڑھ پر خشک کرتی ہے۔
اور پھر جھنڈوں میں لپیٹ کر میز پر جما دیتی ہے

۲۔ شادی کے گیت

یوکرائن کے رواج کے مطابق منسوب شوہر تین دن تک "ڈیوک" کہلاتا ہے اور لڑکی "ڈچس" —— خواہ وہ کتنے ہی غریب کیوں نہ ہوں۔ ہمارے یہاں "پریم گیتوں" میں گلاب کا پھول جو رومانیت رکھتا ہے یوکرائن میں کلینا کا پھول اس کا قائم مقام ہے۔ حسین دوشیزاؤں کو اسی سے تشبیہ دی جاتی ہے مثلاً "کاش میں کلینا کی طرح لال ہوتی تب میں کبھی افسردہ اور غمگین نہ ہوتی۔ میرے ہونٹھ اور میرے گال گلناری ہوتے لیکن افسوس وہ زرد ہیں"۔

اس پھول کے درخت سے متعلق یہ روایت عام طور پر مشہور ہے کہ

ایک نوجوان لڑکی کے قتل کر دیئے جانے پر اس کے رشتہ دار اس کی قبر پر "کلینا" پھول کا درخت اُگاتے ہیں جس کی ایک شاخ سے اس کے بھائی نے ایک بانسری بنائی فوراً اس کی قبر سے ایک آواز آئی۔

"بھائی! بانسری اتنی تیز نہ بجا —— میرا دل دُکھتا ہے۔"

شادی کے رسوم سے متعلق دوسرا پھول جس کا ذکر عام طور سے یوکرائن کے دیہاتی گیتوں میں آتا ہے "باروینو" ہے۔ یہ سدا بہار پھول ہے بعض اس کو بھی قبر پر چڑھاتے ہیں۔ یہ ایک چڑھنے والی بیل کا پھول ہے جو موسم سرما کی برفباری میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ پودا قریب قریب پولینڈ کے "میرٹ" یا خوشبودار ولائتی مہندی کے مماثل ہوتا ہے۔

"باروینو" پھول کا ذکر کہیں کہیں انگریزی شاعری میں بھی آیا ہے مثلاً:۔

"چھوٹے باروینو"

تم دنیا کی چھاتی کے قریب ہی قریب پھیلتے ہو۔

کاش کبھی میرا حسین دوست بھی مجھ سے اتنا ہی قریب ہوتا!"

جون کی چوبیس کو جب گھر کے دیوتا کرپالو کی برسی منائی جاتی ہے جنوبی روس کی جوان کنواری لڑکیاں "باروینو" پھول کے گجرے بناتی ہیں اور انہیں نہروں میں بہا دیتی ہیں۔ اگر ہار ڈوب گیا تو اس سے موت کا شگون بد لیتی ہیں اور جس دوشیزہ کا ہار تیرتا رہا وہ یہ سمجھتی ہے کہ اسی سال اس کی شادی ہو جائے گی۔

(۱) مروسنکا کی شادی

(مروسنکا کا نام یوکرائنی ادب میں وہی اہمیت رکھتا ہے جو "سلمیٰ" اور "لیلیٰ" کے نام اردو ادب میں رکھتے ہیں)

مروسنکا اپنے باپ سے کہتی ہے:۔

"پیارے باپ! دروازے بند کر دیجئے۔

دروازے بند کر دیجئے۔

"ڈیوک" کو قریب نہ آنے دیجئے

قریب نہ آنے دیجئے۔"

"پیاری بچی نہیں، وہ مجھ سے التجا کرتا ہے

کہ میں اس کو اندر آ جانے دوں —— اندر آ جانے دوں

خمل اور ہوپ کی بیلوں کی طرح

دیکھو وہ پیچ و تاب کھا رہا ہے۔"

"باروینو" کے گلدستے کی طرح میز پر کس نے بیٹھنے کی اجازت دی

مغرور —— شکرے کی طرح مغرور"

سورج پہیئے کی طرح آسمان پر چڑھ رہا ہے۔

مروسنکا جنت میں داخل کر لی گئی

"اے دوشیزہ! یہ فردوس کا باغ کس نے تجھے رہنے کے لئے دیا"

"خدا اور میرے باپ نے" وہ جواب دیتی ہے

(۲) ہار بنانے کی رسم

کلینا کا درخت چھوٹی وادی میں اُگتا ہے۔

اور اُس میں ایک سفید پھول کھلا ہوا ہے۔

دولھن کی سہیلیاں ایک شاخ پر سے اُسے توڑنے گئیں۔

لیکن اب وہ خالی ہاتھ آ رہی ہیں۔

وہ اُسے توڑ نہیں سکتی تھیں۔

لیکن وہاں مروسنکا گئی

وہ چھوٹی دُلہن خود وہاں گئی

"کلینا" کے پھول کی شاخ اس کے سامنے جھک گئی

مروسنکا اپنے گھر آئی جہاں شادیانے بج رہے تھے۔

جہاں اس کی خوبصورت سہیلیاں جمع تھیں

اُس نے ان پھولوں کو اپنے چہرے کے آگے رکھ لیا

اور مشتاق نگاہوں سے انہیں دیکھا

تب مروسنکا نے اپنے باپ سے پوچھا:۔

"کیا میں ان "کلینا" کے پھولوں کی طرح خوبصورت ہوں؟"

"جب تک تو میرے گھر کے باغ میں ہے

لڑکی! تو انہیں پھولوں کی طرح حسین ہے۔

لیکن جب تو اپنے سفر پر روانہ ہو جائے گی

تیرا یہ حُسن تجھ سے چھن جائے گا

اے دوشیزہ! تیری گہری سنہری گوٹوں سے

ان کا رنگ رفتہ رفتہ اڑ جائے گا۔"

(۳) دولھا کے دوستوں کا گیت

"دروازہ کھولو —— پھوٹا دروازہ"

"کون آواز دیتا ہے! یہ کون ہمارا انتظار کرتا ہے؟"

"ہم دولھا کے دوست ہیں"

"اچھا تو تم ہمارے لئے کیا تحفہ لائے ہو؟"

"ہم اپنی سنہری شہد کی مکھیاں پیش کریں گے"
کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارا یہ حقیر تحفہ ہمیں خوش کر سکے گا۔
کیا تمہارے پاس ہماری نذر کے لئے اور کوئی چیز نہیں؟
لو یہ بڑا تحفہ ہم لائے ہیں۔
نوجوان لڑکی اپنی پیشانی پر
کنوارپن کی مالا پہنے ہمارے ساتھ آ رہی ہے"

(۴) رخصتی

ماں کہتی ہے:۔
جب صبح ہوئی تو میں جاگی
میں نے دھندلکے میں بھورے آنگن کو دیکھا
وہاں برف پر چلنے والی خوبصورت گاڑی تھی
اور اس کے خوش رفتار گھوڑے ہنہنا رہے تھے
وہ میری مروسنکا کو مجھ سے چھڑا لے جائیں گے"
"کیا اب میں تمہاری بیٹی نہیں رہی؟" لڑکی بولی
"کہ اپنے گھر سے تم اس طرح مجھے بھیجے دیر ہی ہو،
رات ہونے سے پہلے ہی؟
اس کٹھن سفر میں مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے
میرا گانے والا بلبل میرے ساتھ جائے گا۔
کیونکہ میں اس کے رسیلے نغمے سنوں گی
جب وہ اندھیرے منہ مجھے بیدار کرے گا ——
وہ —— میری نئی ماں مجھے نہ جگائے گی
بلکہ وہ مجھ پر عیب لگائے گی —— میرے لئے سخت الفاظ استعمال کرے گی اور کہے گی:۔
یہ دلھن تو ناکارہ پیڑ کی طرح پھوہڑ ہے"۔

(۵) رخصتی کا گیت

میری پیاری ماں! نہ رو
میں اپنے ساتھ سب کچھ نہ لے جاؤں گی
دیکھو گائے، بیل
میں نے اصطبل میں بند ہے چھوڑ دیئے ہیں
میں صرف اپنے ساتھ اپنی گھنی پلکیں
اور نیلی آنکھیں لے جا رہی ہوں
اور تمہاری میز پر
تمہارے لئے میں نے اپنے آنسو چھوڑ دیئے ہیں۔
اور وہ باغ —— وہ پگ ڈنڈی
جہاں میرے قدم پڑتے تھے
جب میں تمہارے لئے پانی لانے کو
ہر روز جاتی تھی"
بیٹی اچھا جا! مجھ کو اکیلا چھوڑ دے
ان پھول کے درختوں کو چھوڑ جا تو جن کی نگہبانی کیا کرتی تھی۔ اب ان کی دیکھ بھال کون کرے گا؟
انہیں کون پانی دے گا جب ان میں کلیاں نکل آئیں گی؟
باغ کی روشوں کے درمیان پڑے ہوئے پتّوں کو جھاڑ کر اب کون راستہ صاف کرے گا؟
آہ تیرا محبوب آئے گا تو میں اس سے کیا کہوں گی؟"

(۶) موباف کا کھولنا

یوکرائن کی بن بیاہی لڑکیاں اپنے سیاہ کھلے ہوئے بالوں کو ایک موباف میں باندھے رکھتی ہیں اور انہیں ریشمی فیتوں سے سنوارتی ہیں۔ بعض اوقات پھولوں سے بھی ڈھک لیتی ہیں۔ یہ موباف "کوسا" کہلاتا ہے اور کنواریوں کا خاص سنگار ہے۔ وہ اسے مقدّس اور اپنی عصمت کا نگہبان جانتی ہیں۔ اس موباف کا کھول دینا گویا اس بات کی علامت ہے کہ اب لڑکی کنواری نہیں رہی۔ بیاہی عورتیں چوٹی کے دو حصّے کر کے ان کو الگ الگ دو موبافوں میں باندھ لیتی ہیں۔ پھر جوڑے کی شکل میں لپیٹ کر سر کے گرد ایک رسّی سے باندھ لیتی ہیں۔
"اس کے کالے بالوں سے موباف کھول دو۔
اور اس کی جگہ پھولوں کا ایک ہار باندھ دو
ڈچس مروسنکا ہور دوڈنکا کے شہر کو
اپنے چھوٹے قدموں کے ساتھ جا رہی ہے
وہ خانہ باغ سے "باروینو" کا پھول توڑتی ہے
اپنے کالے بالوں میں لگانے کے لئے
اس کی ماں اس کو ڈھونڈتی ہوئی آتی ہے
"میری لڑکی! تو کیا کر رہی ہے؟"
"میری ماں! کیا ایسا ہو سکتا ہے"۔
کیا تجھے اب میری ضرورت نہیں ہے؟

تو مجھے گھر میں ٹھہرنے نہیں دیتی۔
بلکہ زبردستی نکال دینا چاہتی ہے
اپنی لڑکی کو اس کے حوالے کر دینے کے لئے
جو مجھے لے جانا چاہتا ہے
میں ابھی بہت چھوٹی ہوں
زیادہ چالاک بھی نہیں ہوں —— پھر کیوں .....؟"
"کیا میں تجھے زبردستی نکالے دیتی ہوں
کیا میں اپنے مکان میں تجھے رکھنا نہیں چاہتی۔
تیرے لئے
میری یہ کبھی آرزو نہیں رہی
اجنبی آکر تجھے مجھ سے مانگتے ہیں
اور مجھے اُن کی بات ماننا پڑتی ہے"؛

(۷) شادی سے ایک روز پہلے

دولہن اپنے عاشق سے کہتی ہے:۔
"اونچے درخت پر پتے بہت گھنے تھے۔
تم کل رات کیوں نہ آئے
مجھے حیرت ہے! میں سمجھی
شاید تمہارے پاس گھوڑا نہ تھا
یا شاید تم راہ بھول گئے تھے
یا تمہاری ماں نے ٹھہرا لیا تھا"
عاشق جواب دیتا ہے
"میرے پاس گھوڑا تھا اور میں راستہ بھی جانتا تھا
اور میری ماں نے بھی مجھے روکا نہ تھا۔
لیکن —— میری چھوٹی بہن تمہیں نہیں پسند کرتی۔
اس نے میری زین چھپا دی۔ میں نے بہتیرا ڈھونڈا نہ پایا
میری بڑی بہن نے اسے ڈھونڈ نکالا
اور جلدی سے میرے گھوڑے کی پیٹھ پر کس دیا
اور بولی، لو یہ گھوڑا —— جلد جاؤ
چاند کی روشنی تمہیں راہ دکھانے کے لئے کافی ہے
بہادر بھائی! ہمیشہ اپنی گردن اونچی رکھنا
وہ ہنستی ہوئی بولی۔
"اپنی محبوبہ کے گاؤں سے نہیں بہت سی باتیں سیکھنی ہیں
اور اس کی راہ بہت پیچیدہ ہے
اپنا گھوڑا کھو نہ دینا —— گمراہ نہ ہو جانا
جاؤ! لیکن تمہاری شادی کا دن طلوع ہونے سے پہلے واپس آجانا"

۳۔ تاریخی گیت

(۱) پین کالنوسکی

"پین" کے معنی معزز شخص کے ہیں اور "پین کالنوسکی" یوکرائن کے طریقہ جاگیرداری کے دور میں سرکشوں کا ایک طبقہ تھا۔ یہ "پین" یا نواب اپنا حرم ترکوں کی طرح بہت وسیع رکھتے تھے۔

ایک پین کالنوسکی "قصبۂ بوہوسلف" کا مالک تھا اور خاص اہمیت رکھتا تھا۔ اس سے متعلق بہت سے دلچسپ واقعات ہیں کہتے ہیں کہ ایک بار وہ ایک بوڑھی عورت سے ملا جو اُس کے علاقے میں سوکھی لکڑیاں چن رہی تھی۔ اُس نے اس کو حکم دیا کہ وہ درخت پر چڑھ کر کوئل کی طرح پکارے اور جب اُس نے اس کی تعمیل کی تو کالنوسکی نے گولی کا نشانہ بنا کر اُسے نیچے گرا دیا۔

اس کی دوسری عادت یہ تھی کہ وہ اپنے کوٹ کی جیب میں ایک سوئی اور تھوڑا تاگا رکھتا تھا اور اُس سے جو دیہاتی ملتا وہ پوچھتا "کیا تمہارے پاس سوئی اور تاگا ہے" اگر وہ نہیں کہتا تو بے اختیار اُسے مارنے لگتا اس جرم میں کہ وہ کفایت شعار نہیں۔ یہ گیت اُسی لارڈ سے متعلق ہے۔

"بوہوسلف کا مالک "پین کالنوسکی" وہاں ناچ رہا تھا۔
"یونڈریونا" پاوا (مورنی) کی طرح حسین تھی
اور جب اس کی نظر میں اس جنگلی کبوتری پر پڑی۔ اس مجسم حُسن پر
اور اُس نے اس کی بغلگیری اپنے گالوں پر محسوس کی۔
"پین کالنوسکی! تم میرا جوتا تک اتار لے سکتے ہو
میرے پاؤں سے —— لیکن میں اُسی کا بوسہ لوں گی جس کو میں پسند کرتی ہوں تب اُس قصبے کے سمجھدار دیہاتیوں نے اُس حسین عورت کے کان میں کہا،
"اگر تو جلد فرار نہ ہو گئی تو تجھ پر آفت آجائے گی"
"یونڈریونا" پُل پر سے ہوا کی طرح گزر گئی۔
اور قصبے کے مکانوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔
دو کریہہ المنظر سپاہیوں نے کھینچی ہوئی تلواروں کے ساتھ اس کا تعاقب کیا
اور جب منڈی کے مقام سے گزر رہی تھی

بے چاری کبوتری آخر پکڑ لی گئی۔
نبین کانوو سکی کی چاندی کی بندوق سیدھی اس کی طرف اٹھی۔
عورت کے دل کی طرف —— اور اس نے اپنی قسمت کا فیصلہ کر لیا
"خوبصورت لانبے قد والی "بوندر یونا" میرے ساتھ رہ
ورنہ تو گوبر کی طرح ابھی زمین پر پڑی نظر آئے گی"
"میں قسم کھاتی ہوں —— میں مر جانا بہتر سمجھتی ہوں کانووسکی!
قبل اس کے کہ میں تجھ جیسے کی آغوش میں ہمیشہ پڑ رہنے کے لئے آجاؤں"
جیسے ہی اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ بندوق چلی —— اور وہ گر گئی
اور اُس کا باپ جو دیکھ رہا تھا بے اختیار چلا اٹھا
"خوبصورت لڑکی! میں بھی تیرے ساتھ مر جاؤں گا"
اور اُس نے اپنا سفید سر دیوار سے ٹکرا دیا
گھنٹے بجنے لگے —— اور غم آلود آوازیں فضا میں گونج اٹھیں
"بوندر یونا! آج ساری زمین تیرا کفن ہے"

(۲) مروسیا

بحیرۂ اسود پر —— ایک سفید چٹان پر
پتھر کا قید خانہ کھڑا ہے
سات سو کوسیک (Cossack) —— قسمت کے مارے ہوئے
ان کالی کوٹھڑیوں میں تین سال سے بند ہیں
انہوں نے خدا کی دنیا نہیں دیکھی
اور نہ مقدس سورج کی روشنی ان کی آنکھوں پر چمکی
(بزرگ خدا ہم بدقسمتوں کو رہائی دلا
اس سخت قید اور مسلمانوں کے عقیدے سے
ہم کو خاموش سمندروں پر تاروں کی دنیا میں بھیج دے۔
خوش آئند وطن میں، عیسائیت کی زمین پر
اے خدا ہم کو ہماری دعاؤں میں سُن)
تب ایک دن غلام لونڈی "مروسیا" پادری کی بیٹی ان کے پاس
آئی اور اُن سے کہا:۔
"اے کوسیک لوگو!
بدقسمت قیدیو!
کہو —— آج یوکرائنا میں کیا ہو رہا ہے
اے غلام لونڈی مروسیا!

ہم کیسے بتا سکتے ہیں کہ آج یوکرائن میں کیا ہو رہا ہے!
کیا ہم تیس سال سے قید میں نہیں
خدا کی دنیا سے الگ۔ سورج کی روشنی سے دُور،
اس لئے ہم نہیں بتا سکتے کہ آج یوکرائن میں کیا ہو رہا ہے"!
تب غلام لونڈی "مروسیا" پادری کی بیٹی بولی
"اے کوسیکو! بدقسمت قیدیو!
آج ہمارے ملک میں "ایسٹر" منایا جا رہا ہے
اور کل "ایسٹر ڈے" کی مقدس دعوت کا دن ہے"
ان کے سفید چہرے زمین کی طرف جھک گئے
اور انہوں نے غلام لونڈی "مروسیا" کو بددعا دی
"خدا کرے، اے پادری کی بیٹی!
تجھ کو کبھی خوش قسمتی اور خوشی نصیب نہ ہو۔
کیونکہ تو نے یہ خبر سنا کر ہمارے بھرے ہوئے رنج کو تازہ کر دیا"
"اے کوسیکو! بدقسمت قیدیو۔
قسمیں نہ کھاؤ۔ مجھے بددعا نہ دو
جمعہ کے دن جب ہمارا ترکی پاشا مسجد جائے گا۔
میں یہاں آؤں گی اور قید خانے کے دروازے کھول کر تم سارے
بدقسمتوں کو رہا کر دوں گی"۔ بد
"ایسٹر کے پہلے دن —— جب ترکی پاشا مسجد گیا
اس نے اپنی کنجیاں غلام لونڈی کو دے دیں
"مروسیا" پادری کی بیٹی کو
وہ آئی اور تمام قیدیوں کو رہا کر دیا۔

اور بولی:۔
میں تم سے کہتی ہوں —— جو حق ہے وہی کرو۔
سیدھا یوکرائن کے شہر کو چلے جاؤ
لیکن میں التجا کرتی ہوں
"یوہسلف" کے گاؤں سے نہ گزرنا۔
میرے باپ اور میری ماں سے ملنا
تو میرے باپ سے یہ کہنا کہ اپنے گلے فروخت نہ کرے
اور اپنا مال نہ لٹائے
مجھے غلامی سے چھڑانے کے لئے روپیہ نہ جمع کرے۔

کیونکہ میں ترک بن گئی ہوں ـــــ مسلمان ـ
ترکی آرام، اچھی زندگی اور غم آمیز خوشی کے لئے"

(۳) تاتاری حملے کے وقت

یوکرائنوں کی تاریخ میں تاتاریوں کو وہی اہمیت حاصل ہے جو امریکہ کی تاریخ میں "رڈ انڈینس" کو ۔ انہوں نے کریمیا میں اپنی حکومت قائم کی تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً یوکرائن پر حملہ کرتے اور لوٹ مچاتے وہاں جو باشندے ہاتھ آتے انہیں لے جاکر ترکی غلاموں کے بازار میں فروخت کرتے۔ بعد میں انہوں نے آپس میں کثیر تعداد میں شادیاں بھی کیں

یوکرائنا بہت فکر مند ہے اس کے رہنے کے لئے کوئی جگہ نہیں۔
اور دا نے اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے بچوں کو کچل دیا ہے
ہورڈوں کا سیلاب بوڑھوں کو اپنے ساتھ بہالے گیا
جو باقی بچ گئے تھے قیدی بن کر چلے گئے
اب یوکرائن کی کون حفاظت کرے گا۔
اس مصیبت کے وقت میں؟
اس کی زمین دو حصّوں میں تقسیم کر دی گئی ہے
اس کے لڑکے چار حصّوں میں منتشر ہو گئے ہیں۔
اس کا چہرہ تاریک ہو گیا ہے
وہ مریض ہے۔
تاتاریوں کے مظالم کی وجہ سے!

(۴) بیدا کا گیت

یوکرائن کے شہزادہ کوسیک بیدا کے متعلق بہت سی کہانیاں مشہور ہیں اس کا اصلی نام ستزو تھا۔ یہ وہی فاتح ہے جس نے کوسیکوں کا مشہور قلعہ "سیچ" بنوایا تھا۔ ترکوں پر اس کے بہادرانہ حملے بہت مشہور ہیں۔ اس گیت کے بند اس کے ایک قابل ذکر واقعے سے متعلق ہیں۔ جہاں تک روایت کا تعلق ہے یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ ترکی کے سلطان کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ جب یہ قید ہو گیا تو سلطان نے بیدا کو قسطنطنیہ کی دیواروں سے جن میں لوہے کے بڑے بڑے کڑے آویزاں تھے۔ رسیوں سے باندھ کر لٹکا دیا لیکن کسی غریب سے بیدا کے ایک ملازم نے اُسے تیر اور کمان دے دی جسے اُس نے چھپا لیا اور جب سلطان کی سواری اُسے دیکھنے آئی تو اس نے تین مسلسل تیروں سے سلطان، اس کی بیوی اور پھر اس کی بیٹی کو مار ڈالا۔

"بیدا، بیدا شہد کی شراب پی رہا تھا۔
نہ ایک دن، نہ دو دن اور نہ ایک رات سے
ترکی کا سلطان آیا
نوجوان تم کیا کر رہے ہو؟
میں شراب پی رہا ہوں" بیدا نے کہا "ایک دن سے نہ بہر دو دن سے نہیں ـــــ میری کوئی رات خالی نہیں"
اگر تم شراب پینا چھوڑ دو تو میں قسم کھاتا ہوں
اپنی لڑکی کی منگنی تمہارے ساتھ کر دوں گا"
"وہ میری نظر میں زیادہ خوبصورت نہیں
اور اس کا مذہب میں نہیں پسند کرتا"
"کہاں ہیں میرے سپاہی۔ اس بد زبان کو لے جاؤ
اس کی پسلیوں سے رسی باندھ کر قسطنطنیہ کی دیواروں سے لٹکا دو
نہ ایک دن، نہ دو دن
اور نہ صرف ایک رات بیدا لٹکتا رہا۔
ایک ہفتہ کے بعد سلطان آیا۔
"ہا ہا! بیدا کیا تو بالکل گونگا ہو گیا ہے؟
"نہیں" اس شہیر نے کہا "میں وہ درخت دیکھتا ہوں
دو کبوتر اُن پر آرام سے بیٹھے ہیں"۔
"اپنی کمان میرے حوالے کر دو" سلطان بولا
"تم کو اس جرأت کی کافی سزا ملے گی"
بیدا کا سیدھا ہاتھ کمان سے قریب ہوا
اور سلطان کی کنپٹی میں تیر پیوست ہو گیا،
اُف سلطان کی بیوی کو بھی اس نے مار دیا،
آہ اُس کی بیٹی کو بھی نہ چھوڑا،
"یہ کچھ دیر پہلے بادشاہ تھا" بیدا چلایا
"لیکن دیکھو اب کیسا بے بس ہو کر پڑا ہے
اچھا اب میں سمجھتا ہوں
مجھے شراب کا دوسرا گھونٹ پینا چاہئے"
بیدا، بیدا شہد کی شراب پیتا ہے
نہ ایک دن، نہ دو دن اور نہ ایک رات!

۴۔ کوسیکوں کے گیت

(۱) روانگی کا گیت (سولھویں صدی)

کوسیکوں نے بگل بجایا۔ اور وہ جا رہے تھے

دور، بہت دور ـــ آدھی رات کو

مروسنکا کی بھوری آنکھیں

روتے روتے بہت جلد اندھی ہو جائیں گی

نہ رو، نہ رو مروسنکا، غمگین نہ ہو ـــ غم نہ کر

خدا سے اپنے پیارے کے لئے دعا کر"

چاند "بے ہوا کی خاموشی" میں طلوع ہوا

کوسیک سے اُس کی ماں نے کہا

اُس کی "الوداع" آنسوؤں سے بھری ہوئی تھی:

"جا اب جا میرے چھوٹے لڑکے!

جا لیکن بہت دنوں تک غائب نہ رہنا

چار ہفتے ختم ہونے سے پہلے آ جانا"

"میں بہت جلد آ جاؤں گا میری ماں

ایک مہینہ ختم ہونے سے پہلے

لیکن میرے سیاہ خوبصورت گھوڑے نے

دروازے سے نکلتے ہی ٹھوکر کھائی

خدا جانے کیا ہوگا ـــ سب کچھ خدا ہی کی مرضی سے ہوگا

میں اچھی طرح گھر واپس آ جاؤں

یا خونی میدان میں ہمیشہ کے لئے سو جاؤں

پیاری ماں ـــ اپنی چہیتی لڑکی کی طرح

میری مروسنکا کو اپنے پاس رکھنا

میرے نیچے میرا گھوڑا غرور سے ہنہنا رہا ہے

تم لوگوں کی امیدوں سے پہلے ہی میں آ جاؤں گا"

(۲) قیدی

کوئل ـــ کوئل گا رہی ہے۔ صبح اندھیرے منہ

نوجوان کوسیک اپنی اپنی محبوبہ سے دور قید خانے میں پڑے ہیں

کمرے کی تاریکی میں اُن کی امیدیں مرچکی ہیں

لیکن کوئل گا رہی ہے۔ صبح سویرے اندھیرے منہ

"ہوا چل رہی ہے ـــ کاش سمندر کی طرف سے چلتی

اور ہم کو ہمارے علم کے بغیر بہالے جاتی

ہماری بھاری زنجیریں پیچھے چھوڑ کر

کاش سمندر کی طرف سے ہوا آتی

او سورج! او سورج تو جس راستہ پر چمک رہا ہے

ہم کو وہیں لے چل جہاں ہماری محبوبہ ہمارے لئے بے قرار ہے

کوسیکوں نے اپنا ناچ شروع کر دیا ہوگا۔

دھوپ میں، دھوپ میں مسرت کا رقص

نیلے سمندر! وہ ہواؤں کے ساتھ سمندر پر رقص کرتے ہوئے

ہمارے بھائی ہماری طرف آ رہے ہیں ـــ ہم کو آزاد کرنے کے لئے

آہستہ آہستہ، سمندر پر ـــ اس کی موجوں پر"

کوئل ـــ کوئل گا رہی ہے

صبح ـــ اندھیرے مُنہ سلطان سو رہا ہے

رونے والوں کی آواز سن کر وہ جاگ اُٹھا

اُن کے ہاتھوں اور پاؤں کو مضبوط زنجیروں سے جکڑ دو

تاکہ وہ فرار نہ ہو سکیں۔ صبح سویرے اندھیرے مُنہ

(۳) ترکوں کی قید میں

دریائے ڈنائپر کے دہانے پر ایک جزیرہ تھا جس کو "ہورتسا" کہتے تھے۔

کونٹ ستروشنوسکی (بیدا) نے یہاں ایک قلعہ بنوا کر دو ہزار کوسیکوں کو متعین کیا تھا تاکہ وہ یوکرائن کو تاتاری حملوں سے محفوظ رکھیں۔ بعد میں یہ قلعہ "سیچ" کہلانے لگا اور تاتاریوں اور پولینڈ کے باغیوں کی آماجگاہ بن گیا ـــ پھر ایک نیم سیاسی حکم کے تحت "نائٹس" کی ایک جماعت لامذہبوں سے لڑنے کے لئے یہاں مقرر کی گئی ـــ وقت گزرتا گیا اور زمانے کے امتداد کے ساتھ ساتھ "سیچ" مشرقی یورپ کا ملٹری ہائی اسکول بن گیا۔ کوسیک تاتاریوں کو کریمیا سے آگے نہ بڑھنے دینے کیلئے لڑتے رہے اور قسطنطنیہ حاصل کرنے کے لئے ترکی پر متعدد حملے کئے جب کوسیکوں کے قصبے نے پولینڈ والوں کے خلاف بغاوت کی تو زیپوروگیں کوسیک بھی اُن میں شامل ہو گئے اور ان کا قلعہ یوکرائنی جمہوریت کا مرکز بن گیا۔ ۱۷۷۵ء میں "سیچ" کیتھرین ثانی کے ہاتھوں تباہ کر دیا گیا۔

"نیلے سمندر پر لہریں گرج رہی ہیں

اور پہاڑوں کی بلندی تک اونچی اُٹھتی ہیں

بدبخت، ڈرپوک کوسیک

اپنے ترکی قید خانوں میں چلا رہے ہیں۔
"کیوں اے میرے مہربان خدا ہم پر یہ آفت کیوں؟
دو سال سے ہم یہاں پڑے ہوئے ہیں۔
زنجیروں سے ہمارے ہاتھ بھاری ہیں
کیا ہم اسی طرح یہاں مر جائیں گے؟
یوکرائنی عقابوں کے بچو اٹھے
ترکی غلام کاٹ کر پھینک رہے ہیں
زندہ شکاریوں کی قبریں
ہائے! نوجوان زیپوروگین کیا تم ابھی بیدار نہیں ہوئے؟
آزادی کے بیٹو
ہم کو ترکوں کی قید سے رہائی دلاؤ"

۵- دیہاتی گیت

(۱) گیت

میں ندی کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا
میرا گھوڑا میرے پہلو میں چل رہا تھا۔
"کوسیک مجھ سے شادی کر دگے؟" ایک میٹھی آواز آئی
"مجھ سے شادی کرو یا نہ کرو
لیکن صرف اتنا تو کہہ دو
کہ شاید کسی اچھے دن تم مجھے شادی کا پیغام دو گے"
"او! اگر تم مجھ سے زیادہ دولت مند ہو، میں خوبصورت لڑکی
میں تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں ضرور لیتا
اور میرے سخت گیر باپ کے سامنے ہم تم کھڑے ہوتے"
"اوہ! اگر میں دولت مند ہوتی مغرور کوسیک!
تو تم جانتے ہو میں کیا کرتی!
میں تمہارے باپ کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالتی"۔
میں ندی کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا
سرد آہیں نہ بھر خوبصورت لڑکی!
تیرے باغ میں "بارومینو" کبھی نہ مرجھائے گا
اگر تو نے مجھے اپنا نہ بنا سکی تو تجھے فکر کیا
تیرے لئے دوسرا بہت جلد آ جائے گا

ابھی تیرے گال سُرخ ہیں، تو جوان ہے"۔

(۲) دوشیزہ لڑکی کا گیت

میری کالی پلکیں کس کام کی ہیں؟
میری نیلی آنکھوں کا کیا مصرف؟
میری جوانی کچھ نہیں —— میری خوشی اُڑی جا رہی ہے،
اس لئے کہ میری جوانی ہر روز ڈھلتی جا رہی ہے
آنکھیں روتے روتے بے نور ہو گئی ہیں
پلکوں کا رسم مرجھا سا گیا۔
اے کنواری لڑکیو! اب میں جوانی سے بیزار ہو گئی ہوں۔
اس پرندے کی طرح جو ہوا کی کمی کے سبب مر جاتا ہے
تو میں کیوں اپنے حُسن کی قدر کروں! —— آخر کیوں؟

(۳) پریمی

تیز ہوا ہمیشہ چلتی ہے
پیڑ کی اونچی شاخیں زور زور سے ہلتی ہیں
اُس کا خط کبھی نہیں آتا
اُف میرا دل ٹوٹ رہا ہے
اے بے رحم تکلیف دہ ہواؤ
اُس سے میں بہت جلد نفرت کرنے لگوں گی
وہ مجھے مسلسل خط لکھتا رہتا ہے
میں کب تک انتظار کرتی رہوں؟

(۴) چاندنی

یوکرائنا میں اکثر یہ ہوتا کہ پندرہ سولہ سال کی لڑکیوں کی شادی ان کی رائے اور اُن کی پسند کے بغیر صرف ماں کے انتخاب پر کر دی جاتی۔ چنانچہ بہت سی جوان لڑکیاں ڈوب مرتیں —— جب وہ یہ دیکھتیں کہ ان کا سنہرا مستقبل تاریک ہو رہا ہے۔

چاند کی روشنی چمکتی جا، چمکتی جا
پن چکی کے پہیئے کے گرد
"باہر آ پیاری اور اس کی بہار دیکھ،
سُن رات کتنی خاموش ہے!
آ! دو گھڑی بیٹھ کر باتیں کریں"
"آہ میں تو خود آنا چاہتی ہوں پیارے

دیکھو میں کتنی بے چین ہوں
لیکن ان کھڑکیوں میں روشنی اب تک جل رہی ہے
ہماری ذراسی سرگوشی انہیں ادھر متوجہ کر دے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
افسوس وہ ہمیں نہیں ملنے دیں گے
ماں! کیا یہ تم ہو؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے نہ ملتہ
مجھے ہمیشہ کے لئے لنگڑا نہ کر دے
ٹھہر ــــ تو آج رات میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر
مجھے دریا میں دھکیل سکتی ہے
لیکن مجھے ایک لمحہ کی نظر سے
تاکہ میں ایک اجنبی پر نظر ڈال سکوں
ــــ خوبصورت دنیا الوداع
زمین ساری خوبصورت چیزوں سے بھری ہوئی ہے
میری بدبختی کو کون دیکھے گا؟
کون میرے ساتھ دریا تک جائے گا؟
دنیا تو خدا کی ساری چیزوں کی طرح حسین تھی
لیکن میرے دن بڑی تکلیف میں کٹے ــــ
اس سے زیادہ تکلیف مجھے جانے میں ہے
آہ! موت کتنی بھیانک ہے!
میرے پاس خوشی کبھی آتی ہی نہیں"

(۵) اکیلی محبت

میں نے اُسے کھو دیا ــــ اپنی پیاری کو
اس طرح میں نے اپنی محبوبہ سے محبت کی
جس طرح ماں اپنے بچے سے
اس طرح کاش میں نے اپنی پیاری کو
اپنا دل دیا ہوتا۔
میں کھڑکی میں بیٹھا ہوں
اور سوچتا ہوں" کیا وہ مجھ سے شادی کرے گی"؟
کاش وہ میرے دل کی حالت جانتی
جس طرح ماں اپنے بچے کی۔
میں اُس کے آنے کا انتظار کرتا ہوں
اگرچہ وہ کبھی نہیں آتی۔ افسوس اب میں نے جانا
وہ میری پروا نہیں کرتی۔ محبت کی توہین کرتی ہے

(۶) ناچ کا گیت

موسلا دھار بارش ہو رہی ہے، موسلا دھار
وہ تیزی سے نیچے آ رہی ہے
تن تنہا ــــ اتنی خوبصورت
نالوں میں شش شش آواز ہو رہی ہے
"آج مجھے کون گھر لے جائے گا"؟
کوسیک جو دیر سے شراب پی رہا تھا
ناچ والوں کی پارٹی میں ایک عورت کو ہنستے ہوئے دیکھ کر بولا۔
"اے حسینہ، کچھ دیر ٹھہر
میں آج تجھے تیرے گھر پہنچاؤں گا"
"میں منت کرتی ہوں۔ مجھے میرے گھر نہ لے جا
کیونکہ ــــ میرا شوہر ریچھ ہے
میں وہاں پہنچوں گی تو وہ مجھے مارے گا
"تم اپنے ساتھ مجھے لے جاؤ گے"؟
سازوں کی آواز بارش کی طرح تیز ہو جاتی ہے
بجانے والے جھومنے لگتے ہیں
وہ کوسیک ٹھہرا ہوا ہے ــــ وہ بھی نہیں گئی
سب جانتے ہیں کہ وہ آج اسے گھر لے جائے گا۔

(۷) جدائی کا گیت

ہوا تیز چل رہی ہے ــــ درخت جھکے جا رہے ہیں
میں روتی ہوں کیونکہ میرا دل دکھتا ہے
ایسے درد سے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں
میرے سال روتے ہوئے بسر ہوتے ہیں اور ہمیشہ ہوں گے
تنہا اکیلی میں روتی ہوں
ایسا نہ ہو لوگ کبھی دیکھ لیں
کیونکہ جب کوئی آنسو نہیں دیکھتا۔ اور کوئی نہیں جھڑکتا
تو ایک لمحے کے لئے میرا دل سکون محسوس کرتا ہے۔
ریت میں اُگا ہوا پودا کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔
اگر سورج اور شبنم اُسے غذا نہ پہنچائیں
پھر میں کس طرح زندہ رہوں جبکہ ایسے بوجھل دنوں میں

میرا جان سے زیادہ پیارا محبوب میرے پاس نہیں

(۸) انگوٹھی

ایک مہینہ گزر گیا جب میرا سپاہی مجھے الوداع کہہ کر رخصت ہوا تھا اور
جاتے ہوئے اُس نے اپنے آنسوؤں کے ساتھ مجھے ایک انگوٹھی دی۔
"اگر میں جنگ سے واپس نہ آؤں
یہ انگوٹھی تمہارے سچے سپاہی کی یاد دلائے گی"۔
آج صبح سویرے انگوٹھی میری انگلی میں ٹوٹ گئی
یقیناً تباہی اُس کے سر پر بیٹھی مسکرا رہی ہے
میں نجومی سے پوچھوں گی — میں ابھی جوان ہوں:۔
"انگوٹھی کے ٹوٹ جانے کا کیا مطلب!
مجھے خوف ہے کوئی بری خبر آنے والی ہے"۔

. . . .

"یہ بہت برا ہوا۔ اس کا ٹوٹنا کسی کی موت ہے"
"ہاں میرا کلیجا جلتا ہے — آگ کی طرح جلتا ہے"۔
دنیا اُس کی آنکھوں میں تاریک ہو گئی اور وہ بیہوش ہو گئی — جیسے
جلتی ہوئی دھوپ سے پھول کمہلا کر پتوں میں ڈھلک جاتا ہے
گاؤں میں ایک پرانا قبرستان ہے وہاں شاہ بلوط کی ایک صلیب ایستادہ ہے
اس کے تلے ایک لڑکی سو رہی ہے — کئی سال سے
دُور کسی زمین میں وہ ابدی نیند سو رہا ہے

(۹) رومال

سورج سمندر کے افقی کناروں پر ڈوب رہا تھا
سُرخ، سُرخ جیسے خون —
اور اس ارغوانی سیلاب میں ایک دوشیزہ نے
سنہرے اور روپہلے تاروں سے ایک دستی بنائی
جب وہ سی چکی تو اُسے اپنے سینے سے لگایا
پھر خوب روئی — اور دریچے کے دونوں پٹ کھول دئے۔
اے ہوا کے تیز جھونکے، میرے عقاب! اسے اپنے بازوؤں پر لے جا
اتنا تیز جس تیزی سے دونائی ندی آگے بڑھتی ہے۔
اے آزاد ہوا میری طرف سے اسے لے جا
جہاں وہ ہے — ان میرا دل خوب جانتا ہے
وہ اس وقت "آلمانوں" کی صفوں میں لڑ رہا ہے۔
جا میرے سنہرے عقاب — سورج اور چاند سے گزرتا ہوا
ہوا پر بہتا جا یہاں تک کہ اُسے پالے
اور سنہرے عقاب جب تو کوئی آواز سنے
قمری کی طرح — ٹھہر جانا میرے پیارے کے لئے
اُس مقام پر میرا پیارا تیرا انتظار کرتا ہوگا
اُس کے پاس ایک نفیس گھوڑا ایک سونے کی سی تلوار ہے
تو آندھی کی طرح آزاد اور نڈر ہو کر
اُس کے اوپر جا گرنا جیسے کوئی گلاب کی پنکھڑی
اگر وہ سو رہا ہے تو اُسے جگانا نہیں اور
(او میرے خدا) اگر وہ بے جان پڑا ہے
تو لوٹتے ہوئے
اسے سنہرے عقاب اس کے میٹھے چہرے پر ڈال دینا

(۱۰) انگوٹھی کا تحفہ

اُس نے مجھے ایک انگوٹھی دی۔ میں ہنسی اور اس سے پوچھا۔
"اس کا کیا مطلب؟" "تحفہ" اُس نے جواب دیا
دوسرے دن میں دوسرے کے ساتھ گئی۔
اور شام کو جب پلٹی تو وہ بہت غصے میں تھا
"تم نے میری انگوٹھی پہن رکھی ہے" اس نے طعنہ دیتے ہوئے کہا
انگوٹھی کے معنی شادی کے ہیں — تم میری ہو گئی ہو"
میں نے انگوٹھی اتار کر اس بے وقوف مرد کی طرف پھینک دی اور کہا۔
"چلے جاؤ! میں نے ایسا بے وقوف شخص آج تک نہیں دیکھا۔
جو کہتا کچھ ہے اور معنی کچھ اور لیتا ہے"

(۱۱) یوکرائنوں کا قومی ترانہ

یوکرائن ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس کی آزادی اس کی شان!
ہم کو یہ اُمید رکھنا چاہئے کہ ایک مرتبہ پھر قسمت
اس کی داستان کو روشن بنائے گی
سورج طلوع ہوتے وقت شبنم کی طرح
ہمارے دشمن غائب ہو رہے ہیں۔
ہم حکومت کریں گے اے نوجوان بھائیو!
ہمارے ملک کو کوئی ڈر نہیں
کورس:- روح اور جسم کی قربانیاں دے کر

ہم اپنی آزادی کی پرورش کر رہے ہیں۔
ہم بتا دیں گے کہ ہم بہادر بیٹے ہیں۔
ان بہادر کوسیکون کے جو برباد ہو گئے
ٹلی ویکوا درزائی زینوک اور ترا سیلو قربان ہو کر
ہم کو ہمارے مقدّس فرض کے لئے آمادہ کر رہے ہیں
وہ اپنی قبروں سے ہمیں جگا رہے ہیں
ہم کو بھول نہ جانا چاہیئے۔۔۔۔
ہمارے بہادر کوسیکون کی موتوں کو
کیونکہ ہمارے نوجوان اور ان کا شباب
ہلکے داموں نہ قربان کیا جائے گا
کورس۔ روح اور جسم کی قربانیاں دے کر
ہم اپنی آزادی کی پرورش کر رہے ہیں۔
ہم بتا دیں گے کہ ہم بیٹے ہیں
ان بہادر کوسیکوں کے جو برباد ہو گئے۔

علی احمد

رباعی

عشرت میں کسی کو بھی چمن لٹتا جائے
ہمت سے بھی یہ نہیں کہ سہتا جائے
مطلب یہ ہے انسان کسی حال میں ہو
احساس کی لذتیں اٹھاتا جائے

حرماں خیرآبادی

غزل

اُس کے در کا سجدہ سجدہ غیرتِ صد سجدہ ہے
اس لئے ہر سجدے میں ہم کو عادتِ صد سجدہ ہے

حُسن کے ہر تازہ مظہر کو نیا سجدہ ضرور
ذوقِ سجدہ کو غمِ محویّتِ صد سجدہ ہے

وسعتوں میں زندگی بھر سے ہے ساعتِ طویل
ایک سجدے کو میسّر عظمتِ صد سجدہ ہے

صدق کی پاکیزگی، حسنِ عقیدت کا سرور
رند کے ہر سجدے میں کیفیّتِ صد سجدہ ہے

پائے خُم پر سر ہو، دل آوازِ ساقی کی طرف
ایسے سجدے کا تصوّر غیرتِ صد سجدہ ہے

ذرّہ ذرّہ تھا مرا مسجود راہِ شوق میں
پھر بھی فطرت بندگی کو حسرتِ صد سجدہ ہے

عبدالعزیز فطرت

بے حس تماشائی

شفق نے پہن لی سرِ شام ہی   ردائے سیہ پُر سکوں رات کی
نہیں دن کا لیتا کوئی نام بھی   خموشی نے کچھ اس طرح بات کی

ہوا نیم جاں اور فضا ناتواں
گرا چاہتا ہے ابھی آسماں

زمیں شب کے آغوش میں سو گئی   اندھیرے کے طوفان میں کھو گئی

غضب ہے کہ ہر چیز چپ ہو گئی

گھروں میں دیے جل کے کچھ بجھ بھی گئے   پتنگے جلے جل کے بجھ بھی گئے
گھنی جھاڑیاں غولِ رہ بن گئیں   بھرے باغ پر وحشتیں تن گئیں
جہاں گم ہوا عالمِ خواب میں   بھیانک سیاہی کے گرداب میں

غضب ہے کہ ہر چیز چپ ہو گئی
ستارے مگر جھلملاتے رہے

(۲)

طلسمِ شبِ تار مٹنے لگا   افق سے ہوا ہے نمودار چاند
چلا اوجِ گردوں پہ بڑھتا ہوا   سبک سیر اور نرم رفتار چاند

سنورتا ہوا جگمگاتا ہوا
جہاں کو منوّر بناتا ہوا

اُمڈتا ہوا آیا سیلابِ نور   کیا کوہ و صحرا کو غرقابِ نور
ہوئے خاک کے ذرّے سیرابِ نور

شگوفوں کے چہرے دمکنے لگے   گلستاں میں نغمے چہکنے لگے
دھڑکنے لگے ماہ پاروں کے دل   مچلنے لگے میگساروں کے دل
خوشی ہر طرف مسکرانے لگی   محبت کی دنیا بسانے لگی

ہوئے خاک کے ذرّے سیرابِ نور
ستارے مگر جھلملاتے رہے

(۳)

نشاط آفریں تھی شبِ ماہتاب   جہاں حُسن و خوبی کا آباد تھا
یکایک چمن کی طرف سے اُٹھا   سیہ لکّۂ ابر پا در رکاب

ہوا کیا چلی سر پہ ہی آ گیا
بڑھا بڑھ کے جھٹ چاند پر چھا گیا

نئی سر پہ نازل مصیبت ہوئی   اندھیرے کی قائم حکومت ہوئی
مسلّط پھر اک بار ظلمت ہوئی

ضیا پاشیوں کا جہاں مٹ گیا   زمیں کے لئے آسماں مٹ گیا
مٹیں حُسن کی جلوہ آرائیاں   مٹیں کیف و مستی کی رعنائیاں
محبت کے سیمیں فسانے مٹے   حسینوں کے رنگیں بہانے مٹے

مسلّط پھر اک بار ظلمت ہوئی
ستارے مگر جھلملاتے رہے

قیوم نظر

یہ شاعر

(خلوصِ آرٹ کا اخلاق سے)

وجد زا کوئی تأثر بھی انہیں ملتا نہیں — قدرتی احساس سے جذبہ کوئی ہلتا نہیں
ہیں عمل پیرا یہ ہر نافہم کی تجویز پر — ناصیہ فرسا ہیں عقلِ عام کی دہلیز پر
اپنے دل کی بے کراں گہرائیوں سے دور ہیں — بک چکی ہے جن کی مختاری، یہ وہ مزدور ہیں
ہے دماغ اِن کا زمانے کی نظر پر رقص کار — ہے ضمیر اِن کا جہاں کی اک نگاہِ مستعار
مانگ کر اندھوں سے بینائی نظر پیما ہیں یہ — ناشناسائے تموّج ریگ کے دریا ہیں یہ
گفتگو اِن کی پرائی سی، نظر نقّال سی — ہے چکیدہ اِن کے للچائے لبوں سے رال سی
جو جہاں کہتا ہے بچّوں کی طرح کرتے ہیں یہ — دوسروں کے رنگ اپنے نقش میں بھرتے ہیں یہ
رُوح اِن کی رنجِ ناپرسی سے یکسر سرد ہے — دل کی رعنائی پہ تاریکی، نظر میں گرد ہے
ایک بے وقعت سی شہرت کا پریشاں سا جنون — پے بہ پے اِن کو بناتا پھر رہا ہے کارٹون
"آرٹ اور پیغام" کا اک ہوش افگن سا خیال — کر رہا ہے اِن کی معقولیتوں کو غیر مال
بیٹھے بیٹھے جب بھی سوجھی ہے زمانے کو ہنسی — ڈال دی ہے کان میں اِن کے بھنک اس بات کی
قوم کی مُردہ رگوں میں جوش بھر سکتے ہیں یہ — چارۂ ناسازیٔ حالات کر سکتے ہیں یہ
انقلاب آور ادب کو لا کے استعمال میں — عظمتِ ماضی کو لا سکتے ہیں دامِ حال میں
بس اِسی وحشت خیالی سے پریشاں حال ہیں — اپنے حق میں آپ گویا شامتِ اعمال ہیں
ہیں یہ تحسینِ زمانہ کے نشے سے چُور چُور — عقل کے پیچھے لئے پھرتے ہیں لٹھ ننگِ شعور
اپنی شخصیّت سے یوں خائف ہیں جیسے مور ہیں — ان کے دعوے کس قدر بے روح اور کمزور ہیں
پائیں گے کیا اپنی گہرائی کا یہ ظالم سُراغ — طاقِ دل میں رکھ کے ترغیبِ زمانہ کا چراغ
اِن کے امکانات [illegible] نمو رہ جائیں گے — اِن کے غنچے ناشناسِ رنگ و بو رہ جائیں گے
ایک کھسیانی ہنسی کا روپ ہے اِن کا کلام — دعوئے رندی تو ہے، لیکن نہ مے اپنی نہ جام!
اپنے من کی وسعتوں کا شائبہ بھی، ہمنشیں — اِن ریاکاروں کے بھولے بخت میں آیا نہیں
ڈال کر پردہ تجاہل کا یہ اپنی ذات پر — کر رہے ہیں تبصرہ آفاق کے حالات پر
پوچھ اِن مُردہ ضمیروں سے کسی دن اے ندیم! — کر چلے ہیں اپنے دل کی قوتوں کو جو یتیم
کیا کبھی سرمایہ و محنت کی آویزش کوئی — دے گئی ہے زخم اِن کے قلب و جاں کو واقعی!
کہہ کے مے پینے کی خواہش کو کسی شب خیرباد — کر سکے ہیں یہ کسی فاقہ زدہ کے دل کو شاد؟
کیا کوئی دن تھا کہ جب دام و درم کے یہ غلام — رُک گئے ہوں کرتے کرتے کج کلاہوں کو سلام
قوم کو روتے ہوئے سو میل تک جاتے ہیں یہ — پیٹ کے دوزخ کا ایندھن جمع کر لاتے ہیں یہ
"انقلابی شاعری" کا کوئی دعویدار ہے — کوئی سرمایہ گری سے مائلِ پیکار ہے

شاعرِ ملت ہے کوئی شاعرِ مزدور ہے
آرٹ کا بیت المقدس گرد سے معمور ہے

آرٹ خود آگاہی و "خود مرکزی" کا نام ہے
آرٹ دل کی گفتگو ہے، رُوح کا الہام ہے

آرٹ اک نازک کنایہ ہے کوئی ناول نہیں
پُر نوا اعجاز ہے، ہذیان کا بادل نہیں

آرٹ ہے نقاش کے احساس کا نازک خدنگ
دل کی سچائی کا شعلہ، رُوح کی گرمی کا رنگ

ظاہری اخلاق کے بے رنگ اور مہمل اصول
کھا چکا ہے جن کا حُسن و دلکشی صدیوں کی دھول

آرٹ کی دنیا میں ہیں کچھ وہم ہائے بے فروغ
سطح پر حُسنِ نمائش، تہ کے اندر اک دروغ

آرٹ کا اخلاق قائم ہے فقط اخلاص پر
آرٹ ہے نقاش کا احساس، آنکھیں اور جگر

مجھ کو مت اُکسا ریاکاری پہ پیہم ہمنشیں!
خود فریبی فطرتِ اخلاص کا عنصر نہیں

میں نے اُس معنی کو دینا ہے لباس اشعار کا
جس میں اک پرتو ہو میری روح کے اظہار کا

میری موسیقی، مرے شام و سحر میرے خیال
میرے دلکش عیب، میرے خوبصورت احتمال

حُسن ہیں آنکھوں کا رنگیں اور وارفتہ مزاج
گاہ دل کی شادکامی، گاہ دل کا اختلاج

چاندنی راتوں میں لہراتی ہوئی زلفوں کا رنگ
رقص کرتی سی مسرت، سانس لیتی سی اُمنگ

مہ وشوں کی نرم باہوں کی صباحت کا گداز
آنکھ کی مستی، جبیں کا نور، مے کے برگ و ساز

معنی و احساس کے تازہ کنول کھلتے ہوئے
مے کی رَو بہتی ہوئی، مستی کے لب ہلتے ہوئے

روحِ شاعر روحِ فطرت، روحِ فطرت بے قرار
شعر ہے فطرت کے دل کا ایک نُورانی شرار

زندگی کے دُکھ کی باتیں، زندگی کے سُکھ کا راگ
قلبِ شاعر ایک مستی، قلبِ شاعر ایک آگ

زندگی کا طرفہ گر ہوں، زندگی کا نغمہ خواں
کہہ رہی ہے زندگی میری زباں میں داستاں

زندگی کا دل دھڑکتا ہے مرے اشعار میں
گیت اور آہیں ہیں ہم آغوش اِس پیکار میں

(ق) ہمنشیں مجبور ہوں، میرے جواں افکار ہیں
میرے شعروں کے تبسم خانۂ پندار میں

میری اپنی ذات ہی ہوگی سراپا جلوہ گر
میرے دریا میں نظر آئیں گے میرے ہی بھنور

اپنے شعروں میں ہر اک اپنے دل سے ہم آہنگ ہوں
اپنے ذاتی حُسن کی قوسِ قزح کا رنگ ہوں

ایک سچائی ہے میرا آرٹ اک دھوکا نہیں
ایک جلوہ ہے مری تقدیر اک پردا نہیں

ایک اونچے روپ میں گُم ہے مرا ذوقِ نظر
اے مرے ہمدم مجھے رہ رہ کے شرمندہ نہ کر

آرٹ کو میں وعظ سے آلودہ کر سکتا نہیں!
جھینگروں کی سطح پر شاعر اُتر سکتا نہیں۔

عدم

گرجن کی ایک شام

عرشی اور ارضی کی بحث بہت پرانی ہے۔ وہ ادیب جو ہر وقت آسمان پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کی خدمت میں میں صرف یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ ہماری زمین بھی ایک ستارہ ہے۔

(میکسم گورکی)

مدتوں سے تمہیں خط نہیں لکھ سکا۔ شاید اوشا کی فریب کاریوں کو بھولنے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر جگدیش کی دلدوز محبت کے آخری منظر دیکھنے میں مصروف تھا۔ کچھ ٹھیک طرح سے تمہیں نہیں بتا سکتا۔ ممکن ہے کہ تم پوچھو۔ کیا جگدیش بھی محبت کر سکتا ہے۔ موٹا سا آدمی۔ گو کچھ اتنا موٹا بھی نہیں۔ لب پر ہر وقت مسکراہٹ شکار کا شوقین۔ برج اور برِج کا پجاری۔ کیا ایسا شخص بھی الفت کی ستمگاریوں کی تاب لا سکتا ہے، تو میری جان، میرے پاس اس کا جواب یہ ہے کہ .....

مگر نہیں، یہ بہتر ہوگا کہ پہلے میں تمہیں اُس جگہ کے متعلق بتاؤں جہاں ہم گذشتہ ڈیڑھ ماہ سے پڑے ہوئے ہیں کیونکہ ماحول نہ صرف حیاتِ معاشقہ کا بلکہ ہماری تمام زندگی کا جزوِ اعظم ہے اور خاص کر محبت اور ماحول میں جو گہرا تعلق ہے وہ مجنوں کی بادیہ پیمائی اور فرہاد کی کوہ کنی سے صاف عیاں ہے۔ دور کیوں جاؤ تمہارے وطن پنجاب ہی میں سوہنی مہینوال کا افسانۂ محبت دریائے چناب کی پرشور روانیوں کا رہینِ منت ہے اور ہیر رانجھے کا دلفریب قصۂ الفت ذات پات اور قبائلی رکاوٹوں کی دیوار پر عشق پیچاں کی طرح آویزاں نظر آتا ہے اور سچ پوچھو تو غالباً ہم کسی فردِ واحد سے محبت نہیں کرتے بلکہ اگر محبت کرتے ہیں تو صرف اپنے آپ سے، در اصل انسانی محبت بذاتِ خود ایک حقیر سی شئے ہے، محبت ہے کیا؟ یہی دو دھڑکتے ہوئے دلوں کا سنگم، لیکن جو چیز اسے عرفانی بلندیوں پر لے جاتی ہے یا اہرمنی پستیوں میں گرا دیتی ہے۔ وہ اس کا ماحول ہی ہے۔ ماحول کی اہمیت سے انکار کرنا زندگی کی عظمت سے انکار کرنا ہے۔

بچارا جگدیش بھی ایسا ہی کیا کرتا تھا لیکن آج اُس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے پوچھو جن کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں اور جن کی گہرائیوں کا الم کسی بے کس زخمی، سسکتے ہوئے آہو کے درد کا آئینہ دار ہے۔

سب سے پہلی بات جو میں تمہیں اس جگہ کی بابت بتانا چاہتا ہوں وہ اس کی بلندی ہے۔ یہ جگہ سطحِ سمندر سے سترہ ہزار فٹ بلند ہے۔ اس رفعت پر پہنچ کر انسانی محبت بھی بلند ہو جاتی ہے۔ خیالات و تاثرات میں غیر ارادی و غیر شعوری طور پر ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ دماغ پر ایک عجیب نشہ دل میں ایک عجیب وسعت، روح پر ایک عجیب سا وجد طاری ہو جاتا ہے۔ تنفس کا دورہ تیز ہے اور کاندھوں پر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منوں بوجھ تھا جو اُٹھ گیا۔ اوپر دیکھو تو اڑنے کو جی چاہتا ہے اور نیچے دیکھو تو دور بیدون تک سلسلہ ہائے کوہ گرتے ابھرتے اور پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں، چشم زدن میں نظر ان پہاڑوں اور وادیوں سے پھسلتی ہوئی نچلے میدانوں پر پڑتی ہے اور نظر کا آخری نقطہ وہ ہے جہاں دریائے جہلم کا پانی چاندی کے پتلے تار کی طرح چمکتا ہوا نظر آتا ہے، اس بلندی پر پہنچ کر آدمی سب بستیوں کو بھول جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اتنا ہی پاک و صاف سمجھتا ہے جتنی کہ یہ سپید برف جس کی آب و تاب میں موت کی خاموشی اور قدرت کی پاکیزگی پنہاں ہے۔ یہاں آ کر مجھے احساس ہوا کہ اوشا کی محبت کتنی حقیر تھی اور اس کا دائرہ کتنا محدود، یہ وہ محبت تھی جو صرف ڈرائنگ روم ہی میں کی جا سکتی ہے۔ اس استوائی پھول کی طرح جو شیشے کی دیواروں کے اندر ایک محبوس باغیچے ہی میں کھل سکتا ہے۔ اور مصنوعی روشنی، مصنوعی حرارت اور مصنوعی غذائیت کا محتاج ہے، ڈرائنگ روم، ریشمیں ساریاں، برقی قمقمے، مصنوعی چلتے ہوئے فقرے۔ میں حیران ہوں کیا واقعی مجھے اوشا سے محبت تھی یا شاید یہ اُس غیر فطری ماحول کا اثر تھا، جو

باہر کی کھلی اور خوشگوار فضا میں پہنچ کر مٹ گیا۔

یہاں بجلیاں کوندتی ہیں، بادل گرجتے ہیں، رم جھم، رم جھم بارش ہوتی ہے اولے پڑتے ہیں۔ برف گرتی ہے۔ پھر ہوا کے چند تیز و تند جھونکے آتے ہیں اور مطلع صاف ہو جاتا ہے، آسمان خوش نما نیلگوں، آفتاب سونے کے تھال کی طرح درخشاں، اور پر پھیلائے ہوئے ہوا میں تیرتی ہوئی چیل کسی پری کی طرح حسین نظر آتی ہے۔ ہم اپنے خیمے کا جالی دار پردہ کھولتے ہیں۔ گرم کافی کی پیالی ہاتھ میں۔ بندوق کاندھے پر لٹکائے باہر نظر دوڑاتے ہیں۔ چاروں طرف برف ہے، ہوا خاموش ہے۔ آسمان صاف ہے۔ ہم آہستہ آہستہ کافی پیتے اور چمڑے کے جوتوں کے اوپر دھان کے خوشوں سے بنے ہوئے جوتے پہن لیتے ہیں اور شکار کی تلاش میں چل پڑتے ہیں۔ یہاں شکار بہت ملتا ہے جنگلی بکریاں۔ رونسے۔ ریچھ اور بھیڑیے، آخر الذکر بھولے بھٹکے شکاریوں کو ہی شکار کر لیتے ہیں۔ پھر رات کے وقت الاؤ کے قریب خیمے میں بچارا چوکیدار اور اُس کا جانباز کتا آگ تاپتے ہوئے مایوسانہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ کالی رات میں ہوا سیٹیاں بجاتی ہے۔ بھیڑیے چلاتے ہیں پھر برف کے تودوں کے گرنے سے ایک مہیب اور خوفناک آواز پیدا ہوتی ہے جو دُور دُور تک پھیلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اُس کے بعد خاموشی مکمل خاموشی، موت اور سکون، شکاری نہیں آیا، شکاری اب کبھی نہیں آئے گا شکار کرتے کرتے وہ خود شکار ہو گیا، اُس کی ہڈیاں برف کے تودوں کے نیچے ہیں اور اُن پر بھیڑیے ناچ رہے ہیں۔

لیکن گھبراؤ نہیں دوست۔ ہم ابھی تک زندہ ہیں۔ صحیح و سلامت اور اب تک ایک درجن کے قریب ریچھ، رونسوں، اور بھیڑیوں کو گولی کا نشانہ بنا چکے ہیں۔

جس جگہ ہمارا کیمپ ہے اس سے کوئی ڈیڑھ پونے دو میل نیچے مغرب کی طرف گرجن کا دلکش مقام ہے، اس سے زیادہ دلکش جگہ میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی۔ یہاں سے پورے دو میل بھی نہ ہوگا، لیکن اُف! کتنا دشوار گذار راستہ ہے۔ بلکہ راستہ ہی نہیں، ہر ایک قدم برف کو کاٹ کاٹ کر بنانا پڑتا ہے اور پھر کئی جگہ اس قدر پھسلن ہے کہ ذرا پاؤں اِدھر اُدھر ہوا تو توازن برقرار نہ رہا تو آدمی چشم زدن میں سینکڑوں فٹ نیچے برف سے اٹی ہوئی کسی کھڈ میں جا گرتا ہے۔ اب تو ہم اس راستے سے کسی قدر واقف ہو گئے ہیں لیکن پھر بھی متواتر برف و باراں سے ہر روز نیا راستہ تراشنا پڑتا ہے اور پھر بھی اگر دھمی سے چلتے چلتے، دائیں یا بائیں نیچے نظر پڑ جائے تو ان بے پناہ گہرائیوں کو دیکھ کر بے اختیار سارے جسم میں اک جھرجھری سی آ جاتی ہے۔

گرجن کا مقام گرمیوں میں رہنے کے لئے بہترین جگہ ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ وہ ہزاروں سیاح جو ہر سال گلمرگ جاتے ہیں، انہیں یہ معلوم نہیں کہ گرجن گلمرگ سے کس قدر نزدیک ہے۔ گرجن میں کہیں کہیں برف کے ٹیلے ہیں تو کہیں ایسے ہموار تختے جن پر گرمیوں میں ریشم کی طرح نرم اور ملائم گھاس اُگتی ہے۔ کہیں کہیں پہاڑی شگنوں میں تنگ کے تناور درخت کھڑے ہیں جو برف و باراں میں محفوظ خیموں کا کام دیتے ہیں، یہاں پانچ جھیلیں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی اور خوش نما سب سے بڑی جھیل کو نندن سر کہتے ہیں۔ یہ کوئی ڈھائی تین میل کے گھیر میں ہوگی۔ سال میں دس مہینے یخ بستہ رہتی ہے لیکن جب ہم نے اُسے دیکھا تو گہرے نیلے رنگ کا ایک تختۂ آب بن رہی تھی، اور چاروں طرف پیلے پیلے جنگلی پھولوں سے مرصع تھی۔ یہ غالباً دنیا کی سب سے اونچی جھیلوں میں سے ہوں گی اور اس زمانے کی یاد دلاتی ہیں جب تمام دنیا زیر سطح آب تھی۔ پھر جب آہستہ آہستہ ہمالیہ کے پہاڑ نمودار ہوئے تو یہ جھیلیں وہیں پانی کے گڑھوں کی مانند رہ گئیں۔

نندن سر پہ غروبِ آفتاب کا جو نظارہ ہوتا ہے۔ وہ نہ جھیل ڈل پر میسر ہے نہ وُلر پر، یہاں نہ ہوٹل ہیں۔ نہ شکارے۔ نہ سیاح۔ نہ موٹریں، نہایت دشوار گذار راستے ہیں جو سال میں صرف تین چار ماہ کھلے رہتے ہیں اور رجن پر جفاکش اور خانہ بدوش گڈریے، اپنے ریوڑوں کو گرجن کے مرغزاروں میں چرانے کے لئے لاتے ہیں۔ اور اگست کے پہلے ہفتے ہی میں پھر نیچے کی آبادیوں میں چلے جاتے ہیں۔ کبھی شاذ ہی کوئی سیاح یہاں آ نکلتا ہے، شکار کا شوقین یا تنہائی کا دلدادہ، اور پھر اُسے شاذ ہی واپس جانا نصیب ہوتا ہے پھر یہیں کہیں برف کے تودوں میں یا بھیڑیوں کے پیٹ میں، یا ان تناور ننگوں کے قریب اُس کی قبر بنتی ہے۔ اس لحاظ سے گرجن بہت بدنام ہے اور گڈریے تو گرجن دیوتا کو پوجتے ہیں جو اس پہاڑ کی چوٹی پر رہتا ہے جہاں ہمارا کیمپ ہے۔ گرجن کے دیوتا کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا لیکن کہا جاتا ہے کہ گرجن کے دیوتا کو پردیسیوں، مسافروں اور سیاحوں سے بہت نفرت ہے وہ نہیں چاہتا کہ ماسوا، اُن پہاڑی گڈریوں کے جو اُسے پوجتے ہیں اور کسی کا بھی اُس کے علاقے میں گزر ہو۔ گڈریے جانتے ہیں کہ گرجن دیوتا جس پر ناراض ہوتا ہے، اُسے موت کی سزا دے دیتا ہے، اور جس پر خوش ہوتا ہے، اُس کی بکریوں میں دودھ زیادہ کر دیتا ہے، اس کی بھیڑوں کو نہایت خوبصورت ملائم ریشم سے ڈھک دیتا ہے۔ برف ہیں، جھکڑ ہیں۔ طوفان ہیں، ہر حالت میں اُس کے

ریوڑ کی حفاظت کرتا ہے۔

گرجن کی ایک دلفریب شام کا ذکر ہے، میں جگدیش اور ریوا ایک پہاڑی شکاری جسے ہم تراٹی کے علاقے سے اپنے ساتھ لائے تھے، شکار کھیل کر واپس کیمپ کی طرف جا رہے تھے۔ اور راستے میں نندن سر کے مقام پر بیٹھ کر سستانے لگے تھے۔ اُس وقت سورج غروب ہونے کو تھا۔ ہوا میں ایسی خنکی تھی کہ ہر سانس میں برف کے لطیف سے گالے مُنہ کے اندر جاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ گرجن کی چوٹی پر اُجلے اُجلے بادل منڈلا رہے تھے۔ بادلوں اور ڈوبتے ہوئے سورج کے عکس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی عالیشان محل کے نیلگوں فرش پر ایک طلائی ستون کھڑا ہے اور ایک مرمریں محراب کو سہارا دے رہا ہے۔ معاً جگدیش نے پانی کی سطح پر ایک سنگریزہ پھینکا، ارتعاش پیدا ہوا۔ اور دوسرے لمحے میں وہ خوب صورت محل اور طلائی ستون تھرتھرا کر لاکھوں جواہر ریزوں میں بکھر گیا، اب پانی کی ہلتی ہوئی سطح پر لاکھوں سورج متلاطم تھے اور ہر موجِ آب ایک کرن بن گئی تھی۔

جگدیش نے ہاتھ بڑھا کر اپنے قریب کے پیلے پیلے پھولوں کو توڑ کر ایک گچھا بنایا اور انہیں اپنے کوٹ پر ٹانکتے ہوئے بولا۔ کتنے خوبصورت پھول ہیں۔ اُن کی مہک، ان کا رنگ، یہ مست کر دینے والا، کیف آور تعطر۔ ریوا۔ ان خوبصورت پھولوں کا کیا نام ہے۔

ریوا کسمسایا، وہ روئیدوں کی قسمیں پہچانتا تھا۔ ریچھوں کو دو میل کی دوری سے سونگھ لیتا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں عقاب کی سی تیزی تھی جو ان کی طرح سامنے سے اڑنے والے پرندوں پر شست لگانے میں بھی کبھی غلطی نہ کرتی تھیں۔ لیکن وہ ان پھولوں کے نام نہ جانتا تھا۔ اچھا شکاری کہیں اچھا شاعر نہیں ہوتا۔ اُس کے بھورے رخسار اور بھی بھورے ہو گئے۔ اور وہ رُک رُک کر بولا۔ "مجھے ۔ پتہ ۔ نہیں۔"

جگدیش کو ریوا کی بے چینی میں بہت لطف آیا۔ پھر وہ آہستہ سے بولا "ٹھیک ہے۔ ان پھولوں کے نام سے کسی کو آگاہ نہ ہونا چاہئے۔ شاید ان پھولوں کا کوئی نام ہی نہیں اور یوں بھی تو خوبصورتی کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ حسن کی کوئی ذات نہیں۔"

میں نے مسکرا کر احتجاجاً کہا "جملہ حقوق محفوظ، تم میری باتیں دہرا رہے ہو۔"

ریوا بے چینی سے اپنی جگہ پر ہلا۔

جگدیش نے مزاحاً کہا "ہونہہ۔ جملہ حقوق محفوظ! شاید تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تم اوشا کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہو۔ ارے بھلے مانس، یہ گرجن ہے گرجن۔"

جگدیش نے بمشکل یہ فقرہ زبان سے ادا کیا ہو گا کہ بادل زور سے گرجا یہاں موسم کتنا غیر معین ہے۔ پل میں دھوپ پل میں برف و باراں، ریوا نے ایک نظر بھر کر اُن بادلوں کی طرف دیکھا جو اب گرجن کی چوٹی کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے۔ اُس نے نتھنے پھیلا کر شمالی ہوا کو سونگھا، اور پھر اپنے فرغل کے بٹن بند کرتے ہوئے بولا۔ جلدی چلو۔ طوفان آ رہا ہے۔

ہم نے اپنی سمور کی ٹوپیاں پھولوں کے تختوں سے ڈھونڈھ نکالیں اور انہیں پہن کر چل کھڑے ہوئے۔ اگرچہ ابھی دھوپ چمک رہی تھی۔ لیکن کئی جگہوں پر پہاڑوں اور گھاٹیوں کے مختلف حصوں پر سفید بادل اپنا سایہ ڈال رہے تھے۔ ہوا کی خنکی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اور ہمیں تو ابھی بہت اوپر اپنے کیمپ تک پہنچنا تھا۔ ہم جلد جلد لیکن نہایت خاموشی سے راستے پر چڑھتے جاتے تھے۔ گرجن کی چوٹی پر سے بادل نیچے کی طرف پھیل رہے تھے۔ ایک ہلکا سا جھکڑ چلنے لگا تھا اور کہیں کہیں روئیں جیسی پتلی اور ہلکی دُھند ہمارے راستے میں آ جاتی تھی۔ ہم نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی، لیکن کوئی پون گھنٹہ کے سفر کے بعد طوفان نے ہمیں آ ہی لیا۔ ہلکی ہلکی بارش، اور پھر کرکری اور اُس کے ساتھ فوراً ہی برف گرنی شروع ہوئی۔ ریوا سب سے آگے تھا۔ درمیان میں جگدیش، اور آخر میں میں، ہم تینوں کی کمر میں ایک ہی رسی بندھی ہوئی تھی۔ ریوا ہمارا رہنما تھا۔ پندرہ بیس منٹ اور چلے ۔ یکایک میری کمر کو ایک سخت جھٹکا لگا۔ بہت سخت، اتنا کہ اگر میرے حواس بجا نہ ہوتے اور برچھا میرے پاس نہ ہوتا تو میں یقیناً اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکتا، اب میں برچھے کے سہارے کھڑا زور لگا رہا تھا۔ کیونکہ رسا بائیں طرف جھکا ہوا تھا۔

چاروں طرف دھند چھا گئی تھی۔

اوپر سے ریوا کی آواز آئی "سنبھل جاؤ۔ سنبھل جاؤ۔"

"کیا ہوا؟" میں نے چلا کر پوچھا۔

جگدیش کی آواز آئی۔ "میں برف پر گر گیا ہوں۔ اُف کتنا درد ہے۔ اٹھا نہیں جاتا۔ پاؤں میں ضرب آ گئی ہے۔"

"اٹھو، اٹھو کوشش کرو۔" میں نے رسی پر زور لگاتے ہوئے کہا

طوفان نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ دھند سفید تھی لیکن تاریکی سے بھی بدتر، میرے اور ریوا کے درمیان جگدیش کہیں بیچ میں برف پر گرا ہوا تھا اور

ہم اُسے اٹھا نہ سکتے تھے۔

ریوا کی آواز آئی "توازن ٹھیک رکھو۔ رسّی کو دائیں طرف جھٹکا دو۔

ایک ...... دو ...... تین"۔

بڑا زور لگایا۔ لیکن جگدیش نہ اُٹھ سکا۔

آخر رسّی کو بل دیتے ہوئے اور برچھے سے کچی گرہیں باندھتے ہوئے میں ریوا اور جگدیش تینوں ایک مقام پر جمع ہو گئے، میں نیچے سے چل کر اوپر جگدیش کے پاس پہنچ گیا اور اسی طرح ریوا اوپر سے نیچے کو آتا ہوا جگدیش کے پاس آ گیا۔ جگدیش گھٹنوں کے بل پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔

"کیا ہوا جگدیش"۔ میں نے جھک کر جگدیش کو اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

جگدیش سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا، مگر پھر فوراً برف پر بیٹھ گیا، "آہ مجھ سے تو اب چلا بھی نہ جائے گا۔ پاؤں میں ضرب آئی ہے۔"

چاروں طرف سفید دھند چھا گئی تھی۔ ہوا میں ایک وحشیانہ تیزی تھی۔ برف خاموشی سے گر رہی تھی۔

"ہو ...... ہو آ ...... آ آ ہو ...... ہوا ...... آ آ آ ...... ہو"۔ ریوا نے دوبارہ سیٹی بجائی۔ سیٹی کی تیز آواز کسی لو کدار خنجر کی دھار کی طرح تلملاتی ہوئی، طوفان کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ اور پھر چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

"ہو آ ...... آ ...... آ ہو، ہو آ ...... آ ...... آ ...... آ ...... ہو"۔

ریوا نے چند لمحوں کے بعد پھر سیٹی بجائی۔ کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔

ریوا نے ایک متعین وقفے کے بعد پھر سیٹی بجائی، اور ہم تینوں دھڑکتے ہوئے دلوں سے اس کے جواب کے منتظر رہے۔ لیکن کانوں میں صرف بڑھتے ہوئے طوفان کے وحشیانہ قہقہے تھے۔ سردی دم بدم بڑھ رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں سُن ہو رہے تھے۔ آنکھوں میں نیند آ رہی تھی۔

"مت سوؤ۔ جگدیش مت سوؤ"۔ ریوا نے سیٹیوں کے درمیانی وقفے میں کہا۔ میری آنکھوں میں ایک عجیب سا خمار چھا رہا تھا۔ پپوٹے بند ہوئے جاتے تھے۔ جانتا تھا کہ مجھے سونا نہ چاہیئے۔ جانتا تھا کہ یہ خمار موت کا خمار ہے، یہ نیند اجل کی نیند ہے۔ آخری اور کبھی نہ ختم ہونے والی نیند۔ پھر بھی آنکھیں جھپک جھپک جاتی تھیں اور جگدیش بیچارا تو بالکل اونگھ رہا تھا۔

ریوا نے ہم دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ میری بات سنو۔ میری بات سنو دیکھو۔ دیکھو۔ میری طرف دیکھو، اپنی مٹھیوں میں برف بھر لو۔ نہیں نہیں دستانے نہ اتارو۔ یونہی مٹھیوں میں برف بھینچ لو۔ زور سے۔ زور لگاؤ اور زور لگاؤ،

اور ......

"ہوا آ آ آ ...... ہو ...... ہو آ۔ آ۔ آ ...... ہو"۔ دور سے نیچے سے، کسی مدھم سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ریوا نے جواب میں سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز ایسا معلوم ہوا کہ دور دور پھیلتی جا رہی ہے اور خطرے کا سگنل دے رہی ہے امداد کے لئے پکار رہی ہے۔ اس سیٹی میں کتنا خوف تھا کتنی التجا۔ کتنا درد کتنی اُمید، ہمارے کان اُس کے جواب کی طرف لگ گئے۔ کیا سچ مچ سیٹی کا جواب آیا تھا۔ کیا یہ محض اک واہمہ تو نہ تھا۔

مگر نہیں دور نیچے۔ کہیں سے پھر سیٹی کی آواز سنائی دی۔ مدھم۔ میٹھی۔ امید دلانے والی، اس برفانی طوفان میں وہ سیٹی روشنی کے مینار کی طرح چمک اٹھی۔

قدرے توقف کے بعد ریوا نے پھر سیٹی بجائی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اس کا جواب آیا۔ ایک سیٹی کہہ رہی تھی۔ "ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ طوفان میں گھرے ہوئے ہیں"۔ دوسری کہہ رہی تھی "گھبراؤ نہیں۔ ہم آ رہے ہیں"۔ دوسری سیٹی نزدیک آتے آتے پھر دور ہو جاتی۔ شاید راستے سے پرے ہٹنا پڑا ہوگا۔ اس طرح ایک گھنٹہ گزر گیا۔ آدھ گھنٹہ اور، اب آنے والا ہمارے نزدیک ہی کہیں تھا۔ چند منٹ اور اضطراب میں گزرے۔ اب ہمارے سامنے ایک جفاکش ادھیڑ عمر کا پہاڑی کھڑا تھا۔ اُس کی چھاتی پر ایک لالٹین بندھی تھی جس کی مدھم روشنی اس تاریک دھند کو چیر کر بمشکل ایک دو گز دور جاتی تھی۔ اُس کے ساتھ ہی ایک چھریرے بدن کا جوان کھڑا تھا۔ لیکن دھند میں اُن کی صورتیں اچھی طرح پہچانی نہ جاتی تھیں۔ بس سائے سے معلوم ہوتے تھے۔

جفاکش پہاڑی نے پوچھا کیا بات ہے، طوفان میں کیسے گھر گئے؟

ریوا نے جواب دیا "ہمارے ساتھی کو چوٹ آ گئی اور ـــ" اُس نے فقرہ ناتمام رہنے دیا۔

جفاکش پہاڑی چند منٹ تک چپ رہا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

چند منٹ آرام کے بعد پہاڑی نے چھریرے بدن کے جوان کو جگدیش کی طرف اشارہ کر کے کہا "اسے اٹھاؤ"۔ میں بمشکل راستے کی رہنمائی کر سکوں گا"۔

چھریرے سائے نے چند لمحوں کے لئے توقف کیا، پھر وہ جھکا اور اپنے مضبوط ہاتھوں سے جگدیش کو اٹھا کر اپنی پشت گگردن کے قریب

رکھ لیا، دوسرے پہاڑی نے ایک رسّی سے جگدیش کی ٹانگیں اُس کی کمر سے باندھ دیں۔ پھر ایک رسّا اپنی کمر سے باندھ کر اُس جوان کی کمر کے گرد لپیٹا۔ پھر وہ رسّا مجھ تک پہنچا، میں نے اُسے کمر میں باندھ کر ریوا کے حوالے کیا، آخر میں ریوا نے اُسے مضبوطی سے اپنی کمر میں باندھ لیا۔

"تیار رہو"۔ پہاڑی نے ہمیں چوکنّا کرتے ہوئے کہا "برف مضبوطی سے تھامو۔ ایک . . دو . . . تین، اور اس طرح رات کی تاریکی میں، برف کے خطرناک سمندر میں یہ کارواں از سرِ نو گرجن کو چلا۔

پہاڑی کا گھر ایک تنگ کے نیچے تھا، وہاں پہنچ کر اُس نے جلدی سے دو تین کھالیں نکال کر زمین پر بچھائیں اور دوسرے پہاڑی نے جگدیش کو وہاں لٹا دیا۔ جگدیش بے ہوش تھا یا شاید برف کی نیند سو رہا تھا۔ ادھیڑ عمر کا پہاڑی تنے کی کوکھ کے اندر گیا اور وہاں سے اپنی مٹھی میں ایک گول مڑی ہوئی چمڑے کی تھیلی سی باہر لایا۔ الاؤ کی سُرخ روشنی میں میں نے دیکھا۔ یہ ایک نافہ تھا۔

"ذی شی لالٹین بجھا دو"۔ پہاڑی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ جواب ایک طرف اندھیرے میں بیٹھا ہوا سستا رہا تھا۔ اندھیرے میں ایک لمبے سانس کی آواز سنائی دی اور پہاڑی کا ساتھی الاؤ کی طرف بڑھا۔ اُسے تاریکی سے روشنی میں آتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ اب اُس نے اپنی سمور کی ٹوپی اتار پھینکی تھی جس نے اُس کے لمبے بالوں کو چھپا رکھا تھا۔ اُس کی آنکھیں تکان سے نیم وا تھیں اور جبیں پسینے سے تر تھی۔ اپنے مضبوط ہاتھوں سے اُس نے پہاڑی کی کمر سے لالٹین کو کھولا۔ اور ایک پھونک مار کر اُسے بجھا دیا۔ پھر لالٹین ہاتھ میں لے کر سر کو ایک طرف جھکائے ہوئے وہ واپس اندھیرے میں چلی گئی۔

پہاڑی گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ اور جگدیش کے تنفّس پر غور کرنے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد اُس نے لکڑی کے بڑے چمچے میں تھوڑا سا گرم دودھ اور نافہ ڈال کر ہلایا اور اسے جگدیش کے منہ میں انڈیل دیا۔ ایک اور چمچے میں اُس نے کوئی اور چیز گرم کی جو غالباً کسی جانور کی چربی معلوم ہوتی تھی۔ اور بہت بدبودار تھی جب وہ چربی بھی گرم ہو کر سیال بن گئی تو اُس میں بھی اس نے تھوڑا سا نافہ ڈال دیا اور اُسے انگلی سے ہلاتے ہوئے اُس نے ذی شی کو پکارا۔

"کیوں۔ کیا بات ہے؟" ذی شی نے وہیں اندھیرے میں بیٹھے ہوئے جواب دیا اس کی آواز سُست اور مضمحل تھی۔

"اِدھر آنا بیٹیا۔ ذرا ان کی کنپٹیوں کو سہلاؤ۔ یہ لو روغن۔

ذی شی نے جگدیش کا کن ٹوپ اتار لیا۔ اور اُس کا سر اپنی گود میں لے کر اس کی کنپٹیوں کو آہستہ آہستہ سہلانے لگی، پہاڑی تنے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا الاؤ کے سرخ ہالے میں پہاڑی کا شکن آلود چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ ٹھوڑی کس قدر مضبوط تھی۔ اور گردن کی رگیں باہر کو تنی ہوئی تھیں جگدیش کا سانس کبھی دھیما ہو جاتا۔ کبھی تیز چلنے لگتا، کبھی اس میں گرّ گرّ کی سی آواز پیدا ہوتی جیسے کسی گھڑی کو چابی دیتے وقت سنائی دیتی ہے . . . . . لڑکی دھیرے دھیرے کنپٹیاں سہلا رہی تھی، اُس کے سہلانے سے چمڑ چمڑ کی ایک عجیب خواب آور سی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ میں ادھ مُندی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ جگدیش پر اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ اُس کا آدھا چہرہ اندھیرے میں تھا اور آدھا الاؤ کے ہالے میں میں اس کا چہرہ صاف دیکھ سکتا تھا۔ یہ آرین اور منگول خطوط کا ایک حسین مرقع تھا۔ زعفران اور گلاب کے رنگوں کا اک دلربا امتزاج۔ اُس کے غلافی پپوٹے اس طرح جُھکے ہوئے تھے کہ آنکھیں بالکل بند معلوم ہوتی تھیں۔ ذی شی . . . . . . معاً میرے دل میں خیال آیا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں۔ یہ ایک خواب ہے۔ یہ جوان لڑکی، یہ پہاڑی بوڑھا، یہ تنگ کا تنا، یہ سُرخ الاؤ، یہ سب کچھ ایک طویل خواب ہے۔ شاید میں اس کے بیٹھنے کے کمرے میں صوفے پر لیٹا ہوا اس سپنے کو دیکھ رہا ہوں۔ اور وہ ابھی ابھی ایک نیلی ساڑھی پہن کر اندر آئے گی اور مجھے سوتا دیکھ کر اپنی تحقیر آمیز ہنسی سے مجھے جگا دے گی۔ "اُٹھو۔ بے فکرا تو، ساڑھے پانچ بج گئے۔ ایڈی کینٹر کا فلم . . . . . میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ قدرے توقف کے بعد میں نے پھر آنکھیں کھولیں تو وہی منظر تھا وہی پہاڑی بوڑھا درخت سے پیٹھ لگائے بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا۔ لڑکی جگدیش کا سر سہلا رہی تھی۔ جگدیش کا تنفس اب صاف چل رہا تھا۔ الاؤ کا ہالہ تنگ ہو گیا تھا، تنگ ہو رہا تھا۔ اونگھتے، جاگتے پلکیں جھپکتے جھپکتے، اس خوبصورت تصویر کو دیکھتے دیکھتے آہستہ آہستہ یہ سارا منظر ایک سکوں ریز دھندلکے میں غائب ہو گیا۔

جب دوسرے دن آنکھ کھلی، تو نہ جگدیش تھا۔ نہ وہ جوان لڑکی۔ پہاڑی بوڑھا بھی غائب تھا۔ میں اکیلا تنگ کے وسیع سائے میں لیٹا ہوا تھا۔ کچھ دیر دل میں یہ خیال جاگزیں رہا کہ کل جو کچھ دیکھا تھا محض ایک افسانہ تھا، آنکھیں ملتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پہلے تنے کی کوکھ نظر آئی، پھر دور پرے دھوپ میں ایک ریوڑ چرتا ہوا نظر آیا۔ ڈھارس بندھی، زور سے آواز دی۔

"جگدیش۔ او۔ جگدیش۔"

ریوڑ میں سے دو ایک بکریوں نے مُنہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"جگدیش" میں پھر زور سے چلّایا۔ "او جگدیش۔ نامعقول جگدیش۔"

یکایک تنے کی کوکھ سے پہاڑی مسکراتا ہوا نکلا۔ "گرجن دیوتا کی مہربانی سے کل آپ کی جان بچ گئی"۔

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا، اور پہاڑی کی طرف تکتے ہوئے کہنے لگا "شکریہ۔ تمہارا اور تمہاری بہادر لڑکی کا ہزار بار شکریہ"۔

"کیا نام ہے اُس کا؟ ذی شی؟"

"ہاں، ذی شی، اُس کا نام ہے۔ میری ننھی ذی شی بہت اچھی لڑکی ہے۔ گرجن دیوتا اُس سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ سب برفیلے راستوں سے واقف ہے۔ اُسے گرجن دیوتا کبھی کوئی گزند نہیں پہنچنے دیتے۔ چھوٹی عمر ہی میں اُس کی ماں مرگئی تھی۔ گرجن دیوتا ہی نے پالا ہے۔ گرجن دیوتا ذی شی سے بہت محبت کرتے ہیں"۔

ایک گرجن دیوتا پر ہی کیا موقوف ہے۔ میں نے دل میں سوچا اس سے تو ہر کسی کا دل محبت کرنے کو چاہتا ہے۔ میں نے پہاڑی بوڑھے سے پوچھا "جگدیش کہاں ہے؟"

پہاڑی نے جواب دیا۔ صبح جب اُن کی آنکھ کھلی تو پاؤں کی موچ بالکل نکل چکی تھی۔ اب وہ ذرا نندن سر تک سیر کرنے کو گئے ہیں۔ ذی شی کو میں نے اُن کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ وہ دونوں اب واپس آتے ہی ہوں گے۔ آپ تو خوب سوئے۔

ہاں میں تو خوب سویا میں نے دل میں سوچا۔ کیونکہ رات بھر کسی نے میری کن پٹیوں پر مالش نہیں کی۔ وہ دونوں! یہ لفظ سن کر میرے دل میں ایک نامعلوم سی خلش پیدا ہوئی۔ ایک خفیف سا انتشار۔ کمبخت جگدیش ہر بار بازی لے جاتا ہے میں نے پہاڑی سے آہستہ سے پوچھا۔ نندن سر یہاں سے کتنی دور ہے؟

یہی کوئی کوس بھر۔ سیدھے اُس طرف، وہ!

اچھا میں بھی نہا دھو آؤں بڈھے سے یہ کہہ کر میں چلتا بنا۔

میں چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جگدیش نہ تو لارڈ بائرن کی طرح لنگڑا ہے اور نہ ڈان جوان کی طرح حسین۔ پھر بھی یہ کمبخت عورتیں کیوں اس پہ اتنی جلدی فدا ہو جاتی ہیں۔ کیا اس دنیا میں ہم ہی مہاتما گاندھی رہ گئے ہیں۔ آخر ہمارے پہلو میں بھی ایک حساس دل ہے۔ سوز، تڑپ، شعریت سب کچھ ہے۔ مگر انہیں پھر بھی سب ہمیں ایک "مٹی کا چکر" سمجھتے ہیں۔ آخر یہ تفاوت کیوں؟ جگدیش میں ایسے کونسے لعل لگے ہیں۔ موٹی موٹی آنکھوں پر عینک جماکر، مرغے کی طرح چھاتی نکال کر چلنے سے کونسے سرخاب کے پر لگ جاتے ہیں۔ وہ چڑیل اوشا بھی اسی پر مرتی تھی! کمبخت، یونہی سوچتے سوچتے، دل ہی دل میں کڑھتا ہوا چلا جا رہا تھا، کہ یکایک سامنے سے ایک دلکش ہنسی اور پھر ایک بلند قہقہے کی آواز سنائی دی۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو سامنے کے ٹیلے پر سے جگدیش اور ذی شی چلے آرہے تھے۔ دونوں نے لمبے سموری فرغل پہن رکھے تھے، دونوں کے سروں پر سموری ٹوپیاں تھیں۔ جن پر ایک طرف کو پیلے پیلے پھولوں کے گچھے بندھے تھے۔ جگدیش کا بلند قہقہہ مجھے بہت ناگوار گذرا۔

"اتنی دیر سوئے رہے؟" جگدیش نے سوال کیا۔ سوال کیا تھا سراسر تضحیک تھی۔

"اتنی جلدی جاگ اُٹھے؟" میں نے جواب دیا۔ جواب کیا تھا۔ سراسر طنز تھی۔

"نہانے چلے ہو؟" جگدیش نے پوچھا۔

"پاؤں کی موچ نکل گئی ہے کیا؟" میں نے جواب دیا۔

ذی شی نے ایک دلکش قہقہہ لگایا، اور اپنا بایاں بازو میرے بازو میں ڈال کر کہنے لگی "آؤ ہم تینوں واپس نندن سر کو چلیں" جب ہم نندن سر کو چلے تو جگدیش اپنی عینک صاف کر رہا تھا۔ اور میں دل میں کہہ رہا تھا کہ اے پُرفن حسینہ تو نے اس وقت، تو ہم دونوں کو خوش کر دیا لیکن جلد یا بدیر تجھے اس امر کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ تو ہم دونوں میں سے کس کو چاہتی ہے؟

اور جلدی اس امر کا فیصلہ ہو گیا۔ میں نندن سر پہ نہاتا رہا۔ اور وہ دونوں پھولوں کے تختوں میں نیم پنہاں خدا جانے کیا باتیں کرتے رہے۔ کبھی کبھی ہنس پڑتے، پھر کان ہی کان میں ایک دوسرے کو کچھ کہتے، ایک دوسرے کی طرف پھول توڑ توڑ کر پھینکتے۔ جگدیش نے خدا جانے اُسے کیا کہا کہ ذی شی یکایک بھاگ اٹھی جنگل کی مست ہرنی کی طرح، جگدیش اُس کے پیچھے اٹھ کر دوڑنے لگا ہاں واقعی، پاؤں کی موچ نکل چکی تھی۔ پھولوں کے تختوں میں اُس نے کئی چکر کھائے مگر ذی شی کہاں اُس کے قابو میں آتی تھی۔ اور اس کے لانبے لانبے سیاہ بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ بھاگتی ہوئی پھولوں کے تختوں سے پرے ٹیلوں پر سے چھلانگیں لگاتی ہوئی دور نکل کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ جگدیش بھی بھاگتا بھاگتا نظروں سے غائب ہو گیا۔ اب میرے سامنے صرف سمور کی دو ٹوپیاں پڑی تھیں اور پھولوں کے مسلے ہوئے تختے۔ یخ کی طرح سرد پانی نے جسم اکڑا دیا تھا۔ اور ہونٹ نیلے کر دیئے تھے۔ میں نہا کر بہت دیر تک دھوپ تاپتا رہا۔ آج گرجن دیوتا کی چوٹی پر بادلوں کا نشان بھی نہ تھا۔ میں پہاڑ پر اس سلوٹ کو ڈھونڈنے لگا جس کے اندر خیمہ تھا لیکن وہ سلوٹ یہاں سے نظر نہ آتی تھی۔ جگدیش اور ذی شی کہاں گئے۔ یہ سوچ کر میرا منہ لال ہو گیا۔ اب تو گرجن کو ہی اپنی قیام گاہ بنانا ہوگا آج ریوا کو کہنا ہوگا کہ مزدوروں کو ساتھ لے کر جائے اور خیمہ اور دیگر سامان اٹھوا کر یہاں لے آئے۔ اس برفانی سلوٹ سے یہ تنگ کی بستی زیادہ محفوظ جگہ ہے

اور اگر کل کی طرح ایک اور ایسی ہی برفانی اور طوفانی شام آگئی تو گرجن دیوتا کی بد دعا پوری ہو جائے گی۔

اب بدن اچھی طرح سے گرم ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں غنودگی سی آنے لگی تھی، دماغ میں جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ میں نے اُٹھ کر کپڑے پہنے اور چلنے لگا۔ راستے میں پھر مجھے جگدیش اور ذی شی مل گئے۔ ذی شی کے رخساروں کی لالی بڑھ گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں نیچی تھیں۔ جگدیش کی چھاتی ضرورت سے زیادہ باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ ایک نئے بھرتی شدہ لفٹنٹ کی طرح۔ اس بار ذی شی نے چلتے چلتے میرا ہاتھ نہیں پکڑا۔ میں نے اپنے دل کو سمجھایا۔ بیٹا صبر کرو۔ رونے دھونے سے کیا ہوتا ہے۔ ایسے ایسے کئی چرکے تم کھا چکے ہو۔

گرجن میں زندگی ایک سپنے کی طرح گذرتی ہے۔ اس سپنے میں سبز ریشمیں گھاس کے بے شمار قطعے ہیں۔ ان قطعوں کے اندر کہیں کہیں تنگ کے درخت ہیں۔ ان تنگ کے درختوں کے نیچے گڈریے اور اُن کے ریوڑ رہتے ہیں۔ دن بھر ریوڑ سبزے کے قطعوں میں گھاس چرتے ہیں۔ کودتے ہیں۔ ناچتے ہیں۔ میں میں بابا کرتے ہیں۔ عشق کرتے ہیں۔ کبھی ناکام رہتے ہیں تو ایک دوسرے کو سینگ مار مار کر لہو لہان کر دیتے ہیں۔ گڈریے مینڈھوں کو لڑاتے ہیں۔ شرطیں بدتے ہیں۔ ہارتے ہیں جیتتے ہیں۔ الغوزے بجاتے ہیں۔ شکنجہ کھیلتے ہیں۔ پھر جب شام ہو جاتی ہے اور مغربی افق کی آخری لال دھاری تاریکی میں گم ہونے لگتی ہے تو ریوڑوں کو واپس تنگ کے درختوں تلے لے آتے ہیں۔ الاؤ کے ارد گرد بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے میں دودھ شامل ہوتا ہے اور مکھن۔ اور مکئی کی روٹی کبھی نمک یا گڑ۔ یا نیچے کی بستیوں سے کبھی کبھی پیاز اور سُرخ مرچیں بھی آ جاتی ہیں۔ ورنہ اکثر دہی دودھ اور مکئی کی روٹی۔ دہی اور مکھن۔ پنیر۔ گرجن میں ہر چرواہے اور چرواہی کے جسم سے پنیر کی سوندھی سوندھی بو آتی ہے۔ جو اکثر شہری طبیعتوں کو بہت بُری معلوم ہوتی ہو گی۔ پسند اپنی اپنی، غازہ اور پوڈر۔ اور لپ سٹک کی جگہ چرواہیاں یہی دودھ مکھن استعمال کرتی ہیں۔ تیل کی جگہ بھی مکھن۔ یہاں مٹی کے برتن بہت کم ہوتے ہیں۔ دودھ کھالوں میں دودھ کر رکھا جاتا ہے۔ دودھ دوہتے وقت چرواہیاں شرطیں بدتی ہیں کس کی بکری زیادہ دودھ دیتی ہے؟ کون زیادہ دودھ کی دھاریں اپنے مُنہ میں ڈال سکتی ہے۔ نیم گرم دودھ کی تازہ دھاریں جب پیاسی زبان سے جا لگتی ہیں۔ تو دل کو وہ فرحت نصیب ہوتی ہے کہ چائے اور کوکو سب بھول جاتے ہیں۔ میرے خیال میں زندگی کا بہترین مصرف یہ ہے کہ آدمی بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک تنگ کے درخت کے تلے رہے۔ بکریاں چرائے۔ الغوزے بجائے اور تازے دودھ کی دھاروں سے مشام جان کو ہر دم تازہ رکھے۔ دودھ سے مکھن نکالنے کا طریقہ بھی بہت عجیب ہے۔ یہاں نہ مٹی کی مٹکی ہے نہ بلونا۔ بس ایک کھال میں اس کے نصف حجم کے برابر دودھ ڈال دیا جاتا ہے۔ اور ایک چرواہی اس کھال کو اچھی طرح سے بند کر کے ایک پھکنے کی طرح گھاس پر لٹا دیتی ہے۔ اور پھر جس طرح آٹا گوندھا جاتا ہے۔ اُس طرح کھال کو اپنے ہاتھوں سے بار بار گوندھتی ہے۔ لٹیں بکھری ہوئی ہیں۔ چہرہ لال ہے۔ آنکھوں میں چمک ہے۔ زبان پر ایک پہاڑی گیت ہے اور کھال کو گوندھے جا رہی ہے۔ کوئی ایک آدھ گھنٹے کے بعد کھال کے اندر دودھ اور مکھن الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ دودھ الگ دوسری کھال میں ڈال لیا جاتا ہے اور مکھن ہاتھ سے اتار لیا جاتا ہے۔ دودھ خالص بھی ہوتا ہے اور گاڑھا بھی۔ اس دودھ میں پانی کم اور مکھن زیادہ ہوتا ہے اور جب پیو تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا شیریں مکھن کا سیال ہے کہ گلے میں اترتا جا رہا ہے۔ اس دودھ کو پی کر نیند بہت آتی ہے۔ ساری زندگی ایک سپنا معلوم ہوتی ہے۔ اور در اصل گرجن ہے بھی ایک سپنا ہی۔ ورنہ ایسے ایسے مقام تو اب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ اب تو دنیا تلخ حقیقتوں سے بھری جا رہی ہے۔ نقلی دودھ اور نقلی محبت، اور نقلی انسانیت، اور پھر زندگی کارخانے سے گھر کے گندے صحن میں۔ اور گندے صحن سے کارخانے کے گندے ورکشاپ تک محدود رہتی ہے۔ اس زندگی میں بچے پیدا ہوتے ہی بوڑھوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں لیکن گرجن میں ابھی تک ہر بوڑھا اور نوجوان بچپن کی معصومیت کو لئے ہوئے ہے۔ الاؤ کے چٹختے ہوئے کوئلوں کی مدھم روشنی میں چرواہیاں اُون سے کچھ بُن رہی ہیں۔ تکلی گھوم رہی ہے۔ اُن کی باہیں اور چہرے۔ اور آنکھیں ایک خاص ترتیب سے حرکت کرتی ہیں، جیسے یہ مکھن کی پتلیاں ہیں۔ ایک چرواہا کہانی سنا رہا ہے۔ ریمی کی کہانی تم نے سنی ہے ریمی گرجن کی سب سے حسین لڑکی تھی۔ وہ تنگوں کے سایوں میں پل کر جوان ہوئی۔ اور ننندن سر کی نیلی جھیل کا عکس اس کی دلکش آنکھوں میں چمکتا تھا۔ اس کی جبیں گرجن کی برف کی طرح سپید تھی۔ اور ڈوبتے ہوئے سورج نے اُس کی گالوں کو چوم کر انہیں ایک جادوانی چمک عطا کی تھی۔ ایسی لڑکی کسی دیوتا ہی سے بیاہنے کے لائق تھی۔ کسی چرواہے کو اُس سے محبت کرنے کی جرأت نہ ہونی چاہیئے تھی۔ گرجن دیوتا کا سایہ اُس پر تھا وہ اکثر دن بھر اکیلی گھومتی تھی۔ کبھی کبھی وہ بے خوف و خطر گرجن کی سب سے اونچی چوٹی پر چلی جاتی۔ شاید اس نے دیوتا کے درشن کر لئے تھے۔ وہ اپنے ماں باپ کو بہت پیاری تھی لیکن افسوس وہ اُسے کسی سے بیاہ نہ سکتے تھے۔ داٹو ایک معمولی چرواہا تھا لیکن اُس نے ریمی سے عشق کیا۔ وہ جان بوجھ کر موت کے مُنہ میں جا رہا تھا۔ اُسے کئی بار سمجھدار بوڑھے چرواہوں نے سمجھایا لیکن وہ نہ مانا گرجن

دیوتانے بھی اُسے کئی بار سمجھایا۔ کہانی سنانے والے چرواہے کو معلوم تھا کہ ایک بار
داتو کو لُگ سر کی گھاٹی میں گرجن دیوتا ملے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ اور گھاٹیاں اور چوٹیاں
اور میدان ایک روپہلی خاموشی میں کھوئے ہوئے تھے۔ نہ ہوا تھی، نہ نغمہ، نہ بادل
اور اس خاموش بے حس و حرکت کائنات میں صرف دو دل دھڑک رہے تھے۔
ریمی اور داتو۔ داتو اور ریمی اور داتو نے جرأت کرکے ریمی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ عین اُسی
وقت داتو کو سامنے ایک سپید برف کا گولا ہوا میں اڑتا ہوا نظر آیا۔ اس نے گھبرا کر
ریمی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ گولا ہوا میں اڑتا ہوا آسمان کی طرف پرواز کرنے لگا۔ اور پھر اُس کے
سامنے زمین سے آسمان تک برف کی ایک لکیر کھچ گئی تھی، ریمی کی آنکھیں بند تھیں
اور چہرہ سپید۔ اور داتو اس لکیر کو دیکھ کر کانپنے لگا۔ لیکن وہ ریمی کی محبت سے دستبردار
نہ ہوا۔ گرجن دیوتا نے اُسے ایک بار پھر سرزنش کی۔ کہانی سنانے والے چرواہے
کو معلوم تھا کہ کس طرح داتو کو گرجن دیوتا نے رات بھر طوفان میں گھیرے رکھا تھا۔ داتو
کو اس بھیانک رات میں کبھی کبھی گرجن دیوتا کی خشمگیں آواز سنائی دیتی۔ ریمی کی محبت
سے باز آ، ریمی تیری نہیں ہو سکتی، کبھی کبھی اُسے بھیڑ بکریوں کی آوازیں سنائی
دیتیں۔ کبھی کبھی کوئی جلتا ہوا الاؤ کسی تنگ کے نیچے نظر آ جاتا۔ لیکن یہ سب گرجن دیوتا کے
کرشمے تھے، وہ رات بھر طوفان میں گھرا رہا، اور جب دوسرے دن وہ گھر پہنچا تو
لوگوں نے دیکھا کہ اُس کی ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی اور اس کے پاؤں کے انگوٹھے
ہمیشہ کے لئے نیلے ہوگئے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ اُسی شدت سے ریمی سے محبت کرتا
رہا۔

"پھر کیا ہوا؟" ایک چرواہے نے کانپتے ہوئے پوچھا۔

"بس گرجن کی کہانیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ان میں محبت ہوتی ہے، بچپن
کے ہوائی قلعے، معصوم توہمات اور قدرت کے ہیبت ناک مناظر۔ ان کہانیوں
میں نہ فن کاری ہوتی ہے۔ نہ عروج، نہ پلاٹ، گڈریہ جو جی میں آئے کہتا چلا جارہا ہے
کہانی آپ ہی آپ بنتی چلی جارہی ہے۔ جیسے ریشم کے کیڑے کے منہ سے ایک
خوبصورت کویا تیار ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہانی کہنے والے کی زبان کہتی چلی جارہی ہے
اور کہانی تیار ہوتی جارہی ہے۔ یہ کہانی اُس کہنے والے نے بھی پہلے کبھی نہیں سُنی
اُسے خود معلوم نہیں "پھر کیا ہوا؟" لیکن وہ کہانی کہتا چلا جارہا ہے۔ اور رات کے سناٹے
میں۔ الاؤ کی روشنی میں، اُن کپکپاتی ہوئی چرواہنوں کے جھرمٹ میں داتو اور ریمی کے
حسین پتلے تخیل کے شبستان میں اُجاگر ہو رہے ہیں۔

لیکن ریوا کو شاعری سے دلچسپی نہیں۔ وہ کہانیاں سننا نہیں چاہتا، اُسے
اعتراض ہے کہ کیوں ہم نے پہاڑ کی بلندیوں کو چھوڑ کر پستی اختیار کی ہے۔ اُس کی
شاہین کی سی نگاہیں شکار کی تلاش میں زیادہ خوشی محسوس کرتی ہیں۔ اُسے یہاں کی
مکھن کی ٹکیلیوں یا الغوزے بجاتے ہوئے گڈریوں یا گرجن دیوتا کی بہیمانہ حرکتوں
سے ذرا بھی دلچسپی نہیں، وہ قدرت سے، طوفان سے، موت سے ایک بہادر
سپاہی کی طرح مقابلہ کرنا جانتا ہے۔ اُسے معلوم نہیں کہ اداشا کی بے وفائی نے
میرے دل میں کیا آگ لگا رکھی ہے اور اب گرجن کی برفانی وادیوں میں ایک نئے
الاؤ کے شعلے لپکنے لگے ہیں۔ وہ صرف ایک خوشبو کی تعریف کرنا جانتا ہے جب
وہ کبھی ہرن کو زخمی کرکے فوراً اُس کے نافے پر زور سے ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ نافے کی
تھیلی میں سے خوشبو کی لپٹیں نکلتی ہیں۔ ہرن جانکنی کی حالت میں ہے۔ زندگی نافے میں
سے خوشبو کی لپٹیں بن کر نکل رہی ہے۔ ریوا اپنے شکار پر جھکا ہوا ہے۔ نافے کو مضبوطی
سے پکڑ کر اور اُسے چاقو سے چیر کر جسم سے الگ کر ڈالتا ہے۔ کہتے ہیں اگر نافہ
ہرن کا شکار کرتے ہوئے فوراً ہی اس تھیلی کو نہ پکڑ لیا جائے تو سارا نافہ ہرن کے
جسم میں جذب ہو جاتا ہے۔ اور تھیلی میں ذرا سی بھی خوشبو نہیں رہتی۔ اور نافہ نافہ
نہیں رہتا، بلکہ محض چربی کی ایک پوٹ۔ ریوا صرف نافے کی تعریف کرسکتا ہے۔ پنیر
کی سوندھی خوشبو سے اُسے گھن آتی ہے۔ ذی شی کے بال۔ ذی شی کے کپڑوں
اور ذی شی کے جسم میں بھی یہی پنیر کی سوندھی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا
کہ جگدیش ایک صاحب ہو کر بھی کیونکر ذی شی سے عشق کرسکتا ہے۔ خود جگدیش کو بھی
اس نئے جذبے پر حیرانی سی تھی، اُس نے اکثر۔ بلکہ ہم دونوں نے اکثر پہاڑی
عورتوں سے عشق کیا تھا۔ اور یہ عشق ہمیشہ چند روپوں۔ حفاظتی تدبیروں اور دو ایک
ریشمی رومالوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ کبھی ہم اسے شعری جذبہ کہتے تھے کبھی وقتی شادی
لیکن ہوتا ہی کچھ تھا یعنی تک دیکھ لیا، دشاد کیا، لیکن یہ کسی بلا خیز طوفان کی آندھی کہ
ذی شی کو دیکھتے ہی جگدیش اُس میں ایسا کھو جاتا تھا کہ ذی شی کے سوائے
اسے دنیا کی کوئی اور چیز اچھی نہ لگتی تھی یہاں نہ جہیز کا سوال تھا، نہ تعلیم کا، نہ آداب
کا اور ذی شی ان سب باتوں سے بیگانہ تھی۔ پھر بھی جگدیش اس بے وقوفی پر
تلا ہوا تھا۔ وہ ذی شی سے شادی کرنا چاہتا تھا، شادی! سمجھتے ہو دوست! جگدیش
اُس بے باک پہاڑی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جس نے صوفے کی شکل تک
نہ دیکھی تھی، جس کے باپ کے پاس ایک گز زمین بھی نہ تھی جس کی انگلیوں میں ایک
چاندی کی انگوٹھی بھی نہ تھی جس کے اطوار وحشی پرندے کی طرح تھے۔ گرجن دیوتا
اس سے زیادہ بدعا اور کسی کو نہ دے سکتے تھے۔ لیکن جگدیش بے بس تھا میں اُسے
کئی بار سمجھاتا، پاگل ہوئے ہو؟ گرجن کی زندگی خانہ بدوش گڈریوں کی زندگی
ہے لیکن انسان ایسی قبائلی زندگی سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ وہ تنگ کے
درختوں تلے نہیں رہتا۔ بلکہ شہر بسا کر رہتا ہے۔ وہ صرف مکھن اور پنیر پر قناعت
نہیں کرتا۔ بلکہ زندگی کی صدہا لذتیں اُسے میسر ہیں۔ ذی شی پہاڑی لڑکی ہے۔ میدان

میں تمازت آفتاب سے فوراً جھلس جائے گی تم خود اس سے نفرت کرنے لگو گے۔ کیا سمجھتے ہو؟ جس نظام میں تم رہتے ہو۔ اُس میں اس قسم کی عورت ایک دن بھی مشکل گزارا سکے گی۔ گھٹ کر مر جائے گی۔ شہری زندگی کا آسمان بہت تنگ ہوتا ہے۔ اور زمین بھی نپی تلی ہوئی۔ وہاں نہ برفانی چوٹیاں ہوتی ہیں۔ نہ سرسبز مرغزار۔ ذی شی تو ایک عجائب گھر میں رکھے جانے کے لائق ہے نہ کہ تمہاری بیوی ہونے کے لائق۔ اور پھر آج کل شادی میں محبت کو کیا دخل۔ قبائلی زندگی میں محبت ہو سکتی تھی لیکن موجودہ زندگی میں اور اس کے زمینی نظام میں محبت کو کیا دخل۔ اس دنیا میں ایک اونٹ کو سوئی کے ناکے سے گزارا جا سکتا ہے لیکن محبت کے جذبے کو اس دنیا میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔ جب گرجن سے واپس جاؤ گے۔ اس وقت میری باتوں کی قدر معلوم ہو گی۔ اُس وقت تمہیں ہوش آ جائے گی۔ ذی شی تو سینما بھی نہیں دیکھ سکتی کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہو! جگ ہنسائی ہو گی۔ لوگ کہیں گے۔ جگدیش چڑیا گھر سے ایک جانور پکڑ لایا ہے۔

لیکن جگدیش بے بس تھا شاید عمر میں پہلی بار اُسے کسی سے محبت ہوئی تھی وہ محبت جو چند رولوں۔ حفاظتی تدبیروں اور ریشمی رومالوں پر مشتمل نہ تھی۔ یہ کسی ان دیکھی آگ کا شعلہ تھا جو اُس کی رُوح کے ہر کونے میں کوندتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یہ کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔ اب جگدیش اور ذی شی اکثر اکٹھے رہتے تھے۔ پہلے پہل ذی شی ہم تینوں کے ساتھ شکار کے لئے جاتی تھی۔ اُس نے بندوق چلانا بہت جلد سیکھ لیا تھا۔ اور کچھ دنوں سے تو وہ ایک مشاق شکاری بن گئی تھی۔ جس کی نگاہیں ریوا کی عنابی آنکھوں سے تیزی میں کچھ ہی کم تھیں۔ لیکن اب جگدیش اور ذی شی اکثر اکیلے شکار کو جاتے تھے۔ اور ریوا اور میں اکثر مخالف سمت میں جایا کرتے۔ لیکن کبھی کبھی کسی گھاٹی کی تنگنائے میں ہمارا میل ہو جاتا۔ وہ باہوں میں باہیں ڈالے چلے آ رہے ہوتے۔ اُن کے کاندھوں پر بندوقیں ہوتیں۔ جھولوں میں دن بھر کا شکار۔ نگاہوں میں ایک دوسرے کے لئے بے اندازہ محبت کبھی کبھی میں انہیں دن ڈھلے کسی گھاٹی کی اونچی چٹان پر کھڑے دیکھ لیتا۔ ان کی پشت میری طرف ہوتی۔ جگدیش کا ہاتھ ذی شی کی کمر میں ہوتا اور ذی شی کا سر جگدیش کے کندھے پر، بندوقوں کی سیاہ نالیں۔ درختوں کے تنوں کی طرح نظر آتیں۔ جس سے وہ سہارا لئے کھڑے ہوتے۔ وہ نیچے اُن وادیوں کی طرف تک رہے ہوتے جہاں شام کی دھند پھیلتی جا رہی تھی اور سورج کا پگھلا ہوا سونا دھند کی سفید لہروں پر تیرتا ہوا نظر آتا۔ ساری فضا میں خاموشی ہوتی اور اس روپہلی خاموشی میں صرف دو دل دھڑک رہے ہوتے۔ میں ان دلوں کا گیت سن سکتا تھا۔ یکایک ریوا بندوق سیدھی کرتا اور "ٹھائیں" کی آواز کے ساتھ ایک سہنولہ زمین پر آ گرتا۔

جگدیش اور ذی شی چونک جاتے۔ جیسے اُن کے سنہرے سپنے کے تانے بکھرا اُٹھے ہوں۔ بندوق کی گرج گھاٹیوں میں بار بار گونجتی ہوئی پھیلتی جاتی۔ جیسے گرجن دیوتا گرج رہے ہوں۔

جگدیش بے بس تھا۔ لیکن یہ جانتا ضرور تھا کہ یہ محبت میدانوں میں پنپنے کی نہیں وہ اس سندر سپنے کو ابدی بنانا چاہتا تھا لیکن سپنے آخر سپنے ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی فضا ہوتی ہے۔ ان کی اپنی دنیا ہوتی ہے اور جب یہ ہماری دنیا سے ٹکراتے میں تو پانی کے بلبلے کی طرح چیخ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور آواز بھی نہیں آتی۔ کئی لوگ اس دنیا میں سندر سپنوں کو ابدی بنانا چاہتے ہیں۔ سچی محبت سچی انسانیت سچی اخوت سچی مساوات ..... پانی کے بلبلے ...... وہ اس دنیا کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ نہیں جانتے کہ یہ چیزیں اس دنیا کی فضا میں نہیں پھل پھول سکتیں۔ ان کے لئے ایک نئی فضا کی ضرورت ہے۔ ان کے لئے ہمیں اس ساری دنیا کو حرف غلط کی طرح مٹا دینا ہو گا۔ اور ایک نئی دنیا آباد کرنا ہو گی جگدیش جانتا تھا کہ یہ کہنا آسان ہے۔ لیکن کرنا بہت مشکل۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جگدیش نے واقعی اپنے سندر سپنے کو ابدی کر لیا۔ مجھے وہ طوفانی رات نہیں بھولتی۔ جب اُسی تنگ کے درخت کے نیچے میں، ریوا اور بوڑھا بونارات بھر جگدیش اور ذی شی کا انتظار کرتے رہے تھے۔ برفانی ہواؤں کے فراٹوں نے ریوڑ کو اس طرح اکٹھا کر دیا تھا۔ کہ وہ سب غریب جانور ایک دوسرے کی تھوتھنیوں میں مُنہ چھپائے پڑے تھے اور کراہ رہے تھے۔ تنگ کے باہر طوفان گرج رہا تھا اور بجلی کے پُر پیچ حلقے زمین پر آگ کے بگولوں کی طرح چلتے نظر آتے۔ ایک جہنمی منظر تھا جس میں بادلوں کی گرج۔ ہوا کی وحشیانہ چیخیں اور چوٹیوں پر سے گرتی ہوئی برف کے بھیانک قہقہے سنائی دیتے تھے۔ ریوا نے صبح سویرے ہی آنے والے طوفان کے متعلق ہم سب کو متنبہ کر دیا تھا لیکن جگدیش اور ذی شی نے ہنس کر بات ٹال دی تھی۔ ذی شی تو طوفانوں سے مطلق نہ ڈرتی تھی۔ اور اس کے علاوہ اُس دن وہ کسی رونسے کا شکار کرنا چاہتی تھی جو دنوں سے گرجن پہاڑ کی چوٹیوں پر گھوم رہے تھے۔ جگدیش اور ذی شی دونوں رخت سفر باندھ کر شکار کے لئے صبح ہی اُن خوفناک بلندیوں کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ جہاں پہلے اُن کا کیمپ تھا اور میں نے اور ریوا نے انہیں رومال ہلا ہلا کر الوداع کہی تھی۔

یہ آخری الوداع تھی یہ اُس رات گرجن کے خوفناک دیوتا نے اپنے محبوب کو اپنی یخ بستہ چھاتی سے ہمیشہ کے لئے لپٹا لیا اور اپنے رقیب کے سینے میں وہی بجلی گھونپ دی جو رات بھر آگ کے پُر پیچ حلقوں میں گردش کرتی رہی تھی

یہ گرجن دیوتا کا انتقام تھا! دوسرے دن جب ہم چند اور گڈریوں کو ساتھ لے کر انہیں ڈھونڈنے کے لئے نکلے تو ہم نے انہیں پہاڑ کی بلندیوں پر ایک سلوٹ کے نیچے مردہ اور یخ بستہ پایا۔ جگدیش کی آنکھیں کھلی تھیں اور ذی شی کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے دیکھتے مر گئے تھے۔

ذی شی برف پر لیٹی ہوئی تھی اور جگدیش اس کا سر اپنے زانو پر رکھے تھا اور سلوٹ کے کناروں سے رات بھر پانی رستا رہا تھا اور اُس نے اُن دونوں کے گرد ایک نیلم کی قبر بنا دی تھی۔ ذی شی کی آنکھیں گہری نیلی تھیں جیسے نندن سر کی جھیل اور جگدیش کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں اُن کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے جگدیش کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا آہ ان گہرائیوں کا الم کسی بے کس، زخمی، سسکتے ہوئے آہو کی فریادوں کا آئینہ دار تھا، ہرن جانکنی میں تھا اور زندگی نافے میں سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی ...... جب سندر سپنے اس دنیا سے ٹکراتے ہیں تو پانی کے بلبلے کی طرح چٹخ کر ٹوٹ جاتے ہیں.....

ٹنگ کے دائرے سے باہر گھپ اندھیرا تھا۔ الاؤ کے تنگ ہالے میں ریوڑ سویا ہوا نظر آتا تھا۔ چرواہیاں تکلی پھراتی ہوئی اُون سے کچھ بُن رہی تھیں چرواہے محویت کے عالم میں ہاتھوں میں ٹھوڑیاں لئے ایک کہانی سُن رہے تھے کہانی سنانے والا چرواہا کہہ رہا تھا۔ بہت دن گزرے اس ٹنگ کے درخت کے نیچے ایک پہاڑی بونار رہتا تھا۔ اُس کی لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ اُس کا نام تھا۔ ذی شی۔ ذی شی گرجن دیوتا کی منظورِ نظر تھی۔ ایک دن کیا ہوا کہ اسی ٹنگ کے درخت کے سائے میں تین شکاری آکر بیٹھے.....

ایک چرواہی نے سانس روک کر پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

کرشن چندر

شعر

میری چپ رہنے کی عادت جس کارن بدنام ہوئی
اب وہ حکایت عام ہوئی ہے سنتا جا شرماتا جا

حفیظ جالندھری

گیت

پاؤں میں پڑے ہوں چھالے
کانٹوں سے چھلے ہوں تلوے
ہم پریم پنتھ کے راہی، ہنس ہنس کر کشٹ سہیں گے
ہم تم ایک ساتھ رہیں گے

چھایا ہو گھور اندھیرا
ڈوبی جاتی ہو نیّا
ہم متوالی لہروں پر، ساجن اک ساتھ بہیں گے
ہم تم اک ساتھ رہیں گے

بھونچال سے دھرتی کانپے
جگ پڑا رہے دکھ ڈھانپے
ہم پریم مندر کے باسی، گائیں گے اور کہیں گے
ہم تم اک ساتھ رہیں گے

سپنے میں آیا کرنا!
یہ گیت سنایا کرنا
ہم تم اک ساتھ رہیں گے۔ ہم تم اک ساتھ رہیں گے
ہم تم ایک ساتھ رہیں گے

صابر ٹوہانوی

غزل

غلط کہ شوق ترا محرمِ نیاز نہیں
مگر یہ کیا کہ غمِ دو جہاں گداز نہیں

ہے تنگ ہمّتِ رہرو کو عرصۂ منزل
میں کیا چلوں کہ رہِ زندگی دراز نہیں

بلا کی بزم ہے یارب ترا جہاں جس میں
کوئی نظر مجھے سامانِ احتراز نہیں

مِلا بھی اور نہ ملا مجھ کو کچھ پتہ اپنا
یہ ایک راز ہے لیکن یہ کوئی راز نہیں

فریبِ عقل میں آتا نہیں جنوں میرا
فریب ہے مگر ایسا زمانہ ساز نہیں

نہ جا خدا کے لئے دشتِ جستجو میں نہ جا
سوادِ غزنیٔ اُمید میں ایاز نہیں

شکستِ حُسن کی روداد بھی تو ہے اس میں
تو گر سُنے تو فسانہ مرا دراز نہیں

عبث ہے وحشتِ انساں کمالِ فطرت سے
کہ اُس کی صنعتِ نازک حریفِ راز نہیں

کہاں ہے شیخ؟ یہ اصل و مجاز کیا شے ہے؟
حقیقتِ ازلی میں کوئی مجاز نہیں۔

ہے پاسِ وضعِ وفا کس کو اس زمانے میں
میں رہنِ شوق نہیں، تُو اسیرِ ناز نہیں

مرے سخن کو ترازوئے نغمہ سے مت تول
سرودِ عشق بقدرِ نوائے ساز نہیں

گدائے میکدہ ہے اب بھی تائبؔ اے ساقی!
تری نگاہ مگر میکدہ نواز نہیں

مراتب علی تائبؔ

اُردو کی شاہی سرپرستی

عرصہ ہوا۔ ادبی دنیا میں اسی عنوان کے تحت ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ جس میں دکھایا گیا تھا کہ شاہان سلف نے اردو کی کیسی قدردانی کی لیکن تعجب ہے کہ اس میں اس سرپرستی کا قطعی ذکر نہیں تھا جو انگلستان کے شاہی خاندان نے کی۔

ملکہ وکٹوریہ کو ہندوستان اور ہندوستانیوں سے جیسی محبت تھی اس کا بہت کم لوگوں کو علم ہے اور ہندوستانی امور کے متعلق حکم احکام جاری کرنے اور اسی کے متعلق دیگر ضروریات کو مدِنظر رکھتے ہوئے انھوں نے حکم دیا کہ ایک سکرٹری ہندوستانی ہونا چاہئیے۔ چنانچہ حافظ منشی عبدالکریم صاحب کا تقرر عمل میں آیا۔

حافظ صاحب آگرہ کے رہنے والے ایک معمولی گھرانے کے فرد تھے۔ فارسی۔ عربی۔ خوب جانتے تھے۔ مگر انگریزی مطلق نہیں جانتے تھے۔ بلند قامت اور انتہا سے زیادہ شان دار اور وجیہہ آدمی تھے۔ ایک انگریز کے ساتھ بہت قلیل تنخواہ پر ولائیت گئے ہوئے تھے۔ وہاں ان کو اس ملازمت کا موقع مل گیا۔

ملکہ معظمہ نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے ہندوستان کی زبان سیکھیں۔ اور منشی صاحب سے اُردو پڑھنا شروع کر دی۔ مجھے ٹھیک تاریخ یاد نہیں لیکن سنہ ۹۰ء سے قبل حافظ صاحب اس عہدے پر مامور ہو چکے تھے۔

بہت تھوڑے عرصے میں حافظ صاحب کا اس قدر رسوخ بڑھ گیا کہ علاوہ تنخواہ میں اضافہ ہونے کے ان کو شاہی محل میں رہنے کو جگہ ملی۔ اور بہت جلد انھوں نے ہر مجسٹی کے اشارے ہی سے اپنی بیوی اور بھتیجے عبدالرشید صاحب کو بھی بلا لیا۔ ملکہ معظمہ نے سلوک اور مہربانی میں کسر نہ اٹھا رکھی۔ خود اُن کے گھر آتیں۔ اور مہربانی دن بدن اس درجے بڑھتی گئی کہ روز کا ان کا معمول ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز برابر حافظ صاحب[1] کے یہاں بھجواتیں۔ روزانہ بعد ناشتہ معمول کر لیا کہ حافظ صاحب کی بیوی سے ملنے آتیں اور دیر تک بیٹھی رہتیں۔ اس اعزاز کے ساتھ حافظ صاحب کا اعزاز بھی بڑھتا ہی چلا گیا۔ ہر موقع پر ان کو ساتھ رکھتیں۔ جہاں سوائے شاہی خاندان کے لوگوں کے کوئی نہ ہو وہاں حافظ صاحب کو دیکھ لیجئے۔ برابری کا سلوک کرنے لگیں اور حد یہ پہنچی کہ یورپ کے بادشاہوں میں سے کوئی آتا تو اس کے ساتھ تمام پروگرام میں برابر کے شریک رہتے۔ ملکہ معظمہ نے ان کو ایک معزز دوست کی طرح رکھا۔ اور اس کی تصدیق ملکہ معظمہ کی خود تحریر کرتی ہے۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً حافظ صاحب کو کتابیں بھی بطور تحفہ دی ہیں۔ اور ان کتابوں میں خود اپنے قلم سے لکھتی ہیں

PRESENTEDTO HERMOST LOYAL & SINCERE

FRIEND HAFIZ MUNSHI ABDULKARIM

دوسری کتاب میں بجائے SINCERE کے

AFFECTIONATE' INTIMATE لکھتی ہیں

کسی میں کچھ اور کسی میں کچھ اور انتہا جا کر ہوتی ہے۔ کہ ایک کتاب میں آپ کو LOVING FRIEND کا لقب عطا ہوتا ہے لیکن لفظ LOYAL سب میں ہے

کئی کتابوں میں اردو میں لکھا ہے:۔

بخدمت حافظ منشی عبدالکریم۔

اور نیچے دستخط فرماتی ہیں: "وکٹوریہ قیصرۂ ہند"۔ ہاتھ میں رعشہ تھا۔ لہذا قلم روک کر لکھتی تھیں سطر قدرے ٹیڑھی ہو جاتی تھی۔ "وکٹوریہ کے" "و" کو خوب گھماتی تھیں اور بہت کچھ تحریر اس طرح ہے:۔

وکٹوریہ

اعزاز کا اندازہ چند واقعات سے کیجئے:۔

زار روس آئے تو اُن کو بھی حافظ صاحب کے گھر آنا پڑا۔ زارینہ اُن کی

سلہ جن برتنوں میں یہ تحفہ آتا وہ بھی تحفے کے ساتھ ہی رہ جاتے اور اب تک کریم لاج میں رکھے ہوئے ہیں۔ یہ برتن مختلف کھانوں کے ہیں۔ جن پر وکٹوریہ کا شاہی کورٹ آف آرم بنا ہوا ہے۔ ان برتنوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کھانے کی ہر قسم کی چیزیں بھیجی تھیں۔ دراصل ان کی میز پر جو بھی پسندیدہ کھانا آتا۔ اس کا ایک حصہ اسی وقت انتہائی بے تکلفی کے ساتھ بھیج دیتی تھیں۔

بیوی سے ملیں اور تبادلۂ تحائف ہوا۔ زار روس نے جو چائے کا مرصع سٹ دیا وہ اب بھی موجود ہے۔ حافظ صاحب کی بیوی نے زردوزی کے کپڑے وغیرہ زارینہ کو دیئے۔ جن کی تصویریں موجود ہیں۔

شاہان یورپ کی دستی تصاویر موجود ہیں۔ جو انھوں نے بطور اظہار دوستی حافظ صاحب کو دیں۔ اپنے زمانے کے ہر بادشاہ سے برابر سے ملے جیسا کہ تمام تصویروں اور اخبارات کے کٹنگ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے۔

ایک تصویر دیکھئے۔ حافظ صاحب ہندوستان جانے کے لئے چوکڑی پر سوار ہیں۔ ملکہ معظمہ نیچے کھڑی ان کو رخصت کر رہی ہیں اور مصافحہ کر رہی ہیں۔ امپیریل گارڈ سلامی دے رہا ہے۔

ایک اور شاہی خاندان کے ممبروں کی تصویر ہیں ملکہ معظمہ درجنوں لڑکوں، لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی ہیں۔ بیچوں بیچ میں حافظ صاحب بیٹھے ہیں۔ داہنے ہاتھ پر ملکہ معظمہ میں شہنشاہ جارج پنجم پیچھے کھڑے ہیں۔ اس وقت یہ ولی عہد کیا بلکہ ولی عہد کے ولی عہد بھی نہ تھے یعنی شہزادہ وکٹر زندہ تھے۔

ایک اور تصویر دیکھئے کہ ملکہ معظمہ بیٹھی اردو پڑھ رہی ہیں اور حافظ صاحب انکی سے کتاب پر کچھ بتا رہے ہیں۔ یہ تصویر چھپا تھی کہ لنڈن میں یہ بھی پھیل گئی کہ ملکہ معظمہ نے PRIVATE CAPACITY میں حافظ صاحب کے ساتھ بیٹھ کر تصویر کیوں کھنچوائی۔ سارا لندن کوئیلوں پر ٹوٹا کیا۔ اخباروں کے کٹنگ دیکھنے کے لائق ہیں

آپ ہندوستان تشریف لائے تو والدہ معظمہ کی بیماری کے سبب آئے تھے۔ برطانوی بیڑے کے جنگی جہاز پر تشریف لائے جو انتہائی تیز چلتا تھا۔ اور آگرہ جو پہنچے ہیں تو ملکہ معظمہ کے دو دو تین تار آتے تھے۔ جن میں بیماری اور خیر و عافیت طلبی ہوتی تھی۔

کمشنر صاحب آگرہ کے بارے میں ایک سخری طبیعت رکھنے والے صاحب کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور حافظ صاحب کے گھر کی ڈیوڑھی دھوپ سے جوتے ٹوٹ گئے تھے۔

آپ کو آگرہ ہی میں موضع "نینا ناجاٹ" بطور جاگیر صرف خاص سے دیا جواب بھی ہے۔ آپ کے والد صاحب کو خان بہادری کا خطاب ملا۔ شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم جب ہندوستان بحیثیت ولی عہد آئے تو حافظ صاحب کے والد کے گھر پر تھے۔ ان سے ملنے گھر پر گئے اور دعوت چائے قبول فرمائی۔

حافظ صاحب کو ہندوستانی خطاب کچھ نہ ملا لیکن وکٹورین آرڈر کا سب سے بڑا خطاب جو خود ملکہ کے ہاتھ میں تھا وہ انھوں نے عطا فرمایا یعنی "سی۔ جی۔ سی۔ وی۔ او"

ملکہ معظمہ سیر و تفریح اور کسی کام کے لئے کسی جگہ بھی جاتیں اسپیشل ٹرین میں ملکہ کے ڈبے سے ملا ڈبہ ان کا ہوتا۔ ایسا ہی فرانس میں ہوا۔ بڑے بڑے عمائد کا ڈبہ علیحدہ اور حافظ صاحب کا ڈبہ ملا ہوا جس میں سے آنے جانے کا راستہ تھا۔ یہاں ملکہ معظمہ کبوتروں کے شکار کو گئیں۔ اور سب سے زیادہ حافظ صاحب نے شکار کئے۔

محل میں ڈرامے بہت ہوتے اور ہمارے حافظ صاحب بھی ڈرامے میں حصہ لیتے۔ باوجود ملکہ کے ساتھ دن رات رہنے کے آپ کا لباس ہمیشہ ہندوستانی رہا یعنی شیروانی اور صافہ۔ اور اسی دھج سے آپ ڈرامے میں بھی شریک ہوتے۔ غالبًا کوئی باوقار پارٹ ادا کرتے ہوں گے۔

ملکہ معظمہ کے اردلی جتنے تھے۔ سب کے سب ہندوستانی تھے۔ ان لوگوں کو حافظ صاحب آگرہ سے لے گئے۔ محل کا تمام انتظام و انصرام اور ملکہ کی ذات خاص کے متعلق جتنے اہم اور ضروری کام تھے۔ ان سب پر ہندوستانی قابض ہو گئے۔ محل میں نہ صرف اردو سمجھی اور بولی جانے لگی۔ بلکہ بغیر اس کے کام چلنا ناممکن ہو گیا۔ تمام شہزادے شہزادیاں جو اپنی دادی کے اردگرد دن بھر کھیلتے سب اردو سیکھ گئے۔ شہزادی بیٹرس۔ ملکہ سویڈن جو ملکہ کی صاحبزادی تھیں۔ اور انکی لڑکیاں تک اردو سیکھ گئیں شہنشاہ ایڈورڈ۔ اور جارج پنجم اور ملکہ میری وغیرہ اور دن رات کے ساتھ رہنے والے عزیز۔ رشتہ دار اور ملازم اردو بولنا سیکھ گئے

ان اردلیوں نے وہ زور باندھا کہ جی چاہتا تو ایک دفعہ وزیر اعظم کو بھی کہہ دیتے کہ "انتظار کیجئے"

اور آخری وقت میں ان اردلیوں کی دن رات کی خدمت کی صد اس درجے پہنچی کہ ملکہ معذور ہو چکی تھیں۔ ان کو اٹھاتے بٹھاتے یہی تھے طبیعت ناساز ہو تو نرس کو ملکہ نکال دیتیں۔ اور اردلی خدمت کرتا۔ اور میں اس اردلی سے ملا ہوں جس کا کہنا ہے کہ ملکہ معظمہ نے اس کے ہاتھوں میں دم توڑا۔ جس وقت اس نے یہ بیان کیا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

بالمورل کاسل (BALMORAL CASLLE) میں ملکہ زیادہ رہتی تھیں۔ حافظ صاحب کے رہنے کے لئے کوارٹر ذرا فاصلے پر تھے۔ لہذا خاص اپنے کمرے کے سامنے چھوٹا سا مکان بالمورل کاسل کے اندر بنوا دیا جس کا نام "کریم لاج" ہے۔ اور جو آج تک مع سامان اسی طرح موجود ہے۔ اس کی خبر اخباروں میں چھپی جس کے میں نے کٹنگ دیکھے ہیں۔ لوگوں کو سخت کوفت ہوئی۔

حافظ صاحب نے ملکہ معظمہ کو نہ صرف اردو پڑھائی بلکہ قرآن پاک بھی پڑھایا۔ جسے وہ احترام اور شوق سے پڑھتی تھیں۔ اس کو الہامی کتاب مانتی تھیں

لارڈ کرزن جیسے مغرور وائسرائے سے حافظ صاحب کی زبردست ٹکر ہوئی۔ وہ ہندوستان میں تھے۔ جب لارڈ کرزن نے دہلی کا مشہور دربار منعقد کیا۔ حافظ صاحب کی جگہ داہنی صف میں والیانِ ملک کا رتبہ رکھنے والوں کے بعد یا ان کے ساتھ رکھی گئی۔ حافظ صاحب جو دن رات شاہانِ وقت سے برابری سے ملتے تھے۔ کب گوارا کر سکتے تھے۔ آپ نے شرکت سے انکار کر دیا۔ دراصل آپ کو دربار میں خود بطور ملکہ معظمہ کے نمایندے کی حیثیت سے شریک ہونا تھا۔ لہذا آپ نے فرمایا کہ میں کرزن کے برابر بیٹھوں گا۔ وہ اگر شاہِ وقت کے سرکاری نمایندے کی حیثیت رکھتے ہیں تو میں ذاتی نمایندہ ہوں۔ بڑی کشمکش ہوئی۔ کرزن ہارے اور ان کو ڈائس پر جگہ دینی پڑی برابر نہیں تو اپنے بعد۔

مگر عبرت کا مقام ہے کہ وکٹوریہ کے مرنے کے بعد متعصب انگریزوں نے بدلا لیا۔ اور وہ عبرت ناک سین بھی لوگوں نے دیکھا کہ حافظ صاحب کمشنر کے بنگلے پر اس کے منتظر ہیں کہ کمشنر صاحب غسل کر کے نکلیں۔

شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم تخت پر بیٹھے تو اس تکلیف کو محسوس کر کے حافظ صاحب نے ایک خط شاہ موصوف کو لکھا کہ آپ یو۔پی کے گورنر کو ایک نجی خط لکھ دیں۔

شاہ موصوف نے خط کا جو جواب دیا۔ وہ میں نے دیکھا ہے۔ اس میں شاہ موصوف نے لکھا کہ "سلطنت اتنی بڑی ہے کہ میں ہر گورنر کو ذاتی طور پر نہیں جانتا لیکن آپ اس خط کو لے جا کر جو صاحب بھی گورنر ہوں ان کو دکھائیں۔ وہ صاحب خود جان لیں گے کہ خط کا لکھنے والا کون ہے (یعنی بادشاہ خود) امید ہے کہ وہ آپ کا خیال کریں گے۔ حافظ صاحب نے ایسا ہی کیا۔ نتیجہ الٹا نکلا۔

حافظ صاحب کی یہاں تو کوئی سنتا نہ تھا۔ اور وہ ذرا ذرا سی بات کیلئے شاہِ وقت کو نجی خط لکھتے تھے۔ ان کی زندگی میں تو کسی کی نہ چلی لیکن ان کے مرنے کے بعد ہی ان کے خاندان والوں کو حکم ہو گیا کہ کوئی نجی خط مت لکھو بلکہ جو خط بھی لکھو کلکٹر ضلع کے ذریعے[۵] سے لکھو۔ کوئی تحفہ بھیجو تب بھی ایسا ہی کرو۔ حافظ صاحب

---

[۵] حافظ صاحب کے چھوٹے بھائی آگرہ کی تحصیل باہ میں تحصیلدار تھے۔ اور وہاں سے کسی نوع تبادلہ نہیں چاہتے تھے۔ جب کبھی تبادلہ کا سوال اٹھتا۔ ڈوری لندن کے شاہی محل سے کھنچتی اور تبادلہ رک جاتا۔ یہ بات یہاں والوں کو سخت ناگوار گزرتی۔ تحصیل باہ میں اب بھی ریل نہیں ہے۔ واللہ اعلم کہاں تک صحیح ہے کہ حافظ صاحب نے وہاں ریل نہ نکلنے دی۔ اس لئے کہ بھائی نہیں چاہتے تھے۔

دراصل لندن میں حافظ صاحب ایسی پوزیشن میں تھے کہ انڈیا آفس میں کسی سے بھی کچھ کہہ دیں تو ہو جاوے۔ یا اور کسی سے کہدیں تو ہو جاوے۔

کے بھتیجے عبدالرشید صاحب ولایت میں ساتھ ہی رہتے تھے۔ اور تمام شاہی خاندان کے لڑکوں کے ساتھ دن رات رہنا ہوتا تھا جن میں شہنشاہ جارج آنجہانی بھی تھے۔ ستم دیکھیے کہ ان کو بھی منع ہو گیا کہ نجی خط نہ لکھو۔

یہ بھی قانون بن گیا کہ شاہِ وقت کے ہندوستانی اردلی خود یہاں سے تین سال کے لئے بھیجے جائیں۔ چنانچہ اب فوجی آدمی جاتے ہیں۔ اور شاہ وقت سے بہت دور رکھے جاتے ہیں۔

ملکہ معظمہ اردو کتابیں پڑھ لیتی تھیں۔ رعشہ کے سبب لکھتی کم تھیں۔ اور اردو بولتی تو خوب تھیں۔ بلکہ میری بھی خوب اچھی طرح اردو بولتی تھیں۔ اور شاہ جارج آنجہانی بھی خوب اردو بولتے تھے اور سمجھتے تھے۔ ان کے بیٹے موجودہ ڈیوک آف ونڈسر ایک حرف اردو نہیں سمجھتے تھے۔ یہی حال موجودہ شاہ کا ہوگا۔

ملکہ معظمہ نے جو تحائف حافظ صاحب کو دیئے۔ وہ تمام مع ان تمام چیزوں کے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ آگرے میں حافظ صاحب کی کوٹھی کریم لاج واقع DRUMMOND ROAD پر موجود ہیں۔ حافظ صاحب کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ بڑے بھتیجے ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اور اب شاید پنشن لے لی ہے۔

ان کے چھوٹے بھتیجے میرے ہم عمر اور دوست تھے۔ اور روزانہ کریم لاج میں ہم لوگ آتے جاتے تھے۔ اور یہ سب چیزیں دن رات دیکھتے تھے۔ ہزاروں تصویریں ہیں حافظ صاحب کی ڈائری بھی ہے۔ جو انگریزی ٹائپ کی ہوئی مصور ہے۔ دیکھنے کی چیز ہے۔ ملکہ معظمہ کے نجی خطوط بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اردو نے شاہی محل میں کیسی حکومت کی ہے محض اردو سیکھنے کے سبب ملکہ معظمہ سے حافظ صاحب کا رسوخ بڑھا۔ ورنہ بحیثیت انڈین سکرٹری صرف بوقت ضرورت کاغذات پیش کرنے سے زائد کچھ خدمت نہ تھی۔ اور آپ نے جو بھی عروج حاصل کیا وہ بحیثیت ملکہ کے URDU TEACHER کے کیا۔

حافظ صاحب کی بیگم صاحبہ کو شاہِ وقت کی جیب خاص سے اب بھی چار سو روپیہ ماہوار پنشن ملتی ہے۔ یہ علاوہ جاگیر ہے۔

محض تحفہ تحائف ہی اتنی قیمت کے ہیں کہ حافظ صاحب مالا مال ہو گئے۔ معمولی چیز سے لے کر اعلے سے اعلےٰ چیز موجود ہے۔ اور حافظ صاحب ہر قسم کی چیزیں اپنے ساتھ لے آئے۔ جو اب یادگار کے طور پر بے حد عجیب ہیں۔ اردو کے رسوخ اور اردو کی ہر دلعزیزی پر ان سب چیزوں کے دیکھنے ہی سے روشنی پڑتی ہے۔ اور اردو کے محقق کے لئے وہاں ضرورت سے زیادہ مواد مل سکتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ جس وقت یہ تمام چیزیں دیکھیں یہ امر پیش نظر نہ تھا کہ اس قسم کا مضمون لکھنے بیٹھوں گا۔

میری دانست میں یہ مضمون بغیر ایک لطیفے کے تذکرے کے نامکمل ہی رہ جائیگا

سنہ ۲۲ء کا ذکر ہے کہ میں آگرہ ہی میں تھا۔ اس وقت ملکہ معظمہ کے دو اردلی زندہ تھے۔ ایک دکان پر پرچونی کرتے تھے۔ دوسرے صرف اپنی چودہ روپے کی پنشن میں گزر کرتے تھے۔ ان سے میں ملا تھا بلکہ اکثر ملتا تھا۔ اور یہ قصر شاہی میں دس گیارہ برس رہے تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کے خاص خادم تھے۔ اور آخری وقت کی خدمت بھی انھوں نے ہی کی تھی۔ ان کے پاس ملکہ وکٹوریہ کے لاتعداد تحفے تھے۔ ڈراموں میں خوب شرکت کرتے تھے۔ ان ہی حضرت کا لطیفہ ہے۔ انھوں نے کوشش کی کہ لڑکا تحصیل میں چپراسی ہو جائے۔ اور ملکہ معظمہ کے خدمت گار کی حیثیت سے بہت کچھ حقوق جتائے۔ مگر دال نہ گلی۔ یہ حیران ہی تھے کہ یہ معلوم ہوا کہ جارج پنجم دربار کرنے خود ہندوستان آئیں گے۔ اور آگرہ بھی آئیں گے۔ چنانچہ اب انھوں نے لڑکے کی ملازمت کا معاملہ التوا میں ڈالا۔ جب بادشاہ کی آمد کی خبر آگرہ میں آئی تو انھوں نے قرض ادھار کر کے عمدہ اچکن بنوائی اور صافہ بندھوایا۔ مگر ان کو ایک خیال اور بھی دامن گیر تھا۔ شاہی محل پر جارج پنجم کی بحیثیت شہزادے کے یہ شاید کچھ خدمت نہ کرتے تھے۔ دن رات کا رہنا ٹھہرا۔ اور جب وہ اپنی دادی سے ملنے آتے تو بھی کچھ توجہ نہ دیتے۔ اس وقت شہزادہ جارج ولی عہد کے دوسرے بیٹے تھے اور زیادہ نوٹس میں آنے والی شے نہ تھے۔ شاہ موصوف ڈاڑھی نئی عمر ہی سے رکھتے تھے۔

جب جارج پنجم آگرہ میں آئے تو یہ پہنچے۔ دور دور تک گوروں کا پہرہ تھا۔ بمشکل کیمپ سکرٹری تک رسائی ہوئی جس نے ان کو دھتکار کر نکال دیا۔ جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو سنا کہ بادشاہ تاج محل دیکھنے جائیں گے۔ یہ رات گئے تاج محل کے دروازے پر پہنچے اور ایسے موقع پر پہنچے کہ بادشاہ گزریں تو سڑک کے کنارے سے سلام ہو جائے۔ ایسا بھی ہو گیا مگر بادشاہ کو پتہ نہ چلا۔ پھر یہ حضرت آگے بڑھ کر موقع پر پہنچے۔ جوں ہی بادشاہ گاڑی سے اترے اور وائسرائے اور گورنر وغیرہ استقبال کو بڑھے اور یہ جھٹ سے لپک کر باوجود گورے کے روکنے کے بڑھ گئے۔ گورے نے بڑھ کر پکڑا ہے کہ بادشاہ نے دیکھ لیا اور انھوں نے سلام کیا۔ بادشاہ نے پہچان لیا اور اشارہ کیا۔ سیدھے قدموں میں جا گرے اور کھڑے جو ہوئے تو بادشاہ بڑی محبت سے پیش آئے۔ بار بار خیریت پوچھتے کہ تم اچھی طرح ہو۔ ملکہ معظمہ بھی آگئیں اور وائسرائے وغیرہ کو چھوڑ کر بادشاہ ان کے ساتھ چلے لیکن جلد ہی ملکہ معظمہ کے یہ ساتھ ہو گئے۔ ملکہ معظمہ نے سب حال پوچھا۔ ایک ایک اردلی کو پوچھا۔ وقت کم تھا۔ ہدایت کی کہ رات کو مع بچوں کے ہم سے ملو۔ انھوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ حضور آپ کے نوکر گھسنے نہ دیں گے۔ چنانچہ اسی وقت کسی کو بلا کر ان کا سامنا کرا دیا۔ یہ رات کو مع دوسرے اردلی کے اور اپنے بچوں کے پہنچے۔ ملکہ معظمہ اور بادشاہ نے بڑی شاہانہ التفات کی۔ ہر اردلی کو پوچھا۔ یہ معلوم ہوا دوسرے سب مر گئے۔ تنگ دستی کی معروض پر تنخواہ کا اضافہ ہوا۔ انعام و اکرام دیا۔ تحفے تحائف دیے۔ اور ہر طرح مہربانی کی۔

اب یہ سوچے کہ لڑکے کی ملازمت کا بھی طے ہو جائے۔ نہ ڈپٹی کلکٹری نہ تحصیل داری بلکہ صرف چپراسی۔ شاید بادشاہ کی سمجھ میں بھی نہ آیا ہو کہ تحصیل دار یا تحصیل کیا بلا ہے۔ ان کا اصرار تھا کہ بس آپ تحصیل دار کو ایک خط لکھ دیں۔

بادشاہ سلامت نے یہ معروض قبول نہیں کی۔ مگر ان کو اطمینان دلایا اور کئی افسروں کو بلا کر ان کو سمجھایا۔ اب میں نہیں بتا سکتا کہ معاملہ کیا ہوا۔ ان کا کہنا ہے کہ سب افسروں نے لاپرواہی کی قصہ مختصر یہ کہ باوجود بادشاہ تک پہنچ کے ان کا لڑکا چپراسی نہ ہو سکا اور یہ بھی صبر کر کے بیٹھ رہے کہ بس اب کوشش کی حد ہو گئی۔ کہنے لگے کہ صاحب اب تو خدا رہ گیا ورنہ جہاں تک سفارش ہو سکتی تھی کرالی ممکن ہے کسی افسر نے یہ بات تحریر میں لانا پسند نہ کی ہو کہ بادشاہ سلامت کی خواہش ہے کہ اس کا لڑکا جو ملازمت چاہتا ہے وہ مل جائے۔ معاملہ زبانی ہی زبانی رہا ہو گا۔ اور پھر انھوں نے خط کے ذریعے جو بادشاہ کو لکھنا چاہا تو وہ خط بھیجنے نہ دیا گیا۔ مجھے ان کا نام یاد نہیں رہا۔ خدا کرے یہ اب بھی زندہ ہوں یہ واقعات خود میں نے ان کی زبانی سنے ہیں۔

حافظ صاحب کے بڑے بھتیجے عبدالرشید صاحب سے کوئی ملے تو شاید اردو کی شاہی سرپرستی کے متعلق دلچسپ معلومات بہم پہنچیں۔ آپ کا اب بھی شاہی خاندان کے افراد سے تعلق ہے۔ شاہ ایڈورڈ ہشتم کی تاج پوشی کے دربار میں آپ شاہی HOUSE HOLD کی طرف سے مدعو تھے۔ مگر اب فرق ہے پہلے محل میں رہتے اور ٹھہرتے تھے۔ اب ہوٹل میں ٹھہرائے جاتے ہیں۔

ڈیوک آف کناٹ کا اسپیشل جا رہا تھا۔ اور راہ میں کسی سے ملنے کا حکم نہ تھا۔ یہ شاید متھرا میں تھے۔ ان کو پتہ چلا تو انھوں نے اسپیشل روک لیا۔ حالانکہ رات کا وقت بے وقت تھا۔ مگر ڈیوک موصوف بہت اخلاق سے ملے۔

اب شاہی خاندان سے اور حافظ صاحب کے خاندان سے صرف یہ تعلق رہ گیا ہے کہ تحفے تحائف بڑے دن پر اور دوسرے موقعوں پر اب بھی جاتے ہیں اور خطوط بھی جا سکتے ہیں لیکن ان کا نجی اور ذاتی رنگ غائب۔

دراصل سول سروس کے انگریزوں کو منظور ہی نہیں کہ ہندوستانیوں کا رسوخ بڑھے اور غالباً موجودہ سیاسی فضا کی رفتار کی ذمہ داری بھی اسی ذہنیت کے سر قرار دی جا سکتی ہے مثال کے طور پر مجھے ایک اور واقعہ یاد آیا۔

ملکہ معظمہ نے عبدالرشید صاحب کو ایک رائفل اور ایک مچھلی پکڑنے کی بنسی بطور تحفہ دی۔ یہ اسے لے کر ہندوستان آئے تو سوال رائفل کے لائسنس کا اٹھا گیا

انھوں نے کہا کہ یہ ملکہ کا تحفہ ہے۔ میں تو ہرگز لائسنس نہ لوں گا خواہ ضبط ہو معلوم نہیں کیا ہوا۔ بندوق ضبط تو کیا ہوتی۔ مگر انھوں نے لائسنس بھی نہیں لیا۔

افسوس ہے کہ اردو کی شاہی قدردانی قصۂ ماضی سی ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید آج سیاسیات پر بھی اردو کی سرپرستی اور قدردانی کے سبب کافی اثر پڑتا اور شاہ اور رعیت کے درمیان وسیع خلیج حائل نہ ہوتی اور آج برطانیہ کا ہندوستان میں اقتدار اور وقار ہی دوسرا ہوتا۔

حافظ صاحب کی روش وہی مولویانہ رہی۔ نہایت باوضع شرعی ڈاڑھی اور کوٹ اگر پہنا تو بند کالر کا۔ ایک تصویر میں یاد پڑتا ہے کھلے گلے کا کوٹ مع ٹائی ہے مگر صافہ ہمیشہ وہی اور نہایت ہی شان دار صافہ باندھتے تھے۔

آخر عمر حافظ صاحب کی اچھی طرح نہیں گزری۔ ہر قدم پہ سول سروس کے افسر جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے تھے۔ ان کی پوزیشن بھی نازک تھی چھوٹے بھائی تحصیل دار تھے۔ بھتیجے تحصیل دار تھے بھلا لارڈ اور وائسرائے بھی ان کے آگے کوئی چیز تھے مگر پڑ دیس کے لوگ اور دوست احباب سے جب ملتے تو شکار کا ذکر ہو سفر کا ذکر ہو۔ کوئی ذکر بھی ہو۔ اگر کوئی تذکرہ چلے تو یہ بیچارے سوائے اس کے اور کیا کہیں کہ بھئی ایک دفعہ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ فلاں ڈیوک اور فلاں لارڈ ساتھ تھے اور فلاں بادشاہ ساتھ تھے وغیرہ وغیرہ

اس قسم کی باتیں سن کر دوست احباب خواہ مخواہ خفا ہوتے کہ ہر وقت شیخی مارتے ہیں۔ یہ نہ سوچتے کہ قریب بیس برس کے جو شخص ایسے ماحول میں رہا ہو کہ ساتھیوں میں سوائے ڈیوک اور پرنس کے دوسرا نہ ہو تو وہ اور کیا ذکر کرے۔

ان کو ملکہ کے مرنے کا سخت صدمہ تھا۔ کہتے تھے کہ جینے کو جی نہیں چاہتا لطف زندگی نہ رہا۔ وہاں رہتے رہتے عادات بھی بدل گئے تھے اور یہاں ان کو لوگوں کی صحبت میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ملکہ کے مرنے کے بعد شاید چار پانچ سال ہی زندہ رہے۔

اپنے سرکاری عہدے سے وہ علیحدہ ہو کر ملکہ معظمہ کے محل کے منتظم خاص کے عہدے پر مقرر ہو گئے تھے اور دہلی دربار میں ملکہ معظمہ کے ذاتی نمایندے کی حیثیت سے شریک ہو کر ان کو جو اعزاز حاصل ہوا تھا۔ وہ اردو کے لئے باعث فخر ہے۔

مجھے امید ہے کہ اردو سے محبت رکھنے والے اگر آگرہ آئیں گے تو ضرور کسی ذریعہ سے "کریم لاج" جاکر اردو کی شاہی سرپرستی کا اندازہ لگانے کی کوشش کریں گے ۱۹۲۳ء تک تو "کریم لاج" میں ایک بہت وسیع کمرے میں تمام اشیا بطور میوزیم کے رکھی رہتی تھیں اور انگریز اور ہندوستانی سب جاکر دیکھ سکتے تھے اور ان کے بھتیجے نہایت اخلاق سے ملتے اور بڑی تکلیف گوارا کرتے تھے۔ ملکہ معظمہ کے ذاتی خطوط اصل دیکھنے کی چیز ہیں۔ اور ان خطوط ہی سے صحیح اندازہ لگتا ہے کہ حافظ صاحب ملکہ معظمہ کے کیسے دوست تھے۔ مثلاً زلزلہ کا جھٹکا ملکہ معظمہ نے محسوس کیا۔ حافظ صاحب کسی وجہ سے علیحدہ کسی دوسری جگہ تھے تو ملکہ معظمہ نے تار دے کر صرف یہ دریافت کیا کہ "کیا تم نے بھی زلزلے کا جھٹکا محسوس کیا" بہت سے خطوط صرف خواص ہی کے دیکھنے کے لائق ہیں۔ جن کا ذکر بوجوہ مناسب نہیں۔

یہ اس شخص کے حالات ہیں جس نے ملکہ معظمہ کے اردو ٹیچر کی حیثیت سے ایسا عروج حاصل کیا جو دوسرے کو نصیب نہیں اور جس نے شاہی محل کی زبان بدل دی تھی۔ اور اردو کا ایسا جھنڈا گاڑا تھا جس کی یادگار اب تک ملکہ معظمہ کے قصر شاہی بالموریل کاسل میں موجود ہے۔

ملکہ معظمہ کے گرد وپیش سارے محل میں اردو کا رواج تھا اور سوائے اردو کے دوسری زبان نہیں بولی جاتی تھی۔ ذرا سوچیے کہ ملکہ کے گیارہ ذاتی خادم اردو داں تھے اور یہ وہ تھے جو ملکہ کا قرب حاصل رکھتے تھے۔ اور تمام اہم خدمات روزمرہ ان کے سپرد تھیں۔ ان اردو جاننے والے ملازموں سے سب کا کام اٹکتا تھا یہ دن رات وہیں محل پر رہتے تھے اور یہ معزز ترین نوکر تھے۔ ان کے سبب دن رات کے رہنے والے سب کے سب اردو بولنے اور سمجھنے لگے تھے۔

جب شاہِ وقت خود اردو پڑھے اور نوکر چاکر بھی سب اردو داں رکھے تو ظاہر ہے کہ اور لوگ بھی اس کی طرف توجہ کریں گے۔

میری دانست میں اردو کی سرپرستی کی ایسی کوئی نظیر نہیں مل سکتی ہے۔ اور شاید دنیا کی زبانوں میں صرف اردو ہی کو یہ فخر حاصل ہوا کہ اتنے بڑے شہنشاہ کے محل تک اس طرح رسائی ہوئی۔ اور اردو کی تاریخ میں ملکہ وکٹوریہ کی شاہی سرپرستی ہمیشہ یادگار رہے گی +

عظیم بیگ چغتائی

شعر

ہے غارتِ چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ
شاخوں پہ انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں میں

سیماب اکبرآبادی

قطعات

غمدیدگی

میں جھیل چکا ہوں شدتِ شوق — میں صدمۂ یاس اُٹھا چکا ہوں
باقی ہے کون سی اذیت — اب جس کے لئے میں جی رہا ہوں؟

حسرت

کون سی شے تمہاری نذر کروں — آہ اے صبح و شامِ کوہ مری!
مجھ تہی دستِ زندگی کے پاس — اک جوانی ہے وہ بھی درد بھری

حسنِ آواز

کر رہی ہو تم کسی سے گفتگو؟ — پڑ رہی ہے یا گلستاں میں پھوار؟
یہ تمہارے ہنسنے کی آواز ہے — بج رہا ہے یا کہیں کوئی ستار؟

جنّتِ ارضی

یہ سبزہ، یہ ترا نغمہ، یہ مہتاب — یہ کلیوں کی چٹک، یہ رنگِ گُل
اگر ایسے میں جنت بھی عطا ہو — تو ٹھکرا دوں اُسے بے تامّل

آسمانی نغمہ

چاندنی، کاہکشاں، مست ہوائیں، نغمہ — یہ سماں عکس ہے فردوس کے گلزاروں کا
لیکن اتنا تو بتا مطربۂ زہرہ خصال! — یہ ترا نغمہ ہے یا گیت ہے سیّاروں کا

رازِ دروں

تکلیف یہ ہر فرقت کی ہوتی نہیں برداشت — یہ بارِ الم آہ اُٹھایا نہیں جاتا
وہ راز کہ اغیار سے کہہ بھی نہیں سکتے — سینے میں بھی اللہ چھپایا نہیں جاتا

میری تصویر

اس کے رنگوں میں مرے حال کی تفسیر نہیں — پرتوِ روح نہیں قلب کی تنویر نہیں
نہ مرا سوزِ غم اس میں نہ مرا جوشِ طرب — میری تصویر نہیں یہ مری تصویر نہیں

اختر انصاری

امریکن سائنسدانوں نے آبِ حیات ڈھونڈھ نکالا!

سدا جوان رہنے کا آسان طریقہ

موڈرن سائنس کا معجزہ

ہر صدی اور ہزاروں سال دریافت کرنے کے بعد بھی سائنس دائمی جوانی کا کوئی کامیاب طریقہ دریافت نہ کر سکی۔ لیکن اب دنیا کو ڈاکٹر ہرشفیلڈ ایم ڈی۔ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے انتھک جد و جہد اور ریسرچ کے بعد افریقہ کے ایک درخت سے ایسا ایلکسر دریافت کیا ہے جو انسان میں ہمیشہ جوانی قائم رکھ سکتا ہے۔ اس کے تجربات سیکسولوجی سائنس انسٹی ٹیوٹ ہوف برلن امریکہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں کئے گئے جس سے شاندار اور حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی۔

اس جادو اثر آب حیات کا نام اوٹون "Otone" ہے جو سلور ڈراپ (SILVER DROPS) میں پیش کیا گیا ہے۔

اوٹون کے سلور ڈراپ کھانے کے بعد آپ اپنے جسم میں ایک خوشگوار اور دل خوش کن تبدیلی محسوس کریں گے۔ چہرے کی جھریاں غائب ہو جائیں گی۔ جوانی کی مد ہوش شباب کی توانائی اور طاقت آ جائیگی۔ رخسارے گوشت و خون سے بھر کر کشمیری سیب کی طرح دمکنے لگیں گے چہرہ حسن و جوانی کی شادابی اور نورانیت اپنی پوری رعنائیوں سے ظہور پذیر ہو جائیگی۔ اور آپ اپنی اصلی عمر سے بہت کم عمر کے نظر آنے لگیں گے۔ مثلاً آپ پچاس سال کے ہیں تو پچیس سال کے معلوم ہوں گے

اوٹون کے سلور ڈراپ مندرجہ ذیل شکایتوں کا کامل علاج ہیں۔

خون کی کمی۔ دماغی و جسمانی کمزوری۔ سر چکرانا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنا چڑچڑاپن، دل کی دھڑکن۔ بے حد موٹاپا۔ ذیابیطس۔ دمہ۔ نابینائی، بھوک نہ لگنا جلد خشک ہونا۔ دائمی قبض۔ سانس کا پھولنا۔ بالوں کا قبل از وقت سفید ہو جانا یا گرنا۔ کمر کا درد۔ جریان و سیلان۔ ضعف باہ۔ ضعف اعضائے رئیسہ۔ ضعف گردہ و مثانہ۔ عورتوں کی پرسوت کی بیماری ہسٹریا (لیکوریا) سیلان الرحم۔ اور دیگر رحمی شکایتوں کو ہمیشہ کیلئے دور کر دیتے ہیں۔

اوٹون کی آب حیات تاثیرات کے لئے ضروری ہے کہ آپ اپنا وزن کرائیں۔ اور ایک فوٹو کھنچوائیں ایک ہفتہ استعمال کے بعد پھر اپنا وزن کریں اور فوٹو لیں اس سے آپ کو اس دوا کی حیرت انگیز تاثیرات کا اندازہ ہوگا۔

اوٹون کے سلور ڈراپ عورتیں بچے۔ بوڑھے ہر موسم میں استعمال کر سکتے ہیں اس کے لئے کسی موسم یا عمر کی قید نہیں ہے۔

15,000 روپیہ کا نقد انعام

اوٹون ریسرچ لیباریٹری اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ اگر کوئی فرد یا ادارہ یہ ثابت کرے کہ اوٹون کی آب حیات تاثیرات کسی جسمانی [illegible] ہیں تو ہم اسے مبلغ ... ۱۵ ہزار روپیہ کا انعام دیں گے۔

اوٹون کے سلور ڈراپ کی اصلی قیمت ممالک غیر میں [illegible] روپیہ ہے۔ لیکن ہم نے اسے ہندوستان میں رواج کرنے کے لئے اس کی قیمت کچھ مدت کے لئے تین روپیہ آٹھ آنہ کی ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اوٹون لیباریٹری کب اس کی قیمت میں اضافہ کر دے۔

Otone

سول ڈسٹری بیوٹرز

میسرز گرانڈ فارمیسی لمیٹڈ پوسٹ بکس ۲۳۲۳ کلکتہ

تار کا پتہ "اوٹون" کلکتہ۔ ٹیلیفون نمبر ۲۰۷۰

Sole Distributor

GRAND PHARMACY( )

POST BOX 2323 · CALCUTTA

دو غزلیں

یہ کون ہے جو حُسن کے پردے میں چھپا ہے؟
معلوم ہے جو کھیل کہ تو کھیل رہا ہے

تجھ سے تو کھنچا ہے فقط انگارۂ تصویر
تصویر کو رنگین مرے خوں نے کیا ہے

یہ تیرے چمکتے ہوئے بے تاب نظارے
اک شعبدہ بازی کے سوا اور یہ کیا ہے

تُو یہ تو بتا صانعِ فردوس و جہنّم!
کچھ تجھ کو مرے دردِ تمنّا کا پتا ہے!

منزل ہے عجب منزلِ مقصودِ محبّت
مسجد کا ہے ماحول نہ مندر کی فضا ہے

کیا چارہ ہے کیا چارہ ہے اے شیخ و برہمن!
بُت کہتا ہے میں بُت ہوں مگر مجھ میں خدا ہے

کیا ڈھونڈتے ہو دودِ چراغِ دلِ تنویرؔ
بے شک یہ بجھا سا ہے مگر جل کے بجھا ہے!

ہم صبح تک دعا کا اثر دیکھتے رہے
بُجھتے ہوئے شرر پہ شرر دیکھتے رہے

دل سے صدا یہ طور پر آئی کلیم کو
جلوہ کدھر تھا آپ کدھر دیکھتے رہے

تاروں نے اپنی راہیں بدل لی ہیں اور ہم
اُن کے گلے میں لعل و گہر دیکھتے رہے

لاکھوں تڑپ تڑپ کے نظارے پلٹ گئے
کچھ بھی نہ دیکھتے تھے مگر دیکھتے رہے

آنسو ٹپک کے خاک میں گم ہو گیا کہیں
ہم لرزشِ شعاعِ قمر دیکھتے رہے

تھی ایک جست صاحبِ معراج کے لئے
جبریل اپنی جنبشِ پَر دیکھتے رہے

تنویرؔ اُن سے کیجے تغافل کا کیا گلہ
ہم ہی نہ تھے اُدھر وہ جدھر دیکھتے رہے

روشن دین تنویرؔ

کھڑکی

ایک مزدور کے کمرے کا اندرونی حصہ۔ سامنے والی دیوار کے بیچ میں ایک کھڑکی ہے جس میں سے آسمان نظر آ رہا ہے۔ سیدھے ہاتھ کو ایک دروازہ۔

چولھے کے آگے مزدور کی بیوی بیٹھی ہے، دو بچے اجو اور جیوتی کھڑکی کے پاس کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔

اجو:۔ وہ بادل دیکھ رہی ہو، بہن جیوتی؛ (جیوتی خوشی سے تالیاں بجاتی ہے) بڑا سارا سفید گھوڑا ہے بالکل، سچ مچ کا گھوڑا۔

جیوتی:۔ مگر لنگڑا ہے۔ تیز نہیں دوڑ سکتا۔

اجو:۔ لنگڑا نہیں۔ بڈھا ہے۔

جیوتی:۔ کیوں بھیا دیکھو تو بھیا! وہ بادل تو ایسا دکھائی دیتا ہے جیسی دادا کی داڑھی دکھائی دیتی تھی..... بالکل سفید!

اجو:۔ دیکھو دیکھو! وہ چل رہا ہے۔ نہ جانے کہاں جا رہا ہے؟

جیوتی:۔ دیکھو! اونٹ معلوم ہوتا ہے۔ وہ دیکھو کوہان۔ مجھے تو اس پر کوئی سوار بھی دکھائی دے رہا ہے۔ وہ کہیں بہت دور جا رہا ہے۔

اجو:۔ اونٹ کیسے ہو سکتا ہے؛ ننھی ننھی گھنٹیوں کی آواز تو آ ہی نہیں رہی۔ سنائی دے رہی ہے کہیں تمہیں؟ مجھے سنائی نہیں دیتی کیونکہ گھنٹیاں تو ہیں ہی نہیں۔ دیکھو، دیکھو! کتنا لال ہوتا جا رہا ہے! کس قدر لال ـــــ جیسے چاچا کی آنکھیں، جب رات گئے وہ گھر آتے ہیں مجھے تو لال بادل اچھے نہیں لگتے۔ تمہیں اچھے لگتے ہیں؟

جیوتی:۔ نہیں! بڑے بُرے ہوتے ہیں۔ جیسے کارخانوں کی دہکتی ہوئی بھٹیوں میں آگ۔ مجھے تو لال بادل سے نفرت ہے۔ یہ اُس آگ کی طرح ہوتا ہے جس میں دادا کو جلایا تھا ـــ جب رات کو اُنہیں آنکھیں بند کر کے نیند آ گئی تھی، اور سب کہہ رہے تھے کہ وہ مر گئے۔

اجو:۔ ہاں۔ لال بادل ایسا ہوتا ہے۔ جیسے ..... جیسے کیا بہن؟ تمہیں یاد ہے جیوا؟ چاچا کا دوست ـــــ جس کا ہاتھ مشین میں آ کر کچلا گیا تھا؛ تمہیں یاد ہے اُس کا لٹکتا ہوا گوشت..... کیسا دکھائی دے رہا تھا؟ او..... !

جیوتی:۔ (اُس کے یاد آنے پر چیخ کر) او..... ! مجھے لال! دلوں سے نفرت ہے۔

اجو:۔ مگر مجھے سُرخ گلاب پسند ہیں۔ چاچا کے کارخانے کا مالک روز صبح کو ایک سُرخ گلاب اپنے کوٹ میں لگاتا ہے۔

مزدور کی بیوی:۔ بس اب ختم کرو بچو۔ بتی تو جلا لے جا کر اجو۔

اجو:۔ مگر ابھی تو اندھیرا نہیں ہوا اماں ـــــ آسمان تو جاگ رہا ہے۔

جیوتی:۔ مجھے تو کھڑکی بڑی پیاری لگتی ہے۔ کیوں اجو، تمہیں بھی اچھی لگتی ہے؟

اجو مجھے تو آسمان بہت پیارا لگتا ہے، جب کھڑکی کھلی ہو۔

جیوتی:۔ جب کھڑکی بند ہوتی ہے تو مجھے ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے رات کو جھانکنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ یہ رات کیا ہوتی ہے اجو؟

اجو:۔ لو! یہ تو سب بتا سکتے ہیں۔ تمہیں نہیں معلوم؟

جیوتی:۔ کیوں نہیں۔ مجھے تو معلوم ہے..... مگر تمہیں بھی معلوم ہے؟

اجو:۔ کیوں نہیں۔ مجھے بھی معلوم ہے۔ جب پرماتما سو جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں رات ہو گئی جب وہ جاگتا ہے تو دن ہو جاتا ہے۔

جیوتی:۔ اجو! بادل دُور چلا گیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ بھی وہیں جا رہا ہے جہاں دادا چلے گئے! دادا بڑے اچھے تھے۔ کیسے اچھے اور پیارے تھے۔ ہمارے دادا ! سدا رنجیدہ رہتے تھے۔

اجو:۔ جیوتی، تمہیں بھی کبھی رنج ہوتا ہے؟

جیوتی:۔ بس جب کبھی ماں کو روتا دیکھتی ہوں مگر جب کھڑکی میں سے

آسمان مسکراتا ہے تو میں خوش ہو جاتی ہوں۔

اجو:۔ ہاں، بتی میں جلاؤں گا۔ بکس کہاں ہے؟

مزدور کی بیوی:۔ لو یہ رہا۔ بس تیرہ دیاسلائیاں ہیں اس میں۔ بڑی ہوشیاری سے جلانا۔ جب بتی جلاؤ تو کھڑکی بند کر لینا۔ نہیں تو ہوا سے کئی دیاسلائیاں بجھ جائیں گی۔

اجو:۔ نہیں ماں۔ تم دیکھنا کیسی ہوشیاری سے میں بتی جلاتا ہوں پہلی ہی دیاسلائی میں جلاؤں گا۔ (دیاسلائی جلاتا ہے)

جیوتی:۔ ہو ہو! ..... کیسا اچھا معلوم ہو رہا ہے! شعلہ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے آنکھ۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ کچھ ڈھونڈ رہا ہے۔

اجو:۔ اچھا اچھا جیوتی۔ ذرا چپکی رہو۔ (شعلہ بجھ جاتا ہے)

مزدور کی بیوی:۔ دیکھا ایک دیاسلائی خراب کی۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا تم سے۔

اجو:۔ ماں، یہ غلطی میری نہیں ہے۔ جیوتی .....

جیوتی:۔ اجو! میں نے کچھ نہیں کیا۔ جھوٹ مت بولو۔

اجو:۔ ماں، ماں! پہلے تو کبھی دیاسلائیاں اتنی بُری نہیں ہوتی تھیں۔

مزدور کی بیوی:۔ دو سلائیاں جلا دیں۔ اب صرف گیارہ رہ گئیں۔ تیرہ تھیں پہلے۔

جیوتی:۔ ماں! کارخانہ میں سب کہا کرتے ہیں کہ تیرہ منحوس ہوتا ہے۔

مزدور کی بیوی:۔ (لڑکے کے ہاتھ سے بکس لے کر) میں خود جلاؤں گی۔ بھاگو یہاں سے، فتنے کہیں کے۔ اگر چاچا ابھی گھر آ جائیں اور دیکھیں کہ اندھیرا پڑا ہے تو کوسنے اور گالیاں دینے لگیں۔ بیچارے چاچا..... سارے دن انہوں نے اتنی سخت محنت کی ہوگی..... سارے دن..... جیسے مشین..... جیسے مشین۔ (بچے کھڑکی کے پاس چلے جاتے ہیں) اتنے میں بتی جلاؤں تم کھڑکی بند کر دو۔ (بچے کھڑکی بند کر دیتے ہیں)

اجو:۔ جیوتی، تمہیں اندھیرے میں ڈر لگتا ہے؟

جیوتی:۔ نہیں تو تمہیں لگتا ہے؟

اجو:۔ ارے نہیں۔ مجھے اندھیرے سے ڈر نہیں لگتا۔

جیوتی:۔ ایک دفعہ میں نے سُنا تھا چاچا کہہ رہے تھے ماں سے "مجھے تو دن کے اُجالے سے ڈر لگتا ہے!" اُجالے سے چاچا کیوں ڈرتے ہیں؟

اجو:۔ دیکھتی نہیں ہو؟ دن بھر اُنہیں کام کرنا پڑتا ہے۔ ارے دیکھو دیکھو! تمہیں وہ بڑی سی پیلی روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ وہ اُن پہاڑوں کے پیچھے؟ وہ؟ وہ؟

جیوتی:۔ ہاں، وہ چاند ہے..... چاند..... مجھے چاند اچھا لگتا ہے بھیّا، مجھے چاند چاہیے۔

اجو:۔ تمہیں چاند نہیں مل سکتا۔

مزدور کی بیوی:۔ (طاق میں دیئے کو رکھ کر بڑبڑاتی ہے) جیسے بھیڑ بکری کا گلا... جسے کوئی نہیں پوچھتا... جس کی کسی کو پروا نہ ہو... ہم غریب مزدوروں کے کنبے۔ جاہل، بے آرام، بھوکے، گندے، چیتھڑے لگے ہوئے، کچلے ہوئے... اندھیرے بلوں میں بستے ہیں، الجھے ہوئے... چلتے پھرتے مُردے... پرچھائیاں... اُن انسانوں کا ہم پر قبضہ ہے جن کے قبضے میں کچھ بھی نہیں — گندگی، ابتری، بیماری... سُست اور سڑاندی موت!... بس یہی بُڑبڑایا کرتا ہے میرا غریب پتی سوتے میں (پکانے ریندھنے پھر چولھے کے پاس چلی جاتی ہے۔)

اجو:۔ (نکلتے ہوئے چاند کی طرف اشارہ کر کے) کتنا بڑا اور گول ہے! جیسے سونے کی بڑی سی تھالی۔

جیوتی:۔ مجھے تو سونے کا سکّہ معلوم ہوتا ہے۔ میرے پاس ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا! کتنی ساری چیزیں اس سے خرید لیتی!

اجو:۔ بھلا کیا کیا خرید دگی؟

جیوتی:۔ ارے بہت ساری مٹھایاں بازار سے خرید لوں۔

اجو:۔ اور میں ایک گیند خرید دل اور واہ! کیا مزا آئے کہ کل دن بھر اس سے کھیلتے رہیں! کیوں بہن؟ میں جانوں چاند تو سچ مچ ایک گیند ہے۔ شاید پرماتما اس سے کھیلتا ہے۔

جیوتی:۔ مجھے یہ کھڑکی پیاری لگتی ہے۔ کیسی کیسی عجیب چیزیں ہمیں اس میں سے دکھائی دیتی ہیں — اس کھڑکی میں سے۔ آؤ اجو! ہم گائیں۔

اجو:۔ اچھا کیا گائیں؟

جیوتی:۔ کھڑکی کا کوئی گیت۔

اجو:۔ ہاں گاؤ۔ پہلے تم شروع کرو۔

جیوتی:۔ نہیں، تم شروع کرو۔

اجو:۔ چلو ہم دونوں مل کر شروع کریں۔

(جیوتی اور اجو اپنا گیت گاتے ہیں)

کھڑکی کھڑکی، پیاری کھڑکی!

چندا ماموں جھانک رہے ہیں

ہم دونوں کو تاک رہے ہیں

کھل جائے تو بادل دیکھیں!

بند ہو شیشوں میں سے دیکھیں

جھوم رہے ہیں، گھوم رہے ہیں

چندا ماموں چوم رہے ہیں!

تجھ سے گذر کر ہم تک آئیں

چندا ماموں ہم کو رجھائیں

کھڑکی کھڑکی، پیاری کھڑکی

(گیت ختم کر کے خوشی سے دونوں چیخیں مارتے ہیں اور ان چیخوں میں سارے محلے اور گلیوں کے بچوں کی چیخیں بھی شامل ہو جاتی ہیں)

مزدور کی بیوی:۔ چلو بچو۔ رات سر پر آ رہی ہے۔ روٹی کھا کر سو رہو۔ (ایک روٹی لے کر دونوں بچے کمرے کے ایک کونے میں جا دبکتے ہیں)

(ایک ہمسائی داخل ہوتی ہے)

ہمسائی:۔ کیوں بہن! ہمیں رات بھر کے لئے ایک ہانڈی دے سکتی ہو؟ ہماری ٹوٹ گئی۔

مزدور کی بیوی:۔ ضرور بہن۔ لو یہ لو۔ اور ہاں اسے واپس کرنے کا خیال نہ کرنا۔

ہمسائی:۔ تم بڑی اچھی ہو بہن۔ ننھے نے ہماری ہانڈی توڑ دی۔

مزدور کی بیوی:۔ آہ بہن۔ دیر سویر ہر چیز ٹوٹ جاتی ہے۔

ہمسائی:۔ تمہارے پتی کیا آج رات کو دیر سے گھر آئیں گے؟

مزدور کی بیوی:۔ میں ابھی تم سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ تمہارے پتی کام پر سے واپس آ گئے یا نہیں؟

ہمسائی:۔ نہیں۔ دیکھنا بہن وہ کہہ رہے تھے کہ آج سب اکٹھے ہوں گے۔ سب مزدور۔ میرا مطلب ہے، ہاں سارے مزدور ــــ کسی بات کا فیصلہ کرنے کے لئے۔ انہوں نے مجھے بتایا نہیں کس بات کا ہیں

گھر لوٹ آئی، روز کی طرح۔

مزدور کی بیوی:۔ ہاں۔ یہ سب کے سب تھک گئے ہیں ــــ میرا غریب پتی مجھے کیسا دکھ ہوتا ہے کہ اس کی مدد نہیں کر سکتی۔ کچھ کام میں بھی کرتی، جس طرح تم اور اور پڑوسیوں کی بیویاں محنت مزدوری کرتی ہیں ــــ مگر کروں گی میں بھی ــــ بس ذرا جی ٹھیک ہو جائے۔ دیکھو تو بہن! میرے پھیپھڑوں میں درد ہوتا ہے اور منہ سے خون آ رہا ہے۔ مگر میں اب اس کی پروا نہیں کروں گی۔ شاید کام پر لگ جانے سے جی کچھ اچھا ہی ہو جائے۔

ہمسائی:۔ کام، کام، کام! سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس کا انجام کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم دکھ جھیلنے کے لئے کیوں پیدا ہوئے تھے۔ ہم سرے سے پیدا ہی کیوں ہوئے! کچھ آرام کرنے کے لئے پیدا ہوئے اور باقی محنت کرنے اور رونے! ایسا کیوں؟

مزدور کی بیوی:۔ مالک ہم سے کہتے ہیں کہ یہ تمہارے کرم ہیں، ایک طرح سے نصیب کا لکھا سمجھو ــــ پرماتما کی مرضی۔ ہاں، یہی ہم سے سدا کہا جاتا ہے۔

ہمسائی:۔ اور ہم دن رات پرماتما کے گیت گاتے رہتے ہیں اور آس لگائے رہتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن وہ ہماری دعائیں سنے گا اور ہماری مدد کرے گا!

اجو:۔ (چپکے سے) جیوتی، کل ہم ایک لمبی سی رسی میں پتھر باندھ کر نیچے لٹکائیں گے۔

جیوتی:۔ ہاں، ہاں! (اٹھ کر چلے جاتے ہیں)

مزدور کی بیوی:۔ ہاں پرماتما کی تعریفیں گاتے ہیں۔ اس وقت بھی جبکہ کمر ٹوٹ رہی ہو اور ہونٹوں پر پپڑیاں بندھ رہی ہوں اور ہڈیاں تھک کر چور ہو رہی ہوں اور گوشت پیلا پڑ گیا ہو ــــ پرماتما کے گیت گاتے ہیں۔ جب آواز مر گئی ہو ــــ جب ہر چیز دم توڑ رہی ہو!

ہمسائی:۔ مگر پرماتما جیتا ہے!

مزدور کی بیوی:۔ سمجھ میں نہیں آتا (اس کے بعد ہی پڑوس میں سے کسی بچے کے رونے کی آواز فضا کو چیرتی ہوئی آتی ہے۔)

ہمسائی:۔ یہ میرے ننھے کے رونے کی آواز ہے۔ اس کے رونے سے کل رات تمہاری نیند تو بڑی بے چین ہوئی ہو گی۔

مزدور کی بیوی:۔ اچھا! یہ تمہارا بچہ کل رو رہا تھا۔ میں نے جانا کہ دوسری

پڑوسن کا بچہ ہے، وہ جسے کالی کھانسی ہو رہی ہے۔ تمہارے بچے کو کیا ہوا؟

ہمسائی:۔ کوئی نئی بات نہیں۔ اس کے سارے بدن پر پھوڑے ہو گئے ہیں اور اس کے سانس میں سے ایسی بُو آتی ہے جیسی کسی گندی نالی میں سے۔ لیکن اِس سب کچھ کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے — یہ نصیب ہے...... اچھا بہن، اس ہانڈی کا شکریہ۔ (چلی جاتی ہے)

مزدور کی بیوی:۔ اے پرماتما! کیا تو سچ مچ وہاں گہرے اندھیرے آسمان پر ہے؟ کیا تو سُن سکتا ہے؟ اگر نہیں سُن سکتا تو کیا تُو بہرہ ہے؟ اور اگر سُن سکتا ہے تو کیا تو گونگا ہے؟ اے پرماتما! تو کون ہے اے پرماتما، پرماتما، پرماتما! تُو کیا ہے؟ اگر واقعی موجود ہے تو کیا ہے؟

(مزدور داخل ہوتا ہے، نشہ میں ہے، تھک کر چُور ہو رہا ہے)

مزدور:۔ عورت! کیا اب بھی تو پرماتما کو پُکار رہی ہے؟ تھکی نہیں؟ کیا تو نہیں جانتی وہ سنگدل ہے، بے رحم اور بے پروا ہے؟ تجھے نہیں معلوم کہ سُننے کے لئے اُس کے پاس وقت نہیں ہے — ہماری سُننے کے لئے پسینے میں نہانے والے بدنصیبوں کی۔ نہیں جانتی کہ اُسے کارخانوں کے مالکوں نے خرید لیا ہے؟ مشین کے مالکوں نے؟ اپنا وقت کیوں ضائع کر رہی ہے؟ عورت! کیوں اپنے پھیپھڑوں کو ضائع کر رہی ہے؟ بھٹیوں کے دھوئیں، کارخانوں کی زہریلی ہوا اور اس کال کوٹھڑی نے جس میں ہم رہتے ہیں، کیا تیرے پھیپھڑوں کو کافی تکلیف نہیں پہونچائی ہے؟

بیوی:۔ آج تم بہت رات گئے آئے؟

مزدور:۔ بچے کہاں ہیں؟

بیوی:۔ ابھی ابھی سوئے ہیں۔ بک بک لگا رکھی تھی بادلوں، چاند اور آسمان کی۔ اور اپنے دادا کی سفید ڈاڑھی کی — کھڑکی کے پاس کھڑے باتیں مٹھار رہے تھے۔

مزدور:۔ کھڑکی سے بچے محبت کرتے ہیں ایسے نا؟ بدنصیب بچے! صرف یہی ایک خوشی انہیں میسر ہے۔ آسمان اور اس پر بادل، چاند اور تارے — یہی ان کے کھلونے ہیں — ہاں! یہ نتیجہ ہے مزدور کے گھر پیدا ہونے کا۔ پرماتما غارت ہو جائے۔ میں کہتا ہوں غارت ہو جائے پرماتما!!! اور اگر میں کُفر بک رہا ہوں تو پرماتما مجھے معاف کرے۔

بیوی:۔ تھوڑی دیر ہوئی میری سہیلی پڑوسن ایک ہانڈی مانگنے آئی تھی۔ تم نے جو پچھلے ہفتے میلے میں سے دو ہانڈیاں لی تھیں ان میں سے ایک میں نے اُسے دے دی ہے۔

مزدور:۔ اچھا کیا۔ ان کی ہانڈی کیا ہوئی؟ ٹوٹ گئی شاید!

بیوی:۔ ہاں۔ اور میں نے اُس سے کہا تھا کہ دیر سویر ہر چیز ٹوٹ ہی جاتی ہے۔

مزدور:۔ واہ واہ! واہ واہ! ہاں، کیونکہ — ہر چیز دیر سویر ٹوٹ جاتی ہے — ہم سب ٹوٹ جاتے ہیں — زندگی کے ہر لمحے ہمیں توڑ دیا جاتا ہے — میں غارت ہو جاؤں — تم غارت ہو جاؤ اور — ہم سب غارت ہو جائیں — مٹی کی ہانڈیاں، سستی ہانڈیاں!

بیوی:۔ کیا تم سیدھے کارخانہ سے اب واپس آ رہے ہو؟

مزدور:۔ ہاں۔ راستے میں ایک جگہ رُک گیا تھا۔ تم تو جانتی ہو۔

بیوی:۔ مجھے تاڑی کی بُو آ رہی ہے۔

مزدور:۔ ہاں۔ تم نے شاید سمجھ لیا ہوگا۔

بیوی:۔ ہاں میں سمجھتی تو ہوں۔ مگر دیکھو تو، کوشش کی جا رہی ہے کہ مزدور تاڑی پینا چھوڑ دیں اور اس کی بجائے پرماتما کے گیت گائیں۔

مزدور:۔ غریب آدمی کے لئے تاڑی کو چھوڑنا ایسا ہی ہے جیسے خدا کو چھوڑ دے اور خدا کو چھوڑنا ایسا ہے جیسے تاڑی کو چھوڑ دے۔

بیوی:۔ آؤ، بھوجن کر لو۔

مزدور:۔ مجھے آج بھوک نہیں لگ رہی — میں تھکا ہوا ہوں — اتنا تھکا ہوا کہ ایک نوالہ بھی نہیں کھا سکتا۔

بیوی:۔ تم کچھ پریشان نظر آتے ہو۔

مزدور:۔ ہاں ایک اُڑتی اُڑتی خبر سے۔

بیوی:۔ کیسی خبر؟

مزدور:۔ کہا جا رہا ہے کہ اب ہر چیز پر ٹیکس لگنے والا ہے۔

بیوی:۔ قانون کون بناتا ہے؟

مزدور:۔ جو قانون بناتے ہیں وہ ہمیں کبھی نہیں دکھائی دیتے۔ و اور قیمتی ہوتے ہیں۔ وہ اُن دیوتاؤں کی طرح ہیں جنہیں ہمیں کبھی نہیں دیکھنا چاہئے۔ کیونکہ اگر ہم انہیں ایک دفعہ بھی دیکھ لیں تو پھر وہ دیوتا نہیں رہتے۔ اور ساری قلعی کھل جاتی ہے۔

بیوی:۔ عجیب قانون ہیں! کیا سارے قانون انسان ہی بناتے ہیں؟

مزدور:۔ سب — ہاں — سب! ہل کے قانون، کارخانوں کے قانون،

— زمین کے قانون۔

بیوی:۔ کرم کا قانون بھی؟

مزدور:۔ ہاں، عورت! کرم کا قانون بھی — سارے قانونوں سے زیادہ چالاکی اور ہوشیاری کا قانون! یہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہم اس لئے کچلے جاتے ہیں، توڑے جاتے ہیں اور بھوکے ہیں کہ ہم نے پہلے گناہ کئے ہیں۔ پرماتما انہیں غارت کرے! اور ہم ان کے آگے اپنا سر جھکا دیتے ہیں۔ اری عورت، تو کیا سوچ رہی ہے! اب ایک اور قانون بننے والا ہے۔ یہ خبر سنی ہے ہم نے آج شام کو۔ تیرے تو خیال میں بھی نہیں آسکتا۔

بیوی:۔ بتاؤ تو، بتاؤ تو۔

مزدور:۔ بھیانک، ذلیل اور سفاک — میرے غریب بچے!

بیوی:۔ تمہارے کہنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ وہ ہمارے بچوں کو ہم سے چھین لے جائیں گے؟

مزدور:۔ عورت، اس کی تو ان میں ہمت بھی نہیں ہے، جب تک میں یہاں ہوں۔ جب تک خون کا ایک قطرہ بھی زندہ ہے اور ان زہر خوردہ رگوں میں دوڑ رہا ہے!

بیوی:۔ تو پھر اور کیا ہے؟

مزدور:۔ میں تمہیں ابھی نہیں بتا سکتا۔ نہیں، بتانا بھی نہیں چاہئے۔ نہیں، میں نہیں بتاؤں گا۔ اچھا، اچھا۔ انہیں کوشش کر لینے دو۔ وہ اپنی سی کر کے دیکھ لیں۔ دیر سویر ہر چیز ٹوٹ جاتی ہے۔ (پاگلوں کی طرح ہنستا ہے) عورت! تو ٹھیک کہتی ہے!

پڑوسی:۔ (ایک مزدور پڑوسی یکایک داخل ہوتا ہے) پڑوسی! وہ سچ ہے — افواہ سچی ہے۔ وہ آپہونچا۔ (یکایک چلا جاتا ہے)

مزدور:۔ وہ ہمارے پیچھے پڑے ہیں کہ ہمیں کچل ڈالیں، زخمی کر دیں، ساری عمر کے لئے اپاہج کر دیں۔ کم تعداد، کم تعداد غاصب! جنہوں نے ہمارے ہاتھ پاؤں اپنی گاڑی کے پہیوں سے باندھ رکھے ہیں گھوڑوں کی طرح ہمیں جوت رکھا ہے، جو ہمیں بھیڑ بکریوں کی طرح مار مار کر ہنکاتے ہیں، جنہوں نے ہمیں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا رکھی ہیں، جنہیں یہ دیکھنے کی امید ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں ماں کے پیٹ ہی سے زنجیروں میں جکڑی پیدا ہوں گی۔ وہ ہمیں گونگے عوام کہتے ہیں۔ ہم اب بھی انہیں بتا دیں گے۔ گونگے عوام! ذرا انہیں ہماری تاریک بے نور کوٹھڑیوں اور تہ خانوں میں آنے تو دو۔ انہیں معلوم ہو جائے گا کہ عوام کوئی گونگی، اندھی حیوانی قوت نہیں ہے کہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے اسے استعمال کر لیں۔ انہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ عوام میں مرد، عورت اور بچے شامل ہیں — جن میں سے ہر ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے، بے مثل اور شاندار! ہر ایک میں ایک دل دھڑک رہا ہے جو طبل جنگ کی طرح گونج رہا ہے اور تیار ہے کہ آخری فتح کا نقارہ بجا دے۔

بیوی:۔ میرے غریب، تھکے ہوئے ساتھی! میں سمجھ گئی، میں سمجھ گئی۔

مزدور:۔ مزدور خیال دوڑا سکتا ہے، ہنس سکتا ہے، خواب دیکھ سکتا ہے، تکلیفیں جھیل سکتا ہے، — ہاں محبت تک کر سکتا ہے اُن سے بھی اچھی۔ عوام! ہاں — دیر سویر یہ بھی ٹوٹ جائیں گے، عورت! جیسے پانی، سمندر کا دھاڑتا ہوا پانی۔ ہم انہیں اس کی سزا دیں گے — کل انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم خوب جاگ رہے ہیں، طویل موت سے یکایک جاگ اٹھے ہیں اور ایسے جاگے ہیں کہ پھر نہیں سو سکتے۔ عورت! آخر کار ہمیں ظالم کے ظلم کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ اس نے ہمیں ہماری نیند سے جگا دیا ہے۔ اب ہم وہ غلام نہیں رہیں گے جو پہیوں سے بندھے رہتے ہیں، جن کے جسم و روح اُن بھاری مشینوں سے کچل دیئے گئے ہیں جو مٹھی بھر آدمیوں کی ملکیت ہیں۔ ہم اٹھیں گے اور ماریں گے اور مالک بن جائیں گے — اور پھر! فرصت! آرام! — مشینیں، کروڑوں کی فرمانبردار ہو جائیں گی۔ ٹھیک ہے — ہم قبروں کی طرح پڑے نہیں رہیں گے۔ کیا! امید؟ آزادی؟ ہمارے لئے، ہم تک کے لئے؟ بے بس، کچلے ہوئے جانور! زرد، غلام، تھکے ماندے مزدور؟ بھوک! کیا تو دھواں تھی کہ اتنے جلدی اڑ گئی؟ اور تو، اے مشقت! کیا تو ایک بھیانک خواب تھا جو ختم ہو گیا؟ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا؟ کیا کہہ رہا ہوں میں؟ عورت! کیا میں پاگل ہو گیا ہوں؟ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ کیا ہمیں بھوک، غلامی اور بیماری سے چھٹکارا مل جائے گا؟

بیوی:۔ ہاں، میرے غریب تھکے ہوئے پتی۔ ہمارا لئے اچھا زمانہ جلدی آنے والا ہے۔

مزدور:۔ نہیں . . . . ابھی بہت دور ہے — اور — ہم تھک چکے ہیں۔ (ایک آدمی کولتار کی بالٹی ہاتھ میں لٹکائے داخل ہوتا ہے)

بالٹی والا:۔ افسوس ہے کہ اتنی رات گئے میں آیا ہوں۔ اور وہ کھڑکی کہاں ہے؟

بیوی:۔ اسے یہاں کیا چاہئے، اور یہ ہے کون!

مزدور:۔ وہ افواہ سچ ثابت ہوئی! وہ ہے سامنے دیکھو۔۔۔ کیسی اچھی کھڑکی ہے۔ اس لئے بھی کہ جب تم اپنی زندگی سے عاجز آجاؤ تو اس میں سے باہر کود پڑو۔

بالٹی والا:۔ (کھڑکی کے سب شیشوں پر کولتار پھیرنا شروع کرتا ہے) گناہ کی طرح سیاہ۔ گناہ کی طرح سیاہ۔۔۔ کولتار کا رنگ ہے۔۔۔ اور میں تو صرف اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ بس۔

بیوی:۔ کیا یہ پاگل ہے؟ یہ کیا کر رہا ہے؟

مزدور:۔ کھڑکی پر کولتار پھیر رہا ہے اور ان ٹوٹے ہوئے شیشوں پر بھی جو اس میں باقی رہ گئے ہیں۔ مٹھی بھر آدمیوں نے ایک نیا قانون بنایا ہے۔ اب وہ روشنی پر ٹیکس لگا رہے ہیں۔

بیوی:۔ روشنی پر ٹیکس لگا رہے ہیں؟ اور کیا اب روشنی ہمارے گھروں میں کبھی نہیں آئے گی؟

بالٹی والا:۔ بس ختم ہوئی۔۔۔ جب تک تم اس کی قیمت ادا نہ کر دو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ایک پیمانہ مقرر کر دیا گیا ہے جس کے مطابق تم اپنی دن بھر کی روشنی خرید سکتے ہو۔ اچھا، تمہارا شکریہ شب بخیر۔۔۔ بلکہ صباح بالخیر۔

(اپنی بالٹی اور برش لئے باہر چلا جاتا ہے)

مزدور:۔ یہ آخری چھاپہ مارا ہے دن کی روشنی پر۔

بیوی:۔ اب اس کے بعد وہ ہر چیز پر ٹیکس لگائیں گے۔ ہماری آنکھوں پر، ہمارے بچوں کی آنکھوں پر۔ شاید ہمارے لبوں پر بھی مہریں لگا دیں گے۔ بلکہ ہمارے خوابوں اور کانوں پر بھی ٹیکس لگا دیں گے۔ ہماری چیخوں اور ہمارے قہقہوں پر بھی۔ ہر چیز پر وہ ٹیکس لگا دیں گے!

مزدور:۔ لیکن ہمارے پرماتما کے گیتوں اور دعاؤں پر ٹیکس نہیں لگائیں گے۔۔۔ کیونکہ یہ تو ہمیں آزادی سے اس پرماتما کی خدمت میں بھیجنی ہیں جو وہاں ہے۔ (آسمان کی طرف غصے سے گھونسا تانتا ہے۔) جو ہر چیز کو دیکھتا ہے، سب کچھ اور پھر بھی۔۔۔ ایک لفظ تک نہیں کہتا۔ یہ ہے ہمارا پرماتما جسے زمینوں اور مشینوں کے تونڈل مالکوں نے بالکل خرید لیا ہے۔ اے عورت! وہ تو شاید تیرے جسم پر بھی ٹیکس لگا دیں گے اور پھر ہر دفعہ جب میں تجھ سے محبت کروں گا۔ مجھے ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔

بیوی:۔ ارے ظالم، ظالم نصیب! کیا یہ سب سچ ہے؟

مزدور:۔ بالکل سچ۔۔۔ اور پھر بھی سب کچھ ایک بہت بڑا جہنمی جھوٹ دکھائی دیتا ہے۔ وہ سب کے سب جھوٹے ہیں۔

(شہر میں سے سات بجنے کی آواز آتی ہے)

بیوی:۔ یہ کیا بج رہا ہے؟ ارے! سات بج گئے! اور بتی بجھ گئی! اے پرماتما! کتنا اندھیرا، کتنا اندھیرا چھایا ہوا ہے ہر چیز پر!

مزدور:۔ اندھیرا جیسا تہ خانے میں ہوتا ہے۔ اندھیرا جیسے اندھے کی آنکھ، سیاہ جیسے جھلسی ہوئی لاش، کوئلے کی رنگت! پڑوس والو! پڑوس والو!! (پاگلوں کی طرح چیختا ہے۔)

اجو اور جیوتی:۔ (اندھیرے میں جاگ کر) ماں! چاچا! ہم کہاں ہیں؟

(سارے پڑوس کی کوٹھریوں میں سٹر پٹر کی آوازیں سنائی دیتی ہیں)

مزدور:۔ اور باہر صبح انتظار کر رہی ہوگی، راہ تک رہی ہوگی اور تعجب کر رہی ہوگی کہ ہم سب کو کیا ہو گیا! روشنی! روشنی! عورت، تو ٹھیک کہہ رہی تھی! دیر سویر ہر چیز ٹوٹ جاتی ہے۔ روشنی! روشنی! روشنی! (کھڑکی کے شیشے کو توڑ ڈالتا ہے ..... چاروں طرف سے شیشوں کے ٹوٹنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں)

یہ ہماری طرف سے ان کو چیلنج ہے۔!

روشنی، روشنی، مزدور کے گھر میں ..... ہمیشہ کے لئے!

(خوشنما گلابی روشنی اندر آتی ہے اور اپنے ساتھ مزدوروں کے لئے ایک نئی اور شاندار زندگی لاتی ہے۔)

(ہرندرا ناتھ چٹوپادھیا)

شاہد احمد دہلوی

دو غزلیں

(۱)

حریمِ نازِ تخیّل کا آستانہ رہے
جو یوں رہے تو کہاں ہجر کا زمانہ رہے

یہ حال بزم کی شرکت سے کم نہیں پیارے!
زبانِ دل پہ ترے حُسن کا فسانہ رہے

نگاہِ لطف ہے لپٹی ہوئی نقابوں میں
کہ میرے شوقِ جنوں زا کی انتہا نہ رہے

مٹا رہا ہوں محبّت میں خود کو دانستہ
کہ عشق حسن یگانہ کا بھی یگانہ رہے

میں تیرے حُسن کے قلزم میں ڈوب ڈوب گیا
کہ میرا گوہرِ یکتا نہ بے ٹھکانہ رہے

تری فضائے محبت کا شاہباز نہیں
مری نگاہ کا جاذب گر آشیانہ رہے

ترے جمال کی مضرابِ "نور پاش" کی خیر!
امیںؔ کے تارِ نفس کا یہی ترانہ رہے

(۲)

جبھی تو شغل ہے شربِ دوام اے ساقی!
کہ قطرہ قطرۂ مے ہے پیام اے ساقی!

اُلٹ کے جام میں شیشے کو توڑ کر رکھ دے
کر اپنی تیغ کو یوں بے نیام اے ساقی!

تری نگاہ کی زرّیں کمندِ ناز کی خیر!
میں انتظار میں ہوں زیرِ بام اے ساقی!

مری خودی کے منافی ہے جام سے پینا
خُموں کے دل میں ہے میرا مقام اے ساقی!

پیوں نہ جس کو ترے خُم میں غوطہ زن ہو کر
وہی شراب ہے مجھ پر حرام اے ساقی!

زمینِ شور کا دانے سے ہے گلہ بے جا
تری شراب کہاں خود ہوں خام اے ساقی!

غزل سرا ہے تری بزم میں امینِ حزیںؔ
وہ تیرے بادہ کشوں کا امام اے ساقی!

امینِ حزیںؔ سیالکوٹی

بیمار

اور پھر دندناکر بخار چڑھتا اور کنپٹی بند ھ جاتی معلوم ہوتا ہڈیاں چٹ چٹا رہی ہیں اور کھال جھلسنے لگی۔ گلے میں جیسے لٹھ چلنے لگتا۔ چون چرے شڑ رد کھڑ اور پھر کھانسی کے پھندے پڑنے لگتے۔

زبان تو جوتے کا تلا ہوگئی تھی کھٹی کھٹی سڑاندی دوائیں کھاتے کھاتے اُس میں جو گلٹیاں ہوتی ہیں وہ بھی مردہ ہوگئی تھیں۔ اُسے یاد آتا تھا جبکہ وہ چھوٹا سا تھا تو کونین کتنی کڑوی، املیاں کتنی کھٹی، اور شکر کی گولیاں کتنی میٹھی ہوتی تھیں!

اُس کی زبان کیسی جاندار اور حساس تھی! اور اب وہی زبان کس قدر ڈھیٹ ہوگئی تھی کہ کسی چیز کا اثر بھی نہ ہوتا تھا۔

بچے آنگن میں کلکاریاں مارتے اور ایسا معلوم ہوتا گویا اُس کے کلیجے پر گھن برس رہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے دروازے دھڑ دھڑاتے نکل جاتے اور اُس کی زندہ لاش سر سے پیر تک لرز جاتی اور پھر دوسری آوازیں بھیانک بھونپو والی لاریاں گونجتی ہوئی موٹریں کھڑ کھڑاتے تانگے اور منمناتی ہوئی سائکلیں سب گویا اُس کے سینے پر سے دندناتی گذرتیں۔

"رام رام ست ہے" اُس کا کلیجہ مسل جاتا۔

"لینا دوڑنا ——— چلیو!" وہ اپنا مُنہ معجونوں میں بسے ہوئے لحاف میں دبا لیتا۔ گویا لوگ اُسے ہی مارنے دوڑ رہے ہیں۔

اور کتے! کُتے تو شیر تھے ان کا بس نہ تھا جو اُس کی گود میں لیٹ لیٹ کر بھونکتے اور بلیوں کو تو رات کے وقت کورٹ شپ کے لئے اسی کے کمرے میں آنا فرض تھا۔ اس کی "شی شی" اور "ہش" پر بلیاں مسکرا مسکرا کر اپنے عاشق بلوں کی طرف نیم باز آنکھوں سے دیکھتیں اور اٹھلاتی ہوئی "ریاؤں" کرکے وہیں پڑ جاتیں، دو ایک دفعہ ڈرنے کے بعد اب وہ بھاگنا بے وقوفی سمجھتی تھیں۔

اور پھر ہوا! خاک پڑی ہر دراز اور چھید سے چنگھاڑتی ہوئی سیدھی اُسی کی طرف لپکتی اور اُس کے جسم میں ٹھنڈ کے انجکشن دینا شروع کر دیتی۔ سر سر کرتی دریا کی طرح اُس کے کانوں میں گرتی اور گردن میں سے پھسلتی ہوئی ٹھیک سینے پر جم جاتی۔ گرمیوں میں یہی ہوا ریت کے گرم گرم ذرے لاکر اُس کے جسم پر چنگاریاں کی طرح چپکاتی اور اُسے بھٹی میں سونے کا مزہ آجاتا۔ وائے موسم!

پر سب سے زیادہ دکھ دینے والی جو بات تھی وہ اُس کا موٹا پڑوسی تھا۔ سُرخ چقندر بڑی بڑی گھندار مونچھوں والا۔ وہ آکر دھپ سے بیٹھ جاتا اور مونڈھا لبالب اُس کے جسم سے بھر جاتا۔

"کیسے ہو!" وہ بغیر پھوے ہوئے ہمیشہ ایک ہی لہجے میں کہتا!

اور پھر۔ "بھابی ذرا پان تو دو۔ بجا ایک" وہ اُس کی بیوی سے فرمائش کرتا۔ مرجھائی ہوئی آدھی درجن بچوں کی ماں کا لکھڑوں والا کتھئی رنگ کا چہرہ ذرا دیر کو مسکرا اُٹھتا۔

"کبھی دہی بڑے کھلاؤ نا۔" یا "بھابی آج تو مٹر پلاؤ کھا کر ہی جاؤں گا"

وہ دھنسی ہوئی تیمارداری کی عادی آنکھیں بھر کنے لگتیں۔ ہونٹ جھک جانے اور پھر وہ اُسے کچھ نہ کچھ جھینکے پر سے دینے یا کوئی اچار یا چٹنی چکھانے دوسرے برآمدے میں لے جاتی۔ وہاں سے اُس کی چپڑ چپڑ کھانے اور بیوی کے کھلکھلانے کی آواز آنے لگتی۔

اس وقت فوراً اُسے یا تو رفع حاجت کی اشد ضرورت لاحق ہو جاتی یا پیاس اُٹھ کھڑی ہوتی یا اُس کے کسی نہ کسی حصۂ جسم کو دبنے یا مسلے جانے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی۔

اُس کے کئی بار پکارنے پر وہ جلی کٹی آتی۔ آنکھیں گھومی ہوئی اور چہرہ تنا ہوا گویا وہ قہقہے جو اُسے دیوانہ کئے دے رہے تھے کچھ دیر پہلے ان ہونٹوں سے نہیں گذرتے تھے بلکہ کہیں کسی اور ہی دنیا سے آئے تھے۔ وہ گھور گھور کر اُس کے منہ کو تکتا گویا وہاں کوئی چیز چپکی ہی تو رہ گئی ہوگی۔

پانی پیتے اور ہاتھ پیر مسلواتے مسلواتے وہ تھک جاتا مگر برآمدے میں بیٹھے ہوئے جبڑے ویسے ہی چکی کی طرح چلا کرتے۔ گویا انہوں نے اُس کی ہستی کو ہی چاب ڈالنے کا ارادہ کرلیا ہو!

وہ بیمار تھا تو کیا۔ دل تو مردہ نہ ہوا تھا۔

پر اس میں بیوی کا کیا قصور تھا وہ تو جوان تھی اور رگوں میں خون دوڑ رہا

تھا مگر وہ کبھی جھوٹ موٹ کو ہی اُس سے کچھ کہتا تو وہ اینٹھ جاتی۔

"اے چلو مجھے یہ چونچلے نہیں پسند" اور اُس کا تنکے جیسا ہاتھ ہوا میں جھولتا رہ جاتا۔ کبھی انہیں چونچلوں کے مارے اس کا میکے میں گھڑی بھر دل نہ لگتا تھا۔ دن دن بھر وہ دونوں ہوتے تھے اور بند کمرہ۔ یہی ہاتھ کتنے شریر تھے! اور اس پڑوسی نے تو اُس کی بدھیا ہی بٹھا دی تھی۔ وہ خود نہ آتا تو قمیص میں بٹن ہی ٹانکنے کو بھیج دیتا اور بیوی جان جان کر سینے میں اُسے اپنے جسم پر ڈالتی۔ گو وہ چاہتی تو مزے سے الگ سے ہی سی سکتی تھی پر نہیں، وہ تو پڑوسی نہیں تو اس کا کرتا پاجامہ یا موزہ ہی اُس کی چھاتی پر مونگ دلنے کو آن موجود ہوتا۔ اوّل تو تھا ہی کتنا خون جسم میں، پر جو بچی کھچی دو چار بوندیں تھیں وہ پڑی سن سن کھولا کرتیں۔ اور اس کا جی چاہتا تھا اپنی سوکھی سوکھی انگلیوں سے موٹے پڑوسی کے جسم پر سے گوشت کی تہیں کی تہیں اُکھیڑ ڈالے اور اوپر سے نمک بُرک کے، مرچیں ملا کر، اور اس وقت اس کی زبان کا مزہ بن جاتا رہتا!

خاموش لیٹ کر وہ کسی کام میں مشغول بیوی کو دیکھتا! اُس کے تخیل میں اُسے صاف موٹے پڑوسی کی پرچھائیں نظر آتی۔ کاش وہ کسی ترکیب سے اُس بدمعاش عورت کے خیالات کو قید کر سکتا! اُس کا بس چلتا تو اُسے سوچنے ہی نہ دیتا، پر وہ تو گویا خاموش طعنے سے دیتی تھی۔

"بکرا لو میرے خیالوں کی ڈور کو" وہ چڑھ جاتا۔ بدگمانیاں بڑھتیں اُسے اپنے سب بچے پڑوسی کی شکل کے معلوم ہونے لگتے۔ ویسی ہی ناچتی ہوئی اکھیر، موٹے موٹے بدن، ویسی گھومے ہوئے پاؤں اور سوجے ہوئے ٹخنے، بالکل پڑوسی جیسے! اور وہ انہیں قریب بلا کر گھور گھور کر دیکھتا۔ کبھی شک مٹتا کبھی اور جم جاتا اور وہ پاگل ہونے لگتا۔ اُس کا دماغ قلابازیاں کھانے لگتا۔ یہاں تک کہ اُسے بیوی کے پیٹ میں صاف صاف پڑوسی کی شکل کے بچے نظر آنے لگتے۔ وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھتا اور اُسے قریب بلا کر گھورتا۔ او دھوبن بھی کتنی بے وقوف ہے۔ آخر ساڑھیوں میں اتنا کلف دینے کی کیا ضرورت ہے! انسان کا وجود ہی کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ انسان کتنا پھول جاتا ہے۔ خواہ مخواہ!

"دھوبن حرامزادی سے کہو اتنا کلف نہ دے" وہ چھلاتا۔

"کیوں؟ اب کلف اور ساڑھیوں میں بھی تمہارا دخل ہو گیا" وہ تنک کر جواب دیتی۔ ساڑھیوں میں تو اُس کا دخل بے شک نہیں پر آخر کیوں!؟ اور بخار انگڑائیاں لیتا اُس کی سوکھی پنڈلیاں پھٹنے لگتیں۔ اور بھیپھڑے زخمی کبوتروں کی طرح پھڑ پھڑاتے۔ کن پٹیاں پھدکنے لگتیں۔ اُس کا جی چاہتا بیوی کی گردن پکڑ کر اتنی مروڑے کہ اُس کا نرخرہ پھٹ جائے اور پھر اس کی ناک کاٹ ڈالے، ناک کاٹنا گو اب بالکل فیشن میں نہیں سمجھا جاتا پر اُسے تو ہر لمحہ تخیل کی دنیا میں بیوی کی ناک کاٹتے ہی گذرتا۔ وہ دیکھتا کہ اُس نے ناک کاٹ ڈالی ہے اور چاقو کی مہین نوک سے اُس کے چہرے پر باریک باریک چارخانہ کاڑھ رہا ہے۔ وہ چونک کر بیوی کے چہرے کو دیکھتا۔ بے شک اُس کے سارے مُنہ پر باریک باریک لکیریں نظر آتیں۔ لوگ کہتے تھے کہ پریشانی کی وجہ سے پڑ گئی ہیں، پر وہ خوب جانتا تھا اور دل ہی دل میں ہنستا تھا۔ یہ وہی تو لکیریں تھیں جو وہ چاقو سے اپنے تخیل کی دنیا میں کاڑھا کرتا تھا۔

رات کو بخار نئی قلابازی لگاتا۔ کوئی ٹکڑا جسم کا یخ ہو جاتا اور کوئی انگارے کی طرح بھبکا کرتا۔ آنکھیں جلتیں تو ناک برف کی ڈلی ہو جاتی اور ہتھیلیاں سُلگتیں تو پنجے گلنے لگتے۔ گلے میں جیسے کوئی دہی بلو رہا ہے گُدّی سُن ہو جاتی۔ ڈاکٹر ٹٹول ٹٹول کر اُس کے جسم پر گوشت کی بوٹیوں میں سوئیاں لگاتا تھا۔ کولھوں میں گٹھلیاں پھانسوں کی طرح چبھتیں۔

ذرا آنکھ لگی اور جیسے کسی نے ہزاروں روئی کے گٹھر کے گٹھر اُس پر کھول کر بکھیر دیئے اور وہ سسکیاں لے لے کر اُس میں ڈبکیاں لگاتا۔ ہاتھیوں کی وضع کے جانور اُس کے سینے پر کودتے اور پنڈلیوں میں جیسے کوئی دُرّے لگا رہا ہے۔ پلنگ کے نیچے سے سینکڑوں سوکھے بے گوشت ہاتھ اُس کی طرف بڑھتے۔ اس کی کن پٹیوں پر مہین مہین غیر انسانی انگلیاں رینگتیں۔ خوابوں میں اُس کے کل مردہ عزیز ہاتھ پھیلا پھیلا کر اُسے بلاتے۔ بوڑھی دادی اپنا ڈگڈگاتا ہوا سر ہلا کر اُسے پھسلاتی مگر وہ بڑی خوش اسلوبی سے ان لوگوں کو ٹال کر صاف لوٹ آتا۔ کہتے ہیں کہ خواب میں اگر کوئی مردہ عزیز بلائے اور اس کے ساتھ چلے جاؤ تو فوراً مر جاتے ہیں! وہ ان روحانی چالوں کو خوب جانتا تھا اور کوئی اُلّو نہ تھا جو چکر میں آ جاتا۔ آخر کیوں مرے وہ؟ وہ انتقاماً جی رہا تھا۔ لوگوں کو کیوں آخر اُس کی موت کی امیدیں لگی ہوئی تھیں؟ نہیں مرا وہ! پھر؟ کسی کو کیا!۔

وہ لوگوں کے سامنے اور اکڑ کر لیٹتا۔ کوئی ذرا سی بھی بات ہوتی تو بہادر اور چھیلے مزاج والے جوانوں کی طرح کڑک کر بولتا۔ لوگوں کے ہمدردی سے افسردہ چہروں کو دیکھ کر وہ سُلگ اُٹھتا۔ جی چاہتا کہ اُن کی تھوتھنیوں کو کچل دے۔ جوں جوں وہ اپنے کو تندرست دکھاتا لوگ متفکر ہوتے جاتے۔

"سنبھالا لے رہا ہے" وہ سر ہلا ہلا کر کہتے۔

لوگ اُسے جانے کیا سمجھتے تھے۔ کبھی وہ بھی جوان تھے جب کنبے رشتہ کی ساری کنواریاں اُس سے بچائی جاتی تھیں، جیسے وہ انہیں کھا ہی تو جاتا۔ اور وہ لڑکیاں بھی تو اُسے دیکھتے ہی تلملا اُٹھتیں۔ اُن کے چہرے تمتما

اُٹھتے اور جو کام کرتی ہوتیں وہ اُن کے ہاتھ سے چھوٹ پڑتا ۔ بھاگتیں تو فوراً گر پڑتیں ، مُنہ ڈھانکنا چاہتیں تو دوپٹہ ہی اُتر جاتا اور وہ بے بس اُس کے رحم و کرم پر رہ جاتیں اور وہ تھا بھی بڑا رحم دل !

اتنی ڈھیر سی لڑکیاں اُس سے شرماتی تھیں کہ وہ کچھ فیصلہ بھی تو نہ کر سکتا تھا ۔ کبھی منجھو پر وہ "مر جاتا" کبھی جاتی اُس کے دل کا ٹکڑا بن جاتی اور کبھی اِن سب کو مع اِس پُر ہوس دنیا کے وہ چھوڑ کر منّی کا پجاری بن جاتا ۔ اور پھر کبھی ایک دم سے گڑ بڑا کر وہ سب پر ایک دم ہی ٹوٹ پڑتا !

پر اب تو عرصہ سے اُس سے شرمانا ہی چھوڑ دیا گیا تھا ۔ مہترانی کی جوان بہو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایسے باتیں کر لیتی جیسے وہ کوئی بلّی یا چوہا ہے ۔ اور منجھو جن سے قریب قریب آدھی منگنی ہو گئی تھی اور شادی سے پہلے اُس کے آنے کی خبر سُن کر اُن پر ہسٹریا کا دورہ پڑ جاتا تھا ۔ مزے سے بیٹھی اپنے بچّے کو اُس کے سامنے ہی دودھ پلایا کرتی ۔ اور جاتی اپنی پوشیدہ بیماریوں کا ذکر اُس کے ڈاکٹر سے اُسی کے سامنے کھلے بندوں کرتی ۔ لوگ اُسے خطرے کی حدّوں سے باہر کر چکے تھے ۔ اُس کی زندگی کے بہترین زمانے کو ناعاقبت اندیشی کا زمانہ کہہ کر معاف کر چکے تھے ۔ ایک دفعہ اُس نے چاہا کہ ان لوگوں کے ذرا ہوش ٹھکانے کر دے اور وہ نوجوان ماما کو دیکھ کر کچھ بڑبڑایا ۔ پھر وہ بننے لگی ۔

"اے ہے بھیّا کا بخار بہت ہی چڑھ رہا ہے" ۔ وہ اٹھلاتی ہوئی چل دی سب اُسے بھیّا کہنے لگے تھے ۔ جب سے وہ بیمار پڑا تھا لوگ بن بن کر اُسے جلاتے تھے ۔ یہاں تک کہ اُس کا بوڑھا چچا تک اُسے "بھیّا" کہہ کر پکارتا تھا ۔ مجھا اینٹھتا تھا ۔ سمجھتا تھا کہ وہ اُس کے اتنا بھی نہیں جینے کا اور بہت جلد دوسری دنیا کو کوچ کر جائے گا ۔ ہونہہ ! لوگ آس لگائے لگائے مر جائیں گے مگر وہ ضد میں نہیں مرے گا ۔ وہ جئے گا ۔ جئے جائے گا ! خواہ کتنے ہی لرزے چڑھیں پھیپھڑے دُکھیں پڑوسی آئیں اور بیوی مسکرا مسکرا کر اُن کے سڑاندے موزے سئے پر وہ جئے گا ۔ خواہ اُس کے سب بچّے پڑوسی کے ہم شکل ہو جائیں ۔ سب پڑوسی سے ملنے لگیں اُس کے بھائی ، ماں باپ بہن سب پڑوسی کی طرح آنکھیں مٹکائیں اور پاؤں گھمائیں ٹھنے سو جائیں ۔ پر وہ جئے گا ۔ انتقاماً جئے گا ! یہ تو ہونے سے رہا کہ وہ لوگوں کے اطمینان کو مر جائے ۔

وہ دیکھتے ہی انسان کو بھانپ جاتا ۔ وہ اپنے عیادت کرنے والوں کے چہروں کو غور سے دیکھتا ۔ اگر اُن پر افسردگی چھائی ہوتی تو وہ بگڑ جاتا ۔ یہ سب مفسدوں کے چہرے ہوتے اور وہ انہیں جلے کٹے جواب دیتا ۔ جو لوگ مریض کا دل خوش کرنے کو ذرا مسکرا کر آتے اُنہیں وہ مکّار سمجھتا ۔ وہ اُسے اُلّو سمجھتے تھے کیا ! وہ گھر سے ہی اُسے "بس اب اچھے ہو جاؤ گے" "اللہ نے چاہا جلد شفا ہو گی" جیسے جملے سنانے آتے تھے اور ایسے لوگوں کے نازک معاملات پر وہ گفت و شنید شروع کر دیتا ۔ اُن کے چہروں سے مسکراہٹ اُڑ جاتی ۔ اور وہ بدحواس ہو جاتے اور جو اگر کسی کے چہرے سے کچھ بھی نہ ظاہر ہوتا تو وہ اُسے پکّا اُلّو سمجھ لیتا ۔ وہ اُسے عجیب و غریب طریقوں سے نقصان اٹھانے ذلیل ہونے لٹھ بازی کرنے اور مقدمہ چلانے کے فوائد سمجھایا کرتا یہاں تک کہ عیادت کو آنے والے کے چہرے پر وحشت اور جنون کے تسلّی بخش آثار نظر آنے لگتے ۔ تب وہ اطمینان سے ہنستا اور آؤ گے ؟ خواہ مخواہ ! وہ دل ہی دل میں اس سے پوچھتا ۔

جتنے ڈاکٹر آتے بدمزہ سے بدمزہ دوا تجویز کرتے اُس کے سینے پر مالش کرانے یا انجکشن لگانے کے بہلانے اُس کی بیوی کی فضول مدد کے خواستگار ہوتے ۔ وہ بے بات بھی اُس کی انگلیاں ٹٹولتے اور خون کی کمی وغیرہ کے بہلنے اُسے روغن کھلانے اور لذیذ دوائیں کھانے کو بتا جاتے ۔ کوئی ہی ایسا ڈاکٹر ہو گا جس نے فوراً بیوی کے لئے نسخے پر نسخہ نہ لکھ دیا ہو ! ۔ وہ انہیں موٹی موٹی گالیاں دیتا اور کل بیوی کے نسخے پھاڑ ڈالتا ۔ اُس کا بس نہیں تھا کہ مٹھی بھر اپنے جراثیم پھانک کر پلا دیتا ۔

کبھی وہ بھی زمانہ تھا کہ یہی بیوی اُس کے جنم مرن کی ساتھی بنی تھی اور سنگ میں جان دینے کے وعدے کر چکی تھی پر اب جراثیم کے ڈر سے فینائل سے ہاتھ دھوتی اور سوڈوں سے غرارے کرتی تھی ۔ کتنی گہری خلیج دونوں میں حائل ہو گئی تھی ۔ !

اور پھر بخار چڑھتا ۔ پھیپھڑے پھولتے گلے میں گاڑی سی چلتی ، ہڈیاں چیختیں اور وہ جسمانی اور روحانی دکھوں میں ڈوب جاتا !

عِصمت چغتائی

شعر

بادل بادل بجلی بجلی

بادہ گساراں بادہ گساراں !

فراقؔ گورکھپوری

ناگ سبھا کا ناچ

ناگ راج سے، ناگ راج سے ملنے جاؤں آج،
ناگ راج ساگر میں بیٹھے سر پر پہنے تاج،
ناگ راج کی سبھا جمی ہے خوشبوئیں لہرائیں،
بہتی، رکتی، الجھتی جاتی، من کو مست بنائیں
چندرماں کی کرنیں آئیں، بل کھائیں، ۔۔۔ بل کھائیں،
ننھے ننھے، ہلکے ہلکے، میٹھے گیت سنائیں۔
گاتے گاتے تھکتی جائیں، سوئیں سکھ کی نیند۔
انگ انگ میں ہلکی ہلکی میٹھی میٹھی نیند!
کچھ لمحے یوں بیتیں، اور پھر سنکھ بجائے ناگ۔
وحشی اور بے باک، انوکھے نشے لائے ناگ۔
سوئی کرنیں جاگ اٹھیں اور ناچیں سندر ناچ،
دیوداسی یاد آ جائے، ہاں ۔۔۔ اور مندر ۔۔۔ ناچ!
ناگ سبھا کا ناچ انوکھا، سارا ساگر ناچ!
میرا من بھی بنتا جائے دیکھ دیکھ کر ناچ!

میراجی

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

ادارہ اس شمارے میں جائزۂ نثر کی عدمِ اشاعت کے لئے معذرت چاہتا ہے اور اس کی وجہ صلاح الدین صاحب کی علالت ہے۔ امید ہے کہ آئندہ مہینے اس کی تلافی کر دی جائے گی۔

میراجی

اجنبی عورت

ایشیا کے دُور افتادہ شبستانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی روماں نہیں۔
کاش اک دیوارِ ظلم
میرے اُن کے درمیاں حائل نہ ہو!
یہ عماراتِ قدیم
یہ خیاباں، یہ چمن، یہ لالہ زار،
چاندنی میں نوحہ خواں،
اجنبی کے دستِ غارت گر سے ہیں!
زندگی کے ان نہاں خانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی روماں نہیں۔
کاش اک "دیوارِ رنگ"
میرے اِن کے درمیاں حائل نہ ہو!
یہ سیہ پیکر، برہنہ راہرو
یہ گھروں میں خوبصورت عورتوں کا زہرِ خند
یہ گذرگاہوں پہ دیوآسا جواں
جن کی آنکھوں میں گرسنہ آرزوؤں کی لپک
مشتعل، بیباک مزدوروں کا سیلابِ عظیم!
ارضِ مشرق! ایک مبہم خوف سے لرزاں ہوں میں
آج ہم کو جن تمناؤں کی حرمت کے سبب
دشمنوں کا سامنا مغرب کے میدانوں میں ہے۔
اُن کا مشرق میں نشاں تک بھی نہیں!

سالنامہ ادبِ لطیف سالنامہ ۱۹۴۲ء —— ن م راشد

ن م راشد کی اس نظم کو پڑھنے کے بعد میرا ذہن اس کے الفاظ کو بھول جاتا ہے سب سے پہلے میں دل سے شاعر کے براہِ راست مفہوم کو نکال دیتا ہوں۔ میرا تخیل یک دم مغرب کے موجودہ ہنگامہ زار میں جا پہنچتا ہے۔ جہاں انگلستان کے وہ باشندے موجود ہیں جو امن پسندی اور جمہوریت کے علمبردار بنتے تھے لیکن آج جن کی تہذیب و تمدن کے گہوارے تباہ کاری کے خرابے بن گئے ہیں اور جنہیں اپنے آدرش کی حفاظت کے لئے مغرب کے میدانوں میں دشمنوں کا سامنا ہے۔ یہاں تک سوچ لینے کے بعد میں پھر ایشیا میں آ پہنچتا ہوں۔ اب میرا ذہن اس نظم کے شاعر کے ذہن سے ہم آہنگ ہے۔ مغرب کی سمت کا یہ ذہنی سفر میں نے اُس نفسیاتی پیچ کی بنا پر کیا ہے جو شاعر نے نظم کے آخر میں رکھا ہے۔ بین الاقوامی حالات کا یہ تاثر اجنبی عورت کے ذہن میں قائم کرنا ایک بعد کی چیز ہے۔ سب سے پہلے ہم یہ سوچتے ہیں کہ شاعر کو اس نظم کی تحریک کیونکر ہوئی۔ آج یعنی موجودہ جنگ سے پہلے بھی ہم مغرب کی کئی عورتوں کو راستہ چلتے یا اور کئی مقامات پر اپنے ہی ملک میں دیکھتے تھے لیکن وہ ہمارے لئے صرف ایک حاکم قوم کے نسائی پہلو کا مظہر تھیں۔ یا اگر ہمارے جنسی جذبات انہیں دیکھ کر برانگیختہ ہو جائیں تو اُس صورت میں

وہ ایک ناممکن الحصول قسم کی عورت بن جاتی تھی۔ جسے دیکھ کر بجنوری جیسا شاعر اُسے "صنم فرنگ" پکار سکتا تھا۔ لیکن اب ہم سیاسی طور پر ترقی پا چکے ہیں، ہمارا نفسی شعور بین الاقوامی حالات کے لحاظ سے ہمیں پہلے مسائل کو ایک نئی روشنی میں محسوس کرا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نظم کا شاعر جب ایک مغربی عورت کو دیکھتا ہے تو بجنوری کی طرح یہ نہیں کہتا ہے کہ تیرے عشق میں ہوں میں مبتلا، بلکہ اُس کا ذہن ایک اور ہی ڈگر پر چل کھڑا ہوتا ہے، وہ اپنے احساسات میں ڈوب جانے کی بجائے اس عورت کے خیالات پر غور کرنے لگتا ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ اس وقت اس عورت کا اندازِ نظر ہماری ذات، ہمارے حالات اور ہمارے ملک کے متعلق کیا ہوگا۔ اور یوں وہ اپنی ہستی کو چھوڑ کر ذہنی طور پر اس اجنبی عورت کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہ عورت ایک ایسی روح ہے، نسائی روح، جو مغرب کے جنگی ہنگامہ زار سے تنگ آکر اگر مادی طور پر مشرق میں نہیں آن پہنچی تو کم از کم روحانی لحاظ سے ہماری سرزمین کی طرف ضرور مائل ہے۔ اُسے اپنے ملک میں تسکین حاصل نہیں وہ اپنے ماحول کے دوزخ سے نکل کر کسی ایسی خیالی جنت میں پہنچ جانا چاہتی ہے۔ جہاں امن و آسائش ہو، جہاں راحت اور مسرت ہو اور اسی جستجو میں وہ مشرق کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اُس کا نسائی ذہن سوچتا ہے کہ مشرق کی حرم سراؤں میں اُس کا مطلوبہ آرام مل سکتا ہے۔ مغرب میں اُسے اپنی زندگی کشمکش سے پُر نظر آتی ہے۔ امن کی حالت میں بھی اور جنگ کی حالت میں بھی۔ ایشیا کے دور افتادہ شبستان اُسے لبھاتے ہیں۔ لیکن وہ سوچتی ہے کہ ان شبستانوں کی پابند اور غیر انفرادی زندگی میں اُسے تسکین حاصل نہیں ہو سکتی ان حرم سراؤں کی خواب گاہوں میں اُس کا آدرش نہیں مل سکتا۔ ان میں اُس کے خوابوں کا کوئی رومان نہیں۔ ان کے اور اُس کے درمیان ایک ظلم کی دیوار حائل ہے۔ یہ ظلم حرم سراؤں کی پابند زندگی ہے۔ حرم سراؤں سے نکل کر اُس کا تصور مشرق کی اور دلکش چیزیں پیش کرتا ہے۔ قدیم عمارتیں، خیاباں، چمن، لالہ زار جہاں کے تہہ خانوں میں بیٹھ کر ایک زمانہ گزرا کہ ان کے بنانے والے زندگی کا لطف حاصل کرتے تھے۔ لیکن رات کی چاندنی میں ان اجڑے ہوئے مقامات اور کھنڈروں کا نقشہ اُسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ نوحہ کر رہا ہے۔ اُس غارت گری کا نوحہ خواں ہے جو اجنبی حملہ آوروں نے ان آثارِ قدیمہ سے روا رکھی۔ اس لئے ان میں بھی اُسے اپنے خوابوں کا کوئی رومان نظر نہیں آتا۔ اُس کا آدرش یہاں بھی غیر موجود ہے۔ اب اُس کا تصور پھیلتا ہے اور وہ موجودہ مشرق پر غور کرتی ہے۔ یہاں کے سیاہ رنگ انسان، مفلس انسان، یہاں کی گھروں میں قیدی عورتیں، جو خوبصورت ہیں لیکن ہنستی ہیں تو ان کی ہنسی بھی دل کی نہیں ہوتی۔ یہاں کے رستوں پہ چلتے ہوئے قومی ہیکل جوان جن کی نگاہیں اُن کے دل کی حالت کو عریاں کئے دے رہی ہیں، یہاں کے مشتعل مزدوروں کا انبوہ ــــ اس تمام مختلف بکھری ہوئی انسانیت میں اُسے اُس تمنا کا عکس بھی نظر نہیں آتا جو اُس کے اپنے دل میں ہے۔ جو اُس کے ہموطن افراد کے دل میں ہے۔ یہ تمنا امن و راحت اور جمہوریت کو تباہی سے بچانے کی تمنا ہے۔ اس اجنبی عورت کے خوابوں کا رومان جو نظم کے شروع میں ایک انفرادی چیز تھا نظم کے آخر میں پہنچ کر اجتماعی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ آغاز میں شاید صرف اُس کی ذات ایک آرام کی جگہ تلاش کرنا چاہتی تھی۔ لیکن انجام میں پہنچ کر اُس کے خوابوں کا رومان ایک نئی چیز بن جاتا ہے، ایک توقع جو مغرب کے رہنے والوں کو مشرق سے تھی اور اب بھی ہے لیکن اُس کے پورا ہونے میں اب مشرق کی طرف سے ایک جھجک دکھائی دے رہی ہے۔ اس جھجک کی وجوہات شروع سے لے کر آدھی نظم تک بیان کی گئی ہیں۔ جن تمناؤں کی حرمت کے سبب مغرب کے رہنے والے دشمنوں کا سامنا کئے بیٹھے ہیں اُن کا عکس مشرق میں کیونکر نظر آسکتا ہے۔ مشرق اور مغرب کے درمیان ایک دیوارِ ظلم حائل ہے۔ ایک دیوارِ رنگ حائل ہے۔ اور اس حقیقت کو جان کر یہ اجنبی عورت شاعر کو ایک مبہم خوف سے لرزتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

مہمانداری

پھیلی ہے فضاؤں میں خوشی میری نظر کی
ہنستی نظر آتی ہیں فضائیں میرے گھر کی
دل شاد مرے اہل و عیال آج بہت ہیں
مصروف ہیں وہ بھی، نہیں مصروف تنفس
رکھی ہے سلیقے سے ہر اک کام کی چیز آج
مہمان مرے گھر میں ہیں کچھ میرے عزیز آج
شادی کا مکاں گھر مرا معلوم نہ ہو کیوں!
مجمع ہو جب اتنا تو بھلا دھوم نہ ہو کیوں؟
بھائی بھی ہیں بہنوئی بھی بھاوج بھی بہن بھی
بیٹھا ہے بھتیجا بھی، بھتیجے کی دلہن بھی
بچی اک ادھر بیٹھ کے تکتی ہے دلہن کو
کچھ طفل ستاتے ہیں اُدھر اپنی بہن کو
بچوں پہ جھلک خاص ہے تنویرِ سحر کی
اُٹھ بیٹھے ہیں سب سنتے ہی آوازِ گجر کی
دلکش یہ فضا صبح کی، یہ نور کا تڑکا
بلبل کی طرح بول رہا ہے کوئی لڑکا

بے وجہ کوئی رونے پہ آمادہ ہوا ہے
حیرت سے "نئے گھر" کو کوئی دیکھ رہا ہے،
بیٹھا ہے یہ چپ، دوڑ رہا ہے وہ خوشی سے
کھانے کے لئے منہ کوئی کرتا ہے ابھی سے
کرنا ہے جو سامان ضیافت کا فراہم
آ آ کے مرے کان میں کچھ کہتی ہیں بیگم
ہونا ہے جو خوبی سے ضیافت کا سرانجام
لڑکی کے ذریعے سے بھی پہنچاتی ہیں پیغام
آتی بھی ہیں جاتی بھی ہیں بیگم سوئے مطبخ
ماماؤں میں ہے وقت جہاں ہوتی ہے وخ وخ
راحت نہ ملے کیوں انہیں ہلکی تگ و دو میں
سائے کی طرح ساتھ ہے لڑکی بھی جلو میں
ننھی ابھی اٹھی نہیں پہلو سے پھپھی کے
لیتی ہیں وہ رہ رہ کے مزے اس کی ہنسی کے
لڑکے مرے خوش ہو کے ادھر دیکھ رہے ہیں
اخلاص و محبت سے مخاطب ہوں جدھر ہیں
مجمع یہ عزیزوں کا، محبت کی یہ باتیں
ان پیار کی باتوں میں نہ چوٹیں ہیں نہ گھاتیں
انوار تبسم کے تکلم سے ہیں پیدا
منو صبح کی اس منظر دلکش پہ ہے شیدا
باتوں کا ابھی تھا طربی سلسلہ جاری
نرگس نے کہا آکے ہے "تیار نہاری"

علی منظور (حیدرآبادی) اپنی شاعرانہ انفرادیت کی وجہ سے میری نظروں میں قابل قدر ہے شاعروں کو عموماً خیالی، فطری، جنسی ماحول ہی بھاتا ہے۔ لیکن سماج یا گھر گرہستی کے ان معاملات میں انہیں کوئی دلکشی نظر نہیں آتی جو عمر کے بڑے حصے پر حاوی ہوتے ہیں۔ علی منظور کی نگاہ اور اس کے احساسات زندگی کی سیدھی سادھی اور بظاہر معمولی باتوں میں تسکین پاتے ہیں اور وہ اپنے کلام میں روزمرہ زندگی کی ایک پیاری تصویر پیش کر کے بالواسطہ گھر ہست آشرم کو سراہتا ہے۔ اوپر کی نظم میں اس کی ذہانت کا سادہ لیکن پُرکار پہلو پوری طرح نمایاں ہے۔ بیانیہ لحاظ سے وہ چند ہی لفظوں میں ایک بڑا منظر پیش کر سکتا ہے

مہمان مرے گھر میں ہیں کچھ میرے عزیز آئے ——

لیکن اس سے ہمارا ذہن صرف ایک "ہیولائی" تصور لیتا ہے۔ جسے صرف ایک شعر باقاعدہ صورت دے کر دھندلا دور کر دیتا ہے

بھائی بھی ہیں بہنوئی بھی، بھاوج بھی بہن بھی
بیٹھا ہے بھتیجا بھی، بھتیجے کی دلہن بھی

محاکات بھی ہیں یہاں خوب ملتے ہیں۔

بچی اک ادھر بیٹھ کے تکتی ہے دلہن کو
کچھ طفل ستاتے ہیں ادھر اپنی بہن کو۔
لڑکے مرے خوش ہو کے ادھر دیکھ رہے ہیں۔
اخلاص و محبت سے مخاطب ہوں جدھر ہیں۔
کرنا ہے جو سامان ضیافت کا فراہم
آ آ کے مرے کان میں کچھ کہتی ہیں بیگم۔

اور پھر ——

لڑکی کے ذریعے سے بھی پہنچاتی ہیں پیغام

نظم کی سب سے بڑی خوبی اس کی بیانیہ قوت ہے اور شاعر کا غائر مطالعہ اقتباس کے طور پر مختلف اشعار پیش کرنے سے کچھ خاص فائدہ نہیں۔ تمام نظم میں جو چلتی ہوئی تصویریں فن کار نے پیش کی ہیں وہ نہ صرف ذہن میں شگفتگی سی پیدا کر دیتی ہیں بلکہ مہمانداری کے بکھیڑے اور ضیافت کے ہنگامے میں ایک دلکش رنگ بھر دیتی ہیں۔

شعریت انداز نظر میں ہے۔ بنفسہٖ مختلف چیزوں یا واقعات میں نہیں اس کی دلیل بھی اسی نظم کو سمجھئے

میراجی

نقد و نظر

باقیاتِ بجنوری

(مجموعۂ نظم و نثر) از ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری (مرحوم) حجم دو سو بیالیس صفحات۔ ناشر مکتبہ جامعہ دہلی قیمت دو روپے آٹھ آنے

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اگرچہ اردو خواں طبقے میں اپنے مقدمۂ دیوانِ غالب کی وجہ سے ایک لازوال شہرت کے مالک ہیں لیکن حالی کے بعد کی جدید اردو شاعری میں بھی ان کا رتبہ اولین رہنماؤں کا ہے۔ اس ہونہار اور جواں مرگ ادیب کے ادبی کارنامے اب تک منتشر حالت میں موجود تھے۔ صرف مقدمۂ دیوانِ غالب ہی ہر کسی کو مہیا ہو سکتا تھا۔ مکتبہ جامعہ دہلی نے اس اہم ادبی خدمت کو انجام دیا ہے۔ بجنوری کی ادبی تخلیقات جہاں بنفسہٖ شعر اور تنقیدِ شعری کے لحاظ سے غور کے لائق ہیں وہاں تاریخ ادب اردو میں بھی اُن کا رتبہ خاص ہے۔ بجنوری کی ذہانت میں علمیت ممتاز دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ علمیت یکسر ساکن انداز نہیں رکھتی، اس میں ٹھہراؤ کے پہلو بہ پہلو بہاؤ بھی موجود ہے، وہ بہاؤ جو ہر تخلیقی ادب میں ترقی پسندانہ رجحانات کا باعث ہوتا ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ میں سب سے پہلے تعارف کے طور پر پروفیسر رشید احمد صدیقی نے آٹھ صفحے لکھے ہیں۔ اس تعارف کے بعض اقتباسات سے بجنوری کی ذہانت پر روشنی پڑتی ہے۔ پروفیسر موصوف کے قول کے مطابق بجنوری نے "یورپ کے زندہ جاوید شعرا اور مفکّرین کے خیالات کی روشنی میں غالب کو پیش کر کے اردو داں طبقے کے لئے نئی راہیں کھول دیں" اور بجنوری کے اس اقدام کا اثر پائدار اور ہمہ گیر رہا۔ کیونکہ "اُن کے بعد اردو دانوں نے اسلوبِ نگارش ہی میں نہیں بلکہ فکر و مطالعہ کے لئے موضوعات انتخاب کرنے میں بھی زیادہ جرأت اور ذمہ داری سے کام لیا۔"

بجنوری کی ذہانت کے شاعرانہ پہلو کے متعلق بھی پروفیسر رشید نے ایک دو نکتہ ورانہ باتیں کہی ہیں۔ "مرحوم عظمت اللہ خاں بجنوری مرحوم ہی کی نظموں سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ عربی فارسی کے متداول بحور و عروض سے آزاد ہو کر اپنے خیالات کو کم، جذبات کو زیادہ مترنم بنانے میں دونوں کو لطف آتا تھا۔" ہمیں اس رائے کے ابتدائی حصے سے اختلاف ہے۔ بجنوری شاید مقدمۂ دیوانِ غالب کی تصنیف کے دوران میں غالب کے اندازِ بیان سے متاثر ہوئے تھے۔ اور اُن کی گنتی کی دو چار نظموں میں بھی غالب ہی کے اندازِ بیان کا اثر نظر آتا ہے۔ برعکس اس کے عظمت اللہ ہندوستان کے خالص مقامی رنگ اور ہندی شاعری سے براہِ راست متاثر ہونے کے باعث بجنوری سے کہیں مختلف ہے۔ بجنوری کے شعر میں اُس کی انفرادیت اس قدر ممتاز اور خود کام دکھائی دیتی ہے کہ اُس کی وجہ سے ہمیں اُس کا کلام ایک آہنی یا سنگین ستون معلوم ہوتا ہے۔ اور اس تاثر میں فارسی اور عربی کے مشکل الفاظ سے اُس کی رغبت نمایاں اضافہ کرتی ہے۔ مگر عظمت اللہ کے کلام کو ہم کسی ایسی لچکتی ہوئی شاخ سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس کی لچک ہر دیکھنے والے کے دل کو موہ سکے۔ نہ یہ کہ صرف ماہرانِ تعمیر ہی شعر کے ستون کو سراہتے ہیں۔

پروفیسر موصوف کو بجنوری کی اس سنگین اور آہنی خصوصیت کا پورا احساس ہے۔ کیونکہ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں "بجنوری مرحوم کی تحریریں الفاظ و عبارت کے اعتبار سے کچھ زیادہ سلیس و سہل نہیں ہیں۔ اکثر فقرے اور عبارتیں نامانوس معلوم ہوں گی۔ کہیں کہیں پُر تکلف یا بوجھل" اور وہ اس مشکل پسندی کی توجیہہ بھی کرتے ہیں ——

"لیکن یہ زمانہ وہ تھا جب جدید علوم و فنون کی مصطلحات عام نہ تھیں۔ اور اسالیبِ انشا محدود تھے۔"

مختلف مغربی ممالک کے ادب کا جیسا کچھ غائر مطالعہ بجنوری نے کیا تھا اس سے یہ اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اُن کا ذہن یکسر مغرب ہی کے رنگ میں رنگا جائے لیکن نہیں۔ پروفیسر رشید کے قول کے مطابق "وہ مغربی طور طریقوں کے ساتھ ساتھ مشرقی رکھ رکھاؤ کے بھی بڑے حامل تھے۔" اور مجھ پر اُن کے کلام سے ایک بہت مختصر سی نظم اس حقیقت کا اظہار کرتی ہے کہ بجنوری ذہنی ترقی کے لحاظ ہی سے مغرب کے پیرو تھے، ان کا دل واقعی یکسر مشرقی تھا۔ مغربی معاشرت اُن کے طبعی رجحانات پر غلبہ نہیں پا سکتی تھی۔ وہ مغرب کی پیروی میں ذہنی ترقی کے باوجود اپنے دل کو مشرق کی سادگی سے ہم آہنگ رکھنا چاہتے تھے۔ محولہ بالا نظم درج ذیل ہے۔

دعا

جامن کے سائے کے تلے جوئے رواں اور نیم ناں
شامل ہوں جس میں سب مرے بچے اور اُن کی نیک ماں
پیغمبری ہو یا شہی یا ہو حیاتِ جاوداں
مجھ کو تو بس دیجو یہی آبِ زلال اور نیم ناں

ہمیں امید ہے کہ ادب کا ہر مشتاق اس قیمتی مجموعے کو حاصل کرنے میں

ذرا جلد بازی سے کام لے گا۔

سریلے بول (مجموعۂ نظم) از محمد عظمت اللہ خاں بی اے مرحوم حجم تقریباً ۲۰۰ صفحات قیمت ہے۔ شائع کردہ محترمہ عظمت زبیدہ بیگم۔ ملنے کا پتہ محمد رشید اللہ خاں برکت بنگلہ ٹھگی جیل قدیم۔ حیدرآباد دکن۔

بجنوری کے مجموعے کے بعد یہ خبر سونے پر سہاگے کا حکم رکھتی ہے کہ اُس کی اشاعت کے لگ بھگ ہی اردو کے ایک اور اہم شاعر کا مجموعۂ کلام بھی ہم تک پہنچ رہا ہے عظمت اللہ اور بجنوری اپنی انفرادیت کے لحاظ سے دو مختلف فن کار ہیں لیکن اردو شاعری کے ایک خاص دور میں اُن کی اہمیت یکساں ہے۔ اگرچہ عظمت اللہ نے اردو کی مزاحیہ اور طنزیہ نثر میں بھی قابلِ قدر اضافہ کیا لیکن یہ اُس کی شاعری ہے جس نے اُسے زندۂ جاوید بنا دیا ہے عظمت اللہ ایک تجرباتی شاعر تھا۔ اور اس لحاظ سے اُس کے کلام میں بعض ایسی باتیں دکھائی دے جاتی ہیں جنہیں اردو شعر کی موجودہ ترقی کے پیش نظر خام کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار کا خیال بھی ہمیں نہیں آتا کہ عظمت اللہ ایک سچا شاعر تھا۔ شعر کے فنی پہلوؤں میں جو اجتہاد اُسے مقصود تھا اُس کی تشریح وہ اپنے ایک دو مقالوں میں کر گیا ہے (اور ایک مقالہ ابتدائی وضاحت کے طور پر اس مجموعے میں بھی شامل ہے) ہر بات کے رہنما اپنے تجربوں میں انتہا پسند ہوتے ہیں اور عظمت اللہ بھی اس لحاظ سے استثنٰے نہیں ہے۔ لیکن جس نئی ڈگر پر چلنے کے اشارے اُس نے اردو شاعروں کو کئے ہیں۔ وقت ہمیں بتا چکا ہے کہ انہیں خاطر خواہ طور پر قبولیت حاصل ہوئی حفیظ جالندھری۔ حامد اللہ افسر میرٹھی، مقبول حسین احمد پوری، ساغر نظامی اور بعد کے دوسرے بے شمار شعرا کا کلام ان اثرات کو کسی نہ کسی صورت میں ظاہر کرتا ہے اور اب بھی عظمت اللہ کی کہی اور کی ہوئی بعض باتوں پر از سرِ نو غور کیا جا سکتا ہے۔ اس مجموعے میں جناب محمد ریاض الدین خاں نے ۱۲ صفحے پر شاعر کے حالات زندگی بھی پیش نظر کئے ہیں اور اُن سے پہلے دکن کے مشہور نقاد جناب سید محی الدین قادری زور نے ۷ صفحے کا ایک مختصر لیکن جامع دیباچہ قلم بند کیا ہے مشہور صوفی شاعر جناب امجد حیدرآبادی کا لکھا ہوا ایک نوحہ بھی ترتیب و تہذیب کتاب کے سلیقے میں ایک اضافے کا باعث ہے۔ شعر و شاعری کے متعلق عظمت اللہ کا مضمون ۸۵ صفحوں پر حاوی ہے اور بعد کے صفحوں میں نظمیں، گیت اور مثنویات ہیں۔ جن میں انگریزی سے ترجمہ شدہ نظمیں بھی شامل کر لی گئی ہیں۔ ترجمہ کی ہوئی نظموں میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اصل مفہوم سے مطابقت اور اپنی ذاتی بے ساختگی اور ننگی کے باوجود اکثر محض تجربہ بن کر رہ جاتی ہیں لیکن عظمت اللہ کے شاعرانہ درجے کو جانچنے کے لئے اُس کی طبعزاد نظمیں ہی ہمارے پیش نظر ہونی چاہئیں۔ شاعرہ رہ ہاستی کا مرثیہ مختصر مثنوی کے مغربی تصور (یعنی بیلڈ) کا ایک کامیاب اردو تجربہ ہے لیکن فن اور اثر کے لحاظ سے بہتر ذیل کی مثنویاں ہیں

۱۔ میرے حسن کے لئے کیوں مرے
۲۔ مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا۔
۳۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔
۴۔ وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے۔
۵۔ تمہیں یاد ہیں وہ دن بھی

معلوم ہوتا ہے کہ عظمت اللہ کے ذہن میں افسانہ طرازی کا جزو بہت پختہ تھا۔ کیونکہ اپنی مختصر مثنویوں کے علاوہ بھی وہ جب ایک خالص شعری مطالعہ ہی لکھنا چاہتا ہے تو مصرعوں کے بین السطور ایک قصہ سا رواں رہتا ہے۔ گویا وہ اظہار احساس و جذبات کے لئے کم و بیش ایک ڈرامائی سا ذہنی ماحول قائم کر لیتا ہے پہلا آمنا سامنا، اور ربالی بیوی سے، اس نظریے کی مثالیں ہیں۔ اور مثال کے علاوہ کامیاب اور مکمل نظمیں بھی۔ گیتوں کے سلسلے میں عظمت اللہ نے جو تجربے کئے وہ اردو گیتوں کے موجودہ معیار کو دیکھتے ہوئے کچھ زیادہ اپیل نہیں کرتے لیکن ایک بات کی ہم اس مجموعے میں کہیں بھی کمی نہ پائیں گے اور وہ بات شعریت ہے۔ شاعر کی رس میں ڈوبی ہوئی فطرت ہر جگہ اپنا اظہار کئے جاتی ہے۔ افسانوی رجحانات سے پہلو تہی کرتے ہوئے اگر ہم خالص شعر کو دیکھنا چاہیں تو اس شاعر کی صرف ایک نظم ہی کافی ہوگی۔ "موہنی مورت موہنے والی" خصوصاً اس کا دوسرا حصہ اردو شاعری میں سانولے حسن کے تاثر کی ترجمانی کے لحاظ سے ہمیشہ ایک بے نظیر چیز رہے گا تنوع کا لحاظ کرتے ہوئے بھی ہم عظمت اللہ کی شاعری کو ہمہ گیر سا پاتے ہیں۔ کہیں وہ موہنی مورت اور سُندر صورت کے گن گا رہا ہے۔ کہیں تریا جاہ بالی بیوی وغیرہ ایسی چیزوں میں نسائی نفسیات کا مطالعہ کرتا ہے۔ کہیں کوئل، برکھا رت، پپیہا وغیرہ نظموں میں مطالعۂ فطرت اُسے رغبت دلاتا ہے اور کہیں جب اُس کی ذہانت کا طنز و مزاح والا پہلو بیدار ہو جاتا ہے تو وہ مونچھ اور چوٹی کے تانے بانے میں خود بھی اُلجھتا ہے اور ہمیں بھی الجھاتا ہے۔ یا مرزا جی کے حقے کی گڑگڑاہٹ سے ہنساتا ہے۔

کلام کے علاوہ شاعری سے متعلقہ مضمون اب بھی اردو شاعروں کے لئے خیال انگیز ہو سکتا ہے اور امید ہے کہ آج جبکہ اردو کے شاعر نئے نئے تجربات میں منہمک ہیں۔ وہ اِس پہلے تجرباتی شاعر کی باتوں پر گہرائی کے ساتھ غور کریں گے۔
توقع ہے کہ نثری مضامین کا مجموعہ بھی علٰحدہ صورت میں ہمیں جلد ہی مہیا ہو سکے گا تاکہ عظمت کے جوہرِ خداداد کو نقاد دونوں پہلوؤں سے دیکھ سکیں

"م"

ڈاک کے ڈاکو ادبی دنیا ہر ماہ کی ۵ تاریخ تک خریداروں کے پاس پہنچ جاتا ہے اگر اس تاریخ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقے کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں تاکہ پرچہ آپ کو دوبارہ بھیجا جائے اور ڈاکہ تمہارے دروازے پر ایک اور دستک دی جائے۔ مینیجر

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ مارچ سنہ ۴۱ء

جلد ۱۹ — نمبر ۳

تصویر: آنچہ من در بزم شوق آوردہ ام، دانی کہ چیست
یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خمخانہ مے

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا دہلی دروازہ لاہور سے شائع ہوا

ایک اور اشارہ

کتب خانہ ادبی دنیا نے وعدہ کیا تھا کہ وقتاً فوقتاً اچھی کتابوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے چھپی ہوئی کتابوں کی تازہ بتازہ فہرستیں ادبی دنیا میں شائع کی جائیں گی تاکہ ناظرین ادبی دنیا کو اپنے مقبول رسالے ہی کے ذریعے سے ہر قسم کی اچھی کتابیں بہ آسانی مہیا ہو سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے کی پہلی فہرست شائع ہو کر مقبول خاطر ہو چکی ہے۔ اس دفعہ کتب خانہ ان فہرستوں کی دوسری قسط آپ کے پیش نظر کر رہا ہے موجودہ فہرست میں التزاماً ہی کتابیں درج کی گئی ہیں جو خواتین اور بچوں کے لئے دلچسپ اور مفید ہو سکتی ہیں۔ حسب معمول اس انتخاب کی ضمانت بھی ادارۂ ادبی دنیا کا نام ہے۔

منیجر کتبخانہ ادبی دنیا لاہور

نام کتاب و مصنف	قیمت
خواتین کے لئے	
ناول اور افسانے	
عورتوں کے افسانے۔ کوثر چاندپوری	۸/عہ
تحفے اور دیگر افسانے۔ حجاب امتیاز علی	۸/عہ
خانم . . مرزا اعظیم بیگ چغتائی	للعہ
شریر بیوی ״	۸/عہ
شام زندگی راشد الخیری	عہ
شب زندگی دو حصے ״	عہ
ماہ عجم ״	۸/عہ
نوابین دوراج ״	۸/
لاشوں کا شہر۔ مسز عبدالقادر	۸/عہ
نرملا . . منشی پریم چند	۸/عہ
یوسف نجمہ۔ عبدالحلیم شرر	۸/عہ
بنات النعش۔ مولوی نذیر احمد مرحوم	۸/عہ
یاسمین . . مرزا محمد سعید	۸/عہ
نظم	
آئینۂ حرم۔ مخدومہ زخ ش کی نظمیں	۶/
شمع خاموش نظمیں	۶/
آئینۂ جمال ״	۱۲/

نام کتاب و مصنف	قیمت
صنعت اور خانہ داری	
گلدستۂ کردشیا۔ فاطمہ بیگم انور علی	۶
عصمتی کروشیا	۸/عہ
بیوی کی تعلیم۔ خواجہ حسن نظامی	۸/عہ
اولاد کی شادی	عہ
مشرقی اور مغربی کھانے	۶
مذاقیہ کھانے	۶/
متفرق	
محبت نامے۔ مترجمہ پروفیسر رام سروپ کوشل	۷/
ادب زریں۔ حجاب امتیاز علی	۸/
نغمات موت ״	۶/
بچوں کے لئے	
قصے کہانیاں	
ولایتی نٹھی۔ راشد الخیری	۶/
دادا لال بجھکڑ ״	۸/
بچوں کا انصاف (ڈراما)	۱۳/
مرغی اجمیر چلی۔ مخدومہ زینبہ ریحانہ	۶/
نبیوں کے قصے	۵/

نام کتاب و مصنف	قیمت
تاریخ ہند کی کہانیاں	
پہلا حصہ	۳/
دوسرا حصہ	۵/
تفریح اور معلومات	
تعلیمی کھیل	۳/
سمندر کا عجائب خانہ	۸/
ایورسٹ کی کہانی	۳/
نظمیں	
بچوں کی نظمیں	۴/
بچوں کے اسمٰعیل	
مرتبہ سعید انصاری پرنسپل مدرسہ جامعہ	۵/
بچوں کی رباعیاں	۱/
بچوں کا علاج۔ یہ کتاب طب کی بہترین اور نہایت سہل اور آسان دوایات کا مجموعہ ہے اس کا ہر گھر میں ہونا ضروری ہے قیمت مجلد سنہری ۶/ بے جلد	۴/
حکمت کے موتی (طب کے نایاب اور صحیح مجربات کا بہترین مجموعہ)	۱۲/
علاوہ ازیں ہر قسم کی کتابیں ملنے کا پتہ	

کتب خانہ ادبی دنیا۔ دی مال۔ لاہور

دنیائے کاروبار

چار بجے کی تھکان سے جنگ

دنیا کے بہتیرے ملکوں میں آج کل چار بجے سہ پہر کو کام کرنے والوں کو چائے پلانے کا عام دستور ہو گیا ہے۔ چار بجے چائے پینے کو جو عام مقبولیت ہو رہی ہے اس کی ایک تازہ ترین مثال یہ ہے کہ امریکہ میں خاص طور پہ ایک کمپنی کھولی گئی ہے جس کا نام "ٹی ٹائیم اینک" ہے۔ یہ کمپنی نیویارک میں بے شمار دفاتر میں چائے مہیا کرتی ہے۔

نیویارک کے جریدہ "اسپائس مل" کے مطابق پتہ چلتا ہے کہ "ٹی ٹائیم اینک" روزمرہ نئے نئے گاہک پیدا کر رہی ہے کمپنی کے نمایندہ کارخانہ داروں اور بڑے بڑے مالکان کمپنی کے پاس جاتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ان کے ملازمین کتنے ہی کام کرنے میں تیز اور ہوشیار ہوں مگر سہ پہر کو ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ان کے دن بھر کام کرنے کی وجہ سے ان میں کام کرنے کی اتنی تیزی نہیں رہتی اس تیزی کی کمی کو دور کرنے کا صرف ایک آسان اور کم خرچ علاج ہے۔ وہ تین روز بلا اجرت چائے تقسیم کرتے ہیں۔ عمدہ طریقے پہ تیار کی ہوئی چائے کی ایک پیالی کی ہر حالت میں جہاں کہیں بھی اس کی آزمائش کی گئی تو یہی پایا گیا کہ کام کرنے والوں میں تیزی اور پھرتی بڑھ گئی جس سے کام کی مقدار میں کافی اضافہ ہونے لگا۔ غلطیوں اور بے کاری میں کمی آ گئی۔

ہندوستان میں بھی انڈین ٹی مارکیٹ ایکسپنشن بورڈ کی کوششوں کی وجہ سے بہت سے مالکان کارخانہ دار اس بات کا اعتراف کر رہے ہیں کہ ان کے ملازمین کو چار بجے چائے پلانا مفید ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ آئی۔ ٹی۔ ایم۔ ای۔ بی نے کلکتہ بمبئی۔ کوئمبٹور کا علاقہ جو جنوبی ہندوستان میں ہے۔ ان کارخانوں کے اندر چائے کو رواج دینے میں بہت حد تک کامیابی حاصل کر لی ہے۔ ان تینوں علاقوں میں بورڈ نے اس وقت تک ۲۵ چائے خانے کھول دیئے ہیں اور ان کو فروغ دے کر کارخانوں کے سپرد کر دئیے ہیں۔ دیگر ۲۶ کارخانوں میں بھی آزمائش کی جا رہی ہے۔ یہ کام بورڈ کے ان کارکنوں کے ہاتھ میں ہے جو خاص طور پر اس کام کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔

ہندوستانی کارخانوں میں اس طرح کے چائے خانوں کا جاری ہونا ایک بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آج کل جب کہ تمام کارخانوں میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس حالت میں تھکان رفع کرنے کا مسئلہ مالکان کارخانہ کی توجہ حاصل کر رہا ہے۔ کام کرنے والوں کی حالت کو درست کرنے سے عمدہ اور اچھا کام کر سکتا ہے۔ اس سے بڑھ کر بھلا اور کم خرچ طریقہ کیا ہو سکتا کہ کام کرنے والوں کے لئے چائے کا انتظام کر دیا جائے +

اورنٹیل کی بیسویں سہ سالہ رپورٹ

اورنٹیل گورنمنٹ سیکیورٹی لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ کی بیسویں سہ سالہ رپورٹ ہمارے پیش نظر ہے اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس عظیم الشان کمپنی نے زیر نظر تین سالوں (۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء) کے دوران میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اس عرصے میں ۱۴۸۵۸۱ اسی پالیسیاں جاری کی گئیں جن کی مجموعی مالیت ۲۷،۴۸۸۹۸۳ روپے تھی اور اُن سے سالانہ آمدنی ۵۳،۵۳۸۶۰ روپے ہوئی۔ ان اعداد کے مقابلے میں ۲۷-۱۹۲۵ء کی سہ سالہ مدت میں ۵۲۳۳۴ پالیسیاں جاری کی گئی تھیں جن کی مجموعی مالیت ۱۱۵۵۸۶۳۸۷ تھی اور اُن کی سالانہ آمدنی ۶۶،۶۷۷۵ تھی۔ گویا بارہ سال کے عرصے میں کمپنی کی پالیسیاں تقریباً تین گنا ان کی مالیت قریباً اڑھائی گنا اور سالانہ آمدنی قریباً ساڑھے تین گنا ہو گئی۔

یہ اعداد و شمار اپنی جگہ آپ کمپنی کی حیرت انگیز مقبولیت، مضبوطی اور فائدہ رسانی کے ناقابلِ تردید ثبوت ہیں۔

دنیائے فلم

راج نرتکی

"کم کم رقاصہ" کو دیکھ کر لوگوں نے مادھو بوس اور اس کے رفقائے کار کے متعلق جو اندازہ لگایا تھا اس کی تصدیق "راج نرتکی" میں بکمال حسن وخوبی ہو رہی ہے۔ گذشتہ ماہ انہیں صفحات میں لاہور کے مشہور سینما رٹز میں "راج نرتکی" کی آمد کی خبر آپ تک پہنچ چکی ہے۔ اور آج یہ اعلان بھی کچھ کم مسرت انگیز نہیں ہے کہ تین ہفتوں سے وادیا مودی ٹون کا یہ کھیل تماشائیوں سے خراج تحسین حاصل کر رہا ہے۔ سادھنا بوس نے اپنے رقص کے کمال کو "کم کم رقاصہ" سے کہیں بڑھ کر بلندی پر پہنچایا ہے۔ اور اس کے بالمقابل پرتھوی راج نے درباری رقاصہ کی محبت میں ڈوبے ہوئے شہزادے کا کام اپنی روایتی چابکدستی سے دکھایا ہے دلکش کہانی اور دلکش اداکاروں کے پہلو بہ پہلو ایک اور چیز بھی اس کھیل میں خصوصاً جاذب توجہ ہے اور وہ اس کا صاف ستھرا سلیس مکالمہ ہے ہم جہاں مادھو بوس کو ہدایت کاری کے لئے اور اداکاروں کو ان کے کام کے لئے سراہتے ہیں وہاں مکالمے کے لئے جناب وحید الدین احمد کی تعریف کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے امید ہے کہ اچھی فلموں کے شائق جوق درجوق اس کھیل کو عملی خراج تحسین پیش کریں گے۔

الٹی گنگا

ملک کی مشہور فلم کمپنی مسرز وادیا مودی ٹون نے اس نام سے ایک مذاحیہ سماجی کھیل تیار کیا ہے۔ یہ کھیل تخیلی تخلیق کے لحاظ سے ایک خاص حیثیت رکھتا ہے آج کل مغرب میں تو عورتوں کے اقتدار سے جو الجھنیں روزمرہ زندگی میں پیدا ہو گئی تھی انہیں وہاں کے باشندوں نے کسی حد تک باقاعدہ کر لیا ہے لیکن ہندوستان میں یہ مسئلہ ابھی اپنی ابتدائی منزلوں پر ہے۔ اس کھیل میں اس سماجی مسئلے پر کہانی کی صورت میں بحث کی گئی ہے کہ کیا عورت کی جگہ صرف گھر میں ہے یا وہ مرد کے پہلو بہ پہلو زندگی کے دوسرے کاموں میں بھی حصہ لے سکتی ہے۔ قدیم کہانیوں میں استری راج کی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ کھیل بھی اسی طرح کے ایک شہر کی کہانی ہے جہاں سماج کا تختہ الٹ جاتا ہے عورتیں مردوں کے کام شروع کر دیتی ہیں اور مردوں کو گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر کھانا پکانا اور بال بچوں کو پالنا پوسنا پڑتا ہے کھیل میں غالباً اس نئی صورت حال کا حل یہی نکالا گیا ہے کہ عورت گھر اور مرد گھر سے باہر کے کاموں کے لئے موزوں ہے اور یہی قدرت کا فیصلہ ہے لیکن اس حل کے باوجود یہ مسئلہ متنازعہ فیہ رہتا ہے۔ بہرحال جہاں تک کھیل کا تعلق ہے یہ ایک دلچسپ خیال افروز اور قابل دید چیز ہے۔

اس سے پیشتر مسرز وادیا فلم کمپنی سنجیدہ چیزیں ہی تیار کرتی رہی ہے یہ اُن کا پہلا خالص مذاقیہ کھیل ہے اور اس میں پرمیلا، صادق علی، پرلیش بینرجی، گلاب، ایرچ تاراپور اور برج رانی وغیرہ اداکاروں نے اپنا اپنا کام محنت سے کیا ہے۔

سوبھاگیہ

بمبئی ٹاکیز کے تازہ ترین کھیل "پنر ملن" کی ہیروئن سنیہ پربھا پردھان اپنے ایک ہی پارٹ سے تمام ہندوستان کے تماشائیوں کی نظروں میں آگئی ہے "سوبھاگیہ" اُس کا آئندہ کھیل ہے، اور اس کے ساتھ ہیرو کا کام پریم ادیب نے کیا ہے۔ سوبھاگیہ بھی ہندوستان کے عام کھیلوں کی طرح ایک سماجی کھیل ہے اور اس لحاظ سے بھی تماشائیوں کے دیکھنے کی چیز ہے کہ "پنر ملن" کی رقاصہ اس میں کہاں تک اپنی پہلی دلکشی کو قائم رکھتی ہے

"ہرجائی"

(بقیہ دنیائے کاروبار)

پرل کلوریم

ڈاکٹر این آر صاحب شرما اور ان کی ایجاد کردہ آنکھوں کی دوائی پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ ناظرین اندرین بارہ سمجھتے۔ پرنتو ڈاکٹر صاحب کی جانب سے اعلان شائع ہوا ہے پڑھ کر تعجب کریں گے کہ کس طرح ہمارے ہی بھائی ایک اصل چیز کو نقل کی شکل میں لاکر اول تو نقلی شے سے لوگوں کو دھوکہ دے کر محروم کرتے ہیں۔ دوم کسی کی پرورش اور مہربانی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں نے جھوٹے اشتہار نکال نکال کر کاروبار کو بدنام کر رکھا ہے۔ پرل کلوریم آئی ڈراپ وقت حاضرہ کی ایک بہترین ایجاد ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب نے یہی ایجاد کر کے بھارت پر ایک بھاری احسان کیا ہے لیکن نقالوں کو چاہئے کہ ایک بہترین چیز کی نقل کرنے کی بجائے وہ اپنی روزی کمانے کے لئے کوئی نیک راستہ اختیار کریں اور اس سے وہ پبلک کو دھوکا نہ دیں۔

دس ہزار روپیہ مفت انعام

10000

دو روپیہ تولہ سونا — کہاں؟

پنجاب میں

ہماری کمپنی نے اپنی سالگرہ کی خوشی میں تین روپیہ تولہ والا سونا دو روپیہ تولہ کر دیا ہے جلد کیجیے اور فائدہ اٹھائیے

ناظرین! دیکھیے اس سونے کے متعلق دنیا کیا کہتی ہے جبکہ گھر میں امریکن نیو گولڈ گیا۔ وہاں سے دوبارہ سہ بارہ فرمائش آئی۔ یہ سونا ایک لاجواب چیز ہے اصلی سونے اور اس سونے میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا جناب وِدیا رتن صاحب میونسپل کمشنر پٹھان کوٹ سے ۲۵۔ نومبر کو تحریر فرماتے ہیں کہ آپ کا امریکن نیو گولڈ کا پارسل ملا۔ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ امریکن نیو گولڈ اور اصلی سونے میں کوئی فرق نہیں۔ آپ نے اس نئی چیز کو تیار کر کے دنیا کی بہت سی ضروریات کو پورا کر دکھایا ہے۔ چھ تولہ سونا فوراً میرے دوست کے نام ارسال کر دیں۔ اس کے بعد آپ کو اور بھی آرڈر دیا جائے گا۔ یہ سونا کسوٹی پر اصلی سونے کا رنگ دیتا ہے۔ اصلی سونے کی طرح کوٹا اور پگھلایا جا سکتا ہے۔ بالکل اصلی سونے کی برابر ہے۔ ہوشیار سے ہوشیار صراف اور جوہری بھی اس کی مشکل سے پہچان کر سکتا ہے۔ اس کے بنے ہوئے زیورات ہر جگہ پسند کیے جا رہے ہیں۔ اس سے ہر قسم کے زیورات آج کل کے فیشن کے مطابق تیار ہو سکتے ہیں۔ مندرجہ بالا فرمائش کو غلط ثابت کرنے والے کو دس ہزار روپیہ نقد انعام دیا جائیگا

قیمت صرف مشہوری کی خاطر ایک تولہ دو روپے۔ تین تولہ پانچ روپے چھ تولہ نو روپے۔ چالیس تولہ پچاس روپے۔ بنے ہوئے زیورات کی قیمت:۔ کانٹے امرفی جوڑی۔ نگ دار انگوٹھی۔ تین روپیہ۔ سادہ انگوٹھی دو روپیہ۔ چوڑیاں فی جوڑہ دو روپے۔ کانٹے چکہ والے فی جوڑی تین روپے ہار ۵ تولہ -/12/8۔ کڑے تین تولہ -/7/8۔ دست بند ہر جوڑی۔ لاکٹ جالی دار جوڑی پانچ روپے جوڑا۔ ضروری نوٹ:۔ ہر تین تولہ کے خریدار کو پیکنگ خرچ معاف اور ۶ تولہ یا اس سے زیادہ کے خریدار کو پیکنگ کے علاوہ محصول ڈاک دونوں معاف۔ چالیس تولہ کے خریدار کو پیکنگ و ڈاک خرچ معاف کے علاوہ ایک عدد اصلی گھڑی بالکل ٹھیک وقت دینے والی چابی ۲۴ گھنٹہ۔ گارنٹی ۱۰ سال مفت بطور انعام دی جاتی ہے جو پسند نہ ہو اگر پسند نہ ہو تو قیمت واپس ہو جائیگی۔ جلدی منگوائیں۔ ورنہ ختم ہونے پر مایوس ہونا پڑے گا۔ سول ایجنٹ

امریکن کارپوریشن (A.D.L) کے۔ سی۔ امرتسر

پچاس ہزار روپیہ کی گھڑیاں بالکل مفت

50000/-

ہماری فارمیسی نے اپنی بے نظیر چمتکاری دوائیوں کی مشہوری کے لئے ایک عدد فینسی رسٹ واچ مفت دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جلدی کیجیے اور فائدہ اٹھائیے۔

بال عمر بھر نہیں اُگتے } ہماری مشہور دوائی جوہر حسن اصلی رجسٹرڈ کے استعمال سے ہر جگہ کے بال بغیر کسی تکلیف کے دور ہو جاتے ہیں اور پھر زندگی بھر اس جگہ بال کبھی پیدا نہیں ہوتے بلکہ ریشم کی طرح ملائم۔ نرم اور خوب صورت نکل آتی ہے۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ پندرہ آنے۔ ڈاک خرچ الگ ہر ایک شیشی کے خریدار کو ایک فینسی رسٹ واچ **مفت** انعام میں دی جاتی ہے۔ جس کی خوب صورتی اور مضبوطی کی گارنٹی **۱۰ سال** ہے۔ گارنٹی کا اقرار نامہ ہر گھڑی کے ساتھ بھیجا جاتا ہے

کالا تیل رجسٹرڈ } یہ بار بار لگانے والا تیل نہیں۔ ایک آزمودہ چمتکاری تیل ہے معمولی تیلوں کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس کی خوبی یہ ہے کہ اس کے استعمال کرنے والے دنگ رہ گئے ہیں۔ اس سے سفید بال ایک دم کالے ہو جاتے ہیں اور پھر ہمیشہ کالے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے پوجیہ سوامی جی کی ایک ایجاد ہے جو دماغ کو ہر طرح کی طاقت پہنچاتا ہے۔ آنکھوں کی روشنی بڑھ جاتی ہے اور سر کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ گویا بالوں کی خوراک ہے **قیمت** فی شیشی ایک روپیہ پندرہ آنے۔ ڈاک خرچ الگ ہر ایک شیشی کے خریدار کو ایک فینسی رسٹ واچ **مفت** انعام میں دی جاتی ہے جس کی خوب صورتی اور مضبوطی کی گارنٹی **۱۰ سال** ہے گارنٹی کا اقرار نامہ ہر گھڑی کے ساتھ بھیجا جاتا ہے۔

کالے بھی گورے کر دکھائے } اگر آپ کے شریر اور منہ کا رنگ کالا پڑ گیا ہے تو اس دوا کا استعمال کیجیے۔ اس سے چہرے کی چھائیاں کالے داغ کیل پھنسیاں چیچک کے داغ مٹ کر چہرے کا رنگ پھول کی طرح نکھر آتا ہے ہماری **پیرین پوڈر** ایک آزمودہ دوائی ہے جو شرطیہ شریر کا رنگ پلٹ کر دکھا دیتی ہے **قیمت** فی شیشی ایک روپیہ پندرہ آنہ ڈاک خرچ الگ ہر ایک شیشی کے خریدار کو ایک فینسی **رسٹ واچ مفت** انعام میں دی جاتی ہے جسکی خوبصورتی اور مضبوطی کی **گارنٹی ۱۰ سال** ہے۔ گارنٹی کا اقرار نامہ ہر گھڑی کے ساتھ بھیجا جاتا ہے۔

نوٹ) ایک ساتھ تین شیشی منگوانے والے کو تین گھڑیاں مفت اور ڈاک خرچ معاف۔

قیمت پانچ روپے۔ مال ناپسند ہونے پر قیمت واپس دی جاتی ہے۔ ملنے کا پتہ :-

سنیاسی آیورویدک فارمیسی (A.D.L) کے۔ سی۔ امرتسر

روز مرّہ کا ایک ضروری واقعہ

بال بچوں کی تندرستی کے لئے چائے

جس وقت آپ کا شوہر اپنے کام سے اور آپ کے لڑکے اِسکول سے واپس آئیں۔ اُس لمحہ آپ کو چائے بنانے میں مصروف ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ اِس طرح آپ اپنے گھر میں روزانہ چائے کی مجلس قائم کرتے ہیں۔ جو کہ گھریلو خوشی کی اِنتہا ہے۔ آپ یقین کیجئے کہ یہ خوش کن واقعہ جس طرح آپ کے گھر میں ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے گھروں میں بھی ہوتا ہے۔

آؤ ہم ہندوستانی چائے پئیں

چائے کس طرح تیار کرنی چاہیئے۔ تازہ پانی اُبال لیجئے۔ اور پھر ایک صاف برتن کو ذرا گرم کرکے اس میں ہر شخص کے لئے ایک ایک چمچہ ہندوستانی چائے کا ڈال دیجئے اور ایک چمچہ فالتو ڈال لیجئے۔ جونہیں پانی اُبلنے لگے اس کو چائے والے برتن میں ڈال دیجئے۔ اور پانچ منٹ تک ڈھکا رہنے دیجئے۔ بعدازاں دودھ اور کھانڈ ملا کر پیالیوں میں ڈال کر استعمال کیجئے۔

آنچہ من در بزمِ شوق آوردہ ام، دانی کہ چیست!
یک چمن گُل، یک نیستاں نالہ، یک خمخانہ مَے

بزم ادب

سالنامے کے لئے جن مضامین کا انتخاب ہوا تھا اُن میں سے ابوالفضل صاحب صدیقی اور علی عباس صاحب جلال پوری کے دل آویز افسانے اس شمارے کی زینت ہیں۔ دیوندر ستیارتھی صاحب کا ایک ہلکا پھلکا مضمون جنگلی کبوتر بھی اسی قبیل سے ہے ـــ اور حقیقت تو یہ ہے سالنامے کی فضا اب تک ہمارے اوراق پر چھار ہی ہے۔ دماغ سے اس رنگین صحبت کا خمار اب تک دور نہیں ہوا۔ صحائف میں سے معزز ہمعصر ساقی اور روزنامہ احسان نے سالنامے کا ذکر نہایت حوصلہ افزا الفاظ میں کیا ہے۔ شاہد احمد صاحب دہلوی مدیر ساقی ہمیشہ سے ہم پر بہت زیادہ مہربانی فرماتے ہیں۔ ہم حقیقتاً اپنے آپ میں وہ اہلیتیں نہیں پاتے جو شاہد صاحب کی نگاہ دوست نواز ہم میں دیکھتی ہے۔ مگر اُن کا خلوص اس قدر شدید ہے کہ ہمیں ڈر ہے کہ کسی دن ہم اپنی نسبت ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

احباب میں سے جن اصحاب کی آراء اب تک موصول ہوئی ہیں۔ امید ہے کہ اگلے نمبر میں ہم انہیں ناظرین تک پہنچا سکیں گے۔ مگر ایک بات ایسی ہے جسے ہم زیادہ دیر تک نہیں چھپا سکتے۔ اور وہ حسن عسکری صاحب کے افسانے "حرامجادی" کی عالمگیر مقبولیت ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر ایک خوش آئند حیرت ہوتی ہے کہ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ حقیقی ترقی یافتہ ادب کو خوش آمدید کہنے میں کسی غیر زبان کے جاننے والوں سے پیچھے نہیں ہے۔ اگر ہمارا مذاق یونہی نکھرتا رہا تو وہ دن دُور نہیں جب ہماری زبان بین الاقوامی ادبیات میں ایک ممتاز حیثیت اختیار کرے گی۔ یہ افسانہ ہندی کے علاوہ پنجابی کے ایک مقتدر رسالے میں بھی چھپ رہا ہے۔

زیر نظر نمبر کے افسانوں میں بے روزگار ہمارے نوجوان افسانہ نگار سیّد علی عباس جلال پوری کے حسنِ تخیّل اور خوبی بیان کا ایک لطیف امتزاج ہے۔ جب میں نے عباس صاحب کا یہ افسانہ پڑھا تو مجھے محترمہ عصمت چغتائی کا ایک اسی طرز کا افسانہ یاد آ گیا جو ان کے تازہ مجموعے میں چھپ رہا ہے لیکن شاید کسی مجلّے میں اب تک شائع نہیں ہوا۔ مگر یہ ایک راز کی بات تھی قلم سے بے ساختہ نکل گئی بہر حال . . . . .

سماج کا تشکار اردو کے ایک کہنہ مشق اور صاحب طرز ادیب جناب ابوالفضل صدیقی کے قلم کا رہین ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ صدیقی صاحب نے اپنے موضوع کا نہایت کاوش سے مطالعہ کیا ہے۔ اور زندگی کی جو حقیقتیں مشاہدے میں آئی ہیں انہوں نے انہیں حفاظت سے اپنے ذہن میں محفوظ رکھا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج یہ دل آویز افسانہ آپ کے سامنے ہے۔ ہمارے ہاں اب ایسے افسانوں کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے جن میں پلاٹ سب سے بڑا اور اہم عنصر ہوتا ہے اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آج کل کی معاشرتی کش مکش کے باعث زندگیوں میں ایک یکسانیت اور میکانکیت پیدا ہو چکی ہے جو کسی پلاٹ کو پھولنے پھلنے کا موقعہ نہیں دیتی۔ اسی لئے نفسیاتی افسانے نسبتاً زیادہ مقبول ہو رہے ہیں مگر ابوالفضل صاحب نے سماج کا تشکار لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ اگر مشاہدے میں گہرائی اور بیان میں خلوص ہو تو منصوبہ دار افسانہ آج بھی اپنی جگہ پر تن کر کھڑا ہو سکتا ہے۔

دیوندر ستیارتھی صاحب بڑی مدت کے بعد ہماری بزم میں تشریف لائے ہیں۔ اس عرصہ میں دیہاتی گیتوں کی ان تھک جستجو اور فراہمی ان کا محبوب مشغلہ رہی ہے اور وہ پڑھے لکھے حلقوں میں اپنی اس ثمر ور محنت کے باعث بہت نام پیدا کر چکے ہیں۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے انمول خزانے میں سے موتیوں کی لڑیاں نکال نکال کر ایک مرکزی نگینے کے گرد پرونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان کا موجودہ مضمون ان کی اس فن کاری کی ایک تازہ دلیل ہے۔ جنگلی کبوتر ایک پھڑ پھڑاتا ہوا موضوع ہے جس کے گرد پنجابی دیہات کے سہانے گیت گھوم رہے ہیں جیسے کنھیا کے گرد گوپیاں۔

ہمیں امید ہے کہ آئندہ نمبروں میں ہم ستیارتھی صاحب کے اور دلکش مطالعے بھی پیش کر سکیں گے۔

صلاح الدین احمد

～～～～～

(۲)

سالنامے کا اثر ابھی ختم نہیں ہوا، جاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ موجودہ شمارے میں بھی کچھ نظمیں ایسی شامل ہیں جنہیں مجبوراً روکنا پڑا تھا اگر چہ وہ مجبوری اب حسنِ اتفاق میں بدل چکی ہے۔ اور سالنامے کی خوشگوار صحبت کے تاثر کو ہر ماہ

بڑھائے لئے جاری ہے۔

مشہور بات ہے کہ زخم ہرا ہو جاتا ہے۔ لیکن داغ باقی رہتا ہے ــ ــ اسی کہاوت کی روشنی میں اگرچہ حاکم محکوم، زبردست اور زیر دست کی باہمی کش مکش کا زخم انسانی ترقی کے نئے رجحان یعنی مساوات کے اصولوں کی حمایت کے تحت ہرا ہو رہا ہے پھر بھی آج قائم رہ جانے والے داغ کے آثار ہمیں نظر آسکتے ہیں بلکہ سچ سنئے تو یہ داغ ابھی زخم ہی ہے، صدیوں سے انسان انسان پر ظلم کرتا آیا ہے لیکن ہندوستانی اچھوت اس ظلم کا مثالی مجسمہ ہے۔ مجید امجد کی نظم "خدا" کا یہی موضوع ہے جس میں اُس تلخی کو شاعرانہ انداز میں نمایاں کیا گیا ہے جو ہمارے دل میں اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم غور کرتے ہیں کہ انسان نے صرف جسمانی طور پر اپنے ہی بھائیوں کو دبا رکھا ہے بلکہ ذہنی طور پر بھی۔ اس نظم میں چھوت ماں کی زبان سے جس قدر لطیف طنز کی گئی ہے وہ (فاعتبروا یا اولی الابصار) کہنے پر اکساتی ہے، انسان کا ظلم اپنے پسماندہ بھائیوں کو اس لفظی تسلی پر مجبور کرتا ہے کہ وہ خدا کا تصور بھی علٰحدہ ہی قائم کریں۔ گویا اگر وہ اچھوت ہیں تو اُن کا خدا بھی نام نہاد برتر ذاتوں کے لئے اچھوت خدا ہی بن کر رہ جاتا ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے بھی اس نظم کا ایک پہلو توجہ کے لائق ہے مسلسل ظلم سہتے ہوئے انسان کی فطرت ہی بدل جاتی ہے اور وہ خوشی کو بھول کر اذیت ہی میں لطف لینے لگتا ہے اس نظم کے آخری حصے میں اُن ناخوشگوار تصورات کی موجودگی اسی اذیت پرستی کو ظاہر کر رہی ہے جسے بعض لوگ شاید جذبۂ انتقام ہی کا مرہون سمجھیں،

"امرت پرچھائیں" جدید مختصر مثنوی کی مثال ہے۔ اور موضوع کی بنیاد اگرچہ پرانے اخلاقی اعتقادات پر رکھی گئی ہے۔ پھر بھی احمد پوری کا سادہ لیکن مؤثر انداز بیان ایک دلکشی لئے ہوئے ہے۔

جاں نثار اختر غالباً پہلی مرتبہ "ادبی دنیا" کی محفل میں آیا ہے لیکن اُس کی آمد سخن فہم حضرات کو یک نظر اپنی طرف متوجہ کر سکتی ہے۔ اُس کی نظم "سوال" میں سیاسی اور جنسی رجحانات کی آمیزش ہے۔ دنیا کے اکثر ممالک وطن کے تصور کو مادرِ وطن کے استعارے میں دیکھتے ہیں، اور اس استعارے کی تخلیق دھرتی ماتا ہی سے ہوئی ہے۔ لیکن "سوال" کا شاعر مادرِ وطن، آزادی اور بعض دوسرے تصورات کو ایک دوسرے میں جس گھلی ملی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ وہ ہمارے ملک کے نوجوانوں کی ذہنی کیفیت کا ایک اچھا عکس ہے۔ شاید یہ تصورات کی بنیادی آمیزش ہی اُسے اس استفسار پر مجبور کر رہی ہے کہ "تو کون ہے"!

"آغا صہبائی" "نذرِ محبوب" میں انگریزی شاعری کے اثرات کو ظاہر کر رہا ہے اگرچہ اُس کے خیال میں دوشیزگی کی کمی ہے لیکن اُس کی سادگی جذبات اور کیفیت کا انہماک ہمیں یہ محسوس کراتا ہے کہ اس خیال سے ہمارے ذہن کا پہلا آمنا سامنا ہے۔

"مندر میں" ـــــ اس نظم کا شاعر پوجا کے احساس میں کھویا ہوا ہے۔ اور اُس کی یہ گمشدگی حسِ سماعت کی مرہون ہے۔ ذہن کی تمام قوت مغنی کے میٹھے بول پر مرکوز ہے لیکن رفتہ رفتہ پہلے اُس کے مادی گردوپیش نمودار ہوتے اور پھر اُس کا ذہنی ماحول جس کو تلازمِ خیال ماضی کی روایات کی طرف لے جاتا ہے۔

میراجی

اس دفعہ کی تصویر

عنوان غالب کا ایک شعر ہے ؎

آنچہ من در بزمِ شوق آوردہ ام، دانی کہ چیست
یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خمخانہ مے

عنوان اور تصویر کے تعلق کی بنیاد تشبیہات پر ہے۔ تصویر میں آنکھیں، ہونٹ اور ہاتھوں کی انگلیاں نمایاں ہیں۔ چمن گل (ہونٹ) اور خمخانہ مے (آنکھیں) مانوس تشبیہیں ہیں۔ میر تقی کے دو شعر اس کی دلیل ہیں۔ کیفیت اُس کے لب کی کیا کہئے یہ پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے اور میر ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے۔ لیکن نیستاں نالہ میں نالے کا مفہوم آوازوں کی اُس ہم آہنگی تک تو صحیح ہے جس کی نمود ساز سے ہو رہی ہے۔ اور نیستاں بھی باجے کے پردوں تک درست لیکن کیا نیستاں کو انگلیوں سے بھی ایک لطیف نسبت نہیں ہے، کیونکہ اگر پردوں سے آواز نکلتی ہے تو انگلیاں ہی اس عمل کی تکمیل کا باعث ہوتی ہیں ـــ چہرہ پیشکش کا مفہوم بھی دے رہا ہے اور اس لئے عنوان کا شعر خارجی نہیں بلکہ داخلی حیثیت رکھتا ہے۔

"م"

آئینۂ عالم

روس کی خارجی حکمت عملی

جغرافیہ، تاریخ اور معاشیات کا کسی ملک کی خارجی یا بیرونی سیاست کے بنانے میں بہت دخل ہے۔ سائنور مسولینی کے نزدیک کسی ملک کی سیاستِ بیرونی انہی تین باتوں پر ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ ملک کی اندرونی سیاست کے بدلنے سے اس کی بیرونی سیاست پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ نظریہ روس کی بیرونی سیاست کے پیشِ نظر بالکل صحیح نظر آتا ہے۔

جغرافیائی حیثیت سے روسی حکومت کی ابتدا ایک وسیع میدانی خطے سے ہوئی۔ اس سلطنت کے چاروں طرف میدان تھا، نہ تو اس کو ہمالیہ جیسے پہاڑ نصیب تھے کہ اس کا بیرونی حملہ آوروں کے خلاف قدرتاً بچاؤ کرتے، اور نہ اس کو بحرِ ہند سا وسیع سمندر ملا، جو اس کی سرحد کو دوسروں کی دست برد سے محفوظ کر دیتا، ان حالات کے ہوتے ہوئے روس کی بیرونی سیاست کے دو اصول بن گئے اول ہمسایوں پر بے اعتمادی اور شبہ دوم بچاؤ کا ایسا نظریہ جس کے پیشِ نظر روس کی سرحدوں کی توسیع اور پھیلاؤ تھا یوں روس کی بیرونی سیاست ہمیشہ اسی دائرے میں چلتی رہی اور اب بھی اسی مدار پر چل رہی ہے۔

روس کی بنیادی سیاست میں انقلاب نے بھی کوئی تبدیلی پیدا نہ کی، بلکہ اس طرزِ فکر کو اور زیادہ مضبوط کر دیا، جس پر مدت سے روس کی بیرونی سیاست چل رہی تھی۔ انقلاب کے تھوڑا عرصہ بعد روس کی قدیم یا پرانی سیاست اس لئے اُبھر آئی، کہ اول مارکسی منطق محض لوگوں میں پرانی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لئے استعمال کی گئی تھی، دوسرے روس کے انقلاب پسندوں کا یہ خواب پورا نہ ہوا کہ تمام دنیا میں سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کا تختہ الٹ دیا جائے گا۔ روس کی حکومت اپنے نئے اشتراکی نظامِ حکومت کے لحاظ سے اردگرد کی سرمایہ دار حکومتوں کے لئے ایک پستول کی حیثیت رکھتی تھی، اس لئے ہمسایوں پر بے اعتمادی کا جذبہ پھر لوٹ آیا، روس کو ہر ایک حکومت سے خوف دامنگیر تھا۔ روس کے انقلاب کی ناکامی کا باعث یہ تھا کہ باقی دنیا انقلاب اور سیاسی اُلٹ پھیر سے ناواقف تھی۔ اس لئے روس کی پرانی سیاست پھر لوٹ آئی۔ روس اپنے آپ کو اردگرد کی "ظالم اور سامراج" طاقتوں میں اکیلا عدل اور انصاف کا علمبردار یقین کرتا، اور تمام سلطنتوں کو شکست اور شبہ کی نظروں سے دیکھتا تھا۔

انقلاب اور افراتفری کے بعد روسی سیاست دانوں کا پہلا کام جرمنی سے صلح تھا، چنانچہ برسٹ لٹوسک کے مقام پر جرمنی اور روس کے درمیان صلح ہو گئی۔ انتہا پسند جرمنوں کی رائے یہ تھی، کہ روس کو جرمنی کے پھیلاؤ کے لئے ایک نوآبادی کی حیثیت میں استعمال کیا جائے، اعتدال پسندوں کی رائے یہ تھی، کہ روس کو ایک دوست اور حلیف قرار دے کر اس کے مالی اور زرعی وسائل سے فائدہ اٹھایا جائے، مگر اس وقت انتہا پسندوں کو فتح ہوئی اور جرمنی نے روس کا بہت سا علاقہ اپنے قبضے میں لے لیا۔

معاہدہ وارسائی نے برسٹ لٹوسک کے معاہدے کو ختم کر دیا اور روس کے اردگرد چھوٹی چھوٹی سرمایہ دار حکومتوں کا ایک حلقہ پیدا ہو گیا جو اس کے پھیلاؤ کے لئے ایک بند کا کام دیتا تھا اس دور میں روس کی بیرونی سیاست پرانے اور نئے سیاسی رجحانات کا عجیب و غریب اتحاد تھی۔ بغاوت کو ٹراٹسکی کی فوجوں نے دبا دیا، روس کے سیاست دانوں کا خیال تھا کہ روس کا بچاؤ دنیا میں انقلاب کے پھیلنے پر ہے، اس لئے کومنٹرن کی اہمیت بڑھ گئی۔ انقلاب کے ابتدائی سالوں میں روس کو یہ مشکل درپیش تھی کہ، قومی مفاد اور انقلاب کی عالمگیر اسپرٹ میں اختلاف کو کیسے کم کیا جائے؟ لینن نے گو اجازت دی کہ، ہر فرقہ اپنی مرضی سے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہے۔ مگر اس سے مشکل کے سارے پہلو حل نہیں ہو سکتے تھے۔ چار سالہ کشت و خون کے بعد روس اگرچہ تباہی سے بچ گیا، مگر اس کے جوڑ بند ڈھیلے ہو چکے تھے۔ پرانے

زلزلے کی طرح اس کو دشمنوں کی اور بین الاقوامی تجارت کو ایک بار پھر زندہ کرنے کی ضرورت تھی روس کا انقلاب اب ناکام ہو چکا تھا، کیونکہ روس کی صنعتی زندگی کو ایک ایسی دنیا سے یارانہ گانٹھنے کی ضرورت تھی جس کو انقلاب سے کوئی دلچسپی اور لگاؤ نہ تھا روس کے اندرونی نظم و نسق میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور روس نے انگلستان اور دوسری کئی حکومتوں سے تعلقات قائم کر لئے۔

روس کے سامنے اب اہم سوال یہ تھا، کہ عالمگیر انقلاب کی ناکامی اور قومی بچاؤ کو کیونکر ایک دوسرے کی ضرورتوں کے مطابق ڈھالا جائے سٹالین کو جو لینن کے بعد روس کی قسمت کا مالک بنا، عالمگیر خیالات سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ ایک معمولی درجے کا سوچنے والا ذہن رکھتا ہے، گو نظم و نسق دفتری کاروبار اور سیاست دانی میں اس کا درجہ بہت اونچا ہے۔ اس کے نزدیک اہم مسئلہ یہ تھا، کہ جب ایک بار طاقت بالشویکوں کے ہاتھ آگئی، تو اس کو کیسے استعمال کیا جائے، اس کو اس سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ کہ دوسرے مقامات پر طاقت کو کیسے حاصل کیا جائے۔ اس کے سامنے ایک ملک میں اشتراکیت کے قائم رکھنے کا خیال تھا۔ اس نے عالمگیر انقلاب کے حامیوں مثلاً ٹراٹسکی۔ زینولیف کیمنیف کو دربدر کر دیا۔ کومنٹرن نظر انداز کر دی گئی۔ دوسرے ممالک میں اشتراکیوں کی کوئی انقلابی اہمیت نہ رہی، گویہ لوگ روسی انقلاب کے غیر شعوری ترجمان تھے۔

۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۹ء تک کا زمانہ دور امن کہلا سکتا ہے، یہ لیگ آف نیشنز کی زندگی کا سب سے کامیاب دور تھا۔ جاپان نے اس دور میں لیگ سے ہمیشہ دوستی کی۔ امریکہ نے مسٹر کیلاگ کے ذریعہ جنگ کو باعثِ نفرین قرار دیا۔ اس زمانے میں روس کو کسی ملک سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ روس کی مرضی یہ تھی، کہ اپنے صنعتی پروگرام کو مغرب کی ترقی یافتہ قوموں سے میل جول کر کے پورا کرے۔ اس کے لئے بہترین پالیسی یہ تھی کہ دوسرے ملکوں کے اندرونی نظم و نسق سے الگ تھلگ رہ کر ہر ایک ملک سے دوستانہ میل جول پیدا کرے۔ چنانچہ جرمنی میں ویمر ریپبلک کے قیام سے، نیز اعتدال پسندوں کے عروج سے روس اور جرمنی میں دوستی اور ہمکاری بڑھنے لگی۔ اس وقت روس کی بیرونی سیاست تجارتی لین دین اور غیر ملکی قرضوں تک محدود رہی تھی۔

روس کی خواہش اس دوران میں امن اور بچاؤ ہی رہی۔ اس لئے ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کے معاہدے اس اسپرٹ کے عین مطابق تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں لٹوینوف پراٹوکول کے مطابق روس نے استونیا۔ لتھونیا، لیٹویا، پولینڈ رومانیا، ترکی اور فارس سے ایسے معاہدے کر لئے۔ روس نے جھگڑوں کے چکانے کے لئے اپنے آپ کو کیلاگ پیکٹ کا پابند قرار دیا۔ جینوا میں روس نے ہتھیاروں کے کم کرنے پر بہت زور دیا۔

اس دوران میں کومنٹرن کو نظر انداز کر دیا گیا، یورپ سے معاشی میل کی پالیسی [illegible] ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کے معاہدوں نے ثابت کر دیا کہ روس کے انقلاب کا عالمگیر پہلو اب ختم ہو چکا تھا، اور اس کی جگہ اب قومی حکمت عملی نے لے لی تھی ۱۹۲۹ء کے عام کساد بازاری کے واقعہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ روسی انقلاب کے لئے اس موقعہ سے خوب فائدہ اٹھا سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہ کیا۔ کومنٹرن اب ایک بے کار ہتھیار تھی۔ اس نے یورپ کی اصلاحی تحریکوں کو ہمیشہ شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا۔ اس کے نزدیک ہر ملک میں بایاں بازو بے کار تھا، جہاں اس نے ووٹوں کی تعداد بڑھائی، وہاں اس نے مزدور تحریک کو دھوکا دیا۔ اکثر جگہ اس نے دائیں بازو کے لوگوں سے میل جول کر کے اشتراکی اور جمہوری محاذ کو نقصان پہنچایا، اس وقت روسی حکومت کے سامنے یورپ سے تجارتی اور فنی آسانیوں کا حاصل کرنا تھا، تاکہ اس کا پنج سالہ پروگرام چل سکے۔

۱۹۳۱ء میں جاپان نے منچوریا پر ہلہ بول دیا، اور اس کی فوجیں اندرونی منگولیا کی طرف بڑھنے لگیں، روس کو احساس ہوا، کہ عدم اقدام جارحانہ کے باہمی معاہدے بے کار ہیں، اس نے فوراً چین سے یارانہ گانٹھ لیا۔ ادھر مغرب میں مالی دباؤ اور کساد بازاری کے باعث حالات نازک ہوتے گئے، ہٹلر کی اشتراکیت سے مخالفت جنون کی حد تک پہنچ گئی۔ نیز جرمنی اور جاپان کے میل جول کا خطرہ روس کے سر پر منڈلانے لگا۔ روس کو ایک نئے سیاسی طریق کار کے اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کے سامنے ہٹلر کی اشتراکیت کے خلاف چیخ پکار کے دو معنے ہو سکتے تھے۔

(۱) ہٹلر کا شور و شغب محض جرمن عوام کو بھڑکانے کے لئے تھا۔

(۲) یوکرین پر حملے کا خیال اس کے مجنونانہ اعتقاد کا حصہ تھا۔

جنگ کی صورت میں اسٹالین کو کامیابی کی بہت کم امید تھی، کیونکہ وہ اکیلا تھا، دوسرے اس کا مالی نظام ابھی ناقص تھا۔ اب اس کے سامنے بچاؤ کی ایک ہی صورت تھی وہ یہ کہ یورپ کے مشترکہ بچاؤ کی کل کا ایک پرزہ بن جائے فرانس کے نزدیک عالمگیر قانون کی حفاظت، اور معاہدوں کی پابندی ہی سے امن قائم رہ سکتا تھا۔ روس ورسائی معاہدے کے اس لئے خلاف تھا کہ اس کا بہت سا سرحدی علاقہ کاٹ کر چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنا دی گئی تھیں۔ اب یہی ریاستیں اس کے بچاؤ کا واحد ذریعہ تھیں اس بنا پر ۱۹۳۶ء میں روس لیگ آف نیشنز کا ممبر بن گیا۔ پرانے خیالات رکھنے والے لوگوں میں روس کے خلاف

بداعتمادی تھی۔ روس اس بے چینی کو دور کرنا چاہتا تھا۔

۱۹۳۴ء میں روس کا پہلا پنج سالہ پروگرام ختم ہوگیا۔ روس کی زرعی حالت اب پہلے سے زیادہ سدھر گئی، اور زندگی کا معیار بھی اونچا ہوگیا۔ دنیا میں روس کی ترقی کے گیت گائے گئے۔ روس کو دنیا کا سب سے بڑا "پُرامن حصّہ" قرار دیا گیا۔ اس کو حقیقی جمہوریت کا نام دیا گیا، ایک نیا آئین حکومت ترتیب دیا گیا، نیز اوسط درجے کے لوگوں کی آزادی بہت حد تک بحال کر دی گئی کومنٹرن ایک بار پھر زندہ ہوگئی، کمیونسٹ پارٹی میں ایسے لوگ آگئے، جو فاشزم کے خلاف تھے۔ فاشیزم کی مخالفت میں عوام نے کمیونسٹوں کا اس وقت تک ساتھ دیا، جب تک انہوں نے عوام کی اعتقادی سطح کو نہ چھوا ۱۹۳۶ء میں فرانس میں عوامی محاذ کی حکومت قائم ہوگئی، اسپین، چیکوسلواکیہ اور امریکہ میں بھی اشتراکیوں کی کثرت ہوگئی۔ اسٹالین کے حامی ہر ملک میں نظر آنے لگے۔

روس کی عالمگیر انقلاب پیدا کرنے کی حکمت عملی، اور دیگر قومی حکومتوں سے اتحاد کی خواہش دو ایسے امور تھے، جن میں اتحاد اور مصالحت ناممکن تھی۔ لوگوں میں روس کی اس دورُخی پالیسی کے خلاف جذبہ بڑھنے لگا۔ عوام کے متحدہ محاذ کی تحریک گو فاشزم کے خلاف تھی، مگر کمیونزم کے پرچار نے ایک سخت الجھن پیدا کر دی۔ ذاتی جائداد کو مٹانے، موجودہ خاندانی زندگی کو تہ و بالا کرنے، خدا سے نفرت اور مادہ پرستی کی کھلم کھلا تبلیغ نے پرانی چال کے لوگوں کے غصہ اور انتقام کی آگ بھڑکا دی، اور یہ لوگ روس کے دوست بننے کی بجائے اس کے علانیہ دشمن ہوگئے ہٹلر اور مسولینی اس بات سے آگاہ تھے، کہ روسی یورپ کی آنکھوں میں خاک نہیں ڈال سکتے، انہوں نے اس بات کا بیڑا اٹھایا، کہ یورپ کو روسی بلیگ سے نجات دلائیں۔ اس طرح انہوں نے یورپ کے پرانے خیال کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہٹلر اور مسولینی کا یورپ کی تہذیب و تمدن کو بچانے کا نعرہ بھی ویسا ہی مضحکہ خیز تھا، جیسا کہ روس کا یہ دعوے کہ عالمگیر امن قایم ہو۔ اب ہر شئے انگلستان کے رویہ پر منحصر تھی کیونکہ فرانس انگلستان کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

جولائی ۱۹۳۶ء میں اسپین میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اٹلی نے کھلم کھلا جنرل فرینکو کی امداد شروع کر دی۔ اسٹالین نے اسپین کی حکومت کی امداد اس لئے شروع کی کہ اسے ڈر تھا، کہ فرینکو کی فتح کی صورت میں فرانس جو اس وقت روس کا دوست تھا، سخت مشکل میں گھر جائے گا۔ نیز اس کا خیال تھا کہ اگر اسپین میں اشتراکی حکومت قائم ہوگئی تو پھر یورپ سے میل جول میں آسانی ہو جائے گی ۱۹۳۶ء میں روس کا وقار جمہوری دنیا میں گرنا شروع ہوگیا، کیونکہ اہلِ اقتدار نے اپنے سیاسی حریفوں کو وسیع پیمانے پر موت کے گھاٹ اتارنا شروع کیا۔ یہ شئے قطعاً روس کے اس دعوے کے خلاف تھی کہ وہ تہذیب اور جمہوریت کا ٹھیکہ دار ہے۔ اس قتل و غارت نے یورپ کے اکثر لوگوں کو یقین دلا دیا، کہ جرمنی اور اٹلی روس کے خلاف حق بجانب ہیں بہت سے مدبر اس کے درپے تھے، کہ روس اور جرمنی کو ایک دوسرے سے لڑا دیں۔ روس اب مغربی یورپ کی جمہوریتوں کے بارے میں بہت چوکنا ہوگیا۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے دو سال کریملن کے لئے بہت بے چینی پیدا کرنے والے تھے، یہ تشویش ۱۹۳۶ء کے جرمن۔ جاپانی اتحاد کے باعث تھی، جس میں بعد کو اٹلی بھی شامل ہوگیا۔ جرمنی نے مشرق کی طرف بڑھنے کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کیا۔ اس کے لئے زیکوسلاویکیہ کا خاتمہ لازمی تھا، پھر جرمنی نے یوکرین کی واپسی کے لئے پروپیگنڈا شروع کر دیا، اور میونخ کے معاہدے نے مشرق میں جرمن پیش قدمی کے خلاف سب سے بڑے محاذ کو توڑ دیا۔

۱۹۳۸ء کا موسم خزاں روس کے لئے سخت خطرے اور بے چینی کا زمانہ تھا۔ فرانسیسی سفیر متعینہ برلن کے نزدیک ہٹلر کی یہ پالیسی تھی "سنٹرل یورپ پر ہنگری اور زیکوسلاویکیہ کو ماتحت ریاستیں بنا کر اقتدار حاصل کرنا اور اس کے بعد جرمن قیادت کے ماتحت ایک بہت بڑی یوکرینی سلطنت کا قیام"۔ دسمبر میں روس نے پولینڈ سے بات چیت شروع کی، جو ناکام ہوگئی۔ جنوری ۱۹۳۹ء میں ایک بار پھر برلن سے میل جول پیدا کرنے کی سعی کی گئی، اس نئے پلٹے سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے، کہ روس کی پرانی حکمت عملی بدل چکی تھی، یا اس کے اور روس کے تعلقات میں کوئی فرق آیا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ بڑے بڑے نازی افسر ہٹلر کے خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے، روس سے تعلقات پیدا کرتے وقت ان لوگوں کو استعمال کیا گیا۔ روس کے مدبرین جانتے تھے، کہ فرانس اور روس کے معاہدے کے بعد ہی کومنٹرن کے خلاف زہر آلود پراپیگنڈا کیا گیا تھا۔ جرمنی کا مقصد اس صورت میں مغرب سے روس کی دوستی اور میل جول کو بے اثر بنانا تھا۔ یوکرین پر ہٹلر کا قبضہ اس صورت میں ممکن تھا کہ انگلستان اور فرانس اس کی راہ میں روڑا نہ اٹکاتے میونخ نے ہر ہٹلر کو انگلستان اور فرانس کی دوستی کا یقین دلایا، مگر بعد میں انگریزوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو حفاظت اور بچاؤ کی ضمانت دی۔ اس نئی سیاسی قلابازی نے ہٹلر اور اس کے نصب العین کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی۔ جرمنی کے لئے اب روس سے تعاون اور میل جول کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اعتدال پسندوں نے ایک بار پھر فتح پائی: اور روس سے سیاسی اور معاشی میل جول کی پالیسی پھر لوٹ آئی۔ روس کا پلڑا ابھی شروع ہی سے جرمنی کی جانب جھکا ہوا تھا۔ روس اور جرمنی کا معاہدہ امن سلئے

بھی آسان تھا، کہ جرمنی محض ناطرفداری کا خواہش مند تھا۔ نیز انگریزی مشن کے وجود نے ماسکو میں روس کی جرمنی سے سودا کرنے کی پوزیشن مضبوط کر دی۔

اوائل ستمبر میں جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا، انگلستان اور فرانس نے پولینڈ کو ضمانت دے رکھی تھی۔ اس لئے انہوں نے بھی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۲۹ر ستمبر کو جرمنی اور روس کی سرحدیں ایک دوسرے سے مل گئیں۔ روس کی اس جنگ کے بارے میں یہ حکمت عملی ہے کہ یہ جنگ ایسی خوفناک صورت اختیار کر لے، کہ جنگ کے خاتمے پر فریقین بالکل تباہ اور برباد ہو جائیں۔ روس کو یہ بھی خوف دامنگیر ہے کہ مبادا کوئی طرف دوسری پر زبردست فتح پالے، کیونکہ اس طرح اس کے اپنے بچاؤ کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ جاتا ہے۔ اسی بنا پر اکتوبر میں ترکی وزیر خارجہ کو ماسکو بلایا گیا، اور اس کو بحیرۂ اسود یا بحیرۂ سیاہ ساگر کے بند کرنے کے لئے کہا گیا۔ فن لینڈ سے بھی اسی لئے مطالبات کئے گئے کیونکہ روس کے نزدیک بچاؤ کی ضمانت اس کے پھیلاؤ میں ہے۔ فن لینڈ نے روس کے مطالبات کو ٹھکرا دیا۔ روس نے فن لینڈ پر چڑھائی کر دی۔ اس کو روسی سامراج کے نوجیون سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ طریق کار روس کی پرانی بیرونی سیاست کی روایات کے عین مطابق تھا۔ یعنی کہ زیادہ محفوظ ہونے کا طریقہ یہ ہے، کہ مقبوضات کو وسیع کیا جائے۔

فن لینڈ کی لڑائی کا افسوسناک پہلو یہ تھا، کہ اس میں انقلابی نعرے استعمال کئے گئے، حالانکہ ان کا مقصد محض روسی پروپیگنڈا تھا۔

روس کو اس بات کا بھی ڈر ہے کہ کہیں لڑائی اس کے گھر کے پاس نہ شروع ہو جائے۔ فن لینڈ کے بارے میں روس کو یہ خطرہ تھا، کہ اگر اتحادی کامیاب ہو جاتے تو وہ فن لینڈ کو جرمنی پر حملہ کے لئے اساس قرار دے لیتے۔ اس لئے روس اور فن لینڈ میں صلح ہو گئی۔

اس جنگ میں جرمنی نے روس سے صرف اس کی ناطرفداری حاصل کی، کیونکہ روس کے لئے بہترین پالیسی یہی ہے کہ دونوں فریق لڑ کر چور ہو جائیں۔ روس کے اپنے بچاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی فریق بھی پورے طور پر کامیاب نہ ہو۔ الغرض روس اپنے بچاؤ کے وہم میں دنیا کو جنگ میں دھکیل کر خوش ہے مستقبل فیصلہ کرے گا، کہ روسی سیاست کا انجام کیا ہو گا۔

عبد القدیر خاں

غزل

خیال غیر کی محفل کا آ گیا؟ — کہئے،
بہانہ کوئی نہیں یاد آ رہا؟ — کہئے،

اے دل کہا جو اُسے بے وفا تو خوب کیا
جو برملا نہ کہا ہو تو برملا — کہئے

بھلے کی بات کہی آپ نے بُرا کیا ہے!
بُرا ہوں میں، — مجھے اِک بار پھر بُرا کہئے

گلہ خدا سے کیا اور انہیں خفا پایا
یہی وہ بات ہے جس پر انہیں خدا کہئے۔

کدھر کا رُخ ہے ابھی نیند کے بہانے سے؟
نصیب کس کا ابھی جاگنے لگا — کہئے

یہاں تو حُسنِ شکایت سے کام ہے اپنا
خطا اُسی کی ہے لیکن اسی کو کیا — کہئے!

یہ آپ ہی کی سہی بزم اور رعد و سب کچھ
اِدھر ضیاؔ بھی ہے کچھ اس سے بھی ذرا کہئے

پرشوتم لال ضیاؔ ایم اے

خدا

ایک اچھوت ماں کا تصور

خبر ہے تجھ کو کچھ رُلدُو مرے ننھّے! مرے بالک!
ترا بھگوان پرمیشر ہے اس سنسار کا پالک!

کہاں رہتا ہے پرمیشر؟ ادھر آکاش کے پیچھے،
کہیں دُور — اس طرف — تاروں کی بکھری تاش کے پیچھے

نہیں دیکھا؟ سویرے جونہی مندر میں گجر باجا
پہن کر نور کی پوشاک اک من موہنا راجا

لئے سونے کا چھابا جب اُدھر پورب سے آتا ہے
تو اُن تاروں کی پگڈنڈی پہ جھاڑو دے کے جاتا ہے

یہ دُنیا والے یہ امرت کے رس کی چھاگلوں والے!
یہ میٹھے بھوجنوں والے، یہ اُجلے آنچلوں والے!

یہ اُس بھگوان کے دامن کو چھو لینے سے ڈرتے ہیں
یہ اُس کو اپنے محلوں میں جگہ دینے سے ڈرتے ہیں

کسی نے بھول کر اُس کا بھجن گایا، یہ جل اُٹھے
کہیں گر جا پڑی اُس کی مدُھر چھایا یہ جل اُٹھے

یہ اُس کو اپنی لاشیں، اپنے مُردے سونپ دیتے ہیں
عفونت سے بھرے دل اور گُردے سونپ دیتے ہیں

جنہیں شعلوں کی سیخوں میں پرو کر بھونتا ہے وہ
جنہیں دوزخ کے زہروں میں بھگو کر بھونتا ہے وہ!

غلط کہتا ہے تو ناداں! تو نے اس کو دیکھا ہے
مرے بھولے ہماری اور اس کی ایک لیکھا ہے"

مجید امجد

سوال

شام کے تارے کو شرماتی ہوئی تو کون ہے؟

سیمِ پیشانی پہ آزادی کا تارا ضو فگن ۔۔۔ قوسِ ابرو میں ہلالِ عصرِ نو کا بانکپن

ماہِ تابانِ وطن! روحِ وطن! جانِ وطن

ظلمتوں میں نور برساتی ہوئی تو کون ہے؟

سازِ خاموشی میں پنہاں علم کے شیریں نکات ۔۔۔ سطوتِ رفتار میں آہنگِ نبضِ کائنات

موجِ گل، بانگِ تمدن، نغمۂ جوئے حیات!

زیرِ لب اک راگنی گاتی ہوئی تو کون ہے؟

بال افشاں جنبشِ مژگاں میں مدحِ انقلاب ۔۔۔ انکھڑیوں میں جاگتے زرّین مستقبل کے خواب

شعلۂ آزاد، شمشیرِ حسیں، سروِ شباب،

اس طرح پرچم سی لہراتی ہوئی تو کون ہے؟

ہر نفس میں نغمۂ آثارِ صبحِ نو لئے ۔۔۔ ساز اور سوزِ بغاوت کا حسیں پرتو لئے

وقت کی مشعل جلائے زندگی کی لَو لئے

روح میں شعلے سے بھڑکاتی ہوئی تو کون ہے؟

سید جاں نثار حسین اختر

فلسفہ کے تین دور اور اُن کی خصوصیات

فلسفہ نے ابتدا سے اب تک بہت سے انقلابات دیکھے ہیں، یا یوں سمجھیے کہ ہر زمانے میں غور و فکر کرنے والوں نے نئے نئے نظریے دنیا کے سامنے پیش کئے فلسفہ کی بڑی بڑی تاریخیں بھی لکھی گئی ہیں اور ہر فلسفی یا اس کے شاگردوں یا متبعین نے نظریات کی تشریح و توضیح اور ثبوت کے لئے بڑی بڑی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ مگر فلسفہ کا مطالعہ اور پھر اُس کے مختلف ادوار کی تعیین خاصا مشکل کام ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت جو کچھ میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں اس میں میں اس مشکل کام کو اُس طرح انجام دے سکا ہوں جس طرح انجام دینا چاہئے تھا لیکن میں نے کوشش کی ہے اور انتہائی کوشش کہ کم سے کم الفاظ میں آپ کے سامنے وہ سب کچھ پیش کر دوں جسے فلسفہ کے تین مشہور ادوار کا مبہم سا خاکہ کہا جا سکے۔

یہ ایک مختصر اور بہت ہی مختصر مضمون ہے۔ اس لئے کسی تفصیل کی گنجائش اس میں نکل سکتی تھی۔ میں نے عام دلچسپی و مطالعہ کے لئے فلسفہ کو تین ادوار پر تقسیم کر کے ان ادوار کی صرف موٹی موٹی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ موضوع میں تفصیلات کی بڑی گنجائش ہے لیکن ایسی تفصیلات تعلیم و مطالعہ میں تو ممکن ہیں یا پھر ایک مبسوط تصنیف میں ہو سکتی ہیں۔ ایک چھوٹے سے مضمون میں ممکنہ اختصار کے ساتھ جو کچھ پیش کیا جا سکتا ہے وہ پیش ہے۔

باور کیا جاتا ہے کہ اس خاکدان عالم پر جن جن اقوام و افراد نے آنکھیں کھولیں انہوں نے اپنی عقل اور اپنی یافت کی حد تک فلسفیانہ مسائل پر بھی غور کیا ہوگا۔ تاریخ چاہے ان کے فلسفہ کی کوئی یادگار محفوظ رکھے یا نہ رکھے۔ مگر یہ کسی طرح سمجھ میں آنے کی بات نہیں ہے کہ وجود، عدم، خلود، فنا، تغیر، استحالہ اور تکوین وصیرورت جیسے اہم مسائل حیات سے کسی قوم نے آنکھیں بند کر لی ہوں اُن کے ادراکات کی بلند پروازیاں ان مسائل کے بالاخانوں سے چاہے کتنی ہی نیچے رہ گئی ہوں مگر پھر بھی ان مسائل پر انہوں نے کچھ نہ کچھ تو غور کیا ہی ہوگا۔

یہ تسلیم کرنے کے بعد بھی کہ زمانہ قدیم سے فلسفیانہ مسائل پر غور کیا جاتا رہا ہے اگر یونانیوں کے فلسفہ کو الگ کر لیا جائے تو قدماء کے پاس جو کچھ تھا اس میں خرافات وہمیات اور مہمل اعتقادات کی آمیزش اتنی زیادہ موجود تھی کہ لفظ فلسفہ اپنے صحیح معنی کے اعتبار سے اُن کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا اور نہ تاریخ نے ان کے ان وہمات و خرافات کا اس قابل کوئی حصہ محفوظ رکھا جس سے آنے والی نسل کچھ فائدہ حاصل کرتی اور اپنی اولاد تک پہنچاتی۔

یونانی فلسفہ کی خوش قسمتی تھی کہ اُس کی ابتدائے پیدائش سے عقلاء اور زبردست قوت فکریہ رکھنے والے ایک ایسے سلسلہ نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا جس نے نہ صرف اس چھوٹے سے پودے کو تناور درخت کی شکل دی بلکہ اس کا وقار اور اس کا علمی وزن بھی قائم کیا۔ ان لوگوں نے اسے اس قدر وسعت دی کہ فلسفہ یونان ایک مستقل اور وسیع علم ہو گیا۔ یہ فلسفہ اس سرعت اور تیزی کے ساتھ متمدن دنیا کے ہر گوشے میں پھیل گیا کہ حیرت سی ہوتی ہے۔

یونانیوں نے فلسفہ کی بنیاد ہی نہیں رکھی بلکہ اپنی کوشش اور محنت سے اُس کی دیواروں کو مضبوط اور اس کی عمارت کو سربلند کیا۔ باہمی بحث و مباحثہ میں آ افکار کا آنے والی نسل کے لئے بہترین مجموعہ چھوڑا۔ انہوں نے فلسفہ کی کوئی شاخ ایسی نہیں چھوڑی جس کے ریشہ ریشہ کا جائزہ ان کی فکر و بحث نے نہ لیا ہو۔ یونانیوں کا مشہور فلسفی ارسطو آج بھی اس زندۂ جاوید شہرت کا مالک ہے جو بعد کو پیدا ہونے والے کسی بڑے سے بڑے فلسفی کو نصیب نہ ہو سکی۔ اسی طرح اس کے استاد افلاطون کا نام بطور ضرب المثل دنیا کی تمام مہذب زبانوں میں رائج ہے۔

یونانیوں کے دور سے اب تک فلسفہ نے تین دور دیکھے ہیں جن میں سے ہر دور دوسرے سے ممتاز و ممیز ہے اور ایسی خصوصیات رکھتا ہے جنہیں مشترک نہیں کہا جا سکتا۔ میں نہایت اختصار کے ساتھ ان تینوں ادوار کا ذکر کرتا ہوں۔ اور کسی قدر اُن کی خصوصیات بھی بیان کرتا ہوں ورنہ ان میں سے ہر دور اپنی اپنی خصوصیات کے بیان کے لئے کئی کئی ضخیم جلدوں کی پہنائیاں چاہتا ہے۔

دور اوّل

<u>یونانی دور</u>:- یہ دور چھٹی صدی قبل مسیح سے شروع ہو کر مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی

ولادت پر ختم ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں۔ قدیم اقوام میں فلسفیانہ فکر تو موجود تھی مگر نہ اس میں کوئی ترتیب و نظام پایا جاتا تھا۔ نہ انہیں ابھی تک خرافات سے علٰحدہ کیا جا سکا تھا۔ اس لئے یونانیوں کے فلسفے کا بانی طالیس کو سمجھنا چاہیئے۔ یہ وہی طالیس ہے جس نے ۲۲ مئی ۵۸۵ قبل مسیح کو ہونے والے چاند گہن کے متعلق صحیح پیش گوئی کی تھی۔

یونانیوں کا فلسفہ اپنی ابتدا ہی سے مختلف نقطہ ہائے خیال پر منقسم ہو گیا تھا ان مکاتیبِ خیال کے نام یا تو بانیوں کے نام پر رکھے گئے ہیں یا مقام کے نام پر مثلاً فیثا غورث سا اپنے بانی فیثا غورث کی طرف منسوب ہے جو اواخر صدی ششم قبل مسیح میں جزیرہ ساموس میں پیدا ہوا تھا۔ اسی طرح آیونیت و ایلیائیت اپنے مقامات ایونیا و ایلیا کی طرف منسوب ہیں۔ اور افلاطونی مشائی رواقی سوفسطائی وغیرہ اپنے اپنے مقامات یا بانیوں کی طرف نسبت رکھتے ہیں۔

یونانی فلسفہ کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) کائنات کے مختلف ظواہر و صور میں جو وحدتِ مشترک اپنی اطلاقیت کو مقید شکل میں دکھا رہی ہے۔ اس کی تلاش و تحقیق۔

اگرچہ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ فلسفہ کے دوسرے اور تیسرے ادوار میں وحدتِ مطلقہ کی تلاش و تحقیق کا جذبہ بالکل باقی نہیں رہا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار کرنا ممکن نہیں کہ یونانی فلسفیوں نے اپنی توجہات و فکر کا جس طرح اس مسئلے کو مرکز بنا رکھا تھا۔ دوسرے دور کے فلسفیوں نے وہ توجہ اس پر صرف نہیں کی اور اسے جو اہمیت فلسفہ کے قدیم دور میں حاصل تھی وہ باقی نہیں رہی۔

آیونی مکتبِ خیال کے فلسفیوں اور ایلیائی فلسفیوں کے مابین اس مسئلے پر جس قدر دقیق بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ایک طالب علم پر یہ صاف روشن ہو جاتا ہے کہ تحویل و صیرورت کا ثبوت و بقا سے جو اختلاف ہے اس نے کتنے باریک و دقیق مسائل پیدا کر دیئے تھے۔ یوں تو فلسفہ کے ہر دور میں وحدتِ محیط و مشترک کا مسئلہ فن کا سب سے زیادہ نازک اور اہم مسئلہ رہا ہے لیکن قدیم فلاسفہ میں سے آیونیوں اور ایلیائیوں نے جتنی توجہ اس پر صرف کی وہ اتنی مابعد والوں نے نہ کی۔

(۲) یونانی فلسفہ کے تمام مکاتیبِ خیال کی یہ نمایاں خصوصیت رہی ہے کہ انہوں نے مادہ اور ہر اس مادی شے کو حقیر ترین شے شمار کیا۔ جو نفسِ انسانی کو حصولِ کمالات سے روک سکے لیکن دنیا کے ہر کلیہ سے مستثنےٰ ضروری ہے۔ فلسفہ یونان کے مکاتیبِ خیال میں سے بقراط اور ابیقورس کے دو مکتبوں کو اس کلیہ سے مستثنےٰ سمجھیے کیونکہ ان کی بنیادیں سراسر مادہ پر قائم ہیں۔ ان کے علاوہ اور جتنے مکاتیب خیال یونانی فلسفہ کے ہیں۔ وہ سب کے سب مادہ کو اخلاقِ انسانی کے لئے مفسد اور اکتسابِ فضائل کے رستے میں دیوار سمجھتے ہیں۔ افلاطون مادہ کی تعریف بایں طور کرتا ہے کہ:-

"مادہ ایک ایسی شے ہے جس کی نہ تو کوئی صورت ہے نہ کوئی شکل عدم سے بہت مشابہ ہے۔ نہ اس کی کوئی قیمت ہے نہ وزن اور نہ اس سے کوئی فائدہ ہوتا ہے بجز اس کے کہ نفس اس میں اپنے مرغوبات و میلانات جاری کرتا ہے اور خود مادہ عقل کی آراء کے ماتحت کیفیت پذیر ہوتا رہتا ہے"۔

افلاطون کی اس تعریف پر غور کیجئے یہ ایک خالص فلسفیانہ انداز کی توہین و تحقیر ہے۔ مذہبی انداز میں جو مادہ اور مادیات سے الگ رہنے کی تلقین کی گئی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے، دوسرے دور میں یہ مذہبی تعلیمات کے ماتحت زیادہ نمایاں نظر آئے گی۔ اس جگہ صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ ایک افلاطونی فلسفی کے نزدیک مادہ کی تحقیر صرف اس لئے کی جاتی ہے کہ یہ نفس انسانی کی ترقی میں حائل ہے اور وہاں پہنچنے نہیں دیتا جہاں نفس انسانی کو اس حیات مادی میں پہنچ جانا چاہیئے بس اس سے زیادہ افلاطون یا اس کے متبعین کی پرواز نہیں ہے۔ مگر مذہب انسان کو صرف نفس انسانی کی ترقی ہی نہیں بلکہ حیاتِ ابدی کی دعوت دیتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ انسانی نفس مادہ اور مادیات سے اس لئے پاک رہے کہ اُس میں حیاتِ ابدی حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے جو عالم شہادت یا عالم مادہ میں نہیں بلکہ اس کے باہر حاصل ہوتی ہے۔

(۳) اس دور کی تیسری خصوصیت حسیت کے مقابلے میں عقلیت کا غلبہ ہے۔ لیکن یہ خصوصیت فلسفہ کی ارتقائی صورت میں پیدا ہوئی تھی۔

یونانی فلسفہ ابتداً محض مادی تھا حتیٰ کہ کائنات ان کے نزدیک صرف ان چار مشہور عناصر کے مختلف مرکبات کا نام تھا جو انہیں احساسات کے ذریعے معلوم ہوتے تھے، انہیں ان کے سوا کسی قوتِ فعال اور عنصر روحی کا تصور بھی نہ تھا، جب انکساغوراس پیدا ہوا اور اس نے ایک ایسی خفیہ قوت کا پتہ چلایا جو مادہ پر مسلط ہے تو یونانی فلسفہ نے ایک جدید صورت اختیار کی انکساغوراس نے اس خفیہ قوت کا نام عقل رکھا، اور دعویٰ کیا کہ یہ عنصر عقلی جوہر و ماہیت میں مادہ سے بالکل مختلف ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے یہی عنصر عقلی اپنے تسلط و اقتدار کے ساتھ سارے عالم کا نظم و نسق کرتا ہے، اسی سے عالم کا تمام طبیعیاتی نظام وجود میں آتا ہے۔ اس کے بعد افلاطون نے اس بارہ میں اس قدر غلو کیا کہ اس کے نزدیک وجود حقیقی اسی عقل یا عنصر عقلی کا دوسرا نام قرار پاتا ہے اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب اسی کے تابع ہیں۔ اور ان کا ماتحت و تابع کے علاوہ نہ کوئی وجود ہے، اور نہ ان کی کوئی حقیقت یہی وجہ ہے کہ متاخرین نے افلاطون

کو فلسفہ میں مذہب عقلی تصوری (Idealism) کا بانی قرار دیا ہے۔ اس دور کے دوسرے فلاسفہ مثلاً سقراط، ارسطاطالیس، پارمینڈس، امپیڈوکلس اور رواقیین کے یہاں بھی ہمیں یہی ملتا ہے۔ اس دور کے فلاسفہ ایک بے اساس اور بے مقصد تگ ودو میں مبتلا تھے۔ افلاطون کی طرح یہ لوگ علم و دانش کو مقصود بالذات قرار دیتے تھے۔ اُن کے نزدیک کوئی اور مقصد نہیں تھا جس کے حصول کے لئے دانش و علم کا حصول واسطہ و زینہ قرار پائے بلکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ کسی چیز کا جان لینا خود نفس انسانی کی سعادت ہے۔ اس سے زیادہ انسان کو کچھ اور حاصل ہونے کی مطلق ضرورت نہیں۔ یہ لوگ نہ تو دوسرے دور کی طرح حیاتِ ابدی کا کوئی تصور رکھتے تھے۔ جس کے حصول کے لئے یقین و معرفت ضروری ہو اور نہ تیسرے دور کی طرح وہ اس علم و دانش سے اپنی حیاتِ مادی کے سلسلے میں کہیں کام لینا مقصد قرار دیتے تھے۔

غرض کہ اس ابتدائی دور میں فلسفہ بہت ہی ابتدائی صورت میں تھا اور بڑے سے بڑے فلسفی کی زندگی ایک تصوری بے مقصد و بے اساس زندگی سے زیادہ کوئی وجہ نہ رکھتی تھی۔ اس دور کے بعد بھی جن لوگوں نے دوسرے اور تیسرے دور میں یونانی فلسفہ کو اپنا سب کچھ سمجھا۔ یا اس کو اصل قرار دیا اُن کی زندگیاں بھی اسی طرح بے اساس ہو گئیں اور ایسا ہونا بالکل یقینی تھا کیونکہ سعادت کی بنیاد یقین پر ہے، اور فلسفہ کی بنیاد بڑی حد تک شک و ارتیاب پر۔

دورِ ثانی

فلسفۂ مدرسین | فلسفہ کا دوسرا دور فلسفۂ لاہوت یا فلسفۂ مدرسین کا دور ہے یہ ولادتِ مسیح علیہ السلام سے شروع ہو کر سولھویں صدی عیسوی کی ابتدا پر ختم ہوتا ہے۔

اس دور کے فلاسفہ کا بڑا حصہ مختلف مقامات پر درس و تدریس کی خدمت انجام دیتا تھا اسی لئے اسے فلسفۂ مدرسین کہتے ہیں۔ جیسے جیسے دین عیسوی پھیلتا گیا یہ فلسفہ مختلف ممالک میں جا پہنچا۔ رومن تمدن کا یہ عہد تھا۔ بلاد یورپ میں عیسائیت نئی نئی داخل ہوئی تھی قدیم بت پرستوں میں جو فلسفی موجود تھے۔ انہوں نے عیسائیت پر طرح طرح کے اعتراضات شروع کر دیئے۔ اسے عقل سے دور، مبادی فلسفہ کے مخالف اور اصول مسلمہ کے خلاف ثابت کرنا شروع کیا۔ عیسائی علما نے جو مختلف خانقاہوں اور دینی مدارس میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے۔ ان کے جوابات دیئے اور اسی یونانی فلسفہ کے ذریعہ دیئے۔ اس ضرورت کے لئے انہوں نے افلاطون اور ارسطو کی تعلیمات کو توڑ موڑ کر عیسائیت کے مطابق بنایا اور عیسائیت کو توڑ موڑ کر فلسفہ کی شکل دی۔ دونوں کی اصلیت و حقیقت مسخ ہو گئی مگر ایک تیسری چیز پیدا ہو گئی جسے اس دور کا فلسفہ کہا جاتا ہے۔

اسی طرح کا تصرف یونانی فلسفہ پر مسلمانوں کے دور میں ہوا۔ یہاں بھی مقصد وہی تھا جو عیسائی مبلغین و مدرسین کے سامنے تھا لیکن مسلمانوں نے عمومی طور پر دین کے مقابلے میں فلسفہ کو نہایت حقیر سمجھا اس لئے اُن کا ذکر بحث سے خارج سمجھئے۔

ہندوستان میں بھی یونان کا فلسفہ آپہنچا تھا۔ اُس میں خرافیات کا مزید اضافہ کر کے وہ شکل دی گئی جو ہندوستانی فلسفہ کہلاتا ہے۔ نتیجہ اور حقیقت کے اعتبار سے یہ سب بے اساس، بے مقصد اور حیاتِ انسانی کی غلط تعبیریں ہیں۔

بہر حال اس دور میں جو فلسفہ تھا اس کی دو خصوصیتیں قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) فلسفہ مدرسین فلسفہ روحیہ تھا۔ لیکن چونکہ یہ لوگ صرف دینی احکام کے ذریعہ لوگوں سے وہ سب کچھ نہیں منوا سکتے تھے جو عیسائیت چاہتی تھی۔ اس لئے انہوں نے فلسفیانہ دقیقہ سنجیوں کے ذریعہ لوگوں کو اُس کی طرف متوجہ کیا اور طرح طرح کے دلائل سے اسے حق ثابت کیا جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے بہتوں نے اپنے اعمال کی اصلاح کی اور اچھے صفات پیدا کئے۔ کچھ لوگوں نے اپنی زندگیاں بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے وقف کر دیں، اگرچہ مادہ اور مادیات سے نفرت اور غلو نے ترکِ دنیا۔ راہبیت اور تپسیا وغیرہ کی صورتیں اب بھی باقی رکھیں لیکن اس دور میں حیاتِ ابدی کے تصور نے زندگی کو بے اساس اور بے مقصد بن جانے سے بڑی حد تک محفوظ رکھا۔

(۲) دوسری خصوصیت اس دور کی یہ ہے کہ فلسفہ عیسائیت کے ماتحت ہو گیا اس لئے بعض اچھے اجتماعی صفات سوسائٹی میں پیدا ہو گئے عدل انصاف مساوات وغیرہ کی ابتدا ہوئی، نسلی امتیازات اگر بالکل مٹ نہیں گئے تو کم از کم اصحاب فلسفہ انہیں برملا برا کہتے رہے اور کوشاں رہے کہ رنگ و نسل کے امتیازات کو مٹا دیں۔

ان دو خصوصیتوں کے علاوہ اس ڈیڑھ ہزار سال میں افلاطون کے اعیان مُثل اور عنصر عقلی کی مختلف تعبیروں کے علاوہ کوئی جدید اور خصوصی چیز نظر نہیں آتی جس کی بنا پر قدیم دور سے اسے ممتاز سمجھا جائے۔

دورِ ثالث

فلسفۂ جدیدہ | فلسفہ کا تیسرا دور یا دورِ جدید سولھویں صدی کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اس دور کی ابتدا ارقدیم فلسفہ کے خلاف ایک عام بغاوت و نارضامندی سے ہوئی۔ غالباً سب سے پہلے مشہور انگریز فلسفی بیکن نے علم بغاوت بلند کیا

اس نے ایک خاص انداز میں ارسطو کے نظریات پر تنقیدیں کیں، اور انہیں غلط، بے ثمر اور پوچ ٹھہرایا۔ اس عام بغاوت کے وجوہ حسب ذیل تھے۔

(۱) اس دور کے اصحاب فکر کی رائے میں فلسفۂ قدیم انسانی زندگی کے شئون واحوال سے مطلقاً کوئی تعلق نہیں رکھتا، نہ ان کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے۔ فلسفہ لاہوت مابعد الطبعۃ سے بحث کرتا ہے جو کوئی نتیجہ خیز بحث نہیں، صدیوں تک اس بحث ومباحثہ میں گزارنے کے بعد بھی نسل انسانی ایک انچ ترقی نہیں کر سکی۔ اس طرح ان کے نزدیک فلسفۂ لاہوت دماغی عیاشی اور فضول بحث وفکر سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

(ب) کلیساؤں اور خانقاہوں کے بدکار، کاہل اور ناکارہ مذہبی ٹھیکہ داروں نے انسانی فکر کو اس قید وبند میں ڈال رکھا تھا کہ آزادی کے ساتھ غور وفکر کرنا ایک ناقابل معافی جرم قرار پا گیا تھا۔ اس لئے اس تسلط کے خلاف ایک عام بغاوت نے دین کو سیاست سے الگ کر دیا اور ساتھ ہی اس فلسفہ کے تار پود بھی بکھیر کر رکھ دئے جس کی تعلیم کلیساؤں اور خانقاہوں میں ہوتی تھی۔

اس بغاوت کے خلاف کلیساؤں نے بڑا زور لگایا اور اب تک طرح طرح کے اعتراضات اس پر کئے جاتے ہیں لیکن یہ زور اور یہ اعتراضات نیک نیتی پر مبنی نہ تھے بلکہ صرف اس اقتدار کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لئے اصحاب کلیسا کوششیں کر رہے تھے۔ مقصود نہ تو عیسائیت کی صیانت تھی اور نہ کسی صداقت کی تبلیغ۔

(ج) اعمال کے اعتبار سے ارباب کلیسا عیش کوشیوں میں مبتلا تھے جس کی وجہ سے ان کا احترام قلوب سے جا چکا تھا، اور ایک سخت قسم کی نفرت موجود تھی، سیاسی اقتدار بھی جب ہاتھ سے جاتا رہا تو ان کی ہر چیز سے نفرت فکر وعمل پر طاری ہوگئی اور اس طرح فلسفہ کے جدید نظریات وجود میں آئے

(۱) اس دور کی چند اہم خصوصیات یہ ہیں۔ سب سے اول مادیت کو لیجئے۔ کلیسا کے خلاف جو نفرت تھی وہ تند اور ہٹ بلکہ بڑی حد تک جذبۂ انتقام سے متاثر ہو کر فلسفۂ روحانیت کے خلاف صف آرا ہو گئی ابتدائی دور میں مادہ ومادیات کا ترک نفس انسانی کی تکمیل کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا اور یونانی فلاسفہ مادہ کی تحقیر پر زور دیتے تھے۔ دور متوسط یا دور کلیسا میں عیسائی پادریوں نے روح کو خدا بنا کے پیش کیا اور مادہ کو انسانی فکر سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ مگر اس تیسرے دور میں روح اور متعلقات روح کو خارج از بحث قرار دے کر تمام تر توجہ مادہ و مادیات پر مرکوز کر دی گئی۔

(۲) دوسری خصوصیت، نفعیت ہے۔ تاریخ میں ابیقوریوں کا عہد نفعیت کی ابتدا کے لئے مشہور ہے لیکن اس کے بعد فکر سے نفعیت کا خیال بڑی حد تک دور جا پڑا تھا۔ اس جدید دور میں اس پر سب سے زیادہ زور دیا گیا اور ہر اس چیز کو ناکارہ اور لاطائل قرار دیا گیا جو انسانی حیات میں راحت وعافیت کا سامان بہم نہ پہنچاتی ہو۔ نظریۂ نفعیت نے اس دور میں اس قدر استیلا حاصل کیا کہ انسانی فکر وعمل کا مرکز انتفاع اور وہ بھی ظاہر وصریح انتفاع ہو گیا۔

اس دور کے فلاسفہ نے نفعیت کے سلسلے میں بڑی بڑی موشگافیاں کیں اور انفرادی نفع سے قومی اور قومی سے بین الاقوامی کے تصورات پیدا ہوئے حتیٰ کہ نفع کی تعریف یوں کی جانے لگی

"نفع عظیم وہ ہے جو زیادہ سے زیادہ تعداد کے لئے ہو"

(۳) تیسری خصوصیت اس دور کی یہ ہے کہ عقل وروح پر حسیت کا رنگ چڑھا دیا گیا۔ یہ آسان نہیں کہ موجودہ دور کے فلسفہ میں سے کسی خاص رنگ کو واضح کر دیا جائے۔ ہر دور کی طرح اس دور میں بھی فلسفۂ حسیت (سینسیشنل ازم) فلسفۂ عقلیت (ریشنل ازم) فلسفۂ خیالیہ (تصوریہ) آئیڈیل ازم اور فلسفۂ روحیہ ومعنویہ (سپرچوآل ازم) کے انصار ومعاونین موجود ہیں اور دلائل وبراہین کا ایک انبار ہے جو ان میں سے ہر ایک پیش کر سکتا ہے۔ بلاشبہ ان میں سے ہر نظریے کے کچھ نہ کچھ لوگ قائل بھی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی اس وقت جو نظریہ طاری ہے وہ حسیت ہے۔ مادیت کا جو رنگ اس دور کی ابتدا میں چڑھ گیا ہے وہ اب تک کسی طرح ہلکا نہیں پڑا ہے۔ عام طور پر اعمال وافکار پر یہی حسیت ونفعیت طاری ہے۔

نفعیت کے اس تسلط کا لازمی نتیجہ انسانیت کی تباہی ہے دماغوں پر نفعیت کا خیال اس بری طرح طاری ہے کہ نہ صرف انفرادی اخلاق خراب ہو گئے ہیں بلکہ قومیں اور اجتماعات بھی انسانی جذبات سے عاری ہیں، افراد میں نفعیت نے لذت گیری کے حیوانی جذبہ کو مستولی کر دیا ہے اور جماعتوں کے قلوب میں دوسری قوموں کے خلاف جذبۂ حقارت ونفرت کو کچھ مفکرین اس صورت حال کے خطرناک نتائج کی طرف دنیا کو متوجہ کر رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ نفعیت (یوٹیلیٹیرین ازم) کے اس قدر استیلا کا لازمی نتیجہ انسانیت کی تباہی ہوگا۔ اور انسانیت حیوانیت سے بدل جائے گی لیکن انہیں اب تک قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔

عبدالقدوس ہاشمی

دو نظمیں

تمنّائیں!

کاش میں جب ایک رات،
شدّتِ غم میں نکل جاتا کہیں بستی سے دُور
تُو مرے خوابوں کی رنگیں کہر میں آتی وہاں
چاندنی کے نُور کا باریک سا آنچل لئے۔
تیرے عارض کی تجلّی سے اُبلتا چشمۂ نُور و ضیا
اور سحر تک داغِ ناکامی کو دھونے کے لئے،
اُس کی لہروں میں اکیلی غسل کرتی میری رُوح!

. . . .

کاش میں اِک رات محوِ سیر ہوتا چرخ پر،
تیرے خوابِ شکریں کے ساتھ اک شیریں تصوّر کی طرح!
اَور ہم دونوں بناتے بادلوں کے درمیاں
چاند کی کرنوں سے اپنا آشیاں!

کمی

یہ شبابِ لالہ و یاسمن
یہ عروسِ باغ کا بانکپن،
یہ بسیط بحر، یہ ندّیاں،
یہ بلند کوہ، یہ وادیاں،
یہ نگارِ صبح کی ساحری!
یہ سکوتِ شام کی دلبری،
یہ فضا کی وسعتِ پُرسکوں،
یہ فلک کا ساغرِ نیلگوں،
یہ حسین تارے، یہ کہکشاں!
تری کائنات ہے بیکراں!!
تری کائنات میں کیا نہیں! تری کائنات میں کیا نہیں!
تری کائنات میں اے خدا، مرے سوزِ غم کی دوا نہیں!

بے روزگار

رفیق نے کمرے میں قدم رکھنے سے پہلے ایک نگاہ اپنے لباس پر ڈالی خدا کی قدرت یہ وہی سوٹ تھا جو اُس نے آج سے تین سال پہلے ای۔ اے۔ سی کے ملاقاتی امتحان کے لئے بنوایا تھا۔ اب وہ اُس کو پہن کر سیٹھ محمد سلیمان صاحب کے سامنے بطور موٹر ڈرائیور کے پیش ہونے والا تھا۔ گذشتہ زمانے کی فراغت اور آسائش ایک دھندلے خواب کی طرح اُس کی آنکھوں کے سامنے جھلملا گئی عزت نفس نے تقاضا کیا کہ واپس چلا جائے یا کم از کم معمولی پھٹے پرانے کپڑے پہن کر آئے مگر موجودہ غربت اور پریشانی کے احساس نے دامن پکڑ لیا اور یہ سوچتے ہوئے کہ شاید پھر ایسا موقع بھی نہ ملے وہ دل پر پتھر رکھ کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ صرف سرسری نظر سے دروازے پر لٹکے ہوئے خوبصورت ریشمی پردوں اور بیش قیمت ساز و سامان کو دیکھ سکا۔ اُس پر نگاہ پڑتے ہی آتشدان کے پاس کوچ پر بیٹھے ہوئے ایک معمر صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور اخبار کو میز پر رکھ کر تعجب کے لہجے میں نیم متبسم ہو کر کہنے لگے "آیئے آیئے" یہ دیکھ کر رفیق پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کوئی معزز ملاقاتی ہے۔ جب سے قسمت پھوٹی تھی۔ اُس کو بارہا ذلت اور خفت کا سامنا ہوا تھا مگر آج تو ستم ہو گیا۔ اُس پر سرتاپا ایک اضطراری کیفیت چھائی ہوئی تھی اور کچھ نہیں سوجھتا تھا کہ کیا جواب دے۔ اُسے چُپ چاپ اپنی جگہ کھڑے دیکھ کر سیٹھ صاحب کی پیشانی کی جھریاں سمٹ کر سوالیہ نشان "؟" ــــــ بن گئیں۔ انہوں نے دوبارہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور کہا "تشریف تو رکھئے"۔

رفیق نے جواب دینا چاہا مگر اُس کی زبان تالو سے چمٹ گئی تھی۔ آخر خود کُشی کے اُس مرتکب کی طرح جو کئی بار اپنے حوصلہ و ہمت کی ناکام آزمائش کر کے یونہی چھلانگ لگا دیتا ہے۔ اُس نے کہہ دیا "کل جناب کے پڑوس میں ایک دُکاندار سے سُنا تھا کہ جناب کو شوفر کی ضرورت ہے میں اسی لئے ....."

"لاحول ولا" بے اختیار شیخ صاحب کے مُنہ سے نکل گیا اور وہ دھم سے اپنی جگہ پر گر پڑے۔ تمسخر آمیز ہنسی سے اُن کی بڑی بڑی سفید مونچھیں جھریوں سے پٹے ہوئے زرد زرد گالوں پر پھیل گئیں مگر دوسرے ہی لمحہ میں اُن کے ابرو یارُعب سنجیدگی سے سکڑ گئے اور آنکھوں میں دنیا داروں جیسی سرد مہری اور بے اعتنائی آ گئی۔

"تو تم شوفر ہو۔ ہوں" انہوں نے دُکاندار کی نظر سے رفیق کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا "تمہاری ہیئت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی والئی ریاست کے پاس رہے ہو۔ لاؤ سرٹیفکیٹ دیکھوں"۔

اُن کے اس مطالبے نے رفیق کو مایوس کر دیا۔ وہ بدستور اپنی جگہ کمر پر ہاتھ باندھے کھڑا رہا۔ بڑھایا ہوا ہاتھ واپس ہٹانے سے شاید سیٹھ صاحب کو ہتک محسوس ہوئی۔ وہ جھنجلا کر کہنے لگے "نہیں ہیں؟ مجھے تو شبہ ہے کہ تمہارے پاس لائسنس بھی نہیں ہوگا"۔ رفیق نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے جیب سے لائسنس نکال کر پیش کیا۔ ناامیدی نے اُس کے دل میں جرأت پیدا کر دی اور وہ بغیر سمجھے سوچے کہنے لگا "سیٹھ صاحب میں نے اپنے موٹر کے سوا کسی کا موٹر نہیں چلایا۔ یہ قسمت کے کھیل ہیں جو میں آپ کے سامنے شوفر کی حیثیت سے کھڑا ہوں ورنہ ...."

سیٹھ صاحب لائسنس کھول کر دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ اس کی بات سن کر چونک پڑے۔ حیرت سے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور آہستہ سے پوچھا "تم کون ہو میاں؟"

"ایک اجڑے ہوئے خاندان کا مصیبت زدہ فرزند" یہ کہتے ہوئے رفیق کی حمیت جو دنیاوی مصائب نے مجروح کر رکھی تھی چمک اُٹھی اور اُس نے سنبھلی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا "میں اپنے معزز باپ کا نام نہیں بتاؤں گا۔ مجھے اس چیز کی پروا نہیں کہ ایک گداگر کی طرح جھوٹ سچ بیان کر کے آپ کو متاثر کرنے کی کوشش کروں میرے والد مرحوم خدا بخشے بڑے متقدر زمیندار تھے مگر شہ خرچ ہونے کی وجہ سے مال و زر کو دونوں ہاتھوں سے لٹاتے تھے جائداد پہلے ہی قرض کے نیچے دب گئی تھی میری تعلیم پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ میں

نے کالج کے چار سال طالب علم کی طرح نہیں بلکہ ایک شہزادے کی طرح گذارے
بی اے میں کامیاب تو ہو گیا مگر مرحوم کی خواہش کے مطابق ڈپٹی نہ بن سکا۔ ایک
دو سال امیدوں میں کٹ گئے ہر طرف دوڑ دھوپ کی مگر بے سود۔ آخر یقین ہو
گیا ملازمتیں صرف وزیروں کے اقربا اور حاشیہ داروں کا اجارہ بن کے رہ گئی
ہیں۔ ساری عمر بے فکری میں کاٹنے کے بعد جب دنیا کے تلخ حقائق کا سامنا ہوا
تو اُن کا دل ٹوٹ گیا اور وہ مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر عالمِ بالا کو سدھار گئے۔
ساری جائداد سود در سود کے چکر میں غائب ہو گئی۔ اب میں روٹی تک کو محتاج ہو گیا
ہوں۔ چار سال تک اپنا موٹر رکھا تھا ہر طرف قسمت آزمائی کرنے کے بعد سوچا کہ
کسی شریف آدمی کی ملازمت ہی اختیار کر لوں۔ آپ سرٹیفکیٹ مانگتے ہیں۔ میرے
پاس خاندانی شرافت کے سوا سرٹیفکیٹ کہاں۔"

رفیق کی باتیں سن کر سیٹھ صاحب دیر تک سر جھکائے غور و فکر کے عالم
میں بیٹھے رہے۔ رفیق کو اُن کے چہرے سے صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ شک اور
یقین کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ وہ غیرت کے جوش میں آ کر تیز تیز باتیں تو کر گیا تھا
مگر اُس کو بخوبی معلوم تھا کہ اس کے پاس نانِ شبینہ کے لئے ایک پیسہ بھی نہ تھا۔
ایک مہینہ ہوا ہو گا جب اُس نے بصد حسرت و افسوس تلاشِ روزگار میں اپنے
گاؤں کو خیرباد کہا تھا۔ اس کے مکان پر ساہوکار کا قبضہ ہو چکا تھا۔ رفیق کی آنکھوں
کے سامنے وہ رات پھر گئی جب وہ ایک دور کے رشتہ کی بوڑھی خالہ سے گاڑی
کا کرایہ لے کر رخصت ہوا تھا کس طرح وہ رات گئے تک موچیوں کے ٹیلہ پر کھڑا محویت
کے عالم میں اپنے آبائی مکان کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ گیارھویں کا چاند ہلکی پھلکی بدلیوں
کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ باہر کا بڑا پھاٹک جس کے کواڑ پر وہ بچپن میں سوار ہو کر اُسے اِدھر
اُدھر دھکیلا کرتا تھا دھندلکے میں کسی ناقابلِ تسخیر قلعہ کا دروازہ معلوم ہوتا تھا۔ ہوا کے
جھونکے صحن میں لگے ہوئے سرس کے درخت کی ٹہنیوں میں سرسرا رہے تھے وہ جگہ
جہاں رات کو بہت دیر تک گہما گہمی رہتی تھی ویران اور سنسان پڑی ہوئی تھی۔
سامنے نشست خانے کی منڈیر پر چھائی ہوئی عشق پیچاں کی بیل اس عورت کے
بالوں کی طرح پریشان دکھائی دیتی تھی جو اپنے کسی عزیز کے ماتم میں سوگوار ہو۔
ایک مرتبہ اُس نے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے حویلی کا چکر لگایا۔ مشرقی دروازے
پر ایک مریل سا کتا بھونکتا ہوا اُس کی طرف لپکا۔ اندر سے کسی کی کرخت آواز آئی
"کون ہے؟" وہ گرم آنسوؤں کو جو اُس کے رخساروں پر ٹپ ٹپ گر رہے تھے
پونچھتا ہوا کھیتوں میں سے ہو کر اسٹیشن کی طرف چل دیا اب وہ اپنے مکان میں
صرف چور بن کر ہی داخل ہو سکتا تھا۔

"دیکھو میاں! تمہارا نام کیا ہے" سیٹھ صاحب کی آواز نے اُسے چونکا
اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا "رفیق احمد"
"رفیق احمد" سیٹھ صاحب دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے اُس
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں تمہاری باتوں کو سچا سمجھتا ہوں۔ اگر تم نے
میرے اعتماد کا پاس رکھا تو زیادہ عرصے تک شوفر نہیں رہو گے۔ اب جاؤ کل
صبح سے کام پر آ جانا۔"

اُسے کام تو مل گیا۔ موٹر ڈرائیوری کا ہی سہی۔ بہر حال دربدر کی ٹھوکروں
سے نجات تو ہوئی۔ اس خیال سے اُسے مسرور ہونا چاہیئے تھا مگر اُلٹا اس کی طبیعت
پر ملال سا چھا گیا۔

دوسرے دن صبح کو رفیق اپنا سامان لے کر سیٹھ صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گیا
اُس کا سارا مال و متاع ایک آہنی ٹرنک ایک پرانے چرمی بیگ اور ایک بستر پر
مشتمل تھا۔ ٹرنک میں بیس پچیس ادبی کتابیں اور متفرق اشیا تھیں اور بیگ میلے
کپڑوں سے ٹھسا ہوا تھا ان میں بیشتر کپڑے کالج کے زمانے کے تھے۔ جو کثرتِ
استعمال سے بوسیدہ ہو گئے تھے۔ رفیق کو دیکھ کر علو بہرا اور بوڑھا ملازم شمّا جن
سے کل وہ شناسائی پیدا کر گیا تھا قریب آئے اور اُس کا سامان ہاتھوں ہاتھ
اٹھا کر ڈرائیور کے کوارٹر میں جو کوٹھی کے مغربی کونے پر موٹر گراج کے پاس بنایا گیا
تھا رکھ آئے۔ یہ ایک تنگ و تاریک کمرہ تھا۔ چھت پر بڑے بڑے جالے لٹکے ہوئے
تھے اور دیواروں پر مینہ کا پانی ٹپکنے کے لمبے لمبے نشان بنے ہوئے تھے۔ اُس نے
ایک الماری میں جس کے دروازے ندارد تھے اپنا ٹوٹا پھوٹا آئینہ کنگھا اور کتابیں جوڑ
دیں۔ ٹرنک کو ایک کونے میں رکھا۔ ایک چھوٹی سی چارپائی پر جس کے چاروں پائے
مختلف نمونوں کے تھے اپنا بستر بچھا دیا۔ اُسے دیکھ کر علو، شمّا کے علاوہ ایک نوجوان
ملازم اور ایک باتونی بڑھیا سب اندر گھس آئے پہلے انہوں نے باری باری رفیق
کے جوتوں میں اپنے اپنے پاؤں ڈال کر دیکھا۔ بڑھیا اُس کے کپڑے الٹ پلٹ کر
دیکھنے لگی اور علو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بالوں میں کنگھا کرنے لگا۔
جب اچھی طرح اپنا اطمینان کر چکے تو اُس کے گرد کھڑے ہو کر اس پر سوالات کی بوچھاڑ
کرنے لگے۔ رفیق اُن کی بدتمیزی پر جی ہی جی میں پیچ و تاب کھاتا رہا مگر کیا کرتا نو وارد
تھا ہر ایک کو خوش رکھنا ضروری تھا۔ اگر وہ گنجے خانساماں سے بگاڑتے تو وہ اُسے بجائے
سالن کے چچوڑی ہوئی ہڈیاں دے گا اور اگر علو کی ہر بات پر ہاں میں ہاں نہ ملائے تو وہ
سیٹھ صاحب کے کان بھر دے گا۔ خدا خدا کر کے وہ باہر نکلے تو رفیق بستر کی ٹیک
لگا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ الٰہی! اس صحبتِ ناجنس میں کس طرح گذر سکے گی۔ آخر
خیالات کی کشمکش سے گھبرا کر وہ کھڑکی کے سامنے جو کوٹھی کے وسیع اور گھاس سے

ڈھکے ہوئے میدان کی طرف کھلتی تھی کھڑا ہو کر باہر دیکھنے لگا۔ قدرت کے اس حسین منظر کو جس پر دیہات کا شبہ ہوتا تھا سامنے کے دومنزلے مکان نے شہری رنگ دے دیا تھا۔ اِس میدان کے چاروں طرف دیوار کے ساتھ ساتھ جامن شیشم اور سفیدے کے درخت لگے ہوئے تھے رشروع خزاں کی ہوا اُن کے پتوں کو ٹہنیوں سے نوچ نوچ کر اِدھر اُدھر اُچھال رہی تھی۔ شمالی کونے پر ٹینس کھیلنے کا میدان بنا ہوا تھا۔ اس کی سفید لکیریں مٹ گئی تھیں اور جابجا چیونٹیوں کے ٹیلے دکھائی دیتے تھے۔ گھاس میں بھی کہیں کہیں زرد دھبّے پڑ گئے تھے۔ کوٹھی کی چھت پر ریڈیو کا ہوائی لگا ہوا تھا۔ جب وہ کھڑے کھڑے تھک گیا تو پہرے سے چابی منگا کر گاڑی باہر نکالی۔ بالکل نئی مرکری تھی۔ پچھلے پہر علو اپنے کام سے فارغ ہو کر حقہ گڑگڑاتا ہوا اس کے پاس آبیٹھا اور رازداری کے لہجے میں سیٹھ صاحب کے گھر کے متعلق تفصیلات بیان کرنے لگا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ چھ برس ہوئے سیٹھ صاحب کی بیوی فوت ہو گئی۔ اُن کی اولاد میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی بچ رہے تھے۔ لڑکا علی گڑھ میں پڑھتا تھا۔ اور لڑکی گورنمنٹ کالج میں ایف اے کے دوسرے سال میں تعلیم پاتی تھی اور بقول علو بڑی چنچل، خودسر اور سیر و تفریح کی دلدادہ تھی۔ سیٹھ صاحب کو اس سے بے حد محبت تھی مگر چونکہ وہ پرانی وضع کے آدمی تھے اس لئے اس کی آزادروی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ علو کی ہمدردی سراسر سیٹھ صاحب کے ساتھ تھی۔ بیٹی کا ذکر کرتے ہوئے اس کا لہجہ ناشائستہ ہو جاتا تھا جو رفیق کو بہت بُرا معلوم ہوا۔ ابھی اس کی باتیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ اُسے آواز پڑی۔ وہ حقہ چھوڑ کر بھاگا۔

"ڈرائیور کہاں ہے" سیٹھ صاحب اُس سے پوچھ رہے تھے۔ رفیق نے جلدی سے کوٹ پہنا۔ ٹوپی اوڑھی اور پیشتر اس کے کہ علو اسے آکر بلائے باہر نکل گیا سیٹھ صاحب چبوترے کے سامنے پام کے پودوں کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ اُن کے سامنے ایک دراز قد لڑکی پستئی رنگ کی ساڑھی پہنے کھڑی اپنی کلائی کی گھڑی دیکھ رہی تھی۔ اس کی گوری گوری کلائی پر چھوٹی سی سیاہ گھڑی اُسے بہت خوشنما معلوم ہوئی۔ اس نے سر کے بھورے بالوں کو دو لمبی زلفوں میں بٹ کے شانوں پر ڈال دیا تھا ہلکے سنہرے ابرؤوں کے نیچے دو متحرک شربتی آنکھیں جو اس کی طرف مڑیں اچہرے کے نقوش پر کیا ساری دنیا پر چھا جانا چاہتی تھیں۔

"زرینہ بیٹی ماما کے بغیر کبھی باہر نہ جایا کرو" سیٹھ صاحب کہہ رہے تھے اُن کے چہرے پر کبیدگی کے آثار دکھائی دیتے تھے "ڈرائیور جو ساتھ ہوتا ہے" زرینہ نے چمک کر جواب دیا "مگر ابا جان آپ اِن معمولی باتوں پر اصرار کیوں کرتے ہیں۔ میں کیا بچہ ہوں جو کھو جاؤں گی مردی روبی ارے شریر کہاں غائب ہو گیا!"

ایک پستہ قد سیاہ لمبے بالوں والا خوبصورت کتا گملوں کے پیچھے سے نمودار ہوا اور اُس کے قدموں میں کھڑا ہو کر دُم ہلانے لگا۔ سیٹھ صاحب چپ چاپ اپنی جگہ زمین پر چھڑی سے لکیریں کھینچتے رہے۔ پھر رفیق کی طرف مخاطب ہو کر کہا "رفیق احمد! میں اپنی گاڑی خود چلاتا ہوں۔ تم اپنے آپ کو بی بی کا ڈرائیور سمجھو۔ دیکھو اِن کی خدمت میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہونے پائے۔" پھر روئے سخن بیٹی کی طرف کر کے کہا "بیٹی جلدی لوٹ آیا کرو" اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اندر چلے گئے۔

"تم نئے ڈرائیور ہو" زرینہ نے اِس انداز سے مڑ کر کہا جیسے اس کو رفیق کی جگہ پر کوئی آدمی کھڑا ہوا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ "جلدی کرو گاڑی لے آؤ۔"

رفیق نے گاڑی لاکر کھڑی کر دی اور باہر نکل کر پٹ کھول دیا۔ پھاٹک کے باہر جا کر وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ کدھر چلے کہ بی بی نے خود ہی کہہ دیا "لارنس باغ"۔

رفیق کو مدت کے بعد موٹر چلانے کا اتفاق ہوا تھا۔ آج اُسے وقت سی محسوس ہو رہی تھی۔ نیو ہوسٹل کے پاس سے گذرا تو وہ اس تصوّر میں مگن تھا کہ اپنی گاڑی لئے جا رہا ہے۔ اسی ہوسٹل کی کھڑکیوں میں کھڑے ہو کر لڑکے اُسے سڑک پر گذرتے ہوئے دیکھ کر حسرت اور رشک سے جل جایا کرتے تھے۔ اِس وقت وہ اپنے پیچھے بیٹھی ہوئی بھورے بالوں اور سنہرے مکھڑے والی لڑکی کو بھی بھول گیا تھا۔

"ارے ہاں تانگہ ہے تانگہ" کسی نے اس کے کوٹ کا کالر کھینچتے ہوئے کہا۔

رفیق نے غیرارادی طور پر گاڑی بائیں جانب موڑلی اور بال بال بچ گیا ورنہ خدا معلوم اس ٹکر کا کیا انجام ہوتا۔

"عجیب بدحواس ڈرائیور ہو تم" زرینہ کی آواز دہشت سے کانپ رہی تھی وہ شرمندگی کے باعث کچھ نہ کہہ سکا اور چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد زرینہ نے کہا "رفیق احمد یہی ہے نا تمہارا نام!"

"جی ہاں"

"کچھ اردو وغیرہ جانتے ہو" یہ پوچھتے ہوئے اس کے لہجے میں نرمی آگئی تھی۔

"جی ہاں" رفیق نے جواب دیا اور اِس کے سوا کہتا بھی کیا۔

"دیکھو اس بات کا خیال رکھنا ہو گا۔ ابا جان نہ سن پائیں کہ ہم کدھر گئے تھے کہاں بیٹھے۔ اگر وہ پوچھیں تو جو میں کہوں وہی کہنا ہو گا۔ اور میرے پاس خوش رہو گے" آخری فقرہ بی بی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مہربانی" رفیق نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

وہ چڑیا گھر کے پھاٹک کے پاس پہنچے ہوں گے کہ زرینہ نے اُسے ٹھہرنے

کے لئے کہا۔ معاً ایک ہڈسن گاڑی اُن کے قریب آکر رُک گئی۔

"ہلو! زرینہ مزاج کیسا ہے؟" ایک درمیانہ قد کے خوبرو نوجوان نے گاڑی سے اُچھل کر باہر نکلتے ہوئے انگریزی میں کہا "تم دیر سے آئیں"۔

"کچھ زیادہ دیر تو نہیں ہوئی" بی بی نے اُسی زبان میں جواب دیا۔ اس کے بعد طے ہوا کہ عابد کا ڈرائیور لڑکے کو پیچھے پیچھے آئے اور وہ خود زرینہ کی گاڑی میں بیٹھ کر نہر پر جائیں۔ جب وہ روانہ ہوئے تو عابد نے مشکوک لہجے میں پوچھا "تمہارا نیا شوفر پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔ انگریزی تو نہیں جانتا"۔

"تم سے کہیں زیادہ" زرینہ نے طنزاً جواب دیا۔

زرینہ اور عابد کے اس طرح چھپ چھپ کر ملنے سے رفیق کو نعتعا اچنبھا نہ ہوا۔ اُس نے کالج کے زمانے میں کئی ایسے واقعات دیکھے تھے اور بعض میں خود بھی حصہ لیا تھا۔ اس کا اخلاقی نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کا میل جول چنداں قابلِ اعتراض نہیں۔ مگر آج اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے عابد نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے اور وہ اُسے قانون کے چنگل سے بچ نکلنے میں مدد دے رہا ہے۔

عابد پہلے تو ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا پھر کہنے لگا "زرینہ تم خیال کرتی ہو گی کہ تمہارے ساتھ میری بے پناہ محبت کا ظہور چند ہفتوں سے ہی ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج سے ایک سال پہلے جب میں نے پہلی بار تمہیں لائبریری میں کھڑے ہوئے دیکھا تھا میں تمہارے دلفریب حُسن کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی محبت کو پہلو میں چھپائے رکھا اور انتظار کرتا رہا اُس مبارک گھڑی کا جب تم میرے جذبے کی تپش کو محسوس کرو گی اور میری کشتِ آرزو پر اپنی اُلفت کی بدلی برساؤ گی۔ میری محبت کے سچا ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ تمہارا دل بھی اُس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکا"۔ وہ دیر تک اسی بحر میں دادِ سخن دیتا رہا۔ رفیق کو بھی ایسے کئی رومانی فقرے یاد تھے ان میں کیٹس۔ ہیوگو۔ بائرن وغیرہ شعرا کے خیالات کو موقع کے مطابق اپنی گفتگو کا جزو بنا لیا جاتا۔ بے چاری بھولی بھالی لڑکیاں اپنے حسن کی مبالغہ آمیز تعریف سن کر خوشی سے پھولی نہیں سماتیں۔ وہ بسا اوقات اپنے آپ کو کسی فلم کی ہیروئن سمجھ کر حریصانہ توجہ سے اپنے کانوں کو محبت کے شیریں الفاظ سے سیراب کرتی ہیں۔ بعض کو تو یقین ہو جاتا ہے کہ جس انطونی کا انہیں انتظار تھا وہ آ گیا رفیق بھی اس فن میں کچھ درک رکھتا تھا مگر یہ عابد تو ماہرِ فن تھا۔ اس کی زبان میں اس بلا کی روانی اور گفتگو میں ایسا سحر تھا کہ کئی دفعہ وہ بھی جھوم جھوم اُٹھا۔ زرینہ تو آسمانی بلندیوں پر پرواز کر رہی تھی۔

ڈرائیوروں کو نہر پر چھوڑ کر دونوں باتیں کرتے ہوئے نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ پیدل چلے گئے۔ اس وقت شام کا جھٹپٹا چھا رہا تھا۔ شفق کی اُودی سُرخی سیاہی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ رفیق باہر نکل کر عابد کے ڈرائیور سے جس کا نام رکھو تھا باتیں کرنے لگا۔ رکھو نے فوراً اُسے اپنا رازدار بنا لیا اور کہنے لگا کہ میرے صاحب نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اس سیٹھانی سے راہ و رسم پیدا کی ہے میں نے اپنے ہاتھوں سے شما اور تم سے پہلے ڈرائیور کو پچاس روپے دیئے۔ وہ ڈرائیور تو بڑا نمک حرام تھا۔ ہاں شما نے تن دہی سے کام کیا اور خط وغیرہ پہنچاتا رہا۔ یہ یہ اُسی کی عنایت ہے کہ پچھلے سوموار سیٹھانی صاحب کو ملنے آ ہی گئیں۔ دیکھو اُس نے جھک کر رفیق کے کان میں کہا "اگر تم نے ہماری مدد کی تو رنگ دیئے جاؤ گے"

رفیق کا جی چاہا کہ اس ملعون کو اُٹھا کر نہر میں پھینک دے مگر معلومات اخذ کرنے کے خیال سے چُپ رہا۔ دورانِ گفتگو میں اُس کی نگاہیں بی بی پر گڑی تھیں وہ کافی دور نکل گئے تھے اور دھندلکے میں سایوں کی طرح نظر آتے تھے۔ عابد کئی دفعہ چلتے چلتے بی بی کے ساتھ لگ گیا مگر وہ ہر بار ایک طرف ہٹ جاتی تھی جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہونے لگی تو رفیق موٹر لے کر اُن کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں گاڑی کے اندر بیٹھ گئے مگر دیر تک خاموش رہے۔ آخر عابد نے اس سکوت کو توڑا اور غمزدہ سی آواز میں کہنے لگا "زرینہ! تم میرا دل توڑ دو گی۔ جب تم نے تسلیم کر لیا کہ مجھے تم سے سچّی محبت ہے تو پھر کیوں مجھ سے گریز کرتی ہو؟"

"گریز کرتی تو آتی ہی کیوں" زرینہ نے آہستہ سے جواب دیا۔

"یہ ستم بالائے ستم ہے" عابد جھلّا کر کہنے لگا "ایک جاں بلب پیاسے کے ہونٹوں سے پانی کا آبخورہ مس کر کے واپس ہٹا لینا کیسی سنگدلی ہے"۔

"اگر میں سنگدل ہوں تو قرب کی خواہش ہی کیوں کرتے ہیں آپ؟" زرینہ نے کہا۔

"میری بے چارگی" عابد نے ایسی مظلومیت اور مسکینی کے لہجے میں کہا کہ زرینہ بے اختیار کہہ اُٹھی "کیا ہم اس موضوع کو چھیڑے بغیر خوش نہیں رہ سکتے تم تو معمولی باتوں کو بھی دل میں جگہ دے دیتے ہو"۔

"تمہارے نزدیک معمولی مگر میرے لئے موت کی طرح اہم" عابد نے کسی رومانی اداکار کے لہجے میں کہا۔

اس اثنا میں وہ باغ کے دروازے پر پہنچ گئے تھے۔ عابد اپنی گاڑی میں جا بیٹھا اور رفیق نے گھر کا رُخ کیا۔ راستے میں ایک جگہ بی بی نے اُسے گاڑی روکنے کے لئے کہا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر رفیق کو کچھ دینا چاہا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا تو وہ کہہ رہی تھی "یہ لو دس روپے ہیں تم ابھی ابھی آئے ہو، چھوٹی موٹی کئی ضروریات ہوں گی"۔

رفیق اس کا عندیہ سمجھ گیا، یہ رازداری کا عوض تھا۔ اس نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا "مہربانی مگر مجھے ضرورت نہیں!"

"یہ بھی لو کام آئیں گے" اُس کے لہجہ میں لجاجت اور لاڈ سا پایا جاتا تھا۔

"مجھے نہیں چاہئیں" رفیق نے روکھے پن سے جواب دیا۔

"ارے تم مالک کے ساتھ اس گستاخانہ لہجہ میں بات کرتے ہو" زرینہ نے سپٹ کر کہا "نالائق۔ بے ادب"

رفیق نے اُس رات سونے کی بہت کوشش کی مگر دیر تک نیند نہ آئی۔ اُسے مدت سے بے خوابی کی شکایت تھی۔ رات کو اکیلے میں اس کو اپنی بے سروسامانی اور خانماں بربادی کا احساس ستاتا رہتا تھا۔ وہ پہروں ایک کروٹ پر پڑا اپنے آرام و آسائش کے دنوں کو یاد کرکے آنسو بہاتا رہتا۔ کتنے اچھے دن تھے وہ اپنی خوشی سے جاگنا۔ اپنی مرضی سے سونا جس چیز کی خواہش ہوئی حاصل کرکے چھوڑی دوستوں کے سنگ جگمٹے تھے۔ سیر و شکار کھیل تماشے میں دن گذر جاتا تھا۔ جوانی کی اُمنگ تھی اور دل میں ترنگ۔ اِدھر بھاگے اُدھر دوڑے روپے کی کمی نہ تھی قیمتی سے قیمتی لباس پہننے کو تھا۔ بڑے ٹھاٹھ سے بسر ہوتی تھی۔ زمانے نے جو پلٹا کھایا تو زمین آسمان ہی بدل گئے۔ اس کے والد ایک بڑی حد تک اس انقلاب کے ذمہ دار تھے۔ مگر جب وہ اُن کی محبت کا خیال کرتا تو اُن پر الزام رکھنے سے گھبراتا تھا۔ جائداد ہاتھ سے نکلنے کی دیر تھی سب احباب رخصت ہوئے۔ بھولے سے کوئی راستہ میں مل جاتا تو وہ بھی نظر بچا کر نکل جاتا۔ اُن کے نقائص جو دولت نے چھپا رکھے تھے اب ظاہر ہونے لگے وہی لوگ جو دن رات اُن کے دروازے پر پڑے رہتے تھے اب اُسے "اے رفیق" کہہ کر بلانے لگے۔ والد کی وفات کا صدمہ اور اس کے بعد یہ انقلاب۔ مہینوں اس پر بے خودی کی کیفیت رہی۔ اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا بھول گیا۔ دن بھر ایک رشتہ دار کے ہاں پڑا رہتا۔ اُس کے دل و دماغ کو ایسا صدمہ پہنچا کہ دنیا اور دنیا والوں سے نفرت ہو گئی۔ انسانوں کی جگہ ہر طرف اُسے درندے ہی درندے نظر آنے لگے جو خود غرضی، سنگدلی، مطلب پرستی اور محسن کشی کے پنجوں سے ایک دوسرے کو پھاڑے ڈالتے ہیں۔ پورے ایک سال بعد وہ اس قابل ہوا کہ سنجیدگی سے بیٹھ کر اپنے حالات پر غور کر سکے۔ ایک عرصہ تک اپنے والد کے دوستوں کے در پر ٹھوکریں کھاتا رہا۔ اس کا سفارشی خط اُس کے پاس لے جا اُس کا اس کے پاس لے آ بڑی خاک چھانی مگر کچھ حاصل نہ ہوا اُسے اس بات پر بھی شک ہونے لگا کہ وہ بھی کبھی کسی رئیس کے گھر کا چراغ تھا۔ ہر قسم کے ذرائع معاش پر غور کیا۔ بی اے کی ڈگری کسی کام نہ آئی۔ پڑھا لکھا بھی تقریباً بھول گیا تھا۔ ناز و نعمت میں پرورش پائی تھی

مشقت کرنے سے وہ رہا۔ آخر کرتا تو کیا کرتا اور جاتا کہاں جاتا۔ اسی کشمکش سے گھبرا کر اس نے بارہا خودکشی کا ارادہ بھی کیا تھا۔ اگرچہ وہ اس ارادے کو پورا نہ کر سکا مگر نامحسوس طور پر اس کے احساسات مُردہ ہو چکے تھے۔

آج رات کو بھی وہ حسب معمول بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا مگر اس کی وجہ غربت کا احساس نہیں تھا بلکہ ایک قسم کا عجیب و غریب اضطراب ایک ایسی بے قراری جو جاڑے کی یخ بستہ ٹہنی کو بہار کے سورج کی پہلی کرنوں کی تپش محسوس کرکے ہوتی ہے۔ پھولنے پھلنے کی خواہش، زندہ رہنے کا شوق۔ خود نمائی کا جذبہ۔ دوسروں کو متاثر کرنے کی اُمنگ۔ ان جذبات کے ہجوم نے اس کی آنکھوں سے نیند اڑا دی تھی۔

"وہ آزاد خیال۔ تیز مزاج۔ ضدّی سب کچھ تھی مگر کس قدر باحیا کہ اُس کو عابد کے ہاتھ کا مَس بھی گوارا نہیں تھا۔ دوشیزگی کے بھولے پن کے باعث وہ اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گئی تھی۔ مگر میری موجودگی اُس کو ہر قسم کی آلائشوں سے محفوظ رکھے گی۔ میرا اخلاقی فرض بھی یہ ہے کہ میں اپنے مالک کی عزت کی حفاظت کروں ..... وہ گورا گورا چہرہ۔ وہ شربتی حیران سی آنکھیں۔ وہ لمبے لمبے بھورے بالوں کی دو لٹیں جو مست سانپوں کی طرح ہوا میں لہرا لہرا کر ایک دوسرے سے ملنے کے لئے بے قرار رہتی ہیں"

رفیق کو سیٹھ صاحب کے ہاں ہر طرح کا آرام میسّر تھا۔ اُن کے ملازموں نے شروع شروع میں اُس کے ساتھ بے تکلفی پیدا کرنے کی کوشش کی مگر اُسے اپنا ہم مشرب نہ پا کر کنارہ کشی اختیار کر لی۔ وہ اپنی خلوت کو مطالعہ سے معمور رکھتا ہاں روبی اور اُس کی خوب دوستی ہو گئی تھی۔ وہ بسکٹ کے ٹکڑے کی توقع میں جو اُس کو دیکھتے ہی خدا معلوم کیسے رفیق کے ہاتھ میں آ جاتا تھا صبح سویرے بھاگتا ہوا آیا کرتا اور اُسے تڑپ تڑپ کر شاید اس خیال سے تھوڑی دیر بیٹھ جاتا کہ میاں رفیق میں بسکٹ کے لئے نہیں بلکہ تم سے ملنے کے لئے آتا ہوں کئی بار وہ رفیق کے جوتے اُٹھا کر باہر درختوں کی جڑوں میں رکھ آتا۔ جب رفیق اُسے جھڑکتا تو یہ بے پروائی سے دُم ہلاتا ہوا اچھل دیتا جیسے وہ بھی اس کو اپنا ملازم سمجھتا ہے۔

رفتہ رفتہ وہ رفیق سے بہت مانوس ہو گیا۔ جب بی بی موٹر میں داخل ہوتی تو وہ اچک کر رفیق کے پاس جا بیٹھتا اور کبھی کبھی اس کی گود میں سر رکھ کر سو رہتا۔ چلنے اور کھانے کے وقت کے سوا وہ بی بی کے ہاں سے اکثر غائب رہنے لگا بی بی نے اُسے ڈانٹا بھی مگر وہ صدر رجہ خود رائے ثابت ہوا۔

بی بی کو رفیق کے متعلق عجیب بدگمانی سی پیدا ہو گئی تھی۔ جب اُس نے

ابا جان کے سامنے اُس کی گستاخی کی شکایت کی تو وہ مسکرا کر چُپ ہو رہے وہ سمجھنے لگی تھی کہ شاید سیٹھ صاحب نے اُس کو جاسوس بنا کر چھوڑ رکھا ہے۔ اگر اُس کا اختیار ہوتا وہ کبھی رفیق کے سامنے عابد سے ملاقات نہ کرتی۔ مگر کیا کرتی مجبور تھی۔ عابد کے اظہارِ الفت نے اُس کے سراپا پر ایک اعصابی ہیجان کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کے مقررہ اوقات میں خلل آگیا تھا کئی دفعہ وہ چوری کی ملاقاتوں سے گریز کرنے کا ارادہ بھی کرلیتی مگر وقت قریب آتا تو خبر نہیں کس طرح اس کے پاؤں اُس جانب اُٹھ جاتے۔ عابد کا طرزِ گفتگو ایک نوجوان ناتجربہ کار لڑکی کے لئے حد درجہ خطرناک تھا۔ اپنی محبت کے سلسلے میں وہ یونان اور روم کے دیوتاؤں کے قصے بیان کرتا اور اس کے خد و خال کی تعریف میں حد درجہ مبالغے سے کام لیتا۔ وہ ہمیشہ اپنی باتوں سے ایک خیالی دنیا آباد کرنے کی کوشش کرتا جس میں زندگی کے تلخ حقائق قطعاً فراموش ہو جائیں۔ رفیق کو تعجب ہونے لگا کہ عابد کی تمام رنگین بیانی زرینہ کے حجابِ نسوانی پر غالب نہ آسکی۔ وہ عابد کی باتیں یقیناً غور سے سنتی اور محظوظ بھی ہوتی مگر اس کے باوجود عابد کو کبھی دست درازی کی جرأت نہ ہو سکی۔ ایک دن عابد رسم شادی کے خلاف تقریر کر رہا تھا کہ زرینہ نے پُر زور الفاظ میں اس کے ساتھ اختلافِ رائے کا اظہار کیا۔ وہ جھلا کر کہنے لگا "تم نے تو فیشن ایبل لباس کے نیچے دقیانوسی دل چھپا رکھا ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ محبت کی تکمیل کے لئے نکاح وغیرہ کی پرانی رسموں کی محتاجی اٹھائی جائے۔ جوانی میں انسان کے لئے صرف دو قانون ہیں حسن اور عشق۔ سماج کی بندشیں۔ اخلاق کی پابندیاں مذہب کے اصول اُن بوڑھے لوگوں نے قائم کر رکھے ہیں جو شباب کی سرخوشیوں سے خود تو فیضیاب نہیں ہو سکتے اور جوان لوگوں کو حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کیا توہمات کی پیروی کئے بغیر محبت کرنے والی دو روحوں کا ملاپ نہیں ہو سکتا۔؟"

ناپاک ارادوں کو ظاہر کرنے کے لئے اِن سے زیادہ پاکیزہ الفاظ کیا ہوں گے مگر یہ نرالی منطق زرینہ کی سمجھ میں نہ آسکی۔ ایک شام کو زرینہ نے سیٹھ صاحب سے کہا کہ میں آج سینما جاؤں گی۔ رفیق گاڑی لے کر باہر نکلا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی "میاں ابلی بارہ دری کو۔"

جب وہ پُل پر سے گذر کر سڑک کے بائیں جانب مڑے تو رفیق کی طبیعت پر ایک عجیب سکون اور فراغت سی چھا گئی تیرھویں کا چاند نوز کے غبار میں لپٹا ہوا درختوں کے پیچھے سے اُبھر رہا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے خوشگوار معلوم ہوتے تھے۔ کھجوروں کے لمبے تڑنگے درخت ایک نورانی دھندلکے میں بے حس و حرکت کھڑے اُن فرشتوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے جو باہم مل کر دعا میں مشغول ہوں ہر طرف فرحت بخش چاندنی چھٹکی ہوئی تھی رفیق نے گاڑی کنویں کے پاس کھڑی کر دی اور بی بی کے پیچھے بارہ دری کی طرف بڑھا۔ دن کے وقت بارہ دری کے کھنڈر بالکل ویران اور افسردہ معلوم دیتے ہیں مگر چاندنی نے ان کی شکستگی کو بڑی حد تک ڈھانپ رکھا تھا رہی سہی کسر رفیق کے تخیل نے نکال دی تھی۔ اسے اپنے آگے آگے جاتی ہوئی دراز قد اور نازک بدن لڑکی کو دیکھ کر سرو کے ان درختوں کا خیال آگیا جو کسی زمانے میں یہاں شبِ ماہتاب میں سیر کرتی ہوئی بیگمات کو اُن کے قد کی رعنائی کا احساس کرا دیتے تھے۔ جب وہ محراب کے قریب پہنچے تو رفیق حیران سا ہو گیا کہ اپنی شہزادی کے اعزاز میں کیوں کنیزیں اور لونڈیاں آداب بجالاتی ہوئی دوڑ کر باہر نہیں نکل آئیں "تکلیف فرمائی کا شکریہ" عابد جھٹ کے قریب بیلجئت ایک بھوت کی طرح اُٹھ کھڑا ہوا۔ رفیق کے تمام تخیلات خاک میں مل گئے۔ "کشتی وہ اجھاڑی کے پاس بندھی ہے"۔ وہ کہہ رہا تھا "اگرچہ پرانی اور شکستہ ہے مگر اس کا نام ہے قلوپطرہ اور اسے اس لئے انتخاب کیا گیا ہے کہ تم بھی تو قلوپطرہ کی طرح حسین اور کافرادا ہو۔ دیکھو کیسی نسبت پیدا کر دی۔ مگر تم تو کبھی میرے ذوقِ سلیم کا اعتراف نہ کرو گی۔ یہ چاندنی رات یہ مسرت بخش خنکی۔ یہ دریا کی رو پہلی لہریں اور یہ آپ کا حبشی غلام۔ ملکۂ عالم مجھے کو شرف بخشیئے۔"

زرینہ کھلکھلا کر ہنستی ہوئی نیچے اُتر گئی اور کشتی میں بیٹھ گئی۔ رفیق بھی چھلانگ لگا کر اندر چلا گیا۔ عابد نے چپو اُٹھاتے ہوئے رفیق کو مخاطب کر کے کہا "دیکھو میاں ہوٹر کے پاس رہنا۔ باغبانوں کے لڑکے شیشے وغیرہ توڑ دیا کرتے ہیں"۔ اور پھرتی سے ہاتھ مارنے لگا۔ آناً فاناً کشتی کنارے سے دور ہو گئی۔ رفیق جال کے پرانے درخت کے نیچے بیٹھ کر اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ دریا میں پانی بہت کم تھا۔ مگر چاندنی میں سامنے کے کنارے کی چمکتی ہوئی ریت پر بھی پانی کا دھوکا ہوتا تھا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کشتی ایک بحرِ ناپیدا کنار میں دھکیل دی گئی ہے اور کبھی واپس نہیں آئے گی۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد زرینہ کے قہقہوں کی سریلی آوازیں سطحِ آب پر تھرتھراتی ہوئی اس کے کانوں میں پڑتی تھیں۔ اس وقت وہ ایک روحانی اذیت محسوس کر رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑے اور دانتوں سے درختوں کی جڑیں کاٹ ڈالے۔ سردی کے باعث جھینگر اور کیڑے چھپ گئے تھے مگر دہرارض کے بطن سے عجیب و غریب ہلکی نامحسوس سی آوازیں اُٹھ رہی تھیں جن کا احساس کانوں سے زیادہ روح کو ہوتا تھا۔ ازلی اور ابدی زندگی کے نمو کی صدائیں جنہیں کند حواس رکھنے والے لوگ سکوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ گرد و پیش کی فضائی وسعت نے اُس کے دل کو تسکین سی بخش دی اور اُس پر خود فراموشی کا عالم طاری کر دیا بیٹھے بیٹھے اُس کا سر دونوں گھٹنوں

پر جھک گیا اور وہ دیر تک غنودگی اور نیم بیداری کی حالت میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ ایک بار سرد ہوا کا جھونکا جو آیا تو بے اختیار اُس کی نیم وا آنکھیں کھل گئیں اور اُسے اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ کہیں عابد کی معیت زرینہ کے لئے میری تنہائی سے زیادہ وحشت انگیز نہ ثابت ہو۔ یہ خیال آتے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دریا کے بہاؤ کی طرف دیکھنے لگا۔ مگر کشتی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ وہ کنویں کے پاس جا کر کنارے پر اتر گیا اور ادھر اُدھر دیکھتا ہوا تیزی سے قدم اٹھانے لگا۔ اس کو یہ خیال رہ رہ کر ستا رہا تھا کہ اگر بی بی نے اس کو جاسوسوں کی طرح اپنا پیچھا کرتے ہوئے دیکھ لیا تو آفت آ جائے گی اگر وہ اُس وقت کشتی کو دیکھ لیتا تو فوراً واپس مڑ جاتا مگر پانی کی نورانی سطح کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ معاً اُس کی آنکھوں کے سامنے عابد کی درندوں جیسی حریص نگاہیں پھر گئیں اور وہ دوڑنے لگا۔ اُس کے پاؤں ریت میں کھُب کھُب گئے مگر وہ دوڑتا گیا آگے آگے اور آگے۔ یہاں تک کہ اُس کا سانس پھول گیا اور وہ یہ سوچتا ہوا کھڑا ہو گیا کہ شاید وہ دوسرے کنارے پر چلے گئے ہوں مگر وہ اسی تذبذب کی حالت میں تھا کہ اُسے روبی کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ یہیں تھے۔

وہ لپک کر آگے بڑھا آہ! اس کا اندیشہ صحیح تھا۔ ببول کے درخت کے نیچے زرینہ بے کسی کے عالم میں ریت پر گری ہوئی تھی اور عابد اس پر جھکا ہوا ریچھ کی طرح غرا رہا تھا۔ "چینی گڑیا تم میرے جذبات سے کھیلتی رہی ہو کہو آج کہاں جاؤ گی"!

یہ دیکھ کر رفیق ایک قاتل کے سے غیظ و غضب سے تھرا اُٹھا۔ "کمینے۔ خبیث" بے اختیار انگریزی میں اُس کے مُنہ سے نکل گیا۔ اس نے عابد کو گردن سے پکڑ کر ایک طرف دے پٹکا۔ عابد کا چہرہ اس کتے کی طرح دکھائی دیتا تھا جس کے منہ سے ہڈی چھین لی گئی ہو۔ آنکھیں پھٹی ہوئی۔ ناک چپٹی۔ دانتوں کی کچلیاں ہونٹوں سے باہر نکل آئی تھیں۔ رفیق بی بی کی طرف متوجہ ہونا چاہتا تھا کہ عابد گالیاں بکتا ہوا اس پر جھپٹ پڑا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ عابد کو جسمانی لحاظ سے برتری حاصل تھی۔ مگر اُس کا گنہگار ضمیر اور روبی جس نے بُری طرح اس کی ٹانگ کو کاٹ کھایا تھا اس کے کمزور پہلو ثابت ہوئے اور وہ لڑکھڑا کر دھم سے زمین پر گر پڑا۔ رفیق ناک سے خون پونچھتا ہوا بی بی کی طرف آیا۔ وہ سکتے کے عالم میں بیٹھی اُن کی طرف دیکھ رہی تھی رفیق نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا اور کشتی کی طرف لے چلا۔

"آہ یہ وحشی۔ پاجی" زرینہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "رفیق اگر تم نہ آتے ..... اگر تم تھوڑی دیر بعد آتے"۔

رفیق نے اُسے دلاسہ دے کر کشتی میں بٹھایا اور روبی کو بھی جو عابد کے سامنے چوکنا کھڑا تھا واپس بلا لیا۔ کشتی کو اتنی دور چڑھاؤ پر لے جانا رفیق کے بازوؤں کے لئے حد درجہ صبر آزما تھا۔ مگر زرینہ اُس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اُس کے بازوؤں پر پر پھوٹ نکلے ہیں اور وہ ان بل پر کشتی کھئے چلے جا رہا ہے۔ زرینہ سر جھکائے بیٹھی سسکیاں بھرتی رہی۔ جب وہ کنارے سے جا لگے تو اُس کی طبیعت قدرے سنبھل گئی اور وہ رفیق کے بازو کا سہارا لے کر موٹر میں جا بیٹھی۔ رفیق انجن کے سامنے بیٹھ گیا تو زرینہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "تو رفیق تم انگریزی جانتے ہو اور ہماری تمام باتیں سنتے رہے ہو۔ تم نے مجھے اس کے ساتھ اکیلا جانے سے روکا کیوں نہیں"۔

"میرا خیال تھا آپ ناراض ہوں گی" رفیق نے اس کے چڑچڑے پن سے ڈرتے ہوئے کہا

"کتنی تعلیم ہے"؟ زرینہ نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"بی اے تک"

"اور سند کہاں سے لی تھی"؟

"آپ کے کالج سے"

"یہ موٹر ڈرائیوری کیسی"؟

"قسمت"

دوسرے دن صبح کو جب زرینہ کالج جانے کے لئے باہر آئی تو رفیق اس کے زرد چہرے اور سوجی ہوئی سُرخ آنکھوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اُسے شاید رات بھر نیند نہیں آئی تھی اور گذشتہ واقعہ کی یاد ابھی تک دُکھ دے رہی تھی راستے میں وہ مہربانی کے لہجے میں کہنے لگی "رفیق میاں! میں نے تمہارا شکریہ بھی تو ادا نہیں کیا"!

"میں نے تو صرف اپنا فرض ادا کیا تھا" یہ کہتے ہوئے رفیق اپنی مسکراہٹ ضبط نہ کر سکا "آپ ناحق اتنی سی بات کو اہمیت دیتی ہیں۔

آج بی بی کے طرزِ عمل میں زمین و آسمان کا فرق نمایاں تھا۔ اُس کی گفتگو میں شیرینی پائی جاتی تھی۔ پہلے وہ شاذ و نادر ہی "دائیں چلو۔ بائیں چلو" سے زیادہ رفیق کے ساتھ بات کرتی تھی۔ اور ذرا سی کوتاہی پر برس پڑتی تھی۔ مگر اب اس کے مزاج میں نخوت اور تُندی کا نام و نشان نہ رہا تھا۔ اس کے التفات نے رفیق کے سراپا میں مسرت کی لہر دوڑا دی تھی۔ وہ متین رہنے کی لاکھ کوشش کرے بی بی کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار اس کی باچھیں کھل جاتی تھیں۔ سہ پہر کے وقت زرینہ نے رفیق کو نہر پر جانے کو کہا۔ اُس کے دل میں یہ وسوسہ کروٹ بدل رہا تھا کہ اب جبکہ عابد سے قطع تعلق ہو چکا ہے نہر پر جانے کا کیا مطلب! جب اُس نے پُل کے پاس گاڑی کھڑی کر دی تو بی بی نے باہر نکل کر کہا "آؤ رفیق

ٹہل آئیں"۔

"مگر گاڑی کے پاس کون رہے گا" اس نے سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا اور اپنے کہے پر پچھتانے لگا۔

"ہم دور نہیں جائیں گے" بی بی نے متبسم ہو کر کہا۔ رفیق نیچے اتر کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس کو بی بی کے دوش بدوش چلتے ہوئے شرم سی محسوس ہونے لگی۔ اور اپنے میلے کپڑوں اور پھٹے ہوئے جوتوں کو دیکھ دیکھ کر اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ بی بی آج مجھے اپنے ساتھ چلنے کا شرف بخشیں گی تو وہ یقیناً اپنے بہترین کپڑے پہن کر آتا۔ اسی خیال کے ماتحت وہ زرینہ سے دو قدم پیچھے ہٹ کر چلنے لگا۔ وہ نہر کی پٹڑی سے نشیب میں اتر گئے۔ حد نظر تک رستے کے دونوں جانب درختوں کی لمبی قطار چلی گئی تھی۔ سرکنڈوں نے کھیتوں کے ساتھ ساتھ ایک حاشیہ سا کھینچ دیا تھا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی زرد کرنیں افق پر لٹکتے ہوئے بادلوں میں الجھ کر رہ گئی تھیں رفیق کے جذبات میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ آخر کار بی بی کا اس کے ساتھ سیر کو آنے کا مطلب ہی کیا تھا؟ شاید وہ اکیلی تھی اس لئے اسے اپنے ہمراہ لے لیا جس طرح امیر لوگوں کا قاعدہ ہے کہ کہیں پیدل جائیں تو اپنی شان برقرار رکھنے کے لئے کسی ملازم کو ساتھ لے لیتے ہیں۔

زرینہ اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی سیدھی جا رہی تھی۔ اس کے کانوں کے آویزے جن میں موتی چمک رہے تھے چلتے ہوئے کبھی کبھی اس کی گردن اور گالوں کے درمیانی حصے سے جہاں چند سنہرے بال زلفوں سے علیحدہ ہو کر جمع ہو گئے تھے ٹکرا جاتے تھے۔ رفیق یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ برابر اس کی طرف نہیں دیکھ رہا کبھی کبھی مڑکر دائیں بائیں دیکھ لیتا مگر اس کی نگاہیں آ جا کر آویزوں پر گڑ جاتی تھیں۔ کچھ دور جا کر زرینہ نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا "رفیق میں تمہاری ماضی کے حالات تفصیل کے ساتھ سننا چاہتی ہوں"۔

"مگر وہ چنداں دلچسپ نہیں ہیں" رفیق نے ٹالنے کے لئے کہا "آپ کی طبیعت منغض ہو جائے گی" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز وفور مسرت سے کانپ رہی تھی۔ وہ اس کی ذات سے کتنی دلچسپی لے رہی تھی۔ جب زرینہ نے اصرار کیا تو اس نے اپنی آپ بیتی من و عن کہہ سنائی۔ لڑکپن اور طالب علمی کے زمانے کے حالات تو اس نے خوب مزے لے لے کر بیان کئے مگر جس وقت اس کے مصائب کا آغاز ہوا وہاں آ کر اس کی زبان لڑکھڑا گئی لیکن وہ اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے چلا تو کہتا گیا۔ جب وہ اپنے گاؤں کو آخری بار الوداع کہنے کا واقعہ بیان کر رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور وہ رقت پر قابو پانے کے لئے سامنے شیشم کے درخت کی چوٹی کو دیکھنے لگا۔ خدا معلوم کیوں اس وقت اسے اپنے کنوئیں پر لگا ہوا شہتوت کا درخت یاد آ گیا جس کے سائے تلے وہ بچپن میں کھیلا کرتا تھا۔ شاید اس کس مپرسی میں زرینہ کی ہمدردی اس کے لئے اتنی ہی راحت بخش تھی جتنا جیٹھ کی تپتی ہوئی دھوپ میں شہتوت کا ٹھنڈا سایہ۔

رفیق کو اندیشہ تھا کہ وہ اس کی داستان سن کر اسے تسلی دے گی یا مالی امداد کا وعدہ کر کے اس کی ہمت بڑھائے گی۔ مگر زرینہ نے کچھ دیر سکوت کے بعد صرف اتنا کہا "ہمیں واپس جانا چاہئے"۔ وہ موٹر تک چپ چاپ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے پہنچے۔ زرینہ نے اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے کہنے لگی "میں اکیلی سینما جانے سے گھبراتی ہوں۔ کل تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا"۔

رات کے آٹھ بجے کا وقت ہوگا کہ زرینہ اپنے کمرے میں جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سیٹھ صاحب متعجب ہو کر کہنے لگے "بیٹی تھوڑی دیر اور بیٹھو اس قدر جلد جاؤ گی" مگر وہ درد سر کا بہانہ کر کے اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ اور اپنے دروازے کی چٹخنی چڑھا کر کپڑے بدلے بغیر اپنے بستر پر گر پڑی بجلی کے لیمپ کے سبز فانوس میں اس کا چہرہ زرد سا دکھائی دیتا تھا اور آنکھیں حیرت سے کھلی کھلی معلوم ہوتی تھیں کبھی کبھی کسی خیال کے ماتحت اس کی صاف پیشانی پر بل پڑ جاتے اور کسی وقت اس کے نازک ہونٹوں کے کناروں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ وہ دیر تک اسی بے خودی کے عالم میں لیٹی رہی۔ پھر ایک تھکی ہوئی انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی پلنگ سے نیچے اترنا چاہتی تھی کہ اپنی جگہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے شال کو اپنی ٹانگوں کے گرد احتیاط سے لپیٹ لیا اور سر جھکا کر کسی فکر میں غرق ہو گئی۔ کوئی پاس ہوتا تو اسے اس حالت میں دیکھ کر یقین کر لیتا کہ وہ آرام کی نیند میں کھو گئی ہے مگر اس کی آنکھوں کے حساس پپوٹوں سے نیند کی بے ساختگی غائب تھی۔ اسی حالت میں دس بج گئے۔ جب یونیورسٹی ہال کے گھنٹے کی گونج اس کے کانوں میں پڑی تو یک لمبی سانس لے کر اس نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ اس نے میز پر سے خزاں کے رنگین پھولوں کا گلدستہ اٹھا کر آتشدان پر رکھا پھر دیوار سے لٹکی ہوئی تصویروں کی طرف بے معنی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی اور کپڑے اتارنے لگی۔ شب خوابی کا لباس پہن کر پلنگ کی طرف بڑھی تھی کہ کسی خیال کے آتے ہی اس نے ریڈیو کھول دیا۔ کسی گائن کی رسیلی آواز آ رہی تھی "سب بے تاب ہے بے خواب ہے معلوم نہیں کیوں"۔

ایک ہی مصرعہ سن کر اس نے ریڈیو بند کر دیا اور پھر کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگی۔ ہوا کے سرد جھونکے نے اس کے جسم میں کپکپی پیدا کر دی مگر خنکی نے اس کی طبیعت پر خوشگوار اثر کیا۔ صحن کے درختوں کی ٹہنیاں ہوا میں سرسرا رہی تھیں۔ لیکن

دھندلکے میں وہ بے حس و حرکت دکھائی دیتے تھے۔ اس غیور آدمی کی طرح جو دل کی پریشانی کا اثر چہرے پر ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ تانگے کے گھوڑوں کی ٹاپوں اور موٹروں کے ہارن کی آوازیں دم بدم آ رہی تھیں۔ یکایک اُس کی نگاہ ایک سائے پر رُک گئی جو ٹینس کے میدان میں سرنگوں دیوار کی طرف جا رہا تھا۔ پہلے تو وہ خوفزدہ سی ہو گئی مگر جب وہ دیوار کے قریب لگے ہوئے بجلی کے لیمپ کے پاس جا کر واپس مڑا تو اُس نے رفیق کو پہچان لیا۔ وہ متفکرانہ عالم میں میدان میں چکر لگا رہا تھا۔ زرینہ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ سر اُٹھا کر اوپر نہ دیکھ لے۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنی جگہ بت بنی کھڑی رہی۔ رفیق کا سر اس طرح جھکا ہوا تھا جیسے وہ کبھی اِدھر اُدھر نہیں دیکھے گا۔ زرینہ تعجب کرنے لگی کہ وہ کیوں ایسے ناوقت دیوانوں کی طرح یہاں پھر رہا ہے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد رفیق اپنے کوارٹروں کی طرف چلا تو بے اختیار زرینہ کا جی چاہا کہ وہ سر اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھے۔ مگر وہ جامن کے درخت کی اوٹ میں غائب ہو چکا تھا۔

وہ بہ مشکل اپنے پلنگ تک پہنچ سکی۔ سردی سے اُس کا سارا جسم اکڑ گیا تھا۔

صبح کو جب روبی حسبِ معمول گھر گھر کرتا رفیق کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اپنے ٹرنک پر جھکا ہوا تمام کپڑوں کو نکال نکال کر چارپائی پر پھینک رہا تھا۔ وہ اس میں اس قدر منہمک تھا کہ اُس نے روبی کو صبح بخیر کا جواب بھی نہ دیا۔ روبی اس تغافل کو کیسے برداشت کر سکتا۔ رونی صورت بنا کر باہر نکل گیا۔ رفیق نے کپڑوں کا انبار سا لگا دیا تھا۔ وہ اس دھوبی کی طرح دکھائی دے رہا تھا جو گھاٹ پر جانے سے پہلے اپنی دھلائی کا جائزہ لیتا ہے۔ سوٹ موجود تھا گو اس میں سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ استری سے ٹھیک ہو جائے گا۔ نکٹائیاں سب کی سب پھٹی پرانی تھیں گرم موزے اور فیلٹ ندارد۔ سیاہ بوٹ دوسروں کی بہ نسبت بہتر حالت میں تھے، پالش سے نئے دکھائی دینے لگیں گے نکٹائی۔ موزے اور فیلٹ خریدنا ہوں گے اس خیال کے آتے ہوئے اُس نے اطمینان سے واسکٹ کی جیب پر ہاتھ پھیرا تنخواہ پرسوں ہی تو ملی تھی۔ اُس نے سوٹ کو لپیٹ کر بغل میں دبایا اور بازار کو چل دیا۔

گیارہ بجے کے قریب جب بی بی نے اُس کو بلایا تو وہ کواڑ بند کئے خوب تندہی سے اپنے بوٹ پالش کر رہا تھا۔ دونوں ہاتھ سیاہ ہو گئے تھے۔ اُس نے جلد جلد پانی سے ہاتھ دھوئے۔ سیاہی کو اچھی طرح دور کرنے کے لئے ہاتھوں کو دو ایک بار کواڑ پر بھی رگڑ لیا اور باہر نکل گیا۔ کالج میں کسی تہوار کی چھٹی تھی۔ بی بی کچھ چیزیں خریدنے بازار گئیں۔ جب وہ ایک بڑی دکان میں داخل ہو گئیں تو رفیق کو خیال آیا کہ میرے پاس سامنے کی جیب میں رکھنے کے لئے رومال بھی تو نہیں ہے۔ وہ لپک کر پاس کی ایک دکان پر گیا اور ایک قیمتی رومال خرید لایا۔ جب وہ واپس آ رہے تھے تو وہ یہ سوچ سوچ کر نڈھال ہو رہا تھا کہ کاش کوئی خوشبو بھی لے آتا۔ ابھی شام کے پانچ بجے تھے تصویر شروع ہونے میں پورا ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ مگر وہ کپڑے پہن کر تیار ہو گیا تھا۔ اس نے دیوار کے ساتھ لٹکے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر اطمینان کی ایک لمبی سانس لی اور اپنے تنگ کمرے میں اُدھر سے اِدھر ٹہلنے لگا۔ ایک دفعہ اُس نے دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا۔ سامنے علو اور خانساماں سر جوڑ کر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اگر انہوں نے اُس کو اِس لباس میں دیکھ لیا تو کیا کچھ نہ کہیں گے۔ چارپائی پر بیٹھے بیٹھے شام کا جھٹپٹا سیاہی میں تبدیل ہو گیا اور وہ ابھی سوچ رہا تھا کہ باہر نکلے یا اچھی طرح تاریکی ہونے تک اندر ہی بیٹھا رہے۔ اتنے میں زرینہ کی مترنم آواز آئی "رفیق جلدی کرو"!

آج وہ خود اُسے بلانے آئی تھی۔ وہ جھپٹ کر باہر نکل گیا۔ زرینہ کا صبیح چہرہ گہرے سبز رنگ کے کوٹ میں لالے کے پھول کی طرح دمک رہا تھا۔ ادبی جو اس کے پاؤں کے ساتھ سر رگڑ رہا تھا رفیق کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"اوہو" بے اختیار زرینہ کے مُنہ سے نکل گیا۔ حیرت اور مسرت کے امتزاج نے اُس کی آنکھوں کی جاذبیت میں اضافہ کر دیا تھا۔ آج پہلی بار زرینہ کو اس کی بلند پیشانی۔ اونچی ناک اور باہم پیوست ہونٹوں سے اس کے خاندانی ہونے کا احساس ہوا۔ اور وہ مرعوب سی ہو گئی۔ اُس نے اپنی گھبراہٹ کو مذاق کے پردے میں چھپاتے ہوئے کہا "رفیق صاحب کیا آپ ازراہِ نوازش مجھے سینما تک لے جائیں گے"!

"ضرور ضرور" رفیق نے اس بے تکلفی سے کہا جیسے وہ کسی دوست کو ممنون کرنے کے لئے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ جب گاڑی کوٹھی سے باہر نکلی تو زرینہ نہ رہ سکی اور کہنے لگی "رفیق تم ہمیشہ اچھا لباس پہنا کرو۔ ڈرائیوروں کی ہیئت میں تم نے اپنے آپ کو کھو دیا ہے"۔ اس کی آواز میں ہمدردی کا عنصر شامل تھا۔

"مگر میں اپنے آپ کو بھول جانے کی کوشش میں رہتا ہوں" رفیق نے تھوڑی دیر بعد دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"میں جو کہتی ہوں وہی ہو گا" زرینہ نے لاڈ اور ہٹ دھرمی کے لہجے میں کہا "میں تمہیں اپنے آپ کو نہیں بھولنے دوں گی"۔

کیسے آرزو انگیز الفاظ تھے۔ رفیق نے بار بار انہیں اپنے دل میں دہرایا اس کے پہلو میں محبت اور عقیدت کا طوفان اُٹھ رہا تھا۔ جب وہ سینما گھر کے

قریب پہنچے تو ٹکٹ خریدنے کے لئے زرینہ نے اُسے پانچ روپے دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"آج میں ٹکٹ خریدوں گا" رفیق نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"تم خریدو گے؟" زرینہ نے ہاتھ پیچھے ہٹائے بغیر کہا۔ مگر وہ جواب دیئے بغیر کھڑکی کی طرف چل دیا۔ زرینہ کا جی چاہا کہ روپے اس کی پیٹھ پر دے مارے مگر خدا معلوم کیوں اس کے لبوں پر ہنسی کی لہر کھیل گئی۔

آخر وہ کیوں مجھ سے اس قدر مہربانی اور لطف سے پیش آتی ہے۔

رفیق اپنی چارپائی پر سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھا اس سوال کا جواب تلاش کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں اس کے لمبے لمبے بالوں میں اُلجھی ہوئی تھیں۔

وہ میری ممنونِ احسان ہے۔ اس لئے کہ میں نے اس کی آبرو بچائی تھی مگر اس کا معاوضہ وہ مالی امداد سے دے سکتی تھی۔ اس کے عام رویّے میں ایک فرق پیدا ہو جانا بھی ایک قدرتی امر تھا۔ مگر یہ بے تکلفی کیسی؟ میں کیا ہوں؟ ایک مفلس و قلاش ڈرائیور جس کا سرمایۂ حیات اس کے آباؤ اجداد کی ثروت کے افسانے ہیں انہیں بھی اس کی موجودہ حالت میں کون تسلیم کرے گا۔ آج وہ ایک معمولی ملازم ہے کل خدا جانے اس سے بھی بدتر حالت میں ہو۔ دنیوی نقطۂ نگاہ سے وہ دو کوڑی کا آدمی تھا۔ پھر وہ کیوں تسلیم اور نیاز کی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتی تھی ملتجی اور رحم طلب نگاہیں جنہوں نے اُسے کئی تکلیف دہ غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ گہری اتھاہ آنکھیں جن میں روحانیت کی پُراسرار کیفیت جھلکتی تھی۔ جن میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے مدھ بھری نمی لہریں لینے لگتی تھی۔ مگر یہ تو محض اس کے تخیل کی طلسم آرائی ہے۔ زرینہ کو کیا پڑی ہے کہ ایک حقیر ملازم کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے۔ اگر اس کی یہی حالت رہی تو کل رو بی بھی اس کے محبت بھرے الفاظ سے دھوکا کھا جائے گا۔ اُس کا دماغ! شاید وہ اپنی حیثیت کو بھول گیا ہے کجا ایک گدائے بے نوا اور کجا ایک لکھ پتی تاجر کی چہیتی بیٹی۔ یہ زرینہ کی عالی ظرفی ہے کہ وہ اُس سے اُس قدر مروت سے پیش آتی ہے اور وہ ہے کہ اُس کی ایک مسکراہٹ، پلکوں کی ایک لرزش۔ ہونٹوں کی ایک جنبش کی طرح طرح سے توجیہ کرنے لگتا ہے۔ مگر انہی تخیلات سے تو اُس کی زندگی وابستہ ہے اگر وہ ان کی سچائی پر شک کرنے لگا تو اس کا کیا حشر ہوگا۔

"تبارک اللہ" اس کے منہ سے بآوازِ بلند نکلا اور اس کے چہرے پر مایوسی کی تاریکی چھا گئی۔ وہ تھوڑی دیر بے چارگی اور کس مپرسی کی حالت میں اپنی جگہ بیٹھا رہا یکلخت اس کی آنکھوں کے سامنے راوی کے کنارے کا منظر پھر گیا۔ وہ موٹر تک اس کے بازو کا سہارا لے کر گئی تھی۔ زرینہ کے ہاتھ کے مَس نے کس طرح اُس کی رگ رگ میں آگ سی لگا دی تھی۔ اُس دن سے وہ اپنے پہلو میں ایک خلا سا محسوس کرنے لگا تھا۔ اُس کی مدت کی دبی ہوئی جوانی کی تمنائیں بھڑک اُٹھی تھیں۔ وہ دہکتی ہوئی حسرتوں کے دوزخ میں دھکیل دیا گیا تھا۔ اس کی روح اس کے بازو زرینہ کے لئے ترستے تھے۔ وہ بظاہر مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ مگر اس کے دل کی تہ میں محبت اور وارفتگی کے جذبات اس آتشیں لاوے کی طرح پیہم مضطرب رہتے تھے جو سبزے سے ڈھکے ہوئے آتش فشاں پہاڑ کے باطن میں پھوٹ بہنے کے لئے بے تاب ہو۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا کہ آج شام کو اُس کے پاؤں میں گر کر اپنے گناہ کا اعتراف کر لے۔ وہ اپنی محبت کو گناہ سے تعبیر کرتا تھا۔ وہ دن رات کے اس روح فرسا عذاب میں تڑپتا رہا مگر افشائے راز نہ کر سکا۔ وہ ڈرتا تھا کہ زرینہ کا برتاؤ محض ایک آقا کے اپنے فرمانبردار نوکر کے ساتھ اچھے سلوک کے برابر ہے اور کچھ نہیں۔ جب زرینہ کو اس کے اندرونی جذبات کا علم ہوا تو وہ اُسے نفرت اور حقارت سے ٹھکرا دے گی۔ اور یہ ایک ایسا تصور تھا جس سے اُس کی روح کانپ اٹھتی تھی۔ کئی بار اُس کے ذہن میں ایک اُٹھتا ہوا خیال آیا بھی کہ شاید وہ اس کی محبت کو قبول کرے مگر رفیق نے ہمیشہ اسے ایک امرِ محال سمجھ کے رد کر دیا۔ اس کو اپنی کمتری کا احساس جس کو وہ مبالغہ آمیز خودداری کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ کیسے اجازت دیتا کہ وہ اظہارِ محبت کی جرأت کر سکتا۔

دن بدن زرینہ اور رفیق کی بے تکلفی بڑھتی گئی۔ اب وہ اپنے ڈرائیور کو ملازم نہیں بلکہ ایک ہم جماعت یا دوست کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اتفاق سے اُس کو ادبیات سے شغف تھا۔ رفیق نے زمانۂ طالب علمی میں مشہور شاعروں کے کلام کا مطالعہ کیا تھا اور اُن کے متعلق اپنے نظریے قائم کر رکھے تھے۔ بسا اوقات کسی جزو کلام پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے دونوں کا اختلاف ہو جاتا اور تیز کلامی تک نوبت آجاتی۔ زرینہ اپنی بات کی تردید کو برداشت نہیں کر سکتی تھی جھٹ غصّے میں آجاتی۔ اس وقت رفیق کہہ دیتا "آپ مالکہ ہیں۔ میرے فرائض کے متعلق آپ تیز کلامی سے کام لے سکتی ہیں مگر جہاں تک ادبیات کا تعلق ہے مجھ پر آپ کی ترش و تیز باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوگا۔ آپ کا مطالعہ ہی کیا ہے۔ اِدھر اُدھر سے چند باتیں سن کر پلّو میں باندھ رکھی ہیں۔ پانچ سات شاعروں کے نام یاد کر لئے۔ آٹھ دس ادیبوں کی چند سطریں حفظ کر لیں اور نقاد بن بیٹھی ہیں"۔

بعض اوقات وہ جان بوجھ کر چند چبھتی ہوئی باتیں کہہ دیتا تھا۔ مگر جب کبھی

جوش میں آکر زرینہ کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جاتی جو رفیق کی موجودہ حالت کی طرف اشارہ کرتی تو وہ بگڑ کر چپ ہو رہتا اور بلائے سے بھی نہ بولتا۔ یہ دیکھ کر زرینہ اُس کی منتیں کرنے لگتی۔ رفیق اس کے تبسم کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔ تھوڑی دیر میں دونوں ہنستے ہوئے گھر واپس آجاتے۔ دوسرے تیسرے دن وہ شالامار یا شاہدرے کی طرف جا نکلتے اور گھاس پر اکٹھے بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔ عورت مرد کے حقوق مذہب و اخلاق۔ سرمایہ اور افلاس وغیرہ موضوع پر خوب بحث مباحثہ ہوتا۔ انہیں ایک دوسرے پر آنکھیں نکالتے ہوئے دیکھ کر روبی عجیب مخمصے میں پڑ جاتا کہ کس کا ساتھ دے۔ ناچار ایک طرف بیٹھ کر انسانوں کی کم عقلی پر حیران ہوا کرتا۔ زرینہ کو چڑ تھی کہ رفیق اس کی ہر بات پر کوئی نہ کوئی اعتراض کر دیتا تھا اور رفیق کو یہ شکایت کہ وہ مسلّمات کو ماننے سے بھی انکار کر دیتی تھی۔ مگر یہ بحث [illegible] بہانہ تھا۔ در اصل وہ ایک دوسرے کی صحبت کو طویل کرنے کے لئے [illegible] مسائل چھیڑ دیتے تھے۔ رفیق کے دل میں محبت کا جذبہ پرستش کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ زرینہ کی عدم موجودگی میں ایک ایک لمحہ بھی اس کے لئے گراں بار ثابت ہوتا۔

زرینہ بھی اس کی خودداری۔ شرافت اور راست گفتاری کی مسحور ہو چکی تھی۔ وہ اس کو مردانہ صفات کا بہترین نمونہ سمجھنے لگی اگرچہ وہ اپنے سامنے بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریز کرتی تھی۔ مگر رفیق نے بلا شبہ اس کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ اب اُسے بھول کر بھی رفیق پر اپنی دنیوی برتری کا احساس نہ ہوتا تھا بی بی کو ڈرائیور پر اس طرح مہربان ہوتے دیکھ کر تمام ملازم جل کر کوئلہ ہو گئے تھے۔ سیٹھ صاحب بھی رفیق کو سوٹ پہنے ہوئے دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے مگر یہ خیال کر کے کہ اس نے اچھے دن دیکھے ہیں چپ ہو رہتے۔ ایک دن عصر کے وقت زرینہ نے کہا چلو لارنس باغ کو چلیں۔ مدت ہوئی اُدھر کا رُخ نہیں کیا۔ رفیق نے گاڑی منٹگمری ہال کے سامنے کھڑی کر دی اور دونوں پہاڑی کی طرف نکل گئے۔ سدا بہار درختوں کے پتوں کی سبزی بھوری پڑ گئی تھی۔ باغ میں سیر کرنے کے لئے بہت کم لوگ آئے ہوئے تھے۔ ہاں ٹینس کے میدان میں خوب رونق تھی۔ سامنے کی سڑک پر دو پنشن یافتہ بوڑھے جا رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی بات سنے بغیر لگاتار باتیں کئے جا رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا میں نے اپنے افسر کو ایک بار ایسا ڈانٹا کہ بالکل بھیگی بلی بن گیا۔ اور پھر جب تک رہا مجھ سے ڈرتا رہا۔ دوسرا اس تعلّی کا جواب دیئے بغیر اپنی ڈینگیں مار رہا تھا۔ دائیں طرف گھاس کے میدان پر ایک آیا بیٹھی کسی انگریز کے بچے کو بسکٹ کھلا رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر روبی زور زور سے دُم ہلاتا ہوا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ زرینہ کہنے لگی "دیکھو تم نے میرے کتے کو کیسا لالچی بنا دیا ہے۔ یہ بھک منگا جہاں کسی کو کوئی چیز کھاتے ہوئے دیکھ پاتا ہے وہیں چمٹ جاتا ہے"۔

"حیوان جو ہوا" رفیق نے مسکرا کر جواب دیا "میں چند انسانوں سے واقف ہوں جو روبی سے کہیں زیادہ حریص ہیں"۔

"کچھ بھی ہو تم نے روبی کی عادتیں بگاڑ دی ہیں" زرینہ نے کہا "اب تو اپنا مالک ہی نہیں سمجھتا۔ روبی روبی ادھر آؤ نامراد! دیکھو ٹس سے مس نہیں ہوا"۔

"آجاؤ روبی" رفیق نے محبت بھرے لہجے میں بلایا۔ تو وہ بھاگتا ہوا اُن کے قریب آگیا۔ رفیق بی بی کی طرف منہ کر کے کہنے لگا "بات ایک ہی ہے کہنے میں فرق ہے"۔

زرینہ کھسیانی ہو کر کچھ جواب دینا چاہتی تھی کہ اُس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ اور چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے رفیق کے بازو کا سہارا لے لیا۔ سامنے عابد چھڑی ہلاتا ہوا آرہا تھا۔ رفیق کو انگریزی لباس پہنے زرینہ کے ساتھ مل کر کھڑے ہوئے دیکھ کر وہ بامعنی انداز سے مسکراتا ہوا پاس سے گذر گیا۔ رفیق کا جی چاہا کہ اُس کو ٹوک کر لڑنے پر مجبور کرے مگر زرینہ کے خیال سے ضبط کر گیا۔

"ذلیل آدمی" زرینہ نے آگے قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

رات کے نو بج چکے تھے۔ سیٹھ صاحب مضطربانہ انداز سے کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ اُن کے سکڑے ہوئے ابروؤں سے خفگی کا اظہار ہوتا تھا۔ جب انہیں دروازے کے باہر پاؤں کی آہٹ سنائی دی تو وہ شمالی کونے میں ایک مفکر کی طرح دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھ کر کھڑے ہو گئے رفیق اجازت پاکر اندر داخل ہوا۔ وہ خلاف معمول اس وقت بلائے جانے پر متعجب سا دکھائی دیتا تھا۔

"مجھے آپ نے یاد فرمایا" اس نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں دو گھنٹہ سے بُلا رہا ہوں۔ کہاں گئے تھے" سیٹھ صاحب نے اس کے سراپا پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"میں بی بی کے ساتھ سینما گیا تھا" رفیق یہ کہتے ہوئے جھجک گیا۔ اس نے کوئی بہانہ تلاش کرنے کی کوشش بھی کی مگر وقت کم تھا اور اُسے اِس فن میں مہارت بھی نہیں تھی۔

"اچھا اب تم بی بی کے ساتھ سینما جایا کرتے ہو" سیٹھ صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "مجھ سے تو بی بی ہر بار یہی کہا کرتی ہیں کہ فلاں سہیلی کو ہمراہ

لے جاؤں گی۔"

رفیق بی بی کو جھٹلانے کے خیال سے گھبرا گیا۔ سیٹھ صاحب نے نیلے رنگ کا کاغذ جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ میں دیا اور بارعب آواز سے کہا "اسے پڑھ لو"

رفیق نے خط لے کر پہلے لکھنے والے کا نام دیکھا۔ نیچے عابد کے دستخط تھے۔ کسی نامعلوم اندیشہ کے احساس سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خط میں اس کے اور زرینہ کے معاشقے کو بڑی رنگ آمیزی سے بیان کیا گیا تھا۔ آخر میں اپنے آپ کو اس خاندان کا حقیقی خیر خواہ ظاہر کر کے لکھا تھا کہ زرینہ اور ایک حقیر ملازم کے باہم اختلاط پر ہر طرف چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں میں نے اپنا اخلاقی فرض ادا کرنے کے لئے وقت پر اطلاع دے دی ہے۔ رفیق نے خط پڑھ کر اُسے توڑ مروڑ دیا۔ "حقیر ملازم" اُس نے دل ہی دل میں ان الفاظ کو جو نشتر کی طرح اس کے پہلو میں کھُب گئے تھے دہرایا۔ سیٹھ صاحب اُسے غصّے کی حالت میں دیکھ کر کشمکش و پیچ میں پڑ گئے۔ کیا واقعی یہ ایک بے بنیاد الزام تھا!

"رفیق۔ کیا یہ سچ ہے؟" انہوں نے زیر لب پوچھا۔

اس سوال پر اس کا رواں رواں "ہاں ہاں" پکار اُٹھا۔ آج سے نہیں، کئی دن سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر اُس نے اپنے جذبۂ بے پناہ کا کہیں نہ کہیں باآوازِ بلند اعتراف نہ کیا تو وہ دیوانہ ہو جائے گا۔ اس نے ضبط کرنے کی بے شمار کوشش کی مگر تکلیف دہ جذبات سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس نے بے اختیارانہ کہہ دیا "جی ہاں"۔

سیٹھ صاحب پُر زور تردید قسم اور سوگند کے منتظر کھڑے تھے یہ سُن کر وہ غیظ و غضب کے عالم میں اپنی جگہ اُچھل پڑے اور چلا اُٹھے "نمک حرام! میں نے تمہارے پدرم سلطان بود کے قصے پر اعتبار کیا۔ یہ میری بے وقوفی تھی۔ تمہاری رگوں میں شریف خون کی ایک بوند بھی نہیں ہے۔ سنا ایک بوند بھی۔ میں تمہیں اپنے کاروبار میں ایک معقول مشاہرے پر لگانے والا تھا۔ شکر ہے کہ جلد ہی تمہاری اصلیت ظاہر ہو گئی۔ بے حیا! اپنی نجاست کو اچھال کر میرے منہ پر پھینکنا چاہتا ہے"۔ رفیق نے پھٹتی ہوئی نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔ سیٹھ صاحب خاموش ہو گئے۔ اُن کو اپنے چہرے پر گڑی ہوئی دو آنکھوں میں جنون کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ اُن کا سارا غصہ ٹھٹھر کر رہ گیا اور انہوں نے ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "میرا مطلب ہے کہ علو سے اپنا حساب لے لو اور چُپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں تمہیں ایسا اچھا سرٹیفکیٹ لکھ دوں گا کہ دو چار ہی دن میں تمہیں ملازمت مل جائے گی۔ اور تم بے روزگار نہیں رہو گے۔ اب جاؤ کل صبح میرے پاس آنا"۔

سیٹھ صاحب کی باتیں سن کر رفیق کے چہرے پر تبسم کی ایک خفیف سی لہر دوڑ گئی اور وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

"یہی تھی زندگی" اس نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے اجڑے ہوئے دل پر محبت کی ایک آوارہ بدلی برس کر اُسے سرسبز و شاداب کر گئی تھی۔ ابھی اُس کی آرزوؤں کی کلیاں لب کشا نہ ہونے پائی تھیں کہ یکلخت بجلی گرنے سے جل کر بھسم ہو گئیں۔ اب وہی ویرانی تھی پہلے سے زیادہ بھیانک، کہیں زیادہ وحشت انگیز۔ اب اس میں جھانکتے ہوئے بھی اس پر خوف کا لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ دولت حشمت، عزتِ نفس۔ محبت سب نے خیرباد کہہ دیا۔ یہاں وہ کیا کیا چھوڑ کر جا رہا تھا۔ جوانی۔ محبت۔ مسرت امنگ اور شاید روح بھی۔ اور کہاں جا رہا تھا مستقبل کے تیرہ و تاریک غار میں جو منہ پھاڑ کر اس کا انتظار کر رہا تھا۔

•

آج صبح روبی کی آنکھ تو سویرے ہی کھُل گئی تھی مگر وہ دیر تک اپنے کمبل میں لیٹا اس کی گرمی کا لطف اٹھاتا رہا۔ ایک بار اس نے اپنی بائیں آنکھ کھول کر دیکھا تو بی بی کا بستر خالی پڑا تھا۔ ہیں! وہ چائے پینے چلی گئیں اور مجھے جگایا تک نہیں۔ اس خیال سے اس کی بھوک چمک اُٹھی اور وہ بھاگ کر باہر نکلا۔ کھانے کے کمرے میں جانا چاہتا تھا کہ شور و غل سُن کر سہم گیا اور ہولے ہولے قدم اٹھاتا اندر داخل ہوا۔ باپ بیٹی چِلا چِلا کر باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سیٹھ صاحب تو چپ ہو رہے مگر بی بی بلند آواز سے سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ وہ حیران سا ہو گیا کہ سامنے چائے کے برتن رکھے ہیں اور انہیں اُن کی پروا تک نہیں۔ کچھ دیر اس خیال سے ٹھہرا کہ شاید جلد ہی ان میں صلح ہو جائے گی اور دونوں چائے پینے بیٹھ جائیں گے مگر بی بی تھی کہ چُپ ہونے ہی میں نہ آتی تھی۔ وہ تنگ آ کر باہر نکلا اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا رفیق کی کوٹھری کی طرف چلا۔ وہاں سے تو کچھ نہ کچھ ضرور مل جائے گا۔ اُس نے اندر جا کر حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ رفیق کا کمرہ خالی تھا۔ فرش پر ہر طرف کاغذ کے ٹکڑے کچھ دھجیاں اور چند جلی ہوئی دیا سلائیاں بکھری پڑی تھیں۔

سید علی عباس
جلال پوری

امرت پرچھائیں

اگلے زمانے میں اک سچّا سادھو تھا یہ ہم نے سنا ہے
اُس کی بزرگی اور سچّائی کا قصّہ بھی ہم نے پڑھا ہے

اُس کے نرمل مَن سے دیوتا روشنی لینے آیا کرتے
اور فرشتے اُس کی دیا کے گیت آپس میں گایا کرتے

سب کے ساتھ بھلائی کرنا مطلب تھا اُس کے جیوَن کا
"نیکی کر اور دل سے بھلا دے" یہ اپدیش تھا اُس کے مَن کا

دیکھ کے اس سادھو کی نیکی دیوتا تھے یہ دل میں ٹھانے
چاہئے اِس کو ملنا اس کی نیکی کا پھل کسی بہانے

کی پنچایت سب نے اک دن اور چڑھے آکاش کے اوپر
برہما کے دربار میں پہنچے اور دعا کی سب نے مل کر

"اے پرماتما اس سادھو کو ملے کرامت کوئی ایسی
کسی بھگت نے آج تلک پائی ہو نہ اِس دُنیا میں ویسی!"

عرض سُنی جب اُن کی تو یہ حکم دیا برہما نے سب کو
"مَیں راضی ہوں چاہتا ہے وہ کون کرامت جا کر پوچھو"

یہ سن دیوتا واپس آئے اور گئے سادھو کے گھر پر
کہنے لگے "برہما نے دی ہے تم کو کرامت راضی ہو کر

کون کرامت چاہتے ہو تم ہم سے کہو دلوائیں گے تم کو
کہو تو ہاتھ میں امرت آوے روگ مٹے جس کو تم چھولو"

کہنے لگا یوں سادھو "یہ خوبی تو خدا ہی کو ہے زیبا
نہیں مجال یہ میری اپنے منہ سے کروں جو ایسا دعویٰ"

بات یہ سُن کر دیوتا بولے "یہ کہنا ہے خوب تمہارا
یہ نہ سہی مکتی دھن لے لو پاپ سے دو سب کو چھٹکارا"

ہو کے مگن سادھو یوں بولا "دیوتا میرے گن پہچانیں
میں پاپی کیا مکت کروں گا اس شکتی کو دیوتا جانیں"

ہنسنے لگے سب دیوتا اِس پر اور کہا "خیر اس کو چھوڑو
کیا ہم دیں تم کو وہ دھیرج جس سے اپنا بنا لو سب کو"

کہا فقیر نے "ٹھیک نہیں یہ لوگ جو میرے ہو جائیں گے
اپنے خدا کو بھول کے مجھ کو اپنا خدا سب تبلائیں گے"

دیوتا گھبرائے یہ سُن کر اور کہا "پھر تم کیا لو گے ؟   تم کو وہی دلوائیں گے ہم جو اپنی زباں سے فرماؤ گے"

یہ سُن کر سادھو مُسکایا، سوچا اب کیا بات بنائے   کہا "خدا کو پایا میں نے اس کے سوا کچھ اور نہ بھائے!"

دیوتا کہنے لگے "اے سادھو! بس اب بات کا بانا مت تَن   کوئی کرامت مانگ نہیں تو جبراً دیں گے دھیان لگا سُن"!

کہا فقیر نے "اچھا صاحب" ہے یہ خوشی میرے ہردے کی   خبر نہ ہو مجھ کو لیکن میں سدا کروں ہر ایک سے نیکی"

بات تھی یہ اُلجھی اور دیوتا اُس کو سُن کے بہت گھبرائے   کون کرامت دیں اس کو اس سوچ میں پڑ کے بہت چکرائے

سب نے کیا طے سادھو کے تن کا سایہ امرت ہو جائے   جس روگی پر پڑے وہ سایہ اُس کی بیماری کھو جائے

اِدھر اُدھر اور آگے پیچھے جس پہ بھی وہ سایہ پڑ جائے   وہ سایہ کچھ کر کے دکھائے لیکن سادھو دیکھ نہ پائے

یہی ہوا جب دُکھی پہ سایہ پڑتا سارا دُکھ مٹ جاتا   سُکھی پہ جب وہ سایہ پڑتا دونا سُکھ اُس سے وہ پاتا

سوکھے پیڑ پہ سایہ پڑتا، پھر سے ہرا بھرا ہو جاتا   پھول نکلتے، پھل لگتے، وہ پھل ہر ایک خوشی سے کھاتا

سوکھے تال پہ سایہ پڑتا میٹھے پانی سے بھر جاتا   روگی کے سب روگ مٹاتا اور دُکھی کو خوش کر جاتا

سادھو پر کچھ حال نہ کھلتا وہ نِت اُسی طرح سے رہتا   "نیکی کر اور دل سے بھلا دے" یہ بھی اب وہ کبھی نہ کہتا

لوگ بہت خوش رہتے اُس سے گیت ہمیشہ اُس کا گاتے

سب اس کو "امرت پرچھائیں" کہتے لیکن بھید نہ پاتے

رسید، مقبول حسین احمد پوری

جنگلی کبوتر

ماں کی گود کی طرح یہ گاؤں بار بار مجھے بلاتا ہے۔ آدمی کی طرح گاؤں کی جنم کنڈلی بنانے کا رواج ہوتا تو نہ صرف میں اس کی وجہ تسمیہ کر سکتا، بلکہ اس کی عمر کا بھی ٹھیک ٹھیک پتہ چل جاتا، نام ہے بھد وڑ۔ اور یہ لفظ میرے لئے ایک گتھی سے کم نہیں۔ ہاں جہاں تک اس کی عمر کا تعلق ہے یہ گاؤں، جیسا کہ روایت سے ظاہر ہے ہماری ریاست کی راجدھانی —— پٹیالہ سے بھی کہیں پہلے آباد ہوا تھا۔

چاروں طرف کتنے ہی چھوٹے چھوٹے گاؤں بسے ہوئے ہیں۔ ان میں سے میں صرف چند ایک گاؤں اب تک دیکھ سکا ہوں۔ باقی گاؤں دیکھنے کا ارادہ ضرور ہے۔ مگر دیکھیئے کب وہاں جا سکوں۔ راس کماری تک میں چکر لگا آیا، اس سے بھی پرے لنکا تک گھوم پھر آیا، مگر قریب کے یہ گاؤں میری نگاہ سے پرے رہے!

یہاں میں نے جنم لیا، اور میرے سپنوں میں جو درجہ اس گاؤں کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کا حق کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے مجھے جکڑ نہیں سکتا۔ ماں کہتی ہے "دیو! تم آتے بعد میں ہو، پر جانے کی رٹ پہلے ہی لگانے لگتے ہو!" بیوی کہتی ہے "اب تو میں چند ماہ یہاں اپنی ساس کی خدمت کر دوں گی"۔ "ضرور"، میں جواب دیتا ہوں اور اس کا سارا حسن اس کی کالی مدھ ماتی آنکھوں میں ناچ اٹھتا ہے۔ مگر اندر سے وہ خوب جانتی ہے کہ نہ جانے یکا یک کس دن اُسے میرے ہمراہ کسی نئے سفر پر چلنا پڑے۔

اُس آزاد پنچھی کی طرح، جو آسمان کی وسعتوں کا دورہ کرنے کے بعد پھر دھرتی پر اُتر آتا ہے، میں بار بار یہاں چلا آتا ہوں —— کسی مقناطیسی کشش کے زیر اثر۔

زندگی کے شروع کے تیرہ سال اسی گاؤں میں گذرے تھے جبھی تو میں اس کی دھرتی تک کی نبض پہچانتا ہوں۔ میں کتنی ہی دور کیوں نہ نکل جاؤں۔ اس کا تصور میرے دماغ میں برابر بندھا رہتا ہے۔ دُور دُور جدھر بھی نگاہ اٹھتی ہے کھیت لہلہا رہے ہیں۔ ساری دھرتی مجھے جانتی ہے —— جیسے میری اپنی ماں جس کی گود میں میں پلا ہوں۔ میری رگ رگ سے واقف ہے۔ اس ماحول میں ماضی اور مستقبل گھل مل کر حال میں بدل جاتے ہیں۔

پرانی کہانیاں یہاں اب بھی پہلے شوق سے سُنی جاتی ہیں۔ گیتوں کو بھی وہی پہلا دخل حاصل ہے۔ یہ کہانیاں ان لوگوں سے چھین لی جائیں، یا یہ گیت کسی طرح ان کے پاس نہ رہیں تو ان کی زندگی پر کیسی مُردنی چھا جائے۔ شکر ہے شعر و نغمہ کی دیویاں اب بھی اس دھرتی کو گدگداتی ہیں۔

غُربت بھی ہے، اور افسردگی بھی۔ مگر دل کو خوش کرنے والے پرانے افسانے اور گیت بھی تو ہیں —— تھکن اتار دینے والے، ڈانواں ڈول روحوں کو خود فراموشی کے عالم میں لے جانے والے۔ یہ افسانے اور گیت ماضی کے بیٹے ہیں، اور مستقبل کے امانت دار۔ سُنے جاؤ، اور سنائے جاؤ اپنے افسانے اے دھرتی کے بیٹو اور گائے جاؤ اپنے گیت۔

وہ سُرخ و سفید گول مہتابی چہرہ، وہ میرے دادا کا جھریوں والا چہرہ اب کہاں! ایک صدی کے لگ بھگ اُن کی عمر اسی گاؤں میں کٹ گئی۔ پرانی روایتوں کی تو وہ گویا ایک کان تھے: "دھرتی ہم سب کی ماں ہے، اسے صرف سطحی انداز سے ہی نہ دیکھتے رہنا اس کے دل کی دھڑکن سننا اور جو یہ کہے اُسے ماننا!" —— اُن کی یہ نصیحت مجھے کبھی نہ بھولے گی۔

چاند اب بھی چمکتا ہے اور کھیت اپنے سینے کھولے پڑے رہتے ہیں، امرت بھری کرنوں کو دھیرے دھیرے اپنے اندر جذب کئے جاتے ہیں! دھرتی کے بیٹے یہ نظارہ دیکھتے ہیں تو وہ زندگی کا سب درد اور کرب یک لخت بھول جاتے ہیں۔ چاندنی میں ایک مدھ ماتی کیفیت ہوتی ہے۔ کھیت تو کھیت، بیابان اور ریتلے میدان بھی چاندنی میں اپنے اندر کی طرف دیکھنے لگتے ہیں، جیسے ایک بڑھیا، جو بظاہر عمر رسیدہ گائے کی طرح دودھ نہ دے سکنے کی وجہ سے بے کار ہو گئی ہو، اپنے بیٹے کی بہو کا چاند سا مکھڑا دیکھ کر اپنی جوانی کی یادوں میں کھو جاتی ہے۔

بہار اب بھی آتی ہے اور بہار کا وہ پرانا نغمہ جو صدیوں سے دلوں کی سیر کرتا ہم تک پہنچا ہے، اپنے الفاظ میں آج بھی وہی جادو لئے ہوئے ہے۔

"کدے بول وے، نمانیاں کا لؤاں!"

کوئلاں کوک دیاں۔

—ارے او حقیر کوّے! کبھی تو بھی بول

کوئلیں تو کوک رہی ہیں۔

کوئل کی نرالی، نازک اور رسیلی کوک کہہ رہی ہے۔ بہار آ گئی! مگر جس کا محبوب پردیس میں ہے وہ بہار کا استقبال کیسے کرے!؟ مگر کوئل کیا جانے برہن کا درد! اُس کی کوک مسلسل ہے۔ برہن حقیر کوّے سے اُس کی کائیں کائیں کا مطالبہ کرتی ہے۔ صدیوں سے کوّا بولتا آیا ہے اور آج بھی جب وہ منڈیر پر بیٹھ کر اپنی کائیں کائیں شروع کرتا ہے۔ گاؤں کی عورت کہہ اُٹھتی ہے۔ "آج کوئی مہمان آئے گا"۔ اور کون جانے یہ مہمان برہن کا ساجن ہی ہو۔ اور کوئل کے متعلق عورتوں کا خیال ہے کہ وہ خود ایک برہن ہے اور ہجر کی آگ میں جل کر ہی وہ کالی ہو گئی ہے۔

پرندے غالباً آدمی سے بہت پہلے پیدا ہوئے ہوں گے۔ پہلے پہل پرندوں کے میٹھے بول سن کر آدمی کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی ہو گی۔ کچھ پرندے تو اس کے جگری دوست بن گئے۔ مگر میں سوچتا ہوں کوئل کی کوک میں کیا پہلے روز بھی ایسا ہی درد و گداز تھا؟ اور کیا کوّے کی کرخت کائیں کائیں میں پہلے روز بھی کوئی مٹھاس نہ تھی مگر ہائے! کتنے ہی پرندوں کو تو آدمی نے اپنی خوراک میں شامل کر لیا۔

بچپن سے ہی کبوتر کے لئے میرے دل میں ایک خاص کشش رہی ہے ہمارے گھر کے عین سامنے ایک کبوتر باز رہتا ہے۔ ذات کا بیراگی اور کام کبوتر بازی۔ اُس کا یہ شوق اب بھی قائم ہے۔ لیکن اب شاید اُس کے پاس زیادہ پیسے نہیں آتے، ورنہ آج بھی اس کے یہاں کبوتروں کی اتنی ہی تعداد ہوتی جتنی میں اپنے بچپن میں ہمیشہ دیکھتا تھا۔

ابھی تک یہ کبوتر باز کنوارا ہی ہے اور اب کون بیراگی اُسے اپنی لڑکی دے گا! ایک طرح سے اچھا ہی ہُوا۔ ورنہ اُس کی بیوی ہمیشہ اپنی جان کو رویا کرتی۔

اب تو خیر مجھے یہ کبوتر باز زیادہ نہیں بھاتا مگر بچپن کے وہ دن میں کیسے بھول سکتا ہوں جب میں گھر والوں کی آنکھ بچا کر اُس کی چھت پر مٹھیاں بھر بھر کے باجرہ پھینکتا رہتا تاکہ مفلس بیراگی کے کبوتر بھوک سے نہ تڑپا کریں۔ جب وہ اڑتے کبوتروں کو للکارتا اور پھر انہیں واپس بلانے کے لئے ہاؤ ہاؤ کرتا، میں سوچتا کاش میں بھی ایک کبوتر ہوتا۔ "بیٹھا ہے تو اچھا"۔— اُس کی آواز میں وہ تعریف ٹپکتی تھی، جو مدت سے کا استاد بھی اپنے ہوشیار شاگرد کے کانوں میں نہیں پڑنے دیتا۔ اور کبوتر بھی اُس کی آواز پر ناچتا نظر آتا۔

میرا تخیل اوپر آسمان کی طرف اُڑتا، کبوتروں کے ساتھ ساتھ۔ دور بہت دور کبوتر بادلوں کو چھوتے دکھائی دیتے۔ گھر کا تصور ان کے دلوں میں برابر بندھا رہتا، اُن کے مالک کا بشاش چہرہ اُن کی آنکھوں میں پھرتا رہتا اور وہ سب کے سب اُس عشق بازی کی وہ گھڑیاں یاد کیا کرتے جو کہ مالک کا دل خوش کرنے کے بعد، آسمان کی بلندیوں اور وسعتوں کی سیر کرنے کے بعد انہیں نصیب ہوتیں۔

اس کبوتر باز بیراگی کا نام ہے رانجھا۔ آپ اس نام کی دلکشی سے بالکل انکار نہیں کر سکتے۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ ہماری کہانی کا رانجھا بھینسیں چرایا کرتا تھا اور وہ بھی چند رکھی "ہیر" کی جسے وہ اپنی محبوبہ بنا چکا تھا اور ہمارا یہ پڑوسی کبوتر اڑایا کرتا ہے — وہ بھی اپنے، اور اُسے کسی ہیر سے بیاہ کرنے کا بالکل شوق نہیں۔ ایک بات اور بھی ہے۔ ہیر کے محبوب رانجھے نے بارہ سال تک اُس کی بھینسیں چرائی تھیں، اس پر بھی ہیر کے باپ نے اپنی بیٹی کی شادی کسی دوسرے نوجوان سے کر دی تھی اور ہمارا یہ پڑوسی رانجھا پورے پچیس سال سے کبوتر پال رہا ہے۔ آج وہ "سلور جوبلی" منا سکتا ہے — اپنی کبوتر بازی کی!

ہمارے اس رانجھے کی ماں نے اپنی ایک پڑوسن کو بیٹی کی گالی دی تھی اور اُس نے جل بھن کر کہہ دیا تھا۔ "تیرا بیٹا کبوتر باز نکلے گا!" مجھے یہ خبر ایک بڑھیا برہمنی سے ملی ہے۔ کون تھی وہ پڑوسن جس کی پیشین گوئی اتنی سچی نکلی! رانجھے کی ڈھیلی پگڑی دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کیا یہ بھی کسی بڑھیا کی بد دعا کا اثر ہے!

"بیٹھا ہے تو اچھا!"— وہ کہہ رہا ہے کبھی کبوتر کی چونچ کی طرف بغور دیکھتا ہے، کبھی اُس کا سینہ پکڑتا ہے اور پھر جب کبوتر پر پھڑپھڑاتا ہے تو اُس کی گردن سامنے کی طرف جھک جاتی ہے اور وہ اپنی آنکھیں کبوتر کی آنکھوں میں گاڑ دیتا ہے۔ کبوتر دیکھتا ہے کہ اس کے مالک کی آنکھوں میں پیار کا ہی نہیں رحم کا بھی ایک بے کنار سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ کبوتر دل ہی دل میں مست ہوا اٹھتا ہے۔ اُس کی آنکھوں کی لالی اور بھی گہری ہو جاتی ہے — لال لال ڈوروں میں شفق کا سا حسن ناچنے لگتا ہے اور اُس کی آنکھوں کی وہ سفیدی، جو دائرے میں کنارے کنارے نظر آتی ہے۔ اپنے اندر پہاڑی شہد کی سی شیرینی لئے رہتی ہے۔ کبوتر آنکھیں بند کر لیتا ہے کیا وہ سونے چلا ہے اپنے مالک کے نرم ہاتھوں میں، جیسے دودھ پیتا بچہ ماں کی گود میں سو جاتا ہے۔

لیکن جب میں کسی کبوتر کے پاؤں میں زنجیر بندھی ہوئی دیکھتا ہوں تو مجھے آدمی کی بے رحمی پر بہت غصہ آتا ہے اور حافظ کے ان الفاظ کو یاد کر کے جو اس نے کعبہ کی چھت پر بیٹھے کسی آزاد کبوتر کو مخاطب کر کے لکھے تھے۔ "نوائے کبوتر بامِ حرم چہ می دانی۔ طپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ بر پا را!"— اے حرم کی چھت پر بیٹھنے والے کبوتر! اُن پرندوں کے دل کے پھڑپھڑانے کو تُو کیا جانے جن کے پاؤں میں رسّی بندھی ہوئی ہے! — میرا دل تڑپ اُٹھتا ہے۔

۱؎ یقیناً — ش م

سپنوں میں بھی جنگلی کبوتر کا خیال میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ادھر جنگلی کبوتروں کی بھرمار ہے۔ باہر کھیتوں میں نکل جاتا ہوں تو شام کے گرد و غبار سے میلے بادلوں میں تیز رفتار سے اڑنے والے کبوتر میری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ اڑتے اڑتے وہ اُفق میں غائب ہو جاتے ہیں، جہاں بادلوں کی سُرخی انہیں ڈھانپ لیتی ہے کھیتوں سے لوٹتے ہوئے کسان اور مزدور شام کی پرسکون فضا میں آزاد جنگلی کبوتروں کی پرواز دیکھ کر اپنی صدیوں سے چھپی ہوئی راحت کو واپس لانے کی جستجو میں کھو جاتے ہیں۔۔۔۔۔ کتنے بے فکر ہیں یہ پرندے، وہ سوچتے ہیں ــ کسان مزدور سے کہیں زیادہ بے فکر!

کبھی کبھی کوئی شکاری بھی مل جاتا ہے اور اُس کے پاس مرے ہوئے جنگلی کبوتر دیکھ کر اُن کی بے بسی کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ظالم کی بندوق چھین کر چکنا چور کر دوں، کئی بار یہ خیال آیا۔ اگر وہ شکاری میری زبردستی سے بگڑ جاتا کہ اسی بندوق سے مجھے بھی کبوتر کی طرح موت کے گھاٹ اتار دے۔ یہ ڈر کچھ نہیں کرنے دیتا۔

پالتو کبوتر غلام تو ہے مگر اُسے کسی شکاری کی بندوق اپنا نشانہ نہیں بناتی وہ جنگلی کبوتر سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ پالتو کبوتروں کی شاہانہ بردباری، خود فراموشی اور پرسکون طبیعت کے بالمقابل جنگلی کبوتروں کی لاپروائی پر میں جی جان سے قربان ہو سکتا ہوں ــ چاہے اُن کی لاپروائی انہیں زیادہ عمر نہ پانے دے۔

"اگر خدا مجھے کبوتر کا جنم دینے پر رضامند ہو جائے تو میں 'لکا' کبوتر بننا پسند کروں" رانجھا کہتا ہے۔ پالتو کبوتروں میں 'لکا' کی اپنی جگہ ہے وہ بہت اڑتا نہیں۔ نفاست میں دوسرے کبوتروں پر بازی لے جاتا ہے۔ پر پھیلا کر اور گردن اکڑا کر وہ اپنے مالک کا من موہ لیتا ہے۔ گردن تو پیچھے کی طرف اس طرح موڑتا ہے کہ وہ پیٹھ کے پروں کو چھوتی نظر آتی ہے۔

مگر خدا مجھے پرندہ بنا دینے پر رضامند ہو جائے تو بلاشبہ میں جنگلی کبوتر کی چند روزہ آزاد زندگی سے یہ زندگی بدلنے کو تیار ہوں۔

بیراگیوں کے ڈیرے میں جو رانجھے کی جدی جائیداد ہے، پیپل کا ایک بوڑھا پیڑ کھڑا ہے۔ پاس ہی جاگیرداروں کی حویلی کے کھنڈر، اپنی بربادی و خستہ حالی کا افسانہ سنانے کے لئے بے قرار معلوم ہوتے ہیں۔ اس حویلی میں بیسیوں جنگلی کبوتروں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں اور اس پیپل پر بھی بھولے بھٹکے کبوتر رین بسیرے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔

پالتو کبوتروں کی کابکیں جنہیں رانجھے نے بڑی خوبصورتی سے تیار کروایا ہے، زیادہ دور نہیں۔ ان پالتو کبوتروں کے کئی رنگ ہیں۔ کوئی سفید ہے تو کوئی چتکبرا، کوئی مٹیالا ہے تو کوئی سیاہی مائل۔ مگر جنگلی کبوتر ایک ہی رنگ کے ہیں ــ خاکستری۔

شروع میں شاید سبھی کبوتر جنگلی تھے۔ شاید کیوں، ضرور۔

چرخہ کاتنے والی دوشیزہ اپنے محبوب کی جادو بھری نگاہوں میں جنگلی کبوتر کی سی حرکت دیکھ لیتی ہے۔ صدیوں سے گاؤں کی لڑکی اس تشبیہ میں بشاشت کی جھلک پیدا کرتی رہی ہے۔

"جنگلی کبوتر نے مینوں ترنجن وچ اکھ ماری!"

چرخہ کاتنے والی لڑکیوں کی محفل میں چرخہ کات رہی تھی، جنگلی کبوتر نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا!

"جنگلی کبوتر نے میرے سدی دے دند گن لئے"

جنگلی کبوتر نے میرے دانت گن لئے جبکہ میں ہنس رہی تھی!

اور جب یہ کبوتر جانے لگتا ہے تو گاؤں کی لڑکی کہہ اُٹھتی ہے۔

"ایتھوں مار اڈاری، کدھر جاویں گا؟"

یہاں سے اڑ کر کہاں جائے گا تُو؟

کبھی یہ کبوتر اپنے سسرال میں بھی جا نکلتا ہے۔

"سس نوں جوائی پچھدا، کدوں بھیجیں کبوتری میری؟"

ساس سے داماد پوچھ رہا ہے، میری کبوتری کو میرے ہمراہ کب بھیجو گی؟

بچپن کی سہیلیاں دلہن کو چھیڑتی ہیں۔

"دھنئے بدام رنگئے تینوں لین کبوتر آیا!"

او بادام کی ہم رنگ دھنی! تجھے لینے کے لئے کبوتر یہاں آنکلا ہے!

یہ حق ہے کہ جنگلی کبوتر جلد ہاتھ نہیں آتے۔ اسی لئے وہ "گولے" کہلاتے ہیں ــ نٹ کھٹ! اور اُن کے بالمقابل پالتو کبوتر "بیبے" کہلاتے ہیں ــ اچھے!

"اے جنگلی کبوتر گولے، تاڑی ماریاں اُڈ جاندے!"

بڑے نٹ کھٹ ہیں یہ جنگلی کبوتر، ہاتھ سے تالی مارتے ہی وہ اُڑ جاتے ہیں!

بھاوج اپنی نند کا راز کھول دیتی ہے۔

"نند کواری نے موہ لیا کبوتر گولا!"

میری کنواری نند نے نٹ کھٹ کبوتر کا من موہ لیا،

اور نند خود اپنے کبوتر کی تعریف کے پل باندھنے لگتی ہے۔

"روہی دا کبوتر گولا، دُھپ وچ چھاں من دا!"

مرغزار کا شریر کبوتر دھوپ میں چھاؤں مانگتا ہے!

گاؤں کی لڑکی خود بھی کسی کبوتری سے کم نہیں۔

"ہریاں کنگاں وچوں، پھٹی اُڈ گئی کبوتر بن کے!"

گیہوں کے سرسبز کھیتوں میں سے پنّھی کبوتری بن کر اڑ گئی!

گیہوں کی بالیاں پنّھی کی پریم کہانی سنا سکتی ہیں۔ کھیتوں کی رومانی کیفیت نے بار بار دیہاتی شاعری کو گدگدایا ہے۔ گیہوں کے کھیت آج بھی پیار اور خوشی سے لہلہا رہے ہیں۔

مرد عورت کا ملاپ، پیار کا جذبہ، حُسن کی کھوج، کالی مدھ ماتی آنکھوں کی ہیرا پھیری، جوانی کی شوخی اور زندہ دلی —— ایسے نظارے دیہاتی کہانیوں اور گیتوں میں ہمیشہ مقبول ہوئے ہیں۔

کسان کی بیٹی، جس نے اپنا گندمی رنگ شاید اپنے باپ کے کھیتوں کے گیہوں سے حاصل کیا ہے، اور جس کے رخساروں پہ ہیروں کی سی دمک آسمان کے آزاد کبوتر کو کھینچ لینے کا دم رکھتی ہے، دھرتی کی شاعری کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ سنو وہ گا رہی ہے۔

"باری وِچ بیٹھی ہوئی دی چمّی لے گیا کبوتر بن کے"

میں کھڑکی میں بیٹھی تھی۔ ہائے کبوتر بن کر میرا مُنہ چوم لیا!

"میں بوسہ بازی کو برداشت نہیں کر سکتی جبکہ میں خود اس میں حصہ نہیں لے رہی ہوتی"—— ایک جرمن کہاوت ہے تو کیا ہماری یہ کسان لڑکی بھی اپنے کبوتر کا مُنہ چوم لینا چاہتی ہے؟ اٹلی کی لڑکی اپنی پرانی کہاوت میں کہتی ہے "مجھے چوم لے پوپ تجھے معاف کر دے گا۔" "مجھے چومو اور میں بھی تمہیں چوموں گی، اور پوپ ہم دونوں کو معاف کر دے گا۔" مگر ہماری یہ کسان لڑکی اس سلسلے میں کیا جذبہ پیش کرنا چاہتی ہے؟ ہاں، مجھے یاد آگیا ایک نغمہ جو سسرال میں میری سالی نے گا کر سنایا تھا۔ "اج دے شوقین منڈے، کھنڈ مُکھ کے بُکیّاں لیندے!"——

آج کل کے شوقین نوجوان (محبوبہ کے رُخساروں پر) کھانڈ لگا کر بوسے لیا کرتے ہیں! ظالم نے اپنی حد کو چھو لیا ہے۔ از خود بوسہ بازی میں لڑکے کچھ مٹھاس نہیں پاتے! کون جانے گاؤں کے اس کبوتر کو بھی، جو کھڑکی میں بیٹھی کسان لڑکی کا بوسہ لے گیا، اُسے کچھ مٹھاس معلوم ہوئی یا نہیں؟ اُسے شاید ابھی تک محبوبہ کے رخساروں پر کھانڈ لگانے کی ضرورت نہیں پڑی!

رابخھا ہیراگی کبوتر اڑاتا اڑاتا خود ایک کبوتر نہیں بن گیا، یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں۔ اپنی سب سے خوبصورت کبوتری کو جو اب پانچ بچوں کی ماں ہے، وہ ہیر کہہ کر اپنا جنسی لطف کچھ کچھ پورا کر لیتا ہے۔ اور وہ گنگناتا ہے "تیری ہک تے آلھنا پایا، جنگلی کبوترسے!" تیرے سینے پر جنگلی کبوتر نے گھونسلا بنا لیا ہے! —— یہ جنگلی کبوتر ہے یا خود کام دیوتا! رابخھا ہیراگی یہی سوچ رہا ہے۔

دیوانندر ستیارتھی

شیلے

(انگلستان کا جواں مرگ شاعر)

(۱)

طوفانِ حوادث سے نہ ڈرنے والے ۔۔۔ ہنس کھیل کے دنیا سے گزرنے والے
اب کون سے گردوں کا ستارا ہے تُو ۔۔۔ اے قعرِ سمندر میں اُترنے والے!

(۲)

اس بزمِ جہاں کو کیا خبر تھی تیری؟ ۔۔۔ جو شام تھی دنیا کی سحر تھی تیری
جس پر نہ پہنچ سکا خیال انساں کا ۔۔۔ اُس عالمِ بالا پہ نظر تھی تیری

(۳)

اے رفعتِ افلاک سے آنے والے ۔۔۔ عالم کو بس اک جھلک دکھانے والے
اب تک دلِ اہلِ دل میں تیرا ہے مقام ۔۔۔ اے بحرِ فنا میں ڈوب جانے والے

جگن ناتھ آزاد

صفائی عجب چیز دنیا میں ہے

تیسری دفعہ ایف اے میں فیل ہونا بڑی پریشانی کا موجب ہوا۔ دوست احباب ملتے تو کہتے "یار، اب تو غریب یونیورسٹی کا پیچھا چھوڑ دو یا عمر بھر ساتھ دینے کی ٹھانی ہے"۔ میں ایسی باتوں کو ہنسی مذاق میں ٹال دیتا۔ مگر اب کے غضب یہ ہوا کہ میرا چھوٹا بھائی مجھ سے ایک جماعت آگے نکل گیا۔ بیس سال کی عمر تھی، رگوں میں خونِ گرم دوڑ رہا تھا۔ یہی صلاح ٹھہری کہ کسی اور میدان میں قسمت آزمائی جائے۔ والد چوتھی بار کالج میں داخل کرانے پر مصر تھے۔ مگر میری نیت بگڑ چکی تھی آخر داخلہ اور فیسوں کے روپے لئے اور کشمیر کی طرف منہ اٹھا کر بھاگ نکلا۔

باہر جا کر معلوم ہوا کہ میں دنیا میں اپنی رہنمائی کے لئے کس قدر ناموزوں ہوں۔ ہوٹلوں کے سوا رہنے کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی تھی اور وہاں کے بیروں اور خانساموں سے خدا دشمن کو بھی بچائے۔ ایک ہی مہینے میں سارا سرمایہ ختم ہو گیا۔ اور اب مجھے پیٹ بھرنے کی فکر بڑی شدّت سے ستانے لگی ایک دو دن فاقے کاٹے تو مجھ پر چاردں طبق روشن ہو گئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ میری تعلیم جسے میرے والد اس قدر ضروری سمجھتے تھے۔ کوئی عملی قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ یہ تو محض سرکس کے گھوڑوں کی تربیت کی مانند ہے اور جس طرح گھوڑوں کے کرتب دکھانے کے لئے سرکس کا دائرہ لازم ہے۔ اسی طرح موجودہ تعلیم یافتہ طبقے کے جوہر کی آزمائش کے لئے دفتروں کے بھاری بھرکم رجسٹر اور فائلوں کے انبار ازبس ضروری ہیں میں جسمانی لحاظ سے کسی سے کم نہ تھا مگر جسمانی کام کرتے عار آتی تھی لیکن آہستہ آہستہ یہ حجاب اُٹھا۔ اور میں نے ہر قسم کا کام کرنے کی ٹھان لی۔ ابھی ارادہ مصمّم ہوا ہی تھا کہ دستِ غیب نے میری لاج رکھ لی۔ اور میں ریاست کشمیر میں ملازم ہو گیا۔

میرا کام سڑک کے کنارے کے درختوں پر نمبر لگانا تھا۔ مجھے یہ کام بہت پسند تھا۔ کیونکہ اس طرح اس جنت نظیر خطے کے چپّے چپّے کی سیر کا موقع میسّر تھا۔ میں چشموں کے کنارے کئی کئی گھنٹے صرف کر دیتا۔ چاندنی راتوں کی صاف شفّاف فضا میں پہاڑی باشندوں کا ایک قطار میں سفر کرنا اور بلند آواز سے گانا ایک وجد آور نظارہ تھا۔ مگر یہ سب دور کی باتیں تھیں۔ ان کے قریب پہنچیئے تو اتنی غلاظت۔ اتنی بدبو کہ الاامان۔ شاید خدا نے اس بہشت کو ان لوگوں سے اس لئے پُر کر دیا ہے کہ اسے کہیں نظر نہ لگ جائے۔

مجھے یہاں سب سے زیادہ تکلیف کھانا پکوانے میں پیش آتی تھی۔ میں بھوکا رہنا گوارا کرتا مگر اُن کے ہاں سے پکوانا مجھے منظور نہ تھا۔ اُن کی تکّی کی روٹی۔ بے نمک، بے مرچ سالن اور پھر وہ بھی نیم پخت۔ کھانا پکانے کے برتن اس قدر گندے کہ خواہ مخواہ نفرت پیدا ہو۔ کبھی کبھی خود روٹی پکانے کا خیال آتا۔ مگر میری جھوٹی تعلیم مانع ہوتی۔ مجھے ایک نوکر بھی ملا ہوا تھا۔ تجویز یہ ٹھیری کہ اس سے یہ کام لیا جائے۔ مگر اس میں بھی بڑی دقّت پیش آئی ہفتوں کی کوشش سے وہ اِس قابل ہوا کہ چند کچّی پکّی چپاتیاں اتار لیا کرے۔

ایک دن دوپہر ہو گئی اور ہمیں کوئی جگہ ایسی نظر نہ آئی جہاں جا کر کھانے کا انتظام کیا جائے۔ آخر کوئی ایک میل بلندی پہ ایک گاؤں نظر آیا۔ دوری مانع تھی مگر وہاں جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مجبوراً میں نے نوکر سے کہا کہ جلدی جا کر آٹا گوندھے اور روٹیاں پکائے۔ نوکر اسی سرزمین کا باشندہ تھا اس لئے وہ مجھ سے قریباً پندرہ منٹ پہلے پہنچ گیا۔ میں بھی اُسے ڈھونڈتا ڈھونڈتا ایک گھر میں جا پہنچا وہاں وہ ایک ایسی کنالی میں آٹا گوندھ رہا تھا جس کے کناروں سے پہلے کا گندھا ہوا آٹا چمٹ کر سوکھ گیا تھا۔ خیال پیدا ہوا کہ اگر کنالی کا یہ حال ہے تو دوسرے برتنوں کی کیا کیفیت ہوگی۔ میری طبیعت وہاں روٹی کھانے پر مائل نہ ہوئی۔ یونہی چھوڑ کر چلے جانا کچھ نامناسب محسوس ہوا۔ ٹھیکالے کے مختلف طریقے سوچے مگر پسند نہ آئے آخر کار ایک بہانہ سوجھا اور میں نے گھر کی مالکہ سے کہا راستے میں مجھے ایک دوست مل گیا تھا اس نے مجھے کھانے کی دعوت دی ہے اور ہم اُس کے ہاں جا رہے ہیں یہ آٹا تم ہیں رکھ لو، اس چار دیواری سے نکل کر کسی صاف ستھرے گھر کی تلاش کرنے لگے۔ اچانک میری نظر ایک مکان کے اندر پڑی تو دیکھا کہ ایک نہایت صاف کنالی دیوار کے ساتھ لگی رکھی ہے۔ طبیعت کو تسکین ہوئی کہ حسبِ منشا چیز مل گئی۔ میں مکان کے اندر داخل ہوا۔ گھر کی مالکہ کو سلام کیا اور خوشامد کے انداز میں اُس سے آٹا گوندھنے کے لئے کنالی مانگی۔ اُس نے بخوشی

اجازت دے دی اور لو کر روٹی پکانے میں مصروف ہو گیا۔

روٹی تیار ہو گئی۔ میں نے کہنیوں تک ہاتھ دھوئے اور منہ بھی دھو لیا بڑی اشتہا بلکہ بے صبری سے روٹی کھانی شروع کی۔ اس دوران میں بار بار میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ خدا نے یہ روٹی بھی کیا نعمت بنائی ہے ..... کھوئی ہوئی طاقت کتنی جلد بحال کر دیتی ہے .... مگر بعض انسان روٹی ہی کی فراوانی کے باعث خدا سے بھی منکر ہو جاتے ہیں ..... انسان کس قدر احسان فراموش ہے ..... شیخ سعدی نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ان ہی خیالات میں غرق میں معمول سے زیادہ روٹی کھا گیا اور ختم کرنے والا ہی تھا کہ خیال پیدا ہوا کہ اس عورت کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ میں نے لقمہ چباتے ہوئے تعریفی لہجے میں کہا "یہاں عام لوگ بڑے گندے ہوتے ہیں مگر تمہارے گھر میں بہت صفائی ہے۔ ہم ایک گھر میں گئے کہ روٹی پکا لیں مگر کنالی سے پہلا آٹا چمٹا ہوا دیکھ کر طبیعت خراب ہو گئی اور ہم وہاں سے چلے آئے۔ تمہاری کنالی کتنی صاف ہے"۔ یہ تعریف سنی تو اس نے چرخہ کاتنا بند کر دیا اور میری طرف متبسم نگاہوں سے دیکھا اور پھر فخریہ انداز میں کہنے لگی "یہ سب عورتیں مورکھ ہیں" (میں نے تائید اً کہا "بے شک") "یہ آٹا گوندھ کر کنالی زمین پر یونہیں ڈال دیتی ہیں۔ اور اس طرح آٹا چمٹا ہی رہ جاتا ہے۔ میں اسے دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیتی ہوں۔ بندر آتے ہیں چاٹ کر صاف کر جاتے ہیں"۔ میرے منہ کا لقمہ بے اختیار زمین پر گر پڑا۔

اسلم صدیقی

رباعی

اُٹھ فکرِ جہاں کرنے دے فرزانوں کو
اُٹھ، زیرِ فلک غم نہیں مستانوں کو
خوش جام بکف رہ، کہ بزورِ شمشیر
یہ چیز میسّر نہیں سلطانوں کو

سعید احمد اعجاز

بیٹے کے نام

یہ دعا ہے راحتِ جانِ حزیں! تیرے لئے — دَورِ عالم ہو مسرت آفریں تیرے لئے
باطنِ مہر و مہ و انجم پہ ہو تیری نظر — جا بجا ہو جلوۂ نورِ یقیں تیرے لئے
آسمانوں سے ہو تجھ پر بارشِ الطافِ حق — باغ گلہائے وفا کا ہو زمیں تیرے لئے
زیست کی تلخی جو ہو تیرے مقدر میں کہیں — التجاؤں سے بھری ہو انگبیں تیرے لئے
مشکلاتِ دہر کو مشکل نہ سمجھے دل ترا — سہل ہو ہر منزلِ دنیا و دیں تیرے لئے
اِن دعاؤں کے سوا، اِن آرزوؤں کے بغیر — پاس میرے کوئی سیم و زر نہیں تیرے لئے

عزم و استقلال و تسکیں ہوں سدا ہمدم ترے
راستی، صدق و صفا ہوں مونس پیہم ترے!

بِک رہی ہے آہ! اپنی قدر و قیمت بھول کر — دَورِ حاضر میں جوانی عشرتِ امروز پر
عیش و عشرت کی تمنا کے سوا کچھ بھی نہیں — نوجوانوں کے دلوں میں آج اے لختِ جگر!
عمر بھر جمعیتِ خاطر کو پا سکتے نہیں — یہ پریشانِ دل و جاں، یہ پریشانِ نظر
وقت سے پہلے ہوا جاتا ہے تاراجِ خزاں — بے ریاضت، بے حفاظت نوجوانی کا شجر
عمر بھر اُس کی غلامی سے ہے بشر کے واسطے — گر جوانی میں نہ ہو مغلوبِ نفسِ حیلہ گر

شکرِ ایزد! دل ترا ہشیار ہے، فرزانہ ہے
ہر روش میں رسم و راہِ عام سے بیگانہ ہے!

خوب شے ہے رسم و راہِ عام سے بیگانگی — میری نظروں میں اسی کا نام ہے فرزانگی
بے نیازِ فکر ہیں افسوس ابنائے زماں — عام ہے اس دَور میں تقلید کی دیوانگی
لائقِ تحسیں ہے کارِ خیر میں تقلیدِ عام — عقل سے حاصل ہے اس تقلید کو پروانگی
بہ رہا ہے اک جہاں جذبات کے سیلاب میں — مستقل رہنا لبِ ساحل پہ ہے مردانگی
دل کی تسکیں کے لئے تفریح گاہوں تک ہے دوڑ — تا کنارِ بام ہے پروازِ مرغِ خانگی

حق تجھے مائل بہ تقلیدِ حق اندیشاں کرے
رہروِ سرمنزلِ راہِ صفا کیشاں کرے!

محرومؔ

سماج کا شکار

کہنے کو تو ضرور شیر خاں ایک سال کی مقدمہ بازی اور آوارہ گردی کے بعد رحیم خاں کو قتل کرکے صاف بچ کر گھر آگئے مگر جیسے کچھ ہی آگئے ان کا دل جانتا ہے اور اُن کے گھر والے۔ ہاتھی سا جسم گل کر خاک ہوگیا۔ سُرخ سپید چہرہ جھلس کر سیاہ ہوگیا اور بھونرا سی کالی داڑھی کھچڑی پڑگئی !! اب یہ حال کہ کہنے کو تو ضرور زندہ تھے مگر اصلی معنی میں زندہ درگور! ۔ قتل بھی کیا تھا دونوں جانب سے کھلا ہوا بلوہ نہ معلوم رحیم خاں کس کی لاٹھی کا شکار ہوا مگر چونکہ شیر خاں اس فریق میں ذرا چمکتے ہوئے تھے اور اِن کے سرغنہ تھے قتل تنہا ان ہی کے سر تھوپ دیا گیا۔ آج چودہ ماہ ہوچکے شیر خاں چھوٹ کر آ بھی گئے اور گھر آکر نئے پُرانے ہوگئے مگر چودہ ماہ تو چودہ ماہ شیر خاں چودہ سال میں بھی نپیتے نہ معلوم ہوتے تھے ان چند ماہ کی تو کیفیت ہی نہ پوچھئے جن میں شیر خاں فرار رہا۔ اب بھی جسوقت خیال کرتا تو بھوک غائب ہو جاتی۔ پیشانی پر ٹھنڈا پسینہ آجاتا'!! اوہ! کیسی کیسی برسات کی کالی اور بھیگی ہوئی بھیانک راتیں'! جنگل کے سنساتے ہوئے دیو قامت درخت۔ اور وحشی جانور رفیق'!! ہر پتے کے کھٹکے پر دل پر گھونسا سا لگتا'! اور اعصاب میں پھڑکن سی پیدا ہو جاتی'! جملہ دماغی قوتیں یکدم مجتمع ہو کر تمیز کرنے کی کوشش کرتیں' صبح آفتاب حشر ساتھ لے کر نکلتی جنگل کا ہر چرواہا سپاہی اور ہر کاشتکار سپرنٹنڈنٹ پولیس معلوم ہوتا۔ جس عزیز دوست کے یہاں جاتا وہ اس کو مارِ آستین سے کم نہ سمجھتا اپنے پرائے سب نگاہیں چُراتے اور مُنہ ٹالتے کیونکہ مقتول کے لڑکے عزیز خاں وغیرہ بھی بڑے جوڑ توڑ والے پٹھان تھے پولیس تو خیر تلاش میں تھی ہی مگر عزیز خاں کو سب حال اصلی معلوم ہوتا۔ چنانچہ انہیں اطلاعات پر وہ کئی مرتبہ پولیس کو لیکر گیا اور قریب قریب شیر خاں کے ہر رشتہ دار کی خانہ تلاشی ایک ایک دو مرتبہ کرائی اور ہمیشہ شیر خاں بال بال بچا۔ بعض جگہ شیر خاں کے غریب رشتہ داروں پر پولیس سے سختی بھی کرائی۔ غرض غریب دِنرات کبھی گھنے اور بیابان جنگلوں میں یا غیر آباد عمارات اور کھنڈروں میں مارا مارا بھاگا پھرتا۔ بچوں اور بیوی کی شکل کو ترس گیا۔ بوڑھی ماں ہمیشہ نوحہ خواں نظر آتی۔ جوان بیوی بیوہ خیال کی جاتی۔ اور معصوم خورد سال بچے یتیم۔ جس وقت وہ اپنی ماں سے سوال کرتے "اماں ابا کہاں گئے ہیں" تو غریب آنسو روک کر کہتی "پردیس کو" کھانا پینا حرام تھا دونوں ساس بہوئیں تمام رات قرآن اور نماز پڑھ کر دعائیں مانگتیں' استخارے کرتیں' نذریں نیازیں کرتیں' اور جب اس سے فارغ ہوتیں تو رونے لگتیں۔ شیر خاں کے ایک چھوٹا بھائی بھی تھا کہنے کو تو ضرور بیس سال کی عمر تھی۔ مگر بڑے بھائی کی پدرانہ شفقت نے عقل و تجربہ دس بارہ سال کے لڑکے سے زیادہ نہ بڑھنے دیا تھا۔ دیکھنے میں قریب چھ فٹ، قد سُرخ سپید رنگ' شیشہ سا دمکتا ہوا جسم اچھا خاصہ مرد مشتین معلوم ہوتا تھا۔ مگر دُنیا کے نشیب و فراز سے بالکل واقف نہیں نہ تھا۔ غریب کو کچہری اور تھانہ کا راستہ ہی معلوم نہ تھا۔ سوا اسکے کہ صبح شام پانچسو ڈنڈ اور ڈھائی سو بیٹھک لگالیں۔ اور دونوں وقت اپنے ہاتھ سے ایک بھینس کا پُورا دودھ دوہ کر تھان پر کھڑے کھڑے پی لیا اور ہفتے والے دن کچھ جنس لے گیا اور اسکے بدلے میں ایک سیر گوشت یا مچھلی لے آیا اور بھاوج سے بھنوا کر کھا لیا یا بہت کیا تو صبح کو نو دس بجے کھیتوں پر چلا گیا اور جتنی دیر ہلواہا چلم پیتا رہا خود جوتتا رہا یا شام کو اپنا موٹا لٹھ لے کر کھیتوں پر جدھر کو مُنہ اُٹھا گھومنے چلا گیا اور دُنیا کے کسی کام سے واقف ہی نہ تھا۔ اس غریب پر نئی پڑی تھی مگر چونکہ اکھڑ پٹھان تھا ڈرنا بالکل نہ

جانتا تھا البتہ جب داروغہ جی، دیوان جی، اور پھر ان سب کے لیڈر سپاہی صاحب چوپال پر تشریف لاکر ایک دم سوالات کی بھرمار کر دیتے تو پریشان ضرور ہو جاتا تھا۔ "بتاؤ کہاں ہے"؟ بھلا غور کیجئے ایک نوجوان سے کتنا مہمل سوال ہے اگر بتانا ہی ہوتا تو فرار ہی کیوں ہوتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اسی قسم کے بے سروپا سوالات کئے جاتے غریب پریشان ہوکر سوچتا کہ کاش بجائے بھیّا کے مجھ ہی پر قتل عائد ہوتا۔ تو ان شیطانی مصیبتوں سے تو نجات ملتی۔ مگر اب کچھ مشیروں کی صلاح نے اور کچھ داروغہ جی اور ان کے ہمراہیوں کی بار بار تشریف آوری نے اس کی بھی آنکھیں کھول دیں تھیں اور اب اسکی سمجھ میں بھی کچھ کچھ آنے لگا تھا کہ موت اور زندگی کا کل اختیار اللہ میاں کے ہی ہاتھ میں نہیں بلکہ بڑی حد تک داروغہ جی بھی اس پر قادر ہیں۔ چنانچہ ایک صبح جب داروغہ جی ملک الموت کی شکل میں حسب دفعہ ۸۷ و ۸۸ تعزیرات ہند مکان اور اثاث البیت کی قُرقی کا پروانہ لے کر وارد ہوئے اور سب سے پیشتر اسکے تھان سے اسکی بھینسیں قُرق کر کے محرّر پونڈ کے نام پروانہ لکھا اور اسکے بعد زنانہ مکان کے اندر قصد کیا۔ تو پہلے تو جوشِ حمیت سے نوعمر پٹھان بگڑا مگر بعد کو داروغہ جی کے چوتھ خور مشیروں کے سمجھانے سے ذرا دھیما ہؤا۔ ایک دلال "ارے میاں لڑنے کہیں سرکاری حکام سے بگاڑ کر کام بنتا ہے"۔ دوسرا "ارے صاحب تم نے ابھی نکل کے دُنیا کی ہوا نہیں دیکھی ہے انکے نذرانہ کا انتظام کرو"۔ چنانچہ ان لوگوں کی ذمہ داری پر داروغہ جی نے قُرقی نالیقے کی کارروائی ملتوی کردی اور دوسرے ہی دن شام تک غریب نے ایک بھینس کے سوا سب بھینسیں اور بچھڑے اور مال کا سب زیور گرو کر کے مبلغ پانچسو روپیہ داروغہ جی کا مُنہ جُھلسنے کے لئے و مبلغ سو روپیہ دیوان جی رپٹ نویس سپاہی اور چوکیدار کا مُنہ میٹھا کرنے کے لئے پیش کئے یعنی حساب کر کے پُوری ۸ ماہ کی تنخواہ تو داروغہ جی کی اور تین تین ماہ کی باقی عملے کی یکمشت وصول ہوگئی۔ دو تین دن تو داروغہ جی چپکے بیٹھے رہے مگر اسکے بعد فوراً ہی ریشہ دوانیاں شروع ہوگئیں اور چوتھ خور مشیروں نے مطلع کیا کہ آج عزیز خاں نے داروغہ جی کو بارہ سو روپیہ کی رقم دی ہے بیچارے نے علم ریاضی بالکل نہیں پڑھا اور نہ تناسب اور مساحت سے واقف تھا۔ یہ ضرور جانتا تھا کہ چھ سو سے بارہ سو روپیہ زیادہ ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ جب دوسرے نے بارہ سو دے دیئے تو میرے چھ سو ختم ہوگئے مگر داروغہ جی کے مشیروں نے وعدہ کیا کہ تمہارے وہ چھ سو بھی وصول کرا دینگے چھ سو کا انتظام اور کرو ناصر علی خاں نے چند دن تساہل کیا پھر کیا تھا داروغہ جی تشریف لے آئے اور داروغہ جی کا بھی کیا قصور جب عزیز خاں نے ہر چیز ڈبل کر دی تو وہ کیوں نہ آتے بھلا یہ تو درجہ الف کا بچّہ بھی جانتا ہے کہ ایک سے دو دگنے ہوتے ہیں بھلا داروغہ جی جو نولکشو پریس کی تیسری ریڈر تک پڑھے ہوئے تھے یہ بھی نہ سمجھتے کہ چھ سو سے بارہ سو دوگنے ہوتے ہیں۔ اور پھر یہ کہ اس صورت میں ان کی کیا ڈیوٹی ہے چنانچہ فوراً قُرقی کی گئی۔

سب سے زیادہ جو چیز قُرقی میں نوعمر اور ناتجربہ کار ناصر خاں کو گراں گزری وہ اس کے بیل اور باقیماندہ ایک بھینس اور گھوڑی کا کانجی ہوس جانا تھا۔ گھر کا سب غلہ بھی قرق ہوگیا اور چارپائی بستر مونڈھے تک سب باہر نکال کر رکھے گئے۔ کپڑوں کے صندوق اور گھی اور دالوں کے مٹکے نکالے گئے گھر کے اندر سے چکّی اور کھانا پکانے کے برتن نکالے گئے اور لاکر گلی میں ایک ایک کر کے سب چیز جمع کی گئی ناصر خاں نے اس قسم کی قُرقی کبھی نہ دیکھی تھی بے اختیار رونے لگا۔ داروغہ جی کے دلالوں نے تسکین دی اور کہا کہ "میاں کس ہوا میں ہو۔ بارہ سو روپیہ پُورے کر دو، اور پھر بچی تک داروغہ جی بچانے کے ذمہ دار ہیں۔ غرض ان مشیروں نے ناصر خاں کو یہانتک شیشہ میں اُتارا کہ اُسے یقین ہوگیا کہ اگر بھیّا کی رُوح ملک الموت بھی قبض کرنے آئینگے تو داروغہ جی اپنے ٹمنچے سے انہیں بھی مار بھگائینگے غرض ان لوگوں کے کہنے سُننے سے ناصر خاں تیار ہوگیا مگر روپیہ کہاں سے فراہم کرتا ہر چیز قُرق تھی داروغہ کی خدمت میں یہ عرض لے گیا۔ کہ مجھے کل تک کی مہلت دیجئے۔ غرض بمشکل مہلت ملی اور دوسرے ہی دن غریب نے کھیتی کا سب غلہ گھر کا ہر جانور اور گرو شدہ زیور فروخت کر کے شام تک داروغہ جی کے مبلغ چھ سو روپیہ پُورے کئے۔ اب داروغہ جی کی ہدایت کے مطابق شیر خاں کو حاضر بھی کر دیا داروغہ جی نے حسب دفعہ ۲۰۰ تعزیرات ہند چالان کر دیا پہلے پہلے داروغہ جی اور دیوان جی رپٹ نویس کا بیان ہؤا جیسے زمین گول مول۔ دونوں جانب سے نوازے جاچکے تھے کیوں صاحب جب ترازو کے دونوں پلّوں میں مبلغ بارہ بارہ سو روپیہ رکھ دیئے جائیں۔

تو برابر رہینگے یا نہیں دار وغہ جی نے بھی اپنے بیان میں توازن کر دیا ایمانداروں کی خاص صفت ہے۔ سچ بول پُورا تول۔ عدالت ابتدا سے لے کر جج اور گورنمنٹ پلیڈر سب کے سب شبہ میں رہے اور آخر دروغہ جی کی راست گوئی کی تعریف کرتے ہوئے مقدمہ چھوڑ دیا۔ جب چھُوٹ کر شیر خاں گھر آئے تو اُنھوں نے احساس کیا کہ دروغہ جی نے اُسے بچایا ہی نہیں ہے بلکہ ایک خدمت اور بھی کی ہے یعنی گھر میں جھاڑو بھی دے دی۔ اب دونوں بھائی گاؤں میں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتے۔ سورج غروب ہونیکے بعد گھر سے باہر نہ نکلتے اور اکثر مغرب کی نماز بھی زنانہ مکان میں پڑھتے۔ تمام گاؤں دشمن تھا۔ کچھ کھُلم کھُلا اور کچھ دوست نما! اپنی پارٹی منتشر ہو چکی تھی اور عزیز خاں کا گروہ ہر وقت درپئے آزار اور تاک میں تھا باہر یہ عالم تھا اور گھر میں فاقوں پر نوبت تھی کھیتوں سے روزانہ خرچ کے قابل نیم پختہ فصل کاٹ کر لاتے جس سے چولہا گرم ہوتا! اور چٹنی سے روٹی ملتی۔

(۲)

زبر خاں اسی گاؤں کے بڑے زور دار پٹھان تھے۔ ایک ہل کی کھیتی کرتے تھے اور چھ سات بھینسیں پالتے تھے! اور لطف یہ تھا کہ خانصاحب کے کھیتوں میں کبھی چارے کی قسم کا ایک تنکا بھی کاشت نہ ہوتا تھا پھر بھی خانصاحب کے بیل تمام گاؤں کے بیلوں سے زیادہ چمکدار اور مرتّب تھے اور بھینسیں سب گاؤں کی بھینسوں سے زیادہ دودھ اور گھی دیتی تھیں۔ خانصاحب کے جانور اد سُر سانڈے کی خاصیتیں رکھتے تھے کیونکہ سرِ شام ہی خانصاحب انہیں قیدِ رسن سے آزاد کر دیتے۔ جو صبح تڑکے تک پیٹ بھر کر سب کے سب خود بخود تھان پر موجود ہو جاتے۔ رات کے وقت اوّل تو کسی کے ہاتھ ہی نہ آتے تھے اور اگر دو چار منچلوں نے گھیر کر دو ایک جانور پکڑ بھی لئے تو کانجی ہوس لے جانا تو درکنار خانصاحب سے شکوہ شکایت کرنا بھی بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کا مصداق تھا۔ خانصاحب کے پاس ایک ہل کے قابل ساقط الملکیّت تھی جس سے ثابت ہوتا تھا کہ زمانہ قدیم میں خانصاحب کے جد امجد موضع میں زمیندار تھے اور زمینداری نکل جانے کے باوجود بھی خانصاحب اب تک انتظام دیہہ سے دست کش نہ ہوئے تھے۔ موضع میں چند گھر پٹھانوں کے سوا باقی تمام کاشتکار رعایا آباد تھی جن میں زیادہ تر مراؤ تھے۔ اِس رعایا میں خانصاحب کا اقبال درست تھا اور اختیارات لامحدود! ہر شخص خانصاحب کو چُپ چاپ بیگار دیتا ورنہ گرنہ ستانی بہ ستم سرہ کا مضمون ہوتا۔ اگر خانصاحب کو کوئی گنّا نہ دیتا تو خانصاحب اس سے بھیلی وصول کر کے دکھاتے۔ خانصاحب کا اقبال ماشاالله اتنا درست تھا کہ جس کاشتکار کے کھیت پر سے خانصاحب کے اقبال کا سایہ اُٹھا۔ سب کا سب ایک ہی رات میں صاف ہوگیا۔ اگر گاؤں کے پڑاؤ پر کوئی گاڑی یا تجارت پیشہ مسافر ٹھہرا اور اس نے خانصاحب کا ٹیکس ادا نہیں کیا تو ہمیشہ یہی دیکھا کہ وہ گاؤں کی چوپالوں پر اپنے مال مسروقہ کی فہرست سُنا رہا ہے اور کبھی کبھی ضربات بھی دکھا رہا ہے۔ چُنانچہ ہر ایک کو خانصاحب کا ٹیکس ادا کرنا گورنمنٹ آف انڈیا کے انکم ٹیکس سے زیادہ اہم اور ضروری تھا۔ کیونکہ اس میں پھر بھی وصول یابی میں دیر لگتی ہے۔ مگر یہاں فوری انصاف ہوتا تھا۔ غرض گاؤں کا ہر کاشتکار خانصاحب کے سب گھر والوں اور ان کے مویشی کا پیٹ بھرنے کا ضامن تھا۔ اور وہ سب استحصال بالجبر اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ انہیں خانصاحب کا کوئی مطالبہ گراں نہ گذرتا تھا۔ اور یہ کہہ کر کہ "ایک ایسا ہے اُسے بھر لو" سب ان کے جائز و ناجائز مطالبات پورے کرتے رہتے تھے۔ مگر اس وقت اس بڈھوا مراؤ کی تو ہمت دیکھئے کتنی دیر سے خانصاحب کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ تو اب جوت رہنے دے اور بیلوں کو ہل سے علیحدہ کر کے دیدے۔ انہیں دیر ہو رہی ہے۔ مگر وہ ہے کہ بہانہ بازیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ بے ادب اتنا نہیں سمجھتا کہ خود ان بیچاروں کے بیل اگر ابھی چار بیگھہ جوت کر نہ آتے ہوتے تو وہ سواری کے لئے تیرے بیل کیوں مانگتے اس پر مزہ یہ ہے کہ انکار بھی خوشامد سے نہیں ہے بلکہ آواز میں ایک قسم کی تیزی ہے مانا کہ تو صبح سے جوت رہا ہے اور دن کے بارہ بجے ہل جوتنے والے کا دماغی توازن ڈانواں ڈول ہونے لگتا ہے۔ مگر تو تُو ہے اور خانصاحب خانصاحب ہی ہیں۔ یہ بھی تو غور کر لے کہ وہ بیچارے تیرے بیل ہی تو مانگتے ہیں۔ بھلا دو دن میں کیا تیری لاٹ ہو جائیگی۔ آج کا دن تو گیا، کل اور پرسوں دو دن ٹھہرینگے پرلے روز شام تک آہی جائینگے۔ کمبخت نہ سمجھا! آخر کار خانصاحب کو اپنے ایک فٹ سے کچھ زائد لمبے جوُتے کو تکلیف دینا پڑی اور سُریلی

آواز کو زیادہ سُریلا کرنا پڑا اور بجائے ہلکی گلابی کے آتشی گلابی اُردو میں تقریر فرمانا پڑی! آخر ضبط کی بھی کوئی حد ہوتی ہے جھپٹ پڑے۔ غریب مراؤ نے مدافعت کی ہلکی سی کوشش کی مگر اس میں وہ اتنا ہی کامیاب ہو سکا جتنا کہ ایک غریب کسان ایک بہادر رئیس پٹھان کے مقابلہ میں ہو سکتا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو خانصاحب نے دو سو مرتبہ ایک ہی سلسلہ میں اپنے کم و بیش ڈیڑھ فٹ لمبے جوتے کو کسان کے سر پر سے اُتار دیا مگر کمبخت کی شامتِ اعمال کہ اب بھی کمبخت نے خاں صاحب کی شانِ جبروتی کا احساس نہ کیا اور بجائے اِسکے کہ پُرانی ہندی مثل کے مطابق "ننگ بڑے پرمیشر سے"۔ خانصاحب کے اتنی تکلیف کرنے کے بعد اس کو سرِ اطاعت خم کر دینا چاہیئے تھا اور اُلٹا اکڑنے لگا اور بیل دینے سے انکار ہی کرتا رہا اب خانصاحب نے غور فرمایا کہ مُراؤ اس سزا سے قابو میں نہیں آیا اس سے زیادہ کارگر ہتھیار استعمال کرنے کی ضرورت ہے! کاش اسوقت ان کی پینٹل کی شام والی لاٹھی ہوتی تو اس گستاخ و سرکش مُراؤ کی گستاخی اور بیباکی کا ہمیشہ کے لئے سدِباب کر دیتے۔ مگر فوراً ان کی نظر بیل ہانکنے کے پینے پر پڑ گئی جو غریب کانپتے ہوئے کسان کے ہاتھ میں تھا۔ جھپٹ کر چھین لیا پھر کیا تھا اسکے گرد آلود اور پسینہ میں شرابور جسم پر خوب خوب ہنوٹ کے ہاتھ دکھائے۔ غریب مُراؤ زمین پر لوٹا لوٹا پھرتا تھا۔ اور یہ ہر ضرب پر نہایت فحش گالیوں کی بوچھاڑ کرتے جاتے تھے ارد گرد کھیتوں میں جو کسان ہل جوت رہے تھے وہ بعض تو ہل کھیتوں میں کھڑے چھوڑ کر اور بعض اپنے ہل بیل لے کر فرار ہو رہے تھے بچانے کون آتا۔ جب خانصاحب کا دستِ مُبارک خود ہی تھک گیا اور اکثر جگہ سے بدھوا کے جسم سے خُون جاری ہو گیا۔ تو خانصاحب خود ہی ٹھہر گئے اور گالیاں بکتے ہوئے بیلوں کی جانب متوجہ ہوئے جو اپنے مالک کی یہ گت بنتی دیکھ کر ایک جانب کو سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ دونوں بیل ہل سے علیٰحدہ کئے اور لے کر چلنے لگے۔ کسان جھپٹ کر دونوں بیلوں کے سامنے ان کی ناتھیں پکڑ کر کھڑا ہو گیا اس کو اپنی مرمت کا اتنا خیال نہ تھا جتنا کہ بیلوں کے جانے کا تھا خانصاحب کی طرف ایک نگاہ ڈالی جس میں التجا، مدافعت اور خوف ... چیز شامل تھی۔ خانصاحب۔ "ابے ہٹ... چھوڑ ناتھیں... ابھی دماغ صحیح نہیں ہوا......"

"ہائے گستیاں جے بھرا بھر گنوار! چار پانچ دن کی جوت ماری گئی تو کیسے نیا بار لگیگی" بُدھوا نے لاچاری سے آسمان کی جانب دیکھ کر کہا خانصاحب نے ڈپٹ کر کہا "ابے ہٹتا ہے یا نہیں" اور یہ کہہ کر اسکے ہاتھوں سے ناتھوں کی رسیاں زبردستی چھڑانے لگے۔ بُدھوا ابھی دھینگا مُشتی کرنے لگا اُسکے ہاتھوں سے بیلوں کی رسیّاں تو چھوٹ گئیں اور دونوں میں زور آزمائی ہونے لگی خانصاحب نے غور کیا کہ سماجی قوّت میں تو یہ کسان ضرور میرا ہم پلّہ نہ تھا مگر جسمانی طاقت میں مجھ سے بڑھا ہوا ہے۔ کمبخت جنیئو پہننے والا مراؤ یہ نہ سمجھا کہ ابھی خانصاحب کے پاس ایک اور بھی آلہ موجود ہے جو اسکے لئے دُنیا کی ہر تلوار زیادہ تیز اور ہر توپ سے زیادہ کارگر ہے جب خانصاحب نے دیکھا کہ عنقریب وہ نیچے آنا چاہتے ہیں تو اُنہوں نے زور آزمائی بند کر دی اور موقع پا کر اپنے اُلٹے ہاتھ سے اس کا سر پکڑا اور سیدھے ہاتھ سے دونوں جبڑے بڑے زور سے دبائے اور منہ کھلنے پر بڑی پھرتی سے اندر تھوک دیا۔ بُدھوا اُچھل کر یکدم علیحدہ ہو گیا اور خانصاحب گالیاں دیتے ہوئے اور دیر ہو جانے کی شکایت کرتے ہوئے دونوں بیل لیکر بستی کی جانب روانہ ہو گئے اور فوراً ریلو میں جوت کر چلدیئے۔

(۳)

دوپہر کا سورج ڈھل کر پردۂ افق میں جا پہنچا۔ گاؤں سے باہر نم آلود خاک اور کہرے کی ایک لکیر سی نظر آنے لگی۔ چراگاہوں کی جانب سے تیز تیز قدم اُٹھاتے پُرشکم بے زبانوں کے قافلے اپنی گردنوں کی گھنٹیاں بجاتے ہوئے اور اپنے کھُروں سے گرد اُڑا کر فضا کو اور مکدر کرتے ہوئے آبادی کی جانب کوچ کرتے دکھائی دیئے جنکے پیچھے گردیں بانسری کا سُریلا نغمہ ہلکی آواز میں سنائی دے رہا ہے جس سے اطمینان اور تکان ساتھ ساتھ ظاہر ہو رہی ہے کوّوں اور طوطوں کے غول کے غول ایک خاص پُرسکون آواز جو محض شام کے وقت نکالتے ہیں نکالتے ہوئے گھنے باغات کی جانب اُڑتے نظر آئے آج خان پور کی ہر چوپال پر دوپہر کے واقعے کا تذکرہ ہے۔ ایک چوپال پر چند مراؤ چلم پی رہے ہیں دو آدمی کٹی کر رہے ہیں ایک بولا "آج بُدھوا تو بھنگی ہو گئے۔"

"اجی بھنگی! بھنگی سے بھی بدتر!"

"بھنگی جوٹھن کھا لیتا ہے مُنہ میں تو کوئی بھنگی نہیں تھکوا لیگا۔"

"اجی اب اس سے کیا کہ بھنگی ہوئے یا چمار ذات سے نکل گئے۔"

"ٹھیک ہے جی حقّہ پانی پڑیگا اور برادری سے خارج ہوگا"۔

ایک بُڈھا "خبر تو سب گاؤں میں آج ہی پہنچ گئی ہے کل پنچایت کا ڈھنڈورا پٹیگا اور شام کو پنچایت طے کر کے اعلان کردے گی"۔

شام کے وقت بُدھوا کی عورت پانی بھرنے گئی تو گاؤں کی دوسری عورتوں نے جو کوئیں پر پانی بھرنے آئی تھیں اسکے گھڑے پنگھٹ سے نیچے لڑھکا دیئے اور کہا کہ چماروں والی کُنیاں سے پانی بھرو کُوآں خراب ہو جائیگا عورت چُپ چاپ واپس چلی گئی اور جنگل کے آبپاشی والے کوئیں سے پانی بھرلائی۔ اگر آج بدھوا مر گیا ہوتا تو بھی اسکے گھر میں اس سے زیادہ رنج نہ ہوتا کھانا تو درکنار کسی کے منہ میں ایک قطرہ پانی بھی نہ گیا تھا۔ دوسرے دن پنچایت ہوئی سات گاؤں کے مراؤ جنگل میں بڑے برگد کے نیچے جمع ہوئے ہر گاؤں نے پہلے کثرت رائے سے اپنا اپنا نمائندہ انتخاب کیا اس صورت میں سات پنچ جمع کئے پھر ان میں سے ایک سرپنچ منتخب کیا گیا۔ پنچوں نے پہلے کل واقعہ لفظ بہ لفظ سُنا اور بالاتفاق رائے بدھوا کا ذات سے خارج ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا اور ہر اس شخص کا بھی جو بدھوا کو اپنا حُقّہ۔ برتن یا چارپائی دے بُدھوا غریب معہ اپنے بوڑھے باپ اور نوجوان بھائی اور لڑکوں کے پنچایت میں اپنی قسمت کا فیصلہ سُننے کے لئے موجود تھا۔ اسکے بوڑھے باپ نے بڑے اطمینان کے ساتھ فیصلہ سُنا! ۔ اور بڑی سنجیدگی سے پنچوں کے پاس جو ایک نکلی ہوئی برگد کی اُونچی جڑ پر بیٹھے ہوئے تھے جاکر کہا "تاوان" اس پر پنچوں نے پھر غور کیا اور دو پنچوں کی رائے میں جس میں ایک سرپنچ بھی تھا کوئی بھی تاوان لے کر اس کو پنچایت برادری میں نہیں لے سکتی تھی۔ مگر پانچ آدمیوں کی رائے میں گئو مُکھ برتنی اور رشی کیش کا اشنان اور اسکے بعد سب برادری کی روٹی۔ اور فیصلہ ختم رہا جسے سُنکر بدھوا کی آنکھوں تلے اندھیرا آگیا تو بہ سات ہزار برادری اور سات ہزار میل کا سفر! ہائے اتنا کہاں سے ملے گا!! مُحال! ناممکن!! خیالات سے بعید۔

سماج کی اتنی زبردست دندناتی ہوئی توپوں کے مقابلہ میں وہ تو جاہل کسان تھے کوئی عالم بھی نہ ٹھہر سکتا تھا بدھوا کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا چکر آیا اور وہ تڑسے زمین پر گر گیا۔ پنچایت برخواست ہو رہی اور کوئی اور درکنار اسکے بیٹے اور باپ بھی اتنی جرأت نہ کرسکے کہ اسکو جاکر سنبھال لیں۔ وہیں پڑا چھوڑ بستی کی جانب چلے گئے بوڑھا باپ البتہ پیچھے مُڑمُڑ کر بار بار دیکھتا جاتا تھا۔ درخت کے نیچے بُدھوا بدستور بیہوش پڑا تھا آدمی جب جا چکے تھے اور بُدھوا کے بیٹے اور بُوڑھا باپ مُڑمُڑ کر اسکو ایسی نظروں سے دیکھتے جاتے تھے جیسے کہ کریا کرم کرنے کے بعد واپسی پر متوفی کے عزیز دُور سے دھکتی ہوئی آگ کو مُڑمُڑ کر دیکھتے جاتے ہیں۔ سماج کے دیو انہیں دُور سے ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے اسکے ارد گرد پہرہ دیتے دکھائی دے رہے تھے۔ جب یہ گاؤں کے قریب پہنچے تو بُدھوا کے باپ نے اسکی ماں سے کہا۔ "لو آج ہم تمہارے بیٹے کا کریا کرم کر آئے" گاؤں کی عورتیں بڑی بیصبری سے بستی کے باہر کھیتوں میں فیصلہ سُننے کی منتظر کھڑی تھیں یہ سُن کر بُدھوا کی عورت نے اپنی چوڑیاں توڑ ڈالیں تمام گھر میں کہرام مچ گیا باقاعدہ صفِ ماتم بچھ گئی شام کو برادری کے مختلف گھروں سے بُدھوا کے گھر والوں کا فاقہ تڑوانے کے لئے کھانا آیا اور باقاعدہ پُرسا پڑنے لگا۔

جب یہ آنے جانے کا سلسلہ بند ہو گیا تو بُدھوا گھر میں داخل ہوا! جیسے ایک چور آتا ہے! باپ بیٹے بھائی ماں بیوی اور بہوئیں سب اسے غیر معلوم ہو رہے تھے اور اسکو ہر نظر میں حقارت اور ہر آواز میں غیریت محسوس ہو رہی تھی آہ! آج اسکی ننھی پوتی بابا بابا کہہ کر اس کی جانب دوڑ کر نہ آئی! ذرا دیر ٹھٹک کر بُدھوا چارپائی کی جانب بڑھا ایک دم سب کے سب اس چارپائی کو چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ بُدھوا نادم ہو کر وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔ اسکی عورت یہ دیکھ کر ایک پرانی پیڑھی ایک کونے میں سے جھاڑتی ہوئی اُٹھا کر اور اسکے قریب ڈالکر علیحدہ ہٹ گئی۔ بُدھوا پیڑھی ذرا پیچھے کو ہٹا بیٹھ گیا۔ اور ایک تنکے سے زمین کریدنے لگا۔ اس وقت اسکے دماغ میں عجب کیفیت طاری تھی وہ سماج کے مقرر کردہ اٹل پہاڑ جیسے قانون کی عظمت پر غور کرنے لگا اس نے اپنے دونوں قوی اور سخت بازو کنکھیوں سے دیکھے اپنی اُونٹ سے مشابہ پنڈلیوں پر نظر کی! اور اپنی آہنی انگلیاں غور سے دیکھیں اور ایک لمبا سانس لیا کوئی چیز نہیں بگڑی! ذرا سی دیر کے لئے دوسرے بنی نوع انسان کا خون نہیں! مُنہ کی رطوبت! ہمارے مُنہ میں داخل ہو گئی۔ پھر مزہ یہ ہے کہ بالکل ویسی ہی رطوبت ہمارے منہ میں موجود بھی ہے کسی جانور کا پیشاب نہیں تھا۔ محض ایک انسان کا تھوک وہ بھی غیر اختیاری طور پر جبراً جا پڑا! اور رسم دائرہ انسانیت ہی سے نکل گئے آدمیوں میں شمار نہیں کئے جاتے حیوانوں سے بھی بدتر ہیں"۔

سامنے اس کی نظر اپنے کتے پر پڑی جو ایک چارپائی پر پڑا ہوا سو رہا تھا آہ! اس سے بھی بدتر!! ہمارے لئے یہ چارپائی اور برتن نہیں ہیں جو اس کے لئے ہیں۔ وہ سماج کے بنائے ہوئے اِس مضبوط اور ناقابلِ فہم مسئلہ پر غور کر رہا تھا اور خود کو کوڑھی سا تصوّر کئے ہوئے تھا۔ سماج کے پھندے کتنے ہی کڑے ہوں۔ اسکی زنجیر کی کڑیاں کتنی ہی گھنی ہوں۔ اس کی بندشیں کتنی ہی سخت ہوں۔ اسکے خود ساختہ قوانین خود خدائے جبّار کے دست خاص کے مظاہر سمجھے جاتے ہوں۔ مگر قدرتی جذبات کی نہ رکنے والی رَو سماج کی چٹانوں کو یا تو تنکے کی طرح اپنے راستہ سے اکھیڑ کر پھینک دیتی ہے یا ورنہ کٹ کر نکل جانا تو معمولی بات ہے۔ یہی عالم اسوقت بُدھوآ کے باپ پر بھی طاری تھا۔ اس میں شک نہیں سماج کے نزدیک اسوقت بدھوآ میں بہت بڑی کمی پیدا ہو گئی تھی۔ اسکے جسم کو نہیں تو رُوح کو ضرور کوڑھ لگ گئی تھی وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں رہا مگر بُدھوآ کا باپ تو بُدھوآ کا باپ تھا! اسے تو اس کے چوتھے فاقہ کا احساس تھا۔ "بہو دیکھو تو بُدھوآ کل کا بھوکا ہے کچھ کھانے کو لاؤ" بڈھے نے دردبھری آواز میں کہہ ہی دیا۔ بُدھوآ کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی ٹیلیفون میں تیز و تُند موسم میں بولتا ہے۔ اور پھر اپنے خیالات میں غرق ہو گیا۔ گھر میں مَوت کا سناٹا طاری تھا۔ کبھی کبھی بُوڑھا مراؤ کھانس کر اور اسکی بیوی بیہوشی کے عالم میں کراہ کر اس خاموشی کو توڑ دیتی تھی۔ بُدھو کے عین سامنے کوٹھیا کے کونے پر نمکولی کے تیل کا چراغ جل رہا تھا جس کی بو تمام کوٹھڑی میں پھیلی ہوئی تھی۔ بُدھو بار بار اپنے سر کو اُلٹے ہاتھ سے کھجاتا اور سیدھے ہاتھ میں ایک سرکنڈا لئے ہوئے متواتر زمین کرید رہا تھا۔ اس کی نظر زمین پر گڑی ہوئی تھی اور تصوّر میں کبھی گنگا جمنا کا سنگم۔ اور رشی کیش کی خوبصورت وادیاں۔ اور گنگوتری کا سرد اور مرطوب پہاڑ۔ سیکڑوں من آٹا۔ بیسیوں گھی کے کپّے۔ اور ترکاری کے انبار۔ بڑے برگد کے نیچے ہزاروں آدمیوں کا اجتماع۔ بعد مسافت۔ اور کم استطاعتی کے باعث رسائلِ سفر سے محرومی۔ تہیدستی اور غریبی کی مجبوری سے برادری کی دعوت۔ آہ!! کالے کالے پہاڑ اور ایک چھوٹا سا تیشہ نہ معلوم کتنے بھیانک خیالات کا اجتماع تھا۔ اسکے استغراق کو اس کے چھوٹے بیٹے کی بیوی نے ایک مٹی کی رکابی اسکے سامنے رکھ کر توڑا اور دُوسرے اس رکابی کو اسکے سامنے بڑھا دیا دوسری بہو نے ایک مٹی کا آبخورہ سامنے رکھ کر اس میں دُور سے پانی چھوڑ دیا بُدھوآ نے کھانے کی طرف کھانے کی نیّت سے نظر بھی نہ کی۔ البتہ کھانا رکھنے کے انداز کو بغور دیکھا "آہ! جس گھر میں مکھ بنکر گذری وہاں آج یہ گت بن رہی ہے" "آہ! ناقابلِ معافی جُرم کا مرتکب ہُوں۔ اب یہاں گزر کیسے ممکن ہے۔ اور دُنیا میں زندہ رہ کر اور سانس لینے کا کیا حق رہا۔ یہ سوچ کر اس نے اپنی پھٹی ہوئی آنکھوں سے چاروں طرف بھیانک نظریں دوڑائیں۔ گھر کے دَر و دیوار اسکو بیکار ملامت و حقارت آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے اور دُنیا کی ہر چیز اُسے کاٹنے کو دوڑ رہی تھی اس کے حواسِ خمسہ جواب دے چکے تھے مگر یکدم اسکے جسم کا ہر رونگٹا کھڑا ہو گیا اس کے چہرے پر اطمینان کے آثار پیدا ہوئے اس نے آہستہ سے اپنے برابر زمین پر رکھی ہوئی چادر اور لاٹھی اُٹھائی اور دروازے سے باہر ہو گیا۔ بڈھے نے آوازیں دیں بیٹے پیچھے دوڑے مگر وہ تاریکی میں غائب ہو چکا تھا باہر ڈر کے مارے زور سے پکار بھی نہ سکتے تھے۔ اور نہ کسی سے استفسار کرنے کی ہی ہمت پڑی چپکے سے گھر میں واپس آ گئے۔

(۴)

رحیم خاں مرحوم کے بڑے صاحبزادہ عزیز خاں جنگل سے واپس آرہے تھے مسجد سے مغرب کی نماز کے بعد سیدھے کھیتوں پر گھومنے چلے گئے تھے جس وقت گاؤں کے قریب پہنچے تو ایک آدمی کڑی کمان کے تیر کی طرح برابر سے نکل گیا اچھی طرح کچھ تو اندھیرے کی وجہ سے اور کچھ اسکی چال کی تیزی سے پہچان نہ سکے مگر فوراً بولے "کون! بُدھوآ۔ برابر سے گُزرنے والے نے کوئی جواب نہ دیا اور ایسا محسوس کیا کہ اسکو کسی آدمی کے موجودگی کا احساس ہی نہیں ہے۔ عزیز خاں ایک گرگِ باراں دیدہ پٹھان تھے فوراً پیچھے ہوئے اور تیز تیز قدم بڑھا کر قریب تر ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ قریب دو فرلانگ سیدھے راستہ پر چلنے کے بعد وہ ایک جانب کو مُڑا یہ بھی مُڑے یہاں تک کہ وہ ایک ایکھ کے گھنے کھیت میں ایک کُوئیں پر جاکر کھڑا ہو گیا یہ بھی گھنی جگہ میں بالکل قریب چھُپکر کھڑے ہو گئے۔ بُدھوآ نہایت اطمینان سے کُوئیں کی من پر بیٹھ گیا اپنی چادر کاندھے سے اُتاری اور لاٹھی ایک جانب پھینک دی اور چادر سے اپنی پنڈلیاں ملا کر اور خوب کس کر باندھ لیں۔ اور ارادہ کیا کہ

اندر کو لڑھک جانے کو یکدم عزیز خاں جھپٹ پڑے اور اس کی دھوتی کا پیچ پکڑ کر پیچھے کو گھسیٹ لیا۔ بُدھو آ نے ایک ہیبت ناک چیخ ماری اور کوشش کی کہ چھوٹ کر بھاگ جائے مگر دونوں پاؤں پہلے ہی کس چکا تھا مجبور ہو گیا۔ عزیز خاں نے ڈپٹ کر کہا "کیا کرتا ہے نامرد" بُدھو آ جس کا کاسۂ سر سماج کی ٹھوکروں سے پاش پاش ہو گیا تھا گھبرا کر بولا "ہائے خانصاحب۔ جینے تو برادری نہیں دیتی اور مرنے تُم" پھر ذرا بیباکی سے بولا مجھے چھوڑ دو میرا وقت آگیا ہے۔ عزیز خاں نے ذرا ہمدردانہ غصّے میں کہا "بڑا وقت کا مُتیسا بنا پھرتا ہے اُلّو کا پٹھا نہیں تو چل گاؤں کو" بُدھو آ نے تلملا کر کہا "میاں مجھے جینے کو تو ٹھکانا نہیں کیا اب مرنے کو بھی جگہ نہیں رہی! ہائے خانصاحب چھوڑ دو" عزیز خاں "چھوڑ کیسے دیں! ڈوب مرنے کو! پاگل بنا ہے! سُور کا بچّہ نہیں تو" بُدھو آ نے جب خود کو مجبور پایا تو بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ہائے خانصاحب دھرم تو زبر خاں نے چھین لیا۔ اب زندہ کس برتے پہ رہوں؟ بھنگی سے بدتر بنکر ساری عمر دُنیا بھر کے دھکّے کھانے کو" خانصاحب نے جب دیکھا کہ یہ ذرا سکون پر آیا تو اپنے ہاتھ سے پہلے اس کی چادر پاؤں پر سے علیحدہ کی اور کہا مرنے کو کون منع کرتا ہے ذرا میری بات اطمینان سے سُن پہلے دھوتی ٹھیک کر کے باندھ اور انسان کی جُون میں آ۔ بُدھو آ نے اپنی دھوتی جو خانصاحب کے گھسیٹنے سے کھل گئی تھی باندھی اور اطمینان سے خاں صاحب کے سامنے بیٹھ گیا تو خانصاحب نے نہایت نرم آواز میں کہا "ارے میری سُن اگر تجھ کو مرنا ہے تو اس اندھیرے کوئیں میں گر کر کتّے کی موت کیوں مرتا ہے پھانسی کے تختے پر لٹک کر بھی موت ہی آتی ہے ایک بہادر کی سی موت۔ سب برادری یاد کرے گی کہ خوب نکلا اس زبر خاں کے سارے گھر کا فیصلہ کئے جا۔ تُو تو مر ہی رہا ہے نام اس کا بھی مٹتے جا"۔

رنج اور غصّہ دونوں ایک ہی قبیلہ کی پیداوار اور یکساں اجزا کا مرکب ہیں بارہا دیکھا ہے کہ ایک ہی ضرب غصّے کو رنج میں اور رنج کو غصّے میں اسی معیار پر تبدیل کر دیتی ہے یکدم بُدھو آ کا چہرہ سُرخ ہو گیا اسکی آنکھوں سے خُون برسنے لگا۔ خانصاحب کا جُملہ اس کے دماغ پر کاری ضرب ثابت ہوا۔ وہ بزدل سے شیر دل بن گیا خانصاحب کی لیڈرانہ رائے نے اسے غصّہ سے پاگل کر دیا وہ دیوانہ وار آبادی کی جانب بھاگا۔ خانصاحب بھی سمجھ گئے کہ نشانہ صحیح بیٹھا ذرا عجلت کے ساتھ تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے گھر آ گئے۔ بُدھو آ رنج کی زنجیروں کے ٹکڑے کرکے بھوکے شیر کی طرح سیدھا اپنی چوپال پر پہنچا جو اس وقت خلاف معمول اندھیری پڑی تھی پہلے تو چھپّر کی بتیاں ٹٹولتا رہا پھر کُٹے ہوئے چارے کے ڈھیر کو منتشر کر دیا اور ایک بڑی سی گنڈاسی اس میں سے برآمد کر کے سیدھا زبر خاں کے دروازہ پر پہنچ گیا پہلے تو ذرا ٹھٹکا پھر بجلی کی تیزی سے اندر گھس گیا۔ زبر خاں کے دو خورد سال بچّے صحن میں کھیل رہے تھے اور بیوی روٹی پکا رہی تھی اور لڑکی آگ پھونکتی جاتی تھی بُدھو آ نے جاتے ہی دونوں معصوم بچوں پر گنڈاسی چلا دی ایک ایک ہاتھ میں دونوں کی گردنیں مار دیں مامتا کی ماری ماں "ہیں بُدھو آ!" "ہیں بُدھو آ!" کہتی ہوئی دوڑی ایک ہاتھ میں اس کا بھی ڈھیر کر دیا اور چلتے وقت ایک ہاتھ لڑکی پر بھی جھاڑا جس سے اسکا ایک ہاتھ بازو سے کٹ کر علیحدہ جا پڑا۔ شور سُنکر چاروں طرف سے آدمی دروازے پر جمع ہو گئے تھے مگر دروازہ بُدھو آ نے اندر سے بند کر دیا تھا لوگ سمجھ گئے تھے اور دروازے کے کواڑ علیحدہ کرنے کی کوشش میں تھے کہ یکدم دروازہ کھلا اور جس طرح حکام کی آمد پر محرم اور دسہرے کی بھیڑ اُن کے لئے ایک چوڑا چکلا راستہ پیدا کر دیتی ہے بالکل اسی طرح زبر خاں کے دروازے کی بھیڑ نے بُدھو آ کو راستہ دے دیا جو خون آلود گنڈاسی بلند کئے بھاگا چلا گیا اور کسی کی ہمت اس پر ہاتھ ڈالنے کی نہ ہوئی!

عزیز خاں گھر پہنچ کر اچھی طرح ایک حقّہ بھی نہ پینے پائے تھے کہ بستی میں ایک شور محشر اُٹھا خانصاحب اطمینان سے حُقّہ کی لگالی مُنہ سے علیحدہ کر کے اُٹھے اور اپنی ڈانڈ ہاتھ میں لے کر بغیر کسی شک و شبہ کے آہستہ آہستہ زبر خاں کے مکان کی جانب چلے ۔ راستہ میں دیکھا کہ لوگ اِدھر اُدھر دوڑے پھر رہے ہیں ایک شخص سے بولے "ارے یہ شور کہاں ہے"۔

"زبر خاں کے گھر میں کوئی گھس پڑا ہے"

"ایں ارے بھئی یہ تو بتاؤ کون؟" ایک دوسرا آدمی جو زبر خاں کے گھر کی جانب سے نہایت سراسیمہ و پریشان آ رہا تھا بولا "ارے بُدھو آ نے غضب کر دیا"۔

"ارے کون بُدھو آ" عزیز خاں نے گھبرا کر کہا۔

"وہی بُدھو آمراؤ سب گھر ختم کر دیا"

عزیز خاں نے کہا۔ "ایں بدھو آمراؤ نے! کیوں!"

چند آدمی دوڑتے ہوئے اِدھر اُدھر اور آئے اور دوڑ کر عزیز خاں اور یہ سب کے سب زبر خاں کے دروازے پر پہنچے۔ عزیز خاں اندر گئے تو دیکھا کہ زبر خاں کے دونوں خورد سال بچوں کے سر دھڑ سے علیحدہ کٹے پڑے ہیں عورت علیحدہ ڈھیر پڑی ہے اور لڑکی ایک جانب تڑپ رہی ہے۔

عزیز خاں۔ ارے انہیں کس نے مار ڈالا!

"بُدھو آمراؤ نے"

"کیوں" "ارے بھئی فتن خاں ان غریبوں کا کیا قصور تھا؟"

"ارے بھائی وہ کل قصّہ ہو نہیں گیا تھا"

"ایں! قصّہ! کیسا قصّہ!"

"ارے یار تُم نے نہیں سنا" (ذرا رُکتے ہوئے) "وہی مُنہ میں تھوک نہیں دیا تھا"۔

"اچھا یہ کب ہُوا تھا"

"کل! اور آج شام پنچایت بھی ہوگئی۔ تمہیں نہیں معلوم آج پنچایت نے حقّہ پانی بھی ڈال دیا تھا"

"اچھا کس بات پر!"

"کل اُنہیں بیلوں کی ضرورت تھی اِس نے دینے میں پس و پیش کیا۔ تم کہاں رہتے ہو۔ کچھ خبر بھی رہتی ہے"۔

"بھائی بات یہ ہے کہ کمزور آدمی ہیں۔ نکلنے نہیں۔ بیٹھتے نہیں۔ جو بات معلوم ہو۔ کہیں نکلیں بیٹھیں تو اچھی بُری معلوم ہو۔ سر شام ہی سے گھر میں جا پڑتے ہیں اسوقت شور سُنکر ادھر چلے آئے تو اتنا معلوم بھی ہوگیا۔ بھائی کیا بڑا غضب! ایک چھوڑ چار خُون"

یہ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ یکدم باہر دروازہ پر ایک ریلو رُکا۔ اور لوگوں نے دیکھا کہ زبر خاں ریلو سے اُترے اور اس میں بُدھو آ والے بیل جُتے ہوئے تھے آپکو دیکھتے ہی عزیز خاں دوڑ کر لپٹ گئے اور ڈھاریں مار کر رونے لگے سب قصّہ سُناتے رہے اور ڈھاریں مار مار کر رو رہے تھے زبر خاں نے کہا کہ مَیں تو آج واپس نہ آتا مگر مجھے معلوم ہُوا کہ بُدھو آ پر پنچایت بیٹھی ہے تو مَیں نے کہا کہ خبر تو لوں۔ سو یہاں یہ گُل کھِلا پایا!!

جب خوب رو دھو لئے تو عزیز خاں نے اپنی پگڑی کے پیچھے لٹکتے ہوئے حِصّے سے زبر خاں کے آنسو پُونچھے اور کہا "بھائی اب جو ہونا تھا ہو چکا رونا دھونا موقوف کرو ذرا اس معاملہ کی خبر لو"۔ "یہ تو موت کے ساتھ پُوری مقدمہ بازی سر پڑ گئی تھانہ اور شفاخانہ کی تیاری کرو عُجلت کی ضرورت ہے زبر خاں کو اب ذرا ہوش آیا اور انہوں نے اپنی آنکھیں ملیں اور جلدی جلدی پلنگ چلا کر کہا۔ "ہاں بھائی عزیز خاں رپٹ ہوگی"

عزیز خاں نے زبر خاں کا ہاتھ پکڑا۔ اور مجمع سے علیحدہ ایک جانب کو لے گیا اور کہا "ہاں بھائی زبر خاں رپٹ کی کہو کس کس پر دو گے"۔

زبر خاں نے کہا "ہاں بھائی تم بتاؤ رپٹ کیسی ہوگی بُدھو آ اور رموآں دونوں پر لکھاؤں اور کہو تو اسکے لونڈوں پر بھی دے دوں"

"خوب کہی! ارے میاں زبر خاں کس پر رپٹ دینے جاؤ گے"

"مَیں نے کہا تھا کہ رموآں اور بُدھو آ کے لونڈوں پر بھی دیدینا اور کہو تو بڈھے پر بھی لکھا دُوں۔ پیروی کو کوئی نہ رہ جائے"

"ارے بھائی کس پر رپٹ دینے جاؤ گے! ان مُرتوں پر کیا وہ تمہارے برابر کے ہیں۔ ان کے ساتھ عدالت میں کھڑے ہوتے شرم بھی نہ آئیگی"

"ارے بھائی کہاں کی ہانک رہے ہو۔ اگر رپورٹ نہیں ہوئی تو پولیس میں چوکیدار اطلاع کر دیگا۔ پولیس خود تحقیقات کرے گی! کہیں قتل بھی چھپ سکتا ہے پھر ایک چھوڑ چار"

"ارے میاں مَیں کیا کہہ رہا ہوں اور تم کیا سمجھ رہے ہو!۔ رپٹ کو کون مسخرہ منع کرتا ہے (کان کے قریب ہونٹ لے جاکر) مطلب یہ ہے کہ کسی برابر والے پر رپٹ دو"

"(ذرا ٹھٹھک کر) ایں برابر والے پر! کس پر!!"

"(طنزسے) اور نہیں تو آپ ان مُرتوں کو پھانسی کرا کر بہت نہال ہو جائینگے"۔

زبر خاں ایک معاملہ فہم پٹھان تھے۔ مگر ساتھ ساتھ اس نعمت سے جو پٹھانوں میں قدرت کی جانب سے نہایت فیاضی کے ساتھ ودیعت ہوتی ہے خوب مالا مال تھے۔ معاملہ کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے بولے "اچھا کس پر ہونا چاہئے" عزیز خاں نے

نہایت سادگی سے کہا "بھائی میری رائے یہ ہے کہ شیر خاں اور ناصر خاں دونوں کو ضرور لے لو"

زبر خاں اوچھل پڑے اور ذرا تعجب سے کہا "ایں شیر خاں اور ناصر خاں۔ کیوں"

"تمہیں کچھ خبر بھی ہو۔ اس دو کوڑی کے آدمی کی یہ ہمت تھی! ہمیں معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ ان دونوں کی شرارت تھی!!۔ بھپارے دینے میں تو بہت طاق ہیں"

"ارے میاں کیا کہہ رہے ہو! وہ تو دونوں بھیا آٹھ دن سے شہزاو نگر شادی میں ہیں وہ کل کے قصے پرشتعل ہو گیا تھا ممکن ہے کہ کسی نے کچھ کہہ سُن دیا ہو وہ بھکانے کہاں سے آگئے" عزیز خاں نے شکار کو بدکتے دیکھ کر ذرا پالیسی سے کام لیا اور اپنی گفتگو کا طرز بدلکر بولے "اچھا تم ان دونوں کو اپنا دوست سمجھتے ہو یہ یاد رکھو کہ یہ لوگ موقع پڑنے پر تم سے چُوکنے والے نہیں ہیں۔ اور یہ اگر ثابت چھوڑ دیئے تو ہُدھوا آگی مدد کرینگے۔ ابھی تو چند سال کا قصہ ہے کہ تمہاری بھینس کانجی ہوس میں کردی اور جب تم نے شکایت کی تو کہنے لگے کہ ہم نے پہچانی نہ تھی! ایسے بورے ہیں۔" زبر خاں کو اس وقت عزیز خاں کی خاطر بہت منظور تھی انکار نہ کر سکتے تھے پھر انہیں یہ بھی یاد آ گیا تھا کہ صرف یہی لوگ تھے جنہوں نے انکی بھینس کانجی ہوس کی تھی ورنہ اس سے پیشتر اور اسکے بعد کسی کی ہمت نہیں پڑی۔ خانصاحب کے لئے کینہ بہت کافی تھا اور پھر سپاہی کا پُوت تو بارہ برس تک بدلہ لیتا ہے اسکو تو ابھی ڈھائی برس ہی ہوئے تھے۔

عزیز خاں نے بھی اندازہ کرلیا کہ شکار پھنس گیا ہے فوراً فتح مندانہ انداز میں بولے "مَیں رتھ میں ڈال کر زخمیوں کو لاتا ہُوں تم گھوڑی پر چلو مگر رپٹ میرے آنے پر لکھی جائیگی" اور یہ کہہ کر عزیز خاں گھر پہنچ گئے اپنے ملازم سے کہا کہ گھوڑی پر چار جامہ کَس کر زبر خاں کے یہاں پہنچا"۔ اور خود جلدی جلدی دھوتی اُتار کر پاجامہ پہنا اور چاندی کے بٹنوں والی واسکٹ اور بُوٹ جُوتا پہنا اور چراغ کے قریب جا کر اس میں ہاتھ لگا کر مُنہ پر ملتے ہوئے ایک لمبا سا شام لگا ہُوا بینا ہاتھ میں سلئے ہوئے پیکتے نکلے۔ گھوڑی پہلے پہنچ گئی تھی زبر خاں نے فوراً ایڑ بڑا دی تھوڑی دیر بعد عزیز خاں اُدھڑے اُدھڑے بیلوں والا رتھ ہانکتے ہوئے تھانہ کو روانہ ہوگئے۔ عورت میں کچھ سانس باقی تھی مگر بالکل بیہوش تھی لڑکی بھی بیہوش تھی اور بار بار کراہتی تھی۔ عزیز خاں کو اندیشہ تھا کہ کہیں رپورٹ میری عدم موجودگی میں نہ لکھی جائے لہذا انہوں نے بغیر اس کا خیال کئے ہوئے کہ میرے پیچھے جو سواریاں بیٹھی ہیں وہ کس منزل میں ہیں بیلوں کو خوب بھگایا کیونکہ ان کے نزدیک راستہ کے ٹھوکے ان سے راحت ابدی کی منزل کو قریب تر لارہے تھے۔ خانصاحب جانتے تھے کہ یہ تو بچنے والے ہیں نہیں اب مرے تو کیا اور کل مرے تو کیا؟

تقریباً گھوڑی پہنچنے کے پون گھنٹہ بعد رتھ بھی پہنچ گیا عزیز خاں جو منشی جی رپٹ نویس سے پہلے سے اچھی طرح متعارف تھے ذرا بے تکلفی کے انداز میں بولے "اسلام علیکم دیوان جی" "وعلیکم السلام بھائی یہ کیا قصہ کرلائے!! کچھ حال وہ زبر خاں سے پہلے سُن چکے تھے پہلے عزیز خاں اور دیوان جی دونوں نے ایک سادہ کاغذ پر ایک مضمون گھڑا۔ داروغہ جی اتفاق سے اس وقت موجود نہ تھے لہذا جملہ کام منشی جی نے انجام دیئے زبر خاں رتھ کے پاس کھڑے رہے اور بار بار پانی کے قطرے بیٹی اور بیوی کے مُنہ میں ٹپکاتے رہے اور یہاں عزیز خاں اور منشی جی ان کا بیان روزنامچہ پر تحریر کر رہے تھے جب رپورٹ مرتب ہو گئی تو عزیز خاں کو آواز دی اُنہوں نے آکر انگوٹھا لگا دیا منشی جی نے رتھ کے قریب جانے کی تکلیف بھی گوارا نہ فرمائی اور وہیں بیٹھے بیٹھے شفاخانہ کو رپورٹ مرتب کرنا شروع کردی اور ضربات کی تفصیل عزیز خاں سے پُوچھ پُوچھ کر لکھتے رہے جب یہ کل کام انجام ہو گیا تو عزیز خاں نے مبلغ پانچ روپیہ واسکٹ کی جیب سے نکال کر منشی جی کی جانب بڑھائے "منشی جی۔ ایں یہ کیا ہے۔ بھلا ایسی رپورٹ اور یہ پیسے" عزیز خاں "(ایک روپیہ اضافہ کرتے ہوئے) لو اب تو لو" منشی جی "کوئی ضرورت نہیں ہے" "میری جانب سے آپ ہی مٹھائی کھالیں۔ عزیز خاں نے مُسکراتے ہوئے ایک روپیہ اور اضافہ کیا اور منشی جی نے روپیہ جیب میں رکھتے ہوئے داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور پانوں کی ڈبیہ اور کثیف بٹوا عزیز خاں کی جانب بڑھایا۔

عزیز خاں (پان چباتے ہوئے) بھائی اب چلینگے سپاہی ساتھ کرو۔ شفاخانہ پہنچنا ہے اور پھر وہاں سے گھر" زبر خاں گھوڑی پر پیچھے پیچھے اور آگے آگے عزیز خاں رتھ ہانکتے ہوئے شفاخانہ پہنچے ڈاکٹر صاحب جھینکتے ہوئے نیند سے بیدار ہو کر کوارٹر سے نکلے اور دونوں

کا معائنہ کیا عورت، مرچکی تھی لڑکی کے ہاتھ سے خون اسقدر بہہ گیا تھا کہ وہ نڈھال ہو رہی تھی اسکی مرہم پٹی کی جب اسے ذرا ہوش آیا تو ڈاکٹر کو دیکھکر بُری طرح چلائی "ارے اللہ شیر خاں آگیا" اور بیہوش ہوگئی سب طائروں پہ سحر ہے صیاد کے اقبال کا۔ عزیز خاں کا کان میں پھونکا ہوا منتر اپنا کام سرانجام دے رہا تھا۔

عزیز خاں اور زبر خاں کے جانے کے ایک گھنٹہ بعد ناصر خاں اور شیر خاں گھوڑوں پر سوار اپنے ماموں زاد بھائی کی شادی کے جملہ مراحل طے کرکے واپس ہوئے جونہی گانوں میں داخل ہوئے چار قتلوں کی خبر سُنی اور یہ بھی سُنا کہ ہم نے کئے ہیں دونوں غریب سناٹے میں آگئے گھر تک بھی نہ پہنچے وہیں سے اُلٹے پاؤں واپس ہوئے سے

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

گانوں سے نکلتے ہی زنانی سواریاں ملیں انہیں بھی اس حادثہ سے مطلع کیا اور سواریاں واپس ہوئیں۔ صبح تڑکے داروغہ جی گانوں میں تشریف فرما ہوئے تو یہاں تمام میں خبر گشت کر رہی تھی کہ شیر خاں اور ناصر خاں نے چار قتل کئے ہیں عزیز خاں نے تین چار خانہ ساز چشم دید گواہاں کو اچھی طرح سبق پڑھایا اور جہاں داروغہ جی تفتیش کررہے تھے انکو لیکر وہاں پہنچ گئے۔ پہلے زبر خاں کے اظہار لئے مثل مشہور ہے کہ دروغ گو را حافظہ نباشد۔ رپورٹ تو ہمارے دیوانجی اور عزیز خاں کی مرتبہ تھی کچھ پتہ نہ تھا کہ کیا لکھا دیا ہے اُلٹی سیدھی ہانکنا شروع کردیں عزیز خاں نے ہر چند آنکھ دی سمند خاں بہتیرا منمنایا۔ فتّو خاں نے ہر چند اشارہ دیا مگر وہ اپنی اُلٹی سیدھی ہانکتے رہے لیکن عزیز خاں خدا کا شکر ادا کررہے تھے کہ باوجود اس بیخودی کے بھی شیر خاں و ناصر خاں کا جو ہوس والے دشمن زبان پر چڑھے ہوئے تھے داروغہ جی کے منہ لہو لگا ہوا تھا پہلے ہی گھر سے گھی کا چراغ جلا کر چلے تھے دو ایک گواہ کا اظہار اور لیا سب نے بالاتفاق رائے شیر خاں اور ناصر خاں پر قتل تھوپا۔ اور یہ بھی بیان کیا کہ گھر بار چھوڑ کر فرار ہوگئے اور بُدھو کی ہمراہی بیان کی داروغہ جی نے فرمایا "بھلا بولو اب میں مقدمہ کا چالان کیونکر کر سکتا ہوں رپورٹ کچھ کہہ رہی ہے رپورٹ دہندہ کچھ کہتا ہے اور گواہ اپنی علیحدہ الاپ رہے ہیں" گویا آپ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس ہیں اور اپیل پر غور فرما رہے ہیں۔ عزیز خاں داروغہ جی کے اس جملے پر چونکے اور داروغہ جی نے بھی انکی جانب غور سے دیکھا اور پھر فرمایا۔

"میں ناصر خاں اور شیر خاں کا بیان بھی لے لیتا مگر وہ فرار ہیں اس صورت میں ان کا چالان کیونکر کرسکتا ہوں" یہ کہکر داروغہ جی چلنے لگے غرض عزیز خاں اُٹھے اور داروغہ جی کو علیحدہ لے گئے اور کہا۔

"حضور چالان کردیجئے پچھلے سال بھی میں نے حضور کے نذرانہ میں کسر نہ رکھی تھی مگر نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا" داروغہ جی نے ایک بڑی تیز اور طنز کی نظر عزیز خاں پر ڈالی اور فرمایا "خوب! میں تو بھائی چالان لکھنے کا ذمہ وار ہوں قلم تو عدالت کے ہاتھ میں ہوتا ہے میرا آپ کا چالان طے ہوا تھا میں نے کردیا۔ اب میں کیا کروں اسکی تقدیر کہ وہ چھوٹ گیا میرے بس میں یہ تو تھا ہی نہیں کہ اسکے گولی مار دوں" ایک سپاہی اور چوکیدار پاس آکر گفتگو میں شریک ہوگئے اور داروغہ جی کی بات کو بالا کرتے رہے داروغہ جی نے کہا "بارہ سو روپے کا کام ہے" عزیز خاں "سرکار اتنی رقم کوئی کھیل ہے" عزیز خاں تو بھونکے بھکاری ہیں یہ سب مجھ ہی پر ہے" داروغہ جی نے کہا۔

"سب ہی تو میں نے کہا تھا"

"حضور اتنی رقم تو کوئی پھنسا ہوا دے سکتا ہے میں کسی اور موقع پر دیکھ لونگا" عزیز خاں کہتے ہوئے علیحدہ جا کر بیٹھ گئے اور حقہ پینے لگے چوکیدار نے داروغہ جی کے کان کے اندر اپنے ہونٹ گھسیٹر کر کہا "سرکار اُدھر تو میدان صاف ہے کوئی پوچھا گچھا نہیں ہے" داروغہ جی نے کہا "اچھا پہلے تو وہ بھی بہت موٹے تھے"

"بس سرکار وہ تو اسی مقدمہ کے ہوئے اب فاقوں پر نوبت ہے"۔

"تو بہتر ہے کہ انہیں سے معاملہ کرلو کتنے پر آجائے گا"

دیکھو جا کر ٹٹولتا ہوں"۔

سپاہی اور چوکیدار دونوں عزیز خاں کے پاس پہنچے۔ اور چوکیدار نے کہا "خانصاحب سودا اور شکار روز روز نہیں پھنستا۔ اسوقت روپیہ کا منہ مت کرو"۔

"یہ سب ٹھیک ہے مگر بھائی داروغہ جی کی تو پچھلے معاملوں سے آنکھ پھٹی ہوئی ہے"۔

"تو آخر آپ بھی تو کچھ کہتے"۔

"سو روپیہ"

"(ہنستے ہوئے) آن بنائی مت کہو! داروغہ جی نے بارہ سو کہے ہیں چھ سو پر معاملہ ہو جائے"۔

(خانصاحب نے چوکیدار پر ایک تُند نظر ڈالی اور بولے)

"چل یہاں سے لایا باتیں"

چوکیدار نے اپنی ہنسی میں جھیپ کو چھپاتے ہوئے کہا "لو خانصاحب کیا یہ سو روپیہ کا کام ہے"

سپاہی جواب تک ان دونوں کی گفتگو کھڑا سُن رہا تھا بول پڑا "نہ بھئی تمہارے چھ سو اور نہ ان کے سو۔ ہم پنچایت کئے دیتے ہیں تین سو پر معاملہ ہو گیا"۔

"واہ جمعدار واہ! خوب کہی! اندھا بانٹیں ریوڑی اور لوٹ پھیر اپنے ہی کو دے۔ بھائی اگر تمہاری مرضی ہے تو پچاس روپیہ اور دے سکتا ہوں۔

تھوڑی دیر چوکیدار اور سپاہی دونو عزیز خاں کو اوبھلاتے جُلاتے رہے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر کو داروغہ جی کے پاس پہنچے اور چوکیدار نے کہا "سرکار وہ تو بڑی مشکل سے ڈیڑھ سو روپیہ پر آیا ہے"۔

"اور تم کہتے ہو کہ اُن میں دم نہیں ہے"۔

"ہاں سرکار وہ تو ختم ہو گئے ایک پیسہ کا بھی ٹھیک نہیں ہے" (ہونٹوں پر زبان پھیر کر تھوک نگلتے ہوئے) "دو سو روپیہ پر آجائے گا"۔

"مشکل معلوم ہوتا ہے بہت ہلا جُلا دیکھا مگر ڈھب پر آیا نہیں"

"جب ادھر سے کوئی کچھ دینے والا نہیں ہے تو آخر ہم ڈیڑھ سو بھی کیوں چھوڑیں مگر تم ایک مرتبہ جا کر پھر دیکھ لو"۔

چوکیدار ادھر جا کر پھر عزیز خاں سے متوجّہ ہوا اور بولا خانصاحب بڑی مشکل سے داروغہ جی دو سو پر آ گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر اس سے کم لے تو سُؤر کھائے۔

عزیز خاں نے لاپروائی سے کہا "بھائی کوڑے ڈیڑھ سو نقد بہرہ شاہی اس سے زیادہ ہے ہی نہیں۔ دُوں کہاں سے"۔

چوکیدار نے جا کر داروغہ جی سے پھر کان کے اندر ہونٹ گھسیٹر کر کہا۔ کہ "سرکار ریکار ہے اس سے زیادہ نہیں دے گا"۔

داروغہ جی نے کہا تو خیر لیلو۔ چالان کر دینگے"۔

اسکے بعد داروغہ جی نے عزیز خاں کی چوپال پر کھانا کھایا آج اُنہوں نے خاص طور پر داروغہ جی کے لئے مُرغی ذبح کی تھی کھانا کھا کر اور ضروری ہدایات دے کر داروغہ جی جیب گرم کئے روانہ ہوئے۔

داروغہ جی کے جانے کے بعد عزیز خاں کو بُدھوا کی تلاش کی دُھن سوار ہوئی۔ جوئندہ یابندہ۔ دوسرے ہی دن مل گیا وہ تھانہ حاضر ہو کر اقبال کرنے کا مصمّم قصد کئے ہوئے تھا اسلئے بہت بے ہراس تھا عزیز خاں پکڑ کر اسکو اپنے گھر لائے اور چوپال کے اندر لے گئے بولے "کہو بُدھوا اب کیا ارادے ہیں کل کی کارروائی کی تو تم کو خبر مل گئی ہو گی"۔

"خانصاحب اب ارادہ کیا ہوتا سمجھو اگر تمہارا آدمی او تھوڑی دیر نہ پہنچا ہوتا تو کچہری یا تھانہ جا کر اقبال کر لیتا۔ اب مجھے کسی کارروائی کی خبر سے کیا مطلب؟ کچھ بھی ہو خواہ مخواہ کیوں گھسیٹن میں پڑتا پھروں"۔

"اُلّو کا پٹھا نہیں تو! ابے گدھے تجھے کچھ خبر بھی ہے۔ ہم نے تجھے کل بے داغ چھڑا دیا"۔

"کیسے خانصاحب" (ذرا رُکتے ہوئے) ایک نہیں دو نہیں۔ پُورے چار قتل کیسے چھُوٹ سکتا ہُوں"۔

"ابے گدھے کے بچّے تجھے معلوم نہیں کل پانسو روپیہ داروغہ کو ہم نے تیری خاطر دیئے ہیں قتل تو شیر خاں اور ناصر خاں پر چل رہا ہے بہت ہو گیا تو یہی تین چار مہینہ کی قید ہو جائے گی۔ تُو جا رہا ہے اقبال کرنے کو بسنت کی خبر بھی ہے۔

"(تعجب سے) ایں! شیر خاں۔ ناصر خاں پر کیسے"۔

"کیسے کیا! بھلا ہم تیرا ساتھ چھوڑنے والے ہیں"۔

"(ذرا رُکتے ہوئے) مگر خانصاحب۔ یہ تو بُری ہوئی ان غریبوں کی خطا؟ کروں میں اور بھریں وہ"۔

اتنے میں سمن خاں آ گئے تھے سُنکر ایک چانٹا رسید کیا اور بولے "گدھے کو نون دیا۔ اور گدھا کہے میری آنکھیں دُکھیں۔ انکا زر کٹا اور آپ خطا قصور تلاش کر رہے ہیں۔ سُؤر کا بچّہ حرام زادہ کہیں کا"۔

جان بڑی بھاری چیز ہے وہ کسان جو چند منٹ پیشتر پھانسی پر لٹکنے جا رہا تھا اور دن پیشتر تاریک۔ کوئیں میں پھاند کر

خودکشی کر رہا تھا اس گفتگو سے یکدم پلٹ گیا اُسے ناامیدی کے تاریک طوفان میں اُمید کا چراغ ٹمٹماتا معلوم ہوا اور زندگی کی اصل اہمیت ایک مرتبہ پھر محسوس ہوئی اور آخر سے اپنی جان اپنی محسوس ہوئی یہ جذبہ ہر چیز پر غالب آگیا اسکی عقل اور دماغ پھر کام کرنے لگے۔ خانصاحب نے اسکو ایک نہایت جامع بیان پڑھا دیا جس کے بعد اس کی پوزیشن ایک اچھے خاصے قتل کے چشم دید گواہ کی ہو جاتی تھی۔ رپورٹ بھی اس پر قتل کی نہ تھی۔ بلکہ اعانتِ قتل کی تھی۔ بیان اس کو صاف بچاتا تھا اور بڑی حد تک شیر خاں اور ناصر خاں پر قتل کو ثابت کرتا تھا۔

(۵)

جیل خانہ میں اس وقت چاروں طرف سناٹا ہے کسی کسی وقت پہرہ داروں کی آوازیں اس خاموشی کو توڑ دیتی ہیں دن بھر کے تھکے ماندے قیدی بےخبر پڑے سو رہے ہیں یہاں پر آکر خواہ مجرم ہوں یا نہ ہوں سب مجرم ہونے کا احساس کرتے ہیں۔ اور مطمئن ہوتے ہیں اسوقت اس خوابیدہ زندان میں اکثر قیدی عالمِ خواب میں آزاد ہونگے۔ کوئی گھر بیٹھا ہوگا۔ کوئی دُکان پر۔ اور کوئی کھیت پر۔ اور بعض بعض منچلا نقب اور قمار خانہ میں بھی مصروفِ کار ہوگا۔ اس وقت حوالات کے حصے میں دو قیدی برابر لیٹے ہوئے ہیں ایک گنگنانے لگتا ہے۔

"تم کب آئے"

"آج"

"کہاں سے"

"گڑھی سے"

"کیا نام ہے"

"پرتاب سنگھ"

"کس جرم میں آئے ہو"

"بلوہ۔ فوجداری' اور تم کہاں سے آئے ہو؟"

"خان پور سے"

"ایں خانپور۔ کونسا خان پور"

"یہی تھانہ دریا بُرد میں جو خان پور ہے"

"اچھا یہ خانپور۔ کس قصے میں آئے ہو بھائی"

"قتل میں"

"ایں قتل کیا فوجداری ہو گئی تھی! وہ تو پٹھانوں کا گاؤں ہے وہاں تو یہی قصے رہتے ہیں! بھائی کیا کریں ٹھاکر ہوئے پٹھان ہوئے اسی میں جو مٹ گئے قتل! بلوہ! فوجداری۔ تم کون ٹھاکر (قوم) ہو۔ پٹھان"

"نہیں میں تو ماؤ ہوں۔ پھنسے اس میں پٹھان بھی ہیں"

"اچھا وہ بھی اسی حوالات میں ہیں"

"نہیں جیلر صاحب نے انہیں کال کوٹھڑی میں رکھا ہے"۔

"کیوں! کیا بہت زور دار آدمی ہیں سنتے ہیں کہ وہاں کے پٹھان ہیں بھی بڑے اکھڑ"

"زور دار تو کچھ بھی نہیں ہیں دوسرے تھوک نے جیلر صاحب کو گھونس دے کے بند کرا دیا ہے"

"پٹھان بھی تو ٹھاکروں کی طرح بڑی تھوک بندی لڑاتے ہیں اور قتل بھی ذرا سی بات پر کر دیتے ہیں تم شاید اس تھوک میں کسی کے نوکر ہو؟ ایں!"

"نہیں نوکر تو نہیں ہوں"

"پھر قتل تو پٹھانوں نے کیا ہوگا تمہیں کیسے لے لیا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا تھوک غریب ہے جب ہی تو کال کوٹھڑی میں بند کرا دیا"

"(تمہارے تھوک پر ذرا متعجب ہو کر) ہاں یہ پٹھان پہلے تو بہت مالدار تھے مگر اب دو برس سے بگڑ گئے ہیں"

"ہاں بھائی اس سے کیا دام گھٹ جاتے ہیں جام نہیں گھٹتا برداشت نہیں کر سکے ہونگے قتل کر دیا!"

"تین قتل ہوئے ہیں"

"ایں تین قتل! کیا بڑی لام بندی ہوئی تھی؟ کسطرح ہوئے"

"وہ جیسے بھی ہوئے! ہوئے! فوجداری لام بندی تو کچھ نہیں ہوئی تھی"

"اچھا تو پھر کس طرح ہوئے"

"گھر کے اندر"

"کیسے"

"اب یہ تم پوچھ کر کیا کروگے"

"بتاؤ تو یار نگرہ یار ذرا سچ سچ بتانا نور ظہور کا وقت ہے سویرا ہوا چاہتا ہے"

"بھائی سچ سچ پوچھ رہے ہو تو قصہ یہ ہے کہ گاؤں کے ایک پٹھان نے میرے بیل زبردستی ہل سے ٹکرا کر ریلوے میں لے جانا چاہا ہے اس بات پر مجھ سے اور اس سے جھگڑا ہو گیا۔ اس نے میرے منہ میں تھوک دیا اور بیل زبردستی ٹکرا کر لے گیا۔ برادری کی پنچایت نے حقہ پانی ڈال دیا اور گھر والوں نے بھی بھنگی کر دیا پہلے تو میں کوئیں میں ڈوبنے چلا وہاں گاؤں کے ایک اور پٹھان جو اب اس مقدمہ کو چلوا رہے ہیں پہلے سے موجود تھے انہوں نے مجھ سے کہا کہ ڈوب کر کیوں مرتا ہے جب مرنا ہی ہے تو دو چار کو لیکر مر۔ میں نے اسکی بات مان لی اور گنڈاسی لے کر تین قتل کئے"

"اچھا وہ خانصاحب مارے گئے جو منہ میں تھوک چکے تھے"

"نہیں وہ کہاں تھے انکے بچے اور بیوی مارے گئے۔ اور ایک لڑکی کا ہاتھ کاٹ دیا"

"اچھا پھر یہ پٹھان جو تم کال کوٹھڑی میں بتاتے ہو۔ کیسے پھنس گئے"

"گاؤں میں پرانی عداوت ہے ان پٹھانوں پر پہلے بھی قتل چل چکا تھا مگر بچ گئے تھے اس دفعہ انکا نام بھر لوا دیا"

"اچھا تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن پٹھان کی اور ان دونوں کی عداوت ہوگی"

"عداوت تو انکی بھی نہیں ہے بلکہ ان پٹھان نے جنہوں نے مجھے سکھا کر قتل کرائے اس پٹھان سے دعویٰ کرا دیا ہے"

"خوب! کوئی بڑا ابنا ہوا معلوم ہوتا ہے خود ہی سکھا کر تم سے قتل کرائے اور مقتول کے آدمی سے جسپر چاہا دعوے کرا دیا"

"ہاں داروغہ جی کو پوری رقم دی ہے"

"مگر ایک بات تو بتا، تو نے کیا سوچا؟ ننھے ننھے بچوں اور عورتوں کو قتل کیا اور دو بیگناہوں کو پھنسایا! ہات تیرے گیدی کی! اے نامرد ٹا! نیچ! اس جنم میں تو برادری نے بھنگی کیا ہے۔ اُس جنم میں بھگوان کتے سے بھی بدتر بنا دیگا۔ ہشت نامرد! اس سے تو ڈوب مرنا تو اچھا تھا۔ اس کا تو کچھ بھی نہ بگاڑ سکے جس نے تھوکا تھا کمزوروں پر ہاتھ ڈالا اور بیگناہوں کو پھنسایا اور وہ بھی دوسرے کے کہنے سے! تھو تیرے جنم میں۔ اور بغیر پھانسی کے بچیگا بھی نہیں! بھلا تین تین قتل کر کے کوئی بچ سکتا ہے مگر ان دونوں بیگناہوں کا۔ لٹیرا گا"

بدھوا کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ فرش سے چند گز اونچا اُٹھ گیا ہے اور ہوا میں معلق ہے اسکے دماغ نے محسوس کیا کہ یکدم ہزاروں توپیں چھوٹ رہی ہیں! موت اور زندگی میں پھر ایک مرتبہ کشمکش ہوئی۔ انسانیت اور ذ ذ تِ دندگی میں زبردست کشتی ہوئی! اُس نے اپنی آنکھوں کے سامنے ہزاروں پتلیاں اُڑتی دیکھیں اور ارد گرد کی ہر چیز گھومتی معلوم ہوئی اسکے سینے میں ایسا معلوم ہوا کہ اسکی روح گھبرا کر تھرتھرائی ہے اُسکی سانس رکنے لگی اور اعضاء میں رعشہ پیدا ہو گیا۔ اُس نے ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس لی اور اپنے زبان کے اعصاب کو قابو میں لاتے ہوئے لڑکھڑاتی زبان میں کہا "تو پھر اب میں کیا کروں"

"کرنا کیا! جو کرا ہے اُسے بھوگ۔ تیرا مقدمہ کب ہے"؟

"کل پہلی جی کی پیشی ہے"

اقبال کرلے یہ جنم تو گیا وہ جنم سنبھل جائیگا ورنہ "دونوں دین سے گئے پانڈے نہ کھیر ملی نہ مانڈے"

یہ گفتگو بدھوا پر تازیانہ کا کام کر گئی وہ بیصبری سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسکو صبح نکالنا مشکل ہو گئی وہ بار بار اپنے بال نوچتا تھا اسکا بس نہ تھا کہ قدرت سے لڑ کر قبل از وقت صبح کر لیتا۔

آج کی پیشی کے دن بدھوا کا چہرہ غیر معمولی طور پر مطمئن اور چمکدار تھا وہ عدالت کے برآمدے میں بیڑیاں پہنے بیٹھا تھا۔ اسکی نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اسکو اپنے ماحول کی کوئی چیز نظر نہیں آرہی ہے۔ عزیز خاں اُسکے قریب سے گذرے تھے اور اس کو تسلی دی اُس نے ایک زہر خند قہقہہ مارا اور اپنا سر اپنے گھٹنوں میں دے لیا۔ مقدمہ پیش ہوا۔ بدھوا نے نہایت آزادی سے جج سے کہا۔ حضور پیشتر اس کے کہ کوئی کارروائی مقدمہ شروع ہو میرا بیان لے لیا جائے۔ اس کے بعد من وعن کل قصہ سچ سچ کہہ ڈالا اس کے بعد جج نے شیر خاں اور ناصر خاں کے بیانات لئے ثبوت کے گواہوں کی ہمت بیان دینے کی نہیں ہوئی۔ صفائی کے چند گواہ پیش ہوئے جج نے شیر خاں اور ناصر خاں دونوں کو رہا کر دیا اور بدھوا کو سزائے موت کا حکم سنایا۔

اور بدھوا سماج کی زنجیروں اور ذات پات کے پھندوں سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گیا۔

ابوالفضل صدیقی

غزل

بنائے آرزو رکھی نہ طرحِ مدعا ڈالی — دلِ مرحوم کی میں نے نئی صورت بنا ڈالی

قدم رکھا جو میں نے دشتِ وحشت کی فضاؤں میں — تو ذروں نے ہواؤں پر نگاہِ آشنا ڈالی

کسی کے ہوش باقی ہوں تو پوچھے جا کے ساقی سے — سبو میں زہر ڈالا یا شرابِ جانفزا ڈالی

محبت جس میں دردِ آرزو کے رنگ بھرتی تھی — زمانے نے بہر صورت وہی صورت مٹا ڈالی

گرے گویا ستارے ٹوٹ کر دستِ حنائی سے — چھٹک کر شانے سے جب زلفِ دوتا ڈالی

دمکتا ہے بلوریں جام کندن کی طرح ساقی — شرابِ ناب کیا ساغر میں ڈالی کیمیا ڈالی

بہت اچھی غزل وحشت کی ہے جس کا یہ مصرع ہے[1] — "جفا سہنے کی عادت یعنی بنیادِ وفا ڈالی"

بساطِ زندگی بے رنگ تھی عابدؔ کہ فطرت نے

سبوئے عشق میں رنگینیٔ خونِ وفا ڈالی

عابدؔ لاہوری

[1] بہت اچھی غزل ثاقب کی تھی جس کا یہ مصرع ہے
"نہ تھا آساں وہ غم جس کی محبت بنا ڈالی"
"م"

مندر میں

منتر بول میٹھے.

منتر بول میٹھے، من بھاتے

دُکھ کو دور کہیں لے جاتے

آئیں پجاری جائیں پجاری

سُکھ کی برکھا لائیں پجاری

منتر بول سے

پریم ایشور کے

کومل من کو رِجھائیں پجاری

گائیں پجاری

منتر بول میٹھے!

(۲)

آئے پروہت دُوب جلائے،

آرتی کو ہاتھوں میں اُٹھائے،

چھن چھن چھن چھن چھن کیسی صدا ہے؟

دل کا گنبد گونج رہا ہے،

سکھ کی آشا

سکھ کا سپنا

ناچ رہی ہے، جھوم رہا ہے،

یوں گاتا ہے

منتر بول میٹھے

(۳)

جاگ اٹھی ہیں بیتی باتیں،

یاد آتی ہیں پہلی راتیں،

یاد آتی ہے دیو اداسی

دل ہے پیاسا، آنکھ بھی پیاسی،

سُکھ ساگر ہیں

اس مندر میں

میرے دل میں چھائی اداسی

دیو اداسی!

منتر بول میٹھے۔

میراجی

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

اضطراب۔ خاص نمبر جنوری فروری۔

خوش مذاقی کے اندھے۔

چودھری محمد علی صاحب کے جتنے افسانے ہم نے دیکھے ہیں۔ اُن میں ایک عنصر ہمیں مشترک نظر آیا۔ اور وہ اُن کی مخصوص بلکہ محبوب قصباتی بیک گراونڈ ہے۔ شمالی ہند کے بڑے بڑے شہروں میں زندگی کی جدّ و جہد اس قدر بڑھ گئی ہے اور معاشرت میں ایسی بے کیف یکسانی پیدا ہو چکی ہے کہ فن کار کو کھُلی ملی معاشرت کے مطالعہ کا موقعہ بہت کم ملتا ہے۔ اور وہ ناچار اپنا خام مواد کلرک اور بے کار، مزدور اور سرمایہ دار جیسے موضوعات سے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس تنگ اور مصنوعی میدان میں اُسے مشاہدے کی وہ آسانیاں کہاں میسّر جن سے ہماری قصباتی زندگی کا دامن اب بھی مالا مال ہے۔ محمد علی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قصباتی معاشرت کے بظاہر بے آب و رنگ مواد سے ایسے ایسے دلربا صنم تراش لیتے ہیں کہ اُن کی فن کاری تخلیق کی انتہائی بلندیوں پر جا پہنچتی ہے۔ **تیسری جنس**، **گناہ کا خوف**، اور **"دوا"** اِن کے اس کمال کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اور زیرِ نظر افسانہ بھی کردار نگاری کے اعتبار سے چودھری صاحب کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

پس منظر حسبِ معمول قصباتی، اور ہیرو اس قصبے کے ایک خوش مذاق نوجوان مولوی ابراہیم حسن ہیں۔ مولوی صاحب کے والد مشرقی وضعداری کا ایک شائستہ نمونہ ہیں جو اگرچہ

> "نماز پڑھتے تھے مگر اس کا احسان کسی پر نہیں رکھتے تھے۔ روزہ رکھتے تھے مگر نہیں سمجھتے تھے کہ محلے بھر کو انہوں نے مول لے لیا ہے۔ لڑکے کو فارسی خود پڑھائی تھی۔ عربی کی تحصیل کے لئے شہر بھیج دیا تھا ——
>
> روشن خیال تو کسی طرف سے نہ تھے مگر باوجود بوڑھے ہونے کے روادار کہے جا سکتے تھے یعنی ان کے ہم سن جن سماجی گناہ گاروں پر زیادہ خفا ہوتے تھے ان پر اُن کا دل چاہتا تھا کہ کم ہی سزا دے کر معاف کر دیں۔"

فن کار نے پیر جی یعنی مولوی ابراہیم کے والد کا تعارف کرانے میں اُن کے سن کا بہت خیال رکھا ہے۔ اور یہیں نہیں بلکہ آگے چل کر بھی۔ درحقیقت سن ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسانی نفسیات پر تمام عناصر سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے مظاہر یوں تو روزمرّہ ہم اور آپ دیکھتے ہی رہتے ہیں مگر افسانہ نگار نے اپنے ہاں اس کے نکات بڑی لطافت سے نمایاں کئے ہیں۔ دیکھتے جائیے ......

ہاں تو مولوی ابراہیم ایک روادار باپ کے بیٹے تو تھے ہی شعر و سخن کا مذاق فطری تھا۔ شہر کی علمی صحبتوں نے اسے جلا بھی دے دی تھی۔ مگر ماحول کی تنگی اُسے اُبھرنے نہ دیتی تھی چونکہ ایک سنجیدہ اور سلیم فطرت ساتھ لائے تھے اس لئے اگرچہ فضیلت کی پگڑی باندھ چکے تھے مگر

> "ہمیشہ فضیلت کو پگڑی پر ترجیح دیتے رہے۔ بلکہ پگڑی سے ایک حد تک پریشان تھے۔ اسی وجہ سے اس کے کونے بنوا ڈالے تھے اور ہماری آپ کی ایسی ٹوپی دینے لگے تھے۔ طبیعت نہایت سلجھی ہوئی، مذاق نہایت ستھرا۔ علم کی رعونت چھو نہیں گئی تھی۔ شعر نہیں کہتے تھے۔ مگر اصلاح دے دیتے تھے۔ مشاعرے میں ضرور جاتے مگر ایسے کونے میں بیٹھتے تھے جہاں آواز پڑ جانے کا ڈر نہیں ہوتا تھا۔ غریب کے پاس بیٹھ کر شرماتے نہیں تھے۔ ہاں —— البتہ اگر ہم

مذاقی کہیں سے بھی نہ پائی تو پھر اُدھر کا راستہ نہیں چلتے تھے۔

ابراہیم صاحب کی بدقسمتی سمجھئے یا اتفاق، ان سے جب کسی امیر آدمی سے ملاقات ہوئی تو کسی نہ کسی طرح اُن کی غریبی کو ٹھیس لگ ہی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امیروں کے ملنے ہی سے گھبرانے لگے تھے۔

علم اور دولت کا جوڑا اکثر مل جاتا ہے۔ غریبوں میں علم حاصل کرنے کی وہ آسانیاں کہاں۔ اسی وجہ سے غریبی کے ساتھ جہالت۔ دولت کے ساتھ اس کے دوسرے عیوب۔ مولوی ابراہیم کو اپنا ہم مذاق کم ہاتھ آتا تھا۔ غریب وطن میں غریب الوطنی کے مزے اٹھاتے تھے۔۔۔۔"

ایسے میں کرنا خدا کا کیا ہوا کہ پیر جی نے مولوی صاحب کی نسبت ٹھہرائی بڑے میاں اپنی تمام رواداری کے باوجود شادی بیاہ کے معاملات میں ایک خاص روش کے پابند تھے۔ وہ نسل کے سوال کو باقی تمام ملحوظات پر ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ مولوی صاحب کو انہوں نے اپنی ہمشیرزادی سے ہمیشہ کے لئے باندھ دیا۔ بے چارے دولہا نے اپنے بعض احباب کے ذریعے کہلوایا بھی کہ

"آپ کے صاحبزادے پڑھے لکھے شہر کی تعلیم پائے نہایت نفیس مزاج آدمی ہیں ان کو جاہل بی بی سے کیا لطف ہوگا"۔

مگر پیر جی نہ مانے۔ اور مولوی صاحب ایک ٹھیٹھ دیہاتی لڑکی بیاہ لائے جو مولوی صاحب کی بی بی تو بن گئی مگر رفیقہ نہ بن سکی۔ اور یہاں افسانہ نگار نے نسوانی فطرت کے متعلق ایک لطیف نکتہ بیان کیا ہے۔ عورت جس چیز کی اپنے میں کمی پاتی ہے اُسے وہ دنیا کی پست ترین چیز قرار دیتی ہے مثال اسی طرح ہمارے نسوانی سماج نے اُن تمام دلفریبیوں اور دل آویزیوں کو جن کے حصول کے مواقع اسے حاصل نہ ہو سکے، کچھ اپنی بزدلی کے باعث اور کچھ مردوں کی بدولت اُس طبقے کی خصوصیت سمجھ رکھا ہے جسے عرفِ عام میں اہلِ نشاط کہا جاتا ہے یہاں رقص و سرود کا ذکر نہیں، عشوہ و غمزہ کی بات نہیں، لیکن ایسی لطافتیں اور رعنائیاں جو ہر جوان عورت کا قدرتی حق ہیں اور جن کی ہر سلجھے ہوئے مرد کو جستجو ہے، ایک جھوٹے معیار کے ماتحت بازاری عورتوں کی زینت سمجھی جاتی ہیں چنانچہ مولوی صاحب کی دُلہن

"کئی دن شرم کے مارے دولہا سے بولی نہیں، اس کے بعد بولیں بھی تو معلوم ہوا کہ نہ بولتیں تو اچھا تھا۔ مولوی صاحب کا دل چاہتا تھا کہ کچھ شوخی ہوتی، کچھ شرارت، کچھ اچپلاہٹ۔ کچھ ناز کچھ کرشمہ کچھ چھیڑ چھاڑ کچھ ٹھنگنا پن وہاں ہر بات کا ایک ہی جواب تھا "کا کچھ ہم بیسوا ہیں"۔ [1] کبھی کبھی

[1] منڈی۔

اسی مضمون کو دوسری طرح باندھتی تھیں۔ "ای سب پتُریا جانیں ہم کا جانن"۔ قصہ مختصر سائنس میں اگر حرکت حدت میں بدل جاتی ہے تو یہاں ہر چیز جمود کا جامہ پہن لیتی تھی۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش۔ مولوی ابراہیم کے دو ہی کام رہ گئے تھے۔ یا لڑکے پیدا کرو نا یا اڑوس پڑوس کے جاہلوں میں بیٹھ کر انہیں کے مذاق کی باتیں کرنا"۔

اور اب فن کار کے حیرت ناک مطالعے کی ایک برقی چشمک دیکھیے۔

" مولوی ابراہیم کی بی بی کو ایک شعر بھی "منہ زبانی" یاد تھا۔ مگر وہ صرف گرمیوں کے دن ہی آفتاب نکلنے کے پہلے نسیم صبح کے تقاضے سے کبھی کبھی پڑھ نکلتی تھیں [2]

جب دم واپسیں ہو یا اللہ

لب پہ ہو لا الٰہ الا اللہ "

راقم الحروف نے جب یہ ٹکڑا پڑھا تو اُسے معاً اپنی ایک رشتے کی ممانی یاد آگئیں جنہیں وہ اپنے بچپن میں صبح کے وقت اسی قسم کے مناجاتی اشعار پڑھتے سنا کرتا تھا۔ مجھے گرمیوں کی صبح کے وہ ہلکے ہلکے جھونکے آج بھی اپنے جسم سے چھوتے معلوم ہوتے ہیں۔ جن کے تقاضے سے "ملی جان جو ماشاء اللہ ایک حاجی کی بیوی اور اُن سے بڑے حاجی کی بیٹی تھیں۔ اس طرز کے آبدار اشعار پڑھ نکلتی تھیں۔ ہائے سماج اولئے سماج!!

میرا خیال ہے کہ ہم میں سے تقریباً ہر شخص نے ایسا مشاہدہ کبھی نہ کبھی ضرور کیا ہے، مگر ـــــ لکھا ایک ہی نے ہے اور یہی لکھنے والے کے کمالِ فن کی دلیل ہے۔

یہاں صاحبِ افسانہ نے ایک لطیفہ بیان کیا ہے اسے بھی سنتے چلیے۔

"ہمارے محلے میں ایک پرانا قصہ مشہور ہے کہ کوئی شاعر تھے۔ انہوں نے رات کو ایک شعر کہا جس کو سنانے کے لئے بیتاب ہو گئے۔ رات کے ایک بجے قدردان نکتہ رس کہاں سے آتا ناچار اپنی اہلیہ کو جگایا۔ ان سے کہنے لگے "ایک شعر ہوا ہے"۔ وہ کہنے لگیں ہاں تو پھر کیا کریں"۔ انہوں نے کہا "سنوگی"! انہوں نے کہا "سناؤ"۔ شعر سُن کر ذرا سی رکیں اس کے بعد کہنے لگیں "سمجھاؤ"۔ جوں جوں شاعر صاحب اس کے معنی بتاتے جاتے تھے۔ بی بی پر مختلف اثرات ظاہر ہوتے جاتے تھے۔ جب یہ سمجھا چکے تو بی بی کے چہرے پر سب سے زیادہ تعجب کا اثر نمایاں تھا۔ کہنے لگیں "میں تم سے کہتی ہوں تم اتنا جھوٹ

[2] عشق کی بات بیسوا جانیں۔ ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں۔

بولتے ہو تمہاری بخشش بھی ہوگی؟!

اور پھر

"زمانہ گذرتا گیا۔ بدمذاقی کی تکلیف کے گھٹے مضبوط ہوتے گئے۔
قضائے کار ایک نوکری باہر سے آگئی اور مولوی ابراہیم صاحب
ایک جگہ پڑھانے پر نوکر ہو گئے۔ جوئندہ یابندہ، وطن سے دور
ایک مسماۃ سے عقد بھی کر لیا۔ اور زندگی حسب دلخواہ گذرنے لگی۔
دو ہی تین برس بعد گھر سے تار پہنچا کہ تمہاری بی بی نے انتقال کیا
موت پر افسوس سب ہی کرتے ہیں لیکن غور کیجئے تو اصل صاحبِ
معاملہ جو دو آدمی تھے ان دونوں کی مصیبتیں کٹ گئیں۔ رہے
پیر جی ان کا دل پوتی پوتوں میں بہلا رہا۔ دو چار سال کے بعد مولوی
ابراہیم کی دوسری بی بی نے بھی انتقال کیا..... پھر مولوی ابراہیم
سے وہاں نہ ٹھہرا گیا اور نوکری چھوڑ گھر آ گئے ..... ایک عورت
کے دکھوں گھر چھوڑ کر پردیس کی راہ لی تھی۔ دوسری عورت کے دکھوں
ہر پھر کر پھر وہیں پہنچ گئے۔

گھر میں کیا رکھا تھا جو یہاں جی لگتا۔ پہلے تو کچھ لوگ بچپن کے
ساتھ کھیلے ہوئے محلے میں باقی تھے۔ اگر علمی مباحثے نہ تھے تو
اڑوسیوں پڑوسیوں کی باتیں کر کے جی بہلا لیتے تھے اب بہت سے
مر چکے تھے دو چار جو بچے بھی تھے وہ بھی اپنے اپنے کام دھندے
میں لگ گئے تھے۔ قصہ مختصر اصلی مولوی ابراہیم کا پہچاننے والا کوئی
بھی نہ رہ گیا تھا۔"

اور اب افسانہ اپنے عروج کو پہنچتا ہے سن شباب اور اس کے ساتھ شباب کے معاملات گذر چکے۔ صحبتِ ناگوار کی تکلیف اور تقرب خوشگوار کا لطف بھی اٹھا لیا۔ خالص جنسی پیاس بھی بجھ گئی لیکن وہ آرزو اور طلب جو غیر جنسی ہوتے ہوئے بھی ایک صورت میں جنسی ہوتی ہے بدستور باقی تھی۔ ایک "شریف" اور سنجیدہ نوجوان جس کی جیب میں کچھ زیادہ پیسے بھی نہ ہوں اور جس کے گھر میں ایک "بہرحال" بی بی اور سر پر ایک وضع دار باپ کا سایہ بھی ہو۔ اُس کے لئے ایک قصبے کی تنگ حدود اور ایک نکتہ چین سماج کے جس میں اظہارِ ذوق اور پذیرائی شوق کا کوئی موزوں ذریعہ تقریباً ناپید ہوتا ہے۔ مگر ایک چالیس سالہ پختہ کار انسان کے لئے جو اس زندگی کی تلخیوں اور شیرینیوں میں سے تھوڑی بہت چکھ بھی چکا ہو اور تسکین جنس کے ابتدائی مراحل بھی طے کر چکا ہو جنس کی ثانوی کیفیات ہی کچھ بالیدگیٔ روح کا سامان بہم پہنچاتی، اور شمع حیات کو روشن رکھنے کا ذریعہ ثابت ہوتی ہیں۔ اور عمر کی اس منزل میں وہ بیرونی اسباب بھی کچھ بدل سے جاتے ہیں جن کے تاثرات زندگی کے آغاز میں بہت قوی اور ناقابلِ مدافعت ہوا کرتے ہیں تو خیر، ہوا یہ کہ

"محلے میں ایک رنڈی رہتی تھی۔ کوئی پچپن برس کا سن۔ مولوی ابراہیم
سے تقریباً پندرہ برس بڑی۔ مگر واہ رے تہذیب اس کو دیکھ کر معلوم
ہوتا تھا کہ واقعی ایسی ہی رنڈیاں ہوتی ہوں گی جن کے یہاں امیرزادے
آدابِ مجلس سیکھنے کے لئے بھیجے جاتے رہے ہوں گے۔ پڑھی لکھی
تو شد بد ہی رہی ہو گی مگر ہمیشہ شریفوں کی صحبت اٹھائی تھی۔ خوش مذاقوں
کا کھلونا رہی تھی خلوت کا حال جاننے والے تو سب ٹھکانے
لگ چکے تھے۔ جلوت کے دیکھنے والے آج بھی شائستگی کی
تصویر سامنے دیکھتے تھے۔ جب جی گھبراتا، مولوی صاحب گھر
سے نکل کر وہیں جا بیٹھتے تھے۔ کچھ دنوں میں وہیں کے ہو گئے۔ رفتہ
رفتہ یہ ہوا کہ جس کو کوئی غزل دعیرہ دکھانی ہوتی تھی سیدھا وہیں چلا
جاتا تھا۔

پیر جی کو یہ باتیں کیسے پسند آتیں۔ مگر چپ تھے۔ یہ اُن لوگوں میں
ہرگز نہ تھے جو ہر ایسے فعل پر کفر کا فتویٰ جاری کر دیتے مگر تب بھی
سن وسال کے فرق کی وجہ سے حیز بز رہتے۔"

مولوی صاحب کو تو اس پچپن سالہ خوش ذوق عورت کی صحبت میں وہ کچھ مل گیا جس کی انہیں عمر بھر تلاش رہی اور لطیف تاثرات کے اظہار و قبول کا ایک موزوں ذریعہ خدا نے ایسے وقت دے دیا جب سلجھی ہوئی طبائع کو اس کے سوا اور کسی چیز کی خواہش نہیں ہوتی مگر پیر جی، کہ عمر کے درمیانی دور سے مدت کے نکل چکے تھے اور اب اُس منزل میں آ گئے تھے۔ جب زندگی کے تمام ابتدائی لذائذ بڑی شدت سے لوٹ آتے ہیں، اور حواس کی ثانوی اور لطیف تر کیفیات اوجھل ہونے لگتی ہیں، کیونکر اس صورت حالات سے مطمئن ہو سکتے تھے۔ چنانچہ

"ایک روز کوئی مولوی ابراہیم کو پوچھتا آ گیا۔ پیر جی بیٹھے حقہ پی رہے
تھے، کہنے لگے۔ "وہیں دیکھو اپنے اڈے پر ہوں گے گھر میں تو ہیں
نہیں" وہ سلام کر کے جانے لگا انہوں نے کہا "بیٹھ جاؤ" "مولوی
ابراہیم کی باتیں کرنے لگے کہ جب سے نوکری چھوڑ کر آئے ہیں، نہ
معلوم کیسی طبیعت ہو گئی ہے۔ گھر میں بیٹھتے ہی نہیں اور گھر میں ہے
ہی کون۔ دو بار، باہم بال بچے۔ میں چاہتا تھا کہ پھر شادی ہی کر لیں
مگر نہ راضی ہوئے۔" اس کے بعد اس رنڈی کے گھر کی طرف اشارہ
کر کے کہنے لگے۔ "جب میں نے ان کو ادھر آتے جاتے دیکھا تو خیال

ہوا کہ وہاں کون دلچسپی ہو سکتی ہے عقل نے کہا کہ اس کے یہاں جو ایک کالی کلوٹی لونڈیا نہیں رہتی ہے "اس کے خیال میں چکر لگاتے ہوں گے۔ مجرد ہیں۔ خیر ہو گا بھئی ہم سے ان باتوں سے کیا واسطہ، تم جلتے ہو گے یہ لونڈیا اس رنڈی نے پالی تھی کہ اس کو ناچ گانا سکھائے گی۔ مگر وہ ایسی کوڑھ مغز کہ اُس کو کچھ آیا ہی نہیں مجبوراً استاد وغیرہ چھڑا دیئے اور اس سے ماماگیری کا کام لینے لگی۔ اگر ابراہیم اُس سے نکاح کر لیتے تو صورت نہ سہی، جوان تو تھی ہم بھی کہتے دنیا یہی کرتی ہے اگر ابراہیم نے کیا تو کیا بے جا کیا۔ جوان ہیں بی بی نہیں ہے۔ جنّت کا شوق جہنّم کا خوف سب دھرا رہ جاتا مگر فطرت اپنا حکم منوا ہی لیتی ہے، مگر یہاں تو خوش مذاقی کے پیچھے اندھے ہی ہو گئے اور یہ راز تو اب کھلا کہ اس سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ اپنی دادی جان پر ریتجھے ہیں۔"

وہ مولوی ابراہیم ریتجھے ہوں یا نہ ریتجھے ہوں، مگر بڑے میاں اپنے گھر میں ایک جوان بہو کی چھم چھم سننے کے ضرور منتظر تھے۔ فطرت واقعی بڑی سخت گیر آقا ہے۔

صلاح الدین احمد

حصۂ نظم

یوں مرے دل سے کھیلتی ہے بہار

جیسے تاروں کی دل نشیں چشمک — جس طرح چاند کی حسیں کرنیں
رات کو گوشۂ گلستاں میں — پتّی پتّی پہ ناز سے کھیلیں

یوں مرے دل سے کھیلتی ہے بہار

جس طرح قربِ حسن کا احساس — جیسے محبوب کی نگاہِ جمیل
دل میں آنکھوں کی راہ سے اُترے — اور ہو جائے روح میں تحلیل

یوں مرے دل سے کھیلتی ہے بہار

جیسے الفت کے بے صدا نغمے — جس طرح غم کی مضمحل تانیں
دردِ افسردگی سے اُکتا کر — سازِ ہستی سے خود بخود اُبھریں

یوں مرے دل سے کھیلتی ہے بہار

جیسے آنچل کسی حسینہ کا — ہولے ہولے اُڑا رہی ہو نسیم
جس طرح عکسِ حور سے کھیلے — خلد میں موج کوثر و تسنیم

یوں مرے دل سے کھیلتی ہے بہار

ہمایوں فروری ۱۹۴۲ء — سکینہ محمود

موسم کی تبدیلی انسان کی ذہنی اور قلبی کیفیتوں پر قدیم زمانے سے اثر کرتی آ رہی ہے۔ فروری کے ہمایوں میں سکینہ محمود ایک ایسے ہی تاثر کو بیان کر رہی ہے تشبیہات میں اُس کا تصور ایک ایسی نزاکت کا حامل ہے جو اس مبہم تاثر سے ہم آہنگی ظاہر کرتا ہے۔ جس کے باعث شعری تحریک ہوئی پہلے بند کی تشبیہ میں بہار کی اٹکھیلیاں کسی قدر "غیر جانبدار" سی محسوس ہوتی ہیں لیکن اس بات کو دوسرا بند مٹا دیتا ہے۔ دل میں آنکھوں کی راہ سے اُترنا اور روح میں تحلیل ہو جانا شاعر اور اُس کے احساس بہار کی کیفیت سے ہمارے ذہن کو ہم آہنگ بنا دیتا ہے — لیکن یہ ابھی بہار کا پہلا تاثر ہے، خوشگوار من بھاتا — دوسرا تاثر غم آلود ہے، جن پر بیتی ہو وہ جانتے ہوں گے کہ کس طرح بہار کا موسم بہجت و ملال کے متضاد احساسات کو پیدا کرتا ہے۔ اور تیسرا بند اُس آسائش اور آسودگی کا مظہر ہے جو ان متضاد تاثرات کے بعد پیدا ہوتی ہے، گویا دل سے ایک بوجھ سا اتر گیا — ہاں اس تیسرے بند میں ایک بات اور ہے اس کا تصور مردانہ ہے۔ اور شاعر کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس غیر آہنگی میں اجنبیت سی محسوس ہوتی ہے لیکن شاید یہ احساس کی بجائے ترجمانی کو وسعت دینے کے لئے فن کار کی شعوری کوشش ہو۔

اسی موسم بہار کی آمد جنوری کے "مشرقی دنیا" میں عابد علی عابد کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ تکمیل لذت کے لئے ساقی کو بُلائے۔ عابد کا ساقی نامہ ایک ایسے شاعر کے بہاریں تاثر کا ترجمان ہے جو ذہنی طور پر ایک انفرادیت کا مالک ہے جو بہار کے تاثر سے ساقی کو دعوت تو دیتا ہے، بہار کی مستی کو مے کی مستی سے اور مے کی مستی کو نغمے کی مستی سے بدلنا تو چاہتا ہے، لیکن اپنی شخصیت کو نہیں بھولتا، اپنی ذہنی نشو و نما اور اپنے علم کو فراموش نہیں کرنا چاہتا۔ اُس کا ذہن بہار کے تاثر سے لبریز ہے اور اس سے جو تناؤ اُس کی ذہنی رگوں میں پیدا ہو گیا ہے اُسے وہ نغمے کے جادو سے متوازن کرنا چاہتا ہے۔ شروع میں ایک

دو جگہہ اُس کی تشبیہات میں قدامت سی محسوس ہوتی ہے "بجلی لپٹ جائے ہزبان سے" ——— شعلہ سا لپک اٹھتا ہے آواز تو دیکھو" (مومن) اور ڈھونڈے ہے اُس مغنیِ آتش نفس کو جی" (غالب) کی یاد دلاتا ہے لیکن آگے چل کر یہ کیفیت دو رہو جاتی ہے۔ شاعر کا ذہن اپنی اُس انفرادی منزل کو پالیتا ہے جسے وہ شاید بہار کے تاثر کی گہرائی کی اُلجھن کے باعث بھول گیا تھا۔ اُسے اس بات کی پروا نہیں کہ جب ساقی بطِ مے لے آتا ہے تو مغنی کس دُھن سے اُس کے قلب کی تسکین کا سامان مہیا کرتا ہے، وہ اس وقت صرف سننا چاہتا ہے، آوازوں کی ہم آہنگی، ایک ایسی ہم آہنگی اُسے مطلوب ہے جو اُس کی ذہنی رگوں کے تناؤ کو دور کر دے، اُس کے ملال کو مٹا دے۔ لیکن وہ یہ سب باتیں، یہ سب تقاضے کچھ اس انداز سے کرتا ہے کہ اُسے معاً خیال آتا ہے "خرد ہے مرے دل سے اُلجھی ہوئی" ——— اور وہ سمجھتا ہے کہ خرد کی اُلجھن کو کسی غزل کا مرہم ہی تسکین دے گا ——— غزل کی ردیف اُس تن آسانی کو ظاہر کرتی ہے جو پہلے پیدا شدہ جوش کا ردِ عمل ہے "دھواں رہ گیا" ——— مسافر پسِ کارواں رہ گیا

ساقی نامہ

بہار آئی ساقی بطِ مے اُٹھا   ہتھیلی پہ تختِ جم و کے اُٹھا
دکھا کوئی محفل کو جادوگری   اتار اپنے شیشے میں ساقی پری
اُبلنے لگی زندگی خاک سے   نکلنے لگا خون رگِ تاک سے
زمانے نے اُلٹی بساطِ خزاں   پلا ساقیا بادۂ ارغواں
مے لعل کو آبِ حیواں بنا   خطِ جامِ مے کو رگِ جاں بنا
مغنی کوئی راگ اس شان سے   کہ بجلی لپٹ جائے ہزبان سے
نہیں قید کچھ بھیروں ٹھاٹھ کی   کوئی شے، کسی دلنشیں ٹھاٹھ کی
نکلتے ہوں شعلے رگِ سنگ سے   ٹپکتا ہو خوں پردۂ چنگ سے
کوئی دھن بہ طرزِ عراق و حجاز   کوئی شے شہانہ ہو یا شاہ ناز
کوئی سُر ہو کومل رکھب یا گندھار   کوئی تال ہو وادرا یا دھمار
وہ دُھرپد ہو اے نغمہ گر یا خیال   کوئی نغمہ ہو بہرِ وضع ملال
چلی آئی آواز شہپور وئے   درت ہو کہ مطرب بلمپت ہوئے
خرد ہے مرے دل سے اُلجھی ہوئی   مغنی غزل کوئی سلجھی ہوئی

غزل

محبت کا سوز نہاں رہ گیا   بجھی آگ لیکن دھواں رہ گیا
مرا دل ہے اور ہم نشینوں کا سوگ   مسافر پسِ کارواں رہ گیا
دل آویز ہے کس قدر کعبۂ شوق   جہاں کوئی [illegible] رہ گیا

ہوئیں کم نہ تقدیر کی گردشیں   زمیں تھک گئی آسماں رہ گیا
گیا تھا پئے سیرِ دشتِ جنوں
خدا جانے عابدؔ کہاں رہ گیا

مشرقی دنیا جنوری ۱۹۴۱ء
عابد علی عابدؔ

اوپر کی دونوں چیزوں میں ایک تیکھا پن تھا۔ پہلی نظم میں خیال اور تصورات کی نزاکت کے باوجود احساس میں ایک شدت تھی اور ساقی نامہ تو یکسر شدت سے لبریز تھا لیکن جنوری کے اضطراب میں ذوقی ایم اے ایک تھکن، ایک گریز کی کیفیت کا اظہار کر رہا ہے۔ "جھیل کے کنارے" جانے کی خواہش اس ہنگامے سے پیدا ہوئی ہے جو ہمارے موجودہ شہری ماحول میں اعصاب پر ایک مہلک اثر ڈالتا ہے۔ اسی لئے اس نظم کا شاعر ایک پُرسکون ماحول کی جستجو میں ہے۔ اور یہ جستجو آخر میں جا کر اس قدر گہری ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ہمدم کے ساتھ انسان کے تخیل کی حد سے بھی پرے جا پہنچنا چاہتا ہے۔

تمام نظم میں الفاظ کی صوتی نزاکت اور تصورات کی نفاست جہاں شاعر کی انفرادیت کو نشوونما دیتی ہے وہاں اُس تھکن کا اظہار بھی کر رہی ہے اُس گریز کی چغلی بھی کھا رہی ہے جو شاعر کے پیشِ نظر ہے۔ مفہوم میں شروع سے آخر تک جو تسلسل اور باقاعدگی ہے وہ اُس یقینِ محکم کی دلیل ہے کہ شاعر کا ذہن ایک نقطے پر قائم ہے تصورات کی حرکت بھی اس نقطے کی ترجمانی میں حارج نہیں ہوتی ہم شاعر کے ساتھ ساتھ ایک نرمی سے بہتے جاتے ہیں اور اُس خیالی جنت میں جا پہنچتے ہیں جس کا تصور شاعر کو تسکین دہ محسوس ہو رہا ہے۔ اس نظم کے تصورات کی نرمی اُس صورت میں اور بھی بڑھ جاتی ہے اگر ہم سب سے پہلے اُس ناگوار اور تھکا دینے والے ماحول کو اپنی ذہنی گرفت میں لے آئیں جو شاعر کو اس دُور کی جنت میں جانے کے لئے مجبور کر رہا ہے۔

جھیل کے کنارے

کل صبح کو اے دوست دبے پاؤں یہاں سے
چپکے سے نکل جائیں کسی کو نہ خبر ہو
بستی سے نکل کر کسی رستے کو سدھاریں
چلتی ہوئی تھم تھم کے جہاں بادِ سحر ہو
مہکے ہوئے جنگل پہ ابھی نیند ہو طاری
ہر چیز پہ کچھ خواب کے جادو کا اثر ہو
آسودہ ہنوز اپنے نشیمن میں ہوں طائر
جاتی ہوئی کچھ رات ہو کچھ نورِ سحر ہو
[illegible]

سویا ہوا سبزہ بھی ابھی اوس میں تر ہو۔
نم گھاس پہ ہم دونوں کے قدموں کے نشاں سے
لہرائی ہوئی دُور تک اک راہ گذر ہو
جس کُنج میں یہ راہ گذر ختم ہو جا کر
فردوس کی اک جھیل وہاں پیشِ نظر ہو

(۲)

ہنستی ہوں مچلتی ہوئی، گاتی ہوئی لہریں
لہروں میں طرحدار کنول جھوم رہے ہوں
پانی پہ ہوں سرخاب کے اڑتے ہوئے جوڑے
لڑتی ہوئی بزکل ہیں خوش اندام جیسے ہوں
گونجیں کبھی اُس پار کلنگوں کی صدائیں
جھاڑی میں ادھر مور کہیں ناچ رہے ہوں
اور دور، بہت دور، فسوں رنگ اُفق پر
پرواز میں بھٹکی ہوئی قازوں کے پرے ہوں
پیروں تلے نوخیز، ہری دوب بچھی ہو
اور دوب میں تاروں کی طرح پھول کھلے ہوں
جب چاہیں، جہاں چاہیں کبھی دوب پہ لوٹیں
چپ چاپ کبھی پھولوں کے جھرمٹ میں پڑے ہوں
سنسار کے دکھ درد سے آزاد ہوں دونوں
انساں کے تخیّل کی پہنچ سے بھی پرے ہوں
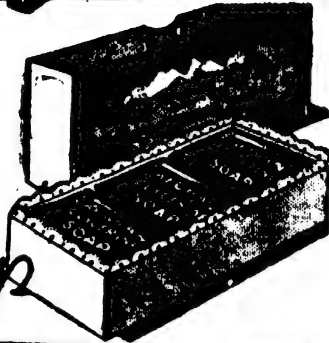
نئی نفسیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ جنسی تسکین کی غیر موجودگی انسان کو مناظرِ فطرت کی طرف مائل کر دیتی ہے اور اس لئے وہ "نیچرل" شاعری کو بھی عام خیال کے برعکس نوعی چیز ہی کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی یہ نظم قابلِ غور ہے اگر چہ اس میں خیالی جنت یعنی جھیل کے کنارے پر ایک ہمدم کا ساتھ اُس کی نوعی حیثیت کی واضح دلیل ہے لیکن اگر ہم نئی نفسیات کے استعاروں کی زبان کے لحاظ سے بھی دیکھیں تو کئی سراغ ہمیں اس جنسی نوعیت کے سلسلے میں ملیں گے جھیل، طیور کی پرواز اور بہت سی اور باتیں نفسی استعارے ہیں۔ نظم سے ظاہر ہے کہ شاعر کا نفسِ شعوری نوعی لحاظ سے غیر مطمئن ہے، اور اس بے اطمینان کیفیت کو شہری ماحول کے بیزار کن تاثر نے اور بھی بڑھا دیا ہے۔ اور اسی لئے اب اس کا نفسِ غیر شعوری نفسیاتی استعاروں کی زبان میں اپنی دبی ہوئی خواہشات

نقد و نظر

خنداں اور دوسرے مضامین

از پروفیسر رشید احمد صدیقی

حجم تین سو اکیاسی صفحات۔ قیمت عہ۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

یہ ایک پرانے جادوگر کے نئے شعبدوں (اقوا شبدوں!) کی کتاب ہے جس میں یہ فقط منتر تھے جن کو آل انڈیا ریڈیو والے تسخیر قلوب کے لئے پاٹ کرایا کرتے تھے۔ اگر کسی کو جادوگری سے انحراف ہے تو وہ غرض ناشر کے لکھنے والے سے بحث لے فن کتب سازی کے لحاظ سے اس کتاب کا کوئی درجہ نہیں۔ کتابت اکثر جگہ غلط ہے۔ کاغذ معمولی، فقط جلد مضبوط ہے۔

رشید نے خود اسی کتاب میں لکھا ہے "میں نے اس سلسلے میں آپ کو کچھ باتیں سنائیں جو بظاہر صرف لطیفہ معلوم ہوتی ہیں لیکن لطیفہ بجائے خود زندگی کے بعض تلخ حقائق کی صرف ایک دلچسپ تعبیر ہوتا ہے" ——— لطیفے کی یہ تعریف درست ہے۔ اردو میں "ہیومر" اور "وِٹ" کی بہت کم تخصیص ہے۔ یوں تو انگریزی میں بھی یہ دونوں کچھ ایسے گھلے ملے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنا دشوار ہے مگر اردو میں دونوں کو ایک ہی نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر ان دونوں سے بالکل الگ طنز بھی ایک چیز ہے۔ ہیومر اور وٹ میں "تبسم" ایک ضروری عنصر ہے۔ خواہ فقط تبسم مقصود ہو یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی۔ مگر طنز کے لئے تبسم قطعاً ضروری نہیں ——— یہ اور بات ہے کہ بعض باوصف اصحاب ہیومر، وٹ اور طنز تینوں کو اس عمدگی سے یکجا کر دیتے ہیں کہ ہنسی بھی آتی ہے چبھن بھی ہوتی ہے۔ اور بات سے انکار بھی نہیں ہو سکتا کیلے کے چھلکے پر کوئی شخص پھسل جائے تو ہنسی آتی ہے لیکن اس واقعہ کو لباس تحریر میں ادا کرنا کوئی خوبی نہیں رکھتا۔ اس پر قہقہہ لگایا جاتا ہے۔ مگر اس کی بساط قہقہے تک ہی ہے ——— حباب آسا! اردو میں اس وقت دو مصنف ایسے ہیں جو مغربی اصول سے صحیح ہیومر، وٹ اور طنز کے مالک ہیں۔ پطرس اور رشید۔ اول الذکر کی حیثیت بہت بلند ہے۔ مگر تحریر پر مغربیت کا اثر غالب ہے۔ اور اکثر یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ پطرس مغربی لکھنے والوں کو اپنا رہا ہے۔ رشید میں یہ بات اس کو خامی نہیں کہا جا سکتا نہیں ہے مگر رشید کے ہاں ایک زبردست نقص یہ ہے کہ وہ ذاتی رنگ میں لکھتا ہے۔ واحد متکلم کا اگر اس قدر رشیدائی نہ ہوتا تو رشید کا آرٹ بہت بلند پایہ ہو جاتا ہے۔ واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرنا بعض جگہ اور بعض قسم کے ادب کے لئے ضروری ہوتا ہے مگر ہر جگہ بلا تخصیص استعمال سے اکثر اچھا مضمون بھی آرٹ سے گر جاتا ہے۔ آرٹسٹ کا کمال یہ ہے کہ بقول ٹالسٹائی وہ اپنے شاہکاروں سے اپنے آپ کو غائب کر دے یعنی صیغہ غائب کی طرف مائل ہو!

لیکن اردو کے بہت سے مزاح نگاروں سے پہلے رشید اس طرز نگارش کو اختیار کر چکا تھا۔ اور غالباً حقیقت یہ ہے کہ اس کے پیرووں نے اس طرز نگارش کو بدنام کر دیا ہے۔ ورنہ اس کی جاذبیت میں شک نہیں۔ لکھنے والے اور پڑھنے والے میں براہ راست تعلق اسی سے پیدا ہوتا ہے۔ گویا لکھنے والا لکھتا نہیں کہتا ہے۔ یا پڑھتا ہے۔ اور پڑھنے والا پڑھتا نہیں فقط سنتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے خنداں بہت عمدہ کتاب ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کے مضامین پڑھنے کے لئے نہیں سننے کے لئے لکھے گئے تھے اور ریڈیو پر نشر ہوئے تھے۔ اس لئے ذاتیت کا اعتراض کچھ زیادہ اصلیت نہیں رکھتا۔ اگرچہ یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ رشید ذاتیات کا پیرایہ ترک کر دیں تو اردو ادب پر یقیناً احسان ہوگا۔

——— تو لطیفہ بعض تلخ حقائق کی دلچسپ تعبیر ہوتا ہے۔ اسی لئے خنداں ایک دلچسپ اور کامیاب کتاب ہے بعض حضرات کی رائے میں رشید "پھسپھسا" لکھتے ہیں۔ مجھ کو اس سے اختلاف ہے۔ ہر فقرے کا ادبی طور پر چسپاں ہونا ضروری نہیں۔ مصنف کا یہ فرض نہیں کہ جو بات لکھے وہ ہنسانے والی ہو۔ آرٹ کا تقاضا فقط اتنا ہے کہ چیز خوبصورت ہو اور دلچسپ۔ خنداں میں کہیں کہیں خوب صورتی نظر انداز ہو گئی ہے مگر دلچسپی ہر جگہ ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ دلچسپی کے لئے ہنسانے کی کوئی شرط نہیں۔ اکثر اصحاب خنداں کو مضامین رشید کے مقابلے میں ہیچ سمجھتے ہیں۔ اس میں بھی انصاف نہیں معلوم ہوتا۔ مضامین رشید کو البتہ "آمد میں آورد" کا امتیازی درجہ حاصل ہے مگر ہر مضمون ذاتیت کا سا غر ہے اور اس درجہ کہ دوست احباب کے ناموں تک سے گریز نہیں کیا گیا۔ اور سلسلے کے لحاظ سے بھی مضامین رشید خنداں سے کہیں زیادہ بے ربط اور قطعہ قطعہ اندا ختہ ہے۔ طوالت میں بھی مضامین رشید شیطان کی آنت ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ناشر صاحب نے

جن مجبوریوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ ایسی ہیں کہ ان سے کامیاب طریقے پر نپٹنا آسان نہیں اور خنداں کی یہ فضیلت ہے کہ وہ ان مجبوریوں کے باوجود وجود میں آئی۔ سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ مزاحیہ انداز کی کتنی تقاریر اب تک ریڈیو پر ہوئیں اور کامیاب رہیں اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو میرا خیال ہے کہ رشید ضرور بازی لے جائے گا۔

کتاب کے پانچ حصے ہیں۔ ادھر ادھر کی، معروف اور غیر معروف ہستیاں نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا، چند خاکے اور طنزیات۔ آخر الذکر سب پر سبقت لے جاتا ہے اور خالص ادبی چیز ہے۔ ذاتیت کا عنصر بھی اس میں بہت ہی کم ہے۔ اگرچہ دوسرے حصوں میں بھی بہت سی کامیاب چیزیں ہیں مثلاً الکشن۔ الکشن کے موضوع کو رشید عدالتوں کے بیان سے شروع کرتا ہے اور ایک ایسی عدالت کی تصویر پیش کرتا ہے جو علم و عقل پر فیصلہ نہیں کرتی بلکہ اس اصول پر "کہ جو فریق چیخ پکار، گالی گلوچ، مار دھاڑ کے اعتبار سے چرب پڑ رہا ہے اسی کے موافق فیصلہ" دینا چاہیے" اس لئے کہ حق کی آواز کبھی دبائی نہیں جا سکتی" ——— بظاہر یہ لغویت ہے۔ عدالت کو الکشن سے یا الکشن کو عدالت سے کیا کام؟ اور رشید کے یہ کہہ دینے سے بھی کہ "یہ چیز (اصول) آج ساری دنیا میں پھیل گئی ہے اور اسی اصول پر دنیا میں انصاف کا کاروبار ہو رہا ہے جس میں خدا رکھے الکشن بھی شامل ہے" ـــ کوئی ربط قائم ہوتا نظر نہیں آتا مگر غور کی بات ہے "الکشن سوائے عدالت کے اور ہے کیا؟ اسی عدالت کے فیصلے پر آج کل حکومت قائم ہوتی ہے" اب کس قسم کی عدالت یہ الکشن ہے وہ مصنف وضاحت سے بیان کر چکا ہے۔ میرا خیال ہے الکشن پر کوئی اور مصنف اس باریک نکتہ سنجی سے کام نہ لیتا اور نہ اس کو ہی "بے ربط" بات سے شروع کرنے کا گردہ رکھتا۔

رشید کے نکتے باریک ہوتے ہیں مگر اس کا آرٹ باریک لکیروں کا حامل نہیں۔ اس کا قلم تاثریت کا قائل ہے۔ اجمالی خطوط سے تصویر کشی کی جاتی ہے جو نزدیک سے ناہموار نظر آتے ہیں بکھرے ہوئے سے رنگ سلسلے وار اور تصویر ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہوئے بھی ایک قالب میں ڈھلی ہوئی دکھائی دیتی ہے کبھی کبھی ایسے خط بھی آجاتے ہیں جو "داغ عیوب" یہ "ننگ وجود" ثابت ہوتے ہیں مثلاً

"حکمراں ہونہار۔ تاجر ہونہار۔ مذہبی ہونہار۔ گاؤں بڑھا ہونہار ..... صاحب ہونہار۔ خانساماں ہونہار۔ شاعر ہونہار۔ پروفیسر ہونہار۔ غرض دلی کی دکان چپل ہی چپل کی طرح ہونہار ہی ہونہار" ہونہاریت کی یہ بے پناہ تکرار ناقابل برداشت ہے ——— سننے میں پڑھنے سے بھی زیادہ!

یہ بھی قابل گرفت بات ہے کہ رشید نے افلاس زدہ بے کاری، مفلس شوہر اور روشن خیال بیوی کو ایک دفعہ اور ایک مضمون میں نہیں بلکہ صدہا بار لیا ہے۔ گو اس اعتبار سے کہ عوام اور بالخصوص ریڈیو سننے والے عوام کا حافظہ نہیں ہوتا اس کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے مگر اس زمانے میں افلاس زدہ بیکاری مفلسی اور روشن خیال عورت ایسے اہم موضوع ہیں کہ ان کا بار بار تذکرہ کرنا (آرٹ سے علیحدہ ہو کر) کچھ عیب نہیں رکھتا۔ یہاں ایک ذرا لطیف قسم کا اقتباس نامناسب نہ ہوگا۔

"لوگ جس ماحول میں رہتے سہتے ہیں۔ ان کی شکل بھی اسی ماحول جیسی ہو جاتی ہے۔ آپ نے تو دیکھا ہوگا اور دیکھنا تو درکنار بہت ممکن ہے یہ بات خود آپ ہی پر صادق آتی ہو کہ جو لوگ دنیا کی نجات کا باعث عورتوں کو سمجھتے ہیں یعنی عورتوں کے زیادہ ہمدرد ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر عورتوں سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں مطلب یہ کہ عورتوں کے زیادہ دلدادہ ہوتے ہیں مختصر یہ کہ زن مرید ہوتے ہیں ان کو غور سے دیکھئے تو ان میں نسوانی خواص۔ یا نسائی انداز یا...... یا..... یعنی کچھ عورت زدگی سی پائی جاتی ہے میرا مطلب یہ ہے کہ قدرے زن آبی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ کچھ یوں ہی سے ہو جاتے ہیں یہی حالت بعض عورتوں کی ہوتی ہے جو مردوں کا زیادہ احترام کرتی ہیں..... لیکن میں تفصیلات میں پڑنا نہیں چاہتا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ عورت تفصیل نہیں اجمال ہے اور بہت کچھ اس وجہ سے کہ عورتوں سے میں خود اتنا واقف نہیں جتنا شاید وہ مجھ سے بدظن ہوں۔ ایسی حالت میں احتیاط بہتر ہے کیونکہ بزرگوں نے کہا ہے:-

بترس از بلائے کہ زن درمیان است!"

میں سمجھتا ہوں مجھے بھی یہاں تفصیل میں نہ پڑنا چاہئے!

رشید کے انداز تحریر یا خنداں کے عیوب و محاسن کے متعلق مختصراً یہ لکھ دینا کافی ہے کہ یہ معاملہ ایکسپریس ٹرین کا سا ہے۔ خنداں ایک ایکسپریس ٹرین ہے جس کے کسی ڈبے میں ایک برتھ پر آپ اور دوسرے پر رشید صاحب متمکن ہیں۔ آپ ان کی شہرت اور قابلیت کے معترف ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ کسی دن لگے مسئلے پر ان کی رائے سے مستفید ہوں چنانچہ آپ ان سے وہ مسئلہ پوچھتے ہیں۔ ابھی آپ نے بات پوری نہ کی ہوگی کہ وہ آپ کو بٹوے میں سے پان پیش کریں گے۔ اور پیشتر اس کے کہ آپ پان کا شکریہ ادا کر سکیں وہ آپ کو کھڑکی کے باہر بھاگتے ہوئے مناظر کی طرف متوجہ کر دیں گے اور آپ کے منظر سے متاثر ہونے سے پہلے وہ آپ کو چھوڑ کسی اور ہمراہی پر فقرہ کس دیں گے اور داد چاہیں گے۔ اگر ہمراہی صاحب ذوق نہ ہو۔ اور تنگ آمد بجنگ آمد کی طرف پلٹا تو یہ شعر پڑھ کر پیچھا چھڑا لیں گے۔ اتنے میں اسٹیشن آ جائے گا۔ اور یہ فوراً اتر پڑیں گے اور انواع و اقسام کی بے کار اشیا خرید لائیں گے گاڑی کے چلتے ہی یہ آپ کے موضوع کو دہرانے کے بہانے ان تازہ خرید اشیا کے خواص گنوانے لگیں گے۔ اب تک آپ لحاظ کے مارے چپ بیٹھے تھے مگر اب آپ کا پیمانۂ صبر

لبریز ہو جائے گا۔ اور آپ کہنے لگیں گے کہ حضرت وہ بات جو آپ نے کہی تھی ... مگر آپ کے لب ہلنے سے پہلے رشید آپ سے وقت دریافت کرنے لگتے ہیں۔ اور گھڑی نکالنے سے پہلے وہ ڈبے کے کسی حصے میں غائب ہو جائیں گے۔ اسی اثنا میں آپ کی منزل مقصود بھی آپہنچی ہے۔ اور آپ ڈبے کو خیرباد کہتے ہیں۔ مگر رات کی تاریکی میں جب آپ آرام و عافیت کی بے خودی سے جویا ہوں اور آپ کی روشن خیال نصف بہتر سفر کے متعلق غلطی سے پوچھ بیٹھیں تو رشید کی سخن طرازی اور حرکات و سکنات کا جائزہ لینے پر آپ مجبور ہوں گے کہ نیک بخت کو یہی جواب دیں کہ سفر عمدہ کٹا! اور یہی نہیں جب ٹھنڈے دل اور روشن دماغ کے ساتھ آپ اس مسئلے پر جو آپ نے رشید سے پوچھا تھا غور کرنے لگتے ہیں اور رشید کی باتیں یاد کرتے ہیں تو یہ راز بھی افشا ہوتا ہے کہ رشید اس مسئلے پر بعض اہم باتیں بھی آپ کو بتا گیا!

خنداں کی بعض "چیزیں" مجھے بہت پسند ہیں مثلاً "ہوٹل میں ریڈیو" "عاشق" "شاعر ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟" "باغ" "احمق کی جنت" "ملاح"۔

نامناسب نہ ہوگا اگر چند اقتباسات پیش کر دیئے جائیں۔ شاعر کی حیثیت اردو ادب میں اس وقت تک بہت کچھ ہے ...... اور بہت کچھ رہے گی۔ رشید کہتا ہے:-

"شاعر کا سارا کھیل الفاظ سے ہے۔ اس کھیل کو ہمارے شعراء نے اتنا کھیلا ہے کہ اب الفاظ میں وہ باتیں پیدا ہو گئی ہیں جو کبھی معنی میں نہیں تھیں۔ پہلے معنی کے لئے الفاظ کی تلاش تھی۔ اب الفاظ تلاش کر لیجئے معنی خود بخود پیدا ہو جائیں گے۔ کبھی معنی کے لئے سرگرداں رہتے تھے۔ بڑی ریاضت، بڑی مشقت کے بعد معنی تک رسائی ہوتی تھی۔ اب الفاظ ہی سب کچھ ہیں۔ ان کو اِدھر اُدھر کرتے رہئے ہر قسم کے معنی نکلتے رہیں گے اور جو نہ رہیں گے ان کو سامعین پورا کر دیں گے۔"

"آج کل کے بیشتر شاعروں کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ انھیں صرف "الفاظ" یاد ہیں جن کو وہ جس طرح چاہتے ہیں ترتیب دیتے ہیں بعض حالتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جب بحروں اور ترکیبوں کے پیچ پر خود بخود الفاظ آجاتے ہیں جن کے لانے میں شاعر کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا یعنی تو سامعین کی شعریت خود ہی پیدا کر دیتی ہے۔ شاعر کا فرض صرف الفاظ کی ترتیب و بندش ہی نہیں ہے اور نہ صرف وہ خیالات ہیں جن کی وہ الفاظ ترجمانی کرتے ہیں۔ سننے والوں میں شاعر بھی موجود ہوتا ہے۔"

لباس نظم میں بالیدن مضمون عالی کے متعلق:-

"شفق سے عبیر اور سپیدۂ سحر سے کافور اڑاتا۔ چاند سورج سے ضیا لے محبوب کی سیر کرتا۔ ثریا کی مانگ سے افشاں چراتا۔ زہرہ کی تان اڑاتا۔ مریخ سے جھگڑتا۔ قاضیٔ فلک سے گپ شپ کرتا۔ اوس سے مسکراتا۔ فرشتوں سے آنکھ ملاتا۔ حوروں کو ورغلاتا۔ رضواں سے لڑتا۔ مالک سے کتراتا۔ قلم سے لکھتا۔ لوح کو پڑھتا۔ طوبیٰ و سدرہ پر جھولتا۔ کوثر و تسنیم میں ڈبکیاں لگاتا۔ جبرئیل کو صید زبوں بناتا۔ اسرافیل سے سرگوشیاں کرتا۔ میکائیل سے رخ بدلتا۔ عزرائیل سے بچتا۔ پرتو خور سے شبنم کو فنا کی تعلیم دیتا۔ یکلخت پاتال پہنچ جاتا ہے۔ وہاں کبھی خاک سے پوچھتا ہے کہ اے لئیم تو نے وہ گنج گراں مایہ کیا کئے۔ لالہ و گل میں نمایاں ہونے سے جو صورتیں بچ رہی تھیں ان سے آداب و تسلیمات کرتا۔ قارون نے راستہ میں جو خزانہ لٹایا تھا اسے ٹھکراتا۔ کسی سوختہ سامان کو فلس ماہی سے شمع روشن کرنے کی ایت دیتا۔ بحر موج میں جو صد حلقہ کام نہنگ ہیں ان میں قطرہ کو گہر بنتے یا بگڑتے دیکھتا۔ عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کرتا۔ ساحل کو سفینہ۔ اور سفینہ کو ساحل سمجھ اور دونوں کو سبک ساران ساحل سے ٹکراتا۔ اس دنیا میں آجاتا ہے جہاں اس کی غزل تیار ہو رہی ہے۔ اور بیوی بچے فاقہ کر رہے ہیں۔"

اردو شاعری میں حسن و عشق کا پہلو جس قدر روشن ہے۔ اس سے بھی زیادہ اس میں عاشق و محبوب کی آن بان ہے۔ اردو کی نئی شاعری میں عاشق و معشوق ابھی ایک مبہم ہستی ہیں۔ انھوں نے نہ ابھی تک فوٹو اتروائے ہیں۔ اور نہ اپنے ملاقاتی کارڈ چھپوا لئے ہیں۔ اس لئے شاید رشید ان سے ملاقات نہ کر سکے اور فقط اگلے شاعروں کے عاشق معشوق پر اکتفا کی۔ لکھتے ہیں:-

"اردو شاعری میں عاشق کے کارٹون بکثرت ملتے ہیں۔ مثلاً لاغر ہوتے ہوتے شکن بستر ہو جانا یا سوکھ کر چلمن کی تیلی بن جانا جس کی وجہ سے پردے کے مقاصد نہ پورے ہوتے ہوں۔ ناتوانی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ دم عیسیٰ بھی پیام مرگ ثابت ہوتا ہے پھر یہ بھی ہے کہ عاشق کے سارے اعضا اسکرو پر ہوتے ہیں جس کے جی میں آتا ہے اڑا لے جاتا ہے۔ اور یہ زندہ رہتے ہیں شراب پینے میں ان کا ثانی نہیں۔ مر کے جی اٹھنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل جو منہ میں آئے کہہ جائیں اور جہاں جی چاہے مار کھا جائیں۔ ہر قسم کے مرض میں مبتلا ہیں گے اور ہر جگہ موجود رہنے پر اصرار کریں گے۔"

"غور تو فرمائیے۔ خط بڑھا ہوا۔ ہر قسم کے متعدی مرض میں مبتلا دامن کے چاک میں اور گریبان کے چاک میں کوئی فاصلہ باقی نہیں

منہ سے وہ بھبکے نکلتے ہیں کہ نکیرین بھاگ جائیں۔ تن بدن لہو لہان بغل میں لپٹا ہوا لبتر۔ خاک بسر۔ آنکھوں میں کیچڑ۔ پیچھے پیچھے رقیب ناصح محتسب اور رپ وان ونکل کی ذریات کا ہجوم۔ آخر اس قسم کی متحرک میونسپلٹی کو کوئی شریف آدمی اپنے قریب کیوں آنے دے؟ لگتے ہاتھ ذرا محبوب کی محفل سے بھی روشناس ہونا ضروری ہے۔

"آپ کو محبوب کے سلح خانے میں مژگاں کے تیر۔ ابرو کی کمان نگاہ کی شرر باری تبسم کی برق پاشی۔ خرام کی حشر انگیزی اور معلوم نہیں کس کس کی اور کیا کیا چیزیں ملیں گی! توشہ خانہ کی سیر کیجئے تو دانتوں کے موتی۔ لبوں کے عقیق۔ خط کا زمرد۔ گردن کی صراحی۔ عارض کا مصحف۔ تل کے سپند۔ آنکھوں کے مے خانے۔ پروانوں کی خاکستر پیشانی کی بیاض۔ بغل کے فتنے۔ دہن کا عنقا۔ افشاں کے ستارے مانگ کی کہکشاں۔ چاہ زنخداں۔ ید بیضا۔ مو کمر۔ مہرۂ افعی۔ دود آہ اعجاز مسیح۔ متاع کنعاں۔ خواب زلیخا۔ نامۂ خوں چکاں ملے گا۔ پائیں باغ میں گزر ہو تو زلفوں کے سنبل۔ زبان کی سوسن۔ قد کا سرو شمشاد کی سولی۔ نرگس کی آنکھ۔ لالہ کا جگر۔ شبنم کا گریہ۔ قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ، پھولا ہوا الٹھاک۔ اور جلا ہوا ساکھو ملے گا۔ حریم محبوب کے گرد جو حصار ہے۔ اس میں ساحل سمندر۔ کام نہنگ۔ سراب۔ بگولے۔ خار مغیلاں بہ زنہ صحرا دستگاہ۔ وقطرۂ دریا آشنا" سنگ آستاں۔ آئینۂ حیرت۔ طور سینا۔ میدان حشر کی پوری سیجنو لائن کا نقشہ نظر آ جائے گا۔ جن کے اندر۔ باہر ادپر نیچے۔ دربان۔ کتے۔ رقیب۔ ناصح۔ واعظ۔ محتسب۔ شحنہ اور بوالہوس اپنے اپنے فرائض انجام دیتے ملیں گے"۔

سب باتوں کے باوجود کتاب دلچسپ ہے۔ اور دلچسپی ایسی چیز ہے۔ جو اکثر نقائص کا رد ہوتی ہے۔ آخر میں یہ بھی لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ادب ایسی چیز نہیں جس کے متعلق یہ کہا جائے "جی چاہے لیجئے۔ جی چاہے نہ لیجئے"۔ رشید صاحب بہت کچھ خدمت کر سکتے ہیں۔ مضامین رشید اور خنداں عام شہرت کے لئے کافی ضرور ہیں۔ مگر دونوں ہرگز غیر معمولی کتابیں نہیں ہیں۔ اور اردو ادب کو غیر معمولی کتابوں کی بہت ضرورت ہے۔ بالخصوص مزاح نگاری میں ہمیں رشید صاحب سے ابھی بہت کچھ توقعات ہیں۔ اور امید ہے یہ توقعات دام امید ہی میں ہمیشہ نہیں رہیں گی۔

جمیل احمد ناخدا

(اس شمارے کے تمام مضامین نظم و نثر کے جملہ حقوق محفوظ ہیں)

ڈاک کے ڈاکو ادبی دنیا ہر ماہ کی ۲۰ تاریخ تک خریداروں کے پاس پہنچ جاتا ہے اگر اس تاریخ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقے کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں تاکہ پرچہ آپ کو دوبارہ بھیجا جائے اور محکمۂ ڈاک کے دروازے پر ایک اور دستک دی جائے ۔ مینیجر

فہرستِ مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہِ اپریل سنہ ۱۹۴۱ء

جلد ۱۹ تصویر: رقاصہ! اُٹھ سرودِ خراماں سنا مجھے **نمبر ۴**

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

[illegible]

دنیائے کاروبار

پاٹن والا لمیٹڈ کا گلیسرین سوپ

ہندوستان میں جوں جوں تعلیم مردوں سے نکل کر عورتوں میں عام ہوتی جا رہی ہے توں توں بناؤ سنگار اور جسمانی رکھ رکھاؤ میں نئے نئے سلیقے دریافت ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں شاید بہت کم خواتین توجہ اور احتیاط سے اپنے برتنے کی چیزوں کا انتخاب کرتی ہیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جن خطرات سے بچنے کے لئے وہ یہ چیزیں استعمال کرتی ہیں اُن سے چھٹکارا نہیں حاصل کر سکتیں پاٹن والا کی افغان سنو اور افغان کریم اس سلسلے میں ہمارے ملک کی خواتین کی بہت زیادہ خدمت کر چکی ہیں۔ ان دونوں زینت کی چیزوں کے علاوہ ان کا گلیسرین سوپ مغرب کی تیار شدہ اشیاء کے مقابلے میں تیار کیا گیا ہے جو کسی صورت میں بھی بیرونی چیزوں سے کم نہیں ہے۔ یہ جلد کو ملائم اور ستھرا رکھتا ہے اور اس کے استعمال سے جلد ہمیشہ پُر شباب اور مخمل کی طرح ملائم رہتی ہے۔ ہندوستانی صنعتوں کو فروغ دینے کے نقطۂ نظر سے بھی اس کا استعمال زیادہ سے زیادہ ہونا چاہئے۔

لٹن واچ کمپنی

وقت کے متعلق حکیم آئن سٹائن کا نظریہ حال ہی کی دریافتِ علمی ہے ان کے خیال میں وقت انسانی ذہن کی رفتار کا نام ہے۔ لیکن انسانی ذہن بھی اپنی رفتار کو باقاعدہ رکھنے کے لئے بعض مشینوں کا محتاج ہے ظاہر ہے کہ ایسی مشینیں جس قدر عمدہ، باقاعدہ اور پائدار ہوں گی اسی قدر انسانی ذہن بھی عمدگی اور باقاعدگی کے ساتھ اپنے تمام کاموں کو سر انجام دے سکے گا۔ آج کل نقل اور سطح بینی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہو گئی ہے اور اس لئے لوگ زندگی کے اس پہلو کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ اچھی گھڑیوں کی پہچان کا بہترین اور آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ اچھی گھڑیاں بنانے والوں کا نام معلوم کر لیا جائے اس لحاظ سے لٹن واچ کمپنی کا نام ہندوستان میں ایک ایسی اہمیت رکھتا ہے جس کی آزمائش اکثر اربابِ وطن کر چکے ہیں۔ وقت سے پیچھے رہ کر زندگی کو ناکام بنانے والے حضرات کو جلد سے جلد ان گھڑیوں کی طرف رجوع کر کے ایک قومی خدمت انجام دینا چاہئے کیونکہ فرد ہی کے اجتماع کا نام ملک و قوم ہے۔

زن۔ زر۔ زمین

حروفِ ہجا کا یہ حرف جس کے اوپر کے تین الفاظ شروع ہوتے ہیں، آغاز عالم سے تاریخ انسانی میں ایک نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن ان الفاظ کی اہمیت ہمیں جوانی کے بعد ہی محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ جوں جوں زندگی کی گہرائیوں اور اُلجھنوں میں ہم داخل ہوتے جاتے ہیں توں توں ہماری ضروریات بڑھتی جاتی اور نئے سے نیا رنگ پکڑتی جاتی ہیں۔ یہ بات نہ صرف انفرادی طور پر صحیح ہے بلکہ اجتماعی طور پر بھی اس میں بہت سچائی موجود ہے۔ پہلے دنیا کی آبادی کم تھی۔ اس لئے انسانی ضروریات بھی کم ہی تھیں۔ آبادی کے اضافے کے ساتھ ساتھ جہاں زندگی کی رفتار تیز ہوئی وہیں ضروریات کے جال نے بھی پھیلنا شروع کیا اور ان بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے والے لوگ بھی پیدا ہو گئے۔

میسرز امریکن پی کمپنی پی اوبکس ۷۲ ایم ایل امرت سر، بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ہیں۔ انہوں نے پرانے سونے کی کمی اور سونے کی بڑھتی ہوئی مانگ کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک نئی دھات ایجاد کی ہے جو رنگت اور دلکشی میں پرانے سونے سے کسی طرح کم نہیں، بلکہ کسوٹی پر بھی اصلی سونے کا رنگ دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی قیمت اس قدر کم (یعنی دو روپے تولہ) ہے کہ ہر شخص اسے حاصل کر سکتا ہے۔ امید ہے کہ میسرز امریکن پی کمپنی کی اس ملکی خدمت سے تمام اصحاب خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے۔

"ہرجائی"

دنیائے فلم

سنہ ۱۹۴۷ء کی بہترین فلم

بنگال فلم جرنلسٹس ایسوسی ایشن صوبہ بنگال کے تمام فلمی پریس کی نمائندہ جماعت ہے۔ حال ہی میں ان کا سالانہ اجلاس اس غرض سے منعقد ہوا کہ وہ ملکی اور غیر ملکی فلموں میں سے سال رواں کی بہترین فلم کا انتخاب کریں۔ جہاں تک ملکی فلموں کا تعلق ہے اُن کے انتخاب سے ڈائرکٹر محبوب کے تیار کردہ فلم "عورت" کو بہترین سمجھا جا سکتا ہے۔ باقی انتخاب میں سے پہلے دس بہترین کھیلوں کا نقشہ مراتب ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ عورت (نیشنل سٹوڈیوز)	۲۱۳	رائیں
۲۔ ڈاکٹر (نیو تھیٹرز) (بنگالی زبان میں)	۱۵۹	"
۳۔ بندھن (بمبئی ٹاکیز)	۱۴۲	"
۴۔ زندگی (نیو تھیٹرز)	۱۳۹	"
۵۔ کنگن (بمبئی ٹاکیز)	۱۱۲	"
۶۔ سنت گیانیشور (پربھات فلمز)	۹۲	"
۷۔ پریچئے (نیو تھیٹرز) (بنگالی زبان میں)	۶۵	"
۸۔ بھروسہ (منروا مووی ٹون)	۴۹	"
۹۔ شکنتلا (فلم پروڈیوسرز)	۴۲	"
۱۰۔ ٹھیکیدار (بھارت لکشمی پکچرز) (قیدی) (فلم کارپوریشن آف انڈیا)	۳۳	"

رادھیکا

رادھیکا نیشنل سٹوڈیوز کا نیا کھیل ہے جس میں ہرش، جیوتی اور رشنا لیلی دیوی کے علاوہ ایک نیا چہرہ پیش کیا گیا ہے جس کی دلکشی کے لئے کھیل کے ڈائرکٹر جناب دیریندر ڈیسائی قابلِ تعریف ہیں۔ اس نئے چہرے کا نام نلنی جیونت ہے۔

کھیل کا قصہ عقیدت کی ایک داستان ہے، اور اس عقیدت کے افسانے میں ہیروئن یعنی رادھیکا کو جن دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ اپنی ڈرامائی خصوصیتوں کے لحاظ سے افسانے کی جان ہیں۔

نیشنل سٹوڈیوز کے کھیل اس سے پہلے اکثر پبلک سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اور امید ہے کہ یہ کھیل بھی ویسا ہی مقبول ہوگا۔

لگن

لگن کے گانے شاعر آرزو نے لکھے ہیں ایک گیت میں ایک معنی خیز مصرع آتا ہے "گھاٹ کا پتھر ہل نہیں سکتا لاکھ تھپیڑے کھائے"۔ نیو تھیٹرز کی حالت بھی ایک طرح سے اس پتھر ہی کی سی ہے۔ اگرچہ معنوی لحاظ سے بھی آغاز ہی سے نیو تھیٹرز کی فلمی کارگذاریاں ہندوستانی صنعتِ فلم کو ساحلِ مراد ہی کی طرف لے جاتی رہی ہیں۔ پھر بھی زمانے کے انقلابات کے باوجود آج بھی کلکتے کی اس کمپنی کا ریکارڈ ملکی صنعت کے کانلسوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کا تازہ ترین کھیل "لگن" بھی اس حقیقت کی شہادت دے سکتا ہے۔ اس کھیل کا قصہ ہماری جدید معاشرت کا ہے۔ اور ڈائرکٹر نتین بوس نے تعلیم اور عکاسی میں حسبِ معمول اپنے کمال کا جوہر دکھایا ہے۔ موسیقی کی دلکشی کے لئے ہندوستانی پردۂ سیمیں کی موسیقی کا مشہور جیتا آرسی بورال اس کھیل کی خوبیوں کا ذمہ دار ہے۔ اُس کے موسیقانہ ذہن کی لہریں اس میں اپنی روائتی اثر انگیزی کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ تو ہوئی فنی پہلو کی وضاحت۔ اس کے علاوہ اداکاروں میں بھی ایک قابلِ تعریف اجتماع دکھائی دے رہا ہے۔ کانن بالا کا میٹھا گلا اور دلکش شخصیت پوری صحت کے ساتھ جنت نظر اور فردوس گوش بن رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی سہگل ہیرو کی حیثیت سے فردوس گوش کو صد فردوس گوش بنا رہا ہے۔ کردار نگاری کے پہلو میں ہندوستان کا مشہور ایکٹر نواب کاشمیری رجر غالباً ہیروئن کے علاوہ ہر پارٹ کو ادا کر سکتا ہے اور کر چکا ہے، نمایاں نظر آتا ہے اور اسی کے پہلو بہ پہلو وہ دلآویز شخصیت بھی ایک نئے انداز میں موجود ہے جسے پبلک نیمو کے مختصر نام سے جانتی ہے لیکن جو بذاتِ خود کچھ خاص مختصر نہیں ہے۔ ان دو ماہرین کے ساتھ ہی جگدیش بھی اپنی روائتی مہارت میں اضافہ کر رہا ہے۔

امید ہے کہ یہ کھیل کافی سے زیادہ قبولیت حاصل کر سکے گا کیونکہ جس طرح لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں لیکن یہ دنیا کی محفل سجی قائم ہے اس طرح یہی کہا جا سکتا ہے کہ اداکار آتے ہیں اور جاتے رہتے ہیں لیکن نیو تھیٹرز جیسا تون قائم دکھائی دے رہا ہے

بہرحال جادُو!

بزمِ ادب

سر شاہ محمد سلیمان کی وفات اس سال کا علمی حادثہ ہے۔ مرحوم جہاں قانون ریاضی اور علم الافلاک میں اجتہادی درجہ رکھتے تھے، وہاں اپنے ذوقِ علم و ادب کے اعتبار سے بھی ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ ادبی دنیا سے انہیں ایک خاص محبت تھی اور اس کی زندگی کے دورِ جدید میں انہوں نے ایک سے زائد مرتبہ اپنے اس جذبے کا اظہار فرما کر ہمیں ممنون اور سرفراز فرمایا تھا۔

انتقال کے وقت مرحوم کی عمر صرف ۵۴ برس تھی۔ اور اس مختصر زندگی میں انہوں نے نہ صرف اپنے پیشے کی بلندترین منازل طے کر لی تھیں بلکہ علم و فن کی دنیا میں بھی وہ ایک غیر معمولی امتیاز اور کامیابی سے ہمکنار ہو چکے تھے۔ اور اس میں ذرہ بھر شک نہیں کہ اگر فلک انہیں کچھ اور مہلت دیتا تو وہ علم کے اس لازوال خزانے میں جو انسانیت کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے، بہت سے بیش قرار اضافوں کا موجب ہوتے۔

ہمیں اس حادثۂ جانکاہ میں تمام علمی دنیا سے دلی ہمدردی ہے۔

فروری کے شمارے میں ہم نے ناظرین سے درخواست کی تھی کہ وہ سالنامے کے بہترین علمی مضمون کے متعلق اپنی آراء سے ہمیں مستفید فرمائیں تاکہ منصور گولڈ میڈل کے استحقاق کا فیصلہ کیا جا سکے۔ افسوس ہے کہ ہماری اس درخواست پر اب تک بہت کم حضرات نے توجہ فرمائی ہے، کیا ہم امید رکھیں کہ اس ماہ کے دوران میں ہمیں آپ کی رائے موصول ہو جائے گی؟

شمارۂ زیرِ نظر میں جناب مالک رام ایم اے کا ایک نہایت بلند پایہ مضمون غالب کی مُہریں نظر افروز ہو رہا ہے۔ مالک رام غالب کے دیوانوں میں سے ہیں مگر بکارِ خویش خوب ہوشیار ہیں اور ان کا یہ مضمون ان کی فرزانگی کی ایک نہایت روشن دلیل ہے۔ انہوں نے مُہروں کے مختصر الفاظ اور تراکیب سے غالب کے نفسیاتی ارتقا کی مختلف کیفیات کو جس خوبی سے قلم بند کیا ہے وہ کچھ ان ہی کی ژرف نگاہی اور حسنِ تفکر کا حصہ ہے۔ اُدبا اور شعرا کی یادگاروں سے ان کے ذہنی اور فنی ارتقا کا تجزیہ ہمارے ہاں ایک بالکل نئی چیز ہے۔ فرانسیسی ادبیات کے بعض نقادوں نے البتہ اس قسم کے چند معرکے کے تجزیے کئے ہیں اور یہ ہمارے ادب کی خوش بختی ہے کہ یہ اس کم عمری میں تنقیدِ عالیہ کے ایسے تجربات سے آشنا ہو رہا ہے۔

اندر سبھا فن کے لحاظ سے ایک نہایت کامیاب افسانہ ہے، جسے چودھری محمد علی صاحب نے اپنے گہرے مشاہدات کے مخزن سے نکال کر آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ مرتی ہوئی نوجدار ن "گلفام" کا تاج سینے پر رکھ کر جو تسکین پاتی ہے اُسے انسانی تجربات کا ایک نادر ترین احساس کہا جا سکتا ہے جسے فن کار نے اپنے مشاہدے کی کمند میں نہایت چابکدستی سے اسیر کر لیا ہے۔

صاحبِ افسانہ کا حُسنِ بیان اور روزمرّہ افسانے کی معنوی خوبیوں کو اور بھی نمایاں کئے دیتا ہے۔ ہم چودھری صاحب سے متوقع ہیں کہ وہ اس سال اسی رنگ کے چند اور مطالعے بھی ہمیں عنایت فرمائیں گے۔

صلاح الدین احمد

---

(۲)

سالنامے کا اثر حصۂ نظم سے دور ہوا۔ چنانچہ اس دفعہ شعرا کا کلام وقت کی صحیح ترجمانی کر رہا ہے اور ہماری موجودہ زندگی کا اظہار ہے۔ زندگی سے بڑھ کر متنوع اور کیا بات ہو گی۔ اور اس لحاظ سے بھی اس شمارے کے شاعر رنگا رنگ بزم آرائیٔ خیال کی تکمیل کر رہے ہیں۔ عدم "جنگ" کے موضوع پر کچھ کہنا چاہتا ہے موضوع نند دیر ہے ــــ تحت سنگھ "چاندنی" کے جادو میں کھویا ہوا ہے۔ اس کا موضوع نرم و نازک ہے۔ میراجی رقاصہ کی دلکشی کا متوالا ہے، اور محمود جالندھری رقاصہ ہی کی ایک اور ہم پیشہ سے ملنے کو "گناہِ بے لذت" کا نام دیتا ہے۔ شاد عارفی گھریلو زندگی میں سرمایہ دارانہ ذہنیت کے خلاف پکار کر رہا ہے۔ اور مسعود شاہد کی پکار اے بسا آرزو کہ خاک شدہ کے ساتھ ساتھ دوست آں باشد کہ گیرد ..... کے ایک اور ہی پہلو کو گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے کے روپ میں پیشِ نظر کرنا چاہتا ہے، اور اور ان سب مختلف اجزا کے مقابل میں قیوم نظر کو تمام بنی آدم ہی کا جائزہ لیکن پہنچاتا ہے۔ آیئے ذرا زندگی کی ان تمام گلیوں کی الگ الگ سیر کریں۔

قیوم نظر نوعِ انسانی کو جنگل کے استعارے میں دیکھ رہا ہے۔ آج تک دنیا کی اس ناٹک سبھا میں ہزاروں نسلیں آئیں اور چلی گئیں۔ اگر کسی ناممکن قسم کے عمل سے یہ سب نسلیں یکدفعہ ہماری نگاہوں میں آ کر ایک ہجومِ محشر کا نقشہ لے آئیں تو یقیناً ذہن پر اس بے پناہ اجتماع کی ایک ہیبت سی طاری ہو جائے گی۔ نظم کا ماحول بھی اسی لئے ڈراؤنا ہے، زشت رُو ہے۔ اور اس ماحول کے بیان میں اداؤں کی نفاست بھی ہے۔ سلئے گھاس پر تیرگی پھیلاتے ہوئے محض ایک بات سے

لیکن مکمل تصویر سے ہم آہنگ اور نگاہ کے مختلف تاثرات کی ہم آہنگی ہی اس نظم کی سب سے بڑی خوبی ہے لیکن ایک بات کا خیال ضروری ہے شاعر نے صرف تاریک پہلو لیا ہے۔ اس سے پیشتر بہت سے لوگوں نے دنیا کو باغ بھی کہا ہے "یہ دنیا کہ سندر بگیا شوبھا جس کی نیاری ہے"۔ —— یہ بگیا والا تاثر شاید اُن بوڑھے سادھوؤں کا ہے جو اپنی طبیعت کی نرم و نازک اور عام عینک سے ہر شے کو دیکھنے کے عادی ہوتے تھے۔ آج کل کی خطروں اور اندیشوں سے بھری پوری دنیا کو ہمارا شاعر دھوپ کی نیلے پیلے، کالے مٹیالے شیشوں والی عینک سے دیکھ رہا ہے۔

مسعود شاہد کا موضوع ذاتی ہے۔ وہ احساسات کے ہنگامے میں ایک چھوٹی سی کہانی بیان کر رہا ہے۔ کہانی یہ ہے کہ دو دوست ہیں مرد۔ اُن کی زندگی میں ایک عورت کی آمد ہوتی ہے۔ اور اس دخل در معقولات سے نہ صرف انہیں ایک نئے جذبۂ عشق کا تجربہ ہوتا ہے بلکہ اس تلخ حقیقت کا احساس بھی کہ عورت کے سامنے مرد کی نظروں میں اور کسی بات کی اہمیت نہیں، دوستی بھی ایک پرِکاہ بن کر رہ جاتی ہے اس نظم میں کردار نگاری کہیں نہیں، لیکن اس کے باوجود ماحول کچھ اس ترتیب سے پیش ہوا ہے کہ تینوں کردار اپنی اپنی اہمیت کے لحاظ سے نمایاں ہو جاتے ہیں نظم کے شروع اور آخر میں منظر فطرت ایک ہی ہے لیکن ہیرو کی ذہنی کیفیتوں کے مطابق اس میں جو دورنگی پیدا ہوئی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ تمام نظم جذبات کی شدت کا ایک چھلکتا ہوا جام ہے۔ لیکن ایک عبرت کا مقام بھی کہ نہ صرف ایک عورت کے عشق میں دو مرد ناکام رہے بلکہ انہوں نے اس سلسلے میں اپنی باہمی دوستی کے آئینے کو بھی مکدر کیا۔ یہاں یہ باہمی دوستی بھی خیال رہے کہ میلانِ ہم جنسی کا درجہ رکھتی تھی —— ایک بلند اور نظم کے عنوان میں ایک دورخی ہے، عورت کے عشق میں ایک دوسرے کے رقیب دونوں مرد ہیں لیکن اُن کے باہمی تعلق میں ان دونوں کی رقیب وہ عورت بھی ہے۔

مخمور جالندھری کا ہیرو پرانے خیالات کے سائے میں پلا ہوا ہے اُسے سہارِ ضمیر، خونِ ضمیر، شرافت، ننگ و ناموس اور گناہ و ثواب کے تصورات تنگ کرتے رہے ہیں لیکن ان پرانے خیالات کے باوجود نئی ضروریات —— جذبات کی تشنگی اُسے اُس ماحول میں لے آئی ہے ایک اور اشارہ بھی ہے "ٹوٹی ہوئی آس" —— شاید اس نظم کا ہیرو کوئی ناکام عاشق ہے جو حسنِ اتفاق سے یہاں اس لئے آپہنچا ہے کہ کچھ عرصے کے لئے ایک جھوٹی تسکین عورت کی ہمدمی کی تسکین اُسے حاصل ہو سکے لیکن یہاں آکر اُسے اپنے مقصود کی بجائے لاشوں کا بیوپار دیکھنا پڑتا ہے۔ جس صدمے کے اثر کو وہ کم کرنا چاہتا تھا اُس کی کمی تو بجائے رہی ایک اور صدمے سے اُسے دوچار ہونا پڑا جس کی وجہ کچھ تو پرانے اخلاقی اصول ہیں، کچھ ماحول کی بیزاری اور کچھ اُس کی اپنی ناتجربہ کاری۔

شاید آپ کو کبھی یہ اتفاق ہوا ہو کہ کسی ملنے والے نے کہا کہ بھئی کوئی ملازم مل سکے تو بتانا۔ اور ایسے موقعے پر ایک ملازم عموماً اُن تلاش کرنے والے صاحب کے گھر میں کچھ عرصہ رہ کر جا چکی ہوتی ہے۔ شاد عارفی کی ملازمہ ایسی ہی ایک عورت ہے۔ لیکن اُس کی بُری حالت اور اُس کے مالکوں کے بُرے سلوک سے جو نتائج شاعر نے سرمایہ دارانہ نظام کے متعلق اخذ کئے ہیں وہ کچھ زیادہ مدلّل نہیں معلوم ہوتے بیان کے لحاظ سے نظم میں کافی سے زیادہ زور ہے لیکن جو ماحول پیدا ہوتا ہے اُسے کلیّہ نہیں کہا جا سکتا۔

"جنگ" اس وقت ساری دنیا کا موضوع ہے لیکن آدھی دنیا صرف اخباروں کے سچ جھوٹ تک ہی اس صورتِ حال کے متعلق بات چیت کرتی ہے۔ عبدالحمید عدم دوسری آدھی دنیا کا رہنے والا ہے، اُس کی ذہانت ایک فرد کی ذہانت ہے اور یہی انفرادیت اُس کے شعری اندازِ نظر کو لئے ہوئے اس نظم میں بھی جلوہ گر ہے۔ ہجوم جس دھارے پر جی چاہے بہتا جائے۔ عدم اپنے فیصلے سے اُسے آگاہ کر رہا ہے۔

"چاندنی" —— اس نظم کو سب سے آخر میں پڑھئے۔ یہ آپ کے ذہن کو اُس تھکان اور اُن بوجھل کیفیتوں سے نجات دے گی جو اوپر کی تمام نظموں کے مطالعے سے پیدا ہو گئی ہوں گی۔ تخت سنگھ کے کلام کی قریباً اکثر خصوصیات اس نظم میں موجود ہیں، تخیل اور تصورات کی نرمی، الفاظ کی نرمی، سادگی، سادگی میں کہیں کہیں شوخی۔

اگر ہم زندگی اور اپنے ماحول پر بھی نظر کریں تو موجودہ شمارے سے ایک مماثلت پائیں گے، زندگی میں اکثر بوجھل کیفیتیں ہی دکھائی دیتی ہیں۔ اور ان سے ہنگامی گریز اور تسکین حاصل کرنے کے لئے لامحالہ ہمیں مناظرِ قدرت ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

گئے مہینے اسی جگہ تصویر کے متعلق کچھ اشارتی عبارت درج تھی اس میں عنوان کے شعر کو غلطی سے اقبال کی بجائے غالب سے منسوب کر دیا گیا۔ معذرت کے طور پر یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں۔

میراجی

آئینۂ عالم

برطانیہ کا مشرقی محافظ

بحرِ ہند اور بحرالکاہل کے سنگم پر ایک شہر بین الاقوامی سیاست میں آج کل نمایاں اور اہم حیثیت کا مالک ہے۔ یہ شہر سنگاپور ہے، اسے مشرق میں برطانوی مفاد کا محافظ کہا جاتا ہے، اور یہ برطانیہ کی بری، بحری اور ہوائی طاقت کا بہت بڑا مرکز ہے۔

جہاں آج کل یہ شہر آباد ہے وہاں کسی زمانے میں دلدل ہی دلدل تھی ۱۸۱۹ء میں ملایا میں ایک برطانوی مدبر سر سٹمفورڈ ریفل آئے اور انہوں نے یہ دلدلیں حکومت ملایا سے خرید لیں اور آٹھ کروڑ پاؤنڈ کا سرمایہ لگا کر جنگلات اور دلدلیں صاف کر کے ان کی جگہ ایک نہایت مضبوط بحری اڈا بنایا جس کی بدولت آج کل سنگاپور کا شہر برطانوی طاقت کا بہت بڑا مرکز بن گیا ہے، آج کل یہ شہر دنیا کی ایک بہت بڑی تجارتی منڈی بھی ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ یہاں ہر سال ۷۵ کروڑ پاؤنڈ کی تجارت ہوتی ہے اور تقریباً ۲۵۰ جہاز روزانہ اس کی بندرگاہ میں آتے جاتے ہیں۔

سنگاپور کے شہر میں دنیا کی تمام اقوام کے باشندے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں لیکن ملایا کے باشندے مفقود ہیں، باشندوں کا پیشہ تجارت ہے، اور چینی یہاں دیگر اقوام کی بہ نسبت زیادہ ہیں، پولیس میں زیادہ تر سکھ سپاہی ہیں جاپانی بھی آج کل یہاں کثرت سے ملتے ہیں، یہ لوگ آپس میں متحد ہیں۔ اور تجارت کرتے ہیں، لیکن گذشتہ دنوں میں جب چینیوں نے ان کی تجارت کا بائیکاٹ کر دیا تو ان کو سخت نقصان پہنچا تھا۔ ان میں سے بیشتر بالکل تباہ ہو گئے لیکن تباہ ہونے کے باوجود یہ سنگاپور سے نہ گئے۔

سنگاپور سے بارہ میل کے فاصلے پر گھنے جنگلوں میں چھپا ہوا ایک قلعہ ہے جہاں فوجوں کے لئے اسلحہ، مرمت کی دکانیں۔ جہاز سازی کے کارخانے اور گودام ہیں۔ انہی جنگلوں اور قلعہ میں تیل کا اس قدر ذخیرہ موجود ہے کہ اگر چھ ماہ تک حکومت برطانیہ کو کہیں سے تیل نہ مل سکے تو سنگاپور کے تیل کے ذخیرے کام دے سکتے ہیں، سنگاپور کا ریڈیو سٹیشن مشرق کے تمام ریڈیو سٹیشنوں سے زیادہ طاقت ور ہے۔

یہاں کے بحری اڈے کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ مملکت برطانیہ میں اس جیسا اور کوئی اڈا نہیں ہے، اور اس کی حفاظت ۱۸" دہانے والی توپوں سے کی جاتی ہے۔ چانگی کے ساحل پر بڑی بڑی ساحلی ہیٹریاں لگی ہوئی ہیں۔ اور بڑی بڑی سرچ لائٹیں اور طیارہ شکن توپیں نصب ہیں۔ اور آبدوزوں کو اپنی بندرگاہ میں داخل ہونے سے روکنے کے لئے سمندر میں فولاد کے جال لگائے گئے ہیں؛ اور دن رات رائل ایر فورس کے طیارے ۵۰۰ میل کے فاصلے تک پرواز کرتے رہتے ہیں، علاوہ ازیں بری اور بحری افواج بھی ہیں۔ اور ہندوستان سے افواج اس طرف بھیجی جا رہی ہیں، یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے محض اس لئے کہ جاپان کی طرف سے حملے کا خدشہ محسوس کیا جا رہا ہے،

نقشے کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ایک ایسے اڈے کے لئے جہاں سے مشرق بعید میں برطانوی مفاد کی حفاظت ہو سکے اس جگہ کا انتخاب نہایت موزوں تھا۔ اس اڈے کے لئے جزائر شرق الہند، فرانسیسی ہند چینی، ہانگ کانگ، ملایا کی ریاستوں، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، فلپائن، افریقہ کے مشرقی ساحل اور کینیڈا کے جنوبی ساحل کی حفاظت کی جا سکتی ہے، اور ہندوستان کی مدافعت کے سلسلے میں بھی یہ نیا اڈا بہت اہم ہے، گویا صرف اس ایک اڈے کے ذریعے سے حکومت برطانیہ کے ¾ حصے کی حفاظت ہو سکتی ہے۔

جس وقت یہ مستقر بنایا گیا تھا۔ اس وقت صرف یہی ایک امکان حکومت برطانیہ کے پیشِ نظر تھا کہ جاپان سے کبھی اسے ضرور نقصان پہنچے گا۔ جاپان سنگاپور سے تین ہزار میل دور ہے، چونکہ مارشل پٹیان آج کل محوری طاقتوں کے ساتھ

ملا ہوا ہے۔ اس لئے جاپانی خطرہ اور زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا جا رہا ہے۔

جاپان کی طرف سے دو طرح کا خطرہ محسوس کیا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرے گا۔ دوسرا یہ کہ اس کی نگاہ جزائر شرق الہند پر پڑ رہی ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس کا امکان کسی قدر کم ہے، اور جزائر شرق الہند پر جاپانی حملے کا امکان بہت زیادہ ہے، کیونکہ وہ بہت عرصے سے ان جزائر کو اپنے قبضے میں لانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ جب سے ان ممالک میں سے ہالینڈ کے جزائر پر سے مقامی حکومت کا سایہ اٹھ گیا ہے۔ اس کا امکان اور بڑھ گیا ہے، کیونکہ اگر جاپان ان پر حملہ کر دے تو ان جزائر کو ہالینڈ کی طرف سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ دوسرے اگر وہ ان جزائر پر قبضہ کر لے تو اسے وہاں سے تیل، ربڑ، سفار کونین اور کالی مرچیں نہایت افراط کے ساتھ مل سکتی ہیں جن کی جاپان کو از حد ضرورت ہے ما دران اشیا کو حاصل کر کے وہ اپنی صنعت و حرفت میں نئی زندگی کی لہر دوڑا سکتا ہے اور اپنی اشیا کو فروخت کرنے کے لئے اس کو ان جزائر کی منڈیاں بھی مل سکتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار ان پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے مگر چونکہ وہ اس وقت تک چین کی جنگ میں مصروف ہے جس نے نہایت طویل صورت اختیار کر لی ہے اس لئے ابھی تک اس طرف متوجہ نہیں ہو سکا، لیکن جاپان کے موجودہ رویے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جلد یا بدیر جزائر شرق الہند کی طرف کسی مہم کا آغاز کرنے والا ہے۔

اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر جاپان نے ان جزائر پر حملہ کر دیا تو کیا ان جزیروں میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اپنی مدافعت کر سکیں، اس مرحلے پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حکومت ہالینڈ کو جس کے ماتحت ان جزائر کی زیادہ تعداد تھی موجودہ جنگ کے آغاز سے پہلے بھی جاپان کی طرف سے خطرہ تھا جس کے پیش نظر اس نے موجودہ جنگ سے پہلے ہی اپنی طرف سے ان جزائر کی مدافعت کے انتظامات مکمل کر لئے تھے۔ یہاں ڈچ حکومت کی بحری اور بری دونوں قسم کی افواج موجود ہیں۔ اور اہم بندرگاہوں میں بڑے بڑے جنگی جہاز بھی ہیں اور فضائی طاقت بھی کافی ہے لیکن ان انتظامات کے باوجود بھی اس بات کی امید نہیں ہے کہ ڈچ حکومت ان جزائر کو جاپان کے حملے سے کامیابی کے ساتھ بچا سکے گی۔ کیونکہ ان جزائر کا ساحل ناروے کے ساحل کی طرح بہت لمبا ہے اور کافی کٹا پھٹا ہے، کھاڑیاں اور خلیجیں بے شمار ہیں اور ایسے مقامات کی بھی کمی نہیں ہے۔ جہاں دشمن اپنی فوجیں اتار سکتا ہے۔

بعض بین الاقوامی فوجی مبصرین کا خیال ہے کہ جاپان اپنی فوجیں یہاں پوشیدہ طور پر نہیں اتار سکتا۔ اس کے جہاز جب ادھر آئیں گے تو ظاہر ہو جائیں گے اور ڈچ حکومت ان کا پوری طرح مقابلہ کر سکے گی لیکن اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ جاپان یوں کر سکتا ہے تو اس صورت میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس کے جہاز آسانی سے شرق الہند کی بندرگاہوں پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کے راستے میں سنگاپور آتا ہے۔ جو برطانوی بحری اور فضائی طاقت کا بہت بڑا مرکز ہے نیز جاپان کا بحری بیڑا جاپان سے نہیں بلکہ جزیرہ ہینان سے آئے گا۔ جو چین کے ساحل کے قریب ہے اور جسے اس نے چین سے چھینا ہے اور ہینان سے جزائر شرق الہند کی طرف آتے ہوئے سنگاپور سے گذرنا پڑتا ہے، اس لئے جاپانی بحری بیڑے کو پہلے برطانیہ کے بحری بیڑے سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔

حکومت برطانیہ یہ نہیں چاہتی کہ یہ جزیرے جاپان کے قبضے میں چلے جائیں کیونکہ برطانیہ نے یہاں کروڑ ہا پونڈ کا سرمایہ لگا رکھا ہے، اور برطانیہ کو تیل کی ایک خاص مقدار بھی یہیں سے ہی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اگر یہ جزیرے جاپان کے قبضے میں چلے جائیں تو آسٹریلیا کو جانے والا راستہ معرض خطر میں پڑ جاتا ہے، اور برطانیہ یہ بھی نہیں چاہتا۔ اس لئے وہ جاپان کے حملے میں جزائر شرق الہند کی امداد کرے گا۔

برطانیہ کی طرح امریکہ کا مفاد بھی ان جزائر سے وابستہ ہے، وہ یہاں سے ربڑ اور ٹین حاصل کرتا ہے جو اس کی اسلحہ بندی کے پروگرام کے لئے نہایت مفید ہیں، اس لئے وہ بھی یہ نہیں چاہتا کہ جاپان ان جزائر پر قبضہ کر کے اسے ان اشیا سے محروم کر دے اور اس کی تجارت کو نقصان پہنچائے۔ اس لئے خیال کیا جاتا ہے کہ امریکہ بھی اس جاپانی خطرے کو رد کرنے کے لئے برطانیہ کے ساتھ تعاون کرے گا۔ اور سنگاپور سے اپنے مشرقی مفاد کی اور فلپائن کی حفاظت کرے گا چونکہ فلپائن بھی جاپانی خطرے سے باہر نہیں ہے۔ اس لئے مشرق میں برطانیہ اور امریکہ کے تعاون کی توقع اور بھی زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے اور یہ خیال خام نظر نہیں آتا کہ ایک دن امریکہ اور برطانیہ کے بحری بیڑے سنگاپور کے مقام پر جاپان کے بحری بیڑے کے خلاف مصروف پیکار نظر آئیں گے۔

تابش صدیقی

ایک عورت

سُر میٹھے ہیں، بول رسیلے، گیت سُنانے والی تُو،
میرے ذہن کی ہر سلوٹ میں پھیلی نغمے کی خوشبُو،
راگنی ہلکے ہلکے ناچے جیسے آنکھوں میں آنسو!
میرے دل کا ہر اک تار
بن کر نغمے کی اک دھار
ظاہر کرتا ہے تیرے پازیبوں کی مدھم، موہن،
مستی لانے والی جھنکار!

تیرے دامن کی لہریں ہیں یا ہے مسلا مسلا گیت؛
یا ہے بھولے دل کی پہلی، ننھّی، نازک، ناداں پیت،
سادہ سادہ لیکن پل میں سب کے دل پہ پائے جیت!
میرے دل کا ہر اِک تار
ہوتا جاتا ہے سرشار
ایسے جیسے گہرے، میٹھے سپنوں کی مدھم موہن،
مستی لانے والی جھنکار!

مر

بنی آدم

یہ بھیانک، سیہ، گھنا جنگل جس کی صورت سے خوف طاری ہے
کون جانے کھڑا ہے یوں کب سے وقت پر اس کی عمر بھاری ہے

موٹے موٹے تنے درختوں کے جھرّیاں چھال پر درشت و مہیب
گرتی گرتی، جھکی جھکی شاخیں اُبھری اُبھری جڑیں عجیب عجیب

سمٹے سمٹے سے زرد رُو پتّے ساتھ موسم کے آتے جاتے ہوئے
پھیلے پھیلے سے ہر طرف سائے گھاس پر تیرگی بچھاتے ہوئے

رات دن، ماہ، سال، سال بہ سال اِن کی ہیبت میں ڈھلتے جاتے ہیں
اور یہ پُرہول نقش صدیوں کے اپنی عظمت سے بدلتے جاتے ہیں

قیوم نظر

غالب کی مُہریں

بڑوں کی ہر بات نرالی۔ وہی چیز جو ایک عامی کے تعلق سے بالکل معمولی اور ناقابلِ توجہ نظر آتی ہے۔ جب کسی بڑے آدمی کے ہاتھ میں پہنچتی ہے تو اُس کی قدر و قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ بات در اصل یہ ہے کہ بڑا آدمی اس چیز پر اپنی شخصیت اور مخصوص ذہنیت کے ایسے گہرے نقوش چھوڑ جاتا ہے کہ وہ اس کے کردار کی آئینہ دار بن جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس کی اہمیت زیادہ ہو جائے گی۔

مُہر ہی کو لیجئے معمولی چیز ہے۔ ادھر جب سے تعلیم اور لکھنے پڑھنے کا رواج ذرا عام ہو گیا ہے۔ لوگ مہریں کم بنواتے ہیں۔ ورنہ پہلے ہر خاص و عام مہر بنواتا تھا تعلیم یافتہ بھی اور ناتعلیم یافتہ بھی۔ اس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ نگینے پر نام کھدوایا اور اسے خطوں پر محضروں پر تمسکوں پر اور دوسری تحریروں پر ثبت کر دیا۔ ان پڑھ صرف مہر ہی پر اکتفا کرتے۔ پڑھے لکھے اس کے ساتھ دستخط بھی کر دیتے۔ نگینے کی قیمت کا فیصلہ صاحبِ مہر کی جیب اور ظاہری شکل و صورت کا اس کے ذوقِ حسن پر منحصر تھا۔ اس سے زیادہ اس میں کوئی بات نہ تھی۔

مگر یہی معمولی چیز دیکھئے ایک بڑے آدمی کے پاس پہنچ کر کیا سے کیا بن جاتی ہے۔ میرزا غالب نے اپنی عمر میں کتنی ہی مہریں بنوائیں۔ مجھے اس وقت تک اُن کی چھ مہروں کا پتہ چلا ہے جو انہوں نے اپنی زندگی کے مختلف اوقات میں تیار کروائیں مگر دیکھئے کہ ان میں سے ہر ایک ان کے ماحول۔ ان کے خیالات اور عام حالات کی ترجمان ہے یا نہیں!

پہلی مہر

اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ (سنہ ۱۲۳۱ھ)

میرزا غالب کی پیدائش سنہ ۱۲۱۲ھ میں ہوئی۔ گویا یہ مہر انہوں نے ۱۹۔۲۰ برس کی عمر میں کھدوائی۔ اس زمانے کا حال وہ ایک خط میں منشی شیو نرائن کو یوں لکھتے ہیں[۱]۔

"تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم ہے مجھ سے سنو۔ تمہارے دادا کے والد عہدِ نجف خانی ہمدانی میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمہارے پردادا نے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر تمہارے دادا، خاں صاحب کے ساتھ ہیں اور انہوں نے جو کیتھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اُن کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت آدھی آدھی رات گذر جاتی تھی۔ چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا۔ اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔ بس ہمارے اور ان کے مکان میں چھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹڑے درمیان میں تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے گھٹیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کے ایک کٹڑہ کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا۔ اور ایک کٹڑہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔"

یہ دور ان کا جس رنگین ماحول اور فضا میں گذرا وہ اس خط کے لفظ لفظ سے ظاہر ہے ہر طرف روپے پیسے کی افراط۔ بے فکری اور بے کاری۔

[۱] اردوئے معلیٰ (مطبع کریمی لاہور۔ بار اول، صفحہ ۲۶۴-۲۶۵)

ان حالات میں جتنی لغزشیں ذہن میں آئیں اتنی ہی کم ہیں۔

اسی زمانے یا اس کے تھوڑے دن بعد کے ایک واقعہ کی طرف ان کے ایک اور خط میں اشارہ موجود ہے جو انہوں نے مرزا حاتم علی مہر کو اس کی محبوبہ کی وفات پر لکھا ہے[1]۔

"عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری۔ بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ مغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں۔ اسی کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا۔ اس فن میں بیگانۂ محض ہو گیا ہوں۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔"

جب اس کے جواب میں مرزا حاتم علی مہر نے بہت جزع فزع کا اظہار کیا تو میرزا نے ایک اور خط لکھا[2]۔

"مرزا صاحب! ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔"

ظاہر ہے کہ یہ دونوں خط ۱۲۷۷ھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ چالیس بیالیس برس پہلے ۳۷-۱۲۳۵ھ میں ان کی عمر ۲۳-۲۴ برس کی ہوگی۔ غالب کے ابتدائی کلام میں ایک غزل مرثیے کے رنگ میں موجود ہے جو غالب اسی ستم پیشہ ڈومنی کی وفات پر کہی گئی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے ۔ کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ ۔ تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے

کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟ ۔ دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا! ۔ عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی ۔ یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا! ۔ خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں ۔ ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا، غالب ابھی وحشت کا رنگ ۔ رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

ساتویں شعر سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے خودکشی کر لی تھی اور یہ اس وجہ سے کہ رازِ محبت فاش ہو گیا تھا اور اُس کے اقربا وغیرہ تک یہ بات پہنچ گئی تھی۔ اس غریب نے رسوائی کی شرم سے بچنے کے لئے موت کے دامن میں پناہ لی۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی رنڈی یا بازاری عورت نہ تھی ورنہ کہاں کی رسوائی اور کہاں کے اقربا۔

غالب کے والد میرزا عبداللہ بیگ خاں کا عرف "میرزا دولہا" تھا۔ اسی لئے لوگ میرزا غالب کو بچپن ہی سے "میرزا نوشہ" کہنے لگے۔ اس عرف کی پستی ظاہر ہے اور خود میرزا کو بھی بعد میں اس "نالائق" عرف سے نفرت ہو گئی تھی۔ مگر اس طوفانی زمانے میں بھلا یہ ثقاہت کہاں قریب پھٹک سکتی تھی۔ یہ باتیں شعور اور تجربے سے حاصل ہوتی ہیں اور وہ ان کی عمر یا گرد و پیش کا اقتضا نہ تھا۔

غرضکہ اس مہر سے ان کی اس زمانے کی سرمستی و رنگینی۔ رندی و ہوسناکی بدرجۂ اتم ظاہر ہے۔

(یہ مہر میں نے صرف ایک جگہ دیکھی ہے۔ مولانا محمد حبیب الرحمٰن شروانی مدظلہ (نواب صدر یار جنگ بہادر) کے کتب خانہ میں میرزا کا ایک فارسی خط ہے اس کے آخر میں یہ مہر ثبت ہے)

دوسری مہر

اسد اللہ الغالب (۱۲۳۱ھ)

پہلی مُہر اور اس مُہر کی تیاری کا زمانہ ایک ہی ہے۔ اس مہر کی بنا حضرت علیؓ کا لقب ہے۔ چونکہ میرزا کا نام اسد اللہ تھا اس لئے انہوں نے اس رعایت سے یہ نام کھدوالیا اور بعد میں ان کے دوسرے تخلص کی بنا بھی یہی ہوئی۔ چونکہ سامنے کی چیز تھی اس لئے جب انہوں نے تخلص تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تو اسد چھوڑ کر بلا تامل غالب رکھ لیا۔ نام کی رعایت سے تخلص رکھنے میں میرزا کو ید طولیٰ حاصل تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اکثر شاگردوں کے تخلص اسی اصول پر رکھے گئے ہیں مثلاً ضیاءالدین احمد خاں نیر رخشاں۔ شہاب الدین احمد خاں ثاقب۔ یوسف علی خاں عزیز۔ شمشاد علی بیگ خاں رضوان۔ جواہر سنگھ جوہر وغیرہ وغیرہ۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے میرزا کو عقیدت ان کی فارسی کے تتبع میں پیدا ہوئی۔ انہوں نے ۱۲۲۶ھ سے ۱۲۲۹ھ تک دو برس ملا عبدالصمد ایرانی سے تعلیم پائی اور ایرانی علوم و رسوم سے واقفیت حاصل کی۔ اسی سے انہیں

1. اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۹۸ ۔ 2. اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۹۰

شیعیت سے شغف پیدا ہوا مگر اس میں غلو کا شائبہ تک نہ تھا۔ ان کی شیعیت تفضیلی تھی نہ کہ تبرائی۔ وہ ایک جگہہ اپنے عقیدے کے متعلق لکھتے ہیں[۵۱]

"میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لاموجود الا اللہ اور لامؤثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہیں ثم حسن ثم حسین تا مہدی موعود علیہ السلام۔

بریں زیستم ہم بریں بگذرم"

پس یہ مہر محض سجع ہی نہیں بلکہ ان کے دلی خیالات و معتقدات کی مظہر ہے۔

(یہ مہر میں نے بہت جگہ دیکھی ہے۔ مکرمی جناب مولانا غلام رسول مہر کی کتاب غالب میں میرزا کی جن دو تحریروں کے بلاک دیئے گئے ہیں۔ ان پر بھی یہ موجود ہے)

تیسری مہر محمد اسد اللہ خاں (۱۲۳۸ھ)

یہ معرکۃ الآرا مہر ایک عظیم الشان داخلی اور ذہنی انقلاب کی آئینہ دار ہے۔ انیسویں صدی کے ربع اول میں دہلی ایک بہت بڑے مذہبی مباحثے کا میدان بنا ہوا تھا۔ دو فریق تھے۔ ایک فریق کہتا تھا کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظیر ممتنع بالذات ہے یعنی خداوند تعالیٰ اب ان کا نظیر پیدا کر ہی نہیں سکتا۔ دوسرا فریق کہتا تھا کہ ممتنع بالذات نہیں بلکہ ممتنع بالغیر ہے یعنی اللہ تعالیٰ پیدا کر تو سکتا ہے یعنی اس میں یہ قدرت ہے مگر اب وہ پیدا کرے گا نہیں۔ فریق اول کے سرگروہ مولانا فضل حق خیرآبادی تھے اور فریق ثانی کے حضرت شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد بریلوی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب میرزا کی شادی خاندان لوہارو کے مشہور صوفی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہو چکی تھی اور وہ آگرہ سے نقل مکان کر کے مستقلاً دہلی میں مقیم ہو گئے تھے۔ مولانا فضل حق میرزا کے نہایت عزیز دوستوں میں سے تھے۔ مولانا نے ان سے فرمائش کی کہ وہ ان کے نقطۂ نگاہ کی تائید میں ایک مثنوی لکھیں۔ یہ مثنوی میرزا کی کلیات میں موجود ہے۔ میرزا اس کے خلاصے میں فرماتے ہیں۔

صورتِ آرائشِ عالم نگر — یک مہ و یک مہر و یک خاتم نگر
اینکہ میگویم جوابے بیش نیست — مہر و مہ زاں جلوہ تابے بیش نیست
آنکہ مہر و ماہ و اختر آفرید — می تواند مہر دیگر آفرید

حق دو مہر از سوئی خاور آورد — کور باداں کو نہ باور آورد
قدرتِ حق بیش ازیں ہم بودہ است — ہر چہ اندیشی کم از کم بودہ است
یک دریک عالم از روئے یقین — خود نمی گنجد دو ختم المرسلین
یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است — قدرتِ حق را نہ یک عالم بس است
خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے — ہم بود ہر عالمے را خاتمے
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمۃ للعالمینے ہم بود
کثرتِ ابداع عالم خوبتر — یا بیک عالم دو خاتم خوبتر
در یکے عالم دو تا خاتم مجوی — صد ہزاراں عالم و خاتم بگوی

ظاہر ہے کہ یہ فلسفیانہ استدلال مولانا فضل حق کو پسند نہیں آ سکتا تھا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ انہوں نے کہا کہ یہ کیا کہتے ہو کہ لاکھ عالم ہوں تو لاکھ ہی خاتم بھی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ یوں کہو کہ اگر لاکھ عالم ہوں تو بھی خاتم المرسلین ایک حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہوگی۔ اس پر اُن کی خاطر سے انہوں نے آخر میں چند اشعار کا اضافہ کر دیا اور لکھا ؎

غالب ایں اندیشہ نپذیرم ہمے — خُردہ ہم بر خویش می گیرم ہمے
ایکہ ختم المرسلینش خواندہ — دارم از روئے یقینش خواندہ
ایں الف لامی کہ استغراق راست — حکمِ ناطق معنئ اطلاق راست
منشاءِ ایجادِ ہر عالم یکے ست — گر دو صد عالم بود خاتم یکے ست

میں نے اس واقعہ کے متعلق اپنی تالیف "ذکر غالب" میں لکھا ہے[۵۲]

میرزا کی اس زمانے کی اخلاقی پستی کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے۔ اگر وہ اسی ڈگر پر قائم رہتے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے دل و دماغ کا کیا حشر ہوتا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ کچھ نواب الٰہی بخش خاں معروف کی عزیزداری اور کچھ مولوی فضل حق صاحب موصوف اور دیگر احباب کی دینداری کا یہ اثر ہوا کہ وہ سنبھل گئے اس زمانے میں دہلی ایک بہت بڑے مذہبی بحث و مباحثہ کا میدان بنا ہوا تھا۔ شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد بریلوی وہابیت اور عدم تقلید کے اصول کے علم بردار تھے اور مولوی فضل حق حامیانِ تقلید کے قافلہ سالار۔ تمام دہلی ان دو دھڑوں میں منقسم تھا۔ غالب بھی اس ہنگامے کی لپیٹ سے نہ بچ سکے مولوی فضل حق ان کے نہایت عزیز دوست تھے۔ اس لئے انہیں مجبوراً ان کا ساتھ دینا پڑا۔ اگرچہ حقیقت میں ان کا نقطہ

[۵۱] اردوئے معلی صفحہ ۳۴۲ (خط بنام نواب علاء الدین احمد خاں علائی بہادر) [۵۲] ذکر غالب صفحہ ۲۵-۲۶

نظر فریق ثانی کے اصولوں کا موید تھا۔ انہوں نے مولوی صاحب موصوف کے کہنے پر ایک فارسی مثنوی بھی "امتناع نظیر خاتم النبیین" کے نظریے کے متعلق لکھی۔ اول اول اس میں بھی انہوں نے اپنی فطری سلامت روی کے اقتضا سے وہی کچھ لکھا جو اصولاً صحیح تھا۔ مگر وقتی مصلحتیں دائمی صداقت پر غالب آئیں اور انہیں مولوی صاحب کے کہنے پر اس میں رد و بدل کرنا پڑا۔

ان تمام باتوں کا یہ اثر ہوا کہ غالب نے اپنی آزادانہ زندگی ترک کر دی۔ اگرچہ وہ اب بھی کبھی کبھی روز ابر اور شب ماہتاب میں شراب نوشی تو کر لیتے تھے اور آخر تک کرتے رہے مگر زندگی کا وہ خود کشانہ ہنجار یک قلم موقوف ہو گیا۔ ان میں مذہبیت کا عنصر پیدا ہو گیا۔ اس سے پہلے ان کی مہر پر کندہ تھا اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ مگر اب جو نئی مہر انہوں نے ۱۲۳۸ھ میں تیار کروائی اس پر کندہ ہے۔ "محمد اسد اللہ خاں"۔ یہ دو نوں مہریں جس عظیم الشان ذہنی انقلاب کی شاہد ہیں اس کی تشریح الفاظ میں نہیں کی جا سکتی۔

(میرے اپنے پاس میرزا کی ایک دو تحریریں ہیں۔ جن پر یہ مہر ثبت ہے۔ اور کسی جگہ یہ مہر میری نظر سے نہیں گذری)

چوتھی مہر

رضینا قسمت الجبار فینا

لنا علمٌ وللجهال مالٌ

اسد اللہ خاں غالب ۱۲۵۸ھ

یہ مہر گویا میرزا کی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کا لوح مزار ہے۔ داستان طویل ہے مگر مختصراً بیان کرتا ہوں

میرزا کے والد جناب میرزا عبداللہ بیگ خاں کا انتقال ۱۸۰۲ء میں ہو گیا جب میرزا کی عمر صرف پانچ برس کی تھی۔ اس کے بعد میرزا اور ان کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف دونوں اپنے چچا میرزا نصر اللہ بیگ خاں کی سرپرستی میں آ گئے۔ چار سال بعد ۱۸۰۶ء میں وہ بھی میدان جنگ میں بگرک ناگاہ ہاتھی سے گر کے مر گئے۔ چونکہ میرزا نصر اللہ بیگ خاں انگریزوں کی طرف سے آگرے کے صوبیدار اور سونک اور سونسا کے جاگیردار تھے۔ اس لئے ان کی وفات پر سرکار انگریزی نے ان کے متعلقین و لواحقین کے لئے دس ہزار روپیہ سالانہ کی پنشن منظور کی۔ مگر بعض اصحاب کی ریشہ دوانیوں سے

اول یہ رقم دس کی جگہ پانچ ہزار رہ گئی اور اس میں سے بھی ایک اور شخص خواجہ حاجی خاں صاحب دو ہزار سالانہ کے حصہ دار قرار پائے۔ ڈیڑھ ہزار سالانہ میرزا نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ اور تین بہنوں کو اور باقی ڈیڑھ ہزار میرزا غالب اور ان کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف میں تقسیم ہو گیا دس ہزار یا پانچ ہزار میں سے میرزا غالب کو صرف ساڑھے سات سو ملے۔

میرزا نے ۱۸۲۵ء میں اس غیر منصفانہ اور ظالمانہ انتظام کے خلاف آواز اٹھائی۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے حکومت انگریزی کے صدر مقام کلکتہ کا سفر بھی کیا۔ وہ ۱۸۲۶ء میں دہلی سے روانہ ہوئے اور دہلی سے ۱۸۲۹ء میں بے نیل و مرام واپس آئے۔ اس مقصد میں میرزا کی عمر عزیز کے گیارہ بارہ برس اور بلا مبالغہ ہزارہا روپیہ صرف ہوئے۔ مگر ان تمام کوششوں کا نتیجہ کیا نکلا؟ سب سے اول جون ۱۸۳۶ء میں گورنر غرب و شمال (حال یوپی) نے میرزا کے خلاف فیصلہ کیا اور لکھا کہ جو انتظام آج تک جاری رہا ہے آئندہ بھی قائم رہے۔ میرزا نے اس فیصلے کے خلاف اول سپریم کورٹ کلکتہ اور اس کے بعد کورٹ آف ڈائرکٹرز انگلستان میں اپیل کیا مگر اس تمام تگ و دو کا بھی کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور ۱۸۴۲ء کے شروع میں کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بھی ان کا اپیل خارج کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک آخری کوشش ملکہ وکٹوریہ کے حضور میموریل بھیج کر کی۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلا۔

اگرچہ آخری فیصلہ ۱۸۴۲-۴۳ء میں ہوا مگر اس دوران میں میرزا کو معلوم ہو گیا تھا کہ میری تمام محنت اکارت گئی ہے اور اس تمام دردسری سے کچھ حاصل نہیں ہونے کا۔ چنانچہ ۱۸۳۹-۴۰ء میں انہوں نے جو مہر کندہ کرائی اس پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ شعر کھدوایا۔

رضینا قسمت الجبار فینا

لنا علمٌ وللجهال مالٌ

ہم خدائے مطلق کی اس تقسیم پر راضی ہیں۔ کہ ہمارے لئے علم مقدر کیا اور جاہلوں کے لئے مال و دولت

ظاہر ہے کہ عمر بھر کی خواہشوں اور حسرتوں کو یوں برباد ہوتے دیکھ کر وہ اپنے دل کے خوش رکھنے کو اس سے بہتر اور کون طریقہ خیال میں لا سکتے تھے۔

(اس مہر کا ذکر سب سے پہلے جناب محمد عبدالرزاق صاحب راشد مددگار معتمد فنانس ریاست حیدرآباد دکن نے اپنی ایک ریڈیو تقریر میں کیا جو وہاں کے روزنامہ "صحیفہ" کی اشاعت ۲۰ فروری ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ جناب مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب غالب میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ اس تقریر

[1] کلیات نثر فارسی ۱۸۵۰ء اردو دراوزنگ آبادی جلد ہشتم ۱۹۳۱ء بلاک مقابل صفحہ ۳۲۸۔

[2] میں نے ایک نسخہ میں یہ شعر یوں پڑھا ہے۔ رضینا قسمت الجبار فینا۔ لنا علم و للاعداء اموالٌ

میں جناب راشد صاحب نے کہا تھا کہ ڈاکٹر سید قاسم صاحب (نتھر گھٹی حیدر آباد)
کے کتب خانہ میں علم طب کی ایک قلمی کتاب "ذخیرۂ دولت شاہی" ہے جس پر میرزا
غالب کی مندرجہ صدر مہر ہے۔ اور کتاب کے صفحات پر حاشیے میں غالب کی
تحریریں بھی ہیں۔ بعض میں مصنف سے اختلاف کیا ہے۔ بعض میں اس کی معلومات
پر اضافہ ہے۔ کہیں کسی مرض کا حال لکھا ہے۔ کہیں دوا کے استعمال کے ساتھ
پرہیز کے لئے اغذیہ کے نام لکھے ہیں۔ اگر حاشیوں کی تمام تحریروں کو یک جا
کر دیا جائے تو فن طب کا ایک رسالہ ہو جائے"۔

پچھلے دنوں ایک کام سے مجھے حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ اس
کتاب کو دیکھنے کے لئے میں ڈاکٹر سید قاسم صاحب کے دولت خانے پر حاضر
ہوا۔ انہوں نے بہت مہربانی فرمائی کہ کتاب مشارالیہ مجھے دیکھنے کو دے دی
میں نے سرورق پر مہر دیکھی۔ واقعی میرزا غالب کی مہر ہے۔ مربع ہے اور گرد یہ شعر
کندہ ہے اور مین وسط میں لکھا ہے "اسد اللہ خاں غالب ۱۲۴۵ھ" مہر کی پیشانی
پر خط نستعلیق میں ہاتھ سے یہ شعر لکھا ہے اور نیچے "اسد اللہ خاں دہلوی" جیسا کہ
جناب راشد صاحب نے فرمایا کتاب میں جا بجا حاشیے پر تحریریں ہیں۔ جو ان کے
خیال میں غالب کے ہاتھ کی ہیں۔ لیکن میں پوری ذمہ داری اور دعوے کے ساتھ
کہہ سکتا ہوں کہ ان تمام تحریروں میں سے زیادہ سے زیادہ دو صفحوں کے سوائے
اور کوئی تحریر میرزا کے ہاتھ کی نہیں۔ ان دو حاشیوں کا سوادِ خط ضرور میرزا کے
خط سے مشابہ ہے اور یہ غالباً انہی کے قلم سے لکھی گئی ہیں۔ سرورق پر شعر اور
"اسد اللہ خاں دہلوی" بھی میرزا کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ نہ یہ ان کا خط ہے اور
نہ وہ اس طرح دستخط ہی کیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب ـــــ (یہ مہر اور
کسی جگہ میری نظر سے نہیں گذری)

پانچویں مہر۔

نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ
(۱۲۶۷ھ)

دربار دہلی سے میرزا کے تعلقات اکبر شاہ ثانی کے عہد سے تھے۔ مگر یہ
ایسے ہی تھے کہ کبھی کسی شادی کے موقعہ پر قطعہ مبارک باد کہہ دیا یا کسی خاص تقریب
سے قصیدہ حضور شاہ میں گذرانا۔ ان عارضی تعلقات کی باقاعدہ اور مستقل صورت
کا سامان ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوا۔ خود میرزا کے لئے یہ زمانہ نہایت عسرت کا تھا۔
پنشن کے مقدمے کا فیصلہ ان کے خلاف ہو چکا تھا۔ ان کے اخراجات شروع
سے رئیسانہ اور مسرفانہ تھے۔ جن میں کمی ممکن نہ تھی۔ ان کے مقابلے میں آمدنی صرف
پنشن کی ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار۔ مزید براں مقدمے کے دوران میں جن
ساہوکاروں نے انہیں اس امید پر قرض دیا تھا کہ اگر مقدمے کا فیصلہ میرزا کے
حق میں ہو گیا تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ اب بہ اصرار اپنا روپیہ واپس مانگ
رہے تھے۔ ان حالات میں میرزا کے دوستوں نے مشورہ کیا اور آخر یہ ٹھہری
کہ کسی طرح میرزا کا ڈیوڑھی سے تعلق پیدا ہو جائے اور بہادر شاہ کے دربار
سے انہیں کچھ وظیفہ ملنے لگے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد نصیر الدینؒ عرف کالے
میاں اور احترام الدولہ معتمد الملک حکیم محمد احسن اللہ خاں بہادر ثابت جنگ
مدار المہام و طبیب شاہی کی وساطت سے میرزا خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے
پر مقرر ہوئے۔ اقتباس کسی قدر لمبا ہے مگر اس واقعہ کی روداد خود میرزا کی زبان
سے سنیئے اور ان کی فارسی کا لطف اٹھائیے لکھتے ہیں:۔

"دریں زمانہ کہ سایہ دیوار حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد نصیر الدین
عرف کالے میاں، مرا ایں خستہ تن را بستر خواب است و دیدۂ بیدار
ایں فرمایدۂ بند پندار روشناس کف پائے خسرو ہلال رکاب،
روزے بود فیروز و صبح دل افروز، باد در وزیدن و سبزہ در چمیدن
بلبل بہ نوا خوانی و زاہد بسبحہ گردانی، رہ نوردان بار بربستہ و شب گرداں
پائے بدامن شکستہ، روز از خجستگی بہ سعد اکبر نامزد بہ پنج شنبہ بود
و بست و سیوم شعبان سال یک ہزار و دو صد و شصت و شش
ہجری با چہارم جون سال یک ہزار و ہشت صد و پنجاہ عیسوی
برابر، مہر در خرگاہ ماہ میہماں و ماہ از نشیمن زہرہ میہماں را بمہر گماں کیواں
محمل در گام سنجی و برجیس بہ سنبلہ در خرامش، مریخ در اسد بانا ہید
ہم ساز و عطارد در جوزا بہ تنہائی شادماں، شہنشاہ بشکوہے کہ
پنداری آفتاب است در بیت الشرف برا ورنگ نشستہ و
و من بہ نشاطی کہ گوئی عطارد است در تعلیم روبرو ایستادہ کار
پردازان شاہی بفرمان حضرت ظل الٰہی بہ خلعت خانہ خاصم
بردند و قامتم را بہ خلعت شش پارچہ آراستہ بسلامگاہم آوردند
خداوند دنیا و دیں بداں دست بخشش آئین کہ کف آں دست
دریائیست کہ گوہر در باکف اوست۔ جگر گوشہائے معدن جیغہ و
سرپیچ و سر بست و در گرد جان ابر نیساں یعنی حمائل مروارید بگردنم

[1] غالب (مولانا غلام رسول مہر) صفحہ ۱۹۱ [2] مہر نیم روز (غالب) طبع اول ۱۲۷۱ھ صفحہ ۱۸۱ [3] جیسا کہ میں نے ذکر غالب (صفحہ ۲۲۲) میں بھی اشارہ کیا ہے یہ میرزا کا سہو قلم
ہے یہاں پہ جون کی جگہ جولائی ہونا چاہیئے۔

آویخت، چاؤش[1] فرخ سروش گہرہائے نزادیدۂ رگ ابر خامۂ شاہ

پر دیں سپاہ بر گوشۂ لبساط بارگاہ افشاند و غالب سخن سرائے را

نجم الدولہ دبیر الملک و نظام جنگ خواند، مہر خواں[2] کہ از خورشید

ذرہ پرور یافتم، خود را چوں گویم کہ با آفتاب، ہر آئینہ باعطار در برابر

یافتم تو قیع خدمتِ تاریخ نویسی تاجداران تیموریہ بنام من نگاشتند

۱۵ر جولائی ۱۸۵۰ء کے اسعد الاخبار (آگرہ) میں یہ خبر درج ہے۔[3]

"ان دنوں شاہ دین پناہ نے جناب معلی القاب مرزا اسد اللہ

خاں غالب کو بہ فرطِ عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ

کے لکھنے پر جو تیمور کے زمانے سے سلطنتِ حال تک ہو مامور کیا

اور اس کے کاتبوں کے خرچ کو بالفعل پچاس روپے مشاہرہ مقرر

کر کے آئندہ انواع پرورش کا متوقع کیا اور نجم الدولہ دبیر الملک

اسد اللہ خاں بہادر نظامِ جنگ" خطاب دے کر چھ پارچہ کا بیش

بہا خلعت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے۔ یقین ہے کہ تواریخ مذکور

ایسی دلچسپ اور متین عبارت میں لکھی جائے گی کہ ہر ایک اس کے

لطفِ عبارت سے فیض یاب ہوگا۔"

میرزا کے محبوب و مشہور شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ نے استادِ باکمال کی

اس عزت افزائی کی تاریخ لکھی۔

سراج الدین بہادر شاہ غازی داد غالب را | خطابے جوہر ہر لفظ آں روشن تر از اختر
دبیر الملک و نجم الدولہ دیک جزوِ دیگر ہم | نظام اول بود زاں بعد لفظِ جنگ اے سرور
خطاب و خلعت و شش پارچہ بخشید بر خلعت | فزود جیغہ و سرپیچ و مالائے دُر و گوہر
بدیں توقیر دانستم کہ باشد خسروِ دہلی | سخن فہم و سخن گو پرورندہ دانا و دانشور
پئے تحریرِ تاریخ خطاب و خلعتِ شاہی | بدریائے تفکر غوطہ زد طبعِ سخن گستر
بہنگامے کہ شد در غوطہ پا بستہ برزمیں قائم | بگوشِ تفتہ ہاتف گفت کائے رند زباں آور

بگو گر سال ایں پیش آمد اقبال می خواہی

یکے ساماں، دوم حشمت، سوم اعزاز چارم فر

(ساماں، حشمت، اعزاز اور فر کے اعداد ۱۲۶۶ھ ہوتے ہیں۔)

یہ مہر اسی خطاب کے بعد ۱۲۶۷ھ میں تیار کرائی گئی تھی۔ یہ میرزا کی

قاطع برہان (طبع اول) کے آخر میں بھی ثبت ہے اور بھی اکثر تحریروں پر دیکھی

جاسکتی ہے)

چھٹی مہر

غالب (۱۲۷۸ھ)

میرے علم میں میرزا کی یہ آخری[4] مہر ہے جو انہوں نے اپنی وفات سے

سات برس پہلے ۱۸۶۲ء میں تیار کرائی۔ جو لوگ نفسیات سے واقف ہیں

وہ خوب جانتے ہیں کہ نفس انسانی میں "انا" کے ارتقار کا انتہائی "مقام" یہ ہے کہ انسان

کسی غیر معمولی کامیابی کے بعد اپنے تعارف کے لئے مختصر سے مختصر "علم" استعمال

کرنے لگتا ہے۔[5]

۱۸۶۲ء اور ۱۸۶۳ء دونوں میرزا کی حیات کے نہایت اہم سال

ہیں۔ وہ ساری عمر ہندوستان کے فارسی دانوں کے خلاف جہاد کرتے رہے

ان کے مکتوبات ان حضرات کی مخالفت سے بھرے پڑے ہیں۔ اُن کی نظر

میں یہ سب "خر ان ناشخص" تھے۔[6] وہ سمجھتے تھے کہ "اصل فارسی کو اس کھتری بچہ قتیل

علیہ ما علیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رام پوری نے کھو دیا۔[7] غیاث اللغات

ایک نام موقر و معزز جیسے الفربہ خواہ نخواہ مرد آدمی۔ آپ جانتے ہی ہیں یہ کون ہے!

ایک معلم فرومایہ رام پور کا رہنے والا۔ فارسی سے نا آشنا محض اور صرف و نحو میں

ناتمام۔ انشاء خلیفہ و منشیات مادھو رام کا پڑھانے والا۔ چنانچہ دیباچہ میں اپنا

مآخذ بھی اس نے خلیفہ شاہ محمد و مادھو رام و غنیمت و قتیل کے کلام کو لکھا ہے

یہ لوگ راہ سخن کے غول ہیں آدمی کے گمراہ کرنے والے یہ فارسی کو کیا جانیں ہاں

طبع موزوں رکھتے تھے شعر کہتے تھے۔"[8]

ایک اور جگہ اس سے زیادہ جامعیت کے ساتھ ہندوستان کے فارسی

دانوں پر تبصرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔[9]

"ہندوستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا۔ خسرو کیخسرو قلمرو سخن طرازی

ہے۔ یا ہم چشم نظامی گنجوی و ہم طرح سعدی شیرازی ہے۔ خیر فیضی بھی

نغز گوئی میں مشہور ہے مگر اس کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے

کلام اس کا پسندیدہ جمہور ہے۔ دیکھو عبد القادر کیا لکھتا ہے۔ زہے

سپاہی نا لزار زو نعرا اور رشید اور بہار وغیرہم انہیں میں آگئے۔

---

[1] چاؤش بروزن طاؤس یعنی نقیب [2] مہر خواں خطابے کہ شاہاں بہ امراد ہند [3] بحوالہ اردو دکن اپریل ۱۹۳۳ء ص ۱۳ [4] مجھے ایک صاحب سے اطلاع ملی ہے کہ انہوں نے مرزا کی ایک بیضوی مہر بھی دیکھی ہے۔ مگر مجھے ان کی بات کا اعتبار نہیں [5] نپولین نے یورپ کی چار بڑی سلطنتوں کو آسٹرلٹز کے مقام پر ایسی شکست فاش دی تھی کہ جب اس کی خبر انگلستان کے وزیر اعظم ولیم پٹ تک پہنچی تو اس نے اپنے کمرے میں داخل ہونے پر سیکرٹری سے کہا کہ یورپ کا نقشہ جو سامنے دیوار پر آویزاں ہے اسے لپیٹ کر رکھ دو ہمیں آئندہ دس برس تک اس کی ضرورت نہ ہوگی جس کا مطلب یہ تھا کہ اب یورپ میں کوئی ملک ایسا نہیں جس کی حد دیکھنے کی ضرورت محسوس ہو صرف فرانس ہی فرانس رہ گیا ہے۔ اس فتح عظیم کے بعد دیکھا گیا کہ نپولین دستخطوں کے لئے صرف این N لکھ دیتا تھا حالانکہ پہلے وہ نپولین بوناپارٹ لکھتا تھا [6] عود ہندی مطبوعہ مجتبائی پریس ص ۱۵
[7] عود ہندی ص ۱۵ [8] ایضاً ص ۱۰۴ [9] ایضاً ص ۳۶

ناصر علی۔ بیدل اور غنیمت ان کی فارسی کیا۔ ہر ایک کا کلام بنظر انصاف دیکھئے ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ متت اور مکین اور واقف اور قتیل یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجئے۔ ان حضرات میں سالم علوم عربیہ کے شخص ہیں۔ خیر ہوں فاضل کہلائیں۔ کلام میں ان کے مزا کہاں۔ ایرانیوں کی سی ادا کہاں۔ فارسی کی قاعدہ دانی ہی اگر کلام ہوا اس میں پیروئ قیاس ایک بلائے عام ہے۔ وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے۔ باایں ہمہ وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے منہ کی کھاتا ہے۔ مولوی احسان اللہ ممتاز کو صنائع لفظی میں دستگاہ اچھی تھی اس میوہ وروش کو خوب برت گئے۔ فارسی کو وہ کیا جانیں۔ قاضی محمد صادق اختر عالم ہوں گے شاعری سے ان کو کیا علاقہ۔ ایک بات حضرت کو اور معلوم رہے کہ ہندی فارسی دانوں نے کمال کو وہم میں منحصر رکھا ہے۔"

لیکن اس تنقیص و تفضیح نے زیادہ واضح صورت ۱۸۵۷ء۔ ۱۸۶۰ء میں اختیار کی۔ جب ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا تو میرزا اپنے مکان کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ رہے نہ شہر چھوڑ کر بھاگے نہ بغاوت میں حصہ لیا۔ اس زمانے میں ان کے پاس چھاپہ کی "برہان قاطع" کا ایک نسخہ تھا۔ یہ لغت کی مشہور کتاب مولوی محمد حسین تبریزی ثم دکنی کی تالیف ہے اس کے مآخذ میں تمام پرانی لغتوں کے نام ہیں میرزا نے دفع الوقتی کے لئے اس کتاب کی ورق گردانی شروع کی تو دیکھا کہ اس میں بیسیوں غلطیاں ہیں۔ وہ ان مقامات پر نشان کرتے اور حاشیئے میں اصلاح لکھتے گئے۔ بعد میں ان تمام حاشیوں کو جمع کر کے انہوں نے ایک مختصر رسالہ "قاطع برہان" مرتب کر لیا۔ اسے انہوں نے بعض دوستوں کو بغرض ملاحظہ بھیجا اور بعد میں اسباب میسر آجانے پر ۱۸۶۲ء میں اسے شائع کر دیا۔ اس کی اشاعت گویا ہندوستان کے فارسی دانوں کو علی الاعلان عام دعوت مبارزت تھی۔ "برہان قاطع" نہایت مستند اور بلند پایہ تالیف خیال کی جاتی تھی۔ اس کے خلاف لب کشائی کے معنی یہ تھے کہ جہاں تک فارسی زبان کا تعلق ہے۔ ہندوستان میں کوئی شخص اور کوئی کتاب قابل استناد نہیں۔ اصحاب تقلید و جمود بھلا کب یہ گوارا کر سکتے تھے۔ بقول مرزا غالب یہ لوگ برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ چھ برس تک ہندوستان کے علمی و ادبی حلقوں میں ایک اودھم مچا رہا اور یہ فتنہ جب فرو ہوا کہ ۱۸۶۹ء میں میرزا کی وفات ہو گئی۔

اگر اس تخریبی اقدام سے دوسروں کے علم و فہم کی پستی اور سوء حاج کا اظہار منظور تھا تو اس کے مقابلے میں ۱۸۶۲ء ہی میں ایک تعمیری کام ہوا یعنی اسی سال میرزا کے کلیات نظم فارسی کی طباعت شروع ہوئی جس سے اپنے فضل و کمال کا دوسروں پر تفوق اور اپنی قدرت کلام کی شہادت پیش کرنا مقصود تھا۔ ان کے فارسی دیوان کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ مگر اس پر سترہ اٹھارہ برس کا طویل زمانہ گذر چکا تھا۔ جہاں ایک طرف وہ نایاب ہو چکا تھا وہاں اس کے بعد کا کلام بھی ہنوز تشنۂ اشاعت پڑا تھا۔ ۱۸۶۲ء میں منشی نول کشور مرحوم نے اپنے مشہور مطبع میں کلیات کی طباعت شروع کی جو ۱۸۶۳ء میں مکمل ہوئی۔

غرضکہ ۱۸۶۲-۶۳ء میرزا کی زندگی میں نہایت اہم سال ہیں۔ "قاطع برہان" اگر دوسروں کی شکست کا اعلان تھا تو کلیات ان کی فتحمندی کا ثبوت تھا۔ اسی سال ان کا اپنے نگین پر غالب کندہ کرانا اسی حقیقت کا ایک اور پیرائے میں اظہار ہے۔ اب گویا انہوں نے اس دعوے پر مہر لگا دی کہ فارسی علم و زبان کے لحاظ سے میں علیٰ کل غالب ہوں۔

(میرزا نے یوسف علی خاں بہادر فردوس مکان اور نواب کلب علیخاں بہادر خلد آشیاں والیان رام پور کے نام جو خطوط لکھے اور جن کا مجموعہ مکاتیب غالب کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان میں سے بعض کے آخر میں یہ مہر ثبت ہے)

یہ تمام مہریں خط نستعلیق یا خط نسخ میں ہیں۔ تحریر کی جگہ کو چھوڑ کر باقی مہر میں بیل بوٹے ہیں۔ ہر ایک مہر میں سنہ ضرور دیا گیا ہے۔ اس آخری دور میں بھی بدرالدین علی خاں ایک بے نظیر مہر کن تھے۔ میرزا کے خطوں میں بھی ان کا ذکر موجود ہے۔ ان میں سے اکثر مہریں یقیناً انہی کی تیار کردہ ہیں۔ مہروں کا سائز عموماً ½ × ½ ہے غالب والی مہر سب سے بڑی ہے۔ اس کا سائز ۱ × ¾ ہے مہروں کی ظاہری شکل و صورت دیدہ زیب اور دلکش ہے۔ میں نے اور کئی اشخاص اور بالخصوص خاندان لوہارو کے بعض افراد کی مہریں بھی دیکھی ہیں۔ مگر کسی میں حسن کے پہلو پر دھیان نہیں دیا گیا۔ دلکشی کا تو کیا ذکر نام تک خوشخط نہیں لکھا ہے۔ مہریں میرزا کی نفاست پسند اور حسن پرست طبیعت پر بھی دال ہیں۔

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ میرزا کی مہریں ان کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت اور عام حالات کی مادی ترجمان ہیں۔ یہ بات صرف ایک عظیم شخصیت ہی سے ممکن الوقوع تھی کہ ان میں اس نے اپنی زندگی کے اہم واقعات کو بھر دیا۔ ورنہ مہریں لوگ بنواتے نہیں تھے یا اب نہیں بنواتے اور میرزا تو خود کہہ گئے ہیں ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے — جو لفظ کہ غالب مری گفتار میں آوے

مالک رام

رقیب

ابھی تو ایک برس بھی نہیں ہُوا اے دوست! مگر وہ پہلی سی اب بات ہی نہیں باقی،

اسی چٹان پہ بیٹھے ہوئے تھے ہم دونوں
اُفق پہ، دُور ــــــ حسیں شام مُسکراتی تھی
سُنائی دیتا تھا نالے کا شورِ پیہم بھی
عجیب بات یہ تھی ہم خموش تھے دونوں،
مگر خموشی میں اظہار کی جھلک بھی تھی
کہ سازِ ذہن کے نغموں میں اک تلاطم تھا

میں دیکھتا تھا کہ تو ایک فلسفی کی طرح
عجیب سوچ میں ڈوبا ہُوا ہے۔ اور میں بھی
کسی خیال کی گہرائیوں میں کھویا ہوں۔
میں جانتا تھا کہ تُو سوچتا ہے کچھ تو ضرور
مگر وہ سوچ تھی کیا میں نہ جان سکتا تھا
تو سن رہا تھا مِری خامشی کے نغمے کو
مگر وہ گیت ہے کیسا تجھے نہ تھا معلوم!
ترا جہان الگ تھا، مرا جہان الگ!
یہ اک معمہ ہے اے دوست! باوجود اس کے
ہمارا رشتۂ الفت تھا کس قدر مضبوط!

اُسی چٹان پہ بیٹھا ہوا ہوں میں تنہا،
تھے جس چٹان پہ بیٹھے ہوئے کبھی دونوں۔
میں سوچتا ہوں کہ وہ رشتۂ محبت بھی
تمہارے اور مرے مابین عارضی ہی تھا۔
اور اِس کے توڑنے والی کو جانتا ہوں میں
مگر وہ نام مرے لب پہ آنہیں سکتا
اور اس کے توڑنے والی کو تُو بھی جانتا ہے
وہ نام تُو بھی مگر لب پہ لا نہیں سکتا۔

افق پہ شام کا منظر ہے اب اُداس اُداس
وہی سکوں کی فضا ہے، مگر ملول ملول
ہوا بھی سسکیاں بھرتی سنائی دیتی ہے
فضا پہ نالے کا غمناک نغمہ طاری ہے
ترا خیال تو ہے پاس، تُو نہیں ہے پاس۔
ترے خیال کو دل میں لئے ہوئے اے دوست!
اُسی چٹان پہ بیٹھا ہوا ہوں میں تنہا،
تھے جس چٹان پہ بیٹھے ہوئے کبھی دونوں

مسعود شاہد

اندر سبھا

ہم اودھ والوں کو اندر سبھا سے ایک دلی تعلق ہے جس کو ہم خود سمجھا نہیں سکتے۔ کوئی سے ناچ گانے ہی کو گناہ جانتا ہے۔ کسی کو اندر سبھا کا پلاٹ نہیں پسند۔ کوئی امانت مرحوم کی غزلوں سے اس ناٹک کا مقابلہ کرکے کہتا ہے زبان بازاری ہے۔ کوئی اشعار میٹھے پھیکے بتاتا ہے۔ مگر اندر سبھا کی جگہ ہے سب کے دل میں اگر کسی کی سمجھ میں آ سکے۔ تو وہ اس واقعہ سے سمجھ لے کہ گلفام کا پارٹ ہمارے اودھ کے آخری بادشاہ سلطان عالم واجد علی شاہ جنت مکان کیا کرتے تھے۔ عورتیں اُن کو جان عالم کہتی تھیں۔ مرد جہاں پناہ کہتے تھے۔ اندر سبھا کے دیکھنے والے کہتے تھے۔ واہ! گلفام ہو تو ایسا تو ہو! لیجئے صاحب بات میں بات نکلتی ہے۔ کہانی کے درمیان میں ایک اور کہانی سر والٹر اسکاٹ کی سُن لیجئے۔

"پہاڑوں کی راہ کٹھن ہو گئی تھی۔ سرد ہوا تیر کی طرح پار ہوتی تھی اور گذشتہ سورماؤں کی بکھان کرنے والا بہت بوڑھا تھا۔ اس کی سفید نرم کا کلیں۔ اور نازک زرد چہرہ پتہ دیتے تھے کہ اُس نے سُکھ کے دن بھی دیکھے ہیں۔ اُس کی مسرتوں کی بچی کھچی کائنات اس کا تانپورہ۔ ایک لڑکا کاندھے پر رکھے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا۔ یہ بدنصیب ان لوگوں میں آخری شخص تھا جو سرحد کے جانبازوں کی بہادری کے گیت گاتے تھے۔ زمانہ بدل گیا تھا پرانی باتیں خواب ہو گئی تھیں۔ اور ایک غیر شخص قدیم بادشاہوں کے تخت پر بیٹھا تھا۔ موجودہ زمانے کے کٹر لوگوں نے اس غریب کے بے ضرر لطیف فن کو گناہ ٹھہرایا تھا۔ انہیں قدیم تلوار کے دھنی لوگوں کی نام لیوا ایک سن رسیدہ امیرزادی تھی جو اس کی قدرداں تھی۔ نہ معلوم کون کون امیدیں لے کر یہ اُس کے دربار میں پہنچا۔ اسلحہ سے سجا ہوا دربار کا کمرہ دیکھا۔ گذرا ہوا زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ مگر چھوٹی ہوئی مشق سے انگلیاں مفلوج تھیں اور آواز غم اور مصیبت سے بھرّائی تھی۔ عزت کی جگہ پر بٹھایا گیا تھا مگر گاتے نہ بنتا تھا۔ امیرزادی نے دلاسا دیا اور دل بڑھایا۔ گاتے گاتے میں نہ معلوم کب کی دبی ہوئی آگ دہک اٹھی جیسے جوانی واپس آ گئی۔ اس نے پھر اسی قدیم آن سے اس امیرزادی کے بزرگوں کے گیت گانے شروع کئے۔ جن میں سرحد کے بہادر تبر، تلوار اور نیزوں سے کھیلتے تھے۔ اور جان کی بازی لگاتے تھے"۔

تھوڑے دن اُدھر تک نوٹنکی کی بدتمیزی اور سینما کے راج کے پہلے اندر سبھا کی کمپنیاں جگہ جگہ تھیں اور صوبے بھر میں دورہ کرتی پھرتی تھیں ان کو دیکھ کر اودھ والے اسی طرح متاثر ہوتے تھے۔ جیسے وہ بوڑھی امیرزادی اپنے ملک کے گیت سُن کر ہوئی ہو گی۔

جن لوگوں نے سلطان عالم کا زمانہ دیکھا ہو گا ان کا ذکر نہیں۔ جو لوگ بعد کو آئے اُن کے دل پر کیوں چوٹ لگتی تھی!

اس ڈیماکریسی بلکہ سوشلزم اور کامیونزم کے زمانے میں دل کی بات کہہ کر کون اپنے کو ہنسائے، جوان فکر لوگوں میں بوڑھا کہلائے۔ مگر نا بلا نہیں ہوتی کہے دیتا ہوں۔

کہیں اُن کے نمک کا اثر نہ ہو!

داستان گو صاحب آپ سٹھیا گئے ہیں۔ نمک کی آپ نے خوب کہی۔ نمک ملک میں پیدا ہوتا ہے۔ کوئی اُن کے باپ کا تھا۔

اے ہے! آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ خیر ہو گا۔ جانے دیجئے۔ کہانی سُنیئے۔

اس کہانی کے ہیرو بھی اُس زمانے کے سینکڑوں گلفاموں میں سے ایک تھے۔ اُس زمانے میں ٹکٹ وغیرہ کا رواج کم تھا۔ اس کے بجائے یہ ہوتا کہ جوار میں جس رئیس نے چاہا تماشا کروا لیا۔ اور دیکھنے والے بے روک ٹوک کے جمع ہو گئے۔ جب کہیں سے مانگ نہ آئی تو مشق کے لئے یا دل کے تقاضے سے خود ہی تماشا کرتے رہے اور ارد گرد کے عورت مرد مفت کی سیر دیکھا کئے۔

روپ بھرنے کے آج والے طریقے کہاں تھے کہ ایکٹر دانت توڑ ڈالیں اور مختلف طرح کے چوکے بنوالیں جن سے صورت بدل جایا کرے اُس زمانے میں روپ تو ضرور بھرتے تھے۔ مگر قدرتی صورت کی محتاجی آج سے زیادہ تھی۔ اسی وجہ سے گلفام ایسا آدمی تجویز کیا جاتا تھا جن پر اسٹیج کے باہر بھی نظر پڑے۔ ہماری کہانی کے ہیرو مدے خان چھوٹی حیثیت کے آدمی، صرف آنا پڑھے تھے کہ اندر سبھا پڑھ کر یاد کر لیں۔ جاہل ہوں کم حیثیت ہوں۔ مگر حکومت کرنے کا کمال خدا کے یہاں سے لائے تھے۔

گاؤں میں اگر کہیں چوری ہو جاتی ہے اور پولیس تحقیقات کرنے آتی ہے یا کوئی حاکم دورے پر آتا ہے۔ تو بعد کو لڑکے ان واقعات کی نقل کیا کرتے ہیں۔ ان میں ایک لڑکا ہوتا ہے جو بلا اختلاف رائے تھانیدار تجویز کیا جاتا ہے۔ اور اسی طرح ایک ہوتا ہے جو چور یا حاکم کا پارٹ لیتا ہے۔ مدے خاں بھی اسی طرح کے تھے کہ اپنے ہم جنسوں میں صرف ممتاز ہی نہیں تھے۔ بلکہ ہر کام میں سب کی نظر پہلے انہیں پر پڑتی تھی اور لوگ بے ارادہ ان کا حکم مان لیتے تھے۔

اندر سبھا کا خیال بھی سب سے پہلے انہیں کو آیا تھا اور انہوں ہی نے دوسرے ایکٹروں کو بھی جمع کیا تھا۔ ہفتے میں ایک رات کو تماشا ضرور ہی ہوتا تھا اور جب لگن بیاہ کا زمانہ ہوتا تھا یا جب کوئی نیا ایکٹر بھرتی کیا جاتا تھا تو ہفتے میں دو تین راتیں تماشے کے لئے الگ کر دی جاتی تھیں۔

گاؤں بھر کی عورتیں۔ بچے اور نوجوان لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ جوان عورتوں میں تو دن کو بھی اس کا چرچا اکثر رہتا تھا۔ اسی کے گانے گائے جاتے تھے۔ اور باتیں کرنے میں بھی اندر سبھا کا تلازمہ آ جاتا تھا۔ ایک دن شام کو اندر سبھا والے جمع تھے۔ کہیں باہر سے کچھڑی (بلاوا) آئی تھی یا مشق کرنے کا ارادہ تھا کہ گاؤں میں ایک طرف آگ لگی دھواں اٹھا ہی تھا کہ گاؤں بھر جمع ہو گیا۔ رسّی ڈول۔ گھڑے۔ سیڑھیاں۔ لمبی لمبی لاٹھیاں۔ جیسے یک بارگی زمین سے پیدا ہو گئیں۔ بجھانے والوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ لوگ ایک طرف بجھاتے تھے کہ شعلے دوسری طرف زبان درازیاں کرنے لگتے تھے۔

اتنے میں ایک کھلی ہوئی چھت پر سے ایک عورت کی چیخ کی آواز آئی۔

گھر کے اندر تو آگ لگی ہوئی تھی وہ غریب اترتی کدھر سے۔ دوسری طرف ایک چھپر تھا جہاں آگ ابھی نہیں لگی تھی۔ مگر وہ چھپر اونچے چھت پر تھا اس وجہ سے گرایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس لئے لوگ اس کو صبر ہی کر چکے تھے۔ جبر تو صبر کر سکتے ہیں لیکن آدمی کی جان بڑی چیز ہے۔ اسے بیچے اوپر بھی آگ نے لے لیا سیڑھی لگائی گئی اور ایک آدمی چھت پر پہنچ ہی گیا۔ مگر اترے کدھر سے! ادھر سے وہ چڑھا تھا ادھر بھی آگ پہنچ گئی تھی۔ مگر اس نے جان پر کھیل کر کام کیا۔ اور اس عورت کو گود میں لے کر پچھواڑے کی طرف کود گیا۔ کسی کا گھٹنا ٹوٹا کسی کی ٹھڈی سے خون بہہ نکلا مگر جانیں دونوں کی بچ گئیں۔ دیکھا گیا تو میاں گلفام تھے اور وہ جو آئندہ چل کر ان کی اصلی زندگی میں سبز پری ہوئیں۔

میرے پڑھنے والے یہاں تک تو میں قصہ سنبھال لایا۔ اب معاملہ میرے بس سے باہر ہوا جاتا ہے۔

میں کہانی کہتا ہوں دل بہلانے کو اور نتیجہ نکلے اس سے فرقہ دارانہ تعصب کا۔ تو ایسی کہانی کہنے سے تو چپ رہنا بھلا۔ بالکل اسی طرح کا اعتراض ایک مرتبہ ایک صحبت میں غریب پریم چند پر بھی کیا جا رہا تھا۔ میں نے حاضرین کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ قصہ کہنے والا غریب بڑی مشکلوں میں ہوتا ہے۔ نہ معلوم کس طرح قصے کی چول بٹھاتا ہے۔ اگر وہ ہندو مسلمان کو لڑانے کی تنخواہ نہیں پاتا تو وہ گھانس کھا گیا ہے کہ ایسا قصہ لکھے گا جس سے لوگ خفا ہو جائیں!

آپ کہیں گے ہیرو ہیروئن ایک ہی قوم یا فرقے کے رکھے جائیں تو کونسا ہرج ہو جائے گا۔ میں کہوں گا کہ ذرا لکھنے بیٹھئے تو معلوم ہو۔ ہندو مسلمانوں اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں یہ آرزو ہے کہ دوسروں کی لڑکیاں لے آؤ۔ مگر اپنی لڑکیاں باہر نہ جانے پائیں۔ اے سبحان اللہ! یعنی چھپا ہوا خیال دل کے اندھیرے کونے میں یہ موجود ہے کہ ماں کے جنسی فرائض کوئی ذلیل چیز ہیں اور باپ کے اس سے زیادہ بلند ہیں۔ واقعی ایسی سمجھ کے بعد فرقہ دارانہ ملاپ پر اگر پتھر نہ پڑیں تو کیا ہو۔ خالص جنسی پہلو سے لے لیجئے بچہ دینے کی نسل میں آگے آگے ایک گدھی بھاگی جاتی ہے۔ پیچھے پیچھے ایک گدھا سی پوں سی پوں کرتا دوڑا چلا جا رہا ہے کوئی فرقہ پسند صاحب بتا سکتے ہیں کہ ان میں کون کس فرقے کا ہے۔

خیر ہوگا۔ پولیٹیکل گتھیاں بعد کو سلجھتی رہیں گی۔ فی الحال قصہ سنئے نہیں تو سلسلہ ٹوٹ جائے گا۔

ہماری کہانی کی ہیروئن بچاری چھوٹی قوم کی شودرنی تھی۔ دھنا نام تھا۔ بیاہ ہو چکا مگر گونہ نہیں گیا تھا۔ اس نے اپنے مرد کو کم سنی میں دیکھا۔ دبلا دبلا کالا کالا ایک لڑکا تھا۔ چیچک کے داغ اچھی طرح یاد تھے اور کچھ نہیں۔ اس کے مقابلے میں میاں مدے خاں کی جوانی تھی۔ کھلتی ہوئی سانولی رنگت۔ چھریرا بدن۔ آنکھوں میں وہ موہنی کہ پری کا دل موہ لیا۔ آدمی کا کون ذکر۔

تماشا دیکھنے والوں میں کون عورت ہوگی جو ایک خیالی پہلو سے سبز پری کی جگہ اپنی نہ سمجھتی ہوگی آخر آپ نے بھی ناول پڑھے ہیں۔ نہ معلوم کتنی بار ہیرو ہیروئن میں اپنی جھلک پائی ہوگی۔

اس سے بھی زیادہ اثر گانے کا پڑتا تھا۔ ایک تو شنبر دوسرے ملوار باندھے بسنت رت جب آتی ہے تو چڑا چوں چوں کر کے چڑیا کو اپنے بس میں کر لیتا ہے غریب دھنا تو پھر آدمی کا بچہ تھی۔ جو بات سمجھتی تھی۔ گو شودرنی تھی نادرچی ذات والے جو سمجھیں، مگر دھنا تو اپنے پہلو میں دل ہی پاتی تھی۔ محبت کی برکت نے اس دل میں جو چوٹ دے دی ہو وہ درکنار رہا آگ میں پھاند پڑنے والا معاملہ اس کو عورت کی نفسیات سمجھنے والے جانیں، ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ جہاں جہاں کی جو کم آن پڑتی ہے۔ وہاں تصنع جذبات کا افسانہ ودہ جا پڑتا ہے۔ اور آدمی کی چھاتی برائی مجسم

ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ پھر سکھانے پڑھانے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ کون بھروسے والا آدمی ہے اور کون نہیں۔

عورت کی روح ایسا ہی آدمی پسند کرتی ہے یا کسی دوسری طرح کا۔ یہ کسی پڑھے لکھے سے پوچھئے یا دھنا جانیں۔ آگ کے واقعہ کے پہلے نہ معلوم کس کے دل میں کیا رہا ہو لیکن اس کے بعد "جوبن پیا یا رے سے تج دیں" میں شک رہ گیا نہ کلام۔

عورت کی ذات بودی کہلاتی ہے مگر جہاں دل کا معاملہ آن پڑتا ہے۔ وہاں اس کی بہادری کی قسم کھائیے یہی حال دھنا کا تھا کہ نہ مار دھاڑ کا ڈر رہ گیا تھا نہ پنچ برادری کا۔ دھنا خیال کرتی ہے کہ زندگی کا مزا میٹھا کھٹا۔ کڑوا سلونا سب مل کر بنتا ہے اور وہی چوکھا ہوتا ہے۔ دُنیا اس کو بے حیا سمجھے۔ مگر عورت کی روح پکار پکار کر کہہ رہی تھی۔ دل و دیں را بہ دوست نثار ے کردم۔ حاصل عشق ہمیں بود کہ کارے کردم۔ دھنا کے ماں باپ چاہتے تھے کہ جلد رخصت کر دیں۔ یہ کال کٹے مگر پنڈتوں کا حساب اور دولہا دولہن کے سن کا پھیر ایسا تھا کہ ساعت نہیں بن رہی تھی۔ اسی انتظار میں سال بھر گذر گیا۔ ماں باپ نے کون جتن اٹھا رکھے۔ نہ معلوم کون کون سنتیاں کیں مگر لاحول ولاقوۃ سو سب بجائے چاہے اونٹ بھاگ جائے مگر روک ٹوک سے دل کی لگی لگی ہی رہتی ہے۔ ابن ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر۔ خدا خدا کر کے رخصتی کی گھڑی آئی۔ دھنا سسرال چلیں۔ راستے میں بڑا گھنا جنگل پڑتا تھا۔ جس وقت یہ لوگ وہاں پہنچے۔ میاں مدے خاں نے دھاوا بول دیا۔ اور دھنا کو چھین لائے۔ نوابی جا چکی تھی مگر مادتیں بگڑی ہوئی تھیں اس طرح کے واقعات اکثر ہو جاتے تھے۔ اس واردات کی کچھ پوچھ گچھ بھی ہوئی۔ ڈاکے کا مقدمہ چلا نہیں۔ مگر بیاہی عورت کو بھگا لے جانے میں میاں مدے خاں چھ مہینے کے لئے جیل خانے بھیج دیئے گئے۔ سسرال والوں کا ذکر کیا۔ خود دھنا کے ماں باپ دھنا کی طرف پھر کے نہ دیکھ سکے البتہ مدے خاں کی ماں نے چھاتی پیٹ سے لگایا اور بہو بنا کر رکھا۔ ان کا نام دھنا سے بدل کر فوجدارن ہو گیا۔ چھ مہینوں کے بعد پھر وہی گلفام اور وہی سبز پری۔ پہلے یہ مشغلہ شروع ہوا تھا دل کے بہلاؤ کو۔ اب روٹیوں کا سہارا ٹھہرا۔ مدے خاں جب تک جئے ان کی اندر سبھا دوسری سبھاؤں کے مقابل میں ایسی رہی جیسے دیوتاؤں کی محفل میں اندر۔ گلفام کا پارٹ تو تو مونہ نکل آنے کے بعد چھوٹ گیا مگر کالا دیو بہت دنوں تک بنتے رہے۔ پھر یہ بھی چھوٹ گیا۔ اور خالی تجربے کی بنا پر کمپنی کے مالک منیجر کی طرح کام کرتے رہے۔ اور استاد کہلاتے تھے۔ بی فوجدارن کی بھی عزت مدے خاں کے ساتھ بڑھتی رہی۔ اور جتنے ایکٹر تھے ان کو استانی کہتے تھے۔ اتنے میں مدے خاں کا انتقال ہو گیا۔ فوجدارن نے مدے خاں کے شاگردوں کے ذریعے سے اندر سبھا جاری رکھنی چاہی مگر نہ کر سکیں۔ ناچار ماماگیری کرنے لگیں رنڈاپے سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ کوئی اولاد نہ تھی۔ اندر سبھا کا وقت گیا۔ تھیٹروں کا زمانہ آیا۔ تھیٹروں کا دور کم ہوا سینما کا دور دورہ ہوا۔ بی فوجدارن بہت بوڑھی ہو گئیں مگر دو باتیں نہ چھوڑیں ایک تو جمعرات کی شام کو مدے خاں کی قبر پہ جانا۔ دوسرے اندر سبھا کا ذکر اس طرح کرنا جیسے ابھی کل کی بات ہے۔

غریب آدمی تھیں کوئی آگے نہ پیچھے۔ صرف مرنا ہی باقی تھا۔ اس لئے جو کچھ کماتی تھیں اس میں سے کچھ جز تکلیف اٹھا کر اپنے گور گڑھے کے لئے ضرور رکھتی جاتی تھیں کہ محتاجی میں نہ اٹھائی جائیں۔ ساتھ والیاں ان کی جز درسی پر آوازے تو آوازے بھی کستی تھیں کہ نہ معلوم کس کے لئے جمع کر رہی ہیں۔ بچانے روکھ کس کو دی جائیں گی مگر یہ سُنی ان سُنی کر جاتی تھیں اور جواب نہیں دیتی تھیں ان کے اثاثے میں ایک بانس کی پٹاری بھی تھی جس پر چمڑا منڈھا ہوا تھا۔ اس کو فوجدارن جان سے عزیز رکھتی تھیں۔ ان کے جیتے جی کسی نے نہ جانا کہ اس کے اندر کیا ہے۔ گو لوگ اندازہ کرتے تھے کہ عمر بھر کی کمائی اسی میں ہو گی۔

جب ان کا آخر وقت ہوا اور زبان بدل گئی۔ آنکھوں پر پردے پڑ گئے تب یہ کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ پہلے لوگ سمجھے پانی مانگتی ہیں جب سکرات میں فوجدارن کو گھنٹوں لگ گئے اور یہ اسی طرح "پانی پانی" کیا کیں تو کسی نے کہا ارے پٹاری تو نہیں کہتی ہیں لوگوں نے کھول کر دیکھا اور اس میں ایک پوٹلی میں بندھی ہوئی چھ اشرفیاں نکلیں اور رو فتی ٹوٹی ہوئی کلابتون سیاہ ستارے مانند۔ گلفام کا تاج۔ ایک عورت نے نکال کر ان چیزوں کو اُن کے سینے پر رکھ دیا۔ ادھر رکھنا تھا کہ اُدھر معلوم ہوا کہ کلی چٹکی اور بُو نکل گئی۔

(چودھری) محمد علی

شعر

ہم بند کئے آنکھ تصوّر میں پڑے ہوں
ایسے میں کوئی چھم سے جو آجائے تو کیا ہو

سہا یاض

غزل

جو پڑاؤ تھا کبھی اہلِ غم کا خموش اب وہ دیار ہے
نہ جرس کی اب وہ صدائیں ہیں نہ وہ کارواں کا غبار ہے

نہ فنا سے عشق ہے بے خبر نہ وجود دوش پہ بار ہے
کبھی آنکھ موت کی آنکھ میں کبھی زندگی سے دوچار ہے

نہ سزا ہے کچھ نہ جزا ہے کچھ فقط اہلِ دل کی پکار ہے
کبھی حق کا نعرہ بلند ہو تو جہان میں وہی دار ہے

یہ بھری بہار میں کیا ہوا! نہ وہ شوخیاں نہ وہ گرمیاں
نہ گلوں میں اب وہ نکھار ہے نہ جوانیوں میں اُبھار ہے

نہ کھلا کہ بیٹھے بٹھائے چھا گئیں کیوں دلوں پہ اُداسیاں
وہی رونقیں سرِ بزم ہیں، وہی حُسنِ روئے نگار ہے

ترا سوزِ غم ہے کہ دل مرا یہ معاملہ نہ کبھی کھُلا
جو بھڑک اُٹھے تو وہ شعلہ ہے جو دبا رہے تو شرار ہے

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ تو جہانِ عشق بدل گیا
نہ وہ غم ہے اب نہ وہ سرخوشی نہ تڑپ ہے اب نہ قرار ہے

تجھے یوں تو صرصرِ غم کبھی نہ نہاں دلوں سے تھی دشمنی
ترے چلتے ہی وہ کنول بجھے کہ جہان تیرہ و تار ہے

ترے صدقے بلبلِ مضطرب یہ بھرم بھی تجھ پہ کھُلا کبھی؟
وہی برق ہے وہی آشیاں وہی پھول ہے وہی خار ہے

سب اُسی کے سائے میں پلتے ہیں یہ کرشمے ظلمت و نور کے
یہ ہے تیری نرگسِ نیم وا کہ طلسمِ لیل و نہار ہے

کبھی جگمگا اُٹھی بزمِ جاں کبھی آگ لگ گئی چار سُو
ترے سوزِ عشق کو کیا کہوں کبھی نور ہے کبھی نار ہے

یہ پیامِ دورِ جدید ہے کہ وہ حال و قال کے دن گئے
ترا عشق ہوش ہے سر بسر نہ وہ نشہ ہے نہ خُمار ہے

جو یہ گونج سی ہے فضاؤں میں جو لپٹ سی ہے یہ ہواؤں میں
مری شامِ غم کی ہے داستاں کہ یہ بوئے گیسوئے یار ہے

جہاں فیصلہ نہ یہ کرسکیں کہ قدم کو روکیں، بڑھے چلیں،
وہیں بستے ہیں ترے غم زدے وہی غم زدوں کا دیار ہے

اسے دین بھی نہ سمجھ سکا اسے کفر بھی نہ پرکھ سکا
کہ طوافِ کعبہ کے پھیر میں ترا عشق بُت بہ کنار ہے

تھی ہر ایک فصل کی شان الگ، مگر اے سیاستِ مغربی
ترے ہاتھوں اُف یہ چمن لٹا کہ خزاں ہے اب نہ بہار ہے

یہ عجیب جاگتا خواب ہے کئی جیتے مردے نظر پڑے
یہ جہان ہے کہ فراقؔ یہ بھی جہانیوں کا مزار ہے[1]

فراق گورکھپوری

[1] غالباً جہاں تماکبیر کا مصرع ہے:۔ "ایک تماشا یہ بھی دیکھا مُردا روٹی کھائے"۔

اقبال کا تصوّرِ ابلیس

شیطان وابوجہل کی عظمت کی قسم

سو بار غلامی سے بغاوت بہتر

خدا کے بعد اگر دنیا میں کسی ہستی کو لافانی شہرت نصیب ہوئی ہے تو وہ ابلیس ہے اور گستاخی معاف اگر میں یہ بھی کہہ دوں کہ خدا کے برابر اگر کسی ہستی کو شہرت نصیب ہوئی ہے تو وہ ابلیس ہے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ اس بات سے تو مجھے انکار نہیں کہ۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوگا تو خدا ہوگا

لیکن ہم خاکیوں کو روزِ ازل سے پہلے کے خدا سے کیا غرض ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ اور اُس دن سے پہلے کے عابد اور سرتاجِ قدسیاں سے کیا واسطہ؟ لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ آدم کے معرضِ وجود میں آنے سے چند لمحات پیشتر ہی ابلیس نمودار ہو چکا تھا۔ اور اسی لمحے سے لے کر دنیا کی رہبری دو متوازی مگر مختلف السمت طاقتوں کے ہاتھوں میں آئی یعنی یزداں اور اہرمن یا خدا اور ابلیس۔ ابلیس ایک اور پہلو سے بھی خدا کا حریف ہے۔ دونوں غیر فانی ہیں۔ قیامت کے بعد ابلیس ہوگا یا نہیں ہم انسانوں کو اس سے کیا مطلب۔ ہاں یہ بات مسلّم ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے ابلیس ہوگا یعنی جہاں تک انسان کا خدا اور ابلیس سے تعلق ہے دونوں لافانی ہیں اگرچہ اس معاملے میں خضر علیہ السلام بھی ہمسری کا دعوےٰ کر سکتے ہیں لیکن ایک تو وہ روزِ ازل سے نہیں ہیں اور اس لحاظ سے ان کا غیر فانی ہونا ممکن نہیں۔ دوسرے عام روایت کے مطابق ان کی رہبری بھی پانیوں تک ہی محدود رہے اور آج کل یوں بھی قطب نما۔ اور دوسری بحری ایجادوں نے ان کی رہبری کو بے معنی سا بنا دیا ہے۔ خود شیطان جبرئیل امین سے کہتا ہے ؎

خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا

میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا۔ جو بہ جو

اس لئے ان کو ان دو عظیم طاقتوں کے مقابلے میں لانا کچھ بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔

دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں اس عظیم الشان ہستی کا تھوڑا بہت ذکر موجود ہے بمثلاً انگریزی میں ملٹن کی زندہ جاوید مثنوی "جنت گم شدہ" کا ہیرو ایک طرح سے شیطان ہی ہے۔ اور اطالوی میں دانتے کی ڈیوائن کامیڈی بھی اس کے ذکر سے معمور ہے لیکن معلوم نہیں کہ فارسی ادب اور خصوصاً فارسی شاعری نے کس منحوس گھڑی جنم لیا کہ یہ انسان کے ہمدم دیرینہ کے ذکر سے بالکل خالی رہی حیرت ہے کہ فارسی شاعری میں تصوف کا تو اس قدر عظیم ذخیرہ ہو کہ دنیا کی دوسری زبانیں اس کی گرد کو بھی نہ پا سکیں لیکن شیطان جس کا تصور خدا کے نام کے ساتھ یا اس کے فوراً ہی بعد دماغ میں آتا ہے۔ اس قدر بے دردی سے نظر انداز کر دیا جائے۔ گو یادہ کبھی خفا ہی نہیں اُردو کے شاعروں نے بھی فارسی کے تتبع میں تصوف پر بہت کچھ لکھ مارا۔ اور اس پامال مضمون میں وہ وہ موشگافیاں کیں کہ فہم تصوّر سے بھی عاجز ہے لیکن ان میں بھی کسی بندۂ خدا کو کبھی اتنی جرأت نہ ہوئی کہ نوعِ انسانی کے اس بڑے ہمدرد اور حقیقی رہبر کی بابت کوئی حرف زبان سے نکال سکے۔ دوسروں سے تو کیا گلہ غالب جیسے شوخ طبع مجدد۔ اور پارینہ روایات کے دشمن کو بھی یہ سعادت نصیب نہ ہوئی۔ خدا کے ساتھ تو بڑی بڑی شوخیاں کیں لیکن اس غریب کو پہچانا تک نہیں۔ ذوقؔ نے مچھر جیسی حقیر مخلوق کی دادِ شجاعت تو ان الفاظ میں دی ؎

پشہ سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی

جب قصدِ خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

لیکن شیطان کہ جس پر خود مردانگی کو ناز ہے نگاہوں سے اوجھل رہا چنانچہ شیطان کا تصور اس قدیم تصوّر سے جو ملاؤں کے دماغ میں پرورش پا کر معرضِ وجود میں آیا تھا ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ اگر کبھی بھول کر کسی شاعر نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا تو ایک لیپ تاو عامیانہ جذبے کے ماتحت جیسے ؎

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر

فعلِ بد تو خود کریں اور لعنت شیطان پر

خدا اور انسان کے حقیقی تصور اور ان کے باہمی تعلقات پر تفکر کی خوش بختی تو اقبال کے حصے میں آئی ہی تھی شیطان کے سادہ خاکے میں رنگ بھرنے کی سعادت بھی اسی کو نصیب ہوئی۔ اقبالؔ نے اردو شاعری کو ایک متلون مزاج فرد کے متصادم نظریوں

کی ترجمانی سے نجات دلاکر پہلی مرتبہ ایک سوچ بچار کرنے والے انسان کے مسلسل خیالات کے ارتقا کا آئینہ دار اور ایک زندہ انسانی فلسفے کا حامل بنایا۔ چنانچہ اقبال کے ہاں جہاں دوسرے مسائل زندگی ہمیں ایک مربوط شکل میں ملتے ہیں وہاں جہاں تک مشرقی ادب کا تعلق ہے پہلی مرتبہ شیطان ایک مکمل صورت میں دنیا کے سامنے آتا ہے۔ اور ہم خدا، شیطان اور انسان کی مثلث کو پہلی بار ایک واضح شکل میں دیکھتے ہیں۔

اقبال کا تصورِ شیطان دیکھنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ابلیس آج تک کس صورت میں دنیا کے سامنے آتا رہا ہے۔ ابلیس کے متعلق دو نظریئے بڑی شد و مد سے پیش کئے جاتے ہیں۔

پہلا تو وہ جو ہمیں تورات۔ انجیل اور قرآن کریم جیسی مقدس کتابوں میں ملتا ہے، اور جس کا مختصر سا خاکہ یہ ہے کہ ابلیس آگ کی مخلوق ہے۔ وہ اپنے زہد و عبادت کی وجہ سے ترقی کرتے کرتے فرشتوں کا سردار بنا لیکن آخر آدم کو سجدہ نہ کرنیکی پاداش میں ہمیشہ کے لئے مردود درگاہ باری ہو کر انسان کا سخت دشمن بن گیا۔ اور اب ہمیشہ اس کو خدا کے سیدھے راستے سے ہٹانے اور بدی کی طرف مائل کرنے میں مصروف ہے،

دوسرا نظریہ مقابلۃً نیا ہے۔ اور مذہب کی پابندیوں سے آزاد یا یوں کہیئے کہ مذہب کو عقل کے ترازو میں تولنے والے لوگ اس کے حامی نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں۔ ابلیس درحقیقت کوئی مادی شئے نہیں۔ اور ان متبرک کتابوں میں یہ لفظ استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے جس سے مراد انسان کا نفسِ امّارہ ہے۔ اقبال ایک مومن کی حیثیت میں دوسرے نظریئے کو غلط مانتا ہے وہ تاویل کا قائل نہیں اور پہلے نظریئے پر اس کا ایمان ہے۔ گو جزئیات اور اندازِ نظر کے لحاظ سے اس کا تصور اس تصور سے قدرے مختلف ہے۔ وہ اس کو ظاہر پرستوں کا نظریہ سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ دل وجود کو چیرنے والی نگاہِ تیز نہیں رکھتے بلکہ توہمات میں الجھے ہوئے ہیں۔

اقبال شیطان کو مجسمۂ بدی نہیں سمجھتا بلکہ اس کا ایک نہایت ہی پاکیزہ تصور رکھتا ہے۔ وہ اسے جمود کے خلاف سرتاسر بغاوت سمجھتا ہے۔ وہ اسے حرکت اور عمل کے مترادف قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ارمغان حجاز میں ابلیس کو مخاطب کرکے اس کی وجۂ تخلیق اور انسان کے ساتھ تعلق ان الفاظ میں سمجھاتا ہے

جہاں تا از عدم بیرون کشیدند
ضمیرش سرد و بے ہنگامہ دیدند
بغیر از جانِ ما آتش کجا بود
ترا از آتشِ ما آفریدند

اور اس طرح شیطان کو تخلیقی اعتبار سے وہ سکون ناآشنا اور شعلہ صفت انسانوں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ وہ شیطان کے انکارِ سجدہ کو بھی ایک گہری نظر سے دیکھتا ہے۔ اور اس کو شیطان کے غرور اور تکبر پر مبنی نہیں کرتا بلکہ اس میں ایک دنیائے مصلحت پنہاں دیکھتا ہے۔ وہ اس انکار کو دو وجوہات پر مبنی سمجھتا ہے۔ ایک خارجی اور ایک داخلی۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے شیطان کو اس انکار پر خود مائل کیا کیونکہ خدا ایک رقیب چاہتا تھا جس کے مقابلے میں اپنی بے پناہ قوت کا مظاہرہ کرسکے۔ وہ اس پرسکون دنیا میں ہنگامہ پیدا کرنا۔ اور اپنے شاہکار کا امتحان لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ خدا اس طاقت ور حریف کے مقابلے میں وہ لذت محسوس کرتا ہے کہ جب کبھی انسان کی زبونی اور اس کی لسپت ہمتی سے گھبرا کر ابلیس درگاہِ خداوندی میں پکار اٹھتا ہے کہ ؎

حرفِ استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

اور خدا سے معافی کا خواستگار ہوتا ہے تو خدا اسے پھر اسے مقابلہ پر آمادہ کرنے کے لئے سے غیرت دلاتا ہے۔ اور فرشتوں سے مخاطب ہو کر اور ابلیس کو سنا کر کہتا ہے :۔

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے
کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

اسی نظریئے کے ماتحت اقبال شوخ انداز میں خدا سے کہتا ہے ؎

مرا گوئی کہ از شیطاں حذر کن
بگو با من کہ او پروردۂ کیست؟

اور جب کبھی وہ خدا کو طعنہ دینا چاہتا ہے تو جھٹ اس واقعے کی طرف پلٹ پڑتا ہے، وہ کہتا ہے کہ تو اپنے چاہنے والوں کی دل داری نہیں کرتا کسی ایک کا ہو کر نہیں رہتا معمولی معمولی واقعات پر ان سے رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر انھیں ہمیشہ کے لئے نظروں سے گرا دیتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

جرمِ او از سجدۂ تقصیر ما از دانہ
نے بہ او بیچارہ می سازی نہ با ما ساختی

اور پھر شیطان کی وکالت کا حق یوں ادا کرتا ہے ؎

ازل سے جرم کا ہے اس کے تذکرہ جاری
کسی غریب کو یوں بھی نہ کوئی خوار کرے

وہ کہتا ہے کہ خدا کا شاہکار یعنی انسان شیطان کے بغیر ایک بے معنی نقش بن کر رہ جاتا۔ خدا کو خود احساس تھا کہ قصۂ آدم بہت پھیکا پھیکا ہے اسلئے اس کو رنگین کرنے اور خود کو ایک کامل نقاش ثابت کرنے کے لئے اس نے شیطان کو قربانی کا بکرا بنایا۔ چنانچہ شیطان جبرئیل امین سے کہتا ہے ؎

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

اقبال کو گلہ ہے کہ خدا کا ہر نقش ابتدا میں بے رنگ ہوتا ہے۔ اور وہ اس کو رنگین کرنے کے لئے ہمیشہ اپنے پیاروں کا خون اس پر چھڑکتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ پہلے تو تو نے قصۂ آدم کا ہنگامہ بپا کیا۔ اور اس کو رنگین کرنے کے لئے خون ابلیس کی قربانی دی۔ اور اب یہ دنیائے رنگ و بو جو تیرا نقش ثانی ہے اسکی یک رنگی اور ویرانی کو دور کرنے کے لئے خون آدم سے اسے رنگین کر رہا ہے اور اس سے پوچھتا ہے :-

ندانم تا کجا ویرانۂ را
دہی از خون آدم رنگ و آبے

انکار سجدہ کی دوسری وجہ داخلی ہے۔ اور یہی اس کا زیادہ شاندار رخ ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ ابلیس کا انکار تکبر و غرور کا نتیجہ نہیں ابلیس نے خوب سوچ سمجھ کر یہ اقدام کیا ابلیس اس بات کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ جو جبین نیاز خدائے لم یزل کے سامنے جھکائی جا چکی ہے وہ کسی اور کے حضور میں بھی جھکے۔ اس طرح وہ انسان کو یہ سبق دینا چاہتا تھا کہ وحدت کسے کہتے ہیں اور لا الٰہ کا کیا مطلب ہے۔ وہ انسان کو بتانا چاہتا تھا کہ لا الٰہ کا مظاہرہ اپنی عزیز ترین متاع کھو کر بھی کیا جانا چاہیئے۔ وہ دکھانا چاہتا تھا کہ

نہ ہر کس خود گر و ہم خود گداز است
نہ ہر کس مست ناز اندر نیاز است
قبائے لا الٰہ خونیں قبائے است
کہ بر بالائے نامرداں دراز است

دوسرے وہ عشق کی رمزوں سے خوب واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وصال محبت کی موت کا پروانہ ہے اور وصال دائم تو ابدی موت۔ وہ فراق کی لذت سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ اور اس طرح سوز و ساز اور درد و داغ آرزو کی لطیف خلش کا تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ سبکساران ساحل، اور "تن آسان عرشیوں" کے سرد و بے کیف ذکر و تسبیح سے متنفر ہو چکا تھا۔ اور ان ہمرہان سست عناصر سے بیزار تھا۔ وہ ؎

نہ چھین لذت آہ سحر گہی مجھ سے
نہ کر نگہ کو تغافل سے التفات آمیز

کا ورد چاہتا تھا وہ سرمایۂ سوز و سلسلہ چاہتا تھا لیکن بغیر کسی حسین و لطیف گناہ کے وہ فراق حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی غیرت عشق گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ کسی بھونڈے طریقے سے اپنے محبوب کو ناراض کر کے اس کا غصہ خرید لے۔ وہ "کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے" کا منتظر تھا۔ چنانچہ اسے یہ موقع مل ہی گیا کہ اپنے محبوب کی عظمت یکتائی کی خاطر وصال یار کو بھی قربان کر دے اور اپنی محبت کو بیگانۂ وصال بنا کر دوامی کر لے چنانچہ جاوید نامے میں رومی اقبال کو انکار سجدہ کی وجہ یوں بتاتا ہے ؎

فطرتش بیگانۂ ذوق وصال
زہد او ترک جمال لایزال
تا گسستن از جمال آساں نبود
کار پیش افگند از ترک سجود

اس کے علاوہ اس مجسمۂ قربانی کے دل میں ایک اور خیال بھی تھا جس نے اس کو ترک سجدہ پر مجبور کیا اور وہ تھی آدم کی بھلائی۔ وہ اس کو مجبوری کے گڑھے سے نکال کر اختیار کی بلندیوں پر فائز کرنا چاہتا تھا اور اس کو خلافت ارضی کا تاج پہنانا چاہتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اگر آدم کا کوئی حریف نہ ہوا تو اس کے قوائے عمل مفلوج ہو جائینگے وہ جانتا تھا کہ

زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوق خراش

وہ اس کی پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار لانا اور اسے لذت گناہ سے آشنا کر کے جرأت رندانہ کا حامل بنانا چاہتا تھا۔ وہ اسے جنت کی تن آسانیوں سے نکال کر کارگاہ عالم اور دنیائے مکافات میں لانا چاہتا تھا جہاں وہ اپنے جوہر کو چمکا سکے اور اپنی فطرت کے مطابق خیر و شر کے دوراہے پر جونسی راہ چاہے منتخب کر سکے۔ چنانچہ ابلیس اقبال سے کہتا ہے ؎

تا نصیب از درد آدم داشتم
قہر یار از بہر او نگذاشتم
شعلہ ہا از کشت زار من دمید
او ز مجبوری بہ مختاری رسید
زشتی خود را نمودم آشکار
با تو دادم ذوق ترک و اختیار

نیز ابلیس نے ہر دو جہاں کو بہ یک نظر دیکھنے والی آنکھ سے دیکھ لیا تھا کہ یہ نوزاد خلیفہ دنیا میں کیسے کیسے سیاہ جرائم اور کریہہ گناہوں کا مرتکب ہوگا لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا محبوب یعنی خدا اپنے ایسے شاہکار کی سیاہ کاریوں اور کمزوریوں سے آگاہ ہو جس کو اس نے بڑے پیار اور بڑی بڑی امیدوں سے تخلیق کیا تھا۔ اور اس میں اپنی روح پھونک کر تمام فرشتوں کو اسے سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا شیطان جانتا تھا کہ انسان کے کمزور پہلوؤں کے آشکار ہو جانے سے خدا فرشتوں کی محفل میں بہت شرمندہ ہوگا کیونکہ جب فرشتوں نے جذبۂ رقابت کے زیر اثر خدا سے کہا تھا کہ تیرا یہ خلیفہ دنیا میں جا کر فتنہ و فساد پھیلائے گا اور طرح طرح کے جرائم کا مرتکب ہوگا۔ تو اس کو نہ بنا کیونکہ تیری عبادت اور تیرے احکام کی بجا آوری کے لئے ہم موجود ہیں تو اس نے انہیں جواب دیا تھا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ وہ اپنے محبوب کی شرمندگی

اور سلا وسی برداشت نہیں کر سکتا تھا چنانچہ وہ اسکی پریشانی پر سے "اس پشیمانی کے صدقے میں پشیماں ہو گیا" کہتا ہوا قربان ہو گیا۔ دوسرے شیطان اپنے محبوب کے دوست یعنی انسان کو بھی ان طعنوں اور الزامات گناہ سے بچانا چاہتا تھا اسے اپنے دوست کا دوست بھی خود دوست کی طرح ہی عزیز تھا اور اس کی عزت کے لئے وہ ہر ممکن قربانی پر تیار ہو گیا۔ اس غیور عاشق نے اپنے محبوب اور اس کے دوست کو ان الزاموں اور شرمندگیوں سے بچانے کے لئے دو لاثانی قربانیاں کیں۔ اس نے اپنی تمام عمر طویل کا سرمایہ یعنی وصال دوست جو اس نے زمین و آسمان کے ذرّے ذرّے پر سجدے ثبت کر کے حاصل کیا تھا ایک لمحے میں قربان کر دیا۔ سرداری ملائک۔ اور دیدارِ دوست سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو لئے۔ ان احسان فراموش انسانوں کے بڑے بڑے طعنے اور الزام بھی برداشت کئے لیکن جو دلیرانہ قدم اٹھ چکا تھا اسے پیچھے نہ ہٹایا۔ اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کے جواز میں جان بوجھ کر ڈھیلے یعنی سے متکبرانہ الفاظ کہے اور اپنے آپ کو انسان کا دشمن ظاہر کیا جس سے ہر کوئی یہ سمجھنے لگا کہ چونکہ آدم کی وجہ سے ابلیس اپنے مقاماتِ بلند کھو بیٹھا ہے۔ اسی لئے وہ ہمیشہ آدم کو برائی کے راستوں کی طرف لے جا کر اس سے انتقام لیتا ہے۔ اس طرح ابلیس نے انسان کے آیندہ گناہوں کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لے کر اسے ہمیشہ کے لئے سرخرو اور معصوم بنا دیا۔ اور اپنے محبوب اور اس کے دوست کو ہر قسم کے طعنوں سے بچا لیا۔ چنانچہ شاعر انسان کے اس محسن کو مخاطب کر کے کہتا ہے ؎

تو میدانی صواب و ناصوابم	نروید لالہ از کشت خرابم
نہ کردی سجدۂ واز دردمندی	بجز گیری گناہِ بے حسابم

اقبال سا مفکرِ اعظم ابلیس کے ترکِ سجدہ کو صرف اس لئے کہ یہ ایک گناہ ہے حقارت سے نہیں دیکھتا۔ وہ اس کے اسباب و علل۔ اس کی حیثیت اور اس کے نتائج پر غور کر کے اپنا فیصلہ دیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک گناہ بالذات کوئی بری چیز نہیں۔ بلکہ خارجی ماحول کے ساتھ مل کر اس کی برائی یا بھلائی اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس لئے اقبال کے فلسفۂ گناہ پر غور کرنے سے پہلے اس خارجی ماحول کا جائزہ لینا چاہیئے جس نے اسے گناہ کو اس زاویۂ نگاہ سے دیکھنے پر مجبور کیا۔ اقبال انسانیت کا نقیب ہے۔ اس کا فلسفۂ زندگی کسی خاص حدود میں مقید نہیں لیکن ایک خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کے بعد ہم اسے شاعرِ مشرق بھی کہہ سکتے ہیں اسے یقین ہے کہ اصلاح کا چشمہ بالآخر مشرق کے سنگ زاروں سے ہی پھوٹے گا۔ اور اسی سے ساری دنیا سیراب ہو گی۔ خود مغرب کو اپنی مضرت رساں تہذیب سے کنارہ کش ہو کر اسی کے دامن میں پناہ لینی پڑے گی۔ لہذا اس کی ہر اصلاحی تحریک کا مرکز مشرق ہے۔ اور اس کا ہر ہر لفظ مشرق کو اس خواب گراں سے بیدار کر کے اسے ادائے فرض پر مجبور کرنے کے لئے ہے لیکن اس وقت مشرق خواب تو کیا تقریباً موت کی نیند سو چکا ہے۔ جنگ عظیم سے پہلے تو تمام مشرق پر باستثنائے جاپان ایک گہرا جمود طاری ہو چکا تھا۔ ذوقِ عمل اور حرکت اہلِ مشرق سے بالکل سلب ہو چکی تھی اور ادھر ہندوستان میں مغل شان و شوکت کی شمع دیر سے بجھ چکی تھی۔ ہاں اس کی پگھلی ہوئی موم میں ایک نحیف شعلہ دھیمی دھیمی ہچکیوں سے جل رہا تھا لیکن آخر "غدر" کے آخری سنبھالے کے بعد یہ روشنی بھی ختم ہو گئی۔ کوئی مرکز باقی نہ رہا۔ اور تمام اجزا پریشان ہو کر قابو ہو گئے طبیعتیں سرد ہو کر ہنگامۂ دنیا سے بیزار اور غلط توکل اور گوشہ نشینی پر مائل ہو رہی تھیں۔ ایجاد و اختراع کا ذوق بالکل مٹ چکا تھا۔ جنگ عظیم نے بھی ان ممالک کی حالت میں کوئی قابل قدر تبدیلی نہیں کی صرف اس قدر ہوا کہ چند ن ل چل رہی اور ان میں بھی ترقی کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن ان کی پست فطرت اور مفلس ذہن تقلید کو ہی معراجِ کمال سمجھنے لگے۔ یورپ کی طے کردہ راہوں اور اس کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھا گیا۔ اور اس سے ذرہ بھر بھی ادھر ادھر ہونا گناہِ عظیم تصور کیا جانے لگا۔ ایسی حالت میں ان کو ذوقِ تقلید اور اجتہادِ عمل سے روشناس کرانے کے لئے ابلیس اور اس کے گناہ و ترکِ سجدہ سے زیادہ موزوں اور کون سی چیز ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ان غلام دماغوں کو تقلید کے بندھنوں سے آزاد کرانے کے لئے فلسفی شاعر نے گناہ کو ایک خاص رنگ میں پیش کیا۔ اس نے گناہ اور ثواب کی سرحدوں کو اعمال کے لحاظ سے نہیں بلکہ مقاصد کے اعتبار سے جدا کیا۔ فرماتے ہیں

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش	براہِ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارِ نادر آید	گناہے ہم اگر باشد ثواب است

چنانچہ اقبال ابلیس کے گناہ سجدہ کو بھی اسی رنگ میں پیش کرتا ہے۔ وہ اس گناہ کو محبت کا ایک نادر مظاہرہ سمجھتا ہے۔ جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں ۔

گستاخی و بیباکی رمزیں ہیں محبت کی
ہر شوق نہیں گستاخ، ہر جذب نہیں بیباک

شیرِ میسور سلطان ٹیپو۔ بہشت میں علامہ سے گناہ کا فلسفہ یوں بیان کرتا ہے ؎

چوں برید آدم از مشتِ گلے	با دلے با آرزوئے در دلے
لذتِ عصیاں چشیدن کارِ اوست	غیرِ خود چیزے ندیدن کارِ اوست
زانکہ بے عصیاں خودی ناید بدست	تا خودی ناید بدست آید شکست

اقبال ابلیس کے گناہ کو اگر اسے گناہ ہی کہا جائے۔ آدم اور منصور کے گناہ کا ہم پایہ قرار دیتا ہے۔ بلکہ ابلیس کے گناہ کو زیادہ پرعظمت۔ کیونکہ وہ رہبر ہے۔ اس نے ایسی مثال پیش کی جس کی تقلید لائقِ صد تحسین ہے۔ اس ... مرتبہ مخلوق کو اس کی خودی سے شناسا کیا۔ یہ گناہ دنیا کے تمام گناہوں سے زیادہ رنگین اور رومانی تھا۔ اس گناہ نے

کائنات اور کائنات ہی کیا، دونوں جہان اور لامکاں میں بھی ایک ہنگامہ، ایک حرکت پیدا کردی۔ ذرہ ذرہ گویا خواب سے چونک پڑا۔ آدم کے گناہ نے (جس میں ابلیس کے گناہ کی تقلید اور عام روایت کے مطابق خود ابلیس کا ہاتھ کام کر رہا تھا) اس کو جنت کی بے حس اور سادہ زندگی سے نکال کر دنیا کی چہل پہل میں پہنچا دیا اور منصور کے گناہِ انا الحق نے مسلمانوں کی خوابیدہ قوم کو فرد کی بلندیوں کا نشان دیا اور اسے بلند کیا۔ یہ وہ گناہ ہیں جن پر ہزاروں بے روح سجود اور تسلیم و رضا کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ اسی قسم کی معصیتوں کی نسبت اقبال طاہرہ سے کہلواتا ہے

از گناہِ بندۂ صاحب جنوں — کائناتِ تازہ آید بروں

کاش کہ نوعِ انسانی عموماً اور مشرق خصوصاً آج اپنے زمینی خداؤں کے سامنے اس گناہِ ابلیس کا اعادہ کر سکے۔

ابلیس اقبال کے خیال میں ایک مردِ کامل ہے۔ اس کی روح میں وہ شعلے ہیں جن کی چنگاریاں دنیا کو جہنم زار نہیں بلکہ بقعۂ نور بنا سکتی ہیں۔ ہاں اسے دیدۂ دل سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اقبال جاوید نامہ میں اسے خواجۂ اہلِ فراق کے بلند و ارفع مقام پر متمکن دکھاتا ہے۔ وہ ابلیس کی بلندیوں کو ہم پر منکشف کرنے اور ہمارے دل میں اپنی پستیوں کو اس کی بلندیوں تک لے جانے کی آرزو پیدا کرنے کے لئے ایک ڈرامائی انداز اختیار کرتا ہے۔ وہ پہلے زندہ رود، یعنی خود اپنی طرف سے عام انسانوں کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہوا ابلیس کا ذکر نہایت حقیر الفاظ میں کرتا ہے۔ وہ حلاج سے کہتا ہے، وہ جس نے اپنے آپ کو آدم سے بہتر سمجھا۔ اس کے جام میں شراب تو کجا تلچھٹ بھی نہیں، ہم انسانوں کی خاک گردوں آشنا ہو چکی ہے لیکن آج اس کی آگ کے شعلے کہاں ہیں جس پر ناز کر کے اس نے خاکی آدم کو سجدہ نہ کیا؟ یہ عامیانہ اندازِ بیان زندہ رود کی طرف سے اس لئے اختیار کیا گیا کہ وہ انسانوں کے خیالاتِ خودستائی کی ایک جھلک ہمیں دکھا سکے۔ اور اُن کے فلسفۂ گناہ کا خاکہ پیش کر سکے۔ اس کے بعد وہ ظاہری نقاب اتار پھینکتا ہے۔ اور ہمیں ابلیس کی حقیقت سے آشنا کرانے کیلئے اسی گناہ کے مرتکب یعنی منصور کی زبان سے یہ الفاظ کہلواتا ہے۔

کم بگو از خواجۂ اہلِ فراق — تشنہ کام و از ازل خونیں ایاق
ما جہول۔ او عارفِ بود و نبود — کفر او این راز را بر ما کشود
عاشقی در نارِ او وا سوختن — سوختن بے نارِ او ناسوختن
زانکہ او در عشق و خدمت اقدم است — آدم از اسرارِ او نامحرم است
چاک کن پیراہنِ تقلید را — تا بیاموزی ازو توحید را

اقبال کے خیال میں ابلیس سب سے بڑا موحد ہے اور یہ چیز انسان اور خاص طور پر مشرقی انسان جو، ہر طاقت کے سامنے جھک جانا ایمان سمجھتا ہے صرف ابلیس سے ہی سیکھ سکتا ہے۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ ابلیس نے خدا کے حکم کو نہ مان کر معنوی طور پر اس کی ہستی سے انکار کیا لیکن جیسا کہ منصور کہتا ہے۔ اس کا یہ کفر ہی اس کے ایمان کی بے نظیر پختگی کا ثبوت ہے۔ گو ظاہر میں ابلیس نے سجدے سے انکار کر کے خدا کی حکم عدولی کی لیکن دراصل اس نے خدا کی یکتائی، وحدت اور عظمت پر ایک نہ مٹنے والی مہر ثبت کر دی۔ اس نے تمام مخلوق کے سامنے یہ اعلان کیا کہ صرف خدا ہی پرستش کے قابل ہے۔ اس نے اس راز کو فاش کر دیا کہ

جہاں کی روحِ رواں لا الٰہ الا ہو

وہ غیر اللہ کے سامنے جھکنا جانتا ہی نہ تھا۔ اور اس اصول پر آج تک ڈٹا ہوا ہے اور "بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ" کا ورد کر رہا ہے۔ اس اعلانِ حق کی پاداش میں اس نے کائنات کی سب سے بڑی سزا بخندہ پیشانی قبول کر لی لیکن سچائی سے ایک قدم پیچھے نہ ہٹا۔ چنانچہ اس انکار کی کیفیت وہ شاعر پر خود ہی واضح کرتا ہے

در گذشتم از سجود اے بے خبر — ساز کردم ارغنونِ خیر و شر
از وجودِ حق مرا منکر مگیر — دیدہ بر باطن کشا ظاہر مگیر
گر بگویم نیست این از ابلہی است — زانکہ بعد از دید نتوان گفت نیست
من بلے در پردۂ لا گفتہ ام — گفتۂ من خوشتر از ناگفتہ ام

شیطان کی عظمت اقبال کے نزدیک مسلّمہ ہے بلکہ قابلِ رشک۔ وہ سب سے پہلا فرد تھا جو اپنی خودی سے آشنا ہوا۔ اور جس نے اپنی خودی کو لا الٰہ سے چاشنی دی۔ اس نے دونِ ہمتی اور توکل سے کام نہیں لیا اور پرانی روایات کی اندھا دھند تقلید نہیں کی۔ بلکہ اس نے خود کو، اپنے محبوب کو۔ اور اپنے نوزائیدہ رقیب کو سمجھنے کی دیانتدارانہ کوشش کی اور اس کے بعد اپنے اصول پر ہر طرح کے خطرات سے بے نیاز ہو کر ڈٹ گیا یہاں تک کہ جس کی عظمت اور یکتائی کی خاطر اپنی عظمت قربان کر رہا تھا۔ اس کی خفگی بھی اسے اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکی۔ شیطان ایک تناور درخت تھا جو غضب الٰہی کی تیز آندھی سے ٹوٹ گیا۔ لیکن جھکا نہیں۔ اس کے ٹوٹنے میں بھی ایک شان تھی۔ اس نے سب سے بڑا گناہ کیا اور سب سے بڑی سزا پائی لیکن یہ سزا اس کے عزم و استقلال کو نہیں کچل سکی۔ وہ اس نکتہ کو سمجھ چکا ہے کہ

گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

وہ دوگنے حوصلے سے اس طاقت کا مقابلہ کر رہا ہے اور اسی قدر حوصلے سے اپنی سزا برداشت کئے جا رہا ہے۔ وہ شکست کھا کر بھی شکست ماننے پر تیار نہیں اور یہی فتح ہے یہی شکست اس کی فتح کا پیش خیمہ ہو رہی ہے۔ بلکہ اقبال کے خیال میں تو ابلیس کی زندگی کی عظمت اور رنگینی انھیں لمحات میں اپنی انتہائی بلندیوں کو پہنچی جب اس نے

ایک اصول کی خاطر سب سے بڑی قربانی دی۔ اس گھڑی اس نے اپنی زندگی کا سب سے درخشاں ورق الٹا۔ اقبال "مومن ابلیس" اور "کافر ابلیس" میں بہت زیادہ فرق دیکھتا ہے۔ اس کے خیال میں اس شکست نے اس کو اپنی پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار لانے اور اپنا امتحان کرنے کا ایک سنہری موقع دیا۔ اور ابلیس نے اس سے پوری طرح فائدہ اٹھایا۔ ملٹن "جنتِ گم شدہ" میں ابلیس کی شکست کو اس کے اصلی رنگ میں نہیں دیکھ سکا۔ وہ راندۂ درگاہ ابلیس کو برباد عظمت (FALLEN GLORY) کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ اور پھر ابلیس کو تسلی دینے کے لئے کہتا ہے "خیر ابھی سب کچھ برباد نہیں ہوا۔ ناقابل تسخیر عزم اور جذبۂ انتقام ابھی نہیں چھینا جا سکا"۔ ملٹن ابلیس کی اس شکست کو اس کی کمزوری سے تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ "جنتِ گم شدہ" میں فردوس اور افلاک سے نکالے جانے کے بعد ابلیس خود سے مخاطب ہو کر کہتا ہے "مغلوب فرشتے! کمزور ہونا سب سے بڑا عذاب ہے"۔ لیکن اقبال کے خیال میں یہ شکست اسے اپنی کمزوریوں کی وجہ سے نصیب نہیں ہوئی بلکہ یہ شکست تو اس کی طاقت کا ثبوت ہے وہ اُسے اُس کی جفا طلبی پر محمول کرتا ہے اور کہتا ہے۔

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی

وہ اسے شکست ہی نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے کہ ابلیس جان بوجھ کر معتوب رکھا ہوا۔ تاکہ اپنی فتح کے لئے نئے نئے بے پایاں میدان حاصل کر سکے۔ اور اس بے کاخ و کو لامکاں سے نکل کر دنیائے رنگ و بو میں آئے۔ اور ساحل پر کھڑا ہو کر تماشا دیکھنے کی بجائے دریا میں طوفان انگیز موجوں کے تھپیڑے کھائے۔ چنانچہ جب جبرئیل اس کو چاکِ دامن کے رفو کا مشورہ دیتا ہے تو وہ اسے جواب دیتا ہے۔

دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون دریا کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو؟
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو۔ اللہ ہو۔ اللہ ہو!!

وہ اسے بتاتا ہے کہ یہی چاکِ دامن اس کو ہمیشہ کے لئے مست کر گیا ہے۔ اور اسی چاکِ دامن نے اس کو یہ قدرت عطا کی ہے کہ اب اس کے طوفان یم بہ یم۔ دریا بدریا۔ جو بہ جو بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کو اس شکست نے وہ لطف دیا ہے کہ اب وہ دوبارہ فتح پانا ہی نہیں چاہتا۔ بلکہ شکستیں کھاتا جاتا ہے، مقابل ہوتا جاتا ہے"۔ وہ جبرئیل کی اس چاک دامن کے رفو والی تجویز کی سادگی پہ ہنستا ہے اور اسے اپنی لذتِ شکست کا یوں احساس دلاتا ہے ؎

آہ اے جبرئیل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو

اور پھر اپنی شکست کے تعمیری پہلوؤں کی طرف اس کی توجہ مبذول کراتا ہے۔

جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا

وہ تو شکستِ قدح سے اس قدر سرمست ہو چکا ہے کہ پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو"۔ حلاج اس کی شکست کو علامہ اقبال سے یوں بیان کرتا ہے ؎

از فتادن لذتِ برخاستن
عیش افزودن ز دردِ کاستن

اور یہ ہے بھی درست کہ "سختی ناکشیدہ کم عیار است"۔ اقبال کے خیال میں شیطان خدا پر اس معاملے میں فوقیت رکھتا ہے کہ یہ لذتِ شکست سے آشنا ہو چکا ہے اور وہ محروم اور ؎ اگر شکست کا امکان نہیں تو کچھ بھی نہیں

اقبال شیطان کو ایک کامیاب اور با اصول باغی سمجھتا ہے جس میں جرأت ہے۔ طاقت ہے۔ بے باکی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر قربانی کا مادہ ہے ابلیس کچھ ہاتھ نہیں آتا بے جرأتِ رندانہ" کی زندہ مثال ہے ارمغانِ حجاز میں جب ابلیس کی مجلس شوریٰ منعقد ہوتی ہے تو آغاز میں ہی ابلیس اپنی افتتاحی تقریر میں انسان اور اس کی دنیا کو ان لافانی الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

یہ عناصر کا پرانا کھیل یہ دنیائے دوں
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں

اور اس میں کوئی مبالغہ بھی نہیں کہ جب خدا نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو تمام فرشتے جوشِ رقابت سے جل اٹھے اور خدا سے کہنے لگے تو اسے کیوں پیدا کرتا ہے۔ وہ دنیا میں فتنہ و فساد پھیلائے گا۔ تیری عبادت کو ہم کافی ہیں لیکن جب خدائے بے نیاز نے ان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آدم کو پیدا کیا۔ اور ان کو حکم دیا کہ اس کو سجدہ کرو تو سب سجدے میں گر گئے۔ اور اپنے اصول کی کسی نے بھی پرواہ نہ کی لیکن ایک مردِ خدا با اصول باغی کھڑا رہا۔ اور پکار پکار کر کہتا رہا۔

جز آں رہے کہ فرمودی نپویم	غلامم جز رضائے تو نجویم
خرے را اسپ تازی گو نگویم	ولیکن گر بہ ایں ناداں بگوئی

اسے ہمیشہ کے لئے جنت سے نکال دیا گیا۔ سرداری کا رتبہ اس سے چھین لیا گیا۔ اسے جہنم کے شعلوں کی نذر کرنے کی ٹھانی گئی لیکن وہ نہیں گھبرایا۔ اس نے اپنے اصول اور عقیدۂ وحدتِ ربانی کی قربانی گوارا نہ کی اور اس طرح با اصول اور نیک نیت بغاوت کی مثال دنیا میں ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا جس کی تقلید سے انسان نے ہزاروں فرعونوں اور لاکھوں شدادوں سے نجات حاصل کی۔ اب بھی ؎

سینۂ ابلیس سے اٹھتی ہے آہِ سوز ناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر

اس نے جنت کی خاطر جوہر خودی کو نہیں بیچا اور "حیات کیا ہے نقطۂ جوہر خودی کی نمود" یہ بغاوت جاہلانہ اور خود غرضانہ غداری سے بہت بلند درجہ رکھتی ہے اور اسی لئے جعفرِ بنگال اور صادقِ دکن اپنی ملت اور قوم سے غداری کرنے کی وجہ سے خوار و زار ہیں۔ دوزخ بھی انہیں نہیں قبولتا اور کہیں انہیں امان نہیں مل سکتی لیکن شیطان سب سے بڑی اور مقدس طاقت سے بغاوت کرنے کے باوجود اب بھی آزاد اور قوی ہے اور آج بھی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ؎

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو
کیا زمیں کیا مہر و ماہ کیا آسمان تو بتو
دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا شرق و غرب
میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو
کیا امامانِ سیاست کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو

نقالی کا ہنر آج کل دنیا میں بہت ترقی کر گیا ہے۔ اور نقالوں کے لئے ایسی اشیا یا ایسی صفات جو تمام دنیا کے لئے سامانِ حیرت بنی ہوئی ہوں اور جن کے سامنے دنیا بے مانگے کا دم بھرے اور بھی توجہ طراز ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں ابلیسی صفات کی نقالی بھی شروع ہو گئی ہے۔ لیکن اس موسن صفت اقبالی ابلیس اور ان نوزادہ ابلیسوں میں وہی فرق ہے جو خدا اور فرعون میں۔ یہ خاکی ابلیس بھی عوام کی طرح شیطان کے ظاہری افسانے اور اس کی ظاہری صفات سے دھوکا کھا گئے اور ان کی ہی نقالی شروع کر دی۔ چونکہ ان کے خیال میں ابلیس کا کام گناہ کی طرف رہبری کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لئے انہوں نے بھی اپنی زندگی کا مقصد گناہوں کی تبلیغ ہی بنا لیا۔ اور گناہ بھی ایسے جو بالکل بے سود ہیں۔ ان خاکی ابلیسوں میں بلندیٔ نظر نہیں۔ جرأتِ رندانہ نہیں۔ ذوقِ خراش نہیں چنانچہ وہ مردہ شکار کے گرد گِدھوں کی طرح جمع ہو کر اس کو مغلوب کر لینا ہی بڑا کمال سمجھتے ہیں۔ انہیں اس شاہیں صفت شیطان سے کوئی نسبت نہیں جو "شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں" کا قائل ہے۔ یہ نقلی شیطان اقبالی شیطان کے انکارِ سجدہ کی روح تک پہنچنا تو ایک طرف اسے سمجھ بھی نہیں سکتے۔ وہ اسے خدائے برتر کے ہر حکم سے انکار کے مترادف سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ بالکل وہی بات ہے جیسے کوئی جاہل بر خود غلط انسان منصور کی پردہ در نظر اور غیر اللہ شکن دل پیدا کئے بغیر اور اس بلند مقام پر پہنچے بغیر جہاں اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ۔ اور اس کی زبان خدا کی زبان ہو چکی تھی انا الحق کے نعرے لگاتا پھرے اور بزعم خود منصورِ ثانی ہو جائے قدرت کے کھیل کہ ان زبوں شیطانوں کو مومن بھی ایسے ہی مل گئے۔ جو یزدانی صفات سے بالکل عاری ہیں جو تقدیرِ یزداں کے شکوے تو کرنا جانتے ہیں لیکن اپنی ہنگامہ پرور مشتِ زندہ خاک کو اسیرِ گردشِ دوراں اور تابعِ ستارہ کر چکے ہیں جن کے پاس دلِ روشن اور نفسِ گرم نہیں۔ جن کی آستیں یدِ بیضا سے خالی ہو چکی ہے۔ جذبِ اندروں باقی نہیں ان کی اصل تو شاہینی ضرور ہے لیکن آنکھوں میں بے باکی نہیں انہیں کی نسبت حق دیدہ کامل عیار شیطان کہہ اٹھتا ہے ؎

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

یہ لوگ ان نقال شیطانوں سے بے نور و سرد اور مردہ گناہوں پر جان دیے بیٹھے ہیں۔ اقبال ان خاکی ابلیسوں سے بہت بیزار ہے۔ اور ان کے شکاروں کو ان کی اصلیت سے آگاہ کر کے متنفر کرنا چاہتا ہے ؎

چہ شیطانے خراشِ دارش گونے	کند چشمِ ترا کور از فسونے
من اورا مردہ شیطانے شمردم	کہ گیرد چوں تو نخچیرے زبونے

اور پھر ان لوگوں کو وجہ بتاتا ہے کہ کیوں ان کے دل سرد ہو چکے ہیں جس سے وہ بآسانی ان ابلیسوں کے پھندوں میں پھنس جاتے ہیں ؎

بشر تا از مقامِ خود فتاد است	بقدرِ محکمی ادراک شاد است
گنہ ہم مے شود بے لذت و سرد	اگر ابلیسِ تو خاکی نہاد است

لیکن زمانہ آخر مردوں سے بالکل خالی تو نہیں۔ اس وقت بھی ایسے بلند ہمت لوگ موجود ہیں جو ان مازہ خداؤں سے بیزار ہیں۔ اور اس مومن شیطان کو اپنا دوست ہمدم سمجھ رہے ہیں۔ ان لوگوں کی بابت شیطان خود کہتا ہے ؎

ہے اگر کوئی خطر مجھ کو تو اس امت سے ہے	جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ	کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

ان گناہ پسند لیکن خوددار لوگوں کو مخاطب کر کے اقبال ان کمینے ابلیسوں سے بچنے کی تاکید کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

مشو نخچیرِ ابلیسانِ ایں عصر	خساں را غمزۂ شاں سازگار است
اصیلاں را ہماں ابلیس خوشتر	کہ یزداں دیدہ و کامل عیار است

اس کے بعد اقبال اپنے محبوب ابلیس اور ان رذیل خاکی ابلیسوں اور ان کے نخچیروں کا موازنہ یوں کرتا ہے ؎

حریفِ ضربِ او مردِ تمام است	کہ آں آتش نسب والا مقام است

نہ ہر خاکی سزاوارِ نگاہِ او
کہ صیدے لاغرے بردے حرام است

وہ پھر ان صاحبِ دل مردوں کو غیرت مندانہ گناہ کی برتری اور اس کو حاصل کرنے کا طریقہ یوں بتاتا ہے ؎

ز فہمِ دوں نہاداں گرچہ دور است
ولے ایں نکتہ را گفتن ضرور است
بہ ایں نوزادہ ابلیساں نسازد
گنہگارے کہ طبعِ او غیور است

اقبال بغض و دماغ ملاؤں کی طرح ابلیس کو انسان کا خطرناک دشمن نہیں سمجھتا اور نہ انھیں اس سے دور رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ اس کے خیال میں یہ حرکت اس عظیم ہستی کی لاثانی قربانی اور قضائے ربانی کا انکار ہے۔ وہ تو کہتا ہے ؎

دلِ شیطاں ہم نہ توانم آزرد
گنا ہے گاہے گاہے مرا ثواب است

اس کے خیال میں خطروں سے دور رہ کر اور ان سے ڈر ڈر کر جینا بھی موت ہے

نہیں ہے ایسی فضاؤں میں لذتِ پرواز
جہاں نہ باز کا خطرہ نہ حملۂ شہباز

خودی خطرہ لائے بغیر ضعیف ہو جاتی ہے۔ اقبال انسان کو یا کم سے کم مومن کو ایک تیغِ اصیل سمجھتا ہے اور شیطان کو سنگِ فساں۔ اس کے عقیدے میں جس قدر بھی یہ تیغ اس پتھر سے ٹکرائے گی اس سے کفر سوز شعلے نکلیں گے اور اس کی چمک اور کاٹ بڑھتی جائے گی۔ وہ کہتا ہے کہ اگر دشمن مضبوط ہو تو یہ خدا کا فضل ہے۔ کیونکہ اس طرح ہم اپنے ممکنات کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور ان کا امتحان کر سکتے ہیں۔ وہ مومن کو شاہین سمجھتا ہے اور کافر کو کبوتر۔ کبوتر پر جھپٹ کر شاہین اپنا خون تو گرم رکھ سکتا ہے لیکن اپنی طاقت کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ اس لئے اسے اپنے سے زیادہ طاقتور یا کم سے کم اپنے جیسا کوئی حریف بھی چاہیئے اور یہ جگہ ابلیس پُر کرتا ہے چنانچہ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں اس کا پانچواں مشیر اس دنیا کو رنگین بنانے اور اس کے نظام کو پختہ کرنے میں ابلیس کا حصہ یوں بیان کرتا ہے ؎

اے ترے سوزِ نفس سے کارِ عالم استوار
تو نے جب چاہا کیا ہر پردگی کو آشکار
تجھ سے بڑھ کر فطرتِ آدم کا وہ محرم نہیں
سادہ دل بندوں میں جو مشہور ہے پروردگار

اقبال اپنے اس پرانے محسن اور موجودہ رفیقِ کار کو پہچانتا ہے۔ اس کی خدمات سے پوری طرح واقف ہے۔ اور اس کی بلند آرزوؤں کو سامنے رکھ کر اپنی تمناؤں کو بلند کرتا ہے۔ اور ان کی تکمیل کے لئے اس سے مدد بھی مانگتا ہے۔ اقبال اس دنیا کو ہی جنت بنانا چاہتا ہے۔ اس کے خیال میں انسانوں نے اپنے پیہم عمل سے اس کو جنت کی مانند رنگین اور دل فریب بنا دیا ہے۔ صرف اس کے دوامی ہونے کی کسر باقی ہے۔ وہ خدا سے کہتا ہے ؎

یکے انداز کن سود و زیاں را
چو جنت جاوداں کن ایں جہاں را
نمے بینی کہ ما خاکی نہاداں
چہ خوش آراستیم ایں خاکداں را

لیکن خدا اسے جاوداں کر کے آدم کی تخلیق کو اپنی جنت کے مقابلے میں لانا کب پسند کر سکتا ہے۔ وہ اپنے حسین نقش کی شانِ یکتائی کو کب ذلیل کر سکتا ہے؟ چنانچہ اس طرف سے مایوس ہو کر اقبال اپنے اس ہمدمِ دیرینہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس سے خدا کا گلہ کرتا ہے ؎

جہانِ خویش با سوداگراں داد
چہ داند لامکاں قدرِ مکاں را؟

اور پھر اسے دنیا کو جنت بنانے کی وجہ بتاتا ہے۔ اور اس کو احساس دلاتا ہے کہ یہ خاکداں ہم بلند ہمت لوگوں کے رہنے کے قابل نہیں ؎

بگو ابلیس را از من پیامے
طپیدن تا کجا در زیرِ دامے
مرا ایں خاکدانے خوش نیاید
کہ صبحش نیست جز تمہیدِ شامے

اور جب اسے یہ احساس دلا چکتا ہے کہ یہ دنیا ہمارے قابل نہیں تو اسے ایک اور طریقہ بتاتا ہے جس سے دونوں شریکِ کار فائدہ اٹھا سکیں۔ کہتا ہے :-

بیا تا نرد را شاہانہ بازیم
جہانِ چار سو را در گدازیم
بہ افسونِ ہنر از برگِ کاہش
بہشتے ایں سوئے گردوں بسازیم

اس تجویز سے دونوں کا مطلب حل ہو سکتا ہے۔ شیطان خدا سے انتقام لے سکتا ہے۔ کیونکہ دنیا کے بہشت بن جانے سے ابلیس اور آدم کا جنت سے نکالا جانا بے معنی سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور دوسرے انسان کا ذوقِ تخلیق بھی پورا ہو جاتا ہے لیکن معلوم نہیں شیطان اس تجویز سے متفق ہو کہ نہ ہو کیونکہ اس کے خیال میں ؎

جنتِ ملا مے و حور و غلام
جنتِ آزادگاں سیرِ دوام

افسوس ہے انسان کی فطرت پر کہ اب یہ احسان فراموش اس قدر پست ہو چکا ہے کہ خدا تو کیا ابلیس کے کام کا بھی نہیں رہا۔ اب اس کا یہ ہمدم بھی جس نے اس کی ہم نشینی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اس سے بیزار ہوتا جا رہا ہے۔ وہ ایک بلند ہمت باغی ہے جس کو مسلسل مقابلے میں ہی لطف حاصل ہوتا ہے۔ وہ کمزور بے جان اور زبوں صید کو مقابلے میں دیکھ کر آب آب ہو جاتا ہے۔ وہ شیر ہے جس کو شکار پر جھپٹ کر اسے پکڑنے میں ہی سکون ملتا ہے۔ اس کے لئے ناممکن ہے کہ گِدھوں کی طرح مردوں کے گرد بیٹھ کر ان کا گوشت نوچے لیکن انسان اس قدر مردہ سرشت ہو چکا ہے کہ وہ خود ہی شیطان کے سامنے لیٹ جاتا ہے۔ اور اس سے کہتا ہے کہ آ مجھے پکڑ۔ اس میں شیطان کا مقابلہ کرنے اور اس کو مغلوب کرنے کی طاقت نہیں ہی وہ انکار سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ حق ہو یا باطل اسے حکم بجا لانے سے کام اس نے خود کو

کلی طور پر شیطان کے قبضے میں دے کر اس کی تخلیق کے مقصد کو مہمل بنا دیا ہے۔ ابلیس تو اس کو ایک کسوٹی کا کام دیتا تھا جس پر وہ اپنی قوت ایمان کو پرکھ سکے لیکن جب اس نے یہ جوہر ہی کھو دیا تو اب کسوٹی کا کیا فائدہ۔ چنانچہ پہلے تو شیطان آخری بار انسان کے دل کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ اور اسے بلند ہونے کی دعوت دیتا ہے ؎

تو نجاتے دہ مرا از نارِ من ۔۔۔ وا کن اے آدم گرہ از کارِ من

اے کہ اندر بندِ من افتادۂ ۔۔۔ رخصتِ عصیاں بہ شیطاں دادۂ

در جہاں با ہمتِ مردانہ زی ۔۔۔ غمگسارِ من! ز من بیگانہ زی

بے نیاز از نیش و نوشِ من گزر ۔۔۔ تا نہ گردد نامہ‌ام تاریک تر

لیکن جب آدم سے بالکل مایوس ہو جاتا ہے۔ تو آخر دل داری کی امید لے کر خدائے دو جہاں کی درگاہ میں حاضر ہو کر فریاد کرتا ہے۔ پہلے اسے بتاتا ہے کہ انسان نے جس کی خاطر اس نے جنت سے نکلنا گوارا کیا اپنی دون فطرتی کے باعث اس کے ساتھ کیا کیا۔ اور پھر اسے انسان کی موجودہ حالت زار کا نقشہ دکھاتا ہے ؎

اے خداوندِ صواب و ناصواب ۔۔۔ من شدم از صحبتِ آدم خراب

خاکش از ذوقِ ابا بیگانہ ۔۔۔ از شرارِ کبریا بیگانہ

از چنیں صیدے مرا آزاد کن ۔۔۔ طاعتِ دیروزۂ من یاد کن

فطرتِ او خام و عزمِ او ضعیف ۔۔۔ تابِ یک ضربم نیارد ایں حریف

اور اس کے بعد اپنی پرانی عبادتوں کا واسطہ دے کر اس سے ایک بھیک مانگتا ہے۔ ایسی بھیک جس کو سن کر انسان کو ڈوب مرنا چاہیئے۔ ابلیس اپنے حریف سے بھیک بھی مانگتا ہے تو ابنِ آدم کی برتری کی۔ اپنی شکست اور ان کی فتح کی بھیک۔ وہ ان کو سربلند دیکھنا چاہتا ہے۔ ان کے لئے ایک پختہ کار رہبر مانگتا ہے جو ان کو صحیح راستے پر چلا سکے۔ وہ اپنے نامرد رفیق یعنی انسان کی بہتری کو اب بھی نہیں بھولتا۔ اور خدا سے کہتا ہے ؎

منکرِ خود از تو مے خواہم بدہ ۔۔۔ سوئے آں مردِ خدا راہم بدہ

بندۂ باید کہ پیچد گردنم ۔۔۔ لرزہ اندازد نگاہش در تنم

اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست ۔۔۔ لذتے شاید کہ یابم در شکست

کیا اس وسیع دنیا میں آدم کا کوئی بھی سعادت مند بیٹا نہیں جو عالم انسانی کے دو بڑے ہمدردوں یعنی اقبال اور ابلیس کی مشترکہ آرزو پوری کر کے اپنے خدا، اور خود اپنے دامن کے داغ دھو ڈالے اور کائنات میں انسان کا نام بلند کر دے؟ ✤

مسعود احمد قریشی

غزل

مرا ہر سانس ہے سازِ محبت
میں ہوں اک نغمہ پروازِ محبت

مذاقِ ضبط! ہاں تائید کرنا
اُٹھی ہے دل سے آوازِ محبت

محبت چھلکی پڑتی ہے نظر سے
نہاں کیونکر رہے رازِ محبت

غموں کی راگنی سوہانِ دل تھی
اُٹھانا ہی پڑا سازِ محبت

نہیں معلوم کیا ہونا ہے انجام
بہت رنگیں ہے آغازِ محبت

نرالا میرا ذوقِ حسن اختر
انوکھا میرا اندازِ محبت

اختر انصاری

جنگ

مضمحل تھا شعلۂ تحریک و پرواز و نمود
عرصۂ تخلیق اک سویا ہوا سنسار تھا
زندگی گرمِ تنفّس تھی، مگر زندہ نہ تھی
زندگی تھی جیسے اک ساحل پشیمان و ضعیف
جس طرح تالاب میں محبوس پانی کا خرام
اک دمکتے پھول کا جیسے شرارِ مضمحل
جیسے اک فانوس جس میں نور ابھی جھلکا نہ ہو
جیسے اک مے جس میں تلخی ہو نہ نشہ کا جلال
جیسے اک رنگین صورت، جیسے اک سطحِ حسیں
اک طائر جس نے پر اپنے کبھی تولے نہ ہوں
اک دھنک جو رنگ کی حد سے نہ بڑھنے پائی ہو
اک نغمہ جو فضا میں گونجنے پایا نہ ہو
زندگی زنجیرِ احکام و ادب میں قید تھی

تھے ازل کے دن فسردہ سے فرشتوں کے سجود
اونگھتے ماحول میں اک موسمِ بیمار تھا
خون کی رَو میں خودی کی برق تابندہ نہ تھی
بن نہیں سکتا جو اک ننھے سے قطرے کا حریف
یا غلامی کے لبوں پر ایک پھیکا ابتسام
جس سے ٹکرا کر پتنگے کا جنوں ہو منفعل
اک گدا کا جامِ تشنہ جو کبھی چھلکا نہ ہو
جیسے اک زاہد کا بے حدّت مگر روشن خیال
جس کی تہ میں گرم سیرت ہو نہ شعلہ آفریں
کچھ جھجکتے عزم جو ہنس کر کبھی بولے نہ ہوں
دوپہر جو ناز سے کھل کر نہ چڑھنے پائی ہو
اک ستارہ جو کبھی سورج سے ٹکرایا نہ ہو
اک اطاعت تھی، حریفانہ روش ناپید تھی

خاطرِ خلّاق میں اک کشمکش پیدا ہوئی
سازِ ہستی کو نوائے بے بدل بخشی گئی
لذّتِ انکار سے خلّاق کا دل جھوم اُٹھا
خود خدا نے اہرمن کو جنگ آمادہ کیا

بربطِ تخلیق میں اک برق سی لہرا اٹھی
زیست کو آزادیٔ فکر و عمل بخشی گئی
اپنی رَو پر زندگی کا گرم خوں بہنے لگا
حریّت کے ساز کو آہنگ آمادہ کیا

جنگ ہے آزاد روحوں کا سرودِ آتشیں
زلفِ خودداری کا بل کھاتا ہوا ضدّی جمال
زندگی کے بال و پر کا اک سنہرا امتحاں
دندناتی آندھیوں کا گرم اور وحشی ضمیر

ایک بے پروا نظر، اک خود نما سرکش جبیں
خون کے چھینٹوں سے اک بے باک اظہارِ خیال
ایک لامحدود گویائی کی طوفانی زباں
حریّت کی روح، آزادی کا سیمابی ضمیر

فطرتِ ہستی کے اُس پہلو کی اک رنگیں جھلک
باندھتی ہے خون کی لہروں سے جو نغموں کا رنگ
خندقوں میں سرد لاشیں دیکھ کر گاتی ہے جو
بے حرارت ہڈیوں سے قہقہے سنتی ہے جو

ذہن کی وہ آگ، قلب و جاں کی وہ گہری کھٹک
تیغ و طیارہ سے سنتی ہے نوائے ساز و چنگ
موت کی سب کیفیوں کو وجد میں لاتی ہے جو
توپ کے ہول آفریں نغمے پہ سر دھنتی ہے جو

علم و عرفاں کے سنہری جام و شیشہ کی کھنک
عقل و دانش کی ملائم زلف کا سحر و جمال
زندگی کی قدرتی رَو کو دبا سکتے نہیں
فلسفہ کے ریشمیں پردے تدبّر کا نقاب

نرم لفظوں کا فسوں، روشن خیالوں کی چمک
حکمت و تادیب کے محراب ابرو کا ہلال
آنکھ اس تیغِ برہنہ سے ملا سکتے نہیں
پھونک کر ہوتا ہے ظاہر زندگی کا التہاب

یہ وہ بجلی ہے جو لہرانے سے ٹل سکتی نہیں
کچھ بھی ہو تہذیب فطرت کو بدل سکتی نہیں

رسید، عبدالحمید عدمؔ

دو رباعیاں

میخانے میں جو رنگینیاں دیکھیں میں نے
چینیاں کیسی صورتیں دیکھیں میں نے
ساقی سے جو ہاتھ کھول کے گرا دو شے سے جام
اس پھول کی سب پتیاں چن لیں میں نے

پیتے ہیں جو بے خودی تصویر کنول کی
پتی جل میں بھاری ہے بہتا ل میں ٹکی
پروانہ سبک مست نظر سحر و دا غوش
کہتے ہیں اسے لال پری شیش محل کی

اشتر مقتدری

مُلازمہ

وہ نوکرانی کہ مفلسی جس کو خدمتوں سے لگا چکی ہے
جو عجلتِ کار کے تقاضوں میں کھو گئی، ہر بڑا چکی ہے
جو جلدی جلدی کباب تلنے میں ہاتھ اپنے جلا چکی ہے
جو اپنے بھوکے یتیم بچے کو دے کے ٹکڑا اٹھا چکی ہے
یہ لغزشیں ہیں کہ جن پہ بیگم اُسے ہزاروں سُنا چکی ہے

زباں کی قینچی میں خنجرِ آبدار کا رنگ آگیا ہے
ٹریل میلی پڑی ہوئی ہے، چھری پہ بھی زنگ آگیا ہے
نفاست و شستگی کا وہ حال۔ خیر دل تنگ آگیا ہے
نظر بچا کر۔ نمک حرامی کا ناروا ڈھنگ آگیا ہے
خراب ہے چوٹی کی میزانِ عقل۔ پاسنگ آگیا ہے
میں سب سمجھتی ہوں رات جس طرح دودھ بلّی گرا چکی ہے

یہ طنزِ آقا کہ پانچ بجتے ہیں۔ چائے تیّار کیوں نہیں ہے
"ابھی اُٹھی ہوں سے" مجھ کو مطلب سحر سے بیدار کیوں نہیں ہے؟
تتر بتر ہیں لباس و بستر مات تجھے سروکار کیوں نہیں ہے
بھری ہیں کیوں گھنگنیاں سی منہ میں، زبانِ اقرار کیوں نہیں ہے
یہ جس کے لچھن، یہ جس کے کرتوت ہوں خطاوار کیوں نہیں ہے
تجھے ہماری عنایتِ چشم پوش کاہل بنا چکی ہے

پکڑ لئے ہیں قدم زمیں نے کھڑی ہے مجبور سر جھکائے
نہیں سزاوارِ پیشِ خدمت کہ ہونٹ کھولے زباں ہلائے
جبیں سے بے چارگی ہویدا مصیبتِ دل کہی نہ جائے
دماغ کے ساتھ گھر کی "ہر چیز" جیسے لٹّو کوئی گھمائے
نظر میں بیگم کے دھندلے دھندلے نقوش جس طرح نیند آئے
ڈراؤنا خواب اسر کو آقا کی ٹھوکروں سے لگا چکی ہے۔

مگر تکبّر نے عاجزی کو نہ لائقِ التفات سمجھا
ستم شعاری نے سجدۂ عفوِ جرم کو واہیات سمجھا
اصیل۔ مُردار۔ سست۔ منحوس۔ بدنظر، نیچ ذات سمجھا
غرورِ سرمایہ نے غریبی کو پیکرِ بے حیات سمجھا
وہ جس نے گھر بھر کی خدمتوں کو فریضۂ کائنات سمجھا
"ابھی نکل جا" کا حکم پاتے ہی اپنا بستر اُٹھا چکی ہے

[illegible]

اجرت

ابھی میں نے کناٹ پلیس کے دو ہی چکر کاٹے تھے کہ دو خوبصورت نوجوان لڑکیاں بہت ہی بھڑکیلی ساڑھیاں پہنے آتی ہوئی دکھائی دیں۔ سب لوگوں کی نظریں اُن کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ میں نے بھی انہیں غور سے دیکھا۔ ان میں سے ایک سے میری نظر ملی اور پھر ملی ہی رہی۔ نہ اُس نے نگاہ نیچی کی نہ میں نے۔ وہ قریب آ رہی تھی اور کچھ حیرت سے مجھے تک رہی تھی۔ اور مجھے اس کے اس طرح دیدے پھاڑ کر دیکھنے پر تعجب ہو رہا تھا۔ جب بہت ہی قریب آگئی تو اُس کے قدم سست پڑ گئے۔ میں نے بھی نہ جانے کیوں اپنی رفتار ہلکی کر لی۔ وہ مسکرانے لگی۔ میں بھی مسکرا پڑا۔ پھر وہ ٹھہر گئی۔ میں بھی ٹھہر گیا۔ اُس نے ایک دلکش تبسم کے ساتھ کہا "شام بخیر"۔

میں نے بھی اپنے چہرے پر خوشی کے آثار پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔ "شام بخیر"

اُس نے پوچھا "کب آئے؟"

میں نے کہا "کل"

اس نے پھر پوچھا

"کہاں ٹھہرے ہو؟"

میں نے ہوٹل کا نام بتا دیا اور کمرے کا نمبر بھی۔

اُس نے اپنی ساتھی سے کہا۔

"اِن سے ملئے یہ میرے دوست ہیں"۔

اور پھر مجھ سے

"یہ میری سہیلی ہیں بہت ہی پیاری"

اُس کی سہیلی نے کہا۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی"

اور میں بولا

"آپ کے مزاج کیسے ہیں؟"

چند لمحوں کے لئے ہم خود بخود نہ معلوم کیوں خاموش ہو گئے۔ ان چند لمحوں میں میں نے محسوس کیا کہ لوگوں کی نظریں ہم پر جم رہی ہیں۔ جو کوئی ہمارے پاس سے گزرتا وہ تو ضرور ہی گھور کر دیکھتا۔ چند ایک گستاخ نظروں پر تو مجھے غصہ بھی آیا۔ گو شاید میں خود بھی بعض دفعہ ایسی ہی گستاخ نظر سے دوسروں کی عورتوں کو دیکھنے لگتا ہوں۔

"آپ کیا چھٹی لے کر آئے ہیں؟" اُس نے خاموشی کو توڑا۔

مجھے پہلے ہی خیال تھا کہ اُسے مغالطہ ہو گیا ہے اور جی میں آ رہا تھا کہ اُسے اُس کی غلطی کے متعلق بتا دوں لیکن اُس میں کچھ ایسی بات تھی کہ اُس سے باتیں ہی کئے جانے کو جی چاہتا تھا جب اُس نے چھٹی کے متعلق سوال کیا تو اس وقت تو میں کہنے ہی لگا تھا کہ در اصل میں وہ آدمی نہیں ہوں جو آپ سمجھ رہی ہیں لیکن خیر اب جب کہ ہم اتنی باتیں کر چکے ہیں تو ہمیں ایک دوسرے سے متعارف ہو جانے میں کوئی حرج نہیں۔

لیکن کسی اندرونی خواہش کی بنا پر میں یہ بات اس سے نہ کہہ سکا۔ اگر کہا تو صرف اتنا

"جی ہاں چار پانچ دن کی چھٹی لایا ہوں"۔

پھر اُس نے ذرا مُنہ بنا کر کہا۔

"آپ ہیں بڑے بے مروّت کہ ہمیں اطلاع تک نہ دی۔ اگر آج اچانک ملاقات نہ ہو جاتی تو آپ بغیر ملے ہی چلے جاتے"۔

"یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ کل آپ کو ضرور بالضرور اطلاع دوں گا"۔

اُس کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ اس کا کوئی دوست میرا ہم شکل ہو گا اور اُس نے مجھے اپنا وہ دوست سمجھ لیا ہے میں نے بھی سوچ لیا کہ جہاں تک ممکن ہو گا اس بات کو نبھاؤں گا یعنی اُسے اُس کی غلطی کا احساس نہ ہونے دوں گا اور اگر میں اس بات کو نہ بھی نبھا سکا تو بھی بڑا دلچسپ انجام رہے گا۔ جب اسے معلوم ہو گا کہ وہ شروع سے غلط آدمی سے باتیں کرتی رہی تو کیسا لطف آئے گا۔

پھر اُس کی سہیلی نے پوچھا

"آپ یونہی ٹہلنے نکل آئے تھے یا کچھ خریدنا تھا؟"

میں نے کہا

"جی ہاں ——— یونہی چہل قدمی کو چلا آیا تھا"

اس نے کہا

"تو آئیے واپس چلیں"

میں انہیں اپنے ہوٹل میں لے گیا۔ وہاں میں نے اُن کے لئے چائے منگائی۔ ذرا سی دیر میں وہ مجھ سے گھل مل کر باتیں کرنے لگیں لیکن یہ شکر ہے کہ کسی ایسی بات کا ذکر نہیں آیا جس کے متعلق میں کچھ نہ کہہ سکوں۔ ابھی ہمیں بیٹھے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ گھڑی نے آٹھ بجا دیئے۔

اُس کی سہیلی اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔

"شاید آپ جانتے ہیں کہ ہمیں رات کو آٹھ بجے کے بعد کالج سے باہر ٹھہرنے کی اجازت نہیں"

میں نے اُس کی بات کے جواب میں "جی ہاں" تو کہہ دیا لیکن ایک دم اُن کے جانے کی بابت سُن کر بہت افسوس ہوا۔ میں انہیں روک بھی تو نہ سکتا تھا۔ تاہم میں نے کوشش ضرور کی۔

"میری خواہش تھی کہ آج آپ میرے ساتھ چلتیں"

جو لڑکی مجھے اپنا دوست سمجھ رہی تھی وہ اپنی سہیلی سے بولی۔

"اب ہم اتنے دن کے بعد تو ملے ہیں اور ہم اتنی جلدی ان سے جدا ہو جائیں"

اور سہیلی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تو تم بیٹھی رہو۔ میں برسر Bursar سے کہہ دوں گی کہ اُس کا ایک رشتہ دار مل گیا ہے وہ دیر میں آئے گی"

پھر دونوں مسکرا پڑیں۔

اُس کی سہیلی جانے لگی تو میں نے کہا۔

"میں تو چاہتا تھا کہ آپ بھی ٹھہرتیں"

"چاہتی تو میں بھی تھی مگر مجبوری ہے" اُس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا

وہ چل گئی۔

کچھ دیر ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر میری مہربان نے کہا۔

"آپ کے نغمے سننے کو جی چاہتا ہے۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو آپ بہت اچھا گایا کرتے تھے"

ایک مرتبہ پھر جی میں آیا کہ اُسے اصلی بات بتا دوں مگر ایک مرتبہ پھر کسی اندرونی طاقت نے ایسا کرنے سے باز رکھا لیکن گانے کے نام تو میں بالکل صفر تھا۔ پھر بھی میں نے کہا۔

"کون سی چیز سنو گی؟"

ابھی وہ شاید سوچ ہی رہی تھی کہ کس غزل یا گیت کا نام لے کہ میں نے پھر کہا۔

"اور ہاں یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ کس سینما میں چلیں گی۔ آپ کو تو انگریزی فلمیں پسند ہیں تو گون ودی ونڈ (GONE with the wind) بہتر رہے گی"

میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"ساڑھے آٹھ بجنے والے ہیں تو ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیئے"

جو فلم دیکھنے کے لئے اُس نے کہا تھا وہ بہت لمبی فلم تھی اس لئے ریگل کے منتظمین اُس کے روزانہ دو شو کرتے تھے ایک ساڑھے تین بجے اور دوسرا ساڑھے آٹھ بجے۔

ریگل پہنچ کر میں نے ٹکٹ بیچنے والے سے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ مانگے۔ اور جب میں نے روپے نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ بولی۔

"پیسے میں دوں گی"

میں نے کہا

"یہ ہرگز نہیں ہو سکتا"

مسکرا کر کہنے لگی۔

"ہو کیوں نہیں سکتا ——— آپ ہمارے مہمان ہیں بھلا یہ بھی کہیں ہوتا ہے کہ میزبان مہمان کو روپے خرچ کرنے دے"

میرے سخت اصرار کے باوجود روپے اُسی نے ادا کئے۔

تماشے میں امریکہ کی جنگِ آزادی کے سین تھے۔ جب اُس نے کُشتوں کے پشتے دیکھے تو ہلکی سی چیخ مار مجھ سے لپٹ گئی۔ میرے سارے جسم میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور میں بے قابو سا ہو گیا لیکن ضبط کئے بیٹھا رہا۔ تماشے میں کئی دفعہ ایسے دل ہلا دینے والے سین آئے اور کئی دفعہ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اور کئی دفعہ مجھے اپنے بدن میں بجلی سی دوڑتی معلوم ہونے لگی۔

آخر تماشہ ختم ہو گیا۔ گو فلم قریباً چار گھنٹے تک چلتی رہی تھی پھر بھی مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بہت جلد ختم ہو گئی۔ خیر بادلِ ناخواستہ اٹھا۔ وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنا بازو میرے بازو میں ڈال دیا اور ہم لوگوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے سینما ہال سے باہر نکل آئے۔ بہت سے اکیلے نوجوان مجھے حسرت اور

رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

تانگے میں بیٹھتے ہوئے میں نے اُس سے کہا۔

"اب تو بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب کالج جا کر کیا کرو گی۔ علی الصبح چلی جانا۔"

اُس نے ایک انگڑائی لی اور چپ بیٹھی رہی۔

میں نے پھر کہا

"تو تانگے والے کو ہوٹل لے چلنے کے لئے کہوں؟"

"ہوٹل نہیں بلکہ ہوسٹل"

مجھے اس کے انکار پر تعجب ہُوا لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔

"وہاں سب لوگ سو رہے ہوں گے۔ انہیں تکلیف دینی پڑے گی۔

اور پھر اگر دربان نے شکایت کر دی تو"؟

"تم بہت شریر ہو" اُس نے اپنا منہ میرے منہ کے قریب لا کر کہا۔

قصہ مختصر میں اُسے ہوٹل ہی میں لے گیا۔

اور جب میں سونے کے لئے کپڑے تبدیل کر رہا تھا تو وہ انگڑائی لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"تم بیکار ضد کر کے مجھے یہاں لے آئے"۔

دوسری صبح جب میں سو کر اٹھا تو وہ جا چکی تھی۔ میں نے خیال کیا کہ صبح ہی صبح چل دی تاکہ صبح کی حاضری پر بھی غیر حاضری نہ لگ جائے اور سوچنے لگا کہ کیا یہ واقعی مجھے اپنا کوئی دوست سمجھتی رہی لیکن ایک آدمی کی شکل و صورت دوسرے سے ایسی بھی کیا مشابہ ہو گی کہ بالکل پہچانی ہی نہ جائے۔ یہی سوچ رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی کھٹ کھٹ ہوئی۔

میں نے کہا "آ جاؤ"

ہوٹل کے ملازم نے قریب آ کر دریافت کیا

"چائے لاؤں حضور"!

"ہاں"

وہ چائے کی ٹرے لایا تو میز سرکا کر میرے پلنگ کے قریب کر دی اور اس پر چائے کی ٹرے رکھ کر چلا گیا۔

میں ابھی چائے بنا ہی رہا تھا کہ میز پر ایک چٹ نظر آئی اُٹھا کر پڑھی لکھا تھا۔

"میں جا رہی ہوں میں نے آپ کی جیب سے اپنی اُجرت لے لی ہے۔ آپ بہت سیدھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آئندہ ہوشیار رہئے۔ عورت اگر بیوقوف بنتی ہے تو دوسرے کو بنانے کے لئے۔ کیا اب بھی یہ بتلانے کی ضرورت رہ گئی ہے کہ میں کسی کالج کی طالبہ نہیں ہوں بلکہ .... ہے"

میں نے پتلون کوٹ کی جیبیں ٹٹول کر دیکھا۔ دو سو روپے کے نوٹ غائب تھے۔

ظفر واسطی

چاندنی

یہ منڈل کا ساگر، اجالے کے کف میں — ستاروں کے اُبھرے ہوئے بلبلے سے
کہ سہمی ہوئی رات کے سندر آنسو — ہیں چھلکی ہوئی چاندنی میں گھُلے سے
شعاعوں کے باریک آنچل کے اوجھل — جھپکتے ہیں آنکھیں، دئیے چلبلے سے،
اٹھائے کچھ اوپر کو چاند اپنی ٹھوڑی — اُس اونچی پہاڑی کے پیچھے کھڑا ہے
جھلکتے دھندلکے کی گہرائیوں میں — اک ایسی انوکھی ہنسی ہنس رہا ہے

کہ ہر جھومتے پیڑ کا پتاّ پتاّ
اُجالے کے دھاگوں میں لپٹا ہوا ہے

وہ جھکتی ہوئی ٹہنیاں اپنی جانب — اشاروں سے مجھ کو بلاتی ہیں شاید
وہ بیکنٹھ کی نازنیں اپسرائیں — زمیں کو تھپک کر سلاتی ہیں شاید
تھرکتی ہوئی پتیوں کو ہوائیں — محبت کا جھولا جھلاتی ہیں شاید
مجھے ایسے دھوکا سا ہوتا ہے جیسے — میں آکاش کی سمت اُڑا جا رہا ہوں
کبھی ہاتھ اٹھاتا ہوں تاروں کی جانب — کبھی مُڑ کے پچھلی طرف دیکھتا ہوں

مرے ہر طرف ہے اُجالے کی برکھا
نجانے میں کس دیس میں آ گیا ہوں

تخت سنگھ

اچھی کتابیں زندگی کو اچھا بناتی ہیں

لیکن ہر شخص کو اچھی اور بُری کتابوں میں تمیز کا موقعہ حاصل نہیں خصوصاً آج کل کے تیز رفتار زمانے میں جب کہ ہر بری چیز اپنا ظاہری دلکش لباس پہنے نگاہوں کو دھوکا دینے کے لئے ہر طرف موجود رہتی ہے۔ اس دھوکے سے بچنے کے لئے سکون اور وقت کی ضرورت ہے ان وجوہات کے مدنظر کتب خانہ ادبی دنیا لاہور نے فیصلہ کیا ہے کہ ادبی دنیا کے پڑھنے والوں اور عام پبلک کے لئے وقتاً فوقتاً چنی ہوئی کتابوں کی مختلف فہرستیں شائع کی جائیں اس انتخاب اور معیار کی ضمانت صلاح الدین احمد اور میراجی مدیران ادبی دنیا کا نام ہے انہوں نے نہایت محنت اور وقت صرف کرنے کے بعد یہ انتخاب کیا ہے اور جو بلند نظری اور معیار کی خوبی ادبی دنیا کے مضامین میں دکھائی دیتی ہے۔ اسی کا لحاظ ان فہرستوں میں بھی رکھا ہے۔ ناظرین کی آسانی کے لئے یہ تمام کتابیں کتب خانہ ادبی دنیا میں فراہم کر لی گئی ہیں تاکہ ایک ہی جگہ سے بغیر کسی دقت کے آپ کو یہ چنی ہوئی کتابیں مل سکیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہر ناظرین ان فہرستوں کا مطالعہ کر کے ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔

نام کتاب و مصنف	قیمت	نام کتاب و مصنف	قیمت	نام کتاب و مصنف	قیمت
افسانے		پس پردہ — چندر بھوشن سنگھ	۱۲ر	منتوش ۸ر — مینا۔ حکیم احمد شجاع	۸ر
فردوس خیال — منشی پریم چند	ہمر	سازِ فطرت — حسن عزیز سجادیہ	ہمر	ہملٹ — مترجمہ عنایت اللہ دہلوی	عہ
پریم بتیسی حصہ اول و دوم — ״	ہمر	محبت اور نفرت — اختر حسین رائے پوری	ہمر	فاؤسٹ — گوئٹے	عہ
نظارے — کرشن چندر	عہ	ہیبت ناک افسانے — امتیاز علی تاج	ہمر	چند ٹوپیاں — نور الٰہی محمد عمر	۸ر
منٹو کے افسانے — سعادت حسن منٹو	ہمر	**مذاحیہ**		چند ڈرامے — ״	۸ر
سحر فرانس — طاہر قریشی	عہ	پطرس کے مضامین — احمد شاہ بخاری	ہمر	**منظومات**	
دانہ و دام — راجندر سنگھ بیدی	ہمر	حاجی لق لق کے افسانے — حاجی لق لق	۱۱ر	بانگ درا — اقبال	٦ر
باسی پھول — سید علی عباس حسینی	ہمر	مطائبات — سندباد جہازی	عہ	نقش و نگار — جوش ملیح آبادی	٦ر
شعلے — پروفیسر احمد علی ایم اے	عہ	جدید جغرافیۂ پنجاب — ״	عہ	فکر و نشاط — ״	ہمر
سوز ناتمام — عاشق حسین بٹالوی	ہمر	دنیائے تبسم — شوکت تھانوی	ہمر	بہارستان — مولانا ظفر علی خاں	للعہ
چغتائی کے افسانے — مرزا عظیم بیگ چغتائی	ے	مضامین فلک پیما — فلک پیما	٦ر	سوز و ساز — حفیظ جالندھری	٦ر
صنوبر کے سائے — حجاب امتیاز علی	عہ	روح لطافت — مرزا عظیم بیگ چغتائی	ہمر	نغمہ زار — ״	ہمر
میری ناتمام محبت — ״		روح ظرافت — ״	ہمر	گیت مالا	٦ر
طلسم خیال — کرشن چندر	ہمر	کولتار — ״	٦ر	چراغاں — احسان دانش	٦ر
اندھی دنیا — اختر انصاری	ہر	**ڈرامے**		آتش خاموش — ״	ہمر
ڈاچی — اپندر ناتھ اشک	ہمر	انارکلی — امتیاز علی تاج	ہمر	نغمۂ حرم — اختر شیرانی	عہ
چوپال — احمد ندیم قاسمی	ہمر	ریڈیو ڈرامے — فضل حق قریشی	عہ	نقش دوام — عبد الحمید عدم	٦ر

ملنے کا پتہ:- مکتب خانہ ادبی دنیا۔ دی مال۔ لاہور

اک جھوٹ ـــــ اُن کی خاطر

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

افراد:۔ ۱۔ نرگس ـــ مسز خالد حسین ۲۔ خالد حسین ۔ ۳ شاہد عبّاس

[آٹھ کا عمل ہے۔ نرگس کی شاندار کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں روشنی نظر آ رہی ہے۔ پردے کھنچے ہوئے ہیں۔

شاہد جو ایک اٹھارہ سال کا خوش فکر اور وجیہہ جوان ہے اشام کے لباس میں رقص کی ٹوپی ہاتھ میں لئے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ دروازہ کمرے کے ایک کونے کے قریب ہے اور جیسے وہ داخل ہوتا ہے اُس کے دائیں ہاتھ دروازے کے پاس آتش دان ہے اور سامنے کی دیوار کے ساتھ بائیں ہاتھ پیانو نظر آ رہا ہے۔ آتشدان کے پاس ہی ایک میز بجاوٹ کے طور پر پڑی ہے جس پر ایک دستی آئینہ۔ ایک لاطینی وضع کی پنکھیا ایک جوڑ سفید لمبے دستانے اور رھیڑ ملسا اون کا گپھا جس کو عورتیں سر ڈھانپنے کے لئے استعمال کرتی ہیں) بے ترتیبی سے پڑے ہوئے ہیں۔ کمرے میں دوسری طرف پیانو کے پاس ہی ایک چوکور اور آرام دہ سٹول رکھا ہوا ہے۔ کمرہ جدید ترین مغربی انداز میں آراستہ ہے۔ اور ایک نظر دیکھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ صاحبِ خانہ کی حیثیت اور وافر ذرائع خرید کی نمائش کی خاطر آسائش سے زیادہ آرائش کا خیال رکھا گیا ہے۔

شاہد جیسا کہ کہا گیا ہے، ایک وجیہہ نوجوان ہے اور چلنے کا انداز کہتا ہے کہ وہ حقیقت کی بجائے خوابوں کی دنیا میں بسا ہوا، ہوا کی سطح پر تیر رہا ہے۔ ٹوپی پیانو پر رکھ دیتا ہے کیونکہ میز پر جگہ نہیں۔ آتش دان تک جاتا ہے اور گھڑی نکال کر وقت دیکھتا ہے۔ اکتا کر میز پر رکھی ہوئی اشیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ میز پر سے اون کا گپھا اُٹھا کر اس میں اپنی ناک گاڑ دیتا ہے۔ بے اختیار پنکھیا اور دستانوں کو بار بار چومتا ہے۔ اور پھر اسٹول پر بیٹھ جاتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملتا ہے گویا کہ وہ عالم خواب سے عالم بیداری میں آنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر اس حماقت پر خود ہی ہنستے ہوئے جھکتا ہے اور اپنے جوتے پر گرد کا ایک دھبا دیکھ پاتا ہے اور جلدی سے اس کو رومال سے صاف کر دیتا ہے۔ اُٹھ کر میز پر سے دستی آئینہ اٹھا لیتا ہے اور نہایت غور سے ٹائی کی گرہ کو دیکھتا ہے اور دوبارہ گھڑی پر نظر ڈالتا ہے۔ نرگس داخل ہوتی ہے۔ وہ سیمنا کا لباس زیبِ تن کئے ہے جس پر کثرت سے جواہرات جگمگا رہے ہیں۔ گو تازہ اور نوجوان نظر آتی ہے۔ لیکن حقیقت میں لباس اور ظاہرداری سے قطعِ نظر نہایت معمولی نقش و نگار کی مالک ہے۔ عمر تقریباً انیس سال ہے اور جسمانی و دماغی لحاظ سے بھی غیر معمولی اوصاف سے متصف نہیں۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوتی ہے شاہد آئینہ رکھ دیتا ہے]

شاہد۔ (اس کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے) اوہ۔ آخرکار . . . . .

نرگس۔ غضب ہو گیا شاہد!۔

شاہد کیوں۔ کیا ہوا؟

نرگس۔ مجھ سے تمہاری نظمیں کھو گئی ہیں۔

شاہد۔ اسی لئے پریشان ہو؟ وہ تو تمہارے قابل ہی نہیں ہیں سینکڑوں اور لکھ دوں گا۔

نرگس۔ شکریہ لیکن مجھے اِن کمبخت نظموں کی ضرورت نہیں . . . . میں بھی کیسی پاگل۔ احمق اور کوتاہ اندیش تھی۔

شاہد۔ میں اس پاگل پن۔ کوتاہ اندیشی اور حماقت کے لئے پروردگار کا شکرگزار ہوں۔

نرگس۔ احمق نہ بنو شاہد۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ مجھ پر کیا بن رہی ہے۔ خیال تو کرو۔ اگر یہ نظمیں کسی کے ہاتھ لگ گئیں تو؟ کوئی کیا کیا نہ سمجھ بیٹھے گا!

شاہد۔ کیا سمجھے گا؟ یہی کہ ایک آدمی نے ایک عورت سے اس قدر محبت کی کہ کبھی کوئی نہ کر سکا لیکن کسی کو کیا معلوم ہو گا کہ وہ آدمی کون تھا۔

نرگس۔ تو مجھے اس سے کیا فائدہ۔ یہ تو سب کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ عورت کون تھی۔

شاہد۔ مگر کیسے؟

نرگس:۔ کیسے! کیوں؟ میرا نام تو اِن اشعار پر چھایا ہوا ہے . . . . یہ برا منحوس اور ناخوشگوار نام . . . آہ! والدین نے میرا نام جمیلہ۔ لطیفہ۔ عائشہ۔ سلیمہ وغیرہ کیوں نہ رکھا لیکن نرگس . . . . . نرگس . . . . شہر بھر میں صرف میرا نام ہی نرگس ہے اور ہر کوئی جانتا ہے۔ کیا معلوم دنیا بھر میں میں ہی ایک نرگس ہوں اور پھر یہ نام کمبخت ہر بحر میں کھپ سکتا ہے۔ آہ تم نے ایسی والہانہ نظمیں کیوں کہیں۔ کیوں نہ تم نے میری خاطر جذبات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی!

شاہد۔ تمہارے متعلق نظمیں اور جذبات کو قابو میں رکھنے کی کوشش! تم مجھ سے ایسی امید رکھ سکتی ہو نرگس؟

نرگس (نرمی سے) درست ہے اور تمہاری عنایت ہے۔ میرا بھی اسی قدر قصور ہے مجھے خیال رکھنا چاہیئے تھا کہ تمہارے اشعار کسی بیاہی ہوئی عورت کے بارے

میں یہ بے باکانہ رنگ اختیار نہ کریں۔

شاہد۔ کاش کہ یہ شعر کسی ناکتخدا نرگس کے لئے لکھے جاتے! اے کاش!!

نرگس۔ تمہیں میری بابت ایسی تمنا رکھنے کا کوئی حق نہیں۔ رہیں نظمیں تو وہ ایک منکوحہ عورت کے لئے نہایت ہی قابل اعتراض ہیں اور یہی مصیبت ہے۔ اور میری نندیں اس کی بابت کیا کیا نہ کہیں گی۔

شاہد۔ (مضطرب لہجے میں) کیا تمہاری نندیں بھی ہیں۔

نرگس۔ جی ہاں میں فرشتہ نہیں ہوں۔

شاہد۔ میں تو تم کو فرشتہ ہی سمجھتا تھا (بمشکل سسکی ضبط کرتا ہے)

نرگس (نرم لہجے میں۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) میری بات سنو۔ یہ تمہاری عنایت ہے کہ تم نے مجھے اپنے خوابوں میں بسایا۔ مجھ سے اُلفت کی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن شوہر کے ناگوار عزیز اور رشتے داروں کا نہ ہونا میرے بس کی بات نہیں۔

شاہد۔ (تیزی سے) وہ تمہارے شوہر کے رشتے دار ہیں۔ نرگس۔ معاف کرنا میں بھول گیا تھا۔ مجھے ان کی بابت یوں ناخوشگوار طور پر استفسار نہ کرنا چاہئے تھا۔

[وہ اپنے شانہ سے اس کا ہاتھ اٹھا لیتا ہے اور اسے بوسہ دیتا ہے۔ وہ اسٹول پر بیٹھ جاتی ہے۔ وہ میز کی طرف پیٹھ کئے کھڑا رہتا ہے]

نرگس۔ قصہ یہ ہے کہ خالد کے پاس رشتے داروں کے سوا کچھ نہیں۔ اس کی آٹھ سگی اور چھ سوتیلی بہنیں ہیں۔ اور کچھ اتنے ہی بھائی ہوں گے۔ بھائیوں کی مجھے پروا نہیں اور اگر تمہیں دنیا کا ذرا سا بھی علم ہے تو یہ جانتے ہو گے کہ اگرچہ اتنے بڑے کنبے میں بہنیں پاگلوں کی طرح آپس میں لڑتی جھگڑتی رہتی ہیں۔ لیکن ذرا ایک بھائی کو شادی کر لینے دو۔ پھر دیکھ لو سب کی سب آپس کے تمام اختلافات دور کر کے اپنی بقیہ زندگی اپنے بھائی کو یہ یقین دلانے کے لئے وقف کر دیں گی کہ اس کی بیوی اس کی شان کے شایاں نہیں۔ وہ بھاوج کے سامنے بھی بھائی کو اس بات کا یقین دلاتی رہتی ہیں گو بیچاری "دلہن بھابھی" کے فلک کو بھی اس کی خبر نہ ہو سکے۔ ہر خاندان کے مزاح کا طریق اور روایات جدا جدا ہوتی ہیں جس سے بے چاری نووارد نابلد ہوتی ہے۔ اُن کے تفکروں کی تہ تک ان کے سوا اور کوئی نہیں پہنچ سکتا اور بعض اوقات تو یہ بھی معلوم نہیں ہونے پاتا کہ اُن کی گفتگو کا موضوع کیا ہے۔ یہ احساس ہی ایک اچھے بھلے انسان کو پاگل بنا دینے کو کافی ہے۔ میری رائے میں تو ایک قانون کے ذریعے بہن کا بھائی کی شادی کے بعد اس کے ہاں آنا جانا ہی بند کر دینا چاہئے۔۔۔۔ وہ نظمیں ثریا نے ہی میری سلائی کی ٹوکری میں سے چرائی ہیں۔ مجھے اس لڑکی کا ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ اپنی زندگی کا۔

شاہد۔ بھلا وہ کیا انہیں سمجھ سکے گی!

نرگس۔ واقعی! میاں مٹھو۔ وہ نہ صرف بہت ہی اچھی طرح سمجھ لے گی بلکہ اُن میں سے اصل سے زیادہ فضولیات تلاش کر لے گی کمبخت۔ ذلیل چوہیا۔

شاہد۔ یوں جوش میں نہ آؤ نرگس۔ تم اس کا خیال ہی نہ کرو۔ ثریا کا ذکر ہی جانے دو۔ (وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور قالین پر اس کے قدموں میں بیٹھ جاتا ہے) نرگس! کیا تمہیں وہ حسین شام یاد ہے جب میں نے اسی طرح تمہارے قدموں میں بیٹھ کر پہلے پہل تمہیں چند اشعار سنائے تھے۔

نرگس۔ مجھے کبھی ایسا کرنے کی اجازت نہ دینا چاہئے تھی۔ جب عالم تصور میں اسی طرح ثریا کو خالد کے قدموں میں بیٹھ کر پہلے پہل وہ اشعار سناتے دیکھتی ہوں تو دیوانی سی ہو جاتی ہوں۔

شاہد۔ بات تو بجا ہے۔ ان مقدس نظموں کے غلط معنی لئے جائیں گے۔

نرگس۔ تم مقدس۔ غیر مقدس کو جانے دو۔ خالد کو کیا کیا نہ گمان گذریں گے اور وہ کیا کچھ نہ کر بیٹھے گا۔ (اس کا سر اپنے زانو پر سے جھٹکتے ہوئے) تم خالد کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے۔

[وہ انتہائی جوش میں آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ جھٹکے کی وجہ سے شاہد کا توازن قائم نہیں رہنے پاتا اور وہ پیچھے فرش پر گر جاتا ہے]

شاہد۔ (پڑے پڑے) میرے لئے مسٹر حسین نقی کے پیارے پیارے مس ثریا نقی سے بھی کم

نرگس۔ ابھی اچھی طرح جان لو گے کہ مس ثریا نقی سے کس قدر کم ہیں۔ اگر تم کسی خبیث متعفن جاسوس کو کم سمجھتے ہو تو تمہیں بہت جلد اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔

[وہ کمرے میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگتی ہے۔ وہ آہستہ سے اٹھتا ہے اور رومال سے ہاتھ صاف کرتا ہے۔ یکایک وہ اس کی طرف دوڑتی ہے اور اس کے بازوؤں میں گر پڑتی ہے]

۔۔۔۔ میری مدد کرو شاہد۔ اس گتھی کا کوئی حل سوچو اور میں تمام عمر تمہاری احسان مند رہوں گی۔ آہ۔ میں بھی کس قدر بدنصیب ہوں! (اس کی گود میں سسکیاں بھرنے لگتی ہے]

شاہد۔ اور آہ! میں کس قدر خوش نصیب ہوں۔

نرگس [تڑپ کر اس کی گود سے نکلتے ہوئے] خود غرض!۔

شاہد۔ (عاجزی سے) جی ہاں میں اسی قابل ہوں۔ اگر کبھی تمہارے دوش بدوش کسی کشمکش میں شرکت کرتا ہوں تو اس خوشی میں اپنا سب خطرہ بھول جاتا ہوں

نرگس (شفقت سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے) تم نہایت ہی اچھے لڑکے ہو شاہد

لیکن (یکایک جھنجھلاتے ہوئے) تم نہایت برے ہو کسی کام کے نہیں! نکمے! میں کسی ایسے آدمی کو پسند کرتی ہوں جو ایسے میں کوئی کامیاب حل پیش کرے۔

شاہد (سنجیدگی کے ساتھ) تمہارا دل تمہیں وقت آنے پر بتا دے گا کہ تم کو کیا کرنا چاہئے۔ میں نے اس معاملے پر کئی مرتبہ غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہی روش ہر حالت میں موزوں ہوگی جو ہم کو جلد یا بدیر اختیار کرنا پڑے گی۔

نرگس۔ لیکن دیکھو میں کسی ناشائستہ حرکت کے لئے تیار نہیں ہوں (اسٹول پر بیٹھ کر مشتبہ نظروں سے شاہد کی طرف دیکھنے لگتی ہے)

شاہد۔ اگر تم کوئی ایسی حرکت کرو تو تم نرگس نہ رہوگی۔ ہمارا راستہ بالکل سیدھا ہے۔ بالکل شائستہ اور ناقابل گرفت۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ میں اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتا۔ میں تمام دنیا کے سامنے علی الاعلان کہنے کو تیار ہوں اور ایسا ہی میں تمہارے شوہر کے روبرو کہوں گا اور تم دیکھ لوگی کہ یہی ہمارے لئے سیدھا اور صاف راستہ ہے۔ آؤ بغیر کسی بے وجہ شرم اور بے جا رازداری کے اپنے گھر چلیں۔ یاد رکھو! ہم تمہارے شوہر کے احسانمند ہیں۔ یہاں ہم اُن کے مہمان ہیں۔ وہ ایک باعزت انسان ہیں۔ اور ہم پر مہربان رہے ہیں۔ اور تم سے بھی اس قدر اُلفت کرتے رہے ہیں۔ جس کی ان کی کاروباری طبیعت اور تجارتی فضا اجازت دے سکتی تھی۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کو حقیقت کی خبر کسی زبان درازانہ غیبت گو کے ذریعے نہ ہونے دیں۔ آؤ ہم نہایت اطمینان سے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ان کے پاس چلے چلیں اور خدا حافظ کہیں۔ اور کسی رازداری یا چوروں کے انداز کے بغیر اُن کے مکان سے چلے آئیں ..... آزادی سے دیانتداری سے اور مکمل عزت کے ساتھ.....

نرگس (اس کے چہرے پر ٹکٹکی لگائے ہوئے) پھر!

شاہد۔ اور ہم روزمرہ کی زندگی سے بال برابر بھی نہ ہٹیں گے۔ ہم سینما جانے کو تھے کہ ٹکٹوں کے کھو جانے کی وجہ سے اتنا وقت ضائع ہوا۔ ہم سینما تو اب بھی جائیں گے لیکن ہم کو یہ جواہرات یہیں چھوڑ دینا پڑیں گے۔ جواہرات ہماری حیثیت سے بلند ہیں۔ اس لئے ہمیں اُن کی ضرورت نہیں۔

نرگس (برہم ہو کر) میں تم سے کئی بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے جواہرات سے سخت نفرت ہے یہ صرف خالد کا اصرار ہے جو میں جواہرات پہنے رہتی ہوں۔..... تمہیں سادگی کے پرچار کی ضرورت نہیں۔

شاہد۔ یہ پرچار کا تو ذکر ہی نہ تھا۔ مجھے علم ہے کہ ایسی چیزوں کا تم پر کچھ اثر نہیں خیر تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ ہاں سینما کے بعد تم میرے گھر چلنا جو آج سے میرا اور تمہارا دونوں کا گھر ہوگا۔ جب تم قانونی آزادی حاصل کرو گی تو اگر تمہاری خواہش ہوگی۔ تو ہم رواجی پابندی بھی اختیار کرلیں گے میں اس ڈھکوسلے کو جسے لوگ بیاہ کہتے ہیں قطعی اہمیت نہیں دیتا۔ میری رائے میں صرف ایجاب و قبول پر ہی نکاح ختم ہے۔ میری محبت رسم و رواج نے پیدا نہیں کی اور نہ ہی سماج کے خوف سے یہ استوار یا کمزور ہو سکتی ہے۔ بالکل سیدھی بات ہے (میز پر سے پھول اٹھا لیتا ہے) یہ لو تمہارے لئے پھول ہیں اور میں نے ٹکٹ خرید رکھے ہیں۔ ہم تمہارے شوہر سے سواری مانگ لیں گے۔ اور وہ ہم کو سینما پہنچا آئے گی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ ان کے دل میں ہماری نسبت کوئی رنجش نہیں ہے۔ لو آؤ.....

نرگس۔ تو کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ ہم سیدھے خالد کے پاس چلے جائیں اور ان کے مُنہ پر کہیں کہ ہم دونوں جا رہے ہیں ہمیشہ کے لئے.....؟

شاہد۔ تو اور چارہ ہی کیا ہے۔

نرگس۔ تمہارا خیال ہے کہ وہ چُپ چاپ سُن لے گا؟ بس میں ہی توڈالے گا۔

شاہد۔ تم نہیں سمجھتیں اور سمجھ بھی نہیں سکتی ہو۔ ہم نے بھی کچھ دن اکھاڑوں میں بسر کئے ہیں۔ کچھ مذاق ہے۔ مسٹر حسین مجھ پر ہاتھ اٹھا کر پچھتائیں گے۔ ہاں اس حالت میں شاید جذبات کی رو میں وہ زیادہ سے زیادہ پندرہ سیکنڈ تک جوش میں ہوں گے۔ پندرہ سیکنڈ تک میں صبر کرلوں گا.....

نرگس۔ پھر!

شاہد۔ پھر کیا! تمہیں میری بابت پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

نرگس۔ اور خالد کی بابت! کیا تم بدمعاشوں کی طرح میری آنکھوں کے سامنے انہیں پیٹ ڈالو گے۔

شاہد۔ بے کار خفا ہو رہی ہو۔ یقین جانو۔ کہ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تمہارے شوہر جانتے ہیں کہ میں اپنی مدافعت کے قابل ہوں اور اس صورت میں کچھ بھی ظہور پذیر نہ ہوگا کم از کم مجھ سے کوئی حرکت سرزد نہ ہوگی جس شخص نے کبھی تم سے محبت کی ہے وہ میرے لئے قابل عزت ہے۔

نرگس (چونکتی ہے) تو کیا وہ اب مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ کیا انہوں نے کچھ تم سے اس بارے میں کہا ہے۔

شاہد۔ نہ۔ نہ میرا یہ مطلب نہ تھا (نرمی سے اپنے بازوؤں میں لے لیتا ہے) میری نرگس تم کس قدر مضطرب ہو رہی ہو تم ارفع ہو۔ نشیب تمہاری شان کے خلاف ہے۔ آؤ میرے ساتھ الفت کی بلندیوں کی سیر کرو۔ روح کی گہرائیوں اور خلوت کی مسرتوں کی سیر کرو..... آؤ.....

نرگس۔ (جیسے اُس کی تیز نظروں سے بچنا چاہتی ہو) ختم کیجئے اس فلسفیانہ گفتگو کو مسٹر عباس......

شاہد۔ (چلاکر) مسٹر عباس!!

نرگس۔ اوہ معاف کرنا۔ میرا مطلب تھا شاہد۔

شاہد۔ مسٹر عباس تمہارے ذہن میں ہی کیوں آیا۔ میں نے تو کبھی تمہیں مسز حسین کے لقب سے جانا ہی نہیں۔ میں تو تمہیں ایک ہی نام سے جانتا ہوں "نرگس! نرگس!!" نرگس!!!

نرگس۔ جی ہاں۔ آپ کی عنایت ہے مسٹر عباس (وہ پھر قطع کلام کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ تیزی سے کہے چلی جاتی ہے) نہیں نہیں مسٹر عباس۔ میں اب اچانک تمہیں شاہد نہیں مسٹر شاہد عباس سمجھنے لگی ہوں۔ اور اس صورت میں تمہیں شاہد شاہد کہتے رہنا نہایت ہی مضحکہ خیز ہوگا۔ میں تمہیں ایک بچہ سمجھتی تھی۔ یا زیادہ سے زیادہ ایک جاگتے میں سویا رہنے والا انسان۔ جو خیالی پلاؤ پکانے کے سوا اور کچھ نہ جانتا ہو۔ میرا خیال تھا کہ تم کوئی عملی قدم نہ اٹھا سکو گے اور اب تم خالد کو بیٹھنے جا رہے ہو۔ میرا گھر تباہ کر دو گے۔ مجھے بھی کہیں کا نہ رکھو گے اور اخباروں میں جو چرچا ہوگا۔ وہ الگ۔ یہ نہایت ہی بزدلانہ اقدام ہے اور قطعی غیر شریفانہ.....

شاہد۔ (قدرے توقف سے انتہائی رنج والم اور تعجب کے ملے جلے اثرات کے ساتھ) تو کیا تمہیں خوف دامنگیر ہے۔

نرگس۔ جی ہاں میں ڈرتی ہوں اور اگر تم میں رتی بھر بھی عقل موجود ہوتی تو تم بھی ڈرتے۔

[وہ آتش دان کے پاس جاتی ہے۔ اور جالی پر پاؤں رکھ دیتی ہے۔ اُس کی پشت شاہد کی طرف ہے]

شاہد۔ (اسے حسرت سے تکتے ہوئے) حقیقی الفت کسی سے خوف زدہ نہیں ہوتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں نہیں ڈرتا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے مسز حسین کہ اب تم کو مجھ سے الفت نہیں رہی۔

نرگس۔ (اطمینان کا گہرا سانس لیتے ہوئے) شکریہ شکریہ۔ تم نہایت ہی اچھے لڑکے بن سکو گے شاہد۔

شاہد۔ یہ کس چیز کا شکریہ ادا ہو رہا ہے؟

نرگس (آتش دان سے اُس کی طرف آتے ہوئے..... پیار سے) شکریہ؟ مجھے مسز حسین کہنے کے لئے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب تم آدمی بنتے جا رہے ہو۔ امید ہے کہ اب تم ویسے جنگلی نہ رہو گے۔

(تھوڑا سا وقفہ)

[وہ دھم سے اسٹول پر بیٹھ جاتا ہے اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیتا ہے]

نرگس۔ کیوں! کیا ہے۔

شاہد۔ اپنی زندگی میں میں نے سمجھا تھا کہ میں انتہائی مسرت محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن اب میں ہوش میں آ رہا ہوں۔ میں آپے میں آ رہا ہوں اور یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میں نے ایک بہت ہی دلفریب خواب دیکھا ہے۔ لیکن آہ! اب میں جاگ رہا ہوں۔ میری آنکھیں پوری طرح کھل گئی ہیں اور میں اچھی طرح دنیا کو دیکھ رہا ہوں.... دنیا میرے سامنے اپنی خوفناک حقیقی صورت میں آگئی ہے..... اوہ! سرد..... برف کی مانند سرد زندگی۔

نرگس۔ دیکھو شاہد۔ ہمارے پاس اس بکواس کے لئے وقت نہیں ہے۔

[شاہد کل کے کھلونے کی طرح جھپٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور میز کے پاس سے ہوتا ہوا نرگس تک جاتا ہے]

نرگس۔ دیکھو دیکھو۔ کدو کا سا سر میری ٹھوڑی میں مارے دے رہے ہو۔

شاہد۔ (درشت نرمی سے) میں معافی کا خواستگار ہوں۔ آخر تم مجھ سے کیا چاہتی ہو میں حاضر ہوں۔ اگر تم اپنا طریق کار صحیح طور سے بیان کر سکو تو میں آئندہ شائستہ رہنے کی کوشش کروں گا۔

نرگس۔ (قدرے خوفزدہ ہو کر) شکریہ۔ شاہد۔ مجھے یقین تھا کہ تم مہذب ثابت ہو گے تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو۔

شاہد۔ کہے جاؤ کہے جاؤ۔ مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں۔ نہیں تو..... نہیں تو.....

[یکایک اسے پھر وہی جنوں خیز دورہ اٹھتا ہے اور میز پر پنکھیا اٹھا کر بھینچی ہوئی مٹھیوں میں توڑ ڈالنے کو ہے کہ نرگس لپک کر پنکھے کو پکڑ لیتی ہے]

نرگس۔ (ملامت آمیز لہجے میں) میری پنکھیا مت توڑو..... خبردار (وہ آہستہ آہستہ پنکھیا پر سے گرفت ڈھیلی کر دیتا ہے).... احمق.... نہایت ہی غیر معقول حرکت ہے۔ میں اسے کبھی پسند نہیں کر سکتی۔ تمہیں ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں تھا.... (پنکھے کو کھولتی ہے۔ تیلیاں بکھر چکی ہیں اور پنکھے کا پردہ ان سے الگ ہو چکا ہے).... کیسے وحشی ہو۔

شاہد۔ معاف کیجئے۔ میں اور لا دوں گا۔

نرگس۔ (جھگڑالو لہجے میں) تم کبھی بھی ایسی نہ لا سکو گے۔ اور پھر یہ تو مجھے خاص طور پر پسند تھی۔

شاہد۔ (سرد مہری سے) تو پھر مجھے افسوس ہے کہ تمہیں اس کے بغیر ہی گذارا کرنا ہوگا

نرگس۔ میری عزیز پنکھیا توڑ دینے کے بعد ایسے الفاظ زیب نہیں دیتے.... بدتمیز

شاہد۔ اگر تم جان سکتیں کہ میں خالد حسین کی محبوب بیگم کو توڑ ڈالنے کے کس قدر قریب تھا۔ اور کس طرح اس کو اس کے شکستہ ٹکڑے مسکراتے ہوئے پیش کرنے کو

تھا۔ تو ضرور میری شکر گذار ہوتیں کہ ابھی تک تم ۔۔۔۔ تم ۔۔۔۔ تم (چلا کر) جہنم میں جائے تمہاری نیکیاں۔

نرگس۔ گالیاں نہ بکو شاہد۔ کوئی سمجھے گا یہ میرے شوہر ہیں۔

شاہد۔ (دوبارہ اسٹول پر بھدے سے گرتے ہوئے) اوہ، خدایا یہ کوئی خوفناک خواب ہے تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ تم میری نرگس نہیں ہو۔۔۔۔ نہیں ہو۔۔۔۔ ہرگز نہیں۔

نرگس۔ خوب۔ مگر پہلے یہ تو بتاؤ کہ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ اگر میں جانتی کہ تم ایسے فضول واقع ہوئے ہو تو میں کبھی تمہاری حوصلہ افزائی نہ کرتی۔

شاہد۔ مجھے ان بلندیوں سے گھسیٹنے کی کوشش نہ کرو۔ خدا کے لئے نہ کرو۔ مجھے پھر اپنے خوابوں کی دنیا میں جینے دو۔ مجھے پھر انہیں خیالات کی بلندیوں میں بسنے کی کوشش کرنے دو۔

نرگس۔ (اس کے آگے دو زانو ہو کر اور اس کے زانوؤں پر ہاتھ رکھ کر ملتجی نظروں سے) ہوش میں آؤ شاہد۔ خدا کے لئے۔ اگر تم یہ دیکھ پاؤ کہ میں بربادی کے کس قدر قریب ہوں تو تم کبھی نہ کہہ سکو گے کہ (چڑھاتے ہوئے) بالکل سیدھی بات ہے۔

شاہد۔ مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

نرگس۔ اگر تم ایسا کہے جاؤ گے تو پھر میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھوں گی کہ بعد کو پچھتانا پڑے گا۔۔۔۔ یہاں ہم خطرے کی بلند چوٹی پر کھڑے ہوئے ہیں۔ اور بدنامی اور بربادی کی غار ــــ بھیانک غار ــــ منہ پھاڑے ہماری تاک میں ہے اور بات تو واقعی سیدھی ہے۔ ایک قدم بڑھائیے اور اس کی بھیانک گہرائیوں سے ہمکنار ہو جائیے لیکن میں کوئی اور قابلِ عمل حل چاہتی ہوں۔ کیا تم کوئی خوشگوار حل پیش نہیں کر سکتے!

شاہد۔ میں نہیں جانتا۔ میرے ذہن پر پردہ پڑ چکا ہے۔ میرے سامنے انتہائی تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ سرد اور سیاہ تاریکیاں۔ اور میں اپنے خوابوں کے تباہ و برباد۔ سسکتے ہوئے کھنڈروں کے سوا اور کچھ بھی دیکھنے کے قابل نہیں ہوں۔

(وہ ایک گہری آہ بھر کر لڑکھڑا کر کھڑا ہو جاتا ہے)

نرگس۔ میں ابھی دیکھنے کے قابل ہوں۔ مجھے خالد اور ثریا ہاتھ میں نظمیں لئے صاف نظر آ رہے ہیں (آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے) اور یہ جان لو شاہد تمہیں نے مجھے اس مخمصے میں مبتلا کیا ہے۔ اور مجھے رہا کرنا بھی تمہارا ہی فرض ہے (اسٹول پر بٹھا دیتی ہے)

شاہد۔ (نرم لیکن مایوس لہجے میں) میں ہر طرح کی خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں۔ کچھ کہو تو کروں۔

نرگس۔ میرے علاوہ تم کسی اور "نرگس" کو بھی جانتے ہو۔

شاہد۔ اوں ہوں۔

نرگس۔ اس سرد احمقانہ لہجے میں "اوں ہوں" کہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ کہیں نہ کہیں تم نے "نرگس" کا نام ضرور سنا ہوگا۔

شاہد۔ تم خود ہی ابھی کہہ رہی تھیں کہ دنیا بھر میں صرف ایک ہی نرگس ہے۔ (جوش میں آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ مٹھیاں بھینچی ہوئی ہیں) یا اللہ (نرگس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) آہ میرے لئے دنیا بھر میں صرف تم ہی ایک "نرگس" تھیں۔ (منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہے)

نرگس۔ (شاہد پر ہلکی سی تھپکی دے کر) درست۔ میاں درست۔ میں تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہوں لیکن یہ اظہارِ جذبات کا وقت نہیں۔ اچھا میری بات سنو۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں تمام اشعار زبانی یاد ہوں گے۔

شاہد۔ ایک ایک لفظ (سر اٹھا کر اسے مشتبہ نظروں سے دیکھ کر) کیوں؟

نرگس۔ کیا کسی شعر میں "خالد" کا نام آیا ہے۔

شاہد۔ نہیں تو!

نرگس۔ تمہیں کامل یقین ہے؟

شاہد۔ یقین کیوں نہ ہو؟ ایسا لفظ میں بھلا ان اشعار میں کیسے نظم کر سکتا ہوں۔

نرگس۔ اگر "خالد" کا نام ان اشعار میں نہیں تو ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اشعار کسی اور "نرگس" سے خطاب ہیں۔ اور تم نے مجھے اس لئے دیکھنے کو دیئے کہ اتفاق سے میرا نام بھی "نرگس" ہے گویا تمہیں ایک عدد "نرگس" ایجاد کرنا ہے۔

شاہد۔ (سرد مہری سے) یعنی تم مجھے جھوٹ بولنے۔۔۔۔

نرگس۔ (قطع کلام کر کے) مسٹر یہ دروغ مصلحت آمیز ہے۔ ہرج ہی کیا ہے بزرگوں کا کہنا ہے کہ ایسی حالتوں میں راستی فتنہ انگیز سے پرہیز لازم ہے۔

شاہد۔ بہت خوب۔ تم نے میری خوابوں کی دنیا کو مسمار کر ہی دیا ہے۔ اب باقی کیا رہ گیا۔ اب جھوٹ بھی بول لوں گا۔ اندیشہ ہے کہ میں اس سلسلے میں کسی قابلِ عزت مرد سے کم نہ رہوں گا۔

نرگس۔ اب تمام الزام میرے ہی سر رہے گا۔ اور کیا!

شاہد۔ (مشکل سے اٹھتے ہوئے) مجھے معاف کرنا مسز حسین۔ دراصل میں دردِ بالیدگی محسوس کر رہا ہوں۔

نرگس۔ دردِ بالیدگی؟

شاہد۔ کیف انگیز رومانوی لڑکپن سے مرد دنیادار ہونے میں عموماً دس سال صرف ہوتے ہیں۔ اور جب یہ عرصہ مختصر ہوتے ہوتے صرف دس منٹ رہ جائے تو قدرتی طور پر رفتار بالیدگی نسبتاً بہت تیز ہوگی۔ اور اس کا نتیجہ درد بالیدگی ہے۔

نرگس۔ یہ وقت فلسفہ چھانٹنے کا نہیں۔ کیا یہ طے نہیں ہو چکا کہ تم نہایت ہی اچھے لڑکے ہو۔ کیونکہ تم خالہ کو بتاؤ گے کہ یہ نظمیں کسی اور نرگس کے لئے ہیں۔

شاہد۔ میں یہ سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ میں پہلے اُن کو بے کم و کاست حقیقت سے خبردار کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اب اُن کے کانوں کو بے کم و کاست جھوٹ سے آشنا کروں گا۔

نرگس۔ میرے اچھے شاہد میں جانتی تھی کہ تم کو میری خاطر ہر حالت میں منظور ہے۔ میں ۔۔۔۔ ہش!

[دروازے کی طرف جھپٹتی ہے۔ اس کو کھول کر کان لگا کر سنتی ہے]

شاہد۔ کیا ہے؟

نرگس۔ خالہ آئے ہیں۔ میں اُنہیں مقیاس الحرارت کے فریم کو کھٹکھٹاتا سُن رہی ہوں۔ شکر ہے کہ ان تک ابھی بات نہیں پہنچی۔ ورنہ یوں اطمینان سے مقیاس الحرارت کو انگلیوں سے نہ بجاتے۔ شاید ثریا کو کچھ کہنے سننے کا کوئی موقع ہی نہ ملا (وہ آہستگی سے آتشدان تک جاتی ہے) بس اب تم بالکل ایسے نظر آنے کی کوشش کرو گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ ذرا میرے دستانے دے دو۔ جلدی سے (دستانے اس سے لے کر جلدی سے پہن لیتی ہے۔ اور نہایت بے تعلقی سے اُن کے بٹن بند کرتی ہے) مجھ سے دور ہو جاؤ ۔۔۔ فوراً (وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس سے دور چلتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ پیانو اس کو آگے جانے سے روک لیتا ہے] تم کچھ گنگنانے ہی لگو ذرا۔

شاہد۔ بہتر لیکن خدا کے لئے دوسرا دستانہ رہنے دو۔ اس وقت بالکل جیب کتری نظر آرہی ہو۔

[خالد حسین اندر آتا ہے۔ درمیانہ قد۔ دوہرے جسم اور کشادہ پیشانی کا انسان ہے۔ اندر آتے وقت چہرے پر رنجش کے آثار نہیں ہیں بلکہ معاملہ برعکس ہے]

خالد۔ ہیلو! میرا خیال تھا کہ تم لوگ سینما میں ہو گے۔

نرگس۔ میں آپ کے لئے رک گئی تھی۔ شام کھانے پر کیوں نہ آئے؟

خالد۔ ثریا کے ہاں سے ایک رقعہ آیا تھا۔ اُس نے بلا بھیجا تھا۔

نرگس۔ اوہ ثریا! مجھے افسوس ہے کہ میں اُسے اس ہفتہ نہ مل سکی۔ کوئی کام تھا۔ خیریت تو ہے؟

خالد۔ ہاں خیریت ہی ہے۔ وہ بے چاری میری بھلائی کی خواہاں ہے اور تمہاری بھی۔ یوں ہی پریشان ہو جاتی ہے۔

[نرگس خالد کی نظر بچا کر خوفزدہ نظروں سے شاہد کی طرف دیکھتی ہے] اور ہاں عباس۔ ذرا تم سے دو چار منٹ گفتگو کرنا چاہتا ہوں اگر نرگس اجازت دے۔

شاہد۔ (سرد مہری سے) میں حاضر ہوں۔

خالد۔ کچھ ایسی جلدی نہیں ہے۔ تم لوگ سینما ہو آؤ۔

شاہد۔ ہم سینما نہیں جا رہے۔

خالد۔ واقعی؟ یہ تو اور بھی اچھا ہے۔

نرگس۔ تو میں یہ زیور سنبھال لوں۔ سینما جو نہیں جا رہے ہیں (چلی جاتی ہے)

[خالد اس طرح جیب سے نظموں کا پلندہ نکالتا ہے کہ شاہد اچھی طرح دیکھ لے گویا خاموشی سے اُس کی توجہ ادھر مبذول کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاہد خواہ مخواہ اس طرف سے منہ پھیر لیتا ہے اور بالکل بے تعلق سا نظر آتا ہے]

خالد۔ میاں صاحبزادے۔ ان مسودات سے آپ واقف ہیں۔

شاہد۔ مسودات! کون سے؟

خالد۔ کیا آپ نزدیک سے ان پر نظر ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

(وہ انہیں شاہد کی ناک کے نیچے ٹھونس دیتا ہے]

شاہد۔ [مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے] اوہ۔ یہ تو نظمیں ہیں۔

خالد۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔

شاہد۔ مسز حسین نے یہ نظمیں آپ کو دکھا دیں۔ آپ مجھے احمق سمجھ رہے ہوں گے عرصہ ہوا یہ نظمیں اختر کے تتبع میں رومانوی انداز میں کہی گئی تھیں۔ یہ سب نرگس کی بابت ہیں۔ دیکھئے نا چشم نرگس کا جا بجا تذکرہ ہے (ورق الٹ پلٹ کرتا ہے) کبھی آپ نے جاڑوں کی خوشگوار صبح میں تختہ نرگس دیکھا ہے آہ! وہ حسین اور نازک کھلے ہوئے پھول۔ کٹورا سی زرد زرد آنکھیں اور پھر اُن کی مہک۔ یہ سماں دنیا کے بہترین نظاروں میں سے ہے۔ جب مسز حسین نے بتایا کہ ان کا نام بھی نرگس ہے تو میں یہ مجموعہ انہیں دکھائے بغیر نہ رہ سکا لیکن یہ اس لئے نہ تھا کہ آپ مجھے اس بے رحمانہ طور پر گھورنے کی کوشش کریں۔

خالد۔ عباس! میں تمہاری حاضر جوابی کا قائل ہوں۔ ہو نہ ہو آخر ادبی شخصیت۔ تمہاری موجودگی ہمارے لئے باعث فخر ہے لیکن ایسی بادر ہوا کہانیاں

بچپن میں اکثر سنی ہیں تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔

شاہد۔ تو کیا آپ اِسے حقیقت نہیں سمجھتے۔

خالد۔ جی نہیں۔

شاہد۔ لیکن کیوں نہیں؟

خالد۔ لو۔ اب اپنے حاضر دماغ کی تحقیر مت کرو عباس۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم سب کچھ جانتے ہو۔

شاہد۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں قطعی کچھ نہ سمجھ سکا۔ اسے اور واضح کرنا پسند نہ فرمایئے گا؟

خالد۔ حد سے زیادہ اداکاری مخدوش ہوتی ہے سمجھے۔ خیر میں صرف اس قدر واضح کرتا ہوں کہ اگر تم یقین دلانے کی کوشش کرتے ہو کہ تمہارے اشعار کسی عورت سے خطاب نہیں کرتے بلکہ کسی سردی سے اکڑے ہوئے تختۂ نرگس کو دیکھ کر کہے گئے ہیں۔ تو مرد معقول! تم اپنی شاعرانہ سحرکاریوں کے اعتراف سے گریز کرتے ہو۔ اور میں شرط بدنے کو تیار ہوں کہ عمر بھر میں ایک مرتبہ بھی سرما کی چاندنی میں علی الصبح تم لحاف سے باہر نہیں نکلے۔ یقین مانو میں ان اشعار کو بے حد پسند کرتا ہوں۔ چلو اب کہہ بھی ڈالو کہ یہ نظمیں تم نے میری بیگم کے لئے کہیں تھیں [نظموں کا پلندہ میز پر پھینک دیتا ہے اور آتشدان کے پاس جم کر کھڑا ہو جاتا ہے گویا شاہد کے اقدام کا منتظر ہے۔ خالد اندرونی کشمکش سے مغلوب ہو کر بولنے سے قاصر رہتا ہے] تو گویا تم نے واقعی ایسا کیا۔

شاہد۔ [تکلف آمیز احتیاط سے] مسٹر حسین میں حلفیہ کہتا ہوں کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی مسز حسین بے داغ روش کی مالک ہیں۔ اور یقین جانیئے کہ ان کی نسبت اس قسم کا بیہودہ خیال کبھی بھی میرے ذہن میں نہیں گذرا اب رہا یہ کہ مسز حسین نے یہ نظمیں آپ کو دکھا دی ہیں.....

خالد۔ جی نہیں یہ نظمیں نرگس نے مجھ کو دکھانا پسند نہیں کیں۔ یہ اُن کی لاعلمی میں میرے ہاتھ لگی ہیں۔

شاہد۔ تو کیا یہ امر بذات خود ان شعروں کی معصومیت کی دلیل نہیں کیونکہ وہ آپ کو کبھی کی دکھا چکی ہوتیں اگر ان کو آپ کے بے بنیاد شکوک کا علم ہوتا۔

خالد۔ [اضطراب کے عالم میں] عباس! دیانت داری سے کام لو۔ اپنی شاعرانہ قوتوں کی تذلیل نہ کرو تو کیا واقعی تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں خود بخود احمق بن رہا ہوں۔

شاہد۔ بے شک۔ بحیثیت ایک مرد خوددار کے میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے مسز حسین سے اپنے تعلقات کو ایک معمولی خوشگوار تعارف سے زیادہ اہمیت کبھی نہیں دی۔

خالد۔ (آہستگی سے۔ لہجہ میں پہلی مرتبہ درشتی پائی جاتی ہے) اوہ! واقعی۔

(وہ آتشدان سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا۔ گہری نظروں سے شاہد کو سر تا قدم دیکھتا ہوا اس کے نزدیک آتا ہے۔ اس کی نظروں میں گہری تحقیر کے آثار نمایاں ہیں]

شاہد۔ (خالد کی تیز نظروں سے پیدا شدہ اضطرابی کیفیت کو جلدی سے اپنے چہرے سے محو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہے جاتا ہے روانی کے ساتھ) مجھے مسز حسین کے متعلق اشعار کہنے کا گمان کبھی خواب میں بھی نہ گذرا ہو گا۔ اُن کی بابت اشعار کہنا..... کچھ مہمل سی بات ہے۔

خالد۔ (چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے) مہمل! کیوں؟

شاہد۔ وجہ یہ ہے کہ..... معاف کیجئے گا کہ..... کہ بدقسمتی سے میں مسز حسین کو اس قدر پسند نہیں کر سکتا کہ.....

خالد۔ (مُکا تانتے ہوئے) احمق۔ تم سے کہیں بہتر آدمیوں نے نرگس کو پسند کیا ہے ..... کمینے۔ بدمعاش۔ نابکار۔

شاہد۔ (غیر متوقع صورت حالات سے بے حد متاثر ہوتے ہوئے) اس طرح مجھے ذلیل نہ کیجئے۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ـــــ

خالد۔ (غصے سے اس قدر بے تاب ہے کہ کوئی جواب سننا گوارا نہیں کر سکتا آگے بڑھتے ہوئے شاہد کو پیانو تک پسپا ہونے پر مجبور کرتے ہوئے) تم مسز حسین کو پسند نہیں کرتے ـــــ مسز حسین پر شعر کہنے کا گمان خواب میں بھی نہیں کر سکتے ـــــ نرگس تمہارے معیار حسن پر پوری نہیں اترتی۔ ہوں! (سختی کے ساتھ) لیکن تم ہو کون جو اپنے آپ کو اس قدر بلند سمجھتے ہو۔ ذلیل کتے۔

شاہد۔ مسٹر حسین میں آپ کے رشک کی خاطر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ـــــ

خالد۔ رشک! تم سمجھتے ہو کہ میں تم سے رشک کروں گا۔ اونہہ تم جیسے سینکڑوں سے نہیں اور اگر تم سمجھتے ہو کہ میں یہاں اپنے مکان میں تم کو اپنی بیوی کی ہتک کرتے دیکھ سکوں گا تو یقیناً تم غلطی پر ہو۔

شاہد۔ [پیانو کی طرف پشت کئے ہوئے خالد کو تشدد آمیز طور پر کھڑے دیکھ کر بے چینی کے ساتھ] یا اللہ۔ اب میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں۔ اگر آپ صبر سے سننا گوارا فرمائیں تو عرض کروں کہ مسز حسین کے ساتھ میرے تعلقات انتہائی سرد مہری، بے پروائی اور بے تعلقی لئے ہوئے ہیں۔ اور ـــــ

خالد۔ (ہونٹ چباتے ہوئے) پھر کہو ـــــ پھر تو کہنا ذرا ـــــ او او ندھی کھوپڑی

پرمغرور سؤر ——— چھی ——— تم تو ٹھوکروں سے اڑا دینے کے قابل بھی نہیں ہو۔

[شاہد ایک دم ماہرِ فن پہلوان کی طرح داؤ توڑ کرتے ہوئے پھسل کر خالد کے ساتھ گویا جگہ بدل لیتا ہے۔ خالد اب شاہد اور پیانو کے درمیان ہے]

شاہد۔ سنو۔ اب میں زیادہ برداشت نہیں کرسکتا۔

خالد۔ اوہ تو تمہارے جسم میں کچھ خون میرا فرش خراب کرنے کو ہے۔ خوب خوب!

شاہد۔ یہ حالت نہایت مضحکہ خیز ہے۔ میں آپ کو پھر یقین دلاتا ہوں کہ مسز حسین قطعی میرے نزدیک ———

خالد۔ ہاں تو مسز حسین تمہارے نزدیک کیا ہے۔ میں بھی تو سنوں۔ لو میں تمہیں بتاتا ہوں، گدھے کہ مسز حسین کیا ہے۔ مسز حسین یہاں صوبہ بھر میں حسین سے حسین عورت سے زیادہ حسین اور چست اور تیز ہے۔ اور سمجھ دار لوگوں نے تسلیم کیا ہے کہ وہ حد درجہ جذباتی تخلیق ہے۔ ٹکڑ گدے مغرور اور بھک منگے شاعروں اور مصنفوں سے قطع نظر ہوشمند سے ہوشمند اور اعلیٰ سے اعلیٰ پائے کا مصنف اس حقیقت کا معترف ہے۔ تین بہترین فلم کمپنیوں کے مالکوں نے ہزارہا روپے کی پیشکش صرف اتنے کے لئے کی ہے کہ وہ ایک مرتبہ پردۂ سیمیں پر جلوہ دکھا جائے اور تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ لوگ اپنے روپے کا صحیح مصرف جانتے ہیں..... موجودہ وزارت کے ایک ممبر نے جسے وجیہہ ترین مرد سمجھا جاتا ہے۔ نرگس کے ساتھ رقص کرنے کے لئے ملکی ضروریات سے غفلت برتتے ہوئے کئی گھنٹے صرف کئے ہیں ——— ایک مشہور اخبار کے شاعرِ خصوصی نے نرگس کے بارے میں ایک بلند پایہ سانیٹ لکھا ہے جو تمہاری اس تمام بلند پایہ خرافات سے گراں قدر ہے ——— شملہ میں گذشتہ موسم کا ذکر ہے کہ ایک ریاست کے ولیعہد نے جس کے ہاں میں مقیم تھا مجھ سے آکر اس لئے معافی طلب کی کہ اس کے خیالات مسز حسین کی بابت اس کی میزبانانہ پوزیشن کے قدرے خلاف تھے۔ اور یہ اس کی عزت افزائی تھی (جوش میں آتے ہوئے) ہوں! اور وہ تمہارے معیار پر پوری نہیں اترتی اور تم غیر جذباتی طور پر سرد مہری اور بے تعلقی کے ساتھ اس سے صرف تعارف قائم رکھے ہوئے ہو۔ اور پھر تم میں یہ حوصلہ و جرأت ہے کہ نہایت اطمینان سے میرے ہی منہ پر ایسا بکتے ہو۔ ایک دو گھونسوں میں یہ ستواں ناک فرش کر کے رکھ دوں گا۔ کہ پھر اس بدتمیزی کی جرأت نہ ہو۔ تم جیسے گدھوں کو ایک حسین خاتون سے متعارف کرنا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہے (چلاتے ہوئے) سنا تم نے سؤر!

شاہد۔ (تصنع اور ملمع سے عاری لہجہ میں) تم مجھے بار بار گدھا سؤر وغیرہ نہ معلوم کیا کیا کہہ رہے ہو۔ اگر ایک گدی پر دوں تمہارے تو ہفتہ بھر تارے ہی تارے ——— نظر آئیں۔

خالد۔ (آتشگیر مادے کی طرح پھٹتے ہوئے) کیا کہا!

[خالد شاہد پر ایک غضیل بھینسے کی طرح ٹوٹ پڑتا ہے۔ شاہد ایک تربیت یافتہ ماہرِ جنگ کی طرح ہوشیار ہو جاتا ہے اور جیسے ہی خالد جھپٹتا ہے۔ تیزی سے کترا کر الگ ہونا چاہتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اپنے پیچھے رکھے ہوئے اسٹول کو بھول جاتا ہے۔ اس سے الجھ کر اس کے اوپر سے ہو کر پیچھے جا گرتا ہے اور غیر ارادی طور پر گرتے ہوئے سٹول اپنے پاؤں سے آگے کو دھکیل دیتا ہے جو خالد کی پنڈلیوں پر آلگتا ہے۔ خالد اس ضرب سے اسٹول کے اوپر گر پڑتا ہے۔ مسز حسین ایک چیخ کے ساتھ دوڑ کر ہانپتے ہوئے پہلوانوں کے درمیان آکر بیٹھ جاتی ہے، اور دایاں بازو خالد کی گردن میں حائل ہو جاتا ہے]

نرگس۔ یوں نہ کیجئے خالد۔ کہئے ایسا نہ کیجئے گا۔ خواہ مخواہ پٹ جائیے گا۔ وہ زبردست مکہ باز ہے۔

خالد۔ (انتقامانہ لہجہ میں) میں ٹھیک بنا دوں گا اسے [وہ نرگس کی گرفت سے نکلنے کی بے نتیجہ کوشش کرتا ہے،

نرگس۔ خالد مت لڑیئے اس کے ساتھ۔ کہہ دیجے کہ نہیں لڑیں گے۔

شاہد۔ [جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو] اوہ! سر میں یہ بڑا گومڑ اٹھ آیا (اٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ نرگس بایاں ہاتھ بڑھا کر اس کے کوٹ کے دامن کو پکڑ لیتی ہے اور شاہد کو کھینچتی ہے اور دوسرے ہاتھ سے خالد کو قابو میں رکھتی ہے]

نرگس۔ (اس کشمکش سے مجبور ہو کر) اس وقت تک نہیں اٹھنے دوں گی شاہد۔ جب تک تم باز نہ آؤ گے ——— نہ جب تک تم باز آنے کا وعدہ نہ کرو گے نہیں اٹھ سکتے (خالد اٹھنے کی کوشش کرتا ہے اسے کھینچ کر بٹھا لیتی ہے) باز آجایئے آپ ہی۔ خالد۔ جانے دیجئے نا۔ ہاں ہاں کہہ دیجئے خالد۔

خالد۔ ہرگز نہیں جب تک وہ اپنے الفاظ واپس نہ لے۔

نرگس۔ وہ لے لے گا۔ تم اپنے الفاظ واپس لیتے ہو نہ شاہد؟ ہاں شاباش کہہ دو۔

شاہد۔ (وحشیانہ طریق سے) ہاں میں واپس لیتا ہوں (نرگس اس کا دامن چھوڑ دیتی ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ خالد بھی کھڑا ہو جاتا ہے) میں واپس لیتا ہوں۔ سب کچھ واپس لیتا ہوں۔ ایک ایک لفظ کسی استثنے کے بغیر ———

نرگس۔ (قالین پر سے) کیا کوئی مجھے اٹھنے میں مدد نہ دے گا؟

[دونوں ایک ایک ہاتھ تھام لیتے ہیں۔ اور اس کو کھینچ کر کھڑا کر دیتے ہیں]۔

اب تم دونوں مصافحہ نہ کرو گے۔ رنجشیں دور کر کے اچھے دوست نہ بنو گے!

شاہد۔ میں ایسی کسی مصالحت کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں نے تمہاری خاطر بہت کچھ کر دیا۔ اب زیادہ کیا چاہتی ہو۔ میں نے تمہارے لئے جھوٹ بولا لیکن صلہ کیا ملا؟ یہ بڑا اسبیب کا سا گوشت مرے سے سر میں لے کر جاؤں گا۔ اب میں سیدھے راستے پر چلوں گا۔

نرگس۔ شاہد۔ خدا کے لئے ——

شاہد۔ قطعی فضول۔ تمہارا شوہر احمق اور وحشی ہے۔

خالد۔ کیا کہا تم نے۔

شاہد۔ میں کہتا ہوں کہ تم احمق اور وحشی ہو۔ اور اگر تم ذرا گھر سے باہر نکل کر یہ چھو تو پھر دہرانے کے لئے تیار ہوں (خالد لڑائی کے لئے کوٹ اتارنے لگتا ہے) سنو۔ وہ تمام نظمیں تمہاری نرگس کے متعلق تھیں۔ اور انہی کے لئے کہی گئیں تھیں۔ ایک ایک لفظ ان کی تعریف میں ہے اور کسی کی نہیں (خالد کی پیشانی کے شکن صاف ہوتے جاتے ہیں) میں نے وہ شعر انہی کی تعریف میں کہے تھے (خالد کوٹ پہن لیتا ہے) کیونکہ میں ان سے محبت کرتا تھا۔ شدید محبت۔ میں ان کی پرستش کرتا تھا۔ میں ان کو دنیا کی حسین ترین ہستی سمجھتا تھا۔ اور میں نے یہ حقیقت ان پر کئی بار منکشف کی سنتے ہو میں نے ان کو کئی بار بتایا کہ تم ایک مشینی اور کاروباری احمق ہو۔ اور ذرہ برابر ان کے شایاں نہیں ہو۔

خالد۔ (اس قدر شکر گزار ہے کہ مشکل سے اپنے کانوں پر اعتبار کر سکتا ہے) تمہارا واقعی یہ مطلب نہیں ہے۔

شاہد۔ جی۔ میرا یہی مطلب ہے بلکہ اس سے گہرا۔ میں نے مسز حسین سے التجا کی تھی کہ وہ میرے ہمراہ اس گھر سے چلی چلیں —— اور ہمیشہ کے لئے تمہیں چھوڑ دیں —— تم سے قانونی آزادی حاصل کر کے میری شریک حیات بن جائیں۔ میں نے التجا کی تھی۔ گڑگڑایا تھا کہ وہ تم کو اسی سب چھوڑ دیں اور یہ ان کا انکار تھا جس کی بدولت ہمارے تعلقات آج اس طرح ختم ہو گئے (خالد کو حسرت سے دیکھتے ہوئے) انہیں تم میں کیا خوبی نظر آئی خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

خالد۔ (ندامت سے عرق عرق ہوتے ہوئے) میرے پیارے دوست یہ تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا۔ میں معافی کا خواستگار ہوں۔ لو دل سے کدورت نکال دو۔ لو آؤ مصافحہ کریں۔ نرگس انہیں کہو کہ میرے ساتھ ہاتھ ملائیں

نرگس۔ میرے لئے ہاتھ ملا لو شاہد۔ تمہیں میری ہی قسم۔ آخر وہ میرے شوہر ہیں معاف کر دو انہیں لو ان کے ہاتھ میں ہاتھ دو۔

[شاہد مبہوت سا ہو کر نرگس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیتا ہے۔ جلسے خالد کے ہاتھ میں ڈال دیتی ہے]

خالد۔ (پر خلوص انداز سے زور سے جھٹکتے ہوئے) سو تم نے اقرار کر لیا تاکہ تمہاری ادبی ہیروئن میری نرگس ہی ہے۔ اور دنیا کی کوئی نازنیں اس کے پائے کو نہیں پہنچتی (یہ کہتے ہو وہ نرگس کی طرف مڑتا ہے اور اس کو آغوش میں کھینچ لیتا ہے، اس کے چہرے سے غرور اور افتخار جھلکا پڑتا ہے) اوہ نرگس واقعی کوئی تمہاری چشم ناز کے تیروں سے اپنے دل کو نہیں بچا سکتا۔ کوئی نہیں ہے۔ جو تم کو دیکھ کر پھر تم سے بے تعلق رہ سکے۔

نرگس۔ احمق نہ بنو خالد (علیحدہ ہو کر) زیادہ چوٹ تو نہیں آئی شاہد (اس کی پشت کی طرف سے سر کو ٹٹولتی ہے۔ وہ اچھل کر الگ ہو جاتا ہے)

اوہ۔ غریب لڑکا او دیکھو تو کیسا سوچ رہا ہے مٹھ میں سر کہ دغیرہ منگواتی ہوں

خالد۔ شاہد عباس۔ ایک احسان اور نہ کر دو گے۔ گو میں درخواست کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے تم منظور کر لو۔ ہم دونوں پر احسان ہوگا۔

شاہد۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔

خالد۔ (نظموں کا مسودہ اٹھاتے ہوئے) کیا میں ان کو چھپوا سکتا ہوں یقین رکھو ان کی بہترین طباعت ہو گی۔ بہترین کاغذ۔ اعلیٰ ترین جلد۔ منور کتابت سے مزین ہوں گی۔ غرض ہر چیز لاجواب ہو گی کیسی پیاری نظمیں ہیں۔ میں فدا

نرگس۔ (گھنٹی کے پاس پہنچ چکی ہے کہ ایک دم مڑ کر آتی ہے اور تجویز سے خوش ہو کر دوڑی ہوئی ان دونوں کے درمیان آ جاتی ہے۔ اور ملتجیانہ لہجے میں کہتی ہے) اوہ شاہد۔ کیا لاجواب تجویز ہے۔ اگر تم برا نہ مانو تو ——

شاہد۔ اونہہ۔ "میں" ہرگز برا نہ مانوں گا —— میں اس وقت احساس سے بعید ہوں

خالد۔ تو ہم اس مجموعے کا نام کیا رکھیں۔ مثلاً

"نرگس کے نام ——"

یا اسی قسم کا کوئی اور نام؟

شاہد۔ میری ناقص رائے میں تو اس کا نام، مناسب ترین نام ہے،——

"اِک جھوٹ —— اُن کی خاطر"

(برنارڈ شا)

محمد اقبال یاد

ایک غزل اور ایک نظم

غزل

مضطرب میری جبیں میں حسرتِ یک سجدہ ہے
اے مری عمرِ گریزاں! فرصتِ یک سجدہ ہے!

غیرتِ صد سجدہ ہے دل کی ہر اک دھڑکن، مگر
سر کو اب تک آرزوئے عزّتِ یک سجدہ ہے

ابر کے پردے سے بجلی نے اذانِ شام دی
میکدے میں دو جہاں کو دعوتِ یک سجدہ ہے

آؤ! پائے خم پہ سر رکھ کر بقا پا جائیں ہم
آج ساقی کی نظر میں دعوتِ یک سجدہ ہے

یہ جہانِ رنگ و بُو یہ عالمِ کیف و نشاط
اس کی ہر عشرت بہائے راحتِ یک سجدہ ہے

فطرتِ خوش فکر و خوش گفتار ہے خاموش کیوں؟
دیکھنا! شاید وہ محوِ عشرتِ یک سجدہ ہے

عبد العزیز فطرت

میرے وطن کے خواب!

(۱)

تاروں کی مُسکراہٹ ظلمت نے چھین لی ہے،
شب کی شعاعِ رنگیں رو رو کے سو گئی ہے،
میرے وطن کے خوابو! اب شام ہو چکی ہے!

(۲)

پھولوں کی نکہتوں میں آزردگی ہے رقصاں،
کلیوں کی ننھی جاں میں ہے خوفِ مرگ لرزاں،
میرے وطن کے خوابو! اب شام ہو چکی ہے!

(۳)

نغموں کے ساز چپ ہیں خاموش ہیں صدائیں،
خوشیوں کا رقصِ مُردہ بھرتا ہے غم سے آہیں،
میرے وطن کے خوابو! اب شام ہو چکی ہے!

عظیم قریشی

گناہ بے لذّت

میں شرافت کا گلا گھونٹ کر آج آیا ہوں
بے حیائی دلِ بے باک میں بھر لایا ہوں

میں نے مشکل سے دبائی ہے ہر آوازِ ضمیر
سازِ بشکستہ مرے ہاتھ سے ہے سازِ ضمیر

آج آیا ہوں خدا سے میں بغاوت کر کے
ننگ و ناموس کا سامان ہلاکت کر کے

دھجیاں دامنِ غیرت کی اُڑا آیا ہوں
اسی اُمّید کے برتے پہ چلا آیا ہوں

میرے بھڑکے ہوئے جذبات کی بجھ جائے گی پیاس
کچھ دنوں کے لئے جُڑ جائے گی ٹوٹی ہوئی آس

سائے میں گیسوئے مشکیں کے چھپا لے مجھ کو
بے گناہی کی ندامت سے بچا لے مجھ کو

ان رسیلے ہونٹوں پہ امواجِ تبسّم کی لکیر
سرخیٔ خونِ حیا ہے کہ ترا خونِ ضمیر

یہ ترے نغمے ترے قہقہے پھیکے پھیکے
یہ ترے خال یہ خط زرد سے دھندلے دھندلے

دے رہے ہیں تری عفت کی تباہی کا ثبوت
ہے ترا رنگ ترے دل کی سیاہی کا ثبوت

تیرا چوسا ہوا یہ جسم، یہ زندہ اک لاش
تیرے اعضائے حسیں تیرے لئے وجہِ معاش

سوچ تو تیرے لئے زندہ رہیں گے کب تک؟
تیری اوباش خصالی کو سہیں گے کب تک!

میری تنقید پہ ابرو کی کمانوں کو نہ کھینچ
غیظ میں کھو کے کھلے جوبن کی اُٹھانوں کو نہ کھینچ

اپنے سنچکے ہوئے سینے سے لگا لے مجھ کو
اے گنہ گار، گنہ گار بنا لے مجھ کو

تیرے چہرے پہ خوشی ہے نہ تری آنکھ میں نور
زندگی میں تری کیف اور نہ ترے دل میں سرور

نہ ہیں معصوم ترے لب نہ جبیں ہے بیدار
بال ہموار ہیں تیرے نہ اچھوتے رُخسار

تیری خواہش ہے کہ تجھے پھر نہ نظر آؤں میں
جیب اُلٹ کر تری محفل سے چلا جاؤں میں

میں بھی نادم ہوں مرا سینہ پھنکا جاتا ہے
اس گنہ زار میں دم میرا گھُٹا جاتا ہے

کچھ خبر بھی ہے تجھے کیا غلطی کی میں نے
چند لمحوں کو تری لاش خریدی میں نے

اچھا رخصت کوئی اور اب مرے بعد آئے گا
تیری کچلی ہوئی لاش اور کچل جائے گا

مخمور جالندھری

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

معاصر ـــــ مارچ

نظیر اکبر آبادی

اس مختصر مگر خیال افروز مقالے میں جناب شمس الدین احمد نے نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالی ہے، اور انہیں "نئی ہندی" کا پہلا شاعر قرار دیا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ نظیر محض نئی ہندی کے کوی تھے بلکہ مدعا یہ ہے کہ نظیر نے اردو کے علاوہ جہاں فارسی۔ بھاشا اور پنجابی میں شاعری کی وہاں اُس نے "نئی ہندی" میں شعر گوئی کے اس رواج کی طرح ڈالی جو آگے چل کر ہمارے ملک کے موجودہ "ہندی گو شعرا" کا مسلک بنا۔ صاحبِ مضمون نے نظیر کے عہد میں شمالی ہند کی مختلف زبانوں کی کیفیت یوں بیان کی ہے۔

"نظیر کے دَور میں ایک نئی زبان ہندوستان کی آب و ہوا میں پیدا ہو کر پرورش پا رہی تھی اور کافی ترقی کر چکی تھی۔ یہ فارسی کے مقابلے میں ہندی کہلاتی تھی اور اس میں نظم و نثر لکھی جانے لگی تھی۔ اس دور کے پڑھے لکھے لوگ اس زبان سے بھی آشنا ہو چکے تھے اور اکثر اس میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ اسی کو بعد میں لوگ ریختہ اور اردو کہنے لگے"

آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"اس زمانے میں یا اس کے بہت عرصہ بعد تک ہندی کا لفظ کسی بھاشا یا پراکرت کے لئے مستعمل نہیں ہوتا تھا ... یہی حال حضرت امیر خسرو کی ہندی شاعری کا ہے انہوں نے اپنی شاعری کے متعلق خود اشارات کئے ہیں۔ اس ہندی سے بھی وہی اردو کی ابتدائی شکل مراد ہے۔ لفظ "ہندی" اردو کے لئے عرصۂ دراز تک مستعمل رہا۔ اخیر زمانہ میں میر و مصحفی نے تذکرہ شعرائے ہندی لکھے ان میں صرف اردو شاعروں کا تذکرہ ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس وقت تک اردو کو "ہندی" کہتے تھے۔ غالب نے جہاں اپنے اشعار میں اردو کو ریختہ لکھا ہے وہاں اپنے خطوط کے مجموعے کا نام عودِ ہندی رکھا ہے۔ اس دور کے بعد اردو کے لئے یہ نام اور دوسرے نام یعنی ریختہ وغیرہ متروک ہو گئے اور اسے صرف اردو کہنے لگے۔ اسی دور میں انگریزوں نے اس کے لئے ایک دوسرا نام ہندوستانی تجویز کیا اور اس وقت سے کبھی کبھی یہ استعمال بھی ہوتا رہا۔"

ہندوستان کے مسلم فرمانرواؤں نے جس طرح یہاں کے مقامی تمدن کو قبول کیا، اس کا ایک پہلو اُن بولیوں کی سرپرستی بھی تھی جو دارالسلطنت کے گرد و نواح میں بولی جاتی تھیں

چنانچہ

"عہدِ اکبری میں جہاں ایک طرف بڑے بڑے عالم و فاضل شاعر و ادیب قندِ پارسی میں شکر شکنی کیا کرتے تھے وہاں دوسری طرف بڑے بڑے کَوی برج بھاشا میں نازک خیالیاں دکھانے لگے۔ عبدالرحیم خان خاناں جیسا تلوار کا دھنی تھا۔ ویسا ہی قلمروِ سخن کا بھی مالک تھا۔ ترکی، فارسی، عربی کے علاوہ برج بھاشا کا بھی وہ ذبردست فاضل اور بے مثل شاعر تھا۔ اس کی رحیمن دلاس آج بھی بھاشا ادب کے خزانے کا قیمتی گوہر ہے۔ شاہانِ مغلیہ نے اس بھاشا شاعری کی بیش از بیش قدردانی کی اور دُور دُور تک اُس کی شہرت پہنچی۔ اودھ کے علاقے میں وہاں کی مقامی بولی میں جسے اودھی بھاشا کہتے ہیں لوگ شاعری کرنے لگے اور اچھے اچھے شاعر وہاں پیدا ہوئے تلسی داس۔

ملک محمد جائسی وغیرہ اسی عہد کی یادگار ہیں۔ ابھی تک یہ شاعری بھاشا کی شاعری سمجھی اور کہی جاتی تھی۔ اُسے "ہندی" کوئی نہیں کہتا تھا۔ ہندی ایک دوسری چیز تھی جو کاروباری تبادلۂ خیال کا ذریعہ تھی، اس کاروباری زبان میں بھی یہ صلاحیت پیدا ہو چلی تھی کہ یہ ادبی اور علمی زبان بنے، چنانچہ بعض اشخاص اس زبان میں طبع آزمائی کرنے لگے تھے۔ اُن کو ہندی زبان کا شاعر اور اُن کی شاعری کو ہندی کی شاعری کہا جاتا تھا۔ یہی صورت سلطنت مغلیہ کے دورِ انحطاط میں بھی قائم رہی اور اس دور کے اخیر تک فارسی، ہندی اور بھاشا، تینوں ادب قائم رہے البتہ یہ ضرور ہوا کہ ہندی کے لئے دو اور نئے نام ریختہ اور اُردو پیدا ہو گئے اور رفتہ رفتہ یہ نئی زبان زیادہ وسیع اور کثیر الاستعمال ہوتی گئی اور فارسی اور بھاشا دبتی گئی یہاں تک کہ سلطنتِ مغلیہ کا چراغ گُل ہو گیا اور اس ملک کی عنانِ حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں آ گئی اب فارسی تو دفتری حیثیت سے ختم ہو چکی تھی۔ برج بھاشا اور اودھی بھاشا مقامی بولیوں کی حیثیت سے اپنے اپنے مخصوص علاقوں میں محدود رہیں۔ صرف ہندی اپنے نئے نام اردو کے ساتھ ملک کے اکثر علاقوں کی عام اور ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان بن کر خوب پھیل گئی اور اچھی طرح پھلی پھولی۔ انگریز حکام نے بھی اس کو ملک کی عام زبان سمجھا اور اس کی حیثیت کو مان کر اس کو ایک نیا نام ہندوستانی یعنی ملک ہندوستان کی زبان دیا۔"

یہاں تک تو اس ہندی کا ذکر تھا جو بعد میں اردو کہلائی اور جسے ایک طرف ذوق اور غالب اور دوسری جانب نسیم اور سرشار نے چار چاند لگائے۔ لیکن انیسویں صدی میں

"بعض ہندو رہنماؤں نے ایک نئی تحریک کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد ہندوؤں کی گذشتہ کھوئی ہوئی عظمت کو واپس لانا تھا...... اس تحریک کی مذہبی پیداوار سوامی دیانند سرسوتی اور ادبی پیداوار للو لال جی ہیں۔ اسی وقت سے ہندو مسلمانوں کی عام زبان جس کا پہلا نام ہندی اور آخری نام اردو تھا۔ دو قسم کے رسم الخط یعنی فارسی اور ناگری میں لکھی جانے لگی۔ اسی وقت سے وہ اردو جو ناگری حروف میں لکھی جاتی تھی۔ اردو کے مقابلے میں ہندی کہلانے لگی اور اس میں سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ بھر دیئے گئے ...... یہ ہندی کا نیا جنم تھا جو اسے فورٹ ولیم میں ملا۔ اس کو تلسی داس اور سور داس وغیرہ کی بھاشا سے کوئی تعلق نہیں۔ جو زبانیں فطری طور پر پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں پہلے شاعری ہوتی ہے اس کے بعد نثر کا دور آتا ہے لیکن چونکہ یہ "نئی ہندی" غیر فطری طور پر اور کچھ تعصب کے جذبات اور ملکی مصالح کے زیرِ اثر پیدا کی گئی تھی۔ اس لئے اس میں پہلے نثر نگاری شروع ہوئی۔ اور شاعری عرصہ دراز تک نہیں ہو سکی مگر اس نئی ہندی کے بانیوں اور مدعیوں کو اپنا مکمل ادب پیش کرنا ضرور تھا۔ اس لئے ان لوگوں نے مجبوراً قدیم برج بھاشا اور اودھی بھاشا کی شاعری کو اپنا نظمی ادب قرار دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اس کی نظم و نثر کی بالکل دو مختلف زبانیں ہو گئیں، حالانکہ کسی اور زبان میں جو فطرتی طور پر پیدا ہوتی اور نشو و نما پاتی ہے یہ صورت نہیں ہوتی ہے۔ ہاں عروض کی بندشوں کی وجہ سے ترتیب الفاظ وغیرہ میں کچھ فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اب بڑی کوششوں سے اس نئی ہندی میں بھی شاعرانہ ادب کچھ کچھ پیدا ہونے لگا ہے۔ مگر وہ ہندی نثر کی طرح بھاشا سے بالکل الگ اور اردو سے نہایت مشابہ ہے۔"

ہندی اور نئی ہندی کا باہمی فرق اور نئی ہندی کی شاعری کے مختلف احوال بیان کرنے کے بعد فاضل مقالہ نگار نے بتایا ہے کہ باوجود اس امر کے کہ بھاشا کی شاعری اور نئی ہندی کی شاعری میں بُعد المشرقین ہے، ہندی ادب کے مورخوں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر ان زبانوں کے شاعروں کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا ہے اور بھاشا کی سہانی شاعری میں جو مخصوص کیفیتیں پائی جاتی ہیں ان کا سہرا بھی نئی ہندی کے سر باندھنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ نئی ہندی نے اب تک کوئی ایسا عظیم الشان شاعر پیدا نہیں کیا جس کی شاعری معیاری قرار دی جا سکے اور اب وہ اصل مبحث کی طرف لوٹتے ہیں اور نظیر اکبر آبادی کی چند ایسی نظموں سے جو نئی ہندی کے انداز میں لکھی گئی ہیں۔ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ نظیر نے اس راہ میں بھی رہبری کی ہے۔ بظاہر اُن کا دعوے درست معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ نظیر کی شاعری کی ابتدا ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ ہو چکی تھی اور یہ وہ زمانہ ہے جب ابھی فورٹ ولیم سکول اور اس کے متبعین کا نام و نشان بھی نہ تھا نظیر نے جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں خالص اردو کے علاوہ بھاشا اور پنجابی میں بھی نظمیں لکھی ہیں۔ پھر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ خالص ہندوانہ موضوعات پر اس نے ایسی زبان میں شاعری کی ہو جس میں سنسکرت الفاظ کی اکثریت پائی جاتی تھی اگرچہ انداز بیان وہی اردو کا قائم رکھا ہے ایک نمونے کا بند دیکھئے جو شاعر کی مشہور نظم کنہیا جی سے لیا گیا ہے:

سبھ ساعت سے یوں دنیا میں اوتار گربھ میں آتے ہیں
جو نار و من ہیں دھیان بھلی سب اُن کا بھید بتاتے ہیں

وہ نیک صورت سے جس دم اس سشٹ میں بجنے جاتے ہیں
جو لیلا رچنی ہوتی ہے وہ روپ یہ جا دکھلاتے ہیں
یوں دیکھنے میں اور کہنے میں وہ روپ تو بالے ہوتے ہیں
پر بالے ہی پن میں اُن کے اُبکار نرالے ہوتے ہیں

زبان کی اس کیفیت کے متعلق صاحب مضمون یوں رقمطراز ہیں :۔

"اس میں صرف دو لفظ عربی کے ہیں اور ایک فارسی کا۔ گویا قصداً عربی فارسی کے لفظوں کو نکال کر ان کی جگہ سنسکرت کے الفاظ رکھے گئے ہیں۔ یہی صورت موجودہ "نئی ہندی" کی ہے۔ اس کی زبان کو ولی سے لے کر اقبال تک کوئی اردو نہیں کہہ سکتا پھر بھی اس کا ڈھانچا اور چوکھٹا پورا اردو کا ہے۔ اگر اس میں سے سنسکرت الفاظ نکال کر عام الفاظ ان کی جگہ رکھ دیئے جائیں تو پھر یہ خاصی اردو ہو جائے گی۔۔۔۔ اور بھی متعدد نظمیں نظیر نے اس زبان میں لکھی ہیں۔۔۔۔ نظیر کی بھاشا شاعری اُن کی نئی ہندی سے بالکل الگ ہے۔ اُس کی زبان طرز بیان وزن عروضی وغیرہ وہ ہے جو برج بھاشا کے لئے مخصوص ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

برہ آگ تن میں لگی جرن لگے سب گات
ناری چھوٹت بید کے پڑے پھپھولا ہات"

نظیر کی اردو شاعری کی مثالیں پیش کرنا چونکہ تحصیل حاصل تھا اس لئے صاحب مضمون نے اس روش سے ایک بڑی حد تک احتراز کیا ہے "نئی ہندی" شاعری سے مقابلے کی غرض سے مندرجہ ذیل دو بند جو بہت معروف ہیں پیش کر دیئے ہیں :۔

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاہٹ قطرات کی بہاریں
ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی ساتھ لے
نیکی کا بدلہ نیک ہے بد سے بدی کی بات لے
میوہ کھلا میوہ ملے پھل پھول دے پھل پات لے
آرام دے آرام لے دکھ درد دے آفات لے
کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے

اور اب ایک تضمین پنجابی کا بھی ملاحظہ فرمایئے۔ شاعر نے اوپر کے تین مصرعے اردو میں اور آخری دو پنجابی میں کہے ہیں :۔

ہوئی وہ تقصیر مجھ سے کیا اب تو جس کے باعث جدا ہوا ہے
مرا تو جان و دل اے پری رو تجھی صنم پر فدا ہوا ہے
کسی طرح سے تو جلد آجا نکلتی منہ سے یہی صدا ہے
تساڈے ملنے نوں دل ہے بیکل یہی وہ گلاں نت آکھدا ہے
سدا ے مینوں وے اپنے گھر وچ نہیں تے اتھے اسلٹے نال آ۔

مقامی بولیوں میں نظیر نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ اس کی ہمہ گیر ذہانت کی دلیل ہیں۔ ورنہ اس کا بیشتر کلام موضوع کی کیفیاتی تبدیلیوں کے ساتھ اُسی عام فہم زبان میں ہے جسے پہلے ہندی اور اب اردو کہا جاتا ہے۔

صاحب مضمون نے موضوع کی رعایت کے لحاظ سے اُس کی زبان کے مختلف رنگ مقرر کئے ہیں۔ ان میں سے ایک کو وہ "پنڈتانہ اردو" کہتے ہیں۔ اور

"نظیر نے اس قسم کی زبان صرف ان نظموں کے لئے استعمال کی ہے جن کا تعلق ہنود کی مذہبی روایات سے ہے۔۔۔۔ ان نظموں کے وہی عنوان ہیں جن پر عموماً پنڈت کتھا کیا کرتے ہیں۔ ان کی کتھائیں نثر میں ہوتی ہیں کہیں کہیں کوئی بھاشا یا سنسکرت کا شعر بطور تلمیح کہہ جاتے ہیں نظیر نے ان نظموں کو کتھاؤں کا جامہ پہنا دیا ہے۔۔۔۔ (ردیف) ہندوستان کی عام زبان جس کا نام اردو بھی ہے اور ہندی بھی، وہی ہے جس میں نظیر نے اپنی اکثر نظمیں جو اس کی شاعری کی جان ہیں لکھی ہیں مثلاً برسات کی بہاریں، ہولی کی بہاریں، کلجگ ہنس نامہ، بنجارہ نامہ وغیرہ"

نظیر عوام کا شاعر تھا اور زبان عوام ہی کی ملکیت ہے۔ ہماری رائے میں نظیر کی شاعری اردو ہندی کے موجودہ مناقشے کا ایک نہایت مناسب حل پیش کرتی ہے۔ خالص مذہبی موضوعات کے لئے آپ بے شک وہی الفاظ استعمال کیجئے جو نظیر نے اپنی "پنڈتانہ اردو" میں استعمال کئے ہیں یا ہمارے بعض علماء اپنی "مولویانہ اردو" میں کرتے ہیں لیکن روزمرہ کی ضروریات اور معاشرتی موضوعات اس قسم کی زبان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے اسے عوام

پر یہ جبر عائد کرنا ایک کھلی ہوئی بے انصافی اور ایک غیر فطری اقدام ہے۔ نظیر نے آج سے کم و بیش ڈیڑھ سو برس پیشتر جس راہ پر قدم اٹھایا تھا وہ ہمیں آج بھی آشتی اور کامیابی کی منزل کی طرف لے جا سکتی ہے۔

صلاح الدین احمد

حصۂ نظم:-

تو اگر واپس نہ آتی

(۱)

تُو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دھواں اُٹھتا بطونِ خاک سے
ہات آ جاتا اگر تیرا نہ میرے ہات میں
دل میں کیا کچھ بیت جاتی اِس اندھیری رات میں
اُف وہ طوفاں، وہ بھیانک تیرگی، وہ ابر و باد
وہ ہوائے تُند، باراں، وہ خروشِ برق و رعد
دفعتہً وہ روشنی کے سلسلے کا ٹوٹنا
وہ گھٹاؤں کی گرج سے نبضِ ساحل چھوٹنا
وہ اُبالو کے کلیجے کو مچلتی "مان سُون"
وہ سمندر کے تھپیڑے، وہ ہواؤں کا جنوں
اور اِس طوفان میں اے زندگی کی روشنی!
کود پڑنا وہ سمندر میں ترا ایک بارگی

(۲)

تُو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دھواں اُٹھتا بطونِ خاک سے
اس دلِ سوزاں میں آتے اِس بلا کے زلزلے
آسماں روتا، زمیں ہلتی، ستارے کانپتے
موت اور پھر موت تیری، الحفیظ و الاماں!
ہڈیوں سے آنچ اُٹھتی اور بالوں سے دھواں
لیکن اک لمحے کے بعد اے پیکرِ حُسن و حیات
جوش کو بھی کاوشِ ہستی سے مل جاتی نجات
پہلے ہوتا اک تلاطم اک طوفاں اک جوش
بعد ازاں تُو اور میں اور بحر و باراں کا خروش
اتصالِ روح ہوتا موت کے گرداب میں
آتشِ غم سرد ہو جاتی کنارِ آب میں

(۳)

بحر کے سینے کو جب طوفان میں لاتی ہوا
پئے بہ پئے آتی ہمارے گنگنانے کی صدا
جب گھٹائیں رقص کرتیں اور پپیہے کوکتے
نُور میں لپٹے ہوئے دونوں اُبھرتے بحر سے
رات جب کچھ بھیگ جاتی اور جُھک جاتا قمر
سیر کرتے روز ہم باہیں گلوں میں ڈال کر
کوئلیں جب کوکنے لگتیں اندھیری رات میں
صبح تک دھومیں مچاتے ہم بھری برسات میں
چھیڑتا جب کوئی ساحل پر ہماری داستاں
پڑنے لگتیں بحر پر ہلکی سی دو پرچھائیاں
زندہ رہتے حشر تک غم کے پرستاروں میں ہم
سانس لیتے سازِ حسن و عشق کے تاروں میں ہم
وقف ہو جاتے محبت کے فسانے کے لئے
سرد ہو کر آگ بن جاتے زمانے کے لئے

ساقی مارچ ۱۹۴۱ء ——— جوش ملیح آبادی

جوش کی اس نظم کی کیفیت ایک تیرہ و تار خلاء کی سی ہے یہ خلاء ہماری نظروں کے سامنے نہیں، ہمارے قدموں کے نیچے ہے۔ اِس خلاء کو دیکھتے ہوئے سب سے پہلے ہمیں شبہ سا ہوتا ہے کہ مفہوم کا اُجالا دکھائی دینے کو ہے، اور پھر جوں جوں ہم مصرعوں کے زینے طے کرتے جاتے ہیں اور قصے کی گہرائی میں اُترتے جاتے ہیں، مفہوم وہ چکنا ہوا جوہر ہوتے ہیں نہایت باقاعدگی کے ساتھ سا تھ رکھا ہوا ہے ہمیں پہلے جھلملاتا اور پھر جگمگاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ ہمیں زینوں کا احساس نہیں رہتا، یوں محسوس ہوتا ہے گویا ہم فضا میں معلّق ہیں اور نیچے گرتے چلے جا رہے ہیں، بلند و پست کا احساس ہے نہ کم و بیش کا، خون کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ متضاد کیفیت بھی قائم ہے کہ ہر سمت کا شعور بیدار ہو رہا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اس نظم کے الفاظ سے مفہوم تک پہنچنے کی کیفیت اس ہوا باز کے احساس سے ملتی جُلتی ہے جو طیارے سے چھتری لے کر کود پڑا ہو۔ اُسی کی طرح زمین پر پہنچ کر قصہ قائم ہوتا ہے۔ قصہ یوں ہے:

شاعر ساحل سمندر پر ایک عورت کو ڈوبنے سے بچا لیتا ہے بس

لیکن اس مختصر سی بات سے بھی کئی باتیں نکلتی ہیں۔ سب سے پہلے تو اسی کا تعین کیجئے کہ شاعر کون ہے! وہ عورت کون ہے؟ — کئی مفروضے قائم کئے جا سکتے ہیں۔ ساحل پر ایک شاعر، اس نظم کا شاعر بیٹھا ہوا ہے، اچانک وہ سنتا ہے کہ نہاتے ہوئے کوئی عورت ڈوب گئی۔ شاعر کو اس خبر سے تحریکِ شعری ہوتی ہے۔ یا وہ سنتا ہے کہ کسی عورت نے خودکشی کے ارادے سے اپنے جسم کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیا، لیکن بچا لی گئی۔ شاعر کو اس خبر سے تحریکِ شعری ہوتی ہے یا شاعر بھی ساحل پر نہانے والوں میں سے ایک تھا، نہاتے ہوئے اچانک اس کے ہاتھ میں کسی عورت کا ہاتھ آ گیا اور اُسے صرف یہ خیال آیا، شاید کوئی لہر اس کے ہاتھ سے یوں چھو گئی گویا کسی ڈوبتی ہوئی عورت کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں آ گیا ہے — تحریکِ شعری کی صورت تو اوپر کے مختلف نقشوں میں سے معین کی جا سکتی ہے لیکن ہمارا استفسار ابھی تک قائم ہے، شاعر کون ہے؟ — وہ عورت کون ہے؟ — شاعر ایک عاشق ہے اور وہ عورت اس کی محبوبہ اب ایک اور ہی رنگ میں قصہ قائم ہو جاتا ہے۔ شاعر اور اُس کی محبوبہ ایالو کے ساحل پر بیٹھے ہیں۔ ہوا تند و تیز ہے، خروشِ برق و رعد ہے۔ بارش کا سلسلہ جاری ہے۔ سمندر کے تھپیڑے ایک وحشیانہ انداز میں ساحل سے ٹکرا رہے ہیں۔ اس ہیبت ناک ماحول میں یہ دونوں ساحل کے کنارے پر کیوں بیٹھے ہوتے ہیں۔ نہ جانے کس طرح کس مشکل سے یہ لمحۂ یکجائی کا حاصل ہوا ہے۔ "اتصالِ روح ہوتا موت کے گرداب میں" — ابھی اتصالِ روح نہیں ہو پایا۔ "آتشِ غم سرد ہو جاتی کنارِ آب میں" — کوئی غم انہیں لاحق ہے مستقل طور پر ہم آہنگ نہ ہو سکنے کا غم۔ تیسرے بند میں "مرنے کے بعد سیر کرتے" اور "دھوم مچاتے" وغیرہ بھی دبی ہوئی خواہشات کی صورت میں اس بات کا اشارہ کر رہی ہیں کہ اس جوڑے کو مکمل ملاپ حاصل نہیں ہے۔ شاید عورت زندگی کی اس ناسازی سے زیادہ برگشتہ خاطر ہے، وہ موقعے سے متاثر ہو کر مکمل ملاپ سے نا اُمید ہو کر اچانک سمندر میں کود پڑتی ہے۔ گھنا گرج اٹھتی ہے اور اس گرج کے ساتھ ہی شاعر بھی اپنی محبوبہ کو بچانے کے لئے اس کے پیچھے کود پڑتا ہے۔ اچانک بجلی چمکتی ہے اور اس "روشنی کے سلسلے" میں محبوبہ کا ہات شاعر کے ہات میں آ جاتا ہے اور وہ اُسے ڈوبنے سے بچا کر کنارے پر لے آتا ہے۔

اب اُسے تحریکِ شعری ہوتی ہے۔ ابھی اس کے اعصاب اس ہنگامے، اس حادثے، اس المناک واقعے کے اثرات سے رہائی نہیں پا سکے، ڈھیلے نہیں ہوئے، کسی حد تک تنے ہوئے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر وہ اپنی محبوبہ کو نہ بچا سکتا تو کیا ہوتا — ہونا کیا تھا؟ وہ بھی اپنے آپ کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیتا اور پھر "اتصالِ روح ہوتا موت کے گرداب میں" — اور یوں مرنے کے بعد اُن کی داستان ہی ساحل پر باقی رہ جاتی اور غم کے پرستار محبت کے اس افسانے کو مزے لے لے کر بیان کرتے — اور یوں "سرد ہو کر" یہ دونوں عاشق "زمانے کے لئے آگ بن جاتے"۔

لیکن کیا یہ نظم فراق کے بعد محبوبہ سے دوبارہ ملنے کا استعارہ تو نہیں ہے۔ کیا فراق کی کیفیت ایک بحرِ ہیبت ناک نہیں ہو سکتی؟ اس صورت میں قصہ یوں ہو جائے گا کہ کچھ مدت جدا رہنے کے بعد شاعر کو اپنی محبوبہ سے ملنا میسر ہوتا ہے۔ وہ ایک تسکین کے ساتھ اس کا ہات اپنے ہات میں تھام لیتا ہے۔ اس لمحے میں اُسے یوں محسوس ہوتا ہے گویا اُس نے کسی بحرِ ہیبت ناک کے قہر و غضب سے رہائی پائی ہے۔ اور پھر اس کا تخیل باقی تمام نظم کھڑی کر دیتا ہے۔

قصے کی اشارتی کیفیتوں کا ذکر تو ہو چکا، اس کے علاوہ جس فن کارانہ بانکپن سے جوشؔ نے اس نظم میں ہیرو کی ذہنی کیفیت کی مطابقت میں ماحول قائم کیا ہے۔ وہ بھی لائقِ تحسین ہے۔ ذاتی طور پر میرے ذہن میں اسے پڑھ کر ایک ویسی ہی اجاڑ، المناک اور سنجیدہ کیفیت طاری ہو گئی تھی جو مغربی ناول نویس اور شاعرہ ایمیلی برونٹی کی بعض نظموں سے پیدا ہوتی ہے اور خصوصاً اس کے مشہور ناول "وودرنگ ہائٹس" کے جذبۂ محبت کا گھنا، گرم جادو تو اس نظم سے بہت ہی ملتا جلتا ہے۔

"نیا ادب" اور "کلیم" کے شمارۂ جنوری اور فروری میں جوشؔ ہی کی ایک اور نظم شاعر کی فن کارانہ اہلیت کا ثبوت دے رہی ہے۔ پہلے نظم دیکھئے۔

مہاجن

قد کی لمبائی سے اک حد تک کمر جھولی ہوئی
سر پہ چُٹیا مردہ چوہے کی طرح پھولی ہوئی
دانت میلے پنڈلیاں پیچیدہ، دھوتی داغ دار
ناک میں مونچھوں کے گچھے پیٹ میں توندی کا غار
سامنے غلے کے بورے پشت پر الماریاں
بغلوں میں گردنیں لیتی ہوئی زرداریاں
کہنیاں تکیے کے اندر وزن سے دھنستی ہوئی
چست صدری دائرے پر توند کے پھنستی ہوئی
خوب لے لے کر ڈکاریں دل کو بہلاتا ہوا
دونوں نتھنوں کو پھلائے، توند سہلاتا ہوا

ہنس کے غوطے آبِ سرد و گرم میں دیتا ہوا
قرض کے طالب کے دل کا امتحاں لیتا ہوا
عذر کرتا ہے بہ پے، تیوری چڑھاتا بار بار
شدتِ حاجت کا اندازہ لگاتا بار بار
کشتیِ ہستی کو جوئے سیم میں کھیتا ہوا
اُلٹی سانسیں فربہی کے بار سے لیتا ہوا
رُخ کی تاریکی پہ زر کی سرخیاں چھائی ہوئی
بے حقیقت خاک سونا بن کے اترائی ہوئی
کان کے بالے نمودِ زر کا دم بھرتے ہوئے
سُود کے بارے میں کچھ سرگوشیاں کرتے ہوئے
عالمِ اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہوا
بے زری کی شام سے اخذِ سحر کرتا ہوا

جوش ملیح آبادی

نیا ادب اور کلیم

پہلی نظم میں نفسیاتی مطالعے کے ساتھ ساتھ جس قوتِ بیان کا اظہار ہو رہا تھا وہی یہاں ایک اور رنگ میں موجود ہے۔ سب سے پہلی خوبی اس بیان میں مجھے یہ محسوس ہوتی ہے کہ کہیں بھی شاعر نے براہ راست مہاجن کے خلاف کوئی بات نہیں کہی لیکن اس کے باوجود اُس نے جولائقِ تحسین حقیقت پرستانہ نقشہ ایک مارواڑی بنئے کا کھینچا ہے۔ اُسے شروع سے دیکھتے ہی اُس کے خلاف ناپسندیدگی کا احساس قائم ہو جاتا ہے اور جوں جوں نظم بڑھتی جاتی ہے۔ یہ ناپسندیدگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی نفرت کے قریب پہنچتی جاتی ہے۔ آغاز میں قد کی لمبائی سے جھولی ہوئی کمر ایک عفریت نما ہستی کا تصور لاتی ہے لیکن اسے چھوڑئیے، دوسرا ہی مصرعہ اس گھناؤنے احساس کو تحریک دے دیتا ہے اور پھر تشبیہ کا حُسن بھی ملاحظہ کیجئے۔ "سر پہ چٹیا مردہ چوہے کی طرح پھولی ہوئی" اسی طرح میلے دانت، پیچیدہ پنڈلیاں، داغدار دھوتی، مونچھوں کے گچھے۔ یہ سب باتیں اس مردہ چوہے سے پیدا شدہ احساس کو گہرا کئے جا رہی ہیں لیکن یہاں ایک فن کارانہ پلٹا دیکھئے۔ ابھی شاعر بنئے کی تمام ناپسندیدہ اور ناخوشگوار باتیں نہیں بیان کر چکا وہ انہیں ملتوی کر کے ماحول کی طرف توجہ کر لیتا ہے تاکہ قاری کے ذہن میں یہ تاثر پیدا ہو سکے کہ کہیں شاعر ناواجب طور پر تو صرف برائیوں کا انبار اکٹھا نہیں کر رہا، کہیں وہ متعصب تو نہیں ہے، کہیں اُس کی نظر صرف عیب بین تو نہیں ہو گئی — اور ماحول سے بھی صرف چند باتیں پیش کر کے وہ اجمال سے تفصیلی تاثر پیدا کرتا ہے "بورے، الماریاں، تکیہ" لیکن ان دو تین باتوں ہی سے پورا نقشہ کھینچ جاتا ہے۔ اب شاعر ماحول کی چیزیں گنواتا ہوا تکئے پر آ پہنچا ہے۔ تکئے ہی سے ٹیک لگائے مہاجن بیٹھا ہے، چنانچہ اب اگر پھر ذرا تھوڑی دیر کو اس کے حلیئے کی خبر لے لی جائے تو قاری کے نزدیک یہ نفسیاتی لحاظ سے ایک مدلّل حرکتِ ذہنی ہوگی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ شاعر تکئے سے گریز کرتا ہے پہلے ان کہنیوں کا ذکر ہے جو تکئے کے اندر دھنسی ہوئی ہیں، پھر اُس چست صدری کا ذکر ہے جس کی چستی کا بیان خود بخود ذہن کو توند کی طرف لے جا سکتا ہے — اور یوں مصرعے میں "نتھنوں کو پھلائے، توند سہلاتے ہوئے ڈکاریں لینا" بنفسہٖ ایک غیر مہذب اور نامناسب سا فعل ہے۔

ہاں اس وقت یہ مہاجن اکیلا نہیں ہے، اس کے سامنے ایک اور شخص بھی اپنی غرض مندی کی وجہ سے مجبوراً موجود ہے۔ اُس کی موجودگی کا براہ راست ذکر بھی آپ نظم میں کہیں نہیں پائیں گے۔ لیکن اُس کی موجودگی کی وجہ سے جو رویہ مہاجن کا ہے وہی اس مختصر سے "سانحے" کے دوسرے کردار کو پوری طرح پیش نظر کر دیتا ہے یوں نہ صرف تصور میں یکسوئی رہتی ہے بلکہ ایک ہی نقش جو شاعر کا اصل موضوع ہے گہرے سے گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ نظم صرف ایک بیانیہ چیز معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں سرمایہ داری کے خلاف اس سے خاطر خواہ تاثر پیدا ہوتا ہے اور ہم غور کرنے لگتے ہیں کہ جس نظام میں اس قسم کے ناپسندیدہ افراد نشو و نما پا سکتے اور قائم رہ سکتے ہیں، اُسے بدلنا چاہئے۔ ایک شخص کے خلاف قاری کو اُکسا کر ایک نظام کا مخالف بنانا کچھ آسان نہیں، اور یہی نکتہ فن کار کو داد دینے پر ہمیں مجبور کرتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے قطعات اور اُن کی دلکشی اور خوبیوں سے "ادبی دنیا" کے پڑھنے والے کافی شناسا ہیں، اس دفعہ بھی اس کے چار قطعے بغیر کسی اضافہ نثری کے پیش کئے جا سکتے ہیں (پہلے تین قطعے ماہ مارچ کے "شاہکار" سے ہیں اور آخری قطعہ ماہنامہ ساقی کے شمارہ مارچ سے)

تاثرات

جھکی کھجور کی شاخوں سے چاند اُلجھنے لگا
ستارے ریت کے ذرّوں پہ مسکرانے لگے
وہ ایک ٹیلے کے سائے میں دو دھڑکتے دل
مذاق گذرے ہوئے وقت کا اڑانے لگے
خدا کے واسطے پیاری(۲) مرے قریب نہ آ
مری ترستی ہوئی زندگی پہ رحم نہ کھا

کہ آج میں کو دیکھا ہے تیرے ہونٹوں پر
وہ بوسہ جس میں لبِ غیر کپکپاتا تھا

(۳)

وہ پانی بھرنے چلی اک جوان پنہاری
وہ گورے ٹخنوں پہ پازیب جھنجھناتی ہے
غضب غضب کہ مرے دل کی سرد راکھ سے پھر
کسی کی تپتی جوانی کی آنچ آتی ہے

(۴)

پھول کی اک پژمردہ پتی گھاس پہ بیٹھی ہانپ رہی ہے
نئی نویلی ایک کلی شاخوں میں چھپ کر کانپ رہی ہے
دیکھ کے ایک بھکارن کو اک مرد کے آگے ہاتھ بڑھائے
شہزادی زلفیں بکھرا کر اپنا سینہ ڈھانپ رہی ہے

جوابِ تغافل

اُس کو ہلکا سا ہے احساسِ جوانی کا سرور
ابھی جھکی نہیں نخوت ابھی سوتا ہے غرور
ہے کلی غنچے کے مفہوم سے کچھ دور ابھی
جام صہبائے جنوں سے نہیں معمور ابھی
گیسوئے سادہ سے ہے دور تکلف کا خیال
کھل کے پھیلا نہیں زلفوں کی سیہ رات کا جال
نرم ہونٹوں کی لکیروں میں نہیں آگ ابھی
قدِ رعنا میں ہے بنتا ہوا اک راگ ابھی
چشم مے رنگ میں شامل نہیں سینے کی کھٹک
ناشناسائے جنوں ہے ابھی سانسوں کی مہک
ابھی رفتار میں گرداب کا انداز نہیں
دل کی گہرائی کو کوئی شاملِ آواز نہیں
ساز کا برقِ فگن تار ہے خاموش ابھی
رد میں طوفانِ ترنم کے نہیں جوش ابھی
نقشِ فطرت کا ہے ابہام سے لبریز ابھی
سطح پہ آئی نہیں موجِ جنوں خیز ابھی
سست رفتاریٔ فطرت کا مداوا کر دوں
یعنی اِس موج کو ہم فطرتِ دریا کر دوں
وقت سے پہلے لبے اس کی جوانی دے دوں
اس کے انفاس کو شعلے کی روانی دے دوں
اس کے اعضا میں جو طوفاں ہیں جگا دوں اُن کو
تارِ احساس کے جتنے ہیں ہلا دوں اُن کو
اپنے جلتے ہوئے لب اُس کے لبوں پر رکھ کر
اس کے خاموش خیالوں میں اٹھا دوں محشر
ڈال کر اپنی جنوں خیز نگاہیں اُس پہ
کھول دوں گرمیٔ جذبات کی راہیں اس پہ
سادہ پانی میں ملا کر ذرا تھوڑی سی شراب
دے ہی دوں فطرتِ بے حس کے تغافل کا جواب

عبدالحمید عدمؔ

شاعر ودیاپتی نے ایک گیت میں ایک "ناہید" کا ذکر یوں کیا ہے

"بال پنا اور بھری جوانی، دونوں کا ہے سامنا — سُن لی اُس نے میٹھی بانی، من میں کامنا؟" — لیکن عدم اپنی اوپر کی نظم میں ایک ایسی ناہید کا ذکر کرتا ہے جس نے ابھی میٹھی بانی نہیں سُنی، جو ایک تصویر ہے پھیکے رنگوں کی، ایک ہے جو رنگین نہیں، ایک کھانا ہے جو مرغن نہیں — اور شاعر اس ... کو دیکھ پاتا ہے، شاعر کی نشو و نمائے ذہنی کچھ عجیب انداز میں ہوئی ہے، اس سادہ منظر کو دیکھ کر اُس کے دل میں ایک نہایت فطری خیال جاگ اٹھتا ہے شاید اُسے اپنی پختہ طبیعت اور اس خام کاری میں ایک بُعد محسوس ہوتا ہے اور وہ اس دوری کو مٹانا چاہتا ہے، اپنے سے ہم آہنگ بنانا چاہتا ہے۔ — نظم کا عنوان "جوابِ تغافل" ظاہر کر رہا ہے کہ شاید جب شاعر کی نگاہیں اس غنچۂ ناشگفتہ پر پڑیں اور اُس کی نگاہوں سے ملیں تو اُس نظر میں ایک بیگانگی تھی، دیکھے جانے کا احساس موجود نہ تھا۔ شاعر چاہتا تھا کہ جس طرح اُس کی نظر یہ کہہ رہی تھی "میں تمہیں دیکھ رہا ہوں" اُسی طرح جوابی نگاہ یہ کہتی معلوم ہوتی "میں دیکھ رہی ہوں کہ تم مجھے دیکھ رہے ہو" لیکن یہ بات نہ ہوئی، شاید شاعر کی خود بینی کو اس تغافل سے ٹھیس پہنچی، اور وہ انتقام پر اتر آیا اور ایک حد تک غیر فطری حرکت کی طرف مائل ہو گیا، غیر فطری حرکت اس لئے کہ "وقت سے پہلے اسے اس کی جوانی دے دوں" — شاعر کی حالت اُس انسان کی سی ہو گئی جو ایک ٹھہری ہوئی جھیل میں کھڑا ہو اور سطحِ آب کی بے حسی سے اُلجھ کر ہاتھوں سے پانی کو

نگار یار

اچھالنے لگے اور یوں سست رفتاریٔ فطرت کا مداوا کرنے لگے اور ایک "موج کو ہم فطرتِ دریا کرنا" چاہے۔ شاعر انتقام پر مائل ہے، وہ صورت حال پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کر رہا اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ اُس نے اپنی حرکت یا ارادے کے نتیجے کی طرف توجہ ہی نہیں کی کہ اُس صورت میں نہ صرف وہ حسن پیدا نہ ہو سکے گا جس کا شاعر جویا ہے بلکہ یہ پہلی تصویر بھی تخریب آلود ہو جائے گی۔

ایک ناہید اور ایک پختہ عورت کے باہمی تضاد میں جو باریک اختلافات ہوتے ہیں اُن کا مطالعہ شاعر نے خوب کیا ہے — "گیسوئے سادہ سے ہے دور تکلف کا خیال" یہ بات تو اس موضوع پر ہر کوئی کہے گا۔ لیکن "ابھی رفتار میں گرداب کا انداز نہیں"۔ اور "دل کی گہرائی کوئی شاملِ آواز نہیں"۔ وہی شخص کہہ سکتا ہے جو صحیح معنوں میں دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان رکھتا ہو۔ شاعر کی ذہانت اور طبیعت کی پختگی اور تجربہ کاری کا اظہار نظم میں جابجا ہو رہا ہے۔ اور بعض جگہ تو شاعرانہ استعارے بہت ہی صاف مادی اشارے کرتے محسوس کرتے ہیں "ساز کا برق فگن تار ہے خاموش ابھی" شاعر کہتا ہے لیکن یہ "برق فگن تار" ہوتا کیا ہے۔ اسے آپ سمجھیے۔ احساس کی شدت ایک لذت آلود ترجمانی کر رہی ہے، "اپنے جلتے ہوئے لب اُس کے لبوں پر رکھ کر" — "اُس کے اعضا میں جو طوفاں ہیں جگا دوں ان کو" — اور یہ شدتِ احساس شاعر میں ایک یقینِ محکم پیدا کر رہی ہے، اُسے اپنے ارادے کی تکمیل پر اعتماد ہے۔

بیان کے لحاظ سے صرف اسی مصرعے کو دیکھیے "قدِ رعنا میں ہے بنتا ہوا اک ساگ ابھی" یوں محسوس ہوتا ہے گویا زمین سے کوئی فتنۂ محشر اٹھتا ہوا آسمان کی سمت چلا جا رہا ہے۔ باریک بینی دیکھیے "نرم ہونٹوں کی لکیروں میں نہیں آگ ابھی" — ہونٹوں کا کیسا واضح تصور پیدا ہوتا ہے۔ تصویر کے تمام خطوط نظر آنے لگتے ہیں۔

تمام نظم میں خیال کا ایک فطری تسلسل بھی موجود ہے۔ شاعر دیکھتا ہے بھڑکتا ہے، تصویر کے مختلف حصوں کا گہرا مطالعہ کرتا ہے اور اپنی خواہش کے خلاف جو رنگ اور خطوط اُسے جس ترتیب میں دکھائی دیتے ہیں۔ اسی ترتیب سے وہ نظم کے دوسرے حصے میں اُن کا ذکر کرتا ہے۔

اس سے پہلے بھی مری نظر سے ایک ایسی نظم گذری ہے جس میں شاعر کو ایک ایسے ہی منظر سے تحریک ہوتی ہے، اور یہ نظم مولوی عظمت اللہ (مرحوم) کی "بالی بیوی" ہے۔ "ابھی آنکھ ڈری سی ہے، ابھی آگ دبی سی ہے — ابھی آیا ہے بور ہی، ابھی پھول ہیں، پھل کہاں" یہ کہتے ہیں طور ہی، کہ ہے صبر کا پھل یہاں، نہیں سانس میں گرمیاں، نہیں باس میں مستیاں" عظمت اللہ کی یہ نظم اور عدم کی موجودہ نظم دونوں ایک صحت مندانہ لذت کی حامل ہیں۔ ایسی صحت مندانہ لذت سنسکرت ادب میں ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی عدم کی اس نظم کا میں مسرت کے ساتھ استقبال کرتا ہوں۔

میراجی

نقد و نظر

سلطان محمد قلی قطب شاہ

از

(ڈاکٹر) سید محی الدین قادری زورؔ

حجم تقریباً پانسو صفحات ۔ سائز ۲۶×۲۰ کاغذ اچھا کتابت خاصی ۔ طباعت اچھی ۔ انیس عکسی تصاویر قیمت پانچ روپے ۔ ملنے کا پتہ : سب رس کتاب گھر عبرت آباد حیدرآباد (دکن)

پیا باج پیالہ پیا جائے نا

پیا باج یک تل جیا جائے نا

کہے تھے پیا بن صبوری کروں

کہا جائے اما کیا جائے نا

قطب شہ نہ دو مجھ دوانے کو پند

دوانے کوں کچھ پند دیا جائے نا

یہ اشعار ایک ایسی شخصیت کے ہیں جس کا نام ہندوستان کے بادشاہوں، عاشقوں اور شاعروں میں بہت عرصے تک زندہ رہے گا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تھا، دکن کے موجودہ دارالسلطنت حیدرآباد کا بانی تھا اور قطب شاہیہ خاندان کا پانچواں حکمران تھا۔ اُس کی ہمہ گیر طبیعت کا اندازہ صرف اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ اُس نے نہ صرف اردو میں تقریباً پچاس ہزار اشعار کہے اور ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی بلکہ اُردو کے علاوہ فارسی اور تلنگی میں بھی شاعری کی۔ شعر و ادب میں عاشقانہ مضامین اُس کی نمایاں خصوصیات ہیں اور اس کا خاص میدان۔ اور اس کی وجہ زیادہ تر اُس کی ذاتی زندگی ہے۔ اس کے حالات کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُس کے زمانۂ اقتدار و حکومت میں حیدرآباد برندابن اور رودِ موسیٰ جمنا کا کنارہ بن گیا تھا جس میں اس کی حرمیں گوپیاں اور اُس کی مشہور محبوبہ یعنی ہملیم کی رقاصہ بھاگ متی عرف حیدر محل رادھا کا عکس نظر آتی تھی۔ لیکن قدیم ہند کی اس مشہور روایت اور محمد قلی کی حکایت میں ایک ہی فرق تھا، برندابن کے شام کی بنسی پر تو رادھا اور گوپیاں موہت ہو گئی تھیں لیکن یہاں یہ رسیا راجہ پریم کی بنسی کا متوالا تھا۔ اور عشق و عاشقی کے سلسلے میں بھی اُس کی طبیعت کی ہمہ گیری اُس کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے مطابقت رکھتی تھی۔ موجودہ تالیف بھی جس میں دکن کے اس جوہر خداداد کے سوانح حیات اور اردو اور فارسی کلام کے نمونے شامل ہیں، اس کی ہمہ گیر زندگی کا صحیح عکس ہے۔ قابل مرتب کا ذوق و تجسّسِ علمی اسی ایک بات سے ظاہر ہے کہ اُس نے ہر اس کتاب کو دیکھا ہے جس میں سلطان مذکور کا ذرا سا بھی تذکرہ موجود تھا۔ اور ان تاریخ اور تذکرے کی بے شمار کتابوں کے علاوہ خود محمد قلی کا کلام بھی ایک ایسا خزانہ تھا جس سے اُس کے ذاتی حالات پر بہت اچھی طرح روشنی پڑتی ہے۔

ترتیب کے لحاظ سے مرتب نے تمام کتاب کے دس حصّے کئے ہیں۔ پہلے حصّے میں خاندانی حالات، اجداد کا تذکرہ، ولادت، جشنِ ولادت، آغاز شباب اور اوائل شباب کی صحبتوں کا بیان ہے۔ جس کے بعد تخت نشینی کا ذکر کر کے محمد قلی کے طبعی رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اسی سلسلے میں اِس کی بارہ پیاریوں کے علاوہ بھاگ متی یعنی اس مشہور رقاصہ کا ذکر بھی ہے جس کے نام پر اس ذیشان حکمران نے حیدرآباد جیسے شہر کی بنیاد رکھی۔ اس حصّے سے جہاں محمد قلی کی ابتدائی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے وہاں اُس زمانے کے دکنی ہندوستان کا بھی ایک نقشہ سا آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔

دوسرے حصّے میں دو فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں محمد قلی کے مذہبی میلانات اور اُن کی وجہ سے اُس کی جو مخالفتیں ہوئیں اُن کا تذکرہ ہے، اور دوسری فصل حیدرآباد

(بھاگ نگر) کے تاریخی اور جغرافیائی حالات پر مشتمل ہے۔

تیسرے حصے میں اس زمانے کے تہواروں میں شاہی مزاج کو کہاں تک دخل تھا اور کہاں تک شاہی سرپرستی سے ان مختلف مواقع کی رونق میں اضافہ ہوتا تھا۔ ان سب باتوں کا بیان ہے۔

چوتھا حصہ ایک طرح سے تیسرے حصے سے ملحق ہے۔ اور اس کی مزید تفصیل۔ لیکن اس میں زیادہ تر مذہبی کی بجائے دوسری قسم کے تہواروں اور اجتماعات کا تذکرہ ہے نیز وقت کے رسوم اور بادشاہ کی دیگر مصروفیات کا ذکر بھی وضاحت سے کیا گیا ہے جو لوگ پرانے بادشاہوں کے متعلق یہی تصور رکھتے ہیں کہ وہ عیش و عشرت یا جنگ و جدال ہی تک اپنی کارفرمائیوں کو محدود رکھتے تھے ان کے لئے کتاب کے اس حصے میں غور کا مواد موجود ہے۔ اس حصے کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل ملک کی حکومت جن مختلف کارگذاریوں کی بنا پر اپنے زمانے کو پہلے زمانے سے بہتر تصور کرتی ہے۔ وہی باتیں قدیم زمانے میں بھی اپنے وقتی رنگ میں ہوا کرتی تھیں۔

پانچواں حصہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اب تک جس قدر حالات بیان ہوئے تھے ان کا ماخذ اکثر کلام محمد قلی قطب شاہ تھا لیکن اس حصے میں اُن معرکہ آرائیوں کا تذکرہ ہے جن سے محمد قلی کو اپنے دورِ حکومت میں روبرو ہونا پڑا۔ اس حصے کے مطالعے سے ہم سلطان مذکور کی ذہنی وسعت کے بھی معترف ہو جاتے ہیں کہ وہ بادشاہ جو ذاتی زندگی میں ایک عاشق اور شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہے، نظم و نسقِ سلطنت کے سلسلے میں بھی کس قدر مختلف صورتوں سے اُسے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

چھٹا حصہ بھی حکومت ہی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے اس میں بیرونی تعلقات کے علاوہ ہندو رعایا کی سرپرستی کے عنوان سے جو باتیں تحریر میں آئی ہیں وہ پرانے زمانے کی مفاہمت پسندی اور انصاف پروری کے ناقابلِ تردید دلائل ہیں۔ یہ وسیع القلب بادشاہ نہ صرف اپنی رعایا کے ہر فرقے کو ایک ہی نظر سے دیکھتا تھا بلکہ دوسرے ممالک سے آئے ہوئے اجنبی لوگوں کی آسائش اور آرام کا خیال بھی اپنا فرض گردانتا تھا۔

ساتویں حصے میں محمد قلی کی بیگمات اور اولاد کا تذکرہ ہے اور اسی سلسلے میں اس کی دوسری رشتہ داریوں کا بیان بھی آگیا ہے۔ اور آخر میں اس کی علالت اور وفات کا ذکر ہے۔

آٹھویں حصے میں اس کے اردو کلام کے مختلف موجود نسخوں کا جائزہ لینے کے بعد اُس کے کلام کی خصوصیات کا ذکر ہے اور پھر انتخاب کلام اردو

اور اسی طرح نویں حصے میں فارسی شاعری کا تذکرہ اور منتخب کلام۔

دسویں حصے میں محمد قلی قطب شاہ کے زمانے کی اہم تاریخیں، ماخذ اور حوالے اور اشاریہ، کتاب کی ترتیب کے سلیقے کو ظاہر کر رہا ہے اور قاری کی آسانی اور حوالے کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

آخر میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ اس کتاب کی دلچسپی میں انیس عکسی تصاویر ایک دلکش اضافہ ہیں۔

قابل مرتب ڈاکٹر (سید) محی الدین قادری زور مبارک و تحسین کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے ایسی جامع کتاب تالیف کر کے بہت عرصے تک محمد قلی کی زندگی کے محققوں کو بے کار ثابت کر دیا ہے۔ نیز کلیات محمد قلی کے لئے بھی ایک مناسب اور بیش قیمت ابتدائی مطالعہ ہمارے لئے مہیا کیا ہے۔ جس سے کلام محمد قلی کے سمجھنے اور اُسے سراہنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

امید ہے کہ ادب و شعر اور تاریخ کے شائقین اس کتاب کی پوری قدر کریں گے کیونکہ یہ ایک ایسی خیال افروز چیز ہے کہ اسے جب کبھی بھی اٹھا کر دیکھا جائے اس میں ضرور کوئی نہ کوئی نئی دلچسپی دکھائی دے جائے گی۔

طالب بنارسی کی نظموں اور خطوں کی ضرورت

محترمی السلام علیکم۔ منشی ونائک پرشاد طالب بنارسی کی نظموں کا ایک مجموعہ برائے اشاعت تیار کر رہی ہوں، اور چاہتی ہوں کہ اس میں ان کے خطوط بھی شامل ہوں، مرحوم ایک بہت بلند پایہ شاعر تھے، ان کا کلام بہت نایاب ہے اور اس کے جمع کرنے میں مجھے بہت دقتیں پیش آرہی ہیں، جن حضرات کے پاس اردو کے پرانے رسالوں کے فائل موجود ہیں وہ حضرات ایسے فائلوں سے نقل کر کے یا اس کے علاوہ طالب کا کوئی کلام یا ان کے خطوط ہوں، اصل یا نقلیں مجھے میرے پتے پر بھجوا سکیں تو میں ان کی بے حد ممنونِ احسان ہوں گی۔ میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ مرحوم کے ایسے عزیزوں کے پتے مجھے مل جاویں، جن سے طالب کا کلام یا ان کے خطوط مل سکنے کا امکان ہو، جو حضرات ایسے پتے بھیج سکتے ہوں وہ مجھے بہت مشکور فرمائیں گے۔

سلیمہ بیگم بنت ملک محمد اسلم خاں صاحب ایم اے کیمبرج بیرسٹر ایٹ لا

کوٹھی "الفیض"۔ ۶ ہملٹن روڈ۔ لاہور

ڈاک کے ڈاکو ادبی دنیا ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک خریداروں کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اگر اس تاریخ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقے کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں تاکہ پرچہ آپ کو دوبارہ بھیجا جائے اور ڈاکئے کے دروازے پر ایک اور دستک دی جائے۔ مینجر

فہرستِ مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہِ مئی سنہ ۱۹۴۱ء

جلد ۱۹ — نمبر ۵

تصویر: چاندنی کی برکھا۔

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ۔ قیمت فی پرچہ ۸/

گیلانی الیکٹرک پریس میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا دی مال لاہور سے شائع ہوا

اردو انسائیکلوپیڈیا

ادارہ ادبیات اردو جس کو ملک کے ذی علم حضرات کی قلمی اعانت اور ذی مرتبہ امرا کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے کم و بیش دس سال سے زبان و ادب کی مسلسل خدمت کر رہا ہے اس کا کام مختلف علوم و فنون کے بارہ شعبوں میں پھیلا ہوا ہے جس کے زیر نگرانی اب تک بہتّر (۷۲) کتابیں شائع ہو کر مقبول ہوئیں۔

بہت غور اور متعدد صاحبان علم و فضل سے تبادلۂ خیال کے بعد اس نے گذشتہ سال اردو انسائیکلوپیڈیا شائع کرنے کا تصفیہ کیا چونکہ اس کی ترتیب و تالیف کے لئے متعدد علوم و فنون کے ماہرین کے اشتراک کی ضرورت تھی اس لئے سب سے پہلے اس نے ہندوستان کے متعدد ماہرین علوم و فنون کو قلمی اعانت پر آمادہ کیا انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و تالیف میں اس کا خاص طور پر خیال رکھا جا رہا ہے کہ مختلف علوم و فنون کے الفاظ ماہرین ہی سے لکھوائے جائیں اس سلسلہ میں ساری انسائیکلوپیڈیا کو مختلف علوم و فنون کے متعدد شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ہر شعبہ کی نگرانی ایک ماہر کے تفویض کر دی گئی ہے جو معاونین کی مدد اور مجلس انتظامی کی عام نگرانی میں اس شعبے کے جملہ الفاظ پر نوٹ مرتب کر رہا ہے۔

فی الوقت حسب ذیل ماہرین اور علما اپنی نگرانی میں مضامین متعلقہ کا کام شروع کر چکے ہیں۔

معاشیات — پروفیسر ڈاکٹر انور اقبال قریشی ایم اے پی ایچ ڈی صدر شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ

تاریخ — پروفیسر ہارون خانصاحب شروانی ایم اے آکسن بار ایٹ لا صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ۔

تہذیب و ثقافت — ڈاکٹر ایشور ناتھ صاحب ٹوپا ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر انڈین کلچر جامعہ عثمانیہ۔

ریاضی — ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی۔

السنہ قدیم و جدید — ڈاکٹر راحت اللہ صاحب ایم اے پی ایچ ڈی مہتمم کتب خانہ آصفیہ

فلسفہ — ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی۔

تعلیمات و تدریسیات — مولوی سبحان مرزا صاحب ایم اے پرنسپل ٹریننگ کالج

طب — ڈاکٹر منور علی صاحب ایف آر ایس ایس و ڈاکٹر قاسم حسین صاحب ایم آر بی ایس ایل آر سی پی (لندن) وغیرہ

نسائیات — مس حبیبی سندی بی اے آنرز آکسن۔ کھیل — ایس ایم ہادی بی اے کیمبرج۔

اردو زبان و ادب — ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی و پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی

انڈکس کی ترتیب اور مقالے لکھوائے جانے کا کام تیزی کے ساتھ جاری ہے ان کے علاوہ بہت سے مشاہیر علما و فضلا ہندوستان کے گوشے گوشے سے متعدد علوم و فنون کے ضمن میں قلمی اعانت فرما رہے ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر محمد باقر ایم اے پی ایچ ڈی لاہور۔ ۲۔ پروفیسر مسعود حسین رضوی ایم اے لکھنؤ

۳۔ احمد شاہ پطرس بخاری ایم اے دہلی ۴۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی وغیرہ وغیرہ۔

ترتیب و تالیف کی نوعیت اور معیار کا صحیح اندازہ پیش کرنے کے لئے ہم پہلے اشاعت انسائیکلوپیڈیا کے چند اوراق بطور نمونہ الگ شائع کر کے صاحبان ذوق و نظر کی خدمت میں بغرض تبصرہ روانہ کریں گے

اردو انسائیکلوپیڈیا جیسی علوم و فنون کی صحیح کتاب کی ترتیب و تدوین کے لئے ایسے ہی بیسیوں ماہرین کی قلمی اعانت درکار ہے اس لئے ہم بیحد ممنون ہوں گے اگر علما و فضلا جن کا اب تک ہمیں تعارف حاصل نہیں ہے اور جو ازراہ نوازش ہمارا ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں ہمیں مطلع فرمائیں کہ انہیں کن خاص علوم و فنون سے دلچسپی ہے تاکہ ہم ان کی قابلیتوں سے استفادہ کر سکیں فقط سید بادشاہ حسین معتمد انسائیکلوپیڈیا۔ ادارہ ادبیات اردو

حیدر آباد دکن

دنیائے کاروبار

جنگ اور بیمے کا کاروبار

گذشتہ ماہ فروری میں کناڈا کے مقام مونٹریل میں سن لائف آف کناڈا کا سترھواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس موقعے پر کمپنی مذکورہ کے صدر اور مینجنگ ڈائرکٹر جناب آرتھر بی ووڈ نے ایک رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۴۰ء میں کمپنی کی املاک کی مجموعی قیمت دوسو ساٹھ کروڑ سے بھی اوپر جا پہنچی ہے۔ جس میں سے سال رواں کا اضافہ دس کروڑ ہے۔ پالیسی ہولڈروں کو جو رقم ادا کی گئی اُس کی تعداد پچیس کروڑ ہے۔ گویا گذشتہ ادائیگی سے ایک کروڑ زائد۔ ۱۹۴۰ء ہی میں حیات کاروبار میں چھ کروڑ چھہتر لاکھ کا اضافہ ہوا۔ یوں حیات کاروبار کی مجموعی رقم آٹھ کروڑ بارہ لاکھ کے لگ بھگ جا پہنچتی ہے۔ چھیالیس کروڑ کے قریب کتابوں میں نیا کاروبار درج ہے۔ پریمیم سے جو رقم وصول ہوتی ہے ۱۹۴۰ء میں اس کی تعداد تیس کروڑ سے اوپر جا پہنچی ہے۔ مجموعی آمدنی ۱۹۳۹ء کی بہ نسبت پینتالیس کروڑ زائد ہے۔ اور سال رواں کے اخراجات تینتیس کروڑ ہیں کمپنی کے بانڈ کے حسابات میں بھی گذشتہ سال سے بارہ کروڑ کا اضافہ ہوا۔ ان میں گورنمنٹ میونسپل اور منفعتِ عامہ کے بانڈ شامل ہیں۔ غیر متوقع ضروریات کے لئے محفوظ سرمائے کی رقم مزید اضافے کے بعد ساڑھے سات کروڑ روپے تک جا پہنچی ہے۔ مجموعی پالیسی اور گروپ سرٹیفکیٹ کی موجودہ تعداد بارہ لاکھ سے اوپر ہے۔

مسٹر ووڈ نے اپنی تقریر کے دوران میں ایک دلچسپ بات یہ بھی بتائی کہ اس سال میں ریاست ہائے متحدہ میں سن لائف آف کناڈا کی شرح اموات کناڈا یا برطانیہ عظمیٰ کی بہ نسبت زیادہ رہی ہے اور اس شرح اموات میں جنگ سے جتنی جانیں تلف ہوئیں ان کو بھی شمار کیا گیا ہے۔ جنگ کے اثرات پر بحث کرتے ہوئے مسٹر ووڈ نے کہا کہ کمپنی کا صرف تیرہ فی صدی کاروبار برطانیہ عظمیٰ میں تھا۔ باقی یورپ میں کوئی کاروبار نہ تھا۔ جنگ کی وجہ سے جو اموات ہوئیں اُن کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جنگ میں شامل افراد کے مجموعی (کلیم) مطالبوں کی رقم صرف آٹھ لاکھ روپے ہوتی ہے اور اس میں سے بھی پچاس فی صدی حادثات اور امراض کی وجہ سے تھے۔ ہوائی حملوں کی وجہ سے جو شہری مارے گئے۔ اُن کے مطالبات ڈیڑھ لاکھ روپے تک ہیں اور سمندر پر جن شہریوں کی جانیں ضائع ہوئیں اُن کی رقم چار لاکھ ہے۔ یوں جنگ کی وجہ سے جو مطالبات کئے گئے اُن کی تعداد صرف ایک سو اُنیس ہوتی ہے جن کی رقم مجموعی مطالبات کا صرف ۰.۵ فی صدی حصہ ہے۔ اگر ان کا موازنہ مجموعی مطالبات کے اس نو فی صدی حصے سے کیا جائے جو عام طور پر کمپنی کو دینے پڑے اور جن کی وجہ روز مرہ حادثات ہیں (خصوصاً موٹر کے حادثات ہی چار فی صدی ہیں) تو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ کمپنی کے کاروبار پر جنگ کے حالات نے کوئی اثر نہیں کیا۔ بلکہ گذشتہ سال کی بہ نسبت ہر طرح ترقی ہی کی طرف قدم اٹھایا گیا ہے۔

سلیمانی ٹوپی مل سکتی ہے

لیکن اگر آپ غور کریں تو سلیمانی ٹوپی کا فائدہ صرف یہی ہے نا کہ جہاں جی چاہے انسان آ جا سکتا ہے۔ آج کل کی اُلجھی ہوئی زندگی میں آپ شہروں میں خصوصاً دیکھیں گے کہ ہزاروں انسان ایسے دکھائی دیتے ہیں جو ہر طرح کی آزادی کے باوجود جہاں جی چاہے آ جا نہیں سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی سلیمانی ٹوپی پھٹ چکی ہے۔ انہیں طرح طرح کے عارضے لاحق ہیں۔ کسی کا معدہ خراب ہے کسی کے خون میں خرابی ہے کسی کے جگر کا فعل باقاعدہ نہیں کسی کے پیچھے قبض ہاتھ دھو کر پڑی ہے لیکن یہ اُن کی اپنی بے احتیاطی کے نتیجے ہیں اگر وہ ذرا سی بھی کوشش کر کے کروشن سالٹ کی کچھ مقدار ہر وقت گھر میں رکھ چھوڑا کریں تو اُن کی سلیمانی ٹوپی صحیح سلامت رہے اور وہ جہاں جی چاہے آ جا سکیں۔

فضل الٰہی
مہتمم صیغہ اشتہارات

(بقیہ صفحہ دنیائے فلم)

شمالی ہند میں بھی ہر دلعزیز ہو چکا ہے وہی اس کھیل کا ہیرو ہے۔ اور مشہور کھیل "جلتی نشانی" کی ہیروئن لیلا بہت دیر کے بعد اس کھیل میں اہل پنجاب کے دل کو موہنے کے لئے آئی ہے اور ان پکچرز کا یہ کھیل آج کل لاہور کے پربھات ٹاکیز میں دکھایا جا رہا ہے۔

"ہرجائی"

دنیائے فلم

پردیسی ڈھولا

یہ پنجابی زبان کا کھیل فلم کارپوریشن کے مشہور نگار خانے میں تیار کیا گیا ہے۔ اور اس میں "غزا ایمپی شہ قیدی" "ادر دل ہی تو ہے" کی مشہور من موہنی رمولا دیوی ایک بار پھر شائقین فلم پر جادو کرنے کو تیار رہے ہے۔ رمولا کے علاوہ دوسرے اداکاروں کا انتخاب بھی زوردار ہے۔ نیو تھیٹرز کا مشہور کرداری اداکار جگدیش۔ بیلاجٹ کی دلفریب ہیروئن انجنا "ادر دل ہی تو ہے" میں رمولا کے باپ کا ڈرامائی کردار گیانی — یہ سب اس کھیل میں یکجا ہیں۔ جن کھیلوں میں مندرجہ بالا اداکاروں نے اس سے پہلے پارٹ کیا ہے وہ قبولیت اور منافع کے لحاظ سے بے حد کامیاب رہے ہیں۔ اور ان کھیلوں کے آزمودہ ایکٹر جس کھیل میں جمع کر دیئے جائیں اس کی کامیابی بھی یقینی نظر آتی ہے۔ اور ان کھیلوں کی طرح اس کھیل میں ایک خاص دلچسپی یہ بھی ہے کہ اس کے ڈائرکٹر مسٹر تلواڑ کا یہ پہلا کھیل ہے، اس کے علاوہ رمولا اور جگدیش اس میں پہلی بار پنجابی مکالمہ ادا کر رہے ہیں۔ اس اولیت کے سلسلے میں بعض اخبارات عجب چہ می گوئیاں کر رہے ہیں لیکن معترضین کو ایک مقامی ہمعصر نے ایک نہایت دلچسپ جواب دیا ہے جسے یہاں درج کئے بغیر نہیں رہا جاتا — مذکورہ ہمعصر ان لوگوں کو جنہوں نے مسٹر تلواڑ کی ہدایت کاری اور رمولا کی پنجابی سے ناواقفیت کے متعلق اعتراض کئے ہیں جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہے کہ "اگر برکت مہرہ جیسا ہندی ڈائرکٹر "گل بکاؤلی" بنا سکتا ہے اور شنکر مہتہ سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ "میرا ماہی" کو بہترین پنجابی فلم بنائے گا تو مسٹر تلواڑ نے کیا گناہ کیا ہے — رمولا اینگلو انڈین لڑکی ہے اور پنجابی نہیں جانتی شاید ان لوگوں کا خیال ہو کہ چونکہ وہ اردو فلموں میں کامیابی سے پارٹ ادا کر سکتی ہے۔ اس لئے وہ ادیب فاضل ضرور پاس ہوگی۔ لہذا گیانی کا امتحان پاس کئے بغیر وہ پنجابی فلم میں کام کیسے کر سکتی ہے.... اگر ایکٹرسوں کی بیشتر تعداد ان پڑھ اور پنجاب کی پیداوار ہو کر اردو فلموں میں کامیابی سے مکالمہ ادا کر سکتی ہے تو ایک ایسی لڑکی جو برسوں سے اردو فلموں میں کامیابی سے کام کرتی ہے۔ اور چھ ماہ کے قریب ایک پنجابی سٹوڈیو میں کام کر گئی ہے کیا پنجابی فلم میں کام نہیں کر سکے گی"۔

اوپر کی دلیل منطقی لحاظ سے درست معلوم ہوتی ہے اس کے علاوہ بھی پنجابیوں کے کمالات عالمگیر شہرت رکھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ چھ ماہ کے عرصۂ قیام میں رمولا کو نہ صرف پنجابی بلکہ پنجابیت سے بھی کما حقہٗ واقفیت ہو چکی ہوگی۔

میرا ماہی

اہل پنجاب کی نغمہ پرستی اور مذاق پسندی تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ "میرا ماہی" ان دونوں باتوں کے لحاظ سے ایک اچھا کھیل ثابت ہونے کا یقین دلاتا ہے۔ حسن و نغمہ کے لحاظ سے اس کھیل میں راگنی اور منورما ہی کے نام کافی سے زائد اہمیت رکھتے ہیں۔ منورما نے اپنے پہلے ہی کھیل میں لوگوں کے دلوں میں جگہ پیدا کر لی ہے۔ اور راگنی کی سحر آفرینی بھی اب تک فلمی دیوانوں کے لئے جنتِ نگاہ بنی ہوئی ہے۔

مذاحیہ عنصر کے لحاظ سے ظہیرا اور سندر سنگھ اس کھیل کے نمایاں اداکار ہیں۔ انہوں نے لوگوں کے اس عام خیال کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غوری ڈکسنٹ اور چارلی کے بعد کوئی کامیاب مذاحیہ اداکار پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

امید ہے کہ ڈائرکٹر شنکر مہتہ کی اس پہلی کامیاب کوشش کا استقبال ایک مناسب طریق پر کرے گی۔

چودھری

پنچولی آرٹ پکچرز نہ صرف پنجاب میں فلمی صنعت کی ترقی کے سلسلے میں نمایاں درجہ رکھتے ہیں بلکہ رفتہ رفتہ وہ اُن پنجابی اداکاروں کو بھی بمبئی اور کلکتہ کی جلا وطنی سے رہائی دلا کر سرزمین پنجاب میں لا رہے ہیں جنہیں مناسب میدان نہ ہونے کی وجہ سے گھر چھوڑنا پڑا۔ "چودھری" میں مشہور کیریکٹر غلام محمد اس کی ایک مثال ہے۔ اس کے علاوہ بے بی نور جہاں، درگا موٹا اور اجمل بھی مددگار کے طور پر موجود ہیں۔ اب تک باکس آفس کے لحاظ سے پنچولی آرٹ کا کوئی کھیل ناکام نہیں ہوا اور ہمیں امید ہے کہ چودھری بھی ان کی دستارِ طرائی میں گل بکاؤلی اور یملا جٹ کے بعد تیسرا پنجابی ہیرا ابن کر چمکے گا۔

نیا سنسار

بمبئی ٹاکیز کا تازہ ترین فلم ہے۔ اس کی کہانی اخبار نویسی کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے اور اس کہانی کے لکھنے والے بھی مشہور اخبار نویس خواجہ احمد عباس اور بابو راؤ پٹیل ہیں۔ اداکاروں کے لحاظ سے اشوک کمار، رینو کا دیوی، مبارک اور ڈیسائی قابلِ ذکر ہیں۔

الکھ نرنجن عرف گورکھ ناتھ

نندر پکچر جنوبی ہندوستان کی قبولیت "نے بعد قیدی" کے ذریعے سے

(باقی صفحہ کاروبار کے نیچے)

بزمِ ادب

ہم نے ارادتاً آج تک اِن کالموں میں اُن گوناگوں تکالیف کا کبھی ذکر نہیں کیا جو ہمیں کاغذ کی کمیابی اور گرانی کے باعث مدت سے پیش آ رہی ہیں۔ ادبی دنیا کا سائز بیشتر رسائل سے تقریباً دوگنا ہے۔ اس لئے ہماری پریشانیاں بھی معاصرین کی پریشانیوں سے بہت زیادہ ہیں۔ ہمیں جس ۲۰×۲۶ کے کاغذ پر ادبی دنیا چھپتا ہے پچھلے دنوں بازار میں کسی قیمت پر بھی نہیں ملتا تھا۔ اپریل کے پرچے کے لئے کاغذ اس قدر دیر سے ملا کہ پرچہ قریباً دو ہفتے لیٹ ہو گیا۔ اب بھی کم و بیش یہی کیفیت درپیش ہے کہ کاغذ کے جس قدر رم ایک اشاعت کے لئے درکار ہوتے ہیں اُتنے رِم یکمشت نہیں ملتے اور اگر ملتے ہیں تو دوگنے سے بھی زیادہ داموں پر۔ اس کمیابی اور گرانی نے مل کر پرچے کے وسائل اور ذرائع پر ناقابلِ برداشت بوجھ ڈال رکھا ہے۔ اور ہمیں آج ہمارے صیغۂ انتظام نے مطلع کیا ہے کہ اگرچہ پرچے کے سالانہ چندے میں فی الحال کوئی اضافہ کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا لیکن پرچے کی نام قیمت اس اشاعت سے ۶ آنے فی کاپی کی بجائے ۸ آنے فی کاپی کی جا رہی ہے۔ یہ انتظام مستقل نہیں بلکہ عارضی ہے اور کاغذ کی موجودہ گرانی کے ہٹتے ہی قیمت پھر وہی ۶ آنے فی پرچہ کر دی جائے گی۔ جو معاونین اب تک اپنا پرچہ ایجنٹوں اور بک سٹالوں سے خرید کرتے رہے ہیں۔ ان کے لئے سالانہ چندہ ادا کر دینا بہتر ہو گا۔ کیونکہ اس طرح پانچ روپے سالانہ میں انہیں سالنامہ بھی مفت ملے گا۔

اُس شمارے کے مضامین میں تمکین کاظمی صاحب کا مقالہ "دربارِ آصفی میں ایک اردو رسالے کا ایڈیٹر" ایک خاص دلچسپی کا حامل ہے۔ اور اُس مخصوص آئینِ دربار داری کا ایک بولتا ہوا مرقع ہے جو آج سے پچاس ساٹھ برس پیشتر رائج تھا۔ اب یہ باتیں خواب و خیال ہو گئیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ آج کی طرح ہمارے اسلاف کیلئے بھی خوشامد اور دربار داری ہی دنیوی ثروت کے حصول کا موجب ہوتی تھی، طور طریقے بدل گئے ہیں لیکن بنیادی آئین وہی ہیں۔ آزاد صحافت آج بھی بد مذاقی کی تمثیل ہے اور شاید تب بھی تھی۔ صاحبِ مضمون نے اس مقالے کی تدوین میں جس کاوش سے کام لیا ہے۔ وہ قابلِ تحسین ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے باہمی اتصال کا زمانہ مغلیہ معاشرت کے مٹتے ہوئے نقوش کا نگار خانہ تھا۔ جنابِ تمکین ہمیں اپنے ساتھ لئے اس کی سیر کو نکلے ہیں۔ دیکھتے جائیے کہیں یہ ہمیں اور آپ کو محوِ نظارہ پا کر خود رو پوش نہ ہو جائیں۔

"سبزہ زار" امریکہ کے ایک قابلِ قدر ڈرامے کا ترجمہ ہے جسے ہمارے دوست جناب شبیر محمد اختر نے اردو کا لباس پہنایا ہے۔ اصل ڈرامے کے متعلق اس کے شروع میں وضاحت کر دی گئی ہے یہاں ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس دفعہ اگرچہ اختر صاحب دیر کے بعد بزمِ ادبی دنیا میں آئے ہیں، لیکن دیر آید درست آید کے مصداق ہیں۔

صلاح الدین احمد

---

(۲)

اگر وسعتِ نظر اور نظرِ غائر حاصل ہو تو بات بات میں گوناگوں کیفیتیں موجود ہیں۔ دل کا حال دل والے جانتے ہیں۔ کبھی کسی حال میں ہے کبھی کسی حال میں اور موسم کی بات کسی سے چھپی نہیں، کبھی کسی رنگ پر ہے کبھی کسی رنگ پر اور پھر ہر حال اور ہر رنگ کے بھی کئی پہلو نکل آتے ہیں۔ نظموں کو بھی اگر دیکھا جائے تو وہ دل کی مختلف کیفیتوں اور موسم کی رنگا رنگ جھلکیوں سے یک گونہ مماثلت رکھتی ہیں۔ بعض نظمیں ہلکی پھلکی شوخ و شنگ ہوتی ہیں۔ جیسے کسی گیت کی مچلتی ہوئی چنچل سُریں۔ بعض میں کسی گمبھیر راگ کی گہرائی ہوتی ہے۔ موجودہ شمارے ہی کی نظموں کو لیجئے۔

"تین نظموں" کا شاعر "مسافر" "ادبی دنیا" کی محفل میں نووارد نہیں ہے اُس کی نظمیں پہلے بھی زینتِ محفل بنتی رہی ہیں اِس دفعہ شاید اُس نے اِس لئے بھیس بدلا ہے کہ فن کار اپنی طبعی سنجیدگی سے موجودہ نظموں کی شوخی کو ہم آہنگ نہیں کر سکا بہر حال ہمارے لئے فن مقدم ہے اور فن کا روحِ ظاہر یہ تینوں نظمیں سپاٹ منظر ہیں۔ خصوصاً کانٹے کے آنسو اور قیدی۔ قیدی کا قصہ پیچیدہ ہے۔ لیکن طنز گہری نہیں، اس کے مقابل میں کانٹے کے آنسو کا افسانہ ایک خطِ مستقیم ہے مگر طنز بہت زوردار۔ محبت کے ایسے جذباتی موضوع کو اس چھوٹی سی نظم میں جس قدر مضحکہ خیز بنا دیا گیا ہے۔ یہ فن کار کے کمال سے زیادہ اس کے دماغ کی لہر کا کرشمہ معلوم ہوتا ہے۔ غنڈے محض منظر ہے لیکن جیتا جاگتا چلتا پھرتا منظر۔ اور یہ حرکت پہلے ہی مصرعے سے شروع ہو جاتی ہے اور آخر تک قائم رہتی ہے۔ اصل میں اِس نظم کا منظر دہرا ہے۔ ایک وہ منظر جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ یعنی تاش کھیلتے ہوئے آوارہ انسان۔ دوسرا وہ منظر جو غنڈہ دا ... کو دکھا رہے ... [illegible]

قریب آتا ہوا پیکر کیفیت کے لحاظ سے ہلکی پھلکی ہونے کے باوجود دبنظیں فن کاری کے نقطۂ نظر سے (میرا خیال ہے کہ) بہت اثر انگیز ثابت ہوں گی۔

"دل کی بات" میں علی احمد بھی ایک ہلکی پھلکی کیفیت کا بیان کر رہا ہے۔ اس نظم کو لکھتے ہوئے تخلیقی ذہن کو طرفِ ثانی سے جس قرب اور گداز کا احساس ہوا ہو گا، قاری کا ذہن بھی اسی رجحان سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ جذبۂ محبت کی لطافت اور نزاکت اس نظم سے پوری طرح ہویدا ہے اور یہ مصرعے (تو مجھ سے چپکے سے کہہ دے، چپکے سے، مجھ سے کہہ دے تو اپنے دل کی بات) شاعر اور قاری کو ایک ہی ہستی بنا دیتے ہیں۔ یہ اظہار کے پہلو بہ پہلو ترجمانی میں بھی فن کار کی کامیابی کا ثبوت ہے۔

احمد پوری کی نظم "وشنوجی" شعر کی ایک گمبھیر زبان ہے۔ شاعر کے احساس کی تین طاقتیں بیدار ہیں، باصرہ، سامعہ اور شامہ ــــ لیکن انہی تین طاقتوں کے تاثرات سے فن کار نے وشنوجی کے مندر اور اس کے آس پاس کی فضا کو مکمل طور پر قائم کر دیا ہے اور اس فضا میں اس کی اپنی سحر زدہ ذات بھی نمایاں ہے لیکن نظم کا موضوع شاعر کی وہ خواب گوں کیفیت ہے جس میں موسیقی زمان و مکان کے ساتھ مل کر اس کے تصور کو شدید کر دیتی ہے۔ اور اسے تخیل میں وشنوجی کے درشن ہوتے ہیں۔

فنی لحاظ سے بھی احمد پوری کی اکثر خصوصیات اس میں موجود ہیں۔ ماحول اور موضوع کے مطابق انتخاب الفاظ اور بحر کی مناسبت۔ احمد پوری کی موسیقانہ ذہانت عموماً اپنی ہر تخلیق شعری کو خواہ وہ نظم ہو گیت بنا دیتی ہے یہ بات بھی زیر نظر نظم میں موجود ہے۔

یوسف ظفر کی نظم "طوفان سے پہلے" بھی ایک گمبھیر زبان ہے لیکن ایک ایسی زبان جو پہلے تاثر میں سطحی محسوس ہوتی ہے۔ اور دوسرے تاثر میں گہری۔ پہلی نظر اس میں دو مناظر کا تضاد دیکھتی ہے اور بس۔ لیکن دوسری نظر دونوں منظروں میں شاعر کی دو ذہنی کیفیتوں کا عکس پاتی ہے۔

ایک نکتہ غور طلب یہ بھی ہے کہ طوفان محض ایک مظہر قدرت ہے یا اس کی کوئی نفسیاتی توضیح بھی ہو سکتی ہے۔ محض یہ کہنا کہ اب منظر ساکن ہے اور میرے دل میں بھی سکون ہے، اس لئے میں تاثر کے قابل ہوں اور اگر منظر میں حرکت پیدا ہو گئی تو میں بھی اس سے ہم آہنگ ہو جاؤں گا۔ اور تاثر کے قابل نہ رہوں گا۔ کوئی اشارتی کیفیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ طوفان سے پہلے کی کیفیت بلوغ یا "رقص غزالین" سے پہلے کی کیفیت سے مماثلت رکھتی ہے اور علیٰ ہذا القیاس بعد کی کیفیت بعد کی کیفیت سے۔ اور اس خیال کو تقویت دینے کے لئے دوسرے بند میں بعض علامتی اشارے بھی موجود ہیں۔

"ہندی جوان" کا قصہ یوں ہے: شاعر اپنے کسی دوست کے ساتھ سینما کے منڈوے سے تماشا دیکھ کر نکلتا ہے۔ پردۂ سیمیں پر جو کھیل اس نے دیکھا وہ ناچ گانے کا کھیل تھا۔ باہر نکل کر آگے پیچھے کئی مرد عورتیں دکھائی دیں۔ اچانک شاعر کی نظر ایک نسائی پیکر کے زیریں حصے پر جا پڑی۔ یہاں سے نظم شروع ہوتی ہے۔ موضوع "ساقِ سیمیں" اور عنوان "ہندی جوان" ہے۔ اس غیر آہنگی کی دلیل یہ ہے کہ ساقِ سیمیں محض ایک محرک کا درجہ رکھتی ہے۔ اصل موضوع وہ ان گنت ہندی جوان ہیں جن کی نوعی حیات بے چارگی کی مختلف صورتوں میں مختلف المناک پہلو پیدا کرتی ہے۔

میراجی

قطعہ

کل وقفِ راز اپنے سے وہ کہتا تھا یہ بات
جرأت سے یہاں رات جو مہمان آئے ہم
جرأت سے کیا ہم پیش آئے ہم
کیا جانئے بخت نے کس کی مان
جرأت نہیں نباہ سکی
جرأت

آئینۂ عالم

بساطِ مشرق کا خطرناک مُہرہ — سیام

اس وقت یورپ میں ہٹلر کی جنگ ختم ہو چکی ہے۔ اس کا آخری حملہ یوگوسلافیہ اور یونان پر بیک وقت ہوا۔ یوگوسلافیہ نے ہفتہ بھر مقابلہ کر کے جبر و استبداد کی قوتوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ یونان کے متعلق بھی جو آج تازہ اطلاعات موصول ہوئی ہیں ان سے یہی پایا جاتا ہے کہ یورپ کا گہوارہ تہذیب و تمدن بھی نازیوں کے اقتدار میں چلا جائے گا۔[1] یونان کے بعد اگر ہٹلر نے ترکی کی طرف قدم نہ اٹھایا تو یورپ میں جنگ رُک جائے گی۔ کیونکہ اس ملک کے بعد کوئی اور ملک ایسا باقی نہیں رہ جاتا جسے ہٹلر حاصل کر سکتا ہے،

لیکن کیا مشرق جنگ سے محفوظ رہے گا؟ حالات اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ کیونکہ مشرق میں محوری طاقتوں کا دوست جاپان اپنا نظام قائم کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے جس کی بنیاد وہ ۱۹۳۱ء میں مانچوریا پر قبضہ کرنے کی صورت میں رکھ بھی چکا ہے۔ اور جس کا اظہار وہ گذشتہ تین چار سال سے چین کے ساتھ جنگ کی صورت میں کر رہا ہے۔ لیکن چین میں اُسے نقصان بہت اٹھانا پڑا اور فائدہ بہت کم ہوا اور بین الاقوامی حلقوں کا خیال ہے کہ چین اور جاپان کی جنگ جس رفتار سے جاری ہے۔ اگر یہی رفتار آئندہ بھی رہی تو جاپان چین کو کبھی بھی فتح نہیں کر سکے گا۔ بلکہ ممکن ہے خود بھی تباہ ہو جائے چین میں جاپان کو جو ناکامیاں ہوئی ہیں اُن سے اُس کی توجہ آج کل سیام کی طرف ہو گئی ہے۔ جس سے خیال کیا جاتا ہے کہ ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں سیام سے جنگ کی کوئی ایسی چنگاری اُٹھے جو مشرق کو جنگ کے شعلوں میں دھکیل دے۔

گذشتہ سال جب فرانس نے جرمنی سے شکست کھائی تو ہٹلر کے مشرقی دوست جاپان نے بھی اس موقعہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور جب فرانس ادھر اپنی پریشانیوں میں گرفتار تھا اس نے سیام سے ہند چینی پر حملہ کرا دیا۔ ہند چینی پر حملہ کرنے کی یہ وجہ تھی کہ وہ اس علاقے کے چند ایسے ہوائی اور بحری مستقر حاصل کرنا چاہتا تھا جو نہایت اہم تھے اور جو جاپان کی ہوس ملک گیری کے لئے نہایت موزوں تھے۔

جاپان کا خیال تھا کہ ہند چینی کو فتح کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ لیکن لات نے زیادہ طول کھینچا اور ہند چینی نے کافی دیر تک مقابلہ کیا۔

ان حالات میں سیام نے بھی ہند چینی کے سامنے چند مطالبات پیش کر دیئے جس سے ان دونوں ممالک میں مخاصمت کا آغاز ہو گیا۔ وشی گورنمنٹ چونکہ اپنی مصیبتوں میں مبتلا تھی اور اُسے اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ اپنے ماتحت علاقوں کا بھی خیال کر سکے، اس لئے وہ سیام اور ہند چینی میں کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ اس موقعے پر جاپان سفیرِ صلح بن کر منظرِ عام پر آیا اور اس نے پہلے توان میں عارضی صلح کرائی لیکن اس کے بعد ۳۱ جنوری ۱۹۴۱ء کو ایک جاپانی جنگی جہاز کے عرشے پر ان ہر دو ممالک نے ایک معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔ جس کی رو سے طے پایا کہ اگر آئندہ کبھی ان میں کوئی جھگڑا ہو گا تو دونوں جاپان کو ثالث بنایا کریں گے اس عہد نامے کی دیگر شرائط کیا تھیں ہمیں ان کی گہرائیوں میں جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اسی ایک شرط سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ سیام کے ہند چینی کے حملے کی تہ میں کس کا ہاتھ کام کر رہا تھا اور اس ایک شرط سے یہ بھی بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ایشیا کے جنوب مشرق میں ریشہ دوانیوں کی اصلی غرض و غایت کیا ہے۔ یہ شرط یہ بھی واضح کر دیتی ہے کہ ہند چینی اور سیام میں مصالحت کرانے کی جاپان نے اس لئے کوشش نہیں کی تھی کہ وہ مشرق میں امن قائم رکھنا چاہتا تھا بلکہ وہ سیام میں اپنے قدم مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سٹیٹسمین نے اپنے ۵ فروری کے اداریہ میں خطرہ محسوس کرتے ہوئے لکھا۔

> سیام اور فرانسیسی ہند چینی میں صلح کرانے سے حکومت جاپان نے بہت بڑی سیاسی نفع حاصل کی ہے۔ جاپانی کسی ایسے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتے جس میں ان کو فائدہ نہ ہو اس لئے یہ خیال نہیں کیا جا سکتا

[1] صاحب مضمون سے ادارہ ادبی دنیا تک یہ تحریر پہنچی ہی تھی کہ یونان کا بھی خاتمہ ہو چکا۔ ادارہ

کہ حکومت جاپان اس طرح سیام اور ہند چینی کی نگاہیں اپنا وفادار بنا کر

خاموش ہو جائے گی بلکہ اس خدمت کی انجام دہی کے صلے میں

کوئی زیادہ قیمت حاصل کرنے کی کوشش کرے گی"۔

حالات بتلاتے ہیں کہ وہ ضرور کوئی نہ کوئی قیمت حاصل کرے گی لیکن وہ قیمت کیا ہوگی۔ اس کے متعلق ابھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے یہ قیمت سیام اور ہند چینی کے اہم فوجی ناکوں اور ان دونوں ممالک کے فطری ذرائع پر قبضہ کرنے کی صورت میں وصول کی جائے یا آہستہ آہستہ ان دونوں ممالک کو اپنے زیر نگیں کر لینے کی صورت میں —!

اگر اُس نے ان ممالک پر قبضہ کر لیا تو اُسے چین کے ساتھ جنگ کے سلسلے میں کئی آسانیاں حاصل ہو جائیں گی اور اگر اُسے امریکہ یا برطانیہ سے مشرقی سمندروں میں الجھنا پڑا تو اس صورت میں بھی یہ دونوں ممالک اس کیلئے بہت مفید ثابت ہوں گے۔ کہ اس صورت میں اگر ایک طرف وہ ہند چینی کے ہوائی اڈوں پر قبضہ کرے گا تو دوسری طرف خلیج سیام اس کے تصرف میں آ جائے گی اس طرح شمال میں وہ چین کی پریشانیوں کو بڑھانے کا موجب ہوگا تو جنوب میں امریکہ اور برطانیہ کی مشکلات کا باعث —!

اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جاپانی مدبر خاکنائے کرا میں سے ایک نہر نکالنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ یہ نہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے تو امریکہ اور برطانیہ کی مشکلات میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا کیونکہ اس طرح سنگاپور کی فوجی اہمیت بالکل ضائع ہو جائے گی اور جاپان کا بحری بیڑا سنگاپور میں برطانیہ اور امریکہ کی بحری قوتوں سے جنگ کئے بغیر خلیج بنگال میں داخل ہو کر ہندوستان کے لئے خطرے کا موجب بن سکے گا۔

اس موقع پر اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ برطانیہ نے برما کی سرحد پر زبردست دفاعی انتظامات کئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی اس خطرے سے بے خبر نہیں ہے، اس لئے اگر جاپان خاکنائے کرا میں سے نہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا تو جاپان کو اس صورت میں بھی برطانیہ کی طاقت سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ نیز برما جاپان کا اقتدار کسی طرح بھی برداشت نہیں کرے گا۔

یہ ہے موجودہ جنگ میں سیام اور ہند چینی کی فوجی اہمیت جسے ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا —!

تابش صدیقی

غزل

دوش پہ میکدہ لئے ابر بہار آ گیا ۔۔۔ نرگس مست جاگ اٹھی ساغر گل بھر آ گیا

پرسش لطف یار اب تیر ابھی آسرا گیا ۔۔۔ ہم سے وہ پوچھتے رہے پھر بھی نہ کچھ کہا گیا

حسن کا اعتبار کیا عشق بھی معتبر نہیں ۔۔۔ بلبل زار رو چکی پھول بھی مسکرا گیا

جلوۂ مشت خاک کی جن کو ابھی خبر نہیں ۔۔۔ کہتے ہیں راز لامکاں اُنکی سمجھ میں آ گیا

بے خبری سی چھا گئی جلوۂ یار دیکھ کر ۔۔۔ جیسے شراب ناب کے جام کوئی پلا گیا

صبر سے تجھ کو کیا غرض صبر ہے مرگ عاشقی ۔۔۔ اے دل بے قرار کیوں تجھ کو قرار آ گیا

عشق میں ہم کو زندگی اور عزیز ہو گئی ۔۔۔ دل میں امید و بیم کی آگ کوئی لگا گیا

رونق بزم عاشقی بے خبری کے دم سے تھی ۔۔۔ تو بھی نہ یاد آ سکا جب ہمیں ہوش آ گیا

ہم کو نصیب سے ملا دل بھی شکست آشنا ۔۔۔ شکوۂ بخت نارسا ہم سے نہ کچھ کیا گیا

سوز و گداز عاشقی دل کے بغیر اب کہاں

آہ شرر فشاں گئی نالۂ شعلہ زا گیا

ظفر تاباں

تین نظمیں

غنڈے

تاش کے پتے پھینک دو یارو تھام لو اپنا سینہ۔
سامنے دیکھو کون آتی ہے کر کے سات سنگار۔
تاش کے پتے پھینک دو یارو تاش کے پتے پھینکو یار۔
پہچانا ہے کون حسینہ تھام لو اپنا سینہ۔
لنگڑے سیٹھ کی یار آتی ہے۔
اِس رستے سے
دن میں یہ دو بار آتی ہے
پھول لبوں کے مہکے مہکے
کالی کالی آنکھوں میں کاجل
چوڑیوں کی جھنکار سناتی
سینے کا گلزار سجائے ۔
ڈالی ایسی کمر لچکاتی
دیکھنے والوں کو تڑپاتی
آتی ہے دو بار یارو! کر کے سات سنگار۔
آج تو آئی ہے یہ اکیلی
ساتھ نہیں ہے اِس کی سہیلی
کیوں بے او تیلی! اونگھ رہا ہے؟
جب وہ آئے
سیٹی چپکے
آنکھ تو اُس کو مار!

کانے کے آنسو

رات کو باورچی خانے میں ہیرا کا نا نوکر
موتی باورچن کے عشق میں تنگ آ کر بے چارا!
اپنی ایک ہی آنکھ سے چھپ کر چپکے چپکے روتا تھا

قیدی

آہستہ سے
چلمن اُٹھی
بجلی سی اک دل پہ گری۔
چاہے گا کون ایسی نہ دل پر بجلی گرے
چڑیا سنہری سی یہ مری
کس کے قفس میں بند ہوئی!

"مسافر"

طوفان سے پہلے

مجھ سے کچھ اور بھی کہنا ہو تو اب کہہ لیجے
اب تو سُن سکتا ہوں خاموش فضا کی صورت

سامنے جھُنڈ درختوں کے ہیں ساکن، بے حس
دُور تک عالمِ حیرت میں سکوں چھایا ہے۔
کوئی آواز نہیں قلب کی دھڑکن کے سوا
کوئی عنواں نہیں افسانۂ ذُو معنی کا
میں بھی خاموش ہوں اسبابِ جنوں بھی خاموش
مجھ سے کچھ اور بھی کہنا ہو تو اب کہہ لیجے

اور اگر تیز ہوا جھُوم کے اُٹھے گی —— تو پھر
ٹوٹ جائے گا خموشی کا طلسمِ باطل
چیخ اُٹھیں گے درختوں سے اُلجھتے جھونکے۔
پھوٹ نکلیں گے ہر اک شاخ سے مبہم نالے۔
ایک اِک برگِ شجر خوف سے تھرائے گا
سائے اُٹھ اُٹھ کے لپٹ جائیں گے ہمسایوں سے ——
پھر سُنی جائیں گی مجھ سے نہ یہ غم کی باتیں
اب تو ہے وقت کہ خاموش ہوں سُن سکتا ہوں
اب تو سُن سکتا ہوں خاموش فضا کی صورت
مجھ سے کچھ اور بھی کہنا ہو تو اب کہہ لیجے۔

یوسف ظفر

سبزہ زار

امریکن ڈرامے کی تاریخ میں "سبزہ زار" کو ایک نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ اس کی فنی خوبیوں کا اندازہ تو اسی حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ اس کی تصنیف پر مصنف کو امریکہ کا مشہور پلٹزر انعام دیا گیا۔ اس انعام کو ریاستہائے متحدہ امریکہ میں وہی شہرت حاصل ہے جو نوبیل انعام کو یورپ میں۔ اس کے علاوہ بھی مذہبی ڈرامے کی صنف میں اس ناٹک کا خاص درجہ ہے۔ اس کے کردار تمام تر پرانے عہد نامے سے لئے گئے ہیں۔ گویا ڈرامے کی صورت میں اناجیل کے فسانے کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس بیان میں فن کی پُرکاری کے ساتھ ساتھ جس سادگی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ وہ اس کے تاثر میں بیش بہا اضافہ کرتی ہے۔ بچوں کے لئے تخلیق کائنات کی کہانی جس قدر حیرت انگیز اور دلکش ہو سکتی ہے۔ اُسی کی نسبت سے مصنف نے یہاں فائدہ اٹھایا ہے نیز تمام کردار اور ماحول کو حبشی رکھ کر ایک ایسا اچھوتا پن پیدا کیا ہے جس سے مذہبی حکایت کی بوسیدگی جاتی رہی ہے۔

آج کل کے بدلتے ہوئے زمانے میں جبکہ مذہب سے انسان دور ہوتے جا رہے ہیں بعض منتخب افراد کا خیال ہے کہ اگر مذہب کی ضرورت کے بجائے احساسِ مذہبی کی تربیت پر زور دیا جائے تو زیادہ مدلّل معلوم ہو اور ہمارا خیال ہے کہ اس نئے اندازِ نظر کو پیدا کرنے کے سلسلے میں زیرِ نظر ڈرامے کی ایسی کوششیں بہت کچھ کام کر سکتی ہیں۔

- ادارہ -

پردہ اُٹھتے ہی گرجے کا ایک کمرہ دکھائی دیتا ہے جس میں ایک معلم مسٹر ڈیلیغی مختلف عمر کے دس حبشی بچوں کو عہد نامۂ قدیم کی تعلیم دے رہا ہے۔ وہ ایک عمر رسیدہ بردبار اور حلیم الطبع آدمی ہے بچوں کا لباس بھی مختلف قسم کا ہے جیسا کہ عام حبشی گھرانوں کا ہو سکتا ہے اور وہ اپنے اپنے مذاق اور سمجھ کے مطابق سبق میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

تین چار بچے اس قدر منہمک ہیں کہ استعجاب سے اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی ہیں۔ دو تین بچے حیران ہیں لیکن سبق میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ چھوٹے بچے اپنے کھلونوں کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔ ایک کسی کھلونے سے کھیل رہا ہے۔ دوسرا اپنی کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔

مسٹر ڈیلیغی سبق شروع کرتا ہے۔

"جب آدم ایک سو تیس برس کا ہوا تو اُس کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا جو بالکل اپنے باپ کا ہمشکل تھا۔ آدم نے اُس کا نام "شیث" رکھا۔ اس کے بعد آدم سو برس اور زندہ رہا۔ اس کے ہاں اور بہت سے لڑکے لڑکیاں پیدا ہوئے۔ آدم نو سو تیس سال زندہ رہ کر مر گیا۔"

مسٹر ڈیلیغی شیث پیغمبر سے حنوک پیغمبر اور حکیم متوسلح پر پہنچتا ہے اور اُن کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے وہ نوح پیغمبر پر آ کر رُکتا ہے:۔

"دنیا میں سب سے زیادہ عمر کا انسان نوح تھا ـــــ!"

مگر نوح کے حالات کو دوسرے دن پر ملتوی کیا جاتا ہے۔ اور آخر میں معلم یہ وعدہ کرتا ہے:۔

"اگلی اتوار ہم تمہیں نوح پیغمبر کے بارے میں کچھ بتائیں گے۔ آج ہم نے تمہیں "کتاب پیدائش" کے پانچ حصّوں کے حالات بتائے ہیں۔ بچو! بتاؤ ـــ کیا تم انجیل مقدس کو پسند کرتے ہو؟"

جواب مختلف ہیں۔ ایک لڑکی اسے حیرت انگیز کہتی ہے۔ ایک لڑکا حیران ہے کہ انجیل میں جن لوگوں کا ذکر ہے وہ کیسے اتنی لمبی عمر تک زندہ رہے۔ کارلیسل نام کا ایک لڑکا یہ جاننے پر اصرار کرتا ہے کہ جب خدا نے پیدائش شروع کی تو دنیا کی کیا حالت تھی اور ان کا قصبہ نیو اورلینز کہاں تھا،

مسٹر ڈیلیغی بیان کرتا ہے:۔

"اس وقت نیو اورلینز میں کوئی بھی نہ تھا، بلکہ نیو اورلینز ہی نہیں تھا پہلے باب کا یہی مطلب ہے۔ اسے خوب ذہن نشین کر لو۔ اس وقت کوچے اور بازار نہ تھے لوسیانہ نہ تھا ـــــ دنیا میں کچھ نہ تھا۔ بچو! اُس وقت تو یہ دنیا ہی نہ تھی!"

کارلیسل کرید کرید کر باتیں معلوم کرتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ خدا نے دنیا کو بنانے کا ارادہ ہی کیوں کیا اور پھر اس جگہ پیدا ہی کیوں کیا جہاں یہ دنیا اب ہے۔ اُس کا جواب اُسے یہ دیا جاتا ہے کہ کتاب میں یونہی لکھا ہے۔

اور معلم سوال کی معقولیت کا اعتراف کرتا ہے:۔

"سوال تو بڑا دلچسپ ہے مگر کتاب مقدس ہی یہی درج ہے اور جب میں بھی ابھی بچہ ہی تھا تو میرے دل میں بھی یہی سوال پیدا ہوتا تھا۔ میرے اُستاد مسٹر دو توئے بڑے شاندار انسان تھے۔ اُنہوں نے میرا سوال سُن کر جواب دیا بچے! کتاب میں اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر نہیں ہو سکتا، اور ان کا خیال درست تھا بعض اوقات مجھے خیال آتا ہے کہ شاید خدا کا مقصد یہ ہے کہ بہت سی باتوں کے متعلق ہم خود سوچیں۔ ایک وقت ایسا بھی تھا۔ جب ابھی صرف فردوس بریں ہی تھی۔ کہاں تھی، یہ ہم نہیں جانتے لیکن تھی ضرور۔ شاید کل کائنات ہی جنت تک محدود ہو تب ایک دن خدا نے سوچا ہوگا کہ آؤ اور چیزیں پیدا کریں۔ اس نے سورج، چاند اور ستارے بنائے۔ اور پھر زمین کو پیدا کیا! اس وقت کوئی بشر نہ تھا، صرف فرشتے اور حوریں تھیں!"

مسٹر ڈیشی کا خیال تھا کہ ان فرشتوں کا کام صرف اس قدر تھا کہ وہ بہشت میں اُڑتے پھریں اور یوں ہی دل بہلایا کریں۔ وہ ہر طرف گلگشت کرتے رہتے ہوں گے۔ اور مچھلیاں بھوننا ان کا مشغلہ ہوگا۔ نوجوانوں کے لئے دودھ میں پھینٹے ہوئے انڈے اور عمدہ سگار موجود ہوں گے۔ ہر ہفتے مچھلی کی دعوت اڑائی جاتی ہوگی اور ننھے فرشتوں کے لئے سکول بھی بنے ہوں گے۔

خدا کی شکل کیسی ہے؟

"خدا کیسا ہے یہ کوئی نہیں جانتا!" مسٹر ڈیشی با دل ناخواستہ مان لیتا ہے "لیکن جب میں تمہاری طرح ابھی بچہ تھا تو میں خدا کا تصور پادری ڈیویس کی مانند کیا کرتا تھا۔ میرے نزدیک وہ دنیا کے بہترین انسانوں سے تھا میں سوچا کرتا تھا کہ جب کبھی خدا زمین پر انسانی شکل میں نمودار ہوگا تو وہ بالکل مسٹر ڈیویس کی طرح ہوگا!"

بچوں کے گھر جانے کا وقت ہو رہا ہے مگر اٹھنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ وہ پہلے سبق کی خاص خاص باتوں کو دہرا لیں۔

"بچو، جو کتاب ہم پڑھ رہے ہیں اس کا نام کیا ہے؟"

"کتاب پیدائش!"

"ٹھیک ٹھیک!!۔ اُس کا دوسرا نام!"

"موسیٰ کی پہلی کتاب!"

"بالکل ٹھیک اور اس کا پہلا باب ..... (روشنی مدھم ہونے لگتی ہے!)..... سب سے پہلے خدا نے جنت اور زمین کو پیدا کیا۔ زمین ایک خلا تھی اور اس خلا میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی......"

سٹیج پر تاریکی چھا جاتی ہے!

دوسرا منظر

سٹیج پر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ مدھم آواز میں کورس میں حمد گانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ سٹیج پر آہستہ آہستہ روشنی ہوتی ہے۔ اجالا ہو لیتا ہے تو فرشتے حمد گاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے سفید لبادے پہنے ہوئے ہیں اور شانوں پر پروں کی شکل کے چھوٹے چھوٹے بازو ہیں۔ مگر ان کے چہروں اور حرکات سے معلوم ہوتا ہے کہ حبشیوں کی ایک جماعت مچھلی بھوننے کی تقریب پر آئی ہوئی ہے۔ یہ منظر تخلیق آدم سے قبل کا ہے۔ پس منظر میں نیلا آسمان ہے جو تمام فضا پر محیط نظر آتا ہے۔ سٹیج پر رنگ رنگ کے بادل چھا رہے ہیں جو اڑتے ہوئے شاہ بلوط کے درخت پر سے جو سٹیج کے بائیں طرف ایستادہ ہے گذرتے ہیں۔ درخت خوب گھنا ہے اور بادلوں کا سایہ اُسے اور بھی تاریک بنا رہا ہے (سٹیج پر رنگ) سائے تلے مچھلی بھوننے کا ساز و سامان رکھا ہے۔ آگ جل رہی ہے۔ جس پر ایک بڑی سی کیتلی چربی سے پُر رکھی ہے زمین میں چار لکڑی کے ٹکڑے گاڑ کر ان پر تختے جوڑے گئے ہیں جو ایک بڑی مگر بھدی سی میز کا کام دے رہے ہیں۔ میز پر روٹی کے ٹکڑے، بسکٹ اور تلی ہوئی مچھلی رکھی ہے۔ دیودار کی لکڑی کے ایک دودھ بلونے والے برتن میں دودھ میں پھینٹ کر اُبالے ہوئے انڈے ہیں۔ ان برتنوں کے قریب کھانا نکالنے کے لئے تو بنا بنا برتن، گلاس اور مختلف انواع و اقسام کے پیالے رکھے ہیں۔

مچھلی بھوننے کے کام پر جو فرشتے مامور ہیں وہ بڑی تندہی سے کام کر رہے ہیں۔ حوریں ننھے فرشتوں کے لئے کھانا برتنوں میں لگا رہی ہیں۔ فرشتے مچھلی کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر باورچیوں کو دے رہے ہیں۔ ایک ننھے فرشتے کے حلق میں کانٹا اٹک جاتا ہے تو حور اُس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر کانٹا نکالتی ہے۔

بعض حوریں سایہ دار ٹوپیاں پہنے ہیں۔ کئی فرشتے بڑے اطمینان سے بیٹھے سگار پی رہے ہیں۔ پرکیف فضا مسرت اور اطمینان سے لبریز ہے۔ تمام ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ تقریب کامیاب ہے کسی کو غصہ بھی آ جائے تو اُسے قہقہوں میں اڑا دیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ فرشتوں کے سماوی دلائل میں ارضی خصوصیت موجود ہے۔ وہاں بھی اس وقت عورت کا مسئلہ وہی حیثیت رکھتا ہے جو ہماری اپنی دنیا میں۔ ایک فرشتہ دوسرے سے کہہ رہا ہے:۔

ان سے بات کرنا محال ہے۔ ذرا کوئی بات سمجھانی چاہی اور وہ
روٹھ گئیں۔"

ننھے فرشتوں کو بھی ڈانٹا جاتا ہے۔

"نیچے اترو!" ایک حور جوش میں اپنے نڈر بچے کو جو ایک درخت کی شاخ پر
جا بیٹھا ہے ڈرا رہی ہے۔ "تمہارا نام گناہوں کی کتاب میں لکھا جائے
گا — اگر تم نے میرا کہا نہ مانا تو وہیں آکر سزا دوں گی۔ سنتے ہو!"

"تم ہو بڑے شریر!"

اس مجلس میں کہیں کہیں شیطان کا ذکر بھی ہو رہا ہے۔ نجانے وہ کہاں گیا
جنّت کے سوا اگر کوئی اور جگہ نہیں تو وہ لازماً وہیں کہیں ہوگا مگر اُسے کسی نے عرصے
سے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے خدا نے اُس کے لئے کوئی اور جگہ تجویز کی ہوگی۔ ابھی
وہ کہیں گیا ہو، فرشتوں کو اُس سے کیا کام!

ایک موٹا فرشتہ:-

"خدا کی باتیں خدا ہی جانے، جس دن سے شیطان کو باغِ جنت سے
نکالا گیا ہے۔ اب کوئی گناہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حوریں جہاں چاہیں
جائیں کسی کی کیا مجال جو ذرا بھی نظرِ بد ڈال سکے!"

مقرب فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ننھے فرشتوں کے لئے سکول
کے داخلے کے فارم لے کر داخل ہوتا ہے اور انہیں ننھوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اس دوران
میں ننھے فرشتے دھیمی آواز میں کچھ گا رہے ہیں۔

فضا میں آہٹ سنائی دیتی ہے اور جبریل نمودار ہوتا ہے۔ وہ کافی جسیم و
لحیم ہے، اور اس کا لباس مقرب فرشتے سے زیادہ پُر شوکت ہے۔ وہ جوان معلوم
ہوتا ہے۔ اس کے لباس میں شوکت کے باوجود سادگی ہے۔ ایک ہی لمحے میں
جنت کی یہ مجلس ہمہ تن گوش ہو جاتی ہے۔

جبریل ہاتھ بلند کر کے جھک جاتا ہے اور بہ آوازِ بلند پکارتا ہے:-

"خداوند بیاہ تشریف لاتے ہیں!"

خدا داخل ہوتا ہے۔ وہ سب سے دراز قد اور قوی الجثہ ہے۔ اس کا
لباس، سفید قمیص، سفید ٹائی۔ الپاکے کا سیاہ لمبا کوٹ اور سیاہ پتلون ہے۔
خدا کی آواز میں بہت ہیبت اور جبروت ہے۔

خدا پکارتا ہے:-

"کیا تم سب نے بپتسمہ لے لیا ہے؟"

"خداوند، بے شک!"

"کیا تم سب نے بپتسمہ لے لیا ہے؟"

"خداوند بے شک، بے شک!"

"کیا تم سب نے بپتسمہ لیا ہے؟"

"بے شک۔ بے شک! خداوند! بے شک!"

پھر آیاتِ الٰہی کی تلاوت ہوتی ہے۔ دوسری آیت کے ختم ہوتے
ہی سب کے سر جھک جاتے ہیں۔ خدا سب پر ایک نظر ڈالتا ہے اور پھر
نہایت شان سے اپنا ہاتھ اٹھاتا ہے۔

"مچھلی بھوننے کی تقریب جاری رہے!"

فضا میں پھر ہل چل شروع ہو جاتی ہے۔ خدا اپنے مقرب فرشتے سے باتیں
کر رہا ہے کہ بہت سے ننھے فرشتے خدا کے گرد جمع ہو جاتے ہیں بعض اس کے
کوٹ کا دامن تھام لیتے ہیں مگر وہ اس سے بُرا نہیں مانتا۔ اہرمن — ایک
ننھا فرشتہ اس کے دامن کو بُری طرح زور زور سے کھینچتا ہے۔ خدا اُسے
اٹھا لیتا ہے اور پیار سے اس کو تھپکیاں دیتا ہے۔

فرشتے خدا کو مچھلی کے سموسے پیش کرتے ہیں مگر وہ نرمی سے انکار کر
دیتا ہے۔ ہاں وہ دودھ میں پھینٹے ہوئے انڈے چکھ لے گا۔ سگار جب پیش
کیا گیا تو خدا نے اُسے لے لیا۔ جب اُسے بتایا گیا کہ وہ صبح سے اس تقریب
میں مشغول ہیں اور بہت خوش ہیں۔ نیز مچھلی کی دعوت نہایت خوبی سے سرانجام
پا رہی ہے، تو وہ بہت خوش ہُوا۔

"ہم نے سنا ہے کہ تم نے خوب وقت گزارا" [سب تعظیم سے جھک
جاتے ہیں] "ہمیں نغمہ سناؤ!"

"جو حکم ہو خداوندا!"

سب مل کر حمد گاتے ہیں جسے خدا پسند کرتا ہے۔

خدا جونہی پھینٹے ہوئے انڈوں کا پیالہ لبوں کے قریب لے جاتا ہے
تو اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ دوسری بار چکھتا ہے۔
اُسے پھر پسند نہیں آتا۔

جبرئیل۔ خدائے عزوجل! کیا بات ہے؟

خدا۔ [پھر چکھتے ہوئے] مجھے یہ پسند نہیں آیا۔

باورچی فرشتہ۔ خداوند! کیا یہ خوش ذائقہ نہیں!

خدا۔ یہ اچھی طرح تیار نہیں کیا گیا — کیا تم نے پکایا تھا!

باورچی فرشتہ۔ بجا ارشاد، خداوند! مگر میں نے سارا مسالہ ڈالا تھا، پھر کیوں
پسند نہیں آیا۔

خدا۔ انڈا، مکھن، اور شکر۔ یہ ان کا ذائقہ ہے [illegible] نقص کیا ہے

[وقفہ] ہاں، اس میں آکاش کا پانی ڈالا گیا!

فرشتہ۔ خداوند! وہ بھی اس میں موجود ہے!

خدا۔ ہوگا مگر بہت کم۔

فرشتہ۔ بجا فرمایا خداوند! مگر میں نے سارے کا سارا ختم کر دیا تھا۔

خدا۔ اچھا کیا! اچھا کیا! لیکن اور پانی چاہیئے! ٹھہرو! [کورس بند ہو جاتا ہے] آکاش کا پانی! میرا ارشاد کن، فیکون ہے [سٹیج پر دھندلکا سا چھا جاتا ہے۔ خدا اور تمام سماوی مخلوق اس دھندلکے میں اوجھل ہو جاتی ہے جونہی خدا اپنا کلام ختم کرتا ہے فضا میں رعد کی مہیب آواز پیدا ہوتی ہے۔ سٹیج اور بھی تاریک ہو جاتی ہے] میری منشا یونہی پوری ہوتی ہے [فرشتوں کی ملی جلی آوازیں "پانی خوب برسنے لگا" "یہ ہے آکاش کا پانی" "یہ کب تھمے گا"]

ایک حور۔ خداوند عالم! پانی کب تھمے گا؟ بچے بھیگ رہے ہیں۔

دوسری حور۔ میری بچی تو سکڑی جا رہی ہے۔ پانی سر سے گذرا جا رہا ہے!

خدا۔ پانی کو کہیں اکٹھا کر لو۔

جبرئیل۔ خداوند، ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں!

پہلی حور۔ اگر اجازت ہو تو ہم ننھوں کو لے کر یہاں سے چلے جائیں۔

خدا۔ میں اس تقریب کو درہم برہم نہیں کرنا چاہتا۔ میں ایک معجزہ دکھاؤں گا۔ معجزوں میں یہی خرابی ہے کہ ایک معجزہ دکھا کر دوسرا دکھانا ہی پڑتا ہے [ایک خاموشی طاری ہو جاتی ہے] پانی کے لئے جگہ ہو جائے! پہاڑ نمودار ہو جائیں۔ وادیاں پیدا ہوں! جھیلیں بن جائیں اور سمندر بن جائیں۔ اس پانی کو سمندر تک پہنچانے کے لئے دریا اور ندیاں ظاہر ہوں۔ اے زمین! — پیدا ہو جا!! اے سورج! طلوع ہو تاکہ ننھے فرشتوں کے پر سوکھ جائیں! [سٹیج پر روشنیاں اوپر کر لی جاتی ہیں اور ان کی جگہ سورج کی روشنی سے اجالا ہو جاتا ہے سٹیج پر ایک اونچا سا گیلری نما کٹہرے دار چبوترہ نمودار ہو جاتا ہے۔ ننھے فرشتے دھوپ کی وجہ سے ایک راحت سی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ حوریں انہیں اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ تمیرا ننھا ایک کہہ رہی ہے۔ "اب تو سردی نہیں لگ رہی میرے بچے کو؟" دوسری بولی مقرب فرشتہ چبوترے پر کھڑا سب کو گھور رہا ہے]

مقرب فرشتہ۔ دیکھو! [سب فرشتے فوراً چبوترے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور بے اختیار ہمہ تن سوال بن کر پوچھتے ہیں "ارشاد!" "کیا بات ہے!" چبوترے کے درمیان جبرئیل کھڑا نظر آتا ہے۔ خدا کسی خیال میں محو ہے۔ فرشتے حمد گانے لگتے ہیں: "تیرا نام مالکِ دوسرا، تیری شان جل جلالہٗ"۔ جب کورس آہستہ آہستہ ختم ہوتا ہے تو جبرئیل خدا کی طرف مڑتا ہے اور جھک کر ہاتھ کے اشارے سے زمین کی طرف توجہ دلاتا ہے]

جبرئیل۔ خداوندِ قدیر! دیکھا آپ نے؟

خدا۔ [آہستہ سے۔ سر ہلائے بغیر] ہاں جبرئیل!

جبرئیل۔ مالکِ ارض و سما! یہ زمین کتنی خوب صورت ہے۔

خدا۔ ہاں جبرئیل [جبرئیل کٹہرے پر کھڑا ہو کر زمین کو دیکھ رہا ہے]

جبرئیل۔ [نیچے دیکھتے ہوئے] اے حکیم و بصیر! کتنی پُر بہار ہے زمین! ہر طرف سبزہ ہی سبزہ لہرا رہا ہے۔

خدا۔ میری تخلیق کا شاہکار ہے یہ کرۂ زمین [خدا اٹھتا ہے۔ جبرئیل جھک کر راستہ دیتا ہے] ہاں، تو اس کرہ میں ایک مخلوق کی ضرورت ہے جو ہماری نعمتوں سے فائدہ اٹھائے۔

[یکایک خدا کچھ سوچتا ہے۔ وہ زمین پر جانے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ اس کی غیر حاضری میں، جبرئیل کو امورِ خداوندی کی دیکھ بھال کا اختیار ہوگا (میں جلد ہی) لوٹ آؤں گا۔ خدا وعدہ کرتا ہے اور وہ مڑ کر کورس کو خاموش ہونے کا اشارہ کرتا ہے]

میں ایک اور معجزہ دکھانے والا ہوں۔ یہ معجزہ سب سے بڑا اعجاز ہوگا۔ تم سب مل کر ایک مہیب ترین آواز پیدا کرو۔

[خدا آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور اپنا بازو بلند کرتا ہے]

"آدم — پیدا ہو جا!"

[فضا میں ایک کڑک سنائی دیتی ہے۔ سین تاریک ہو جاتا ہے۔ فرشتے سجدے میں گر کر کورس میں تمہید گانے لگتے ہیں۔ آہستہ آہستہ روشنی نمودار ہوتی ہے

[پہلا منظر ایک نئے سین میں جذب ہو جاتا ہے]

تیسرا منظر

قسم قسم کے درخت۔ خوبصورت پھول اور پتے، کیاریاں، روشیں نظر آ رہی ہیں۔ فضا پر ایک دھند سی چھا رہی ہے۔ آہستہ آہستہ سورج کی روشنی نمودار ہوتی ہے۔ اور دھند کو اڑا لے جاتی ہے۔ سٹیج کے وسط میں آدم نمودار ہوتا ہے۔ اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی ہے۔ درمیانہ قد لباس ایک عام دیہاتی کسان کی مانند سادہ، وہ ننگے سر ہے — دور

سے گانے کی آواز آتی ہے جیسا کہ پرندہ چہچہاتا ہے جسے سن کر آدم خوش ہوتا ہے
سورج کی گرمی کے ساتھ جیسا کہ آدم میں بھی زندگی کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔
وہ اپنے مضبوط بازوؤں کو دیکھ کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ اپنے پاؤں فرش پر دیکھ
کر وہ انہیں ہلاتا ہے۔ خدا داخل ہوتا ہے۔

خدا۔ (پکار کر) کیسے ہو بیٹا؟

آدم۔ (ذرا تن کر) خداوند، آداب عرض کرتا ہوں۔

خدا۔ تمہارا نام کیا ہے بیٹا؟

آدم۔ آدم۔

خدا۔ آدم؟ صرف آدم؟

آدم۔ صرف آدم۔

آدم جنت سماوی کو پا کر خوش ہے۔ اس کے لئے نیا کام ہے۔ مگر وہ
اسے جلد ہی سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن ایک چیز کی وہ کمی محسوس کرتا ہے
اس کا کوئی جیون ساتھی نہیں ہے۔ اس کا دل پکار پکار کر اس کمی کو جتا رہا ہے۔ خدا
بھی آدم کی تائید کرتا ہے۔

جیون ساتھی کی کمی تھی۔ مگر یہ کمی کیسے پوری ہوگی۔ یہ آدم نہ جانتا تھا
خدا نے اس کو پورا کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

سٹیج یکایک تاریک ہو جاتی ہے۔ اور اس تاریکی میں خدا حوا کو پکارتا
ہے۔ جونہی دوبارہ روشنی ہوتی ہے آدم اور حوا اکٹھے کھڑے دکھائی دیتے ہیں
— دنیا کا پہلا جوڑا!

حوا کی عمر چھبیس سال ہے۔ وہ بہت خوبصورت ہے۔ اس کا لباس دیہاتی
لڑکیوں کا سا مگر بالکل نیا ہے۔ خدا سٹیج کے ایک طرف دور کھڑا ان کو غور سے
دیکھ رہا ہے۔ حوا حیران ہو کر آدم کو تکتی ہے۔ پھر دھیرے دھیرے سر کو پھراتی
ہے اور آخر اس کی نگاہ خدا پر جا پڑتی ہے۔ وہ رکتی ہے اور دونوں ایک دوسرے
کو تکتے رہتے ہیں خدا مسکرانے لگتا ہے۔

خدا۔ تم دونوں میرے اس باغ کے محافظ ہو۔ اس میں رہو سہو۔ حوا تو آدم
کے لئے ہے اور آدم تو حوا کے لئے۔ تم ایک دوسرے کا لباس ہو۔
تمہارے لئے اس باغ میں تسکین اور امن ہے اور جاوداں مسرت،
پیاس بجھانے کے لئے ندی کا صاف اور شفاف پانی، انگور دل
کا رس، اور کھانے کے لئے — پھل، جہاں سے تم چاہو۔ (یکایک
رک جاتا ہے) مگر یاد رکھو اس درخت (اشارہ کرتا ہے) کے نزدیک
نہ جانا (توقف — منہ دوسری طرف کرتے ہوئے) میرے بچو! میرے
حکم کی تعمیل ہو۔

دونوں۔ خداوند! ارشاد کی تعمیل ہوگی (مگر آہستہ آہستہ ان کے سر شجر ممنوعہ
کی طرف مڑ جاتے ہیں) تو ہی تعریف کے لائق ہے اے خدا!

خدا۔ اب میں جاتا ہوں تاکہ تمہارے لئے اور نعمتیں بھیج سکوں۔ باغ میں
خوش خوش رہو۔

خدا جاتا ہے۔ آدم اور حوا اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ دونوں
کے ہاتھ خود بخود ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے
کا ہاتھ تھامے شجر ممنوعہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

"آدم!"

حوا پکارتی ہے۔ وہ جواب دیتا ہے مگر اس کی آنکھوں میں ایک قسم
کا خوف دکھائی دے رہا ہے۔

"آدم!"

اندھیرا ہو گیا ہے اور اس تاریکی میں مسٹر ڈیشی اور بچوں کی آوازیں
سنائی دے رہی ہیں۔

بچے۔ جانتے ہو آدم اور حوا کی پیدائش کے بعد پھر کیا ہوا؟

ایک آواز۔ انہوں نے ممنوع درخت کا پھل کھا لیا اور جنت سے نکالے گئے

ڈیشی۔ اور پھر کیا ہوا؟

آواز۔ دونوں کو اس کا بہت صدمہ تھا۔

ڈیشی۔ صدمے کی بات جانے دو۔ یہ بتاؤ کہ ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوا؟

آوازیں۔ ہاں، ہاں!

قابیل اور ہابیل کی پیدائش کا معاملہ ختم ہوا۔ بچے سمجھتے تھے کہ دونوں
کی پیدائش اس وقت ہوئی جب آدم اور حوا جنت سے نکالے جانے کے
بعد زمین پر رہنے لگے تھے۔ سب جانتے تھے کہ قابیل برا لڑکا ہے۔

روشنی مدھم ہو جاتی ہے۔

چوتھا منظر

سڑک کے کنارے، قابیل، ایک موٹا تازہ حبشی نوجوان۔ ہابیل کی
لاش کے قریب کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا پتھر ہے۔

خدا نے جب یہ دیکھا تو وہ ناراض ہوا۔ قابیل کا خیال تھا کہ اس کی
توہین کی گئی جس کا اس نے بدلہ لیا۔ وہ کھیت میں کام کر رہا تھا اور قابیل درخت
کے سائے تلے بیٹھا بھائی کو مذاق کرنے لگا۔ ہابیل نے کہا:

"بھیا! ہم تو اس گرمی میں کام کرنے سے باز آئے۔ ہمارا تو بھیجا اُبل

آئے گا — لیکن تم! — تمہارے سر میں تو بھیجا ہی کہاں ہے تمہیں اس کا کیا خطرہ!

قابیل نے غصے میں آکر اُسے پتھر دے مارا۔ نہ جانے اگر کوئی اور چیز ہوتی تو وہ اُسے بھی دے مارتا۔ قابیل کے اس جرم کی سزا خدا نے اُسے یہ دی کہ تمام عمر وہ مصائب کی زنجیروں میں جکڑا رہے گا۔ اُسے جلا وطن کر دیا گیا۔ خدا نے کہا کہ وہ جا کر شادی کر لے اور اپنی سزا کو بیوی بچوں کی محبت سے بھلانے کی کوشش کرے۔ انسان کی فطرت ہی یہی ہے۔

قابیل روانہ ہو جاتا ہے۔ پس منظر میں الوداعی گیت سنائی دیتا ہے۔

روشنی مدھم ہو رہی ہے۔ منظر معدوم ہو جاتا ہے

پانچواں منظر

قابیل چلا جا رہا ہے۔ راستے میں بڑے دلکش نظارے ہیں اور وہ چلتا جا رہا ہے۔ آخر وہ ایک باڑ کے قریب آکر رکتا ہے۔ باڑ کے قریب ایک اونچا درخت ہے جس پر "سرحد" کا بورڈ آویزاں ہے۔

قابیل درخت کے سائے تلے ذرا سستانے کے لئے بیٹھ جاتا ہے اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ چالیس برس تک متواتر چلتا رہا ہے۔ ابھی وہ بیٹھا ہی تھا کہ درخت کی ٹہنیوں میں سے کسی نے اُسے پکارا۔

آواز۔ دیہاتی!

قابیل۔ کون (اوپر دیکھ کر) اوہو، تم! گاؤں کا راستہ کونسا ہے؟

دونوں کی شناسائی کی ابتدا یوں ہوئی۔ چشم زدن میں ایک لڑکی اُس کے پہلو میں آکر بیٹھ گئی۔ وہ قابیل کی طرح مضبوط بدن کی خوبصورت لیکن شریر ہے اور بھڑکیلا شوخ لباس پہنے ہوئے ہے۔

لڑکی۔ دیہاتی! ادکھو ان مضبوط بازوؤں سے کسی لڑکی سے بُرا سلوک نہ کرنا۔ کسی کا گھورنا میں برداشت نہیں کر سکتی۔

قابیل۔ مجھ پر یقین رکھ — میں اتنا کمینہ نہیں!

لڑکی اور قابیل گھل مل جاتے ہیں۔ اور رازدارانہ لہجے میں گفتگو ہونے لگتی ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ کیا اُس کے گھر والے اسے اپنے ہاں ٹھہرنے کی اجازت دیں گے۔ لڑکی کا خیال ہے کہ وہ بخوشی ایسا کر لیں گے!

لڑکی۔ مجھے تم سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ اگر میں نے کبھی تمہاری مرضی کے خلاف کوئی بات کر دی تو شاید تم مجھے مار ہی ڈالو۔

قابیل۔ ایسی فضول باتیں نہیں سوچا کرتے!

دور سے گانے کی آواز آتی ہے اور وہ گاؤں کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔

خدا سڑک کے دوسرے کنارے پر نمودار ہوتا ہے اور دونوں کو جاتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنا سر ہلا کر کہتا ہے۔

"یہ آغاز بہت بُرا ہے — ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا!"

روشنی مدھم ہو جاتی ہے!

چھٹا منظر

جنت میں خدا کا ذاتی دفتر ہے۔ اُس کی ایک بڑی کھڑکی میں سے وسیع نیلا آسمان نظر آ رہا ہے۔ میز بہت ہی شاندار ہے۔ اس کے سامنے چمڑے سے منڈھی ہوئی کرسی رکھی ہے۔ میز پر لکھنے کا سامان رکھا ہے۔ میز کے نیچے ردی کی ٹوکری ہے۔ ایک کتاب دان میز پر رکھا ہے جس میں قانون کی کتابیں آراستہ ہیں۔ دیوار پر کلنڈر لٹک رہا ہے اور کھونٹی سے جبرئیل کا "صور" آویزاں ہے۔

دفتر کی فضا بالکل لوسینیا کے جلبتی وکیل کے دفتر کی سی ہے۔ جونہی سٹیج پر روشنی ہوتی ہے۔ خدا بکس سے ایک نیا سگار اٹھاتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کو سلگائے بغیر کش لگانے لگتا ہے۔ جبرئیل ہاتھ میں بہت سے کاغذ اور ایک پنسل لئے ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔

خدا اور جبرئیل ابھی ابھی ایک اہم معاملے کی تکمیل سے فارغ ہوئے ہیں۔ ایک ننھے فرشتے کا قضیہ باقی رہ گیا ہے جو مقربین کے سونے کے محل میں رہتا ہے۔ اس کے پر بے موسم ہی جھڑ رہے ہیں۔ جبرئیل کو اس معاملے کی طرف توجہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

جبرئیل چاہتا ہے کہ وہ چپکے چپکے اپنے صور پر مشق کرے۔ وہ صور کو اتارتا ہے مگر خدا بغیر مڑے اُسے ایسا کرنے سے منع کر دیتا ہے۔

چاند میں بسنے والی مخلوق کی طرف سے ایک شکایت موصول ہوئی کہ سورج کی گرمی سے چاند پگھلنے لگا ہے لیکن خدا پہلے ہی سے یہ جانتا تھا کیونکہ بعض فرشتے رات کو چاند کے ارد گرد ناچتے پھرتے تھے۔ اُن کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے گرمی پیدا ہوتی تھی۔ خدا حکم دیتا ہے۔

"اب ہمارے اس حکم کے بعد ایسا کرنا گناہ ہوگا۔ ناچ بند کر دیا جائے۔ اس طرح چاند ٹھنڈا رہے گا!"

زمین سے انسانوں کی بہت سی دعائیں قبولیت کے لئے درگاہ ایزدی میں پہنچ چکی تھیں۔ خدا اس سے ذرا پریشان سا ہو گیا ہے۔ آخری بار تین چار سال کا عرصہ ہوا وہ زمین پر جو کچھ دیکھ کر آیا تھا اُس نے اُسے برہم کر دیا تھا

خدا پھر زمین پر جانے کا ارادہ کرتا ہے تاکہ چند دن ذرا تفریح ہو جائے وہ جبرئیل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے!

"میں زمین پہ جا رہا ہوں اور اپنی عزیز مخلوقات کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا کر رہے ہیں!"

روشنی مدھم ہو رہی ہے۔ منظر اس میں معدوم ہو جاتا ہے!

ساتواں منظر

جونہی پردہ اٹھتا ہے کورس میں گانا سنائی دیتا ہے۔ روشنی ہوتی ہے۔ اور خدا ایک سڑک پر چلتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ سڑک کے دو رویہ سبزہ ہی سبزہ نظر آ رہا ہے۔ کھیتوں کے پار سے عبادت خانے کے گھنٹوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔

کٹے ہوئے درخت کے تنے پر ایک لڑکی بیٹھی ساز کے ساتھ گا رہی ہے۔ اس کا لباس چست اور شوخ ہے۔ اُس کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ ہے۔

خدا نے اسے کہا کہ سبت کے روز یوں گانا درست نہیں۔ وہ ہنس پڑی کیونکہ اب سبت کا دن ہی کوئی نہ رہا تھا۔

لڑکی۔ اتوار کا دن اب جشن منانے کے لئے ہے۔

خدا۔ تم عجیب لڑکی ہو!

لڑکی۔ بلکہ عجیب سے بھی عجیب۔

خدا ناراض ہو جاتا ہے۔ لڑکی مرعوب ہو کر اُسے بتاتی ہے کہ وہ شیث پیغمبر کی نسل ہی سے ہے۔ اُن کے واعظ نے لڑکی سے کئی بار کہا تھا کہ تو دوزخ کی راہ پر چل رہی ہے مگر اس کے نزدیک یہ راہ ایک ایسی ہی وادی کو جا نکلے گی۔ جہاں اُس کے باپ دادا ہوں گے اور وہ خوشی خوشی وہاں سیر و تفریح کر سکے گی۔

اتنے میں قابیل ششم داخل ہوتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے بالکل بے پروا معلوم ہوتا ہے۔ اُسے صرف اپنے بچے کی فکر ہے۔ لڑکی اُس کی بغل میں بیٹھی گا رہی ہے۔

جب تک گانا ختم نہیں ہوتا وہ خدا کو نہیں دیکھ سکتے۔ دونوں اپنے آپ میں محو ہیں قابیل نے بڑی افواہیں سنی ہیں کہ زیبا کسی اور مرد سے راہ و رسم پیدا کر رہی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُسے بتا دے کہ زیبا کا واحد مالک صرف وہی ہے اور اس کے لئے اُس کے پاس ایک ثبوت ہے اور وہ ہے — ریوالور!

زیبا اور قابیل سڑک پر روانہ ہو جاتے ہیں۔

"بہت برا ہے یہ —" یہ کہتا ہوا خدا بھی چل دیتا ہے

خدا اب پھر سڑک پر تنہا چل رہا ہے۔ درختوں پہ پرندے چہچہا کر اور کھیتوں میں پھول مسکرا کر اپنے خالق کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔

"پھولو! — تم کیسے ہو؟"

"بڑے مزے میں ہیں خداوند!"

"تم ہو بھی خوبصورت!"

"شکریہ — خالقِ ارض و سما!"

"مگر انسان نے مجھے بڑا تنگ کیا ہے!"

خدا پھر روانہ ہو جاتا ہے۔

آج اتوار کا دن کیسا سہانا ہے۔ میرے بندے اس دن میری عبادت کریں گے مگر!

راہ میں لڑکوں کا ایک مجمع نظر آتا ہے۔ وہ جھکے ہوئے کھڑے ہیں۔ شاید وہ عبادت میں مشغول ہیں لیکن وہ عبادت خانے میں کیوں نہیں گئے؟ مگر جب خدا اُن کے نزدیک پہنچتا ہے تو ایک لڑکا جھک کر اپنا ہاتھ تین چار مرتبہ زور سے ہلاتے ہوئے کہتا ہے۔

"میرے خدا۔ اب کے تو بیڑا پار کر دے۔ دل کی آس بھر لا میرے مولا تیرا فضل"

وہ پانسہ پھینکتا ہے

"نو مارا — پو بارہ! — سبحان تیری قدرت!"

"جوا اور میرے نام پر —!"

جواری جوئے میں اس قدر محو ہیں کہ انہیں خدا کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ خدا ایک چھوٹے سے بچے کی طرف سب سے زیادہ متوجہ ہے جو اس عمر میں جوئے اور گناہ کی لعنت کا شکار ہو رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے باپ کی طرح تمباکو بھی چبا رہا ہے اُسے شرم آنی چاہیئے۔ دوسرے جواریوں کو بھی شرم آنی چاہیئے جو اس معصوم بچے کو گناہ کی تعلیم دے رہے ہیں۔!

خدا کو یوں متوجہ دیکھ کر ایک جواری کہتا ہے۔

"حضرت! — کیا خوب پانسہ پھینکتا ہے!"

"میں ابھی جا کر اس کی ماں سے کہتا ہوں کہ اس کا لڑکا خراب ہو رہا ہے۔"

"وہ اس کے کرتوت نہیں جانتی ہوگی۔ نہیں تو —"

"نہیں جانتی ہوگی! بڑی بھولی ہے وہ!"

"ضرور بتانا میری ماں کو — ضرور!"

خدا ایک مکان پر جا کر رُکتا ہے۔ یہ لڑکے کا گھر ہے۔ آواز دینے پر اندر سے جواب آتا ہے کہ جب تک تلاشی کے وارنٹ نہ ہوں گے دروازہ نہیں کھلے گا — جواری لڑکا! اس کی ماں ریلوے کے ایک ملازم کے ساتھ بھاگ گئی تھی اس کا باپ میز کے نیچے نشے میں چور پڑا ہے۔ ہر شخص جو گذشتہ رات دعوت میں موجود تھا۔ وہ مست ہے! اور جواب دینے والا بھی شاید مدہوش ہی ہوتا اگر اُس کی نئی کشید کی ہوئی شراب نے اس کا حلق جلا کر اُس کی مے نوشی کو روک نہ دیا ہوتا!

خدا مایوس ہو کر آگے چل دیتا ہے اور اپنے آپ سے باتیں کرتا جاتا ہے۔ اس طرح تو کچھ بھی نہیں بنے گا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسان کی حالت کچھ

حوصلہ افزا نہیں ہے! اور اس سے میں نے اپنی دنیا آباد کی تھی۔"

وہ رُکتا ہے اور مڑ کر پیچھے دیکھتا ہے:۔

میرا خیال ہے کہ ان سب کو نیست و نابود کر کے اس دنیا میں فرشتوں کو آباد کر دوں، نہیں — جہاں تک نغمات، ناچنا اور ہوا میں پرواز کرنے کا سوال ہے۔ فرشتے بہترین مخلوق ہیں لیکن یہ کھیتی باڑی اور عمارتیں بلند کرنے کا کام نہیں کر سکتے۔ انسان اس طرح تو اس دنیا کے لئے سب سے موزوں مخلوق ہے۔ بشرطیکہ یہ گناہ میں اس قدر غرق نہ ہو جائے۔ میں تو اس دنیا میں انسان اور اس کے گناہوں کو آباد کرنے پر اسے مچھلیوں سے بسانے کو ترجیح دیتا ہوں — میں اسے برداشت نہیں کر سکتا!"

وہ دوبارہ آگے بڑھنے کو ہے کہ نوح داخل ہوتا ہے۔ اُس نے ایک دیہاتی مبلغ کا لباس پہنا ہوا ہے۔ اور اپنی بغل میں ایک کتاب دبا رکھی ہے۔

نوح۔ آداب عرض، بھائی صاحب!

خدا۔ آداب عرض، بھائی — میں کہہ سکتا ہوں کہ تم ایک شریف آدمی نظر آتے ہو۔

نوح۔ میری کوشش ہے بھائی کہ میں ایسا بن سکوں — میں یہاں پر تبلیغ کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے۔ کہیں نے تمہیں کسی مجلس میں نہیں دیکھا، اسا تھ ساتھ چل دیتے ہیں!

خدا۔ مجھے یہاں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا اور اس دوران میں میں بہت مصروف رہا ہوں۔

نوح۔ جی ہاں۔ ہر شخص یہی کہتا ہے کہ وہ بے حد مصروف ہے۔ کیا وہ مذہبی مجلس میں شرکت کے لئے بھی وقت نہیں نکال سکتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جتنی زیادہ محنت سے میں تبلیغ کرتا ہوں، اُسی قدر زیادہ ملامت واقع لوگوں میں پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ عبادت گاہ میں حمد گانے والوں کی ہی تعداد پوری نہیں ہوتی! اور مجھے وعظ کہنے کے علاوہ گانے کا فرض بھی خود ادا کرنا پڑتا ہے۔

خدا۔ سچ!

نوح۔ جی ہاں — یہاں تو ہر شخص بے حد مصروف ہے۔ شراب، جوا اور بجانے کیا کیا مصروفیات ہیں تم ذرا صبر تو کرو — جبرئیل کو صور پھونکنے دو اور پھر دیکھو گے کہ دوزخ میں ان کے لئے عذاب حاصل کرنے کو کتنا وقت نکلتا ہے — سمجھے جناب؟

خدا۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ اُن کی صحت تو بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔

نوح۔ صاحب، صحت تو سب کی اچھی ہے لیکن اسے کیا کریں کہ وہ سب نکمے، سست، کمینے اور گنہگار ہیں — تم بھی واعظ ہی معلوم ہوتے ہو بھائی — کیوں؟

خدا۔ کچھ ایسا ہی ہے۔

نوح۔ گرد و نواح کے علاقے میں سفر کر رہے ہو شاید؟

خدا۔ ہاں میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تمہاری قوم کا کیا حال ہے — میں تمہاری رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔ ان کی حالت بہت مایوس کن ہے اور تمہارا حوصلہ پست کرنے کے لئے بہت کافی!

نوح۔ یہ درست ہے لیکن مجھے اپنا فرض بہر صورت انجام دینا ہو گا — تمہیں کہاں جانا ہے بھائی!

خدا۔ فی الحال تو جدھر پاؤں اٹھتا ہے چل دیتا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ اگلے گاؤں میں جاؤں۔

نوح۔ کافی دور ہے یہاں سے — خیر یہ میرا مکان آ گیا (رُک کر) اگر تم آج رات کھانا یہاں کھا کر میری عزت افزائی کرو تو کیسا رہے۔ میرا خیال ہے کہ میری بوڑھی بیوی نے آج رات چوزہ پکایا ہے۔

خدا۔ اوہ! — تم بہت نیک دل ہو بھائی! — شاید میں ابھی تک تمہارا نام نہیں جانتا۔

نوح۔ نوح — صرف نوح، بھائی! — یہ میرا گھر ہے۔ بے تکلف اندر چلے آؤ!

نوح اور خدا، نوح کے گھر کی طرف چل دیتے ہیں جو پن چکی کے قریب نظر آ رہا ہے۔ سٹیج پر تاریکی چھا جاتی ہے — منظر تبدیل ہو جاتا ہے۔

آٹھواں منظر

خدا اور نوح۔ نوح کے کمرے میں جو کھانے اور سونے دونوں کا کام دیتا ہے نظر آتے ہیں۔ کمرہ صاف اور خوشنما ہے۔ میز پر چارخانے کا میز پوش ہے۔ نوح کی بیوی (ایک بوڑھی، سیدھی سادی جیش، صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے) انہیں وہاں ملتی ہے۔

نوح کی بیوی ایک اور مبلغ کو کھانے پر مدعو پا کر بہت خوش ہوتی ہے ہر چیز تیار ہے۔ چوزا رکابی میں رکھا ہے۔ کچھ دیر نہیں۔ وہ سام، حام اور یافث کو آواز دیتی ہے۔

"یہ ہمارے بچے ہیں" نوح کی بیوی کہتی ہے "یہ سب کافی دور ایک علیحدہ مکان میں رہتے ہیں لیکن اتوار کو ہم سب رات کا کھانا

اکٹھے کھاتے ہیں۔"

خدا نوح کی بیوی سے بہت خوش ہوتا ہے۔ وہ نوح کے گھر کو بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ سچ پوچھو تو وہ بے تکلف بھی بہت ہو جاتا ہے۔ اور نوح کو اپنے دس دس آنے والے سگاروں میں سے ایک پیش کرتا ہے۔ پھر وہ سنجیدہ گفتگو چھیڑ دیتے ہیں۔

خدا۔ آخر نوح، بنی نوعِ انسان میں سب سے بڑی خرابی کیا ہے؟

نوح۔ بھئی جہاں تک میرا خیال ہے، سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ کرۂ زمین بہت وسیع ہے۔ اب تم جانتے ہو کہ اس سے انسان تن آسان ہو جاتا ہے۔ اور اپنا تمام وقت لڑنے جھگڑنے، فضول بکواس، جوئے اور شراب نوشی میں ضائع کر دیتا ہے۔

خدا۔ اور، عورت — اس کا کیا حال ہے؟

نوح۔ کچھ نہ پوچھو۔ عورتیں تو مردوں سے بھی گئی گذری ہیں۔ اگر وہ عشق بازی سے باز آتی ہیں تو جوئے کے ٹکٹوں کے لئے روپیہ قرض لینے یا چرانے کے لئے نکل کھڑی ہوتی ہیں — ابھی پچھلے سے پچھلے اتوار کا ذکر ہے کہ میں گرجے میں عبادت شروع ہونے سے ایک گھنٹہ پیشتر پہنچ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک عورت منبر کا کپڑا چرانے کی کوشش کر رہی ہے ان میں اخلاق تو نام کو بھی نہیں صاحب۔ اب تم وہ واقعہ ہی لے لو جو گذشتہ ماہ ایسٹ پٹنی میں رونما ہوا۔ اس نوجوان۔ ولی ردبک کا معاملہ —

خدا وہ کیا تھا؟

نوح۔ ایک لڑکا تھا وہاں، سترہ سال کا — وہ اپنی چچی کے ساتھ بھاگ کھڑا ہوا۔ اب دیکھئے نا۔ ایسی باتیں ہمسایہ علاقے کے لئے تو بہت برا اثر رکھتی ہیں نا؟

خدا۔ بے شک — بے حد زہریلا اثر!

نوح۔ جی ہاں۔ یہ بہت اچھی قوم ہوا کرتی تھی کبھی۔ میں انہیں سدھارنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہوں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جتنا میں انہیں انسان بنانے کی کوشش کرتا ہوں، اسی قدر جانوروں سے بھی بدتر ہوتے جا رہے ہیں — خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس دنیا کا کیا بنے گا

خدا۔ یہ سچ ہے!

یکایک نوح کو اپنے گھٹنے میں ٹیس محسوس ہوتی ہے۔ وہ اسے بارش ہونے کا شگون تصور کرتا ہے۔ خدا کو بھی نوح کی رائے سے اتفاق ہے — ایک ایسی بارش ہوگی، وہ کہتا ہے، جو اس علاقے میں پہلے کبھی نہ ہوئی ہو!

"اگر متواتر چالیس دن اور چالیس رات بارش ہوتی رہے تو تم اُسے کیا کہو گے؟"

"میں اُسے ایک "مکمل بارش" کے نام سے موسوم کروں گا۔" نوح جواب دیتا ہے۔"

"نوح! — تم نہیں جانتے میں کون ہوں — جانتے ہو کیا؟"

"تمہارا چہرہ بہت پر سکون ہے۔ — لیکن میرا خیال نہیں کہ میں تمہیں جانتا ہوں۔"

اس وقت خدا خاموشی سے اٹھتا ہے اور اپنے پورے قد پر پہنچ کر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے۔ بجلی گرتی ہے! بادل کی خوفناک گرج دل دہلا دیتی ہے — ایک لمحے کے لئے سٹیج پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ جب دوبارہ روشنی ہوتی ہے تو نوح خدا کے سامنے دوزانو نظر آتا ہے۔

"مجھے پہچان لینا چاہئے تھا تجھے — اے پروردگار!" بوڑھا نوح کہہ رہا ہے "مجھے تیرا جلال نظر آ جانا چاہئے تھا! میں محض ایک بوڑھا ملنگ نوح ہوں — خداوندا! تیرا ناچیز بندہ — میں کچھ بھی نہیں ہوں لیکن تو نے مجھے سب کچھ بخش دیا ہے۔"

طوفان کے متعلق خدا کی تدابیر مکمل ہو چکی ہیں۔ تمام بنی نوع انسان میں سے صرف نوح اور اس کے کنبے کو بچایا جائے گا۔

"میں تمہیں نابود نہ ہونے دوں گا، نوح" خدا کہتا ہے "تم، تمہارا کنبہ تمہارے مویشی اور وہ تمام جاندار جو انسان نہیں ہیں بچا لئے جائیں گے — لیکن باقی سب کچھ تباہ کر دیا جائے گا [اپنی جیب سے کاغذ اور پنسل نکالتا ہے] سنو! نوح! [نوح سیدھا ہوتا ہے اور خدا کے شانے کی طرف دیکھتا ہے] میں چاہتا ہوں کہ تم ایک کشتی بناؤ۔ اس کا نام کشتیِ نوح رکھا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی شکل ایسی ہو [وہ کاغذ پر تصویر بناتے ہوئے گفتگو جاری رکھتا ہے] میں چاہتا ہوں کہ تم ہر چرند اور پرند کا جو اس ملک میں پایا جاتا ہے — ایک ایک جوڑا لے کر اس کشتی میں رکھ لو۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم ہر قسم کے بیج اور پودوں کی شاخیں بھی رکھ لو کیونکہ ایک نہایت تباہ کن طوفان آنے والا ہے ایک ایسا سیلاب جو ہر شے کو فنا کر دے گا — سمندر میں تیرنے والا کوئی جہاز اس طوفان کی زد سے نہ بچ سکے گا۔ ہر چیز کو فنا ہونا پڑے گا۔ ہر چیز کو! ہر اس چیز کو جو میں نے اس خوبصورت

دنیا میں بنائی ، ماسوا ایک کے — اور وہ نوح ! تم اور تمہارا کنبہ اور وہ جانور جو میں نے تمہیں بتائے ہیں تم کشتی میں بیٹھ کر سیلاب سے بچ جاؤ گے۔ یہ سب اِسی طرح ہوگا نوح !"

نوح کو جانوروں کے متعلق کچھ تشویش ہے۔ تمام جانوروں کے جوڑے جمع ہوکر بھی خاصی سردردی کا باعث بن جائیں گے اور پھر خاص طور پر ہر قسم کے سانپ کا ایک جوڑا ۔ اور اگر ہر قسم کے سانپ کشتی پر رکھنے ہی ہوں گے تو بہتر ہوگا کہ وہ ایک پٹیارا بھی اپنے ساتھ لیتا جائے اور سانپوں کو ان میں بند کردے۔ خدا اس رائے سے اتفاق کرتا ہے۔ نوح کہتا ہے کہ دو ٹھیک رہیں گے۔ ایک کشتی کے اس سرے پر اور دوسرا دوسرے سرے پر، تاکہ وزن قائم رہ سکے۔ لیکن خدا ایک پیپا پے جانے پر مصر ہے۔ نوح صرف ایک پیپا لے جاسکے گا جو وہ کشتی کے درمیان میں رکھ دے گا!

نوح کی بیوی کھانا لاتی ہے — دور سے بادل کے متواتر گرجنے کی آواز آتی ہے۔ نوح اور خدا اپنی اپنی کرسیاں میز کے قریب لے آتے ہیں۔

منظر معدوم ہو جاتا ہے!

منظر نواں

نوح اور اس کے بیٹے سام، حام اور یافث کشتی بنانے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ پہاڑی کے دامن میں گاؤں کے حسد۔ لوگ حیرت اور استعجاب سے انہیں دیکھ رہے ہیں۔ نوح کو کہیں سے جہاز ران کپتان کی وردی مل گئی ہے جو وہ پہنے ہوئے ہے وہ خود تو کام نہیں کر رہا بلکہ صرف حکم دینے پر اکتفا کرتا ہے۔

مجمع، خصوصاً عورتیں نوح سے مذاق کر رہی ہیں بعض لوگ اسے سودائی خیال کرتے ہیں لیکن وہ ان سب سے بے پروا اپنے کام میں مشغول ہے۔

جانوروں کے آنے کا وقت بھی قریب آرہا ہے اس لئے حام کو چاہیئے کہ وہ انہیں دامن کوہ سے جاکر لے آئے۔ اتنے میں زیبا اپنے نئے آشنا لڑکے کو لئے وہاں پر پہنچ جاتی ہے۔ یہ لڑکا دراز قد، بدصورت اور سیاہ فام ہے۔ یہ بھی نوح کو دیوانہ خیال کرتا ہے۔ بعض دانا لوگ بھی کشتیاں بنانے میں مصروف ہیں مگر ان کا خیال ہے کہ اگر بارش ہوئی بھی تو نوح کے کہنے کے مطابق پانی اتنی بلندی تک پہنچ سکے گا۔

قابیل ششم اور حواری لڑکے بھی ہجوم میں آکر مل جاتے ہیں۔ وہ سب کے سب بہت خوش و خورم ہیں۔ زیبا جو بھی قابیل کو دیکھتی ہے، موقع کی نزاکت کو تاڑ جاتی ہے اور اپنے نئے آشنا کو آگاہ کردیتی ہے کہ قابیل کے پاس ریوالور ہے۔ لیکن قابیل زیبا کی تردید کرتا ہے اور ریوالور بڑھا دیتا ہے۔ آشنا لڑکا ریوالور کو پکڑنے کے لئے آگے بڑھتا ہے تو قابیل چپکے سے چاقو نکال کر اُس کی پشت میں پیوست کردیتا ہے۔

"لوگو! زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں"۔ وہ یہ کہہ کر زیبا کو اپنے بازوؤں میں لے لیتا ہے "میں نے اپنا راستہ صاف کرلیا ہے"!

لڑکے کا مردہ جسم زمین پر پڑا ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اسے دفن کرنا ضروری نہیں کیونکہ اس جگہ بھلا آتا ہی کون تھا اور پھر وہ لڑکا تھا بھی کونسا بڑا آدمی!

بارش شروع ہو جاتی ہے۔ نوح منتظر ہی تھا۔ لیکن اس کا دل دکھتا ہے کہ کاش دوسرے لوگ عبرت پکڑیں اور توبہ کرلیں۔

لوگوں نے بارش کو معمولی چھینٹے جانا اور مجمع منتشر ہونے لگا۔ پہاڑی کے دامن میں چوپائے اکٹھے ہو رہے ہیں۔ حام نے آکر کہا کہ جونہی ان جانوروں کو کشتی میں لادنے کے انتظامات مکمل ہو جائیں گے تو وہ انہیں جاکر لے آئے گا۔

نوح بہ آوازِ بلند پکارتا ہے۔

"خدا نے اپنا نشان دکھادیا۔ جانوروں کو فوراً سوار کردو — خدائے قہار اب دنیا کو غرق کرکے ہی رہے گا"۔

حام کا چابک ہوا میں گونجتا ہے۔ جانور کشتی میں سوار ہو رہے ہیں!

پس منظر میں گانا سنائی دیتا ہے۔ تاریکی چھا رہی ہے۔ گانے کی آواز آہستہ آہستہ بارش کی بوندوں میں گم ہو جاتی ہے!

دسواں منظر

کشتی سمندر میں جا رہی ہے۔ سمندر کی لہریں ساکن ہیں۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی چھائی ہے۔ صرف کشتی پر تھوڑی سی روشنی پڑ رہی ہے۔ سام کشتی پر بیٹھا پائپ پی رہا ہے۔ حام بھی بھائی کے پاس آن بیٹھتا ہے۔ سام پوچھتا ہے۔

"بھیا! یہ سفر کب تک جاری رہے گا؟"

"خدا جانے کب تک۔ ابا کہتے ہیں کہ بارش چالیس دن اور چالیس رات متواتر ہوتی رہے گی۔ اس کے بعد شاید ہم کہیں کنارے لگ جائیں۔ جانے بارش کب تھمے"!

تیسرا بھائی یافث بھی ان میں آن ملتا ہے اور کہتا ہے کہ بوڑھے ابا نے کہا ہے کہ اُس نے خواب میں کشتی کو کنارے لگتے دیکھا ہے۔ لیکن یہ خواب ہی خواب تھا — نوح کی بیوی، نوح سے ناراض ہو رہی ہے۔

"دیکھو بیٹو! تمہارے ابا تو شراب سے مخمور ہیں"۔ وہ غصے سے حکم دیتی ہے "کشتی کھینا چھوڑ دو!"

"لیکن وہ تو کہتے ہیں کہ انہیں خدا کا یہی حکم ہے"!

"لیکن میرا یہی حکم ہے۔ وہ تو دیوانہ ہو رہا ہے" نوح بھی آہستہ آہستہ نیچے سے اوپر آتا دکھائی دیتا ہے۔ بیوی کی حقارت آمیز نگاہوں کے باوجود وہ اپنا اثر ڈالتا ہے۔

نوح۔ کشتی کا اب محافظ کون ہو؟

بیوی۔ کوئی ہنگامہ ــ تمہیں کیا؟

نوح۔ تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں!

بیوی۔ تم تو اتنی پی گئے ہو کہ اب آپے سے بھی باہر ہو رہے ہو۔

نوح۔ میں آپے سے باہر نہیں ہو رہا بلکہ تم ـــــ

وہ جانتا ہے کشتی کا کھویا خود خدا ہے!

نوح کہتا ہے کہ ایک فاختہ اڑا دی جائے اور سام جا کر ایک فاختہ لے آتا ہے۔ حام بانس سے پانی ناپتا ہے اب پانی کم ہوتا جا رہا ہے۔ مشرق کی طرف روشنی دکھائی دیتی ہے دور سے کورس میں حمد گانے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔

"زمین! ــ خدا نے ہمیں کنارے لگا دیا ــ سام تم آگ لا کر جلاؤ اور سینکو۔

حام بیٹا تم بھی اپنے بھائی کی مدد کرو!"

فاختہ زیتون کی تازہ پتی لئے واپس آتی ہے۔ نوح اُسے کشتی کے نچلے حصے میں بھیج دیتا ہے تاکہ وہ دوسرے جانوروں کو بھی یہ مژدہ جانفزا سنا آئے۔ کشتی کے مکیں سب خوش خوش ہیں اور نوح کی بیوی اپنی گفتگو پر نادم ہو رہی ہے۔

"میں اس طویل عرصے میں بہت اکتا گئی تھی نوح!" وہ معذرت چاہتی ہے۔

"مجھے امید ہے کہ تم مجھے معاف کر دو گے!"

"کوئی بات نہیں!" نوح کہتا ہے۔

پانی غائب ہو جاتا ہے لیکن کشتی پھر پہاڑی کے دامن میں نظر آتی ہے۔ دُور ــ پس منظر، پہاڑ دھند میں سے نظر آنے لگتے ہیں کشتی کے اوپر قوس قزح نمودار ہوتی ہے!

نوح جنگلے سے سہارا لئے قدرت کی اس نیرنگی کی شان میں زیر لب کہہ رہا ہے:

"تیرا شکر ہے پروردگار ــ لاکھ، لاکھ شکر!"

وہ یہ کہہ ہی رہا ہے کہ خدا اُس کے قریب نمودار ہوتا ہے۔ وہ نوح کو کشتی کی کامیاب اور بخیریت واپسی پر مبارکباد دینے آیا ہے۔ وہ اُن کی شراب نوشی اور متبدل گفتگو کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

"میرا خیال ہے کہ تمہاری طرح کے ایک جہاز ران کو جو اس قدر لمبے سفر کے لئے نکلا ہو کچھ مشورے کی ضرورت تھی تاکہ وہ پریشان نہ ہو جائے!"

"شکریہ خداوندا ــ اب کیا ارشاد ہے؟"

"تمام جانور بخیر و عافیت ہیں؟"

"ہر طرح سے تندرست اور صحت ور!"

"تو پھر میں چاہتا ہوں کہ تم دائیں ہاتھ کے تختے کا دروازہ کھول دو اور انہیں پہاڑی کے دامن میں آزاد کر دو ــ اور تم اور تمہارا کنبہ تمام بیج اور پودوں کی شاخیں لے کر کاشت کرے۔ میں سب کچھ از سر نو شروع کرنا چاہتا ہوں، نوح!"

نوح باہر چلا جاتا ہے۔ خدا اپنے ارد گرد نظر ڈالتا ہے۔

"اب ــ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے!"

خدا مسکرا رہا ہے۔ وہ جانوروں کے باہر نکالے جانے کا شور سنتا ہے چابک کی آوازیں اور کشتی میں سوار آدمیوں کی چیخ پکار سنائی دیتی ہے ــ "اُس طرف لے جاؤ" "ذرا آرام سے کام کرو" ــ "قطار میں رکھنا نہیں" ــ اس طرح کی ملی جلی آوازیں آتی ہیں ــ پروں کے پھڑپھڑانے کا شور پیدا ہوتا ہے۔

"اب ٹھیک ہوا ــ اے آوارہ پرندو! تمہیں نئے آشیانے بنانے ہوں گے!"

پرندوں کی چہچہاہٹ کا شور بلند ہوتا ہے ــ خدا کچھ دیر سنتا رہتا ہے اور پھر اپنا ایک بازو جنگلے پر رکھ کر آرام سے کھڑا ہو جاتا ہے۔

وہ آہستہ سے کہتا ہے ـــــ

"جبرئیل ــ ایک منٹ کے لئے آسکو گے!"

جبرائیل نمودار ہوتا ہے۔

"خداوندا!"

کشتی کے دوسرے سرے سے آنے والی آوازیں دب جاتی ہیں خدا ہاتھ اٹھا کر نئی دنیا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

خدا۔ دیکھو ــ یہ ہو گیا!

جبرئیل۔ [ادب سے لیکن متاثر ہوئے بغیر] میں دیکھ رہا ہوں۔

خدا۔ ہاں! ــ از سرِ نو ابتدا ہو گی!

جبرئیل۔ ہاں خداوند۔

خدا۔ [چونک کر اُسے دیکھتے ہوئے] معلوم ہوتا ہے کہ تم اس سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوئے۔

جبرئیل۔ ہاں خداوند، مگر ــ [جھجکتا ہے]۔ آخر مجھے اس سے کیا غرض ــ یہ میرا کام بھی تو نہیں!

خدا۔ کیا؟

جبرئیل۔ میرا مطلب ہے کہ میں اس بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں رکھتا۔

خدا۔ مجھے معلوم ہے تمہیں علم نہیں ــ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ تم اسے دیکھو [اُسے ایک دم کچھ خیال آتا ہے] ہاں، ہاں تمہیں اس سے کیا مطلب آخر؟ ــ یہ میرا کام ہے۔ یہ میرا تخیل تھا ــ اور اس کا ہر جزو میرا اپنا کام ہے کسی اور کا نہیں! یہ سب بوجھ میرے اپنے کاندھوں پر ہے

—— اور مجھے یقین ہے کہ اسی لئے ہیں اِن لمحات میں اس درجہ سنجیدہ اور متین ہوں —— تم جانتے ہو کہ یہ ایک نہامہ معمہ بن گیا ہے۔ میرے لئے

جبرئیل۔ (حلیمی سے) لیکن یہ سب کچھ ٹھیک تو ہے خداوند —جیسا آپ نے چاہا ویسا ہو گیا!

(خدا ایک گہری آہ بھرتا ہے۔ آہستہ سے دائیں اور بائیں دیکھتا ہے اور پھر نرمی سے کہتا ہے)

میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اب دوبارہ یہ سب کچھ ٹھیک طرح سے ہونا ہے!

[پردہ گرتا ہے]

دوسرا حصّہ

دو خادمائیں خدا کا دفتر صاف کر رہی ہیں اور اسی دوران میں باتیں بھی کرتی جا رہی ہیں۔ باہر سے بھنبھناہٹ کا مسلسل شور اور دُور، فاصلے سے خوفناک گرج کی آواز متواتر سنائی دے رہی ہے — یہ آوازیں آہستہ آہستہ ایک بلند ہوتے ہوئے نغمے میں دب جاتی ہیں، جو پس منظر میں پیدا کیا جا رہا ہے۔

گرج کی دبی ہوئی آواز دور سے سنائی دیتی ہے لیکن اس کا مطلب کسی پر قہر کی خبر ہے۔ ناشتے سے لے کر اس وقت تک خدا زمین اور اس پر بسنے والے ناپاک انسانوں پر چھپالیس مرتبہ تباہ کن بجلیاں پھینک چکا ہے۔

خدا کبھی اس قدر نہیں جھلایا تھا — اپنے دنیا کے سفر اور اس میں بسنے والے اُن آدمیوں کے معائنے کے دوران میں بھی نہیں! جن کی مثال اس غلاظت کی سی ہے جو پانی پر تیر رہی ہو۔ ایک کہتی ہے۔

"جہاں تک میں جانتی ہوں انہیں اُن کی مانگی مراد مل رہی ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ میرا بھائی زمین پر ایک دلی کو یہاں لانے کے لئے گیا۔ اس نے جو کچھ دیکھا اُس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر شیطان کی حکومت ہے اور تمام انسان اس کے مطیع ہو گئے ہیں"۔

چونکہ زمین کے ناگفتہ بہ حالات کو سدھارنے کے لئے خدا کو بے حد مصروفیت تھی اور گذشتہ چند دن وہ بہت دیر تک اپنے دفتر میں بیٹھا کام کرتا رہا تھا اس لئے دفتر کی صفائی کی ضرورت محسوس کی گئی۔ صفائی کرنے والیوں کا خیال ہے کہ خدا کا دفتر بہت آراستہ اور خوبصورت ہونا چاہئے لیکن اس لحاظ سے خدا کچھ قدامت پسند واقع ہوا ہے۔

ایک کہتی ہے "یہ جگہ تو اُس وقت قابلِ دید ہوتی ہے جب خداوند یہاں کسی ضروری مطالعے میں محو ہو۔ بہشت میں ہر چیز اس قدر پرشوکت اور پُر تکلف ہے کہ وہ کبھی کبھی اس سے اُکتا کر سادگی کی تلاش میں یہاں آن بیٹھتا ہے"۔

دوسری اپنے بارے میں کہتی ہے

"یہی حال میرا ہے۔ میرا جی بھی بعض دفعہ یہی چاہتا ہے کہ خدا کا دفتر دیکھوں اور میں صفائی کرنے یہاں آجاتی ہوں"۔

اُن کا کام ختم ہونے کو ہے۔ خدا داخل ہوتا ہے۔ جبرئیل اُس کے پیچھے پیچھے ہے۔ وہ آج صبح بے حد مصروف رہے تھے جبرئیل کے حساب کے مطابق کل بجلیوں کی تعداد اٹھارہ ہزار نو سو ساٹھ نکلتی ہے!

"ان میں جو نسلی قوم کا گاؤں بھی شامل ہے۔ اُن کی تعداد یقیناً جلد بڑھ جائیگی"۔

"وہ مجھے بہت بُرے لگتے ہیں۔ وہ مجھے بے حد بُرے لگتے ہیں!"

خدا متانت سے کہتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ بادل کی کڑک اور بجلیوں سے کام نہیں نکلے گا۔ اکثر اوقات خدا کو بعض معاملات اپنے ہاتھ میں لینے پڑتے ہیں مثلاً خدا اس وقت ایک چھوٹے شخص کی طرف انگلی اٹھا رہا ہے۔ یہ شخص زمین پر ایک بھولی بھالی لڑکی سے شادی کا جھوٹا وعدہ کر رہا ہے —"او خدا!" کی ایک ہلکی سی نسائی چیخ جو زمین سے آتی ہے۔ اس اثر کو ظاہر کرتی ہے جو خدا کے کسی انسانی کام میں دخل سے پیدا ہوتا ہے۔

خدا کا حوصلہ ٹوٹ گیا ہے۔ لیکن وہ جبرئیل کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا کہ پہلے سیلاب کی طرح دنیا کو پھر تباہ کر دے۔

"سیلاب سے کس قدر فائدہ ہوا یہ تو تم دیکھ ہی رہے ہو — آج کے دن بھی دنیا کی وہی حالت ہے جو ہمیشہ سے چلی آرہی ہے!"

اور نہ وہ انسان کو دنیا سے مٹا کر وہاں کوئی اور جاندار آباد کر سکتا ہے کیونکہ یہ اس کے اعترافِ شکست کے مترادف ہے۔

خدا۔ نہیں! یہ نہیں ہو سکتا۔ انسان سے مجھے ایک قسم کا اُنس ہو گیا ہے۔ اور اس کی فلاح کی کوشش سے ہاتھ اٹھا لینا مجھے منظور نہیں — بہر حال، اندرونی یا کسی اور طریقے سے انسان کو درست تو کرنا ہی ہو گا —— آخر میں اس جھنجھٹ میں سرے سے پڑا ہی کیوں!

جبرئیل۔ یہی تو ایک جھگڑا ہے جس کے متعلق پریشان ہوتے ہوئے میں آپ کو نہیں دیکھ سکتا، خداوند!

خدا۔ جبرئیل۔ ایسی تو کوئی چیز بھی نہیں جو کسی کے لئے کسی نہ کسی تفکر کا باعث نہ ہو۔ میں نے تمہارے سامنے کبھی اپنی اُن مشکلات کا ذکر نہیں کیا جو زمین اور آسمان کے کاروبار چلانے میں مجھے پیش آتی ہیں —— یہ

ایک لمبی کہانی ہے! جس قدر زیادہ عرصہ میں مسندِ خدائی پر بیٹھتا ہوں اُسی قدر زیادہ محنت سے مجھے کام کرنا پڑتا ہے ۔ زیادہ تو مجھے حالات کو سنبھالنا پڑتا ہے اور اس کے لئے دماغی کاوش اور وقت درکار ہے۔ انسان میں سب سے زیادہ خرابی یہی ہے کہ مجھے اس پر اپنا بہت سا وقت ضائع کرنا پڑتا ہے ۔ اُسے چاہیئے کہ وہ خود بھی کبھی اپنی مدد کر لیا کرے ۔ [وہ رُکتا ہے اور خیالات میں ڈوب جاتا ہے]

اوہ! اوہ مارا! ۔۔۔ میں سمجھ گیا!

جبرئیل ۔ کیا سمجھ گئے آپ خداوند؟

خدا ۔ کتنی اچھی تدبیر! ۔۔۔ کتنی اچھی تدبیر سوجھی ہے مجھے!!

جبرئیل ۔ مجھے بھی بتلایئے نا، خداوند؟

خدا ۔ جبرئیل ۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ بنی نوع انسان میں اچھے اچھے لوگ بھی پیدا ہونے لگے ہیں۔

جبرئیل ۔ بجا ارشاد ہے خداوند۔

خدا ۔ ذرا ابراہیم اور اسحاق ہی کو لو اور ان کی اولاد سے یعقوب اور اس کے بیٹے۔

جبرئیل ۔ خداوند!

خدا ۔ کتنے اچھے تھے یہ لوگ ۔

جبرئیل ۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ آج ہمارے ساتھ بہشتِ بریں میں اُڑتے پھر رہے ہیں ورنہ ۔

خدا ۔ کیا کہا تم نے؟

جبرئیل ۔ کیوں بارِ الٰہا!

خدا ۔ جب تک انسان تمہاری طرح رہا تو باغِ عدن میں آرام اور سکھ تھا ۔ وہ رات دن فرشتوں کی طرح بے کار رہتا تھا لیکن جوں ہی میں نے اُسے تھوڑا سا اختیار دیا تو بس وہ ۔۔۔ (وقفہ) ۔۔۔ ہاں، مجھے یاد آیا، ۔۔۔ میں ایک نیا تجربہ کرنا چاہتا ہوں!

جبرئیل ۔ (اشتیاق سے) نیا تجربہ ۔ خداوند، وہ کیا!

خدا ۔ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا ۔۔ تم جا کر ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کو بھیج دو۔

خدا نے جبرئیل کو مشورہ دیا کہ اگر وہ چاہِ ظلمات کے پاس سے گذرے تو وہ کنارے پر جھک کر شیطان سے کہتا جائے کہ اُس نے نافرمانی کر کے لعنت کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا ہے۔

جبرئیل کو خدا کا یہ پیغام سن کر خوشی ہوئی اور اُسے موقع مل گیا کہ وہ شیطان کے منہ پر پھٹکار ڈال سکے گا۔

خدا کو تھوڑا سا وقفہ مل گیا ہے ۔ جب تک ابراہیم اور اسحٰق نہیں آتے وہ معجزہ دکھائے گا۔ سورج کی گرمی زیادہ ہو رہی تھی ۔ اس نے ایک بادل کو پیدا کیا جس نے سورج پر چھا کر اُس کی تمازت کو مدھم کر دیا۔

میرے بندو! جونہی ابراہیم اسحاق اور یعقوب آرام سے کرسیوں پر بیٹھ گئے تو خدا نے کہنا شروع کیا "میں تم سے ایک تجویز کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں ۔ بات کچھ ایسی ہے کہ اُس کا اثر تمہارے خاندان اور اولاد پر پڑے گا اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ تم سے بھی مشورہ کر لوں ۔ تم سے میں بہت خوش ہوں کیونکہ تم نے میرے منشا کو پورا کیا ہے ۔ میرے پیغام کو دنیا میں پہچاننے کے لئے تم کو مصائب کا سامنا کرنا پڑا ۔ مگر تم کامیاب نکلے ۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ایک قطعۂ زمین پسند کر لو تاکہ تمہاری اولاد کو میں وہ جگہ بخش دوں ۔۔ باقی دنیا جائے بھاڑ میں! ۔ تمہاری فرمانبرداری کا صلہ تمہاری اولاد ہی کا حق ہے ۔ تم دنیا سے خوب واقف ہو گے اس لئے جو جگہ تمہیں پسند ہے مجھے بتا دو ۔ ہاں تم سوچ سکتے ہو تاکہ انتخاب لاجواب ہو! (وقفہ)۔

ابراہیم ۔ خداوندِ قدیر! میں تو کنعان کو پسند کروں گا۔

خدا ۔ (اسحٰق اور یعقوب سے) تمہاری کیا رائے ہے۔

یعقوب ۔ (اسحٰق کا اشارہ پا کر) ہمیں بابا جان کی رائے سے اتفاق ہے۔

خدا ۔ (کھڑکی کے قریب جا کر باہر دیکھتا ہے) سرزمین کنعان! ۔۔ اچھی جگہ ہے میں اُسے تمہارے لئے وقف کر دوں گا (پھر اپنی جگہ پر آن بیٹھتا ہے) لیکن تمہارا جانشین کون ہو گا ۔۔ یہ ظرف تمہارے خاندان تک محدود رہ!

اسحٰق ۔ باری تعالیٰ ۔۔۔ جانشین کیسا ہو؟ مقدس یا صاحبِ فراست؟

خدا ۔ مقدس، فراست میں اُسے خود دے دوں گا (تینوں خدا کی اس دین کا شکریہ ادا کرتے ہیں)

اسحٰق ۔ (ابراہیم اور یعقوب سر سے اثبات میں اشارہ کرتے ہیں) خداوند! میری نسل کا آخری بیٹا اس قابل ہے کہ تو اُسے انتخاب کرے۔

خدا ۔ وہ کہاں ہے؟

اسحٰق ۔ اے عالم الغیب، وہ اس وقت مدین میں گلہ بانی کر رہا ہے ۔ مصر میں اس سے تھوڑی سی بات ہو گئی تھی ۔ ایک مصری نے ہمارے خاندان کے ایک شخص کو گالی دی ۔۔۔ فرعونِ مصر نے ہمارے خاندان کو اس قدر ذلیل کر رکھا تھا کہ ہمارے خاندان کو گالی دینا معمولی بات تھی مگر ہمارا وہ غیور بیٹا بھڑک اٹھا اور اُس نے مصری کو مار ڈالا۔

خدا ۔ ہاں میں نے سنا تھا ۔۔ (غضب ناک ہو کر) لیکن انہیں ذلیل کس نے کیا! ۔ ان کی بُری عادات نے (سب کے سر شرم سے جھک جاتے ہیں) لیکن اب میں انہیں نجات دوں گا ۔ وہ کنعان کے مالک ہوں گے۔

اُن کا نجات دہندہ کون ہوگا — موسیٰ، تمہاری نسل کا آخری بیٹا اور تمہارا جانشین!

اسحٰق۔ بے شک خداوند!

خدا۔ [مسکراتے ہوئے] میں اس کو ایک عرصے سے دیکھ رہا ہوں۔

ابراہیم۔ خداوندِ کریم۔ تو ہمارے خاندان پر کس قدر مہربان ہے اور اس کو کتنی نعمتیں عطا کی ہیں تو نے!

خدا۔ میں نے تمہیں عام دنیا پر فضیلت دی ہے — میں نے تمہیں سرفراز کیا —
اب تم جا سکتے ہو!

[تینوں نہایت عجز و انکسار سے اُٹھتے ہیں اور ان کے لبوں پر خدا کی حمد ہے
"تو ہی سب تعریف کے لائق ہے۔ تیری ہی ہم سب حمد کرتے ہیں۔ تو بڑا مہربان ہے خداوند —"
دور سے نغمے کی آواز سنائی دینے لگتی ہے۔ خدا کھڑے کھڑے ان کو جاتے دیکھتا ہے]

جاؤ! میں نے تمہیں دنیا کا وارث بنایا!

[وہ کھڑکی کی طرف بڑھتا ہے۔ نغمہ مدھم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ کھڑکی سے زمین کی طرف خطاب کرتا ہے]

موسیٰ میں خود زمین پر آ رہا ہوں۔ میرے کلیم! میری مرضی پوری ہو کر رہے گی۔

[سٹیج تاریک ہو جاتی ہے۔ گانا بلند ہوتا جا رہا ہے — جب تک یہ منظر معدوم ہو کر دوبارہ روشنی ہونے سے دوسرا منظر پیدا نہیں ہوتا گانا زور سے گایا جا رہا ہے]

منظر دوسرا

ایک غار کے منہ پر ہری ہری گھاس پر موسیٰ بیٹھا دوپہر کا کھانا کھا رہا ہے جو اس کی بیوی صفورہ لائی ہے۔ موسیٰ کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ ہے صفورہ اس سے کم عمر ہے۔

غار کے قریب تاریکی ہے جس سے دونوں کچھ پریشان سے معلوم ہوتے ہیں۔

تمام فضا پر سورج کی روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ جہاں وہ کھڑے ہیں وہاں بارش کے آثار نظر آ رہے ہیں۔

صفورہ کا خیال ہے کہ شاید خدا نے موسیٰ کو مصریوں کی آمد کی خبر دینے کے لئے یہ نشان دکھایا ہے اور شاید فرعونِ مصر نے موسیٰ کو گرفتار کرنے کے لئے اپنی فوج بھیجی ہے۔

موسیٰ کو اس کا ذرہ بھر بھی خدشہ نہیں کیونکہ خدا خود اس کا محافظ ہے کئی سالوں سے وہ فرعون کی زد سے محفوظ رہا۔ اب وہ اس کو کیسے چھوڑ دے گا اُسے خدا پر پورا بھروسہ ہے۔ جونہی صفورہ لوٹتی ہے تاریکی میں سے خدا خود ظاہر ہوتا ہے اور ایک جھاڑی کے پیچھے سے آواز دیتا ہے۔ اوّلاً اسے موسیٰ اپنے بھائی ہارون کی آواز خیال کرتا ہے لیکن جھاڑی میں سے آگ کے شعلے بلند ہونے لگتے ہیں۔ اب موسیٰ کو یقین ہو جاتا ہے کہ خدا اس سے ہم کلام ہو رہا ہے۔ یہ آگ نہ تھی بلکہ ایک معجزہ تھا۔ خدا نے موسیٰ کو بتایا کہ اُسے بھی معجزہ دکھانے کی اجازت ہے۔ خدا اُسے کہتا ہے کہ وہ مصر میں جا کر اپنی قوم کو نجات دلوائے۔

"موسیٰ [illegible] تب لوگ ہیں۔ فرعون کا ظلم حد سے بڑھتا جا رہا ہے۔ اس لئے
تم اُن کو مصر سے نکال لے جاؤ۔ نیل کا پانی تمہیں راستہ دے دے گا مگر یہ آسان کام نہیں ایک مدت تک تم سرگرداں رہو گے اور پھر —"

"پھر کیا خداوند؟"

"اور پھر تم کنعان کی بستی میں داخل ہو گے۔ وہ بستی ہم نے تمہارے لئے چن لی ہے اور تمہاری قوم سے ہم اُس کا وعدہ بھی کر چکے ہیں!"

"لیکن فرعون مجھے کب اجازت دے گا کہ میں اپنی قوم کو لے جاؤں؟"

"میں جانتا ہوں — معجزہ تمہاری رہنمائی کرے گا!"

موسیٰ چاہتا ہے کہ خدا ہارون کو بھی اس کے ساتھ بھیج دے۔ خود خدا ہی ہارون کا نام تجویز کرتا ہے اور ایک اور معجزہ دکھا کر ہارون کو وہاں اپنے درمیان نمودار کر دیتا ہے۔ خدا دونوں کو بتانا شروع کرتا ہے کہ عصا کا معجزہ کیا ہے — موسیٰ کا عصا لے کر خدا زمین پر ڈال دیتا ہے اور پھر ——

روشنی مدھم ہو جاتی ہے۔ سین معدوم ہو جاتا ہے۔ گانے کی آواز آ رہی ہے!

منظر تیسرا

فرعون کے دربار میں اُس کا تخت — گویا حبشی مذاق کا ایک بڑا سا کمرہ۔ دیوار پر بڑے بڑے شاہی پرچم آویزاں ہیں۔ جن پر مصری نشانات ہیں۔

تخت ایک معمولی قسم کی کرسی ہے جو ایک اونچی جگہ پر رکھی گئی ہے۔ فرعون تخت پر متمکن ہے۔ اس کا لباس اور تاج بالکل ایک حبشی افسر جیسا ہے۔ تخت کے اردگرد سلطنت کے اراکین ہیں۔ اُن کی ٹوپیوں پر چھوٹے چھوٹے پر لگے ہوئے ہیں۔ ان کا لباس فوجی قسم کا ہے۔ کمر میں تلوار لٹک رہی ہے۔ تخت سے کچھ فاصلے پر سپاہی ہاتھوں میں خنجر لئے کھڑے ہیں۔ تخت کے ایک طرف خاص قسم کا لباس پہنے چند لوگ کھڑے ہیں اُن کے چہروں پر ڈاڑھیاں ہیں۔ اُن کا لباس عجیب وضع کا ہے۔ یہ سلطنت کے جادوگر ہیں۔ درباریوں کا لباس گو مختلف ہے۔ مگر زرق برق ضرور ہے۔

فرعون سب سے بڑے جادوگر کو طلب کرتا ہے اور اس سے دریافت کرتا ہے کہ آیا اس کے احکامات کی تعمیل کی گئی۔ جواب میں جادوگر مفصل بیان کرتا ہے کہ کس طرح فرعون کے حکم کی لفظ بلفظ تعمیل کی گئی ہے۔

"اے جادو جبال کے مالک! ہم نے تیرے حکم کی تعمیل میں گذشتہ رات ہزاروں بچے قتل کر دیئے" جادوگروں کا سردار فخریہ بیان کرتا ہے۔

"مرحبا! مرحبا! تم ہمارے حکم کو خوب بجا لائے مگر ہمارا دل ابھی تک خطرہ محسوس کرتا ہے۔ بالکل تراشت کر دو۔ عبرانیوں کو خوب ذلیل کئے جاؤ — عبرانی کتے!"

درباریوں میں ہلچل سی پیدا ہو جاتی ہے۔ سپاہیوں کی روک تھام کے باوجود موسیٰ اور ہارون آگے بڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ دونوں آگے بڑھ کر فرعون کے

سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فرعون گرج کر اُن کے قتل کا حکم دیتا ہے لیکن سپاہی کی تلوار کے بلند ہونے سے قبل ہارون کا ہاتھ بلند ہوتا ہے اور ایک نورانی ہالہ ان کے گرد نمودار ہوتا ہے۔ سپاہی خود بخود پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ فرعون اپنے جادوگروں کو آگے بڑھنے کا حکم دیتا ہے وہ موسیٰ اور اُس کے معجزے کا رد سوچتے ہیں لیکن اُن کی فسوں سازی بیکار ثابت ہوتی ہے۔ وہ مجبور ہو کر صلح پر رضامندی کا اظہار کرتے ہیں۔ فرعون بھی خوش ہے کہ اس کے دربار میں دو اور جادوگروں کا اضافہ ہو گیا۔ وہ اُن سے اپنی رغبت کا اظہار کرتا ہے۔

"مجھے جادوگری سے والہانہ محبت ہے یہی تو اس کے لئے بعض دفعہ خزانوں کے دروازے بھی کھول دیتا ہوں۔ میری بخشش تمہیں بھی مالامال کر دے گی!"

موسیٰ اور ہارون زمین پر عصا پھینکتے ہیں جو اژدہا میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ فرعون اسے شعبدہ بازی سمجھ کر خوش ہوتا ہے لیکن اس قدر خوش بھی نہیں کہ موسیٰ کو اس کی قوم کی آزادی دے دے۔ اور فرعون بھلا عبرانیوں کو کب جانے دیتا ہے۔ کیا عبرانی اس کے غلام نہ تھے؟ — وہ دونوں اپنی قوم کے کراہنے کی آواز جو دربار کے باہر سے آرہی تھی سن رہے تھے۔ لیکن فرعون انہیں آزاد کس طرح کرے — اُس نے کئی مرتبہ انکار ہی کیا تھا۔ نئے معجزے کی ضرورت تھی!

ہارون عصا کو ہوا میں ہلاتا ہے تمام کمرے میں تاریکی چھا جاتی ہے۔ اور بھڑوں کی بھنبھناہٹ سنائی دیتی ہے۔ درباری چیخ پکار سے ہال سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ آخرکار فرعون چلّاتا ہے ——

"یہ شعبدہ بازی روک لو!"

"کیا تم عبرانیوں کو آزاد کر دو گے؟"

"ہاں، ہاں!"

دوبارہ روشنی ہو جاتی ہے بھنبھناہٹ کا شور معدوم ہو چکا ہے۔ فرعون مسکرا رہا ہے۔ اس نے شعبدہ بازوں کو جُل دے کر اُن سے کام نکال لیا۔ وہ بھلا غلاموں کو کیوں آزاد کرنے لگا ——؟

موسیٰ نے دوبارہ معجزہ دکھانے کا عزم کیا۔ ہارون نے پھر عصا اٹھایا۔ تاریکی چھا گئی اور ہال بھڑوں سے بھر گیا۔ درباریوں کے بدن پر اُن کے ڈنک کا اثر ہونے لگا۔ آہ و بکا اور واویلا اس قدر بڑھا کہ مجبور ہو کر فرعون بھی چلّانے لگا۔ ایک بھڑ نے اُسے ناک پر کاٹ کھایا۔ اس لئے اپنی تکلیف کا اُسے زیادہ احساس ہے۔ وہ دوبارہ عاجزی کرتا ہے۔ موسیٰ کے حکم سے بھڑیں جا چکی ہیں۔ فرعون مسکرا رہا ہے —— پھر وہی چال! وہ پھر اپنے قول سے پھر گیا ہے۔ موسیٰ کی آنکھیں ایک سماوی نور سے چمک اٹھتی ہیں۔ وہ غضب ناک ہو کر کہتا ہے۔

"اے بادشاہ! تو بار بار جھوٹ بول رہا ہے — تجھے اپنے قول کا بھی پاس نہیں؟"

"کیا کہا! میں جھوٹ بول رہا ہوں — یہی میرا شعبدہ ہے!"

"اے بادشاہ خدا سے ڈر!"

"کس سے!"

"بنی اسرائیل کے خدا سے!"

"بنی اسرائیل کا خدا!"

"اے بادشاہ، ڈر اس سے جس کا عذاب سخت ہے۔ اور بنی اسرائیل کو جانے دے!"

"تم یہاں تبلیغ کرنے آئے ہو؟"

"اے بادشاہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا ماسوا اس کے کہ عبرانیوں کو چھوڑ دے"

"خاموش! — [موسیٰ کا اشارہ پا کر ہارون عصا اٹھاتا ہے] — اگر تم نے یہ شعبدہ پھر کیا تو میں ——"

"اے خداوند ارض و سما میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا ہے" [ہارون اپنا عصا پھینکتا ہے!

[بجلی کڑکنے کی ہولناک آواز — تاریکی — کئی چیخیں گونج اٹھتی ہیں۔ جب پھر یکایک روشنی ہو جاتی ہے تو بہت سے نوجوان درباری زمین پر بے ہوش گرتے نظر آتے ہیں اور بعض کو دوسرے تھامے ہوئے ہیں]

"یہ تم نے کیا کر دیا! — میرا بچہ کہاں ہے!" [دروازے میں سے چار آدمی ایک لاش کو اٹھائے داخل ہوتے ہیں]

ایک آواز۔ اے مصر کے خدا!

[لاش جب نزدیک لائی جاتی ہے تو فرعون صدمہ کی تاب نہ لا کر کرسی سے گر پڑتا ہے]

"میرا بچہ — میرا لختِ جگر!" [درباری سوگ میں سر جھکا لیتے ہیں]

"خدا کے قہر کو کوئی نہیں روک سکتا۔ اے بادشاہ! اب بھی عبرت پکڑ اور بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے"

"تم انہیں لے جا سکتے ہو ——"

[روشنی مدھم ہونے لگتی ہے۔ منظر غائب ہوا جا رہا ہے۔ دور سے آزادی کا گیت سنائی دے رہا ہے آوازیں بے شمار ہیں —— آہستہ آہستہ روشنی تیز ہوتی ہے اور چوتھا سین نمودار ہوتا ہے!]

منظر چوتھا

گانا ابھی تک جاری ہے اور روشنی کی تیزی کے ساتھ بلند ہوتا جا رہا ہے۔ سٹیج پر بنی اسرائیل کے بچوں کا ایک جمِ غفیر عازمِ سفر ہے — وہ سب گا رہے ہیں۔ اس قافلے میں ہر عمر کے لوگ شامل ہیں۔ اکثر کا لباس پھٹا پرانا ہے مرد کاندھوں پر اپنا اپنا بوجھ اُٹھائے جا رہے ہیں بعض کے پاس ہاتھ گاڑی ہے۔

پچھلی رات کا وقت ہے۔ستاروں کی روشنی سے لوگوں کے چہرے نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔آہستہ آہستہ پو پھٹ رہی ہے۔

موسیٰ ہارون کے بازو کے سہارے آتا دکھائی دیتا ہے۔ دونوں اب بوڑھے ہو چکے ہیں۔اُن کی داڑھیاں لمبی اور بھوری ہیں۔ موسیٰ کچھ مضمحل سا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی ایسا واقعہ ہو گیا ہو — جو پہلے کبھی نہ ہوا تھا اور موسیٰ اس کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اب بوڑھا ہو چکا ہے لیکن اُسے خدا کا وعدہ بھی یاد ہے کہ خدا اسے ضرور ارض موعود دکھائے گا۔ بالآخر وہ کہتا ہے۔

"چالیس برس سے میں تمہاری رہنمائی کر رہا ہوں — میں تمہیں مصر سے باہر نکال لایا تھا۔ میں نے تمہیں سینا کی لق و دق وادی سے نجات دلائی لیکن اب مجھ سے آگے نہیں بڑھا جاتا۔"

ہارون۔ رات بھر یہیں آرام کر لیں، صبح تازہ دم ہو کر آگے بڑھیں گے۔

موسیٰ۔ ہم نے مخبروں کو حکم دے رکھا ہے کہ وہ ہمیں یہاں سے تین میل کے فاصلے پر ملیں۔ اگر ہم وہاں نہ پہنچے تو وہ خواہ مخواہ پریشان ہو کر یہاں تک آئیں گے۔اب اندھیرا ہو رہا ہے۔

ہارون۔ ابھی تو نہیں — بھائی!

موسیٰ۔ اوہ! — میری آنکھیں کمزور ہو گئی ہیں۔

ہارون۔ شاید گرد و غبار کی وجہ سے یوں محسوس ہوتا ہے۔

موسیٰ۔ میری بینائی کم ہوتی جا رہی ہے — خداوند! کیا تیرے بندوں کا رہنما نابینا ہو جائے گا؟ ہارون، تم کہاں ہو؟

ہارون۔ بھائی- میں یہ رہا۔

موسیٰ۔ کیا ابھی تک خدا کا وعدہ پورا ہونے کا وقت نہیں آیا!

ہارون۔ کیوں نہیں بھائی!

[لوگ حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے ہیں]

موسیٰ۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وقت آن پہنچا ہے۔ خدا نے مجھے دریائے یردان کا وعدہ دیا تھا۔ مگر میری قوم نے خدا کا وعدہ توڑا اور چالیس برس تک بھٹکتی رہی۔ میں نے ابھی ابھی مکاشفہ میں دریائے یردن اور وہ بستی دیکھی ہے جس کا خدا نے وعدہ کیا تھا۔

[دور سے خوشی کے نعرے بلند ہوتے سنائی دیتے ہیں]

"قافلے کا سردار — نوجوان یشوع — کہاں ہے، کہاں ہے وہ؟

["یشوع" "یشوع" کی پکار تمام سٹیج پر پھیل جاتی ہے۔ موسیٰ اُسے بلا رہا ہے "کہاں گیا وہ؟" یشوع داخل ہوتا ہے۔ وہ ایک مضبوط، چالیس سالہ حبشی ہے!]

یشوع۔ [موسیٰ کے نزدیک جا کر] میں حاضر ہوں آقا!

موسیٰ۔ یشوع، یہ شور کیسا تھا؟

یشوع۔ مخبر واپس آ گئے ہیں۔ وہ خبر لائے ہیں کہ دریائے یردن ہمارے دائیں ہاتھ کی طرف قریب ہی ہے۔ اور یریحو کی سرزمین بالکل اس کے مقابل دوسری طرف — ہم خود دیکھ آئے ہیں۔

[نعرہ ہائے مسرت پھر بلند ہوتے ہیں ہر کوئی اپنی مرضی کے مطابق نعرے لگا رہا ہے آخر کافی ہلچل کے بعد شور ذرا تھمتا ہے۔ قافلے میں اور بہت سے لوگ آن ملتے ہیں یشوع نئے آنے والوں کو دیکھ کر پوچھتا ہے] "مخبر کہاں ہیں؟"

موسیٰ۔ [شور تھم جانے کے بعد] دریائے یردن کا پتہ مل گیا؟

پہلا مخبر۔ جی!

موسیٰ۔ یشوع تم فوج کو سنبھالو اور ہارون یہاں کاہنوں کے ساتھ رہے گا۔

یشوع۔ اور آپ؟

موسیٰ۔ میں بھی پیچھے ہی رہ جاؤں گا۔ یشوع! تم لوگوں کو اکٹھا کر کے حملہ کر دو۔ اور غروبِ آفتاب سے قبل شہر پر قبضہ کر لو۔

یشوع۔ اتنی جلدی ناممکن ہے۔ شہر کے گرد فصیل ہے اور ہمارے پاس آدمی بھی کافی نہیں

موسیٰ۔ تم فتح پاؤ گے!

یشوع۔ لیکن کیسے؟

موسیٰ۔ تم محاصرہ کر لو! — کاہن بھی ہمارے ساتھ ہی جائیں گے۔ وہاں جا کر بکرے کا سینگ بجانا، خدا خود میری مدد کرے گا اور —

یشوع۔ بہتر!

موسیٰ۔ میں نے جتنی بار کسی شہر پر حملہ کیا۔ خدا ہمیشہ میرے ساتھ رہا — کبھی شکست کھائی ہم نے!

بہت سی آوازیں۔ کبھی نہیں — کبھی نہیں! [سب ہاتھ اٹھاتے ہیں]

موسیٰ۔ اب بھی خدا ہماری مدد کرے گا [وہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے سب جھک جاتے ہیں] — اے خدا اب مجھ میں طاقت نہیں اس لئے میں بنی اسرائیل کے نوجوان اپنی راہ میں لڑنے کے لئے پیش کرتا ہوں — تو ہی ان کا محافظ و ناصر ہو! [وقفہ] میں نے تجھ سے وعدہ کیا تھا۔ اب اس کے پورا ہونے کا وقت آ گیا۔ اب یہ نوجوان ہیں اور تو — تو ہی ان کا رہنما ہو تا کہ ہم موعودہ شہر کو دیکھ سکیں! آمین، [یشوع سے] آگے بڑھو — اور تم سب اس کی پیروی کرو گے، کوچ کا حکم دے دیا جائے [نقارہ بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے] رات کو تم یریحو کے شہر ہی میں آرام کرو گے!

فوج کوچ کر چکی ہے۔ قافلے کا گانا ختم ہوگیا ہے۔ خدا موسیٰ کی دعا کے جواب میں خود آتا ہے۔ وہ موسیٰ سے ناخوش نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"موسیٰ! تو میرا نیک بندہ ہے۔ تو نے اپنی قوم کی خوب رہنمائی کی —— ہاں ایک بار تیری حرکت پر مجھے غصہ آیا تھا —— جانتا ہے کہ بعض دفعہ رحیم خدا، قہار بھی بن جاتا ہے۔ ہم نے تیری دعا کو سن لیا۔ اب وقت آگیا ہے کہ تو ارضِ موعود کو دیکھ سکے —— کیا تو کھڑا ہو سکتا ہے؟"

موسیٰ۔ کیوں نہیں خداوند!

خدا۔ آ! میں تجھے وہ سرزمین دکھاؤں جس کے لئے اس قدر بے تاب ہے تُو۔ اِس پہاڑی پر چڑھ کر تو اُسے دیکھ سکے گا۔ یہ جگہ ارضِ کنعان سے بھی ہزار درجہ زیادہ خوبصورت ہے۔

موسیٰ پہاڑ پر چڑھ رہا ہے، اُس میں ایک تازگی آگئی ہے۔ وہ حیران ہے کہ خدا تو اس کے پاس ہے یشوع اور اُس کی فوج کی مدد کون کرے گا۔ خدا اُسے بتاتا ہے کہ اُس کا اپنا یقین موسیٰ میں تازگی پیدا کر رہا ہے۔ اور یشوع کی مدد خدا کر رہا ہے دور سے سینگ کے بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے اُس کے ساتھ ہی فصیل کے گرنے کا دھماکا —— اور قریب سے پس منظر کا گانا ——

"خداوند —— تو ہی حمد کے لائق ہے —— تو نے ہی بنی اسرائیل کو فتح دی —— وہ اب ارضِ کنعان میں داخل ہو رہے ہیں۔ اے خداوند! تیرا وعدہ پورا ہو گیا!"

خدا خاموش ہے، آخر کچھ دیر کے بعد وہ کہتا ہے۔

"موسیٰ —— آؤ، چلیں!"

اور پھر مسکراتا ہوا موسیٰ کو سہارا دیئے پہاڑی پر چڑھ رہا ہے۔ جب وہ چوٹی کے قریب پہنچتے ہیں تو تاریکی چھانے لگتی ہے۔

اندھیرے میں سے مسٹر ڈیلشی کی آواز سنائی دیتی ہے —— وہ کہہ رہا ہے۔

"نتیجہ! اس کے بعد خدا کا کارخانہ پھر درہم برہم ہوگیا۔ ارضِ کنعان میں بنی اسرائیل پھر ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگے اور اس کا نتیجہ ان کی غلامی ہوا۔ اب وہ ارضِ بابل میں پہنچ چکے تھے"۔

دور سے گانے کی آواز آرہی ہے —— منظر معدوم ہو جاتا ہے!

منظر پانچواں

نیو اور لین کے ایک پبلک نائٹ کلب کے ہال کا تصور دماغ میں سے آیئے۔ جہاں لوگ جمع ہیں۔ اُن کا لباس وہی ہے جو محفلِ رقص و سرود میں حبشی پہنتے ہیں۔ یہ لوگ بابل کے عیاشوں کو پیش کریں گے۔ ہال میں ایک بہت بڑا اور لمبا میز رکھا ہے۔ اُس کے ایک سرے پر ایک اور میز شہ نشین پر رکھا ہے۔ جس پر بادشاہ کے لئے "لکھا ہوا ہے"۔ رقص کے لئے ساز کی نے جدید موسیقی طرز پر نکالی جا رہی ہے۔

رقص و سرود کی محفل ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ مہتمم بزمِ طرب بادشاہ کی آمد کی اطلاع دیتا ہے۔ بادشاہ داخل ہوتا ہے۔ سر پر ایک تاج ہے جس میں مصنوعی جواہرات لگے ہوئے ہیں۔ وہ شام کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ اُس کے ساتھ پانچ نوجوان لڑکیاں ہیں جن سے بادشاہ دل لگی کرتا جا رہا ہے اور اُن سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ انہیں کل صبح جواہرات سے مالا مال کر دے گا۔

محفل کا رنگ دیکھ کر بادشاہ بہت خوش و خرم ہے۔ وہ ایک یہودی نژاد نوجوان کا منتظر ہے جسے اُس نے کاہنوں کے سردار کا عہدہ دے رکھا ہے۔ محفلِ رقص و سرود کا نظارہ جہاں اس کے لئے موجبِ انبساط ہے وہاں اُسے یہ بھی خوشی ہے کہ وہ کاہن کو اپنی دلپسند لڑکیاں جن کا ثانی ارضِ بابل میں نہ تھا، دکھا کر اس سے داد لے گا۔

اچانک بادشاہ کی خوشی مایوسی سے بدل جاتی ہے۔ جب ایک شخص جو پیغمبر معلوم ہوتا ہے۔ پھٹا پرانا لباس پہنے نمودار ہوتا ہے وہ رقص کو بند کرا دیتا ہے اور اُن کو عذاب کی خبر سناتا ہے۔

"بابل کے بیٹو اور بیٹیو! میری سنو! اپنی اسرائیل کی اولاد تو بھی سن! تم نے بابل والوں کی طرح اپنے آپ کو عیش و عشرت میں ڈال دیا ہے۔ تم گناہ کے اتھاہ گڑھے میں ایسے گرے ہو کہ تمہیں خدا تک یاد نہیں رہا —— خدا نے بھی تم پر اپنا عذاب نازل کر دیا ہے، اب بھی وقت ہے گناہ سے باز آؤ۔ توبہ کر لو۔ خداوند یہوواہ کا عذاب بڑا ہولناک ہے۔ سدوم و عمورہ کی بستیوں پر اس نے آگ برسائی۔ تمہارا بھی یہی حشر ہوگا۔ توبہ کرو ابھی وقت ہے ورنہ ——"

کاہنوں کے سردار کی آمد سے پیغمبر کی بات رک جاتی ہے۔ وہ ایک موٹا سا عیاش نوجوان ہے۔ جو رنگین بھڑکیلا لباس زیبِ تن کئے داخل ہوتا ہے وہ ایک حسینہ کی باہوں میں باہیں ڈالے چلا آرہا ہے۔ نبی کو دیکھ کر وہ بے پروائی سے بادشاہ کو مخاطب کرتا ہے:۔

"اوہ! یہ بھی یرمیاہ اور یسعیاہ کی طرح کوئی وحشی معلوم ہوتا ہے"۔

بادشاہ کا خیال ہے کہ بوڑھے واعظ کو قلعہ کی دیوار سے گرا کر مار دیا جائے لیکن پھر اُسے خیال آتا ہے کہ اُس کو قتل کر دیا جائے۔

"خدا تو ان پر اپنی لعنت بھیج۔ یہ تیرے نیک بندے کو دکھ دے رہے ہیں"۔ نبی کی یہی آخری دعا ہے۔ مہتمم بزمِ نشاط جلاد کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔

لاش کو دو خادم اٹھا کر باہر لے جاتے ہیں۔ بادشاہ اور کاہن سرگوشی کر رہے ہیں۔ بادشاہ کاہن کو دو سو نقرئی سکّے اس غرض کے لئے دیتا ہے کہ

وہ عبرانیوں کے خدا کے پاس اس کی سفارش کرے اور مقتول نبی کی بد دعا کے اثر کو زائل کرا دے۔ یکایک رعد کی کڑک سنائی دیتی ہے اور روشنیاں مدھم ہو جاتی ہیں۔

جب پھر روشنی ہوتی ہے تو خدا اس کرے کے وسط میں کھڑا دکھائی دیتا ہے خدا کی آواز میں ایک گرج ہے وہ کہہ رہا ہے۔

آپ مدہو کیونکہ میں نے ابن آدم کو اپنا جانشین بنایا ہے۔ میں نے اس کے لئے زمین کو سبزہ زار بنا دیا ہے میں نے آدم، نوح، موسیٰ اور داؤد کی مدد کی لیکن اس کا پھل مجھے کیا ملا۔ گناہ؟ دنیا میں ہر طرف گناہ ہی گناہ نظر آتا ہے۔ ابن آدم! میں نے تجھے موقعہ دیئے میں نے پیغمبر بھیجے، ان کے ذریعے احکام شریعت بتلائے لیکن تو نے ہمیشہ سرکشی کی اور میرے احکام کی خلاف ورزی۔ میری نعمتوں کا کفران کیا، ہر بار میں نے بخش دیا لیکن میری بخشش کا مذاق اڑایا گیا۔ اب بنی اسرائیل کا کاہن سردار میرے نام پر رشوت لے رہا ہے۔ اب سنو! اے تاریکی کے فرزند تمہارا خالق تم سے بیزار ہے۔ تمہارا خداوند یہوواہ تم پر اپنی لعنت بھیجتا ہے۔ تم انسانیت کے نام پر ایک دھبہ ہو۔ [یکایک تاریکی پھیل جاتی ہے]

رحم رحم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں لوگ خدا سے بخشش کے طلبگار ہو رہے ہیں۔ یہ شور اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک کہ دوسرے منظر کے لئے روشنی تیز نہیں ہو جاتی]

چھٹا منظر

خدا بہشت میں اپنے دفتر میں میز پر بیٹھا لکھ رہا ہے۔ خدا دنیا سے ناراض معلوم ہوتا ہے خدا کے دفتر کے باہر ہوشعیا نبی —— ایک معزز بوڑھا آدمی جس کے بازوؤں پر یعقوب نبی کی طرح پر ہیں۔ بے چینی سے ادھر اُدھر چکر لگاتا دکھائی دیتا ہے۔ خدا کو یہ پسند نہیں۔ ہوشعیا خدا کے کام میں دخل انداز ہو رہا ہے۔

جبرئیل ایک وفد کی آمد کی اطلاع کرتا ہے۔ وفد میں ابراہیم، اسحٰق، یعقوب اور موسیٰ شامل ہیں۔ خدا انہیں با دل ناخواستہ ملاقات کی اجازت دے ہی دیتا ہے۔

یہ سب پھر پرانا قصہ لے کر آئے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ خدا اپنے بندوں کی مدد کے لئے خود جائے وہ جب بھی آتے ہیں یہی التجا لے کر آتے ہیں اور خدا ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا ہے۔

"میں ابن آدم سے تنگ آ چکا ہوں، اب میں ان کو نجات نہیں دوں گا۔ اچھا الوداع"

چاروں آہستہ آہستہ قطار میں باہر نکل رہے ہیں۔ وہ بار بار کیوں آتے ہیں؟ جبرئیل کا خیال ہے کہ ان کا بار بار کا تقاضا شاید خدا کی مشیت کو تبدیل کر دے لیکن وہ خدا کے اٹل ارادے سے واقف نہیں۔

ہوشعیا نبی کی موجودگی خدا کو بُری معلوم ہو رہی ہے مگر وہ اس کو دور بھی نہیں کر سکتا۔ ہوشعیا کو جنت میں آنے کا حق حاصل ہے ورنہ وہ آتا کیوں؟ خدا اُسے روکنا پسند نہیں کرتا۔ خدا کو اقرار ہے کہ ——

"اس نے ایک لفظ تک مجھ سے نہیں کہا اور اگر وہ اندر آنا نہیں چاہتا تو یہ اس کی مرضی"

جتنی بار ہوشعیا نبی دروازے کے پاس سے گزرتا ہے اتنی بار ایک آواز اس طرح آ رہی ہے کہ خدا بھی اُسے سُن رہا ہے۔ یہ آواز ہزڈرل (HEZDREL) کی ہے۔ زمین پر ہزڈرل یروشلم کو واپس لینے کے لئے برسرپیکار ہے۔ لیکن خدا اس کی مدد کے لئے زمین پر جانا نہیں چاہتا۔

جبرائیل [ہمدردانہ لہجے میں] خداوند آپ کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے دکھ ہو رہا ہے۔

خدا۔ [دھیمی آواز میں] کوئی بات نہیں۔ خدا ہونے سے بھی سکھ اور چین میسر نہیں آتا [جبرئیل باہر جاتا ہے، ہوشعیا نبی کا سایہ دیوار پر پڑ رہا ہے، خدا کھڑکی کی طرف بڑھتا ہے] میں نے تمہاری پکار سُن لی ہے تم بہادری سے مردانہ وار مقابلہ کر رہے ہو لیکن میں اب زمین پہ نہیں اتر سکتا کیا تم مجھے اب چین سے الگ نہیں رہنے دو گے! میں تم سے دور رہنا چاہتا ہوں [خدا پر کبھی غصے کی حالت طاری ہو جاتی ہے، کبھی رحم کی]

سٹیج پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ پس منظر میں دعائیہ نغمہ گایا جا رہا ہے جب تک آئندہ سین کے لئے روشنی پھر تیز نہیں ہو جاتی اس وقت تک نغمہ برابر گایا جا رہا ہے]

ساتواں منظر

یروشلم کے معبد کی دیواروں کے سائے میں ہزڈرل ایک کونے میں کھڑا ہے ہزڈرل وہی شخص ہے جس نے پہلے منظر میں آدم کا پارٹ ادا کیا ہے اور وہ کھڑا بھی وہیں ہے جہاں آدم کھڑا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں تلوار ہے اور بایاں بازو زخمی ہونے کی وجہ سے بندھا ہوا ہے۔

ہزڈرل کے ارد گرد اُن لوگوں کی لاشیں پڑی ہیں جو لڑائی میں مارے گئے ہیں اور نزدیک ہی جنگ کے جاری ہونے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ دف کی آواز سنائی دیتی ہے۔ چند آدمی آ کر اُسے بتاتے ہیں کہ جنگ رات بھر کے لئے بند کر دی گئی ہے۔

"کل صبح پھر جنگ جاری رہے گی، بادشاہ ہیروڈیاس کہتا ہے کہ وہ کل عبادت گاہ بھی لے لے گا وہ ہماری کتابوں اور لوح مقدس کو جلا دے گا اور ہمیں قتل کرا دے گا۔"

ہزڈرل اس کے لئے بھی تیار ہے۔ اس کو دیکھ کر دوسرے لوگوں کے حوصلے بھی بڑھ جاتے ہیں۔

وہ انہیں تسلی دیتا ہے "بہادرو! پروا نہ کرو۔ جونہی ہمارا سر قلم ہوا ہماری روح خداوند کی آغوش میں ہوگی ہم چند روزہ زندگی دے کر حیاتِ ابدی خرید رہے ہیں"

لوگ اپنے زخمیوں کو لے جاتے ہیں ہزڈرل اکیلا کھڑا رہ جاتا ہے کہ سائے میں سے خدا نمودار ہوتا ہے وہ ایک بوڑھے مبلغ کے بھیس میں ہے گویا وہ پہاڑوں کے پرے سے آیا ہے۔ ہزڈرل اُسے جاسوس سمجھتا ہے اس لئے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

لڑائی میں ہزڈرل کا پلّہ کمزور رہا ہے اور اُسے دوسرے دن اپنی شکست اور موت کا یقین ہو رہا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے استقلال میں فرق نہیں آتا۔ اُسے اپنے خدا پر پورا یقین اور بھروسہ ہے اس کا یہ یقین دیکھ کر خود خدا کو حیرانی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔

خدا۔ کیا ہوشعیا نبی کا خدا وہی ہے وہ نہیں جو موسیٰ نبی کا خدا تھا؟

ہزڈرل۔ [متکبرانہ لہجے میں] نہیں! وہ خدائے قہار و جبار تھا لیکن ہوشعیا نے ہمیں اور خدا بتایا ہے۔

خدا۔ وہ کیسا ہے؟

ہزڈرل۔ وہ خدائے رحیم ہے۔

خدا۔ کیا خدائے قہار اور رحیم دونوں ایک نہیں ہیں؟

ہزڈرل۔ ہوں گے، مجھے اس بحث سے کیا کام، شاید دونوں ایک ہی ہوں میرا تو خیال ہے کہ خدا کو خود بھی اپنی قہاریت پسند نہیں رہی اس لئے وہ رحم کا روپ بدل کر آتا ہے۔

خدا۔ اس سے تمہارا مطلب؟

ہزڈرل۔ خدا نے انسان کا روپ بدل کر اُن میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے خدا نے انسان کے گناہ کو قریب سے دیکھا خدا کو اس قرب نے قہار اور جبار بنا دیا، پھر خدا نے ہوشعیا نبی کو پیدا کیا اس نے رحم کو ڈھونڈا۔

خدا۔ کیسے؟

ہزڈرل۔ وہ ایک ہی راستہ ہے جسے ہوشعیا نبی نے پایا۔ میں نے بھی اُسی راہ سے اُسے ڈھونڈا ہے اور ہر کوئی اسی راہ سے اس کا پتہ لگا سکتا ہے۔

خدا۔ وہ کونسا راستہ ہے؟

ہزڈرل۔ اپنی جان پر دکھ جھیل کر ہم خدا کے رحم کو حاصل کر سکتے ہیں۔

خدا حیران ہے۔ اگر دوسرے دن بادشاہ ہرمڈیاس، ہزڈرل کو قتل کر دے، معبد کو گرا کر لوح اور اُس کتابِ مقدس کو جلا دے جس کی اور کوئی نقل دنیا میں موجود نہیں صرف لوگوں کو زبانی یاد ہیں جن میں سے بعض تو جان بچا کر بھاگ گئے ہیں صرف اب ہزڈرل کو سارے احکامات یاد ہیں اور اس کے دماغ میں محفوظ۔

خدا۔ [اپنے بہادر بیٹے پر خوش ہوتا ہے] ہاں ہزڈرل تمہیں وہ شکست نہیں دے سکتے"

ہزڈرل۔ یہ میں خوب جانتا ہوں۔ تم بھی جب اپنے پہاڑی علاقے میں جاؤ تو لوگوں کو یہی پیغام دینا کہ ہوشعیا نبی کا خدا بڑا رحیم کریم ہے۔

خدا۔ بہتر! لیکن اگر کل تم قتل ہو گئے تو مجھے یقین ہے کہ ہوشعیا نبی کا خدا تمہارا منتظر ہوگا

ہزڈرل۔ اس پر میرا ایمان ہے۔

خدا۔ شکریہ ہزڈرل!

ہزڈرل۔ کس بات کا شکریہ!

خدا۔ یہی کہ تم نے مجھے خدا کے بارے میں اتنی باتیں بتائیں۔ میں یہاں سے دُور رہتا ہوں۔ اس لئے اِن باتوں کو نہ جانتا تھا اچھا خدا حافظ ——

ہزڈرل آج کے دن ہماری قسمت کا فیصلہ ہوگا میرے بہادرو! ان سے کہہ دو کہ ابدی زندگی کو خریدنے کا دن آج ہے آج ہی سرتک مقام سے گزرنے کا موقع ہے" [سپاہی سے] اے دوست چلیں۔ آج خدا کی رضا پر سر تسلیم خم کرنے کا دن ہے"

دور سے کوچ کے نقارے کی آواز سنائی دے رہی ہے روشنی مدھم ہو جاتی ہے

آٹھواں منظر

جنت میں محفل ہونے کی ایک اور تقریب ہے وہی پہلے فرشتے اور وہی اُن کا کورس۔ اِس وقت ان میں بے چینی کے آثار کم پائے جاتے ہیں۔

اُن کے درمیان خدا ایک آرام کرسی پر دراز غور سے زمین کی طرف دیکھ رہا ہے خدا کی خاموشی اور سوچ جبرئیل کو پریشان کر رہی ہے اور وہ ایک صبر آزما عرصہ سے خدا کی حالت کا نظارہ کر رہا ہے کوئی اہم معاملہ ہی ہے جس نے خدا کو یوں منہمک کر رکھا ہے۔ خدا اس کی تائید کرتا ہے کہ واقعی معاملہ بڑا اہم ہے۔

جبرئیل۔ خداوند کیا وہ وقت آن پہنچا ہے کہ میں صور پھونکوں؟

خدا۔ ابھی نہیں جبرئیل! میں سوچ رہا ہوں۔

جبرئیل۔ کیا سوچ رہے ہیں آپ خداوند! [خدا ہاتھ اٹھا کر گانا بند کر دیتا ہے]

خدا۔ ہزڈرل کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ ہوشعیا نبی اور اُس نے ایک نئی بات معلوم کر لی ہے۔

جبرئیل۔ وہ کیا؟

خدا۔ میرا رحم [وقفہ] خود تکلیف اٹھا کر انہوں نے میرے رحم کو مجبور کر دیا کہ میں اُن کی مدد کروں۔

جبرئیل بے شک خداوندا!

خدا۔ اگر میرے بندے تکلیف اٹھا کر مجھے پا سکتے ہیں تو کبھی میں خود بھی تکلیف

نہ اٹھاؤں۔

[خدا حاضرین کی طرف تھوڑی دیر تکتا ہے اس کے چہرے پر حیرانی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک آہ بھرتا ہے، دور سے ایک آواز سنائی دے رہی ہے]

آواز۔ وہ دیکھو وہ اُسے پہاڑی پر لئے جا رہے ہیں وہ اُسے سولی پر لٹکا دیں گے۔ خدا کا بیٹا اتنی تکلیف کیسے برداشت کر سکے گا۔

[خدا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور زیر لب کہتا ہے "ہاں" گویا وہ آواز کی تصدیق کر رہا ہے۔ آسمانی مخلوق خدا کو غور سے تک رہی ہے۔ خدا کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہو جاتی ہے ساس سے تمام فرشتے اور مقربین اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور "خداوند یسوع زندہ باد" نعرۂ تحسین بلند کرتے ہیں۔ خدا مسکرا رہا ہے]

روشنی مدھم ہوتی جا رہی ہے۔ دور پس منظر میں گانا سنائی دے رہا ہے۔

آہستہ آہستہ پردہ گرتا ہے

(مدرک کونسل) شیر محمد اختر

شعر

ناتواں قیس نازنیں لیلےٰ
کون پردہ اٹھائے محمل کا

بیباک

عکسِ لرزاں
شمعِ نور تھرکتی ہوئی دیکھی میں نے
لرزتی ہوئی دیکھی میں نے
موجِ سیماب عکسِ لرزاں
بنتِ پانی میں شرابور کا وہ دیکھی میں نے
بجلی پانی میں تڑپتی ہوئی دیکھی میں نے

عصمت جاوید

دِل کی بات

راز دل کا نہ یوں چھپا شہنا
مجھ سے چپکے سے کہہ دے چپکے سے
زیرِ لب مسکرا کے چپکے سے
نرم سرگوشیوں کی پھونکوں میں
مجھ سے کہہ دے تو اپنے دل کی بات
صرف میرا ہی دل سنے گا اُسے

رات تاریک ہے ہر کاں چُپ ہے
گھونسلوں میں پرند سوتے ہیں
دھیمی دھیمی ہے کائنات کی نبض
نیند میں ہر حیات ہے مُدغم
اوس پر ڈھلتی جاتی ہے شبنم
مجھ سے چپکے سے کہہ دے چپکے سے
ڈبڈباتے ہوئے سرشکوں میں
رُکتی رُکتی سی مسکراہٹ میں
مجھ سے کہہ دے تو اپنے دل کی بات

علی احمد

وشنو جی

رات ابھی تھی کالی کالی، اور اندھیری بھاری بھاری
وشنو جی کے مندر سے سن پڑتی تھی دھن پیاری پیاری
گونج رہا ہے اب تک کانوں میں وہ پچھلی رات کا گانا

اگر کی خوشبو بنی ہوئی تھی پیارا سپنا وشنو جی کا
اس میں کوئی سپنے کا کوئی بال نہ کر سکتا تھا بیکا
گونج رہا ہے اب تک کانوں میں وہ پچھلی رات کا گانا!

کھڑک رہا تھا طبلہ، تھے مردنگ دھمکتے دھنا دھنا دھن
ٹھنک مجیروں کی بھی سن پڑتی تھی باہر سے تینک تن
گونج رہا ہے اب تک کانوں میں وہ پچھلی رات کا گانا!

ڈوب چکا تھا دل میرا سن کر وہ گیت منوہر پیارے
آن لگی تھی ناؤ مری جیون ساگر کے ٹھیک کنارے
گونج رہا ہے اب تک کانوں میں وہ پچھلی رات کا گانا!

ہوا میں گھل کر گوگل کا ہوا اور اگر کی گہری خوشبو
مست کیے تھی رات کی روح کو گھوم رہی تھی ہر سو
گونج رہا ہے اب تک کانوں میں وہ پچھلی رات کا گانا

دیکھے سپنے پرکاش کے گھیرے میں آکاش سے آئے وشنو
پھیل رہی تھی اس گھیرے سے پریم کی موہنی پیاری خوشبو
گونج رہا ہے اب تک کانوں میں وہ پچھلی رات کا گانا

ہیرے جیسے تارے کرتے تھے آکاش میں جھلمل جھلمل
ہوا بھی ہانپ رہی تھی جیسے دھڑک رہا تھا اس کا بھی دل
گونج رہا ہے اب تک کانوں میں وہ پچھلی رات کا گانا

جیسے کہتے تھے وہ مجھ سے دل ہے تیرا دھندا اندھیرا
آ بھر دوں پرکاش سے اپنے دھلا دھلا جیون تیرا
گونج رہا ہے اب تک کانوں میں وہ پچھلی رات کا گانا!

جیسے کوئی سندر سپنا دیکھ رہی تھی آنکھ ہماری
پریم کی دھن پر تھی دل کی دھڑکن بھی دھیمی دھیمی جاری
گونج رہا ہے اب تک کانوں میں وہ پچھلی رات کا گانا

سید مقبول حسین
احمد پوری

تاریخ اُردو کا ایک ورق

اردو زبان کا تعلق کئی زبانوں سے ہے اور السنۂ قدیم کا تعلق بہت دور تک پہنچتا ہے، اس لئے اردو سے پہلے چند قدیمی زبانوں کا ذکر کرنا نہایت ضروری ہے۔ دنیا میں کوئی زبان مفرد نہیں ہوتی کیونکہ ایک ملک نہ تو تمام دنیا کی چیزوں کو مہیا کر سکتا ہے۔ نہ تمام اشیا کے اسماء الفاظ پر کوئی ایک قوم حاوی ہو سکتی ہے، باہر کی چیزیں خصوصاً فاتحوں اور ہمسایہ ممالک کی لائی ہوئی اشیا اور ان کے نام ہر ملک اور ہر زبان میں داخل ہوتے ہیں، آغاز تمدن سے یہ سلسلہ جاری ہے۔

دنیا میں سب سے قدیم زبانیں دو رہی ہیں، ایک سامی (آرامی) اور دوسری سومری یا اکادی، سامی زبان کو ہم مذہبی روایت کی رو سے حضرت نوح کی زبان قرار دے سکتے ہیں، جسے ان کے سب بیٹے استعمال کرتے تھے، لیکن جب وہ جدا ہو کر مختلف ملکوں میں آباد ہوئے تو سب کی زبانیں مختلف ہو گئیں، سام کی اولاد میں توریت کے مطابق، آرام، عیلام اور اشور وغیرہ تھے، عرب میں یمن سے حجاز تک آرام اور اُن کی نسل آباد تھی، جو عراق تک بڑھ گئے تھے، ان تمام مقامات کی زبان حضرت مسیح سے چار ہزار برس پہلے سامی تھی، جب ان لوگوں نے بابل پر حملہ کر کے غلبہ حاصل کیا تو ان کی زبان وہاں کی زبان سومری اور اکادی میں شامل ہو کر غالب ہو گئی، اس طرح سوریا (شام) میں جہاں اشور کی اولاد آباد تھی، عابر کی وجہ سے عربی یا عبرانی زبان شامل اور حاوی ہو گئی، سوریا میں شام کی زبان سریانی صرف توریت میں اور عبرانی صرف انجیل میں باقی رہ گئی۔

تقریباً اس سے کچھ پہلے مصر میں تین زبانیں مستعمل تھیں ایک مقدس اور مذہبی، دوسری علمی اور تیسری بازاری، اسی زمانے میں فینیشن اور آرین قوموں کو دور دراز ملکوں کا سفر کرنا پڑا، یہ سفر شام سے ایران تک اور ایران سے ہندوستان تک کئے گئے، فینیشن چین کی طرف چلے گئے اور آرین ہندوستان میں رہ گئے ایران میں ژند، پاژند اور دساتیر کی زبان آریوں کی سنسکرت سے اس قدر ملتی جلتی ہے کہ ہزاروں الفاظ میں یہ امتیاز مشکل ہو گیا ہے کہ وہ سنسکرت کے الفاظ ہیں یا دری، پہلوی اور اس سے قبل کی ایرانی زبانوں کے۔

آریہ جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ سنسکرت میں وہ الفاظ بکثرت تھے جو ایران و سنسکرت میں مشترک ہیں اور جو اس لئے اب تک محفوظ و موجود اور بے تغیر ہیں کہ سنسکرت کی تعلیم عوام کو نہیں دی گئی اور فارسی زبان میں جس طرح عرب پڑوسیوں اور فاتحوں کے بے شمار الفاظ داخل ہو گئے اسی طرح سنسکرت میں غیر زبان کے الفاظ ہندوستان میں آنے کے بعد مخلوط نہ ہو سکے مگر فارسی اور سنسکرت کا میل جول ایران کو چھوڑنے اور ہندوستان آنے سے پہلے جو کچھ ہو چکا تھا وہ نہ صرف مضبوط رہا، بلکہ اس نے دو بنیادی اور تاریخی اصول قائم کر دیئے۔ اول یہ کہ ایرانی و سنسکرت الفاظ کے باہمی اتحاد و اشتراک کے ثبوت میں ایک بڑی فرہنگ تیار ہو سکتی ہے، دوم یہ کہ اگر ہم یہ مان لیں اور ماننا پڑے گا کہ فارسی و ہندی کے میل جول سے اردو مرکب ہوئی تو یہ بھی تسلیم کرنا لازمی ہے کہ فارسی الفاظ کا داخلہ سنسکرت کے پردے میں سب سے پہلے آریوں کے ہاتھ سے ہوا، یعنی اردو کی تخم ریزی کے موجد آریہ ہیں۔

آریوں کے بعد ایک ایسی زبان سے ہندوستان کو سابقہ پڑا۔ جو ہندوستانی زبانوں سے نامناسبت اور بعد رکھتی ہے یعنی عربی، جس طرح ہندوستان کو ملک عرب کی ملاقات کے لئے خلیج فارس پھاندنا پڑتی ہے۔ اسی طرح ہندی بھاشا اور عربی کے درمیان فارسی کی کڑی جب تک نہ ملی، دونوں کا میل جول نہ ہو سکا، اور میل کے بغیر اردو کا بننا غیر ممکن تھا۔

چار سو برس ہند میں عربوں کا دور دورہ رہا۔ ہر چند کہ عربی اثر سندھ، کشمیر اور تمام سواحل عرب پر اس قدر رہا کہ آج تک و پنجاب و سرحدی مقامات پر مسلمانوں اور ہندوؤں میں امتیاز مشکل ہے، وضع، قطع، تمدن، معاشرت اور چال چلن میں دونوں قومیں متحد ہیں، مگر اس پر بھی ان ملکوں کی پراکرتوں نے عربی سے مل کر ادبی بُعد کی وجہ سے کوئی بین الاقوامی زبان پیدا نہ کی۔

آریوں کے بعد فارسی الفاظ کی دوسری کھیپ سلطان محمود کے ساتھ

ہندوستان میں آئی، یہ درآمد صرف تلواروں ہی کے ذیل میں نہ تھی بلکہ تجارتی، اقتصادی، معاشرتی اور علمی و ادبی ذرائع سے بھی تبادلۂ الفاظ کا سلسلہ جاری ہوا۔ پنجابی، پالی، سوراسینی، گجراتی اور بہت سی مختلف زبانوں میں فارسی مضامین اور کتابوں کے ترجمے ہونے لگے، ان ترجموں کے ذریعے سے ایجاد اردو کی جو داغ بیل پڑی اس کے بانی بھی اتفاق سے ہندو ہی بنتے، کیونکہ بہلات تِلک ہی پہلا شخص تھا، جس نے اصفہان جاکر فارسی کی تعلیم حاصل کی، اور واپس آکر سنسکرت سے فارسی میں کتابوں کا ترجمہ کیا جو بنیادِ اردو میں سب سے اہم چیز ہے، اس کے بعد رواج اردو کا جو مستقل کاروبار شروع ہوا، وہ ہندوستان میں فارسی کی تعلیم کی ترویج تھی، ہندوستانی سپاہی سلطان محمود کی فوج میں ملازم ہوکر غزنیں تک گئے اور فتح و ظفر کے تمغے لے کر ہندوستان واپس آئے اس زمانے میں اردو نے دوسری منزل طے کی،

تین سو برس میں پنجاب نے اردو کو مکمل تو نہیں مگر مضبوط اس قدر کردیا کہ وہ فنا نہ ہوسکی، بلکہ یہاں تک پہنچ گئی کہ اُس زمانے کی اردو میں سعد بن مسعود کا دیوان تیار ہوگیا۔ اس کا تذکرہ لب الالباب اور خسرو کے دیباچہ غرۃ الکمال میں بھی آگیا اور جب آٹھویں صدی میں قطب الدین ایبک نے اپنا دارالسلطنت لاہور سے دہلی کو منتقل کیا ہے تو لغت آدات الفضلا میں فارسی الفاظ کے معنی ہندی یعنی اس زمانے کی اردو میں لکھے گئے، تقریباً اسی زمانے میں حضرت فریدالدین شکر گنج کی ایک نظم جس میں اس قسم کے اردو ٹکڑے ہیں "ابھی رات ہے" "وہی سات ہے" وغیرہ وغیرہ تصنیف ہوئی، اور جب انہوں نے اپنے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح سے کہا کہ "آنکھ آئی ہے" تو آپ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ "اگر آئی ہے چرا بستہ اند" امیر خسرو کے اردو ٹکڑے نظم و شعر میں شہرۂ آفاق ہیں اور وہ اس قدر مشہور اور اتنے زیادہ ہیں کہ ثبوت و مثال کی حاجت نہیں۔

ان کے بعد تقریباً اسی صدی میں حاجی قوام الدین، شیخ الاسلام مولانا سعداللہ لکھنؤ میں، شیخ احمد عبدالحق ردولی میں شاہ مینا، لکھنؤ میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہار میں، شیخ اشرف جہانگیر سمنانی، شیخ نورالحق پنڈوی بنگال میں، قطب عالم بن محمود، بن سید جلال الدین اور عبداللہ الحسینی گجرات میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز دکن میں ابتداءً اردو پر احسان کرنے والوں میں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ کبیر، گورو نانک اور سور داس خاص طور پر اردو کے محسنوں میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے بعد ان کے جانشینوں نے اپنے اردو اقوال سے گویا اعلان کردیا ہے کہ اردو کے موجدوں اور ترقی دینے والوں میں مسلمان اور ہندو یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔

بعض کم نظر خسرو اور کبیر وغیرہ پر اعتراض کرتے ہیں اور ان کے کلام کو مشکوک بتاتے ہیں میری گذارش یہ ہے کہ جس زمانے میں فن تاریخ نہ تھا۔ اس زمانے کے واقعات کا تاریخوں اور دلیلوں سے ثبوت بہم پہنچانا ناممکن ہے، یہ روایتیں اسی وقت غلط ثابت ہوں گی جب یقین ہوجائے کہ ان اشعار کے مصنف بجائے خسرو اور شکر گنج، فلاں اور فلاں ہیں، اور جب تک یہ بات یقینی طور پر ثابت نہ ہوجائے ہم کو ان روایات پر شک کرنے کی وہم کے سوا کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔

دلی میں آکر اردو پروان چڑھی اور پھر سارے ہندوستان میں پھیل گئی، اودھ ہوتی ہوئی بہار، بہار کی راہ سے بنگال، بنگال سے مرشدآباد اور ڈھاکہ غرض تمام مشرقی ہند میں پہنچ گئی، جب محمد تغلق نے دارالسلطنت دہلی سے دیوگڑھ منتقل کیا اور اس کا نام دولت آباد رکھا۔ اس وقت اردو کا داخلہ گجرات میں ہوا۔ اگرچہ اس سے پیشتر بھی ہزارہا فارسی الفاظ کا ذخیرہ وہاں پہنچ گیا تھا۔ مگر دارالسلطنت ہونے کے بعد اردو نے رفتہ رفتہ اپنے کو انتہائی عروج تک پہنچا دیا۔ بے شمار شعراء اور ادیب اردو زبان کے مصنف اور مولف شہرۂ آفاق ہوگئے۔

بہمنی، ظفر شاہی اور نظام شاہی قلمرو کے اردو مخطوطے ابھی نہیں ملے ہیں، اگر کبھی نہ ملیں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ گجرات میں اردو بہت قدیم اور عام زبان تھی مثلاً قطب عالم نے ۸۵۰ھ سے پہلے گجرات میں فرمایا۔ "بیٹے تسا نصیب دوہوں ویکھ" یعنی بیٹے تیرے نصیب میں دونوں ہیں اور لوہا یا لکڑ یا پتھر پا لیا ہے"۔ اور حضرت خواجہ بندہ نواز مصنف معراج العاشقین نے ساٹھ برس دہلی رہ کر اسی برس کی عمر میں گجرات و دکن کا سفر کیا؛ تاریخ و بجانگر اور تاریخ فرشتہ میں جابجا ظاہر کیا ہے کہ گجرات اور بیجاپور میں ہندی (اُس زمانے کی اردو) اچھی طرح بولی جاتی تھی، "تاریخ فتوحات عادل شاہی میں فارسی سے زیادہ ہندی کا رواج تھا، غرضکہ یہ شہادتیں اس امر کے استدلال کے لئے کافی ہیں کہ گجرات میں بہمنی عہد میں اردو شعروادب اچھی خاصی ترقی کررہا تھا، لیکن عادل شاہ نے بیجاپور میں خودمختار حکومت قائم کرتے ہی ترکوں اور ایرانیوں کو بڑے بڑے عہدے دیئے اور اردو کی طرف سے نگاہیں پھیرلیں، اپنے بیٹے اسمٰعیل کو بھی اردو کی طرف توجہ کرنے سے منع کیا، خیر اردو غریب نے اتنے دنوں صبر کیا مگر ابراہیم عادل شاہ اول کے عہد میں پھر اردو کے دن پھرے، گجرات کے شعرا بکثرت آنے لگے ایرانیوں اور ترکوں سے جگہیں خالی کراکے برہمنوں اور ہندوستانی مسلمانوں کو عہدے دیئے گئے

یہاں تک کہ سرکاری حسابات فارسی کی جگہہ اُس زمانے کی اردو میں لکھے جانے لگے، یہ کام خاص طور سے دکھنی برہمنوں کا تھا۔ اسی زمانے میں شاہ برہان الدین جانم کے اردو نثر و نظم کی کتابیں تصنیف ہوگئیں ابراہیم کے بعد علی عادل شاہ نے پھر اردو کی طرف سے سرد مہری کی، لیکن اب یہ ایسی منزل پر پہنچ چکی تھی کہ وہاں سے نیچے آنا غیر ممکن تھا۔ اگرچہ اُس زمانے میں اردو کی رفتار کچھ سست ہوگئی تھی لیکن جب ابراہیم عادل شاہ کا زمانہ آیا تو ساری کمی پوری ہوگئی، اور اردو نے حد سے زیادہ ترقی کی، خود بادشاہ اردو شعر کہنے لگا، اور نثر میں ایک کتاب فن موسیقی پر نورس نامہ کے نام سے ایسی لکھی کہ ظہوری کے مقدمہ نے اسے سندِ دوام لکھ دی، اب جبکہ بادشاہ اردو کا شاعر اور ادیب ہوگیا تو رعایا کا کیا ذکر ہے ایرانی بھی اردو شعر کہنے لگے، آتشی اور مقیمی فارسی گو تھے سار دو گو ہوگئے، مقیمی نے ایک مثنوی بہرام و بانو حسن[1] تصنیف کی، ان کے علاوہ۔ صنعتی، نصرتی، شاہ ملک، امین، مرزا، ایاغی، سیوا، مومن وغیرہ بھی بڑے قادرالکلام شعراء تھے۔ جنہوں نے اردو میں کمال ہنر دکھایا۔

زوالِ گجرات کے بعد شاعری اور انشاپردازی انتقالِ حکومت کے ساتھ دکن میں منتقل ہوئی، یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ گجرات میں اردو نے زیادہ وسعت حاصل کی یا دکن میں، کیونکہ دکن میں بھی ہزاروں مثنویاں اور بیشمار مرثیے اور تمام اصنافِ سخن اس کثرت سے تصنیف و شائع ہوئے کہ اُن کا احاطہ نہیں ہوسکتا، یہاں تک کہ بادشاہوں نے کمال ذوق و شوق سے اس فن کی طرف توجہ کی بلکہ سیکڑوں شاعروں کو سلاطین عادل و قطبیہ صلاح دیا کرتے تھے، ان سلاطین میں خصوصیت سے قابلِ ذکر محمد عادل شاہ اس کی ملکہ خدیجہ، محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ تھے۔

دکن کے مقابلے میں شمالی ہند اردو کے شاعر و ادیب اس لئے زیادہ پیدا و مہیا نہ کرسکا کہ تمام آبادی اور حکومت پر ایرانیوں کا سلسلہ ایک سیلابِ عظیم کی طرح جاری اور محیط رہا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک رہا کہ عالمگیر نے دکن کو فتح کرلیا۔ لیکن جس وقت شمالی ہند کے ادیبوں نے اردو کی طرف توجہ کی ہے۔ اسی وقت سے ان لوگوں کے دماغ اردو کی اصلاح و تصحیح کی طرف متوجہ ہوئے! اسی اصلاح نے یہاں تک ترقی کی کہ آگرہ و دہلی میں خان آرزو، جانِ جاناں مظہر، شاہ حاتم، میر محمد تقی میر، مرزا سودا، میر درد، قائم، مرزا غالب، مومن اور ذوق ایسے باکمال شعراء نے ترقی یافتہ اردو کا مظاہرہ کیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا جواب ہندوستان بھر کے شاعروں میں مشکل سے ملے گا۔

غرضکہ زبان کی ترقی و اصلاح شمالی ہند کے حصے میں آئی اور تدریج و توسیع اور اشاعت جنوبی ہند کی قسمت میں تھی۔

اردو ادبیات کے متعلق یہ امر خصوصیت سے قابل توجہ ہے کہ عالمگیر کے فتح دکن سے پہلے ایک صوبے کی اردو دوسرے صوبے میں بہت مشکل سے سمجھی جاتی تھی، لیکن جب شمالی و جنوبی شاعروں کا میل جول شروع ہوا تو زبان میں مساوات کی ابتدا ہوئی اور تمام ہندوستان میں اصلاح شدہ اردو کے ذریعے نثر و نظم میں تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ قائم ہوا۔ یہی وہ منزل ہے جو ہر شائستہ زبان کی منزلِ تکمیل ہے۔

افسوس ہے کہ مجھے اس مقام پر ایک دلخراش حقیقت کا ذکر کرنا پڑ رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ مساوات جو دنیا بھر میں ہر ادب کی محبوب و مرغوب شئے ہے اس سے آج کل ہندوستانی دور ہوتے جارہے ہیں اور پھر اس مقام پر پہنچ رہے ہیں جس مقام پر اب سے کئی سو برس پہلے تھے بعض مسلمان عربی اور فارسی کے مشکل اور نامانوس الفاظ اور اکثر ہندو سنسکرت کے غیر مستعمل اور ثقیل کلمات اردو میں شامل کرکے اردو کو ناقابلِ فہم بنا رہے ہیں۔ گویا اگلا زمانہ پھر واپس آرہا ہے۔

اس سلسلے میں اردو شاعری کے متعلق مجھ کو یہ کہنا ہے کہ ہزاروں شاعر اپنی تمام قوت کو بے نفع شاعری خصوصاً غزل گوئی پر صرف کر رہے ہیں، اور اپنی ذہنی اور دماغی قابلیت کو غیر مفید شاعری پر قربان کر رہے ہیں، قطع نظر تضیع اوقات کے مشاعروں میں اکثر طلبہ کی طرف سے جو ہنگامے اور غیر مہذب حوادث پیش آتے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ مشاعروں کو موقوف کرنے کا اب اس سے بہتر کوئی اور زمانہ نہ آئے گا طلبہ کا ذوق ادب موسیقی کی طرف اس قدر منتقل ہوگیا ہے کہ وہ ایک بدترین شاعر مگر خوش الحان کو ایک بہترین مگر غیر مترنم شاعر پر ترجیح دیتے ہیں۔

ابوالعلا ناطق لکھنوی

---

[1] حسن بانو؟

قطعات

(۱)

میرے اشکوں میں لہو روتی ہے عالم کی خوشی
سوز سے میرے کوئی ساز نہیں مل سکتا!
خونِ دل کیوں نہ ہو جب بخت کا تارا ڈوبے
رات اندھی ہو تو یہ پھول نہیں کھل سکتا۔

(۲)

میرا کیا دوش ہے گر میں ہوں مجسم آنسو
ڈوب کر نیر میں نینوں کے ابھرنا معلوم
زندہ رکھے چلی جاتی ہیں الجھتی سانسیں
سخت جانی کا یہ عالم ہو تو مرنا معلوم

(۳)

روحِ قیسِ عامری کو خاک اڑانے کے لئے
اس خرابے میں کئی دشتِ جنوں موجود ہیں
روڑا اٹکانے کو راہِ وحشتِ فرہاد میں
کیا بتائیں کتنے کوہِ بے ستوں موجود ہیں

(۴)

چھلکا جاتا ہے کنول سی انکھڑیوں سے خونِ دل
پھول سے گالوں پر اشکوں کے نشاں موجود ہیں
کچھ نہ کہئے منہ سے، اڑ جائے گی ہونٹوں کی مٹھاس
ہجر کے شکووں میں لاکھوں تلخیاں موجود ہیں!

(۵)

چشمِ سرمستِ مئے ناب میں آنسو؟ توبہ!
مہرِ انور سے نہ شبنم نے نباہی ہوگی
جس میں چمکے گا مرے بخت کا تارا یارب
میں نہ سمجھا تھا ان آنکھوں کی سیاہی ہوگی!

مختار صدیقی

تین ہفتے اسپتال میں

بیس دن سے لاہور کے عظیم الشان اسپتال کے ایک صاف ستھرے کمرے میں لیٹے لیٹے یا باہر وسیع برآمدے میں بیٹھے بیٹھے علل و معلول کی الجھن سلجھانے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔ سوچتا ہوں ایک غیر ذمہ دار شخص کے منہ سے نکلا ہوا صرف ایک لفظ کس قدر ہلاکت آفریں ثابت ہو سکتا ہے

شہر کی پرسکون فضا میں تہلکہ مچ گیا۔ صوبہ بھر کا امن تہس نہس ہو گیا گلیوں بازاروں میں خون کی ہولی کھیلی گئی۔ بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہوئیں صرف اس لئے کہ سرحد کے ایک کوتاہ اندیش۔ سرکش اور گمراہ نوجوان نے تین حرف ب۔ ز۔ ن اکٹھے استعمال کر دیئے تھے۔

میری زندگی حسبِ معمول ایک اوسط درجہ کے ہندوستانی کی زندگی کی طرح ہموار زمین پر سست رفتار ندی کی طرح گزر رہی تھی۔ اس واقعہ نے اس میں ایک خفیف سی ہلچل پیدا کر دی بلکہ یوں کہیئے کہ اس ندی نے چند دنوں کے لئے اپنا رستہ تبدیل کر لیا۔

اس حادثۂ خونیں کی تفصیلات میرے ذہن میں محض پراگندہ اور پریشان ہیں۔ چند لمحے شور ہوا — خوفناک شور — اور پھر خون — زخمی — مقتول — اور اسپتال جہاں قدرت کے اَن مٹ قانون، — موت کا مقابلہ انسان اپنے آٹھ چھٹانک بھر دماغ کی بنائی ہوئی ادویہ اور اوزاروں سے کرتا ہے۔ جاہل اور گستاخ انسان!

....

دو دن تک پہلو کے درد نے پریشان رکھا۔ ہلنے جلنے میں شدید تکلیف تھی۔ اس لئے گردوپیش کے کوائف سے قدرے بے تعلق رہا۔ اس کے بعد جب جسم میں مرض کے مقابلے کی طاقت آ گئی تو اپنے ماحول پر غور کیا۔ مجھے اسپتال میں آئے ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے تھے۔ مارفیا کی لیکجہ کے زیر اثر آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں کہ اپنے بائیں جانب ایک شخص کو کھڑا دیکھا۔ ڈھلتی عمر کا ایک صحت مند شخص مغربی وضع کا لباس پہنے مجھے احساسِ ترحم سے دیکھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ بند ہونے والی آنکھوں سے میں نے اس طرف نظر کی۔ "آپ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے"۔ اُس نے سرمدی انداز میں کہا اور میری آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔

یہ شریف آدمی میرے مشرقی جانب والے کمرے میں مقیم تھا۔ جہاں اس کا ایک عزیز بچہ — ہندوستان کے ہمسایہ ملک کے ایک معزول شدہ فرمانروا کے خاندان کا چشم و چراغ — زیرِ علاج تھا۔

اگلی صبح ایک نوجوان نے جو شکل و شباہت سے ملازم معلوم ہوتا تھا آہستہ سے میرے کمرے کا دروازہ کھولا اور کہا "بیگم صاحبہ نے آپ کا حال پوچھا ہے۔"

بیگم صاحبہ اس مریض بچے کی ایک بزرگ خاتون تھیں جو اس کے ہمراہ اسپتال میں مقیم تھیں۔

"اُن کی بہت مہربانی۔ میں اچھا ہوں" میں نے کہا اور خیالات کی تیز و تند رَو مجھے بہا کر لے گئی۔

بیگم صاحبہ! ایک بدنصیب ملکہ جن کو اب "ملکہ" کہلوانے کا حق حاصل نہ تھا۔ میرے جیسے کم مایہ انسان کا حال دریافت کر رہی تھی قسمت بھی کس قدر ستم ظریف ہے!

آج سے چند سال پیشتر یہی خاتون ایک آزاد ملک کی باوقار ملکہ تھی مگر خون نے خون کے خلاف بغاوت کی اور نتیجہ — یہی کہ ملکہ اب ملکہ نہ تھی۔ بلکہ ایک معمولی حیثیت کی عورت! جو پردۂ گمنامی میں اپنے وطن سے کوسوں دور لاہور کے ایک اسپتال میں اپنے لختِ جگر کا علاج کروا رہی تھی۔

میں نے ملکہ کو دیکھا اپنا سب کچھ کھو دینے کے بعد بھی وہ ملکہ تھی۔ ایک باوقار و پرجلال ملکہ جسے اب لوگ بیگم کہتے تھے دو دن کے بعد وہ لوگ چلے گئے

....

تیسرے دن اسی کمرے میں ایک اور مریض آ گیا۔ اُسے کان کی تکلیف تھی پنجاب کے بہترین سرجن نے اپریشن کیا۔ مگر قدرت اپنا فیصلہ دے چکی تھی۔ انسانی کوششوں کے لئے شکست کا فتوےٰ صادر ہو چکا تھا۔

چوبیس گھنٹے تک مریض موت و حیات کی جانگداز کشمکش میں مبتلا رہا۔ اس کے عزیز و اقارب امید و بیم کی زندہ تصویریں تھیں۔ زرد مرجھائے ہوئے چہرے

پُرنم آنکھیں سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے سایوں کی طرح گزر رہے تھے۔ ایک شخص دروازے کے ساتھ کان لگائے کھڑا ہے تو دوسرا آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے مصروفِ دعا ہے۔

اگلے روز رات کے آٹھ بجے کے قریب برآمدے میں ایک شخص کی آواز بلند ہوئی، اور اُس نے لاہور کے باشندوں کی مخصوص طرز میں کسی کو مخاطب کر کے کہا: "تمہاری باری ہر گئی"۔

ان الفاظ میں کچھ اس قدر درد و کرب تھا کہ میرے کمرے کی فضا میں تھرتھری سی پیدا ہو گئی۔ میں چارپائی پر اُٹھ بیٹھا۔ اسی وقت ایک نرس میرے کمرے میں داخل ہوئی۔

"چھبیس نمبر چل بسا"

انسان قدرت کے مقابلے میں واقعی بازی ہار چکا تھا۔ مجھے یوں معلوم ہوا کہ میرے جسم سے جان مسلوب ہو رہی ہے۔ میں نیم جان ہو کر چارپائی پر گر پڑا۔ باہر برآمدے میں سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مرحوم کے بدنصیب ورثا اسپتال کے قوانین کے مطابق بلند آواز سے نالہ و شیون بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اسپتال کی زندگی کا سب سے دردناک پہلو!

....

وقت گزرتا گیا۔ دوست احباب برعیادت آتے، کسی خوش خلق نرس کو میری تیمارداری کرتے دیکھتے اور میری خوش بختی پر رشک کرتے ہوئے اپنے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے چلے جاتے۔

زندگی بھی کس قدر عجیب ہے! انسان جانگداز سے جانگداز سانحہ کو کتنی جلدی بھول جاتا ہے۔ کمرہ نمبر ۲۶ پھر خالی ہو گیا ہے اور میرے مجروح رفیق اچھے ہو رہے تھے۔ خون کا دوران پھر اپنی اصلی حالت پر آ رہا تھا کہ اچانک ایک شام پھر ایک نرس میرے کمرے میں داخل ہوئی اور اُسی بے حسی کے ساتھ جو اسپتال کی زندگی اور موت و حیات کے اس روزمرّہ کے کھیل کے مشاہدہ کی بدولت اس کے اندر فطرتِ ثانی کی صورت اختیار کر چکی تھی کہنے لگی: "اٹھارہ نمبر بھی چلنے کو ہے"۔

مجھے یوں محسوس ہوا گویا میرے دل کی حرکت بند ہو گئی ہے۔

یہ مریض خود ایک ڈاکٹر تھا۔ کامیاب ڈاکٹر۔ آج سے چند روز پیشتر چنگا بھلا اسپتال میں داخل ہوا۔ پیٹ میں کچھ تکلیف تھی جس کے لئے اپریشن کیا گیا۔ اپریشن تو کامیاب ہو گیا مگر کچھ پیچیدگی پیدا ہو گئی۔

میں اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ برآمدے کے نیچے دیکھا، مریض کا ایک عزیز جو ابتدا سے تیمارداری کے فرائض ادا کر رہا تھا مجسمۂ حرمان و یاس بنا ایک سٹول پر خاموش بیٹھا تھا۔ میں یہ منظر شاید عمر بھر نہ بھول سکوں گا۔

موت اور زندگی کی ازلی کشمکش آخری منازل طے کر رہی تھی۔ انسان اپنی ناقص عقل کے ساتھ مدافعت کر رہا تھا اور فرشتۂ موت مسکراتا ہوا اپنے پر تمام فضا پر پھیلا رہا تھا۔ اس شخص کی آنکھیں خلا میں دیکھ رہی تھیں، ہاتھ مضطربانہ ایک رومال پر کھیل رہے تھے۔ اس کے چہرے سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ جذبات کے طوفان اٹھ رہے ہیں اور ان پر قابو پانے کے لئے وہ اپنی تمام طاقتِ ضبط استعمال کر رہا ہے۔ ہر دو منٹ کے بعد وہ بے چینی سے اٹھتا، اور مریض کے پاس کمرے میں جہاں وہ زندگی کی آخری گھڑیاں پوری کر رہا تھا، جاتا اور پھر اس منظر کی تاب نہ لا کر باہر نکل آتا۔

اسپتال کے متصل ایک سڑک تھی۔ جہاں حیاتِ انسانی کا دریا حسبِ معمول بہہ رہا تھا۔ میری نگاہیں غیر ارادی طور پر اس جانب اٹھ گئیں ایک بوڑھا فقیر لاٹھی ٹیکتا ہوا گزر رہا تھا۔ ایک موٹر تیز و تند رفتار سے رُکی۔ فقیر نے ایک جست کی اور بمشکل خود کو اس کی زد سے بچا سکا۔ موٹر ایک لمحہ کے لئے رُکی، ایک فرعون مزاج بصورت دولت مند نے اپنا سر کھڑکی سے باہر نکالا اور پھر اس بوڑھے فقیر کو تیزی سے کچھ کہا۔ اُس کے چہرے ہی سے اُن الفاظ کا غصہ ظاہر تھا جو مجھ تک نہ پہنچ سکتے تھے اور بوڑھے فقیر کی دبکی ہوئی صورت احساسِ جرم کا مجسمہ محسوس ہوتی تھی۔ رحم طلب نگاہوں سے اُس نے موٹر کی طرف دیکھا، مگر موٹر جا چکی تھی۔

زندگی بھی کس قدر عجیب ہے میں نے سوچا۔ اور انسان بھی کتنا بیوقوف کون اس موٹر والے فرعون کو بتائے کہ تجھ ایسا ہی ایک انسان تجھ سے چند قدم کے فاصلے پر انتہائی بے کسی اور بے چارگی سے دم توڑ رہا ہے اور دولت اور دنیا کی کوئی طاقت اُسے نہیں بچا سکتی۔

آخر وہ وقت آ گیا جس کو ٹلنے کے لئے تیماردار اور معالج اپنی پوری طاقت صرف کر رہے تھے۔ تیماردار آنکھیں پونچھتا ہوا کمرے سے باہر نکلا، اور ایک دبی ہوئی نسوانی چیخ نے اعلان کر دیا کہ زندگی کا ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ گُل ہو گیا۔

قطرہ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق ہو گیا تھا جس کی تلاش لاحاصل اور بازیافتگی ناممکن تھی۔

میری وہ رات بے چینی سے گزری۔ بھیانک خواب آتے رہے۔ صبح جاگا ہی تھا کہ اسپتال کے نیچے موٹر کے دھڑکنے کی آواز آئی۔ میں برآمدے میں آ گیا۔ مرحوم کے تیماردار اپنا سامان لے جا رہے تھے۔

"اسے رات جلا دیا گیا" میرے پاس کھڑے ہوئے چپڑاسی نے کہا۔
"اچھا آدمی تھا بیچارا! ڈاکٹر۔ صرف ایک لڑکا ہے اُس کا جو ولایت میں پڑھتا ہے"!
میرے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔ یہ تھا انجام خلیفۃ فی الارض کا جس کو سجدہ نہ کرنے کے جرم میں ایک فرشتہ کو شیطان بنا دیا گیا تھا۔

موٹر میں سامان بار ہو چکا تو دو نوکر دو عورتوں کو تھامے ہوئے باہر لائے۔
ایک ڈھلتی ہوئی عمر کی عورت ڈاکٹر مرحوم کی بیوی اور دوسری ایک ضعیفہ بیوی کی ماں۔ اس حادثۂ جانگداز نے نہیں زندہ درگور کر دیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ دو مردے ہیں جو چل رہے ہیں۔ عین اسی وقت مجھے محسوس ہوا کہ ہم لوگ درازیٔ عمر کی دعا کیوں مانگتے ہیں۔ کوئی اس ضعیفہ کو دیکھے جس کے ہاتھوں میں اس کے داماد نے جان دی جس نے اپنی آنکھوں سے اپنی بیٹی کا سہاگ لٹتے دیکھا۔ کیا قدرت نے اس کو اسی وقت کے لئے زندہ رکھا تھا آخر کیوں؟ میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ قدرت کی بھول بھلیاں کون جانے؟

....

وقت نے ایک اور کروٹ لی۔ صبح سویرے میں بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا کہ خلیفہ صاحب داخل ہوئے اور میرے چہرے پر صابن کی تہہ جماتے ہوئے بولے "مسٹر بی ٹی"!
میرے ہاتھ سے اخبار چھوٹ گیا۔ اور مجسمۂ سوال بن کر میں نے خلیفہ صاحب کی طرف دیکھا۔
خلیفہ صاحب نے صابن والے برش کو پانی میں ڈبویا اور پھر سر کو خفیف سی جنبش دے کر کہا "ختم"
مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ایک ہفتے سے ڈاکٹر تقریباً مایوس ہو چکے تھے مگر پھر بھی کوشش جاری تھی۔ حکومت نے بہترین سے بہترین طبی امداد پہنچائی ڈاکٹروں نے مقدور بھر کوشش کی۔ مگر آخر کار اٹل موت!
"ختم" میں نے کہا اور میرا سر جھک گیا۔

....

مجھے صحت ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے گھر جانے کی اجازت دے دی ہے۔ چپڑاسی اور دیگر ملازم —— انعام کی توقع میں میرے کمرے کا طواف کر رہے ہیں۔ میرے مجروح رفیق ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔ نرس کھانسی کی دوا کی خوراک لے کر داخل ہوتی ہے۔ میں مسکرا کر اُس کی طرف دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں "آخری خوراک"۔ نرس بھی مسکرا دیتی ہے اور پھر میرے بندھے ہوئے سامان کی طرف دیکھ کر کہتی ہے "مگر آپ ہم کو کبھی کبھی ملنے تو آیا کریں گے"۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکل جاتا ہے "یقیناً"۔
میں یہ کہہ کر اسپتال کو خیرباد کہہ دیتا ہوں۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے مجھے پھر خیال آتا ہے۔ زندگی بھی کس قدر عجیب ہے۔ بیلچہ۔ زخم۔ اسپتال۔ موت اور پھر —— نرس!

خادم حسین بٹالوی

انتظارِ دوست

(بندرگاہ بمبئی میں ملتان جہاز آنے سے قبل)

میں شام سے انوارِ سحر ڈھونڈ رہا ہوں
موجوں کے تلاطم میں گہر ڈھونڈ رہا ہوں
"ملتان" کو تا حدِ نظر ڈھونڈ رہا ہوں
گو وقت مقرر ہے مگر ڈھونڈ رہا ہوں

اس فکر کے قربان اس اُمید کے صدقے
صد عید نظارہ تری اک دید کے صدقے

ہر موج کی آغوش میں ہیں چاند ستارے
ساحل پہ گہرپاش ہیں سیماب کے دھارے
بالائے فضا رقص میں آہوں کے شرارے
یہ آگ بجھے گی اسی دریا کے کنارے

کل ہجر کی زحمت کا صلہ خوب ملے گا
اک عمر کا بچھڑا ہوا محبوب ملے گا

پرکیف ہوائیں ہیں جنوں خیز ہیں بادل
ساغر ہے تہی یونہی دھری رکھی ہے بوتل
چہرے سے ابھی صبح کے سرکا نہیں آنچل
گردی ہے تری راہ کے پانی میں نظر حل

مایوس نہ کر عشق کو اے جانِ تمنّا!
خوابوں سے سجایا ہے شبستانِ تمنّا

مانا ترے آنے میں فقط ایک گھڑی ہے
لیکن یہ گھڑی ساعتِ محشر سے کڑی ہے
آنکھوں سے رواں نوہرِ غلطاں کی جھڑی ہے
اے راحتِ دل! جان بچانے کی پڑی ہے

جلد آ، کوئی دم بھر ترا دیدار تو کر لے
ساحل کے قریں ڈوبنے والے کی خبر لے

سوئے ہوئے فتنوں کو جگایا نہیں میں نے
ہمراز صبا کو بھی بنایا نہیں میں نے
موجوں کو ترا گیت سنایا نہیں میں نے
بربط ہے، مگر ہاتھ لگایا نہیں میں نے

افسانۂ الفت ابھی مشہور نہیں ہے
دل کانپ رہا ہے کہ سحر دور نہیں ہے

سکندر علی وجد

پنجاب نیشنل بینک لمیٹڈ

قائم شدہ سنہ ۱۸۹۵ء

منظور شدہ سرمایہ	1,00,00,000/= روپیہ
جاری اور فروخت شدہ	50 00,000/= روپیہ
ادا شدہ سرمایہ	31,47,117/= روپیہ
ریزرو	15,15,368/= روپیہ
کاروباری سرمایہ بتاریخ 31-12-40	9,15,14,000/= روپیہ

ہیڈ آفس ۷۴۔ دی مال لاہور

چیئرمین۔ رائے بہادر دیوان بدری داس۔

ہندوستان اور پنجاب میں تمام مشہور اور تجارتی شہروں میں برانچیں قائم ہیں۔

ایجنسیاں ۔ احمد آباد (انڈیا)، رنگون (برما)، نیویارک - کوبے (جاپان)

ہر قسم کا بینکنگ اور بیرون ہند ایکسچینج کا کام نہایت رعایتی نرخوں پر کیا جاتا ہے

قواعد اور دیگر شرائط کاروبار کے لئے مینیجر صدر دفتر یا کسی برانچ سے خط و کتابت کریں۔

یودھ راج — سیکرٹری

بی این پوری بی اے ایل ایل بی — مینیجر ہیڈ آفس

اورینٹل

بیمہ زندگی کی چوٹی کی ہندوستانی کمپنی کی کامیابی کا باعث پبلک کا اعتماد ہے

۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۳۹ء کو

جاری پالیسیوں کی مالیت زائد از ۹۷½ کروڑ روپے۔ سرمایہ ۲۵½ کروڑ روپے سے زیادہ آمدنی قریباً ۴½ کروڑ روپے۔

ہمارا پراسپکٹس حاصل کرنے کے لئے جس میں ہماری دلکش تجاویز بیمہ سے متعلق تفصیلات مذکور ہیں براہ مہربانی مندرجہ ذیل پتہ پر لکھیں

لالہ گوپال داس سونی (ایف سی آئی (ایڈنبرگ) / آر ای ایس (لنڈن)) **برانچ سیکرٹری**

اورینٹل گورنمنٹ سیکیورٹی لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ ۷۴ سی دی مال لاہور

صدر دفتر بمبئی — قائم شدہ سنہ ۱۸۷۴ء

نسل انسانی کے دشمن

شیر، سانپ، جراثیم، سل اور دق

شیر اور سانپ تو گولی اور لاٹھی سے مارا جاسکتا ہے۔ مگر ان ننھے ننھے خورد بینی جراثیم کا بقراط اور سقراط کے زمانے سے کوئی خاص علاج نہیں تھا۔

لعاب اور دہن میں جراثیم ہوتے ہیں۔

گندے ہوٹلوں، گندے گلاسوں اور چائے کی پیالیوں سے یہ مرض روز بروز ترقی کر رہا ہے۔

چونکہ پھیپھڑوں کو رات اور دن کسی وقت بھی سکون میسر نہیں یعنی سانس کے ساتھ ہر وقت پھولتے رہتے ہیں اس لئے ان کے نقائص اور زخم وغیرہ دور کرنا ناممکن تو نہیں مگر از حد دشوار ضرور تھا۔

ہمدرد کی مجلس تجربات نے دس سال تک سرگرم تحقیقات جاری رکھی اور قرص سحر اور ربار الحیات دو اکسیر دوائیں دنیا کے سامنے پیش کر دیں، جن سے پھیپھڑوں کے جراثیم ہلاک ہوکر ان میں روز بروز طاقت پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے۔

ہلکی حرارت، کھانسی، سانس پھولنا، وزن کا بلا وجہ کم ہونا دق جیسے خطرے کی علامات ہیں۔ ہرگز ہرگز غفلت نہ کیجئے، ان کو فوراً قرص سحر اور ربار الحیات سے روک دیجئے۔ اگر خدانخواستہ مرض بڑھ گیا ہے تو بھی انشاء اللہ یہ دونوں دوائیں فرشتہ رحمت ثابت ہوں گی۔ اور آپ کے پھیپھڑوں میں زیادہ طاقت بھر دیں گی۔

پچھتر فی صدی ایسے اصحاب جن کے انتظار میں موت شہرت کنندہ کے برابر لگی کھڑی تھی، خدا کے فضل سے بالکل تندرست ہو گئے۔

مریض خوش ہو جائیں ماں باپ بچے، عورتیں، رشتے دار اور دوست بھی خوشیاں منائیں، زیادہ سے زیادہ چالیس روز میں مریض کو مکمل شفا ہو جاتی ہے۔

قیمت قرص سحر فی عدد دو آنے، ربار الحیات جو بارہ روز کے لئے کافی ہے، فی بوتل دو روپے (۲) ابھی منگائیے

ترکیب استعمال بہت آسان ہے، صبح کو قرص سحر ایک عدد منہ میں ڈال کر اوپر سے ربار الحیات ۵ تولہ پی لیجئے اور ترش و ثقیل چیزوں سے پرہیز، خوراک میں انار، انگور، سنگترہ استعمال کیجئے۔

غذا نرم اور زود ہضم کھائیں آش جو، ساگودانہ وغیرہ زیادہ مناسب ہے۔

ہمدرد گرما جس میں گرمی کے موسم میں تندرست اور چست رہنے کی ترکیبیں لکھی ہیں ضخامت ۳۶ صفحے
ہمدرد نوجوان جس میں نوجوان اور ادھیڑ عمر والوں کے لئے مناسب کارآمد ہدایات لکھی ہیں ضخامت ۳۲ صفحے
ہمدرد ونسواں۔ جس میں عورتوں کے امراض اور ان کے مجرب علاج لکھے ہیں۔

(حاشیہ: مفت طلب کیجئے)

ہمدرد دواخانہ یونانی دہلی

بہت دُور

آشا نے دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر رُک گئی۔ اندر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ شاید اُس کے والد سے کوئی ملنے آیا تھا۔ دروازے سے کان لگا کر آشا سُننے لگی۔ اُس کے پتا کہہ رہے تھے: "اچھا تو تم آشا کو جانتے ہو۔ مگر کیسے؟ شاید تم بھی اسی کالج میں......"

"جی نہیں" کسی نے جواب میں کہا۔ "اُن سے میری ملاقات ریکھا کے ہاں ہوئی تھی۔ ریکھا اُن کی سہیلی ہے نا؟"

"سہیلی!" آشا کے والد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ تو ایک دوسرے کی دیوانی ہیں۔ دیوانی! اور تم شاید ریکھا کے کوئی رشتہ دار....؟"

"جی نہیں" پھر جواب ملا۔ "رشتہ تو کوئی نہیں۔ بچپن سے ساتھ کھیلے ہیں۔ اور ویسے بھی دونوں گھرانوں میں پُرانا تعلق چلا آتا ہے"۔

"اسی لئے....."

آشا کسی سوچ میں پڑ گئی۔ اُس کے بعد کیا کیا باتیں ہوئیں، اُس نے نہیں سُنیں کرسی کھسکانے کی آہٹ سے اُس کا دھیان ٹوٹا تو اُس کے والد کہہ رہے تھے۔

"اچھا سریش بابو۔ اب تو آیا کرو گے نا؟"

"جی ہاں۔ کیوں نہیں"۔

اور پھر زینوں پر پاؤں کی آہٹ نے آشا کو بتایا کہ کمرے میں اُس کے والد تنہا رہ گئے ہیں۔ آشا کے کمرے میں قدم رکھتے ہی وہ بولے "سریش آیا تھا"

"اچھا!" آشا نے لاپروائی دکھاتے ہوئے کہا۔ "کیوں؟"

"یونہی۔ ملنے۔ تم تو اُس کو جانتی ہو نا؟"

"ہاں"

"کتنا اچھا لڑکا ہے!"

آشا خاموشی سے میز کی چیزیں سنبھالنے لگی۔ اس کی نظر ایک خط پر پڑی لفافہ ہاتھ میں اُٹھا کر اُس نے والد کی طرف دیکھا۔ "پرکاش بابو کا خط! کب آیا؟"

"ابھی۔ میں پڑھ ہی رہا تھا کہ سریش آ گیا۔ اسی سے تم کو کہنا بھول گیا۔ معلوم ہے کیا لکھا ہے؟"

آشا خاموشی سے والد کے اگلے فقرے کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن والد نے ناراضگی سے کہا: "تم خود ہی پڑھ لو"

آشا پڑھنے لگی مگر والد خاموش نہیں رہ سکے۔ وہ چاہتے تھے کہ اُن کی لڑکی اُن سے ہی پوچھے کہ خط میں کیا لکھا ہے۔ اور جب آشا نے ایسا نہیں کیا تو وہ خود ہی کہنے لگے "لکھا ہے حساب کا پرچہ پھر خراب ہو گیا ہے۔ پھر خراب ہو گیا ہے! ہونہہ۔ چاہتے ہیں بغیر محنت کئے ہی کامیاب ہو جائیں"۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ بابو جی۔ آپ جانتے ہیں کہ اُن کی صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ اس پر بھی وہ اتنی محنت کرتے ہیں کہ...."

"خاک محنت کرتے ہیں۔ محنت کرتے ہیں تو دو سال سے پرچہ خراب کیوں ہو جاتا ہے۔؟"

آشا خاموش بیٹھی خط پڑھتی رہی۔

ذرا رُک کر والد پھر بولے بے پروائی۔ "کھانے کو ملتا ہے نا!"

آشا آہستہ سے اُٹھی۔ اور خط ہاتھ میں دبائے کمرے سے چلی گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر اُس نے دروازہ بند کیا اور پلنگ پر لیٹ کر خط پڑھنے لگی۔ خط ختم کر کے اٹھی اور کھڑکی کی چوکھٹ سے سر لگا کر آسمان پر بھاگتے ہوئے بادل کے ٹکڑوں کو دیکھنے لگی۔ اُسے بچپن کے گزرے ہوئے دن یاد آ گئے۔ تب بھی وہ اور پرکاش گھاس پر لیٹ کر گھنٹوں بادلوں کی بنتی اور بگڑتی ہوئی شکلوں کو دیکھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں اُس کی ماں بھی زندہ تھی اور پرکاش کی بھی۔ پرکاش کا باپ نہیں تھا ویسے بھی وہ بہت غریب تھے۔ آشا چھوٹی تھی مگر سب کچھ سمجھتی تھی اور شاید اسی سے پرکاش سے ہمدردی کرتی تھی۔ اُس کا خیال رکھتی۔ کبھی کوئی پرکاش کو کچھ کہتا تو اُس کی سی کہتی۔ اکثر رو بھی دیتی۔ جب آشا کی ماں اُس کو چھوڑ گئیں تو وہ پرکاش کی ماں کو ہی "ماں" پکارنے اور سمجھنے لگی۔ مگر جب پرکاش کی ماں بھی نہ رہیں تو آشا نے خود اپنی اور پرکاش کی ماں کی جگہ لینے کی کوشش شروع کر دی کھیل کود سے اس کا جی جیسے ہٹ سا گیا۔ پرکاش اور اپنے والد کی دیکھ بھال ہی گویا اُس کا فرض ہو گیا۔ اُس کے والد نے بھی یہ تبدیلی دیکھی اور "میری ننھی مالکن" کہہ کر اُس کا مذاق اڑانے لگے مگر آشا نے اپنی روش نہ بدلی اور آہستہ آہستہ اُس کے والد نے بھی اُس کو گھر کی مالکن مان لیا۔ سب کچھ آشا کے ہی حکم سے ہونے

لگا۔ پرکاش بھی ـــ جواب اسی گھر میں رہتا تھا۔ یہ بات جانتا تھا اور خاموشی سے آشا کی مرضی کے سامنے سر جھکا دیتا تھا۔ اسی طرح کئی سال گذر گئے۔ آشا بڑی ہوگئی۔ اس کے والد پنشن لے چکے تھے۔ پرکاش تعلیم کی غرض سے نزدیک کے ایک بڑے شہر میں جا چکا تھا۔ وہ کبھی کبھی خط بھی لکھا کرتا اور ۔۔۔۔ خط کا خیال آتے ہی آشا نے اپنے ہاتھ کو اٹھایا پرکاش کا خط ابھی تک اُس کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

(۲)

سُریش اب اکثر آنے لگا۔ وہ گھنٹوں آشا کے والد کے پاس بیٹھا دُنیا جہان کی باتیں کیا کرتا۔ آشا کے والد بھی روز بروز سریش کے گرویدہ ہوتے جاتے تھے۔ بغیر سریش سے صلاح لئے کوئی کام بھی نہ کرتے۔ اگر اُن کو کسی دوا کی ضرورت ہے تو سریش لا رہا ہے۔ اگر کسی کو خط لکھوانا ہے تو سریش لکھ رہا ہے اخبار وہ سریش سے پڑھوا کر سنتے۔ غرض اُن کے سب کام جو پہلے آشا کیا کرتی تھی اب سریش نے سنبھال لئے۔

آشا یہ سب کچھ چپ چاپ دیکھتی۔ مگر یہ کوئی نہ جانتا تھا کہ سریش کی یہ گھر کا آدمی بننے کی کوشش اُس کو کیسی لگتی تھی۔ والد کے جو بھی کام سریش کرنا چاہتا، آشا کچھ کہے بغیر اُن سے ہاتھ کھینچ لیتی۔ لیکن جب سریش آشا کے اپنے کاموں میں ہاتھ بٹانا چاہتا اور کہتا۔ "لائیے میں کر دوں۔ آپ کو تکلیف ہوگی"۔

تو آشا آہستہ سے کہہ دیتی۔ "نہیں نہیں۔ مجھے تو عادت ہے"۔

سُریش جب بھی آتا آشا کسی نہ کسی کام میں لگی ہوتی۔ وہ اکثر ہنس کر کہتا "آپ تو جب دیکھو کام میں ہی لگی ہوتی ہیں۔ کبھی بات کرنے کی بھی فرصت نہیں"۔

جواب میں آشا یونہی ذرا مُسکرا دیتی۔

سُریش جب دوپہر کو آتا تو اکثر آشا والد کے کمرے میں ہی بیٹھی کچھ نہ کچھ کاڑھ یا بُن رہی ہوتی۔ وہ اپنے کام میں لگی دونوں کی باتیں سنتی رہتی۔ جب کبھی اس کے والد پوچھتے "کیوں بیٹی ٹھیک کہتا ہوں نا میں؟"

یا سریش کہتا۔ "آپ کا کیا خیال ہے اس کے متعلق ـــ؟"

تو وہ کوئی مختصر سا جواب دے دیتی اور پھر خاموش ہو رہتی۔

اس خاموشی کو سُریش بھی محسوس کرتا تھا۔ آخر ایک دن اُس نے آشا سے تنہائی میں کہا "ایک بات آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں ـ جواب ملے گا؟"

آشا نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ سریش آشا کی "ہاں" کا انتظار کئے بغیر ہی کہنے لگا۔ "کیا آپ کو میرا یہاں آنا بُرا لگتا ہے؟"

"مجھے کیوں برا لگے گا؟" آشا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ آتے ہیں تو بابو جی کا دل بہل جاتا ہے۔ وہ آپ کو کتنا پسند کرتے ہیں اور پھر آپ اتنے اچھے آدمی ہیں ہر کسی کا کام کر دیتے ہیں، ہر کسی سے ہمدردی ۔۔۔۔"

"بس" سریش پہلے ہی بول اٹھا "یہی جاننا چاہتا تھا۔ شکریہ!" ہاتھ کا ہیٹ سر پر جماتے ہوئے وہ کمرے سے چلا گیا۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

(۳)

ایک دن باتوں ہی باتوں میں کچھ حساب کا ذکر آ گیا۔ آشا کے والد پوچھ بیٹھے "اچھا سریش تم نے بھی تو بی اے میں حساب لیا تھا۔ کیا بہت مشکل مضمون ہے؟"

"ہاں زیادہ تر لڑکے تو یہی کہتے ہیں۔ لیکن میں تو سب سے زیادہ نمبر حساب میں ہی لیتا رہا"۔

"زیادہ تر لڑکے کیا"۔ آشا کے والد بولے۔ "وہی کہتے ہیں جو پڑھنا نہیں چاہتے"۔

سریش ذرا سا مسکرا دیا۔ "ہاں یہ بھی ہے۔ کیوں کیا آپ کا بھی کوئی ـ؟"

"ہاں۔ ہمارے پرکاش بابو ہی ۔۔۔۔"

"پرکاش بابو کون ـــ؟"

"اوہ ـ شاید میں نے پرکاش کا ذکر تم سے ابھی تک نہیں کیا"۔

اور پھر وہ پرکاش کا حال سُریش کو سنانے لگے۔ "وہ میرے ایک غریب دوست کا لڑکا ہے۔ بیچارہ ریل کے حادثے میں جان کھو بیٹھا تھا۔ اس روز سے پرکاش اور اُس کی ماں ہمارے ہاں رہنے لگے۔ آشا کی ماں نے اُسے اپنی بہن بنایا ہوا تھا اس کے بعد آشا نے بھی اُسے ماں کہہ کر ہی پکارا۔ لیکن جب وہ بھی نہ رہی تو ۔۔۔۔"

آشا جو ابھی تک وہیں بیٹھی تھی۔ آہستہ سے اُٹھی اور اپنے بُننے کی تھیلی بغل میں دبا کر باہر چلی گئی۔ شام ہو چلی تھی۔ سردی کے دن تھے۔ وہ مکان کے سامنے ٹہلنے لگی۔ اُس کے ہاتھ غیر معمولی طور پر تیزی سے چل رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد سریش گھر جانے کو نکلا اور تعجب سے بولا۔ "ارے! آپ یہاں اکیلی گھوم رہی ہیں اور وہاں بابو جی کب سے آپ کو آوازیں دے رہے ہیں"۔

"جاتی ہوں" آشا نے رُکھائی سے جواب دیا۔

"آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"مجھ سے؟ کہئیے۔"

سینے کا سامان تھیلی میں ڈال کر آشا سُریش کے بہت نزدیک آکر کھڑی ہوئی۔ ایک منٹ تک خاموشی سے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ پہلے دن جب آپ آئے تھے اور بابو جی نے آپ سے پوچھا تھا کہ ریکھا سے آپ کا کوئی رشتہ ہے تو آپ نے نہیں کہہ کر اُن سے چھپایا کیوں؟"

سریش کو شاید اس سوال کی اُمید بالکل نہ تھی۔ وہ ایک منٹ تک کوئی جواب نہ دے سکا۔ آشا نے اپنی آواز کو اور بھی تلخ بنا کر کہا "میں سمجھتی تھی کہ آپ جھوٹ نہیں بولتے۔" لیکن سریش نے ذرا رک کر جواب دیا۔

"میں نے تو کبھی یہ دعوےٰ نہیں کیا۔"

"لیکن میں سمجھتی تھی!"

اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر آشا تیزی سے مکان کے اندر چلی گئی۔ اُس کے والد میز پر کچھ تلاش کر رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر بولے "تم کہاں تھیں آشا بیٹی؟ میں نے کتنی ہی آوازیں دیں۔ میں پوچھ رہا تھا کہ وہ پرکاش کا خط کہاں گیا۔ کیا تم لے گئی ہو۔ یہاں تو ملتا نہیں۔ اُس کا جواب بھی تو دینا ہوگا۔"

آشا نے ہاتھ سے تھیلی کرسی پر رکھتے ہوئے کہا "میں نے جواب دے دیا ہے۔"

آشا کے والد تعجب سے اپنی لڑکی کی طرف دیکھنے لگے۔ "جواب دے دیا ہے! کب؟"

"کئی روز ہوئے۔"

"کیا لکھا تھا؟"

"وہی جو آپ لکھنا چاہتے تھے۔"

بوڑھے چہرے کی حیرانی ناراضگی میں بدل گئی۔

آشا کہتی گئی: "میں نے اُن کو لکھ دیا ہے کہ آپ ساری عمر اُن کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے۔ اب اُن کو پڑھائی چھوڑ کر اپنے بل پر کھڑے ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔" والد کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ انہوں نے کہا "میں تو کبھی نہ لکھتا۔"

"ہو سکتا ہے کہ آپ نہ لکھتے۔ مگر لکھنا تو یہی چاہتے تھے۔"

اُن کا چہرہ اور بھی سخت ہو گیا۔ انہوں نے چلا کر کہا "آشا!"

"مجھے سچ بات کہنے دیجئے بابو جی! کسی سے نفرت کرتے ہوئے بظاہر اُس سے ہمدردی کرنا۔ اُس پر احسان کرنا۔ اس سے بڑھ کر ایک انسان کی بے عزتی اور کیا ہو سکتی ہے۔" اور پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا کر آشا بولی "مجھ سے یہ نہیں دیکھا جا سکتا۔ میں یہ نہ ہونے دوں گی۔"

آشا کے والد بیٹی کا چہرہ نہ دیکھ سکے لیکن انہوں نے جان لیا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔ محبت سے اُس کے سر پر اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ کہنے لگے "آشا بیٹی۔ مجھے معلوم نہ تھا میں نے تمہیں دکھ پہنچایا ہے۔ اب کبھی ایسا نہیں ہوگا۔"

آشا نے اپنے ہاتھوں میں اُن کا ہاتھ دبا لیا۔

. . . .

(۴)

چار دن ہو گئے۔ سریش نہیں آیا۔ آشا کے والد روز پوچھتے۔ "کیا بات ہے۔ آج بھی سریش نہیں آیا۔" آشا کہہ دیتی "شاید اُن کی طبیعت ٹھیک نہ ہو۔" آخر والد بولے۔ "تو بیٹی ایک رقعہ لکھ کر بھجوا دو نا۔" آشا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جا کر ملازم کو والد کے پاس بھیج دیا۔ ملازم واپس آکر بولا۔ "بابو کہتے ہیں۔ ایک رقعہ لکھوا کر لے جاؤ۔"

آشا چند لمحوں تک کھڑی کچھ سوچتی رہی اور پھر کاغذ پنسل لے کر بیٹھ گئی۔ رُک رُک کر اُس نے لکھا:۔

"سریش بابو!

آپ چار روز سے نہیں آئے۔ ناراض ہو گئے کیا؟ اُس شام کو میں آپ سے کچھ ایسی باتیں کہہ بیٹھی جو شاید مجھے نہیں کہنا چاہیئے تھیں۔ مجھے افسوس ہے۔ بابو جی روز آپ کا انتظار کرتے ہیں۔ آج آئیے گا؟

آشا

اُس روز شام کو سریش آیا۔ اور پھر پہلے ہی کی طرح روز آنے لگا۔ آشا سے اب بھی اُس کی اُسی طرح باتیں ہوتیں لیکن ریکھا کا ذکر بھول کر بھی وہ نہ کرتا۔ آشا بھی اُس کا نام نہ لیتی۔

دن گذرتے گئے۔ سردی خوب پڑنے لگی۔ ایک روز آشا کے والد بارش میں بھیگ گئے بوڑھے آدمی کو کھانسی اور زکام نے گھیر لیا۔ ایک ہفتہ گذرتے گذرتے تکلیف بڑھ گئی۔ حرارت بھی ہونے لگی چلتے تو ہانپ جاتے۔ سانس لینے میں تکلیف ہوتی۔ سریش دن میں کئی کئی بار آنے لگا۔ کبھی ڈاکٹر کو لے کر آتا کبھی دوا لینے جاتا۔ تمام دن دوڑ دھوپ میں لگا رہتا۔ جہاں

تک ہوسکتا وہ تیمارداری میں آشا کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا مگر آشا کو پھر بھی بہت محنت کرنی پڑتی۔ سارا سارا دن دم لینے کی فرصت نہ ملتی۔ کبھی کبھی تو رات کو بھی سونا نصیب نہ ہوتا۔

ایک دن آشا کے والد نے سُریش سے کہا۔ "دیکھتے ہو لڑکی کی کیا صورت نکل آئی ہے؟ رات رات بھر جاگتی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں یہ بھی بیمار نہ ہو جائے"۔

سریش بولا۔ "اگر یہ نہ کریں تو کون کرے۔ کوئی مدد کرنے والا بھی تو نہیں" اور پھر ذرا سوچ کر بولا۔ "اگر آپ مناسب سمجھیں تو تھوڑے روز کے لئے میں یہیں رہ جاؤں۔ مجھے دن بھر کوئی تکان نہیں ہوتی۔ میں تو رات کو خوب جاگ سکتا ہوں"۔

آشا کے والد نے اپنی لڑکی کی طرف دیکھا۔ آشا نے اُن کا مطلب سمجھ کر کہا۔ "اس کی کیا ضرورت ہے۔ ایک دو روز کی تو بات ہے پھر تو پرکاش بابو آ ہی جائیں گے"۔

"پرکاش آجائے گا؟"

"ہاں۔ میں نے انہیں آنے کو لکھ دیا ہے"۔

آشا کے والد نے آہستہ سے سر ہلایا۔ گویا انہیں پرکاش کے آنے کی اُمید نہ تھی۔ مگر آشا نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا "وہ ضرور آئیں گے"۔

والد نے پھر کچھ نہیں کہا۔ مُنہ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔

. . . .

(۵)

دوسرے روز ہی پرکاش آگیا۔ اُس نے آتے ہی تیمارداری کا سب کام سنبھال لیا۔ آشا بے فکر سی ہوگئی۔ سریش بھی شام کو بس ایک دفعہ ہو جاتا۔ مریض کی حالت سُدھر رہی تھی۔

ایک روز شام کو سریش آیا تو پرکاش اور آشا سیر کو جانے کے لئے تیار تھے پرکاش نے کہا۔ "آپ بھی چلئے نہ سُریش بابو"۔

سریش بولا۔ "میں تو بابوجی کو دیکھنے آیا تھا۔ آپ لوگ جائیے میں اُن کے پاس بیٹھتا ہوں"۔ آشا نے کہا۔ "بابوجی آج اچھے ہیں۔ اس وقت ذرا سو گئے ہیں"۔

سُریش نے واپس جانا چاہا۔ مگر آشا بولی۔ "آپ کو ایسی کیا جلدی ہے ہمارے ساتھ چلئے نا!"

سریش راضی ہوگیا۔ راستے میں آشا نے پرکاش سے کہا۔ "ہر ایک مصیبت گذر جانے پر آسان معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اب بھی میں سوچتی ہوں کہ اس بیماری میں اگر مجھے سریش بابو کا سہارا نہ ہوتا تو شاید تمہارے آنے تک تو میں گھبراہٹ سے پاگل ہو جاتی۔ ان سے مجھے بہت سہارا رہا۔

سریش نے کوئی جواب دینے کی کوشش نہیں کی۔ سر جھکائے خاموشی سے چلتا رہا۔ لوٹتے ہوئے سریش گھر تک ساتھ نہیں آیا۔ راستے میں ہی سے چلا گیا۔ سریش کے جانے کے بعد پرکاش نے کہا۔ "آشا تمہارے سریش بابو تو بڑے اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں"۔

آشا نے اِس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر پرکاش بھی نہیں بولا۔ باقی راستہ خاموشی سے گذرا۔ گھر پہنچ کر پرکاش نے کہا۔ "میں کل واپس جا رہا ہوں"۔

آشا کو تعجب ہوا۔ "کیوں کیا چھٹی ختم ہوگئی تمہاری؟"

"ہاں"

"کچھ دن کی اور نہیں مل سکتی؟"

"اس کی ضرورت کیا ہے۔ بابوجی اب اچھے ہیں۔ میں یہاں رہ کر کیا کروں گا؟"

آشا خاموش ہوگئی۔

دوسرے روز پرکاش چلا گیا۔ جانے کے فوراً بعد ہی اُس کا ایک خط آیا آشا کے والد کے نام لکھا تھا۔

"میں نے کالج چھوڑ دیا ہے۔ اگلے مہینے سے روپیہ مت بھیجنا میں اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہونے کی کوشش کروں گا۔ کل ہی یہاں سے جا رہا ہوں خط کا جواب نہ دینا"۔

خط پہلے آشا نے کھولا۔ پڑھا۔ اور پھر والد کو دے کر چلی آئی۔ آدھ گھنٹے بعد والد کے کمرے میں گئی تو دیکھا وہ ابھی تک خط ہاتھ میں پکڑے ہوئے بیٹھے ہیں۔ آشا کو دیکھ کر انہوں نے عینک اُتاری اور نمدار آنکھوں کو رومال سے پونچھا آشا نے انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "آپ اتنے دُکھی کیوں ہو رہے ہیں۔ پرکاش بابو آخر ہمارے کون ہیں؟"

"کیوں، کوئی نہیں ہیں کیا؟"

"کوئی نہیں"

"مجھے بہکانا چاہتی ہو بیٹی؟ ذرا ادھر تو دیکھو"۔

آشا نے والد کی طرف دیکھا۔ چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔ مگر نہ لا سکی۔ اُس کے بجائے آ گئے آنکھوں میں آنسو۔ پلنگ کی پٹی پر سر رکھ کر رونے لگی۔

کسی کے پاؤں کی آہٹ پا کر آشا نے سر اٹھایا۔ دروازے میں سریش کھڑا تھا۔ ایک لمحہ تک سریش کچھ سمجھ نہ سکا۔ آخر آگے بڑھ کر بولا۔ "کس کا خط ہے؟"

سوال شاید آشا سے کیا گیا تھا لیکن اُسے خاموش دیکھ کر والد بولے "پرکاش کا" آنچل سے آنکھیں چھپاتی ہوئی آشا کمرے سے چلی گئی۔ اپنے تئیں سنبھال کر جب وہ لوٹی تو اُس کے والد سریش سے کہہ رہے تھے "پرماتما جانتا ہے، میں نے ہمیشہ پرکاش کو اپنا لڑکا سمجھا۔ صرف ایک دفعہ غصے میں میرے مُنہ سے کچھ نکل گیا اور یہ اُسی کی سزا مجھے دی گئی ہے"۔

آخری فقرہ انہوں نے آشا کی طرف دیکھ کر کہا۔ آشا اُن کا مطلب سمجھ گئی۔ پلنگ کے قریب جا کر آہستہ سے بولی "میں جانتی ہوں بابو جی قصور میرا ہے۔ لیکن آپ غصہ نہ کیجئے طبیعت خراب ہو جائے گی"۔

والد خاموش تو ہو گئے۔ مگر دماغ سے اُس بات کو نہ نکال سکے۔ تمام رات نہیں سوئے۔ صبح تک طبیعت کافی خراب ہو گئی۔ وہ دن بھی یوں ہی گذرا۔ آخر سریش ڈاکٹر کو لایا۔ اُس نے نیند کے لئے انجکشن لگایا۔ اور تمام رات کسی کو مریض کے پاس بیٹھنے کی ہدایت کر کے چلا گیا۔

اندھیرا ہوتے ہی آشا نے ملازم کو چھٹی دے دی۔ مکان کے سب دروازے بند کئے اور خود ایک شال لے کر والد کے کمرے میں آ بیٹھی۔

دس بج گئے۔ مکان میں بالکل خاموشی تھی کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا آشا نے دروازہ کھولا تو دیکھا سریش تھا۔ سُریش نے آہستہ سے کہا "کیسے ہیں بابو جی؟"

"اچھے ہیں۔ ابھی آنکھ لگی ہے"۔

"شکر ہے۔ اچھا ذرا ہٹیے۔ مجھے اندر تو آنے دیجئے"۔

"آئیے — لیکن ..... اگر ذرا سی بھی آہٹ ہوئی تو نیند نہ ٹوٹ جائے مجھے خیال ہے"۔

دونوں دبے پاؤں زینے چڑھنے لگے۔ والد کے کمرے کے سامنے پہنچ کر سریش رُکا۔

"رات کو جو دوائیں دینی ہیں۔ وہ میز پر ہی رکھی ہیں نا؟"

"ہاں۔ لیکن آپ ....."

"بس تو آپ جا کر سو جائیے۔ میں یہاں بیٹھا ہوں"۔

"اس کی کیا ضرورت ہے سُریش بابو۔ میں تو آسانی سے جاگ سکتی ہوں"۔

"اور میں نہیں جاگ سکتا؟"

"جاگ کیوں نہیں سکتے۔ لیکن ....."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ آپ جائیے"۔

"نہیں میں آپ کو نہیں جاگنے دوں گی"۔

آشا نے یہ بات اس لہجے میں کہی کہ سریش چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

آشا اپنی آواز کو ذرا نرم بنا کر بولی "دیکھئے سریش بابو آپ نے ہم لوگوں کے لئے آج تک جو کچھ کیا ہے۔ وہ کیا کم ہے؟ میں آپ کا احسان کبھی نہ بھول سکوں گی۔ لیکن ضرورت کے بغیر میں آپ کو تکلیف نہیں اٹھانے دوں گی"۔

"اوہ۔ آپ اسے احسان سمجھتی ہیں؟"

"اور کیا سمجھوں —؟"

"لیکن جب پرکاش بابو ذرا ذرا رات کو جاگا کرتے تھے تب تو آپ احسان نہیں سمجھتی تھیں"۔

"سُریش بابو! پرکاش بابو کی بات رہنے دیجئے۔ اُن سے آپ کو کیا مطلب ہے؟"

"کچھ نہیں، مگر آپ اتنے زور سے کیوں بول رہی ہیں۔ بابو جی سوئے ہوئے ہیں"۔

آشا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکا لیا۔ اُس کی نگاہیں سریش کے جوتوں پر جم گئیں۔ دونوں خاموش تھے۔ آخر آشا کے کانوں نے سُنا "میں جا رہا ہوں"۔ اور جن دو جوتوں پر اُس کی نگاہیں ٹکی ہوئی تھیں۔ اُن میں حرکت ہوئی۔

آشا نے سر اٹھایا تو وہ تنہا کھڑی تھی

....

(۶)

جب تک آشا کے والد کی طبیعت ٹھیک نہ ہوئی سریش روزانہ ایک آدھ چکر لگا جاتا۔ مگر اُن کے اچھا ہوتے ہی اُس نے آنا بہت کم کر دیا۔ آشا کے والد نے ایک بار کہا بھی "تم تو اب آتے ہی نہیں سریش کیا ہم سے ناراض ہو گئے؟"

سُریش نے ہنس کر کہا "آپ لوگوں سے کوئی ناراض ہو سکتا ہے"!

اور پھر ذرا سنجیدہ ہو کر بولا "میرا کم آنا ہی اچھا ہے میں اچھا آدمی نہیں ہوں"۔

اور پھر ذرا سا مسکرا دیا۔ گویا دوسری بات بھی مذاق میں ہی کہی ہو۔

چلتے ہوئے سریش نے پوچھا "پرکاش بابو کا کوئی خط آیا؟"

آشا نے تو جیسے سُنا نہیں۔ والد نے کہا "کوئی نہیں"

پندرہ روز گذر گئے سریش نہیں آیا آخر ایک دن صبح سویرے ہی آ گیا۔ آشا کے والد تو سیر کو گئے ہوئے تھے۔ آشا چائے تیار کر رہی تھی۔ سریش نے آتے ہی پوچھا "کوئی خط آیا۔ پرکاش بابو کا۔؟"

کیتلی میں چائے کی پتیاں ڈالتے ہوئے آشا نے رکھائی سے کہا "نہیں"

سُریش نے اس رُکھائی کو نظر انداز کر دیا اور کرسی کھینچ کر اُس پہ ایک پاؤں دھرتے ہوئے بولا "یہ کہاں ہیں۔ کیا یہ بھی پتا نہیں لگا؟"

آشا نے چائے کا ڈبہ ہاتھ سے رکھ دیا "دیکھتی ہوں۔ آپ کو پرکاش بابو کی بہت فکر ہے۔"

سُریش کرسی کے بازو کو تھامے خاموش کھڑا رہا۔

آشا کہتی گئی "اگر انسان کسی سے بھلائی کرتا ہے۔ اُس پر احسان کرتا ہے۔ تو کیا اُس کے بدلے میں اُسے تکلیف پہنچانے کا حق بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ آپ نے ہم لوگوں سے جو ہمدردی ظاہر کی ہے۔ کیا اب آپ اُسی کی قیمت لے رہے ہیں؟"

سُریش اب بھی کچھ نہیں بولا۔ بہت دیر تک کرسی کو تھامے اسی طرح کھڑا رہا گویا اس کے ہاتھ کسی جاندار چیز کو پکڑے ہوئے ہوں۔ اور پھر میز پر رکھے ہوئے چینی کے برتنوں کو دیکھتے ہوئے بولا "میں نے پرکاش بابو کے متعلق ایک خبر سنی تھی اور میں جاننا چاہتا تھا کہ آپ لوگ . . . . ."

آشا نے اُسے بات پوری کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔ "بابو جی گھومنے گئے ہیں آتے ہی ہوں گے۔ آپ اُنہیں سے سب کچھ کہئے گا۔"

"اچھا" سُریش نے کرسی کو دھکیل دیا۔ "شاید وہ راستے میں ہی مل جائیں۔"

سُریش زینے سے اُترنے لگا۔ آشا نے پکارا "سُریش بابو!"

سُریش رُک گیا۔ آشا نے اوپر ہی سے کہا "میں نے سنا ہے کہ آپ نے ریکھا کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ کیا یہ بات ٹھیک ہے؟"

"ہاں"

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

"مجھے ڈر ہے کہ میں اس کا جواب آپ کو نہ دے سکوں گا۔"

ایک لمحہ خاموش رہ کر آشا بولی "سُریش بابو۔ آپ نے ریکھا کے ساتھ بے انصافی کی ہے۔ آپ نے ایسا کر کے اچھا نہیں کیا۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ ریکھا آپ کو کتنا . . . ."

"جانتا ہوں۔"

اور پھر آشا کو کچھ اور کہنے کی مہلت نہ دیتے ہوئے سُریش دھم دھم کرتا ہوا زینے سے اتر کر چلا گیا۔

سُریش چلا گیا۔ مگر آشا وہیں کھڑی رہی۔ جب والد سیر سے واپس آئے تب بھی آشا وہیں کھڑی تھی۔ انہیں دیکھ کر بولی "آپ کو سُریش بابو ملے؟"

"نہیں تو۔ کیا یہاں آیا تھا؟"

آشا نے آہستہ سے کہا "ہاں" اور پھر بولی۔ "اچھا چائے پینے چلئے۔"

چائے پیتے ہوئے والد بولے "اتنے سویرے ہی کیوں آیا تھا؟"

"ایسے ہی۔ شاید آپ سے کوئی کام ہو۔"

"تو میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟"

"معلوم نہیں۔ ممکن ہے پھر کسی وقت آئیں۔"

مگر سُریش پھر نہیں آیا۔ دوسرے روز بھی نہیں۔ تیسرے روز علی الصباح زینوں پر کسی کے پاؤں کی آہٹ سُن کر آشا سُریش سے ملنے کی امید میں کمرے سے نکل آئی۔ مگر آنے والے کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ "پرکاش بابو آپ؟"

پرکاش مسکرا دیا۔ "اتنی حیران کیوں ہوتی ہو۔ یہ بتاؤ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"میری طبیعت کو کیا ہوا؟ اچھی ہے۔"

"بالکل اچھی ہے؟"

"ہاں . . . . . آپ سوچ میں کیوں پڑ گئے؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ سُریش بابو نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟"

"انہوں نے آپ سے کیا کہا؟"

"یہی کہ تم سخت بیمار ہو اور اگر میں . . . . ."

"سُریش بابو آپ کو کہاں ملے؟"

"ملے؟ ارے وہی تو مجھ کو کھینچ کر لائے ہیں۔"

"خود بھی آئے ہیں؟"

"ہاں اسٹیشن تک تو ساتھ ہی تھے۔ یہاں نہیں آئے۔ کہتے تھے میں بہت جلد کہیں باہر جا رہا ہوں۔ بہت ضروری کام ہے۔"

"باہر جا رہے ہیں۔ کہاں؟"

"یہ تو میں نے نہیں پوچھا . . . . . کیوں؟"

"کچھ نہیں!"

"بابو جی کہاں ہیں؟"

"اپنے کمرے میں"

پرکاش نے آشا کی طرف دیکھا۔ مگر اُس کی نگاہیں نیچے اترتے ہوئے زینوں پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک منٹ تک کچھ سوچ کر پرکاش آشا کے والد سے ملنے چلا گیا۔ آشا اُسی طرح کھڑی رہی۔

پرکاش کو دیکھتے ہی آشا کے والد تو خوشی کے مارے کرسی چھوڑ

کر کھڑے ہو گئے۔ سوالوں کی بوچھاڑ ہی تو کر دی۔ پرکاش نے آہستہ آہستہ سب کچھ بتا دیا۔ سب سُن کر بولے "اچھا تم آشا سے بھی ملے؟ آشا!"

لیکن آشا تو پہلے ہی دروازے میں کھڑی تھی۔ کہیں جانے کو تیار

"یہ کیا؟" والد نے حیرت سے پوچھا "تم کیا کہیں جا رہی ہو؟"

"ہاں۔ سریش بابو کے ہاں"۔

والد نے سمجھا مذاق کر رہی ہے۔ ہنس کر بولے "سریش کے ہاں، کیوں؟"

"کام ہے" آشا نے کسی قدر رُکھائی سے کہا۔ اور پھر پرکاش کی طرف دیکھ کر بولی۔ "پرکاش بابو! آپ کو بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا"

والد نے سنجیدہ ہو کر کہا "یہ کیا بچپنا کر رہی ہو آشا؟ بھوکا پیاسا پرکاش گھر میں آیا ہے اور تم سریش کے ہاں جانے کو تیار ہو۔ وہاں جانے کی ایسی جلدی کیا ہے؟"

"جلدی ہے۔ بابو جی!" آشا نے اور بھی رُکھائی سے کہا۔ اور پھر پرکاش سے بولی "آپ بھی چلیں گے پرکاش بابو یا مجھے اکیلے ہی جانا ہوگا؟"

پرکاش نے ایک بار والد کی طرف دیکھا اور پھر کھڑا ہو کر بولا "چلوں گا"

دونوں خاموشی سے باہر نکل آئے۔ آشا کے والد سناٹے میں آئے خاموش پڑے رہے ایک لفظ بھی مُنہ سے نہ نکال سکے۔

تانگے پر چڑھتے ہوئے پرکاش نے پوچھا "جا تو رہی ہو لیکن سریش بابو کا مکان بھی جانتی ہو؟"

"جانتی ہوں"

سریش مکان پر نہ ملا۔ چوکیدار مکان کے کمرے بند کر رہا تھا۔ اُس نے کہا "بابو تو ابھی ابھی اسٹیشن گئے ہیں۔ مکان چھوڑ دیا ہے۔ شاید اب واپس نہیں آئیں گے"۔

آشا نے پوچھا "تم کو معلوم ہے کہ بابو کہاں جا رہے ہیں؟"

"یہ تو نہیں معلوم" چوکیدار نے جواب دیا "مگر جو ساڑھے آٹھ بجے گاڑی چھوٹتی ہے اس سے جائیں گے"۔

سوا آٹھ بج چکے تھے۔ آشا نے تانگے والے سے پوچھا "تم دس منٹ میں اسٹیشن پہنچا سکتے ہو؟"

"کوشش کریں گے حضور!"

پرکاش بولا "اب اسٹیشن جانا بیکار ہے آشا۔ ہم نہیں پہنچ سکتے"

مگر آشا نے اُس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ تانگے والے سے بولی "جلدی چلو!"

چابک کی مار سے گھبرا کر گھوڑا سرپٹ بھاگنے لگا۔

اسٹیشن پر تانگہ رُکا تو کسی انجن کی سیٹی کی آواز آشا کے کان میں آئی اُس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ مگر وہ دوڑتی ہوئی پلیٹ فارم پر پہنچی۔ گاڑی چل چکی تھی۔ ایک ایک ڈبہ اُس کے سامنے سے گزرنے لگا وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ آخر ایک ڈبے میں کھڑکی کی طرف پیٹھ کئے کوئی بیٹھا تھا جس کے دیکھنے سے سریش کا شک ہوتا تھا۔

آشا نے پکارا "سریش بابو!"

پلیٹ فارم پر کھڑے لوگ تعجب سے آشا کی طرف دیکھنے لگے۔

مگر اُس آدمی نے سر گھما کر نہیں دیکھا۔

آشا نے پھر پکارا "سریش بابو!"

اسٹیشن کے شور میں یہ آواز بھی ڈوب گئی۔ اس آدمی کے کانوں تک اب بھی نہیں پہنچی۔

آشا نے ایک بار پھر پکارنے کو مُنہ کھولا۔ مگر وہ ڈبہ اب بہت دُور نکل گیا تھا ——— بہت دُور!

ایم بقایا

نگہہِ کرم

مجھ پہ احساں ہے تری نگہہِ کرم کا اے دوست !

زندگی جس سے حسیں لمحوں کا مجموعہ بنی
غم نے شرما کے لیا عشرتِ الفت کا نقاب
فکرِ شاعر کا حسیں خواب تھا جینا اپنا
لیکن افسوس کہ وہ لمحے بھی یوں ختم ہوئے
کسی مفلس کے جہاں سوز ارادے جیسے
بھوک کے دیو سے ٹکراتے ہیں، مٹ جاتے ہیں

ظلمتِ غم میں ہے لپٹا ہوا صحرائے حیات
منتشر جس میں ہیں افسردہ، اندھیری راہیں
دردِ راہی پہ تڑپتی ہوئی، بل کھاتی ہوئی
دُور انسانی درندوں کے شکاروں کی پکار
اُن کی امید کے بجھتے ہوئے بے نور دیے
زیست سے اور بھی بیزار کئے دیتے ہیں
اور تری راہ سے بھٹکا ہوا دھندلا رستہ
غم میں ڈوبا ہوا تنہائی سے گھبرایا ہوا
میں امنگوں کی شکستوں کی گرانباری میں
اس پہ مدہوش سے قدموں سے چلا جاتا ہوں
لڑکھڑاتے ہیں قدم یاس کی تاریکی میں

پر چمک اٹھتے ہیں وہ لمحے ستاروں کی طرح
حسرتیں پھر سے تمنا میں بدل جاتی ہیں
پھر سے کھا لیتا ہوں میں زیست کا سادہ سا فریب
کتنا احساں ہے تری نگہہِ کرم کا اے دوست ؟

مسعود احمد قریشی

ہندی جوان

ساقِ سیمیں کا فسوں رنگِ جنوں لے آیا،
کیوں سکوں سر کو نگوں کر کے ہوا محوِ ملال ؟
کیوں نظر آتے ہیں پھیلے ہوئے بازو مجھ کو!
مری آنکھوں میں ہیں اپنے بازو
جیسے اِک پیڑ کے ٹہنے ہوں کہیں پھیلے ہوئے
جن پہ طائر کا نشیمن کبھی بنتا ہی نہ ہو
سُوکھتے جاتے ہوں ٹہنے غمِ محرومی سے۔

کیسی ڈھلوان سے پھسلا ہے شعور!
سوچ اک تیتری بن کر یوں اُڑی جاتی ہے،
اے جواں سال! ترے دل کو لبھاتا ہے یہ منظر لیکن
مرمریں قصر کا لذّت سے یہ لبریز ستون
اپنی دُوری، تری مجبوری سے
کہیں احساس کو ہی ساکت و جامد نہ کرے۔
اپنی محرومی پہ بل کھاتے ہوئے، جھنجلا کر
جاگ اُٹھا ہے خیال
پیرہن شعلے کی مانند لپک اُٹھے ترا۔
اور مجھے غرقِ مے رنگِ نسائی کر دے۔

لیکن اک منظرِ پس ماندہ نظر آئے گا
دلکشی جس کی پلٹ کر مجھے جانے ہی نہ دے گی آگے
اِس حکایت میں مَیں پسماندہ ہی رہ جاؤں گا۔

ذہن آلودہ ہے افسانے سے
وہ جو دیکھا تھا ابھی پردۂ سیمیں پہ نگاہوں نے مری،
رقص میں پاؤں اُٹھے جاتے تھے سر سے اُوپر،
پیرہن کا تو کہیں نام نہ تھا۔
دِل مرا غرقِ مے رنگِ نسائی ہو کر
جھُوم اُٹھا تھا جب آیا انجام۔

اب وہ افسانہ حقیقت بن کر
لوٹ آیا ہے نگاہوں میں مری۔
لیکن اُس منظرِ بے باک پہ اب
بارشِ پنبۂ لرزاں کی حیا چھائی ہے۔

چار — ہاں چار — فقط چار قدم
فاصلہ مجھ سے ترے جسم کا ہے۔

دسترس شعلہ بناتی نہیں پیراہن کو،
پیرہن شعلے کی مانند نہ لپکے گا کبھی۔

وہ جو دیکھا تھا ابھی پردۂ سیمیں پہ نگاہوں نے مری
وہ تو افسانہ تھا،
میرے مقدور میں تھا اس کا حصُول،
جیب سے میری نکل کر چاندی
روئی پہ جا کے چمک اُٹھی تھی۔
نیم عریاں یہ حقیقت نہیں قسمت میں مری
مرمریں قصر کا لذّت سے یہ لبریز ستون
ترے دامن ہی میں پوشیدہ ہے۔

مجھ کو تسلیم ہے اے ہمدمِ افسانہ طراز!
چاک آنکھوں کے تو سِل سکتے ہیں،
نیند آ سکتی ہے اب بارِ تصوّر سے مجھے،
جیب و دامن میں مگر دوری ہے۔
تُو سمجھ سکتا نہیں ہے یہ بات؟
جیب تو میری ہے، دامن اُس کا

میراجی

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

ساقی - اپریل

مسز ڈی کوسٹا۔

دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اردو میں بھی جدید افسانوی ادب نے فن کاری کے اعتبار سے تین مختلف لیکن واضح راہیں اختیار کی ہیں۔ خارجی انداز نظر، داخلی تجزیہ۔ اور ان دونوں کا امتزاج، تخیلی مشاہدہ۔ اول الذکر اسکول کے تابعین کی تعداد سب سے زیادہ ہے لیکن اول درجے کے لکھنے والے بہت کم ہیں۔ ان کے فکر کی بنیاد سراسر مشاہدہ پر ہوتی ہے۔ وہ تخیل سے بہت کم مدد لیتے ہیں لیکن جزئیات پر ان کی نگاہ نہایت گہری ہوتی ہے اور وہ اپنی تخلیق کے نقوش اپنی قوتِ مطالعہ کی مدد سے ابھارتے ہیں۔ ثانی الذکر طبقے کے افسانہ نگار فاتی تحلیل سے کام لیتے ہیں۔ اُن کا فنی افق قدرتی طور پر نسبتاً محدود ہوتا ہے۔ اور اس کے احاطے میں اسی قسم کے موضوع سما سکتے ہیں جن کا فن کار کی ذہنی افتاد اور تجربے سے گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ اس صنف میں مخلص لکھنے والوں کی بہت کمی ہے۔ اور دوسری اصناف کی مقبولیت کے پیش نظر غالباً یہ کمی کبھی پوری نہیں ہو سکے گی۔

فن کاروں کی تیسری جماعت شاید سب سے خوش قسمت جماعت ہے اسے مبداءِ فیاض سے نہ صرف ایک دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان عطا ہوئے ہیں بلکہ ایک چھٹی حس بھی ملی ہے جسے ہم کسی بہتر نام کی عدم موجودگی میں مشاہداتی تخیل کا نام دے سکتے ہیں۔ یہ تخیل، تخیلِ مفرد کے خلاف اپنی بنیاد کے لئے حقیقت کی ٹھوس زمین تلاش کرتا ہے۔ اور پھر اُس پر ایسی رفیع الشان عمارت کھڑی کرتا ہے جو اگرچہ آسمان سے باتیں کرتی ہے لیکن زمین ہی کا قصہ سناتی ہے۔ اس طبقے کا فن کار تخیل کی پگھلی ہوئی دھات کو حقیقت کے سانچے میں ڈال کر کردار کا ایک ایسا مکمل نمونہ تیار کرتا ہے جس کا کوئی حصہ بے جوڑ معلوم نہیں ہوتا اور ذہین سے ذہین پڑھنے والا یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ مشاہدہ کہاں ختم ہوا اور تخیل کہاں سے شروع ہوا۔ زیرِ نظر افسانے کا مصنف، سعادت حسن منٹو، فن کاروں کی اسی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔

"مسز ڈی کوسٹا" ایک نمونے کے کردار کا نہایت گہرا مطالعہ ہے۔ اس ٹائپ کی عورتیں ہر سوسائٹی میں، اور سوسائٹی کے ہر طبقے میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن مقامی رنگ کے اُستادانہ استعمال نے مسز ڈی کوسٹا کو بجائے خود ایک ٹائپ بنا دیا ہے۔ اور ہمارے لئے اب یہ بہت مشکل ہے کہ اس مطالعے کو بمبئی کے ایک اوسط درجے کے فلیٹ کے علاوہ جہاں اوسط درجے کے مختلف النسل کنبے رہتے ہوں کسی اور پس منظر پر ابھرتا دیکھ سکیں۔ اور یہ بات بجائے خود فن کار کی مہارت کا ایک نمایاں ثبوت ہے۔

افسانہ "واحد متکلم مونث" میں بیان ہوتا ہے۔ بیان کرنے والی ایک بہو ہے جس کی ساس اُن دنوں زندہ تھی۔ اور اب "اللہ بخشے" مر چکی ہے۔ افسانے کی کہانی محض اتنی ہے کہ بیان کرنے والی پورے دنوں سے تھی، غالباً پہلا بچہ تھا۔

"نو مہینے پورے ہو چکے تھے۔ میرے پیٹ میں اب پہلی سی گڑبڑ نہیں تھی مگر مسز ڈی کوسٹا کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔"

آئندہ کے چار صفحات چوہوں کی اس دوڑ کی تفصیل پر مشتمل ہیں، اور بس۔ شاید ہمارے بعض پڑھنے والے کہیں کہ "بس؟ پھر کہانی کیا خاک ہوئی"۔ مگر اسے پڑھ کر ان کی رائے یقیناً بدل جائے گی۔ کیونکہ خود زندگی سے بہتر کہانی آج تک نہیں لکھی گئی اور یہ کہانی زندگی کے ایک چھوٹے سے منظر کی ایک نہایت صاف، شفاف اور "رعین مین" تصویر ہے۔ دیکھئے:۔

مسز ڈی کوسٹا میری پڑوسن تھی۔ ہمارے فلیٹ کی بالکونی اور اُس کے فلیٹ کی بالکونی میں صرف ایک چوبی تختہ حائل تھا جس میں بے شمار ننھے ننھے سوراخ تھے۔ ان سوراخوں میں سے میں اور اللہ بخشے میری ساس ڈی کوسٹا کے سارے خاندان کو کھانا کھاتے دیکھا کرتے تھے، لیکن جب اُن کے ہاں سکھائی ہوئی جھینگا مچھلی پکتی اور اُس کی ناقابلِ برداشت بو اُن سوراخوں میں سے چھن چھن کر ہم تک پہنچ جاتی تو میں اور میری ساس بالکونی کا رُخ تک نہ کرتے تھے۔ میں اب بھی کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اتنی بدبودار چیز کھائی کیونکر جا سکتی ہے۔ پر ہاہا کیا کہا جائے۔

انسان بری سے بری چیزیں کھا جاتا ہے۔ کیا پتہ ہے کہ انہیں اُس ناقابلِ برداشت بو ہی میں لطف آتا ہو۔

مسز ڈی کوسٹا کی عمر چالیس بیالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اُس کے کٹے ہوئے بال جو اپنی سیاہی بالکل کھو چکے تھے اور جن میں بے شمار سفید دھاریاں پڑ چکی تھیں اس کے چھوٹے سے سر پر گھسے ہوئے نمدے کی ٹوپی کی صورت میں پریشان رہتے تھے۔ ..... میں نے کئی بار اُسے اپنے انہیں بالوں میں لہریں پیدا کرنے کی کوشش میں بھی مصروف دیکھا ہے۔

جب وہ اپنے بڈھے خاوند کو جو کہ ریلوے میں ملازم تھا بالکونی میں نکل کر ہاتھ کے اشارے سے "بائی بائی" کرنے کے بعد فارغ ہو جاتی تھی تو اپنے سر کے ناقابلِ گرفت بالوں میں لہریں پیدا کرنے والے کلپ اٹکا دیا کرتی تھی اور ان کلپوں سمیت سوچا کرتی تھی کہ میرے ہاں بچہ کب پیدا ہوگا۔

وہ خود آدھی درجن بچے پیدا کر چکی تھی، جن میں سے پانچ زندہ تھے۔ اُن کی پیدائش پر بھی وہ یونہی دن گِنا کرتی تھی یا چُپ چاپ بیٹھی رہتی تھی اور بچے کو خود بخود پیدا ہونے پر چھوڑ دیتی تھی، اس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں لیکن مجھے اس بات کا تلخ تجربہ ضرور ہے کہ جو کچھ میرے پیٹ میں تھا اس سے مسز ڈی کوسٹا کو جس کا ماہنا پیر اور اس کے اوپر کا حصّہ کسی بیماری کے باعث ہمیشہ سوجا رہتا تھا، بہت گہری دلچسپی تھی، چنانچہ دن میں کئی مرتبہ بالکونی میں سے جھانک کر وہ مجھے آواز دیا کرتی تھی، اور گرامر سے بے نیاز انگریزی میں جس کا نہ بولنا اس کے نزدیک شاید ہندوستان کے موجودہ حکمرانوں کی ہتک تھی، مجھ سے کہا کرتی تھی "میں بولی، آج تم کدھر گیا تھا۔"

جب میں اُسے بتاتی کہ میں اپنے خاوند کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی تھی تو اُس کے چہرے پر ناامیدی کے آثار پیدا ہو جاتے اور وہ انگریزی بھول کر بمبئی کی اردو میں گفتگو کرنا شروع کر دیتی جس کا مقصد مجھ سے صرف اس بات کا پتا لینا ہوتا تھا کہ بچے کی پیدائش میں میرے خیال کے مطابق کتنے دن باقی رہ گئے ہیں۔

اگر مجھے اس بات کا علم ہوتا تو میں یقیناً اُسے بتا دیتی۔ اس میں حرج ہی کیا تھا اس بے چاری کو خواہ مخواہ کی اُلجھن سے نجات مل جاتی اور مجھے بھی ہر روز اُس کے نت نئے سوالوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا مگر مصیبت یہ ہے کہ مجھے بچوں کی پیدائش اور اس کے متعلقات کا کچھ علم نہیں تھا۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ جب نو مہینے پورے ہو جائیں تو بچہ پیدا ہو جایا کرتا ہے۔

مسز ڈی کوسٹا کے حساب کے مطابق نو مہینے پورے ہو چکے تھے اور میری ساس کا یہ خیال تھا کہ ابھی کچھ دن باقی ہیں —— لیکن یہ نو مہینے کہاں سے شروع کر کے پورے کر دیئے گئے تھے، میں نے بہتیرا اپنے ذہن پر زور دیا لیکن ناکام رہی۔

بچہ میرے پیدا ہونے والا تھا، شادی میری ہوئی تھی، لیکن سارا حساب کتاب مسز ڈی کوسٹا کے پاس تھا۔ کئی بار مجھے خیال آیا کہ یہ میری اپنی غفلت کا نتیجہ ہے اگر میں نے کسی چھوٹی سی نوٹ بک میں، چھوٹی سی نوٹ بک میں نہ سہی اس کاپی ہی میں جو دھوبی کے حساب کے لئے مخصوص تھی، سب تاریخیں لکھ چھوڑی ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔

اتنا تو مجھے یاد تھا اور یاد ہے کہ میری شادی ٢٦ / اپریل کو ہوئی یعنی ٢٦ کی رات کو میں اپنے گھر کے بجائے اپنے خاوند کے گھر میں تھی۔ لیکن اس کے بعد کے واقعات کچھ اس قدر خلط ملط ہو گئے تھے کہ اُس بات کا پتا لگانا بہت مشکل تھا۔ اور مجھے تعجب تو اسی بات کا ہے کہ مسز ڈی کوسٹا نے کیسے اندازہ لگا لیا تھا کہ نو مہینے پورے ہو چکے ہیں اور بچہ لیٹ ہو گیا ہے۔

ایک روز اُس نے میری ساس سے اضطراب بھرے لہجے میں کہا۔

"تمہارے ڈاٹر اِن لا کا بچہ لیٹ ہو گیا ہے —— پچھلے ویک (ہفتے) میں پیدا ہونا مانگتا تھا۔"

میں اندر صوفے پر لیٹی تھی اور آنے والے حادثے کے متعلق قیاس آرائیاں کر رہی تھی، مسز ڈی کوسٹا کی یہ بات سن کر مجھے بڑی ہنسی آئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مسز ڈی کوسٹا اور میری ساس دونوں پلیٹ فارم پر کھڑی ہیں اور جس گاڑی کا انہیں انتظار تھا لیٹ ہو گئی ہے۔

اللہ بخشے میری ساس کو اتنی شدت کا انتظار نہیں تھا۔ چنانچہ وہ کئی مرتبہ مسز ڈی کوسٹا سے کہہ چکی تھی "کوئی فکر کی بات نہیں۔ خدا اپنا فضل کرے گا۔ کچھ دن اوپر ہو جایا کرتے ہیں۔" مگر مسز ڈی کوسٹا نہیں مانتی تھی جو حساب وہ لگا چکی تھی غلط کیسے ہو سکتا تھا۔ جب مسز ڈی سلوا کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اُس نے دور سے دیکھ کر ہی کہہ دیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگے گا۔ چنانچہ چوتھے روز ہی مسز سلوا ہسپتال جاتی نظر آئی، اور خود اس نے چھ بچے جنے تھے جن میں سے ایک بھی لیٹ نہ ہوا تھا۔ اور پھر وہ نرس تھی۔ یہ علٰحدہ بات ہے کہ اس نے کسی ہسپتال میں دایہ گیری کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر سب لوگ اُسے نرس کہتے تھے، چنانچہ اُن کے فلیٹ کے باہر چھوٹی سی چوبی تختی پر "نرس ڈی کوسٹا" لکھا رہتا تھا۔ اُسے بچوں کی پیدائش کے اوقات معلوم نہ ہوتے تو اور کس کو ہوتے۔

اس تصویر کشی کے بعد افسانہ نگار اس میں رنگ بھرنے میں مصروف ہو گیا ہے۔ وہ پس منظر کی طرف خصوصیت سے متوجہ ہے۔ اور مسز ڈی سلوا

سے لے کر جس کی شادی بقولِ مسز ڈی کوسٹا کرسمس میں ہوئی اور بچہ جولائی میں، سلمنے رہنے والے یہودیوں کے اس خاندان تک کا جائزہ لے لیتا ہے جو ہماری ہیروئن کے اخلاقی معیار پر قیامت تک پورا اُتر نہیں سکتا، اور پھر جب وہ اس کے سیاسی اور سوشل عقائد سے ہمیں آشنا کراتا ہے تو اس کے نقوش اور بھی اُبھر آتے ہیں یہاں تک کہ وہ ہمیں اپنے سامنے چلتی پھرتی نظر آنے لگتی ہے۔

صرف آس پاس کی عورتوں اور پڑوس کے مردوں تک مسز ڈی کوسٹا کی معلومات محدود نہیں تھیں، اسے دوسرے محلّے کے لوگوں کے متعلق بھی بہت سی باتیں معلوم تھیں۔ چنانچہ جب وہ اپنے سوجے ہوئے پیر کا علاج کرنے کی غرض سے باہر جاتی تو گھر لوٹتے ہوئے دوسرے محلّوں کی بہت سی خبریں لے آتی تھی۔

ایک روز جبکہ مسز ڈی کوسٹا میرے بچے کی پیدائش کا انتظار کر کر کے تھک ہار چکی تھی میں نے اُسے باہر پھاٹک کے پاس اپنے دو بڑے لڑکوں، ایک لڑکی اور پڑوس کی دو عورتوں کے ساتھ باتوں میں مصروف دیکھا میں یہ خیال کر کے جی ہی جی میں بہت کڑھی کہ وہ میرے بچے کے لیٹ ہو جانے کے متعلق باتیں کر رہی ہوگی۔ چنانچہ جب اُس نے گھر کا رُخ کیا تو میں جنگلے سے پرے ہٹ گئی۔ مگر اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ سیدھی اوپر چلی آئی اور میں نے دروازہ کھول کر اُسے باہر بالکونی ہی میں مونڈھے پر بٹھا دیا اس مونڈھے پر بیٹھتے ہی اُس نے بمبئی کی اردو اور گرائمر سے بے نیاز انگریزی میں یہ کہنا شروع کیا: "تم نے کچھ سُنا!.... مہاتما گاندھی نے کیا کیا!... سالی کانگرس ایک نیا قانون پاس کرنا مانگتی ہے۔ میرا فریڈرک یہ خبر لایا ہے کہ بمبئی میں پروہشبن ہو جائے گی ــــ تم سمجھتی ہو پروہشبن کیا ہوتی ہے؟"

میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ کیونکہ جتنی انگریزی مجھے آتی تھی اس میں پروہشبن کا لفظ نہیں تھا۔ اس پر مسز ڈی کوسٹا نے کہا "پروہشبن شراب بند کر دینے کو کہتے ہیں ــ ہم پوچھتا ہے اس کانگرس کا ہم نے کیا بگاڑا ہے کہ وہ شراب بند کر کے ہم کو تنگ کرنا مانگتی ہے ــــ یہ کیسی گورنمنٹ ہے، ہم کو ایسی بات ایک دم اچھی نہیں لگتی۔ ہمارا تہوار کیسے چلے گا ہم کیا کریں گے۔ وسکی ہمارے تہوار دں میں ہونا ہی مانگتا ہے ــ تم سمجھتی ہونا، کرسمس کیسے ہوگا!.... کرسچین لوگ تو اس لا کو نہیں مانے گا کیسے مان سکتا ہے.... میرے گھر میں چوبیس کلاک (گھنٹے) برانڈی کی ضرورت رہتی ہے۔ اگر یہ لا پاس ہو گیا تو کیسے کام چلے گا..... یہ سب کچھ گاندھی کر رہا ہے..... گاندھی جو ہم مٹن لوگ کا ایک دم بیری ہے...... یہ سالا آپ تو پیتا نہیں اور دوسروں کو پینے سے روکتا ہے اور تمہیں مالوم ہے یہ ہم لوگوں کا میرا مطلب گورنمنٹ کا بہت بڑا اینمی (دشمن) ہے ــــ"

اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگلستان کا سارا ٹاپو مسز ڈی کوسٹا کے اندر سما گیا ہے۔ وہ گوآ کی رہنے والی کالے رنگ کی کرسٹان عورت تھی مگر جب اس نے یہ باتیں کیں تو میرے تصور نے اس پر سفید چمڑی منڈھ دی اور وہ مجھے چند لمحات کے لئے یورپ سے آئی ہوئی تازہ تازہ انگریز عورت دکھائی دی جسے ہندوستان اور اُس کے مہاتما گاندھی سے کوئی واسطہ نہ ہو۔

اس ٹکڑے میں راوی کے بیان کا وہ حصہ جہاں وہ مسز ڈی کوسٹا کو اپنے دو لڑکوں، ایک لڑکی اور دو پڑوسنوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر سمجھتی ہے کہ وہ اس کے بچے کے لیٹ ہو جانے کی باتیں ہی کر رہی ہوگی، ایک نہایت باریک نفسیاتی نکتے کا اظہار ہے اور جہاں تک افسانہ نگاری کا تعلق ہے ہم بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کے پیچ لگانے کا سلیقہ بہت کم فن کاروں کے حصے میں آیا ہے۔ تو خیر ہوا یہ کہ

مہاتما گاندھی اور اس کی ہشت پشت پر لعنتیں بھیج کر مسز ڈی کوسٹا اصل بات کی طرف متوجہ ہوئی: "اور ہاں یہ تمہارا بچہ کیوں پیدا نہیں ہوتا۔ چلو میں تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔"

میں نے اس وقت بات ٹال دی مگر مسز ڈی کوسٹا نے گھر جاتے ہوئے پھر مجھ سے کہا: "دیکھو تم کو کچھ ایسا ویسا بات ہو گیا تو پھر ہم کو نہ بولنا۔"

اس سے دوسرے روز کا واقعہ ہے ــ صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ کئی دنوں سے میں نے مسز کافلی کو ٹیلیفون نہیں کیا، اس کو بھی تو بچے کی پیدائش کا بہت خیال ہے، اس وقت فرصت ہے اور نذیر صاحب کا دفتر جو کہ اُن کے گھر کے ساتھ ہی ملحق تھا بالکل خالی ہوگا کیونکہ چھ بج چکے ہیں، اُٹھ کر ٹیلیفون کر دینا چاہئے۔ یوں سیڑھیاں اُترنے اور چڑھنے سے ڈاکٹر صاحب اور تجربہ کار عورتوں کے مشورے پر عمل بھی ہو جائے گا جو کہ یہ تھا کہ چلنے پھرنے سے بچہ آسانی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ میں اپنے پیدا ہونے والے بچے سمیت اُٹھی اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ جب پہلی منزل پر پہنچی تو مجھے نرس ڈی کوسٹا کا بورڈ نظر آیا اور پیشتر اس کے کہ میں اُس کے فلیٹ کے دروازے سے گذر کر دوسری منزل کے پہلے زینے پر قدم رکھ سکوں، مسز ڈی کوسٹا باہر نکل آئی اور مجھے اپنے گھر لے گئی۔

میرا دم پھولا ہوا تھا اور پیٹ میں اینٹھن سی پیدا ہو گئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایک ربڑ کی گیند ہے جو کہیں اٹک گئی ہے۔ اس سے بڑی اُلجھن

ہو رہی تھی۔ میں نے ایک بار اس تکلیف کا ذکر اپنی ساس سے کیا تھا تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ بچے کی ٹانگ دانگ اِدھر اُدھر پھنس جایا کرتی ہے۔ چنانچہ یہ ٹانگ وانگ ہی ہلنے جُلنے سے کہیں پھنس گئی تھی اور مجھے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔

میں نے مسز ڈی کوسٹا سے کہا کہ مجھے ایک ضروری ٹیلیفون کرنا ہے اس لئے میں آپ کے یہاں نہیں بیٹھ سکتی اور بہت سے چھوٹے بہانے میں نے پیش کئے مگر وہ نہ مانی اور میرا بازو پکڑ کر اس نے زبردستی مجھے اس صوفے پر بٹھا دیا۔ جس کا کپڑا بہت میلا ہو رہا تھا۔

مجھے صوفے پر بٹھا کر جلدی جلدی اس نے دوسرے کمرے سے اپنے دو چھوٹے لڑکوں کو باہر نکالا، اپنی کنواری جوان لڑکی کو بھی جو جہاتما گاندھی کی لنگوٹی سے کچھ بڑی سکرٹ پہنتی تھی، اس نے باہر بھیج دیا اور مجھے خالی کمرے میں لے گئی۔ اندر سے دروازہ بند کر کے اُس نے میری طرف اُس افریقی جادوگر کی طرح دیکھا جس نے الہ دین کا چچا بن کر اُسے ایک غار میں بند کر دیا تھا۔

یہ سب کچھ اُس نے اتنی پھرتی سے کیا کہ مجھے وہ ایک پراسرار عورت معلوم ہوئی۔ سوجے ہوئے پیر کے باعث اس کی چال میں خفیف سا لنگڑا پن پیدا ہو گیا تھا جو مجھے اس وقت بہت بھیانک دکھائی دیا۔

میری طرف گھور کر دیکھنے کے بعد اُس نے اِدھر دیوار کی تینوں کھڑکیاں بند کیں۔ ہر کھڑکی کی چٹخنی چڑھا کر اُس نے میری طرف اس انداز سے دیکھا گویا اسے اس بات کا ڈر ہے کہ میں اُٹھ بھاگوں گی۔

ایمان کی کہوں تو اُس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ دروازہ کھول کر بھاگ جاؤں۔ اس کی خاموشی اور اُس کے کھڑکیاں دروازے بند کرنے سے میں بہت پریشان ہو گئی تھی۔ آخر اس کا مطلب کیا تھا؟ — وہ چاہتی کیا تھی؟ اتنے زبردست تخلئے کی کیا ضرورت تھی؟ ... اور پھر ... وہ ٹھیک ہماری پڑوسن تھی، اُس کے ہم پر کئی احسان بھی تھے۔ لیکن آخر وہ تھی تو ایک غیر عورت اور اُس کے بیٹے ..... وہ مُوا فوجی اور وہ کلف لگی پتلون والا جو چھوٹی چھوٹی کرسٹان لڑکیوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا تھا ... اپنے اپنے ہوتے ہیں اور پرائے پرائے۔ میں کئی عشقیہ ناولوں میں کٹنیوں کا حال پڑھ چکی تھی، جس انداز سے وہ اِدھر اُدھر چل پھر رہی تھی اور دروازے بند کر کے پردے کھینچ رہی تھی اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ نرس ورس بالکل نہیں بلکہ بہت بڑی کٹنی ہے۔ کھڑکیاں اور دروازے بند ہونے کے باعث کمرے میں جس کے اندر لوہے کے چار پلنگ پڑے تھے کافی اندھیرا ہو گیا تھا جس سے مجھے اور بھی وحشت ہوئی۔ مگر اس نے فوراً ہی بٹن دبا کر روشنی کر دی۔

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا کرے گی۔ پراسرار طریقے پر اس نے آتشدان سے ایک بوتل اٹھائی جس میں سفید رنگ کا سیال مادہ تھا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ "اپنا بلاؤز اتارو ... میں کچھ دیکھنا مانگتی ہوں"۔

میں گھبرا گئی۔ "تم کیا دیکھنا چاہتی ہو؟"

اوپر سے سب کچھ نظر آ رہا تھا پھر بلاؤز اتروانے کا کیا مطلب تھا اور اسکو کیا حق حاصل تھا کہ وہ دوسری عورتوں کو یوں گھر کے اندر بلا کر بلاؤز اتارنے پر مجبور کرے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ "مسز ڈی کوسٹا، میں بلاؤز ہرگز نہیں اُتاروں گی"۔ میرے لہجے میں گھبراہٹ کے علاوہ تیزی بھی تھی۔

مسز ڈی کوسٹا کا رنگ زرد پڑ گیا۔ "تو .... تو ..... پھر ہم کو کیسے مالوم پڑے گا کہ تمہارے گھر بچہ کب ہو گا ... اس بوتل میں کھوپرے کا تیل ہے۔ یہ ہم تمہارے پیٹ پر گرا کر دیکھے گا ..... اس سے ایک دم معلوم ہو جائیگا کہ بچہ کب ہو گا۔ لڑکی ہو گا یا لڑکا"۔

میری گھبراہٹ دور ہو گئی۔ مسز ڈی کوسٹا پھر مجھے ڈی کوسٹا نظر آنے لگی۔

کھوپرے کا تیل بڑی بے ضرر چیز ہے۔ پیٹ پر اگر اس کی پوری بوتل بھی انڈیل دی جاتی تو کیا حرج تھا اور پھر ترکیب کتنی دلچسپ تھی۔ اس کے علاوہ اگر میں نہ مانتی تو مسز ڈی کوسٹا کو کتنی بڑی ناامیدی کا سامنا کرنا پڑتا۔ مجھے ویسے بھی کسی کی دل شکنی منظور نہیں ہوتی، چنانچہ میں مان گئی ... بلاؤز اور شمیض اتارنے میں مجھے کافی کوفت ہوئی مگر میں نے یہ برداشت کر لی۔ غیر عورت کی موجودگی میں جب میں نے اپنا پھولا ہوا پیٹ دیکھا جس کے نچلے حصے پر اس طرح کے لال لال نشان بنے ہوئے تھے جیسے ریشمی کپڑے میں چُرسیں پڑ جائیں تو مجھے ایک عجیب قسم کا حجاب محسوس ہوا۔ میں نے چاہا کہ فوراً کپڑے پہن لوں اور وہاں سے چل دوں لیکن مسز ڈی کوسٹا کا وہ ہاتھ جس میں کھوپرے کے تیل کی بوتل تھی اُٹھ چکا تھا۔

میرے پیٹ پر ٹھنڈے ٹھنڈے تیل کی ایک لکیر دوڑ گئی۔ مسز ڈی کوسٹا خوش ہو گئی۔ میں نے جب کپڑے پہن لئے تو اُس نے مطمئن لہجہ میں کہا۔ "آج کیا ڈیٹ ہے؟ گیارہ۔ گیارہ، بس پندرہ کو بچہ ہو جائے گا اور لڑکا ہو گا"۔

بچہ ۲۵ تاریخ کو ہوا تھا لیکن تھا لڑکا۔ اب جب کبھی وہ میرے پیٹ پر اپنے ننھے ننھے ہاتھ رکھتا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسز ڈی کوسٹا نے کھوپرے کے تیل کی بوتل انڈیل دی ہے"۔

قابلِ داد بات یہ ہے کہ صاحبِ افسانہ صنفِ کرخت سے تعلق رکھنے کے باوجود اُس عجیب قسم کی ٹھنڈک سے بھی آشنا ہیں جو ماں کے پیٹ پر ننھے کے ہاتھ رکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسے تخیلی مشاہدے کا اوجِ کمال کہنا چاہیئے۔

صلاح الدین احمد

حصۂ نظم

برات

گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہوگا
آئے براتی آئے ساجن
آنکھوں میں سہلانا ہوگا
دے رہے تن من پیت کے گاہک
ہاتھ اُن کے بک جانا ہوگا
گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہوگا
دھمک رہی ہے دُور سے ڈھولک
سوئے بھاگ جگانا ہوگا
چمک رہی ہے مشعل کی لَو
اب تو لگن لگانا ہوگا
گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہوگا
گونج رہی شہنائی قرنا
من کی پیاس بجھانا ہوگا
دُھن بنسی کی پریم کی دُھن ہے
اسی میں گھل مل جانا ہوگا
گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہوگا
بھول کہیں بدھی کے ہنس کر
آنکھ سے آنکھ ملانا ہوگا
پریم کی بھینی بھینی خوشبو
ساجن گھر پھیلانا ہوگا
گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہوگا
چہل پہل دنیا کی تھوڑی
اس میں جی نہ کڑھانا ہوگا
ساجن کا پیغام یہی ہے
سکھ کا ساتھ نبھانا ہوگا
گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہوگا

ہمایوں اپریل ۱۹۵۱ء — سید مقبول حسین احمد پوری

مقبول حسین کی متنوع ذہانت نے اوپر کی چیز میں فنی لحاظ سے ایک دہرا تاثر پیدا کیا ہے۔ یعنی نظم کو گیت اور گیت کو نظم بنا دیا ہے۔ ہیئت غزل کی ہے اور ایک ہی زمین نرم و نازک الفاظ کی انفرادی موسیقی کو ساتھ لئے ہوئے آخر تک چلی جا رہی ہے۔ اس یکسانی سے جہاں گیت کی یکرنگی نمایاں ہوئی ہے وہیں کیفیت بھی مرکوز رہی ہے۔ لیکن گیت کا عنوان تو گیت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کا عنوان (برات) ایک نظم کے مقصد کا اظہار کرتا ہے۔ اور پھر دیکھئے کہ آغاز سے چلتے ہوئے رفتہ رفتہ فن کار نے کیونکر بالواسطہ طریق سے ماحول قائم کیا ہے۔ اکثر صرف ایک ہی حس یعنی قوتِ سامعہ سے کام لیا گیا ہے (باجا باجے، دھمک رہی ہے ڈھولک، گونج رہی شہنائی قرنا؛ دھن بنسی کی) اور کسی کسی جگہ باصرہ کو بھی دخل ہے (مشعل کی لَو چمک رہی ہے)

لیکن کیا یہ نظم صرف شاعر کا بیان ہے یا دلہن کے احساسات "آئے براتی" کا ٹکڑا ظاہر کرتا ہے کہ یہ سب دُلہن یا دلہن کے گاؤں کے کسی اور شخص کی باتیں ہیں لیکن باراتیوں کے ساتھ "آئے ساجن"—— دلہن کے احساس و خیالات کی دلیل ہے —— اس سلسلے میں ذہن کی زرخیزی کثرتِ راہ کی حامل ہے۔ کبھی دل کہتا ہے کہ شاعر باراتیوں کے ساتھ ہے (شاید دولہا کا کوئی دوست ہو) رات کا وقت ہے (چمک رہی ہے مشعل کی لَو) بارات گاؤں کے کنارے آکر رک گئی ہے۔ شاید اس بات کا انتظار ہے کہ استقبال کرنے والے بڑھیں۔ اور دولہا اور اس کے ساتھیوں کو خوش آمدید کہیں۔ باجا بج رہا ہے۔ اس انتظار کی کیفیت میں دولہا کے دوست شاعر کا ذہن اس خلوت گاہ میں جا پہنچتا ہے، جہاں اس مختصر افسانے کی "جان" سہیلیوں کے جھرمٹ میں سنجیدہ صورت بنی ہوئی، سر جھکائے، سولا سنگاروں سے سجی سجائی بیٹھی ہے اور شاعر سوچتا ہے کہ اس کے خیالات گاؤں کے کنارے بارات کے باجے کی آواز سن کر کس رَو میں بہنے لگے ہوں گے —— لیکن ہمارا خیالوں سے بھرپور چنچل دل کہتا ہے یوں نہیں، قصہ یوں ہے سکھیاں دلہن کو گھیرے بیٹھی تھیں، انہیں گاؤں کنارے باجا بجنے کی آواز سنائی دی، کچھ اٹھ کر بارات کا تماشہ کرنے کو اٹھ کھڑی ہوئیں، ایک آدھ شوخ، رازدار دلہن کے پاس ہی بیٹھی رہی، اور باجے کی آواز سے بارات کی آمد کا احساس کر کے کچھ چھیڑ کے طور پر، کچھ مسرت میں کھو کر گانے لگی۔ اور دلہن سے کہنے لگی "گاؤں کنارے باجا باجے، پیتم دیس بسانا ہوگا"۔

ٹیپ ہر بند کے بعد اپنے تواتر سے کسی طرح کی بیزاری یا پھیکا پن نہیں پیدا کرتی۔ عموماً گیتوں کی ٹیپ میں کسی حد تک تنوع پیدا کرتے چلے جانا مناسب ہوتا ہے۔ لیکن یہاں ٹیپ کی یکسانی فضائے بعید میں باجے کی آواز

کے توازن کا احساس گہرا کرتی ہے اور تصویر کے بدلتے رنگوں سے مرکزی آواز

ریاز نگ، کو زائل نہیں ہونے دیتی۔

جبر و قدر

گھیر لی تھی ہم نے کتوں سے جہاں ہرنوں کی ڈار

تھے اُسی ادجھل میں تیتر محوِ ذکرِ کردگار

شام کو گھر کی طرف پلٹے بایں قول و قرار

کل سحر کے وقت کھیلا جائے گا اِن کا شکار

سب کو چُن چُن کر فنا کے گھاٹ اتارا جائے گا

سر نکالا نیستاں سے جس نے، مارا جائے گا

....

ایک ساعت بھی نہ گذری تھی، ابھی بارش رُکے

ہو کے ٹھنڈے ابر کے ٹکڑے زمیں پر جُھک پڑے

رات میں بلی کی آنکھیں تھیں کہ برقی قمقمے

بھاپ بنتی تھی نفس کی آمد و شد کُہر سے

یوں جبیں محسوس ہوتی تھی پلک ملنے کے ساتھ

جیسے چھو جاتے ہیں آنکھوں کو کبھی مرچوں کے ہاتھ

کھا کے سردی منہ سے ہر بند و ق دیتی تھی دھواں

اوس میں ڈوبے ہوئے گنّوں کا تاروں پر گماں

بوٹ اور جیبوں میں ٹھٹھری جا رہی تھی انگلیاں

پھر بھی اس شیخی میں تھی مصروف ہر اکڑی زباں

ہم شکاری ہیں، شکاری اور سردی کا سوال؟

ایک اوچھا سا تصور، ایک ادنیٰ سا خیال!

جا رہے تھے کیفِ خود بینی میں ہم مخمور سے

شہر سے باہر ہوئے وہ چار اُس مغرور سے

آدمی اندھا نظر آتا ہے جس کو دُور سے

جس کی خود مختاریاں بیزار ہیں مجبور سے

جس کو رہتی ہے غریبوں سے تمنائے ادب

ظلم ہے جا جس کو واجب، جس کی نخوت مستحب

پھر نظر آئی وہ موٹر، کیک سبز و موجِ رنگ

جس کا پردہ دستِ کافوری میں اِک گوشے پتنگ

تھا کبھی حاضر کبھی غائب شباب شوخ و شنگ

مسکراتی تھی حیا پر بے حجابی کی اُمنگ

تہہ بہ تہہ غازہ نگاہِ جلوہ بیں پر بار تھا

حُسن سے زاید فریبِ حسن کا پرچار تھا

پاپیادہ پھر کئی جوڑے ملے آتے ہوئے

مشرقی رسمِ جہل قدمی سے کتراتے ہوئے

گھر میں پائیں باغ، جنگل کی ہوا کھاتے ہوئے

سر بسر مغرب کی نقالی پہ اتراتے ہوئے

کثرتِ بادہ سے ہر شب خواب نوشیں میں خلل

یہ ہوا کھانا مگر اس نقصِ صحت کا بدل!

ہم سے آگے جا رہا تھا گاؤں کا وہ نوجواں

جس کی سرگرمی پہ برساتا ہے ادبے آسماں

جس کا خرمن پھونکتی ہے فطرتِ نامہرباں

دودھ جس کی گائے کا جاتا ہے پٹواری کے ہاں

جس کے بیلوں کو کبھی مہلت نہیں بیگار سے

جس کو چھٹکارا نہیں شیطان کی پھٹکار سے

رامل دیہات در در پہ اُسی کا میہماں

مرغ و مسکہ نوش گرداور اُسی کا میہماں

شحنۂ بے رزق و بے بستر اُسی کا میہماں

شہر کا ہر سیٹھ، ہر موٹر اُسی کا میہماں

ہر وبالِ ضلع اُس کے مال، اُس کی جان پر

صادق و الحق طویلے کی بلا بندر کے سر

دھوپ چمکی تھی کہ ہم نے تیتروں کو جا لیا

پَے بہ پَے اُٹھتے ہوئے فائر کہ جنگل گونج اُٹھا

جان دی اس نے زمیں پر وہ ہوا میں چل بسا

ایک بے چارے کے بازو پہ گرے دھڑ وہ گرا

ظالموں کی دل کی تکمیل پاتی ہے یونہی

بے ضرر مخلوق کو دنیا ستاتی ہے یونہی

ساقی اپریل ۱۹۴۲ء — شاد عارفی

شاد عارفی کی یہ نظم بظاہر چند شکاری دوستوں کے ایک ہنگامی مشغلے کا

بیان ہے لیکن اصل میں شاعر اس ایک معمولی سے واقعے میں قانونِ قدرت

کی کارفرمائی کا شائبہ پاتا ہے۔ بلکہ اُس کا ذہن غور کرتے ہوئے پلٹا کھا کر گویا جوش کے الفاظ میں یہ سوچنے لگتا ہے کہ "یہ کیوں دریا دلی کے ساتھ ہر خوں ریز طاقت کو مشیئت کی طرف سے اذنِ قتلِ عام ہے ساقی ــــ"

یہ تو ہوا نظم کا خیالی پہلو، اب اس کے بیان کی طرف آئیے۔ کیونکہ اس نظم میں بیان اور طرزِ ادا ہی نے ایک عام خیال میں خاص دلکشی پیدا کر دی ہے۔ اصل نظم پہلے اور آخری بند میں مکمل ہو جاتی ہے لیکن ان دونوں ٹکڑوں سے جو نتیجہ شاعر کو اخذ کرنا ہے۔ اُسے مدلل بنانے کے لئے درمیانی بند موجود ہیں۔ پہلے بند کا مضمون آخری بند سے ایک روز پہلے کا بیان کر رہا ہے اور صرف ایک ارادے کا اظہار کرتے ہوئے بظاہر فالتو معلوم ہوتا ہے گویا دوسرے بند سے اگر نظم شروع کی جاتی تو بھی ترجمانی میں کوئی فرق نہ پڑتا لیکن اگر ہم ذرا سا غور کریں تو موجودہ صورت نفسیاتی لحاظ سے بہتر تاثر کی محرک ہے۔ پہلے بند سے قاری کے ذہن میں ایک خیال سا بیٹھ جاتا ہے کہ ہاں، کل شکار کو جائیں گے، شکار کو جائیں گے تو کیا ہو گا، شکار ہو گا اور کیا ہو سکتا ہے لیکن جب دوسرے روز صبح سویرے منہ اندھیرے شکار کو نکلتے ہیں تو راستے میں بہت سی باتیں دکھائی دیتی ہیں۔ جوں جوں شہر سے نکل کر دور ہوئے جاتے ہیں مختلف منظر دیکھنے میں آتے ہیں، کبھی سیر کرتے ہوئے جوڑے پیادہ پا، کبھی موٹروں میں امرا اور اُن کی عشرت پرستیوں کے شبانہ ہمدم، کبھی کوئی غریب کسان کام پر جاتا ہوا ــــ شاعر شکاری ہے اس کے ذہن میں اس وقت شکار کا خیال جما ہوا ہے، اس لئے ہر معمولی سے معمولی بات بھی اس کے لئے فکر انگیز ثابت ہو سکتی ہے چنانچہ وہ ان تمام مناظر پر غور کرتا ہوا، ان کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور ان کے تنوع سے اُسے دنیا کی نا انصافی اور انسانیت کے مختلف پہلوؤں کا بُعد یاد آجاتا ہے، مجبوری اور مختاری، بندگی اور بے چارگی کا فلسفہ اُسے زندگی کے ہر شعبے میں عمل پیرا محسوس ہوتا ہے اور اُس کے اس نظریے کو آخری بند کا منظر تقویت پہنچاتا ہے۔

بعض جگہ فن کار ہمیں منظر کے بالکل روبرو کر دیتا ہے۔ "بوٹ اور جیبوں میں ٹھٹھری جا رہی تھیں انگلیاں" ــــ شکاری گویا مجسم ہو کر نگاہوں میں آ جاتے ہیں۔ "پا پیادہ پھر کئی جوڑے ملے آتے ہوئے" ــــ اس مصرعے میں دیکھئے کہ ایک مسلسل حرکت کرتی ہوئی تصویر نظر آتی ہے۔ پہلے بند میں "گھیر لی تھی ہم نے کتوں سے جہاں ہرنوں کی ڈار" ــــ ایک مصرعے میں تمام منظر کی وسعت سما گئی ہے۔ اور آخری بند بھی اس لحاظ سے لائقِ ستائش ہے، اس بند کے پہلے چار مصرعوں میں حرکت اور عمل کا جو ہنگامہ قلم بند ہوا ہے اس کو آخری شعر کی سنجیدگی اور اچانک جمود اپنے تضاد سے انتہائی بلندی پر پہنچا دیتی ہے۔ آخری شعر گویا ایک پتھر ہے جسے کسی نے کھینچ کر مارا ہے اور جو فہم کی گرفت کے سر پر لگتا ہے۔

رقص

چاندنی شب میں مری مرمر کی ناگن رقص کر،
پھر اسی دھن میں اُسی گت پر چھنا چھن رقص کر۔
چھن چھن چھنا چھن رقص کر
مرمر کی ناگن رقص کر
طبلہ کہے دھن دھن دھمک
چھاگل کہے چھُو چھا چھمک
پتلی کلائی لوچ کھائے
پاؤں کی ایڑی موچ کھائے
آنکھوں کے تارے ناچ جائیں
گت کے سہارے ناچ جائیں
ہوں رقص میں یوں انگلیاں
جیسے لچکتی کہکشاں
تیکھی نگاہیں رقص میں
چاندی کی باہیں رقص میں
رُک اور رُک کر جھوم جا
دیکھ اس طرف اور گھوم جا
گردن کو مٹکا کر دکھا
آنکھوں کو شرما کر دکھا
نازک کمر پہ ہات رکھ
اب مان کہنا، بات رکھ
چھن چھن چھنا چھن رقص کر
مرمر کی ناگن رقص کر

بال بکھرا کر ذرا باہیں اٹھا کر رقص کر
یوں نہیں ترچھی نظر سے مسکرا کر رقص کر
ہاں ہاں مٹک کر رقص کر
گیسو جھٹک کر رقص کر

سینے کو بل دے، ناچ جا
پاس آ کے چل دے، ناچ جا
آنچل اُٹھا کر مسکرا
آنکھیں دکھا کر مسکرا
آئی وہ تن تن کی صدا
پاؤں کو تیزی سے اُٹھا
حلقے بناتی گھوم جا
سر کو ہلاتی گھوم جا
آڑے کبھی، ترچھے کبھی
ایسے کبھی، ویسے کبھی
پہلو بدل کر یوں نکل
سانچے میں ڈھل کر یوں نکل
انگڑائیاں لیتی ہوئی
درسِ جنوں دیتی ہوئی
خاموشیوں پر وار کر
تابِ نظر بیدار کر
چھن چھن چھنا چھن رقص کر
مرمر کی ناگن رقص کر

پھر اُسی سحر آفریں طرزِ ادا سے رقص کر
میں ہوں دیوانہ، مگر تیری بلا سے رقص کر
ہاں، رقص کر دیوانہ وار
سیماب گوں، پروانہ وار
بے تاب ہو کر گھوم جا
انگڑائی لے کر جھوم جا
گردش میں آ، اے جامِ جسم
رکھ کے چل چل کے تھم
ایسے اُٹھا اپنے قدم
لہروں کا جیسے زیر و بم
پھر اک طرف کو جھک کے چل
ہو جھیل میں جیسے کنول
کچھ لب ہلیں اُنگلی اُٹھے
دل کی تمنا جی اُٹھے
خاموش نغمے گائے جا
جلووں کے گُل برسائے جا
چکرا کے اک دم بیٹھ جا
چھم چھم چھما چھم بیٹھ جا
چھن چھن چھنا چھن رقص کر
مرمر کی ناگن رقص کر

داستان۔ اپریل ۱۹۴۱ء یوسف ظفر

یوسف ظفر کی اس نظم پر کسی خیال آرائی کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ دو باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ صوتی لحاظ سے الفاظ سے جو کام فن کار نے لیا ہے اس نے تمام نظم کو ایک جیتی جاگتی تصویر بنا دیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر بعض مصرعے اس میں سے نظر انداز کر دیئے جاتے تو شاید تاثر زیادہ اچھا ہو جاتا، کیونکہ رقص خواہ کتنی ہی دیر تک کیوں نہ جاری رہے ایک سرسراتی ہوئی کیفیت ہے۔ اس نظم میں بھی وہ مصرعے جن میں الفاظ کی آوازوں کے ذریعے سے منظر کشی کر کے ماحول قائم کیا گیا ہے اس سرسراتی ہوئی کیفیت کو کامیابی کے ساتھ ظاہر کر رہے ہیں۔ لیکن ان مصرعوں کے ساتھ بعض جگہ جذباتی خیال کی آمیزش منظر کے رنگ کو گدلا دیتی ہے۔ رقص کو دیکھ کر احساس بیدار ہو سکتے ہیں، رقص کی کیفیت سے سرشارانہ زاویۂ احساس پیدا ہوتا ہے۔ لیکن خیال کی بیداری اس سلسلے میں ایک ذرا دور کی بات معلوم ہوتی ہے خیال کی آمد کے یہ معنی لئے جا سکتے ہیں کہ اب رقص احساس سے اپیل نہیں کر رہا۔ یا کم سے کم وہ اپیل کم ہو گئی ہے۔

قدموں کی حرکات کو صرف الفاظ نہیں، بلکہ الفاظ کے ساتھ بحر کا وزن ظاہر کر رہا ہے۔ اور بعض جگہ لمبے شعر گویا منظر کی اور بھی ترجمانی کرتے ہیں جیسے ناچ کا ایک ہلّہ ختم ہو کر دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔ لمبے اور چھوٹے مصرعوں کی بحریں مختلف ہیں لیکن اُن کا امتزاج صوتی اور ہم آہنگی شاعر کی فن کاری کی دلیل ہے۔

میراجی

افسوس ہے کہ اس دفعہ جگہ کی قلت کے باعث دو نظمیں شامل ہونے سے رہ گئیں اُنہیں آئندہ ماہ کے جائزۂ نظم میں دیکھئے۔ م

نقد و نظر

تبویبِ حیدری

از فضل اللہ احمد بی اے۔ ناشر حیدری گشتی کتب خانہ حیدر آباد دکن۔
قیمت ۸ ر۔ لکھائی چھپائی اچھی کاغذ اچھا۔

اردو زبان کی روز افزوں ترقی کے دلائل کچھ کم نہیں۔ ایک معمولی سی بات پر غور کیجیے۔ ادب اور زندگی کے ہر پہلو کے ذیلی سے ذیلی معاملات سے متعلق کتابیں کسی زبان میں اس وقت شائع ہوا کرتی ہیں۔ جب وہ کم سے کم ترقی کے درمیانی دور سے آگے بڑھ چکی ہو اور تیسرے اور آخری دور میں داخل ہو رہی ہو۔ تبویبِ حیدری جدید اصولوں پر کتابوں کی ترتیب اور فہرست سازی کے لئے اردو میں غالباً سب سے پہلی کتاب ہے۔ جسے مرتب نے اردو زبان کے گزشتہ اور موجودہ ماحول اور آئندہ امکانات کو دیکھتے ہوئے ترتیب دیا ہے ہر علم و فن کے لئے باقاعدگی کے ساتھ علیحدہ علیحدہ عنوان اور نشانِ تبویب دے رکھے ہیں۔ جس کسی کے پاس یہ کتاب ہو اُسے ایک ہی کمی محسوس ہو گی اور وہ یہ کہ اس کے پاس کتابیں نہیں ہیں کہ وہ انہیں اس تبویب کے مطابق ترتیب دے سکے۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ ہندوستان کے کتب خانوں کے علاوہ بہت سے اصحاب کے ایسے ذاتی کتب خانے بھی موجود ہوں گے جنہیں آج تک ایسی باقاعدہ تبویب میسر نہ ہوئی ہو گی۔ ایسے افراد اور دیگر تمام کتب خانوں کے لئے یہ کتاب بہت بیش قیمت ثابت ہو سکتی ہے۔

عصمت کی کہانی

از رازق الخیری۔ ناشر عصمت بک ڈپو دہلی قیمت ۸ ر کاغذ لکھائی چھپائی اچھی

مندرجہ بالا کتاب ہی کی طرح عصمت کی کہانی بھی اردو کے اشاعتی اداروں کی روز افزوں ترقی کا ثبوت ہے۔ بظاہر یہ مختصر سی کتاب ملک کے مشہور زنانہ ماہنامے عصمت کی تاریخ ہے لیکن اس حکایت کے بیان کے ساتھ ہی ساتھ دنیائے ادب کے ایک ماحول کی دلچسپ کہانی بھی ہمارے پیشِ نظر ہو جاتی ہے۔ یہ وہ ادبی ماحول ہے جو عصمت کے اجراء سے لے کر اب تک اس قابلِ قدر ماہنامے کے کارکنوں کے اردگرد قائم رہا گزشتہ چند مہینوں میں ملک کے ایک دو اور ادبی اداروں نے بھی اسی طرح اپنی تاریخ کتابی صورت میں شائع کی ہے۔ لیکن زیرِ نظر تاریخ میں ایک مستزاد دلکشی یہ بھی ہے کہ یہ اس ادارے کی تاریخ ہے جس کا قیام اور جس کی ترقی اردو کے ایک زندہ جاوید خادم علامہ راشد الخیری مرحوم کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھی اور اس لئے اس سے جہاں ادارۂ اشاعتِ عصمت کی کارگزاریوں پر روشنی پڑتی ہے وہاں علامہ مرحوم کے حالات بھی معلوم ہوتے ہیں۔

وداعِ راشد

از رازق الخیری۔ حجم اسی صفحات۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا۔ ناشر عصمت بک ڈپو دہلی۔

اس کتاب میں اُس زبردست شخصیت کی زندگی کے آخری دنوں کا المناک افسانہ ہے جس نے ہندوستان کی مسلمان عورت اور اردو زبان کے سلسلے میں ایسا قابلِ قدر کام کیا ہے جس کی مثال ہمیں مشکل ہی سے مل سکے گی بلکہ نہیں مل سکے گی کیونکہ اگرچہ اردو زبان کے متعلق تو اُس جامع ہستی کے کارنامے بہتوں کی نظر میں ہیں لیکن مسلمان عورت کی ترقی اور بہبود کے لئے اُس نے جو کچھ کیا وہ ابھی کمل طور پر لوگوں کو نہیں معلوم ہے یہ کام اس شخصیت کی زندگی میں ایک علیحدہ باب کی حیثیت رکھتا ہے جس پر اُمید ہے کہ ہندوستان کی تاریخ نسواں کا مؤلف کما حقہٗ توجہ کرے گا۔ موجودہ کتاب اندازِ بیان کے لحاظ سے علامہ راشد الخیری مرحوم کے دردناک طرزِ تحریر کا ایک کامیاب عکس ہے اور اس میں جس سادگی سے جناب رازق الخیری نے اس عظیم شخصیت کے آخری لمحوں کے مؤثر بیان کے ساتھ ساتھ گھریلو زندگی کا دلکش اور قابلِ رشک نقشہ کھینچا ہے وہ بھی کچھ کم لائق توجہ نہیں ہے۔ رازق صاحب کو معلوم ہوتا ہے کہ اثر ورثے میں ملا ہے۔ اور جگہ جگہ بعض روزمرہ زندگی کے شگفتہ واقعات کے بیان نے اس اثر میں اصل تصویر سے تضاد کی وجہ سے اور بھی شدت پیدا کر دی ہے ہندوستان کی بے شمار عورتیں ذہنی طور پر علامہ مرحوم کی تحریروں کی پروردہ ہیں۔ اُن کے لئے یہ دلکش لیکن المناک بیان خصوصاً مرغوبِ طبع ہو گا کیونکہ ایک ایسے شخص کے حالات کے مطالعے سے ایک طرح کی تسکین پیدا ہوتی ہے جس کا اس دنیا سے اُٹھ جانا اس وسعت کے ساتھ اثر انداز ہوا ہو جیسا کہ اردو زبان میں طبقۂ نسواں کے سب سے بڑے مصنف کا سانحۂ انتقال ہے۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ملال میں ایک ہلکی سی مسرت بھی محسوس ہوتی ہے کہ سوانح نگاری کا یہ ضروری کام علامہ مرحوم ہی کے ایک لائق بیٹے کے ہاتھوں تکمیل پا یا۔

"م"

فہرستِ مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ جون سنہ ۱۹۴۱ء

تصاویر:۔ ۱۔ امریکہ کا تخیل پرست شاعر ۲ اور ۳ اس کی نظر کے دو مرکز

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے۔ ممالک غیر سے دس شلنگ قیمت فی پرچہ ۸؍

سوزِ ناتمام

(دوسرا ایڈیشن)

عاشق بٹالوی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ

اس کا پہلا ایڈیشن دس ماہ کی قلیل مدت میں ختم ہو گیا اہلِ ذوق کے اصرار پر اب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے جو پہلے ایڈیشن کے تمام افسانوں کے علاوہ پروفیسر حمید احمد خاں ایم اے کے ایک مبسوط مقدمے پر مشتمل ہے۔

ایک رائے

"عاشق صاحب نے حیات بشری کے نشیب و فراز اور معاشرتی کشمکش کے فلسفوں کو جس خوبی سے ادا کیا ہے اس کی داد نہ دینا ایک جرم ہے" (خواجہ) حسن نظامی

مینیجر کتب خانہ ادبی دنیا دیال لاہور

سحرِ فرانس

جو فرانس کے افسانہ نگار گائی دموپساں کے بائیس دلکش افسانوں کا مجموعہ ہے

جس کا ترجمہ طاہر قریشی بی اے بی ٹی نے کیا ہے۔ تعارف جناب عاشق بٹالوی بی اے ایل ایل بی نے سپرد قلم کیا ہے۔ اور موپساں کی افسانہ نگاری پر ایک مبسوط محققانہ مقالہ حضرت شاہد احمد بی اے آنرز ایڈیٹر ماہنامہ "ساقی" دہلی کے قلم کا مرہونِ منت ہے۔

اعلیٰ درجے کی کتابت و طباعت دلکش۔ سرورق خوشنما جلد ضخامت سوا تین سو صفحات ظاہری و باطنی محاسن سے آراستہ کتاب میں مصنف و مترجم کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ **قیمت ایک روپیہ چار آنے** (عہ)

علاوہ ازیں افسانے۔ فردوس خیال عہ۔ پریم تیسی حصہ اول و دوم عہ۔ نظارے عہ۔ منٹو کے افسانے عہ۔ دانہ و دام عہ۔ باسی پھول عہ۔ شعلے عہ۔ چغتائی کے افسانے عہ۔ صنوبر کے سائے عہ۔ میری ناتمام محبت عہ۔ طلسم خیال عہ۔ اندھی دنیا عہ۔ چوپال عہ۔ ریس عہ۔ پیدائش ساز نفرت عہ۔ محبت اور نفرت عہ۔ ہیبت ناک افسانے عہ۔ سب کتابیں ملنے کا پتہ

مینیجر کتب خانہ ادبی دنیا لاہور

دنیا کے کاروبار

ستارے اسی پر اعتبار کرتے ہیں

پسند اور ضرورت دونوں چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے ہندوستان میں فلم سٹار چائے پر اعتبار کرتے ہیں۔ اُن کی زندگی بڑی سخت گذرتی ہے۔ اس لئے جسم کی تھکاوٹ اور دماغ کی پژمردگی جو کہ بہت دیر اور بے وقت انہیں گھنٹوں اسٹوڈیو میں کام کرنے سے ہوتی ہے دور کرنے کے لئے بہت سی چائے تھوڑے تھوڑے وقفہ میں پیا کرتے ہیں۔

یہاں پر فلمی دنیا کی پانچ ہستیوں کی آراء جو کہ چائے کی تعریف میں بیان کی گئی ہیں۔ کہ چائے الہام اور طاقت حاصل کرنے میں مدد کرتی ہے۔ ذیل میں درج ہے

میری رفیق چائے کی پیالی

ڈائرکٹر پی۔ سی۔ بروا نے چائے کے متعلق کہا جب کہ وہ اپنا نیا شاہکار "شاپ مکتی" کی تیاری کر رہے تھے اور جس میں اُنہوں نے سب سے بڑا پارٹ بھی کیا ہے کہ "پینے والی چیزوں میں میرے نزدیک چائے سب سے زیادہ مقدم ہے۔ میں ہر گھنٹے اور ہر موقع میں چائے پیتا ہوں۔ تازگی پہنچانے اور قوت و جوش پیدا کرنے میں میرے خیال کے مطابق چائے کی برابری کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ جب کبھی میں سستانا کچھ پڑھنا یا آرام کے لمحوں کی خوشی منانا چاہتا ہوں تو اپنے قریب کسی چیز کی خواہش ہوتی ہے تو وہ چائے کی ایک چھوٹی کیتلی۔"

جمنا دیوی ایک مقبول فلم اسٹار جن کا شمار ہندوستان کی اچھی ایکٹریسوں میں ہے کہتی ہیں کہ چائے کی پیالی سے بڑھ کر تازگی پہنچانے والی اور چیز نہیں۔ یہ پیالی درحقیقت دل شاد کرتی ہے۔

کے۔ ایل۔ سہگل ایک بہت ہی مقبول گانے والے اور فلم کے شائقین کے بُت تصوّر کئے جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ چائے کو اس قدر کیوں پسند کرتا ہوں وہ اس لئے کہ فلم میں کام کرنے اور گانے میں مجھے غیبی مدد پہنچاتی ہے بلکہ تمام اُن کاموں میں جن سے مجھے خوشی حاصل ہو قبل اس کے آپ مجھ سے گانے کی فرمائش کریں ایک پیالی چائے کی پلائیں۔

چھایا دیوی بنگال کی مشہور فلم ایکٹریس چائے کے متعلق اسی زور سے اپنے خیال کا اظہار کرتی ہیں "میرے نزدیک چائے پیاس بجھانے اور نسوں کو آرام پہنچانے کے لئے ایک بہترین شے ہے۔ فلم میں ایک دشوار کام سے فارغ ہونے کے بعد مجھے اگر کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ چائے۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف رغبت بھی نہیں ہوتی۔"

اسی خیال کا اظہار کرتے ہوئے ایک نوجوان اور ہونہار ایکٹریس سرلا دیوی فرماتی ہیں۔ فلم اتارتے وقت میں کتنا ہی تھک جاؤں۔ اس کے بعد چائے کی ایک پیالی مجھ میں جان پیدا کرتی ہے اور میں اپنے کام پر دوبارہ پورے جوش و خروش کے ساتھ واپس جاتی ہوں۔

پاٹن والے کی ایک اور شاندار فتح

پاٹن والے کا افغان گلیسرین کاربولک صابن گلیسرین کا سو فیصدی اور ۲ فیصدی جراثیم سے محفوظ رکھنے والا کاربولک ایسڈ کی آمیزش ہے

صرف پاٹن والے کا نام ہی آپ کے لئے قابل اعتبار ہے

جلد کے لئے ایک لاثانی صابون۔ کاربولک ایسڈ جبکہ اس کے تناسب کے مطابق حصوں میں برابر استعمال کیا جاوے تو یقیناً جلد کی تمام تکالیف کے لئے ایک بہترین علاج ثابت ہوتا ہے سالہا سال متواتر تجربوں کے بعد افغان گلیسرین کاربولک صابن بنایا گیا ہے۔ اس کی بناوٹ میں جلد کی فوائد کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب ملائی گئی ہیں ہندوستان میں چمڑی کے فائدے کے لئے جیسا صابن چاہیئے ویسا ہی لاجواب و لاثانی بنایا گیا ہے۔ افغان گلیسرین کاربولک صابن اور افغان سنو۔ استعمال کرنے سے آپ کی جلد کی کوئی بھی شکایت ہو بہت جلد دور ہو جائے گی۔ اور اس کے بدلے خوشنما نرم اور ملائم جلد ہو جائے گی۔

تمام گھروں میں استعمال کے لئے ایک ضروری چیز ہے۔ افغان گلیسرین کاربولک صابن جسم کی تمام ناپسند بو دور کرتا ہے اور جلد کو جراثیم سے پاک و صاف رکھتا ہے۔ اور اسی طرح میلے اور غلیظ کپڑوں کو بھی صاف کرتا ہے۔ افغان گلیسرین کاربولک صابن گرمی کی پھنسیوں کا اور ہر ایک قسم کی کھجلی دور کرنے کا ایک مؤثر علاج ہے۔

تیار کنندہ گان۔ ای ایس پاٹن والا۔ بمبئی

فضل الٰہی منیجر صیغۂ اشتہارات

امریکہ کا تخیل پرست شاعر

ایڈگر ایلن پو

اُس کی نظر کے دو مرکز

سارا وِہٹمن

فرانسس اوس گڈ

بزمِ ادب

موجودہ نمبر کے افسانوں میں ایک دلکش تنوع پایا جاتا ہے۔ جناب مدنی کا "ایک خط" لطفِ زبان کے اعتبار سے ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ موضوع اگرچہ نیا نہیں لیکن اندازِ بیان اچھوتا ہے جب سے ہمارے ہاں افسانہ نگاری کے جدید اسلوب کا رواج ہوا ہے۔ اس نوع کی چیزیں بہت کم شائع ہوئی ہیں۔ اس لئے امید ہے کہ ناظرین کو اس کے مطالعے سے کچھ بھولے ہوئے مزے یاد آجائیں گے۔

دیوندر ستیارتھی صاحب کا افسانہ "برہمچاری" ہماری معاشرت کے جنسی پہلو کا ایک لطیف اور بے باک مطالعہ ہے۔ اس کہانی کی خوبی یہ ہے کہ کرداروں کو کسی قسم کی حرکت دینے یا افسانے میں بحران پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ مگر اس کے باوجود کہانی کی زندگی اور حرکت میں کوئی فرق نہیں آیا اور افسانہ نگار کا مرکزی تاثر پڑھنے والے پر اسی طرح چھا جاتا ہے، جیسے کسی جاندار ڈرامے کا انجام۔ ستیارتھی صاحب کے محبوب دیہاتی گیتوں نے ان کا پیچھا یہاں بھی نہیں چھوڑا بلکہ ہمیں تو شک گذرتا ہے کہ انہوں نے ان کشمیری گیتوں ہی کے تانے بانے پر اس دلکش افسانے کی زرنگار شال تیار کی ہے۔ بہر حال دیکھنے کی چیز ہے۔

اُپندر ناتھ صاحب اشک کی کہانی "مینگن کا لو دا" ان تجربات کے سلسلے کی ایک نئی کڑی ہے جو ہمارے بعض نوجوان افسانہ نگار علامتیت (سمبلزم) کے میدان میں کر رہے ہیں۔ اشک صاحب جیسے مشاق افسانہ نگار کے لئے کسی نئی ٹکنیک کو اپنانا کچھ مشکل نہیں ہونا چاہئے اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے اس تجربے میں کچھ ایسے ناکام نہیں رہے۔ لیکن ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص انداز میں اس سے بہتر چیزیں لکھ سکتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں۔

میراجی کا مضمون "امریکہ کا تخیل پرست شاعر" ان کی شعر و شاعری کی تنقید کے سلسلے کا ایک اہم اور وزن دار حلقہ ہے اور ہمیں یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ ان کی وسعتِ مطالعہ اور شدتِ تفکر کا ایک شاندار نتیجہ ہے۔

ایڈگر ایلن پو کو اکثر اہلِ ذوق ایک ممتاز افسانہ نگار بلکہ مختصر افسانہ نویسی کے موجد کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن اس کی شاعری بھی کچھ کم دلچسپ نہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کی غیر معمولی شخصیت اور انوکھے تصورات اس کی افسانہ نگاری کو بھی نثر سے ہٹا کر شعر کے قریب لے جاتے ہیں۔ ادب پر اپنے اثرات کے لحاظ سے اس کا درجہ اور بھی بلند ہے کیونکہ اس کے فرانسیسی مداحوں کے ذریعے سے نہ صرف یورپ کے تمام ممالک پر اس کے نظریات کا اثر ہوا بلکہ اسے ادب کی اس تحریک کا بانی تسلیم کیا گیا جسے یورپ کے نقاد تحریکِ انحطاط کا نام دیتے ہیں۔ اس تحریک کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ فرانس کے مشہور شاعر چارلس باڈلیئر اور سٹیفانے میلارمے اس کے حامی اور پیرو تھے۔

میراجی نے پو کی بعض نظموں کو جس انداز سے اردو کا جامہ پہنایا ہے، وہ کچھ انہی کا حصہ ہے۔

صلاح الدین احمد

(۲)

اردو شاعری کے بدلتے ہوئے رجحانات کا ذکر اس صفحے پر ایک سے زیادہ دفعہ آچکا ہے — ان بدلتے ہوئے رجحانات کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ پہلا دور ختم ہوا، اب ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ لیکن پہلے دور میں ہر بات محدود تھی، اصنافِ سخن مقرر تھیں، موضوعِ شعری کا ایک معین دائرہ تھا، اور اس کے ساتھ ہی ذہنی افق بھی ایک ہی رنگ کا حامل تھا — نئے دور میں جہاں موضوعاتِ شعری میں وسعت ہوئی اور اصنافِ سخن میں بھی نئے بُت ڈھالے جانے لگے وہاں ذہنی افق بھی رنگا رنگ جلووں سے نگاہوں کو لبھانے لگا — ضرورت اب اس بات کی ہے کہ موجودہ اردو شاعری کے مختلف رنگوں اور ان اثرات پر نقاد اپنے قلم کو مائل کریں اور اس وضاحت سے تحسین و ستائش اور نقد و نظر کے باب کو صحیح بنیادوں پر کھڑا کریں۔

موجودہ شمارے میں مختار صدیقی کی "ایک تمثیل" میں بظاہر بیاہ اور موت کی اس مماثلت سے تحریک شعری ہوئی ہے کہ — پہلا دور ختم ہوا۔ ،

اور نئے دور کا آغاز ہے۔ لیکن اس خیال یا احساس کی ادائیگی میں ناگوار اور دلکش رنگوں کی جو آمیزش کی گئی ہے، اس کا نفسیاتی پہلو بھی غور کے لائق ہے بیاہ اور موت کے دو واقعے ایک ایسی چوکھٹ کے نمائندے ہیں کہ اُس پر کھڑے ہو کر فن کار نے جو منظر پہلے خود دیکھا ہے اور پھر ہمیں دکھایا ہے۔ وہ ہیئت کی پابندی اور لغت کی قدامت کے باوجود ایک ایسے "عجوبے" کا اظہار کر رہا ہے جو ہمیں ناپسندیدگی اور رغبت کی ایک ایسی اُلجھن میں جکڑ لیتا ہے جس کا زور اور جس کی قوت اذیت پرستی اور الم پسندی میں نہاں ہے۔ نظم کی تحریک کا باعث ایک شعر ہے۔ اور اُس شعر سے جس خیال کو انگیخت ہوئی ہے اگرچہ اس کا اظہار دوسرے حصے (چوتھی چولے) میں ہے لیکن اس کے آثار پہلے حصے میں ہی ظاہر ہوئے ہیں۔ "باغِ مصفّٰی"، "حجلۂ خلد نشاں" اور آخر میں "گلشنِ جنت" —— اگرچہ سب کے سب خوشگوار تصورات کے حامل ہیں لیکن ان کا تعلق حیات بعد الممات ہی سے ہے۔

امریکہ کے تخیل پرست شاعر ایڈگر ایلن پو کی نظر میں دنیا کا سب سے زیادہ شعریت سے لبریز موضوع ایک حسین عورت کی موت ہے، اس نقطۂ نظر سے بھی اس نظم کو دیکھا جا سکتا ہے —— ہاں، ایک بات کا خیال رہے ممکن ہے اس نظم کی تمثیل دہری ہو، اِس لئے ہمیں یہ بھی سوچنا ہے کہ موت کی تمثیل بیاہ ہے یا بیاہ کی تمثیل موت۔

"عشقِ گریزاں" میں قیوم نظر اپنی استعارہ پرستی کا اظہار کر رہا ہے۔ خواہ آپ پروانے کو پروانہ سمجھ لیں خواہ اس پردے میں اپنا عکس دیکھیں نظم دونوں طرح لطف دے جائے گی۔ لیکن یہ فن کار کا کمال ہے۔ آپ کا کمال یہ ہوگا کہ پروانے کو محض پروانہ نہ سمجھتے ہوئے مفہوم میں ایک گہرائی پیدا کر لیں۔

"سرد ہو چکی محفل" —— ان تینوں لفظوں میں پروانے کا مکمل ماحول ہے —— اور اس گرد و پیش کا تاثر فن کار کے لئے خیال انگیز بن جاتا ہے۔ شاید بے حرکت فضا سے اُس کو اُلجھن ہو رہی ہے۔ وہ اس اُلجھن کو مٹانا چاہتا ہے۔ الجھن کیسے مٹے؟ —— بے حرکت فضا نوامیس کی اپنی "بے عملی" کا ایک عکس ہے۔ اب وہ اپنے آپ کو کیا بُرا بھلا کہے؟ —— وہ اپنی ہستی کے بے عمل پہلو کو پروانے کی صورت میں دیکھنے لگتا ہے۔

لیکن عزیز احمد "پیارے چاند" کو دیکھ رہا ہے۔ تکتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی رات کا ماحول قیوم نظر کی رات کی طرح محفل تک محدود نہیں (اگرچہ وہ محفل بھی کارگاہِ ہستی کی وسعت کو ظاہر کرتی ہے) —— عزیز احمد کی رات پھیلی ہوئی، سوئی ہوئی، کھوئی ہوئی رات ہے۔ بلند دلیسٹ پر چاندنی کی برکھا ہو رہی ہے۔ لیکن جی اُداس ہے، دل چاہتا ہے کہ یہ برکھا براہِ راست اُس پر اثر کرے۔ اس اُداسی کو دور کر دے۔ تمام نظم میں چاندنی کی لطافت ہے، الفاظ اور بحر کا ترنم ہے —— لیکن ایک بات کا خیال رہے شاعر کی اداسی جنسی حیثیت نہیں رکھتی، اس کا الم مبہم ہے، تمام نظم میں کوئی سراغ ایسا نہیں جو ہمارے ذہن کو کسی عورت کی طرف لے جا سکے۔ اور اس لئے یہ نظم خالصتاً فطرت پرستی کے احساس کی نمائندگی کر رہی ہے۔

آسمان کی اس لطیف فضا سے علی احمد ہمیں زمین ہی کا ایک لطیف منظر دکھاتا ہے۔ "گرما کی دوپہر کا ایک رومان" —— گرما اور پھر اس کی دوپہر، —— اس میں کیا لطافت ہوگی جس کے تصور ہی سے کثافت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ فن کار کا کمال ہے جو اس پسینہ لانے والی فضا میں بھی ایک حسینہ کے نرم و نازک بیان میں کچھ ایسا گم کرتا ہے کہ گرمی کا احساس بھی باقی نہیں رہتا۔

"گرما" سال کے ایک حصے کا نام ہے۔ وقت کا ایک معمولی سا ٹکڑا، لیکن یوسف ظفر "عکس" کے عنوان سے ماضی حال اور مستقبل تینوں زمانوں کا ذکر کر رہا ہے۔ تصورات کی آمیزش اور ترتیب سے اُس نے احساس و خیال کو تحریک دی ہے۔ اور یہ تحریک کہاں تک کامیاب ہے اس کے متعلق اس وقت کچھ کہئے گا جب نظم کو پڑھنے کے بعد آپ کا ذہن بھی شاعر کے ذہن سے ہم آہنگ ہو کر تینوں زمانوں کے تانے بانے میں کھو کھو جائے۔

شاعری کی ریل گاڑی یوں مختلف منزلوں سے چلتی ہوئی شملے کی طرف جا نکلتی ہے جہاں ضمیر جعفری نے خوب خوب مزے لے کر خلوت کے مناظر کو جلوت کے مناظر بنایا ہے

میراجی

آئینۂ عالم

مصر اور برطانیہ کے تعلقات

برطانوی وزیراعظم لارڈ سالسبری عام طور پر کہا کرتے تھے کہ "خدا نے افریقہ کو یورپ کی وزارت ہائے خارجہ کی زندگیوں کو تلخ کرنے کے لئے پیدا کیا ہے"۔ افریقہ سے ہمیشہ ان کی مراد مصر ہوا کرتی تھی اور مصر ہمیشہ یورپ کی دو بڑی طاقتوں فرانس اور برطانیہ کے مابین کشمکش کا موجب رہا ہے۔ آخر برطانیہ کو مصر میں زیادہ اقتدار حاصل ہو گیا لیکن اس اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے اسے ہمیشہ بے شمار پریشانیوں اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا جس کی ہلکی سی جھلک صرف اسی بات سے ظاہر ہے کہ مصر پر برطانوی قبضے کے پہلے چالیس سال کے دوران میں ہی اسے چھیالیس اعلان کرنے پڑے جس میں اس نے بار بار اس امر کا اعادہ کیا کہ حکومت برطانیہ اس وقت مصر کو اپنے تصرف سے آزاد کر دے گی جب یہاں خدیو کی پوزیشن مستقل ہو جائے گی اور سارا ملک منظم ہو جائے گا۔

مصر مغربی طاقتوں کے لئے ہمیشہ جاذب نگاہ رہا ہے۔ اسے پرانے زمانے میں بھی مشرق کی کنجی تصور کیا جاتا تھا۔ مختلف حکومتوں نے مثلاً پہلے اٹلی اور پھر فرانس اور برطانیہ نے مشرق کے ساتھ اپنی تجارت کو مضبوط کرنے کے لئے بحیرۂ روم اور بحیرۂ قلزم کو ایک نہر کے ذریعے سے ملانے کے کئی منصوبے باندھے۔ نپولین نے بھی اپنے زمانے میں یہی خواب دیکھا اور اس مجوزہ نہر کو بنانے کی کوشش کی۔ وہ اس غرض کے لئے مصر میں آیا بھی تھا۔ بعض اطلاعات کی بنا پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مصر کی رائے عامہ کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔ حقیقت حال کچھ بھی ہو لیکن اس امر سے انکار ناممکن ہے کہ مغرب مصر کو مشرقی ممالک میں سب سے زیادہ اہم خیال کرتا تھا۔ یہ تو اس وقت کی بات ہے جب نہر سویز ابھی معرض وجود میں نہیں آئی تھی۔ اس نہر کے بننے کے بعد تو مغربی اقوام بالکل دیوانی سی ہو گئیں اور انھوں نے اس ملک کو اپنی "سرپرستی" میں لینے کے لئے جو جو کوششیں کیں، وہ ارباب بصیرت سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

برطانیہ کو مصر کے ساتھ پرانے وقتوں سے دلچسپی ہے اور اس گہری دلچسپی کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب اس نے سلطنت عثمانیہ کے امور میں جس کے ماتحت مصر ۱۵۱۷ء سے آ رہا تھا دلچسپی لینا شروع کی تھی۔ واقعات یوں بیان کئے جاتے ہیں کہ انیسویں صدی میں مصر کے گورنر محمد علی پاشا نے ترکی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ ترکی نے روس کی مدد سے اس فتنے کو دبانے کی کوشش کی لیکن اُسے ناکامی کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ آخر سات سال بعد برطانیہ نے دونوں میں صلح کرا دی محمد علی کو ترکی حکومت کے ماتحت کسی قدر آزادی سی حاصل ہو گئی اور مصر پر ترکی کا اقتدار برائے نام رہ گیا۔ یہ ۱۸۴۰ء کی بات ہے۔ اس وقت سے برطانوی اقتدار مصر پر برابر بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ بالآخر ترکی کی بجائے برطانیہ اس کا "آقا" تصور کیا جانے لگا۔ برطانوی اقتدار کا اعلان اس وقت تک نہ کیا گیا جب تک ترکی نے گزشتہ جنگ میں برطانیہ کے خلاف اور جرمنی کی حمایت میں جنگ میں شرکت نہ کی اور معاہدہ لوزان کی رو سے جو ۲۳ جولائی ۱۹۲۳ء کو ہوا مصر پر ترکی کے آئینی حقوق کا خاتمہ کر دیا گیا۔

اب ہم ایک بار پھر انیسویں صدی کے آخری ربع میں جاتے ہیں جب ۱۸۷۴ء میں گلیڈسٹن کے بعد ڈسرائیلی نے برطانیہ کی وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھالا۔ گلیڈسٹون اور ڈسرائیلی میں بہت فرق تھا۔ اور یہی فرق ڈسرائیلی کے وزیراعظم بننے کا موجب ہوا۔ گلیڈسٹن اس بات کا خواہشمند تھا کہ برطانیہ میں مزید اصلاحات نافذ کی جائیں اور امن کی حکمت عملی بر سر کار رہا جائے لیکن برطانوی سیاست داں یہ چاہتے تھے کہ برطانیہ کو اس چھوٹے سے جزیرے کے باہر بھی قدم رکھنا چاہئے اور وہ کسی ایسے آدمی کے جویاں تھے جو نو آبادیات حاصل کرنے کی پالیسی کا حامی ہو۔ ڈسرائیلی نے ان کی آرزوؤں کو پورا کیا۔

ان ہی دنوں ایک واقعہ پیش آیا۔ خدیو مصر سویز کے حصے جو اس نے خود خریدے تھے بیچنا چاہتا تھا۔ سویز اور مصر کو چونکہ مشرق کی کنجی سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے یورپ کی ہر بڑی قوم انھیں خریدنے کے لئے مضطرب تھی۔ فرانس سب سے زیادہ کوشش کر رہا تھا اور اسے اس میں کامیابی کی امید بھی ہو چلی تھی لیکن ڈسرائیلی نے فرانس کی امید کی

پانی پھیر دیا اور ایک صبح فرانس نے نہایت حیرت واستعجاب سے یہ خبر سنی کہ خدیو نے سویز کے حصّے برطانیہ کو بیچ دیئے۔ اگر واقعات کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سویز کے حصّوں کو خریدنے سے اس نے صرف سویز کے انتظام میں ہی زیادہ اختیارات حاصل کر لئے بلکہ سارے افریقہ اور ہندوستان میں برطانیہ کا اقتدار مضبوط کر دیا۔

ممکن ہے خدیو یہ حصّے فروخت نہ کرتا اگر مصر کا قرضہ بہت زیادہ نہ بڑھ جاتا جو ۱۸۶۳ء میں تیتس لاکھ پونڈ تھا لیکن ۱۸۷۶ء میں ۹ کروڑ پونڈ ہو گیا۔ اس پر طرّہ یہ کہ مصر کی مالی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی اور اس حالت کی ذمہ داری ان غیر ملکی تاجروں پر عائد ہوتی ہے جو وہاں آباد ہو گئے تھے اور خراب اشیا کو نہایت مہنگی قیمتوں پر بیچ رہے تھے جنھیں بعض وجوہ کی بنا پر حکومت خریدنے پر مجبور تھی۔ علاوہ ازیں یہ اجنبی حکومت کو ٹیکس بھی نہیں دیتے تھے۔ ان تمام باتوں نے مصر کی مالی حالت کو کمزور کر دیا اور وہ واقعہ پیش آیا جس نے مشرق کی قسمت کو بدل دیا۔ دوسرا اسمٰعیل نے خدیو کو مشہور یہودی خاندان راتھچائیلڈ سے ایک خطیر رقم بطور قرض بھی لے دی۔ جس سے اس نے مصر کی حالت کو سدھارنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ مصر ابھی سلطان ترکی کے ماتحت سمجھا جاتا تھا۔

۱۸۷۹ء میں سلطان نے خدیو کو حکومت سے ہٹا دیا اور اس کے بیٹے کو تخت پر بٹھایا۔ یہ حکومت کے سخت ناقابل تھا۔ اس نے نظامِ حکومت میں غیر ملکی افسروں کو بہت بڑی تعداد میں اور زیادہ سے زیادہ تنخواہیں دے کر ملازم رکھ لیا۔ چونکہ مصری خزانے میں اتنی استطاعت نہ تھی کہ اتنے اخراجات کا کفیل ہو سکتا اس لئے اس نے اپنے ملکی افسروں کی تنخواہوں کو پہلے سے نصف کر دیا۔

ان واقعات کا ردّعمل ضروری تھا۔ لہٰذا مشہور مصری جرنیل عربی پاشا کی سرکردگی میں مصری فوج نے اس نوجوان بادشاہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عارضی طور پر مصر میں قوم پرست وزارت قائم ہو گئی۔ مگر بہت جلد بغاوت فرو ہو گئی۔ عربی پاشا کو گرفتار کر لیا گیا اور برطانیہ نے چونکہ اسی نے بغاوت فرو کی تھی فیصلہ کیا کہ جب تک مصر کے حالات درست نہیں ہوتے برطانوی فوج وہاں مقیم رہے۔ اس کے بعد اگرچہ نوجوان بادشاہ بدستور حکمراں رہا لیکن محض برائے نام رہا۔ کیونکہ دراصل لارڈ کرومر جو مصر میں برطانوی قونصل تھا مصر پر حکومت کرتا تھا۔

ان دنوں ادھر سوڈان میں حالات خراب ہو رہے تھے اور مہدی سوڈانی کی قیادت میں درویشوں نے علمِ آزادی بلند کر دیا تھا۔ برطانیہ نے جنرل گورڈن کی درخواست پر اسے سوڈان میں حالات پر قابو پانے کے لئے بھیجا لیکن وہ کامیاب نہ ہوا اور دشمن نے خرطوم میں اس کا محاصرہ کر لیا جو چھ ماہ تک جاری رہا اور جس کے نتیجے کے طور پر جنرل گورڈن اپنی گیارہ ہزار سپاہ کے ساتھ قتل ہو گیا۔ اس موقع پر شروع شروع میں نہ تو حکومت مصر ہی گورڈن کی مدد کر سکی نہ حکومت برطانیہ۔ آخر اس واقعہ کے دس سال بعد لارڈ کچنر کو سوڈان میں بھیجا گیا جس نے محض دو بریگیڈوں کی مدد سے جس میں صرف ۲۳ ہزار سپاہی تھے، چالیس ہزار درویشوں پر فتح پائی اور مہدی سوڈانی کی قبر سے اس کی ہڈیوں کو نکال کر جلایا اور اس طرح گورڈن کا انتقام لیا۔ سوڈان فتح ہونے کے بعد خرطوم پر مصری اور برطانوی جھنڈے پہلو بہ پہلو لہرائے گئے۔

جب لارڈ کچنر سوڈان میں آیا تھا۔ اس وقت ایک فرانسیسی فوج وسطی افریقہ کے جنگلوں سے ہوتی ہوئی نیل کے بالائی حصّے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ درویشوں کی سرکوبی کے بعد کچنر نے اس فرانسیسی فوج کی طرف توجہ کی پہلے کچنر نے اس کے جرنیل سے درخواست کی کہ وہ واپس چلا جائے۔ مگر اس نے اس درخواست کو ماننے سے انکار کر دیا۔ البتہ جب برطانیہ نے فرانس پر دباؤ ڈالا تو اسے واپس آنا پڑا۔ آخر ۱۸۹۹ء میں فرانس کے نئے وزیر اعظم ڈیلکیسی نے جو السّاس اور لورین کے فرانسیسی صوبوں کی واپسی کے لئے جو جرمنی کے قبضے میں تھے برطانیہ اور فرانس کے اتحاد کو ضروری خیال کرتا تھا نیل کے بالائی حصّے پر برطانوی تصرف تسلیم کر لیا۔ ۱۹۰۴ء میں برطانیہ اور فرانس نے جب اپنی نوآبادیوں کے مسائل کا فیصلہ کیا تو فرانس نے مصر پر برطانوی اقتدار قبول کر لیا اور برطانیہ نے مراکو پر فرانسیسی قبضہ کو مان لیا۔ اور یہ دونوں اقوام ایک دوسرے کی دوستی کے حلقہ میں زیادہ مضبوطی سے بندھ گئیں۔

پہلے بیان کیا گیا ہے کہ ان دنوں خدیو کے نوجوان بیٹے کے پردے میں لارڈ کرومر مصر پر حکمراں تھا اور اس کی حکومت بالکل خود مختارانہ تھی۔ اگرچہ اس نے اپنی حکومت کے دوران میں مصر کو بہت سے فائدے بھی پہنچائے مثلاً نظامِ حکومت کی کمزوریوں کو دور کیا۔ بیگار کو بند کر دیا۔ انصاف کو تقویت دی۔ مصریوں کو اعلیٰ عہدے دیئے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بہت زیادہ خود مختار تھا۔ اس حد تک کہ بعض دفعہ وہ خدیو یا مصری حکام سے مشورہ نہیں کیا کرتا تھا اور ملکی نظام کو برقرار رکھنے میں تشدّد کے استعمال سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ آخر اس کی سختی رنگ لائی ملک میں ہر طرف بے اطمینانی ظاہر کی جانے لگی۔ آخر ۱۹۰۶ء میں اس نے استعفےٰ دے دیا۔

کرومر کے بعد مصریوں میں آزادی کے جذبات جنھیں کرومر نے سختی کے ساتھ دبا رکھا تھا بھڑک اٹھے اس لئے حکومت نے مصریوں کو مطمئن کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ مصری اسمبلی کے نمائندوں کو بعض امور پر سوالات کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ اور لارڈ کچنر کے زمانے میں جہاں منتخب شدہ ممبروں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا۔ وہاں ان کو بعض ایسے امور پر بھی جرح کرنے کی اجازت مل گئی جن پر ابھی تک انھیں اجازت نہ تھی۔ لارڈ کچنر نے زراعت پیشہ طبقہ کی زمینوں کو قرضہ میں

قرق ہونے سے بچانے کے لئے بھی ایک قانون پاس کرادیا لیکن مصری ان اقدامات سے مطمئن نہ ہوئے، وہ مکمل آزادی سے کم کسی چیز پر بھی رضا مند ہونے کو تیار نہ تھے۔

کچھ عرصے کے بعد جنگ عظیم شروع ہوگئی جس کے دوران میں برطانیہ نے قاہرہ کو مشرق وسطیٰ میں اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا۔ خدیو کو تخت شاہی سے محروم کرکے اسے مکمل برطانوی قبضے میں لے لیا گیا نیز برطانوی فوجیں زیادہ تعداد میں یہاں رکھی گئیں۔

جنگ کے بعد صدر جمہوریہ امریکہ ولسن نے مصر کے قائد اعظم زاغلول پاشا کو بھی امن کی کانفرنس میں وفد لانے کی دعوت دی۔ ولسن کا اس سے یہ مطلب تھا کہ برطانیہ کو مصریوں کے مطالبات معلوم ہو جائیں گے۔ چنانچہ زاغلول وفد لے کر گئے لیکن کسی نے ان کے مطالبات پر کان نہ دھرا اور وہ سب بے نیل ومرام واپس آ گئے۔ ان کی ناکامی سے مصریوں کی آزادی کی تحریک زیادہ تیز ہوگئی۔ جس کی وجہ سے حکومت نے زاغلول پاشا کو مالٹا میں بھیج دیا لیکن اس واقعہ سے برطانیہ کی مخالفت زیادہ بڑھ گئی اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے مصر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ سی لگ گئی ہے اور زاغلول پاشا کی گرفتاری کے دو دن بعد ملک میں بغاوت ہوگئی۔ جسے دبا دیا گیا۔ مصر کے ہائی کمشنر ایلن بی نے زاغلول کو رہا کرا دیا اور مصالحت کی کوششیں کیں جو کامیاب نہ ہو سکیں اور فسادات پھر رونما ہونے لگے۔ اب حکومت نے زاغلول اور ان کے پانچ ساتھیوں کو مصر سے باہر کسی مقام پر نظر بند کر دیا۔

فروری ۱۹۲۲ء میں حکومت برطانیہ نے مصر کو آزادی دینے کا اعلان کر دیا لیکن یہ آزادی مکمل آزادی کی حیثیت نہیں رکھتی تھی کیونکہ حکومت نے بعض نہایت اہم محکمے اپنے قبضے میں رکھے۔ اس آزادی کو اگرچہ مصر کی حکومت نے بھی تسلیم نہ کیا لیکن خدیو نے اپنے آپ کو مصر کا بادشاہ کہنا شروع کر دیا۔ جب عام انتخابات ہوئے تو اس میں وفد پارٹی نے ایک سو اٹھاسی نشستوں پر قبضہ کرکے زاغلول کی قیادت میں جو اب آزاد ہو چکے تھے وزارت قائم کر لی۔

وفد پارٹی کی وزارت قائم ہونے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ مصریوں نے مکمل آزادی کی جدوجہد چھوڑ دی۔ زاغلول نہایت سختی سے اپنی قوم کے متفقہ مطالبے پر ڈٹا رہا۔ اگرچہ ریمزے میکڈانلڈ نے دو بار ان سے ملاقات کرنے کا شوق بھی ظاہر کیا لیکن آپ نہ ملے۔ آخر جب تیسری بار مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے پھر دعوت دی تو آپ لندن میں ان سے ملے۔ ابھی تک آزادی کی تحریک جاری تھی اور کہیں کہیں مصری تشدد بھی برت رہے تھے۔ اسی دوران میں کسی شخص نے سوڈان کے گورنر جنرل سر لی سٹیک کو قتل کر دیا۔ چونکہ یہ فعل ذاتی حیثیت میں کیا گیا تھا لہٰذا خدیو اور وزیر اعظم نے قاتل کے اس فعل کی مذمت کی اور کہا کہ مجرم کو قرار واقعی سزا دی جائے گی لیکن برطانوی حکام نے مصری حکومت کے اقدام کا انتظار کئے بغیر مصری حکومت کو چوبیس گھنٹے کا الٹی میٹم دے دیا اور مطالبہ کیا کہ حکومت مصر

۱۔ جرمانہ ادا کرے۔

۲۔ سوڈان سے مصری حکام کو واپس بلا لے۔

۳۔ اجنبیوں کی ملازمت کے قوانین پر نظر ثانی کرے۔

۴۔ ان کی حفاظت کے سلسلے میں قدم اٹھائے۔

چونکہ الٹی میٹم کی میعاد بہت کم تھی اس لئے کچھ نہ ہو سکا۔ لہٰذا انگریزوں نے اسکندریہ کے چونگی خانہ پر قبضہ کر لیا۔

زاغلول پاشا نے اس واقعے سے متاثر ہو کر وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور لیگ آف نیشنز سے اپیل کی لیکن لیگ نے اس معاملے کو بین الاقوامی حیثیت نہ دیتے ہوئے رد کر دیا۔ زاغلول کے بعد لبرلوں نے وزارت قائم کی اور وعدہ کیا کہ مصر کی حکومت برطانوی ماہرین مالیات و انصاف کے مشوروں پر عمل کرے گی چنانچہ اسکندریہ کے چونگی خانے سے برطانوی حکام نے فوجیں واپس بلا لیں لیکن سوڈان کا مسئلہ وہیں کا وہیں رہا۔

۱۹۲۵ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان کئی بار مصر اور برطانیہ کے جھگڑے کو ختم کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ ان ہی دنوں زاغلول پاشا وفات پا گئے۔ اس کے بعد ۱۸ر جون ۱۹۲۹ء اور ۸ر مئی ۱۹۳۰ء کے درمیان بھی ایک بار پھر کوشش کی گئی جس میں مصری رضامند ہو گئے کہ برطانوی فوجیں نہر سویز کے خطے میں رہیں لیکن ہنڈرسن نے مصری مہاجرین کو زیادہ تعداد میں سوڈان جانے کی اجازت نہ دی اور مصری پھر بگڑ گئے۔ اس دوران میں حکومت برطانیہ مصر کے بین الاقوامی معاملات میں برابر مداخلت کرتی رہی اور کبھی کبھی طاقت کا استعمال بھی کرتی رہی! لیکن مصر نے آزادی کی جدوجہد جاری رکھی اور یہ جدوجہد ۱۹۳۶ء میں بہت زیادہ بڑھ گئی۔ آخر ۱۹۳۶ء میں حکومت برطانیہ نے مصر کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے مصر نیم آزاد ہو گیا اور اس معاہدے کی رو سے یہ بھی طے پایا کہ برطانیہ مصر میں اپنی افواج کی ایک تعداد رکھ سکے گا۔ جسے جنگ کے دوران میں بڑھانے کی اجازت ہوگی۔ اور برطانیہ مصر کی ریلیں اس کے ہوائی اور بحری اڈوں کو بھی استعمال کر سکے گا۔

اس لحاظ سے آج کل مصر نہ تو بالکل آزاد ہی ہے نہ پورا غلام اس کا درجہ ان دونوں کے بین بین ہے۔ اور مصر اور برطانیہ کو ۱۹۳۶ء کے معاہدے نے دوستی کے رشتے میں منسلک کر رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ مصر برطانیہ کی جنگ کو اپنی جنگ سمجھتا ہے اور دامے درمے برطانیہ کی مدد کر رہا ہے اور اس کے حق میں پروپاگنڈا بھی کرتا ہے۔ اور مصر کے مدبرین بارہا موجودہ جنگ میں اتحادیوں کے ساتھ اپنی ہمدردیوں کا اظہار کر چکے ہیں ۔

تابش صدیقی

ایک تمثیل

"حجلۂ گور میں سامانِ عروسی ہوگا
لاش آرام سے سوتی ہے سہاگن بنکر"

رخصتی

رخصتی ہوتی ہے، جاتی ہے دلہن کی ڈولی،

باری باری یہ اعزّہ ابھی کاندھا دیں گے
دھن پرایا تھا مگر آج پرایا ہوگا
فرطِ رقت سے ہوئی جاتی ہیں پُرنم آنکھیں
کون ایسا ہے جو اس وقت نہ رویا ہوگا
گل بداماں ہے کہ اک خرمنِ گُل ہے ڈولی
دوش پر پھول نہیں باغ مصلّے ہوگا
کوئی دم ہے کہ اسی خرمنِ گُل کے صدقے
حجلۂ خُلد نشاں اور مہکتا ہوگا
روتی آنکھوں میں جھلکتے ہیں لہو کے قطرے
پھول ہنستے ہیں مگر خون ٹپکتا ہوگا
ہے جو خلوت میں یہ وارفتہ لپٹ سیلے کی
دل میں نوشہ کے مگر حشرِ تمنّا ہوگا
سمٹی سمٹائی لجاتی ہوئی آئی دلہن
داخلِ گلشنِ "جنت" ہوئی جانِ گلشن!

چوتھی چالے

لئے آتے ہیں سبھی داغِ جگر کے مالے
زیبِ تن ہوگا نیا آج عروسی جوڑا
پھر نئے سر سے اعزّہ کی ضیافت ہوگی
ڈھیریوں پھول مہکتے ہیں پڑے خلوت میں
منہ چھپائے ہوئے گھونگھٹ میں ہے راجدھارانی

خیر سے چاند سی دلہن کے ہیں چوتھی چالے
گردِ مہتاب پڑیں گے نئے سیمیں ہالے
پھر سے رقت میں لہو روئیں گے رونے والے
اور خوشبو سے ہوئے جاتے ہیں دل متوالے
گرچہ خلوت میں نہیں سانوری صورت والے

لاش آرام سے سوتی ہے سہاگن بن کر
گوہرِ اشک سے آنکھوں کی بھری ہے جھولی!
رخصتی ہوتی ہے، جاتی ہے دلہن کی ڈولی!

مختار صدّیقی

امریکہ کا تخیّل پرست شاعر

ایڈگر ایلن پو

اُردو ادب کی تاریخ میں میر تقی کی شخصیت اور اُن کا افسانۂ حیات (جس کی پنہاں گہرائیاں کم ہی لوگوں کو معلوم ہیں) اپنی المناک دلکشی کو لئے ہوئے آج بھی ہمارے دلوں کو موہ رہا ہے اور اگر ہم اُن کی حیاتِ عشقی کے کم روشن پہلو پر غور کریں تو اُن کی بد دماغی کے وجوہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ امریکی ادب میں بھی ایک شاعر اور ادیب کی زندگی اس افسانے سے مماثلت رکھتی ہے، لیکن یہ مشابہت محض بنیادی ہے، تفصیل کے لحاظ سے امریکی ادیب میر تقی سے کہیں مختلف ہے اور اس کی وجہ شاید کسی حد تک ملکی اختلاف ہے اور کسی حد تک اردو اور انگریزی ادب کا فرق۔

پو کی زندگی میں سب سے تلخ حقیقت جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس کی بدنصیبی ہے، ایسے بدنصیب انسان جن کی ذہانت میں عظمت کا جوہر موجود ہو خاص طور پر لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ اُن کی شخصیت ایک حکایت بن جاتی ہے اُن کی زندگی کے ارد گرد روایات کا جال تن جاتا ہے اور اس حکایت اور اُن روایت کی ہر کوئی من مانی شرح کرنے پر اتر آتا ہے۔ ایسے لوگوں کی ذہانت میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی بلکہ وہ خوش قسمت، ذہین لوگوں ہی کی مانند ہوتے ہیں لیکن بظاہر اُن کی ذات میں دنیا کو کئی اُلجھنیں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُن کی ذہانت اور زندگی کی متضاد کیفیتیں بیرونی دنیا میں بھی متضاد عکس ڈالتی ہیں۔ میر تقی کا فسانہ کسی کے لئے صرف ایک بد دماغ ذہانت کا فسانہ ہے، کسی کے لئے اُس ناکام عاشق کی کہانی ہے جسے اپنی کسی رشتہ دار لڑکی سے محبت تھی، اور کوئی آج اُس کے کلام سے اس کے میلان ہم جنسی کے دلائل مہیا کرتا ہے۔ اردو کے ایک اور شاعر انعام اللہ خاں یقین کی شخصیت ابھی لوگوں کی نظر میں زیادہ مانوس نہیں ہوئی ورنہ اُس کے متعلق میر تقی سے بھی بڑھ کر مختلف قیاسات کا امکان ہے۔ اور آج بھی ایک دو شاعر اردو ادب میں نمایاں نظر آتے ہیں جن کے متعلق اُن کی موت کے بعد اسی قسم کے مختلف قیاسات قائم کئے جائیں گے۔

پو کا بھی انگریزی ادب میں یہی حال ہے، جو بھی کتاب اُس کے متعلق لکھی گئی ہے ایک نئے نقطۂ نظر سے۔ کوئی اُسے شرابی کہتا ہے۔ کوئی اعصابی مریض، کوئی اذیت پرست، اور کوئی جنسی لحاظ سے ناکارہ ثابت کرتا ہے۔—— اور ان رنگا رنگ خیال آرائیوں کی وجہ سے اصلیت پر ایسے پردے پڑ گئے ہیں کہ اٹھائے نہیں بنتا ہے۔

حقیقتاً پو اور اُس کی زندگی کے متعلق صرف ایک ہی بات اُلجھی ہوئی ہے، صرف ایک پیچیدگی ہے۔ اُس کی ذات میں صرف یہی بات پُر اسرار اور اس لئے قابلِ غور ہے کہ وہ ایک اعصابی مریض تھا اور اُس کی تخلیقاتِ ادبی میں صرف ایک اُلجھن ہے، ادب اور آرٹ کی ازلی (اور ابدی) اُلجھن۔ اُس کی شخصیت میں متضاد، غیر معمولی اور تخریب آلود باتیں ہیں، لیکن وہ سب واضح ہیں، اُن میں کوئی بھید کی بات نہیں ہے خصوصاً اس صورت میں کہ کوئی مصنف ایسا نہیں گذرا جس نے اپنے ذہن کی کارفرمائیوں کے روشن نقوش اپنی تحریروں میں پو کی ایسی وضاحت کے ساتھ چھوڑے ہوں، نیز کوئی مصنف ایسا نہیں گذرا جس کی ذہانت اور زندگی کے حالات کا تجزیہ پو کی مانند کمال محنت اور فراست سے کیا گیا ہو۔

پہلی نظر میں پو کو نہ تو شرابی کے لحاظ سے دیکھنا چاہئے نہ اعصابی مریض کے لحاظ سے، اور نہ اُس کی آوارہ مزاجی کا ذکر کرنا چاہئے، حقیقت تک زینہ بہ زینہ پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اُسے پہلی نظر میں ایک صحافت نگار، ایک اخبار نویس سمجھیں، انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے کا ایک محنتی اخبار نویس، ذہنی لحاظ سے امریکی سماج میں اس وقت ایک عجیب دُہری قسم کی

کیفیت تھی، روحانی اور اخلاقی لحاظ سے ایک بے چینی تھی، کھُلی زمینیں رہنے سہنے کے لئے موجود تھیں، انسان کی حرکات و سکنات پر کوئی پابندی نہ تھی اور تمام سماج ایک تیزی کے ساتھ متحدہ جمہوریت کی طرف رواں تھی۔ پہلے ابتدائی اثرات دور ہو رہے تھے اور قوی اعصاب کا ساز ہر نئی مضراب سے گونج اٹھتا تھا۔ ذہانت میں ایک تیزی اور بیداری تھی لیکن دماغوں میں تربیت کی کمی تھی۔ اور عام طور پر ملک میں کوئی پختہ نظام کارفرما نہ تھا۔ ایسی صورتِ حال ادب اور آرٹ میں بھی ایک دورنگی کا باعث ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ڈی۔ ایچ لارنس کے خیال میں امریکی ادب اور آرٹ کی حرکت کا بہاؤ دہرا ہے۔ اس بہاؤ کا ایک پہلو پرانے شعور کو مانجھنا اور اُس کا تجزیہ کرنا ہے اور دوسرا پہلو اس کے ساتھ ہی نیا شعور قائم کرنا۔

لارنس کے خیال میں پو کی تخلیقات میں پہلے پہلو کا اظہار ہے۔ کیونکہ یہ اُس کی قسمت میں لکھا ہوا تھا کہ وہ اپنی روح کو ایک تجزیے کے ایک مسلسل بکھیڑے میں اُلجھا دے، اور اس عمل کو واضح صورت بھی دیتا چلا جائے اور یہ بھی اُس کی تقدیر میں تھا کہ اس کام کے لئے لوگ اُسے بُرا بھلا بھی کہیں۔ حالانکہ اُس نے تلخ ترین انسانی تجربات میں سے بعض کی کامیاب ترجمانی کی تھی اور یہ ترجمانی ضروری بھی تھی۔ کیونکہ اگر روحِ انسانی اپنا قیام چاہتی ہے تو اُس کے لئے ضروری ہے کہ کوئی نہ کوئی مردِ مجاہد اپنی قربانی سے اُس کے لئے تلخ ترین تجربات کی تکمیل کرے۔

پو کے متعلق آج تک جو کچھ لکھا گیا اُس میں سے زیادہ تر مواد جانب داری سے آلودہ ہے۔ پو کو یا تو ایسے سوانح نگار اور نقاد ملے جن کے لئے اُس کی ذات اور اُس کے حالات میں بہت زیادہ اپیل تھی اور انہوں نے اُسے اندھا دھند سراہا، یا دوسری طرف ایسے لوگ تھے جو تنگ نظری اور محدود ذہنیت کے باعث اُسے پسند کرنے ہی کے قابل نہ تھے۔ نیویارک کے ایک اخبار میں اُس کی موت پر جو مضمون اُس کے متعلق شائع ہوا وہ اس قسم کے رسمی مضامین سے کہیں مختلف ہے جو مشاہیر کی موت کے عین بعد شائع ہوا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُس مضمون کے چند اقتباسات دیکھئے جو اب اپنی اس غیر معمولی خصوصیت کی بنا پر امریکی ادب میں تاریخی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

"ایڈگر ایلن پو مر چکا ہے۔ پرسوں بالٹی مور میں اُس کی موت ہوئی۔ یہ اعلان بہت سے لوگوں کے لئے حیران کن ہوگا لیکن ان میں سے بہت ہی کم ایسے نکلیں گے جنہیں اس خبر سے رنج ہو۔ شاعرِ مذکور اپنی ذات اور شہرت کے لحاظ سے تمام ملک میں جانا پہچانا تھا۔ اُس کی تحریروں کا مطالعہ کرنے والے انگلستان چھوڑ یورپ کے باقی علاقوں میں بھی موجود تھے۔ لیکن کہیں بھی اُس کا کوئی دوست نہ تھا۔

"باتیں کرتے ہوئے اُس کی گفتگو بسا اوقات فصاحت کے لحاظ سے انسانی مرتبے سے کہیں بلند ہو جاتی تھی۔ اُس کی آواز کا زیر و بم حیرت ناک مشاقی سے ظاہر ہوا کرتا تھا۔ اور اُس کی بڑی بڑی بلیغ آنکھیں کبھی تو آسودہ دکھائی دیتی تھیں اور کبھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ اُن آنکھوں سے اس کے مخاطبوں کی آنکھوں میں آتشیں لہریں چھوٹ رہی ہیں۔ اس دوران میں اُس کا اپنا چہرہ یا تو بے حد چمک رہا ہوتا یا اس میں ایک اَن مٹ قسم کا پھیکا پن نمودار ہو جاتا۔ اور چہرے کی یہ بدلتی ہوئی کیفیتیں اُس کے تخیل کی رفتار کے ساتھ ساتھ دورانِ خون کی کمی بیشی کے مطابق ہوتیں۔ اُس کے تصورات اُن دنیاؤں سے تعلق رکھتے تھے جن تک اسی شخص کی نظریں پہنچ سکتی ہیں جسے عمیق نظری کا جوہر خداداد عطا ہوا ہو۔ کبھی کبھی وہ خواب دیکھنے لگتا اور اس وقت وہ کسی خیالی دنیا کا باشندہ معلوم ہوتا۔ ایک ایسی سرزمین کا رہنے والا جو کبھی جنت میں ہے کبھی دوزخ میں اور جس میں اس کے اپنے ذہن کے پیدا کردہ کردار رہتے بستے ہیں، اور جہاں اُس کے من مانے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں ...... رستہ چلتے ہوئے بازاروں میں کبھی تو وہ دیوانہ معلوم ہوتا اور کبھی رنج و الم سے چور کبھی وہ زیرِ لب گالیاں دیتا ہوا نظر آتا اور کبھی اس کی آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہوتیں۔ گویا وہ کسی ایسی دعا میں مشغول ہے جو اُس کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہی ہے۔ لیکن یہ دعا اُس کی اپنی ذات کے لئے نہ ہوتی تھی کیونکہ اُسے محسوس ہوتا تھا یا کم سے کم وہ اس کا بہانہ کرتا تھا کہ اُسے موت سے پہلے ہی مردود اور ملعون قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ دعا اُس ہستی کی مسرت و راحت کے لئے ہوا کرتی تھی جو اُس خاص لمحے میں اُس کی پرستش کا مرکز ہو۔ کبھی یوں رستہ چلتے وہ بے دھیانی سے سامنے دیکھتا جاتا لیکن ایسے موقعے پر اُس کی نظریں اپنے دل کی حالت کو ہی دیکھ رہی ہوتیں، وہ دل جسے درد و کرب اور اندیشوں نے تڑپنے پر مجبور کر رکھا ہو۔ اُس کے چہرے پر ملال کا ایک کفن سا لپٹا ہوا ہوتا اور ایسی حالت میں اُسے موسم کی تندی اور تیزی کی بھی کچھ پروا نہ رہتی۔ تمام رات بھیگے ہوئے کپڑوں میں بازوؤں کو یا دو باراں کے تھپیڑوں اور بوچھاڑوں کے مقابل وحشیانہ طور پر ہلاتے ہوئے یوں محوِ گفتار ہوتا گویا وہ روحوں سے باتیں کر رہا ہے، اُن روحوں سے جنہیں ایسے سمے میں صرف اُسی کی ذات بیدار کر سکتی ہے۔ یہ روحیں اُس کی نظر میں اُس عدن کی رہنے والی تھیں جس کی خاک پر پہنچ کر

اُس کی اپنی روح اُن تمام مصائب کو بھول جائے گی جو اُسے اس مادّی زندگی میں لاحق تھے۔ اسی عدن میں وہ سب لوگ بھی رہتے تھے جو اُس کے پیارے تھے۔ اس سرزمین تک وہ خود کبھی نہیں پہنچ سکتا تھا، ہاں کبھی کبھی چند بیتاب لمحوں میں اُسے اُس کی جھلک دکھائی دے جاتی تھی"۔

یہ مضمون رَفَس گرِس وُلڈ نے لکھا تھا، وہ پو کی زندگی میں نہ صرف اُس کا دوست تھا بلکہ مرنے سے پہلے پو نے اپنی تصنیفات کے انتظام کے لئے بھی اُسی کا نام مقرر کیا تھا ـــــ ظاہر ہے کہ اس مضمون کے مطالعے کے بعد پو کو ایک دیوانے کے سوا اور کچھ نہیں سمجھا جا سکتا لیکن وہ عمر بھر دیوانہ تو نہ تھا۔ اعصابی مزاج البتہ تھا۔ اور اسی عصبیّت اور حالاتِ زندگی کی بنا پر اپنی عمر کے آخری دور میں اس پر جنون کے دورے پڑنے لگے تھے۔ اس مضمون میں گرِس وُلڈ نے پو سے یقیناً ناانصافی کی تھی۔ لیکن اس کا انتقام پو کے مدّاحوں نے اس عمدگی سے لیا کہ آئندہ نسلوں کے لئے اس کی حیثیت ایک دغاباز دوست اور کینہ ور نقاد کی بن کر رہ گئی۔

یہ تو تھا پو کے متعلق لوگوں کی رائوں کا ایک رُخ جس کی ترجمانی مندرجہ بالا اقتباسات کر رہے ہیں۔ دوسری طرف اس مضمون کے شائع ہوتے ہی پو کی جانب داری میں اُس کے دوست این پی و الس اور جی، آر گراہم نے مضامین لکھے۔ ان میں تصویر کی دوسری انتہا کا اظہار تھا اور گرس ولڈ جسے خبطی اور جنونی کہہ رہا تھا اُسے ایک خاموش، صابر، محنتی اور "شریف انسان" کہا گیا۔ جس کے متعلق لوگوں کے دلوں میں اُس کے عادات و اطوار اور قابلیت کی بنا پر احترام کے جذبات تھے۔

اُس کے اپنے زمانے کے لوگوں کی انتہائی رائوں کی وجہ تو یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ وہ لوگ اُسے قرب کے باعث غیر جانبداری سے نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن اصل بات پھر بھی وہیں کی وہیں رہتی ہے۔ پو دراصل ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی انسانی اور فن کارانہ ـــ دونوں حیثیتوں سے لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اسی لئے جو اُن کی مخالفت کرتے ہیں وہ انتہائی مخالفت کرتے ہیں اور جو اُن کے حق میں بولتے ہیں۔ وہ بھی حد سے بڑھ کر حق میں بولتے ہیں۔

پو کی شخصیت میں سب سے نمایاں بات اُس کا دہرا پن ہے اور یہ خصوصیت نہ صرف اس کی طبیعت اور ذہانت ہی میں نمایاں ہے بلکہ اُس کی تخلیقات میں بھی موجود ہے۔ اس کے ہمعصر اس کے متعلق دو یکسر مختلف رائیں رکھتے ہیں اسی سے ظاہر ہے کہ وہ ایک شخص نہ تھا بلکہ اُس کی شخصیت کے دو پہلو تھے۔ جن لوگوں سے اُسے قلبی تعلق تھا اور جنہوں نے اُسے سکون اور ہوشمندی کی حالت میں دیکھا تھا۔ اُن کی نظر میں اُس کی ہستی محبت بھری، ملنسار اور وفا شعار تھی اور وہ لوگ جن پر اُس کی تنقید کے بے پناہ نشتر چلتے رہے یا جنہیں اُس سے اس حالت میں ملنے کا اتفاق ہوا جب وہ نشے کی حالت میں ہوتا تھا۔ اُسے تنک مزاج، اکھڑ باز، خود کام، وحشی بلکہ ضمیر تک سے عاری تصوّر کرتے رہے۔ لیکن ہمیں سوچنا ہے کہ کیا اس نشے کی حالت میں پو کی اپنی شخصیت غائب ہو جاتی تھی اور اُس کی عمیق ذہانت سے کوئی اور ہستی نمودار ہوتی تھی، وہ ہستی جو اُس کے ذہن کے اُن وحشیانہ تصورات کی ترجمان تھی جن میں قبرستانوں کی ہیبت اور نحوست تھی؟

اگر ہم پو کے ذہن کی طرف غور کریں تو وہاں بھی وہی دہرا پن دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف تو وہ آدرش کا پجاری تھا۔ تصوّرات کو پوجنے والا آدرش کے لئے اس کے دل میں جو آرزو تھی اُس کی بنیاد صرف تخیل پر نہ تھی بلکہ دل ہی کی کوئی اندرونی طاقت اس آرزو کی تخلیق کئے ہوئے تھی۔ عورت کے حُسن، دلکشی اور پاکیزگی کے سلسلے میں اس کا دل حسّاس تھا اور اس حُسن کا اُجالا بعض اوقات اُس کی نظموں میں نہایت نفاست کے ساتھ نمودار ہوا ہے۔ اُس کے تصورات اُس کے شعور کو اس خاکی کُرے کی سطح پر نہیں رہنے دیتے تھے۔ اس مادّی دنیا سے دور فرشتوں کی فضائیں، پریوں کی بستی میں، خوابوں کی سرزمین میں جہاں روحیں لافانی ہو کر پھرتی رہتی ہیں اُس کا تخیل اُسے بھی لے جاتا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اُس کے دل میں بعض خواہشات ایسی بھی تھیں جن کا تعلق اس پست دنیا ہی سے ہوتا ہے شہرت کی ہوس کے بارے میں وہ کہتا ہے۔ "مجھے شہرت سے محبت ہے۔ میں اُسے پوجتا ہوں۔ شہرت کے ساغر کو میں تلچھٹ تک پینے کو تیار ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس زمین کے ہر شہر اور قصبے سے ہر میدان اور گھاٹی سے میرے اعزاز میں خوشبو کے دھوئیں کی لپٹیں بلند ہوں۔ شہرت! ناموری! ـــ ان کا سانس زندگی بخش ہے۔ یہ جیتا جاگتا تابندہ درخشاں لہو ہیں۔ جب تک انسان شہرت کو حاصل نہیں کر لیتا وہ گویا زندہ ہی نہیں ہوتا"۔

اور شہرت کی یہ ہوس، امتیاز کی خواہش بچپن ہی سے اس کی زندگی پر ایک نمایاں حیثیت رکھتی تھی۔ ایک شخص جو سکول میں اس کے ساتھ پڑھا تھا۔ بیان کرتا ہے کہ سکول کے زمانے میں پو اکثر اپنے ہم سبقوں میں سب سے طاقتور لڑکے سے کہا کرتا کہ لوجتنے زور سے جی چاہے میرے سینے پر مکّا مارو، اور اُس نے مُکّا کھانے کا یہ ڈھب مجھے بھی سکھایا تھا اور میں بھی اپنے بل بوتے کے مطابق اُس کی پیروی کیا کرتا تھا یوں مکّا کھانے کے لئے پھیپھڑوں کو پہلے

آخری حد تک ہوا سے بھر لینا ہوتا تھا اور مُکّا کھانے کے لمحے میں ہوا کو خارج کرنا ہوتا تھا"۔ بچپن کے اس واقعے سے جہاں پوؔ کی ہوشیاری اور چالاکی کا پتہ چلتا ہے وہاں اُس کی طبیعت کے ایک اور پہلو پر اس سے روشنی پڑتی ہے۔ معلوم نہیں اُس نے پھیپھڑوں میں یہ ہوا بھرنے کا طریقہ کہاں سے سیکھا تھا۔ لیکن آئندہ عمر میں یہ اس کی خاص عادت تھی کہ ذرا سی کوئی بات معلوم کر کے اُس کی بنا پر بڑے نتائج کا اظہار کیا کرتا اور یوں لوگوں کو تعجب میں ڈال کر اُن کی حیرانی اور اپنی برتری اور فوقیت کا لطف اٹھاتا۔ حقیقی علم سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ذہنی زندگی میں جس طرح حقیقت کو چھوڑ کر تخیل پرستی اُس کا شعار بن گئی تھی۔ اسی طرح علم کے سلسلے میں بھی اُسے محض دکھاوے کی باتوں ہی سے دلچسپی تھی۔ علم کی طرف وہ محض اس لئے رجوع ہوتا کہ اس سے حاصل شدہ طاقت اور امتیاز اُس کی ذہنی زندگی کے گزارے کے لئے ضروری تھا۔ جس طرح علم کی حقیقت اور سچائی کی خواہش کسی عالم یا سائنس دان کے دل میں ہوتی ہے پوؔ کے دل میں نہ تھی۔ اور اسی لئے اُس نے کبھی کسی علم کو باقاعدگی کے ساتھ حاصل کرنے کی کوشش نہ کی [illegible] جان کر چھوڑ دیا جتنا اُسے اپنی نمائش کے لئے ضروری معلوم ہوا۔

آج کل تہذیب و تمدن کی تیز رفتاری نے وقت کا احساس لوگوں کے دلوں میں گہرا کر دیا ہے اور اس تیز روی میں گھڑیاں محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہر بات کے لئے وقت بہت تھوڑا ہے اسی احساس کے زیر اثر علم کے متعلق لوگوں کے انداز نظر میں بھی تبدیلی آ گئی ہے۔ اور وہ کم جان کر زیادہ جتا سکنے کو ہی علم سمجھنے لگے ہیں پوؔ کے زمانے کے امریکہ میں بھی رفتار تیز ہی قسم کی تھی۔ اس لئے اگرچہ اور کسی لحاظ سے پوؔ امریکی روایات کا حامل نہ تھا لیکن اس پہلو سے وہ اپنے ماحول کا پروردہ کہا جا سکتا ہے کہ علم کو زیادہ ظاہر کرنا بچپن ہی سے اُس کی طبعی خصوصیت تھی اور بڑی عمر میں جب اپنی تصنیفات کی بنا پر سماج میں اس نے کامیابی اور قبولیت حاصل کر لی تب بھی یہی رنگ اُس کی شخصیت میں جھلکتا ہے ۱۸۴۶ء میں جبکہ وہ سماجی لحاظ سے انتہائی بلندی پر تھا۔ اس کے متعلق ایک شخص اپنے کسی خط میں لکھتا ہے "معلوم ہوتا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اُس میں کوئی مافوق الفطرت خصوصیت ہے اور اس سلسلے میں عجیب عجیب باتیں مشہور ہیں۔ عجیب باتوں کی شہرت تو خیر کوئی بات نہ تھی لطیفہ یہ ہے کہ اُن باتوں کو لوگ سچ سمجھتے ہیں۔ مسمریزم کے لحاظ سے اُس کے تجربات کے متعلق عجیب کہانیاں مشہور ہیں اور اُن کے متعلق جب کبھی کہا جاتا ہے تو وہ ہمیشہ مسکرا دیتا ہے۔ اُس کی مسکراہٹ میں ایک عجیب دلکشی ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اُس سے تعارف پیدا کرے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اُس سے اچھی طرح میل جول قائم رکھ سکتے ہیں"۔ جس ماحول سے یہ تاثر پیدا ہوا وہی ماحول پوؔ کی منشا کے عین مطابق تھا۔ شہرت کی جس بھیدوں سے بھرپور خوشبو کا وہ متوالا تھا۔ اس ماحول میں وہی اُس کے نتھنوں کو تسکین دیتی ہے۔ لیکن ایسی فضا اُس کے لئے سازگار اور صحت مند نہ تھی۔ کیونکہ اس میں جہاں اُس کی ہوس تسکین پاتی تھی وہاں وہ اور بھی بھڑک اٹھتی تھی اور اس سے بڑھ کر بھی ایک اور خرابی یہ تھی کہ اس ماحول نے اس کے آسودہ نفس میں بعض مہلک رجحانات کو بیدار کر دیا۔ یعنی آسودہ عشقی رجحان کو جگا کر اُسے اُن راستوں پر چلایا جن پر اب تک وہ بوجوہ جانے سے باز رہا تھا۔ اس سماجی ماحول میں اُس نے جن عورتوں سے دل لگایا اُن کا ذکر آگے آئے گا۔ پہلے ہمیں پوؔ کی زندگی کے ڈرامے کے خاص خاص کرداروں کا جائزہ لے لینا چاہئے۔

ظاہر ہے کہ پوؔ کی زندگی میں سب سے پہلے خاص کردار اُس کے ماں اور باپ تھے۔ پوؔ ۱۹ر جنوری ۱۸۰۹ء کو بوسٹن میں پیدا ہوا۔ اُس کے ماں اور باپ دونوں کسی سفری تھیٹریکل کمپنی میں ایکٹر تھے لیکن اُن کے بیان کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ پوؔ ابھی تین ہی سال کا تھا کہ اُس کی ماں مر گئی اور باپ کا حال اب تک سوانح نگاروں کو معلوم ہی نہیں ہو سکا۔ پوؔ کو رچمنڈ کی ایک امیر اور بے اولاد عورت مسز ایلن نے لے کر پال لیا۔ اور بہت چاہ سے پرورش کیا۔ لیکن مسٹر ایلن جو اپنی عیش پسند طبیعت کی وجہ سے گھریلو فضا کو کچھ خاص پسند نہ کرتا تھا ہمیشہ پوؔ کا مخالف رہا۔ اُس کی یہ مخالفت ہی پوؔ کی زندگی میں سب سے پہلا ایک ایسا واقعہ ہے جس نے آئندہ چل کر اُسے تمام دنیا کا مخالف بنا دیا۔ نیز اپنی بیوی سے پوؔ کا یہ زبردستی کا باپ جو بے وفائیاں کیا کرتا تھا لامحالہ اُس کا اثر بھی عہد بلوغ میں پوؔ کی زندگی پر یقیناً ہوا ہو گا۔ پوؔ کی ابتدائی تعلیم انگلستان اور امریکہ دونوں جگہوں پر ہوئی اور بعد میں ورجینیا کی یونیورسٹی میں بھی وہ ۱۸۲۶ء میں داخل ہوا لیکن مسٹر ایلن سے اختلافات کی بنا پر پہلے ہی سال کے بعد نوجوان پوؔ بوسٹن بھاگ گیا اور وہاں جا کر فوج میں بھرتی ہو گیا۔ تین سال تک فوج میں رہا۔ طبعی رجحانات نے اُسے تلوار کی بجائے قلم کی طرف رجوع کیا اور نوجوانی کے معمول کے مطابق سب سے پہلے اُس نے شعر گوئی شروع کی اس زمانے کا کچھ کلام بوسٹن اور نیویارک کے رسائل میں شائع بھی ہوا۔ لیکن باقاعدگی کے ساتھ ۱۸۳۳ء سے بالٹی مور کے مقام پر پوؔ نے لکھنے لکھانے کو اپنا پیشہ بنا لیا

اور پھر غربت سے اس کی کبھی نہ مٹنے والی جنگ شروع ہوئی۔

ابھی تک جن کرداروں کا بیان ہوا وہ پوؔ کی زندگی میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ اُن کی حیثیت محض پس منظر کی ہے۔ نمایاں کرداروں میں سب سے پہلا درجہ پوؔ کی ساس مسز کلیم کا ہے۔ اسی عورت کی وجہ سے پوؔ جسمانی طور پر زندہ رہا۔ مسز کلیم گویا پیدا ہی اسی لئے ہوئی تھی کہ بغیر سوچے سمجھے اپنے متعلقین کی خدمت گزاری کرتی رہے۔ اپنی سیدھی سادھی بیٹی اور پریشان دماغ پوؔ سے اُسے ویسی ہی دل بستگی اور محبت تھی جیسی ایک ماں کو اپنے کسی آوارہ بچے سے ہوتی ہے جہاں کہیں بھی وہ ان کے ساتھ گئی اور جیسی بھی حالت میں رہی زندگی کی کشمکش میں ہمیشہ اُن دونوں کی اپنے مقدور سے بڑھ کر حفاظت کرتی رہی۔ مکان کے کچھ حصے میں اگر کچھ اور لوگ رہنے کو مل جاتے تو انہیں کے سہارے سے وہ مدد حاصل کرتی۔ پوؔ کے وہ مسودے جن کے مواد کے متعلق اُسے کچھ بھی علم نہ تھا بغل میں دبا کر وہ ایڈیٹروں کے دروازے کھٹکھٹاتی پھرتی بلکہ آخری عمر میں تو بعض لوگوں نے اُسے شہر سے باہر کھیتوں میں بھی دیکھا کہ کوئی نہ کوئی خود رو سبزی جمع کرتی پھر رہی ہے تاکہ غریبانہ دسترخوان پر ایک آدھ چیز کھانے کے لئے زیادہ ہو جائے۔

گھر کی فضا میں جب کبھی شراب کے نشے میں پوؔ کی تندی و تیزی یا اُس کے پُراسرار غم کی المناک گھٹا کے اثرات سے اگر اس کا دل کبھی ڈرا یا گھبرایا بھی ہوگا تو اس نے کبھی کسی سے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ کیونکہ پوؔ سے اُس کی دلبستگی ایک انسان کے لحاظ سے تھی اور اس لئے اُسے اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ وہ اُس کے غیر معمولی افعال پر نکتہ چینی کرے۔ اپنوں کے عیب بھی اپنے ہی نظر آتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ اپنے عیبوں کو برداشت کرنا ہوتا ہے، ان پر حرف گیری نہیں کی جا سکتی۔

پوؔ کو بھی مسز کلیم سے بھی ویسی ہی دل بستگی تھی، جس بے غرضانہ انداز میں یہ ماں کی ایسی محبت کا تحفہ اُسے پیش کیا گیا۔ اُسی انداز میں اُس نے اُسے قبول کیا۔ جب کبھی پوؔ گھر سے دور ہوتا تو خطوں میں وہ اپنی زندگی کی معمولی سی معمولی تفصیلات کا بھی ذکر کرتا۔ مثلاً "آج میں نے ایک چھاتا خرید لیا ہے کیونکہ بارش کا موسم آن پہنچا ہے" ——— اور اسی قسم کی اور باتیں۔

اوپر کی باتوں سے ظاہر ہے کہ مسز کلیم ایک سیدھی سادھی عورت تھی۔ اس کی طبیعت میں کوئی کج روی نہ تھی۔ اس لئے پوؔ کے متعلق اُس کے دوسرے ہم عصروں کی بجائے اُس کی ساس کی رائے پر ہمیں اعتبار کرنا چاہیئے کہ اُس نے جو کچھ دیکھا ہوگا وہی بیان کیا ہوگا۔ اُس کے الفاظ میں پوؔ عادات و اطوار کے لحاظ سے گھریلو انسان تھا۔ گھر سے اگر ایک آدھ گھنٹہ بھی باہر رہتا تو اکیلا نہ ہوتا۔ یا اپنی بیوی ورجینیا کو ساتھ رکھتا، یا ساس کے ساتھ نکلتا۔ "وہ ایک مہربان اور محبت کرنے والا خاوند تھا۔ اور ایک فرمانبردار بیٹا۔ طبیعت کی تیزی کے ساتھ ساتھ اس میں فراخ دلی بھی تھی، فیاضی بھی اور شرافت بھی۔ اُس کے ذوقی رجحانات میں ایک سادگی تھی اور ہر خوبصورت اور اچھی چیز کے لئے اُس کے دل میں تعریف کا جذبہ تھا۔ ہم تینوں گویا ایک دوسرے ہی کے لئے زندہ تھے" مسز کلیم کے ان الفاظ سے خیال ہوتا ہے کہ پوؔ کے گھر کی فضا بہت پرسکون قسم کی ہو گی۔ لیکن اس پرسکون فضا میں بھی اُس کے دل پر ہر وقت ایک گھٹا سی چھائی رہتی تھی اور وہ ایک ایسی دنیا میں زندگی گزار رہا تھا۔ جہاں ناگفتنی ہیبت اور ملال آمیز شوکت طاری تھی۔

پوؔ کے جیون ناٹک میں عورتوں کے لحاظ سے سب سے اہم کردار اُس کی ساس تھی جس کی بنیادی خصوصیتوں کو آپ کسی حد تک جان چکے ہیں لیکن ایک بات کا لحاظ رہے۔ اس کی اہمیت بھی بنیادی لحاظ سے ہی تھی بظاہر وہ پس منظر کا ایک کردار معلوم ہوتی ہے۔ اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ایسے باہر سے دیکھنے والوں کو ایک بڑھیا میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے دوسرا کردار اسی بڑھیا کی بیٹی ورجینیا ہے۔ پوؔ جیسے جوہر خداداد کے مالک اور لاپرواہ سے آدمی کو دو وجوہ کی بنا پر عورت کی ضرورت تھی ایک اپنی تخلیقی تحریک کے طور پر اور دوسرے اپنی دیکھ بھال کے لئے۔ ورجینیا سے شادی کر کے گویا اُس نے ایک تیر سے دو شکار کیے اور یوں ورجینیا تحریکِ تخلیقی کے لئے اور اس کی ماں مسز کلیم دیکھ بھال اور حفاظت کے لئے ملی۔ ورجینیا ذہنی اور جسمانی لحاظ سے بچہ سا تھی۔ ابھی اُس کی عمر بارہ ہی سال کی تھی کہ پوؔ نے اُسے اپنی بیوی بنانے کی کوشش کی لیکن اُس کی کم عمری کے باعث دور نزدیک کے کسی رشتہ دار کی مداخلت نے ایک دو سال تک یہ کام نہ ہونے دیا۔ ورجینیا کی ماں جس طرح اور باتوں میں پوؔ کے دوسرے احکام اور خواہشات کے تابع تھی۔ اسی طرح اس معاملے میں بھی اُس کی رضامندی پوؔ کو حاصل تھی۔ یہ دونوں ماں بیٹیاں پوؔ کی ذہنی اور نفسی ضروریات کو کماحقہٗ پورا کرتی تھیں ساس میں اُسے شاید بچپن کی چھوٹی ہوئی ماں کا عکس نظر آتا تھا اور اس بالی بیوی میں اُسے اُن نحیف و نزار شکلوں کا سایہ دکھائی دیتا تھا جو ہر وقت اُس کے تصورات میں گردش کرتی رہتیں اور پھر اس کی تحریروں میں

بقائے دوام پاتیں۔ اس لحاظ سے ورجینیا پو کے تخریب آلود تخیّل کو مکمل
تسکین پہنچا سکتی تھی۔ طفلانہ ذہنیت، بیلا، مریضانہ چہرہ اور نیچا اُبھرا ہوا ماتھا،
یہ تمام باتیں مل کر اس کی نظروں میں ایک غیر زمینی پاکیزگی کا تصور پیش
کرتی تھیں اور یوں اُس کی بیوی ایک ایسا سایہ سا بن جاتی تھی۔ جسے حقیقت
سے کوئی تعلق نہ ہو جس کی جسمانی ضرورت کے سلسلے میں کوئی سوال ہی نہ اُٹھتا
ہو۔ اور جیسے کہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے اگر ایسا کوئی سوال پیدا بھی ہوتا تو پو
اس کے پورا کرنے سے قاصر تھا۔ اور یہ انوکھا پن کچھ بیوی ہی کے معاملے میں
نمایاں نہیں دکھائی دیتا۔ کیونکہ اس شادی سے پہلے اور بعد کے زمانے
میں جتنے بھی معاشقے اس نے کئے ان سب میں یہی اچھوتا پن کارفرما تھا۔
جس طرح بچپن میں اپنے ایک دوست کی بیوی سے جو عمر میں اُس سے کہیں
بڑی تھی اُسے وارفتگی پیدا ہو گئی تھی اور اُس کے احساسات میں کوئی جسمانی
پہلو نمایاں نہ تھا اسی طرح بعد کی عمر میں بھی اُس کے اکثر معاشقے روحانی
ہی قسم کے ہوا کرتے تھے۔ ہاں ایک بات تھی اگر کبھی ذہنی طور پر اس کے جسمانی
احساسات بیدار ہوتے تو پھر اُن کی شدّت اور تندی و تیزی بھی یکسر طور پر غیر
معمولی ہی ہوا کرتی تھی۔ عمر کے آخری سالوں میں جب کبھی اس کے دل میں جنسی
جذبات جاگ اُٹھتے تو وہ گویا دیوانہ سا ہو جاتا۔ اُسے اپنے احساس و شعور
پر قابو نہ رہتا۔ شادی سے پہلے بھی ایک بار ایسا واقعہ درپیش ہوا تھا۔ بالٹی مور میں
اس کے ابتدائی قیام پر ایک دھندلکا سا چھایا ہوا ہے لیکن اس زمانے میں
اس کے ایک معاشقے کا پتہ چلتا ہے اس عورت کو وہ نظموں میں "میری" کے نام
سے مخاطب کرتا ہے (جس کا اصل نام مس ڈیورو تھا) اس معاشقے کے
دوران میں ایک روز شام کو اُس نے اچانک یہ تجویز پیش کر دی کہ چلو ہم اسی
وقت شادی کر لیں۔ اس غیر معمولی رویے اور اصرار سے وہ گھبرا گئی اور اس نے
انکار کر دیا تو پو وہاں سے چلا آیا۔ اور گھنٹے آدھ گھنٹے کے بعد پھر اُس کے گھر پر جا پہنچا
لیکن اب وہ نشے کی حالت میں تھا۔ اور اس حالت میں اُس نے اس قسم کا
وحشیانہ رویہ اختیار کیا اور مجنونانہ حرکات کیں کہ اُسے کہہ دیا گیا کہ
یہاں سے چلے جائیے۔ اور مہربانی سے پھر کبھی نہ آئیے۔ ابتدائی زندگی
کا یہ واقعہ اُس کے آخری زمانے پر روشنی ڈالتا ہے لیکن یہ واقعہ اور بعد کے
تمام واقعات ویسے عجیب نہ تھے جیسا کہ ورجینیا سے اُس کی شادی کا
معاملہ۔ کیونکہ اصلاً یہ شادی کوئی شادی ہی نہ تھی۔

پو کے ذہن کا جنسی پہلو اور پو کی باتوں کے مدنظر ایک انوکھی نشو
نما کا حامل تھا معلوم نہیں کہ اس نشو و نما میں کن اثرات کو دخل ہے۔ لیکن
ایک سراغ ہمیں ملتا ہے اور وہ یہ کہ بلوغ کے زمانے میں اُس کے زبردستی
کے باپ مسٹر ایلن کی اپنی بیوی سے بے وفائیوں نے اُس کے ذہن پر یقیناً
ایک خاص قسم کا اثر پیدا کیا ہو گا۔

محبت اور عورت کے متعلق پو کے خیالات بہت سیدھے سادھے
اور شریفانہ قسم کے تھے۔ مثلاً نوجوانی کی محبت کے متعلق وہ لکھتا ہے۔ "نوجوانی
کی شاعرانہ محبت بغیر کسی حیل و حجت کے ایک ایسا انسانی جذبہ ہے جو زیادہ سے زیادہ
ہمارے اُن تصورات سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے جو محبت کی پاکیزہ لذت
کے متعلق ہمارے ذہنوں میں قائم ہیں"۔ ایک نقّاد نے لکھا ہے کہ پو کی تخلیق
کے نسائی پیکر یا تو سنگین مجسمے ہیں یا فرشتے اور ایک اور مصنف کہتا ہے کہ پو
عورت کی بجائے عورت کے تصوّر کی پوجا کرتا تھا۔ اور یہ رائیں پو کی خیالی
اور حقیقی زندگی کے متعلق ایک سنجیدہ گہرائی کی حامل ہیں اگر ہم اُس کی زندگی کے
اہم واقع یعنی ورجینیا سے اس کی شادی پر غور کریں اور اس کے ساتھ
ہی اُس کی لکھی ہوئی کہانیوں پر نظر دوڑائیں تو دونوں میں ہمیں ایک یکسانیت
دکھائی دیتی ہے۔ دونوں کا منبع و ماخذ ایک ہی نظر آتا ہے۔ شادی کا
واقعہ اُس کوشش کو ظاہر کرتا ہے۔ جو اُس نے اپنے آپ کو حقیقت سے
ہم آہنگ بنانے میں کی۔ اور افسانوی کردار اُس کی اس کوشش کو ظاہر
کرتے ہیں جنہیں اُس نے اعصابی مریضوں کے اسلوب پر ایک خیالی دنیا میں
اپنی ذہنی ضروریات کی تکمیل کے لئے بسایا تھا۔

لیکن اپنے عشقی واقعات کی کثرت کے باوجود پو عام معنوں میں
عاشق نہ تھا۔ اپنے ایک مقالے "اصولِ شعری" میں عورت کے متعلق وہ لکھتا
ہے "اس سے (عورت سے) بڑھ کر کوئی اور بلند اور پاکیزہ موضوع کسی شاعر
کے زیر قلم نہیں آیا۔ یہ ایک خیال ہے جو روح کو پھیلاتا ہے۔ کسی شخص کو یہ حق حاصل
نہیں ہے کہ وہ اپنے مصائب کے باوجود اُس صورت میں تقدیر کا شکوہ
کرے جبکہ اُسے کسی عورت کی غیر متزلزل محبت حاصل ہو، ..... عورت
کے حُسن میں، اُس کی چال کی رعنائی میں، اُس کی آنکھوں کی چمک میں، اُس کی
آواز کے ترنّم میں، اُس کے نرم و نازک قہقہوں میں، اُس کی آہوں میں، اُس کے
ملبوس کی سرسراہٹ کی ہم آہنگی میں انسان کو سچّی شعریت کا احساس ہوتا ہے
اُس کی دل کو جیت لینے والی محبت میں، اُس کی گرم جوشی میں، اس کی لطیف
کشادہ دلی میں، اُس کے خفیف اور عقیدتمندانہ صبر و قناعت میں بھی ایک
گہرا احساس شعریت ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر، ہاں اس سے کہیں
بڑھ کر انسان شعریت کو عورت کے اعتماد و اعتقاد میں، اُس کی پاکیزگی میں،

اُس کی قوت میں اور اُس کی محبت کی یکسر ارفع شان میں پوجتا ہے"۔

لیکن محبت اور عورت کے متعلق اس اندازِ نظر کے باوجود بعض لوگ جو پو سے ذاتی طور پر واقف تھے یہ کہتے ہیں کہ وہ جذبات سے یکسر عاری تھا۔ اور بیوی کے معاملے میں اس کا رویہ اس خیال کی تائید ہی کرتا ہے۔ ورجینیا اور اُس کے تعلقات عمر بھر نامکمل ہی رہے ہیں روحانی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی۔ اور اس سلسلے میں ایک عجیب حقیقت یہ بھی ہے کہ وہ پیار سے اکثر اپنی بیوی کو "سِس" کہا کرتا تھا جو "سِسٹر" (یعنی بہن) کا مخفف ہے۔

اس کے علاوہ ابھی اُس کے بیاہ کو کوئی خاص عرصہ نہیں ہُوا تھا کہ وہ جب کبھی سماجی تعلقات میں کسی سے ملنے ملانے جاتا تو اوّل تو تنہا ہوتا۔ اور اگر ورجینیا اس کے ساتھ ہوتی بھی تو سارا وقت خاموش رہتی۔ کسی کے گھر پر یا کسی ادبی حلقے میں جو کچھ بات چیت ہوتی اُس میں صرف وہی حصہ لیتا۔ اس کی بیوی کا وہاں ہونا نہ ہونا یکساں تھا۔ اور اس کے باوجود وہ جب کبھی بیوی کی بات کرتا تو یہی کہتا کہ اُس کی زندگی کا صرف وہی ایک سہارا ہے۔ اور یہ بات حقائق سے صحیح ثابت ہوتی ہے۔ بیوی کی موت کے بعد اس کے اعصاب گویا بالکل جواب دے گئے لیکن اس صدمے کی وجہ یہ نہ تھی کہ اُسے اپنی بیوی سے ویسی ہی محبت اور دلبستگی تھی جیسی کسی خاوند کو ہوتی ہے بلکہ وہ ایک ذریعہ تھی جس سے وہ اپنی ذہنی کشمکش کو ایک ہنگامی تسکین دے سکتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب وہ نہ رہی تو اُس کی ذہنی کشمکش بڑھتے بڑھتے جنون کے درجے تک جا پہنچی۔ جس طرح اُسے اپنی عظمت میں ایک افسانوی اعتقاد تھا اسی طرح بیوی کی ہستی بھی اُس کی نفسی زندگی کی اُلجھنوں کے افسانے کے لئے ضروری تھی۔

جذباتی سوانح نگار اور نقاد اس بات پر زور دیتے ہیں کہ پو کو اپنی بیوی سے ایک برادرانہ دلبستگی تھی اور ایک طفلانہ عورت کے ساتھ یہ غیر معمولی سنجوگ پو کے کردار کی امتیازی پاکیزگی کا ثبوت ہے۔ لیکن حقائق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر پو نے ورجینیا سے اس لئے شادی کی تھی کہ اُسے ارادتاً نامکمل طور پر اپنی بیوی بنائے تو اس سے صرف دو نتیجے نکالے جا سکتے ہیں یا تو اُس کے نفس میں ایک ظلم اور سفاکی تھی یا وہ اعصابی لحاظ سے صحت مند نہ تھا اور اگر صرف یہ بات تھی کہ وہ ایک نام کی بیوی حاصل کرنا چاہتا تھا تو اس سے ایک اور ہی نتیجہ برآمد کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ معمول کی زندگی کو یوں ارادی طور پر تیاگ دینا ظاہر کرتا ہے کہ اُس میں کسی قسم کی نہایت اہم اور گہری احساساتی بدنظمی تھی اور اسی لئے اُس کا تخیل عجیب تخلیقات و تصورات میں ڈوبا رہتا تھا اور یہ نتیجہ ہمیں قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک شخص نے جو پو کو زندگی میں جانتا تھا کہا ہے "وہ ہر وقت کسی نہ کسی کی محبت میں مبتلا رہتا تھا" —— اور نوجوانی سے موت تک اس کی زندگی میں بھی عشقبازی کا ایک تانتا دکھائی دیتا ہے اگرچہ اِن عشقی معاملات سے کبھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوتا تھا، لیکن عشق کے لحاظ سے اس کی اہلیتِ نفسی سے ہمیں انکار نہیں ہو سکتا۔ ایک طرف تو ہم دیکھتے ہیں کہ پو اس قسم کا مستقل عاشق ہے اور دوسری طرف ہمیں نظر آتا ہے کہ نوجوانی کے عین بعد ہی اپنی ابتدائی دنیوی زندگی میں ہی وہ جانتے بوجھتے ہوئے اپنے دامن کو ایک ایسی عورت سے باندھ دیتا ہے۔ جو ابھی نہ صرف ذہنی لحاظ سے بچہ تھی بلکہ جسمانی لحاظ سے بھی۔ اور جس کے متعلق پو کو بخوبی علم تھا کہ شادی کے بعد کافی عرصے تک زناشوئی کے تعلقات قائم کرنا ناممکن ہوگا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ بلوغ کے بعد بھی بیوی کی مسلسل بیماری کے باعث پو کو اُس سے خلوت میں الگ ہی رہنا پڑا۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس غیر متوقع صورتِ حال سے جو ضبطِ نفس پو کو کرنا پڑا اس نے بھی اُس کی نفسی اُلجھنوں میں معتدبہ اضافہ کیا ہوگا۔ لیکن پو کی اُفتادِ طبع اور اُس کے دوسرے افعال کے مدِنظر یہ خیال کچھ زیادہ صحیح نہ ہوگا۔

یہ بات ہمیں بہت اُلجھاتی ہے کہ آخر ورجینیا میں وہ کون سی بات تھی جس کی بے پناہ اپیل کے آگے اُسے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ اُس کی کہانیوں اور نظموں میں بھی، جن فرشتوں اور سنگین مجسّموں کی ایسی عورتوں کا ذکر ہے، اُن کے ہوتے ہوئے یہ اشارہ ہمیں ملتا ہے کہ پو کی خارجی زندگی چونکہ جنسی افعال سے مبرّا تھی اس لئے اس کے تصوّرات بھی ایسی ہی عورتوں کے خیالوں سے لبریز تھے اور یہیں سے یہ نظریہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ورجینیا کے حسن میں جو ایک غیر جنسی قسم کا رنگ تھا وہی پو کی پسندیدگی کا باعث بنا۔ اور یوں ضبطِ نفس کا سامنا اُسے مجبوراً نہیں ہُوا بلکہ اُس نے ارادی طور پر اس اندازِ حیات کو منتخب کیا۔ اس کے دل کو صرف اس دلکشی کا احساس تھا جو نسائی حُسن میں اُس وقت باقی رہ جاتی ہے جب اُس میں سے ہر قسم کے جنسی اجزا الگ ہو جائیں۔ اس طرح پو کہہ سکتا تھا کہ ورجینیا کے لئے اُس کی دلبستگی اور رغبت پاکیزگی کی پُوجا کا حکم رکھتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی جب ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی تحریروں میں وہ جنسی جذبے کے تصوّر ہی سے منحرف ہے، نیز عملی زندگی میں

بھی جب کبھی کسی عورت سے عشقی تعلق قائم کرتا ہے تو یہی جنسی پہلو سے علیحدہ رہنے والی بات ہی اُس کے تعلق کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ تو ہمیں شک گذرتا ہے کہ کہیں پاکیزگی میں یہ غیر معمولی دلچسپی کسی گہری نفسی ممانعت اور اُلجھن کا ظاہری نشان تو نہیں ہے۔ اور یوں اگرچہ جینیا کی دلکشی کے بھید کو وہ خود نہ جان سکا لیکن ہم کسی حد تک پہچان لیتے ہیں کہ نفسی ممانعت اور اُلجھن ہی اس رغبت کا باعث تھی۔ گویا ورجینیا سے شادی کر کے بیوی کی نوعمری نہ صرف زناشوئی کے تعلقات میں مانع رہی بلکہ دوسری عورتوں سے بھی جب کبھی پو کے تعلقات قائم ہوئے تو وہ پورے طور پر روحانی نہ تھی، لیکن پورے طور پر جسمانی بھی نہ ہو سکے کیونکہ وہ ایک شادی شدہ انسان تھا۔ حقیقی زندگی میں تو بیوی کی کم عمری اور مرض پو کے مکمل تعلق میں حائل ہوئے لیکن ذہنی زندگی میں نہ مرض کا خیال تھا نہ پاکیزگی کا، صرف پو کی اپنی ذات حارج تھی۔

ہاں، ورجینیا کی شکل وشباہت کے متعلق۔ اس سلسلے میں بھی مختلف بیان ہیں بعض اُسے دلکش اور حسین بتاتے ہیں لیکن ان لوگوں کے بیان سے جنہوں نے اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس کا ذکر تحریر میں کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسین تو اتنی نہ تھی جتنی اچھوتی تھی۔ اُس کے حسن یا دلکشی میں ایک انوکھا پن تھا۔ ایک اجنبیت سی تھی۔ بال سیاہ تھے اور شربتی آنکھوں میں اس کی طبعی نرمی اور دل سوزی جھلک رہی تھی۔ لیکن اس کا اونچا ماتھا۔ چہرے کے خدوخال کے تناسب کو نامناسب بنائے ہوئے تھا۔ اس کے علاوہ اس کا رنگ اتنا پیلا تھا کہ یک نظر دیکھنے میں تو پھیکا سفید محسوس ہوتا تھا گویا اُس میں لہو کی ایک بھی بوند موجود نہیں ہے اور اُس کے طفلانہ ذہن کے ساتھ کالے بال، چمکدار آنکھیں اور پیلی رنگت ــــ یہ سب مل جل کر ایک غیر انسانی قسم کا تاثر پیدا کرتی تھیں۔

اپنی کہانیوں میں، تنقیدی مقالوں میں، متفرق ٹکڑوں میں، ــــ ہر جگہ پو لارڈ ویرولم کا ایک فقرہ درج کرتا ہے "دنیا میں کوئی ایسا اعلیٰ حسن نہیں ہے جس میں تناسب کا ایک انوکھا پن موجود نہ ہو"۔ اور اس فقرے پر اُس نے نہ صرف اپنے جمالیاتی نظریے کی بنیاد رکھی بلکہ اُس کے تخیل کی کارفرمائی کا بھی یہ قانون بن گیا۔ یہاں ایک خیال رہے کہ انوکھے پن سے پو کی مراد اچھوتا پن نہ تھی بلکہ اس اجنبیت کو وہ غیر معمولی شے سے بڑھ کر مافوق الفطرت کے معنی دیتا تھا اور اسی لئے اُس کی ذہنی دنیا ایک ایسی سرزمین ہے جہاں معمول کے مطابق باتیں غیر معمولی سمجھی جاتی ہیں اور غیر معمولی بلکہ مافوق الفطرت باتوں کو روزمرّہ کی چیزیں تصور کیا جاتا ہے۔ وہاں گویا ہماری دنیا کے تمام اصول وقوانین باطل ہو جاتے ہیں، وہاں کے رہنے والے بھی کسی دھندلے خطے کے رہنے والے ہیں، اور ایک ایسی سرزمین میں چلتے پھرتے ہیں جو ہمارے احساسات سے دور کسی ان دیکھے، انجانے مقام پر واقع ہے۔ وہاں کا ماحول تخیل کی غیر معمولی قلابازیوں کا مرہون ترتیب ہے اور اسی لئے چونکہ ان کی آنکھیں کوئی عام منظر نہیں دیکھتیں، ان کے دل بھی عام جذبات کو پرورش نہیں کرتے۔

لیکن ہم ورجینیا سے ہٹتے ہوئے پو کی خیالی دنیا میں کھوئے جا رہے ہیں۔ ابھی ورجینیا کے آخری دور کا بیان باقی ہے۔ ایک شخص جسے اُس زمانے میں پو کے گھر جانے کا اتفاق ہوا لکھتا ہے "میں نے دیکھا کہ ورجینیا بستر پر لیٹی ہوئی ہے۔ لیکن یہ بستر تنکوں کا بنا ہوا تھا۔ نہ اس پر کوئی گدیلا تھا۔ نہ اس قسم کی کوئی اور چیز۔ چارپائی پر تنکے بچھا کر اُن پر ایک دودھ برف کی ایسی سفید چادر ڈال دی گئی تھی۔ موسم سردی کا تھا اور بیمار عورت رہ رہ کر سردی سے سکڑی جاتی تھی اور اُسے تشنج کا دورہ پڑتا تھا جو دق کے مریض کو اکثر شدید حرارت میں محسوس ہوا کرتا ہے۔ رضائی یا لحاف کے طور پر خاوند کا بڑا اوورکوٹ اس کے اوپر رکھا تھا۔ اور اس کے سینے پر ایک بڑی سی چتکبری بلّی بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ بلّی کو اپنے مفید ہونے کا احساس تھا۔ یعنی وہ جانتی تھی کہ اس سردی میں اپنی مالکن کو وہ اپنے جسم کی گرمی سے کتنا آرام پہنچا رہی ہے۔ بڑا کوٹ اور بلّی۔ یہی دو چیزیں سردی سے بچاؤ کا ذریعہ تھیں اور پو بیوی کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھا اور اُس کی ساس اُس کے پاؤں اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے تھی تاکہ اس طرح بھی کچھ نہ کچھ گرمی اُسے پہنچائی جا سکے"۔ ــــ

پو کے لئے یہ انتہائی غربت اور پریشان حالی کا زمانہ تھا۔ غربت کو دور کرنا اُس کے بس کی بات نہ تھی اور اُسے اس کا بھی یقین تھا کہ اُس کی مدقوق بیوی آج نہیں تو کل ضرور مر جائے گی۔ ممکن ہے کہ اُس کے بستر مرگ پر بیٹھے ہوئے پو نے اپنی امکانی کوشش کی ہو کہ وہ اپنی نفسی اُلجھنوں کو آئندہ کے لئے کسی حد تک تو صاف کرے۔ لیکن جیسا کہ آئندہ کے واقعات سے ظاہر ہو گا۔ یہ مادہ ہیولیٰ جو اُس کے ذہن کے ہر کونے پر مستولی تھا۔ پہلے سے کہیں زیادہ بے ترتیب ہوتا گیا۔

۳۰ جون ۱۸۴۷ء کے روز ورجینیا کا آخری دن تھا۔ پو کے دل

میں اس کے لئے خواہ کسی قسم کا جذبہ کیوں نہ ہو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُس
جذبے میں محبت کی ترمی ضرور موجود تھی۔ اور اگرچہ اُس نے کافی عرصے سے اس
حادثے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رکھا ہوگا۔ پھر بھی جب بیوی کی موت سے
سامنا ہوا تو اُس کے دل و دماغ گویا غم کے ایک اتھاہ سمندر میں ڈوب گئے
اور اس غمناک کیفیت میں رفتہ رفتہ اور بھی پیچیدگی پیدا ہوتی گئی جب کہ اُس
کا آسودہ جنون اپنے ہنگامی دوروں کو لے کر آن پہنچا۔ جنون سے اب تک
ڈور رہنے کی وجہ اُس کی بیوی تھی۔ بیوی کی ہستی اُس کی کشمکش سے پُر زندگی
اور ذہانت کے لئے ایک سہارا تھی لیکن جب وہ نہ رہی تو اُس کے تصورات
آہستہ آہستہ پہلے سے زیادہ وحشت ناک ہوتے گئے اور اُس کا
تخیل اس کے سامنے متواتر جنون و جرائم کی تصویریں لانے لگا۔

اور اب ہم تیسرے اہم کردار کی طرف آتے ہیں۔ بیوی کی موت نے
خطرناک طور پر پو کو آزاد کر دیا۔ اور اس کی زندگی میں اُن کسی حد تک مضحکہ خیز
معاشقوں کا دور شروع ہو گیا جن کی انگیخت سے آخری سین کی تیاری
ہونے لگی۔ بیوی کی موجودگی نے پو کے احساسات پر جو پردہ ڈال رکھا
تھا۔ وہ اب اُٹھ چکا تھا اس لئے اُسے اپنے اُن ذہنی رجحانات سے جو
اب تک آسودہ رہے تھے گہری شناسائی ہو گئی۔ اور جب جنس کا سویا
ہوا شیر جاگ اٹھا تو پو کی زندگی عورتوں کے رحم و کرم پر بسر ہونے لگی۔
آج تک کسی شخص کو یہ معلوم نہیں کہ اس زمانے میں اُسے کتنی عورتوں
کی طرف رغبت ہوئی۔ لیکن یہ حقیقت واضح ہے کہ کم سے کم چار عورتیں
ایسی تھیں جن سے اچھے خاصے جذباتی تعلقات قائم ہوئے۔ اور اُن میں
سے دو کے ساتھ تو نسبت بھی ٹھہر گئی۔ ایک طرف تو اُس کی ذہنی
کارفرمائیوں کا یہ حال تھا اور دوسری طرف اس کے اندیشہ ناک دل و
دماغ کی یہ حالت تھی کہ رات کو جب وہ بستر پر لیٹتا تو جب تک اُس کی
ساس سرہانے بیٹھ کر اُس کی پیشانی کو نہ سہلاتی اسے نیند ہی نہ آتی۔ اور
اس سہلانے کے دوران میں ظاہر ہے کہ وہ اپنے وحشیانہ تصورات کی
اتھاہ گہرائیوں میں اپنے آپ کو کھو دیتا ہوگا۔

عشق بازی کے یہ قصّے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ ورجینیا
کی موت سے کچھ عرصہ پہلے ہی شروع ہو گئے تھے۔ شاید اُسے یہ احساس
ہو رہا تھا کہ اب اُس کی بیوی کے دن تھوڑے ہیں اور کوئی دن آتا ہے
کہ یہ سہارا باقی نہ رہے گا، پابندی اُٹھ جائے گی۔ اور اس لئے وہ پیش قدمی
کے طور پر مشق کی طرف راغب تھا۔ اس زمانے کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔

مسز اوس گڈ ایک جذباتی شاعرہ تھی۔ پو نے اس سے سلسلہ جنبانی کرتے
ہوئے میل جول شروع کر دیا لیکن جلد ہی یہ تعلقات رسوائی کی صورت
اختیار کرنے لگے اور رسوائی سے ڈر کر شاعرہ الگ تھلگ ہو بیٹھی۔ اس کے
بعد مسز شیو کی باری آئی۔ اس عورت نے پو کو بے ہوشی کے دوروں
میں نرس کیا تھا۔ یہ خاتون بھی مندرجہ بالا شاعرہ کی طرح پو کے دیوانہ
جوش سے خوفزدہ ہو کر علیحدہ ہو گئی۔ اور پھر مس رائسٹر کی باری آئی۔ یہ
پو کے بچپن کی محبوبہ بھی تھی۔ لیکن یہ معاملہ بھی پہلوں ہی کی طرح ٹائیں
ٹائیں فش ثابت ہوا۔ جس طرح ہر معاملے میں پو کو کوئی عجیب طاقت آگے
بڑھنے پر مجبور کرتی تھی اُسی طرح اُس کا ردِ عمل ہوتا تھا۔ اور کسی بھی معاشقے
سے کوئی مناسب نتیجہ نہ نکلتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان سب عورتوں میں
سے پو کی نظر میں کوئی بھی حقیقی نہ تھی۔ ہاں۔ وہ اُس کے اُلجھنوں سے بھرپور
دل و دماغ میں عشقی تحریکات کو برانگیختہ کرتی تھیں، لیکن جو تخیل کی دیوی
ہر لمحے اُس کے تصورات پر چھائی رہتی تھی۔ اُس کا ہنگامی نمائندہ بھی وہ
انہیں نہ بنا سکتا تھا۔

اس دور کے معاشقوں میں سے سب سے زیادہ تفصیلات
ہمیں مسز سارا وٹمن کے قصے کی معلوم ہیں اور چونکہ بیوی کی موت نے
جس کشمکش اور ہنگامے میں پو کی زندگی کو دھکیل دیا تھا۔ اُس پر یہ معاملہ
سب سے بڑھ کر روشنی ڈالتا ہے۔ اس لئے مسز وٹمن کو ہی ہم پو کے
تماشائے حیات کا تیسرا اہم کردار قرار دیں گے۔ مسز وٹمن بھی شاعرہ
تھی اور زمانے کے رجحانات کے مطابق ادبی ذوق رکھتی تھی۔ طبعاً ایک
جذباتی عورت تھی اور اس کے ساتھ ہی بیوہ۔ ذہنی رجحانات کے لحاظ سے
اس میں عصبیت بھی پائی جاتی تھی چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ہر وقت کسی اہلِ بصیرت
کا روایتی سفید لباس اس کے زیب تن ہوتا اور ایتھر کا عطر ہمراہ لئے رہتی
اپنے اس طبعی الوکھے پن کے باعث وہ پو کا مرکزِ ذہنی بننے کے لئے بہت
مناسب عورت تھی۔ اور پو خاطر خواہ طور پر اُس کی ہستی کے ارد گرد اپنے
الوکھے اور مجنونانہ تصورات کا تانا بانا بن سکتا تھا۔

پو کی پُر جوش توجہ اور اندھا دھند اظہارِ اشتیاق سے اُس کا ذہن
بالکل اپنے قابو میں نہ رہا اور بعض دوستوں کے روکنے کے باوجود وہ پو سے
شادی کرنے پر رضامند ہو گئی۔ وہ اس بات کا اُسے خیال نہ آیا کہ پو کی ذات
اب ایک کھنڈر کی مانند ہے۔

۱۸۴۷ء کے موسم گرما میں پو شہر پرووی ڈینس سے گذر رہا تھا

یہیں مسز وٹمن رہتی تھی۔ چاندنی رات تھی اور اپنے مکان کے باغ میں مسز وٹمن معمول کے مطابق سیر کر رہی تھی۔ پو کا گذر کہیں قریب سے ہوا اور سب سے پہلی بار اس نے سارا وٹمن کو دیکھا۔ اور اگرچہ پو نے بعد میں جا کر یہ لکھا ہے کہ اُسی لمحے میں اُسے اس بات کا احساس ہو گیا کہ یہ عورت بھی اس کی اپنی ہستی کی طرح ایک "ہم قسمت روح" ہے لیکن ان دونوں کی ملاقات ورجینیا کی موت کے بعد ہوئی۔ ملاقات کا قصہ یوں ہے کہ کسی محفل میں پو نے سارا وٹمن کے متعلق کچھ تعریفی کلمات کہے۔ اِن سے متاثر ہو کر مسز وٹمن نے پو کے اعزاز میں ایک نظم لکھ کر شائع کی۔ اور جب پو کی نظر سے وہ نظم گذری تو اس نے سارا کے نام ایک خط لکھا جس کے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں۔ ان اقتباسات سے پو کی وہ ہذیان آلود ذہنی کیفیت صاف ظاہر ہے جو موت تک برابر قائم رہی۔

"میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ سب سے پہلے میں نے تمہارا نام ——— سے سُنا۔ وہ گفتگو میں اپنے قول کے مطابق تمہاری "انفرادی افتادِ طبع" کے متعلق اشارہ کر رہی تھی، نیز اُس نے کنایتاً کچھ تمہارے "غم" کے بارے میں بھی کہا۔ پہلی بات نے میری توجہ پر ایک عجیب گرفت کی اور دوسرے کنائے نے میری اُس توجہ کو پابند اور مرکوز کر دیا۔ اُس نے تمہارے ایسے خیالات، جذبات، رجحانات اور کیفیات کا ذکر بھی کیا جنہیں میں جانتا تھا کہ یہ میرے دل کی باتیں ہیں، نوعِ انسانی میں سے اور کوئی ان میں حصہ دار نہیں ہے۔ چنانچہ یہ سب باتیں سُن کر میری روح پر ایک گہری ہمدردی کا احساس چھا گیا۔ جو کچھ مجھے محسوس ہوا۔ اُسے میں بہترین طریق پر یوں ظاہر کر سکتا ہوں کہ تمہارا انجان دل مجھے اپنے سینے میں محسوس ہونے لگا، اور یہ معلوم ہوا کہ اب یہ دل یہیں رہے گا، اور اس کے ساتھ ہی میرا دل تمہارے سینے میں محسوس ہوا۔

"اُسی لمحے سے میں تمہیں چاہتا ہوں، اس لمحے کے بعد جب کبھی میں نے تمہارا نام سُنا یا کہیں پڑھا میرے دل پر ایک لرزش سی طاری ہو گئی اور اس لرزش میں اندیشہ و مسرت۔ دونوں کی آمیزش تھی۔ مجھے یہی خیال رہا کہ تم ایک بیاہتا عورت ہو اور گذشتہ چند مہینوں ہی میں مجھ پر حقیقت حال کھلی ہے۔ تمہیں دیکھنا تو جُدا رہا میں تم سے بات کرنے کی بھی جرأت نہ کر سکتا تھا کئی سال تک میں اپنے لبوں پر تمہارا نام تک نہ لایا، اور اس دوران میں جب کبھی کوئی تمہارا ذکر کرتا تو اُسے میری روح ایک ساغرِ مے سمجھ کر نوش کرتی۔

تمہارے متعلق اگر میں کوئی سرگوشی بھی سُن پاتا تو اُس سے مجھ میں ایک چھٹی حس بیدار ہو جاتی اور یہ احساس خوف، بہجت آمیز شادمانی، اور ایک ناقابلِ وضاحت وحشی جذبے سے مل جل کر بنا تھا اور اس کی مشابہت احساسِ جرم سے تھی...... محض یہ خیال کہ جو الفاظ میں لکھ رہا ہوں۔ ان پر تمہاری پیاری انگلیوں کا زور پڑے گا اور تمہاری رسیلی آنکھیں انہیں دیکھیں گی ——— ان الفاظ کو جو ایک شدید محبت کی گہرائی سے بیساختہ طور پر اُمڈ آئے ہیں ——— محض یہ خیال میری روح کو ایک ایسی انتہائی مسرت سے لبریز کئے دیتا ہے جو میری انسانی فطرت کے لئے بہت کافی ہے ..... لیکن ایک اور خیال بھی تھا جس نے مجھے یہ سطریں لکھنے پر مجبور کیا۔ ——— میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ احساس ——— یہ مقدس جذبہ جو میرے سینے میں اُس کے لئے چمک رہا ہے۔ آسمان سے تعلق رکھتا ہے، آسمانی ہے، اور یوں اس کے پاکیزہ سینے کی گہرائیوں میں بھی جوابی محبت کا کم سے کم ایک ذرّہ تو لازمی طور پر ہو گا ——— اور میرے اللہ! کتنے عرصے تک ——— آہ کتنے عرصے تک میں یونہی بے مصرف انتظار کرتا رہا ہوں، ناامیدی میں اُمید کی جھلک دیکھتا رہا ہوں، یہاں تک کہ آخر کار مجھ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو گئی جو ناامیدی کی کیفیت سے کہیں بڑھ کر سخت اور بے باک ہے"!

لیکن یہ عورت بھی جسے پو ایسے جوشیلے الفاظ میں مخاطب کرتا ہے اس قابل نہ تھی کہ اس کے تصورات کی آدرشی عورت کا نمائندہ بن سکتی۔ ہاں، دوسری عورتوں کو دیکھتے ہوئے وہ نسبتاً اس درجے کے لئے موزوں تھی لیکن حقیقتاً نامکمل۔ مگر حقیقت پر پو کی گرفت اس قدر ڈھیلی پڑ چکی تھی کہ اُس کی معمولی انفرادیت ہی اس کو ایک غیر زمینی دلکشی کی صورت میں لبھانے لگی بلکہ کچھ عرصے کے لئے تو اُس کے ذہن سے ورجینیا کا تصور بھی جاتا رہا۔ ہاں اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن کے کسی کونے میں یہ احساس موجود تھا کہ اُسے مسز وٹمن سے تعلقات کے سلسلے میں کس مشکل کا سامنا ہے۔ وہ اتنا اندازہ تو آسانی سے لگا سکتا تھا کہ مسز وٹمن جسمانی طور پر ایک صحت مند عورت ہے اور اگر اُسے بیوی بنا لیا گیا تو اس صورت میں زناشوئی کے بعض ایسے حقوق بھی اس کو پورے کرنا ہوں گے جن کی تکمیل سے بوجوہ قاصر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کے دل و دماغ میں ایک چھٹی حس بیدار ہو جاتی اور یہ

احساس خوف، ہیجت آمیز شادمانی اور ایک ناقابلِ وضاحت وحشی جذبے
سے مل جل کر بنا تھا اور اس کی مشابہت احساسِ جرم سے تھی"۔
گویا اس کے نفس تحت الشعور نے اُسے متنبہ کر دیا تھا لیکن وہ اپنی
افتادِ طبع سے مجبور تھا۔ اس معاشقے کے دوران میں پو کی حرکات و افعال
کسی ایسے شخص سے ملتے تھے جسے اس بات کا شدید احساس ہو کہ وہ
کسی عجیب پیچیدہ مصیبت کے جال میں گرفتار ہے۔ اور اسی لئے وہ اوپر
کے خط کی طرح کئی اور خطوں میں اپنی وکالت کرتا رہا، لیکن جونہی اُسے
مسز وٹمن کی رضامندی حاصل ہو گئی اس کی یاس پرستی نے اسے
مے خواری کی طرف دھکیل دیا۔ اور اسی مے نوشی نے ان تمام تیاریوں
پر پانی پھیر دیا جو شادی کے لئے کی جا رہی تھیں بلکہ لازماً یہ بھی کہا جاتا ہے
کہ شادی سے ایک آدھ روز پہلے پو نشے میں دُھت مسز وٹمن کے سامنے
جا پہنچا۔ تاکہ اس کا دل پلٹ جائے اور وہ اُسے اُس پابندی سے رہائی
دے دے جس کی ذمہ داریاں وہ خاطر خواہ طور پر پورا نہ کر سکتا تھا۔
لیکن جہاں تک پو کے سوانح نگاروں نے اندازہ لگایا ہے۔
مسز وٹمن کا معاشقہ کوئی آخری معاملہ نہ تھا۔ بیوی کی موت کے بعد سے
اپنی موت تک پو کا یہی شعار رہا کہ جو بھی عورت اُس کے راستے میں آئی
اور اُس کے اعصابی ذہن کو ذرا بھی اپیل کی اس کا جنسی تعاقب شروع
ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں تمام صنفِ لطیف اُس کے ذہن
میں ایک ہستی کی صورت میں مرکوز ہو گئی تھی۔ اور اُسے اس صنف کے
مختلف افراد میں کوئی تمیز نہ رہی تھی۔ اور اس لئے ہر کسی کو وہ واسطے دیتا
پھرتا تھا کہ وہ اُسے خدا جانے کون سی مصیبت سے بچالے۔ اصل بات
یہ تھی کہ ورجینیا اس کی زندگی میں ایک پشتے کی حیثیت رکھتی تھی جس نے
اس کی ذہنی زندگی کے اس ریت کے محل کو برقرار رکھا ہوا تھا اور جب وہ
سہارا نہ رہا تو اُس کے تخیل کا وہ گھروندا آنکھ جھپکتے میں ڈھے گیا۔ اور اُسے اچانک
اس ضرورت کا سامنا ہوا کہ وہ اب کوئی نیا ڈھکوسلا تیار کر لے جس کے
بل پر زندگی گذاری جا سکے۔ جس طرح ابتدائی ایام میں وہ اپنی حقیقی قابلیت
کے ساتھ اپنی مفروضہ اہلیتوں کے افسانے کو ملا کر اپنے اعصابی مزاج کی
تسکین کا سامان مہیا کر لیا کرتا تھا۔ اسی طرح اب اُسے پہلے سے بھی بڑھ
کر کسی خود فریبی کی ضرورت تھی۔ اُس کی اُلجھی ہوئی بصیرت کے سامنے اب
دنیا کا بڑے سے بڑا کام کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ زندگی کی ناکامیوں نے
اُس کے ذہن پر اس قدر گہرا اثر کیا تھا کہ اب، جب تک وہ کائنات کے
معمے کو حل نہ کر لے اسے تسکین ہی نہ ہو سکتی تھی بلکہ اب تو اُسے خدائی
عظمت کے لگ بھگ ہی کوئی مرتبہ چین دے سکتا تھا۔ اگرچہ تمام عمر
اس کو ایسے سراب دکھائی دیتے رہے تھے لیکن پہلے وہ تصورات کسی نہ
کسی حد تک قابو میں رہے تھے۔ انہوں نے اُسے نقصان پہنچانے کی بجائے
حصولِ کمال کی طرف متوجہ رکھا تھا بلکہ اُس کے جوہرِ خداداد نے اُس کے خبط
کو ادب کی لازوال صورت دے دی تھی لیکن حقیقت اور تخیل میں جو حد
قائم ہے وہ بہت نازک ہے۔ اور وہ حد مٹ چکی تھی۔ دونوں میں اب
کوئی فرق نہ رہا تھا۔ پہلے جو باتیں دھندلی حقیقت معلوم ہوتی تھیں۔ وہ
اب ایسے حقائق کی صورت میں جلوہ گر ہونے لگی تھیں جن پر اُسے اعتقادِ کامل
تھا لیکن اس خطرناک حالت کو دور نہ کیا جا سکتا تھا۔ پانی سر سے گذر چکا تھا اور
انجام لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہا تھا۔ کیونکہ اب وہ روک بھی باقی
نہ رہی تھی۔ جس نے اُس کی عشقیہ زندگی کو کافی سے زیادہ حد
تک اپنے بس میں کر رکھا تھا۔ اب وہ گویا تین دنیاؤں میں بیک وقت زندگی
بسر کر رہا تھا۔ پہلے صرف دو پہلو تھے ایک خیالی پہلو اور دوسرا گھر کا حقیقی پہلو
لیکن اب حیاتِ عشق کا تیسرا پہلو بھی نظر کے سامنے تھا۔
اوپر پو کے جن ڈگمگاتے ہوئے خصائلِ طبعی کا ذکر کیا گیا ہے اس میں
دوسری باتوں کے علاوہ اُس کی شراب خوری کو بھی کافی سے زیادہ دخل تھا
اس لئے ضروری ہے کہ ہم اُس کی اس علت کا بھی کم سے کم مختصر جائزہ
لے لیں۔

بچپن میں پو رچمنڈ کے جس سماجی حلقے میں پل کر بڑا ہوا تھا اُس
میں شراب کا استعمال عادت کی بجائے تہذیب و شائستگی کا زیادہ مرہون
تھا۔ گھر آئے مہمان کی خاطر تواضع میں اس آتشِ سیال کی پیشکش طرفین
کے لئے اعزاز کا باعث تصور کی جاتی تھی۔ چنانچہ ایسی سوسائٹی میں ظاہر
ہے کہ پو بلوغ سے پیشتر ہی شراب کے استعمال سے کافی سے زیادہ
شناسا ہو چکا تھا۔ اور اُسے اُس ہنگامی تسکین کا بھی احساس و شعور ہو چکا
تھا جو اس چیز کے استعمال سے محسوس ہوتی ہے لیکن پو کی شراب خوری
کی صرف یہی توضیح کافی نہیں ہے۔ کیونکہ اُس سوسائٹی میں اور بھی تو کئی
نوجوان ہوں گے جو باوجود شناسائی کے شراب کے عادی نہ بن سکے ہوں
گے۔ اس کے علاوہ پو کا اندازِ استعمال تہذیب و شائستگی سے بظاہر
کچھ زیادہ تعلق نہیں رکھتا۔ مختلف بیانات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ
اکثر کافی لمبے عرصے تک پو شراب کو ہاتھ تک نہ لگاتا تھا۔ نیز وہ متواتر اور

مسلسل پینے کا عادی نہ تھا۔ بلکہ اُس پر اپنی ذہنی کشمکش اور اُلجھنوں کے ساتھ ہی ساتھ شراب خوری کے بھی گویا دورے پڑا کرتے تھے اور اس وقت اُس کی کیفیت کسی دیوانے کی سی ہو جایا کرتی تھی جس کا چلن ایک ایسی غیر معمولی صورت اختیار کر لیتا جس کا سمجھنا اُس کے روز کے ملنے والوں کی سمجھ سے بھی بالا ہو جاتا۔ غالبًا وہ غالبؔ کے اس شعر کا پیرو تھا کہ

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بےخودی مجھے دن رات چاہیئے

البتہ ایک فرق تھا کہ اسؔ گونہ بےخودی" کی جستجو اُسے "دن رات" نہ تھی، ہاں جب کبھی اس کی ذہنی اُلجھنیں اُس کے اختیار سے باہر دکھائی دیتیں تو وہ تسکین کے لئے اِس ہنگامی علاج کی طرف رجوع ہو جاتا۔ طبّاع ذہانتوں میں عمومًا اور شعراء میں خصوصًا یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنی کسی انفرادی افتادِ حیات یا افتادِ طبع کی بنا پر اس شغلۂ جوالہ کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ پوؔ نے صاف الفاظ میں اپنی مے خواری کی وضاحت کی ہے۔ ایک بار اس نے اپنی محبوبہ مسز ڈمن سے کہا تھا کہ میں نے مے خواری سے حصولِ عشرت کے لئے اپنی شہرت زندگی اور دل و دماغ کو خطرے میں نہیں ڈالا۔ یہ کام میں نے ہر طرف سے مایوس ہو کر اذیت رساں یادوں سے چھٹکارا پانے کے لئے کیا ہے بعض دفعہ مجھے ایک ناقابلِ علاج تنہائی کا احساس ہونے لگتا ہے، اور کسی عجیب آنے والی مصیبت کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اپنے کئی ایک خطوں میں بھی اُس نے اس بیان کا اعادہ کیا ہے اور اُس کے حالاتِ ذہنی کو دیکھتے ہوئے ہمیں اُس کے بیان کو صحیح سمجھنا پڑتا ہے۔

جب کبھی اُس پر یاس اور اندیشوں کا یہ دورہ پڑتا اور اسے بھلانے کے لئے وہ شراب کا سہارا لیتا تو اُس نشے کی حالت میں اس سے عجیب حرکات سرزد ہوتیں اور ہوش میں آنے کے بعد وہ اپنی اُن حرکات کے متعلق کوئی وضاحت پیش نہ کر سکتا۔ ہاں، ایک صحیح اعصابی مریض اور شرابی کی طرح رہ رہ کر یہ بات کہتا کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا، اب وہ کبھی شراب کو ہاتھ بھی نہ لگائے گا، اب اُس نے اپنی کمزوری پر قابو پالیا ہے لیکن جلد یا بدیر پھر وہی کیفیت طاری ہو جاتی۔ یاس اور اندیشے اور پھر وہی ہنگامی اور غیر مکمل علاج، مے خواری۔ ان دوروں کے بعد اُسے اپنے دوستوں سے ایک شکایت رہتی کہ وہ اُس کے شراب کو جنون کا باعث سمجھنے کی بجائے جنون کو شراب کا باعث کہتے ہیں۔

مفصل کتاب لکھی ہے جس میں تمام حالات اور بیانات سے ثابت کیا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں ایک ایسا مے خوار تھا جس کی عادت بظاہر ناقابلِ وضاحت دکھائی دیتی ہے لیکن جس کی کمزوری کی حقیقی وجہ اُس کی روح کی مریضانہ کیفیت ہے۔ لیکن یہاں ایک دلچسپ اور اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پوؔ صحیح معنوں میں ایک شرابی تھا تو کیوں ہر عادی مے خوار اُس کی طرح تخلیقِ ادب کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ اگر اُس کے اندیشوں سے لبریز دماغ کو "سایۂ شاخِ گُل افعی نظر آتا تھا"۔ تو یہ اُس کی مے خواری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے جوہرِ طبع کی وجہ سے تھا۔ گویا وہ طبّاع پہلے تھا اور شرابی بعد میں۔

پوؔ کا جیون ناٹک دیکھتے ہوئے ہم اس کہانی کے اہم کرداروں سے واقف ہو چکے۔ اور چونکہ ہر شخص اپنے ملنے والوں سے پہچانا جاتا ہے۔ اس لئے اس قصے کے ہیرو کو بھی کچھ ہم نے براہِ راست پہچانا اور کچھ بالواسطہ اُن اہم کرداروں کے ذریعے سے۔ اس لئے اب ہمیں اُس کی ذہنی دنیا کی طرح رجوع ہونا چاہئے لیکن پہلے ایک نکتے کو سامنے رکھ لیں۔ بیوی کی زندگی تک اگرچہ اُس نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے میل جول ترک نہیں کر دیا تھا بلکہ اپنے معاشقوں کے سلسلے میں مختلف صورتوں میں زندگی کا سہارا تلاش کرتا رہا لیکن اُس زمانے میں بھی بنیادی طور پر وہ تنہا ہی تھا اور یہ تنہائی ازلی اور ابدی تھی اور اس لئے لاعلاج۔ اپنی ایک نظم میں وہ بہت خوبی سے اس کا اظہار کرتا ہے۔

اکیلا

دائیں بائیں جو لوگ تھے اُن سا نہ تھا بچپن کے زمانے سے
مری آنکھ نہ اوروں کی آنکھ سی تھی مرے جذبوں کا رنگ نرالا تھا
مرے دُکھ کو کوئی نسبت ہی نہ تھی لوگوں کے رونے رُلانے سے
مرے عیش و مسرّت کی لہروں کا سب سے ڈھنگ نرالا تھا۔
جو کچھ بھی مجھے مرغوب ہوا، وہ صرف مجھے مرغوب ہوا،
جو شخص مجھے محبوب ہوا وہ صرف مجھے محبوب ہوا۔
وہ دورِ طفولیت جس کو اندھا طوفان بن جانا تھا،
وہ دورِ زیست کے دن سے پہلے آنے والا سویرا تھا۔
اُس دور میں ہی اس بھید کے بندھن نے مرے دل کو گھیرا تھا
یہ بھید کہ جس کو نیکی بدی کی گہرائی سے آنا تھا
آنا تھا اندھے دھارے سے، آنا تھا مچلتے چشمے سے

سرگرداں سورج سے آتا تھا میری زیست پہ چھاتا تھا،
وہ سورج جس کو خزاں میں افق پہ سونے کا رنگ چڑھاتا تھا،
اُس برق سے آتا تھا اس کو جو چمک اُٹھتی ہے گھٹاؤں سے
اور شور سے رعد کے آتا تھا، آتا تھا ردتی ہواؤں سے۔
آتا تھا اُن طوفانوں سے جو سب کا دل دہلاتے ہیں
اور اک آوازِ مجسّم بن کر دنیا پر چھا جاتے ہیں،
ان بادلوں سے آتا تھا جو آکاش پہ ڈیرا جماتے تھے
اور میری نگاہوں میں کالے بھوتوں کے جھنڈ بناتے تھے

اس نظم سے جہاں پو کے احساسِ تنہائی کی شدّت اور گہرائی معلوم ہوتی ہے وہیں یہ سراغ بھی ملتا ہے کہ بچپن ہی سے اُس کا ذہن سیدھی سادی باتوں سے غیر معمولی تاثر لیتا تھا۔ ایک عام بچے کو مظاہرِ فطرت سے تسکین اور شگفتگی کا احساس ہو سکتا ہے لیکن وہ ایک عام بچہ نہ تھا۔ اس کو بچپن ہی سے بادلوں میں بھوت دکھائی دیتے تھے اور آئندہ چل کر یہی بھوت اُس کے دل و دماغ پر چھا گئے۔ یہاں تک کہ ان غیر معمولی تصوّرات نے حالاتِ زندگی کے ساتھ مل کر ایک نئی دنیا کی تخلیق کی۔ یہی نئی دنیا پو کے تخیّل کی دنیا تھی۔ اور اس دنیا کا مطالعہ پو کی ذہانت کو سمجھنے میں کافی حد تک ہمارا معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

پو ایک جگہ لکھتا ہے "وہ لوگ جو دن کو خواب دیکھتے ہیں انہیں بہت سی ایسی چیزیں دکھائی دیتی ہیں جو ان لوگوں کو دکھائی نہیں دے سکتیں جو صرف رات کو خواب دیکھتے ہیں" — اُس کی یہی بات ایک ایسا سراغ ہے جس سے ہم اُس کی خیالی دنیا کی نوعیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ یوں تو اس دنیا میں (جسے دار المحن کہتے ہیں) ہر کسی نے اپنے کسی ذہنی گوشے میں ایک ایسی جگہ کا تصوّر کسی نہ کسی صورت میں قائم کر رکھا ہوتا ہے جہاں وہ زندگی کے مصائب سے گھبرا کر ایک دو لمحوں کو پناہ لے سکے۔ لیکن ایک عام شخص کی خیالی دنیا اور ایک طبّاع کی تخلیقی سرزمین میں فرق ہے۔ مگر ایک بات یکساں ہے، خواہ کوئی عام انسان ہو، خواہ شرابی یا کسی نشے کا عادی، خواہ اعصابی مریض اور خواہ جوہرِ خداداد کا مالک — سب کی خیالی دنیا اذیّت دہ اُلجھنوں کو تمام تر نہ مٹا سکتی ہے نہ دھندلا سکتی ہے۔ ہاں ہنگامی طور پر احساس و شعور کو کند کر دیتی ہے۔ عام انسان اس کند کیفیت کو حاصل کرنے کے لئے اپنے معمولی تصوّرات سے کام لیتا ہے، شرابی یا نشے باز اپنی علّت سے، اعصابی مریض کو اندرونی طور پر ہی اس دنیا کی تخلیق میں مدد مل جاتی ہے۔ اور ایک طبّاع انسان کی تخلیقی ذہانت ان سب سے بڑھ کر تخیّل پرستی کے کرشمے دکھاتی ہے۔ عام انسان جانتا ہے کہ اس کی یہ دنیا محض ایک دل بہلاوا ہے، شرابی اور اعصابی مریض بھی اس بات کا احساس کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ محض ایک طفل تسلّی ہے اور طبّاع کو تو اس کا بھی شعور ہوتا ہے کہ یہ سارا محل اُس کا اپنا کھڑا کیا ہوا ہے لیکن سب کے سب اپنے تصوّرات اور خوابوں کو حقیقت پر ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ خواب اُس کے لئے زندگی سے گریز کا ذریعہ ہیں۔ خواہ اس خیالی دنیا میں ہیبت ناک باتیں ہی کیوں نہ ہوں، اس میں ایک ایسی تسکین تو ہوتی ہے جسے شعور تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ پو کی خیالی دنیا کا یہی حال تھا۔ اگرچہ اس کے اندیشوں اور گہرے ملال کی صحیح نوعیت عام طور پر متنازعہ فیہ ہے لیکن اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا باعث دبی ہوئی جنسی آرزوئیں تھیں جو اس کے ذہن کی گہرائیوں میں جا کر آسودہ ہو چکی تھیں، اور اس کے تصوّرات میں علامتی صورت اختیار کر کے اُبھرتی تھیں۔ اس ملال، اور اس اندیشے نے اُس کی زندگی کو مصائب کا ایک ان مٹ سلسلہ بنا رکھا تھا۔ اور اسی لئے اس کی تخلیقاتِ ادبی، اُس کی کہانیاں بھی ایک ایسے ہی سائے کے اثر میں نشو و نما پاتی تھیں۔

جب وہ تصوّر میں اپنی کسی کہانی کے ہیرو کی زندگی بسر کرتا تھا اور اس تخیّلی بھیس میں کسی ان دیکھی، انوکھی دنیا میں جا پہنچتا تھا اور ایسی اچھوتی دوشیزاؤں کے خیالات میں ڈوب جاتا تھا جو اُس سے جدا ہو چکی ہوں، تو یہ کیفیت اُس کے لئے اس حقیقی زندگی کی بہ نسبت کہیں زیادہ تسکین دہ ہوتی تھی، کیونکہ اُس کی یہ حیثیت اُس کے اعصابی آدرش سے ہم آہنگ ہوتی تھی۔ اس دنیا میں تو وہ صرف ایک ایڈیٹر تھا اور ایڈیٹر بھی ایسا جسے اپنے حق سے کہیں کم معاوضہ ملتا ہو، جس کے ساتھ ناانصافی پر ناانصافی ہو رہی ہو۔

نفسیات کے ماہر ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ اعصابی مریض کی بنیادی خصوصیت ہے کہ وہ ایک افسانے کے بل پر زندگی گزارتا ہے، اور اُس کا عمل اس افسانے کو حقیقت بنانے کے لئے ایک براہِ راست یا بالواسطہ کوشش ہوتی ہے، اُس کی تمام حرکات اور افعال کا یہی ایک

مقصد ہوتا ہے۔ ابتدا میں احساسِ کمتری کے باعث اپنے آپ پر اعتماد پیدا کرنے کے لئے یا اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے وہ افسانہ طرازی کرتا ہے، اور پھر اُس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس افسانے کو حقیقت کی صورت دے دے۔ ظاہر ہے کہ پو کا منتہائے نظر بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔

پو اگرچہ زندگی بھر اپنے پیشے کے سلسلے میں شہر بہ شہر پھرتا رہا بلکہ اُس کی یہ آوارگی اور پریشان حالی میر کے اس شعر سے تطابق رکھتی ہے کہ

نہ دیکھا میر آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بہ کو تھا

پھر بھی اُس کے اس مستقل انتقالِ ماحول کا اثر اُس کی تخلیقات پر نہ ہوا۔ وہ جہاں کہیں بھی گیا اپنی دنیا، اپنی کائنات کو ساتھ لے کر گیا۔ کیونکہ اس کے لئے اسی دنیا کی زندگی حقیقی زندگی تھی۔ اس دنیا کی چار دیواری میں اس کا ذہن اس قدر مرکوز تھا گویا اُسے اپنی مستقل حرکت کا احساس تک نہیں ہے۔ اور اسی لئے اُس پر مختلف مقامات اور مختلف شخصیتوں کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس کا ثبوت اس کے اپنے الفاظ سے بھی ملتا ہے۔

"اس دنیا کے حقائق مجھے سراب معلوم ہوتے ہیں، محض سراب! ——اور اس کی بجائے خوابوں کی بستی کے وحشیانہ تصورات اس روز مرّہ زندگی کا مواد ہی نہیں بلکہ کلیتاً اپنی ہستی نظر آتے ہیں۔"

تخیّل اور تصوّرات کے اس قدر مرکوز ہو جانے کی ایک اور وجہ بھی دکھائی دیتی ہے۔ اپنی گھریلو کائنات میں اُس کی اپنی ذات ہی ایک ایسا مرکز تھی جس کے گرد گھر کی فضا گھوم رہی تھی۔ اس گھر میں اس کا کہا ایک حکم تھا، ایک قانون۔ کسی کو اُس کی بلندی اور برتری پر اعتراض نہ تھا، نہ اُس کے جوہر کی فوقیت میں کسی کو شک تھا۔ اور اس لئے اس محدود مقام پر اُسے نہ صرف اُس پاس کی دنیا بلکہ باہر کی کائنات کا مرکز بھی اس کی اپنی ذات معلوم ہوتی تھی۔ گویا اُس کا گھر — گھر کی فضا اُس کے لئے گریز کا ایک ایسا ہی محفوظ مقام تھی جیسا کہ اُس کی تخیّل کی دنیا۔ اُسے اپنی تسکین کے لئے جس چیز کی ضرورت تھی یعنی ایک غیر مادّی، غیر جنسی حسن کا مجسمہ، وہ گھر میں اس کی بیوی کے بھیس میں اسی طرح موجود تھا جیسے اُس کے تصوّرات کی دنیا میں۔ نیز گھر میں بھی وہی سلطانِ کائنات تھا اور تخیّل میں بھی۔

باہر کی دنیا میں جہاں خود کام ناشر اور ایڈیٹر اس کو دکھائی دیتے تھے، اچانک اُسے محسوس ہوتا کہ یہاں نہ تو اُس کی بیوی ایسی چپ چاپ صورت ہے، نہ اُس کی ساس ایسی خدمت گذار عورت۔ اپنے آپ کو وہ جو کچھ سمجھتا ہے باہر کی دنیا اس نقطۂ نظر سے اس کی قدر نہیں کرتی۔ باہر کی دنیا اس دھندلے محل کی ملال آمیز شان سے بے خبر ہے جسے اُس نے بنایا ہے، اور اُس علم و کمال سے بھی بے خبر ہے جس نے اُس کی ذات کو فانی انسان کے درجے سے کہیں بلند کر دیا ہے —— اور یہ احساس اُس کے لئے درد و کرب کا باعث ہوتا، اُس کی ذہنی کشمکش شدید تر ہو جاتی اور اس کشمکش سے جو اس کے لئے دو یکساں نمایاں حقیقتوں کی صورت میں موجود تھی۔ ایک وحشت، ایک جنون بیدار ہو جاتا۔ اور اسی جنونی کیفیت کے باعث وہ غیر معقول غصہ اُس پر طاری ہو جاتا جو اُسے نامناسب افعال پر مجبور کر دیتا، لوگوں کو برا بھلا کہنے پر اکساتا، ہمعصر لکھنے لکھانے والوں کی مخالفت پر بھڑکاتا، اور جو لوگ اُس کی شخصیت کے صرف بہتر اور شعوری پہلو سے واقف ہوتے وہ اس غیر متوقع ردِّعمل سے متحیّر رہ جاتے۔

پو کے ذہن نے جو الگ تھلگ دنیا بنا رکھی تھی اگر ہم اُس کی نوعیت اور علّتِ تخلیق کو سمجھ لیں تو ہم اُس کی زندگی، اُس کی شخصیت اور اس کی تخلیقاتِ ادبی کو صاف اور واضح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اور ہمدردانہ نہ ادبیہ نگاہ سے غور کر سکتے ہیں۔ اس کے بغیر ہم لامحالہ دشوار منزلوں سے ہٹ جاتا ہے، بلکہ ہم صحیح معنوں میں کسی راستے پر گامزن ہی نہیں ہو سکتے۔

اب ہم پو کے تماشائے حیات کے آخری سین کی طرف آتے ہیں۔ اس بات کا بیان تو پہلے کیا جا چکا ہے کہ ورجینیا کی موت کے بعد پو کا ذہن اُس کے قابو میں نہ رہا تھا اور اُس کے ان گنت معاشقوں نے اس کیفیت میں اضافہ ہی کیا تھا۔ جولائی ۱۸۴۹ء تک وہ بکسر اس قابل نہ رہا کہ اپنی دیکھ بھال کر سکے۔ اس زمانے میں اُس کے جنونی دماغ میں ایک خیال آیا کہ کیوں نہ وہ دوسروں کی ملازمت کی بجائے اپنا ایک ماہنامہ جاری کر دے اور اس تجویز کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے روپے کی فراہمی کے سلسلے میں وہ رچمنڈ پہنچا۔ لیکن یہاں پہنچ کر پہلے روز تک وہ شہر کے ذلیل ترین میخانوں میں ڈولتا پھرا۔ اور اس آوارگی اور پریشان حالی سے جان آ رہا تھا جس نے اُسے رہائی دلائی جو اس زمانے میں ماہنامہ "پیامی"

(میسینجر) کا ایڈیٹر تھا۔ اس کے بیان کے مطابق اس بات کے باوجود کہ اُس نے اس کی فوری ضروریات کو پورا کیا تو آپ اس قابل نہ تھا کہ کسی طرح کا بھی اثر اس کی بہتری کے لئے اس پر ڈالا جا سکتا۔ چنانچہ اس پھیرے میں جتنا عرصہ وہ رچمنڈ میں رہا۔ اس کی آوارگی بدستور جاری رہی۔

یہ اُس کی خارجی زندگی تھی اور داخلی طور پر پوس کا غیر مدلل اور ناقابل فہم ملال اُس پر پہلے سے زیادہ گہرائی کے ساتھ تسلط پا رہا تھا۔ اپنی ایک محبوبہ "اینی" کو لکھتا ہے "میرا غم و ملال ناقابلِ فہم ہے، اور یہ بات مجھے اور بھی غمگین بنا دیتی ہے۔ میرے ذہن میں تاریک پیشگوئیاں چھا رہی ہیں۔ کسی بھی بات سے میرا غم دور نہیں ہوتا، مجھے خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا میری زندگی ضائع گئی ہے، ماضی کی زندگی اور مستقبل ایک بے رونق خلا کی مانند دکھائی دیتا ہے۔ لیکن میں کوشش کروں گا کہ اس کشمکش اور ان اندیشوں سے پنپ سکوں، اور یاس کی اس تاریکی میں بھی امید کی جستجو کو جاری رکھوں۔"

اس سے قریباً ایک سال بعد ۳۰ر جون ۱۸۴۹ء کے روز اُس نے ایک بار پھر اسباب کی دفعہ آخری بار، رچمنڈ آنے کی تیاریاں کر لیں تو اس وقت بھی اس کا ذہن اسی طرح اندیشوں سے پُر تھا۔ چنانچہ اس سفر سے پہلے وہ اپنی ایک دوست مسز لیوس سے ملنے کے لئے گیا اور دوران گفتگو میں کہنے لگا۔ "مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں آپ کو اب کبھی دوبارہ نہ دیکھ سکوں گا۔ مجھے آج رچمنڈ جانا ازحد ضروری ہے، اگر میں نہ لوٹوں تو میرے سوانح حیات ضرور لکھیئے گا۔ کیونکہ مجھے امید ہے کہ آپ میری ذات سے انصاف کریں گی۔"

چنانچہ یہ آخری مہلک سفر ان خیالات کے ساتھ شروع ہوا۔ جب وہ فلاڈلفیا پہنچا جو اُس کے سفر کی پہلی منزل تھی تو اس پر جنون کا ایک دائمی دورہ پڑا۔ اس دورے میں اُسے یوں محسوس ہونے لگا گویا بعض انجان اشخاص اس کا پیچھا کر رہے ہیں اور اُس کی جان کے درپے ہیں۔ اس شہر میں جان سارٹین نامی ایک شخص رہتا تھا جس سے پو کی شناسائی قیام فلاڈلفیا ہوئی تھی۔ اس کے ہاں پہنچ کر پو نے اس سے درخواست کی کہ وہ اُسے ان لوگوں کے چنگل سے رہائی دلائے اور اپنی حفاظت میں رکھے۔ جان سارٹین لکھتا ہے کہ پو نے مجھ سے کہا کہ جو کچھ میں آپ کو بتاؤں گا اسے آپ مشکل ہی سے سچ سمجھیں گے۔ لیکن اس انیسویں صدی میں بھی ایسی باتیں ممکن الوقوع ہیں ——— اس کے بعد اس نے ذیل کا قصہ سنایا "میں نیویارک کو جا رہا تھا کہ گاڑی میں اپنی سیٹ سے پیچھے کچھ دور میں نے چند لوگوں کو سازش کرتے سُنا کہ کس طرح وہ مجھے مار کر گاڑی کے پائیدان سے نیچے دے پھینکیں گے۔ وہ اس قدر آہستہ آواز میں یہ باتیں کر رہے تھے کہ اگر میری قوتِ سامعہ غیر معمولی طور پر تیز نہ ہوتی تو میرے پلے کچھ بھی نہ پڑتا۔"

اور اس قتل کے افسانے کے بعد اس نے خودکشی کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس کے بعد کافی دیر تک خاموش رہا اور پھر اچانک بول اُٹھا۔ "اگر میں یہ اپنی مونچھیں صاف کر ڈالوں تو پھر مجھے پہچاننا ذرا مشکل ہو جائے گا۔ کیا آپ مجھے ایک اُسترا لا دے سکتے ہیں تاکہ میں انہیں مونڈ لوں؟" ——— اس کے علاوہ اس نے یہ بھی کہا کہ ایک جعلی چیک بنانے کے جرم میں مجھے مویامینسنگ کے جیل خانے میں ڈال دیا گیا تھا اور اس قید کے دوران میں میں نے دیکھا کہ ایک سفید لباس میں ایک عورت کی شکل نمودار ہوئی۔ اور مجھ سے کچھ باتیں کرنے لگی، اگرچہ کچھ اس نے مجھے کہا اُسے میں نہ سُن سکتا تو بس یوں سمجھو کہ اب تک خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ وہیں ایک ملازم نے مجھ سے کہا کہ اگر میں چاہوں تو اس کے ساتھ قلعے کی چار دیواری میں چل پھر کر سیر کر سکتا ہوں۔ میں رضامند ہو گیا۔ یونہی قلعے کے مختلف مقامات کی سیر کے دوران میں ہمیں فصیل کے قریب ایک خم مے ملا۔ میرے ساتھی نے پوچھا کہ شوق فرمائیے گا؟ میں نے انکار کر دیا۔ اگر میں ہامی بھر لیتا تو وہ مجھے اُسی خم کی آتشِ سیال میں ڈبو دیتا ——— یوں ہی آخر کار وہ لوگ مجھے اذیت دینے کے لئے اور میرے دل کے ٹکڑے کرنے کے لئے میری ساس مسز کلیم کو وہاں لے آئے اور پھر میں نے یہ لبصارت سوز منظر دیکھا کہ انہوں نے پہلے ٹخنوں تک اُس کے پاؤں آرے سے الگ کر دیئے، پھر گھٹنوں تک ٹانگیں کاٹ دیں اور پھر کولھوں تک تمام کی تمام ٹانگیں اُڑا دیں ———"

جنون کے اس دورے میں پو کی جو کیفیت تھی اس کا اندازہ اوپر کے دہشت ناک بیان سے کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے روز اُس کی ذہنی حالت کافی حد تک درست ہو گئی، اور اس بات کا بھی احساس ہونے لگا کہ ایک روز پیشتر اُس نے جو داستان سنائی تھی وہ اس کے تخریب آلود ذہن کا ایک کرشمہ تھا۔

۳۱ر اکتوبر ۱۸۴۷ء کے روز بالٹی مور کے ایک ڈاکٹر کے نام اسی شہر کے ایک ناشر نے ذیل کا رقعہ لکھا۔

محترمی

رائن کے چوتھے وارڈ پول پر ایک صاحب موجود ہیں، جن کالباس

کچھ ضرورت سے زیادہ خستہ و خراب ہے اور جن کا نام ایڈگرایلن پو بتایا جاتا ہے۔ یہ صاحب اس وقت ایک بڑی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ کی ان سے شناسائی ہے۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انہیں اپنی موجودہ حالت میں مدد کی ضرورت ہے۔ جلدی میں یہ رقعہ لکھ رہا ہوں۔

آپ کا

جوس ڈبلیو واکر

اس رقعے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پو کو مذکورہ مقام سے ایک ہسپتال میں پہنچایا گیا۔ جہاں ڈاکٹر جے مورین اس کا علاج کرنے لگا جو وہاں کا معالج تھا۔ ہسپتال پہنچنے کے چار روز بعد مریض ہذیان کی کیفیت میں راہیٔ ملک عدم ہوا۔

لیکن پو مرنے سے پہلے اس حالت کو کیونکر پہنچا؟ بہت عرصے تک لوگوں کو اس کی موت کے متعلق صحیح واقعات کا علم نہ ہو سکا۔

رچمنڈ سے پو چند روز پہلے روانہ ہوا تھا۔ یہاں اس نے اگرچہ پبلک طور پر آئندہ شراب کو ہاتھ نہ لگانے کا عہد کیا تھا لیکن ہمیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ روانگی کے وقت وہ کافی سے زیادہ نشے کی حالت میں تھا۔ نیز بالٹی مور میں بھی جب وہ مذکورہ بالا ناشر کے سامنے پہنچا ہے تو اس وقت بھی نہ اُسے یہ معلوم تھا کہ وہ کہاں سے آیا، کہاں ہے، کون اس کو ہسپتال پہنچا رہا ہے وغیرہ، بلکہ درمیانی وقفوں میں جب کچھ ہوش بھی آیا تو وہ یہ یاد نہ کر سکا کہ اس سانحے سے پیشتر وہ کن لوگوں کے ساتھ تھا۔

ہسپتال میں اُسے صبح پانچ بجے پہنچایا گیا۔ اس وقت سے لے کر دوسرے روز صبح تین بجے تک وہ اسی بے ہوشی کی حالت میں رہا۔ اس کے بعد اس کے اعضا میں تشنج شروع ہوا۔ اور ساتھ ہی ہذیان کی ہلکی سی لیکن متواتر کیفیت بھی جاری رہی۔ ہذیان کی اس حالت میں بے تحاشا لگاتار باتیں کرتا رہا گویا وہاں کوئی ایسے لوگ موجود ہیں جن سے وہ مخاطب ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ یکسر زرد تھا اور اس کا تمام جسم پسینے میں شرابور، ہسپتال میں داخلے سے دوسرے روز ڈاکٹر اس کی اس کیفیت کو بدل سکے ہوش آنے کے ساتھ ہی ڈاکٹر اس کے سرہانے پہنچا اور اس سے اُس کے رہنے کی جگہ اور اگلوں پچھلوں کا اتہ پتہ پوچھنے لگا۔ لیکن اُس کا ہر جواب گڈمڈ اور ناقابلِ فہم تھا۔ البتہ یہ اس نے بتایا کہ رچمنڈ میں اُس کی ایک بیوی ہے۔ (حالانکہ ورجینیا کبھی کی مر چکی تھی) نیز یہ بھی کہا کہ اُسے یہ معلوم نہیں کہ وہ رچمنڈ سے کب روانہ ہوا اور اُس کے کپڑوں کا ٹرنک کہاں گیا۔ چونکہ پو نے

اس گفتگو کے دوران میں زندگی سے ناامیدی کا اظہار کیا اس لئے ڈاکٹر نے اُسے تسلی دلائی کہ کوئی فکر کی بات نہیں چند روز میں ہی اُسے افاقہ ہو جائے گا۔ اور وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے مل سکے گا۔ اس وقت تک ڈاکٹر اس کی ہر طرح سے خبرگیری کرے گا۔ اس پر پو گویا پھوٹ پڑا اور ایک غیر معمولی جوش کے ساتھ کہنے لگا کہ اس وقت اس کا بہترین دوست بھی اس کی یہی سب سے بڑی خدمت کر سکتا ہے کہ اس کے سر میں پستول رکھ کر چلا جائے۔ کیونکہ جب وہ اپنی موجودہ ذلت کو دیکھتا ہے تو چاہتا ہے کہ زمین پھٹ پڑے اور وہ اس میں سما جائے۔ یہ کہنے کے کچھ لمحوں کے بعد وہ اونگھ گیا۔ جب ڈاکٹر دوبارہ اس کے پاس پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ اُس پر شدید ہذیانی کیفیت طاری ہے۔ اور دو نرسیں اُسے قابو میں لانے کی ناکام کوشش کر رہی ہیں ہفتے کی شام تک یہی کیفیت طاری رہی۔ اور اُس وقت سے لے کر دوسرے روز صبح تک وہ "رینالڈز" نامی کسی شخص کو رہ رہ کر متواتر پکارتا رہا۔ اور اس کے بعد اُس کی حالت میں ایک نمایاں تبدیلی شروع ہوئی۔ ہذیان میں ہاتھ پاؤں مارنے سے وہ بہت تھک چکا تھا اس لئے اب خاموش ہو گیا۔ اور کچھ دیر تک یوں معلوم ہوا گویا آرام کر رہا ہے پھر اُس نے آہستہ سے اپنے سر کو جنبش دی اور بولا "او خدایا! مجھ بے چارے کی مدد کر!"۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کا دم نکل گیا۔ ہسپتال کے ڈاکٹر کا بیان ہے کہ موت کے بعد شہر کے بہت سے نمایاں اصحاب ہسپتال میں اسے دیکھنے کو آئے۔ اور اُن میں سے بہت سے ایسے تھے جو چاہتے تھے کہ انہیں اُس کے بالوں کی ایک لٹ مل جائے۔

بالٹی مور میں پہنچنے سے پہلے کے حالات پر اگرچہ ایک دھند کا چھایا ہوا ہے۔ لیکن اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ رچمنڈ سے روانہ ہونے سے پہلے وہ اپنے دوست ڈاکٹر جان کارٹر کے ساتھ کچھ وقت گذار کر اس کی چھڑی عاریتاً لئے ہوئے اس نیت سے علیحدہ ہوا کہ کسی ہوٹل میں کھانا کھا آئے۔ اس ہوٹل میں اُس کے کچھ اور دوست مل گئے جن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت وہ بالکل ہوش میں تھا اور بے حد چہک کر باتیں کر رہا تھا۔ لیکن یہاں سے نکل کر وہ ڈاکٹر کارٹر کو اس کی چھڑی لوٹانے کے لئے نہ گیا نیز اس کے کپڑوں کا ٹرنک بھی رچمنڈ کی ایک سرائے میں جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا پڑا رہا۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ رچمنڈ سے چلا تو اُس کو اپنے بھلے بُرے کا مطلق ہوش نہ تھا اُس کی جیب میں کافی رقم موجود تھی۔ یہ رقم اُسے ایک لیکچر کے معاوضے میں [illegible]

بل پر وہ نہ جانے کب اور کیونکر بالٹی مور پہنچا۔ یہاں آکر غالباً اس نے پھر شراب نوشی شروع کی جس کی وجہ سے اس کے پھیپھڑوں کا پرانا مرض عود کر آیا اور یوں وہ اُن توقعات کے عین مطابق اپنے انجام کو پہنچا جو اس کی پہلی زندگی کو دیکھ کر قائم کی جاسکتی ہیں۔

اگرچہ اب ہمیں اُس کے انجام کی تفصیلات معلوم نہیں ہوسکتیں۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہوسکتا کہ اُس کے ذہن کو جن اُلجھنوں نے اپنا گھر بنا رکھا تھا ان سے موت ہی اُسے رہائی دے سکتی تھی۔ بیوی کی موت کے بعد ڈھائی سال تک اُس نے جو کچھ کیا اور کہا اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اب اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے کوئی اور افسانوی محل تیار کرنے کے ناقابل ہے، یہ اُس کے بس کی بات ہی نہیں رہی، چنانچہ ان حالات کی بنا پر اُس کی زندگی اُس کے متعلقین اور اس کی اپنی ذات کے لئے بھی ایک بارِ گراں تھی۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی ذہنی تخریب اب اس گہرائی کو پہنچ چکی تھی کہ وہ پہلے کی طرح اپنی اُلجھنوں اور اندیشوں کو ادب کی صورت بھی نہ دے سکتا تھا اور اس لئے اگرچہ موت اس قدر رفرد مایہ اور نامناسب طریق پر اُس تک پہنچی لیکن پھر بھی وہ اس کے دکھ کا دارو تھی۔

امریکہ میں اگرچہ پو اپنی زندگی میں مقبول تھا لیکن اس کی تحریرات محبوب نہیں تھیں اور اس کم پسندی کی مختلف وجوہات تھیں ایک تو اس کی ذاتی حرکات مثلاً معاصرین پر اس کی زہر آلود تنقید دوسرے نشے کی حالت میں مختلف لوگوں سے اس کا نامناسب رویہ تیسرے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بعض دفعہ دوستوں کے علاوہ اور لوگوں سے اُس کا نہ صرف قرض لینا بلکہ بعد میں اپنی پریشان حالی اور پریشان خیالی سے واپس نہ کرنا۔ اس صورتِ حال میں وہ ایک محبوب مصنف کبھی نہ بن سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی ایک تو قرب نے اس کو گھر کی مرغی بنا رکھا تھا، نیز امریکہ کے ادبی ماحول میں وہ فضا اور وہ شخصیتیں ہی نہ تھیں جو پو کے ایسے غیر معمولی جوہر کی قرار واقعی قدر کرسکتیں۔ اس کے جوہر کو ظاہر ہونے کے لئے سب سے مناسب ملک فرانس تھا جہاں کے ادب اور زندگی میں ہر طرح کی اُپج اور غیر روایتی چلن پنپ سکتا ہے۔ اور فرانس تک اُس کا کلام پہنچا، اس کی زندگی میں ہی بعض کہانیوں کا ترجمہ فرانس کے رسالوں میں شائع ہوا۔ اس بات کا اس کو خود بھی علم تھا لیکن باقاعدہ طور پر فرانس نے اسے اپنے مشہور شاعر چارلس باڈلیئر کے ذریعے سے حاصل کیا۔ [illegible] رسائل میں شائع شدہ پو کی بعض چیزیں باڈلیئر کی نظر پڑیں۔ اور وہ انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا اور اُس نے پو کی اصل کتابیں مہیا کیں۔ انہیں دیکھ کر اس پر جو اثر ہوا وہ اس کے اس فقرے سے ظاہر ہے —— "جب پہلے پہل میں نے اس کی کتاب کھولی اور اس کا مطالعہ کیا تو [میں] نے ایک خوف اور ایک مسرت کے ساتھ دیکھا کہ پو نے بیس برس پہلے نہ صرف اُن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن کے خواب میں دیکھتا تھا۔ بلکہ بعض دفعہ تو ایسے فقرے کے فقرے میری نظر پڑے جو میں اپنے ذہن میں ڈھالا کرتا تھا۔"

اس وقت ابھی چارلس باڈلیئر نے بذاتِ خود فرانسیسی ادب میں کوئی درجہ حاصل نہ کیا تھا وہ ابھی آپ ذریعۂ اظہار کی جستجو میں سرگرداں تھا۔ اس دریافت کے عین بعد ہی باڈلیئر نے پو کے کلیات کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں شروع کردیا اور پندرہ سال کی لگاتار محنت کے بعد یہ کام ختم کیا۔ ان ترجموں اور ان کے بعد باڈلیئر کی اپنی شاعری کے ذریعے سے پو کا اثر فرانس کے دیگر شعراء اور مصنفین پر بھی ہوا جن میں سے فرانس کا مشہور تخیل پرست شاعر سٹیفانے میلارمے خصوصاً قابلِ ذکر ہے۔

فرانس میں نقادوں شاعروں اور ادیبوں نے جس گرمجوشی سے پو کا استقبال کیا اس کا اندازہ ذیل کی آراء سے ہوسکتا ہے۔

ایک نقاد لکھتا ہے "اُس کا کلام ایک ایسے پھول کی طرح ہے جس کا رنگ اور جس کے نقش و نگار اس لئے اچھوتے اور انوکھے ہوں کہ اس پھول کا پودا زہر میں سینچا گیا ہے۔"

ایک اور لکھتا ہے "وہ خوف، جنون اور موت میں بہجت کا شاعر ہے —— وہ پہلا شاعر ہے جس نے اپنے کلام سے ضمیرِ شعری کو بیدار کیا ہے، لیکن اُس کی اٹ پٹی ریت کو ہماری آنکھیں نہیں دیکھتیں بلکہ ہماری روحیں محسوس کرتی ہیں۔"

باڈلیئر جو شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھا نقاد بھی تھا۔ اس کے متعلق لکھتا ہے "جس اشتیاق کے ساتھ وہ اپنے آپ کو انوکھے پن کی گہرائیوں میں محض انوکھے پن کے لئے کھو دیتا ہے اور ہیبت ناک کی اُلجھنوں میں محض ہیبت ناک کے لئے سمو دیتا ہے۔ اس سے اس کی تخلیقات کا اخلاص ظاہر ہے، نیز وہ ہم آہنگی بھی نمایاں ہے جو اُس کی ذات میں شاعر اور انسان کے درمیان قائم ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ بہت سے افراد کے سلسلے میں یہ اشتیاق نتیجہ ہوتا ہے ایک ایسی وسیع اور پر زور مشکتی کا جو بیکار پڑی ہوتی ہے، یہ مشکتی بعض دفعہ تو ایک تندی پاکیزگی سے پیدا ہوتی ہے اور بعض دفعہ

گہرے احساسات کے دباؤ سے۔ وہ غیر فطری مسرت جو کسی انسان کو اپنا بہتا خون دیکھ کر محسوس ہوتی ہے، وہ حرکات جن کی شدت اور جن کا اصراف اُن کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور وہ چیخیں جو روح کے حکم کے بغیر گلے سے بلند ہوتی ہیں ـــ سب ایک ہی ذیل میں آتی ہیں، (اسی دبی ہوئی شکستی اور حد سے بڑھی ہوئی پاکیزگی کی ذیل ہیں) ـــ"

گویا دوسرے لفظوں میں اگر انسان اعصابی مریض ہو اور اُس کی جنسی آرزوئیں معمول کے مطابق پوری نہ ہو سکیں تو اُس کے نفیس احساسات دب کر اس قسم کے غیر معمولی راستے اختیار کرتے ہیں۔ اس مسئلے کو زیادہ وضاحت سے سمجھنے کے لئے ہمیں جدید نفسیات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ امریکہ کے ایک مصنف نے پو کی ذہانت کا نفسی تجزیہ اپنی ایک کتاب میں کیا ہے لیکن اس کی طرف نگاہ کرنے سے پہلے کسی حد تک فنی طور پر اذیت پرستی کو سمجھ لیں۔

اذیت پرستی ایک نفسی تجربے کا نام ہے جس میں کسی شخص کو کسی حیوان ناطق یا مطلق کے درد، مصیبت یا خفت میں جنسی حظ حاصل ہو۔ اگر اس درد و مصیبت کا مرکز اپنی ذات ہو تو اُسے داخلی اذیت پرستی کہا جائے گا۔ اور کسی دوسرے کی صورت میں خارجی اذیت پرستی بعض صورتوں میں اس درد و مصیبت کے تصور ہی سے ایسے اعصابی مریض کو تسکین ہو سکتی ہے اور عملی طور پر کسی اذیت کے منظر کی ضرورت نہیں رہتی پو کا نفسی مرض بھی یہی خیالی اذیت پرستی ہی تھا جو بنیادی طور پر خارجی تھا لیکن چونکہ ماہرین نفسیات کے نزدیک داخلی اور خارجی اذیت پرستی میں گویا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لئے ہم پو کی زندگی اور تخلیقات میں بھی اس مرض کی دونوں کیفیتیں دیکھتے ہیں۔

امریکن مصنف البرٹ مورڈیل نے اپنی ایک کتاب میں بہت سے انگریزی مصنفین اور شعراء کا نفسی تجزیہ کیا ہے۔ اور ایک باب اس کتاب میں پو سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ ذیل میں ہم البرٹ مورڈیل کے خیالات کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

تجزیۂ نفسی کے نقطۂ نظر سے ایڈگرایلن پو کا مطالعہ ایک خاص دلچسپی رکھتا ہے۔ اگرچہ اس لحاظ سے بہت سے ماہرین نے اس پر لے دے کی ہے مگر اب بھی اُس کا یہ پہلو کافی حد تک تشنۂ تکمیل ہے۔

پو کے کلیات اور سوانح حیات کو دیکھنے کے بعد سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنی کہانیوں اور نظموں میں بھی وہ متواتر جن دوشیزہ عورتوں کا ذکر کرتا ہے ان کی تہ میں کون عورت چھپی بیٹھی ہے، وہ اکثر ان نازنینوں کو مردہ تصور کرتا ہے۔ اور اس لئے بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں وہ اپنی بیوی ورجینیا کا عکس دیکھتا ہے لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی کیونکہ ورجینیا ابھی زندہ تھی تب ہی سے اُس کے تخیل نے ان عورتوں کی تخلیق شروع کر رکھی تھی۔ ابھی وہ چودہ پندرہ سال کا تھا کہ اُسے اپنے ایک دوست کی ماں مسز سٹینارڈ سے محبت ہو گئی اور جب یہ عورت مر گئی تو اُس کا غم کسی کروٹ چین ہی نہ لیتا تھا۔ اس کے بعد ایک اور عورت سے اُسے رغبت ہوئی جس کا نام میری ڈیورو تھا اس عورت نے پو سے وفا نہ کی۔ ہمارے خیال میں یہی عورت تھی جس کی جدائی کو پو موت کی جدائی تصور کرتا ہے۔ بچپن کی پہلی محبت کا خاتمہ موت نے کیا اور دوسرا تعلق بے وفائی سے ٹوٹا۔ ان دونوں حقائق نے مل کر اس کے دماغ میں مری ہوئی دوشیزاؤں کا تصور پیدا کر دیا اور یوں اُس کی نظموں اور کہانیوں میں اُس کے ان تشنہ افسانہ ہائے محبت کا غیر شعوری اثر ظاہر ہوا۔ یہ نفسی نشوونما طفلی ہی سے شروع تھا۔ ابھی وہ بچہ ہی تھا کہ اُس کی ماں کا انتقال ہوا اور اس کے بعد جس بھی عورت سے اس کا تعلق پیدا ہوا۔ خواہ وہ تعلق ماں کا تھا یا محبوبہ کا، اس میں اُسے مکمل تسکین حاصل نہ ہو سکی۔

اس سلسلے میں دوسرا سوال موت کے موضوع میں پو کی غیر معمولی دلچسپی کا ہے، خصوصاً جب وہ موت اور نازنین عورتوں کو یکجا تصور کرتا ہے۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی بیوی کی موت یا کم سے کم اس کی مہلک بیماری کے باعث یہ تصور اس کے ذہن میں جاگزین ہو گیا۔ لیکن ہمیں یہ بات نہیں بھولنا چاہئے کہ ابھی پو نے ورجینیا سے شادی بھی نہ کی تھی کہ موت کے موضوع سے اس رغبت کا اظہار ہو چکا تھا۔ اس کی ابتدائی کہانیوں میں دوشیزہ عورتوں کی موت کا نہایت واضح بیان ہے۔ پو نے اپنے اس نظریے کا اظہار بھی کیا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ شعریت سے لبریز موضوع ایک حسین دوشیزہ کی موت ہے۔ اور ہمارے خیال میں اس نظریے کی تحریک اُس کو اُن عورتوں سے ہوئی تھی جو اُسے مل نہ سکیں یا الگ ہو گئیں یا اُس کے جذبۂ محبت کو تشنہ چھوڑ کر مر گئیں۔ تیس سال کی عمر سے پہلے چھ ایسی عورتوں کا حال ہمیں معلوم ہوتا ہے جس کا سلسلہ طفلی میں اُس کی اپنی والدہ سے شروع ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُس کے ذہن میں حسن اور موت ہم آہنگ ہو کر رہ گئے تھے۔

اسی مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ پوکو نہ صرف موت یا دوشیزہ عورتوں کی موت سے دلچسپی تھی بلکہ وہ اکثر مختلف کرداروں کے زندہ دفن ہونے کا بیان بھی کرتا ہے یا ایسے لوگوں کا حال لکھتا ہے جو اس جرم کے مرتکب ہوتے ہوں۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ہمیں جدید نفسیات کے پیغمبر مرحوم ڈاکٹر سگمنڈ فرائیڈ کے ایک اقتباس کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ وہ لکھتے ہیں "تھوڑا عرصہ ہوا کہ مجھ پر ان تصورات اور خیالات کی اہمیت واضح ہوئی جو انسان کے ذہن میں زمانۂ حمل میں آ سکتے ہیں۔ انہیں خیالات اور تصورات میں اس حقیقت کی وضاحت ہے کہ بہت سے افراد کو بعض وقعہ زندہ دفن ہونے کا خوف لاحق ہوتا ہے۔ نیز حیات بعد الممات کے اعتقاد کی گہری غیر شعوری دلیل بھی انہی میں ہے۔ کیونکہ حیات بعد الممات رحم کی زندگی سے اس دنیا کی پر اسرار زندگی میں آنے کا ایک عکس ہے۔ اس کے علاوہ پیدائش کا عمل انسان کے لئے خوف کا پہلا تجربہ ہے۔ اور اسی لئے یہی عمل خوف کے احساس کا نمونہ اور ماخذ ہے"۔

ڈاکٹر فرائیڈ کے مندرجہ بالا نظریے ہی میں ہمیں پو کے اندیشوں اور خوف سے بھرپور افسانوں اور اس کی اپنی ذہنی الجھنوں کے حل کا سراغ ملتا ہے ـــــ ایک فرد کی جنسی آرزوئیں جب پیاسی رہتی ہیں تو ان میں ایک ناگوار جھلک ایک خوف کی صورت اختیار کر لیتی ہے اس لحاظ سے پو کی زندگی پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اس خوف میں اگر پیدائش سے پہلے کا خوف بھی شامل ہو جائے تو تمام بات صاف ہو جاتی ہے اور ظاہر ہو جاتا ہے کہ پو کس لئے دوشیزاؤں کے مرنے اور مر کر پھر جی اٹھنے میں دلچسپی لیتا تھا۔

یہ تمام باتیں ایک طرح سے پو کی نفسی نشوونما کا پس منظر ہیں۔ ان سب سے مل کر اور اس کے ساتھ احساسِ کمتری کا اضافہ ہو کر اس کے اذیت پرستانہ رجحانات ظاہر ہوتے ہیں۔ نہ صرف اس کی کہانیاں اور نظمیں اس اذیت پرستی کو ظاہر کرتی ہیں بلکہ وہ زہریلے مضامین بھی اس کے شاہد ہیں جو اس نے اپنے ہمعصر مصنفین اور شعراء کے خلاف لکھے۔ گویا وہ درد اور تکلیف کو محض درد اور تکلیف کے لئے پسند کرتا تھا، چاہتا تھا اور چونکہ وہ حقیقی زندگی میں یہ کام نہ کر سکتا تھا اس لئے اس نے اپنی ادبی زندگی میں اس گہرے جذبے کے لئے نکاس کی صورت پیدا کر لی تھی۔

پو کی نمایاں خصوصیت تخیل پرستی ہے۔ وہ خوابوں کا رسیا تھا، سپنوں کا گھسانا ہے۔ اور اس کی تخلیقات بھی خوابوں ہی کے تانے بانے ہیں۔ وہ خود ایک جگہ ایک کہانی کے کردار کی زبانی جو حسبِ معمول اس کی اپنی شخصیت کا عکس ہے، کہتا ہے "خواب دیکھنا ہی میری زندگی کا حاصل رہا ہے۔ اس لئے میں نے اپنے لئے سپنوں کی ایک کٹیا بنا لی ہے"۔ اسی طرح ایک اور جگہ لکھتا ہے "جو لوگ خواب دیکھتے ہیں انہیں ابدیت کی جھلک نظر آتی ہے"۔ اس کے علاوہ اس کی نفسیات بھی ایک سچے خوابوں کے رسیا کی نفسیات سے مشابہت رکھتی ہے۔ وہ جو باتیں زندگی میں حاصل نہ کر سکتا تھا ان کے تصورات قائم کر لیتا تھا۔ زندگی میں وہ غریب تھا اس لئے کہانیوں میں وہ امیرانہ محلوں کا بیان کرتا ہے، زندگی میں اس کو اپنی محبوب عورتیں حاصل نہ ہو سکیں اس لئے کہانیوں میں وہ موت پر حیات بعد الممات کے نظریے سے فتح حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس کا یہ انہماک اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اسے حقیقت میں کوئی دلچسپی ہی نہ رہی تھی۔ اس کی کسی تحریر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کے زمانے میں امریکہ میں غلامی کے انسداد کا مسئلہ بھی تھا یا میکسیکو کی جنگ بھی ہوئی تھی۔

اور اب ہم اس تحریکِ ادبی کا ذکر کرتے ہیں جس کا بانی مبانی پو تھا لیکن جس کا اثر نہ صرف فرانس بلکہ یورپ کے تمام ممالک پر ہوا۔ لیکن اس سے پہلے حسن اور شاعری کے متعلق پو کے نظریات سے ذرا سی واقفیت حاصل کر لی جائے۔ شعر کے متعلق اگرچہ اس نے ایک سیر حاصل مقالہ "اصولِ شعری" کے عنوان سے لکھا ہے لیکن ذیل کا اقتباس اس کے اندازِ نظر پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔

بہت عرصے سے میرا یہ خیال ہے کہ "غیر معین" سچے شعر کا نمایاں جزو ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ "غیر معین" سچی موسیقی کا بھی جزو ہے ـــ میرا مطلب راگ کے سچے اظہار سے ہے۔ اگر موسیقی میں ہم کسی قسم کا تعین پیدا کر دیں، اس میں کسی قسم کے ارادی سُر ملا دیں تو یک قلم اس کی مصفا، آدرشی، بنیادی اور لازمی خصوصیت اور کیفیت جاتی رہے گی۔ اس میں جو خواب کی سی ایک لذت ہو گی وہ باقی نہ رہے گی جس روحانی فضا میں موسیقی تیر رہی ہوتی ہے وہ مٹ جائے گی۔ اس کی تاب پروانہ کا ہیدہ ہو جائے گی۔ اس کی بجائے وہ آسانی سے سمجھ میں آنے والی اور سرا ہے جلنے والی چیز بن جائے گی ـــ اس زمین کی ایک چیز"۔

گویا پو شعر میں کنایتی فضا اور دھندلکے کا حامی تھا۔ شعر کو وہ دو اور دو چار قسم کی کوئی چیز نہ سمجھتا تھا۔ ریاضی اور سائنس کے مسائل سے الگ انداز کا الگ مسئلہ جانتا تھا۔ اور حسن کے متعلق اسی مقالے کے

مندرجہ ذیل اقتباس اُس کے نقطۂ نظر کو ظاہر کرتے ہیں۔

"ہمارے تجربات ہمیں بتاتے ہیں کہ حسن کے بلند ترین مظاہرات میں ملال کا ایک لہجہ موجود ہوتا ہے۔ نشوونما کے انتہائی درجے پر پہنچ کر حسن خواہ کسی قسم کا ہو ایک حساس روح کو آنسو بہانے پر مجبور کرتا ہے، اور یوں ملال شاعرانہ لہجوں میں سب سے زیادہ مرتبہ رکھتا ہے"۔

"حسن کی ہر بلندی میں ملال کا یہ شائبہ ضرور نمایاں ہوتا ہے۔ اور جب راگ کے اثر سے ہماری آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں تو اس کا باعث شدتِ مسرت نہیں ہوتی، بلکہ ایک بے قابو کر دینے والا غم اس کی علتِ غائی ہے۔ جسے ہم فانی انسان عام طور پر اُس اچھوتی بہجت سے ہم آہنگ نہیں بنا سکتے جس کی ایک کنایتی اور غیر معیّن جھلک ہم کو راگ کی بدولت دکھائی دیتی ہے"۔

اگر ہم حسن کے لازمی خصائص کے تجزیے کا نتیجہ اوپر کے اقتباسات کی صورت میں معین کر لیں تو یہ کام نہایت آسان ہو جاتا ہے کہ کسی ایسے ایک موضوع کا تقرر کر لیا جائے جو بنیادی طور پر تمام ضروریات کی تسکین کر سکے۔

"— بلندی، رفعت یا تکمیل کو ایک پل بھی نظر سے اوجھل نہ رکھ کر میں نے اپنے آپ سے سوال کیا "انسانیت کی ہمہ گیر مفاہمت کے لحاظ سے ملال انگیز موضوعات میں سب سے زیادہ ملال انگیز موضوع کون سا ہے؟" — ظاہر ہے کہ اس کا جواب — موت تھا۔ اور پھر میں نے سوال کیا کہ کس صورت میں یہ سب سے زیادہ ملال انگیز موضوع شعریت کا حامل ہو گا! — جو کچھ میں اوپر وضاحت سے بیان کر چکا ہوں اُس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا جواب بھی ظاہر ہے "جب یہ موضوع حسن سے قریب ترین ہم آہنگی حاصل کر لے۔ چنانچہ دنیا میں ایک حسین عورت کی موت بغیر رد و قدح کے ایک ایسا موضوع ہے جس میں سب سے زیادہ شعریت ہے"۔

ظاہر ہے کہ حسن اور شعر کے متعلق پو کے مندرجہ بالا اندازِ نظر کی تخلیق اُس کے ذاتی حالات سے ہوئی لیکن یہ کوئی اعتراض نہیں۔ ہر شخص عالمگیر نظریوں تک بھی ذاتی تجربات اور تفکر ہی کے ذریعے سے پہنچتا ہے۔ ان نظریات کو ہم کمزور نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان کے اندرونی زور ہی نے یورپ کی ذہنی اور روحانی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کیا۔ جب سے پو کے کلیات کو چارلس باڈلیئر نے فرانسیسی زبان میں پیش کرنا شروع کیا تبھی سے فرانس اور پھر رفتہ رفتہ یورپ کے مختلف ممالک میں اُس تحریک کی ابتدا ہوئی جسے "اشاریت" کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن جس کا زیادہ مشہور نام "تحریکِ انحطاط" ہے۔ اگرچہ اس تحریک کے آثار اس سے پہلی ذہنی تحریک رومانی ہی میں موجود تھے (جس کا بانی مبانی مشہور مفکر روسو تھا) لیکن باڈلیئر کی پیش کش کے زمانے ہی سے اس کی واضح صورت لوگوں کے سامنے آئی۔ کیونکہ اب اس تحریک کو ایک گرو یا پیغمبر مل گیا تھا۔ (ایڈگر ایلن پو) اور اُس گرو یا پیغمبر کو ایک ایسا چیلا حاصل ہو گیا جو اُس کے نظریات کی نہ صرف خاطر خواہ تبلیغ کر سکتا تھا بلکہ خود بھی ایک پیامی ہی کی حیثیت رکھتا تھا انگریزی مصنف ایڈورڈ شانکس کے خیال میں مندرجہ بالا دونوں نام اس تحریک کے لئے موزوں نہیں ہیں لیکن وہ "تحریکِ انحطاط" کے نام کو زیادہ موزوں سمجھتا ہے، کیونکہ اس میں یاس کی ایک ایسی خاموش مدافعت کی جھلک ہے جو اس تحریک کی نمایاں خصوصیت تھی۔ اور دوسرے نام سے تو صرف ادبی طور پر ایک مسلک کی حمایت کا اظہار ہوتا ہے اور بس۔ یہ نام روحانی طور پر کلیتہً حاوی نہیں ہے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ پو کے اس نظریے کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو اُس نے شعر کی "غیر معین" خصوصیت کے متعلق پیش کیا تھا۔ خیر نام خواہ کچھ ہو ہمیں کام سے زیادہ تعلق ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نظریات جو تحریکِ انحطاط کے اجزا ہیں، کسی فرد سے ہٹ کر اجتماعی حیثیت اختیار کر چکے تھے، اور یہ زمانہ انیسویں صدی کے دوسرے پچاس سالوں کا ہے اور جب باڈلیئر نے پو کے کلیات کی پیشکش کے بعد اپنا مجموعۂ کلام شائع کیا تو یہ تحریک فرانس سے نکل کر یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی پھیلی۔

اس تحریک کی نمایاں خصوصیت وہ ردِ عمل تھا جو انیسویں صدی کے ماحول سے بعض افراد کے ذہنوں میں پیدا ہوا لیکن صنعتی لحاظ سے جو بغاوت اُس وقت پیدا ہو رہی تھی اُس کی مخالف ہونے کے لحاظ سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ تحریک بھی بغاوت کا ایک ایسا پتھر تھا جو پہلی بغاوت کے پتھر کا جواب دینے کے لئے اٹھایا گیا۔ یہ محض ایک اندازِ نظر تھا۔ اس کے حامی اُس نسل سے تعلق رکھتے تھے جس کی آنکھوں کو ایک ایسی ہی دنیا اپنے گرد و پیش دکھائی دے رہی تھی جو اُن کے آباؤ اجداد کی دنیا سے یکسر مختلف تھی۔ انقلابِ فرانس اور اس کے ساتھ ہی صنعتی انقلاب دو ایسے ردِ عمل تھے جن کے نتائج اب نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔

بادشاہوں کا زمانہ رخصت ہو رہا تھا اور جمہور کی فتح تحریک انحطاط والوں کو عمومیت کا ایک ایسا طوفان معلوم ہوتی تھی جو ہر قائم بات کو تہس نہس کردے گا اس لئے انہیں نئے حالات سے کوئی رغبت نہ تھی نیا صنعتی نظام اُس پہلے حُسن کو مٹا رہا تھا۔ کیونکہ عمومیت اور حُسن میں جو لبعد ہے وہ ظاہر ہے اور انحطاطی شعرا کو یہ بات پسند نہ تھی۔ وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ جمہور محض مادی زور کی بنا پر ایک ایسی چیز کا خاتمہ کردیں جس کی پرورش صدیوں میں ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی انہیں سائنس سے بھی نفرت تھی۔ کیونکہ یہی ایک ایسا علم تھا جو اُن کے مخالفوں کا سب سے زیادہ معاون تھا۔ پو نے خود سائنس کے متعلق ایک جگہ کہا ہے کہ گیت کی لازمی خصوصیات سے سائنس کو مطلق ہمدردی نہیں۔ اور "گیت" حُسن" سے ہے۔ چنانچہ پو کا انداز نظر "تحریک انحطاط" کے حامیوں کا مسلک بن گیا اور اس کے ساتھ اس کے سوانح حیات نے اس کی حیثیت ایک ایسے شہید کی سی بنا دی جس نے گویا ماحول سے ہم آہنگی نہ پیدا کی اور اپنے نظریات کے لئے رفتہ رفتہ گھُل کر جان دیدی۔ اُس نے ریل گاڑی کی دنیا کو ناپسند کیا اور ریل گاڑی کی دنیا نے اس ناپسندیدگی کا انتقام اُس کی ذات سے لیا۔ اور یوں وہ ایک شہید پیغمبر بن گیا۔ اور اس کے بعد بھی جن شعرا نے تحریک انحطاط کی حمایت کی عموماً ان کی زندگی ایک المناک افسانہ ہی بنتی رہی۔ اور وہ گویا اپنی تکلیف اور اپنے خون سے اس پودے کو سینچتے رہے اور یوں صنعتی انقلاب سے شاعری کو جس صدمے کا اندیشہ تھا وہ کسی حد تک دور ہو گیا کیونکہ تحریک انحطاط والے نہ صرف قدیم حسن کے قیام میں کامیاب ہوئے بلکہ اپنی قربانیوں سے ایک نئے حسن کی تخلیق کا ذریعہ بھی بنے۔

اور اب ایک دو نظمیں۔

مرے ہوؤں کی روحیں

تاریک خیالوں کا جھرمٹ بے رنگ لحد کے گوشے میں
تیری ہستی کو لپٹائے گا تنہائی کے بچھونے میں
ان لمحوں میں اس دنیا کا گستاخ ہجوم بے پایاں
جانے گا نہ کوئی بات تری تو ہوگا ہر ایک نظر سے نہاں

۲

وہ گنج عزلت ہوگا لیکن اس میں نہ ہوگی تنہائی
چپ چاپ ہی تکتے رہنا ہاں، ہونٹوں پہ ہو مہر خاموشی!
اُن لوگوں کی روحیں جاگیں گی اس دنیا میں سامنا تھا جن سے
کچھ سائے نظر آئیں گے تجھے ہلتے ہلتے سا در ساکن سے
پھر دیکھے گا تو ان کی رضا تیری ہستی پر چھائے گی
آواز رہے سینے میں نہاں، ہونٹوں پہ ہو مہر خاموشی!

۳

آکاش کا منڈل رات کو صاف تو ہوگا مگر غرّائے گا
اور انجم رخشاں میں بھی یہاں کا اُجالا نظر نہیں آئے گا
یہ اجالا جس میں آس دمکتی مورت بن کے جھلکتی ہے
یہ اجالا جس کی ہر اک کرن اونچے منڈل میں چمکتی ہے
وہ انجم رخشاں لہو کے دھبوں ایسا رنگ دکھائیں گے
وہ تھکن جو تجھ پر چھائی ہوگی اُس کو اور بڑھائیں گے
اور تیرے لہو کی گردش میں اک ایسی گرمی لائیں گے
جس کی سوزش سے خون کے ذرے انگارے بن جائیں گے

۴

سب اک پل میں مٹ جائیں گی یہ باتیں جو تیرے دل میں ہیں
وہ گھڑیاں پھر نہ دکھائیں گی نظارے جو اس محفل میں ہیں،
جیسے شبنم کے اڑنے پر شبنم کا نام گیاہ میں ہے
ان باتوں کا ہے حال یہی، ان کا حاصل اک آہ میں ہے۔

۵

وہ سامنے دور پہاڑی ہے اور اُس پر کہرا چھایا ہے
اور بہتی ہواؤں نے اپنے ہونٹوں پر قفل لگایا ہے
یہ کہرا دھندلا دھندلا ہے ذرّے ذرّے میں سمایا ہے
اَن مٹ ہے، لافانی، جیسے لوہے سے کسی نے بنایا ہے
یہ کہرا ایک اشارہ ہے پیڑوں کے سروں سے چھلکا ہے
بھیدوں کے بھید نہاں اس میں، یہ تو بھیدوں کا دھندلکا ہے

موت اور حیات بعد الممات کے موضوع جس طرح پو کی کہانیوں میں نمایاں نظر آتے ہیں اسی طرح اس کی نظم سے بھی اس کی یہ دلچسپی ظاہر ہے اور ذیل کی نظم عشقیہ ہے، لیکن اس عشق میں بھی اُس کے تصورات کا تاریک رنگ موجود ہے۔ یہ نظم اس کی کسی محبوبہ کے نام ہے بیوی کے نام نہیں

بعض نقادوں کے خیال میں اس کی مخاطب پوؔ کے بچپن کے دوست کی والدہ مسز سٹینارڈ ہے لیکن ایک نقاد اس نظم کو "میری" کے نام سمجھتا ہے کیونکہ بے وفائی کے بعد اس کا درجہ بھی پوؔ کی نظر میں ایک مری ہوئی عورت کا ہو چکا تھا۔

سورگ باشی سے

یہ تو ہی تھی جس کی خواہش کا جذبہ مرے دل کے اندر تھا
سرسبز جزیرہ سمندر میں، اک چشمہ تھا، اک مندر تھا
پھل پھول تھے پریوں کی بستی کے،
پھل پھول تھے سب میرے ہمکے!
سندر سپنا تھا ہٹ بھی چکا امید کا شعلہ راکھ بنا
"بڑھتا جا، آگے نکلتا جا، آگے ہی آگے چلتا جا"
آتی ہے یہی آواز مجھے
اب آنے والے زمانے سے
لیکن ماضی اب آنکھوں میں اک دھندلی نیلیج کی صورت ہے
رہتی ہے وہیں پر روح مری حیران ہے، چپ کی مورت ہے
آرام کی مے کا پیمانہ
ماضی ہی بنا ہے کاشانہ
لیکن افسوس کہ مجھ میں نہیں اب زیست کے وہ انوار حسیں،
وہ شمع بجھی، وہ نور مٹا اب کچھ بھی نہیں اب کچھ بھی نہیں
(ساحل کی ریت پہ آتی ہیں
لہریں یہ بات سجھاتی ہیں)
کیا سوکھا پیڑ ہرا ہوگا؟ گھائل پنچھی پر تولے گا؟
ناممکن - میں تو سمجھتا ہوں آئندہ دور بھی بولے گا:
"اے دکھیا دل" ماضی کے مکیں!
اب کچھ بھی نہیں اب کچھ بھی نہیں،

پو حقیقت پر خواب کو ترجیح دیتا تھا، ذیل کی نظم سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے:-

ایک خواب

شب کے تاریک تصور میں مجھے لاکھوں بار
خواب آئے ہیں مسرت کے جو اب دور ہوئی
خواب بیداری کے جب لائے مگر نور حیات
دل مرا ٹوٹ گیا —— روح مری چور ہوئی

اُس کو ہر چیز نظر آتی ہے دن میں اک خواب
جس کی آنکھیں ہوں لگی بیتے زمانے کی طرف
اُس کی آنکھوں سے نگاہوں کی کرن مائل ہے
حال کی باتوں کو ماضی میں چھپانے کی طرف

آہ! وہ خواب، وہ اک خواب مقدس میرا،
میں اُسے دیکھتا تھا، لوگ ہنسا کرتے تھے،
ہاں اُسی خواب نے اب تک مجھے خوش رکھا ہے۔
اُس کے ہی نور سے رستے بھی کٹا کرتے تھے۔

اس کی کیا فکر مجھے اب ہے جو طوفانی رات
اور وہ نور بہت دور سے آتا ہے نظر
پوچھتا ہوں میں کہ سچائی کے تاروں میں کبھی
ایسی تابانی کا دیکھا ہے کسی نے منظر؟

ذیل کی چھوٹی سی نظم کو بیداری کا ایک خواب سمجھنا چاہیئے کیونکہ یہ محض ایک چھوٹی تسلی کا حکم رکھتی ہے ورنہ پوؔ سے سچی ہمدردی سوائے اُس کی ساس کے اور کس کو تھی؟

کسی کے نام

غرض نہیں مجھے اس سے کہ خاک میں میری
نہیں ہے خاک کا ذرہ بھی اب کوئی موجود
نہ اس کی فکر ہے: نفرت کے ایک لمحے سے
ہزاروں سال محبت کے ہو گئے نابود

میں اس کا غم نہیں کھاتا کہ دہر میں جو لوگ
اکیلے رہتے ہیں مجھ سے زیادہ ہیں مسرور،

35

مجھے یہ سوچ ہے: میں تو فقط مسافر ہوں۔
مرے نصیب کی برگشتگی پہ تو رنجور؟

ذیل کی نظم کی تحریک پو کو غالباً اپنی بیوی ورجینیا کے مستقل اور مہلک مرض سے ہوئی ہے جب اُس کے بسترِ مرگ پر بیٹھے بیٹھے موت اور مصائب کے متعلق اس کے ذہن میں خیالات اور تصوّرات کا ایک طوفان جاگ اُٹھتا تھا۔

جیون کی ندی

دھیرے دھیرے — دھیرے دھیرے — جیون ندّی بہتی جا،
اے عنابی لہو کی بوندو! رُک جاؤ، اب رک بھی جاؤ۔
دیکھنے دو تم، دیکھنے دو تم مجھ کو یہ سندر سپنا
اُن لمحوں تک جن میں رُکے گا اِس بہتی دنیا کا بہاؤ۔

دیکھو — دیکھو — میری آنکھو! اُس کا درد اذیت، گھاؤ،
دیکھو کیسے ہر اک آنکھ کی پُتلی تیز چمکتی جائے۔
سُن لو، سُن لو ان چیخوں کو، یہ آواز کا پیارا گھلاؤ،
جن میں اُس کی ناامیدی دھندلی دھندلی دکھتی جائے۔

اُٹھو — اُٹھو — اے پاتال کی روحو اُٹھو، اُٹھ بھی جاؤ،
تیر کے ایسے آنکھ جھپکتے اُس کے دل میں ڈیرا جماؤ۔
ہیبت! — دہشت! — اپنی خون جماتی چیخوں کو لے آئے
جلدی آ کے آ کر اپنا نحوست والا جال بچھائے

ہاں! اے میرے دل کی لہرو! خوش ہو جاؤ، خوش ہو جاؤ،
اب بدلے کی مٹھاس کو چکھو، اس کے نشّے میں کھو جاؤ
اور ہاں، تم بھی میرے دل کی نفرت کو دیکھو چُپ چاپ
کیا ملعون تھا وہ لمحہ بھی جبکہ ہُوا تھا اپنا ملاپ

پو کی اذیت پرستی کو یہ نظم کافی سے زیادہ حد تک ظاہر کر رہی ہے اور ذیل کی نظم سے بھی پو کے خصائص طبعی ظاہر ہیں، موت، نغمے میں نوحہ، قبر کا کونا، جھیل خلوت گزینی، خوابوں کی پوجا — اور اسی سے ایک اور بات یاد آئی، شعر میں فنی لحاظ سے ایک مکمل ست [illegible] نظم کی [illegible] موسیقی، منظر کا استعمال، فضا کی ہیئت

ان سب باتوں کے لحاظ سے اس کا درجہ بلند تھا۔ اس مضمون کے ساتھ آپ جو ترجمے دیکھیں گے اُن میں سے اکثر میں ہندی کی وہ بحر استعمال کی گئی ہے جو فارسی میں نہ تھی لیکن اردو والوں نے ہندی سے لے کر اپنا لی۔ یہ ڈھیلی ڈھالی بحر (جس میں ضرورت کے وقت ایک تیزی بھی پیدا کی جا سکتی ہے) نہ صرف موسیقی کے لحاظ سے گیتوں کے لئے بہت موزوں ہے بلکہ خواب دیکھنے والی طبائع سے ایک فطری مناسبت رکھتی ہے چنانچہ میر تقی کی اکثر غزلوں میں (اور اچھی غزلوں میں خصوصاً) آپ اسی بحر کو پائیں گے۔ پو کے ترجموں میں بھی اس بحر کا زیادہ استعمال ہونا اُس کی خواب آلود ذہانت کی نسبت سے ہے۔

جھیل

جب آئی بہار جوانی کی،
(من موہن میٹھی کہانی کی)
اِس پھیلی پھیلی دنیا کا
اک کونا میں نے ڈھونڈ لیا،
اس کونے سے جو رغبت تھی
ویسی نہ کسی سے چاہت تھی،
ہر ذرّہ دل کو بھاتا تھا
اور آنکھوں کو گرماتا تھا،
اک جھیل تھی بن میں کھوئی ہوئی
اور گہری نیند میں سوئی ہوئی
اُس جھیل کے سونے کناروں کو
کچھ کالی چٹانوں نے گھیرا تھا
اور ساتھ صنوبر کے لمبے
اونچے پیڑوں کا ڈیرا تھا
لیکن جب رات آ جاتی تھی،
اور دنیا پر چھا جاتی تھی،
بے چین ہوائیں چلتی تھیں
اور اُن سے چیخیں نکلتی تھیں،
وہ گریہ تھا، وہ نغمہ تھا،
وہ نغمہ بھی اک نوحہ تھا،
میں اس نوحے کو سنتا تھا،
اور پہروں ہی سر دُھنتا تھا،
اُن روتے روتے نغموں میں
اُن چیخوں والے لمحوں میں
پل بھر جادو مٹ جاتا تھا
اور دھیان مجھے یہ آتا تھا:
یہ کیسی وحشت چھائی ہے،
تنہائی ہے، یہ تنہائی ہے!
احساس مگر ناگفتہ تھا،
ظاہر تھا پھر بھی نہفتہ تھا،
ہیروں کی کان سے ملے مجھ کو
یا سارا جہان سے ملے مجھ کو
میں جھیل کہانی کیسے کہوں؟
بہتر ہے یہی خاموش رہوں،
وہ سب لہریں تھیں زہر بھری،
ان لہروں میں تھی موت چھپی،
جو گہرائی میں پھوٹا تھا،
اک ایسی قبر کا کونہ تھا،
جس میں اس شخص کو راحت ہو
(اور ذہن رسا کو مسرت ہو)
جو بڑھ کے اس گہرائی کو،
اپنے دل کی تنہائی کو
اس کے ذرّوں میں سمو ڈالے
پہلے منظر کو دھو ڈالے
وہ دھندلی جھیل سنور جائے
اور باغ عدن کا نکھر آئے

مترجمہ — میراجی

کالکا کی ایک صبح

چٹکیاں لیتی ہے دل میں کالکا کی اک سحر
ہے تصوّر جس کا اب تک جنّتِ قلب و نظر

جا رہی تھی ریل زناتی سی، لہراتی ہوئی
ایک زخمی سانپ کی مانند بل کھاتی ہوئی

کہر آلودہ دھندلکوں کی ردا کو چیرتی
کوہساروں کے جگر، قلبِ فضا کو چیرتی

یخ ہوا کے تیز رو جھونکوں سے ٹکراتی ہوئی
پٹریوں پر اک خنک سی راگنی گاتی ہوئی

دھندلے دھندلے آسماں پر سرخیاں سی چھا گئیں
رات کی پریوں کے چہرے فق ہوئے شرما گئیں

چونک اُٹھے ذرات، ویرانے نے لیں انگڑائیاں
ضَوفشاں تھیں صبحِ زرافروز کی رعنائیاں

کوہساروں کے کنارے نور میں دھوئے گئے
شبستاں کے نظارے نور میں دھوئے گئے

چوٹیاں روشن، شجر جاگے، سویرا ہو گیا
صبح کے زانو پہ سر رکھ کر اندھیرا سو گیا

تھرتھراتی روشنی میں جھلملائیں وادیاں
جاگ اٹھیں خواب میں لپٹی ہوئی آبادیاں

میری نظریں چومتی تھیں ان مناظر کو ابھی
ناگہاں ہونکے ہوئے انجن کی منزل آگئی

جلوۂ رخشاں سے حیراں رہ گئی میری نظر
کالکا کے "ریل اسٹیشن" کا منظر دیکھ کر

یک بیک سب شبنم آلودہ دریچے کھل گئے
بام و در سارے ضیائے مہ وشاں سے دُھل گئے

پھوٹ نکلا ریل کے کمروں سے اک سیلابِ حُسن
ہر حسیں جس میں تھا گویا گوہرِ نایابِ حُسن

رات کے کپڑوں میں وہ سوئے ہوئے چہروں کے رنگ
کچھ کے بُشروں پر سمٹ آئی ہوئی دل کی اُمنگ

چاند سے چہروں پہ آوارہ لٹیں بکھری ہوئی
خاک پر گویا خراماں جنّتیں بکھری ہوئی

خواب آلودہ نگاہیں، خواب برساتی ہوئی
جسم میں انگڑائیاں سی پیچ و خم کھاتی ہوئی

بعض احساسِ جوانی کے نشے سے چُور چُور
لب پہ متوالی ہنسی، آنکھوں میں ہلکا سا سرور

گفتگو میں شہد، لوچ اعضا میں، آنکھوں میں خمار
چال میں رس، سانس میں گرمی، نگاہوں میں بہار

آنچلوں میں جگمگاتی یاسمیں باہوں کا نور
سادگی میں بھی نمایاں اک نشیلا بانکپن
سیمتن پریاں نکل آئیں تھیں فرشِ خاک سے
بعض ابھی ناآشنائے کیفِ صہبائے شباب
خندہ زن پیشانیوں پر صبح کے تاروں کا نور
پھول سے چہرے، تھکن سے چور سنولائے ہوئے
ہر نظر بہکے ہوئے منظر کو بہکاتی ہوئی
ہر طرف اٹھلا رہا تھا کاروانِ حسن و رنگ

احمریں آنکھوں کی مستی، مرمریں باہوں کا نور
کھوئی کھوئی سی ادائیں، سوئے سوئے سے بدن
یا جواں حوریں اتر آئیں دلِ افلاک سے
تھی رگ و پے میں رواں لیکن تمنائے شباب
اک ردائے بے نیازی، اک غرورِ بے شعور
گردنوں میں سر سے دوپٹے ڈھلک آئے ہوئے
ہر ادا رگ رگ میں انگارے سے دوڑاتی ہوئی
ٹوٹ آیا تھا زمیں پر آسمانِ حسن و رنگ

اک خلش سی دل کی بستی میں ابھی آباد ہے
کالکا کی وہ سنہری صبح اب تک یاد ہے

سید ضمیر جعفری بی اے

دو رباعیاں

(۱)

طوفانِ بلا کا ساتھ دیتے دیتے
گھٹنے لگا ہے سانس لیتے لیتے
دم [illegible] ہیں
کشتیِ حیات ڈوب بھی جائے کھیتے
بازو مرے تھک گئے ہیں کھیتے کھیتے

(۲)

[illegible] گفتہ کچھ بنانا ہی پڑا
اشکوں کو ... سے درد کو دبانا ہی پڑا
سمجھا تھا کہ مرے ساتھ روئیں گے دوست
لیکن وہ ہنسے تو مسکرانا ہی پڑا

پرویز شاہدی

پیارے چاند

دل پہ مرے بھی نور کی ہلکی ہلکی بارش کردے چاند
ظلمت کے اس کاشانے میں ایک اجالا ابھر دے چاند
نور کا تو اک منبع ہے اور میرا کلبہ تیرہ و تار
یاس کے بادل جس کے اندر پیہم چھائے رہتے ہیں
ظلمت کے اس کاشانے میں ایک اُجالا ابھر دے چاند
دل پر میرے بھی نور کی ہلکی ہلکی بارش کردے چاند!
مایوسی کا جادو سارا، تاریکی کا سارا پردہ
پھاڑ دے اس کو، توڑ دے اُس کو میرے پیارے پیارے چاند

پھوٹ پھوٹ کر تیری کرنیں چپکے سے آجاتی ہیں،
ساری زمیں پر سارے جہاں پر نرمی سے چھا جاتی ہیں،
نور کا پردہ ہے آویزاں، ساری فضا میں سیمیں پُھبیاں
خواب کی دیوی چاندنی بن کر گویا فلک سے اُتری ہے
جس کی لپٹ میں ہر اک شے کو حاصل ہے اک کیف و سرور
سب دنیا ہے نور کا مخزن، میرا کلبہ تیرہ و تار
ظلمت کے اس کاشانے میں ایک اُجالا ابھر دے چاند!

ہر اک شے کو حاصل ہے اک کیفِ سکونِ روح و قلب
ہر اک شے ہے راحت میں آرام نصیب اور محوِ خواب
اس پھیلے سیمابِ رواں میں خارِ بیاباں، باغ کے پھول،
حل ہو جانے کے شوق میں جیسے جگ کو بھول کے سوئے ہیں
ایسا سماں ہے پھر بھی میرا دل بے چین ہے اور بیتاب
دل پہ مرے بھی نور کی ہلکی ہلکی بارش کردے چاند
ایسے سمے میں سوئے سوئے چاندنی میں گم ہو جاؤں میں
دھرتی چھوڑ آکاش پہ پہنچوں جگ والوں سے کھو جاؤں میں
ایسے سمے میں مر جانا بھی ایک نیا جینا ہے چاند
درد کی دھول کو دھو کر نور کے امرت کو پینا ہے چاند

دھیان رہے یوں اڑتی اڑتی روح کوئی جب تجھ سے ملے
روح مری ہوگی، تو بھی بازو پھیلا کر مجھ سے ملے
تیرے ان کالے داغوں میں اور سہی اک کالا داغ!

اچھی کتابیں زندگی کو اچھا بناتی ہیں

لیکن ہر شخص کو اچھی اور بُری کتابوں میں تمیز کا موقعہ حاصل نہیں خصوصاً آج کل کے تیز رفتار زمانے میں جب کہ ہر بری چیز اپنا ظاہری دلکش لباس پہنے نگاہوں کو دھوکا دینے کے لئے ہر طرف موجود رہتی ہے۔ اس دھوکے سے بچنے کے لئے سکون اور وقت کی ضرورت ہے ان وجوہات کے مدنظر کتب خانہ ادبی دنیا لاہور نے فیصلہ کیا ہے کہ ادبی دنیا کے پڑھنے والوں اور عام پبلک کے لئے وقتاً فوقتاً چنی ہوئی کتابوں کی مختلف فہرستیں شائع کی جائیں اس انتخاب اور معیار کی ضمانت صلاح الدین احمد اور میراجی مدیرانِ ادبی دنیا کا نام ہے انہوں نے نہایت محنت اور وقت صرف کرنے کے بعد یہ انتخاب کیا ہے اور جو بلند نظری اور معیار کی خوبی ادبی دنیا کے مضامین میں دکھائی دیتی ہے۔ اسی کا لحاظ ان فہرستوں میں بھی رکھا ہے۔ ناظرین کی آسانی کے لئے یہ تمام کتابیں کتب خانہ ادبی دنیا میں فراہم کر لی گئی ہیں تاکہ ایک ہی جگہ سے بغیر کسی دقت کے آپ کو یہ چنی ہوئی کتابیں مل سکیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہر ماہ ناظرین ان فہرستوں کا مطالعہ کر کے ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔

نام کتاب و مصنف	قیمت	نام کتاب و مصنف	قیمت	نام کتاب و مصنف	قیمت
افسانے		پس پردہ — چندر بھوشن سنگھ	۱۲ر	نقوش ۸ر مینا — حکیم احمد شجاع	۸ر
فردوس خیال — منشی پریم چند	عہ/۸	ساز فطرت — حسن عزیز جاوید	عہ/۸	ہملٹ — مترجمہ عنایت اللہ دہلوی	عہ
پریم بتیسی حصہ اول و دوم — ″	سے/۱۲	محبت اور نفرت — اختر حسین رائے پوری	عہ/۱۲	فاؤسٹ — گوئٹے	عہ
نظارے — کرشن چندر	عسہ	ہیبت ناک افسانے — امتیاز علی تاج	عہ/۸	چند ٹوپیاں — نور الٰہی محمد عمر	۸ر
منٹو کے افسانے — سعادت حسن منٹو	عہ/۴	**مضامین**		چند ڈرامے — ″	۸ر
سحر فرانس — طاہر قریشی	عہ	پطرس کے مضامین — احمد شاہ بخاری	عہ/۸	**منظومات**	
دانہ و دام — راجندر سنگھ بیدی	عہ/۸	حاجی لق لق کے افسانے — حاجی لق لق	۱۱ر	بانگِ درا — اقبال	عا/۸
باسی پھول — سید علی عباس حسینی	عہ/۱۲	مطائبات — سندباد جہازی	عہ	نقش و نگار — جوش ملیح آبادی	عہ/۱۲
شعلے — پروفیسر احمد علی ایم اے	عہ	جدید جغرافیہ پنجاب — ″	عہ	فکر و نشاط — ″	عہ/۱۲
سوز ناتمام — عاشق حسین بٹالوی	عہ/۱۲	دنیائے تبسم — شوکت تھانوی	عہ/۱۲	بہارستان — مولانا ظفر علی خاں	للعہ
چغتائی کے افسانے — مرزا عظیم بیگ چغتائی	سے	مضامین فلک پیما — فلک پیما	۶	سوز و ساز — حفیظ جالندھری	۶
صنوبر کے سائے — حجاب امتیاز علی	عسہ	روح لطافت — مرزا عظیم بیگ چغتائی	عہ/۱۲	نغمہ زار — ″	عہ/۱۲
میری ناتمام محبت — ″	عہ/۴	روح ظرافت — ″	عہ/۴	چراغاں — احسان دانش	۶
طلسم خیال — کرشن چند	عہ/۱۲	کولتار — ″	عہ/۱۲	آتش خاموش — ″	عا/۴
اندھی دنیا — اختر انصاری	عہ	**ڈرامے**		نغمۂ حرم — اختر شیرانی	عہ/۱۲
ڈاچی — اپندر ناتھ اشک	عہ/۴	انارکلی — امتیاز علی تاج [illegible]	عہ	نقش دوام — عبدالحمید عدم	۶

ملنے کا پتہ:- کتب خانہ ادبی دنیا، دی مال، لاہور

برہمچاری

چینج ترنی کی وہ رات مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ نہ پہلے کسی پڑاؤ پر سورج کماری نے اتنا سنگار کیا تھا۔ نہ پہلے وہ گیس کا لیمپ جلایا گیا تھا۔ اس روشنی میں سورج کماری کا عروسی لباس کتنا چمک اٹھا تھا۔

دونوں گھوڑے والوں کو خاص طور پر بلایا گیا تھا ایک کا نام تھا عزیزا اور دوسرے کا رسیح۔ جے چند کا کشمیری کلرک جیالال بہت مسرور نظر آتا تھا۔ خود جے چند بھی دولھا بنا بیٹھا تھا۔ رسو ئیے کو نہ جانے اس محفل میں کچھ کشش کیوں نہ محسوس ہوئی۔ کام سے فارغ ہوا تو وہ یاترا کا بازار دیکھنے چلا گیا۔

پریم ناتھ سے بغیر کچھ کہے سنے ہی جب میں سری نگر سے پیدل پہلگام کی طرف چل پڑا تھا تب کسے خبر تھی کہ اتنے اچھے خیمے میں جگہ مل جائے گی سورج کماری نے بات پہچان لی تھی۔ اُس نے جے چند کو بتا دیا کہ میں گھر والوں کی رضامندی کے بغیر ہی ادھر چلا آیا ہوں۔ اس طرح اُس نے میرے لئے اپنے خاوند کے دل میں ہمدردی کے جذبے کو اور بھی اُبھار دیا۔

جیالال نے عزیزا سے وہ گیت گانے کا مطالبہ کیا، جس میں ایک کنواری کہتی ہے۔ "بید مشک کی خوشبو میرے من میں بس گئی ہے۔ باورے بھونرے! تو کہاں جا سویا ہے؟" اُسے یہ گیت یاد نہ تھا۔ اُس نے سوچا ہو گا کہ وہ لڑکی جس کے من میں بید مشک کی خوشبو بس گئی تھی، سورج کماری سے کہیں بڑھ کر حسین ہو گی۔ یہ اور بات ہے کہ کشمیر کی بیٹی کو اکثر خوبصورت لباس نصیب نہیں ہوتا!

خود سورج کماری نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ مجھے اُس کا وہ روپ یاد آ رہا تھا، جب وہ ہرا دوپٹہ اوڑھے گھوڑے پر سوار تھی اور چندن واڑی پار کر کے برف کے اُس پل پر اُتر پڑی تھی جس کے نیچے سے شیش ناگ بہہ رہا تھا۔ اس وقت وہ جنگل کی اپسرا معلوم ہوتی تھی۔ راستے میں جنگلی پھول چن کر چلتے چلتے جیالال نے ایک گجرا تیار کر لیا تھا۔ اور وہ مسکراہٹ مجھے کبھی نہ بھولے گی جو جیالال سے یہ گجرا لیتے ہوئے سورج کماری کی آنکھوں میں رقص کرنے لگی تھی۔

میں نے کہا "گیت تیار کرنا کچھ مشکل تھوڑا ہی ہے۔ بول بنسری میں سے گذار دیں، گیت بن جائے گا۔"

سورج کماری بولی "میرے پاس تو ایسے بول بھی نہیں رہ گئے۔ ہاں بنسری میں نے سنبھال کر رکھ چھوڑی ہے۔۔۔۔ میرے بھی دل میں کبھی گیتوں کی دُھن سمائی تھی۔

میں خاموش ہو گیا۔ لیکن اپنے ذہن میں اُس سے مخاطب ہوا ــــ گھبراؤ نہیں، متوالی دُلہن! تمہارے بول تو بہت سریلے ہیں۔۔۔۔ وہ ضرور کسی روز پھر بنسری میں سے گزریں گے۔۔۔۔ اور اپنے گیتوں کے رس میں ڈوب کر تو مجھے بھول جائے گی۔۔۔۔

عزیزا نے لوچدار آواز میں گانا شروع کیا۔

"لج پھلے اندونن
چج کنن گوئے نامے اون!
لج پھلے کول سرن
ود تھونیرن کھس دو۔
پھولی یوسمن اندونن
چج کنن گوئے نامے اون؟"

دور جنگلوں میں پھول کھل گئے۔ کیا میری بات تیرے کانوں تک نہیں پہنچی؟ کول سر جیسی جھیلوں میں پھول کھل گئے۔ اُٹھو ہم چراگاہوں کی طرف چڑھیں گے۔ دور جنگلوں میں ینبیل کے پھول کھل گئے۔ کیا میری بات تیرے کانوں تک نہیں پہنچی؟

جے چند کشمیری خوب سمجھتا تھا۔ کشمیر میں ٹھیکیداری کرتے اُسے کئی سال ہو گئے تھے۔ سورج کماری نے کیوں اس زبان میں دلچسپی نہ لی تھی،

اس بات پر سب سے زیادہ حیرت مجھے اسی رات ہوئی۔ جے چند بولا "یہ کسی کنواری کا گیت ہے۔ اس نے دیکھا کہ بہار آگئی جنبیلی کے پھول بھی کھل گئے۔ اور پھر شاید غیر شعوری طور پر اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ خود بھی جنبیلی کا ایک پھول ہے۔"

گیت کا ایک ہی ریلا عزیزا کو مجھ سے قریب کھینچ لایا۔ سارے راستے میں میں نے کبھی اسے اتنا خوش نہ دیکھا تھا۔ آدمی کتنا چھپا رہتا ہے۔ اسے جاننے کی میں نے اب تک کوشش بھی تو نہ کی تھی۔

روز روز کے لمبے سفر سے ہم بہت تھک گئے تھے۔ اب اس شغل میں سب تکان بھول گئی۔ سورج کماری کا سندیسہ سامنے نہ ہوتا تو عزیزا کو بہار کا گیت کیسے یاد آتا۔

سورج کماری کہہ رہی تھی "بابو جی! میں نے سنا ہے کہ اس وادی میں بہنے والی پانچوں ندیوں کا پانی، جو اتنا قریب قریب بہتا ہے، ایک دوسری سے کم و بیش ٹھنڈا ہے۔"

جے چند بولا۔ "شاید یہ ٹھیک ہو۔"

میں سوچنے لگا کہ سب مرد بھی تو ایک سی طبیعت کے مالک نہیں ہوتے ...... عورتیں بھی طبیعت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتیں .....

واہ ری قدرت، پنج ترنی کی پانچوں ندیوں کا پانی بھی یکساں ٹھنڈا نہیں!

"پاربتی ان ندیوں میں باری باری سے نہایا کرتی تھی، بابو جی!"

"تم سے کس نے کہا؟"

"جیالال نے۔"

جیالال چونک پڑا۔ سورج کماری نے عشرت انگیز ہنسی ہنس کر جے چند کی طرف دیکھا جیسے وہ بھی خود ایک پاربتی ہو اور اپنے شِو کو رجھانے کا جتن کر رہی ہو۔

میں نے عزیزا سے کوئی دوسرا گیت گانے کا مطالبہ کیا۔ وہ گا رہا تھا۔

"دنی و متی آردلن یار کنی ہے لکھنا؟
چھوہ لوگم مس دلن یار کنی مے لکھنا؟
و متی سیندز شیلن یار کنی مے لکھنا؟"

"آرو کے پھولوں میں تمہیں تلاش کروں گی۔ کہیں تم ملو گے نہیں (میرے) محبوب؟ میرے بال بال کو خود سے نفرت ہو گئی ہے کہیں تم ملو گے نہیں (میرے) محبوب؟ سندھ نالے کے پانی میں تمہیں تلاش کروں گی۔ کہیں تم ملو گے نہیں (میرے) محبوب!"

رفیع اس درخت کی طرح تھا، جسے جھنجوڑنے سے اونچی ٹہنی پر لگا ہوا پھل نیچے نہیں گرتا۔ اس نے ایک بھی گیت نہ سنایا لیکن جیالال تو بس چھل ہی پڑا اور بغیر رسمی تقاضے کے اس نے گانا شروع کیا۔

"چوری یار چولم تائے، تہی ماڈے اُٹھ ودن؟
. . تہی ماڈے اُٹھ ودن؟
وورن مارن گرائے لولو گرائے لولو
دوتھی وی دگ نیاؤر و وہائے کردنے!
سنگر مالن چھائے لولو، چھائے لولو!"

"میرا محبوب چوری چوری بھاگ گیا۔ کیا تم نے اسے دیکھا ہے کہیں، دیکھا ہے کہیں؟ ـــ کان کے سبزے ہلاتے ہوئے، ہلاتے ہوئے! اُٹھو، پریو! ہم "رؤ" ناچ ناچیں گے، پہاڑیوں کی چھاؤں میں، چھاؤں میں!"

جیالال مسکرا رہا تھا۔ سورج کماری کی طرف للچائی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگا رہ رہا۔ وہ اس کی زبان نہ سمجھتی تھی، داد نہ دے سکتی تھی لیکن اسے مسکراتا دیکھ کر وہ بھی مسکرانے لگی۔

سورج کماری کی مسکراہٹ میں کتنی موہنی تھی۔ وہ کالی داس کی کسی حسن و عشق کی نظم کی طرح تھی جس میں لفظوں کے ایک سے زیادہ معنی نکل آتے ہیں۔ چنانچہ مجھے یوں محسوس ہوا گویا اس کی مسکراہٹ جے چند اور جیالال کے نہیں بلکہ میرے لئے ہے۔

مگر میں اس مایا جال میں پھنسنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اپنشد کی پرانی کہانی کچھ دیویانی میری آنکھوں کے آگے پھر گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ایک کچھ ہوں اور اسی اثر کے ماتحت سورج کماری دیویانی کے روپ میں دکھائی دینے لگی۔

کچھ سورگ کا رہنے والا تھا اور وہ دھرتی پر ایک رشی کے آشرم میں زندۂ جاوید رہنے کی ودیا سیکھنے آیا تھا اور میں نے یاترا کے دن کاٹنے کے لئے جے چند کے خیمے میں پناہ لی تھی۔

سورگ سے چلتے وقت کچھ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ یہ ودیا سیکھ کے سورگ ہی کو لوٹ آئے گا۔ اور وہاں کے باسیوں کو اس کا فیض پہنچائے گا اس کے لئے سب سے ضروری یہی تھا کہ وہ برہمچاری کے دھرم پر برقرار رہے رشی آسانی سے وہ ودیا کسی کو سکھاتا نہ تھا۔ کتنے ہی نوجوان کچھ سے پہلے بھی

آ چکے تھے۔ ہر کوئی رشی کے غصے کی تاب نہ لاکر وہیں ختم ہو گیا۔ مگر جب کچ آیا تو رشی کی لڑکی دیویانی اُس پر فریفتہ ہو گئی۔ اپنے باپ سے فرمائش کرکے اُس نے اسے یہ ودیا سکھانے پر رضامند کر لیا۔

جب کچ یہ ودیا سیکھ چکا تو واپس جانے کے لئے تیار ہوا۔ دیویانی کہنے لگی۔ "دیکھو، اس وینومتی ندی کو نہ بھولنا۔ اس کا بہاؤ پریم کے بہاؤ ایسا ہے۔"

کچ نے جواب دیا "اسے میں کبھی نہ بھولوں گا..... اسی کے قریب اُس دن، جب میں یہاں پہنچا تھا، میں نے تجھے پھول چُنتے دیکھا تھا..... اور میں نے کہا تھا۔ میرے لائق کوئی سیوا ہو تو کہو۔"

دیویانی بولی "ہاں اسی طرح ہمارا پیار شروع ہوا تھا..... اب تم میرے ہو..... عورت کے دل کی قیمت پہچانو..... پیار؟ کسی ودیا سے سستا نہیں..... اور اب تمام دیوتا اور اُن کا بھگوان اپنی ساری طاقت سے بھی تمہیں واپس نہیں لے سکیں گے..... مجھے پھول پیش کرنے کے خیال سے بیسیوں بار تم نے کتاب پرے پھینک دی تھی..... ان گنت بار تم نے مجھے وہ گیت سنائے تھے جو سورگ میں گائے جاتے ہیں..... تم نے یہ چال صرف اسی لئے تو نہیں چلی تھی کہ یوں مجھے خوش رکھ سکو اور آسانی سے وہ ودیا سیکھ لو جسے میرے پتا جی نے پہلے کسی کو سکھانا منظور نہیں کیا تھا.....؟"

کچ بولا۔ "مجھے معاف کر دے، دیویانی!..... سورگ میں تو مجھے جانا ہی ہوگا..... اس کے علاوہ میں تو برہمچاری ہوں!"

"برہمچاری!..... ایک راہی کی طرح تو یہاں آ نکلا تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ چھاؤں دیکھ کر آن بیٹھا اور پھول چُن کر تو نے میرے لئے ہار بنایا..... اب اپنے ہاتھوں سے تو ہار کا تاگا توڑ رہا ہے..... دیکھ، پھول گرے جا رہے ہیں.....!"

"پھول گرے جا رہے ہیں، لیکن میں بے بس ہوں، سورگ میں سب میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ مجھے وہاں جانا ہی پڑے گا — اور یہ بات تو تم سے چھپی نہیں کہ مجھے اب سورگ میں سکھ چین نصیب نہ ہوگا۔"

میں نے سوچا کہ ایک لحاظ سے میں کچ سے کہیں زیادہ مدلل وجہ پیش کر سکتا ہوں۔ میں کہہ سکتا ہوں۔ "سورج کماری! تیری مسکراہٹ تیرے خاوند کے لئے ہونی چاہئے۔ دیویانی کی طرح تو کسی رشی کی کنواری لڑکی تھوڑی ہے۔"

سورج کماری انگڑائی لے رہی تھی۔ اُس کے بالوں کی ایک لٹ بائیں گال پر سرک آئی تھی۔ میری طرف مخاطب ہو کر بولی۔ "بس یا ابھی اور؟"

میں نے اُس کا پورا مطلب سمجھے بغیر ہی کہہ دیا۔ "بس۔ اور نہیں۔"

"اور نہیں..... خوب رہی۔ میں تو اِدھر کی زبان سمجھتی نہیں۔ تمہاری خاطر بابو جی نے عزیزا کو یہاں بلایا۔ اب ایک دو گیت سُن کر ہی تمہاری بھوک مٹ گئی؟ اور وہ جو گیت گیت کی رٹ لگا رکھی تھی پہلگام میں؟....."

میں نے کہا "نہیں بی بی جی! میں نے سوچا آپ کو نیند آ رہی ہے، اور شاید عزیزا بھی سونا چاہتا ہے۔"

عزیزا کچھ نہ بولا۔ جے چند نے محفل برخاست کر دی۔ عزیزا اور رفیع چلے گئے اور رسوئیا، جے چند اور سورج کماری کے بستر لگا کر ہمارے پاس آ بیٹھا۔

سورج کماری پوچھ رہی تھی۔ "بابو جی! سنا ہے گپھا میں کبوتروں کا جوڑا ابھی درشن دیتا ہے۔"

"صبح کو تم خود دیکھ لو گی۔"

"کبوتر کہاں سے آتے ہیں؟"

"اب یہ میں کیا جانوں؟"

"ایک سنیاسن نے بتایا تھا کہ یہ کبوتر شو اور پاربتی کے روپ ہیں۔"

"شاید عورتوں کا دیدیہی کہتا ہو۔"

رسوئیا سو چکا تھا۔ جے چند اور سورج کماری بھی سو گئے۔ جیالال بولا "اُف! کتنی سردی ہے!"

"کتنی سردی ہے! برہمچاری ہو کر بھی یہ سردی نہیں سہہ سکتے۔ شرم کا مقام ہے۔"

"برہمچاری تو میں ٹھہرا۔ مگر اس آب و ہوا کا عادی نہیں ہوں۔"

"برہمچاری کو تو کسی موسم سے بھی نہیں ڈرنا چاہئے۔"

"تم بھی تو برہمچاری ہو۔" اُس نے طعن سے کہا۔

"تو میں کب ڈرتا ہوں؟"

"تو کیا تم خیمے کے باہر کھلے آسمان کے نیچے سو سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔"

یہ بات میں نے جوش میں آ کر کہہ دی تھی۔ میں نے اپنی موٹی کشمیری لوئی اٹھائی اور خیمے کے باہر نکل گیا۔ جیالال میرے پیچھے بھاگا، میں رُک کر کھڑا ہو گیا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔

وہ بولا "میں نے تو ہنسی میں کہہ دیا تھا اور تم سچ مان گئے۔"

"سچ ہو یا جھوٹ۔ میں دکھا دوں گا کہ برہمچاری ڈرتا نہیں۔"

"اچھا تو خیمے کے قریب ہی لیٹ جاؤ۔"

میں خیمے کے قریب ہی لوئی میں لپٹ کر لیٹ گیا۔ وہ اندر سے چٹائی نکال لایا اور بولا اسے نیچے ڈال لو۔ ایسی تو کوئی شرط نہ تھی کہ ننگی دھرتی پر سو کر دکھاؤ گے۔

چٹائی ڈال کر وہ میرے پاؤں کی طرف بیٹھ گیا۔ بولا "ارے یار! مفت میں کیوں جان گنواتے ہو؟"

"اونہہ" میں نے شانے پھڑکاتے ہوئے کہا۔ "مجھے کسی بات کا خطرہ نہیں۔"

"اچھا تو میں ٹھیکیدار صاحب کو جگاتا ہوں۔" جیالال بولا۔

پھر جیالال اُس مسلمان چرواہے کی کہانی مجھے سنانے لگا جس نے ایک بڑا کام کیا تھا۔ یاتری امرناتھ کا راستہ بھول گئے تھے۔ اس نے ڈھونڈھ نکالا تھا۔ اور اُس کے عوض میں اب تک اُس کی اولاد کو چڑھاوے کا ایک معقول حصہ ملتا آرہا ہے۔

میں نے سنز ارتاً کہا "وہ چرواہا ضرور اُس وقت برہمچاری ہوگا۔"

وہ ہنس پڑا اور اندر جا کر لیٹ رہا۔ میں چاند اور تاروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پرانے زمانے میں بڑے بڑے رشی ادھر آتے تھے تو خیموں میں تھوڑا ہی رہتے تھے۔ یوں کھلے آسمان تلے پڑ رہتے ہوں گے۔ اِس کڑاکے کی سردی سے وہ ڈرتے نہ تھے۔

کچھ دیر کے بعد تارے میری نگاہ میں کانپنے لگے۔ چاند دھند میں لپٹ گیا۔ خواب آلود پلکوں نے آنکھوں کو سی دیا۔ اور .....

میں نے دیکھا کہ جیالال گھوڑے پر سوار سورج کماری کو گمراہ پیش کر رہا ہے۔ اور وہ پشاور کی ہرے دوپٹے والی جوان عورت عجب انداز سے مسکرا رہی ہے۔ میں نے جیالال کو متنبہ کرتے ہوئے کہا۔ "جیالال! تمہارا نصب العین عورت سے کہیں بلند ہے ..... عورت ایک سراب ہے — مایا!"

جیالال ایک طنز آمیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھنے لگا اور بولا "لیکن یہ مایا کس قدر حسین ہے۔ مجھے تو اس سراب کے پیچھے ہی سرگرداں رہنے دو۔"

عزیزا بید مشک کی ٹہنی لئے آرہا تھا۔ میں نے معاً اُس سے سوال کیا۔ "یہ کس کے لئے لائے ہو، عزیزا؟"

"اُس بہار کی دلہن کے لئے جو خیمے میں اس وقت مستِ خواب ہے۔" عزیزا نے نیم مدہوش آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اُس وقت مجھے کسی سورج کماری کی آواز سنائی دی۔ جیسے وہ گا رہی ہو — "بید مشک کی خوشبو بہک کر من میں بس گئی ہے ...... دور جنگلوں میں جنبیلی کے پھول کھل گئے۔ کیا میری آواز تمہارے کانوں تک نہیں پہنچی میرے محبوب؟"

اور جیسے کوئی جے چند کہہ رہا ہو۔ "تمہاری آواز میں نے سُن لی۔ اُٹھو! ہم چراگاہوں کی طرف چڑھیں گے۔"

پھر وہ سورج کماری تتلیوں کے پیچھے بھاگی۔ جے چند بھی اُس کے ساتھ ساتھ رہا۔ سورج کماری کو دیکھ کر مجھے اُس چینی کنواری کا خیال آیا۔ جسے تتلیوں نے پھول سمجھ لیا تھا اور ٹولیاں بنا کر اس کے گرد جمع ہو گئی تھیں۔ ..... مگر یہ تتلیاں تو سورج کماری سے بھاگ رہی تھیں اور ان کا پیچھا کرتے ہوئے اُس کا سانس چڑھ رہا تھا۔ جے چند کو دیکھ کر مجھے چینی تاریخ کے اس بادشاہ کی یاد آئی جس نے پنجروں میں سینکڑوں تتلیاں پال رکھی تھیں۔ جب اُس کے باغ میں خوبصورت لڑکیاں جمع ہوتیں تو وہ حکم دیتا کہ پنجروں کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ تتلیاں سب سے حسین لڑکی کے گرد گھومنے لگتیں اور اس طرح یہ لڑکی بادشاہ کی نگاہوں میں بھی جچ جاتی ...... کیا اس جے چند نے بھی تتلیوں کی مدد سے اس سورج کماری کو چنا تھا؟ مگر یہ تتلیاں تو نہ سورج کماری کی پروا کرتی ہیں نہ جے چند کی .....

دوڑتی دوڑتی وہ سورج کماری ایک چرواہے کے پاس جا پہنچی۔ بولی "بنسری پھر بجا لینا۔ پہلے میرے لئے تتلی پکڑ دو — وہ سندر تتلی جو ابھی ابھی سامنے پھول پر جا بیٹھی ہے۔" شاید تتلی کی بجائے وہ اُس نوجوان چرواہے ہی کو گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ اور پھر جب اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اُسے جے چند نظر آیا۔ وہ بدستور گا رہی تھی — "کہیں تم ملو گے نہیں، میرے محبوب؟ اور دل کے پھولوں میں تمہاری تلاش کروں گی۔"

کہیں سے کوئی جیالال آ نکلا۔ بولا "تو نرگس ہے — خمار سے بھرپور۔ شرم سے تو گردن جھکائے ہوئے ہے۔" اور وہ سورج کماری بولی۔ "بادہ سے بھونرے! میں تیرے انتظار میں تھی۔"

جے چند کو آتا دیکھ کر جیالال بھاگ گیا ورنہ وہ بُری طرح پٹتا۔ جے چند بے تحاشا گالیاں دینے لگا۔ سورج کماری سر جھکائے کھڑی تھی۔ پاؤں کے انگوٹھے سے وہ زمین کریدتی رہی۔

میں نے تہیہ کر لیا کہ اب اور یہ کھیل نہیں دیکھوں گا اپنی لوئی میں سمٹ کر لیٹ گیا۔ سورج کماری کا خیال تک میرے دل میں نہ آئے یہی میری کوشش تھی

مگر سورج کماری تھی کہ سامنے سے ہٹتی ہی نہ تھی۔ میرے پاس آ بیٹھی اور پر معنی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اسے اپنے بالکل قریب پاکر میں بہت گھبرایا۔ اور میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ "عورت ـــ عورت مایا ہے۔ اور میں ایک برہمچاری ہوں۔"

اُس نے میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "نا بابا! مجھے پاپ لگے گا۔"

"اور تمہیں مجھے بھی؟"

"ہاں۔"

"پیار تو پاپ نہیں۔"

میں چپ رہا۔ وہ بولی۔ "اب یاد آیا۔ جیالال سے گھبرا کر میں نے اُسے تھوڑی سی مسکراہٹ دے دی تھی۔ اُس دن سے تم کچھ تنے تنے سے رہتے ہو..... تمہارے ہاتھ کیسے شل ہو رہے ہیں۔ جانتے ہو؟"

"ہو جانے دو۔"

"پاؤں نیلے ہو رہے ہیں۔"

"ہونے دو۔ تم جاؤ۔"

وہ مجھے سہلاتی رہی۔ اُس کے بازو کتنے گداز تھے۔ ان میں کتنی گرمجوشی تھی! وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے بھینچنے لگی۔ میں سنبھل نہ سکا۔ جسم ہارتا جاتا تھا۔

کیا سچ مچ میں وہ دیا ہوں جس کا تیل کبھی ختم نہیں ہوتا، جس کی بتی کبھی بجھتی نہیں؟ کیا عورت مایا ہے..... سورج کماری بھی مایا ہے؟ اُس کے بازوؤں کی گرمی اس کی لانبی لانبی پلکیں اور اُس کے بھرے ہوئے گال، کیا یہ سب مایا ہے؟ اس پیار سے خدا ناراض ہوتا ہے تو ہو جائے۔ یہ بات تھی تو یہ صورتیں نہ بنائی ہوتیں، یہ جذبات نہ دیئے ہوتے۔

اوپر تارے جھلملا رہے تھے۔ میرے ذہن میں محبت کے جذبات جاگ رہے تھے۔ میں نے کہا: "بکھرے ہوئے بال درست کر لو۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ میں اُٹھ بیٹھا۔ "سورج کماری! تم نے بڑی تکلیف کی۔" میں نے کہا۔ "اس سردی میں تم یہاں بیٹھی ہو۔ خیمے میں چلی جاؤ۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ بنسری میں سُر جاگ اُٹھیں گے..... ضروری نہیں کہ بنسری منہ لگانے ہی سے بجے..... ہوا بھی تو سُر جگا دیا کرتی ہے..... اور اُس کا گیت مجھے ہمیشہ کے لئے جیت لے گا۔

پھر مجھے اُس رشی کی یاد آ گئی جس کی کہانی میں نے کسی پرانی کتاب میں پڑھی تھی۔ اُس کے آشرم میں عورت کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ ایک دن مہماں نوازی کے جذبے کے ماتحت اُس نے ایک بھولی بھٹکی سندر کنواری کو اپنے ہاں ٹھہرا لیا تھا۔ لڑکی کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اندر سے کنڈی لگا لے۔ مگر آدھی رات کے بعد رشی کی ہوس جاگ اُٹھی۔ وہ لڑکی کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ پھر چھت پھاڑ کر اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ اندر کودے، تالڑکی دروازہ کھول کر بھاگ گئی..... پھر جیسے کسی نے تصویر اُلٹی لٹکا دی۔ میں نے دیکھا کہ رشی ہون کنڈ کے قریب سو رہا ہے اور وہ لڑکی اُس کے قریب آ بیٹھی ہے۔ رشی کا سر اُس نے اپنے زانو پر رکھ لیا ہے۔ رشی گھبراتا ہے، جھنجلاتا ہے۔ مگر پھیلے اور سمٹتے بازوؤں کی گرفت اُسے بھاگنے سے روکے رکھتی ہے۔

میرا جسم سردی سے اکڑ رہا تھا۔ اپنی ضد پر جھنجلانے کے لئے جس گرمی کی ضرورت پڑتی ہے، وہ سب ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ دل سے باتیں کرتے کرتے میں پھر نیند کے دھارے میں بہہ گیا۔

میرا سینہ گرم ہو گیا تھا۔ گردن بھی۔ پیٹ بھی گرم ہو رہا تھا۔ پیٹ کی نچلی آنتیں ٹھنڈے پانی سے نکل کر آگ کی طرف لپکنے والے مچھلی کی طرح جدوجہد کر رہی تھیں۔ گردن کے پاس تو گرم اور خوشگوار سانس لپٹ رہی تھی۔ زانو ابھی بے حس تھے اور پاؤں میں کسی نے سیسہ بھر دیا تھا ـــ ٹھنڈا اور بھاری۔

میں نے بولنا بند کر دیا تھا۔ کون جانے یہ کیا چیز تھی۔ جو میرے اندر پرہیز کے خیال کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس خیال کی آواز جسم کی ایک ایک گہرائی سے سُنی اَن سُنی سی اُٹھ رہی تھی۔ یہ کچھ ایسی حالت تھی جو سوتے سوتے چھاتی پر ہاتھ آ پڑنے سے ہو جاتی ہے..... کوئی میرے دل کو پچکار رہا تھا۔ میں نے ایک انگڑائی لی۔ ہاتھ کی ٹھنڈی انگلیاں پیٹ پر آ لگیں۔ اب یہ گرم تھا۔ زانوؤں میں بھی جنبش محسوس ہوئی اور یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ پاؤں بھی میرے جسم سے الگ نہیں۔

سورج کماری بھی چپ تھی۔ مگر جب اُس کے بازو مجھے بھینچنے کے لئے پھیلتے اور سمٹتے تھے۔ وہ کنکھیوں سے میری طرف دیکھ کر کچھ کہنا چاہتی۔ مگر اُس کے ہونٹ، جو دیر تک اڑتے رہنے والے پرندوں کی طرح پر سمیٹ کر آرام کر رہے تھے۔ ہل کر رہ جاتے۔ نیم خفتہ سی اس کی آنکھیں۔ جیسے گھنے جنگل کے سایوں میں کرنیں جھلملا رہی ہوں، پھر اُن میں ایک خاموش مسکراہٹ تھرتھرانے لگتی۔ اپنی آنکھیں میں نے اُس کی گردن کی طرف موڑیں۔ دیکھا کہ اُس کی رگیں مدہوش سی لیٹی ہوئی ہیں۔

زور سے مشعلنے ہلا کر میں اُس کی آنکھوں کے اندر جھانکنے لگا۔ کیا

یوں دیکھنا گناہ ہے؟ کیا برہمچریہ ہی سب سے بلند معیارِ زندگی ہے؟ کیا اس کے لئے سب لطف تیاگ دینا چاہیئے۔ یہ سب لطف جو خوبصورتی، اگرمحوشی اور رازِ خود رفتگی سے مل کر بنا ہے۔

سورج کماری، جو پہلے کون جانے کس غنودگی میں اونگھ جاتی تھی۔ اب شاید کسی سپنے کی راحت بخش چھاؤں کی بجائے خود زندگی میں تھرکنے والے پیار کا آنند لینا چاہتی تھی۔ اُس کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ پلکوں کی سیاہی دھیرے دھیرے دُور ہوتی گئی۔ میری آنکھیں کھُل گئیں۔ کچھ دیر تو نیلے آسمان کے گرد کرنوں کا نظارہ رہا ـــــ ایک مست پھیلا ہوا نظارہ۔ پھر یہ نظارہ سمٹ کر سورج کماری کی آنکھوں میں بدل گیا۔

میرا سر اُس کی گود میں تھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں ڈر گیا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ سورج کماری نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر پھیرا۔ دوبارہ آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ خیمے کے اندر ہوں، پاؤں کے پاس انگیٹھی سُلگ رہی ہے، اور کئی لوگ اس چہرے میرے سرگرد جمع ہیں۔

دیکھنے کی قوت کے ساتھ ساتھ سننے کی قوت بھی لوٹ آئی۔ سنسکرت کے کچھ بول میرے کانوں میں پڑے۔ کوئی پنڈت جی میرے لئے پرارتھنا کر رہے تھے اپنے آپ یاان لوگوں کے کہنے سے۔

میں خاموش تھا۔ احسان مندی کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اپنی ہٹ دھرمی پر پشیمان بھی تھا۔ یہ دونوں خیال کافی دیر تک رہے۔ پھر کچھ شیطانی جذبے، جن سے ہماری زندگی قائم ہے، دھیرے دھیرے جاگنے لگے۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ ہٹ دھرمی نہ ہوتی تو سورج کماری کی گود کا لطف اور سکون کیسے نصیب ہوتا۔ سورج کماری کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ میں ڈرا۔ کیا اُس نے میرے جذبات کا بھید پا لیا ہے؟ شرم، بے بسی، خودفریبی اور نہ جانے کن کن چیزوں سے پیدا ہونیوالی ایک مسکراہٹ میری مونچھوں میں ہی کہیں گم ہوگئی۔

سورج کماری نے لوگوں سے کہا۔ اب یہ ٹھیک ہیں..... ٹھیک ہوجائیں گے آپ لوگ بستر وغیرہ سنبھال لیں۔ امرناتھ جانے کا وقت ہوگیا ہے"۔

لوگ اطمینان سے سفر کی تیاری میں مشغول ہوگئے۔ مگر پنڈت جی بدستور منتر پڑھے جا رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں۔ سورج کماری نے ایک بار پنڈت جی کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف منہ موڑ کر ایک للچائی سی ادا سے مسکرا کر کہا۔ اُٹھو، برہمچاری جی!..."

دیوندر ستیارتھی

گرما کی دوپہر کا ایک رومان

کھڑکی جو کھلی سامنے بیٹھی نظر آئی
پنکھا لئے اک ہاتھ میں جھلتی نظر آئی

گرمی سے پریشاں سی نظر آئی جوانی
افسردہ و حیراں سی نظر آئی جوانی

ننگا تھا سر اور بال سلیقے سے جمے تھے
چوٹی میں دو اک پھول قرینے سے لگے تھے

تھا سمٹا ہوا دوش پہ چُنت کا دوپٹہ
گہرا نہ بہت، ہلکی سی رنگت کا دوپٹہ

وا تکمہ گریباں کا تھا، سینہ کھلا تھا
کچھ تھوڑا بہت حُسن کا گنجینہ کھلا تھا

کچھ نیچی نگاہیں وہ کئے دیکھ رہی تھی
شاید کوئی تحریر رسالے دیکھ رہی تھی

گردن کو اک انداز سے نیہوڑائے ہوئے تھی
نظریں نہ اٹھانے کی قسم کھائے ہوئے تھی

ہونٹوں پہ تبسم کی گھٹا جھوم رہی تھی
پھولوں کے نشیمن میں صبا جھوم رہی تھی

کچھ دیر جو گذری اسی خاموش فضا میں
اک شعر پڑھا میں نے ترنم کی ادا میں

"گُل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
او خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی"

وہ برق کی تیزی سے چمکتی ہوئی پلٹی
جلدی سے خط اک سمت کو رکھتی ہوئی پلٹی

پلٹی تو مجھے کھڑکی میں گاتے ہوئے دیکھا
دیکھا تو مگر آنکھ چراتے ہوئے دیکھا

بالوں کو دوپٹے سے چھپاتی نظر آئی
مشتاق نظر کو بہت اچھی نظر آئی

چاندی سی جبیں، لعل سے لب، آنکھ شرابی
گنجان بھویں، لانبا سا قد، چہرہ کتابی

جرأت سے ذرا کام لیا میری نگہہ نے
پیغام مرا دے ہی دیا میری نگہہ نے

بے ساختہ ہونٹوں پہ اُدھر آئی ہنسی سی
برساتی ہوئی پھول نظر آئی ہنسی سی

ہنستی ہوئی دو چار قدم ہٹ گئی پیچھے
لے کر نگہِ لطف و کرم ہٹ گئی پیچھے

"پھر مڑ کے بڑے ناز سے پٹ بھیڑ گئی وہ
اُمید کے بربط کو مرے چھیڑ گئی وہ"

علی احمد بی اے

عشق گریزاں

(۱)

سرد ہو چکی محفل

اور تُو نے پروانے، خواہشوں سے بیگانے!
جان سے گزرنے کا کھیل ہی نہیں کھیلا
بُجھ گیا ترا بھی دل؟
سرد ہو چکی محفل۔

(۲)

آدمی کو جینا ہے

ہم کنارِ غم ہو کر لطفِ زندگی کھو کر
آج اور کل برسوں بے بسی کے بل برسوں
زہرِ زیست پینا ہے
آدمی کو جینا ہے

(۳)

عمر پر نہ جا اُس کی

یہ طویل مجبوری اپنی اصل سے دوری
وجہِ دردِ ہستی ہے ننگِ نامِ مستی ہے
عمر ہے سزا اُس کی
عمر پر نہ جا اُس کی

(۴)

دیکھ رات جاتی ہے!

اُٹھ ابھی لپک کر آ بن سنور چمک کر آ
صبح ہونے سے پہلے موت ہی سے دل بہلے
شمع جھلملاتی ہے
دیکھ رات جاتی ہے!

قیوم نظر

ایک خط

الہ آباد

۶ر اگست سنہ ۴۰ء

..... خوش رہو۔

تم نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی پہلی فرصت میں مجھے خط لکھو گی۔ لیکن میں اب تک چشم براہ ہوں۔ کیا بھول گئیں؟

اب کی بار آگرے کا قیام میرے لئے ایک نیا باب ہے جس کی ابتدا تم نے کی ہے..... یہ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ میری فطرت کے وہ نازک اور کمزور پہلو تم لوگوں کے سامنے نہ آنے پائیں جن کی معمولی سی خراش بھی میرے دماغی سکون کو برباد کر دینے کے لئے کافی ہے۔ میں نے حُسن کی مسلسل تنقیص کی اور حسین لوگوں کی صحبت کو اپنے لئے ہمیشہ زہر ہلاہل سمجھا ـــــ یہ سب میں اس لئے نہیں لکھ رہا ہوں کہ خدانخواستہ تم سے مجھے کوئی شکایت ہے ـــــ میں کیا اور میری شکایت کیا! ـــــ یہ تو میں صرف تم کو بتا رہا ہوں کہ واقعات کی ہلکی ہلکی لرزشیں کس طرح مجھے بہاتی رہیں۔

یا وش بخیر! تم سے قبل ایک اور ناوک فگن بھی مجھے اپنا شکار بنانا چاہتا تھا۔ میں نے بچنے کی ہر ممکن تدبیر کی اور اسے اپنی فطرت کے اتنے گھناؤنے پہلو دکھائے کہ اگر معمولی دل و دماغ کا آدمی ہوتا تو نفرت کئے بغیر نہ رہتا ـــــ مگر زمانے کی ستم ظریفی کو دیکھو کہ میری ہر تدبیر اُلٹی پڑی۔ طبیعت کی پراگندگی کو نا تجربہ کاری کا جامہ پہنایا گیا۔ پھر اس حُسنِ عقیدت کے باوجود جب اصرارِ اجتناب حد سے آگے بڑھا تو یہ کہہ کر کہ "اونھ! آپ کو کیا؟ آپ بُرے ہیں تو غیروں کے لئے! میں اپنے لئے تو آپ کو اچھا بنا لوں گی"۔

مجھے ایک ایسی دماغی "اُلجھن" میں مبتلا کر دیا گیا جس سے چھٹکارا آج چھ برس کے بعد بھی نصیب نہیں۔

..... تمہیں بتاؤ کیا یہ فطرت کا انتقام نہیں تھا؟ کیا میری سپر سے تلوار کا کام نہیں لیا گیا؟

اے روشنی طبع .....

میں نے علی گڑھ کا قیام ترک کیا اور الہ آباد بھاگ آیا کہ شاید جگہ کی تبدیلی زندگی کو پھر پرانے ڈھرے پر لگا دے اور میں پھر اسی اطمینان سے زندگی کی لہروں پر تیرنے لگوں جس پر کبھی اپنے دوستوں کے سامنے فخر کیا کرتا تھا مگر تو بہ کیجئے۔ بھلا کھوئی ہوئی چیز ـــــ اور کھوتی ہوئی بھی نہیں چھینی ہوئی چیز کہیں واپس ملا کرتی ہے! کتابیں اُلٹیں، مضمون لکھے۔ آگرہ دہلی کلکتہ اور مدراس کے سفر کئے۔ دوستوں سے مباحثوں میں وقت کاٹا۔ سیاسیات میں حصہ لیا جلسوں میں تقریریں کیں اور نہ معلوم کیا کیا کر ڈالا مگر پھر! پھر یہ کہ آج بھی وہی کھٹک کہ

جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں!

چونکہ عمر کا بیشتر حصہ بورڈنگ میں گذرا ہے۔ مختلف قسم کے احباب سے صحبت رہی ہے اور طبیعت کے فطری رجحان کی بدولت بڑا وقت اپنے اور دوسروں کے نفسیاتی مطالعہ میں گذارا ہے۔ اس لئے اس کیفیت کو سمجھنے میں زیادہ کاوش نہیں کرنا پڑی اور ہمیشہ یہ محسوس ہوتا رہا کہ میں اپنے آپ کو ایک سخت دھوکا دے رہا ہوں۔ ایک گمراہ فریب۔ لیکن ہر مرتبہ یہ فریب کھل گیا اور میں اپنی بے مائیگی پر افسوس کرتا ہوا بکڑا گیا۔

میں بیٹھا پڑھ رہا ہوں۔ کتاب بہت عمدہ ہے۔ مضامین کی سنجیدگی اور اندازِ بیان کی لطافت توجہات کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ بارہ پندرہ صفحے ختم کر چکا ہوں کہ ایک دم سے یہ محسوس ہوا جیسے بڑی دیر سے کسی نے دماغ کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ جو کچھ میں پڑھ رہا تھا وہ نہ معلوم کہاں غائب ہو گیا۔ نہ ہاتھ میں کتاب یاد رہی اور نہ کتاب پر سطریں دکھائی دیں۔ ایسا معلوم ہوا جیسے ہلکا ہلکا کہر بڑی دیر سے چھا رہا تھا لیکن ہم محسوس نہیں کر رہے تھے جھنجھلا کر چند صفحے اُلٹے اور پھر سے پڑھنا شروع کیا ـــــ ایک سطر ـــــ دو سطر ـــــ تین ـــــ چار ـــــ آج مولانا کا اخبار نہیں آیا ـــــ ڈاکیہ تو دکھائی دیا تھا ـــــ کوئی خط بھی نہیں آیا ـــــ معلوم نہیں ابا جان کیسے ہیں ـــــ ان کا

خط تو کئی روز سے نہیں آیا ـــ یہ لوگ خط کیوں نہیں لکھتے ـــ چار ہفتے ہوئے ایک خط آیا تھا ـــ لفافہ تھا ـــ اس میں الائچی کے دانے ـــ دو میں نے کھائے۔ باقی اسی لفافے میں رکھے ہیں ـــ لفافہ بکس کے اندرونی خانے میں ہے ـــ پڑھوں؟ کتاب رہ جائے گی ـــ اونھ! ـــ پہلے کمرے کا دروازہ بند کرلوں ـــ اوہو اس میں کتنے خط جمع ہوگئے ـــ خانہ بھر گیا ـــ ائیں ـــ ابا جان کے خطوط بھی اسی میں ہیں؟ چلو اچھا ہے چائے بنے گی ردی کم ہوگئی ہے۔ چوڑی ـــ الائچی کے چار دانے لفافے میں ـــ دو پچکے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے جن پر کچھ لکھا ہوا ـــ چھ برس کی پرانی تحریر ـــ ایک خط بے القاب کا ـــ

"مجھے معلوم ہوا کہ آپ کی طرف سے کوشش ہو رہی ہے۔ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آپ اپنی مرضی سے ایسا کر رہے ہیں۔ اس میں آپ کی اور میری دونوں کی بڑی بدنامی ہے۔ اگر چچی جان یا دادی امی کوشش کرتیں تو کوئی بات نہ تھی ـــ اب آپ خدا کے لئے اپنے آپ کو سنبھالئے۔ میں تو دیکھئے آپ سے زیادہ مجبور رہوں۔ لیکن پھر بھی اپنے دل کو کیسا تھامے ہوئے ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اس خط سے آپ کو بڑی تکلیف ہوگی۔ لیکن آپ کی محبت سے امید ہے کہ آپ میرا کہنا نہ ٹالیں گے۔ آپ کو دنیا میں بڑے بڑے کام کرنے ہیں ـــ اس سے ہزار درجے بہتر موقع آپ کو ملتے رہیں گے ـــ میں تو خیر جیسے تیسے گذار لوں گی۔ آپ اپنی حالت درست کیجئے اور پڑھنے میں دل لگائیے۔ دوا خدا کے لئے پیتے رہیے گا۔ آپ گھر خط لکھ دیجئے جیسے آپ ٹال رہے ہیں۔ میں بدنصیب نہ معلوم کتنی کوشش اور ہمت کے بعد آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ کیا کروں زمانے کے ہاتھوں سے مجبور رہوں۔ میری تو ماں بھی اس دنیا میں نہیں رہیں جو انہیں سے کچھ کہتی سنتی"۔

چار دفعہ یہ خط پڑھنے کے بعد ایک شعر پڑھا۔

ادھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی۔ اُن سے آہ بھی نہ ہوئی

لاحول ولا قوۃ۔ میں تو بھول چکا تھا۔ پھر یہ ہنگامہ کیوں؟ ارے! تو میں رو رہا ہوں۔ یہ کیا مذاق ہے۔ اونھ یہ خطوط جلا کیوں نہ ڈالوں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری ـــ مگر جلانے سے فائدہ؟ کبھی یادگاری کے طور پر کام دیں گے ـــ کام دیں گے؟ ـــ اچھی کہی ہٹاؤ بکس ہی ہو بند کئے دیتا ہوں ـــ اب نہیں کھولوں گا۔ اور نہ دماغ میں خیال آنے دوں گا ـــ چلو گھوما جائے ـــ "ضیا صاحب ـــ ضیا صاحب ـــ آپ کو دنیا میں سوائے اونگھنے اور پڑھنے کے اور بھی کوئی کام آتا ہے؟" ـــ دروازے جو زور سے کھولے تو شاید انہیں ناگوار ہوا ـــ بہت خفا! فرمانے لگے "جناب آپ کو تو امتحان دینا ہے نہیں ـــ دوسروں کو کیوں پریشان کرتے ہیں؟ جی ہاں ـــ آپ امتحان دیں گے؟ مجھے بھی امتحان دینا ہے ـــ ضیا صاحب واقعی دیکھئے چاندنی کیسی چھٹکی ہوئی ہے ـــ آئیے گھوم آئیں ـــ چائے نہیں پیجئے گا ـــ چلئے بھائی عابد علی کے ہاں آپ کو چائے پلا لائیں ـــ دروازہ میں تالا ڈال دیجئے گا۔

شام کو رنگیں سماں اور تیرے ہاتھوں میں کتاب
ہو نہیں سکتا تری اس بد مذاقی کا جواب

ضیا صاحب شعر تو بس ایک ہے۔

چاندنی رات میں جب پھول کھلا کرتے ہیں
اور بڑھ جاتا ہے سودا ترے سودائی کا

آج جناب ایک غزل دکھائی دی۔ جگر کی ہے ـــ بھئی مطلع کا دوسرا مصرعہ قیامت کا ہے۔

آ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

(زور زور سے)

جیسے ہر شے میں کسی شے کی نہ نا۔ نا۔ نا۔ نہ۔ نا
نا۔ نہ۔ نا۔ نا۔ نا۔ نہ . . . .

جیسے ہر شے میں ـــ ضیا صاحب کورس ختم کرلیا آپ نے؟ کیوں؟ آپ تو نہ معلوم کب سے کتابوں کو دبائے بیٹھے ہیں اور اب بھی کورس ختم نہیں ہوا ـــ میں نے تو آج طے کرلیا ہے کہ اب امتحان کی تیاری شروع کر دینا چاہیئے ـــ نہیں مذاق نہیں ـــ بھئی میں امتحان کے معاملے میں ذرا فراخ دل واقع ہوا ہوں۔ جو کچھ دماغ میں سماتا ہے وہ یاد کرلیتا ہوں۔ اور جو رہ جاتا ہے اسے کاغذ کے ٹکڑوں اور دھات کے لیبل پر لکھ لیتا ہوں۔ یہ سب امتحان میں کام دیتا ہے۔ اور صاحب میرے نزدیک تو یہ سب جائز ہے۔ میرے ایک استاد کا قول ہے کہ "چوری ضرور کرو لیکن پکڑے نہ جاؤ"۔ اور ہے بھی یہی امتحان نام ہے ممتحن کو بے وقوف بنانے کا ـــ جو زیادہ سلیقے سے بے وقوف بنائے گا وہ زیادہ نمبر پائے گا ـــ میں ہمیشہ اول آتا

ہوں۔ کیوں؟ مجھے امتحان دینے کا راز معلوم ہے ۔۔۔ مگر ضیا صاحب۔ اس سال میں پاس نہ ہوں تو کیا رہے؟ ۔۔۔ نہیں۔ واقعی ۔۔۔ مذاق نہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ پاس تو ہمیشہ ہی ہوتے رہے ۔۔۔ اب کی مرتبہ فیل ہو کر کیوں نہ دیکھیں؟ ۔۔۔ اجی نہیں۔ گھر پر کسی کو فکر بھی نہیں کہ میں پاس ہوتا ہوں یا فیل ۔۔۔ میری کامیابی پر کس کو خوشی ہوتی ہے جو ناکامیابی پر کوئی رنج کرے گا ۔۔۔ دنیا تو ناکامیابوں کا نام ہی ہے ۔۔۔ اور پھر میں تو صد درجہ کا بدقسمت ہوں ۔۔۔ واللہ اگر سونے میں ہاتھ لگا دوں تو مٹی ہو جائے ۔۔۔ جی! تعلیم میں یقیناً کامیاب رہا ۔۔۔ مگر کیا کامیاب رہا ۔۔۔ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا ۔۔۔ میرے لئے تو پاس ہونا بھی اجیرن ہو گیا ہے ۔۔۔ گھر پر ہر شخص کہتا ہے "پاس تو ہو ہی جاؤ گے"۔ اور جب واقعی پاس ہو جاؤ تو پھر یہ کہ "ہم تو جانتے ہی تھے" جانتے ہی تھے! گویا ہماری محنت اور ہماری ترکیبیں کوئی چیز ہی نہیں! ذلیل ہیں یہ لوگ۔ مولوی صاحب میں تو اپنی بدقسمتی سے عاجز آگیا ہوں ۔۔۔ اسی لئے ضیا صاحب۔ آج تک میں نے کسی سے محبت نہیں کی ۔۔۔ نہ معلوم کیا اُفتاد اس غریب پر آن پڑے ۔۔۔ زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا ۔۔۔ ہا ہا ۔۔۔ ہا ہا ۔۔۔ ارے یہ ہنسی کی بات تو ہے ہی ہے ۔۔۔ کبھی نریش سے بھی ملے ہیں آپ؟ ۔۔۔ آدمی بہت دلچسپ ہے ۔۔۔ آج مجھ سے کچھ نفسی تحلیل پر گفتگو کر رہے تھے ۔۔۔ کچھ محبت کا ذکر چھڑ گیا۔ آپ بہت مقدس انداز میں بولے "عورت یا تو کسی سے محبت نہیں کرتی اور اگر کرتی ہے تو صرف عمر میں ایک مرتبہ"۔ اور پھر مزید ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے ۔۔۔ کہنے لگے کہ مرد ہمیشہ اس کی محبت سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے ۔۔۔ پہلے تو اُسے محبت پر مجبور کر دیتا ہے اور پھر اس سے کھلونے کی طرح کھیلتا ہے"۔۔۔ میں نے کہا "میاں کیا حماقت کی باتیں کر رہے ہو! عورت ہمیشہ مرد کو انگلیوں پر نچاتی ہے ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ مرد اپنی طرف سے پہلے محبت کا اظہار کرے ۔۔۔ یہ تو عورت ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ قتل بھی کرتی ہے اور مسکراتی بھی جاتی ہے ۔۔۔ ہمیشہ محبت کا اظہار خود کرے گی۔ کبھی زبان سے اور اکثر آنکھوں سے ۔۔۔ تم سفر کے لئے گھر سے چلے ۔۔۔ وہ ہاتھ پکڑ کر رو دے گی ۔۔۔ تم پوچھو "کیوں روتی ہو؟" کہہ دے گی "کچھ نہیں"! بہت اصرار کرو تو نہایت سادگی اور معصومیت سے نظریں جھکا کر کہے گی "میں کیا بتاؤں۔ آپ میری جگہ ہوتے تو سمجھتے ۔۔۔ بہرحال اچھا ہے نہ سمجھئے"! اب اگر آپ سمجھتے ہیں تو فی النار۔ اور نہیں سمجھتے تو فی السقر اور ضیا صاحب ۔۔۔ یہ واقعہ ہے کہ عورت کی فطرت کا سمجھنا بہت نازک علم ہے ۔۔۔ اور اتنا ہی خطرناک بھی ۔۔۔ لیکن اگر خدانخواستہ سمجھ میں آجائے تو پھر خود سمجھ کا خدا حافظ!

دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن!

اُدھو ۔۔۔ ہو گا۔ آج کون تاریخ ہے؟ ۔۔۔ چاند ڈوب رہا ہے ۔۔۔ ستارے بھی کچھ دھندلے دھندلے سے ہو رہے ہیں ۔۔۔ جیسے کسی دوشیزہ کی قبر پر باسی پھول ۔۔۔ کیوں صاحب! کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ روشنی کتنی ہی مدھم کیوں نہ ہو کسی نہ کسی مخرج کی مرہون منت ہوتی ہے ۔۔۔ مگر تاریکی؟ ۔۔۔ تاریکی خود پیدا ہوتی ہے اور خود تمام عالم پر چھا جاتی ہے ۔۔۔ یہ تاریکی کا بھی کوئی مخرج کیوں نہیں ہوتا؟ ۔۔۔ دل پر تاریکی کے اثرات کتنے ہولناک ہوتے ہیں ۔۔۔ میں اپنی زندگی کی تاریکیوں سے گھبرا گیا ہوں ۔۔۔ میرا بچپن کتنا امید افزا تھا ۔۔۔ جیسے انگور کی بڑھتی ہوئی بیل ۔۔۔ میرے دماغ میں ترقی کی کتنی قوتیں موجود تھیں ۔۔۔ میری ذہانت ۔۔۔ میرا حافظہ ۔۔۔ میری خوش مذاقی ۔۔۔ لیکن اب؟ ۔۔۔ اب کیا! کچھ بھی نہیں ۔۔۔ کلیاں سب ایک طرح کی ہوتی ہیں ۔۔۔ خوش رنگ ۔۔۔ خوبصورت بھینی بھینی خوشبو کی مالک ۔۔۔ مگر پھول بننے کے بعد ۔۔۔ اور بعد کیوں! اکثر پہلے بھی ۔۔۔ کچھ ہاروں میں گندھ کر سہروں میں چڑھ جاتی ہیں اور کچھ دنیا کو دھوکا دینے کے لئے مرنے والے کی قبر پر ڈال دی جاتی ہیں۔

جس طرح چاہے چھیڑ دے ہم کو
تیرے ہاتھوں میں ساز ہیں ہم لوگ

آج دو روز کے بعد جو یہ خط اٹھا کر دیکھا تو نہ معل
بہک چکا تھا۔ اب اس کشمکش میں ہوں کہ یہ خط پھاڑ دوں
اگر بھیجتا ہوں تو ڈر ہے کہ کہیں تم بھی خفا نہ ہو جا
سے اتنا ہی ڈر لگتا ہے جتنا غیروں کی نا
پھاڑنے کو جی اس لئے نہیں چا
ذکر اس پری وش
خیر نیاں اپنا تو
کا یہ پہلا ہی موقع
تمہیں بھیج د
گا کہ تمہیں

غالباً یہ داستان کبھی نہ سنائی جاسکی۔ جن صاحب نے یہ خط لکھا تھا وہ میرے عزیز ترین دوست ہیں۔ ان کی زندگی کے متعلق غالباً اتنا کہنا کافی ہوگا کہ باوجود گھر کی خوش حالی کے اپنی تعلیم کی نصف سے زیادہ ذمہ داری انہیں ہمیشہ اپنے ہی کاندھوں پر اٹھانا پڑی — ٹیوشن کرتے تھے اور درجہ میں اول آکر وظیفہ لیتے تھے۔

یہی ان کا ذریعہ آمدنی تھا جس پر چھٹے درجے سے لے کر ایم اے تک کی زندگی گذری۔ بی اے کے آخری سال میں وہ میرے "ہمکرہ" ہو گئے — ابتدا میں تو ہمارے تعلقات بہت رسمی سے تھے۔ وہ ہمیشہ مجھ سے بھاگنے کی فکر میں لگے رہتے تھے اور قدرتاً مجھے بھی ان سے دور ہی رہنا چاہیئے تھا۔ لیکن ان کی ایک حرکت مجھے بہت عجیب سی معلوم ہوتی تھی چنانچہ ان سے میں نے اس کے متعلق جب ایک مرتبہ سوال کر دیا تو اُن کی گھبراہٹ اور پریشانی دیکھنے کے قابل تھی — اور غالباً ان کا جواب۔ یا میرا سوال، ہماری دوستی کا پہلا زینہ تھا — وہ حرکت یہ تھی کہ جہاں دوپہر کو ہم لوگ کالج سے آئے تو ہوسٹل کے نوکر سے ان کا پہلا سوال یہ ہوتا کہ "ڈاکیہ تو نہیں آیا؟" "میرا کوئی خط تو نہیں ہے؟" ان تین برسوں میں شاید کوئی دن ایسا نہیں گذرا کہ انہوں نے یہ سوال نوکر سے نہ کیا ہو اور انہیں جواب نفی میں نہ ملا ہو۔ پھر لطف یہ — اور یہ میں نے دس ہی پندرہ روز کے بعد سے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ کہ سوال کرتے وقت ان کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پوچھتے ہوئے ڈر رہے ہیں۔ شاید اس لئے کہ انہیں جواب کا علم پہلے ہی سے — وہ خود خط کبھی نہیں لکھتے تھے۔ البتہ رات کو اکثر دیکھا گیا کہ کچھ لکھ

کو معلوم ہوا کہ جو کچھ لکھا تھا اسے یا تو پھاڑ دیا یا جلا دیا —

ف ایک زمانہ مجھے یاد ہے کہ جب ان کے پاس

لفافہ آیا کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ ان کی

ت دن تھے۔

گ کبھی فرصت ہوئی تو ان کی زندگی

اے جوان کی ایک شیروانی

دن وہ غائب ہو

میں ایک صاحب

پھر فرد ورد

ائے

جا کر سو رہتے ہیں — ہماری دوستی کے آخری زمانے میں ایک شعر وہ اکثر گنگنایا کرتے تھے اور جس پر ان کے اکثر احباب نے فقرے بھی چست کئے لیکن خود انہیں اس کا کبھی احساس نہ ہوا۔ شعر یہ تھا کہ

ہر چند بگولہ مضطر ہے، اک جوش تو اس کے اندر ہے
اک وجد تو ہے، اک رقص تو ہے، بے چین سہی، برباد سہی

ان کے اصلی خط میں جہاں نقطے لگے ہیں وہاں مکتوب الیہا کا نام تھا جسے احتراماً میں نے پوشیدہ رکھا ہے۔

صدفی

عکس

ریشمیں ہے مرے امروز کا لمبا دامن
دوش کی وادیٔ پرخار پہ جو پھیلا ہے
آگے جب بڑھتا ہوں اُمید کے گلشن کی طرف
دوش کی وادیٔ پُرخار کی اک جھاڑی سے
ریشمیں دامنِ امروز اُلجھ جاتا ہے
لوٹ کر دیکھتا ہوں دامنِ امروز کو میں
اور رُک جاتا ہوں۔ رُک جاتا ہوں اک آہ کے ساتھ
میرے ماضی کے بیاباں کی غمگیں وسعت
یوں سمٹ کر مری آنکھوں میں چلی آتی ہے
جیسے اک تیز نظر میں کسی خونخوار کا جوش
اور ماضی کے بیاباں کے رنگیں کانٹے
جن کی آنکھوں میں لہو ہے مرے ارمانوں کا
میرے دامانِ تصوّر سے لپٹ جاتے ہیں

گونجنے لگتے ہیں کانوں میں پرانے قصے
سامنے آنکھوں کے آجاتی ہیں سُونی راہیں
سلسلہ چھڑتا چلا جاتا ہے مایوسی کا
دوشِ مرحوم کے دامن پہ لہو کے چھینٹے
دُور سے روشن و تابندہ نظر آتے ہیں
بند کر لیتا ہوں آنکھیں غمِ محرومی سے

اور ۔۔۔ پھر دیکھتا ہوں گلشنِ فردا کی طرف
پھول جھڑ جاتے ہیں اُمیّد کی ہر ڈالی سے
سُونا سونا سا نظر آتا ہے سارا گلشن
یاس کے تار لرزتے ہیں نگاہوں میں مری
ٹوٹنے لگتے ہیں آنکھوں کے فلک پر تارے
سر جھکا لیتا ہوں ناکامِ تمنّا ہو کر

یوسف ظفر

بینگن کا پودا

اگرچہ ماہی رام نے وہ بینگن کا پودا اکھاڑ دیا ہے۔ پھر بھی جب میں ترکاری کے کھیت کی مینڈھ پر سے ہوتا ہوا اپنی کوٹھی کو جاتا ہوں تو میری آنکھوں میں بینگن کا وہ سوکھا ہوا پودا اور اس پر لٹکتا ہوا مرجھایا، سوکھا پچکا سا زرد بینگن پھر جاتا ہے۔

. . . .

سردیوں کے مختصر سے دن کو گذرے دیر ہو چکی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد جب میں ایک لمبا چکر لگا کر نیچے کھادی کی موٹی بنیان، اس پر چھوٹا گرم انڈرویئر اس پر موٹے کھدر کی قمیص۔ اس پر اچکن اور گلوبند۔ اور ان سب کے اوپر اوورکوٹ پہنے ہنہ میں بیڑی لئے اپنے لوہے کی ایڑی والے فلیکس کے بوٹوں کی ٹھک ٹھک میں مست، دسمبر کی تیکھی، ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لئے کانوں کو اوورکوٹ کے کالروں میں چھپاتا ہوا اپنی کوٹھی کے برامدے میں داخل ہوا تو وہاں ایک میلی سی چارپائی پر ایک نحیف و ناتواں بوڑھے کو خستہ اور بوسیدہ، اندھیری کالی رات کی طرح کالا لحاف لپیٹے دیکھ کر کچھ ٹھٹھک سا گیا۔

"کیوں بھئی کیا بات ہے" میں نے اوورکوٹ کی جیبوں میں پڑے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لاکر کہا۔

"کچھ نہیں بابوجی، میں ماہی رام کا آدمی ہوں"

"ماہی رام کے ہی سہی، لیکن اتنی سخت سردی میں تم اس کھلے برآمدے میں کیوں پڑے ہو"

"تبھی کے پاس کپڑا ہے بابوجی"

میں نے چپ چاپ اپنا کمرہ کھولا۔ ڈٹ مار کر بڑا ہمالائن کا ٹیبل لیمپ جلتا چھوڑ گیا تھا۔ اور اگرچہ اوپر کے دونوں روشن دان کھلے تھے۔ پھر بھی کمرہ گرم ہو گیا تھا میرے داخل ہوتے ہی گرم، لیکن مٹی کے تیل کی تیز لپٹ آئی۔ بارہا میرے دوستوں نے مجھے اس طرح لیمپ جلا کر چھوڑ جانے سے منع کیا ہے شہر کی گندی فضا کو چھوڑ کر اس کھلے ماحول میں رہنے کا فائدہ ہی کیا، اگر شہر کی مضر عادتوں کو نہ چھوڑا جائے" وہ کہا کرتے ہیں اور بتایا کرتے ہیں کہ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق کمرے کو بند کر کے اندر لیمپ جلائے رکھنا نہایت مضر ہے۔ سانس کے راستے گندی ہوا پھیپھڑوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور پھیپھڑوں پر اس کا دباؤ پڑتا ہے۔ میں بارہا یوں محسوس بھی کرتا ہوں لیکن مجبور ہو جاتا ہوں۔ جب کبھی بھی دروازہ کھول کر بیٹھتا ہوں اور تیز ہوا کا جھونکا اندر آتا ہے۔ اور میرے ہاتھ یخ ہو جاتے ہیں اور قلم چلنے سے انکار کر دیتا ہے تو میں اُٹھ کر کواڑ بھیڑ دیتا ہوں ـــــ جیسے سگرٹ پینے والوں کو اس کی کڑوی، کسیلی، سر چکرا دینے والی بو اچھی لگتی ہے، کچھ اسی طرح یہ سب کچھ بھی مجھے اچھا معلوم ہونے لگا ہے۔

ہیٹ کو کھونٹی پر لٹکا کر اور گلوبند کو سر اور کانوں کے ارد گرد لپیٹ کر میں کام پر آبیٹھا۔

بیٹھ تو گیا لیکن میرا دھیان برآمدے کی طرف ہی لگا رہا۔

اس بوڑھے کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ صبح ہی دیکھا تھا، وہ بینگن کے پودے چھانٹ رہا تھا۔ اور مشترکہ "کمیونٹی کچن" سے گھر کو آتے ہوئے، میں نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ وہ کیوں ایسا کر رہا ہے؟ اس نے بتایا تھا کہ بینگن کا پودا دوبار پھل دیتا ہے۔ ایک بار چھانٹ دیا جائے تو اور بھی پھلتا پھولتا ہے۔ میں نے ان سوکھے پتوں سے محروم بینگن کے پودوں پر ایک نگاہ ڈالی تھی۔ ایک پودے پر ایک مرجھایا ہوا، سوکھا، سکڑا، پچکا زرد بینگن لٹک رہا تھا۔ وہاں سے ہٹ کر میری نظر اس بوڑھے پر جا ٹکی تھی۔ اس کی عمر نہ جانے کتنی تھی۔ لیکن وہ بے حد معمر دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ سردی سے بچنے کے لئے اس نے کھیس اوڑھ رکھا تھا۔ پھر بھی اس کے لکڑی سے پتلے ہاتھ، بانس سی ٹانگیں، سوکھا پچکا چہرہ، اور آنکھوں کے حلقے صاف نظر آتے تھے۔ اس وقت ایک عجیب سا خیال میرے دل میں پیدا ہوا تھا ـــــ بینگن کا پودا جب سوکھ جاتا ہے، تب چھانٹ دینے پر پھر سے پھل لے آتا ہے۔ سہانجنا بھی چھانٹنے پر بڑھتا ہے، نباتات میں ایسے درختوں اور پودوں کی کمی نہیں جو چھانٹنے پر پہلے سے بھی زیادہ پھلتے پھولتے ہیں ـــ شہتالا، اور دُوب وغیرہ وغیرہ۔ تو انسان کو اس خدائے برتر نے ایسا کیوں نہیں بنایا! لیکن وہیں کھڑے کھڑے جیسے مجھ سے کسی نے کہا کہ انسان کی بیل بھی تو امر ہے۔ موت

اس کی قینچی ہے سرد عود ہیں، نیچے بوڑھے۔ اس کے پھل پھول، پتے اور شاخیں ہیں جب یہ سوکھ جاتے ہیں یا گل سڑ جاتے ہیں یہ قینچی انہیں کاٹ دیتی ہے اور اُن کی جگہہ نت نئے، ہرے بھرے، زندگی کی حرکت سے خوش، اچھلتے کودتے ہنستے ناچتے گاتے، پھول اور پتے لگتے ہیں۔ اور زندگی کی امر بیل بڑھتی پھولتی، جھومتی ہی چلی جاتی ہے .....

لیکن یہ بوڑھا یہاں سردی میں کیوں آپڑا ہے؟ کیا اس کا کوئی گھر گھاٹ نہیں اور اپنی اس محویت سے ذرا چونک کر میں نے پوچھا۔ کیوں جی، تم ہو کون؟

"میں جی، ماہی رام کا آدمی ہوں"

"ہاں ماہی رام کے آدمی تو ہو، لیکن ماہی رام کے کیا ہوتے ہو؟"

بوڑھا کچھ جواب دینے لگا تھا کہ اسے کھانسی کا دورہ پڑا گئی لمحے لگاتار کھانسنے کے بعد، اپنے سانس کو مشکل سے درست کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ وہ رشتے میں ماہی رام کا کچھ نہیں لگتا۔ وہ اس کا ہموطن ہے۔ اس کا کنبہ بہت بڑا ہے۔ پانچ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور بیوی ہے، دو لڑکیاں ہیں — بیاہنے کے قابل اور وہ روزگار کے لئے ماہی رام کے ساتھ آگیا ہے۔

اس کی آواز میں کچھ ایسا سوز تھا کہ کام کرنا میرے لئے ناممکن ہو گیا۔ میں اتنے کپڑے پہننے کے باوجود پتلون پر کمبل ڈال کر بیٹھا ہوں۔ اور وہ غریب باہر سردی میں پڑا ہے: نام نہاد بستر کے طور پر شاید ایک میلی پھٹی ڈلائی اُس کے پاس ہے۔ اور وہ میلا کالا لحاف بھی برسوں کا پرانا ہے — قریب قریب گھُل کر میں نے کہا۔ "تو بھائی اندر لیٹ جاؤ، باہر تو بڑی سردی ہے، برآمدہ دونوں طرف سے کھلا ہے۔ باہر تم کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟"

لیکن اسی وقت سیمنٹ کے فرش پر بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی اور دوسرے لمحہ ماہی رام — وہ ٹھیکیدار گوپالداس کا چھ فٹ تین انچ لمبا آدمی دروازے پر آکھڑا ہوا — بڑی سی پگڑی، اس کے نیچے کالا، موٹا کمبل، گھٹنوں تک دھوتی اور پاؤں میں سیر سوا سیر کا جوتا — ایک دن چھ مولیوں کے لئے وہ ایک میل تک ایک آدمی کے پیچھے دوڑتا گیا تھا اور وہاں پکڑ کر اس نے اسے وہ وہ پٹخنیاں دی تھیں کہ پھر اس نے کبھی ادھر کا رُخ نہیں کیا۔

تم نے اسے خود یہاں سلایا ہے بابو جی، نہ جانے کون سالا رات کو کھیتوں میں ڈاکہ ڈالتا ہے۔ دو تین دن دیکھتے دیکھتے ہو گئے ہیں۔ کل رات گو بھی کے دس پھول غائب ہو گئے۔ سارے کھیت میں ایسے پھول نہ ملیں گے۔ برسوں کوئی تمام پکے ہوئے ٹماٹر اتار کرے گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں کچن کو ترکاری بھی سپلائی کرنی ہوتی ہے اور پھر دو سو روپے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ وہ بھی تو اسی میں سے پورا کرنا ہے اور پھر مزدوروں کی مزدوری ....

لیکن ترکاری پر کون ڈاکہ ڈال جاتا ہے۔ یہاں تو کبھی چوری ہوتے سُنی نہیں۔ میری کوٹھی سنسان جگہ میں ہے۔ پاس کوئی کوٹھی نہیں۔ لیکن میں تو دروازے کھلے چھوڑ کر گھنٹوں غائب رہتا ہوں۔

"نہیں بابو جی، باہر کا آدمی اتنی سردی میں صرف دس گو بھی کے پھول لینے نہیں آسکتا۔"

"لیکن اس دن مُولیاں ....."

"وہ اور بات تھی بابو جی۔ وہ تو کوئی راہ چلتا آدمی تھا جاتے جاتے اکھاڑ کر لے گیا۔ یہ کوئی ہمیں کا ہی ہے — میں سالے کو پکڑ کر ایسا سبق دوں گا، کہ عمر بھر کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے۔" اور اُس کے موٹے موٹے ہونٹ بھیں گئے اور چیچک کا مارا ہوا چہرہ تن گیا۔

"لیکن بھائی اگر چاہو تو اسے اندر سلا دو۔"

"نہیں بابو جی، سردی تو آپ امیروں کو لگتی ہے، اسے تو یونہی محض دکھاوے کے لئے یہاں سلا دیا ہے، ورنہ رکھوالی تو میں کروں گا — ان مونگروں کے پیچھے بیٹھ کر، جونہی یہ سمجھ کر کہ بوڑھا سو گیا ہے، کوئی آیا کہ میں نے دبوچا۔"

اور وہ ہنسا۔

"لیکن اس کے پاس کپڑے ....."

"کافی کپڑے ہیں اس کے پاس بابو جی"

یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ بوڑھے کو پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔

....

میں پھر کام میں منہمک ہو گیا۔ لیکن مجھ سے کام ہو نہیں سکا۔ میرے سامنے ان دونوں کے مالک کی تصویر کھنچ گئی۔ ٹھیکیدار گوپالداس — دھن دولت اولاد اور بے فکری سے اس کے گال اس پچاس سال کی عمر میں بھی گلاب کی طرح سرخ تھے — اس ہڈیوں میں پیوست ہونے والی سردی میں، جب یہ بوڑھا باہر پڑا ہے، وہ اپنے گرم لحاف میں لیٹا دہکتی ہوئی انگیٹھی سے گرم اپنے کمرے میں، مزے سے گپیں ہانک رہا یا تاش یا شطرنج کھیل رہا ہوگا ......

اور یونہی سوچتے سوچتے میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور کچھ غنودگی سی مجھ پر طاری ہونے لگی۔ کھانا زیادہ کھا گیا تھا۔ کپڑوں کا بوجھ میں نے لاد رکھا تھا اور کمرہ خوب گرم تھا — میں اُٹھا کچھ ضروری کاغذ قلم دوات لے کر

سونے کے کمرے میں چھوڑ آیا۔ میں نے سوچا کل ذرا سویرے اُٹھ کر کام کر دوں گا۔ دفتر کے کمرے کو تالا لگاتے ہوئے میں نے ایک بار بوڑھے سے پوچھا کہ اگر وہ چاہے تو دفتر کو کھلا چھوڑ دوں۔ لیکن "نہیں نہیں بابو جی۔ میرے پاس کافی کپڑے ہیں۔" اس کا یہ جواب سُن کر قفل بند کر کے میں اپنے چھوٹے سے، گرم سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ بستر بچھا ہوا تھا۔ صرف لحاف پر نیچے کمبل اور ڈال لیا اور کپڑے بدل کر لیٹ گیا۔

بستر برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ میں نے پاؤں سکیڑ لئے۔ اور پھر انہیں آہستہ آہستہ پھیلایا۔ کئی طرح کے خیالات دماغ میں گھومنے لگے —— بے ربط، بے ترتیب لیکن لحاف کی گرمی سے آنکھیں بوجھل ہو گئیں۔ اور پھر بند....

سوتے سوتے، کبھی ماہی رام، کبھی اس بوڑھے، اور کبھی اس کے مالک ٹھیکیدار کی صورتیں میرے سامنے آنے لگیں۔

میں نے دیکھا کہ ماہی رام نے چور پکڑ لیا ہے۔ اور وہ اسے مارتا مارتا ساتھ کے گاؤں دیہہ کے تکسے گیا ہے۔ اور سب گاؤں والوں کو جمع کر کے اس نے اعلان کیا ہے کہ جو ہماری سبزی چرائے گا اسے ایسی ہی سزا دی جائے گی۔ اتنا کہہ کر وہ پھر چور کو زدوکوب کرنے لگتا ہے۔ چور نہایت پر درد نگاہوں سے اس کی طرف تکتا ہے، اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ وہ ٹھیکیدار گوپال داس کے سوا کوئی نہیں —— وہی گھٹا ہوا سر، وہی پھولے ہوئے گال اور وہی چوکور ناک!

میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا پاؤں سے رزائی اتر گئی ہے۔ زیادہ کھا جانے کی وجہ سے چھاتی کچھ بھاری تھی، اور گلا سوکھا جا رہا تھا۔

سرہانے رکھے ہوئے لوٹے سے پانی پی کر اچھی طرح سے لحاف لے کر دونوں طرف سے اسے پاؤں کے نیچے کر کے پھر لیٹ گیا۔ باہر ہوا مکانوں کو ٹکریں مار رہی تھی۔ درخت حتی الامکان اس کا مقابلہ کرتے ہوئے جوش کی شدت سے چنگھاڑ رہے تھے —— شاں —— شاں —— شاں —— اور دُور بادل کی گرج اور رعد کی کڑک بھی سنائی دے رہی تھی۔ لیکن گرم ہو کر جسم ڈھیلا پڑنے لگا اور میں پھر سو گیا۔

اس بار کیا دیکھتا ہوں کہ زور کی بارش ہو رہی ہے۔ تیز ہوا چلتی ہے۔ پاؤ پاؤ بھر کے اولے پڑتے ہیں۔ ساری کی ساری سبزی تباہ ہو جاتی ہے۔ کیاروں میں پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ صرف اس مرجھائے ہوئے سکڑے سمٹے۔ پیلے زرد بینگن کا پودا رہ جاتا ہے۔ پھر وہ بینگن میرے سامنے بڑا ہونا شروع ہو جاتا ہے، اور میں دیکھتا ہوں کہ اس کی شکل اس بوڑھے کی ایسی بن گئی ہے۔ گھٹنوں کو بازوؤں میں لے کر چھاتی سے لگائے، وہ سکڑا سمٹا، ننگا، اپنی لمبی چوٹی کے سہارے لٹک رہا ہے —— اولے اُس کے سر پر لگتے ہیں اور وہ اسی بینگن کے پودے کے ساتھ لٹکا ہوا جھولتا ہے۔

پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ بینگن کا پودا ایک بڑا اونچا، نہ جانے جامن کا، نہ جانے آم کا درخت بن جاتا ہے۔ لوگوں کی بھیڑ نیچے کھڑی شور مچا رہی ہے —— بوڑھا مر گیا، بوڑھا پھانسی لے کر مر گیا۔

پھر میرے کانوں میں صرف "مر گیا" "مر گیا" کی آواز آتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاخ ٹوٹ رہی ہے —— کڑ کڑ.... کڑ کڑ......

میری آنکھ کھل گئی دیکھا کہ کوئی زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

سرہانے رکھی ہوئی گرم جرابیں پہن کر سر پر ٹوپی رکھ اور کمبل کو اچھی طرح لپیٹ کر میں اُٹھا۔ دروازہ کھولا۔ دیکھا تو سیکرٹری صاحب دوسرے کئی اصحاب کے ساتھ کھڑے ہیں۔

"کیا بات ہے" میں نے پوچھا۔

"رات آپ کے برآمدے میں بوڑھا مر گیا"

میں نے دیکھا —— اسی میلی سی کالی چارپائی پر اپنے اردگرد وہی میلا لحاف لپیٹے، بوڑھا جھکا ہوا پڑا ہے۔ اس کا جسم اکڑ گیا ہے اور آنکھیں پھٹی پڑتی ہیں، اس کا لحاف بھیگ گیا ہے دور دور تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہے اور برآمدے کا سارا فرش گیلا ہے۔

"میں نے تو رات ہی اس سے کہا تھا کہ دروازہ کھلا...." میں نے کہنا شروع کیا۔

"میں چائے کے لئے کچن سے دودھ لینے جا رہا تھا کہ اسے بارش میں بھیگتے پایا۔ آواز دی، لیکن یہ ہلا تک نہیں۔ آ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات سردی میں اکڑ گیا ہے۔" اور ٹھیکیدار کے آدمی سے انہوں نے کہا کہ اسے اٹھوانے کا انتظام کیا جائے۔

....

اس کے دو دن بعد، کچن کو جاتے ہوئے اچانک رک کر میں نے ماہی رام سے کہا "خدا کے لئے اس پیلے سے بینگن کے پودے کو اکھاڑ دو۔"

میری آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ ماہی رام حیران سا میری طرف دیکھنے لگا اور پھر اس نے کہا۔

"بہت اچھا سرکار"

اُپندر ناتھ اشک

ایک منظر

پھیل رہی ہے سیاہی، رستہ بھول نہ جائے راہی ۔۔۔ سامنے جیوتی جاگ رہی ہے، پیچھے گھور اندھیرا،
دیکھ کے دو دنیاؤں کا جلوہ ڈول اٹھا من میرا!

آج اشنان کیا گوری نے، (آج بھلا کیوں نہائی؟) ۔۔۔ دونوں اڑائیں دھیان کے پنچھی کی، جوگی والا پھیرا!
یہ سنگار جال مایا کا، اس نے کس سے نبھائی؟
مورکھ چھوڑ نادانی کی باتیں، کیسی دھن یہ سمائی؟ ۔۔۔ دونوں لوک دیکھ کے دھیان اک اور ہی جگ کا آیا،
دور سے دیکھو تو اندھیارا، پاس اجیالے کی مایا،
پھیل رہی ہے سیاہی، رستہ بھول نہ جائے راہی، ۔۔۔ مایا کا جب بندھن ٹوٹے، چھائے تھکن کا سایا،

جھومی گیسو کی چھایا تو دھیان انوکھا آیا، ۔۔۔ پھیلے پھر سے سیاہی، رستہ بھول ہی جائے راہی
نٹ کھٹ برندابن سے ساتھ میں رادھا کو بھی لایا،
رادھے مکھ کی اجلی مورت شام گیسو کا سایا۔

میراجی

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

اس دفعہ "نقد و نظر" کا حصہ غیر معمولی وسعت اختیار کر گیا ہے اس لئے حصہ نثر کا جائزہ شامل نہیں ہو سکا۔ ناظرین یہاں جو کمی پائیں گے اس کا بدل انہیں نقد و نظر کے صفحات میں مل جائے گا۔ (ادارہ)

موہن بابو

ملے تھے جب تم موہن بابو مجھ پاپی سے پہلے پہلے
یہ آنکھیں تھیں سرمہ دانی بال تھے بھنورا جیسے کالے
تھی پیشانی چاند سی پیاری چاندی جیسے دانت رو پہلے
گال تمہارے پھول گلابی، ہاتھ تمہارے روئی کے گالے
بڑے مزے کے دن تھے وہ جب ہم تم کھیلے جیون ناٹک

اب دیکھو تو آنکھیں ڈوبی، سر ہے چکنا جیسے کدّو
پیٹھ جھکی، گردن میں رعشہ کانپ رہی ہیں دونوں ٹانگیں
جھکے ہوئے ہو تم جیسے جھک جائے کوئی خچر لدّو
پٹا دوالہ ہم دونوں کا اب وہ جیون کس سے مانگیں
بڑے مزے کے دن تھے وہ جب ہم تم کھیلے جیون ناٹک

کھیلے تاش حسینوں کے جھرمٹ میں نچا نچا کر آنکھیں
چومے گال رنگیلے سندر اب وہ لٹکے جیسے تھیلا
اب وہ آنکھیں بجھی بجھی سی پلک اوٹ سے آنسو جھانکیں
بنے ہوئے تھے موہن بابو کسی زمانے میں تم چھیلا
بڑے مزے کے دن تھے وہ جب ہم تم کھیلے جیون ناٹک

موہن بابو تھے زندہ دل من تھا ان کا پریم میں پورا
لگے وہ ہنسنے جیسے اونٹ جماہی لیتا منہ کو پھیلا
ہوئے تھے بوڑھے لیکن اُن کا دل نہ ہوا تھا ابھی ادھورا
آئی یاد جوانی اُن کو جیسے سپنا میلا میلا
بڑے مزے کے دن تھے وہ جب ہم تم کھیلے جیون ناٹک

کر کے جگالی بولے تجھ کو احمد پوری یہ کیا سوجھی؟
سُن یہ جیون روپ بدل کر کرتا جگ میں اوٹنک ماٹک
یہ دنیا ہے ایک پہیلی چلا یہاں سے جس نے بوجھی
ختم ہُوا اب کھیل ہمارا کھلا ہوا ہے سامنے پھاٹک
بڑے مزے کے دن تھے جب ہم تم کھیلے جیون ناٹک

کھیل ہمارا ختم ہوا اب کہہ دو یہ پھاٹک والے سے
بجا کے گھنٹی چھوڑ دے جلدی اُس پھاٹک کے اوپر پردے
آؤ چلیں اب دیر ہوئی کل ملنا ہے ناٹک والے سے
کہیں یہ اس سے کھیل ہمارا جانچ کے ہم کو رخصت کر دے
بڑے مزے کا کھیل تھا وہ جب ہم تم کھیلے جیون ناٹک

(یہ نظم ایک انگریزی نظم کو دیکھ کر لکھی گئی۔)

سید مقبول حسین احمد پوری ، ہفت روزہ مقصود افسانہ نمبر ۶ اپریل ۱۹۴۱ء

احمد پوری کی مندرجہ بالا نظم میں جو خصوصیت مجھے سب سے نمایاں دکھائی دیتی ہے وہ ہے گفتگو کے ذریعے سے کردار نگاری نظم ایک ذرا سا واقعہ ہے لیکن اس واقعے کو فن کار نے زندگی بلکہ ہر زندگی پر محیط کر دیا ہے اور وہ بھی صرف آخری بند کی فکر انگیزی سے نظم کا لطف اس صورت میں پوری طرح آسکتا ہے اگر ہم اسے ایک ایسی تصویر سمجھ لیں جس میں دو بوڑھے آدمی ایک دوسرے کے سامنے موجود ہیں، ایک شاعر (احمد پوری) جو مسلمان ہے اور دوسرے موہن بابو جو ظاہر ہے کہ ہندو ہیں، ایک زمانہ گذرا کہ یہ دونوں ایک گاؤں میں رہتے تھے (گاؤں کی دلیل بعض تشبیہات ہیں ــــ آنکھیں سرمہ دانی، ہاتھ روئی کے گالے، چکنا سر کدّو، خمیدگی لدّو خچر کی ایسی)، نیز شاعر

کا کردار جس سادگی اور زندہ دلی کا حامل ہے وہ اکثر دیہات میں دکھائی دیتی ہے) ہاں تو بچپن سے یہ دونوں دوست ایک گاؤں میں رہتے تھے مسلمانوں میں تعلیم کا خیال کم ہے شاید شاعر وہیں کھیتوں ہی میں اُلجھا رہا اور موہن بابو پڑھنے لکھنے کے بعد کسی شہر میں چلے گئے۔ یوں وقت گذرتا گیا اور دونوں کی عمریں بیتتی رہیں۔ آخر بڑھاپے سے کچھ عرصہ پہلے بلکہ بڑھاپا آجانے پر دونوں کی ملاقات ہوئی۔ دلوں میں وہ پرانی بچپن کی چاہ جاگ اُٹھی اور احمد پوری اپنے دوست کی قلب ماہیت پر غور کرنے لگے۔ موہن بابو چونکہ شہر کی ہوا اچھی طرح کھا چکے تھے اس لئے ان میں سے جذباتیت کافی حد تک رخصت ہو چکی تھی۔ احمد پوری کے سادہ خیالات اور اخلاص بھری دلبستگی سے وہ متاثر ہوئے ہوں گے لیکن انہوں نے "حال" کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا سیکھ لیا تھا۔ چنانچہ اسی زاویہ نظر سے انہوں نے احمد پوری کی باتوں کو جانچا۔

نظم میں جگہ جگہ کئی دلچسپ کنائے ہیں۔ مثلاً (موہن بابو) کر کے جگالی بولے۔ اس ٹکڑے سے جہاں آپس کی بے تکلفی ظاہر ہوتی ہے، وہاں موہن بابو کے شہر میں جا کر پان چبانے کی عادت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ نظم کے پہلے مصرعے میں دو باتیں ذرا اُلجھانے والی معلوم ہوتی ہیں۔ مصرعہ ہے "ملے تھے جب تم موہن بابو مجھ پاپی سے پہلے پہلے" ــــ پہلے پہلے گویا بچپن کے بعد ان کی ملاقات ہوئی تھی ــــ دوسرا لفظ "پاپی" ہے "مجھ پاپی سے" ــــ پاپی کیوں!ــــ ــــ اسی بند کے اگلے تین مصرعوں میں جس انداز سے موہن بابو کی دلکشی کا بیان ہے کیا اس سے کوئی اشارہ ملتا ہے؟ ــــ اگر کوئی اشارہ نہ بھی ملتا ہو تو بھی اس نظم میں "زیرِ لب" "میلان ہم جنسی" کے کنائے موجود ہیں۔

یہ نظم احمد پوری نے کسی انگریزی نظم کو دیکھ کر لکھی ہے۔ جس کامیابی سے شاعر نے ایک اجنبی زبان کے خیال کو اپنایا ہے وہ توصیف کے لائق ہے۔

موضوعِ سخن

گُل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
دھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سُنی جائے گی
اور ان ہاتھوں سے مس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہاتھ

اُن کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

آج پھر حسن دل آرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ وہ غازہ کا ہلکا سا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

اپنے افکار کی اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی۔ شاہدِ معنی ہے یہی

آج تک سرخ و سیاہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی اجداد پہ کیا گزری ہے

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے
یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لئے اِن میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے

یہ ہر اک سمت پُر اسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ

یہ ہر اک گام پہ اِن خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ

یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہئے کوئی ایسے بھی افسوں ہوں گے

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

نیا ادب مارچ اپریل ۱۹۴۱ء ــــــــــــ فیض احمد فیض

فیض کی یہ نظم اپنی بہت سی خوبیوں کے ساتھ ساتھ متنازعہ فیہ بھی ہے۔ انفرادی لحاظ سے اگر ہر مصرعے یا شعر کو دیکھا جائے تو اس کے تاثر کی کامیابی یقینی دکھائی دیتی ہے لیکن مکمل تاثر کے لحاظ سے صرف اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے۔ جس شدت سے ہر مصرعہ الگ الگ ذہن پر اثر کرتا ہے وہ کیفیت مکمل صورت میں نہیں دکھائی دیتی شاید یہ اس لئے ہے کہ اس نظم کی حیثیت کچھ اس کلمے کی سی ہے کہ "ہائے میری جان! انقلاب زندہ باد۔ میری جان" ــــ اور یوں یہ نظم نہ انقلاب زندہ باد رہتی ہے نہ

میری جان بنتی ہے۔ جدید شعراء میں فیض احمد فیض کی تغزل کا کامیاب شاعر ہے لیکن اُس کی دوسری نظموں میں توجہ کے انجماد کی جو کیفیت عموماً پائی گئی ہے وہ مجھے اس نظم میں مفقود نظر آتی ہے۔ انفرادی لحاظ سے ہر مصرعہ فن کار کی شاعرانہ خوبیوں کو ظاہر کر رہا ہے۔ الفاظ کا لطیف اور نازک استعمال ۔۔۔ "افسردہ، سلگتی ہوئی شام ۔۔۔ ترسے ہوئے ہاتھ، زلف کی موہوم گھنی چھاؤں، سرخ و سیہ صدیاں، دمکتے ہوئے شہر، پراسرار کڑی دیواریں، جسم کے کمبخت دلآویز خطوط" ۔۔۔ "دھندلی سی حنا کی تحریر" اور "آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ" تصور کا گہرا احساس دلاتے ہیں۔

غالباً مکمل طور پر آخر میں اس لئے انتشار پیدا ہوا ہے کہ اس نظم میں فن کار اپنی عام روش سے کسی حد تک ہٹ کر رہا ہے، یعنی داخلی ہوتے ہوئے بھی ایک طرح سے خارجی ہے۔

ہاں، ایک بات بہت کھٹکنے والی ہے یہ ہر اک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں ۔۔۔ مقتل گاہیں درست نہیں بلکہ غلط ہے کیونکہ ظرفِ مکان کے آخر میں ظرفِ مکان کا لاحقہ لگانا گویا ایسا ہی ہے جیسے "لالہ گارڈن کا باغ" یا "شب قدر کی رات"

ٹوٹا ہوا ریکٹ

پانی کا اک بلبلہ جیسے
حد سے زیادہ پھول گیا ہو
میلا سا اک تمقمہ جیسے
کوئی فضا میں بھول گیا ہو
جیسے اک ننھا غبارہ اُڑ اُڑ کر نغمے گاتا ہے
دل میں ایک بڑا سا سیارہ دو جانب آتا جاتا ہے
صاف زمیں پر جال ہے اس پر دل کی اک دنیا اُٹھتی ہے
یہ "تارا" کی گیند نہیں ہے، یہ میری آشا اڑتی ہے
امرت رکھنے والی ناگن
جالی اور گل کاری کا پھن۔
حرکت کی آتی ہے آہٹ
وہ اٹھا اک نازک ریکٹ
گاہے اچھا ہاتھ لگا کر اپنے اوپر اتراتی ہیں
گاہے "ضربیں" خالی پا کر غصے میں شرما جاتی ہیں
دوسری جانب کھیلنے والے پہلے خود موقع دیتے ہیں
کچھ لمحے کے بعد ہرا کر غصے کی لذت لیتے ہیں
کالج کے رومانی لڑکے پاس ہی سے آتے جاتے ہیں۔
دیکھ کے "ٹینس لان" کی جانب سہگل کے گانے گاتے ہیں
پوچھ رہی ہیں ساتھی سے وہ بولو کیسا کھیل رہی ہوں؟
سوچ رہی ہیں اپنے جی میں سب سے اچھا کھیل رہی ہوں
ہاں یہ کیسی گیند کی تیزی
کیا اب کھیل ترقی پر ہے؟
یہ متواتر ضربیں کیسی
کیا مقصود اپنا جوہر ہے!
لیکن یہ کیا کھیلنے والے کیسے اچانک رُک سے گئے ہیں؟
کچھ ہنس کر کچھ پوچھ رہے ہیں، کچھ تارا کو دیکھ رہے ہیں۔
چپ ہیں وہ ماتھے پہ پسینہ اُن کے جیسے چھوٹ گیا ہے!
کھیلتے کھیلتے جانے کیسے اُن کا ریکٹ ٹوٹ گیا ہے۔

سلام مچھلی شہری اس نظم میں اس کے نتیجے کی بوسیدگی کے باوجود ایک اچھوتا موضوع پیش کر رہا ہے۔ اکثر انسانوں کی نگاہ ثابت ریکٹ کی طرف ہی نہیں جاتی، ٹوٹے ہوئے ریکٹ کی تو بات ہی جدا ہے، ۔۔۔ گویا موضوع واقعی اچھوتا ہے۔ سلام کے کلام کی سب سے نمایاں خوبی سادگی ہے اور اس کے علاوہ اُس کے فنی خصائص بھی اس نظم میں موجود ہیں۔ ریکٹ کا پھیلا ہوا بیضوی حصہ جالی اور گلکاری کا پھن، ہے، محاکاتی لحاظ سے ۔۔۔ جب اچھا ہاتھ لگتا ہے تو کھیلنے والی اتراتی ہے اور جب ضرب خالی جائے تو غصے میں شرما جاتی ہے۔ نفسیاتی مطالعہ بھی ہے ۔۔۔ "دوسری جانب کھیلنے والے پہلے خود موقع دیتے ہیں، اور کچھ لمحے کے بعد ہرا کے غصے کی لذت لیتے ہیں" (البتہ لطف اٹھانے کی بجائے لذت لینا کچھ ٹھیک نہیں۔ نیز کچھ لمحوں چاہئے تھا) ۔۔۔ حقیقت پرستی بھی ہے ۔۔۔ کالج کے رومانی لڑکے جب ٹینس لان کے پاس سے گذرتے ہیں تو سہگل کے گانے گاتے ہیں۔

آخر میں "میں کب اس سوسائٹی کا ہوں" اور "بس ان کا ٹوٹا ہوا ریکٹ دور یہاں سے دیکھ رہا ہوں" ۔۔۔ ان ٹکڑوں سے فن کار نے جو پلٹا کھایا ہے اس سے نظم کا موضوع ریکٹ نہیں رہا بلکہ وہ مضمحل اور ناکام نوجوان نمایاں ہو گیا ہے جس کے ہم قسمت انسانوں کی اس دنیا میں کمی نہیں ہے ایک جگہ غبارے کو تشدید سے باندھا گیا ہے۔ یہ غلطی ہے۔

پسپائی

کیوں جگاتے ہو مرے سینے میں اُمیدوں کو؟
رہنے دو، اتنا نہ احسان کرو۔
میں تو پردیسی ہوں اور آئی ہوں دو دن کے لئے
کل چلی جاؤں گی یا پرسوں چلی جاؤں گی
اور پھر آنے کا امکان نہیں۔
روز یوں گھر سے نکلنا بھی تو آسان نہیں
کیوں جگاتے ہو مرے سینے میں اُمیدوں کو؟

کیوں جلاتے ہو مرے دل کے چراغ
میں نے یہ سارے دیئے خود ہی بجھا ڈالے ہیں۔
آپ اس بستی کو تاریک بنا رکھا ہے۔
جس طرح جنگ کی راتوں کو بڑے شہروں میں
بتیاں خود ہی بجھا دیتے ہیں
زندگی کے سبھی آثار مٹا دیتے ہیں۔
اس طرح
میں نے یہ سارے دیئے خود ہی بجھا ڈالے ہیں
آپ اس بستی کو تاریک بنا رکھا ہے۔

اس پہ ہر رات نئے حملے ہوا کرتے تھے۔
آسماؤں سے کئی دشمن جاں طیّارے
انہیں شمعوں کا نشانہ رکھ کر
بم گرا جاتے تھے اور آگ لگا جاتے تھے۔
اس کو تاریک ہی تم رہنے دو
دل کی دنیا میں اجالا نہ کرو۔
میری امیدوں کو مدہوش پڑا رہنے دو

تم نہیں مانو گے؟
تم دیکھتے ہی جاؤ گے؟
اچھا دیکھو!
لو جلاؤ میرے سینے کے چراغ
دل کی بستی میں چراغاں کر دو۔
پھر مرے جینے کا — یا مرنے کا — ساماں کر دو۔

پریت لڑی مئی ۱۹۷۱ء — شریف کنجاہی

آس اُجالا ہے، یاس تاریکی۔ شروع سے یہ تصور انسانی زندگی میں چلا آیا ہے اور شاعری میں بھی۔ چاہت سے بھرپور دلوں کے لئے ان دونوں کیفیتوں کی باہمی کشمکش توجہ کا مرکز رہی ہے۔ گھر کو دل کا استعارہ کہا جاتا رہا ہے، اور یوں یاس سے پُر سینے کو کلبۂ تاریک، اندھیری کٹیا، خانۂ ویراں اور بہت کچھ اور ایسا کہا جاتا رہا ہے۔ لیکن اب تک اس "تاریکی، دل کی" تاریکی کی تشبیہہ میں کوئی حقیقت پرستانہ مماثلت پیدا نہ ہوئی تھی۔ آج نئی زندگی کی نئی باتیں چھوٹی صورتوں میں ہماری شاعری پر بھی اثر انداز ہو رہی ہیں۔ اس کی ایک مثال اوپر کی نظم ہے اگر یوں کہا جائے کہ اُمید کا اُجالا مفقود ہونے کی وجہ سے میرے دل میں بلیک آؤٹ ہو گیا ہے، تو بات ہنسی پیدا کر دے گی۔ لیکن شریف کنجاہی نے اسی تصور کو مندرجہ بالا نظم میں ایک فنکارانہ نفاست کے ساتھ پیش کیا ہے۔

آیئے اب قصہ قائم کریں۔ شاعر کسی گاؤں کا رہنے والا ہے "جس طرح جنگ کی راتوں کو بڑے شہروں میں" — یہاں شہر کی وسعت کی تخصیص، صرف لفظ "بڑے" اس کا اظہار کر رہا ہے کہ پیش نظر واقعے میں ہیرو اور ہیروئن کسی بڑے شہر میں نہیں ہیں، گاؤں میں ہو سکتے ہیں لیکن گاؤں میں بھی نہیں ہیں، — شروع میں ایک مصرعہ ہے "روز یوں گھر سے نکلنا بھی تو آسان نہیں" — گاؤں میں گھر سے نکلنا کچھ اتنا مشکل بھی نہیں ہوتا اگرچہ آج کل شہروں کی حالت بھی دگرگوں ہے) — تو گویا ہیرو اور ہیروئن نہ کسی بڑے شہر میں ہیں، نہ کسی گاؤں میں کسی قصبے میں ہوں گے۔ اور وہاں ہیروئن چند دن کے لئے آئی ہے (کل چلی جاؤں گی یا پرسوں چلی جاؤں گی) نہ جانے کن بہانوں سے یہ ملاقات میسر آئی ہے (روز یوں گھر سے نکلنا بھی تو آسان نہیں) — چوری چھپے کی اس ملاقات میں عاشق محبوبہ کی صورت کو تکتا چلا جا رہا ہے۔ شاید بہت عرصے کے بعد ملے ہیں اور اس لئے" اور عشرت کی تمنا کیا کریں، سامنے تو ہو، تجھے دیکھا کریں"! شاید گذشتہ جدائی نے ہیروئن کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا تھا کہ اب تو اتنا زمانہ بیت چکا۔ اب اُس کے دل میں میری وہ پہلی سی چاہ کہاں رہی ہو گی۔ اور اسی لئے جب عاشق اُسے ایک بے خودی سے دیکھے جاتا ہے تو اس کے دل میں مردہ تمنائیں جاگ اٹھتی ہیں، مٹی ہوئی امید پھر سے لہریں لینے لگتی ہے لیکن اُس کا نفس غیر شعوری اُسے کہتا ہے کہ وہ یاس کا اندھیرا وہ سکونِ یاس کچھ بُرا تو نہ تھا بُرا نہ تھا۔ پہلی اُمید و بیم والی اضطرابی کیفیت کے درد و کرب سے تو نجات

ملی تھی رنا کر وہ در د و کرب بھی ایک لذت لئے ہوئے تھا اُمید کی حالت میں کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے" سینکڑوں بھلے بُرے خیالات دل میں آتے تھے ۔ امید کہتی تھی ہم ملیں گے، یاس کا اندھیرا آتا اور سمجھاتا اگر وہ بے وفا نکلا؟ اُمید کہتی تھی ملنے کے بعد کس آرام سے رہیں گے ۔ یاس کا اندھیرا آتا اور سمجھاتا، نہ معلوم وہ اب کس حال میں ہے، دشمنوں کو کہیں کچھ ..... دشمن، ہاں دشمن بھی تو آج کل جب شہروں میں اندھیرا کر دیا جاتا ہے ۔ تو حملہ آور ہوتا ہے اس کے طیارے یاس کے خیالات کی طرح امید کی شمعوں کا نشانہ رکھ کر دل کی بستی میں آگ لگا جاتے ہیں ۔ اب میں ہوں، میرا چاہنے والا ہے ۔ یہ مجھے تک رہا ہے "تکتا ہی چلا جا رہا ہے ۔ اس کے یوں دیکھنے سے سکون یاس کا اندھیرا مٹ گیا، میرا وہم تھا، یہ بے وفا نہیں ہے، ہم ملیں گے ۔ ملنے کے بعد کس آرام سے رہیں گے، ـــــ لیکن کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے" ـــــ پھر وہی پہلی کیفیت قائم ہو گئی اور صرف اس لئے کہ عاشق محبوب کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے ہے ۔ محبوبہ نہیں چاہتی کہ وہ یوں دیکھے، امید دل کو جگائے لیکن وہ نہیں مانتا ـــــ محبوبہ ہار مان لیتی ہے "اچھا دیکھو! ـــــ لو بلاؤ میرے سینے کے چراغ" ـــــ اور یہاں "دل" کے چراغ "سینے" کے چراغ بن کر ایک کنائتی رنگ لے آتے ہیں اور اگر یہ کنایہ صحیح مانا جائے تو آخری مصرعے میں دھر مرے جینے کا ـــ یا مرنے کا ـــ سامان کر دو) ـــ "جینے یا مرنے کا سامان" سماجی پابندیوں کے ان گنت پہلوؤں کا عکس بن جاتا ہے ۔

میراجی

شعر

میر صاحب رُلا گئے سب کو

کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

میر تقی

نقد و نظر

"کونپل" اور "ہوائی قلعے"

پہلی کتاب مکتبۂ اردو لاہور اور دوسری اردو بک سٹال لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ قیمت علی الترتیب ۱۲ اور ۸ ہے۔ جو مضامین کے لحاظ سے مناسب بلکہ کم اور ضخامت کے اعتبار سے زیادہ ہے۔ دونوں کتابوں میں اغلاط کی افراط ہے۔ لکھائی چھپائی دونوں کی بہت خوب اور گردپوش خوبصورت اور دیدہ زیب ہیں۔

کرشن چندر اور اُپیندر ناتھ اشک ہمارے جدید افسانوی ادب میں جو اہمیت رکھتے ہیں وہ ناظرینِ "ادبی دنیا" سے مخفی نہیں۔ دونوں فن کاروں کی پُرخلوص ادبی خدمات ہمارے لئے باعثِ فخر و مباہات ہیں اور مستقبل کا مورخِ ادب جب بیسویں صدی کے چوتھے عشرے کی فنی ترقیوں کا حال بیان کرے گا تو کرشن چندر اور اُپیندر ناتھ اشک کا نام شاید اُسی ایک سانس میں لے گا۔ جس سانس میں وہ "ادبی دنیا" کی ناچیز خدمات کا ذکر کر رہا ہوگا۔

یہ دونوں فن کار جہاں اپنی خدمات کے اعتبار سے ہم پایہ ہیں۔ وہاں اپنی تخلیقات کی نوعیت اور زبان و بیان کے لحاظ سے باہم دگر بالکل مختلف ہیں اس ضمن میں مثالاً ایک لطیفہ پیشِ خدمت ہے :-

اس ماہ کے "نقد و نظر" کے سلسلے میں جب رفیقِ گرامی میراجی نے مجھے یاد دلایا کہ اب کے یہ صفحات مجھے لکھنے ہیں اور میرے ذمے کی کتابوں میں "کونپل" اور "ہوائی قلعے" کا نمبر آچکا ہے تو میں کہ اپنی تفصیل نگاری کے ہاتھوں عاجز ہوں اس شش و پنج میں پڑ گیا کہ دونوں میں سے کون سی کتاب کا انتخاب کروں۔ ہمارے ہاں "نقد و نظر" کا دامن وسیع ہونے کے باوجود عموماً تنگ ہی ثابت ہوتا ہے اور ایک دفعہ میں ایک سے زیادہ کتابوں پہ ریویو کرنا کم از کم میرے بس کی تو بات نہیں۔

ازبس کہ ہم پر اشک اور کرشن دونوں کے حقوق ایک ہی جیسے ہیں اس لئے جب مجھے اس مشکل کا یہ حل دفعۃً سوجھا کہ دونوں کتابوں کی وصولی کی تاریخ دیکھ لی جائے اور جو کتاب پہلے آچکی ہو اِس بار اُسے لے لیا جائے۔ تو یقین جانیئے میں فرطِ مسرت سے اُچھل پڑا لیکن تقدیر کھڑی ہنس رہی تھی۔ "کونپل" کا سرورق اٹھا تو سامنے یہ تحریر تھی :-

مولانا صلاح الدین صاحب کو

سادر

اوپندر ناتھ اشک

۴ر دسمبر ۱۹۴۲ء

اسے سامنے رکھ کر "ہوائی قلعے" کا پہلا ورق نکالا تو لکھا تھا :-

محبی صلاح الدین احمد کی نذر

بخلوصِ تمام

کرشن چندر

۴ر دسمبر ۱۹۴۲ء

یہ تو ہوا اس لطیفے کا "کلائی میکس" لیکن "اخلاقی نتیجہ" ابھی باقی ہے اور وہ ہے ان دونوں فن کاروں کے اندازِ بیان کا باہمی اختلاف۔ بات یہیں سے چلی تھی۔ بظاہر دو دو الفاظ کی یہ دو سطریں بے حقیقت سی نظر آتی ہیں لیکن مجھ سے پوچھیے تو میں ان ننھی منی سطروں کو نہ صرف ان فن کاروں کے اسلوب نگارش کا آئینہ دار سمجھتا ہوں بلکہ ان کی ذہنی کیفیتوں کا عکس بھی تصور کرتا ہوں۔ اشک نے افسانہ نگاری اردو میں شروع کی لیکن ہندی والوں نے اپنے وسیع تر ذرائع کے باعث اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اب نہ صرف اس کی زبان غیر شعوری طور پہ ہندی آمیز ہوتی جا رہی ہے بلکہ اس کے اسلوب بیان میں بھی ہندی والوں کا سا روکھا پن آ رہا ہے لیکن شکر ہے کہ موجودہ تصنیف جس کے بیشتر افسانے اردو کے بلند پایہ رسائل میں چھپ چکے ہیں ایک بڑی حد تک اس رجحان سے مبرا ہے۔ دراصل یہ مجموعہ اشک کا پہلا معقول مجموعہ ہے۔ اور اس کی تدوین میں جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے اشک نے خاص کاوش

سے کام لیا ہے۔

کرشن چندر نے پہلے پہل جب لکھنے کو قلم اُٹھایا تو وہ ہماری زبان کی لطافتوں اور سان کی ممکنات سے ایک بڑی حد تک متأثر ہو چکا تھا۔ اسی لئے اس کی تحریر کی سب سے نمایاں خوبی چست بندشوں اور خوب صورت الفاظ کا انتخاب ہے۔ موجودہ مجموعے میں یہ خوبی اگرچہ اپنی پوری شان سے قائم ہے لیکن بعض بعض مقامات پر زبان و محاورہ کی لغزشیں بُری طرح کھٹکتی ہیں۔

ہوائی قلعے ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو بیشتر ہفتہ وار اخبارات میں چھپے اور ہفتہ وار صحافت کی عجلتیں مصنف یا مدیر کو پیشِ نظر مواد کی نوک پلک سنوارنے کا موقع نہیں دیتیں۔ بظاہر ہوائی قلعے کے پبلشر نے ان اخبارات کے کٹنگ لے کر ان کی اسی طرح کتابت کرا دی اور شاید اپنی منصبی مصروفیات کے باعث جناب مصنّف اس پر نظرِ ثانی نہیں کر سکے۔

"ایسے" یعنی انشائے لطیف کی بنیاد جن عناصر پر رکھی جاتی ہے۔ اُن میں زبان سب سے اہم ہے۔ اس لئے ایک کامیاب مصنّف کو اس بارے میں نہایت احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ زبان کی ذرا سی لغزش اس سارے تاثر کو منہدم کر دیتی ہے جو فن کار ایک معمولی سے خیال کی بنیاد پر بڑی محنت سے تعمیر کرتا ہے۔

"ہوائی قلعے" اردو کی ان معدودے چند کتابوں میں سے ہے جن کا موضوع زندگی، اور ذریعۂ اظہار انشائے لطیف ہے۔ اس صنفِ ادب میں کرشن چندر نے اپنے لئے ایک مخصوص پیرایۂ بیان چن لیا ہے۔ وہ اپنی تحریر کو اگرچہ افسانے کے قالب میں ڈھالتا ہے لیکن اسے افسانے کے اصطلاحی لوازم سے بچائے رکھتا ہے۔ طنز کی ایک لطیف سی لہر اس کے رگ دپے میں جاری رہتی ہے۔ اور اس طرح پڑھنے والا بہت سی تلخ حقیقتیں منہ بنائے بغیر نگل جاتا ہے۔ ہماری رائے میں کرشن چندر کی انشائے لطیف اور اس کے افسانوں میں محض ایک ہلکا سا اصطلاحی فرق ہے۔ اور موجودہ مجموعے کے بیشتر مضامین ایسے ہیں جن سے ملتے جلتے مضامین افسانوں کی شکل میں مصنّف کے پہلے مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً بے رنگ و بو دو فرلانگ لمبی سڑک وغیرہ۔ اور سچ پوچھئے تو دو فرلانگ لمبی سڑک کے پائے کا کوئی مضمون موجودہ مجموعے میں نہیں ہے۔ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ "الف لیلہ کی گیارھویں رات"، "سوا راج سے پچاس سال بعد"، "عشق اور ایک کار" اور "ہوائی قلعے" زندگی کے بعض مناظر کو ایسے لطیف پیرائے میں پیش کرتے ہیں کہ مصنّف کی فنی مہارت آپ سے داد چھین چھین لیتی ہے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس مجموعے کے بیشتر مضامین زندگی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ ہماری اور آپ کی زندگی سے عوام کے مسائلِ حیات سے۔ اور مقامِ شکر ہے کہ ان کا مصنّف ان کی تحریر کے وقت زندگی کے ایسے دور سے گزر رہا تھا جس پر ابھی آسائش کا رنگ نہیں چڑھا تھا۔ ورنہ ممکن ہے کہ وہ ایسی بے رحمانہ حقیقت نگاری سے کام نہ لیتا جو پیشِ نظر صفحات سے جھلک رہی ہے اور جس نے ان مضامین کے لئے ہمارے طنزیہ ادب میں ایک بلند مقام حاصل کر لیا ہے۔ کرشن چندر کی طنز نگاری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جھٹکے نہیں دیتا بلکہ چٹکیاں لے لے کر مارڈالتا ہے پڑھنے والے پر چھا جانے کی کبھی کوشش نہیں کرتا اور نہ اس کا مزاج بگاڑتا ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیتا ہے۔ مضمون کا عنوان دیکھ کر آپ اس کی مخالفت پر تُل جاتے ہیں لیکن جب اسے ختم کرتے ہیں تو خود کو اس کے ہم رکاب پاتے ہیں۔ اُس کی بے پناہ طنز اپنے نادرہ کار حسن سے آپ کو اسیر کر لیتی ہے۔ اور ایک شیریں زبان ساحرہ کی طرح آپ کو اپنی ہم نوائی پر مجبور کر دیتی ہے۔

عشق اور ایک کار میں نادار سکھو جوبے کا تعلیم یافتہ طبقے کی نمایندگی کرتا ہے، ایک بورژوا لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ واقعہ اور کردار کا یہ ٹائپ کس قدر عام ہے لیکن ہمارے طنز نگار نے اسے کیسی خوبی سے ایک اچھوتا پن عطا کیا ہے۔ دیکھئے :-

> "اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں پلازا تھیئٹر کے تیسرے درجے میں بیٹھا تھا۔ اور وہ فرسٹ کلاس میں تھی لیکن پھر بھی میری محبت کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی سنیما کے دروازوں میں روشنی بڑھ جاتی۔ تو میں مڑ کر اس کی طرف دیکھنے سے باز نہ رہ سکتا تھا اور کھیل کے ختم ہونے تک تو مجھے یقین ہو گیا کہ ربِّ عظیم نے مجھے ایک جاودانی جذبے سے نوازا ہے۔ چنانچہ اسی جذبۂ سرمدی سے سرشار ہو کر میں نے کھیل ختم ہونے کے بعد لڑکی کی کار کی طرف مخمور نگاہوں سے دیکھا اور پھر احتیاط سے اس کا نمبر اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیا ....
>
> میں یہ بیان نہیں کرنا چاہتا کہ اس کے بعد ہم کہاں ملے اور کیسے ...... وہ مجھے یقیناً پسند کرتی تھی اور پھر ایک دن میں نے لال باغ میں اسے چند غنڈوں کی چھیڑ چھاڑ سے بچا لیا! اگرچہ اس میں شک نہیں کہ وہ غنڈے میں نے ہی کرائے پر مہیا کئے تھے۔ اور میں ہی انھیں لال باغ لے گیا تھا۔ غرضکہ میں نے فضل بک ڈپو کے ناولوں کا ہیرو بننے کی پوری پوری سعی کی۔ وہ اس دن سے مجھے اور بھی پسندیدہ (؟) نظروں سے دیکھنے لگی۔ اور میں تو اس کے قدموں کی مٹی کو پوجتا تھا ...... میں یقیناً خوش تھا اور یقیناً ایک لمبے عرصے کے لئے خوش رہتا۔ اگر مہندر نے اپنے

محبت کے جنتی نظریئے سے میری عقل کو مسلوب نہ کر دیا ہوتا۔ پچھلے
اتوار مسنر نے مجھ سے کہا تھا کہ اپنی محبوبہ سے شادی کی درخواست کرو،
کم بخت یہیں سامنے تو بیٹھا ہے ......

"ہیلو ۔ لو" اس نے پھر حیرانی سے کہا "یہ کیا؟ تم
آج ایک نئی ٹائی لگائے ہوئے ہو، خیر تو ہے؟"

میں نے اپنے چہرے پر ایک حزنیہ مسکراہٹ پیدا کرلی
اور پھر کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گیا اور آہستہ سے کہنے لگا
پڑھے جاؤ کرت ۔۔۔ کی ۔ پڑھے جاؤ۔ میں تمھاری شیریں آواز
سننا چاہتا ہوں۔ یہاں تک کہ یہ نغمہ کیٹس کی بلبل کے نغمے کی طرح
مجھے اپنے آپ میں تحلیل کرلے۔ آہ۔ تمھاری آواز کس قدر شیریں ہے

اس نے بلند آواز میں پڑھنا شروع کر دیا لیکن اب وہ چیخ رہی
تھی اور تلخ لہجے میں میری نقلیں اتار رہی تھی۔

"کل میں نے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں پنگ پانگ چیمپین
شپ جیت لیا"

میں نے اپنے سر کے گرد ایک روحانی ہالہ بناتے ہوئے
کہا "بہت خوب" کرسی نے جواب دیا "کیا تم ایک دیوار کے مقابلے
میں کھیل رہے تھے، بدھو اڈوانی۔ مذاق کی حد ہو چکی"

میں تم سے پیار کرتا ہوں، مذاق کی حد ہو چکی۔ کرسی میری
بات سنو، مجھے تم سے محبت ہے بے اندازہ محبت۔ کرسی۔ کیا
تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

وہ چند ثانیئے خاموش رہی۔ پھر اس نے سنجیدہ ہو کر
پوچھا "تمھارا باپ کیا کام کرتا ہے؟"

"سچی محبت" میں نے جواب دیا "مذہب نسل اور باپ
کی تمیز سے بالاتر ہے۔ یہ ایک روحانی، سرمدی ......"

کرسی نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا "تم ایک مہینہ
میں کتنا کما لیتے ہو؟"

میں نے احتجاجاً کہا "میں ۔۔۔ اشتراکی ہوں"
"کیا تمھارے پاس ایک کار ہے؟"

"کار تو نہیں لیکن ایک بائیسکل ضرور ہے جو مجھے کیپیٹل
سینما کی دیوار کے ساتھ لگا ہوا مل گیا تھا" میں نے تفاخراً کہہ دیا
کرسی نے جھٹ گھنٹی بجائی اور اس کا ملازم داؤد کمرے
کے دروازے میں نمودار ہوا۔

"داؤد!" کرسی نے بلند آواز میں کہا۔ اس کی آواز میں
غصے کے ساتھ عصمت و عفت کے نسائی جذبات کوٹ کوٹ کر
بھرے ہوئے تھے "داؤد ۔۔۔ اس بدمعاش کو کمرے سے
باہر نکال دو"

سکھو نے داستان ختم کر دی اور اپنے خیالوں کی دنیا میں
گم ہو گیا۔ کلب میں ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ ج۔ س اور پنڈ
اپنی کرسیوں پر اس طرح سہمے ہوئے بیٹھے تھے جیسے کسی استاد کی گھرکی
سے بچے دبک کے بیٹھ جائیں۔ آتش دان میں جلتی ہوئی لکڑیوں
پر تیز تیز شعلے چمک جاتے تھے۔ یکایک کلب کے سب سے
پرانے ممبر نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور سکھو کے حزیں چہرے کی
طرف دیکھ کر کہا۔ بیٹا سکھو۔ غم کھانے سے کیا ہوتا ہے، انقلاب
کے لئے کام کرو اور خدا کا شکر کرو کہ اپنی روحانی محبت کے باوجود
تم زندہ ہو۔ ورنہ اگر تم کسی بورژوا ناول کے ہیرو ہوتے تو اس واقعے
کے بعد یقیناً خودکشی کر لیتے!"

اقتباس قدرے طویل ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ یہ کرشن چندر کی انشانویسی
کے تمام عناصر کی نمایندگی کرتا ہے۔ ہمارے نوجوان طبقے کی جنسی فاقہ زدگی۔ رومانی
خود فراموشی اور زندگی سے فرار کی کوشش کو اس سے زیادہ مؤثر پیرایۂ بیان شاید کبھی
نصیب نہیں ہوا۔ اور سماج اور عورت اور عشق اور روٹی کی ایسی ظالمانہ تحلیل بہت کم
فن کاروں کے حصے میں آئی ہے۔ مضمون کا آخری حصہ اپنے اندر ایک ڈرامائی تأثر
لئے ہوئے ہے اور اپنے ادبی کیف سے اس تأثر کو شدید تر کئے دیتا ہے۔ یہ
ادبی کیف اردو کے بہت کم طنز نگاروں کو میسر ہے۔ اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ
وہ اپنی افتادِ طبع اور رجحان ادبی کے لحاظ سے محض طنز نگار ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں
لیکن کرشن چندر کی ادبی تربیت ایک رومانی ماحول میں ہوئی اور اس نے زندگی پر
ہنسنے سے پہلے زندگی کے ساتھ ہنسنے کی کوشش کی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اس کوشش
کا کیا حشر ہوا لیکن بظاہر اس نے تیز و نازک تأثرات اور حسین و جمیل نگارشات کا
ایک لطیف ورثہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ جو اس فن کار کی ہر اچھی تخلیق پر چھایا جاتا ہے
مجموعے کے آخری مضمون "ہوائی قلعے" کا آخری ٹکڑا ملاحظہ ہو:۔

"وہ اٹھارہ برس کی لڑکی جس سے بڑے چاؤ سے چھوٹی عمر میں جھوٹ
موٹ بیاہ رچایا تھا کیوں عین شباب کی سرمستیوں میں ایک بالکل
انجان، ناواقف آدمی کی بیاہتا بن کر چلی گئی اور تمھارے کلیجے میں

ناسور پیدا کر گئی ... لیکن جہاں تم نے جوانی میں کئی پرانے قلعوں کو بچشم پرنم خیر باد کہی دی؟ وہاں تم نے بہت سے نئے قلعوں کی تخلیق بھی کی۔ تم نے اپنی ساولی محبوبہ کی نکہت کو چنبیلی کے پھولوں کی طرح حسین بنا دیا ... اپنے غریب ملک کے جھنڈے کو اتنا بلند کیا کہ کائنات کی کل وسعتیں اس کے سائے تلے آگئیں۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے کی جگہ ایک جگمگاتا ہوا زمرد و لعل و جواہر کا محل تیار کیا ... تم دنیا کے سب سے بڑے شاعر ادیب، افسانہ نویس، سیاست دان، سپاہی حکیم اور مصلح کہلائے اور شہرتِ دوام کا تاج تمہارے سر پر رکھا گیا!

لیکن ان باتوں کے باوجود تمہاری آنکھ اس وقت کھلی جب تم ایک حقیر سے دفتر میں ایک حقیر سی نوکری حاصل کرکے ایک حقیر سے مشاہرے پر ملازم ہوئے۔ تمہارے ماں باپ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے اور تمہارے پلے ایک چڑچڑی اور بھید وفادار بیوی باندھ گئے۔ محبت کے سوتے خشک ہو گئے۔ پھوس کے جھونپڑے جل گئے اور تمہارے ملک قوم غریب تر ہوتے گئے

× × × × × × × × ×

مگر اتنا کچھ ہونے پر بھی ہوائی قلعوں کی تعمیر ہوتی رہتی ہے جوانی کے بعد پیری آئی۔ اب پچھلے سب قلعے معدوم ہو چکے۔ اپنے لئے کچھ باقی نہیں۔ اب توجہ دوسروں کی طرف ہے۔ بوڑھے باپ نے قلعے بنائے اپنے جوان بیٹے کے لئے۔ بوڑھی ماں نے اپنے لرزتے ہوئے تخیّل میں اپنی جوان بیٹی کے خاوند کو دیکھا کہ اس کے گھوڑے کی رکابیں موتیوں سے گندھی ہوئی ہیں۔ اور اس کے خوبصورت دولہا نے اپنا سر ساس کے پیروں میں رکھ دیا ہے۔

نوجوان پوتے نے دادا کے نام پر ایک بہت بڑا ہسپتال تعمیر کیا ہے جس میں دنیا بھر کے گنٹھیا کے مریضوں کا مفت علاج ہوتا ہے کیونکہ بڑا دادا کو خود گنٹھیا کا مرض ہے اور وہ ڈاکٹروں کو فیس دیتے دیتے تنگ آگئے ہیں۔

خدائے برتر نے ستر سال سے زیادہ عمر کے بوڑھوں کے سب گناہ بخش دئیے ہیں۔ ان میں بوڑھے دادا بھی شامل ہیں وہ خوشی سے ناچنا چاہتے ہیں۔ مگر گنٹھیا کی وجہ سے نہیں ناچ سکتے وہ گانا چاہتے ہیں۔ مگر زبان پر لکنت طاری ہو جاتی ہے۔ سننا چاہتے ہیں مگر ساری کائنات پر یکایک ایک بسیط خاموشی چھا جاتی ہے۔ پھر چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا۔ یا روشنی ہی روشنی یا پانی ہی پانی۔ پھر انھیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمٹ رہے ہیں سکڑتے ہوئے سمٹتے ہوئے صرف ایک ذرّہ بن کر رہ گئے ہیں اندھیرے کا ایک ننھا سا ذرّہ۔ روشنی کی ایک چھوٹی سی کرن۔ پانی کی ایک پتلی سی لہر۔

اس طرح ہوائی قلعے بناتے بناتے زندگی گزر جاتی ہے"

آپ نے دیکھا! ایک رنگین تخیّل اور دل پذیر انداز بیان نے کتنی خوبی کے ساتھ طنز کی وہ تمام تلخی بکھیر ڈالی ہے جو درحقیقت اس پارے کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق خلاق کی آئینہ دار بن گئی ہے۔ ایک ادبی کارنامے کے نقاد کو شاید یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ تصنیف سے مصنف کے کردار کو جانچے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ جب میری نگاہ ان اوراق پر پڑتی ہے تو ان کا لکھنے والا انھیں اپنے گرد لپیٹتا ہوا میرے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے لبوں پر ایک ہلکا سا تبسم ہے اور آنکھوں کی گہرائیوں میں ایک ناقابل بیان حزن۔ وہ بظاہر ہنستا ہے لیکن اس کی ہنسی کی بازگشت سننے والوں کے دل و دماغ پر ایک نغمۂ یاس بن کر چھا جاتی ہے پھر کون ہے جو گریہ و تبسم کے اس سیلاب میں نہ بہ جائے اور کون ہے جو اس طنز کی شیریں خلش کو اپنے دل و جگر میں جگہ نہ دے۔

کرشن چندر اس خصوصیت کے اعتبار سے اردو کے تمام طنز نگاروں میں ممتاز ہے لیکن کیسے تعجب کا مقام ہے کہ ہمارے فاضل نقادوں میں سے ایک نے بھی طنز نگاروں کے کسی تذکرے یا جائزے میں اس نوجوان فن کار کا نام تک نہیں لیا۔ ادبی ناشناسی کی اس سے عجیب تر مثال نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔

اور اب کونپل

جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں۔ اس مجموعے کے افسانے سلیس اور سادہ اردو میں لکھے گئے ہیں اور شدھ ہندی کے نامانوس الفاظ سے عبارت کو بے کیف بنانے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اور اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ ان میں سے بعض افسانے کتابی صورت میں آنے سے پہلے ادبی دنیا اور چند دیگر بلند پایہ رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ غالباً دو تین چیزیں نئی بھی ہیں۔ یا کم از کم عام ناظر کے لئے بالکل نئی ہیں۔ اشک صاحب میں یہ ایک قابل تعریف بات ہے کہ وہ اپنے مضامین پر ہمیشہ ایک کڑی نگاہ رکھتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ان کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ اور یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ جب اس مجموعے کی تدوین کا وقت آیا تو اس کے مصنف نے اکثر مضامین

دوبارہ لکھے اور ان کی پہلی طباعت اور موجودہ تالیف کے درمیانی وقفے میں اسے جو فنی یا لسانی اصلاحیں سوجھیں ان سے انھیں آراستہ کیا۔ اور اب ہم بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ کونپل اردو کے مختصر افسانوں کے مجموعوں میں ایک امتیازی درجہ رکھتی ہے اتنا افسوس ضرور ہے کہ بعض ایسے افسانوں میں جو اچھے رسائل میں نہیں چھپے زبان و محاورہ کی چند غلطیاں بھی نظر آتی ہیں اور بعض افسانوں کے عنوانات بھدّے اور اجنبی سے ہیں مثلاً گوکھرو، ددلو وغیرہ لیکن بقول اشک ' آخر ناموں میں کیا رکھا ہے ؟ ان کی جرات کی تو یہ کیفیت ہے کہ انھوں نے اپنی پہلی اردو تالیف کا نام "ڈاچی" رکھ دیا اور ڈاچی اردو زبان کا کوئی لفظ نہیں۔

بہرحال — — پیش نظر مجموعے کے گیارہ افسانوں میں سے "راج کما" کو چھوڑ کر باقی تمام کہانیاں زندگی کی بولتی ہوئی تصویریں ہیں۔ "آج کما" البتہ ایک رومانی مطالعہ ہے جو اس مجموعے میں شامل نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔ اس ایک چیز نے نہ صرف کتاب کی انفرادیت کو صدمہ پہنچایا ہے بلکہ اشک کی ایک نہایت اہم خصوصیت کو بے رنگ کر دیا ہے۔ ہمارے نوجوان مصنفین میں سے عاشق حسین بٹالوی کے سوا اور کوئی قابل ذکر افسانہ نگار ایسا نہیں ہے جس نے اپنے مطالعے کا میدان عمداً اس قدر محدود کر دیا ہو جس قدر اشک نے کر دیا ہے اور اس کا بڑا بھاری فائدہ اسے یہ پہنچا ہے کہ مطالعہ کی باریکی کے باعث اس کی کہانیاں پلاٹ کے لحاظ سے تقریباً بے عیب ہوتی ہیں اگرچہ اس کا مطالعہ داخلی نہیں بلکہ خارجی ہے لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ اپنی تمام جزئیات میں وہ زندگی اور مشاہدے سے براہ راست متاثر ہوتا ہے جزئیات نگاری افسانہ نگاری کی جان ہے اور جس فن کار نے اس پر قابو پا لیا وہ اپنے فن میں کامیاب ہے۔ اشک ہندو سوسائٹی کے نچلے متوسط طبقے کی زندگی سے بیحد متاثر نظر آتا ہے۔ اس کے معاشرتی مسائل کا اس نے غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اس کے افسانے اس کے شدید مطالعے کے شاہد ہیں۔ یہ ایک خوشی کی بات ہے کہ اس نے مغربی افسانہ نگاری سے واقفیت کے باوجود اس کا اثر قبول نہیں کیا۔ اس کی کہانیاں نہ صرف گہرے مقامی رنگ میں رنگی ہوتی ہیں بلکہ خالص ہند و معاشرت کی ایسی ہو بہو تصویریں ہوتی ہیں جنھیں صرف ایک محرم راز ہی کھینچ سکتا ہے۔ ہمارے عام افسانہ نگاروں میں مغربی افسانوں کو اپنانے اور خود اپنے تجرباتی افق سے پار جھانکنے کی جو وبا سی پھیل رہی ہے اشک اس سے یکسر محفوظ ہے۔ وہ جو کچھ لکھتا ہے اس پر اسے پورا قابو ہوتا ہے اور اسی لئے اس کی صناعی میں ایک خوش آیند پختگی بے تکلفی اور مہارت پائی جاتی ہے۔ مجھے اس کے افسانے پڑھتے وقت بارہا ایسا محسوس ہوا ہے کہ اشک ایک چابکدست کمہار ہے جو اپنے مشاہدے کا چاک گھمائے جا رہا ہے اور بڑی آسانی سے اس پر سے ایسے ایسے نازک اور سڈول کوزے اتارے جاتا ہے جو اپنی نزاکت میں افرنگ کی بلوری صراحیوں کو پرے بٹھاتے ہیں۔

ہاں اتنا ہم بھی محسوس کرتے ہیں کہ اشک اگر کسی سے متاثر ہوا ہے تو وہ منشی پریم چند آنجہانی کی ذات گرامی ہے۔ پریم چند کے افسانوں کے متعلق یہاں کچھ کہنے کا موقع نہیں ہے لیکن ان کی اس خصوصیت سے سب لوگ واقف ہیں کہ ان کا ہر افسانہ ہماری کسی نہ کسی اخلاقی یا سماجی کمزوری کو بے نقاب کر کے ہمارے فکر و احساس کو اس کے خلاف صف آرا کر دیتا ہے۔ اور یہ عمل کچھ ایسے غیر معلوم طریق پر سرانجام پاتا ہے کہ ہم شعوری طور پر اس تبدیلی سے آگاہ نہیں ہوتے۔ اور یہ سلیقہ ان کے فن کا سب سے باریک اور اہم نکتہ ہے۔ اشک میں بھی ہم بعینہٖ یہی خصوصیت پاتے ہیں۔ وہ اپنی دیکھی بھالی زندگی میں سے کوئی چبھتی ہوئی چیز چن لیتا ہے اور اسے ایسے انداز سے پیش کرتا ہے کہ ہم اسے بظاہر کسی مقصد یا مدعا کی طرف بڑھتے ہوئے نہیں دیکھ پاتے مگر اس کے باوجود وہ اپنا مطلب حل کر لیتا ہے اور ہمارے تحت الشعور میں ہلچل مچا دیتا ہے۔ زیر نظر مجموعے کا بہترین افسانہ کونپل اس کے اس شعبدے کی بہت اچھی مثال ہے سنیکری ایک ٹائپ ہے نوجوان ہندو بیوہ کا سہاگ کے دنوں میں پاک دامن رہنے کے باوجود وہ اپنے بوڑھے شوہر کے شک سے محفوظ نہیں رہتی۔ زندگی کی اور بے کیف مصروفیتوں میں وہ اس قدر منہمک ہے کہ دبائے جانے اور پھر ابھرنے کے موقعے پانے کے باوصف اس کی جنسی زندگی میں کوئی بحران پیدا نہیں ہوتا۔ ایک ہندو عورت کو شوہر پرستی کی ایسی سخت تربیت دی جاتی ہے کہ شعوری طور پر اس میں جنسی بغاوت کا پیدا ہونا نہایت مشکل ہے اور اس کا نفسیاتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے دبے ہوئے جذبات و احساسات کسی اور محور کے گرد گھومنے لگ جاتے ہیں اور وہ جب زندگی کی تلخ کیفیتوں سے ذہنی طور پر فرار ہوتی ہے تو اسے اسی محور میں تسکین کا سامان میسّر آتا ہے۔ موجودہ افسانے میں زیور پہننے کا شوق اس محور کی نمایندگی کرتا ہے اور فن کار نے نہایت خوبی سے اسے ہلکی ہلکی جنسی لہروں پر جھلایا ہے۔ دیکھئے :-

"سینکری کی عمر اس وقت صرف تیرہ برس کی تھی لیکن اس کے بھرے بھرے ہاتھ پاؤں برائی کی سنہری صبح کے سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ کنگن اس کی کلائیوں میں ایسے ٹھیک بیٹھے کہ کچھ دیر بعد ان میں سے ایک کو اسے اپنی جگہ سے کھسکانا پڑا۔ اس کی جگہ خون اکٹھا ہو جانے سے ایک سرخ حلقہ سا بن گیا تھا۔ بہت دیر تک وہ مسحور سی ہو کر اسے دیکھتی رہی۔ پھر کلائیوں سے لٹکتے ہوئے کلیروں اور ناک میں پڑی ہوئی بڑی تنکار پوری نتھ کو سنبھالتی ہوئی وہ اٹھی اور جا کر سہیلیوں کو اپنا ایک ایک گہنا اور اس کی بناوٹ دکھانے لگی ......

تاسور پیدا کر گئی ... لیکن جہاں تم نے جوانی میں کئی پرانے قلعوں کو باچشم پرنم خیرباد کہی (؟) وہاں تم نے بہت سے نئے قلعوں کی تخلیق بھی کی۔ تم نے اپنی سانولی محبوبہ کی نگہت کو چنبیلی کے پھولوں کی طرح حسین بنا دیا ... اپنے غریب ملک کے جھنڈے کو اتنا بلند کیا کہ کائنات کی کل قوتیں اس کے سائے تلے آ گئیں۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے کی جگہ ایک جگمگاتا ہوا زمرد و لعل و جواہر کا محل تیار کیا ... تم دنیا کے سب سے بڑے شاعر ادیب، افسانہ نویس، سیاست دان، سپاہی، حکیم اور مصلح کہلائے اور شہرت دوام کا تاج تمہارے سر پر رکھا گیا!

لیکن ان باتوں کے باوجود تمہاری آنکھ اس وقت کھلی جب تم ایک حقیر سے دفتر میں ایک حقیر سی نوکری حاصل کر کے ایک حقیر سے مشاہرے پہ ملازم ہوئے۔ تمہارے ماں باپ اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور تمہارے پلّے ایک چڑچڑی اور بھید وفادار بیوی باندھ گئے۔ محبّت کے سوتے خشک ہو گئے۔ پھونس کے جھونپڑے جل گئے اور تمہارے ملک و قوم غریب تر ہوتے گئے۔

× × × × × × × × ×

مگر اتنا کچھ ہونے پر بھی ہوائی قلعوں کی تعمیر ہوتی رہتی ہے جوانی کے بعد پیری آئی۔ اب پچھلے سب قلعے معدوم ہو چکے۔ اپنے لئے کچھ باقی نہیں۔ اب توجہ دوسروں کی طرف ہے۔ بوڑھے باپ نے قلعے بنائے، اپنے جوان بیٹے کے لئے۔ بوڑھی ماں نے اپنے لرزتے ہوئے تخیّل میں اپنی جوان بیٹی کے خاوند کو دیکھا کہ اس کے گھوڑے کی رکابیں موتیوں سے گندھی ہوئی ہیں۔ اور اس کے خوبصورت دولہا نے اپنا سر ساس کے پیروں میں رکھ دیا ہے۔

نوجوان پوتے نے دادا کے نام پر ایک بہت بڑا ہسپتال تعمیر کیا ہے جس میں دنیا بھر کے گنٹھیا کے مریضوں کا مفت علاج ہوتا ہے۔ کیونکہ دادا کو خود گنٹھیا کا مرض ہے اور وہ ڈاکٹروں کو فیس دیتے دیتے تنگ آ گئے ہیں۔

خدائے برتر نے ستّر سال سے زیادہ عمر کے بوڑھوں کے سب گناہ بخش دیئے ہیں۔ ان میں بوڑھے دادا بھی شامل ہیں وہ خوشی سے ناچنا چاہتے ہیں۔ مگر گنٹھیا کی وجہ سے نہیں ناچ سکتے وہ گانا چاہتے ہیں۔ مگر زبان پر لکنت طاری ہو جاتی ہے۔ سننا چاہتے ہیں مگر ساری کائنات پر یکایک ایک بسیط خاموشی چھا جاتی ہے۔ پھر چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا۔ یا روشنی ہی روشنی یا پانی ہی پانی پھر انہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمٹ رہے ہیں سکڑتے ہوئے سمٹتے ہوئے صرف ایک ذرّہ بن کر رہ گئے ہیں اندھیرے کا ایک ننھّا سا ذرّہ۔ روشنی کی ایک چھوٹی سی کرن۔ پانی کی ایک پتلی سی لہر۔

اس طرح ہوائی قلعے بناتے بناتے زندگی گزر جاتی ہے"

آپ نے دیکھا! ایک رنگین تخیّل اور دل پذیر انداز بیان نے کتنی خوبی کے ساتھ طنز کی وہ تمام تلخی بکھیر سی دی ہے جو درحقیقت اس پارے کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق خلّاق کی آئینہ دار بن گئی ہے۔ ایک ادبی کارنامے کے نقّاد کو شاید یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ تصنیف سے مصنّف کے کردار کو جانچے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ جب میری نگاہ ان اوراق پر دوڑتی ہے تو ان کا لکھنے والا انہیں اپنے گرد لپیٹتا ہوا میرے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے لبوں پر ایک ہلکا سا تبسّم ہے اور آنکھوں کی گہرائیوں میں ایک ناقابل بیان حزن۔ وہ بظاہر ہنستا ہے لیکن اس کی ہنسی کی بازگشت سننے والوں کے دل و دماغ پر ایک نغمۂ یاس بن کر چھا جاتی ہے پھر کون ہے جو کہ یہ تبسم کے اس سیلاب میں نہ بہ جائے اور کون ہے جو اس طنز کی شیریں خلش کو اپنے دل و جگر میں جگہ نہ دے۔

کرشن چندر اس خصوصیت کے اعتبار سے اردو کے تمام طنز نگاروں میں ممتاز ہے لیکن کیسے تعجب کا مقام ہے کہ ہمارے فاضل نقّادوں میں سے ایک نے بھی طنز نگاروں کے کسی تذکرے یا جائزے میں اس نوجوان فن کار کا نام تک نہیں لیا۔ ادبی ناشناسی کی اس سے عجیب تر مثال نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔

اور اب کونپل

جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں۔ اس مجموعے کے افسانے سلیس اور سادہ اردو میں لکھے گئے ہیں اور شُدھ ہندی کے نامانوس الفاظ سے عبارت کو بے کیف بنانے کی قطعًا کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اور اس کی ایک وجہ غالبًا یہ بھی ہے کہ ان میں سے بعض افسانے کتابی صورت میں آنے سے پہلے ادبی دنیا اور چند دیگر بلند پایہ رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ غالبًا دو تین چیزیں نئی بھی ہیں، یا کم از کم عام ناظر کے لئے بالکل نئی ہیں۔ اشک صاحب میں یہ ایک قابل تعریف بات ہے کہ وہ اپنے مضامین پر ہمیشہ ایک کڑی نگاہ رکھتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ان کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ اور یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ جب اس مجموعے کی تدوین کا وقت آیا تو اس کے مصنّف نے اکثر مضامین

دوبارہ لکھے اور ان کی پہلی طباعت اور موجودہ تالیف کے درمیانی وقفے میں اسے جو فنی یا لسانی اصلاحیں سوجھیں ان سے انھیں آراستہ کیا۔ اور اب ہم بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ "کونپل" اردو کے مختصر افسانوں کے مجموعوں میں ایک امتیازی درجہ رکھتی ہے اتنا افسوس ضرور ہے کہ بعض ایسے افسانوں میں جو اچھے رسائل میں نہیں چھپے زبان و محاورہ کی چند غلطیاں بھی نظر آتی ہیں اور بعض افسانوں کے عنوانات بھدّے اور اجنبی سے ہیں مثلاً گوکھرو، دولو وغیرہ لیکن بقول اشکؔ ' آخر ناموں میں کیا رکھا ہے؟ ان کی جرأت کی تو یہ کیفیت ہے کہ انھوں نے اپنی پہلی اردو تالیف کا نام "ڈاچی" رکھ دیا اور ڈاچی اردو زبان کا کوئی لفظ نہیں۔

بہرحال — — پیش نظر مجموعے کے گیارہ افسانوں میں سے "راج کما" کو چھوڑ کر باقی تمام کہانیاں زندگی کی بولتی ہوئی تصویریں ہیں۔ "راج کمار" البتہ ایک رومانی مطالعہ ہے جو اس مجموعے میں شامل نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔ اس ایک چیز نے نہ صرف کتاب کی انفرادیت کو صدمہ پہنچایا ہے۔ بلکہ اشکؔ کی ایک نہایت اہم خصوصیت کو بے رنگ کر دیا ہے۔ ہمارے نوجوان مصنفین میں سے عاشق حسین بٹالوی کے سوا اور کوئی قابل ذکر افسانہ نگار ایسا نہیں ہے جس نے اپنے مطالعے کا میدان عمداً اس قدر محدود کر دیا ہو جس قدر اشکؔ نے کر دیا ہے اور اس کا بڑا بھاری فائدہ اسے یہ پہنچا ہے کہ مطالعہ کی باریکی کے باعث اس کی کہانیاں پلاٹ کے لحاظ سے قریباً بے عیب ہوتی ہیں۔ اگرچہ اس کا مطالعہ داخلی نہیں بلکہ خارجی ہے لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ اپنی تمام جزئیات میں وہ زندگی اور مشاہدے سے براہِ راست متاثر ہوتا ہے جزئیات نگاری افسانہ نگاری کی جان ہے اور جس فن کار نے اس پر قابو پالیا وہ اپنے فن میں کامیاب ہے۔ اشکؔ ہندو سوسائٹی کے نچلے متوسط طبقے کی زندگی سے بےحد متاثر نظر آتا ہے۔ اس کے معاشرتی مسائل کا اس نے غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اس کے افسانے اس کے شدید مطالعے کے شاہد ہیں۔ یہ ایک خوشی کی بات ہے کہ اُس نے مغربی افسانہ نگاری سے واقفیت کے باوجود اس کا اثر قبول نہیں کیا۔ اس کی کہانیاں نہ صرف گہرے مقامی رنگ میں رنگی ہوتی ہیں بلکہ خالص ہند و معاشرت کی ایسی ہو بہو تصویریں ہوتی ہیں جنھیں صرف ایک محرم راز ہی کھینچ سکتا ہے ہمارے عام افسانہ نگاروں میں مغربی افسانوں کو اپنانے اور خود اپنے تجرباتی افق سے پار جھانکنے کی جو وبا سی پھیل رہی ہے اشکؔ اس سے یکسر محفوظ ہے۔ وہ جو کچھ لکھتا ہے اس پر اسے پورا قابو ہوتا ہے اور اسی لئے اس کی صناعی میں ایک خوش آیند پختگی بے تکلفی اور ہمواری پائی جاتی ہے۔ مجھے اس کے افسانے پڑھتے وقت بارہا ایسا محسوس ہوا ہے کہ اشکؔ ایک چابکدست کمہار ہے جو اپنے مشاہدے کا چاک گھماتا جاتا ہے اور بڑی آسانی سے اس پر سے ایسے ایسے نازک اور سڈول کوزے اتارے جاتا ہے جو اپنی نزاکت میں افرنگ کی بلوری صراحیوں کو پرے بٹھاتے ہیں۔

ہاں اتنا ہم بھی محسوس کرتے ہیں کہ اشکؔ اگر کسی سے متاثر ہوا ہے تو وہ منشی پریم چند آنجہانی کی ذاتِ گرامی ہے۔ پریم چند کے افسانوں کے متعلق یہاں کچھ کہنے کا موقع نہیں ہے لیکن ان کی اس خصوصیت سے سب لوگ واقف ہیں کہ ان کا ہر افسانہ ہماری کسی نہ کسی اخلاقی یا سماجی کمزوری کو بے نقاب کر کے ہمارے فکر اور احساس کو اس کے خلاف صف آرا کر دیتا ہے۔ اور یہ عمل کچھ ایسے غیر معلوم طریق پر سرانجام پاتا ہے کہ ہم شعوری طور پر اس تبدیلی سے آگاہ نہیں ہوتے۔ اور یہ سلیقہ ان کے فن کا سب سے باریک اور اہم نکتہ ہے۔ اشکؔ میں بھی ہم بعینہ یہی خصوصیت پاتے ہیں۔ وہ اپنی دیکھی بھالی زندگی میں سے کوئی چبھتی ہوئی چیز چن لیتا ہے اور اسے ایسے انداز سے پیش کرتا ہے کہ ہم اسے بظاہر کسی مقصد یا مدعا کی طرف بڑھتے ہوئے نہیں دیکھ پاتے بجز اس کے باوجود وہ اپنا مطلب حل کر لیتا ہے اور ہمارے تحت الشعور میں ہلچل مچا دیتا ہے۔ زیر نظر مجموعے کا بہترین افسانہ "کونپل" اس کے اس شعبدے کی بہت اچھی مثال ہے "سینکری" ایک ٹائپ ہے نوجوان ہندو بیوہ کا۔ سہاگ کے دنوں میں پاک دامن رہنے کے باوجود وہ اپنے بوڑھے شوہر کے شکوک سے محفوظ نہیں رہتی۔ زندگی کی اور بےکیف مصروفیتوں میں وہ اس قدر منہمک ہے کہ دبائے جانے اور پھر ابھرنے کے موقعے پانے کے باوصف اس کی جنسی زندگی میں کوئی بحران پیدا نہیں ہوتا۔ ایک ہندو عورت کو شوہر پرستی کی ایسی سخت تربیت دی جاتی ہے کہ شعوری طور پر اس میں جنسی بغاوت کا پیدا ہونا نہایت مشکل ہے اور اس کا نفسیاتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے دبے ہوئے جذبات و احساسات کسی اور محور کے گرد گھومنے لگ جاتے ہیں اور وہ جب زندگی کی تلخ کیفیتوں سے ذہنی طور پر فرار ہوتی ہے تو اسے اسی محور میں تسکین کا سامان میسر آتا ہے۔ موجودہ افسانے میں زیور پہننے کا شوق اس محور کی نمایندگی کرتا ہے اور فن کار نے نہایت خوبی سے اِسے ہلکی ہلکی جنسی لہروں پر جھلایا ہے۔ دیکھئے:-

"سینکری کی عمر اس وقت صرف تیرہ برس کی تھی لیکن اس کے بھرے بھرے ہاتھ پاؤں جوانی کی سنہری صبح کے سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ کنگن اس کی کلائیوں میں ایسے پھنسے تھے کہ کچھ دیر بعد اُن میں سے ایک کو اسے اپنی جگہ سے کھسکانا پڑا۔ اس کی جگہ خون اکٹھا ہو جانے سے ایک سرخ حلقہ سا بن گیا تھا۔ بہت دیر تک وہ مسحور سی ہو کر اسے دیکھتی رہی پھر کلائیوں سے لٹکتے ہوئے کلیروں اور ناک میں پڑی ہوئی بڑی تنکار پوری نتھ کو سنبھالتی ہوئی وہ اٹھی اور جا کر سہیلیوں کو اپنا ایک ایک گہنا اور اس کی بناوٹ دکھانے لگی ......

سنیکری کی مسرت اور خوشی کو دیکھ کر بڑی بوڑھیاں اپنے پوپلے منہ لئے ہنستیں اور اس کی خوش بختی کی تعریف کر کے اسے دعائیں دیتیں۔ بھاگ سنگے برہمن کی لڑکی اتنے بڑے گھر جا رہی ہے۔ اتنے دھنی کے گھر!۔۔۔

لیکن گاؤں کی نوجوان لڑکیوں کو اس کی خوش بختی پر کچھ ایسا رشک نہ تھا۔ اتنے قیمتی اور خوبصورت زیور اس غریب برہمن کی لڑکی کے جسم پر دیکھ کر اگر کسی کو کچھ جلن بھی ہوتی تو یہ جان کر کہ سنیکری سوت پر جا رہی ہے۔ اور پچاس سالہ دولھا کی پہلی بیوی بھی موجود ہے اُن میں سے اکثر نے منہ بنا بنا کر کہہ دیا تھا —— دُنیا میں سب کچھ گہنے کپڑے ہی تو نہیں ہوتے ۔۔۔۔۔۔۔۔

سسرال آنے پر گہنے کپڑے سے سنیکری کو اور بھی محبت ہوگئی۔ لیکن وہ جب ابھی، گہنے کپڑے پہنتی تو پنڈت جی کے پاس بیٹھنے کی بجائے اپنی سہیلیوں کو اپنی شان دکھانے کے لئے بے چین ہو جاتی۔ پنڈت جی اپنے گھٹے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے للچائی ہوئی نظروں سے خوبصورتی کے اس مجسمے کو دیکھتے اور کہتے

"تم تو سورگ کی اپسرا ہو" اور اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے۔ لیکن وہ اپنے میکے جانے کے لئے مچل پڑتی۔

درحقیقت گہنے کپڑے زیب تن کرتے کرتے کچھ عجیب طرح کی کسمساہٹ سنیکری کے جسم میں پیدا ہو جاتی تھی۔ کوئی نامعلوم سی آرزو اس کے دل میں سلگنے لگتی تھی لیکن جوتشی جی سے جیسے اسے کچھ خوف سا آیا کرتا ۔۔۔۔ ایک بار جب پنڈت جی اسے لینے گئے تو اس نے جانے سے صاف انکار کر دیا ؟ اس کی ٹھیک وجہ تو اسے خود بھی معلوم نہ تھی لیکن اس "راج گھر" میں اس کا دم جیسے گھٹنے لگتا تھا۔ اس وقت پنڈت جی نے اس سے سونے کے بڑے بڑے منکوں کی کنٹھی بنوا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ماں نے سمجھایا تھا —— باپ نے جھڑکیاں دی تھیں ۔۔۔۔۔۔

لیکن پھر جب اس نے میکے جانے کی ضد کی تو پنڈت جی نے جھوک دیا —— "وہاں کسی سے آشنائی ہے جو آئے دن اٹھ بھاگتی ہے" —— سنیکری یہ سن کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ ہرن جو اس اسے جواب دیتے ہوئے معلوم ہوتے تھے ۔۔۔۔۔۔ وہیں

ٹکڑے ٹکڑے اس کی آنکھوں میں گاؤں کے کئی سیدھے سادے نوجوانوں کی تصویریں پھر گئی تھیں جن کو وہ بھائی کہتی تھی ۔۔۔ کیا اُن میں سے کسی کے ساتھ اس کی آشنائی تھی ؟ دل کو ٹٹول کر اس نے اچھی طرح دیکھا لیکن کہیں کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اس نے ابھی تو اس روپ میں دیکھنا بھی نہ سیکھا تھا —— وہ ضبط نہ کر سکی رو پڑی۔ جوتشی جی نے دیکھا نشانہ بہت آگے پڑا تھا"

لیکن جب پنڈت جی نے خود ہی جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اسے اس جنسی نیند سے بیدار کر دیا تو پھر اگر پرمیشری برہمنی کا وہ نوجوان لڑکا جو ہر روز دوپہر کو روٹی لینے آیا کرتا تھا اور اب تک محض ایک غریب برہمن لڑکا تھا۔ اسے اپنے خوابوں کا راجہ نظر آنے لگا تو حیرانی کی کیا بات تھی۔ یہاں پہنچ کر افسانہ نگار نے حیرت انگیز صناعی کا ثبوت دیا ہے :-

"دوسرے دن پنڈت جی صراف کی دکان سے سونے کے بڑے منکوں والی خوبصورت کنٹھی لے آئے ۔۔۔۔ انھوں نے لاکھ کہا کہ اسے ذرا پہن کر دکھا دو۔ دیکھیں تو سہی تمھارے خوبصورت گلے میں کیسی لگتی ہے لیکن سنیکری چپ بیٹھی رہی ۔۔۔۔ جب پنڈت جی چلے گئے، تو اسے پہن کر دیکھنے کے لئے اس کا من بے چین ہو اٹھا۔۔۔۔ اتنے میں نہدا لینے والی برہمن پرمیشری کا لڑکا تھالی اٹھائے ہوئے آیا : ہنس مکھ، بے پروا، بائیس تیئیس برس کی عمر اور طبیعت میں کچھ کچھ بھولاپن۔

آشنائی ! —— اچانک سنیکری کے دل میں یہ ایک لفظ گونج اٹھا اور اُس نے اس برہمن لڑکے کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا بھی لیکن پھر جھٹ ہی اپنی آنکھیں جھکا لیں ۔۔۔ کنٹھی کا ہک گردن کی پشت پر تھا۔ نیا ہونے کی وجہ سے اور گردن میں کنٹھی کے بالکل فٹ آنے کے باعث وہ کوشش کرنے پر بھی اسے نہ لگا سکی۔ تب اس نوجوان نے ہنستے ہوئے آگے بڑھ کر اسے لگا دیا۔ سنیکری کے تمام جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

اس بدقسمت ملک میں جہاں سماج کا عفریت جنسی اظہار کی ہر صورت کو بری طرح دبائے رکھتا ہے وہاں جنسی بغاوت اور اس سے پیدا ہونے والی بیداری کی کیفیت میں صنفِ مقابل کی انگلیوں کا ایک ہلکا سا لمس بھی جذبات کا ایک طوفان پیدا کرنے کو کافی ہے لیکن ہندوستانی عورت کی فطری پابندی اس ردّعمل پر غالب آ کر اپنے آپ کو ایک بار پھر مرد کے ہوس کا مانہ تفوق کی بھینٹ چڑھا دیتی ہے۔

اتنا ضرور ہے کہ ہر نئی تحریک اس کے ادراک و احساس میں ایک نئی کشمکش کا آغاز کر دیتی ہے اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے جب تک کہ موت یا جدائی اس کا خاتمہ نہیں کر دیتی۔ مگر نہیں۔ ایک ہندو بیوہ کے لئے سماج نے یہ آخری خلاصی بھی گوارا نہیں کی۔ زیرِ نظر افسانہ مذکورہ کشمکش کی ایک درد انگیز داستان ہے۔ اور افسانہ نگار نے اسے ناتمام چھوڑ کر فن کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ پنڈت جی کی موت کے بعد سنیکری کے ویرانۂ دل میں اپنے آپ کو پا لینے کی کونپل پھوٹی تو سہی لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اسے پنپنا بھی نصیب ہوا یا وہ اس سموم کی نذر ہو گئی جو سماجی دباؤ کے تپتے ہوئے ریگستان سے چلتی ہے اور ایسے ایسے لاکھوں شگوفوں کو آن واحد میں جھلس جاتی ہے۔

اشک اپنے افسانوں کے پس منظر بڑی کاوش سے تیار کرتا ہے اور انہیں کہانی کے اتار چڑھاؤ سے مطابقت دینے میں اسے بڑی مہارت حاصل ہے۔ ادب میں سمبل ازم یعنی علامتیت کا فنکارانہ استعمال بہت دشوار چیز ہے۔ اشک اس امتحان میں بھی پورا اترتا ہے۔ افسانے کو پس منظر پر ابھارنے اور علامتیت کی فنکارانہ امداد سے اس میں جان ڈال دینے کی ایک دو مثالیں ملاحظہ فرمایئے:۔

پہلے ایک آرزو انگیز منظر ——

"اسی طرح لیٹے لیٹے، کروٹیں بدلتے بدلتے دن ڈھل گیا۔ کمرے میں جیسے اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ اٹھی صحن میں آئی۔ منڈیر پر ایک کوّا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ طاق کے اوپر آگے کو بڑھی ہوئی محراب پر ایک کبوتر پنکھ پھیلائے گردن جھکائے اپنی محبوبہ کو منانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ لیکن جب وہ مستانی (۹) چال سے چلتا چلتا اس کے پاس جاتا وہ اڑ جاتی —— ایک طاق سے دوسرے پر۔ دوسرے سے تیسرے پر۔ تیسرے کی کھونٹے پر کھونٹے سے چارپائی کے پائے پر اور پھر وہاں سے لکڑی کے جنگلے پر وہ جا جا کر بیٹھی لیکن کبوتر نے پیچھا نہ چھوڑا۔ پھر ایک زنانے سے جو وہ اڑی ہے تو نیلے وسیع آسمان میں گم ہو گئی۔ کچھ لمحہ تک وہیں جنگلے پر کبوتر نے ایک دو چکر لگائے غٹرغوں غٹرغوں کی اور پھر وہ بھی اوپر آسمان کی طرف اڑ گیا۔

سنیکری نے لمبی سانس بھر کر انگڑائی لی۔ پھر اس نے گھڑے کے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھویا اور پھر جیسے کسی نامعلوم ترغیب کے زیر اثر وہ چھت پر کھلی ہوا میں چلی گئی۔ سامنے محلے کے پرلے سرے پر برہمن کا لڑکا اپنے پرانے مکان کی چھت پر کتاب میں دھیان جمائے چپ چاپ پڑھ رہا تھا۔ سنیکری نے بے ساختہ اپنے بکھرے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے من میں امنگ اٹھی کہ کچھ گائے۔ کوئی ڈھولک کا ٹپا، کوئی گیت۔ لیکن وہ چپ ٹکٹکی باندھے ادھر دیکھتی رہی۔ محلّے کا نیم ٹھنڈی ہوا کے لمس سے جیسے سرمست ہو کر جھوم رہا تھا۔ آسمان کی گہرائیوں میں چیلیں ایک دوسری کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ سنیکری نے انگڑائی سی لی۔ اس وقت نوجوان نے اس کی طرف دیکھا۔ ساری کا پلّو اس کے سر سے ڈھلک گیا تھا۔ اور اس کی بلوریں گردن میں کنٹھی کے بڑے بڑے سنہری منکے غروب آفتاب کی کرنوں سے کئی سورج بن کر چمک رہے تھے۔

سنیکری کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا........

اور اب وہ رات جب پنڈت جی مر چکے ہیں اور سنیکری کی ماں جو رسم و رواج کے بندھنوں میں اسیر ہو کر اپنی روح تک سے ناآشنا ہو چکی ہے۔ اسے تسلی دینے اور اس کی ہونے والی بھاوجوں کے لئے اس کا زیور قابو میں کرنے کو آئی ہے اور اب ایک ڈھیلی سی چارپائی پر گٹھڑی سی بنی ہوئی پڑی ہے۔

"ساتھ لگی ہوئی بچی دودھ پیتے پیتے چھاتی منہ میں لئے ہی سو گئی تھی۔ سنیکری نے اسے الگ کیا اور کروٹ بدلی۔ اور آسمان میں پورنماشی کا چاند اپنی کرنوں کا تاج پہنے۔ پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ سنیکری کے دل سے ایک آہ سرد نکل گئی۔ ان دو برسوں میں وہ زندگی کو کتنا زیادہ سمجھنے لگی تھی۔ بستر پر پڑے پڑے اس کا دم گھٹنے لگا۔ ایک ناقابل برداشت سی آگ اس کے روئیں روئیں میں دھواں دھواں کر کے بھڑک اٹھی۔ اس کی ماں نے جیتے ہی کیوں نہ اس کا گلا گھونٹ دیا.... آنکھوں کے بھیگے ہوئے کونوں کو دامن سے پونچھ کر اس نے کروٹ بدلی۔ محلّے کے نیم پر بیٹھا ہوا چھوٹے الوؤں کا جوڑا اپنی کرخت آواز میں چیخ اٹھا۔ ہوا سائیں سائیں کرنے لگی اور اوپر آسمان میں ایک بڑی سی چمگادڑ اپنے پروں کا سایہ دیوار پر ڈالتے ہوئے گزر گئی......

اور پھر جب ایک ناقابل برداشت جذبے کے زیر اثر سنیکری نے دبے پاؤں نیچے جا کر اپنا عروسی جوڑا اور اپنے تمام زیور پہنے تو۔

"ہاتھوں میں کنگن ڈالتے وقت اسے معلوم ہوا کہ وہ کتنی کمزور ہو گئی ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہ گول حلقہ پھر گیا جو کبھی

کلائی پر کنگن کے پھنس جانے سے پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے گئی۔ اس کے گول گول گالوں میں گڑھے پڑ چلے تھے جبڑوں کی ہڈیاں دکھائی دینے لگی تھیں اور ابھی اس کی عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی۔

ایک لمبا سانس بھر کر وہ وہیں ٹرنک پر بیٹھ گئی اور اسکی آنکھوں کے سامنے چار برس پہلے کا ایک واقعہ آ گیا جب پڑوسی برہمنی کے منہ نکھ لڑکے نے اس کی کنٹھی کا ٹانکہ باندھ دیا تھا اسی دن کی طرح ایک نا معلوم سی مسرت کی جھرجھری اس کے تمام جسم میں دوڑ گئی "

دور کہیں مسلمانوں کے محلے میں مرغ نے اذان دی سنیکری چونک کر اٹھی۔ سب گہنے اتار کر اس نے ٹرنک میں بند کئے۔ کپڑے تہ لگا کر رکھے اور دبے پاؤں اوپر پہنچی۔ چاند اس وقت داہنی طرف کے اونچے مکان کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ سنیکری چپ چاپ اپنی چارپائی پر جا لیٹی۔

دوسرے دن جب ماں واپس جانے لگی اور اندر لیجا کر اس نے سنیکری سے گہنے مانگے تو اس نے ٹال دیا "

آپ نے اس آخری چیز کو دیکھا! علامتیت کے بل پر افسانہ نگار نے چاند کو اس اونچے مکان کی اوٹ میں کس فن کاری سے پہنچایا ہے۔ اور اس ایک اشارے سے اس نے اپنی نا تمام کہانی کو کس خوبی سے آپ کے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے ——— اشک کو اس ٹیکنیک میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ وہ بلا شبہ قابل رشک ہے۔

ہم نے ارادتاً اس مجموعے کے صرف ایک افسانے کا تجزیہ کیا ہے۔ اور یہ افسانہ اشک کے فن کی پوری نمایندگی کرتا ہے۔ آپ اسی سے اس کے اور افسانوں کی خوبیوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ موجودہ مجموعے میں کونپل کے علاوہ تہذیب کے نیم مردا اور قفس اعلےٰ پائے کی تخلیقات ہیں اور اشک کی تمام خصوصیات کی آئینہ دار۔ باقی افسانے اوسط درجے کے ہیں اور راج کمار بالکل ادنیٰ ہے۔

ایک بات رہ گئی۔ ایک دو مقامات پر اشک نے پریم چند آنجہانی کے تتبع میں تشبیہہ و استعارہ سے اثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً۔

"سب سے بڑھ کر بات یہ تھی کہ جگت کے نانا کی بیوی دوسری تھی اور سوتیلی ماں کے ہوتے جگت کی ماں کو کچھ زیادہ ملنے کی امید بھی نہ تھی پھر بھی سب طرف سے نا امید ہو کر جگت کی ماں بہیں جا رہی تھی۔ کنارہ کتنا بھی اونچا اور چکنا کیوں نہ ہو۔ سہارا لینے کے لئے وہاں کوئی پکڑ ہو یا نہ ہو لیکن ادر سہارا نہ پاکر ڈوبنے والا۔ اسی طرف جاتا ہے "

ہم نے پریم چند کی تصانیف میں یہ استعارہ ایک سے زیادہ جگہ دیکھا ہے لیکن وہ زبان کے دھنی تھے۔ استعارہ بندی سے جو غضب کی اثر آفرینی اُن کے بس میں تھی اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی اور غالباً نہیں ہوگی۔ ہم اشک صاحب کو یہی مشورہ دیں گے کہ اس انداز بیان کے حاصل کرنے کی بہ نسبت اگر وہ اپنی ذاتی خصوصیات کی طرف زیادہ توجہ دیں گے تو یہ بات نہ صرف ان کے لئے بلکہ ان کے پڑھنے والوں کے لئے زیادہ سے زیادہ تسکین کا موجب ہوگی +

صلاح الدین احمد

فہرست مضامین ادبی دنیا۔ لاہور

بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۴۱ء

تصویر۔ غالب کا ایک شعر

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک و وی پی پانچ روپے۔ ممالک غیر سے دس شلنگ۔ قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

باہتمام صلاح الدین احمد [illegible] لاہور میں چھپا اور دفتر ادبی دنیا دی مال لاہور سے شائع ہوا

دُنیائے کاروبار

سنٹرل بنک آف انڈیا لمیٹڈ

نصف سال کا منافع

سنٹرل بنک کی شاخ (لاہور) کے چیف ایجنٹ کو اُن کے ہیڈ آفس سے ذیل کا "تار" موصول ہوا ہے:۔

"ہمارا گذشتہ ششماہی کا خالص نفع مع نفع سابق کے اکیس لاکھ آٹھ ہزار ایک سو پینتالیس روپے ہوا ہے۔ اس میں سے چھ فی صدی کے حساب سے مبلغ پانچ لاکھ چار ہزار تین سو چھیانوے روپے کی رقم بطور منافع حصہ داروں کو تقسیم کی گئی۔ بقایا سولہ لاکھ تین ہزار سات سو انچاس روپے آیندہ حساب میں ڈال دیئے گئے ہیں۔"

پنجاب نیشنل بنک کی گذشتہ نصف سال کی

کارگزاری

سکرٹری پنجاب نیشنل بنک اطلاع دیتے ہیں کہ گذشتہ نصف سال میں یعنی ۳۰ رجون ۱۹۴۱ء تک بنک کو مبلغ چار لاکھ چھہتر ہزار چھ سو چھہتر روپے چار آنے ایک پائی کا منافع ہوا ہے۔ یہ خبر بنک کی ترقی یافتہ حالت پر کافی سے زائد روشنی ڈالتی ہے۔

پرکاش والوں کا نیا کھیل

درشن

پرکاش پکچرز چند معین روایات پر عامل ہے اور اِن روایات کے مطابق اس نے آج تک جتنے بھی کھیل تیار کئے ہیں اُن میں اکثر کم و بیش کامیاب اور گلٹ سے غیر معمولی طور پر بلند رہے ہیں۔ "درشن" کے نام سے اُن کا تازہ کھیل پردۂ سیمیں پر آرہا ہے اور لاہور کے رہنے والے اسے ۲۵ رجولائی سے رٹز سینما میں دیکھ سکیں گے۔

پرکاش کے گذشتہ چند کھیلوں کی طرح یہ بھی ایک سماجی کھیل ہے قصے میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کی گئی ہے۔ یوں تو ہر بات میں زن زر زمین کا کوئی نہ کوئی پہلو نمایاں ہوتا ہے لیکن "درشن" کے افسانے میں اس کہاوت کے ہر پہلو کا مناسب استعمال کیا گیا ہے اور افسانے کے مختلف کرداروں کو نمایاں فلمی اداکاروں نے اپنی اپنی قابلیت کے مطابق خوبی سے پیش کیا ہے جیوتی اپنی المناک صورت اور بھولی بھالی شخصیت کرتے ہوئے موجود ہے اور پریم ادیب ایک دلکش نوجوان کی صورت میں ہیرو کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ گانوں کے سلسلے میں جیوتی پریم ادیب اور میرا کے علاوہ کوشلیا اور امیر بائی کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں گانے تعداد میں تیرہ ہیں۔ مشہور اداکار پانڈے سماج کے ہٹ دھرم پہلو کی نمائندگی کر رہے ہیں اور تمام کھیل میں مدھواڈوانی اپنے مسخرے پن سے قصے کی یکسانی اور سنجیدگی میں خوشگوار اثر پیدا کرتا ہے۔ امید ہے کہ فلم کے شائقین اس کھیل سے خاطر خواہ طور پر محظوظ ہوں گے۔

کتب خانہ ادبی دنیا

جب شروع میں ادارہ ادبی دنیا کی طرف سے اردو ادب کی منتخب کتابوں کی فہرستیں شائع کی گئی تھیں تو خیال بھی نہ تھا کہ ہمارے قارئین اس جوش کے ساتھ اس کا استقبال کریں گے لیکن حالات کو دیکھتے ہوئے اب ہمارا خیال ہے کہ جلد ہی اور چھپی ہوئی فہرستیں بھی آپ کے پیشِ نظر کی جائیں۔ امید ہے کہ ان کا نتیجہ بھی پہلے ہی کی طرح بلکہ اس سے بھی بہتر برآمد ہوگا۔

مینجر کتب خانہ ادبی دنیا لاہور

"ہرجائی"

بیخودی وہشیاری سادگی و پُرکاری
حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

بزم ادب

زیر نظر شمارے میں ایک دو چیزیں خاص توجہ کی متقاضی ہیں۔ اکتوبر ۱۹۴۰ء کے شمارے میں ہمارے پرانے کرم فرما جناب تسکین عابدی نے ریختی کے موضوع پر جدید لکھنے والوں میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں اردو کے ایک ریختی گو عابد مرزا مرحوم المتخلص بیگم کے کلام کا جائزہ لیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی متنوع مصروفیات کے باعث موضوع کے بعض پہلوؤں کی طرف اپنی روایتی توجہ نہ دے سکے۔ شاید یہی وجہ ہو کہ موجودہ اشاعت میں آپ اسی موضوع پر ایک اور نقطۂ نظر سے ایک مضمون پائیں گے جس میں بقولِ صاحبِ مضمون بیگم کی پہیلی" کو سلجھایا گیا ہے۔ چونکہ جنابِ تسکین کا مضمون بیگم کے متعلق پہلا مضمون تھا۔ اس لئے توقع ہے کہ موجودہ مضمون میں تصویر کا دوسرا رُخ بھی قارئین کی دلچسپی کا ذریعہ بن سکے گا۔

جناب ظہیر الدین احمد ذرا دیر کے بعد بزمِ ادبی دنیا میں آئے ہیں لیکن اپنے "اقبال اور نئی پود" میں شاعرِ مشرق کے متعلق بعض نئے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں، اب تک اگرچہ اقبال پر بہت سے زاویوں سے بحث کی گئی ہے۔ لیکن اس لحاظ سے بھی علامہ مرحوم کے کلام کا جائزہ لینے کی بہت ضرورت تھی۔ امید ہے کہ یہ مضمون نوجوانوں کے لئے خصوصاً خیال افروز ثابت ہوگا۔

اس مضمون کے بعض حصے دہلی ریڈیو سٹیشن سے ایک تقریر میں نشر ہو چکے ہیں۔

افسانوں میں جناب ابوالفضل صدیقی شریکِ بزم ہیں۔ اس سے پہلے بھی وہ جاگیردارانہ زندگی کے جاندار مرقعے دکھا چکے ہیں اور اب بھی اُن کا قلم اُسی چابکدستی سے ماحول کی ترجمانی کر رہا ہے۔

جناب محمد عبدالقادر فاروقی اگرچہ ابھی قارئین کے لئے ایک نئی صورت ہیں، لیکن اپنی ادبی تخلیق کے لحاظ سے جاذبِ نظر ہیں خصوصاً ان کا نفسیاتی مطالعہ عورت کی فطرت سے کافی حد تک باخبر ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

جناب محمد حسن عسکری کا خط بھی "ایک نفسیاتی مطالعہ" کے عنوان سے شاملِ اشاعت ہے اور اس کے ساتھ کا ادارتی نوٹ اس کی وضاحت ہے۔

(۲)

آج تک، اور خصوصاً گذشتہ تین سالوں سے "ادبی دنیا" نے معنوی ترقی کی طرف جو سفر جاری رکھا۔ اس کے حاصل سے یہاں بحث نہیں کہ شاید اسے بعض لوگ انانیت پر محمول کریں لیکن اس سلسلے میں کبھی کبھی جس خاص قسم کی رکاوٹ سے دو چار ہونا پڑا اُس کی وضاحت ضروری ہے۔ ادب زندگی کا ترجمان ہے اور ظاہر ہے کہ ہماری زندگی ماہ بماہ نہیں تو سال بہ سال ضرور بدلتی جا رہی ہے اور یوں نہ صرف اقتصادی اور سماجی حالات ادب پر اثر انداز ہو رہے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ذہنی طور پر بھی خصوصاً مغرب سے آئے ہوئے خیالات ادب اور آرٹ میں جہاں فن کاری کے نئے اسلوب رائج کرنے کا باعث ہوئے ہیں وہاں اخلاقی لحاظ سے بھی ایک جدید اندازِ نظر قائم ہوتا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے "ادبی دنیا" کے پڑھنے والوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا گروہ اگرچہ تعداد میں سب سے زیادہ ہے لیکن تاثر اور اس کے ردِ عمل کے لحاظ سے یکسر غیر نمایاں ہے اس کی حیثیت ایک کاہل ذہن کی مانند ہے، ایک بچے کی سی جسے جو کچھ کھانے کو دو کھائے گا، جو پہننے کو دو پہن لے گا۔ دوسرا گروہ ایک ذہین اور حساس بچہ ہے۔ جس میں نئی بات کے متعلق ایک فطری ردِ عمل پیدا ہوگا۔ یہ گروہ اگرچہ تعداد کے لحاظ سے اقلیت میں ہے لیکن اسی کو ہم روحِ حیات کہہ سکتے ہیں، صحیح معنوں میں ترقی پسند۔ کیونکہ یہ کل جدید لذیذ کے درست مفہوم کو سمجھتا ہے۔ قدامت پرستی میں آ کر قبول کرنے والی چیزوں کو محض اُن کی اجنبیت کے باعث نہیں رد کر دیتا ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ ہے جو اگرچہ تعداد میں دوسرے گروہ کے لگ بھگ نہیں تو اس کے قریب قریب ہے لیکن سب سے زیادہ قابلِ اعتراض یعنی بگڑا ہوا بچہ ہے جس کی قدامت پرستی تو اس کی ذہنی تربیت کی مرہونِ منت ہے۔ لیکن جس کی ضد ایک جھوٹی خودداری کی پیداوار ہے۔ یہ بچہ ہر نئی چیز کو ناپسند کرتا ہے۔ یہ ادبی لحاظ سے ہر نئی چیز کو اس لئے مردود قرار دیتا ہے کہ خود ایسی چیز کی

تخلیق کا اہل نہیں ہے اور اخلاقی لحاظ سے اس لئے معترض ہوتا ہے کہ جس حدبندی اور تنگ نظری نے اس کی اپنی زندگی کو ناخوشگوار اور غیر فطری بنا رکھا ہے۔ وہی دوسروں پر بھی عاید رہے، وہ کہیں زندگی کے فن میں بہتر راستے پر گامزن نہ ہو جائیں۔ اگر بات یہیں تک رہتی تو اس بچے پر ہمیں صرف رحم آتا، لیکن اس میں خلوص اور اخلاقی جرأت کی کمی ہے جس پر نہ صرف رحم آتا ہے بلکہ جو اعتراض کی گنجائش بھی پیدا کر دیتی ہے۔ کیونکہ یہ گروہ اپنے اُن دعاوی کا کھلا اعلان بھی نہیں کر سکتا جن کے لئے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ لیکن بات لمبی ہوتی جا رہی ہے اس لئے یہاں صرف اسی قدر اشارہ کافی ہو گا کہ بگڑے ہوئے بچوں کو سزا بھی ملا کرتی ہے (اگرچہ ہمارے خیال میں ذہنی پستی سے بڑھ کر اور کیا سزا ہو گی!)

ہاں، ایک بات ظاہر ہے کہ ادب کے متعلق چند اعتقادات اپنے ذہن میں معین کر کے "ادبی دنیا" ایک راستہ اختیار کر چکا ہے لیکن اُس کا یہ سفر ترقی پسندانہ ہے۔ وقت کی رفتار کے مطابق رہنا اس ارتقائی رجحان کے لئے ضروری ہے اور اس مسلک میں جہاں ایک آدھ مخالف آواز سنائی دے جاتی ہے وہاں بہت سے لوگوں کی ہمنوائی بھی خوش قسمتی سے حاصل ہے —— اس سلسلے میں کسی طرح کی حدبندی یا خود بینی بددیانتی پر محمول کی جا سکتی ہے، اور نہایت خلوص کے ساتھ اس بددیانتی سے دور رہنے کی کوشش ہی ہمارا مطمحِ نظر ہے۔

موجودہ شمارے میں سلام مچھلی شہری اگرچہ دیر کے بعد نمودار ہوا ہے۔ لیکن ایک نئی چیز لے کر آیا ہے، موضوع اور ہیئت میں ہم آہنگی ہے اچھوتی تشبیہات کے لحاظ سے یہ نظم خصوصاً توجہ کے لائق ہے نہ صرف "سگریٹ کیس" "نقاب نقرئی" ہے اور سگریٹ "کسی دوشیزہ کی انگشتِ سحر افروز" بلکہ پھیلتا ہوا دھواں ہلکے ہلکے اُڑتے ہوئے بادلوں کے علاوہ بکھرے ہوئے گیسوؤں کی یاد بھی دلاتا ہے۔ تمام نظم میں ایک ساکن اور مطمئن سی فضا ہے لیکن فن کار بڑھتے ہوئے خیالوں میں اچانک پلٹا لے کر ایک معمولی سے سگرٹ کے ذریعے سے ذہن کو ہماری زندگی کے اقتصادی پہلو کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ اور اس دوران میں نہ صرف، ایک تصویر مکمل ہو جاتی ہے بلکہ سگرٹ پینے والے کا قصہ بھی پورا دکھائی دینے لگتا ہے

ادب کے ذریعے سے اصلاحی نکات سمجھانے کا جو ذریعہ سلام نے اختیار کیا وہی شاد عارفی کا مسلک معلوم ہوتا ہے لیکن اس فن کار کو ایک سگرٹ کی بجائے چند تصویریں برانگیختہ کرتی ہیں۔ نیز اس کا موضوع اقتصادیات کی بجائے اخلاقیات سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن دونوں نظموں کے فن کار مختلف افتادِ طبع کے مالک ہیں، (جیسا کہ ہونا بھی چاہئے) سگرٹ والا نرم طبیعت رکھتا ہے۔ سگرٹ نہ ہونے پر بیڑی پر بھی قانع ہو سکتا ہے لیکن تصویروں سے بھڑکنے والا اپنے اعتقاد میں راسخ ہے۔ اس لئے اُس کی طنز زیادہ تیز ہے اور اُس کی نظم میں بیان سے زیادہ خطابت کا رنگ پیدا ہے۔

مخمور جالندھری ان دونوں سے الگ رستے پر کھڑا ایک دکان کے اندر نگاہیں جمائے ہوئے ہے۔ اور ایک حسین (اور نوجوان) عورت کو کچھ خریدتے دیکھ کر جذباتی خیالوں میں کھو جاتا ہے۔ اس نظم (مجبوری) میں بھی تشبیہات کا دلکشی اور رس لطف انگیز ہے۔

مجید امجد بیان کے لحاظ سے اوپر کے تینوں شاعروں کی بہ نسبت زیادہ سادگی پسند ہے اور ایک پتّے —— ایک گرتے ہوئے پتّے کے پردے میں نہ صرف اپنے دل کی بات بتا رہا ہے بلکہ اُس ماحول سے بھی ہمیں پورے طور پر آگاہ کر رہا ہے جس میں موجود رہنا اُس کے لئے انتہائی مسرت و راحت کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس نظم میں ایک اشارتی کیفیت بھی خوب ہے۔ شاعر نظم کی ہیروئن کا کوئی واضح بیان نہیں کرتا لیکن اس کے باوجود ہمیں اُس کی یہ آرزو کہ وہ ایک خاص آنگن میں جا پہنچے، خواہ ایک پتّے کی صورت ہی میں جا پہنچے، شک میں ڈال دیتی ہے کہ ضرور وہاں کوئی ایسی ہستی ہے جس سے ملنے کو سلیمانی ٹوپی ہی کارآمد ہو سکتی ہے۔

میراجی

شعر

مبادا کارواں جاتا رہے تُو صبح سوتا ہے

بہت ڈرتا ہوں میں اے میر تیری دیر خوابی سے

میر تقی

آئینۂ عالم

تاریخِ عالم میں روس پر دوسرا حملہ

"جو لوگ اس وقت روس کے حاکم بنے ہوئے ہیں وہ کسی سے بھی باعزت اتحاد کے قابل نہیں ہیں۔ وہ اگر کبھی کسی سے اتحاد کر بھی لیں گے تو اس پر ہرگز قائم نہیں رہیں گے جو لوگ آج کل روس کے حاکم ہیں وہ مجرم ہیں۔ ان کے ہاتھ خون آلود ہیں یہ ذلیل اور لفنگے ہیں۔ انھوں نے نازک اور دردناک حالات سے فائدہ اٹھا کر ایک عظیم الشان سلطنت کو تباہی کے گھاٹ اتارا اور محض اپنی خون خواری کی تشنگی کی تسکین کے لئے لاکھوں تعلیم یافتہ انسانوں کو ذلیل و خوار کیا۔"

"میری جدوجہد"

"روس کے حکمرانوں کا مذہب جھوٹ۔ دھوکے۔ چوری لوٹ مار اور ڈاکے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ طفیلیوں کے ساتھ معاہدہ کرکے محفوظ رہے گا۔ وہ اس درخت کی طرح ہے جو اپنے گرد لپٹی ہوئی بیل سے کسی نفع کی امید رکھے۔"

"میری جدوجہد"

"ہم نیشنل سوشلسٹ اور بولشویک اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے درمیان جو گہری خلیج حائل ہے۔ اسے کوئی نہیں پاٹ سکتا۔ اگر بولشویزم جرمنی کو اپنے پنجے میں گرفتار کرنا چاہتا ہے تو اسے یاد رکھنا چاہئے کہ ہم اس کے جانی دشمن ہیں۔"

۲۱ مئی سنہ ۱۹۳۵ء کو ہٹلر کی تقریر

"بولشویزم ایک گندہ اور پاگلوں کا سا عقیدہ ہے۔ یہ ہمارے لئے خطرے کا باعث ہے۔ میں اس حکومت سے کوئی معاہدہ نہیں کر سکتا جس کا پہلا کام مزدوروں کی آزادی نہیں بلکہ جیل خانے کے قیدیوں کی رہائی ہے ہم یہودی کمیونسٹوں سے بات چیت نہیں کر سکتے۔"

۱۳ ستمبر سنہ ۱۹۳۶ء نورمبرگ میں ہٹلر کی تقریر

"بولشویک اور جرمنی دو الگ الگ دنیائیں ہیں۔ بولشویک روس میں لوٹ مار قتل و خون اور بربادی ہے۔ یہاں (جرمنی) میں تہذیب حسن اور شادمانی ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباسات ہٹلر کی کتاب مین کیمف یا اس کی تقریروں سے لئے گئے ہیں۔ ان خیالات کے پیش نظر جو وہ روس اور اس کے بولشویک حکمرانوں کے متعلق رکھتا تھا کس کو گمان تھا کہ وہ روس سے معاہدے کرنے کی کوشش کرے گا لیکن ضرورت کے وقت انسان کیا کچھ نہیں کرتا جب اس نے دیکھا کہ جنگ چھیڑنے کے لئے وقت آگیا ہے تو اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ بیک وقت برطانیہ اور روس سے نہیں لڑ سکے گا۔ اس لئے اس نے ان ہی لوگوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جنھیں وہ مندرجہ بالا خطاب دے چکا تھا۔ جو اس کی نگاہوں میں دنیا کے ذلیل ترین انسان تھے۔ جو خونخوار تھے۔ جو ڈاکو تھے اور نہ جانے کیا کیا تھے۔ سٹالن نے ہٹلر کے ہاتھ کو محبت بھرے دل سے بوسہ دیا اور سالہا سال کے دو پرانے دشمن دوست بن گئے۔ دنیا نے اس اتحاد پر تعجب کا اظہار کیا۔ کسی نے اسے محض بھنگ خانے کی گپ سمجھا کسی نے اس میں حقیقت کی جھلک دیکھی۔ کسی کو ایسا نظر آیا جیسے دنیا اس اقدام سے تباہی کے دروازے پر پہنچ گئی ہے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کہ کس طرح پولینڈ تباہ ہوا۔ اور روس نے کس طرح اپنا حصہ حاصل کیا۔ کیسے بالٹک کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو غلام بنایا گیا اور کس طرح فن لینڈ سے جنگ چھیڑی گئی۔ پھر ماسکو اور برلن میں محبت کے پیغامات کا جو مبادلہ ہوتا رہا وہ کسی صاحب کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ غرضیکہ ان سب واقعات سے دنیا نے بھی

اندازہ لگا لیا تھا کہ روس اور جرمن یک جان و دو قالب ہو چکے ہیں۔ اب ان کا جدا کرنا ممکن نہیں ہے لیکن چشم عالم نے جون میں جب روس اور پولینڈ کی سرحدوں پر جرمنی اور روس کی افواج کا اجتماع دیکھا تو یہ پیش گوئی کی گئی کہ روس اور جرمنی میں جنگ چھڑنے والی ہے۔ جنگ کی افواہیں پہلے تو کچھ عرصے تک اڑتی رہیں لیکن روس اور جرمنی خاموش بیٹھے رہے۔ آخر ماسکو نے ان خبروں کی تردید کر دی اور کہا کہ اتحادی روس اور جرمنی میں جنگ چھڑنے کی جو خبریں مشہور کر رہے ہیں وہ سب بے بنیاد ہیں۔" لیکن دوسرے ہی دن ہٹلر نے روس پر چڑھائی کر دی اور دنیا نے ایک بار پھر برلن اور ماسکو کو ایک دوسرے کا دشمن پایا۔

آخر جرمنی نے روس پر کیوں چڑھائی کی؟ اور اس کے لئے موجودہ وقت کیوں انتخاب کیا۔

ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کے لئے ہمیں کہیں زیادہ دور نہیں جانا پڑتا۔ اس حملے کی کئی وجوہ ہیں۔ جن میں پہلی وجہ روس اور جرمنی کی پرانی دشمنی اور باہمی بنیادی اختلافات ہیں جو ہٹلر کے خیال کے مطابق کبھی دور نہیں کئے جا سکتے۔

دوسری وجہ۔ برطانیہ پر حملہ کرنے میں ناکامی بیان کی جاتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ وجہ بھی معقول نظر آتی ہے ہٹلر نے گزشتہ سال نشیبی ممالک کو اپنا غلام بنانے کے بعد اعلان کر دیا تھا کہ وہ اکتوبر میں انگلستان کو فتح کر کے جنگ ختم کر دے گا۔ لیکن اس بات کو دس ماہ گزر گئے۔ اور برطانیہ فتح نہ ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جرمن عوام میں بے اطمینانی سی پیدا ہو گئی تھی۔ ہٹلر کو اس بے اطمینانی سے خطرہ محسوس ہوا اس لئے اس نے روس کو اپنا نشانہ بنایا۔ تاکہ جب تک جرمنی برطانیہ پر حملہ کرنے کے قابل نہیں ہوتا لوگوں کی توجہ اس ہنگامے پر لگی رہے۔

تیسری وجہ باکو کا تیل اور گندم ہے۔ دنیا میں آج تک جتنی جنگیں ہوئی ہیں۔ ان میں بعض مذہب کے لئے لڑی گئی تھیں بعض محض بہادری اور جرأت کے مظاہروں کے لئے بعض حب وطن کے لئے لڑی گئی تھیں اور بعض عورت کے لئے ہٹلر نے روس پر حملہ کر کے بتا دیا ہے کہ تیل کے چشموں میں اور گندم کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں بھی وہ کشش ہو سکتی ہے جو حسینہ کے چہرے میں ہوتی ہے۔ اور تیل کے مٹکے اور گندم کے خوشے بھی ہیلن کا روپ دھار سکتے ہیں۔

ہٹلر کو روس کی گندم اور باکو کے تیل کی ضرورت اس واسطے پیش آئی کہ گزشتہ ڈیڑھ سال کی جنگ میں جرمنی کے وہ تمام ذخیرے ختم ہو چکے تھے جو اس نے فراہم کر رکھے تھے۔ جنگ شروع کرتے وقت ہٹلر کا خیال تھا کہ چند ماہ کے مقابلے کے بعد برطانیہ شکست کھا کر بیٹھ جائے گا۔ اس لئے اس نے زیادہ طویل جنگ کے لئے ذخیرے جمع نہیں کئے تھے لیکن جنگ طول پکڑ گئی اور ذخیرے ختم ہوتے گئے اور برطانیہ جرمنی کی دسترس سے دور ہوتا گیا۔ اس لئے اس کی نگاہ روس کی طرف اٹھی۔ اور اس نے جھٹ حملہ کر دیا۔

اس حملے کی چوتھی وجہ ایک اور بھی ہے۔ چونکہ جرمنی عراق اور شام میں کامیاب نہیں ہوا۔ اور اس طرح اس پر مشرق کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ اس لئے ممکن ہے وہ روس کے راستے ہندوستان پر حملہ آور ہونا چاہتا ہو۔

ہٹلر نے بھی حملہ کرنے کی وجوہ بتائی ہیں لیکن اس نے کلیتہً سٹالن کو مجرم ٹھیرایا ہے۔ اس نے کہا ہے چونکہ روس جرمن کا ازلی دشمن ہے اس لئے وہ جرمنی کی پیٹھ میں چھرا بھونکنا چاہتا تھا تاکہ نیشنل سوشلزم تباہ ہو جائے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس نے پہلے بالٹک کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی آزادی چھینی پھر فن لینڈ پر حملہ کر دیا۔ ازاں بعد رومانیہ سے بسرابیہ اور بکووانیا کے صوبے چھین لئے۔ ان علاقوں سے بھی جب اس کا پیٹ نہ بھرا تو اس نے یوگوسلاویا کے معاملات میں دخل دینا شروع کیا اور جرمنی کے خلاف بغاوت کرا دی۔ ہٹلر نے کہا ہے۔ ان سب اقدامات کا مقصد نازیوں اور جرمنی کی مخالفت تھی۔ جسے جرمنی پہلے زبرداشت کرتا چلا آیا لیکن آخر اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا ہٹلر نے روس پر در پردہ برطانیہ سے دوستی کا الزام بھی لگایا ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے۔ نازیوں کو اس دوستی کے متعلق چند دستاویزیں بھی ملی ہیں۔ ہٹلر نے یہ کہنے کو تو کہہ دیا ہے لیکن وہ دستاویزیں شائع نہیں کیں۔

جہاں تک ہٹلر کے دوسرے الزامات کا تعلق ہے۔ ان کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ الزامات صحیح ہیں تو ہٹلر اس وقت کیوں چپ سادھے بیٹھا رہا۔ اس وقت کیا جرمنی میں روس پر حملہ کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ یا کیا اس وقت اتنا بڑا مجرم نہیں تھا جتنا وہ اس کی نگاہوں میں اب ہے۔ یہ سب باتیں بتاتی ہیں کہ ہٹلر نے روس پر جو الزامات لگائے ہیں ان میں کوئی صداقت نہیں ہے محض "خوئے بدرا بہانہ بسیار" والی بات ہے۔ غرضیکہ یہ واقعہ ہٹلر کی بدعہدی کا بدترین ثبوت ہے جسے نازی کسی صورت میں بھی احسن قرار نہیں دے سکتے۔

اس وقت روس کی سرحد پر پندرہ سو میل لمبے محاذ پر نہایت خونریز جنگ ہو رہی ہے۔ فریقین کے ڈیڑھ ڈیڑھ سو ڈویژن میدان میں اترے ہوئے ہیں ٹینکوں کی یلغار ہے اور طیاروں کی پروازیں اس کے علاوہ ہیں۔ [illegible]

کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہ ہر محاذ پر سخت مقابلہ کر رہے ہیں۔

ہٹلر نے روس پر حملہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ وہ اس جنگ کو چار ہفتوں میں ختم کر دے گا لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ چار ہفتے تو ایک طرف اسے چار ماہ بھی اس مہم کو سر کرنے کے لئے ناکافی ہوں گے۔ کیونکہ نہ تو وہ فرانس بلجیم اور ہالینڈ کی طرح نحیف و زار ہے۔ اور نہ چھوٹا سا قطعہ زمین ہے جو چند ہفتوں میں سر کیا جا سکے۔ علاوہ ازیں ہٹلر کا خفیہ ہتھیار ففتھ کالم بھی روس میں مفقود ہے ایک اور بات بھی قابل غور ہے کہ دو ماہ کے بعد روس کا موسم تبدیل ہو جائے گا پہلے بارشیں شروع ہوں گی جس سے سارا علاقہ دلدلوں سے پُر ہو جائے گا۔ اور جرمن فوجوں کو پیش قدمی جاری رکھنے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے برخلاف روسی افواج کو آسانیاں حاصل ہو جائیں گی۔ اور وہ جرمنوں کو سخت نقصان پہنچا سکیں گی۔ دو ماہ کے بعد سردی اور برف باری جرمنوں کی پیش قدمی کو بالکل روک دے گی۔ اور ایک بار اگر جرمنوں کی پیش قدمی رُک گئی اور انھیں شکستیں ملنا شروع ہو گئیں تو پھر ان کے قدم رُکنا مشکل ہو جائیں گے اور ممکن ہے کہ ان حالات میں ہٹلر کو تباہی کا سامنا کرنا پڑے۔

ہٹلر کا حملہ روس پر دوسرا بڑا حملہ ہے۔ پہلا حملہ نپولین نے ۱۸۱۲ء میں کیا تھا لیکن اسے سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اور یہی ناکامی اس کی تباہی کا موجب بنی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر اور نپولین کے حملوں میں ایک گونہ مناسبت پائی جاتی ہے۔ نپولین کو بھی ہٹلر کی طرح برطانیہ پر حملہ کرنے میں ناکامی ہوئی تھی اور اس نے روس کا رُخ کر لیا تھا۔ اس وقت ہٹلر کی طرح نپولین بھی کم و بیش سارے یورپ پر قابض ہو چکا تھا۔ ہٹلر کی طرح وہ بھی ساری دنیا پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھا کرتا تھا۔ اس کے لئے اس نے یورپ کی بیس اقوام کی فوج سے جس کی تعداد سات لاکھ تھی روس پر حملہ کیا تھا لیکن جب اس نے دریائے نیمن کو عبور کیا تو روسی فوجوں نے پس پا ہونا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ ماسکو کے دروازے تک پہنچ گیا۔ یہ حملہ اس نے ۱۴ اکتوبر ۱۸۱۲ء کو کیا تھا۔ روسیوں نے ماسکو کو آگ لگا دی۔ اس اثنا میں برف باری شروع ہو گئی اور اسے واپس جانا پڑا۔ آخر بصد مشکل وہ برف باری کے طوفانوں کا مقابلہ کرتا ہوا۔ سات لاکھ آدمیوں میں سے چند ہزار سپاہیوں کے ساتھ واپس پہنچا لیکن اب اس کے بعد اس کا تنزل شروع ہو گیا۔ اور دو سال کے بعد یورپ کا فاتح سینٹ ہلینا میں قید نظر آیا۔

روسی اس جنگ میں بھی ان ہی طریقوں پر عمل کر رہے ہیں جو انھوں نے نپولین کے خلاف برتے تھے۔ وہی پسپائی وہی شہروں کو جلا کر خاکستر کر دینے کا ہتھیار وہ اب بھی استعمال کر رہے ہیں۔ اس لئے جرمن جن شہروں پر قبضہ کر رہے ہیں۔ ان میں سے انھیں کوئی شے حاصل نہیں ہو رہی۔ اگر ہٹلر یلغار کرتا ہوا ماسکو تک پہنچ گیا تو روسی پھر اسی پرانے ڈرامے کو دُہرائیں گے اور اگر وہ تین ماہ تک روس کو فتح نہ کر سکا تو پھر روس کی شکست بمشکل ہو جائے گی۔ اور دوسرا حملہ آئندہ گرمیوں سے قبل نہیں ہو سکے گا۔ اس اثنا میں وہ برطانیہ پر بھی سردیوں کی وجہ سے حملہ نہ کر سکے گا اور برطانیہ بدستور اپنی قوت و طاقت بڑھاتا جائے گا جو جرمنی کے حق میں نہایت مہلک ثابت ہوگی نیز جنگ طویل ہو جائے گی۔ اور جنگ کی طوالت ایسی شے ہے جس سے ہٹلر سخت ڈرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر جنگ طویل ہو گئی تو اسے سخت نقصان اٹھانا پڑے گا اور اس کا حشر بھی نپولین کا سا ہوگا!

غرضیکہ ہٹلر نے بھی نپولین کی غلطی کا اعادہ کیا ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ اس کا بھی انجام نپولین جیسا ہو!

تابش صدیقی

رباعی

یاد آتی ہے پھر ایک ملاقات کی رات
پھر پھر آتی ہے آنکھوں میں وہ برسات کی رات
جب [illegible] سے اور [illegible] ہنستی تھی
[illegible] بس [illegible] رات

[illegible]

سگریٹ

نقابِ نقرئی سے تو
کسی دوشیزہ کی انگشتِ سحر افزوں کی صورت
ابھی نکلا ہے — میں تجھ کو جلاتا ہوں۔
نہیں، تو خود ہی جلتا ہے
کہ دوشیزاؤں کی انگشتِ رنگیں آگ ہوتی ہے!

اُٹھاتا ہوں۔
ورق گرداںتا ہوں بھول جاتا ہوں کہ میں کیا پڑھ رہا تھا!
اور یہ سب خواب ہوتا ہے۔
تصوّر۔ خواب۔ محویّت!
نہ جانے کس لئے کس واسطے کس دوست کی خاطر!

جس کو دوست کہتا ہوں۔
یہ دولت مند لڑکا
یہ میرا ساتھی
مرے اسکول کا ساتھی
ہمیشہ کیا مجھے مہمان رکھے گا؟!

تری خوشبو؟ —
کسی کے بال جیسے خشک ہو جائیں!
میں اس خوشبو میں کھویا جا رہا ہوں آج ہی شاید۔
نہیں، میں پہلے کھویا تھا
کہ وقتِ صبح اُن بالوں کی خوشبو میں،
یہی بکھرا ہوا، پھیلا ہوا اک منتشر انداز پیدا تھا
میں کش پر کش لگاتا ہوں۔
دھوئیں کے پیچ و خم کچھ اس طرح اوپر کو اٹھتے ہیں
کہ جیسے ہلکے بادل اڑ رہے ہوں چرخ کی جانب۔
کچھ اس تیزی سے اڑتے ہیں کہ رکتے ہی نہیں پل بھر
میں ہلکے بادلوں میں منتشر تخیئل کو اپنی
مہیا کر رہا ہوں ایک تازہ نظم کی خاطر۔
اک ایسی نظم، جس کو کر سکوں منسوب میں اس سے!

یہاں تنہائیوں میں گاؤں کی تو اک ساتھی ہے۔
وہ ساتھی جس پہ مجھ کو فخر ہے میں ناز کرتا ہوں!
کسی سے دور یوں خاموش چپکے چپکے جلتا ہے
مرے دل کی طرح تو بھی
کہ تو ایثار کرتا ہے فقط اک دوست کی خاطر!
مرے ساتھی! مری ان انگلیوں سے کھیلتا ہی جا!
ہمیشہ، کاش! میری انگلیوں سے کھیلتا ہی جا!!

مگر میں سوچتا کیا ہوں؟
وہ رومانی تصور جو ابھی کس درجہ رنگیں تھے۔
فسردہ کیوں ہوئے جاتے ہیں؟
آخر سوچتا کیا ہوں؟

یہاں سے دور
کوسوں دور
اک گندے سے کمرے میں،
میں جب سگریٹ تو کیا بیڑی بھی دو دو بار پیتا ہوں،
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ بیڑی بھی نہیں ملتی۔

ہمیشہ کیا مجھے مہمان رکھے گا
مرا ساتھی
مرے اسکول کا ساتھی؟!

جلا ہی جا رہا ہے تو۔
میں تنہائی میں اپنی میز کے پہلے کنارے پر
یونہی محویتوں میں راکھ کو تیری گراتا ہوں
اور اس ناول کو جو رکھا ہے میری میز کے اوپر

یہ مہمانداریاں
خاطر تواضع
قیمتی سگریٹ!
یہاں اس گاؤں کے مالک کی،

سلام مچھلی شہری

اقبال اور نئی پود

وقت بہترین لیکن کسی قدر سست نقاد ہے۔ اقبال کی وفات کو ابھی اتنا عرصہ نہیں ہوا کہ اس کے کلام اور اس کی زندگی کا صحیح زاویے سے اندازہ کیا جا سکے۔ پہلے پہل جب اس کا کلام لوگوں کے سامنے آیا تو انہوں نے اس میں ایک ایسا انقلاب آفریں انداز نظر دیکھا کہ اکثر ذہن اس کی روشنی سے گویا خیرہ ہو گئے۔ مدت سے ہندوستانیوں کے کان ایسے نغمے سنتے آئے تھے۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا!

اور ـــ

جہازِ عمرِ رواں پہ سوار بیٹھے ہیں   سوار خاک میں بے اختیار بیٹھے ہیں

تھوڑا ہی عرصہ پہلے حالی - جو اردو ادب کے باغیوں میں سے تھا - بڑے خلوص سے یہ کہہ رہا تھا

حکومت نے آزادیاں ہم کو دی ہیں   ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں

لیکن اب ایک ایسی شخصیت ہندوستان کی ادبی اور ذہنی دنیا پر چھا رہی تھی جس کی "تاب سخن" نے اسے خدا سے ہم سخن کر دیا، اور جو اپنے جوش صداقت میں نہ کہنے والی باتیں بھی کہہ جاتا۔

بات کہنے کی نہیں، تو بھی تو ہرجائی ہے!

زندگی اس کے لئے ایک گریۂ پیہم کی جگہ سعیٔ پیہم تھی اور وہی مغربی تہذیب جو سر سید سکول کے لئے نصب العین کا درجہ رکھتی تھی۔ اسے ایک حقیر دھوکا اور ایک ناپائدار سراب نظر آتی تھی۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہو گا

اقبال کا یہ انداز نظر اس قدر نیا تھا اور لوگوں کی عرصے سے دبی ہوئی خواہشوں کا اتنا صحیح ترجمان تھا کہ لوگ رفتہ رفتہ اسے ایک انقلاب کا اوتار سمجھنے لگے۔ اور اس کے کلام کو الہام کا درجہ دیا جانے لگا اور اب تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اس نسل کے لوگ جنہوں نے اقبال کا اولین زمانہ دیکھا ہے اسے اسی عقیدت سے پڑھتے ہیں جیسے کسی مقدس کتاب کو۔ اور اس کے بے جان شعروں پر بھی اسی طرح جوش کا اظہار کرتے ہیں جس طرح ایک پکا مسلمان قرآن کی ان آیتوں کو بھی جھوم جھوم کر پڑھتا ہے جن میں بیاہ شادی اور تقسیم جائداد کا بیان ہے۔

اس نسل نے اقبال کی شاعری کو ایک ہدایت نامہ بنا لیا ہے۔ ان کے ذہنوں میں عمل، خودی، مشرقی تہذیب وغیرہ چند سرخیوں کے ماتحت اقبال کے متعلق ایک منجمد سا تصور بن چکا ہے۔ اور وہ بظاہر کسی طرح اس تصور کو بدلنے کے لئے تیار نظر نہیں آتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اقبال کی عظمت اسی میں تھی کہ وہ ایک جید مفکر اور معلم تھا۔ اور اس وہم میں وہ اس کی شخصیت کے اور بہت سے لطیف اور اہم پہلوؤں کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

لیکن خوش قسمتی سے نوجوان حلقوں میں اس ذہنی انجماد کا "ردعمل" شروع ہو گیا ہے اور وہ کوشش کرنے لگے ہیں کہ اقبال کو محض پرستش اور ستائش کی بجائے اس کی عظمت کی صحیح بنیادوں پر قائم کیا جائے اور اس کی ہنگامی اہمیت کی بجائے دائمی اہمیت سمجھی جائے۔

یہ نئی پود ـــ میری مراد اس نسل سے ہے جس کی ذہنی پرورش اس زمانے میں ہوئی جب اقبال کی شاعری کا چرچا عام ہو چکا تھا ـــ اقبال کا مطالعہ کسی جذباتی عقیدت سے شروع نہیں کرتی۔ یہ سچ ہے کہ خود اس کی ذہنی فضا کے تیار کرنے میں اقبال کا بہت حصہ ہے۔ ہمارا ترقی پسند ادب جس کے پیش نامے کے دو اہم عناصر رسمی مذہب سے بغاوت اور تہذیب مغرب کی بت شکنی ہیں ـــ اقبال کا احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔ لیکن نوجوانوں کے لئے یہ فضا شروع سے ہی عام ذہنی فضا بن چکی تھی۔ انہیں اس میں کوئی خاص انوکھا پن نہیں محسوس ہوتا۔ وہ اسے زمانے کی عام اور فطری روش

سمجھتے ہیں۔ وہ اقبال کی روح استغفار کو بھی رفتارِ زمانہ کا ایک اظہار سمجھتے ہیں، اس کا باعث نہیں۔ اس لئے وہ اقبال کی مجددانہ حیثیت کو کوئی خاص درجہ نہیں دیتے۔ بلکہ بہت اطمینان اور غیر جانبداری سے اس کی شاعری کے اصلی محرکات اور مقصدات تک پہنچنا چاہتے ہیں۔

نئی پود کا اقبال کے متعلق تصور سمجھنے سے پہلے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اقبال اپنی روح کی توانائی کے باوجود نوجوانوں کا شاعر نہیں۔ وہ جوانی کے شک اور بے اطمینانی سے بہت بیگانہ ہے۔ اس کے کلام کا صحیح لطف اسی وقت آ سکتا ہے جب آدمی بہت حد تک عقل اور عمر کی پختگی کو پہنچ جائے۔ میرے ملنے والوں میں اقبال کے سب سے زیادہ سرگرم مداح قدرے ادھیڑ عمر کے بزرگ ہیں۔ ہندوستان کے نوجوان، بالخصوص ان میں سے وہ جو زیادہ حساس دماغ ہوئے ہیں، اقبال کو پڑھ کر اکثر کسی برقی لہر کی تڑپ محسوس نہیں کرتے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہو کہ اقبال کو ہندوستانی نوجوانوں سے بحیثیت جماعت کوئی خاص ہمدردی یا محبت نہیں تھی۔ اس کی نظموں میں اکثر نوجوانوں کا ذکر آتا ہے، وہ ان کے سامنے ایک بلند مقصد پیش کرتا ہے اور کہیں کہیں اس میں یاس خیال کی جھلک بھی ملتی ہے کہ جس جہان کی وہ تلاش میں ہے، اسے نوجوان ہی پیدا کر سکتے ہیں لیکن اس کا اندازِ نظر ہمیشہ اس معمر بزرگ کا سا رہتا ہے جو برخورداروں کے لئے دعا کرنے، ان کے سامنے ایک آئیڈیل یا مثالی تصور پیش کرنے کے لئے بے تاب رہے۔ لیکن جو کبھی نوجوانوں کی سطح پر آ کر اپنے آپ کو ان میں سے ایک نہ محسوس کر سکے۔ اس کا "خطاب بہ جاوید" یا "سخنے بہ نژادِ نو"۔ بڑی قابلِ قدر نصیحتوں کے باوجود اپنے نوجوان پڑھنے والوں کے دلوں میں شاذ ہی کوئی زندہ تڑپ پیدا کر سکتا ہے۔ روح کا رقص جس پر اقبال اپنی تمام تر توجہ دیتا ہے جسم کے رقص سے خوب تر سہی، لیکن نوجوانوں کے لئے جسم کا رقص ہی فطری ہے۔

سچ یہ ہے کہ اقبال کے ہاں نوجوانوں کے روزمرہ کے مسائل سے دست و گریباں ہونے کی کوشش کہیں نظر نہیں آتی۔ بدقسمتی سے اس نے اس گروہ کو نوجوانوں کا نمائندہ سمجھ لیا تھا جس کی زندگی محض سطحی ہے۔ اور نتیجۃً وہ اکثر سطحی اسباب کو آج کل کے نوجوانوں کی پوری زندگی پر حاوی سمجھنے لگا تھا۔ وہ ان کی تن آسانی کی شکایت کرتا ہے۔ لیکن اس روحانی خراش اور شکستگی سے قطع نظر کر جاتا ہے جو ان کی زندگی کی سب سے زیادہ دردناک حقیقت ہے

ترے سوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی!

نوجوان دیکھتا ہے کہ یہ اس کے آباؤاجداد کی تن آسانی کا نتیجہ ہے کہ اس کے سوفے افرنگی اور اس کے قالین ایرانی ہیں۔ اور اس صورتِ حالات کو ایک لمحے میں بدل کر رکھ دینا اس کے بس کی بات نہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ حالات اس کی تن آسانی کی پیداوار نہیں بلکہ اس کی تن آسانی حالات کی پیداوار رہے اور اس نظام کو بدلنا اس لئے اس کے اختیار میں نہیں کہ بعض اور مسائل اس کی زندگی میں براہِ راست اسے الجھا رہے ہیں۔ اس صورت میں اگر اسے کوئی الزام دیتے ہوئے نصیحت کرے تو یہ نصیحت اسے کھوکھلی اور غیر مدلل معلوم ہوتی۔ اگر ہمدردی سے غور کیا جائے تو انہی افرنگی سوفوں میں ہندوستانی نوجوانوں کی ٹریجڈی کی ایک داستان ہے۔ ایک نوجوان شاعر کا نقطۂ نظر دیکھئے

زندگی تیرے لئے بستر سنجاب و سمور
اور میرے لئے افرنگ کی دریوزہ گری

عافیت کوشیِ آبا کے طفیل

پارۂ نانِ جویں کے لئے محتاج ہیں ہم
ہیں، مرے دوست، مرے سینکڑوں اربابِ وطن۔

افرنگ کی دریوزہ گری بہت بری چیز ہے۔ لیکن اس کا کیا جائے کہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس نے سینکڑوں نوجوانوں کی زندگیوں کو تلخ کر دیا ہے۔ اسے برا کہتے وقت ہمیں اس تلخی کا احساس بھی ضرور رہنا چاہئے۔

آج کل جو اہم ترین مسئلے ہندوستان کے نوجوانوں کو درپیش ہیں وہ ہیں عورت اور بھوک۔ ان دونوں کی کشمکش نے نوجوانوں میں ایک عجب روحانی تھکن اور دل برداشتگی پیدا کر دی ہے۔ جوان کی زندگی پر ایک گھٹا کی طرح چھا رہی ہے۔ اقبال ان دونوں سے بہت حد تک بے اعتنا نظر آتا ہے۔

جہاں تک عورت کا تعلق ہے اسے شکایت ہے کہ

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار!

کیوں سوار ہے؟ اس کا وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ نہ اعصاب کی آسودگی کے لئے کوئی علاج تجویز کرتا ہے۔

اس کے نزدیک عورت سوائے ماں کے مرد کی زندگی میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی بلکہ مرد کی تکمیل کے لئے اس کی ضرورت نہیں۔

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر؛
لیکن خود اس کی تکمیل بغیر مرد کے ناممکن ہے۔
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود

عورت کا "ستر"[1] — صحیح طور پر یہ کہنا کہ اقبال کا "ستر" سے کیا مطلب ہے۔ مشکل ہے — یا مرد ہے یا خاکِ لحد! وہ یہ بھی فیصلہ نہیں کرسکتا کہ کونسی چیز زیادہ قیمتی ہے۔

آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند!

ایک خودی کے پیغمبر کا یہ خیالات رکھنا کچھ حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے لیکن نوجوانوں کو اس کی بھی زیادہ شکایت نہیں۔ انہیں تو گلہ ہے کہ اقبال کے نزدیک محبت اور عورت میں کوئی براہ راست تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ محبت فاتح عالم ہے! عشق پر جہان کی بنیاد قائم ہے لیکن وہ محبت جو زندہ عورت اور مرد میں ہوسکتی ہے۔ ایک ایسی چیز ہے جس کے ذکر سے اقبال کوشش کے ساتھ اجتناب کرتا ہے۔ بانگِ درا میں دو ایک نظمیں ایسی ہیں جہاں اس محبت کی ہلکی سی — بہت ہی ہلکی اور نازک سی جھلک ہے "— کی گود میں بلی دیکھ کر" "پھول کا تحفہ عطا ہونے پر" —

وہ مستِ ناز جو گلشن میں جا نکلتی ہے
کلی کلی کی زباں سے دعا نکلتی ہے
الٰہی غنچوں میں وہ انتخاب مجھ کو کرے! —

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے ذہن میں آہستہ آہستہ اس کی اپنی جوانی کی زندگی کا ایک زبردست ردِ عمل ہو رہا تھا جس نے آخر اس کے لئے اس خوش فضا زندگی کا دروازہ ہی بند کر دیا۔ اور اس کے نزدیک عورت چند اصول اور مقاصد کا مجسمہ بن کر رہ گئی۔

بھوک — صحیح جسمانی بھوک — بھی اقبال کے ہاں مفقود ہے۔ عمر کے آخری دور میں اسے ہندوستان کے افلاس کا احساس ہونے لگا تھا —

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو!

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے کبھی ذاتی تجربے کی شدت سے بھوک کی تکلیف کو محسوس نہیں کیا۔ وہ غریبی اور امیری کو اکثر مثالی چیزیں قرار دے کر پہلی کو نعمت اور دوسری کو مصیبت کے طور پر پیش کرتا ہے۔

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسر تونگری سے نہیں

اور

کثرتِ نعمت گداز از دل برد
نازمی آرد نیاز از دل برد

یہ اندازِ نظر بہت بلند اور بے حد قابلِ قدر ہے۔ لیکن یہاں بھی اقبال تلخ حقائق کی جانکاہ قوت کو نظر انداز کر کے عام اصولوں کے بیان پر اکتفا کرتا نظر آتا ہے۔

اقبال کے اس طرح نوجوانوں کے مادّی مسائل کو نظر انداز کر دینے سے اس میں اور ہندوستان کے نوجوانوں میں کچھ دوری اور اجنبیت پیدا ہو گئی ہے جو اکثر انہیں ایک دوسرے کی روح تک نہیں پہنچنے دیتی۔ نوجوان یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اقبال کی دنیا تلخ حقیقتوں کی دنیا سے بہت دور ہے۔ اور اس کا پیغام ایک خیالی پیغام ہے جسے گوشت پوست سے لگاؤ نہیں۔ چنانچہ وہ اقبال کے پیغام اور اس کے فلسفے میں دلچسپی محسوس نہیں کرتے۔ وہ اس تصور سے بیزار ہیں جس میں اقبال زیادہ تر ایک مفکر اور معلم ہے وہ اس کے نام سے پہلے علامہ یا ڈاکٹر کا لفظ لگانا ضروری نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک اس کی شاعری اس کے فلسفے سے زیادہ اہم ہے۔

اس کے ساتھ ہی انہیں اقبال کی حدود، اس کی مجبوریوں اور کمیوں کا بھی پورا احساس ہے۔ وہ خواہ مخواہ اسے حریفانہ صفوں میں نہیں دھکیلنا چاہتے، آخر اقبال اور ٹیگور کو ایک ہی اکھاڑے میں لا کھڑا کرنے سے حاصل؟ اس حقیقت سے تو انکار نہیں ہوسکتا کہ دونوں کی شاعری نے ہزاروں انسانوں کے دلوں کو گرمایا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ راگ دونوں نے مختلف گائے ہیں۔ ایک دیپک الاپتا ہے تو دوسرا ملہار۔ دونوں میں آگ پانی کا بیر ہے، لیکن دونوں زندگی کے لئے یکساں طور پر ضروری ہیں۔ ان میں سے ہر ایک بذاتِ خود زندگی کی تصویر کو مکمل کرنے سے قاصر ہے۔

نئی پود جانتی ہے کہ اقبال ایک خاص نوع کا شاعر ہے — ایسا شاعر جس کے لئے شاعری اور پیغمبری کا منتہا ایک ہی ہے۔ اسے دنیا تک ایک پیغام پہنچانا ہے اور اس لئے اسے وہ تمام قربانیاں کرنا پڑتی ہیں جو ایک پیغمبر کے لئے ضروری ہیں۔ اسے جذبات کی ایک دنیا سے کنارہ کشی

[1] یہاں یہ بیان کر دینا غیر دلچسپ نہ ہوگا کہ قرآن میں بھی مرد کو عورت کا "ستر" کہا گیا ہے، لیکن وہاں عورت کو بھی مرد کی نسبت سے یہی درجہ عطا ہوا ہے۔

کہ کے اپنی توجہ تمام تر ایک خاص اندازِ نظر اور اندازِ خیال پر مبذول کرتا ہوتی ہے ۔۔۔ آپ نے اقبال کے کچھ شعر مناظرِ فطرت کے متعلق پڑھے ہوں گے۔ اس کی نظم "ایک شام" جس میں ع نیکر کا خرام بھی سکوں ہے، اور ع قدرت ہے مراقبے میں گویا!

اس کا "ہمالہ" اور ع وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا، اس کا پرستانی صحرا ؎

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن!

ان لطیف تاثرات سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کے نظاروں کے لئے اقبال نے نہایت حساس دل پایا تھا۔ لیکن اُس نے کبھی یہ احساس پیش منظر میں نہیں آنے دیا۔ کیونکہ اس سے اس کے پیغام کی حدت اور یک جہتی شاید کم ہو جاتی۔

اسی طرح اقبال کی پیغمبری نے اس کی شاعری میں سوائے ان مقامات کے جہاں وہ کائنات میں اپنی تنہائی محسوس کرتا ہو، زندگی کی بے تجدی کا احساس بہت مدھم کر دیا ہے۔ اس کا پیغام امید اور ترقی کا پیغام ہے اور یاس کے نغموں کا حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اقبال حزنیہ شاعری سے بہت دل برداشتہ نظر آتا ہے۔ آخری عمر میں تو یہ دل برداشتگی تعصب کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ وہ "ہنرورانِ ہند" کو موت کا نقش گر کہہ کر ان پر اظہار افسوس کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت قومی اور ملکی حالات کا اقتضا یہی ہے کہ ہمارا آرٹ موت کی نقش گری کی بجائے زندگی کے بلند مقاصد کی تلقین کرے۔ لیکن آرٹ کو ضروریات کی حدود میں پابند نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کا تانا بانا غم اور خوشی، امید اور یاس سے مل جل کر بنا ہے۔ حیات و ممات ایک ہی دریا کی دو موجیں ہیں۔

غالب کی یاس نمائی ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یا ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے!

اور اقبال کی امید آرائی۔

در طلب کوش و مدہ دامنِ امید ز دست
دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے

وطن اپنی اپنی جگہ سچے اور حقیقی انداز ہیں۔ اصل چیز شاعر کا خلوص اور اس کے جذبات کی گہرائی ہوا کرتی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں براؤننگ کے فلسفے کی طرح حد سے زیادہ رجائیت میں سطحیت کا زیادہ امکان ہے۔

یہاں تک ہم نے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ نئی پود کس ذہنی اور قلبی کیفیت کے ماتحت اقبال تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور اقبال کو سمجھنے کے لئے اسے کیا دقتیں پیش آتی ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ نوجوان اقبال کے پیغام سے قدرے بددل ہیں کیونکہ یہ ان کے روزمرہ کے مادی مسائل سے بے نیاز ہے۔ چنانچہ وہ اقبال کے فلسفے کو بذاتِ خود بہت توجہ کے قابل نہیں سمجھتے لیکن اقبال کا کلام اس قدر فکر انگیز اور جوش سے پُر ہے کہ کوئی ذہن، بوڑھا ہو یا نوجوان، اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نئی پود بھی اس سے اثر لیتی ہے، لیکن ایک نئے رنگ میں۔ اب یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ اس کے لئے اقبال کا اثر اور اس کی عظمت کن باتوں میں ہے۔

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ نوجوان اقبال کو اس کی حدود اور کمیوں سمیت سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ کمیاں لامحالہ اقبال کی کمزوری کا باعث نہیں بلکہ اُس کی عظمت اور قوت کے لئے لازمی ہیں۔ ان کے بغیر اس کے اندازِ نظر میں کبھی وہ یک سوئی نہ آ سکتی جو اُس کی شاعری کے جوش کا راز ہے۔ اقبال کی شاعری کئی جگہ زندگی سے دور جا پڑتی ہے۔ اس میں تنوع بھی بہت کم ہے، بلکہ کہیں کہیں تو اُس کے خیالات کی یکسانیت سے ہم اکتا جاتے ہیں لیکن اس کی نظر بے حد استقامت کے ساتھ زندگی کی عظمت اور اس کے اعلیٰ مقاصد پر جمی رہتی ہے۔ اس کے "دشتِ جنوں" میں جبریل واقعی "ایک صیدِ زبوں" ہے۔

خیالِ من بہ تماشائے آسماں بود است
بدوشِ ماہ و بہ آغوشِ کہکشاں بود است
گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمن ماست
کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بود است!

اس کے ابتدائی شعر

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

سے لے کر آخر تک

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

خیال اور نظر کی یہ بلندی قائم رہتی ہے اور یہ اس کا کمال ہے کہ اس نے ہمیں بھی اس بلند نظری کے قابل بنا دیا۔ یہ پہلی چیز ہے جو اقبال کے نوجوان پڑھنے والوں کو متاثر کرتی ہے۔

دوسری چیز اقبال کا خلوص ہے۔ سچ (جو کچھ وہ سچ سمجھتا ہو) کہنے سے وہ کبھی نہیں ڈرتا۔

جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو!

آخر میں تو یہ خلوص اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ وہ اپنے خیالات اور اپنے الفاظ میں کوئی پردہ نہیں حائل ہونے دینا چاہتا۔ اور اس کی کئی نظمیں تمام آرائشوں سے معرّا ہو کر اپنی عریاں قوت سے ہمارے دلوں پر قبضہ کر لیتی ہیں۔ یہ سادگی بہت جگہ آرٹ کے حدود سے بڑھ جاتی ہے۔ اور اقبال کو یہ خیال نہیں رہتا کہ شاعر کے لئے پڑھنے والے کے ذہن میں اپنا جذبہ پیدا کرنے کے لئے صداقت کے علاوہ صنعت کی بھی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ ضربِ کلیم کی بہت سی نظمیں محض منظوم خیالات یا تعلیمات معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن پھر بھی کلی اثر یہی ہوتا ہے کہ اقبال اپنے خیالات اور جذبات بے کم و کاست بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

تیسری چیز جو نوجوانوں کے نزدیک اقبال کی عظمت کا اہم جزو ہے اس کی فنی چابک دستی ہے۔ وہ بغیر کسی شک کے فنِ شعر کا ایک زبردست کاریگر تھا۔ الفاظ کی موسیقی، اور خیال اور آواز کی مطابقت کی حس تو اس میں اتنی تیز تھی کہ بعض دفعہ حیرت ہوتی ہے۔ اس کی موسیقی سننی ہو تو "زبورِ عجم" پڑھئے۔ معلوم ہوتا ہے اس رومی کے پیرو میں حافظ کی روح سرایت کر گئی ہے۔

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را
. . . . . .
با مہ و مہر دادہ ام تلخیٔ انتظار را!

اقبال نے ہمارے ادب کے ذخیرے کو سینکڑوں اچھوتی اور پُر معنی ترکیبوں سے بڑھایا ہے۔ حقیقت منتظر، خضرِ راہ، ذوقِ شعر، خسکم آویزی، خود آگاہی، فکرِ نا رسا، ہست و بود، اور بے شمار ایسی ترکیبیں ہمارے لئے عام ادبی زبان کا جزو بن چکی ہیں۔ اس کے بہت سے شعر اور مصرعے ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ع پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی، ع وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی۔ ع شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو، ع ڈھونڈھ اب ان کو چراغِ رخِ زیبا لے کر وغیرہ۔ کئی لفظوں کو اس نے ایک نئے اور وسیع معنی کا جامہ پہنایا — قلندری، مشتاقی، نظر، سفر، شاہین، راہی — یہ عام لفظ اب گنجینۂ معنی کا طلسم لئے ہوئے ہیں۔

اگرچہ تازہ ترین شعرا کی زبان اقبال کی زبان سے کئی لحاظ سے مختلف ہے (اقبال زبان کے معاملے میں بہت classical ہے) لیکن اس میں کلام نہیں کہ اقبال کو زبان پر پوری قدرت حاصل تھی اور وہ اس سے دقیق ترین خیالات کے اظہار کا کام لے سکتا تھا۔ زبان اس کے قابو میں تھی وہ زبان کے قابو میں نہیں تھا۔

یہ سب خوبیاں۔ بلند نظری، خلوص، موسیقی۔ بہت بڑی خوبیاں ہیں۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر کردار کا وہ عظیم الشان تصور ہے۔ جو اقبال نے نصب العین کے طور پر ہمارے سامنے پیش کیا اور جسے وہ اکثر قلندری کا جامع نام دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ قلندری اقبال کی سب سے بڑی دولت تھی۔ اور یہی اس کی زندگی کا اصلی حاصل تھا جو اس نے ہمیں عطا کیا۔ اگر ہمیں اقبال سے کوئی پیغام لینا ہو تو اس کی روحِ قلندری کو پہچاننے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

اقبال کا قلندر سوز و گداز کا مجسمہ ہے۔ شباب اس نے اپنے لہو کی آگ میں جل جل کر گزارا ہے اور اب وہ پگھلے ہوئے لوہے کی طرح ہو گیا ہے — نرم لیکن بے حد قوت کا حامل، اور ہر وقت فولاد بننے کے قابل اس کی اصل علامت "آہِ سحر" یا "فغانِ صبحگاہی" ہے۔ جو بہ یک وقت دل کے سوز اور روح کی آزادی کا نشان ہے۔ یہی اس کی دنیا ہے۔ ع مری دنیا فغانِ صبحگاہی۔ اور اسی سے وہ کائنات کے تمام اسرار پر عبور حاصل کرتا ہے کہ از اندیشہ برتر می پرد آہِ سحرگاہی "حتّٰی کہ وہ شاہوں کی شاہی اور فقیروں کی فقیری کا راز سمجھ جاتا ہے اور زمانے کے حادثے اسے رنجیدہ خاطر تک نہیں کر سکتے ؎

تلخے کہ فروریزد گردوں بہ سفالِ من
در کامِ کہن رندے آنہم شکریں بادا!

جلوت میں وہ مہر و ماہ پر کمند ڈالتا ہے اور خلوت میں زمان و مکاں اس کی آغوش میں ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اجتماعی فرائض بھی نہیں بھولتا۔ اور اپنے سوز سے دوسروں کے لئے نیا جہان پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

در میانِ سینہ دل خوں کردہ ام   تا جہانش را دگرگوں کردہ ام

دوسروں کے لئے جلنا اس کا فرض ہے۔

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا
بزم کو مثلِ شمع بزم حاصلِ سوز و ساز دے!

ضربِ کلیم میں اس "مردِ بزرگ" کی نہایت دلنواز تصویر ہے، دیکھئے

اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق
قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو
شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق
اس کا اندازِ نظر سارے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے واقف نہیں پیرانِ طریق

معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقبال کی روح کا مکمل اظہار ہے۔ جب وہ قلندری کا تصور پیش کرتا ہے تو اکثر تعلیم و تدریس کا خیال بھول جاتا ہے۔ اور اندرونی الہام پر تکیہ کر کے صرف اپنی ذہنی اور قلبی حالت کے اظہار پر اکتفا کرتا ہے۔ اسی لئے نئی پود کے لئے اس اظہار میں خاص اثر اور اہمیت ہے اور یہی وہ نقطہ ہے جس پر اقبال کے متعلق نئی اور پرانی پود کے اندازِ نظر کا بڑا فرق مبنی ہے۔ نوجوان اقبال کے تعلیمی اور افادی پہلو کی بجائے اس کے شخصی اور جذباتی پہلو کو زیادہ بنیادی سمجھتے ہیں۔ اس کا قومی احیا کا کام بےحد قابلِ قدر رہا ہے اور وہ تیزی سے ہندوستانی مسلمانوں کا ذہنی اور غالباً روحانی مرکز بن رہا ہے۔ لیکن یہ عملی نتائج فروعات میں سے ہیں۔ اصل چیز اس کی شاعرانہ اور عالمگیر حیثیت ہے۔ نوجوانوں کے نزدیک یہ انتہائی خود غرضی بلکہ آرٹ کی ہستی کی تردید ہے کہ ایک عظیم الشان شاعر کو محض قوم سدھار کے خیال سے پڑھا جائے۔ اقبال کو پہچاننے کے لئے ہمیں اس روح تک پہنچنا چاہئے۔ جو ہر وقت اس کے سینے میں اظہار کے لئے تڑپتی رہتی تھی۔ جب وہ کہتا ہے

سرِ دیں صدقِ مقال اکلِ حلال
خلوت و جلوت تماشائے جمال!

تو ضروری نہیں کہ اس شعر پر سر دھن لیا جائے۔ اس سے ہم کسی طرح اقبال تک نہیں پہنچتے۔ برخلاف اس کے جب ہم یہ نوا سنتے ہیں۔

ایں بندہ را کہ با نفسِ دیگراں نہ زیست
یک آہ خانہ زاد مثالِ سحر بدہ!
سیلم مرا بجوئے تنک مایۂ مپیچ،
جولانگہے بوادی و کوہ و کمر بدہ!

تو اقبال خود ہمارے لئے زندہ ہو جاتا ہے۔

دراصل ہمارے بزرگ اکثر یہ غلطی کرتے ہیں کہ اقبال کی قومیت میں اس کی شخصیت کو بھلا دیتے ہیں۔ وہ یہ حقیقت نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اقبال زمانۂ حاضر کے سب سے بڑے خود نگروں میں سے تھا۔ اس کے دل میں قوم کا بے حد درد ہے، وہ شمعِ محفل کی طرح دوسروں کے لئے جلتا ہے لیکن پھر بھی اس کی اپنی ذات اس کی ذہنی اور روحانی زندگی کا مرکز رہتی ہے وہ اکثر کائنات میں اپنی تنہائی محسوس کرتا ہے۔ اور اگرچہ آخر میں اسے امید ہو گئی تھی کہ ع مرے اب یہاں رازداں اور بھی ہیں، لیکن دانائے راز کی حیثیت سے اسے اپنا ساتھی نظر نہیں آتا ؎

سرآمد روزگارِ ایں فقیرے   دگر دانائے راز آید کہ ناید!

اس تنہائی کے احساس نے اس سے چند بہترین شعر کہلوائے ہیں اقبال شکسپیئر یا ہومر کی طرح ان شعرا میں سے نہیں جن کی ذات کو ان کی شاعری سے علیحدہ رکھا جا سکے۔ برعکس اس کے اس کی تمام شاعری اس کی شخصیت کا پرتو ہے۔ اسی لئے اس میں وہیں زیادہ تڑپ اور اثر ہے جہاں ذاتی جذبات کا عنصر غالب ہے۔ "خطاب بہ جاوید" کو پڑھتے جائیے۔ آپ کی ذہنی تربیت شاید ہوتی جائے لیکن دل میں ٹیس پیدا نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ آپ ایک ایسے شعر پر پہنچ جاتے ہیں

در میانِ سینہ دل خوں کردہ ام
تا جہانش را دگرگوں کردہ ام!

اور آپ کی روح کے تار تھرک اٹھتے ہیں۔ دراصل اس کی شاعری وہی ہے جہاں ع

روحِ من خوں گشتہ از تارِ رباب آید بروں!

آپ نے اقبال کی چند مختصر مگر حیرتناک دعائیں پڑھی ہوں گی۔ کوئی بہت ہی خارا دل انسان ہو گا جو ان سے متاثر نہ ہو۔

میں بلبلِ نالاں ہوں اس اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا دے!

اور

یارب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ
در بادہ نشہ را نگرم آں نظر بدہ!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب اقبال دعا کے لئے سر جھکاتا ہے تو دنیا وما فیہا سے اسے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اس کی ذات اپنی تمام سادگی اور سوز کے ساتھ اپنے معبود کے روبرو ہوتی ہے۔ اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ باوجود فلسفے اور پیغام کی مجبوریوں کے اقبال کا دل کتنا گداز ہے۔

ایسے شاعر سے تعلیم کے نظام اور عمل کے پروگرام اخذ کرنا شاید جائز تو ہو لیکن ہمیں کبھی یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اقبال کی عظمت اس کے فلسفے میں نہیں اس کے سوز و گداز، اس کی قلندری میں ہے۔ اور اس کی اصل اہمیت اس کی پیغمبری میں نہیں۔ اس کے احساس پیغمبری میں ہے

ظہیر الدین احمد ایم اے

رباعی

بادل جو جھک پڑے ہیں برسات کی رات
یہ رات ہے ساقی کی عنایات کی رات
کہہ دو مے و مینا کے پرستاروں سے
اُٹھو اُٹھو کہ زیست ہے رات کی رات

عبدالعزیز فطرت

استفسار

یوں ملاقاتوں میں تلخی کس لئے لاتی ہو تم؟
آنسوؤں کی مجھ سے طالب ہو تو کیوں آتی ہو تم؟

رات کو حقِ مسرت سونپ دیتی ہو مجھے
اور دن کو اجنبی بن کر چلی جاتی ہو تم!

کیا محبت کی یہ باتیں ہیں فقط بچوں کا کھیل!
کیا یونہی اس اپنے ظالم دل کو بہلاتی ہو تم!

وہ جو آغازِ تعلق میں کہی تھی ایک بات
رفتہ رفتہ اب اُسے کیوں بھولتی جاتی ہو تم؟

گر نہیں منظور یکسانی تعلق کی تمہیں،
رونق افزائے شبانہ بن کے کیوں آتی ہو تم

سیّد ارشاد علی گیلانی

شعر

جس در پہ یہ غل تھے کہ آنی کان پڑی آواز نہ تھی
غلِ سحر اُس در پہ تھی حیران کھڑی آواز نہ تھی

غزل

اک نگاہِ ناز اُس کی دل کو کیا برما گئی
زندگی بن کر سمائی، روح بن کر چھا گئی

اللہ اللہ، وہ شبِ غم قلب کی جنبش کا حال
میں یہ سمجھا عرش کانپ اُٹھا، زمیں تھرّا گئی

وقتِ نظّارہ کہاں کی گفتگو، کیسا پیام!
بس نظر کے سامنے اک برق سی لہرا گئی

انقلابِ دہر نے کچھ اس طرح اُلٹا ورق
ایک ہی جنبش میں ساری داستاں دہرا گئی

حادثوں میں زندگی کے سانحے کا کیا ملال
موج ہی تو تھی کسی طوفان سے ٹکرا گئی

یہ کہاں کی آرزوؤں نے احاطہ کر لیا
دیکھتے ہی دیکھتے دل پر اُداسی چھا گئی

اس سے پہلے بھی تو آخر بزمِ مہر و ماہ تھی
آج ہی کیوں انجمن کی انجمن شرما گئی

اک نفس کی زندگی اُس پر یہ شورِ اضطراب!
کیا کسی کے چشم و ابرو کا اشارہ پا گئی

گلشنِ ہستی میں بس اتنی سی ہے دل کی زندگی
شاخ میں جیسے کلی آئی، کھلی، مرجھا گئی

کس طرح کہیے کہ اُس کی آرزو نے کیا کیا
میری بربادی کا مجھ کو آئنہ دکھلا گئی

یہ زمانے کے شدائد، یہ جہاں کی سختیاں
کس طرح حرماں تجھے اس دار پر نیند آ گئی

حرماں خیرآبادی

دو بہنیں

شام کے چار بج چکے تھے حسبِ معمول آج بھی میں کلب گیا کھیل کو ختم کر کے روز کی طرح سب مل کر گپ شپ کرنے بیٹھے تھے۔ گپ شپ کے بحران کی کوئی حد نہیں ہوتی! ہمارے کلب ہی کی بات ہے نا! کلب کے سارے ممبروں نے عید پر ایک عصرانہ کی تجویز کی۔ اس دعوت میں کس قسم کے پکوان پکائے جائیں۔ اس پر اس قدر بحث و تکرار ہوئی کہ شاید ہی کسی میونسپل کمیٹی کے انتخاب میں ہوئی ہو۔ بہرکیف جب کھانوں کی فہرست تیار ہو گئی تو دن اور وقت کے تعین پر کافی دیر تک بحث و تمحیص ہوتی رہی۔ خدا خدا کر کے عصرانہ کے سارے مراحل طے ہو گئے۔

جب اس بکواس سے فرصت ملی تو کلب کی رنگین فضا نے دل و دماغ پر محبت اور رومان کے پردے ڈال دئیے۔ فلسفۂ محبت طے ہو ہی رہا تھا کہ کسی نے چھیڑ دیا —— "بھائی اور بہن میں اتنی محبت کیوں ہوتی ہے۔ بہن بہن میں کیوں اتنی گاڑھی نہیں چھنتی"۔ اس مسئلے کے حل کے لئے کئی نوجوان فلسفی آگے بڑھے، کسی نے بات کو مذاق میں اڑاتے ہوئے کہہ دیا کہ بھائی بہن میں زیادہ قربت ہوتی ہے کسی نے ویسے ہی غیر ارادی طور پر کہا دس آدمی ایک جگہ چین سے بسر کر سکتے ہیں لیکن دو عورتیں کبھی ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں گو ان باتوں سے مجھے ایک گونہ کیف محسوس ہوا۔ مگر میں کلب سے باہر نکل کر معمول کی طرح اکیلا ہی ٹہلنے نکل گیا ——

لیکن پانی میں دبا کر رکھا ہوا کارک، ہاتھ ہٹاتے ہی جس طرح سطح پر اچھل پڑتا ہے۔ اسی طرح میرے دماغ میں بھی ایک ہی سوال ابھر آیا —— شادی بیاہ، رسم و تقریبات ہر جگہ بھائی بہن کی محبت کا مظاہرہ تو دیکھا ہی جاتا ہے، لیکن ایک بہن کی دوسری بہن سے محبت —— میرے تمام افسانے میری نظروں کے سامنے سینما کی تصویروں کی طرح تیزی سے گزرنے لگے ان میں زندگی کی تلخ حقیقتیں تھیں، تخیل کی بلندی تھی، سب کچھ تھا لیکن ایک سادہ سوال کا جواب جسے میں ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ نہ تھا ——

میں اپنی پسندیدہ جگہ پر بیٹھ کر اسی ایک سوال کے حل میں محو تھا۔ آہستہ آہستہ شام نے اپنا آنچل پھیلانا شروع کیا۔ میں نے گردن اونچی کر کے سامنے دیکھا دُور فلکِ نیلی فام پر ایک ستارہ چمک رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ایک بہن کی دوسری بہن سے محبت بھی ایسی ہی ہے۔ کہاں اپنی یہ زمین اور کہاں یہ ستارہ! دونوں میں کتنا بُعد! لیکن اتنی دور سے بھی یہ ستارہ تاریکی کے نرغے میں پھنسی ہوئی زمین کو روشنی بخشنے کی کوشش کرتا ہے ——

اس خیال سے مجھے کچھ سکون محسوس ہوا۔ لیکن وہ لمحہ بھر ہی! خواب آور دوا کی خوراک سے بیمار پر جس طرح اونگھ طاری ہوتی ہے۔ ایسے ہی —— بالکل ایسے ہی محسوسات کے تاثرات ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اثر زائل ہو جائے تو ——

گھر پہنچنے تک میں اسی ایک سوال کی عقدہ کشائی میں منہمک رہا۔ میں نے اپنی اکثر ملاقاتی لڑکیوں کو یاد کیا۔ ان میں سے دو بہنوں کے لڑکپن کی آپس کی محبت صاف نمایاں تھی۔ لیکن ان کے بڑے ہونے کے بعد کی محبت؟ سچ ہے کہ شادی کے بعد ہر لڑکی اپنی گرہستی کی مصروفیات میں کھو جاتی ہے! پہاڑوں سے بہتے جا کر سمندر میں ملنے والی ندی کو پہاڑوں کا حسین منظر یاد نہ رہے تو کونسا تعجب!

گھر کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے خیال آیا —— میں نے خواہ مخواہ اس سوال کے حل کی بے سود کوشش کی۔ اپنے سامنے تو اپنی امّی کی ہی زندہ مثال ہے —— پھر ——

والدہ کی محبت اور ہر دلعزیزی کی میں ہی کیا بلکہ سارا گاؤں تصدیق کرے گا۔ والد بلا کے متلوّن مزاج تھے مگر کیا مجال جو کبھی والدہ کی پیشانی پر شکن تک آیا ہو تین برس تک والد دق میں مبتلا رہے۔ ان تین برس میں وہ کتنے تیز مزاج اور چڑچڑے ہو گئے تھے! لیکن اس تمام عرصے میں والدہ نے بے چون و چرا اُن کی خدمت کی ——

امی کی مجھ سے محبت .... میں ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوا تو وہ میرے

لئے دعا کرتیں "اے معبود! میری باقی ماندہ عمر سب کی لے، ہر سال کے بدلے ایک مہینہ کر دے، لیکن یہ ساری حیات میرے جگر گوشہ کو دے دے"!

شاید اُن کی اس التجا کو سن کر ہی میرے کمرے کے دروازے پر کھڑا موت کا فرشتہ بغیر کسی بھینٹ کے واپس چلا گیا!

امی نے کبھی کسی ہمسائے اور پڑوسی کو خالی ہاتھ نہ لوٹایا۔ ایک کے بجائے دس مہمان بھی آئے تو ان کی پیشانی پر شکن تک نہ آئی..... لیکن! لیکن انہوں نے کبھی خالہ عطیہ کو اپنے گھر نہ بلایا ان کی گفتگو سے کبھی یہ بھی محسوس نہ ہوتا کہ ان کی کوئی بہن بھی ہے۔ آخر ایسا کیوں؟ ——

خالہ عطیہ بیوہ تھیں۔ شادی کے ابتدائی چند سالوں میں ہی ان کے شوہر داغ مفارقت دے گئے تھے۔ یہ امی کی چھوٹی بہن تھیں۔ امی کے سوا ان کا اور کوئی قریبی رشتہ دار نہ تھا۔ اس کے باوجود، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ خالہ عطیہ کبھی ہمارے گھر نہ آئیں! میں بڑا ہو گیا۔ بچپن میں میں اکثر منصوبے باندھتا کہ جب میں کمانے لگ جاؤں تو خالہ عطیہ کو بھی لے آؤں گا! لیکن انسان کے منصوبے تو سطح آب پر بلبلوں کے سے ہوتے ہیں، جو ہوا کے ایک جھونکے سے نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ میرے کالج سے نکلنے سے قبل ہی عطیہ خالہ رحلت کر گئیں۔ رفتہ رفتہ میں ان کو بھول گیا۔ والدہ بھی کبھی ان کا ذکر نہ کرتیں!

میں دستر خوان پر بیٹھا تھا، مگر بے حد خاموش تھا۔ تخیلات کے بے پناہ ساگر میں ڈوبا جا رہا تھا۔ مجھے غیر معمولی طور پر خاموش دیکھ کر والدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیوں۔ آج تم کچھ اداس معلوم ہوتے ہو؟"

"نہیں کوئی بات نہیں۔ یوں ہی کچھ سوچ رہا تھا!"

"کیا سوچ رہے ہو۔ ایسی کیا بات ہے؟"

میں نے گردن اونچی کر کے ایک مرتبہ امی کی صورت دیکھی اور پھر شام سے دماغ میں چکر لگانے والے سوال کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "سچ ہے کہ ایک بہن کو دوسری بہن سے محبت نہیں ہوتی!"

"تم افسانہ نگار جو....."

"دنیا کو حقیقت کا درس دینے کی ذمہ داری تو ہمارے ہی سر ہے!"

"لیکن جو بات تم بناتے ہو، کیا کبھی اُس پر غور بھی کرتے ہو"

"ہاں!"

"آخر یہ تو معلوم ہو کہ تمہیں یہ خیال پیدا کیسے ہوا؟"

"کیسے؟" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "آپ سے!"

اُمی میری طرف دیکھتی ہی رہ گئیں! خواب میں کوئی چونکا دینے والا بھیانک منظر نظر آنے پر آدمی آنکھیں کھول کر جس طرح سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے، بالکل یہی حال امی کا بھی تھا۔ لیکن ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

اب میرا خاموش رہنا قرینِ مصلحت نہ تھا۔ میں نے کہا۔ "آپ اور عطیہ خالہ حقیقی بہنیں ہیں نا؟"

"ہاں!"

"آپ دونوں میں محبت ہوتی تو خالہ ضرور ہمارے گھر آتیں۔ کم از کم آخری مرتبہ اپنی بہن کی گود میں سر رکھے ہوئے جان دینے کی خواہش تو انہیں ضرور ہوتی"!

مجھ سا حقیقت نگار جانے اور کیا کیا بڑبڑاتا!

امی کی آنکھوں میں ساون بھادوں کی گھٹائیں چھا گئیں۔ ——

آنکھیں پونچھنے کے لئے انہوں نے گردن پھیری۔ میرے دل پر زبردست چرکا لگا! غیر ارادی طور میں نے امی کے زخمی دل پر نمک چھڑک دیا تھا! شاید دنیا کے سامنے کسی تلخ حقیقت کے انکشاف کی ترنگ میں میں نے ——

امی نے آنکھیں صاف کیں اور اٹھ کر چلی گئیں۔

ہاتھ دھو کر بھاری قدم لئے ہوئے میں اپنے کمرے میں آیا۔

سامنے کی حسین تصویر کی طرف دیکھا۔ وہ دو ندیوں کا ایک دلفریب سنگم تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے ہنسی آئی ——

اتنے میں والدہ اندر آئیں۔ ان کے ہاتھ میں صندل کی لکڑی کا ایک چھوٹا سا صندوقچہ تھا۔ اسے میں نے امی کے زیورات کے صندوق میں کئی بار دیکھا تھا لیکن اس کے متعلق امی سے کبھی پوچھ گچھ نہ کی۔ جب میں یہ صندوق دیکھتا تو خیال کرتا —— امی نے بہو کے لئے کوئی سونے کا زیور بنا کر رکھا ہو۔ شاید عین شادی کے وقت نکال کر مجھے حیرت میں ڈالنے کا ارادہ ہو! اس صندوقچے میں کیا ہے۔ یہ پوچھ کر امی کے دماغی سکون میں ہلچل ڈالنے سے کیا حاصل!

امی یہ صندوقچہ لے کر اس وقت میرے کمرے میں کیوں آئیں۔ یہ میں نہ سمجھ سکا!

محسوس ہوا —— اس صندوقچے میں خالہ عطیہ کے زیورات ہوں گے۔ شاید انہوں نے امی کو دیئے ہوں گے گفتگو کے درمیان میں میں نے کہا

تھا نا کہ بہن کی بہن سے محبت نہیں ہوتی؟ مجھے اس دعوے کو باطل کرنے کے لئے امی یہ صندوقچہ لے کر ـــــ فوراً ہی خیال ہوا۔ والد کی حیثیت تو اچھی تھی۔ پھر خالہ کا امّی کو زیور دینے کا سبب؟ خالہ تو بیوہ تھیں! اگر ان کی ضرورت سے زیادہ تھے تو غربا اور محتاجوں پر خرچ نہیں کرسکتی تھیں کیا؟

صندوقچے پر کنجی رکھ کر امّی نے میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ایک تلخ تبسم تھا ـــــ

مجھ سے بغیر کچھ کہے وہ چلی گئیں۔

وہ صندل کا صندوقچہ اور اس پر کی وہ چھوٹی سی کنجی ـــــ

میں نے کنجی ہاتھ میں لی۔ لیکن باوجود کوشش کے بھی صندوقچہ کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔

بچپن میں "علی بابا اور چالیس چور" میری محبوب کہانی تھی۔ اس میں کھل سم سم کہنے سے غار کے دروازے کے کھلنے پر جو کیفیت علی بابا کی ہوتی ہوگی اس وقت اس کا حقیقی تصور میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

ناکامی یاس سے بھی زیادہ روح فرسا ہوتی ہے۔ نہیں! اس لئے میں نے اسی ادھیڑبن میں ایک دفعہ کسی طرح کنجی گھمائی اور صندوقچہ کھل گیا۔

اوپر ہی ایک نوجوان حسینہ کی تصویر تھی۔ اس کا لباس کوئی خاص پرتکلف نہ تھا۔ مگر چہرہ اتنا جاذب اور دلکش! سچ تو یہ ہے کہ اس کی شریانیں مچلتے ہوئے خون سے پر دکھائی دیتی تھیں۔ وہ ایسی ہی لطیف اور موہنے والی معلوم ہو رہی تھی جیسے ایک رسیلا انگور۔

میں اس تصویر کو بغور دیکھ رہا تھا کہ یکایک میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے! یہ خالہ عطیہ کی جوانی کی تصویر تو نہ تھی؟ میں نے اپنے کالج کے زمانے میں ایک تصویر دیکھی تھی مگر وہ تو ان کے ادھیڑپن کی تھی۔ لیکن یہ تصویر.... تصویر کی حسینہ سترہ اٹھارہ برس کی تھی مگر آنکھیں بالکل خالہ عطیہ کی سی تھیں۔

امّی کے پاس خالہ کی تصویر ہوتے ہوئے بھی انہوں نے مجھے اب تک کیوں نہ بتلایا؟ امی اور خالہ کبھی ایک دوسرے کے پاس جاتی آتی بھی نہ تھیں! جوں توں کر کے میں نے تصویر کو ایک طرف رکھ کر صندوقچے کا جائزہ لیا۔ دو خط تھے اس میں! جلدی جلدی میں نے اوپر کا ہی لفافہ اٹھایا اور اس میں سے چٹھی نکالی۔

اس خط کی تحریر دیکھتے ہی مجھ پر بجلی گر پڑی!

والد کی تحریر تھی وہ!

صندل کے صندوقچے میں والدؒ کی محفوظ رکھی ہوئی خالہ کی تصویر کے اس کے نیچے والد کا خط! اس کا آغاز بھی کیا تھا!

"پیاری عطیہ ....."

میں جیسے کڑی دھوپ میں جھلس گیا۔ دس پانچ منٹ تو وہ خط ہاتھ میں لے کر جوں کا توں بیٹھا رہا۔ گھر کے بل ہی میں سانپ کا وجود پا کر آدمی کے دل کی جو کیفیت ہوتی ہے بالکل یہی حال ان دس پانچ منٹ تک میرا بھی رہا۔

آخر کار بڑی ہمت کر کے جلدی جلدی وہ خط پڑھا ـــــ وہ خط ایک محبت نامہ تھا ـــــ ابا نے عطیہ خالہ کو لکھا تھا۔ اس میں ابا نے امّی کی طرف سے اتنی بیزاری کا اظہار کیا تھا کہ....

کوئی نیا دولھا حجلۂ عروسی میں داخل ہو کر عروس نو کے انتہائی حسین ہونے کے تصور سے نقاب ہٹاتا ہے اور نقاب الٹتے ہی اسے انتہائی کریہہ المنظر پا کر جو کیفیت اس کے دل کی ہوتی ہے۔ بالکل یہی کیفیت میری بھی تھی!

والد کے اس خط کو دور پھینک کر میں نے صندوقچے سے دوسرا خط نکالا۔ اس خط کی تحریر موتیوں کی لڑی کی طرح خوبصورت تھی۔ لیکن اس سے پہلے میں نے یہ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے خط کے نیچے نام پڑھا ـــــ

تمہاری بہن ـــــ عطیہ"

بے چاری بھولی امّی! سادہ لوح!

انہوں نے یہ خط محفوظ رکھا!

ساتھ ہی مجھے خیال ہوا..... ایک بہن کی دوسری بہن سے محبت نہیں ہوتی۔ میرے اس گمان کو غلط ثابت کرنے کے لئے امی یہ صندوقچہ لائیں۔ تب ـــــ

میں بڑی ہی تشویش سے عطیہ خالہ کا خط پڑھنے لگا.....

رضیہ آپا! عطیہ کا پرخلوص سلام قبول ہو!

لیلیٰ شب کے گیسو کمر تک دراز ہیں۔ باہر آدھی رات کی بھیانک تاریکی ہر سو حکومت کر رہی ہے۔ میرے دل پر بھی ایسی ہی تیرگی چھائی ہوئی ہے فضا کی تاریکی کو روشنی بخشنے کے لئے لاکھوں ستارے جگمگا رہے ہیں۔ لیکن میرے دل کی تیرگی کو ضیا بخشنے والا ایک بھی ستارہ نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن آج ـــ البتہ اب ـــــ یہ پڑھ کر تم خیال تو کرو گی کہ عطیہ پاگل ہو گئی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تم سے من و عن بیان کر دوں۔ بالکل ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ دل کی ساری باتیں قے کر دوں۔ اُگل دوں۔ لیکن —— کھانے میں مکھی مل جائے تو وہ سارا کھانا قے کے ذریعے نکل پڑتا ہے۔ لیکن انسان کے دل میں جو گناہ حلول کر جاتے ہیں۔ انہیں البتہ وہ پچا لیتا ہے۔ اندر ہی اندر اُبکائیاں آتی ہیں متلی ہوتی ہے لیکن وہ باہر نکلنے کا نام نہیں لیتے!

تمہارے شوہر کی مجھ سے محبت اور میلان ہے —— کیسے کہوں کہ میں نے انہیں بالکل لالچ نہیں دی؟ ہمارا حال بالکل اُن دو انتہائی ڈرپوک بچوں کا سا ہوا جو ایک دوسرے کی ہمت پر گھنے جنگل میں گھس پڑتے ہیں۔ یہی کیا۔ سارے لوگوں کا ایسا ہی ہوتا ہوگا!

آپا۔ میں اپنے کو بری کرنے یا اپنے گناہ ثابت کرنے کے لئے یہ نہیں کہہ رہی ہوں! بغیر ہوا کے چراغ نہیں جلتا نا؟ دوسرے کے سہارے بغیر گناہ کی جوالا بھی کبھی بھڑکتی نہیں ——

آپا۔ امی کی یاد تو مجھے آتی ہی نہیں۔ تم ہی میری امی۔ تمہاری اور میری عمر میں صرف سات آٹھ سال ہی کا فرق ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے محسوس ہوتا کہ تمہاری گود میں سر رکھ کر خوب خوب روؤں اور تم میرے سر پر ہاتھ پھیرتیں۔ میرا منہ اوپر اٹھا کر میری آنکھیں پونچھتیں اور جس طرح بچپن میں کبھی کبھی ضد کرنے پر تم جیسے محبت سے کہتیں "پاگل کہیں کی!" ایسا ہی اب بھی تمہارے منہ سے نکلے! لیکن ——

تمہیں تو نفرت ہو گئی ہو گی۔ میری صورت بھی دیکھنا نہ چاہتی ہو گی لیکن —— آپا۔ گذشتہ دو سال تم مسلسل بیمار نہ ہوتیں۔ ناتوانی اور چڑچڑا پن نہ ہوا ہوتا تو ——

تم تو بیمار رہی تھیں۔ مگر اس عرصے میں ہم سالی بہنوئی میں بے تکلفی بڑھتی گئی۔ گاؤں میں تھیئٹر آیا۔ تم جاگ نہیں سکتی تھیں اس لئے تم نے انکار کر دیا۔ ہم دونوں ہی گئے —— اس کا ایک منظر —— !

تماشے سے واپس آتے ہوئے انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں نے بھی اُسے وہیں رہنے دیا۔

آپا۔ غصّے نہ ہو جئے۔ انسان بہت جلد اپنی خواہشات کا غلام ہو جاتا ہے۔ لیکن نیکی کا تصوّر —— گرتے پڑتے گناہ کی بھیانک غار میں گرنے کا بھی تصوّر تو مجھے ضرور تھا۔

لیکن ——

گذشتہ چھ مہینے میں ہمارے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ بے تکلفی حد سے سوا ہو گئی۔ انہوں نے فوراً ہی میری ایک تصویر کھنچوا کر میز پر رکھ لی وہ تو تم نے اٹھالی تھی۔ مگر انہوں نے مجھ سے کہا۔ میری میز پر سے تیری تصویر اُس نے پھینک دی تو بھی میرے دل میں تری تصویر کچھ ——

آپا مجھے معاف کرنا! وہ کچھ اس طرح کہہ رہے تھے کہ مجھے بڑا ہی کیف و سرور محسوس ہو رہا تھا بالکل شہد سا —— اس شام تک مسرت و انبساط کا خمار تھا۔

شام کو وہ اور میں گاؤں سے دور جنگل میں ٹہلنے نکل گئے۔ انہوں نے مجھ سے شادی کا وعدہ لیا۔ میں نے وعدہ کیا۔ بہن کی سوت بننا میں نے قبول کیا۔ مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں تمہاری مسرت و شادمانی پر ڈاکہ ڈال رہی ہوں۔ لیکن ——

ایک بہت پرانا واقعہ ہے۔ بہت بڑا قحط پڑا۔ ہزاروں جاندار بھوک سے تڑپنے لگے۔ ایک زاہد کو کئی دنوں سے کچھ کھانے کو نہ ملا۔ آخر کار ایک رات وہ چوری چھپے سے ایک چمار کے گھر گھُسا۔ ایک مردہ کتّے کی ٹانگ اس کے ہاتھ لگی۔ اُس نے وہی چوسنا شروع کی۔

محبت کے بارے میں میرا بھی یہی حال ہُوا۔

رات ہونے پر ہم گھر آئے۔ ابر میں چاند کا کنارا بہت ہی بھلا معلوم ہو رہا تھا جیسے گھاس کے تنکوں میں موتی پروئے ہوں۔ اس چاند کے کنارے کو دیکھتے دیکھتے میرے دل میں ہزاروں قسم کے خیالات پیدا ہونے لگے۔ اور فوراً ہی ایک خیال ان سب پر غالب آگیا۔

مجھے محسوس ہُوا۔ تم میری بڑی بہن ہو اور میں میں ——

آپا۔ تم سے بغیر کہے یا تمہاری خبر گیری کے بغیر میرے چلے جانے سے تم ناراض نہ ہونا۔ میں کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں بہن ہی ہوں۔ تمہاری مسرت و شادمانی کے خیال سے ——

میں اب تمہارے گھر واپس نہ آؤں گی۔ منظر کتنا خوبصورت ہوتا ہے لیکن وہ اتنا تلخ ہوتا ہے کہ ——

میرا بھی یہی حال ہے۔۔

جی چاہتا ہے کہ خوب خوب لکھوں۔ لیکن ——

تمہاری بہن علیہ"

خط ختم کر کے میں نے سامنے دیکھا۔ سامنے رکھا ہُوا صندل کا صندوقچہ اب بھی کہہ رہا تھا کہ دنیا کی اکثر تلخ حقیقتیں ایک سربستہ راز ہوتی ہیں ——

محمد عبدالقادر فاروقی

پتّہ

اس بیری کی اونچی چوٹی پر وہ سوکھا تنہا پتّہ
جس کی ہستی کا بیری ہے، پت جھڑ کی رُت کا ہر جھونکا۔
کاش مری یہ قسمت ہوتی، کاش میں وہ اِک پتّہ ہوتا!
ٹوٹ کے جھٹ اس ٹہنی سے گر پڑتا، کتنا اچھّا ہوتا!
گر پڑتا اس بیری والے گھر کے آنگن میں گر پڑتا،
یوں ان پازیبوں والے پاؤں کے دامن میں گر پڑتا!
جس کو میرے آنسو پوجیں، اس گھر کے خاشاک میں مل کر،
جس کو میرے سجدے ترسیں اس دوارے کی خاک میں مل کر
اس آنگن کی دھول میں مل کر مٹتا مٹتا مٹ جاتا میں،
عمر بھر ان قدموں کو اپنے سینے پر مضطر پاتا میں!
ہائے مجھ سے نہ دیکھا جائے! آیا، ہوا کا جھونکا آیا،
ڈالیاں لرزیں، ٹہنیاں کانپیں، لو وہ سوکھا پتّہ ٹوٹا!

مجید امجد بی اے۔

ایک نفسیاتی مطالعہ

"ادبی دنیا" اپنی زندگی میں پہلی بار اپنے ایک قلمی معاون کا خط شائع کر رہا ہے۔ روش سے ہٹ کر اس اقدام کے جواز کی سب سے بڑی دلیل تو بجائے خود یہ خط ہے۔ لیکن وضاحت کے طور پر اس قدر ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اپنی ادبی خصوصیات اور خلوص کی بنا پر یہ محض ایک خط نہیں رہا، بلکہ انشائے لطیف کا نمونہ بن گیا ہے۔ نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے جہاں اس میں ایک غیر معمولی ذہانت کا خود نوشتہ تجزیہ موجود ہے وہاں اس اہم مسئلے پر بھی روشنی پڑتی ہے جو براہِ راست مصنفین کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ گویا اظہار و ترجمانی کے سلسلے میں تہذیب و تمدن کی ابتدا سے ہی صحیح معنوں میں ترقی پسند فن کاروں کی راہ میں جو مشکلات حائل ہوئی۔ یہی ہیں اُن کا عکس اس خط میں ایک ایسی تلخی کا حامل ہے جسے محسوس کرتے ہوئے ایک جوش دل میں پیدا ہوتا ہے، ایک باغیانہ جوش جو رسم و رواج کی پابندی کے مہمل اور دقیانوسی تانے بانے کو ایک پل میں توڑ دینے پر اکساتا ہے ـــ اس کے علاوہ ایک ذہین ہندوستانی نوجوان کی زندگی کا عکس بھی اس میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ہمارے خیال میں وقت آ چکا ہے بلکہ گذرا جا رہا ہے کہ ہم ادب اور آرٹ میں ایک مجاہدانہ شان کے ساتھ اُن تمام باطل کا مدلل جادہ پر زور مقابلہ کریں جن کی طرف اس مختصر انشا کے الفاظ اور بین السطور میں واضح اشارے ہیں۔

ادارہ

مکرمی تسلیم:-

عنایت نامہ کل ملا۔ آپ نے میرے خط کا مطلب غلط سمجھا۔ میں نے کوئی بات طنزاً نہ لکھی تھی ....

..... وہ خط لکھنے کے بعد مجھے افسوس بھی ہوا کہ میں نے فضول لکھا۔ لیکن میں اُس دن مایوسی کے انتہائی نقطۂ عروج پر تھا۔ آپ میری اس جھک جھک سے تنگ تو ضرور آ جائیں گے لیکن آپ کی بدگمانی رفع کرنے کے لئے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں نے یہ کیوں لکھا تھا کہ میں اب افسانہ نہیں لکھ سکتا ورنہ "ادبی دنیا" سے تو میں ایک ذاتی قسم کا لگاؤ محسوس کرتا ہوں۔ اور میرے سہر بھائی بہن کا یہ اصرار ہے کہ میں "ادبی دنیا" ہی میں لکھوں۔ جب میں نے سب سے پہلے افسانہ لکھا ہے تو میں اپنی سب سے بڑی کامیابی یہ سمجھتا تھا کہ وہ "ادبی دنیا" میں شائع ہو جائے کیونکہ اس کا معیار بلند ہے، یا "نیا ادب" میں کیونکہ وہ سوشلسٹوں کا رسالہ ہے۔ ٹھیک ایک سال ہوا جب آپ نے میرا پہلا افسانہ قبول کیا تھا۔ اُسی زمانے میں میں نے بی اے میں فرسٹ کلاس حاصل کی تھی، لیکن مجھے ذرا بھی خوشی نہ ہوئی تھی، بلکہ کچھ، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں نے اپنے انحطاط پذیری کے اصول سے غداری کی ہو، یا Bourgeois[1] Prejudicees اختیار کر لی ہوں۔ میں ایم اے میں داخل ہونے جا رہا تھا مگر اسے بالکل فضول چیز سمجھتا تھا۔ اسی دوران میں میرا جی صاحب کا خط ملا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ آپ کا افسانہ خوب ہے"۔ اگرچہ یہ فقرہ رسمی سا ہے، مگر پھر بھی اس سے مجھے اتنی خوشی حاصل ہوئی کہ میں یہ سمجھنے لگا کہ کم سے کم ایک چیز تو ایسی ہے جس کے لئے میں زندہ رہ سکتا ہوں، اور ایک آدھ مہینے تک میں اسی فقرے سے تازگی حاصل کرتا رہا جب تک کہ میں Marcel Proust[2] اور Andre Maurois[3] کی Byron[4] سے آشنا نہ ہوا۔ ان دونوں نے جو کسر تھی وہ بھی پوری کر دی، اور میں ہمیشہ سے زیادہ تیزی سے انحطاط کی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔

افسانہ نہ لکھ سکنے کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ میں اپنی صحت بالکل برباد کر چکا ہوں۔ چار سال سے مجھے مستقل کھانسی ہے۔ لیکن میں اپنی زندگی کی طرف سے اتنا بے پروا ہوں کہ روزانہ دوا کے فوراً بعد گرم مزور کھاتا ہوں جس سے دگنی شدت سے کھانسی اٹھتی ہے، اور میں سر پکڑ کر لیٹ جاتا ہوں اور سو جاتا ہوں۔ نیند کے دوران میں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بلیاں اپنے پنجوں سے میرے دماغ کی رگیں سہلا رہی ہوں۔

اور پھر مجھے افسانے لکھنے سے ملا کیا، یہ بھی سن لیجئے، مثلاً اس قسم کی بات "دادا تو ایسے مولوی اور پوتے لکھیں حرام جادی" جو لوگ مجھے کل تک بڑا سیدھا سادا، نیک اور معصوم سمجھتے تھے۔ وہ اب یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید میری عمر ہی لڑکیاں گھیرتے گزری ہے۔ ایک صاحب مسکراتے ہوئے پوچھتے ہیں:۔ "آپ گھر سے تو نکلتے نہیں ہیں، آپ کو یہ باتیں کہاں

سے معلوم ہوئیں۔" ایک اور صاحب ہیں جو میرے سر پہنچنے پر یہ کہہ کر چپ ہو جایا کرتے تھے کہ "آپ کو تو ان باتوں سے دلچسپی ہی نہیں ہے۔" یا کبھی کبھی یہ پوچھ لیتے تھے کہ میری شادی کب ہونے والی ہے، اب روز میرے سر ہوتے ہیں: "تو پھر بتائیے، عسکری صاحب، آپ نے کون سی لڑکی دڑکی پٹا رکھی ہے الہ آباد میں؟" ہر شخص جس نے میرے افسانے پڑھے ہیں مجھے شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگا ہے، اور سب سے زیادہ وہ جو میرے سب سے زیادہ گہرے دوست ہیں۔ اگر میں نے دو ایک افسانے اور لکھ دیئے تو شاید کوئی شریف آدمی مجھے اپنے گھر کی دہلیز پر بھی دیکھنا گوارا نہ کر سکے گا۔ اول تو قصباتی کی عقل ہی خدا کا خاص عطیہ ہوتی ہے، لیکن جو دو ایک مہینے کسی شہر میں رہ آئے وہ بڑا خطرناک جانور بن جاتا ہے۔ چنانچہ ایسے ہی ایک حضرت ہیں جو مجھ سے اس پر لڑتے ہیں کہ میرے افسانے اخلاق اور سنجیدگی سے گرے ہوئے ہیں، اور مجھے "مست قلندر" میں لکھنا چاہئے۔ غرض میں ایک بے ضرر کتاب کے کیڑے سے ایک مشتبہ اور خطرناک انسان بن گیا ہوں اور پھر افسانوں پر احمقانہ اعتراضات۔ ایک صاحب جو میرے افسانے لکھنے سے پہلے سیاست پر ادب کی برتری کے قائل تھے اب مجھے یہ سمجھاتے ہیں "افسانے وفسانے تو فروعی چیزیں ہیں۔ اصل تو سیاست ہے جس سے قومیں بنتی ہیں۔" کوئی صاحب کہتے ہیں "آپ کے افسانوں میں یہ ہیجان انگیز چیزیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے الگ سے ایک کھونٹی گاڑ دی ہو۔" "یہ آپ نے نذرو کا کردار اتنا کیوں نمایاں کیا؟ آپ کا مقصد تو بدن میں کھلبلی پیدا کرنا تھا۔" "بھئی بات یہ ہے کہ عسکری صاحب کی ابھی شادی وادی نہیں ہوئی ہے، یہ افسانے لکھ لکھ کر ہی اپنی پیاس بجھانا چاہتے ہیں۔" یونیورسٹی کے ایک پروفیسر صاحب نے فرمایا: "افسانہ تو اچھا ہے۔ مگر اسٹائل بھاری ہو جاتا ہے، اور اسٹائل ہی اصل چیز ہے۔" ہمارے صوبے کے شاعرِ اعظم حضرت ساغر نظامی کی "پھسلن" پر تنقید بھی سن لیجئے: "افسانہ تو اچھا ہے، مگر اس میں ایک بہت بڑی نفسیاتی غلطی ہے۔ نذرو کو ارتکاب کی ترغیب دیتے ہوئے نہیں دکھانا چاہئے تھا، کیونکہ ترغیب ہمیشہ اونچے طبقے کی طرف سے ہوتی ہے، نیچے طبقے کی طرف سے نہیں۔" اور تعریفیں اعتراضوں سے بھی زیادہ بیزار کن ہیں۔ "بھئی کیا خوب لکھا ہے آپ نے، وہ تانگے والی لڑکی، اور اس کا سینہ، مجھے تو بڑا مزا آیا۔ میں تو مات کر پڑھتا ہوں آپ کے افسانے۔ بس آپ تو ایسے ہی لکھئے، اور کچھ نہ لکھئے۔" "آپ نے اس مدّوا لفٹ کا (جو ابھی چند مہینے ہوئے شکارپور میں تھی) بڑا عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔ وہی ہے بالکل، بس وہی . . . . . اب کے آپ ـــ دا ایک عیسائی لڑکی جو تھوڑے دن ہوئے یہاں سے گئی ہے) پر افسانہ لکھئے۔ اس سے تو آپ کا بڑا دہ تھا۔" یا پھر اس کی داد دیجئے: "یہ آپ نے بڑا عمدہ لکھا ہے کہ میرا ہاتھ گھونسے کی شکل اختیار کر کے ہوا کو مارتا ہے، بالکل فطری ہے یہ۔ ایسا ہی ہوتا ہے واقعی یہ جان ہے آپ کے افسانے کی۔" "آپ نے نندو کی زبان خوب لکھی ہے۔"

اب میری داخلی کیفیت سنئے جس زمانے میں میں نے آپ کو خط لکھا ہے میں کچھ Back to Methuselah[1] میں ART کے بے کار ہونے کے بارے میں The Ancients کی تقریروں سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ پھر میں جس چیز سے نفرت کرتا تھا وہی پیش آ گئی تھی چند واقعات نے مجھے یہ یقین دلا دیا تھا کہ ادب ودب سب لغو چیزیں ہیں آدمی کو صرف طاقت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، چاہے وہ روپے کی ہو یا حکومت کی۔ حالانکہ میں نے مسلسل کوشش کر کے اپنے آپ کو اس لائق ہی نہیں رکھا ہے کہ میں کسی مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہو سکوں لیکن اب میں نے یہ ارادہ کیا کہ میں اپنے خاندان کی خواہش کے مطابق I.C.S. میں بیٹھوں گا، اور جب میں کلکٹر ہو جاؤں گا تو پھر مجھے طاقت حاصل ہو گی۔ جو کائنات کی سب سے عجیب چیز ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے طاقت بھی مضحکہ خیز، بلکہ 'SILLY' نظر آنے لگی۔ جب میں باہر نکلتا ہوں تو ایسی باتیں سننے میں آتی ہیں: "بھولے میاں (یہ میرا گھر کا نام ہے) تم کلکٹر ہو جاؤ تو ایک آدمی کو تو میں جان سے مار دوں گا!" "ایک لیسنس تو ہم بھی لیں گے، انتظار کر رہے ہیں۔" "وہ دن تو آئے، دعا کرو دعا۔" "بھئی ہم تو ایمان سے ہر وقت یہ دعا کرتے رہے ہیں کہ خدا بھولے میاں کو بڑے ہودے پر پہنچائے۔ جب تم کلکٹر ہو جاؤ گے تو ہمیں پہچان بھی لو گے بھولے میاں، کہ ناں۔ آئیں گے تو ہم ضرور کہ ہم وہی ہیں جو تمہارے واں آویں تھے۔" "ابے، یہ شریف ہیں شریف، خاندانی۔ بھلا کوئی بات ہے کہ نہ پہچانیں۔ کوئی بچے ہیں۔" "ہم تم جیسے تو ان کے سائیس ہوں گے۔" "مجھے بھی رکھ لیجو چپراسی وپراسی۔" "ابھی میں تو پیڑ کے نیچے چارپائی بچھائے پڑا رہا کروں گا، جب کوئی آئے گا تو دور سے ڈانٹا کروں گا، چلو، سرکار آرام میں ہیں۔"

"صاحب، میں تو اپنے لونڈے کو انٹرینس سے آگے پڑھانے کا نہیں۔ اتنے بھولے میاں کلکٹر ہو ہی جائیں گے، کہیں نہ کہیں چپکا ہی دیں گے۔" کیا یہ ہی ہوتا ہے انسان؟ کیا اسی کے لئے نئی دنیا بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں؟ ایسوں کے لئے افسانہ ہی لکھ کر کیا ہو گا؟ سب سے عقلمندی

[1] بیک ٹو [illegible] انگریز مصنف برنارڈشا کا ایک ڈرامہ

کی بات یہ ہے کہ آہستہ سے مسکرا کر چپ ہو رہا جائے!

پھر، یقین تو میرے دل سے بالکل رخصت ہو گیا ہے۔ کم سے کم پہلے افسانہ لکھتے وقت تو میں اپنے اُس افسانے کی دنیا پر یقین کر سکتا تھا، لیکن اب مجھے اپنے افسانوں پر ہنسی آتی ہے۔ جو میں لکھ چکا ہوں اُن پر بھی اور جو میں نے نہیں لکھے اُن پر بھی۔ میں نے اپنے آپ کو مذہب، اخلاق، سماجی ذمہ داری، ہر ہر بند سے آزاد کر دیا ہے، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ میں مجسم سوالیہ نشان بن گیا ہوں۔ پرانی اقدار کو میں تسلیم نہیں کر سکتا، نئی اپنے لئے بنا نہیں سکتا۔ کاش میں صرف سوشلسٹ یا ترقی پسند ہو سکتا! مجھے عموماً ترقی پسند سمجھا جاتا ہے، اور میں خود بھی یہی کہتا ہوں، مگر در اصل میں سب سے بڑا decadent ہوں۔ حرام جادی کی تلخی، قنوطیت، آدم بیزاری اور شدید انفرادیت سے ہی اندازہ کر لیجئے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے افسانوں میں ایسی روح بھر سکوں جس سے انسان کے لئے نئی زندگی اور نئی دنیا کی امید پیدا ہو سکے، لیکن میرے افسانے رہی سہی امیدوں کے تاگے بھی کاٹے دے رہے ہیں۔ روح اجتماع میری گرفت میں آتی ہی نہیں، روح انتشار ہی سے میری گہری دوستی ہے۔ تو کیا میرے افسانے نئی زندگی کے لئے مہلک اور زہرناک نہیں ہیں؟ کیا بیمار ذہنیتیں میرے مثالی نمونے ہیں؟ کیا میرا یہ فعل مستحسن ہے کہ ایسی جنگ کے زمانے میں جب انسان کے مستقبل کی آخری بازی لگ رہی ہو، میں صرف افراد کے ذہنی اور فرضی اور خود پرستانہ رنجوں پر افسانے لکھا کروں؟ کیا میں اس طرح انسانیت کا مجرم نہ ٹھیروں گا؟ کیا وہ چیزیں جن پر میں افسانہ لکھتا ہوں دوسری چیزوں سے اہم ہیں؟ اگر اہم ہیں تو کیوں؟ لیکن میرے پاس اقدار کا کوئی نظام نہیں ہے جس سے میں ایک چیز کو دوسری پر فوقیت دے سکوں۔ چونکہ مجھے یہی یقین نہیں کہ میرے افسانوں کے موضوع اتنے اہم ہیں، اس لئے میں افسانہ لکھنا ایک مجرمانہ فعل سمجھتا ہوں۔ جب میری سوشلزم کا آغاز تھا۔ تو میں نے Keats کا یہ جملہ پڑھا تھا کہ شاعر کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ اُس وقت مجھے Keats کی اس decadent بات سے بڑی نفرت ہوئی تھی۔ لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ صرف decadent ہی زندگی کو اصلی رنگ میں دیکھ سکتا ہے کیونکہ وہ کوئی عینک ہی نہیں لگاتا۔ میرا بھی کوئی کردار نہیں ہے۔ ہوا کی ہر موج کے ساتھ میری رائیں اور خیالات بدلتے ہیں۔ لیکن قنوطیت میری مستقل کیفیت ہوتی جا رہی ہے۔ پہلے مجھے SHELLY بہت پسند تھا، لیکن اب بائرن بہت زیادہ پسند ہے۔ میں ایک انسان کے دوسرے انسان سے لگاؤ کو بالکل ناممکن سمجھنے لگا ہوں۔ کوئی شخص اپنی خودی کی مملکت میں دوسرے کو پیر رکھنے کی بھی اجازت نہیں دیتا، خواہ وہ اپنے آپ کو فریب دے دے کر یہ سمجھتا ہے کہ وہ ایسا کر رہا ہے۔ محبت وغیرہ تو غیر بڑی باتیں ہیں، اتنا سا لگاؤ بھی ممکن نہیں۔ اگر انسان اپنے آپ ہی سے محبت کرتا تب بھی خیر صبر آ جاتا۔ مگر جسے وہ اپنے فائدے کی چیز سمجھتا ہے وہ درحقیقت محض اُس کی بے عقلی ہے۔ ہواؤں کے اڑتے ہوئے ذرّوں کے رحم و کرم پر منحصر ہے انسان، اور بس۔ اور ہواؤں اور ذرّوں کو افسانہ پڑھ کر سنانے سے فائدہ؟

میں انحطاط کی منزلیں چھلانگیں مارتا ہوا طے کر رہا ہوں۔ میں ہر حیثیت سے اپنے آپ کو برباد کر رہا ہوں کیونکہ میں اپنی نشوونما کر ہی نہیں سکتا۔ جب پکڑنے کے لئے ایک تنکا تک نہیں تو میں اپنے آپ کو پانی کے ریلے کے حوالے نہ کر دوں؟

میری depravity[2] اور Degeneration[3] کی ٹھوس مثالیں بھی دیکھ لیجئے۔ اکثر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ میں چیزوں کو پھاڑ دوں، نوچ دوں، برباد کر دوں، کسی کو اذیت پہنچاؤں۔ چنانچہ میں اپنے چھوٹے بھائیوں کو ذرا سی بات پر بے طرح مارتا ہوں، مجھے یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ کل ہی کی بات ہے کہ میں نے اپنے کتے کے پلّے کو دیکھا تو میرے دل میں ایک گدگدی سی پیدا ہوئی کہ اس کا گلا گھونٹ دوں، اور میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو روکا۔ میں جانور بنتا چلا جا رہا ہوں — بلکہ Monster[4]۔ کسی کی موت یا بیماری کا میرے دل پر ذرا اثر نہیں ہوتا۔ ابھی ایک مہینہ ہوا میرے چچا زاد بھائی کا انتقال ہوا۔ جب میں اُدھر جا رہا تھا تو رستے میں ہنستا ہوا اور مذاق کرتا ہوا جا رہا تھا کہ اب مجھے سنجیدہ چہرہ بنا کر بیٹھنا پڑے گا، بلکہ اس پر جھنجھلا رہا تھا کہ انہوں نے مرنے کا اچھا وقت نہیں چھانٹا، اب مجھے دوپہر کو سونا بھی نہیں ملے گا۔ میں اپنے آپ کو سوشلسٹ کہتا ہوں، لیکن میں اپنے ماموں زاد بھائی کو "بھائی" نہیں کہہ سکتا کیونکہ باپ کے مر جانے کی وجہ سے اُس کی تربیت نہیں ہو سکی۔ اگر کوئی ایسا شخص جو مجھے سلام کرتا ہو، سلام کئے بغیر گزر جائے تو میں چونکتا ہو جاتا ہوں۔ "اچھا، آج اس بڑھئی نے سلام نہیں کیا۔" میں ہر ہر نئے خیال پر عمل کر کے دیکھ چکا ہوں، لیکن یا تو دوسرے اُسے نہیں چلنے دیتے یا میں نہیں چلا سکتا۔

مجھے اپنا انجام بہت صاف نظر آ رہا ہے۔ بہت دن نہیں گزرتے

۱؎ انحطاط ۔ ۲؎ اور ۳؎ گراوٹ اور پستی ۔ ۴؎ راکشس ۔

کاردوکے ہر رسالے کے ایڈیٹر سے میری لڑائی ہو جائے گی، اور اردو کے ہر ہر ادیب سے بھی، اور میں افسانوں، اپنے رشتے داروں اور دوستوں سب کو چھوڑ چھاڑ کر چالیس روپے ماہوار کا کلرک بن جاؤں گا جو صبح ۹ بجے سے ۵ بجے تک کام کر کے اور گھر آکر رات کو ندیم صہبائی اور تیرتھ رام فیروزپوری کے جاسوسی ناول اور کوک شاستر پڑھا کرے۔

لیکن کون جانتا ہے کہ کیا ہو!

بہر حال میری پہلی والی حالت میں تو اب کچھ کمی ہوئی ہے۔ یوں ہی گھڑی کے پرزوں کو چھیڑنے کے لئے میں نے Andrew's Liver Salt پینا شروع کر دیا جس نے میرا فلسفۂ زندگی (؟) تھوڑا سا بدل دیا ہے، دوسرے مجھے ایک میلاد دیکھنے کا اتفاق ہوا جس سے مجھے ذرا جھرجھری سی آئی۔ اور اب میں بہت جلد ایک افسانہ "میلاد شریف" لکھنے والا ہوں لیکن میں یہ افسانہ آپ کو نہ دوں گا کیونکہ یہ اچھا نہیں ہوگا بلکہ محض Stop Gap۔ یہ میں ایک اور رسالے کو دوں گا جن سے میں گزارش کروں گا کہ اب وہ مجھے اپنا رسالہ نہ بھیجا کریں۔ یہ رسالے لے کر رکھتے جانا بھی بڑا دردِ سر ہے! آپ کے لئے میں ایک اور افسانہ لکھنا شروع کروں گا جو دو مہینے تو ضرور لے گا لیکن مجھے امید ہے کہ "حرام جادی" کے معیار سے گرا نہ ہوگا۔

لیکن آخر میں میں آپ سے بہت ہی مخلصانہ طور پر پھر یہ کہتا ہوں کہ آپ میرے کسی وعدے، کسی بات کا اعتبار نہ کریں۔ مجھے بالکل پتہ نہیں کہ اگلے منٹ میری کیا رائے ہوگی، یا میں کیا کروں گا۔ مجھ سے آپ کسی نیکی کی توقع تو رکھیں ہی نہیں، بلکہ بری سے بری بات کی امید کیجیے۔ اگر اب بھی آپ رسالہ بھیجتے ہیں تو آپ جانیں آپ کا کام۔ آگاہ کرنا میرا فرض تھا، اس کی تو آپ کو شکایت نہ ہوگی۔

اگر آپ کو پہلے خط میں یا اس میں کوئی بات ناگوار گزری ہو تو معاف فرمایئے گا۔ میں خلوص دل سے معافی مانگ رہا ہوں۔

میرا جی صاحب سے آداب کہہ دیجئے گا۔

نیاز مند

محمد حسن عسکری

غزل

لوٹ کر جب آئے تھے ان کے آستانے سے
حُسن لے چکا تھا رنگ عشق کے فسانے سے

راہِ عشق میں اکثر زندگی ہوئی بے جان
دل مگر دھڑک اٹھا تیرے یاد آنے سے

یاد ہم کو جب آیا وہ سرورِ تنہائی
خود قفس میں جا پہنچے اڑ کے آشیانے سے

کیا کہوں تجھے تیری کس قدر ضرورت ہے
سانس تک نہیں آتی اک ترے نہ آنے سے

آنکھ میں نہیں جنبش پاؤں میں نہیں طاقت
ہم بتا کہاں جائیں تیرے آستانے سے

بس یہی وہ آ جائیں شمع بن کے محفل میں
ورنہ مدعا کیا ہے داغِ دل دکھانے سے

ڈوب کیوں نہیں جاتا رنج و غم کے دریا میں
ملتی ہے خوشی اکثر غم کے کارخانے سے

اب ہر ایک ذرّے سے غربت جھلکتی ہے
دشمن اک زمانہ ہے اُن کے روٹھ جانے سے

دیکھ شمع کو اختر صبح کی تجلّی میں
نیند آئی جاتی ہے عشق کے فسانے سے

اختر ہوشیارپوری

رات سے خطاب

رات! میں تجھ پر نثار،
تیری خاموشی میں میرے دل کی آوازیں بلند
تیری مدہوشی سے پیدا دل میں موجِ ارتعاش
زندگی میری سراپا پیکرِ مغموم ہے
اور میرے دل میں مضطر ایک طوفانِ خیال

تیری ظلمت معصیت کی پردہ دار!
نیم خوابی میں تری مظلوم کی آہیں بلند،
اضطرابِ زیست سے تاریکیوں کا راز فاش،
لغزشِ انسان کا تو پیکرِ معصوم ہے۔
میری ہستی تیری ظلمت کی طرح عکسِ خیال۔

زیرِ پردہ تیری شورش قلب کی آئینہ دار!
یاد آتے ہیں مجھے رہ رہ کے وہ شام و سحر
زندگی جب سر بسر اک نغمۂ پرکیف تھی
اور میں اک رہروِ میدانِ شوق
سو رہا تھا بے خبر آغوش میں امید کے

بادۂ ہستی کا میری زیست پر طاری خمار!
میرے گرد و پیش جب رنگینیاں تھیں منتشر
جبکہ دنیا حسن کا اک جلوۂ بے باک تھی
اور میرے دل میں اک ہیجانِ شوق۔
دفعتہً دنیائے دل پر تیرگی چھانے لگی،

شعلہ آسا ضربِ ناکامی سے روحِ حسیات،
قلب کی گہرائیوں میں سو گیا ذوقِ سرور
چھا گئی دنیا پہ اک روحِ الم حسرت بہ دم

رفتہ رفتہ کم ہوا میرا وفورِ انتشار!
اپنی دنیا اک بنائی ماورائے کائنات
رات کی لہروں میں دیکھی محفلِ عیش و سرور
سینۂ گردوں میں پائے میں نے انجم نغمہ ساز
چاند اپنے ملگجے پردوں میں رقص انداز تھا۔

آج میرا دل ہوا جاتا ہے پھر بے اختیار،
کس قدر دلکش ہے تو اے ظلمتِ خوابِ حسیں!
تیرے جامِ واژگوں کی تہ میں انجم بے قرار
تیری آغوشِ سیہ میں ماہِ تاباں جلوہ گر
پر سکوں خاموشیوں میں تیری طوفانِ حیات
آہ میری حسرتوں کا آج کیسے ہو شمار!
یہ ستارے ہیں کہ آنسو کھو گئے تھے جو کہیں
یا مرے رنج و الم کے داغہائے مضطرب
ہاں نظر آتا ہے مجھ کو چاند بھی ہے نوحہ گر،
داغِ حسرت کی مرے شاید یہ ہے روشن حیات؛
صبحدم تاریکیاں مجھ کو نظر آنے لگیں
رات سوتی رہ گئی آغوشِ رحمت وا کئے۔

حمد ذوالنورین

بیگم کی پہیلی

کہتے ہیں۔ "چراغ سے چراغ جلتا ہے"۔ میں نے بھی، اپنے مضمون کا عنوان، اسی روشنی میں، "بیگم کی ریختی" سے "بیگم کی پہیلی" تلاش کر لیا۔ مجھے امید ہی نہیں، بلکہ یقین کامل ہے کہ جناب تسکین عابدی صاحب، میری اس جسارت پر، ہرگز "چراغ پا" نہ ہوں گے۔ انہوں نے اپنے "ادبی دنیا" والے مقالے میں وعدہ کیا تھا — جسے شاید وہ ابھی بھولے نہ ہوں گے۔ کہ "انشاء اللہ، آئندہ کسی فرصت میں شیدا ...... کے کلام پر روشنی ڈالی جائے گی"۔

اس روشنی کی لَو میں ۱۹۸۰ء تمام ہو گیا، ۱۹۸۱ء بھی ادھیا سا گیا ہے۔ مگر مطلع ادب پر ابھی تک کوئی کرن نہیں پھوٹی۔ البتہ "عالمگیر" میں "آرسی کی ایک جھلک" نمودار ہو گئی، وہ بھی اس آب و تاب سے کہ، مجھے بوکھلا دیا۔ گھبراہٹ میں اپنا مسوّدہ نکالا۔ اُلٹ پلٹ کر دیکھا، تو معلوم ہوا کہ، اس پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ دل نے کہا۔ ابھی سویرا ہے۔ خدا کا نام لے کر، ٹھنڈے ٹھنڈے، تھوڑی سی ترمیم و تنسیخ کے بعد، کسی رسالے کی طرف باگ موڑ دو، ورنہ اب دیر کی، تو سب گڑ مٹّی ہو جائے گا۔

دُنیا میں تین حکومتیں مسلّم ہیں۔ پہلی مذہب کی، دوسری بادشاہِ وقت کی، اور تیسری زبان کی۔ ان میں سے کسی ایک کی بھی سرتابی، انسان کو خاک میں ملا سکتی ہے۔ اس وقت ہمیں، مذہب اور بادشاہِ وقت کی حکومتوں سے باہر نکل کر، زبان کے حدود میں قدم رکھنا ہے، اور اسی کی منزلوں کو طے کرنا ہے یہ وہی زبان ہے، جس کے لئے، مہاراجا چندو لال شاداں کی بارہ دری میں، دلّی نے، سرِ مشاعرہ یہ اعلان کر دیا تھا۔

سب مقلّد ہیں ہمارے سب ہمارے خوشہ چیں ؛ اردو ہے اپنی زباں، ہو وار کی یا پار کی

اس پر عابد مرزا بے غم و بیگم نے، لکھنؤ کی زبان کی طرف داری میں، پوری قصیدہ پڑھ کر دم لیا تھا، اور حضورِ نظام، غفران مکاں، کو رفع شر کے لئے فرمان نافذ کرنا پڑا تھا۔ یہ آج کی نہیں، ۱۹۲۳ء سے بھی خدا جانے کتنے برس قبل کی بات ہے۔ اس سے پہلے ۱۸۳۱ء میں، جب نواب ابراہیم خاں کے مکان، عظیم آباد، پٹنہ، میں تین دن رات برابر مشاعرہ ہوتا رہا، تو اکثر شاعر گھبرا گئے، اور بے غم بیگم نے، اپنی باری آنے پر، دو رباعیاں پڑھیں:

جاہل شاعر ہوئے بورچی کے میٹ اوروں کے کلام کو دیا لنگوٹے میٹ

تیرے ہی لئے کہی گئی تھی یہ مثل "رکھوا لیا جیٹھ کے بھڑوسے پر پیٹ"

جو شاد تھا، اُس کے دل کو ناشاد کیا محفل کو مشاعرے کی برباد کیا

کہوا کے جو دوسروں سے لایا تھا غزل آ کے مجھ سے موئے نہ کیوں یاد کیا

"لوگوں نے میر علی محمد شاد کو جا لگایا کہ حضرت یہ چوٹ آپ پر، اور آپ کے شاگردوں پر ہے۔ شاد صاحب، بہاریوں کی ناک کا بال، سُن کر بیگم سے کھٹک گئے، اور طنزاً بیگم سے فرمائش کی، لیکن جب اُن کا کلام سنا تو بہت متاثر ہوئے۔ فوراً اٹھ کر بغل گیر ہو گئے، اور کہا کہ بد معاشوں نے، میرے دل میں، آپ کی طرف سے، کدورت ڈال دی تھی۔ جو کچھ ہوا، اُسے بھول جائیے، بیگم نے بہت کچھ عذر معذرت کی، اور آپس میں، ایک دوسرے سے، صاف ہو گئے"۔

ناظرین! اس مجذوب کی بڑ کو سمجھنے کے لئے، بڑے صبر و تحمل، اور غور و فکر کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے آپ عابد مرزا بے غم و بیگم کے مسلّہ تخلیص کو سمجھ لیجئے۔ کیوں؟ کہ جو پہیلی میں بجھانے والا ہوں، اُس کے بوجھنے میں انہی سے مدد ملے گی۔ پہیلی بوجھنا آسان نہیں۔ ایک مرتبہ مولانا جامی علیہ الرحمۃ نے ایک پہیلی بجھائی تھی، جس کا حل ہماری پہیلی کے لگ بھگ ہے۔ دیکھئے، کہتے ہیں۔

بتزلیف و بتقلیب و تجنیس، زروئے یار خواہم صندِ شرقی

یعنی، تزلیف، تقلیب و تجنیس، جس طرح ممکن ہو، ہم دوست کے رخسار سے "صندِ شرقی" کے خواہشمند ہیں۔ اچھا صاحب، شرقی کی صند

غزلی ہے، غزلی کی تجنیس غزنی، غزنی کی تقلیب ریغع، ریغع کی زد ریف بہار؛ بہار کی تجنیس نہار، نہار کا مترادف توشہ اور توشہ کا متجانس پوشہ بس مولانا یہی رخسار دوست سے چاہتے ہیں۔ نظر بریں، ہماری بیگم کی پہیلی بھی، اس پہیلی سے کم پہلو دار نہیں۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے بھی، دل و دماغ سے کچھ کام لینا پڑے گا۔ دیر آید درست آید پر نگاہ رکھئے۔

ان بیگم کے درشن، ہمارے ملک کو، پہلی بار اُس وقت ہوئے، جب نظامی پریس بدایوں نے ۱۹۲۳ء میں جان صاحب کا دیوان، نہایت آب وتاب سے، چھاپ کر شائع کیا، اور جناب آغا حیدر حسن صاحب دہلوی نے، اپنے مقدمے کی کامیابی کے لئے، جان کا مد مقابل بنا کر ادبی دنیا کے سامنے، ان میٹھے بولوں کے ساتھ بے نقاب کیا۔

"جان صاحب کے ہم عصر اکثر ریختی گو شعرا تھے، لیکن کسی کا چراغ ان کے آگے نہ روشن ہو سکا۔ ان کے بعد بھی، بہت لوگوں نے طبع آزمائیاں کی ہیں۔ ان میں سے عابد مرزا، جن کا ریختی میں تخلص بیگم ہے، اور ریختے میں بے غم قابل ذکر ہیں۔ ان کے بزرگ شیراز سے آئے تھے، اور کتاب خوانی کرتے تھے۔ عابد مرزا بیگم کے والد کا نام حسین مرزا تھا۔ یہ نواب فخر محل اور خاص محل کی سرکار میں، کتاب خوانی پر مامور تھے۔ کلکتے کے مٹیا برج میں، لکھنؤ والوں کے پیا، جان عالم چھاؤنی چھائی تھی، جس جس کو سڑک اٹھتی جا پہنچتا، بیگم کے والد بھی مع اہل وعیال کے کلکتے چل کھڑے ہوئے۔ اس زمانے میں بیگم کی عمر کوئی چھ برس کی ہوگی۔ کلکتے میں اپنے مزے سے رہنے لگے۔ ایک ڈومنی بھی نوروزی۔ وہ بھلا لکھنؤ میں دم کے کیا کرتی۔ دولھا کے دم سے برات ہے۔ یہیں، اپنے پیا کے پاس چلی آئی۔ ایک دن آئینے کے سامنے بیٹھی بزت کر رہی تھی بیگم کی عمر کوئی تیرہ چودہ برس کی ہوگی۔ اس کو بزت کرتے دیکھ لیا، اور اندر سے جی میں گدگدی اٹھی کہ، خود بھی اسی طرح سے بھاؤ بتائیں۔ والد سے جان نکلتی تھی کہ انہوں نے بھنک بھی سن پائی، تو جیتا در گور کر دیں گے۔ جب کبھی موقع ملتا تنہائی ہوتی، چھپ کر، کہ کوئی دوسرا نہ دیکھتا ہو، اپنی چھیل بل، مٹک چٹک اپنے آپ ہی کو دکھا خوش ہوتے۔ ریختے میں آغا حجو تخلص شرف کے شاگرد تھے۔ ایک دن بے غم، میر صادق حسین کے پاس بیٹھے تھے، اور میر صاحب، الملک الدولہ کے صاحبزادوں کو پڑھاتے تھے کہ میر صاحب سے ملنے، ریختے کے مخشر اور ریختی کہنا تم آئے، اور اپنا کلام بتا بتا کے سنانا شروع کیا۔ بے غم نے ریختی پہلے کبھی نہ سُنی تھی اب جو نام کو پڑھتے سنا تو پھڑک اُٹھے، اور چاہا کہ خود بھی اسی رنگ میں کہنا شروع کریں جان صاحب کا دیوان خریدا، اور اول سے آخر تک پڑھا، یاد کیا، اور اس کو بھاؤ بتا بتا پڑھنا شروع کیا۔۔۔۔"

بے غم کا شوق اس قدر بڑھا، کہ ریختی کہنے کا خیال پختہ ہو گیا، اور جا کے مرزا علی بہار گلشن الدولہ کے شاگرد ہو بیگم بن گئے۔ نواب گلشن الدولہ، گو ریختی گو نہ تھے، لیکن شاگرد کو ما کچھ سوجھ بوجھ خوب چمکا دیا۔"

۱۸۹۳ء والے مشاعرے کے بعد غیر ملک کا تحفہ "طاعون" کلکتے میں خوب زور شور سے رونما ہوا۔ عزیزوں نے لکھا کہ، ہرگز کلکتے کا رخ نہ کرنا، یہاں ترا تڑی کا بازار گرم ہے۔

"خیال آیا، حیدرآباد چل کے قسمت آزمائی کیجئے۔ یہاں (تقریباً ۱۸۹۸ء) میں آ کے نواب محبوب یار جنگ بہادر کے توسط سے، مرحوم نظام غفران مکاں تک رسائی ہو گئی۔ حضور نظام میر محبوب علی خان غفران مکاں خود شاعر تھے، اور آصف تخلص کرتے تھے بیگم جب وہاں پہنچے، تو فصیح الملک نواب مرزا داغ بھی موجود تھے۔ غفران مکاں نے، کوئی دو ہزار کا بھاری تلواں دوپٹا، عنایت فرمایا۔ عابد مرزا بیگم نے، خوب ہی بل کھا کھا کے، اور مٹک مٹک کے پڑھا۔ بڑی دیر تک سنتے رہے، اور بہت محظوظ ہوئے۔ نواب فصیح الملک بہادر داغ سے، مخاطب ہو، دریافت فرمایا کہ بیگم کا کلام کیسا ہے؟ تو داغ مرحوم نے کچھ اعتنا نہ کیا، اور بے پروائی سے کہہ دیا کہ "ایسے شاعر، مبلغ علم سے عاری ہوتے ہیں، اور میں تو میر یار علی "جان صاحب" کو سن چکا ہوں۔

ان کی جیسی قدر ہونی چاہئے تھی، نہ ہوئی۔ بہت ہی پریشان حال رہتے ہیں۔ نواب تہور جنگ بہادر مرحوم خبر لیتے رہتے تھے۔ یمین السلطنت بہادر کے ہاں سے کچھ گذارا مقرر ہے، اسی کا سہارا ہے۔ نواب سالار جنگ بہادر بھی سمجھتے رہتے تھے۔ بیگم کے پڑھنے کا انداز بڑا دل فریب ہے۔ سفید داڑھی اور سر ہلتے ہوئے دانتوں پر، دوپٹا اوڑھ کے، جو کبھی پڑھنے بیٹھتے ہیں، تو ہنساتے ہنساتے لٹا دیتے ہیں۔ بہت ہی سیدھے سادے نیک خوش دل آدمی ہیں۔ ادب آداب، پاس لحاظ کا بہت خیال ہے"

ہے۔ ان کا کلام بہت ہے۔ افسوس، کہ یونہی پڑا ہے"!

آئیے آغا صاحب کی اس طویل خامہ فرسائی کا خلاصہ کرلیں، تاکہ بیگمی پہیلی کی ہر گرہ آسانی سے کھل جائے، اور ہر نقش اُجاگر ہوجائے۔

عابد مرزا بیگم، لکھنو، جمائی ٹولے میں پیدا ہوئے۔ کوئی چھ سال کی عمر میں مٹیا برج پہنچے۔ وہیں تیرہ چودہ برس کی عمر میں، نوروزی ڈومنی کو، آئینے کے سامنے، ترت کرتے دیکھ کر، خود بھی چھل بل، مٹک چٹک کی مشق کی۔ سالک الدولہ کے صاحبزادوں کے معلم، میر صادق حسین کے پاس خانم کی ریختی سُنی، تو پھڑک اُٹھے۔

للہ الحمد، ہر آں چیز کہ خاطر می خواست   آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید

جان صاحب کا دیوان خریدا، پڑھا، یاد کیا، اور بھاؤ بتا بتا کر پڑھنا شروع کیا۔ یہ شوق اتنا بڑھا، کہ ریختی کہنے کا خیال پختہ ہوگیا۔ مرزا علی بہار گلشن الدولہ کے شاگرد ہو، بیگم بن گئے۔ نواب ریختی گو نہ تھے، لیکن شاگرد کو مانجھ مونجھ کر، خوب چمکا دیا۔ سنہ ۱۳۱۵ھ میں، نواب ابراہیم خاں عظیم آبادی کے، تین دن رات والے، مشاعرے میں، دو رباعیاں پڑھ کر، شاد کو ناشاد کیا۔ پھر اُن کی طنزیہ فرمائش پر اپنا کلام سنا کر انہیں گلے لگا لینے پر مجبور کردیا۔ بعدازاں، حیدرآباد پہنچ کر، نواب محبوب یار جنگ کے توسط سے، مرحوم نظام غفران مکاں آصف کی حضوری میں، کوئی دو ہزار کا بھاری تلواں دوپٹا اوڑھ کر، بل بل کھا کھا کے، اور مٹک مٹک کر دیر تک پڑھا۔ سرِ دربار نواب فصیح الملک داغ سے مبلغ علم سے عاری ہونے کی سند ہمیشہ کے لئے حاصل کرلی۔ مگر، بقول تسکین عابدی ثریا ہٹ پر آمادہ ہوگئیں، اور دامن گرداں، دوپٹا کمر سے لپیٹ کر، پلٹ ہی پڑیں، اور حیدرآباد میں ایسے نیچے گاڑ کر رہیں کہ یہیں کی مٹی میں ۲۶ جنوری ۱۹۳۱ء کو مل گئیں۔" اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن!

یہ ہیں بیگم کی آیاتِ تخلیق، جو سب سے پہلے، سنہ ۱۹۳۳ء میں نازل ہوئیں پھر سید تمکین الکاظمی کے "تذکرہ ریختی" میں سنہ ۱۹۳۰ء میں ظہور کیا، اور اس کے دس سال بعد سنہ ۱۹۴۰ء میں سید تسکین عابدی کے مضمون "حسرت آیات، بیگم کی ریختی" کی شکل میں "ادبی دنیا" کے صفحاتِ ابیض کو "سیاہ پوش" کر گئیں۔

سچ ہے   ع   جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

آئیے! اب ہم بھی بیگم کی پہیلی بوجھیں، اور

ع   پیدا بیچ کی گھڑی بھی خوشی میں گزار دیں۔

"تذکرہ ریختی" سنہ ۱۹۳۰ء میں کہتا ہے۔

"بیگم کے مزاج میں اب تک ظرافت باقی ہے۔ قویٰ بہت گھٹ گئے ہیں۔ کان جواب دے رہے ہیں۔ آنکھیں بھی کچھ کچھ ساتھ چھوڑ رہی ہیں۔ ہوش و حواس بھی ذرا کھوئے جاتے ہیں۔ مگر طبیعت ہے، کہ برق بنی ہوئی ہے۔ ہمیشہ شعر سنانے کو تیار ہر وقت غزل کہنے پر آمادہ۔ خاکسار کے کرم فرما ہیں۔ جب ملتے ہیں، کچھ نہ کچھ سناتے ہیں۔ اب اپنا کلام ترتیب دے رہے ہیں۔ خدا کرے! جلد مرتب ہو کر شائع ہوجائے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج کل یہی ایک ریختی گو رہ گئے ہیں، اور وہ بھی چراغِ سحری۔ غدر کی پیدائش، بھلا کب تک جئیں گے۔ خدا انہیں دیوان شائع کرنے کی فرصت دے"!

رسالہ ادبی دنیا سنہ ۱۹۴۰ء میں رقمطراز ہے۔

"بیگم دُبلے پتلے، میانہ قد، سُرخ و سفید تھے۔ مزاج میں ظرافت تھی۔ آخر وقت میں قویٰ بہت کمزور ہوگئے تھے۔ کان جواب دے چکے تھے، بصارت ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ بعض بعض وقت ہوش و حواس بھی انجان ہوجاتے تھے۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے۔ طبیعت ایک برق تھی، کہ ہر وقت جولانیوں پر آمادہ نظر آتی تھی ہمیشہ شعر سنانے پر تیار، ہر مشاعرے میں غزل کہنے پر آمادہ بیگم راقم کے کرم فرما تھے۔ جب کبھی ملتے، کچھ نہ کچھ سناتے تھے آخر وقت میں اپنا کلام ترتیب دے رہے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ موت نے بیگم کی یہ آرزو پوری نہ ہونے دی......"

"بیگم نے تقریباً پچاس سال تک شاعری کی ہے، اور ان کا ذخیرۂ شعر سارے کا سارا ریختی تھا۔ ریختے میں بھی وہ بیگم تخلص کرتے۔ اور ریختے کے شاعر ہونے کا ادعا رکھتے تھے مگر ریختے میں ان کے شعر نہ تو پھلتے پھولتے تھے، اور نہ اُن کی طبیعت ریختے سے مناسبت رکھتی تھی۔ اس طویل مدت ریختی گوئی میں، انہوں نے ہزاروں غزلیں (ریختیاں؟) کہیں، جن میں سے بعض گلدستوں، رسالوں وغیرہ میں طبع ہوئیں، اور بقیہ انہیں کے پاس رہیں۔ مرنے سے چند مہینے پہلے انہیں دیوان مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ ترتیب شروع ہی کی تھی، کہ قضا نے اُن کے "دیوانِ حیات" کے شیرازے کو بکھیر دیا۔ اب ان کے کلام کی اشاعت کی کوئی امید ہے، اور نہ حفاظت!

کی توقع۔ اس لئے میرے پاس جس قدر ان کا کلام رکھا ہوا تھا اُس
میں سے معتد بہ حصّہ، اس مضمون میں نقل کیا گیا ہے، تاکہ،
کم از کم یہی حصہ محفوظ ہو جائے اور اس صنف سے دلچسپی
رکھنے والوں کے کام آسکے۔"

مُقدمۂ دیوان جان ۲۳ء میں بتاتا ہے۔

"بیگم کا کلام بہت ہے۔ جو ایک ضخیم کلیات کی صورت میں شائع
ہو سکتا ہے۔ لیکن اب تک ایسی صورت میسر نہ آئی۔ ان کے
ڈھنگوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ وہ یوں ہی تلف ہو جائے
گا...... عابد مرزا بیگم کے کلام میں پختگی بہت ہے۔ یہ جان
صاحب کا تتبع بہت کرتے ہیں۔"

ناظرین! منزل سامنے ہے۔ گلزار، صحرا، خارزار کے کٹھن مرحلے
طے ہو گئے۔ اطمینان کی سانس لے کر، اب اپنی اس سیاحت پر، ایک سرسری
نگاہ ڈالئے گا، تو آپ کو صاف نظر آ جائے گا، کہ آدم کو سجدہ نہ کرنے پر شیطان
بہشت سے نکالا گیا تھا، یہاں بیگم کے آگے سر جھکانے سے ایک "مرشد"
اور دو "ولی"۔ ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

حضرات! یہ ریختی بیگم کا کوچہ ہے، کسی خانگی کا نہیں۔

جدید تعلیم کا کہنا ہے کہ مشکل سے مشکل مسائل، اگر اسٹیج پر دکھا
دئے جائیں، تو اُن کے سمجھنے میں بڑی سہولت ہوتی ہے، اور آنکھیں دل
پر ایک دائمی نقش ثبت کر دیتی ہیں۔ ہم بھی "ایک ایکٹ کا ڈرامائے ابتث"
ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

پہلی جھلک

(پردہ اُٹھتا ہے)

جناب الف دونوں مٹھیوں سے قلم پکڑے، کہنیاں میز پر ٹیکے،
بڑبڑا رہے ہیں۔

مولوی نظامی بدایونی نے، مقدمے کی دہائی دے ڈالی ہے، کہ
میرے ہاتھ پاؤں پھلا دئیے۔ میں نے آج کل، آج کل کرکے، ایک
برس ٹوٹالا، اور اس کے کام میں مُٹھار ہا۔ یہ چینی کا خمیر کسی طرح اُٹھنے
پر نہیں آتا۔ آخر مولوی صاحب کی اس بلا کو پھے ڈالنے سے مجبوراً
یوں ہی حوالے کر دوں گا.....

(دروازہ کھلتا ہے، اور ایک گندمی رنگ، کھڑے کھڑے نقشے،
چھریرے ڈیل والا شخص، نصف مرد، نصف عورت کی ہیئت
وضع میں، کاندھے پر دوپٹا ڈالے داخل ہوتا ہے)

الف: آئیے آئیے! بہت انتظار دکھایا! ڈاک کے جانے میں تو صرف دو
گھنٹے باقی ہیں۔

ب: میں قربان! آتو رہی ہوں۔ نگوڑے پاؤں نہ اُٹھیں تو کیا کروں!

الف: خیر! ان گل فشانیوں کا موقع نہیں۔ بس میں جو سوال کروں، جواب
دیتے جائیے۔ دیکھئے مولانا شبلی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے، اور
لازوال شہرت کے مالک ہوئے؟

ب: تو پھر بندی نے بھی اسی غدر میں جنم لیا۔

الف: جان صاحب، فرخ آباد میں پیدا ہوئے تھے، لیکن وہ کوئی اردو
کا مرکز نہ تھا۔ میں آپ کی ولادت محلہ رکاب گنج لکھ دوں؟ کیونکہ
اردو یہاں کی لونڈی مشہور ہے۔

ب: نہیں میاں! جائی تو لا بھی تو آخر لکھنؤ ہی میں ہے۔ میں نے سب
سے پہلے دنیا میں وہیں جائی لی تھی۔ میں صدقے! بس وہی لکھو۔

الف: ہاں خوب یاد آیا، جان صاحب بچپنے میں قدیم لکھنؤ چلے آئے
تھے۔

ب: تو لونڈی کو بھی چھ سال کی عمر میں جدید لکھنؤ، مٹیا برج میں، پیا جان عالم
کے سلئے میں پہنچا دو۔

الف: مجھے آپ کو ریختی گو بنانا ہے؟

ب: جو چاہو بناؤ! خدا الوزوزی ڈومنی کو کروٹ کروٹ راحت دے،
جس کے رتنا میں نے چھوٹی ہی عمر میں سیکھ لئے ہیں۔

الف: جان صاحب، نواب عاشور علی خاں بہادر کے شاگرد تھے؟
آپ کو بھی مٹیا برج کے کسی نواب شاعر کا نام یاد ہے؟

ب: اے کیوں نہیں! اللہ رکھے بیسیوں! ایک تو مرزا علی بہار
گلشن الدولہ ہی تھے۔ اللہ بخشے! خوب شعر کہتے تھے۔

الف: تو بس آج سے آپ اپنے کو ریختی میں اُنہی کا شاگرد مشہور کیجئے
اگر جان نواب کے شاگرد تھے، تو آپ کو بھی اُن سے کم نہ رہنا
چاہئے۔ کوئی شعر آپ کو اُن کا یاد ہے؟

ب: نہ میاں! چیتے کو تو آگ لگی ہے! مجھے تو ایک پیٹ کے آگے
کچھ یاد نہیں۔

الف:۔ بھئی خوب! نواب عاشور علی خاں کا بھی، شعر تو کجا! کسی کو کوئی مصرع بھی یاد نہیں ۔۔۔۔ اور ہاں! جان صاحب، عبداللہ خاں کے بیٹے کرامت اللہ خاں گستاخ رام پوری کے مشاعرے میں شریک ہوئے تھے۔ یہ مشاعرہ بڑے زور کا ہوا تھا۔

ب:۔ میں بھی ۱۳۱۵ھ میں، جب کلکتے میں طاعون کا زور تھا، پٹنہ عظیم آباد چلی گئی تھی۔ وہاں ایک مشاعرہ نواب لطف علی مرحوم کے بیٹے، نواب ابراہیم خاں کے مکان پر ہوا تھا۔ دور دور سے شاعر بلائے گئے تھے۔ میں بھی پہنچ گئی تھی۔ تین دن رات برابر مشاعرہ ہوتا رہا۔ بعض لوگوں نے بڑی لمبی چوڑی، غزلیں پڑھیں، کہ اکثر شاعر گھبرا گئے۔ مجھ کو بھی بااللہ نے دو رباعیاں دلوا دیں۔ پڑھنا تھا کہ موئے لے دوڑے، اور شاد کو مجھ سے ناشاد کر دیا پھر جو میں نے ادھر ادھر کی کچھ شعریں سنائیں، تو بس اپنی بیگم ہی سمجھ کر مجھے گلے لگا لیا۔

الف:۔ آپ حیدرآباد کب تشریف لائے؟

ب:۔ میاں! یہ تو تم جانتے ہی ہو، کہ کلکتے میں میرا کون رہ گیا تھا، جو پٹنے سے اُدھر کا رُخ کرتی۔ اُسی زمانے سے یہیں ہوں۔ خدا نواب محبوب یار جنگ کا بھلا کرے، جس نے کوئی دو ہزار کا بھاری تُلواں دوپٹہ سرکار سے دلوا دیا۔ روزی کا بھی سہارا ہو جاتا۔ کل موئے داغ کو میں پھوٹی آنکھوں نہ بھائی۔ لکھنؤ کی تھی نا! چپ سے کچھ پھسک دی ہوگی۔ پھر وہاں کبھی نہ گھسنے پائی۔

الف:۔ حیدرآباد میں بھی آپ نے کبھی کوئی معرکہ سر کیا۔ یاد رکھیے آپ کا زمانہ جان صاحب کے بعد ہے، اور ع

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

ب:۔ کیوں نہیں؟ مہاراجہ چندولال کی بارہ دری میں جب میرزا خورشید عالم نے کسی شعر میں، اردو کو اپنایا تھا تو اس وقت لکھنؤ کے بھی بہت سے، آغا جان عیش، دہلوی جیسے لوگ موجود تھے۔ بس یوں سمجھو کہ از غیب سے ایک قصیدہ میری گود میں آپڑا اور پھر جو میں نے اپنی نوزدری والی خاص ادا سے اُس کو پڑھا ہے تو دلی نگوڑ ماری کی رگ رگ ہی تو ڈھیلی پڑ گئی، یوں سمجھو۔ جس طرح سودا کو میر منشی صاحب نے لپٹ کر گالیاں سنائی تھیں وہی حال موؤں نے میرا کرنا چاہا۔ خدا سرکار آصف کا نام کبھی نہ مٹائے۔ انہوں نے ایک فرمان جاری کر کے جان بچائی۔

الف:۔ بس اتنا کافی ہے۔ آپ اطمینان رکھیے۔ آپ کا حق گھر بیٹھے پہنچ جائے گا۔ جو کچھ باتیں یہاں ہوئی ہیں، اگرچہ راز ہیں، لیکن کھلا۔ آپ اِن کو خوب شہرت دیجئے اور دلوائیے۔ میں خوش اور میرا خدا راضی۔

(پردہ گرتا ہے)

دوسری جھلک

(مقام مکتبۂ ابراہیمیہ)

[آت صاحب ٹہلتے ہیں۔ مینیجر صاحب نے ایک پاکٹ ایڈیشن دیوان جان اُن کے آگے بڑھا دیا ہے۔ پڑھتے جاتے ہیں، اور اعتراض کرتے جاتے ہیں مینیجر صاحب شربت کا سا گھونٹ سمجھ کر کان کے رستے چپکے اتارتے جاتے ہیں]

ت:۔ دیکھئے! ان دہلوی حضرت نے بیگم کا الک الدولہ کے صاحبزادوں کو پڑھانے والے، امیر صاحب کی صحبت میں، خانم کی ریختی سننا لکھ دیا ہے۔ یہ بھی نہ سمجھے، کہ اس سے مرتبہ گھٹتا یا بڑھتا۔ کہاں کٹھملا صادق حسین، کہاں یہ؟ میں تو تذکرے میں لکھوں گا۔ الک الدولہ کے پاس خانم جان کو ریختی پڑھتے سنا، تو یہ شوق بھی چرایا۔ دیکھئے اب بیگم بیگم ہے! جان صاحب کو نواب عاشور علی خاں بہادر کا شاگرد بنایا! اور انہیں علی بہار کا۔ اب کون ان سے پوچھے ۵ جو ہے بہار، اُس کو خزاں کا خطر بھی ہے

اے باغباں بسنت کی تجھ کو خبر بھی ہے؟

میں تو علی بہار نہیں، علی بہادر لکھوں گا، کیونکہ بہادر، ہر حال میں، بہادر ہی رہتا ہے۔۔۔۔۔ نیز ناشاد شاد نے، اپنے بدمعاش ہم جلیسوں کے بھڑکانے پر، کلام سنانے کی فرمائش نہیں کی تھی، اور متاثر ہو کر بغلگیر نہیں ہو گئے تھے۔ بلکہ میں لکھوں گا، خوب خوب چوٹیں چلی تھیں بیگم نے اپنی ریختی گوئی کی دھاک بٹھادی تھی، جس سے مجبور ہو کر شاد نے مصالحت کر لی تھی۔۔۔۔۔

یہ دیکھئے! حضرت نے "گارساں دتاسی" کو "گارڈن ڈی ٹاسی" لکھ دیا، اور اُسی کے حوالے سے، جان صاحب سے بھوپال، اور اورنگ آباد کے پتھر ڈھوائے اور بیگم کو صرف حیدرآباد ہی دکھایا!

میرا فقرہ ہوگا۔ کلکتہ اجاڑ کر عظیم آباد گئے تھے۔ وہاں سے بھوپال کا چکر کاٹ کر، جان صاحب کے نقشِ قدم پر چل کر، حیدر آباد آئے تھے۔ اتنا بھی نہ سمجھے۔ جھکتے جائے گا، مدینے کی زیارت نہ کرے گا!۔۔۔۔ اور ستم پر ستم ملاحظہ ہو، کہ نواب محبوب یار جنگ بہادر کے توسط سے حضور نظام میر محبوب علی خاں غفراں مکاں کی حضوری کا شرف بخشا تو وہ کوئی دو ہزار والا بھاری تلواں دوپٹہ، پڑھنے، اور کلام سنانے سے پہلے ہی بیگم کے سر پر ڈال دیا۔ میں اس پر یوں پردہ ڈالوں گا۔ جب بیگم دربارِ حضور نظام میں باریاب ہوئے، حضور نے ریختی سنی، بہت پسند فرمایا، کوئی دو ہزار کا بھاری تلواں دوپٹہ مرحمت فرمایا۔۔۔۔۔ ارے توبہ! یہ دو ہزار سے قبل "کوئی" کا لفظ بھی دوپٹے کی قیمت گھٹا رہا ہے۔ میں ایسے روز مرے کو بھی صاف کر دوں گا۔

مینیجر: ۔ داکتاکر، بھائی تمہارا جو جی چاہے، لکھنا۔ مجھے تو اپنے "تذکرے" سے کام ہے۔ ایسا ہو کہ بس چھپتے ہی بک جائے، اور "مکتبہ" مالا مال ہو جائے۔ تمہاری بھی محنت ٹھکانے لگے۔

(پردہ گرتا ہے)

تیسری جھلک

(بیگم اس دنیا سے روپوش ہو چکی ہیں۔ ت صاحب نے مدتوں سے "ادبی دنیا" کو کوئی اپنا قلمی کارنامہ نہیں بھیجا ہے۔ اس وقت اسی فکر میں ڈوبے، بیگم کی ریختی سے مصروفِ جنگ ہیں۔ دیوانِ جان ہات میں ہے، اور "تذکرۂ ریختی" سامنے کھلا رکھا ہے)

ت: ۔ حضرت ت نے تو مرحوم بیگم کو اپنے من گھڑت سانچے میں خوب ڈھالا۔ اب اس سانچے سے نکلی مورت پر کلک پھیرنا، اور پالش کر کے چمکانا میرا کام ہے۔۔۔۔ تذکرے کو چھپے دس برس ہو گئے۔ یہ تو ایک وقتی تفریحی مطالعے کی چیز تھی۔ رات گئی بات گئی۔ کس کو اتنی فرصت ہے کہ ایسے غریب موضوع پر سنجیدگی سے بار بار نظر ڈالے، اور یاد رکھے۔ ہاں اے میری طبیعت داد دے! ہاں امیرے قلم جولانگاہ سامنے ہے! تھوڑے سے شاعرانہ مبالغے کی ضرورت ہے یاد رکھو ع فکر سے نزدیک ہو جاتا ہے مغلوب دور کا۔ تیس تیس شعر کا اضافہ ابھی رات ہی کر چکا ہوں رہا الف اور ت کا سرمایہ، تو وہ بھی میری بے حواسی کے حوالے۔ اُسے بھی اپنا ہی سمجھ، از تو کہ محاسبہ گیرد! ؎

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے ٭ سانپ کو مار کے گنجینہ زر لیتا ہے

(قلیل وقفہ)

(قلم دوات میں غوطہ لگا کر نکلتا ہی ہے کہ) آہیں! الف صاحب یہ کیا کیا؟ حضرت آپ نے تو بیگم کو "گندمی رنگ" لکھ کر لونڈی بنا دیا۔ خیر ایک گناہ خدا بھی معاف کرتا ہے۔ کان کھول کر سُن رکھو وہ سُرخ و سفید تھے، سُرخ و سفید۔۔۔۔ نیز یہ، کہ آپ نے بیگم کے اتنے طول طویل سوانح حیات لکھ کر، صرف دو رباعیاں، ایک قطعہ، اور ایک ریختی بغیر کسی تبصرے کے مقدمے میں پیش کر کے جگ جیت لیا۔ حضرت! شاعر یوں نہیں بنائے جاتے، کہ صرف اُن کے حالاتِ زندگی قلم بند کر دیئے اور لکھ دیا، کہ ایک غزل ملاحظہ میں پیش ہے۔ اس میں چودھویں صدی کی ضروریات نے نئے خیالات پیدا کئے ہیں۔۔۔۔ اس کا ایک ایک شعر تشریح طلب ہے جس قدر غور سے پڑھا جائے۔ اور موجودہ مسائل کو پیشِ نظر رکھا جائے، اُسی قدر زیادہ مزہ آئے گا۔ دریں چہ شک! خوب مزہ آیا! سنیئے۔ شاعر گر ایسے ہوتے ہیں کہ بغیر کسی مسالے کے پورا دیوان تیار کر دیتے ہیں۔ آیئے! آپ بھی اس خوان کا نمک چکھ لیجئے جو ریختی آپ نے پیش کی ہے، اُس کے دو ہی چار شعر ریختی کہے جانے کے مستحق ہیں۔ بقیہ میرے رعبِ تشریح کے حوالے۔ پہلے اچھی طرح نوٹ کر لیجئے۔ شاعر وہی اچھا سمجھا جاتا ہے، جس کے اشعار میں نفیس استعارات، خوب صورت تشبیہات بہترین محاورات ہوں۔ روز مرہ صاف، نشستِ الفاظ اچھی، تخیل میں بلندی ہو۔ اگر اس کے ساتھ ہی ساتھ طنز کا استعمال بھی وہ لطیف پیرائے میں کرے، تو شاعری کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اب آپ یہ تمام چیزیں بیگم کی ریختی میں ملاحظہ فرمائیں، اور جو نہ ہوں، اُن کی فکر نہ کریں۔ تشبیہہ ملاحظہ ہو۔ غیر منتظم اور منتشر بیبیوں کو "حیران تصویریں" کہنا کس قدر بلیغ تشبیہہ ہے۔ یہ ان کی جدید تشبیہہ ہے۔

بی بیاں بہتیری لیکن ان کی مجلس بھی تو ہو ٭ چند تصویریں ہیں حیراں اور کوئی انجمن نہیں

تشبیہ کے علاوہ اس میں عورتوں کے منظم ہونے کی بھی تلقین کی ہے ...... بیگم کے روزمرہ کے شعر بھی سن لیجئے:۔

دل کسی کو کیوں دیا بی لت ملتی ہو جواب ؎ چیز اپنی جب تک اپنے پاس ہے جو کم نہیں

..... اجی جناب الف صاحب! آپ کا خزانہ تو خالی ہو گیا۔ اب ت صاحب کی تحصیل میں ہاتھ ڈالتا ہوں ع

چاہے ہیرا لے تقدیر سے ہیا ہے کنکر

روزمرہ۔ لے گئی جب بھری سونے کی جوشن کندن — اوہی کیا ننگے بُرے لگتے ہیں بازو میرے

پکڑتا ہے کوئی یوں بھی کسی کا ہاتھ چھوڑو بھی — ہمئی جاتی ہیں ٹھنڈی دیکھو منا چوڑیاں میری

طنز: مجھے غم ہو تو شادی ہو تیری شان کے صدقے — میں روتی ہوں خوش ہوتی ہے سُن کر داستاں میری

تیری شان کے صدقے" اللہ میاں سے تخاطب ہے، اور پھر اس میں عجز و انکسار نہیں، بلکہ گہرا طنز ہے بیگم نے اگرچہ کچھ نہیں لکھا، لیکن میں کہتا ہوں کہ انہوں نے تمام اصناف سخن (غزل قصیدہ مثنوی، رباعی، قطعہ مسمط، ترکیب بند، ترجیع بند، مستزاد، فرد) میں فکر کی ہے۔ اگرچہ ت صاحب نے صرف دو مخمسوں کے ایک ایک بند نقل کئے ہیں۔ میں تو یہی کافی سمجھتا ہوں ؎

صاف کھلتا نہیں کیا شے ہے بھری شیشوں میں — اے میں صدقے گئی! دیکھو تو ذری شیشے میں

سن کے لاکن نے کہا مجھ سے ہماری شیشے میں! — مے گل رنگ کی ہے جلوہ گری شیشے میں

بند کی ہے مرے ساقی نے پری شیشے میں ...... وغیرہ

یہ لاکن خدا جانے کیا بلا ہے سارہ گولی ماتے گئے پڑھو ..... عظیم آباد کی رباعیاں، باسہ دری کی قصیدی، اپنی اپنی جگہ خوب پھلی پھولیں۔

پھر سنہ ۱۲۲۳ھ والی حضور نواب میر محبوب علی خاں بہادر غفران مکاں کی جُبلی کے موقع پر بھی تو بیگم (رکے لئے کسی) نے ایک طویل قصیدی کہی تھی، جو اُنہیں دنوں گلدستہ "نغمۂ عندلیب" میں شائع ہوئی تھی۔

..... مگر افسوس اس کے زیادہ شعر نقل نہیں کر سکتا۔ اسے کون ریختی کہے گا! لیکن الف کے مقابلے میں "پس پردہ" رہنا بھی امکان سے باہر ہے۔ بہتر ہے کہ طوالتِ مضمون کا پردہ ڈال کر لکھ دوں یہ قصیدی بہت طویل اور شرائط قصیدہ گوئی کی پوری پوری حامل ہے۔ مطلع نقل کیا جاتا ہے۔

بہار نے چمنستان میں کی ہے گلکاری بنی ہوئی ہے دُلھن باغ میں ہر اک کیاری

دیکھو بیگم! یہ ہم ہیں، جو تمہیں ریختی گو بنا رہے ہیں! نواب لطف علی خاں کے مقابلے میں اُن کے بیٹے نواب ابراہیم خاں کو کون جانتا ہے۔

میں نے لکھا ہے۔ نواب لطف علی خاں ابن ابراہیم علی خاں ..... ت نے تمہیں دس برس پہلے ہی ترتیب کلام میں لگا دیا تھا۔ میں نے، مرنے سے چند مہینے پہلے ترتیب شروع کرائی ہے، تاکہ سنہ ۳۰ سے سنہ ۴۰ تک کا کلام (وہی تین تیس شعریات والے) ضائع نہ جائے ....

اور ہاں خوب یاد آیا! سنہ ۴۱ میں تقریب نوروز (۲۱ مارچ سنہ ۴۰ء) نواب مرزا شجاعت علی، سفیر ایران نے کلکتے میں، ایک مشاعرہ کیا تھا، جس میں طرح دی گئی تھی ع

بلبلیں شاد ہیں، گلشن میں ہے سامانِ بہار

ان دنوں بیگم (المتوفی ۲۶ جنوری سنہ ۴۰ء) عالم ارواح والے کلکتے میں تھے۔ چنانچہ اس مشاعرے میں، انہوں نے طرح میں دو غزلہ پڑھا۔ چونکہ (اب حور مل نے بتا دیا تھا) عورتوں کی زبان میں واوِ عطف یا اضافت ترکیبی نہیں ہوتی، اس لئے بیگم (مرحوم) نے بلا اضافت کہے ہیں۔ ؎

مجھ سے کیا پوچھتی ہو اے مری نادان بہار ؎ گل کی لالے کی، سمجھے کیا نہیں اپنی بہار

....

کنگھی چوٹی سے حسینوں کو جو رکھتا ہے درست

بال سنبل کے لگی آتے ہی سلجھانے بہار

....

(پردہ گرتا ہے)

چوتھی جھلک

[نوابانِ دکن کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہے۔ خاندانی اور خطابی جاگیر دار اور عہدے دار، ملکی اور غیر ملکی، سبھی قسم کے نواب مجتمع ہیں۔ ابھی افتتاحِ جلسہ میں دیر ہے یا دھر اُدھر کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اسی درمیان میں تذکرۃ الشعرا چھڑ گیا۔ گزشتہ باکمالوں کے اشعار زبانوں پر جاری ہو گئے۔ شعر سحر ہے، مگر یہ سحرِ حلال "سلسلۂ کلام متقدما سے چل کر، دور حاضر تک پہنچ گیا۔ ایک بھولے ادب نواز نواب بیگم کی وفات پر اظہارِ افسوس کرنے لگے، اور بے ساختہ اُن کی زبان سے نکل گیا!]

نواب ادب نواز جنگ۔ افسوس جن ہستی نے، تیس چالیس سال تک

اپنے آبِ حیات سے ہماری مسرتوں کے چشموں کو پانی سے کبھی ٹوٹنے نہ دیا، اگرچہ خود دم توڑ دیا، اس کے لئے ہم سے اتنا بھی نہ ہوا کہ اُس کا کلیات ہی چھپوا دیتے۔ ۱۹۳۰ء سے مرتے دم تک، وہ برابر اس کی ترتیب و تدوین میں صرف اس آس پر لگا رہا کہ ایک نہ ایک دن سہ

ذرّے کا بھی چمکے گا ستارہ قائم جو زمین و آسماں ہے

دنیا کی لغویات میں، ہم توڑے کے توڑے لٹا دیتے ہیں، اور بجا مصرف پر ہمارا ہاتھ کبھی نہیں اُٹھتا۔

نواب خردیار جنگ:۔ تقصیر! آپ کا قطع کلام ہوتا ہے۔ کیا آپ کا یہ منشا ہے اگر کبھی، ہم اپنے افکار و آلام سے اکتا کر، تفریحاً، سمندر کے کنارے نکل جائیں، تو واپس آتے وقت وہاں کے سنگ ریزوں، گھونگوں سیپیوں، اور کوڑیوں کو بھی، اپنے دامنوں، رومالوں اور جیبوں میں بھر لائیں۔ بیگم کی ریختی کا حسن قبح تو مشاعروں ہی تک محدود رہنے کے قابل تھا۔ تقصیر! یہ میری ذاتی رائے ہے۔ کوئی تنقید نہیں، تبصرہ نہیں۔

نواب ہمت یار جنگ:۔ اگر واقعی بیگم کا کوئی دیوان کسی کے قبضۂ تصرف میں ہے، تو وہ پیش کرے۔ اگر سب نہیں تو اُس کا منتخب ہی حصہ، میں اپنے جیب خرچ سے شائع کر دوں گا

نواب باخبر جنگ:۔ جناب! وہ تو آغا جان عیشؔ کے ہدہد الشعرا تھے۔ ادھر غزل ہاتھ آئی، اُدھر مشاعرے میں پڑھی، ہا ہا! ہو ہو!! ہی ہی!!! کا ہنگامہ ابھی دبا بھی نہیں، کہ کالائے بد بریش خاوندش۔ ٹائیں ٹائیں فش۔ البتہ مٹیا برج، کلکتہ، اور عظیم آباد کا کلام، جو بیگم کے قبضے میں نہیں، رسائل و مجلات کے کالموں میں محفوظ تھا۔ "تذکرہ ریختی" میں شائع ہو گیا۔ اب ہے کیا، جو چھاپا جائے؟

نواب ادب نواز جنگ:۔ ارے توبہ! یہ بات ہے۔

نواب باخبر جنگ:۔ جناب!

نواب مضحک جنگ:۔ (ہندوستانی) اور جو کچھ ہے، اُس کا یہ عالم ہے کہ لکھنؤ، دلّی، عظیم آباد، بھوپال، کلکتے کے محاورات، اور کلمات طیبات کے ساتھ، دکنی زبان کے سمندر میں غوطہ لگا کر، کچھ ایسے بہروپ میں اُبھرا ہے، کہ ادبی دنیا اُس پر سوکھا ٹھٹا بھی نہیں لگا سکتی ہیں ایک غزل پڑھتا ہوں۔ سنئے اور فیصلہ کیجئے:۔

باجی اب کے جو تم نے کھلتی کی ایک ہی دھپ میں توبہ تلّی کی

بیگماں آئیاں کیملے سے منہ پہ ڈلے نقاب جھلّی کی

پوت کہتا ہے "ماں جی ہو تقصیر! سب گناہاں تمے اِس جبلّی کی"

(دیکھو کیا شعر ہے!) گلی گڑیا تھی بی بی زہرا کی کوئی گڑیا نہیں ہے گلّی کی

ٹوٹے، پوٹی سبھی خوش ہیں یہ کہانی ہے شیخ چلّی کی

میرے باتاں کنواریاں نے سُنے لکھنؤ کی رہیں، نہ دلّی کی

شعراں بیگم کی کالے دکھن ہیں ہیں چمکتی سی آنکھاں بلّی کی

بس یوں سمجھئے، آنچہ در کانِ نمک رفت نمک شد۔ میرے خیال میں ایسا کلام بغیر تشریح کے چھاپا جائے گا، تو دکن کے باہر اس کی کیا قدر و قیمت!.....

نواب نقیب نواز جنگ:۔ اب آپ لوگ یہ سوب باتاں خلاص کیجئے جلسہ شروع ہوتا ہے۔

(ڈراپ سین)

ایکٹ ختم ہوا

یہ ہے بیگم کے بیگم گردں، اور بیگم کی پہیلی۔ اب اس کا بوجھ لینا کچھ دشوار نہیں۔ خدانخواستہ! اگر پھر بھی کچھ کسر ہے، تو جہاں ذرا اور اتا پتا دیا نہیں، کہ آپ معصوم بچوں کی طرح چلائے نہیں، کہ وہ مارا!

بیگم ایک مرد عابد مرزا کا تخلص ہے۔ نصف دنیا مردوں سے بھری پڑی ہے ہمیں کسی سے کوئی سروکار نہیں، اور اگر معدودے چند سے کوئی لگاؤ ہے تو بلا شبہ ضرور ان میں کوئی خصوصیت ہے۔ اسی طرح ہم بیگم سے بھی (خواہ کسی کی بھی ساختہ پرداختہ ہوں) دل چسپی لے سکتے ہیں، مگر وہی بشرط خصوصیت ہر سہ بیگم گردوں کی پونجی تھوڑی سی تقلیب ترتیب کے بعد تاکہ تصنیف کلام کی تاریخیں ترتیب وار مسلسل سامنے آجائیں، اور ناظرین، یہ اچھی طرح دیکھ سکیں، کہ کس زمانے میں شاعر وہ کلام پیش کرتا ہے، جو بقول "تذکرہ ریختی" بیگم کی ریختی جان صاحب سے کسی طرح کم نہیں، بلکہ بعض دفعہ تو جان سے کہیں آگے نکل جاتے ہیں، اور کبھی "پنش بغایت پست" کا ثبوت دیتی ہے۔

۱۹۳۰ء میں "تذکرہ ریختی" "گلدستۂ نتیجۂ سخن" "مشاعرۂ ٹالی گنج کلکتہ ۱۳۱۱ھ کی ذیل کی ریختی پیش کرتا ہے، جو اب سے ساٹھ سال پہلے کا کلام ہے جو بیگم نے ۱۷ سال کی عمر میں کہی ہوگی

۲ جن کو معلوم ہے کہ آتے ہیں یہ جادو میرے بن کے ہمزاد وہی لوگ ہیں لاگو میرے

سلہ بھوپال محاورہ، گھری سے ۲ بیٹے ہیں۔

نقش اس ڈھب کا ہی لادو مجھے بدھو میرے   اُس کے زانو کو مسلتے رہیں زانو میرے

ساتھ سبزہ کے رہے، اب تو ہوا پوٹا تر   مجھ سے ٹہنیں ہیں نکر وُلے بیاں مٹھو میرے!

مردوے ڈولی کے ساتھ آئے فقیروں کی طرح   یہ تو مجنوں سے سوا ہو گئے لاگو میرے

دیکھو اب بارہ اماموں کی قسم کھاتی ہوں   لوں گی ہیکل نہ کبھی، دو وہی جگنو میرے

لے گئی جب سے مری سونے کی جوشن کندن   اوہی کیا ننگے بُرے لگتے ہیں بازو میرے

ہیں تو مفلس ہمیں نہیں سوجھتی ہے محلوں کی   یار ہیں، یا کہیں چھوڑے ہوئے اُلّو میرے

ادھ موئی ہو گئی ہیں سب بے اٹھاؤں کب تک!   اے دوگانا! یہ خسم ہیں کہ بلا گو میرے!

چھاتیاں نور کے دو قمقمے بن جائیں ابھی   رکھ لو محرم میں دوگانا جو یہ جگنو میرے!

سوت تو جل گئی، جل بل کے میں اینٹھی ہوں   کیا نہا جو بھی بنیں گے، یہ دولہا جو میرے!

جو خبر لیتے ہیں ہر حال میں اس بیگم کی   یا الٰہی رہیں زندہ وہ کماؤ میرے!

صاد کردہ اشعار کے علاوہ کوئی شعر قابلِ اعتنا نہیں۔ اس میں بھی "جوشن" والا شعر بیگم کو لکھنوی نہیں ثابت کرتا۔ یہ لفظ، اہلِ زبان کے ہاں، بالاتفاق مذکر ہے۔ اس طرح ساڑھے چار شعر ہمارے ہات آئے ہیں۔ وہ بھی بجبر تمام

۲۳ء میں "مقدمہ دیوان جان" مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ذیل کی ریختی پیش کرتا ہے، جس کا سال تصنیف، تسکین صاحب یوں متعین فرماتے ہیں۔ "پھر نموئی عورتوں" الخ۔ یہ شعر بیگم نے کوئی بیس سال پہلے کہا تھا"۔ اس لحاظ سے یہ ریختی سنہ۲ کی تصنیف ہو سکتی ہے، جو بیگم نے ۶۳ سال کی عمر میں کہی ہوگی۔

۵

مردوے تلوار کا کس بل نہیں، دم خم نہیں   بل ہے تیوری پر تو ہو، بندی کو اس کا غم نہیں

زال تو بیشک ہے تو، بنیا اگر رستم نہیں!   بار دو دو جوروؤں کا، اور کمر میں خم نہیں

پھر نموئی عورتوں پر، جو نہ ہو تھوڑا ہے ظلم،   کونسلوں میں جب کوئی بیگم نہیں خانم نہیں

ہات میں جن کے قلم ہے، بات میں جن کی اثر،   اے بوا وہ عورتیں بھی، مردوؤں سے کم نہیں

بیویاں بہتیری، لیکن ان کی مجلس بھی تو ہو   چند تصویریں ہیں حیراں، اور کوئی البم نہیں

جنگ سے ہے صلح بدتر، نوج ہو ایسا ملاپ!   کون سا دن ہے یہاں جب چل نہیں اور خم نہیں

دل کسی کو کیوں دیا بی، ہات ملتی ہو جواب   چیز اپنی جب تک اپنے پاس ہے، جو کم نہیں

تیری باتوں کے مرے دل میں ہزاروں گھاؤ ہیں   اور پھر بخیہ نہیں ٹانکے نہیں، مرہم نہیں

سوت بازی مجھ سے لے جائے، خدا کی شان ہے!   وہ ہے چھتیسی اگر، میں بھی تو اس سے کم نہیں

یاد رہے گی سوت گھر میں یار جیں گے راج ہم   اب تو دل میں ٹھان لی ہے، وہ نہیں یا ہم نہیں

جلتے ہیں سب بہین السلطنت کی ہے کنیز   کون سی محفل میں تیرا ذکر اے بیگم نہیں

اس معرکۃ الآرا ریختی کے بھی، صرف پانچ ہی شعر میں انتخاب کر سکا، جن میں سے "یار جیں گے راج ہم" والا شعر لاجواب ہے، اور ریختی کا بہترین نمونہ۔ اگر واقعی ان کا ہے، تو شاید بیگم کی زندگی بھر کی کمائی ہو سکے۔

پھر "تذکرہ ریختی" مجلہ مکتبہ حیدر آباد، دکن، بابت ماہ اکتوبر ۲۹ء سے ذیل کی ریختی نقل کرتا ہے۔

سونا مرا، آباد سدا سوت کا گھر تھا   میں نے جو تمہیں دل دیا، اُس کا یہ ثمر تھا

پہنچے نہ جہاں وہم، وہاں تیر اگر رہتا   واری گئی تجھ پر، تو ملک تھا کہ بشر تھا

قطرے میں تھا انسان پڑا پیٹ میں جس دم   روتا ہوا جب گود میں آیا تو بشر تھا

صدقے گئی، اللہ نے پروان چڑھایا!   سچ پوچھو تو یہ میری دعاؤں کا اثر تھا

برسات میں سمدھن بڑی تکلیف اٹھائی!   تم کیوں نہیں آئیں، ابھی خالی مرا گھر تھا؟

میں جاتی ہوں میکے، نہ رہوں گی نہ رہوں گی   اب تک جو دیا ساتھ، یہ میرا ہی جگر تھا،

کرتی تھی اِدھر کام، اُدھر دیکھ رہی تھی   اے چھوکری! اس وقت ترا دھیان کدھر تھا؟

جھک مار کے پھر کیوں مجھے تم بیاہ کے لائے   رہنا ہی تمہیں گھر میں نہ منظور اگر تھا؟

معراج کی شب سنتی ہوں احمد ہیں احد میں   تھا ہیم کا پردہ، یہ اِدھر تھے، وہ اُدھر تھا۔

ملنے کے لئے کل مرے گھر آتیں جو بیگم!   کچھ نفع تمہارا تھا، نہ کچھ میرا ضرر تھا۔

نعت کسی زبان میں ہو، وہ ہر جگہ قابلِ احترام ہے۔ اب نیچے ریختی کے پانچ شعر، جن پر صاد ہے۔ بقول "صدیقہ بیگم سیوہاروی" پہلا مطلع، اگر میں بھی "سوت" کو "غیر" بنا دوں، تو واقعی غزل ہو جائے گا۔ اسی طرح خط کشیدہ مصرع اور الفاظ بھی ریختی پسندوں کے لئے قابلِ توجہ ہیں۔ بہر حال، یہ ریختی ۲۷ سال کی عمر میں کہی ہوگی۔ اس نقالی کے بعد "تذکرہ ریختی" نے اپنی سعی جمیلہ سے چار مکمل ریختیاں اور پیش کی ہیں، جن سے سنہ تصنیف اخذ کرنا ممکن نہیں اس کے بعد وہی دو خمسوں کے ایک ایک بند ہیں، اور دو شعر معراج شریف کے۔ بیگم بقول "مقدمہ جان" ۹۹-۱۸۹۸ء میں حیدر آباد آئے، اور نواب آصف، غفراں مکاں، کے دربار سے حضرتِ داغ کے ہاتوں نکالے گئے اتفاق سے اسی زمانے میں، مہاراجہ چندو لال شاداں کی بارہ دری میں مشاعرہ ہوا"، تو داغ کے علاتی بھائی نے "اردوئے معلیٰ" پر اپنا حق جتایا۔ عابد مرزا بیگم نے جواباً، ایک قصیدہ نما قطعہ کہا، جس میں حضرتِ داغ پر چوٹ کر کے، بڑی خوبی سے گریز کی ہے، اور اردو کی تاریخ اور اُس کی بتدریج ترقی کا ذکر کیا ہے"۔ ملاحظہ ہو۔

سناتے ہو نہ مجھے باتیں ہزار دل   کہوں میں بھی جو کچھ اپنی زباں سے

تو اس دم کرکری ہو جائے گی بس   سبھوں کے سامنے میرے بیاں سے

جسے کہتے ہیں اُردو ہے وہ لشکر   سُنی باتیں جو لشکر کی زباں سے'

اسی کا نام اردو ہو گیا ہے   کوئی منکر نہیں میرے بیاں سے

ہوئی جب چھاؤنی دلّی میں اے بی / وہاں لوگ آ گئے سارے جہاں سے
ہوا ہر قوم کے لوگوں کا مجمع / کوئی کابل، کوئی مازندراں سے
عرب تھا کوئی، اور کوئی عجم تھا / کوئی شیراز، کوئی شیرواں سے
جو کیں آپس میں ان لوگوں نے باتیں / تو اردو کی زباں نکلی یہاں سے
زباں یا ست نجا، بھونا ہوا تھا، / کہ گرما گرم آیا ہوں دکاں سے
نمک مرچیں ملی ہیں لکھنؤ میں / کہ اب تک رال بہتی ہے زباں سے
وہ اردو تھی، کہ اک لڑکی کا چیلا / نہ نکلے جس کے کانٹے باغباں سے
خراد الکھنؤ والوں نے اس کو / تمہیں کیا فخر؟ تم لائیں کہاں سے
مری جاں! لکھنؤ والوں کے آگے / بہت مشکل ہے کچھ کہنا زباں سے
نہ کہنا اب کبھی، میں ہوں زباں داں / ذرا اللّو کو روکو، اس بیاں سے
میں اپنے وقت کی زیب النسا ہوں / جواب اپنا کوئی لائے کہاں سے
یہ کہنا ہے بہت بے جا، دوگانا! / کہ اچھی ہوں میں ہی سارے جہاں سے
نہیں کرتا، زمانے کا ہے دستور / ثنا اپنی کوئی اپنی زباں سے
ہے فضلنا بڑی روٹی میں آیا / ذرا پوچھو میاں حافظ کی ماں سے
کیا خالق نے پیدا، ایک پر ایک / سنا ہم نے یہ آتوں کی زباں سے
زباں کے خلد کی ہے حور عورت / اگر ہو لکھنؤ کے بوستاں سے
زباں کے ملک کا سکّہ ہے عورت / انوکھا ہے چلن سارے جہاں سے
زباں کا فیصلہ ہے عورتوں پر / یہ باتیں مردوے لائیں کہاں سے
زباں دانی ہے حصہ عورتوں کا۔ / لڑائے کیا زباں کوئی زباں سے
نگوڑی سوت جل ککڑی کے ہاتھوں / بتنگ آئی بہت میں اب یہاں سے
یہ بیکاری بنی ہے سوت میری / نکلتی ہی نہیں میرے مکاں سے
وطن چھوڑا اسی شفتال کے چلتے / دکن میں آئی ہیں ہندوستاں سے
چھڑایا مجھ کو پیاروں سے اسی نے / چھپا کے منہ چلی آئی وہاں سے
موئی کو لاگ مجھ سے ہو گئی ہے / یہاں بھی آن لپٹی میری جاں سے
سند اس نے مجھے دی مفلسی کی / نتیجہ خوب نکلا امتحاں سے
غرض ہونا ہے جو، ہو جائے مجھ پر / میں کچھ کہتی نہیں، اپنی زباں سے
مری اب پرورش فرمائیں آصف / کنیزی میں رہوں میں دل سے جاں سے
تو میری مفلسی اس طرح بھاگے، / کہ جیسے تیر چھٹتا ہے کماں سے
جو مجھ کو عرض کرنا تھا، کیا، بس / دعا بیگم یہ ہے دل سے، زباں سے
بجے چاروں طرف آصف کا ڈنکا! / خراج اس کو ملے سارے جہاں سے

تسکین عابدی صاحب نے ۱۹۴۰ء میں جو کچھ پیش کیا ہے۔ وہ کل تیس بتیس شعر ہیں، جو ان ریختیوں کے مقابلے میں شاید ہی کوئی وقعت رکھتے ہوں۔ اس لئے ہم قلم انداز کرتے ہیں۔ البتّہ دو شعر قابلِ توجہ ہیں۔ ہم نے بہت کوشش کی، لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ دیکھئے شاید آپ کچھ نتیجہ نکال سکیں۔

اب جواں ہونے کو آئی چھوکری / کب تری یہ لااُبالی جائے گی!

یہ "لااُبالی" خدا جانے کہاں کی زبان ہے۔ "لااُبالی پن" تو ہم نے اکثر سنا ہے

دیکھو، کیا دولہا اسے دیتا ہے نیگ / مانجھے لے کر چھوٹی سالی جائے گی

یہ اشعار انہی بیگم کے ہیں، جو بقول تسکین عابدی صاحب، ذیل کے شعر میں "ایک محاورہ محلات کا بھی لکھ گئے ہیں"۔

ذرا چولیں اُکا سولے بی دیا دیکھتی کیا ہو، / لیا ہے پھیر بچے نے، بڑی مشکل سے نکلے گا

اس سے بھی آگے فرماتے ہیں: "اس قسم کی اصطلاحات سے بیگم کا کلام بھرا ہوا ہے"۔ اب ذرا ایک مرتبہ پھر "لااُبالی" پر نظر ڈال لیجئے۔ ممکن ہے "لا" کوئی بیگمی استعارہ ہو، اور اُس کے چوٹھے پر چڑھا کر اُبالے جانے کا وقت دریافت کیا ہو۔

ہمارے ہندوستان میں ضرور ایک رسم بیگمات میں مرسوم ہے۔ وہ یہ کہ یوم شادی سے تین دن پہلے، دُلھن کی چھوٹی بہن "مہندی" لے کر اپنے بہنوئی کے گھر جاتی ہے، اور "حنا بندی" کی رسم ادا کر کے کچھ نیگ پاتی ہے۔ وہ بھی شادی جب اپنایت میں ہو۔ معلوم نہیں یہ "مانجھے" کیا ہے؟ کوئی دکنی چیز ہو گی۔

آخر میں ہمیں ان بیگم پرستوں سے صرف اتنا کہنا ہے اگر وہ بیگم، جو مشاعروں میں فی البدیہہ رباعیاں کہتی تھیں، اردو کو اپنی تسجائی گڑیا ثابت کرنے کے لئے، قلم برداشتہ ایسی طویل نظم لکھ سکتی تھیں، جو بیک وقت قطعہ بھی ہے، ریختی بھی ہے، قصیدہ بھی ہے، اور زبانِ اُردو کی مکمل تاریخ بھی، کیا انہوں نے اپنے پچاس سالہ دورِ شاعری میں یہی اتنے اشعار کہے! کہ جنہیں عالی جناب پروفیسر آغا حیدر حسن صاحب نظام کالج، دکن سے لے کر حضرت عابدی تک، علم سینہ سے علم سفینہ بنائے چلے آ رہے ہیں۔ اگر اس تثلیث کو پیراں نمی پرند و مریداں می پرانند یا یہ کی سمست وگواہ چست کا مصداق نہیں بننا ہے، تو وہ شیدا کے کلام پر روشنی ڈالنے سے پہلے، جواب تک معرضِ التوا میں ہے، براہِ مہربانی، ایسے عدیم المثال ریختی گو کے ثبوت سلسل نغمت میں سے کچھ اشعار شائقین کر کے خراجِ تحسین حاصل کریں، اور مرحوم کی روحِ پاک پر درود پڑھنے کا شرف بخشیں، اور دنیائے ادب کو یہ کہنے کا

مجبور کردیں۔

ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

غور کرنے کی بات ہے کہ عابد مرزا مرحوم، تمکین و تسکین دونوں فطین حضرات کے کرم فرما تھے۔ آخر دم تک جہاں مل جاتے، اپنی براق طبیعت کی بدولت، ان "جاذب صفت" ریختی کے دلدادوں کو ہمیشہ شعر سنانے کو تیار، ہر وقت غزل کہنے پر آمادہ "رہتے تھے۔ کیا انہوں نے کم از کم ۲۵ سال تک ان مخلص قدر دانوں کو یہی چند اشعار یا ریختیاں بار بار سنائیں جن میں مقدمہ جان۔ مجلہ مکتبہ حیدرآباد۔ دکن، گلدستہ نتیجہ سخن کلکتہ، نغمہ عندلیب کا سرمایہ بھی شامل ہے؟ کہ ان کو دھرلتے دھرتے، کیفیت امتلائی حلق سے نیچے اتارنے کے بالعوض، بار با کا غذ پر اگلوا دیتی ہے، اور پس از موت بھی بیگم کے منہ سے یہ شعر کہلوا دیتی ہے ؎

جن کو معلوم یہ کرتب ہیں، یہ جادو میرے … بن کے ہمزاد وہی لوگ ہیں لاگو میرے

بیگم کے کلام کی حفاظت و شہرت کا موجودہ طریق کار، سرو قبلہ کا رخ مغرب سے مشرق کی طرف پھیر دیتا ہے۔ منزل تک مسافر کا پہنچنا معلوم!

ہماری رائے میں دونوں "سیہ زادوں" کو قبلہ بیگم کی "مقدمہ دیوان جان" کی اس قیمتی رائے پر عمل پیرا ہونا چاہئے، جو انہوں نے کلام جان کے تحفظ کے لئے بتائی ہے۔

"رام پور / حیدرآباد میں جان صاحب / بیگم نے جو کہا ہے، وہ اُن کا کلام بہت کم ملتا ہے بعض شائقین نے کچھ جمع کیا ہے۔ ایک صاحب نے ان مشاعروں کی غزلیں یک جا کی ہیں، جو رام پور / حیدرآباد میں اس زمانے میں ہوئے تھے۔ اس طرح اگر جان صاحب / بیگم کے کلام کی تلاش کی جائے تو مل سکتا ہے، اور ایک جا ہو سکتا ہے"

گارساں دتاسی نے تو جان کو اسی کلام کے ناتواں، یورپ میں "خبرد ا" بنا دیا، آپ بیگم کو اسی کلام کے چلتے "مُردہ ا" بنا دیجئے۔

مزید براں، بیگم کے مکان پر جائیے، جملہ نوابان دکن و ہند سے دبا ڈلوائیے، جن میں وہ پیدا ہوئے، پلے، بڑھے، پھلے، پھولے اور مرے، اور ان کے وارثوں سے ایک ایک حرف حاصل کرکے ایک کار خیر انجام دے جائیے، تاکہ بیگم کی طرح، آپ بھی زندگی جاوید حاصل کیجئے۔ ورنہ وہ بھی گئے "اور آپ بھی۔ آزاد نے تو غدر میں، سنگینیں چھاتی پر لے کر اپنے اُستاد ذوق کا کلام بچایا تھا۔ کیا آپ کو ان "غدری بیگم" سے اس کی نصف محبت بھی نہیں کہ ان کے بستر مرگ کو، جھاڑ جھٹک کر، سرہانے، پائنتی، ڈھونڈ ڈھانڈ کر ان کا کلام محفوظ کرلیں؟ ورنہ یاد رہے۔ زباں کی حکومت ہے

اور آپ! ؎

مانیں نہ مانیں، آپ کو اس کا ہے اختیار۔
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں۔

حسانِ سخن

حجاباتِ دو رنگ

مجھ کو جس پر ہو بے جا سے دلچسپی غلط
یورشِ تقلیدِ مغرب کی طرفداری نہیں

وادیٔ آزادیٔ نسواں کی حد تک چشم پوش
وادیٔ آزادیٔ نسواں سے باہر نکتہ چیں

میں رہینِ احتجاجِ عصمتِ ملّت سہی
کیوں امینِ عفّتِ اسلام ہوں چیں بر جبیں

پاکبازی دامنوں پر جن کے پڑھتی ہے نماز
وہ کبھی اس طنز کی زد میں نہ ہوں گی، ہیں، نہ تھیں

ہاں نشیبوں میں سما جائے گی یہ سیلِ سخن
صاف ستھری سطح میں پانی نہیں مرتا کہیں

چھو نہیں سکتی تھی جن کے جسم دن کی روشنی
جن کا پردہ تھا مقامی طور پر عین الیقیں

شور سنتا تھا مگر اب تک جنہیں دیکھا نہ تھا
اُن کی تصویریں مجھے اک بدگماں نے لا کے دیں

اور کہا دیکھو مری اُس بدگمانی کے ثبوت
جن پہ تم کہتے تھے "کیوں بکتے ہو وہ ایسی نہیں"

"اب تمہیں آنا پڑے گا میری سچائی کی سمت
اب تمہیں لانا پڑے گا میری باتوں پر یقیں

اب تمہیں لکھنی پڑے گی ایک نظمِ تند خو
اب تمہیں کہنا پڑے گا آں چناں و ایں چنیں"

ہوگئے پیدا پتنگے سے نظر کے سامنے
سر پہ گھوما آسماں پیروں میں چکرائی زمیں

انجمن میں اُن کو پایا حسنِ شمعِ انجمن
لغزشیں جن کی پسِ پندار تاریکی میں تھیں

کان تک آئی نہ تھی جن کی خیانت کی بھنک
شرع جن کو مانتی تھی لیلئ محمل نشیں

مغربی انداز میں نامحرموں سے ملتفت
عزت اسلاف سے پھیرے نگاہِ شرمگیں

عظمتِ خون گشتۂ اجداد صرفِ دلبری
"ڈیل" زانو آشنا، شانوں سے غائب آستیں

ہر تعارُف پر یہ اظہارِ خلوصِ ناشکیب
"خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں"

گفتگو میں ہاتھ پھیلاتا پیامِ اختلاط
مسکراہٹ سے ٹپکتی جراتِ حیرت نگیں

ہر نظر میں شعر کہتی شوخیٔ غیرت فریب
ہر ادا میں آنکھ مٹکاتے غزالِ سرمگیں

اگلے وقتوں کی جہالت "مثنویٔ زہرِ عشق"
عہدِ موجودہ میں "اُلفت ایک سے" لازم نہیں

غیر مردوں کی معیت ہو، نمائش اور یہ.....
برق ساماں ہوٹلوں کے راز پوشیدہ نہیں

کھو کھلا تھا کس قدر ان کی حیاداری کا ڈھونگ
ناگنیں گویا حریمِ قصرِ سرمایہ میں تھیں

گھر کے اندر یہ "طہارت"، چشمِ بیگانہ نجس
گھر سے باہر یہ "رعایت" کوئی نامحرم نہیں

ہم وطن جتنے ہیں۔ گویا بد معاش و بدقماش
غیر ملکی آدمی کا ہے کو — جبریلِ امیں!

شاد عارفی

دو غزلیں

اب کوئی دم میں غرق ہوا چاہتا ہوں میں
جو موجِ آب پر ہو رواں وہ دیا ہوں میں

بہنے دو میری آنکھوں سے خونابۂ جگر
اس آئینے میں خود کو جواں دیکھتا ہوں میں

ان بجلیوں کو رہنے دے اے شوخیٔ نگاہ!
شاید خبر نہیں ہے تجھے جل چکا ہوں میں

ہاں اے غمِ فراق! اُٹھا میرے ناز تو،
برسوں کسی کی آنکھ کا تارا رہا ہوں میں

میں نے بھی اک بنائی ہے دنیا یہاں سے دُور
ایسا بھی اک جہان ہے جس کا خدا ہوں میں

یہ شاعری نہیں ہے، تمنا کی قبر پر
تعمیر ایک تاج محل کر رہا ہوں میں

جو زندگی تھی اصل میں اختر وہ کٹ گئی،
جینے کی شرم رکھنے کو اب جی رہا ہوں میں

(۲)

ہو کے برباد غمِ عشق میں جینا ہوگا
کیا خبر تھی ہمیں یہ زہر بھی پینا ہوگا

یاس کا ہے یہ تقاضا، "کہیں مر بھی کم بخت"
ہے یہ امید کا فرمان، "ابھی جینا ہوگا"

ہو کے محرومِ تمنا جو جیئے گا یارب!
اُس کا جینا بھی کوئی جینے میں جینا ہوگا

آج جس سینے میں طوفانِ تمنا ہے بپا،
کل تمناؤں کا مدفن وہی سینا ہوگا

عشرت اک خواب ہے اے دوست جہاں آنکھ کھلی
مطربہ ہوگی نہ شغلِ مے و مینا ہوگا

اے خدا، موسمِ باراں کی فضا کے خالق!
باغِ جنت میں بھی ساون کا مہینہ ہوگا؟

تہِ گرداب جو ہوگا دمِ طوفاں اختر
ہے یقیں مجھ کو وہ میرا ہی سفینہ ہوگا

اختر انصاری

ع۔ منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

منزل ..... !!؟؟

کنور رگھراج سنگھ معمولی حیثیت کا زمیندار تھا۔ مگر ضروریات نہایت محدود۔ جن کے معیار سے آمدنی نہایت وافر کہ اندر سے باہر تک بھرا ہی بھرا نظر پڑتا۔ حالانکہ ڈیڑھ ہزار سالانہ مال گزاری تھی اور دروازے پر ایک چھوٹا سا ہاتھی دو تین اچھی نسل کی گھوڑیاں۔ درجنوں بھینسیں اور گائیں۔ علاوہ درجن بھر ہل کے بیلوں کے مفت میں بندھے کھاتے تھے۔ مگر ان سب کے باوجود غرور اور جھوٹی شیخی نام کو نہ تھی اور نہ کسی کام میں عار۔ حتیٰ کہ مزدوروں کے ساتھ سر پر لاد کر غلے کی گٹھڑیاں لاتا۔ جیٹھ بیساکھ کی تپتی ہوئی لُو اور دھوپ میں چماروں کے ساتھ کھیتوں میں کھاد ڈالتا۔ اس کا قول تھا کہ زمیندار درزی کی سوئی ہے کبھی مخمل میں کام کرتی ہے۔ اور کبھی گاڑھے میں۔ وہ کھیتی ہی کے متعلق کیا بلکہ ہر اس کام کا کرنا جو اپنے لئے کیا جائے باعثِ عزت سمجھتا اور اپنے کسی کام کو ذلیل خیال نہ کرتا۔ علاوہ یومیہ چلنے والے حسب ضرورت مزدوروں کے قریب ایک درجن مستقل ملازمین محض کھیتی کے کام پر رہتے تھے اور تین سائیس اور دو ہاتھی بان۔ ان ملازمین اور مزدوروں کے ساتھ کنور اور اس کا چھوٹا بھائی گجراج سنگھ دوش بدوش کام میں لگے ہی رہتے یہی وجہ تھی کہ کنور کا سا اطمینان اور فراخی اس سے چوگنی حیثیت کے زمینداروں کے گھر میں بھی نظر نہ آتی تھی۔ اس کے یہاں ہر چیز پر خواہ جاندار ہو یا بے جان ترقی برستی تھی۔ کنور کے اثر کا یہ عالم تھا کہ علاقہ بھر کے اچھے اچھے ٹھاکر اور پٹھان زمیندار اس کے اشارے پر چلتے تھے۔ ان میں اکثر اس کے بے پایاں احسانات اور اخلاق کے گرویدہ تھے۔ حیثیت معمولی مگر بات اور اعتبار لاکھوں کا۔ دس دس بیس بیس کوس تک ناممکن تھا کہ کوئی پنچایت بغیر کنور کی شرکت کے طے ہو جائے۔ مجال کیا کہ سب انسپکٹر یا انسپکٹر پولیس کوئی اہم تحقیقات حلقہ بھر میں خواہ کسی جگہ ہو بغیر اس کے مشورہ اور مرضی کے صحیح کر لیں۔ چاروں طرف اس کی ایسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ ہر گاؤں میں بیسیوں چھوٹی بڑی ہستی کے آدمی اس کے فدائی موجود تھے اس کا دسترخوان نہایت وسیع تھا۔ کوئی منحوس دن ایسا ہوتا ہوگا کہ چار چھ مہمان اس کے دروازے پر نہ ہوتے ہوں۔ مہمان داری اور تواضع اس کے خمیر میں گھسی ہوئی تھی اور چھوٹی بڑی ہر حیثیت کے آدمی کے ساتھ یکساں خاطر و مدارات سے پیش آتا۔ سرکاری حکام کے ساتھ بھی اس کا رویہ نہایت اچھا تھا۔ تحصیل کرنیوالے چپراسی سے لے کر امین، قانون گو، نائب تحصیلدار، تھانے دار حلقہ بھر میں کہیں آئیں مگر ہمیشہ شام کو اس کے دروازے پر ٹکڑ کھاتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ خوشامد کرنا بالکل نہ جانتا تھا۔ بلکہ بعض تھانے داروں اور تحصیلداروں وغیرہ نے جو اس کی عادت سے ناواقف تھے۔ اس کی خوش اخلاقی کو خوشامد پر مبنی کر کے اس کو بے جا دباؤ ڈال کر مرعوب کرنے کی کوشش کی مگر منہ کی کھائی اور بجائے مرعوب ہونے کے کنور نہایت آزادی اور بے باکی کے ساتھ مقابلہ پر آ گیا اور حکام بالا تک نوبت پہنچ گئی۔ تمام حکام میں کنور رگھراج سنگھ بھینٹ بیگار اور بے جا دباؤ ماننے کے معاملہ میں بدنام سا ہو گیا تھا۔ البتہ شرافت اور نرمی سے کوئی جسم کے کپڑے تک اتار لے تو اسے خبر نہ ہوتی۔ کچہری کے اہلکاروں کے پرانے مقررہ حق حقوق نہایت قاعدے کے ساتھ حساب کر کے دے دیتا اور اول تو کبھی ایسا ہوتا نہ تھا اور اگر بالفرض اس کے بعد بھی کبھی اس کے کام میں کوتاہی ہوتی تو نہایت آزادی سے حکام بالا سے شکایت کر دیتا۔ وہ اس قدر کھرا اور سخت طبیعت کا انسان واقع ہوا تھا کہ شخصیت سے مرعوب ہو کر کسی سے جھکنا جانتا ہی نہ تھا۔ پڑوس کے راجہ صاحب سے دریا کی مچھلی پر اس کا جھگڑا ہوا کنور بغیر اس کا خیال کئے ہوئے کہ راجہ صاحب کی مالی حیثیت ٹھیک اس سے پچاس گنی ہے چیئرمین، آنریری مجسٹریٹ وغیرہ سب ہی کچھ ہیں برسرِ مقابلہ آ گیا اور دریا کے کنارے میلوں تک اپنے آدمی اور مچھیرے تعینات کر کے اور راجہ صاحب کے کارندوں اور سپاہیوں کو مار بھگایا اور زبردستی مچھلی مار لایا اور تمام علاقے میں تقسیم کر دی۔ راجہ صاحب نے اپنے رعب و وقار کو ایک معمولی حیثیت کے آدمی کے مقابلہ میں اس طرح پامال ہوتے دیکھا تو اپنی دولت اور افراد کے زعم میں عدالت سے رجوع کیا۔ مگر جب یہ دیکھا کہ غیر تو در کنار خود اپنے ذاتی کاشتکار بھی کنور کے مقابلہ پر شہادت دینے کو تیار نہیں ہیں تو چپ ہو گئے اور مقدمہ واپس لے لیا

کنور جس معیار سے دوست کا دوست تھا۔ اسی معیار سے دشمن کا دشمن۔ مشہور بات تھی کہ رگھراج سنگھ نے جسے ایک مرتبہ دوست کہہ دیا اسے عمر بھر نباہ دیا۔ اور جسے ایک مرتبہ بھائی کہہ دیا۔ اس کا بھائی ہی بن کر دکھا دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ کینہ پروری بھی اس درجہ کا تھا کہ جس سے ایک مرتبہ بگڑ گئی عمر بھر دل صاف نہیں کیا

اداوہ مانت کی۔ دوست کی خاطر جان، مال، آبرو، ہر چیز سے حاضر رہنا اور انھیں چیزوں کی بازی دشمن سے انتقام لینے کے لئے بھی لگائے رہنا۔ خان پور والے زور آور خاں نے بچپن کی بگڑی بدلی ہوئی تھی۔ اتفاق سے ایک دوسرے گاؤں کے ٹھاکروں سے اور کنور کے دوست زور آور خاں سے ایک عرصہ سے ٹریاگدکے قبضے پر مقدمہ بازی ہو رہی تھی۔ پٹھان موضع پر پہنچ کر زمین جوت رہے تھے اور ٹھاکر مقابلے کے لئے جمع ہو کر چلے۔ اتفاق سے ان کا راستہ کنور کے گاؤں کی زمین پر ہو کر تھا۔ کنور نے خبر پائی کہ زور آور خاں پر ٹھاکر چڑھ کر جا رہے ہیں فوراً ہی بغیر پٹھانوں کو اطلاع کئے راستے میں جا دھمکا اور ٹھاکروں کے گروہ کو گھیر لیا اور کہا کہ پٹھانوں سے پیچھے مقابلہ ہوگا پہلے مجھ سے نپٹتے جاؤ۔ ٹھاکروں کے گروہ میں کچھ لوگ گاندھی کیپ اور سدھ کھدر کی دھوتی پہننے والے بھی تھے۔ لگے لیڈرانہ شان سے ٹھاکر پر روغن قاز ملنے۔ "جو ہم تم ہو جائیں گے وہ دوہ نہیں ہو سکتے۔

"ہم بھی ہندو تم بھی ہندو"

"ہم بھی چوہان ٹھاکر اور تم بھی چوہان ٹھاکر"

"پٹھانوں کی ہمتیں بڑھ گئیں تو آج ہمارے لئے ہیں کل تمھارے لئے ہوں گے"

وغیرہ وغیرہ ہر قسم کے سبز باغ دکھائے۔ مگر واہ رے عجیب الطرفین راجپوت کیا وضع داری کی مثال قائم کر دی کہ اپنے غیر مذہب والے دوست کی ہمدردی وحمایت میں پتھر کی چٹان کی طرح اٹل رہا۔ مذہب، برادری ہر چیز کو تعلقات اور دوستی پر قربان کر دیا۔ پٹھان بھی یہ خبر پاکر پہنچ گئے۔ کنور نے زور آور خاں سے نہایت خشمگیں ہو کر اس سے مدد طلب نہ کرنے کی شکایت کی۔ اور اس کے بعد کہا کہ تمھارا اور ان کا مقابلہ تو کھیت پر ہوگا۔ اس وقت تو یہ میری گاؤں کی زمین پر ہو کر میرے دوست پر چڑھ کر جا رہے ہیں تمھیں اس وقت ان سے لڑنے کا حق نہیں ہے جب ہم سب مارے جائیں اور کھیتوں پر پہنچ جائیں تو تم سے نوبت آئے گی"

اور نہ زور آور خاں کے آدمی اپنے گروہ میں ملنے دئے اور ٹھاکروں سے کہا کہ "اگر خاں صاحب مجھے پہلے سے اطلاع دے دیتے تو تم لوگوں سے میں تمھارے خاص گاؤں ہی میں جاکر روانہ ہونے سے پہلے ہی مقابلہ لے لیتا"۔ ٹھاکروں کی ہمتیں تو کنور کو دیکھتے ہی پست ہو گئی تھیں۔ زور آور خاں کے غول کو دیکھ کر رہے سہے ہوش وحواس پریشاں ہو گئے اور جان لے کر ایسے فرار ہوئے کہ پھر کبھی

ادھر کا رخ نہ کیا اور پٹھان بے خرخشے زمین پر قابض ہو گئے۔ کنور رگھوراج سنگھ آدھی صدی کھا چکا تھا۔ مگر اس عرصے میں نہ کسی حاکم وقت۔ دولت مند یا سرکش کو خیال میں لایا تھا۔ نہ کسی کے سامنے جھکا تھا نہ کسی پر اپنا انتقام چھوڑا تھا۔ اور نہ کسی کی کڑی سنی تھی۔ دور دور کے سرکش اور قاتل قسم کے آدمی اس کے نام سے تھراتے اور اس کو اپنا استاد خیال کرتے تھے۔ اس کا قول تھا کہ جو دنیا میں اپنا انتقام نہ لے سکے اس کو زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں۔ وہ آزادی اور انتقام کو ہر جاندار کا قدرتی حق سمجھتا تھا۔ اس کی جرأت بہادری کے درجے پر۔ اس کی صداقت بیباکی کی حد پر اور اس کا اخلاق انکساری کی منزل پر تھا۔ وہ اچھا خاصا قرن اولی کے راجپوتوں کا نمونہ تھا۔ جان جائے، مگر آن نہ جائے!!

(۲)

کنور رگھوراج سنگھ کا خاندان نہایت مختصر تھا۔ اس کی بیوی۔ دو نہایت خورد سال بچے چھوڑ کر مر گئی تھی۔ یہ دو بچے اور ایک چھوٹا بھائی جو عمر میں بیس سال کم تھا اور ایک بھاوج اس کی ساری کائنات تھی۔ بھاوج کے کوئی اولاد نہ تھی اور نہ ہونے کی امید۔ مگر جگراج سنگھ اور شوراج سنگھ کی موجودگی نے چچی ہوتے ہوئے بھی کبھی اس کے دل میں یہ خیال نہ آنے دیا کہ وہ بانجھ ہے۔ اور نہ ان دونوں بچوں کو ہی یہ علم تھا کہ ان کے ماں نہیں ہے۔ یوں تو چچی دونوں پر جان چھڑکتی تھی اور دونوں بچے سارے گھر کا ہی کھلونا تھے مگر چچی چھوٹے شوراج سنگھ سے اس قدر مانوس تھی کہ ہر وقت اس سے اس طرح شغل کرتی جیسے کوئی چھوٹی لڑکی اپنی گڑیا سے کھیلتی ہے۔ اور بڑے جگراج سنگھ سے چچا کو اس قدر محبت تھی کہ کام کے بعد کل وقت گودی میں چڑھائے ہی نظر پڑتا۔ جاڑوں کی سردراتوں میں جگراج سنگھ مستقل چچا کے بستر پر اور شوراج سنگھ چچی کے ساتھ سوتا۔ دونوں بچوں کی عمر میں ایک سال کا فرق تھا مگر صورت شکل اور جسم جثے میں اس قدر مشابہ تھے کہ بالکل جڑواں معلوم ہوتے۔ حالانکہ شیوراج سنگھ عمر میں ایک سال چھوٹا تھا مگر اس کے جسم کا اٹھان کچھ ایسا اچھا تھا کہ جگراج سنگھ سے ایک سال بڑا معلوم ہوتا۔

کنور رگھوراج سنگھ کی تعلیم بالکل نہ تھی بمشکل دستخط کر سکتا تھا۔ وہ بھی بغیر بقلم خود کے اور اس کا چھوٹا بھائی بھگراج سنگھ یہ بھی نہیں۔ ان دونوں کی بڑی تمنا تھی کہ ان کے بچے اتنا پڑھ جائیں کہ اپنی رسید فارخطی کے لئے یہ دوسرے کے محتاج نہ رہیں۔ جب دونوں لڑکے پانچ چھ سال کے ہو گئے تو گاؤں کے پٹواری کے بڑے بیٹے منشی الفت رائے کے سپرد کئے گئے۔ منشی جی پرانی قسم کے فارسی دانوں کا اسوہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے کتب کی رسم ادا کرائی گئی گیارہ من لڈو تمام

گاؤں میں تقسیم کیے گئے۔ اور رات کو ناچ گانا جلسہ ہوا اور تمام بستی کا کھانا۔ منشی الفت رائے کو جوڑے اور نذرانہ دیا گیا۔ دونوں بچوں نے سہرا باندھا۔ غرض پوری تقریب ہوئی اور کنور کے دوستوں کی ہدایت کے بموجب منشی الفت رائے چھ روپے ماہوار اور دونوں وقت کی خوراک پر مستقل طریقے سے جگراج سنگھ اور شیوراج سنگھ کے معلم اور اتالیق مقرر کیے گئے۔ منشی الفت رائے نے دونوں بچوں کو پرانے طرز پر تعلیم شروع کرادی اور کنور کی خوشی کا کوئی اندازہ نہ رہا جب دو ہی سال کے اندر منشی جی نے دونوں بچوں کو آمد نامہ شروع کرادیا۔ آمد نامہ شروع ہونے پر کنور نے بہت سا غلہ اور گڑ انعام میں دیا اور کپڑے بنائے۔ دونوں بھائی اپنے بچوں کو آمد نامہ پڑھتے دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے اور جس وقت وہ جھوم جھوم کر اور چلا چلا کر آمدن آمد۔ آمدند آمدی آمدید۔ آمدم آمدیم۔ بخستن بلند ار کھینچنا پڑھتے تو دونوں بھائیوں کو ایسا محسوس ہوتا کہ ہفت اقلیم کی بادشاہت ان کے گھر میں آگئی ہے۔ بچی کی خوشی کا بھی ٹھکانا نہ تھا۔ دن بھر تختیاں دھوتی اور یہ دونوں لکھ لکھ کر اسے دکھاتے اور خود بتا بتا کر اس سے پڑھواتے۔ غرض سارے دن گھر میں ایک خوشی اور کھیل کا سماں بندھا رہتا اور قہقہے گونجتے رہتے۔

گلستاں شروع ہونے کے تھوڑے ہی عرصے بعد جہاں دیدہ منشی الفت رائے نے اندازہ کرلیا کہ ٹھاکر کا چھوٹا لڑکا غیر معمولی ذہانت اور ذکاوت قدرت کی جانب سے لے کر آیا ہے اور ہر چیز کو اپنی بساط سے زیادہ سمجھ لیتا ہے اور جتنا بتایا جائے اس سے زیادہ اپنی طبیعت سے نکالتا ہے۔ انھوں نے کنور سے کئی مرتبہ کہا کہ اس کو انگریزی پڑھائی جائے تو یہ خوب پڑھ سکتا ہے۔ مگر کنور ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ انگریزی پڑھ کر دھرم ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ اور لڑکا ماں کو ماں اور باپ کو باپ نہیں سمجھتا۔

ایک روز کنور کے دوست خاں صاحب محمد شاہ خاں جو شہر کے رہنے والے ایک رئیس تھے اور کنور کے ہمسایہ زمیندار نمسکار کو آئے اور حسب معمول کنور کے یہاں مقیم ہو گئے۔ اس مرتبہ خاں صاحب نے غور کیا کہ کنور کے دونوں بچے فارسی پڑھ رہے ہیں۔ پاس بلایا اور پیار کیا۔ سبق سنا اور کچھ سوالات کیے۔ اتنی ہی دیر میں تجربہ کار پٹھان نے بھانپ لیا کہ کنور کا چھوٹا لڑکا غضب کا پتلا ہے اور ہر قسم کی دماغی صلاحیت رکھتا ہے۔ انھوں نے فوراً کنور کے سامنے تجویز پیش کردی کہ شیوراج سنگھ کو انگریزی پڑھانا چاہیئے۔

"انگریجی! اے کہاں صاحب۔ انگریجی بھلا ہم گاؤں کے آدمی کا کہا جانیں۔ اتنا ہی بہت ہے کہ اپنی رسید پھارکتی کاٹ لئیں" کنور نے ایک قہقہہ مار کر کہا۔

"نہیں جی تمھارے پاس کمی تو خدا کے فضل سے کسی چیز کی نہیں ہے اور ماشاء اللہ بچہ بھی ذہین ہے۔ پھر کیوں اس کے دماغ کا خون کیا جائے؟!" خان صاحب نے زور دیتے ہوئے کہا۔

کنور نے کہا "ارے کھان صاحب انگریجی پڑھ کے دھرم کو دھرم ہاتھ سے جائیگو اور ہمیں تو پہچانے گو ناہے"۔ اور پھر بچے کی جانب مخاطب ہو کر بولا "اے سنت ہے ــــــ جے تیرے چاچا تجھے کرسٹان بنان کو کہت ہیں ــــــ اب انگریجی پڑھے گو؟" ــــــ

شیوراج سنگھ کرسٹان ورسٹان تو کچھ نہ سمجھا۔ البتہ انگریزی پڑھنے کی تجویز کو جو اس کے خاں صاحب چاچا اتنی دیر سے پیش کر رہے تھے خوب سمجھ گیا اور نہایت تیزی سے آنکھیں جھپکا کر اور ذرا کود کر بولا ــــــ "ہاں یاد نا (اس دن) منشی جی کہت رہے ــــــ" پھر خان صاحب کی جانب نہایت پر اشتیاق نگاہوں سے دیکھ کر بولا "ہاں کھاں صاحب چاچا میں انگریجی پڑھنگو ــــــ تم پڑھا بوگے؟ ــــــ میں تمھارے سنگ چلنگو"

خاں صاحب نے جو بچے کا من اور شوق دیکھا تو بے اختیار ہو کر گود میں بٹھا لیا اور پیار کیا۔ کنور نے کہا "اب کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا ــــــ کھانصاحب، تم ہی اس عیسائی کو بھرو بھگتیو ــــــ اور ہاں پھر انگریجی پڑھ کے تو تم ہم کو ناے پہچانے گو۔ اور کہے گو۔ دل ٹبڈھا تمھارا بڈھی اچھا ہے" ہو ہو کر کے ایک قہقہہ مارا۔

خاں صاحب نے کہا "بکو مت جی بے کار ــــــ ہاں ہم بھریں بھگتیں گے ــــــ! خدا نہ کرے وہ عیسائی ہو!! تم مذاق سمجھ رہے ہو بھئی۔ رگھوراج کے سر کی قسم یہ تو تمھارا نام اچھالے گا۔ اللہ اس کی عمر میں برکت دے۔ اس سے تمھاری سات پشتیں چمک جائیں گی۔ یہ ضرور بڑا آدمی ہوگا۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ ابھی سے اس کے دم خم نرالے ہیں۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ــــــ دیکھیئے گا کہ تعلیم پا کر کس منزل پر پہنچتا ہے۔ انشاء اللہ"

منشی الفت رائے دوسری چارپائی پر بیٹھے کنور اور خاں صاحب کی ساری گفتگو بغور سن رہے تھے۔ فوراً قریب آ گئے۔ قوم کے کائستھ ویسے ہی قدرتی لسان اور پیدائشی نستعلیق۔ اتنی جو شہ خاں صاحب کی جانب سے پائی لگے سوائی بولنے اور خاں صاحب کی گفتگو پر جلا دینے ــــــ خانصاحب آپ بالکل بجا فرماتے اور سامنا تو جا امر کے بارا میں کنور جی سے پیشتر ہی عرض کرچکا ہوں ــــــ جا لڑکا کا د[illegible]ب سے الیسو دماغ لے کر آؤ ہے کہ یہاں قرب و جوار میں تو جا کو م[illegible] دریہ نا ے سکت ہے۔ خدا کے فضل سے ذہین او اچھو پاؤ۔ اور حافظ[illegible]ہ و ذہین بھی ــــــ ورے میری بات پہ تو کنور

جی نے مطلق کان نہ دھرا ۔۔۔ میں نے کنور جی سے بار بار عرض کی
کہ اب زمانہ جو ہے کہ جب تک دو حرف انگریزی کے پیٹ میں نہ پڑیں۔ عزت
حاصل ہو سکت۔ مگر یہاں نقار خانہ میں طوطی کی صدا کون سنتا ہے۔"
کنور خاں صاحب اور منشی جی کے بار بار اصرار پر راضی ہو گیا۔ اور دو تین
دن بعد جب خاں صاحب قصبہ کو واپس چلنے لگے تو کنور سب طیاریاں مکمل کر چکا تھا
خاں صاحب نے سخت تاکید کر دی تھی کہ بچے کے سامنے بے کار رونا دھونا نہ ہو
ورنہ بچہ ہراساں ہوگا ۔۔۔ تین دن گھر میں ایک خاموش ماتم برپا رہا۔ شیوراج
سنگھ کی چچی کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس کے دل پر چھریاں چل رہی تھیں ۔۔۔
بے اختیار جی چاہتا تھا کہ دہاڑ مار کر روئے ۔۔۔ دیواروں سے سر پھوڑے مگر
صبر کی سل رکھے ماتا کی ماری خاموش تھی۔ اسے کنور یا خاں صاحب کی ہدایت
کا اتنا خیال نہ تھا بلکہ بچے کی پریشانی کے خیال سے چپ تھی۔ چپکے چپکے چھپ
چھپ کر روتی پھرتی۔ اور تین دن سے کھانا پینا حرام کر دیا تھا۔ شیوراج سنگھ
کو بار بار بھینچ بھینچ کر پیار کرتی اور آنسو پی پی کر رہ جاتی۔ اس کا جیٹھ جگراج سنگھ
بھی بہت ہراساں تھا۔ مگر بڑے بھائی اور پھر ان سے زیادہ محترم بزرگ محمد
شاہ خاں کے حکم میں اسے بھی دم مارنے کی گنجائش نہ تھی۔ کنور بھی حالانکہ
بچے کے ہمراہ جا رہا تھا مگر گھر کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور
بہت کچھ پریشان سا تھا۔ البتہ چھوٹا شیوراج سنگھ بہت خوش تھا "سہر جات
ہیں ۔۔۔ بنارس ۔۔۔ انگریجی پڑھن کو چچا لئے جات ہیں ۔۔۔
ریل میں بیٹھن کے ۔۔۔ کپڑا بنائے کے ۔۔۔" ہر ایک سے کہتا پھرتا
اور کودتا پھرتا۔ اور جو گفتگو اپنے باپ اور خاں صاحب میں اپنے متعلق سنتا
وہ ہر ایک سے بیان کرتا پھرتا۔ شیوراج کو لے کے خاں صاحب اور کنور
راج نگر سے روانہ ہو کر شہر پہنچے اور دو تین دن خاں صاحب کے یہاں قیام
کیا۔ شیوراج سنگھ کے کپڑے سلوائے اور خاں صاحب نے اپنا سامان ... ر ا
درست کیا اور بنارس پہنچ کر شیوراج سنگھ کو داخل کرا دیا۔ دوسر ... ے سفر
خاں صاحب تو چلے آئے مگر کنور کو اس خیال سے کہ اگر یک ... ے ہی د ن
دیا تو گھبرا جائے گا ہفتے بھر کے لئے چھوڑ دیا۔ ہفتے بھر کی ... دم بچے کو تنہا چھوڑ
دو ہفتے ٹھہرا اس کی طبیعت خود اپنے بچے کو چھوڑ ... بجائے کنور پر رست
بنہ رہ ہی دن کے اندر شیوراج سنگھ ہوسٹل ... رے کو نہ چاہتی تھی حالانکہ
جب کنور اسے چھوڑ کر چلنے لگا تو بالکل ... کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ
ہت شاق گزری۔ بورڈنگ کے ... دسال نہ ہوا۔ مگر کنور پر یہ جدائی
کو اس قدر گرویدہ بنا لیا کہ جب ... دل نے چند مہینوں میں ہی چھوٹے شیوراج
دسہرے کی چھٹی ... تو وہ گھر

نہ جانا چاہتا تھا۔ اور غالباً اسے یہ یاد بھی نہ رہا تھا کہ دسہرے پر اس کے
گاؤں میں کتنا زور دار میلا لگتا ہے۔ یا اگر یاد تھا تو اب اس کی نظر میں اس کی
کچھ حقیقت ہی نہ رہی تھی۔

(۳)

گھنٹے دنوں میں اور دن مہینوں اور برسوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے
اور کنور رگھراج سنگھ کے دونوں بیٹے بچے سے نوجوانوں میں تبدیل ہو گئے۔ بڑا
لڑکا جگراج سنگھ بڑا لمبا چوڑا مضبوط اور جفاکش کسان زمیندار بنا۔ وہ اس قدر
جفاکش اور محنتی تھا کہ بڑے بڑے مشہور مضبوط اور جفاکش چمار بھی اس کے
ساتھ کام کرنے میں جی چھوڑ جاتے تھے۔ اس کے مزدور اور ملازمین جن کے
ساتھ وہ کام کرتا تھا اس کا ساتھ نہ دے سکتے تھے اور پریشان سے ہو جاتے
تھے بھینسوں کا سب سے اونچی جٹ والا بھاری پنجابی ہل خود جوتتا۔ گھر بھر میں
سب سے زیادہ خوراک کھاتا اور موٹی سے موٹی اور ثقیل سے ثقیل غذا بہ آسانی
ہضم کر لیتا۔ صبح کو جاڑوں کے موسم میں سیر بھر مٹھا اور سیر بھر گنے کا رس ملا کر ناشتے
کے طور پر پی جاتا اور دوپہر کو نہایت آسانی سے سیر سوا سیر آٹے کی روٹی یا
پوری اور جو کچھ بھی اچھا برا سالن طیار ملتا کھا لیتا اور تیسرے پہر کو ورزش اور
کشتی سے فارغ ہو کر پورا ایک بھینس کا دودھ کچا ہی دوہ کر کھڑے کھڑے پی جاتا
اور پھر رات کو دوپہر کی برابر کھانا کھاتا۔ اس کا جسم فولاد کا بنا معلوم ہوتا تھا۔ سخت
سے سخت موسم کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ سال میں تقریباً دس مہینے زیر آسمان جنگل
میں رات گزارتا۔ اسے جاڑوں میں سردی اور گرمیوں میں لو دھوپ گویا محسوس
ہی نہ ہوتی تھی ہمیشہ ہر موسم میں ایک گاڑھے کی سفید بنڈی اور ناگ پوری موٹی
دھوتی اس کے جسم پر نظر آتی۔ گویا اسے پتہ ہی نہ چلتا کہ کدھر گرمی گئی اور جاڑا آیا
اور کہاں جاڑا پہنچا اور گرمی آئی۔ وہ ہر وقت متحرک نظر آتا حتیٰ کہ ہاتھی سے بھینسے
کام سے ہٹ جاتے مگر جگراج سنگھ ایسا معلوم ہوتا کہ ایک مشین ہے جو ہر وقت
حرکت میں ہے۔ گویا تھکنے اور آرام کرنے کے لئے بنا ہی نہیں ہے۔ ہر وقت
دھوتی چڑھائے کسی نہ کسی کام میں جٹا ہی رہتا۔ کام سے فرصت ہونے پر مہینے
میں دو چار مرتبہ بھاری لمبی نال والی بندوق لے کر جنگل کو نکل جاتا۔ وہ ایک مستقل
مزاج اور چالاک دست محنتی شکاری تھا۔ سخت سے سخت سردی کے موسم میں صبح
سورج نکلنے سے پیشتر جھیل کے کنارے پہنچ جاتا اور اوس سے بھیگی ہوئی فصل اور
گھاس میں چھپ کر نم اور سرد زمین میں فرلانگوں پیٹ اور سینے کے بل گھسٹ کر
تالابوں کے سر پر جا کر فیر کرتا اور سخت سے سخت گرمی میں ہرنوں کو زخمی کر کے ان کے
پیچھے شکاری کتوں کے ساتھ میلوں بھاگتا۔ وہ ایک نہایت اچھا نشانہ باز تھا۔

اور تیز سے تیز گھوڑے پر نہایت کامیاب سواری کرتا اور منہ زور سے منہ زور جانور کو نہایت آسانی سے قابو میں لے آتا۔ کبھی کبھی سور کے شکار میں اپنی چینی گھوڑی کو یک دم پانچ پانچ چھ چھ میل سرپٹ اڑاتا اور پھر نہایت استقلال اور جرأت کے ساتھ دو دو تین تین من وزن کے سور کو دس دس بارہ بارہ گز آگے برچھے کی نوک پر رکھ کر اچھال دیتا۔ اور پھر لطف یہ کہ اس قسم کے سخت کھیل میں اس کے ہاتھ پیر پھولنا تو درکنار سانس بھی نہ پھولتی اور نہ کبھی سرد سے سرد موسم میں سورج نکلنے سے پیشتر تالاب کے اندر سے تازیں نکال کر لانے کے بعد کپکپی پیدا ہوتی۔ اسکی آواز میں بلا کی کڑک تھی۔ لاٹھی اور کشتی کے فن کا ماہر ——— جرأت تندرستی اور طاقت کا مجسمہ ——— اردگرد اس کے مقابلے کا خوب صورت۔ تنومند۔ بہادر اور جفاکش نوجوان شاید ہی نظر آتا۔ گلراج سنگھ کی عمر اگرچہ پینسٹھ سے متجاوز کر چکی تھی۔ مگر اس کے قویٰ ویسے کے ویسے ہی بنے ہوئے تھے اور نہ وہ کھیتی وغیرہ کسی کام سے عاجز ہوا تھا۔ مگر جگراج سنگھ کی سرگرمیوں اور محنتوں نے باپ کو باپ جوان چچا کو بھی قریب قریب بے نیاز سا کر دیا تھا۔ کبھی کبھی حسب عادت معمولی کام اور زیادہ تر دیکھ بھال جگراج سنگھ تو کرتا ہی تھا۔ مگر بوڑھا کنور تو محض آرام سے چوپال میں لیٹا چلم سے دھوئیں ہی اڑاتا رہتا۔ وجہ یہ تھی کہ اس قدر محنتی اور جفاکش ہونے کے ساتھ ساتھ جگراج سنگھ منتظم باپ اور چچا دونوں سے زیادہ تھا۔ اس کے انتظام میں بوڑھے ٹھاکر کے کام اور آمدنی میں چار چاند لگ گئے۔

کنور نے اسے بالکل اپنے ہی اصولوں اور وضع پر پروان چڑھایا تھا۔ وہی خلاق انکساری، وہی آزادی و خودداری، وہی صداقت اور بے باکی۔ وہی بہادری اور وضع داری۔ سر پر باپ کی طرح بڑی بھاری پگڑی۔ اور بالکل ویسے ہی بڑے بڑے گل مچھے اٹھے ہوئے اور ہمیشہ پیتل کی شیام دالی موٹی لاٹھی ہاتھ میں۔ غرض جگراج سنگھ کیا تھا۔ عادات خصائل۔ وضع صورت شکل ہر اعتبار سے جگراج سنگھ کی عنفوان شباب کی تصویر تھا۔

شیوراج سنگھ نے یونیورسٹی میں نہایت اعلیٰ کامیابی حاصل کی۔ انٹرنس کا امتحان دیا اور بنارس یونیورسٹی میں سب طلبا سے زیادہ نمبر لایا اور اکثر مضامین میں ممتاز رہا۔ یونیورسٹی کی جانب سے وظیفہ ملا، اور انٹرمیجیٹ میں داخل ہوا۔ دو سال بعد یہ درجہ بھی اچھی کامیابی سے پاس کیا۔ سب سے بڑی چیز جو اسے قدرت نے نہایت فیاضی کے ساتھ عطا کی تھی۔ وہ اس کی تقریر تھی۔ وہ اپنے اسکول کے زمانے ہی میں تقریر کیا کرتا تھا اور جب انٹرنس میں تھا اسی وقت سے اسکول کے ماسٹر اس کی تقریر کے طرز اور مغز کے معترف تھے اور جب کالج میں انٹرمیجیٹ میں تھا تو یونیورسٹی کے بڑے سے بڑے مجمع میں بغیر ذرا بھی جھجکے ہوئے ایسی بے تکان تقریر کرتا کہ اچھے اچھوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ اور جب بی۔ اے میں تھا تو اہم سے اہم سیاسی۔ علمی۔ ادبی مسئلے پر بغیر پہلے سے تیار ہوئے فی البدیہہ تقریر کرتا۔ یونیورسٹی کی جانب سے ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور علمی اداروں میں تقریر کرنے گیا۔ انگریزی اردو وغیرہ مختلف زبانوں کا عالم تھا مگر خاص طور پر انگریزی میں ایسی مہارت تھی کہ تقریر کرتے وقت یہ معلوم ہوتا کہ کوئی اہل زبان بول رہا ہے۔ ملک کے ہر حصے سے چاندی کے کپ اور سونے کے تمغے انعام میں لایا۔ اس نے یونیورسٹی کے اکثر اعزازی عہدے ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیئے کہ یونیورسٹی میں مثال قائم کر دی۔ جس وقت کوئی باہر کا مہمان یونین یا یونیورسٹی کی جانب سے مدعو ہوتا تو اس کا حسن انتظام دیکھ کر اور اس کی تقریر سن کر دل میں یونیورسٹی کی زبردست عظمت لے کر جاتا۔ اس کے ساتھ ساتھ کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ شیوراج سنگھ خشک طبع واقع ہوا ہے۔ نہایت شائستہ اور خوش اخلاق۔ دعوتوں کے بعد کی تقریر میں کبھی کبھی بڑے زور کے جملے کہہ جاتا تھا کہ حاضرین ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے۔ غرض اس کی ظرافت بھی علم میں لپٹی ہوئی ہوتی تھی۔ یونیورسٹی کے نہایت ہر دلعزیز طلبا میں تھا۔ آج تک اس کی کسی قسم کی شکایت یونیورسٹی اسٹاف کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ وائس چانسلر سے لے کر چپراسی تک اس سے دلی محبت کرتے تھے اور ہر درجے کے طلبا اس کی دل سے عزت کرتے تھے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد یونیورسٹی نے پھر وظیفہ دیا۔ اور شیوراج سنگھ نے انگریزی میں ایم۔ اے میں داخلہ لیا۔ اسکول کی زندگی ختم کرتے ہی شیوراج سنگھ کی تعلیم کے جملہ اخراجات تو یونیورسٹی نے اپنے ذمے لے ہی لئے تھے۔ مگر جگراج سنگھ کو اس کی اطلاع نہ تھی۔ بیچارا سیدھا سادہ گانوؤں کا رہنے والا ٹھاکر بھلا کیا قیاس کر سکتا تھا کہ پڑھتے پڑھتے بھی کوئی طالب علم کچھ کما سکتا ہے۔ اس نے تو اپنے دوستوں سے یہی سنا تھا کہ انگریزی پڑھانے میں ہزار ہا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ وہ برابر شیوراج سنگھ کے بیان پر ڈگری دیتا رہا۔ اور ہر مہینے جتنی رقم شیوراج سنگھ منگواتا۔ وہ نہایت پابندی کے ساتھ بھیج دیتا۔ [illegible] ہر مہینے ایک معقول رقم مختلف ریڈیو اسٹیشنوں پر اپنے مضامین کے ذریعے پیدا کر لیتا اور یہ کل روپیہ اور گھر سے آئی ہوئی رقم مہینہ ختم ہونے میں تین چار دن باقی ہوتے پانی کی طرح بہا دیتا۔ اس کے خداداد دماغ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ یونیورسٹی کے اندر ٹھاٹ اور سامان میں بھی اچھے اچھے تعلقہ داروں اور مہاراجوں کے لڑکے اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس نے اپنے اثرات کو کام میں لا کر ہوسٹل میں وارڈن کے کمروں کے نیچے کی منزل میں دو تین چھوٹے بڑے کمرے لے لئے تھے جن کو ہمیشہ دلہن کی طرح سجائے رکھتا۔ اور دو تین نجی ملازم رکھتا۔ ....

اور چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ موٹر سائیکل۔ ریڈیو۔ ٹائپ رائٹر۔ بجلی کے پنکھے۔ بجلی کے
ہیٹر۔ بجلی کے لیمپ بھلا درجن بھر سے زیادہ تو مشینیں لگی ہوئی ہیں۔ موٹے موٹے
اونی قالین۔ بھاری بھرکم ڈرائنگ روم سٹ۔ اونچی شاندار مسہری۔ خوبصورت
وارنش دار کتابوں اور کپڑوں کی الماریاں۔ قدِ آدم آئینے۔ دیواروں پر ایک
ایک تصویر۔ پانچ پانچ چھ چھ روپیہ کی قیمت کی۔ دو دو فوٹو کیمرے۔ غرض کس کس
چیز کا ذکر کیا جائے۔ ان تین چھوٹے بڑے کمروں میں محض آرائش کا سامان ہی
ڈیڑھ دو ہزار روپے سے کم کا نہ تھا۔ اس کے پاس درجنوں سوٹ اور شیروانیاں
تھیں اور جوتے اور ٹوپیوں اور موزوں اور ٹائیوں وغیرہ لوازمات کی تو شمار ہی نہ
تھی۔ حالانکہ وہ اپنے علمی مشاغل میں زیادہ منہمک رہتا۔ مگر پھر بھی صبح و شام
ایک نئے لباس میں نظر آتا اور کہیں مہینوں کے بعد پھر اس لباس کی نوبت آتی
اور اس کا ہر کپڑا ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے کل سل کر آیا ہے۔ غرض جیسا قدرت نے
اس کا دماغ آراستہ کیا تھا ویسا ہی جسم بھی آراستہ رکھتا اور اس نمائش کا کل بار
تعلیم کے ضروری اور ناگزیر لوازمات اور تجربہ سمجھ کر کنور رگھراج سنگھ اپنے گاڑھے
پسینے کی کمائی سے پورے کرتا رہا۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ جس وقت شیوراج سنگھ نے ایم اے کی ڈگری
لے کر یونیورسٹی کو خیرباد کہا تو کنور رگھراج سنگھ کی مالی حیثیت میں کوئی نمایاں فرق
پیدا ہو گیا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اگر اس کے جگہ راج سنگھ جیسا منتظم اور محنتی بنیا
نہ ہوتا تو اس کی ہستی بگڑ جاتی۔ اس نے حساب لگایا تو وہ اتنے روپیہ سے بآسانی
ایک پورا گاؤں خرید سکتا تھا۔ مگر اس بیوپار سے تو وہ بالکل مطمئن تھا۔ کیونکہ وہ
جانتا تھا کہ جس سودے میں اس نے روپیہ لگایا ہے وہ سونے کی کان کا ہے البتہ
ایک ناقابلِ تلافی نقصان جس پر بوڑھے کنور کے سوا اور کسی کی نظریں نہ پڑتی تھیں
شیوراج سنگھ کی تندرستی کا تھا۔ اس وقت وہ ضعفِ ہضم۔ بے خوابی اور اختلاجِ
قلب کا شکار تھا۔ ہر گھنٹے میں دو مرتبہ دوا کھا لیتا اور اس قدر احتیاط کے باوجود
بمشکل دو وقت دلیہ۔ شوربہ اور توس وغیرہ ہضم کر سکتا اور خدا خدا کر کے تین چار
گھنٹے سو سکتا۔ اس کی دماغی پرورش۔ اس کی تندرستی اور جسم کی قربانی پر ہوئی تھی۔
اس کا دل اس قدر کمزور تھا کہ اگر اس کے قریب کھڑے ہو کر کوئی چھینک دیتا۔ یا
یکایک اس کو کوئی خاص خبر سنا دی جاتی کہ اگر اس کے قریب سے بے خبری میں کوئی
پرندہ اڑتا تو اس کو گھنٹوں اختلاج ہوتا۔ ڈاڑھی۔ مونچھ صفا چٹ۔ رنگت زرد۔ آواز
میں نسائیت۔ آنکھوں پر قریب و دور بین عینک۔ پتلے جسم پر سوٹ۔ ہاتھ میں
پتلی سی نازک چھڑی۔ جیب میں ریشمی رومال اور کلائی پر سنہری گھڑی اور چہرے کا یہ
عالم کہ باوجود ڈھیروں صابن۔ کریم۔ اور پوڈر کی بھرمار کے اتنی بھی رونق اور تازگی
نہ تھی جتنی ستر سال کے رگھراج سنگھ کے چہرے پر تھی۔ اور اپنے بڑے بھائی کی تو
ہر صورت میں ضد تھا بچپن میں دونوں بھائی ہم شبیہ تھے۔ مگر اب تو کوئی مشابہت
یا مناسبت ہی نہ تھی۔ جب کبھی تعلیم کے دوران میں تعطیل کے موقع پر شیوراج سنگھ گھر آیا
تو چینی کے برتن۔ دلیہ بسکٹ۔ اوولٹین اور مکھن وغیرہ کے بیسیوں قسم کے ڈبے اور
یونانی اور انگریزی ادویہ سے پُر ایک بڑا بکس۔ کتابوں کا ایک بڑا بھاری انبار
اور مطالعہ میں ڈوبا ہوا دماغ ساتھ لے کر آیا۔ اس کی چچی نے سب کام پہلی ہی مرتبہ
میں سیکھ لئے تھے۔ اس کی آمد پر مجسم خدمت بن جاتی۔ حالانکہ اس کا ایک ملازم بھی
ساتھ ہوتا۔ مگر شیوراج سنگھ کے متعلق ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتی۔ اس کی آمد پر
باغ باغ ہو جاتی۔ اس کی صحتِ جسمانی اور کم خوراک پر دل ہی دل میں کڑھتی۔ اور
تعطیل کے اختتام پر جب وہ رخصت ہوتا تو آب دیدہ ہو کر گلے لگاتی اور اس کے
جانے کے بعد دو دو وقت کھانا چھوڑ دیتی۔ اوّل تو تعطیلوں میں شیوراج سنگھ
آتا ہی کم تھا کیونکہ چھوٹی تعطیلیں ہندوستان کے مختلف حصوں میں سیر یا ڈپوٹیشن
چندہ یا تقریر کے سلسلے میں گزرتی تھیں۔ بڑی تعطیل کا کچھ حصہ البتہ گھر گزرتا تھا۔ ہولی
دیوالی اور دسہرے کی تو اسے خبر بھی نہ ہوتی تھی کہ کب اور کہاں گزر گیا۔ دورانِ تعلیم
ہی میں شیوراج سنگھ کو اس کے خاندان اور گاؤں والوں نے شیوراج بابو کہنا
شروع کر دیا تھا۔

(۴)

جس وقت ایم۔ اے کے امتحان میں شیوراج سنگھ نے زبردست کامیابی
حاصل کی تو تمام یونیورسٹی کے پروفیسران نے بالاتفاق رائے اس کو امپیریل سروس
کے امتحان مقابلہ میں شریک ہونے کی رائے دی۔ کنور رگھراج سنگھ اونچے
خواب دیکھنے لگے۔ انھیں اپنا بیٹا عروج و ارتقا کی آخری منزل پر نظر آنے لگا۔
جس وقت ایم۔ اے پاس کر کے شیوراج سنگھ بڑی تعطیل میں گھر آیا تو تمام علاقہ
میں خبر اڑ گئی کہ کنور رگھراج سنگھ کا لڑکا پولیس کپتان ہو گیا۔ ہر ایک کو رگھراج سنگھ
کچھ سے کچھ نظر آنے لگا۔ اس کی عزت اور شہرت کچھ سے کچھ ہو گئی۔ یہاں تک کہ
رام نگر والے تعلقہ دار رنبیر سنگھ اور بنگڑھ والے راجہ گھمنڈ سنگھ جیسی ہستیاں اس سے
اپنی اپنی لڑکی کا رشتہ کرنے کی آرزو کرنے لگے۔

تجربہ کار پروفیسروں کا اندازہ غلط نہ تھا۔ شیوراج سنگھ معمولی سی
محنت کر کے امپیریل پولیس سروس کے امتحانِ مقابلہ میں شریک ہوا۔ اور اتنے نمبر
لایا کہ پورے پانچ سو طلبا میں کسی کے نہ آئے تھے ——— اب تو شیوراج
سنگھ بھی اپنے کاندھوں پر ستارے اور جسم پر خاکی وردی محسوس کرنے لگا۔ اور
منزلِ مقصود بالکل قریب ——— انٹرویو کے لئے بلایا گیا۔ علاوہ شیوراج سنگھ

کے نو امیدوار اور تھے اور محض وہ انتخاب کرنا تھے۔ انتخاب کرنے والی مجلس کے دفتر کے سامنے گویا مشین کے ذریعے آہستہ آہستہ خون کھنچے ہوئے بوڑھے نوجوانوں کا ایک گروہ جمع تھا۔ یا دوسرے الفاظ میں بھوالی سناٹوریم کے ڈسچارج شدہ مریض سوٹ پہنے کھڑے ہوئے تھے۔ تاہم انتہائی کمزور ہونے کے باوجود ان سب میں شیوراج سنگھ جیسا بھی کوئی امیدوار نظر نہ آتا کیونکہ شیوراج سنگھ نے غور کیا کہ جیسیا وہ اپنے خاندان اور گاؤں والوں میں کھڑا ہو کر خود معلوم ہوتا ہے ویسے ہی یہ باقی نو اسے اپنے مقابلے میں معلوم ہو رہے ہیں کیونکہ ان سانس لیتے ہوئے مُردوں کی جماعت میں کسی پر زندہ ہونے کا گمان ہو سکتا تھا تو شیوراج سنگھ پر۔ بڑا افسوس کہ سفارشی گدھی عراقی کے لات رسد کرنے کے لئے ان نو میں کھڑی تھی۔ اور ہائی کورٹ کے جج صاحب کے صاحبزادہ بلند اقبال جن کے روئے مبارک پر خدا جھوٹ نہ بلوائے تو تین پاؤ قیمہ بھی بمشکل رفو کرنے کے لئے کافی ہوتا ہمارے شیوراج بابو سے سبقت لے گئے اور باوجود چار انچ چوڑائی اور چھ انچ لمبائی میں کم ہونے کے شیوراج سنگھ سے زیادہ لمبے چوڑے اور موزوں سپرنٹنڈنٹ پولیس ثابت ہوئے۔

دوسرا انتخاب چیف سکریٹری صاحب بہادر کے بلند اقبال کا ہوا۔ جن کے جسم پر ولایت کا سِلا ہوا سوٹ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بانس کی کھپچیوں پر سرج منڈھ دی ہے اور سینے اور جسم کے ناپ کا تو کوئی حساب ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اس کا اندازہ وہ لوگ خوب کر سکتے ہیں جنھوں نے کبوتر کے سینے کی شکل والا سینہ دیکھا ہو۔ کیونکہ اس کو فیتے سے ناپنا تو ناممکن تھا۔ البتہ پرکار سے معلوم ہو سکتا تھا کہ اقلیدس کی کون سی شکل ہے۔ اور سوالات کرتے وقت سوائے چند سیکنڈ "اُو" ——— "اُو" کرنے کے کوئی آواز ایسی پیدا نہ کر سکے جس پر کلام موضوع کا اطلاق ہو سکتا۔ مگر چونکہ یہ بھی بلند اقبال تھے۔ لہٰذا کچھ اپنے اور کچھ پدر بزرگوار کے اقبال سے انٹرویو میں ایسے نمبر لائے کہ شیوراج بابو کے علمی و اکتسابی معیار سے بڑھ گئے۔

شیوراج سنگھ کو اپنے دماغ پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کہاں تک مجھے اونچی جگہ نہ دیں گے۔ "ابھی ایک موقع پی۔ سی۔ ایس کے امتحان مقابلہ کا اور باقی ہے"۔ دل میں پوری امید لگائے بیٹھا تھا۔ وقتِ مقررہ پر پی۔ سی۔ ایس کا فارم بھیجا اور اس مرتبہ بنارس میں رہ کر محنت کرنے کی ٹھانی۔ یونیورسٹی حدود میں ایک چھوٹی سی کوٹھی کرایہ پر لی کنور شیوراج سنگھ مستقل مع اپنی بساوج کے اس کے ساتھ جا کر رہا گھر سے دو ملازم اور ایک شیر دار گائے اور سب جنس ساتھ تھی اور اس کی چچی نے سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس کا ناشتہ۔ کھانا ہر چیز خود نہایت احتیاط کے ساتھ وقت پر طیار کرتی اور اوقات مقررہ پر اس کی دوائیں اور غذائیں نہایت پابندی سے دیتی۔ شیوراج سنگھ اس قدر منہمک تھا کہ اس کی چچی کو اس کی دوا اور غذا۔ اکی مثل شیر خوار بچے کے خبر گیری کرنا پڑتی۔ رات کو شیوراج سنگھ جس وقت تک جاگتا رہتا خود بھی نہ سوتی اور جب کبھی اس کو بے خیالی ہو جاتی تو اس کی نیند قدرتی طور پر غائب ہو جاتی اور تمام رات اس کے سر میں تیل دباتے اور پیروں کے تلوے سہلاتے ہوئے یوں ہی آنکھوں میں گزار دیتی۔ شیوراج سنگھ نے اپنا ٹائم ٹیبل یوں رکھا تھا کہ دن رات میں سترہ اٹھارہ گھنٹے پڑھتا۔ چار پانچ گھنٹے سوتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کھانے پینے اور دیگر ضروریات کے لئے تھے۔ اسکی چچی رات کو تو اس کے ساتھ جاگتی رہتی اور دن میں کسی وقت موقع نکال کر گھڑی بھر کو آنکھ جھپکا لیتی۔ اس مرتبہ گھر کے یہ دونوں رکن ارادہ کر کے چلے تھے کہ اپنے بچے کو ڈپٹی کلکٹر کرا کر ہی آئیں گے۔ انھوں نے گھر کا سارا کام تج دیا تھا۔ انھیں یہ بھی خبر نہیں تھی کہ وہ ایک زراعت پیشہ آدمی ہیں اور یہ فصل کی تیاری کا خاص وقت ہے۔ اگر انھیں کوئی چیز نظر آتی بھی تھی تو اپنے بچے کے چہرے کی روز افزوں زردی شیوراج سنگھ کا چہرہ اب بجائے زرد کے خشک مٹیالا سا ہو گیا تھا۔ اس کے ناخن بجائے گلابی کے نیلے سے ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی اور اندر سے قدرے بے رونق ہو گئی تھیں۔ اس کے معدے اور آنتوں کا فعل بہت کافی خراب ہو گیا تھا۔ اس کو اپنی زندگی کی مشین چلانے کے لئے دواؤں کے پرزوں کی مدد لینی پڑتی تھی۔ دونوں، باپ اور چچی یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ چچی غریب عورت ذات منہ سے کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ دل ہی دل میں افسوس کرتی۔ اس کا بس نہ تھا کہ اپنی رگوں میں سے نکال کر اس کے جسم میں اپنا خون داخل کر دیتی۔ ہر وقت اسی خیال میں خاموش رہتی۔ جب شیوراج بھوک نہ ہونے کی وجہ سے کچھ نہ کھا سکتا تو خود بھی فاقہ کرتی اور دن رات اس کی تندرستی اور کامیابی کی دعائیں مانگتی رہتی۔ مگر بوڑھا کنور کبھی کبھی بڑبڑا [illegible] ہو ——— بابو سے کا ہو گھر چلیں ——— میرے پاس کس چیز کی کمی ہے ——— میں ڈپٹی کلکٹری سے بھر پایا ——— ایسو ہی سمجھیں تو کانون کا امتحان دے دیں ——— ابھے تو امتحان میں ڈیڑھ مہینہ ہے ——— مفت میں بیمار پڑ رہے ہے ——— مگر اسے بھی جس وقت ڈپٹی کلکٹری کا رنگین و شیریں خواب نظر آتا تو چپ ہو جاتا ع

میری دنیا لٹ رہی تھی اور میں خاموش تھا

خدا خدا کر کے امتحان کا وقت آیا ——— کنور اور اس کی بھاوج بنارس سے گاؤں گئے اور ہمارے بابو پورے دس پندرہ سیر کتابوں میں مکمل کر چالیس دن قبر میں چلّہ کھینچے ہوئے فقیر کی صورت امتحان دینے سدھارے۔ امتحان دیا اور پہلے کی

بھی زیادہ نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ بھلا اب ڈپٹی کلکٹر ہونے میں کیا شبہ رہا تھا۔ ایک مرتبہ پھر منزلِ مقصود قریب معلوم ہوئی ——— انٹرویو کا وقت آیا اور ایک مرتبہ پھر مجادلۂ حق و باطل ہوا اور پھر حق کو شکست اور باطل کو فتح نصیب ہوئی۔ اس مرتبہ میں تین انتخاب اور پندرہ امیدوار تھے۔ ان پندرہ میں ایک تو اسی انتخاب کرنے والی مجلس کے رکن کے بھتیجے بہادر تھے۔ جن کو نہ معلوم کتنی دشوار گزار گھاٹیاں اور پُرخار وادیاں پھاند کر تو یہاں تک لانے کی نوبت لائی گئی تھی۔ ان کا انتخاب اخلاقاً تو اخلاقاً کچھ قانوناً بھی فرض سا ہو گیا تھا۔ دوسری جگہ کے لئے ڈپٹی پوسٹ ماسٹر جنرل صاحب کے صاحبزادے کے انتخاب میں کس سنخرے کو شک ہو سکتا تھا۔ اور بھلا یہ تو بتائیے کہ کون سے انتخاب کرنے والے مجلس کے رکن کی مجال تھی کہ وائیسرائے صاحب بہادر کے دفتر کے ہیڈ کلرک صاحب کے داماد کے انتخاب میں چون وچرا کر سکے غرض انٹرویو ختم ہو گیا۔ اور شیوراج بابو کو پتہ چلا کہ بقول مرزا غالب یہاں نظر لگنے کا بھی خوف نہیں ہے اور سارے کا سارا عیش تجمل حسین خاں کے لئے ہی بنا ہے اس مرتبہ شیوراج سنگھ کو ڈپٹی کلکٹری نہ ملنے کا اتنا افسوس نہ ہوا جتنا کہ اس کا ہوا کہ دونوں منتخب شدہ خوش قسمت ہستیاں انٹر سبجیکٹ سے لے کر ایم۔ اے تک اس کی کلاس فیلو رہی ہیں اور وہ ان کی علمی لیاقت سے اچھی طرح واقف تھا۔ مگر ع

اسپ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالاں
طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خر مے بینم

پڑھتے ہوئے گھر تشریف لے آئے۔

(۵)

دو سال امپیریل اور پراونشل سروس کے کابوس میں مبتلا رہ کر اور تین ہزار روپیہ اور سب سے قیمتی چیز تندرستی برباد کر کے شیوراج بابو کی آنکھیں کھلیں تو خود کو پہچانا۔ اب اگر راج سنگھ کو ان کی آیندہ زندگی کے لئے کوئی نیا راستہ سوچنا تھا۔ باوجود کافی غور و خوض کے شیوراج سنگھ خود ابھی تک کوئی رائے قائم نہ کر سکا تھا کنور نے اپنے عقلمند اور تعلیم یافتہ مشیروں سے رائے طلب کی۔ اکثر نے وکالت کا امتحان پاس کرنے کی رائے دی۔ مگر ان کے پرانے محسن محمد شاہ خاں نے وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کی مخالفت کی اور نہایت زور دار الفاظ میں رائے دی کہ نائب تحصیلداری کا امتحان مقابلہ ابھی باقی ہے اس میں قسمت آزمائی کر لینا چاہئے۔ ورنہ پھر بدرجہ مجبوری وکالت تو ہے ہی غرض کثرت رائے سے یہی طے ہوا کہ شیوراج بابو ایک مرتبہ پھر نائب تحصیلداری کے لئے انتخاب کی کسوٹی پر آئیں۔ ہر چند کہ شیوراج سنگھ اس ملازمت کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اور اپنے باپ کے محترم دوست محمد شاہ خاں اور شرماجی کے پیہم اصرار پر انکار ہی کرتا رہا۔ مگر جب صورت حال پر ٹھنڈے دل سے غور کرتا تو باوجود ایک قابل مقرر ہونے کے اسے وکالت کا میدان نائب تحصیلداری سے بھی زیادہ تاریک نظر آتا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا ہفتہ عشرہ کتابیں لوٹ پوٹ کر کے امتحان میں جا بیٹھا ——— نتیجہ ظاہر تھا ——— ایک مرتبہ پھر اسی مردم شناس اور ایمان دار مجلس سے پالا پڑا۔ پچھلی دو مرتبہ میں اگر ہائی کورٹ کے ججوں وزیروں اور جنرلوں کے لڑکوں سے مقابلہ تھا تو اس مرتبہ ڈپٹی کلکٹروں سپرنٹنڈنٹوں اور ڈسٹرکٹ ججوں کے لڑکوں سے کشتی تھی۔ مگر پورے پندرہ انتخاب تھے جس سے ہمارے شیوراج بابو جیسے نااہل بھی اپنی آس لگائے ہوئے تھے۔

یہ تو امر مسلمہ ہے کہ جس وقت انسان اس کا اہل ہوتا ہے کہ اس کو حکامِ وقت کا چُناؤ کرنے کے معزز اور ذمہ دار عہدے پر فائز کیا جائے تو وہ اس مادی عہد میں غیر مادی خدا اور اس کے خوف کی حماقت سے تو بالاتر ہو چکا ہے۔ اب رہا پنچ کی لاج کا سوال سو وہ لاج کی دنیا اپنے ہی مخصوص دائرے میں قائم کر لیتا ہے۔ اور اس محدود دائرے کے اندر "تو مجھ کو اور میں تجھ کو" پر عمل پیرا ہوتا ہے چنانچہ اس مرتبہ بھی سب کے سب ارکین گھر سے ہی انتخاب کر کے چلے تھے اور اس وقت اندھے والی ریوڑیاں بٹ رہی ہیں کہ انگریز رکن نے شیوراج سنگھ کا پچھلا ریکارڈ اٹھایا۔ اور اس کے انتخاب پر بہت زور دیا۔ مگر درویش برجان درویش۔ نہ معلوم کس کی گردن کاٹ کر دوسرے ارکین کو بھی صاحب کی رائے سے متفق ہونا پڑا اور ہمارے شیوراج بابو نائب تحصیلدار ہو ہی گئے۔

دو سال بابو شیوراج سنگھ مختلف اضلاع میں نائب تحصیلدار رہے مگر دو برس کے بعد اپنے پڑوس کے ضلع میں تقرر ہوا۔ اس تحصیل میں کنور رگھوراج سنگھ کی زمینداری کا بھی ایک موضع تھا۔ اور اس کی باقی زمینداری کے مواضع اور وہ موضع جس میں کنور رہتا تھا سب کے سب اس تحصیل کی سرحد پر تھے۔ اور اس موضع سے جو بابو شیوراج سنگھ کی تحصیل میں تھا ہم سرحد تھے۔ حالانکہ ضلع علیحدہ علیحدہ ہے۔ بھلا رگھوراج سنگھ کی خوشی کا کیا ٹھکانا تھا ——— گھر سے اتنے قریب اور پھر اپنی زمینداری کے موضع پر بیٹا حاکم ہو کر آگیا۔"

جب شیوراج سنگھ مستقل طور پر تحصیل میں پہنچ کر رہنے لگا تو ایک روز کنور کو موج اٹھی۔ اپنے ان دوستوں کو جمع کیا جو ہمیشہ سے اس کے رنج و خوشی میں دل سے شریک رہے تھے، رام نگر سے پنڈت جگن ناتھ شرما۔ بائے پور سے ٹھاکر مان سنگھ۔ جاٹ نگر سے چودھری شیام سنگھ اور چودھری رنجیت سنگھ۔ دولت آباد

سے شیخ عطاء اللہ اور خان بور سے خان صاحب نور آور خاں اور سردار ولی خان سادات نگر سے سید علی مرزا وغیرہ اصحاب کو بلایا۔ اور شہر سے نہایت اصرار کے ساتھ لالہ رام پال اور خاں صاحب محمد شاہ کو بلایا۔ اور منشی الفت رائے کی رائے کے مطابق کنور نے بہت سے رتھ اور رہلے جمع کئے۔ اور ہاتھی نہایت شان کے ساتھ سجایا۔ ان سب لوگوں کی زمینداری اس تحصیل کے علاقہ میں تھوڑی بہت ہر ایک کی تھی۔ اور آئے دن وہاں کام پڑتے رہتے تھے۔ اس مرتبہ ہر ایک نے تھوڑے بہت کام کا بہانا نکالا۔ اور دراصل کام وام کسی کو کچھ نہ تھا بلکہ اپنے ایک چھو لے کو حکومت کی کرسی پر بیٹھے دیکھنا منظور تھا اور تحصیل کے اہلکاروں پر اپنا اثر قائم کرنا تھا۔ گاؤں کے لالہ پٹواری اپنی سبز پگڑی اور کشمیرے کا کوٹ پہن کر ہم رکاب ہوئے۔ کیونکہ شیوراج بابو ان کی گودوں کے کھلائے ہوئے تھے۔ اس لئے ان کا چہرہ فرطِ مسرت سے سرخ ہو رہا تھا۔ قریب تیسرے پہر کے

یہ قافلہ تحصیل پہنچا۔ اتفاق سے تحصیل دار صاحب پندرہ یوم کی چھٹی پر تھے اور تحصیل کے انچارج بابو شیوراج سنگھ تھے جو تحصیل کے اجلاس میں بیٹھے ہوئے مقدمات سن رہے تھے۔ جیسے ہی یہ قافلہ تحصیل کے صحن میں پہنچا۔ اجلاس کے اندر ہی سے شیوراج سنگھ نے سب کو پہچان لیا۔ فوراً کام بند کر کے باہر نکل آیا۔ سب بزرگوں کو نہایت ادب سے سلام کیا اور پھر سب کے قدم چومے تحصیل کے اندر یہ عروج دیکھ کر لالہ پٹواری پھولے نہ سماتے تھے۔ بھلا تحصیل دار قدم چوم رہے ہیں۔ لالہ نے نہایت شفقت سے شیوراج سنگھ پر ہاتھ پھیرا اور چمکار کر طبیعت پوچھی۔ کنور نے بھی غور کیا کہ آج تحصیل کے اندر دنیا ہی بدلی ہوئی ہے۔ اس تحصیل کے اندر رگھراج سنگھ کو کوئی نئی چیز نہ تھا۔ کم از کم سال میں دس بیس مرتبہ مقدمات اور مال گزاری کے سلسلے میں آنا پڑتا ہی تھا۔ اس مرتبہ عجیب عالم تھا۔ وہ تحصیل کے اہلکار اور مختار جن کی نظریں ہمیشہ کنور کی جیبوں پر رہتی تھیں اور باوجود ان کو خالی کر لینے کے بھی ان میں مٹھاس نہ پیدا ہوتی تھی۔ آج اس کو جھک جھک کر سلام کر رہے تھے۔ بابو شیوراج سنگھ ان کو کوارٹر لے گئے۔ جہاں پیچھے باڈیگیرے محرر جوڈیشل محرر مال۔ واصل باقی نویس۔ سیاہہ نویس۔ نقل نویس۔ رجسٹرار۔ قانون گو اور ناظر وغیرہ سب جمع ہو گئے۔ ہر ایک اپنی پچھلی ملاقات اور مراسم کا اعادہ کر کے کنور کو خوشامدانہ بے تکلفی سے اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔ خدا کی شان اور انقلاب زمانہ تو دیکھئے لالہ رام بخش پٹواری نائب رام کرسی پر دراز تھے۔ اور منشی رضا حسین رجسٹرار قانون گو۔ اور پنڈت رام پہنچتے رجسٹر جوڈیشل مودب کھڑے تھے۔ اور ان سب اہل کاروں کے سامنے لالہ تھے۔ پٹواری بار بار مہمانوں کی خاطر تواضع کے سلسلے میں شیوراج سنگھ کے ملازم صاحب بزرگانہ انداز میں ہدایتیں فرما رہے تھے۔ اور بار بار شیوراج سنگھ کو "بیٹا شیوراج" "لالا شیوراج" اور "شیو بابو" مخاطب کر کے اس کی تندرستی اور پرہیز کے متعلق اس کو ہدایتیں کر رہے تھے اور اس سیاسی گفتگو کے وقت کنکھیوں سے سب اہلکاروں کی جانب دیکھتے جاتے تھے۔

شیوراج سنگھ ہزار تعلیم یافتہ سہی پھر بھی نجیب الطرفین ٹھاکر اور زمیندار ٹھاکر بچہ تھا اور ایک آن بان والے باپ کا بیٹا ———— گھر میں جو آنکھ کھولی تھی تو دولت ثمو اور شان ہی جو دیکھی تھی۔ یہ ساز و سامان اور اپنے شان دار باپ کو علاقہ بھر کے مشہور رئیس و عمائدین کے ساتھ اور پھر اپنا ذاتی ہاتھی اپنی تحصیل کے اندر جھومتا دیکھا تو اس کے دل میں بھی نمود و شیخی کی لہر اٹھی۔ اور تو کوئی موقع تھا نہیں لہذا یہ طے کیا کہ آیندہ ہفتے میں نائب تحصیل دار صاحب وصول تقاوی کے سلسلے میں علاقہ جائیں گے۔ اور سیدھے اپنی زمینداری کے موضع میں جا دھمکے۔ تمام گاؤں خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا جس وقت شیوراج سنگھ کی سواری پہنچی تو گھروں سے عورتیں اپنے تحصیل دار زمیندار کا تماشا دیکھنے نکل آئیں اور رات کو گھر گھر ڈھول بجا کر گانا گایا۔ گویا ہر گھر میں تقریب منائی۔ دوسرے دن کنور نے اپنی تو ید چاروں طرف بھیجی کثیر الاحباب آدمی۔ ہر حیثیت کے بے شمار ہندو مسلمان دوست نہایت وسیع پیمانے پر دعوت کا انتظام کیا اور علاقہ بھر کے کاشتکار اور زمیندار دوستوں کی یکساں پیمانے پر دعوت کی مسلمانوں کے کھانے کا علیحدہ اور ہندوؤں کے کھانے کا علیحدہ انتظام کیا اور دو تین دن خوب ناچ رنگ اور دعوتوں کا بازار گرم رہا۔ بیسیوں بھاٹ۔ بھکاری اور نقال طوائفیں جمع ہو گئیں اور خوب انعام و اکرام پا کر گئے۔ ہر سال تحصیلدار کی آمد پر گاؤں کا مکھیا۔ مقدم بطور تہنیت اور پٹیل نذر پیش کیا کرتے تھے۔ یہ اس سال اچھے تحصیلدار صاحب تشریف لائے جو اپنے ساتھ ان سب کے لئے جوڑے اور پگڑیاں لائے۔ غرض قریب ہفتہ بھر خوب جشن رہا۔ اور کنور نے خوب دل کھول کر روپیہ خرچ کیا اور اپنے کام والوں کو معافی دوامی زمین دی۔ اس وقت اس کی خوشی کا وہی شخص اندازہ کر سکتا تھا جس کو کبھی اس قسم کے موقعے قسمت نے دیئے ہوں۔ دراصل اس کی عزت اور شہرت پر بیٹے کی ملازمت سونے پر سہاگہ ثابت ہو رہی تھی۔ تمام علاقے میں مشہور ہو گیا کہ رگھراج سنگھ کا لڑکا خاص اپنی تحصیل میں تحصیل دار ہو کر آ گیا۔ ہر طرف اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ اول تو وہ خود ویسے ہی کس سے کم تھا اور پھر بیٹا تحصیلدار۔ تنخواہ بڑی نہ سہی۔ عزت کتنی بڑی ہے۔ اس کی آبرو میں چار چاند لگ گئے۔

خان صاحب محمد شاہ خان جو ہفتہ بھر جلسے اور جشن کے منتظم اعلیٰ رہے تھے شیوراج سنگھ کے رخصت ہونے کے بعد کنور کے مکان کے وسیع صحن میں مونڈھے پر بیٹھے پان چبا رہے تھے اور اپنے جانے کی تجویز کنور کے سامنے پیش کر چکے تھے،

کنور اور خصوصاً اس کا بڑا بیٹا جگراج سنگھ ان کو اصرار سے روک رہا تھا۔

"چاچا جی ——— بس ایک دن جیڑا یا اور ایک دن ہرن کھیلت جائے بس دو دن کی تو ہم کہت ہیں"۔ جگراج سنگھ نے ذرا ناز کے ساتھ ٹھنک ٹھنک کر کہا "ہے جنگل دو مہینا سے ناہے بچو ہے"۔ خاں صاحب نے پان کی پیک منہ میں روک کر کچھ اشاروں سے اور کچھ اوپر کو منہ اٹھا کر مفلوج سی زبان میں مقدمہ کی تاریخ کا عذر کیا اور ایک لمبا کش لے کر نتھنوں سے دھواں نکالا۔

اتنے میں کنور نے بات کاٹ کر کہا "بھائی محمد شاہ کھاں آج ہماری بات سانچی ہو گئی جس گھڑی شیوراج نوں لے کر بنارس گئے تھے تو ہم نے کہی تھی کہ جے تمھارا نام اچھالینگو۔ سو آج میرو نام جا لڑکا نے اچھال دوؤ۔ میری سات پیڑھی چمک گئی۔ میری سب محنت وصول ہو گئی"۔ یہ کہتے ہوئے بوڑھے کنور کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ منہ کے اندر سے ٹوٹے پھوٹے بے آب دانت چمک گئے۔

"اجی ابھی کیا ہے۔ اللہ اس کی عمر میں برکت دے۔ ابھی اس کو بہت اونچی منزل پر پہنچنا ہے۔ تم کسی دن اس کو ڈپٹی کلکٹری تو ڈپٹی کلکٹری کلکٹری کی کرسی پر دیکھو گے ——— انشا اللہ"۔ خاں صاحب نے پیک تھوک کر گویا منہ کے مشکیزے کو خالی کر کے کہا اور فرنچ کٹ کھچڑی داڑھی پر دو مرتبہ ہاتھ پھیرا۔

(۶)

جاڑوں کا موسم آیا ——— جنٹ صاحب دورے کو نکلے ———

جس طرح تحصیلدار صاحب بہادر کلکٹر صاحب بہادر کے پیچھے اس طرح لگے رہتے ہیں جیسے شیر کے پیچھے سیا ہو۔ بالکل اسی طرح نائب تحصیلدار صاحب بہادر جنٹ صاحب بہادر کی دم بنے رہتے ہیں۔ غرض ان دونوں بہادروں کا دورہ ان دونوں بہادروں کے ساتھ قدرتی طور پر شروع ہوتا اور ختم ہوتا ہے۔ اور جب تک یہ دونوں صاحب لوگ ان کی تحصیل سے باہر نہیں ہو جاتے۔ یہ لوگ صدر واپس نہیں آسکتے کیونکہ ان دونوں کی ذمہ داری اس وقت تحصیلداری اور نائب تحصیلداری سے ہٹ کر مہتمم باورچی خانہ اور مہتمم سواری کی ہو جاتی ہے۔ جنٹ صاحب کے دورے کا تیسرا مقام حسن اتفاق سے کنور کی زمینداری کے اسی موضع میں پڑا جس میں کنور نے شیوراج سنگھ کی آمد پر جشن منایا تھا۔ ابھی رگھراج سنگھ کی تمنا پوری نہ ہوئی تھی پچھلی مرتبہ تو بیٹے کی تحصیلداری کے زور سے علاقے میں دھاک بٹھانا منظور تھی۔ اور اس مرتبہ سرکاری حکام جنٹ اور کلکٹر پر اثر اور رسوخ قائم کرنا تھا۔ لہٰذا شیوراج سنگھ نے جنٹ صاحب کے سررشتہ دار کے ذریعے ظاہر بھی کرا دیا کہ "حضور کا تیسرا مقام نائب تحصیلدار صاحب کی زمینداری کے خاص موضع میں ہے"۔ رگھراج سنگھ نے دوبارہ نہایت اعلیٰ پیمانے پر جشن کا انتظام کیا اور شیوراج سنگھ جنٹ صاحب کے پہنچنے سے ایک دن پیشتر اجازت لے کر پہنچ گیا۔ یہاں ایک دن پیشتر سے کنور اور اس کے معزز دوست جمع ہو کر مصروف کار تھے۔ بستی کے قریب ہی اپنے باغ میں پڑاؤ کا انتظام کیا۔ راستے میں میلوں تک جھنڈیاں اور جگہ جگہ دروازے نصب کئے اور باغ کو نوشل دلھن کے سجایا۔ باغ کے پھاٹک پر ایک نہایت بلند اور شاندار دروازہ نصب کیا اور اس پر سنہرے حروف میں "ویلکم" لگایا اور دروازے سے خاص صاحب بہادر کے خیمے تک فرش کیا۔ خیمے پر سیکڑوں گلدستے اور پھولوں کے ہار لگائے۔ ہر قسم کی جنس سیکڑوں انڈے مرغیاں۔ منوں گھی دودھ۔ بکرے۔ جنوں بکرے۔ وسکی و برانڈی کی بوتلیں اور انگریزی اجناس کے بیکٹ اور ٹین اور خشک و تر میوے کی ٹوکریاں جمع کر دیں۔ اور پھر تیسرے پہر کے قریب ایک دعوتی درخواست صاحب بہادر کی خدمت میں اپنے نجی ملازم کے ہاتھ بھیجی اور اس میں ظاہر کیا کہ "چونکہ یہ مقام میری ذاتی زمینداری کے موضع میں ہے۔ لہٰذا حضور والا دوران قیام میں میرے مہمان رہیں گے۔ ہندوستانی تہذیب و تمدن کی رو سے مجھے ایک ماتحت ہوتے ہوئے حضور کی مہمان داری کا اس موضع میں پورا پورا حق حاصل ہے"۔ اس کے بعد سب کی رائے یہ ہوئی کہ جیوں ہی صاحب بہادر موٹر سے اتریں شیوراج سنگھ اپنے اہل خاندان و دیگر عمائدین سے ان کا تعارف کرائیں۔

مشہور پرانی بات ہے کہ ہندوستانی آئی سی ایس بھی اپنے ہندوستانی ہونے کو دل ہی دل میں رو رو کر گالیاں دیتا ہے۔ اور اپنے گھٹنوں سے اونچی دھوتی یا ٹخنوں سے اونچا پائجامہ پہننے والے نااہل باپ کو کوسنے اور خواہ اتنا کالا ہو کہ باوجود تین چار برس لندن میں رہنے کے بھی اس پر یہ شبہ ہوتا ہو کہ واپسی میں بحر اسود میں غوطہ لگا کر آیا ہے۔ مگر پھر بھی ہندوستان آتے ہی اپنے انرجی النسل ہونے کا اعلان کرنے کے بعد صابن۔ کریم اور سیفٹی ریزر کی متواتر رگڑ سے چہرے کی اوپر والی ابھری کھال اڑا کر چھپکلی کے پیٹ کے رنگ والا اینگلو انڈین تو بن ہی جاتا ہے اور اگر کہیں حسن اتفاق سے ذرا رنگت کھلتی سی ہوئی تو تو پھر وہ پاپائے روم کا خلیفہ ہونے کا دعویٰ کر دیتا ہے۔ بھلا ہمارے جنٹ صاحب بہادر تو جن کے جدامجد بزرگوار غدر ۱۸۵۷ء کی طوائف الملوکی کے کسی نامعلوم ہندوستانی اور انگریزی اختلاط کا اتفاقی اور غیر اختیاری نتیجہ تھے۔ اور اس کے بعد سے اب تک اپنے اسی فرقے میں مسلسل باہمی ازدواج کی ارتقائی مدد سے اس وقت ساتویں پشت میں جا کر اگر ڈارون کی تھیوری کے مطابق حساب لگایا جاتا تو ترقی کرتے کرتے پورے انگریز سے بھی بہت اوپر نکل گئے تھے اور غدر والی ہندوستانیت

کی بدبو تو بالکل ہی سٹ گئی تھی۔ رنگت میں البتہ ہندوستان کی نامعقول آب و ہوا کی وجہ سے ذرا سا فرق رہ گیا تھا۔ ورنہ صاحب بہادر تو صاحب بہادر، اُن کی پچھلی تین چار پشتوں کو بھی کوئی اینگلو انڈین نہ کہہ سکتا تھا۔ غرض جنٹ صاحب بہادر ان بیرونی اور اندرونی خصوصیات کے جو نامعلوم طریقے پر متضاد خونوں کی آمیزش سے (جو ہمیشہ سماج کی مقرر کردہ آہنی اور بھدّی زنجیروں کو توڑ کر ہوتی ہے) فطرتاً پیدا ہو جاتی ہیں پورے پورے حامل تھے۔ دوسرے روز صاحب بہادر وقت معیّنہ پر پہنچے شیوراج بابو اپنے اہلِ خاندان اور دیگر عمائدین کے ساتھ پیشوائی کے لئے موٹر تک پہنچے اور جلدی سے موٹر کی کھڑکی کھول کر اٹینشن کو ہو گئے۔ صاحب بہادر کا انداز اس قدر خشک تھا اور خود شیوراج سنگھ کے سلام کا جواب اس قدر سرد مہری سے دیا کہ اس کی ہمّت ان لوگوں سے تعارف کرانے کی نہ ہوئی۔ ان سب نے ہندوستانی طریقے سے مؤدبانہ سلام کیا۔ صاحب بہادر نے ایک سرسری نگاہ اس مجمع پر ڈالی اور سب کے سلاموں کا جواب یکدم دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھا کر ایک ہی مرتبہ میں "سالام" کہہ کر دیدیا۔ اور اس کے بعد دانتوں میں سگار چباتے ہی چباتے منہ سے دھوئیں کا ایک بخارا نکال کر فرمایا: "ول نائب ٹیسلدار تمارا بوت بوت شکریا ——— اے۔ اے ——— ہم کو بوت افسوس ہے ہم ٹمارا اڈراوڈٹ منظور نہیں کرسکٹا! ——— اے۔ اے۔ کہلاف کانون بات ہوگا ——— ہو ہو ہو" کر کے ایک سوکھا قہقہہ اوپر کو منہ اٹھا کر لگایا۔ اور ساتھ ہی ایک پریشانی کا اظہار کیا کہ میم صاحب کا "پپی" (کتا) راستے میں بھٹک گیا ہے۔ وہ تلاش ہونا چاہئیے۔ یہ حکم دے کر صاحب بہادر خیمے میں چلے گئے ——— تمام لشکر میں ایک شور مچ گیا ——— یک دم ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر میم صاحب کا پپی۔ میم صاحب کا کتا، تھا ——— چپراسی۔ قانون گو۔ محرر مال سب کے سب اسی انتظام میں مصروف ہو گئے۔ پہاڑ رخ کی سرد اور مرطوب ہوا چل رہی تھی۔ تمام آسمان پر نہایت گہرا بادل چھایا ہوا تھا اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ اس سخت موسم میں تقریباً ایک درجن چپراسی اور پٹواری۔ قانون گو اور محرّر مال۔ اور درجن ہی بھر شیوراج سنگھ کے نجی ملازمین اور کاشتکاران تھنیت اور مقدم ایک بدحواسی کے عالم میں جس کا جدھر کو منہ اٹھا میم صاحب کے لعل بے بہا کی تلاش میں چاروں طرف دوڑ گئے تھے اور جنگل اور گاؤں میں اس کتے کا حلیہ بیان کر کر کے پوچھتے پھرتے تھے اور جس گاؤں میں پہنچتے تھے اس گاؤں کے مکھیا اور چوکیدار کو اسی اہم ڈیوٹی پر متعین کرتے چلتے تھے۔

صاحب بہادر کل والے سامان میں سے دو تین مرغیاں مرڈ کر۔ اور دو تین درجن انڈے۔ پھوڑ کر ایک وسکی کی بوتل اور ایک پھلوں کی ٹوکری خالی کر چکے تھے۔ کام کی زیادتی اور انتظام کی پریشانی میں شیوراج سنگھ کو یاد بھی نہ تھا کہ صبح سے اس وقت تک اس کے پیٹ میں ایک پیالی چائے کے سوا۔ اور کوئی چیز نہیں پہنچی ہے۔ مگر ایک ہستی ایسی بھی تھی جسے یاد تھا اور وہ موقع کی منتظر تھی۔ رگھراج سنگھ اس کے قریب آیا اور کہا "بابو چلو، بھوجن پالو۔ ——— سویرا سے سانج ہو ان آئی منہ میں کھیل اڑ کے نائے گئی ہے"۔ شیوراج سنگھ جیسے چونک سا پڑا اور ایک انگڑائی لے کر کنور کے پیچھے پیچھے بستی کی جانب چلنے لگا۔ اس نے چند قدم بڑھائے ہی تھے کہ ایک چپراسی صاحب کے خیمے کی جانب سے دوڑتا ہوا آیا اور گھبرا کر بولا "نائب صاحب کو صاحب بہادر سلام دے رہے ہیں"۔

شیوراج سنگھ نے نہایت سراسیمگی کی حالت میں پلٹ کر خیمے کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ اور انگلیوں سے بالوں کو درست کر کے منہ پر رومال پھیرا۔ ساتھ ہی اور بہت سے آدمی جن میں اس کے باپ اور بھائی اور ان کے دوست وغیرہ سب ہی تھے اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ مگر یہ دیکھ کر کہ صاحب بہادر خود خیمے سے باہر نکلے چلے آ رہے ہیں اور لوگ تو ٹھہر گئے۔ اور شیوراج بابو نے منہ سے سگریٹ علٰحدہ پھینک کر زور سے دوڑنا شروع کر دیا۔ اور صاحب کے سامنے پہنچ کر سلام کیا۔ صاحب بہادر نشے میں دُھت تھے۔ اور شیوراج ابھی چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا کہ فرمایا۔

"ول نائب ٹیسلدار ٹم پپی لایا؟"

"سرکار! قانون گو، پٹواری، محرر مال، چپراسی اور بہت سے میرے ملازم گئے ہیں۔ کچھ واپس آ گئے۔ اور کچھ ابھی نہیں آئے ہیں"۔

"ہم بولٹا ہے ٹم پپی لایا ——— ہم ٹم کو صبح بولا ——— (گھڑی دیکھ کر) اب پانچ بجٹا ہے۔ اب تک نہیں لایا ——— سسٹ نکما ہندوستانی۔ کالا آدمی"۔

"حضور بہت سے آدمی گئے ہیں ——— کچھ آ گئے اور کچھ ابھی نہیں آئے ہیں"۔ شیوراج بابو درست ہو کر بولے۔

——— "ڈیم ——— فول ——— گدھا کا مافک ——— اُلّو کا پٹھا ——— ٹم کو کون نائب ٹیسلدار بنایا ——— ٹم یہاں کیا کرٹا رہا ——— ایک پپی نہیں لایا" ———

س سا سرکار! ——— ہو ہو حضور ——— آ آ آ ہم

——— چپ رہو ——— نیٹو ——— سور کا بچہ ——— انتظام بوت کھراب ہے ——— تمھارے کیریکٹر رول میں منڈھری

شیوراج سنگھ جوڑے ہوئے ہاتھ ذرا آگے بڑھا کر بمشکل کانپتے ہوئے بولا ——— ہو ہو حضور آ آ آ بھی جاتا ہوں۔

"ہم پوچھنا مانگتا ہے تم اب ٹک یہاں کیا کرتا رہا ——— اچھا جلدی جاؤ ——— بڑبڑاتے ہوئے کیمپ کے اندر چلے گئے ———

شیوراج سنگھ کی خون کی گرمی تو کالج ہی میں ٹھنڈی پڑ چکی تھی ——— پھر دو ڈھائی سال کی نائب تحصیل داری نے اس پر مزید برف باری کر دی تھی ——— این ہم بر علم۔ بھلا یہ تو روزمرہ کی باتیں تھیں۔

بوڑھا کنور اپنے کاشتکاروں اور ہم چشموں کے غول میں کھڑا یہ سب ماجرا دیکھ رہا تھا ——— اپنے سات پشت کے وقار اور عزت کو اس طرح پامال ہوتے دیکھ کر اس کے جھرّی دار چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ گئی تھی اور اس کی بے رونق آنکھیں اُبل کر باہر نکلی سی پڑتی تھیں۔ برابر ہی اس کے پرانے دوست محمد شاہ خاں کھڑے تھے۔ ان کی جانب قریب ایک منٹ دیکھتا رہا اور پھر ذرا بے اختیار سا ہو کر بولا۔

"ہائے کھاں صاب ——— بڑھاپا میں جے گت بنی ——— ہائے ہمیں موت مٹ گئی تھی ——— گنے کی ناک کٹ گئی ——— سات پیڑھی کو نام کنڈا میں ڈوب گئو ——— شیوراج نے تو نیا ڈبوئے دئی" ———

——— ادھر سید علی مرزا کھڑے تھے ——— غصّے سے بے اختیار ہو کر بولے ——— استغفراللہ ——— اچھی نوکری ہوئی ——— اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی ——— اور پھر ٹھاکر کی جانب دیکھ کر اپنے کف نکلتے ہوئے ہونٹوں سے فرمایا ——— "اور ٹھاکر جی ——— ابھی کیا دیکھتے ہو۔ ابھی تو پہلی منزل ہے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا" ———

نوجوان جگراج سنگھ کے سینے میں غیرت و حمیت کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خون کبوتر ہو رہی تھیں ——— آج اسے دنیا تاریک معلوم ہو رہی تھی ——— اس کی مٹھیاں بندھی ہوئی تھیں اور اس کے آہنی اعصاب میں غصّے کے مارے ارتعاش کی کیفیت تھی ——— مگر اس وقت کسی کی آنکھ میں وہ کیفیت جو وفادار کتّے کی آنکھ میں مالک کی ٹھوکر کھانے کے بعد پیدا ہوتی ہے تھی تو وہ شیوراج سنگھ تھا ——— اس کے چہرے پر گھبراہٹ ضرور تھی۔ مگر پشیمانی پہ چین نام کو نہ تھی۔ اس وقت وہ احساس فرض کا ایک مجسمہ بنا ہوا تھا۔ اسے اس بھی نہ ہوا کہ ابھی ابھی جو الفاظ ہوا میں گونج رہے تھے۔ انھوں نے اس کے کانوں پر پگھلے ہوئے سیسے کا عمل کیا ہے۔ اس وقت اس کے چہرے پر ——— غفلت کی ——— اس کے مرتعش ہاتھ پیروں پر ایک کیفیت ——— کی ——— اس کے اعصاب پر ایک بجلی کارفرما تھی تعمیل فرض کی

——— اس نے غیرمعمولی پھرتی سے پلٹ کر چاروں طرف دیکھا اور جلدی سے جھپٹ کر اپنی گھوڑی پر جو ایک درخت کے نیچے کسی طیار کھڑی تھی۔ اس کی زین سے بارش کا بھیگا ہوا کمبل علیحدہ پھینک کر سوار ہو گیا اور سائیس کو برساتی لانے کا اشارہ کیا ——— گھوڑی پر چڑھتے ہی چڑھتے برساتی پہنی۔ سائیس نے زمین سے کمبل اٹھا کر کندھے پر رکھا اور جس جانب گھوڑی کا منہ تھا اسی جانب کو ہانک دی۔ شام ہو چکی تھی ——— مغرب میں مہیب سیاہ بادل پر شفق ؎ تماشا ہے تہ آتش دھواں رہنے کا سماں پیدا کر رہی تھی ——— ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی پر منتظم چڑیاں غول کے غول بنا کر الوداعی سی آوازوں میں چہچہاتی ہوئی اپنے آشیانوں کی جانب مراجعت کر رہی تھیں۔ بھوکے چمگادڑ نہایت اطمینان سے تازہ دم اضطراب کی سی پرواز کرتے ہوئے امرودوں کے باغوں کی جانب جا رہے تھے ——— قازوں کی ایک لمبی قطار دل میں امنگ سی پیدا کرنے والی آواز میں قیں قیں کر کے تالاب کے اوپر چکر کاٹ کر پر تول رہی تھی۔ بار بار بجلی چمک کر زبردست کڑک ہوتی تھی جس کی آواز پر باغوں کے اندر گھنے درختوں میں سکون سے بیٹھے ہوئے مور فضا کو سر پر اٹھا لیتے تھے جنگل پر شام اور ابر دونوں کی ادائیں مل کر ایک عجیب بھیانک سماں پیش کر رہی تھیں۔ پرانے آم کے باغوں میں درختوں کے نیچے خودرو جھاڑیاں ہوا سے ہل کر ایسی معلوم ہو رہی تھیں کہ جیسے بھوتوں کے غول کے غول نکلے چلے آ رہے ہیں دور بن سے گیدڑوں کی ہو ہو سنائی دے رہی تھی۔ بوڑھا رگھراج سنگھ نیچے کو سر ڈالے اپنے دوستوں اور کاشتکاروں کے گروہ میں بستی میں داخل ہوتے ہوئے مویشیوں کے گلّے سے بچتا ہوا اپنی جائے قیام کو جا رہا تھا۔ اس جماعت پر وہی کیفیت اور سکوت طاری تھا جو دفن کرنے کے بعد قبرستان سے واپس آتے ہوئے مجمع پر ہوتا ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ مائل بہ سکوت تھا۔ شیوراج سنگھ کی گھوڑی پر سوار شاہ گام چلتے ہوئے۔ اس طرح ہل رہا تھا جیسے کبھی کبھی نفی الغت رائے کے بید کے خوف سے آمد نامے پر ہلا کرتا تھا اور اس خواجگی اور بندگی کی اہم گتھی کو سلجھاتا ہوا ایک بغیر منزل مقصود کا سفر بے سنگ و میل کرتا آہستہ آہستہ سنسان تاریکی میں غائب ہوتا ہوا اپنے سات پشت کا نام روشن کر رہا تھا ◆

چودھری محمد ابوالفضل صدیقی

مجبُوری

جگمگ جگمگ ساری دکانیں جھلمل جھلمل ساماں
چنچل نٹ کھٹ گاہک خنداں، خنداں، رقصاں رقصاں

ایک دکاں کے گوشے میں یوں زلفیں ہیں آوارہ
جیسے سپیرا اک چورستے پر کھولے ہو پٹارہ

باتیں کرنے میں نیلی رگ پیشانی کی پھڑکے
جوبن یوں اُبھرے اور ڈُوبے قلبِ دو عالم دھڑکے

ہنسنے میں گالوں کے کنوئیں ہوتے جاتے ہیں گہرے
تیور کے اندر سپاہی دیتے ہوں جیسے پہرے

بیگانوں کی تند نگاہیں بھولے پن سے روکے
گردن کو نیہوڑا کر اُن کو اس جرأت پر ٹوکے

کھینچے آنچل جوبن پر ساری کی کور مروڑے
جیسے کبوتر بلّی کے ڈر سے پر اپنے سکوڑے

ہونٹ سمندر نشّے کے آنکھیں مستی کے ڈیرے
بالوں میں پُر نور دھندلکے رخساروں میں سویرے

خطِ جبیں کی پہلی رَو میں ننھّے تِل کی چھاؤں
جیسے اک ندّی کے کنارے چھوٹا سا اک گاؤں

زمزمِ تبسم کی موجوں میں مشک اور عنبر مہکے
خال و خد سے شعلے لپکیں جیسے انگیٹھی دہکے

"بے اندھیر گرانی" گاہک حیرت سے مُنہ کھولے
سوداگر کی بات نہ پلٹے اس کی ناؤ ڈولے

من بھاتی چیزوں کو دیکھے، تھامے، سوچے، چھوڑے
چمڑے کے بٹوے کو ہاتھوں سے رہ رہ کے مروڑے

میں رستے پر سنگِ مجسّم کیسے پاؤں بڑھاؤں
بڑھ کے دکاں کے اندر پہنچوں، حُسن کے کام آجاؤں

تاجر کی ہٹ توڑ کے رکھ دوں لیکن دنیا داری!
ان دیکھی، انجانی صورت ہوں، خاموش پجاری۔

مخمور جالندھری

عکس کی حرکت

کچھ رنگ کا نور، کچھ آوازیں، کچھ سائے، —— دھندلکے کا پردا،
—— اور مجھ کو جھجک سے ہے، کیسے کہوں، سننے والے جھلّائیں گے،
اک مورت ہے،
میٹھی، من موہنی صورت ہے،
انمول بدن اک چندرکرن —— لہراتی ہے،
بہتی ندّی —— بل کھاتی ہے،
اک پل کو دکھائی دیتی ہے،
پھر آنکھ جھپکتے میں اوجھل ہو جاتی ہے،
حیران ہوں کیسا جادو ہے،
یا میری آنکھ میں آنسو ہے،
آنسو ہے دھندلکے کا پردا ——
کچھ سائے ہیں، کچھ آوازیں، کچھ رنگ کا نور بھی لرزاں ہے،
اور مجھ کو جھجک ہے کیسے کہوں، سننے والے جھلّائیں گے،

کیا دھیان آیا، کیا دھیان آیا،
کیوں آنکھ جھکی، دل شرمایا؟
تیری پوجا کے مندر کی مورت ٹوٹی، جُگ بیت چکے،
اب ہارنے والے ہار چکے اور جیتنے والے جیت چکے،
کیا سُوکھی، پھیکی کہانی میں اُس رنگ سے موہنی آ جاتی! ——
وہ رنگ کا نور، وہ آوازیں، وہ سائے، وہ پردا —— دھندلا

دھندلا پردا پیراہن ہے۔
ساری نگار سیلا دامن ہے۔

رہ رہ کے لرزتا جاتا ہے،
رُک رُک کے مچلتا جاتا ہے،
اک سایہ اُن آوازوں کی اُجلی، نورانی کہانی کو.
کہہ کہہ کے لرزتا جاتا ہے،
اور آگے نکلتا جاتا ہے،
اور مجھ کو جھجک ہے کیسے کہوں!

خاموش رہوں، دُکھ درد سہوں، یہ بات نہیں میرے بس کی،
کیوں جاگتی ہیں لہریں رس کی؟
اِن زہری پھولوں کو کون چُنے؟
دُکھ درد کی بات نہ کوئی سُنے،
ہاں، مجھ کو جھجک ہے کیسے کہوں سُننے والے جھلّائیں گے،
خاموش رہوں، چُپ چاپ سہوں —— سہتا جاؤں،
اک ندّی میں بہتا جاؤں،
بہتی ندّی —— بل کھاتی ہے،
لہراتی ہے —— اک چندر کرن، انمول بدن،
میٹھی، من موہنی صورت ہے،
چنچل، متوالی مورت ہے،
کچھ رنگ کا نور، کچھ آوازیں، کچھ سائے، —— لرزتے جاتے ہیں،
اور لمحے گذرتے جاتے ہیں، اور لمحے گذرتے جاتے ہیں!

میراجی

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

ادبِ لطیف۔ مئی جون۔

لو ایک قصہ سنو

ہمارے نوجوان ادیبوں میں جنابِ اختر انصاری ایک ایسے فن کار ہیں جو اپنے افسانوں کا خام مواد نہ تو رومانیت کی تخیل نواز بلندیوں میں تلاش کرتے ہیں اور نہ "ترقی پسندی" کی بے کیف پستیوں میں بلکہ وہ زندگی کو اور خصوصاً اپنے طبقے کی زندگی کو کسی داخلی اندازِ نظر کی عینک لگائے بغیر دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم نے آج تک اُن کی جتنی چیزیں پڑھی ہیں۔ ان سب میں ایک بات مشترک ہے۔ اور وہ ہماری زندگی کی ایسی حقیقتوں سے اُن کی پنجہ آویزی ہے جو دنیا کے اس سفر میں ہر ہر قدم پر ہمارا سامنا کرتی ہیں۔

اختر کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنا مدعا پیش کرنے کے لئے کوئی پُرتکلف پس منظر تعمیر نہیں کرتے۔ اُن کے احساس کی شدت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ شاہدِ مقصود کو آہستہ آہستہ بے نقاب کریں۔ لیکن وہ افسانے کے مرکزی خیال سے اس خوبی سے دست و گریباں ہوتے ہیں کہ اس آویزش کے لئے کوئی معذرت پیش کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ہماری رائے میں سوسائٹی کے "اُجلے پوش" طبقے کے مسائل ہی کچھ ایسے بے ڈھب ہیں کہ ایک مخلص فن کار اُن سے رسمی تقریبات کی تاب نہیں لا سکتا۔ اختر انصاری کے بیشتر افسانے اُن کی اس بے تکلف روش کے آئینہ دار ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس فن کار کی کرداری مخلوقات ہمیں بسا اوقات گھر کے کونوں سے جھانکتی اور دفتر کے برآمدوں میں اس انداز سے ٹہلتی نظر آتی ہے کہ ہم چونک چونک اُٹھتے ہیں بعض دفعہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاص کردار جسے ہم گذشتہ شب کتاب کے اوراق میں سُلا آئے تھے۔ اپنا کاغذی جامہ اتار کر دفعتاً ہمارے سامنے آن بیٹھا ہے۔ اور اپنے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیلا کر کہتا ہے "اب بتاؤ کہاں تک بھاگو گے مجھ سے ؟"۔ اندھی دنیا اور اُس کے ساتھ کے دوسرے افسانوں میں کردار نگاری کی یہ حیرت انگیز کیفیت برابر قائم ہے اور اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ اختر کو اپنے خام مواد کی تلاش میں کسی اور دنیا میں بھٹکنا نہیں پڑتا۔ اور دوسری غالباً یہ کہ اس کے ناظر بھی بیشتر سماج کے اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس طبقے سے اس کے کردار۔ پھر اگر اُس کے سیدھے سادے افسانے ہمارے دل کے تاروں کو چھیڑ دیتے ہیں۔ اور ان افسانوں کے بسنے والے ہماری آنکھوں میں کھُب جاتے ہیں تو اس میں اُن بے چارے ادیبوں کا کیا قصور جو محلوں میں رہ کر جھونپڑوں کے خواب دیکھتے یا زمین دوز سیاہ خانوں کے مکین ہوتے ہوئے آسمانوں میں پرواز کرتے ہیں۔

اختر انصاری نوجوانوں کا آرٹسٹ ہے۔ اس کی تقریباً ہر تخلیق نوجوان اور اس کے مسائل کا جائزہ لیتی ہے۔ ان مسائل میں وہ حسن کی سحر کاریوں اور عشق کی جاں گدازیوں کو کوئی نمایاں مرتبہ نہیں دیتا۔ وجہ ظاہر ہے ؎

چناں قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تمام توجہ "روٹی" اور اس کی متعلقات پر بھی صرف نہیں کرتا۔ کیونکہ دنیا میں آخر روٹی کی بھوک کے سوا اور بھوکیں بھی ہیں۔ زیرِ نظر افسانہ نہ صرف مابعدِ جنگ کے نوجوان کا ایک گہرا نفسیاتی مطالعہ ہے بلکہ ہمارے موجودہ معاشرتی اور سیاسی خلفشار کا ایک کامیاب مرقع۔ فن کار نے ہنسی ہنسی میں اُن تمام حماقتوں اور جذباتی بیہودگیوں پر نشتر چلائے ہیں جن میں آج ہمارے بے شمار حساس نوجوان مبتلا ہیں۔ لو ایک قصہ سنو ایک طویل خط ہے جو ایک بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی کو لکھ رہا ہے۔ چھوٹا بھائی برما میں اپنے ایک بزرگ کے ہاں مقیم، بظاہر روزگار کی تلاش میں لیکن

بباطن اُس بے نام پیکار میں مصروف ہے جو اس غیر مطمئن دور کی خصوصیت ہے
صاحبِ افسانہ نے اس خط میں الف لیلےٰ کی ٹکنیک کو بڑی خوبی سے جدید
ترین لباس پہنایا ہے۔ بات میں سے بات نکلتی چلی آتی ہے، اور فن کار اسے
لو ایک قصہ سنو کہہ کر ایسی صفائی سے اگلی جست لگاتا ہے کہ بے اختیار داد دینے
کو جی چاہتا ہے ___ زبان کی صفائی اور روانی اس خط کی جان ہے، اور "گفتہ
آید در حدیثِ دیگراں" نے لطفِ بیان کو چند در چند کر دیا ہے۔ جگہ کی کمی سارے
خط کو نقل کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس لئے چند ٹکڑوں پر اکتفا کیا جاتا ہے
مگر امید ہے کہ ان کے جوڑ ملانے سے آپ ایک بڑی حد تک اس خط کی روح
سے آشنا ہو جائیں گے۔ ملاحظہ ہو:-

"میں بھاٹو میں نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان واپس آرہا ہوں"

چھوٹے بھائی کے متعدد خطوط جو اس مضمون پر مشتمل تھے۔ برما سے آچکے تھے۔ میری کاہلی جواب لکھنے کی اجازت ہی نہ دیتی تھی۔ روز ارادہ کرتا تھا اور روز یہ ارادہ ملتوی ہو جاتا تھا جب نصف درجن خطوط جمع ہو گئے اور یوں بھی اپنی خیریت کا خط لکھے بغیر کم و بیش دو مہینے گزر چکے، تو ایک دن غیر معمولی عزم سے کام لے کر کاغذ اور قلم دوات لے کر بیٹھا، اور تہیہ کر لیا کہ نہایت مفصل خط لکھوں گا اور انتہائی چرب زبانی اور دلائل آفرینی سے کام لوں گا تاکہ بنّن میاں ہندوستان واپس آنے کے خیال سے تائب ہو کر بھاٹو میں اپنا قیام جاری رکھنے پر مجبور ہو جائیں۔

بنّن میاں! خدا تمہیں خوش رکھے، تم خدا کو سرمایہ داروں کے دماغ کی پیداوار سمجھتے ہو۔ لیکن میں اس خدا پر ایمان رکھتا ہوں جس کا وجود سرمایہ داروں کے وجود سے بہت پرانا ہے۔ اس لئے بھائی! میں تو اپنا خط ایسی دعا سے شروع کروں گا کہ خدا تمہیں خوش رکھے، نیک اعمال کی توفیق دے اور ایمان کی روشنی عطا فرمائے! آمین! لو ایک قصہ سنو! "ایمان کی روشنی" یاد آ گیا:-
بہت دنوں کی بات ہے۔ برسات کا لطف اٹھانے کے لئے مہرولی میں یوسف کے ہاں مقیم تھا۔ ایک دن قطب مینار کی سیر کو گئے۔ ہم لوگ ہانپتے کانپتے سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے، ہمارے پیچھے پیچھے نوجوانوں کی ایک ٹولی تھی، اور کہیں اُن کے قریب ہی کچھ برقع پوش عورتیں تھیں۔ عورتیں برقع پوش ضرور تھیں۔ مگر ان کے چہرے بے نقاب تھے، اور وہ آزادی کے ساتھ ہنستی بولتی، قہقہے لگاتی اور "ائی اللہ" اور "ہے ہے" کی دلفریب چیخیں بلند کرتی ہوئی غیر مردوں کے دوش بدوش سیڑھیاں طے کر رہی تھیں۔ ماحول کی تبدیلی بھی کیسی عجیب چیز ہوتی ہے بنّن میاں! ذرا غور کرنے کی بات ہے۔ یہی عورتیں جو شہری زندگی اور معاشرتی زندگی کی حدود میں رہتے ہوئے ہمیں اپنی جھلک بھی دکھانا گوارا نہ کرتیں اب اس زندگی سے دور ___ بلکہ بلند! ___ ہو کر اپنے آپ کو کس قدر آزاد محسوس کر رہی تھیں! خیر تو نوجوانوں کی اُس ٹولی میں... بگڑے دل بھی موجود تھے۔ وہ چار گوری گوری صورتیں جو دیکھیں تو آئے شرارت پہ اپنے کسی ساتھی سے بولے "اماں یار، روشنی تو یہاں بہت ہے، پھر لالٹینوں کی کیا ضرورت ہے؟" اُن عورتوں کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی۔ اس نے پٹ سے جواب دیا "میاں صاحبزادے! ایمان کی روشنی چاہئے۔ یہ لالٹینیں تو بہت جلدی بجھ جائیں گی" نہ پوچھو کیا حال ہوا سننے والوں کا۔ ہنستے تھے سب پہ گھڑوں پانی پڑ گیا۔ کیا مُنہ توڑ جواب دیا ہے۔ بڑھیا نے کمال کر دیا۔ سچ مچ افلاطون کی نانی تھی کم بخت! تو غرض یہ ہے بنّن میاں! کہ ایمان کی روشنی بڑی چیز ہے۔

. . . .

بنّن میاں! سچ پوچھو تو تم ابھی تلاشِ معاش کی تلخی سے دوچار ہی نہیں ہوئے اور خدا نہ کرے کہ کبھی ایسا وقت آئے! تمہارے روزگار کا مسئلہ کوئی بہت نازک اور پریشان کن مسئلہ نہیں ہے۔ زندگی کی ابتدائی ضروریات یعنی کھانا کپڑا وغیرہ حسبِ دلخواہ پوری ہوتی رہتی ہیں، اور آئندہ بھی اُن کے پورا ہوتے رہنے کا امکان ہے۔ چنانچہ تم نہایت اطمینان اور سکونِ قلب کے ساتھ روزگار کی تلاش اور مستقبل کی فکر کر سکتے ہو۔ میرا مطلب ہے کہ تمہیں اس آرام اور عافیت کی قدر کرنی چاہئے۔ بہر طور بھاٹو وہاں رہ کر کچھ کام بھی کر دیا گا اس وقت اپرنٹس ہو سکتے ہو تو ضرور ہو جاؤ، چاہے آئندہ مستقل ملازمت ملنے کی امید بالکل نہ ہو۔ معاوضہ نہ ملے تو اس کا بھی غم نہ کرو۔ کچھ نہیں تو تجربہ ہی حاصل ہو گا۔ دفتری کاموں کی نوعیت سے واقفیت پیدا ہو گی، معلومات میں اضافہ ہو گا، قابلیت بڑھے گی۔ اور کچھ نہیں تو رخصت ہوتے وقت ایک آدھ سرٹیفکیٹ ہی لے لو گے۔ غرض یہ کہ اگر بلا معاوضہ نوکری بھی ملتی ہے تو تمہیں اس کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے۔

اور جناب نے یہ کیا فرمایا کہ ہندوستان کو جنگِ آزادی کے لئے سپاہیوں کی ضرورت ہے اور میں یہاں بیکار پڑا سڑ رہا ہوں! واہ واہ! کیا کہنے ہیں بنّن میاں تمہارے! قربان جائیے اس بلند خیالی کے، مگر اتنی بڑی بات کہنے سے پہلے ذرا اپنے حالات پر تو نظر ڈال لی ہوتی۔ باوا مرچکے، گھر میں جو تھوڑی بہت پونجی تھی وہ ختم ہو چکی، بیوہ ماں اس انتظار میں جی رہی ہے کہ دیکھئے وہ دن کب آتا ہے جب صاحبزادے اپنے پیروں پر کھڑے ہوں، اور دو وقت کی روٹی کمانے کے قابل ہوں یہ تو جناب کے حالات ہیں، اور بات وہ کہی ہے جو صرف گاندھی، اور جواہر لال ہی کے منہ سے نکلتی ہوئی اچھی معلوم ہو سکتی ہے۔ جنگِ آزادی کا سپاہی بننا آسان کام نہیں ہے بنّن میاں! اس کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اُن میں دولت سب سے اہم ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس سے تم یکسر محروم ہو۔ ایک مفلس اور قلاش نوجوان کو تو ادھر کا رُخ بھی نہیں کرنا چاہئے۔ لو ایک قصہ سنو!

ہندو کالج میں میرے ساتھ ایک لڑکا بھگوان داس پڑھتا تھا۔ اس کے سیاسی خیالات کچھ تمہارے ہی جیسے تھے لیکن تم نے تو (معاف کرنا بنّن میاں!) دو چار باتیں ادھر اُدھر سے سُن لی ہیں جن کو تم وقتاً فوقتاً دہراتے رہتے ہو۔ اس کے برعکس بھگوان داس نے سیاسی لٹریچر کو شوق کے ساتھ اور محنت کے ساتھ پڑھا تھا۔ اس کی زبان سے جو نکلتی تھی وہ ایک وسیع مطالعے اور گہرے فکر کا نتیجہ ہوتی تھی۔ ابتدا میں اس کو فارسی سے بڑی دلچسپی تھی اور سعدی و حافظ کے سینکڑوں اشعار یاد تھے۔ اردو سے بھی بہت شغف رکھتا تھا اور یہی وہ چیز تھی جس نے مجھ کو اس سے قریب تر کر دیا تھا لیکن

اس کا یہ شوق جلد ہی ختم ہوگیا، کیونکہ سیاسیات سے اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد بی۔ اے میں اُس نے فارسی نہیں لی، بلکہ انگریزی کے علاوہ تاریخ اور اقتصادیات لے کر مضامین کی مثلث کو پورا کیا۔ اب اس کے خیالات میں ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی اردو فارسی ادب سے وہ بیزار ہوگیا —— جس ادب کا کبھی دیوانہ وار عاشق تھا، اب اُس کو حقارت کے ساتھ "مڈل کلاس لٹریچر" کہنے لگا۔ یہی نہیں، اور بھی بہت سی چیزیں اب اُس کے نزدیک سرمایہ داروں اور دوسرے خوش حال طبقوں کی پیدا کی ہوئی اور بنائی ہوئی تھیں، مثلاً مذہب، مروجہ اخلاق، معاشری رسوم، مختلف سیاسی ادارے، فنونِ لطیفہ کے شاہکار، ان سب کو وہ قابلِ نفرت خیال کرتا۔ "پرائیویٹ پراپرٹی" (ذاتی ملکیت) کو وہ دنیا کی سب سے بڑی لعنت اور زندگی اور سماج کی ساری برائیوں کا سرچشمہ تصور کرتا۔ جنگ، غلامی، غریبی، جہالت، ہر چیز اُس کے نزدیک پرائیویٹ پراپرٹی ہی کی پیداوار تھی۔ فرانسیسی مفکر و مدبر پرودھن کا مشہور جملہ "پراپرٹی از تھفٹ" (ملکیت سرقہ ہے) ہر وقت اُس کی زبان پر رہتا۔ مجھ سے ملنے آتا تو دیوار پر کہیں نہ کہیں یہ جملہ ضرور لکھ دیتا۔ ایک دن مجھ سے بولا "تم تاج محل کو کیا سمجھتے ہو؟" میں نے کہا "میں تاج محل کو ایک ایسی عمارت سمجھتا ہوں جو سنگِ مرمر سے بنائی گئی ہے۔" کہنے لگا "میرا یہ مطلب نہیں۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ تاج محل کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے کہا "تاج محل کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ وہ دنیا کی سب سے خوبصورت عمارت ہے۔" "تو گویا وہ تمہارے نزدیک ایک لائقِ صد تحسین چیز ہے۔" اُس نے سوال کیا۔ میں نے کہا "بیشک وہ فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے اور لائقِ صد تحسین ہے۔" "مگر میں اس کو قابلِ نفرت سمجھتا ہوں۔" اُس نے کہا۔ "ضرور سمجھو۔" میں نے جواب دیا۔ "آج کل اچھی چیزوں کو برا کہنا بھی فیشن میں داخل ہے۔ ایک صاحب نے نگار میں ایک مضمون لکھا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب جس کو اردو کا سب سے بڑا شاعر خیال کیا جاتا ہے، دوسروں کے خیالات چرایا کرتا تھا اور اس لحاظ سے ایک نہایت معمولی درجے کا شاعر تھا۔" اُس نے میری بات کو غور سے نہیں سنا اور اپنی کہے گیا "میں تاج محل کو قابلِ نفرت سمجھتا ہوں وہ اُس زمانے کی یادگار ہے جب بڑے بڑے جاگیردار، راجہ اور مہاراجہ کسانوں کو بے دردی کے ساتھ لوٹتے تھے اور اُن کے خون سے اپنی محفلوں کو رنگین بناتے تھے" —— "تمہارا خیال صحیح ہے۔" میں بیچ میں بول اُٹھا "لیکن ایک بات بھول رہے ہو بھگوان داس، اِتم اس وقت اسٹیج پر نہیں ہو بلکہ اپنے ایک دوست کے کمرے میں بیٹھے ہو، تم اپنے ماحول سے بڑی جلدی بے خبر ہو جاتے ہو۔ یہ تمہارے اندر بڑا عیب ہے۔" اُس نے جواب دیا "تاج محل ایک ایسے سیاسی و معاشی نظام کی پیداوار ہے جو "اِم مورل" تھا —— بنیاد سے لے کر چوٹی تک "اِم مورل"! اس لئے تاج محل بھی ایک "اِم مورل" چیز ہے۔" میں نے کہا "اگر "اِم مورل" ہے تو ہوا کرے خوبصورت تو ہے اور یہی اصلی چیز ہے۔ ایک طوائف بھی "اِم مورل" ہوتی ہے لیکن بعض اوقات وہ حسین بھی ہوتی ہے، اور اُس کا "اِم مورل" ہونا اُس کے حسین ہونے میں حارج نہیں ہوتا۔" اس پر طوائف کا مسئلہ لے بیٹھا، کہنے لگا "طوائف "اِم مورل" نہیں ہوتی۔ طوائف کو "اِم مورل" کہنا قطعی جہالت ہے۔ طوائف "پرائیویٹ پراپرٹی" کی پیداوار ہے ......" میرے نزدیک اُس کی گفتگو ہمیشہ ایک بے ربط نظم ہوتی تھی اور پرائیویٹ پراپرٹی ٹیپ کا بند۔ جب وہ اس ٹیپ کے بند پر پہنچا تو میں اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکا اور ایک زور کا قہقہہ لگایا لیکن اُس نے اپنے کلام کا سلسلہ جاری رکھا "طوائف پرائیویٹ پراپرٹی کی پیداوار ہے ......" میں نے کہا "بھگوان داس! آج تمہارا بخار بہت تیز ہے، تھوڑی دیر خاموش لیٹ کر آرام کرو۔" وہ اُٹھا اور مجھے جاہل، کودن، مغز اور نہ جانے کیا کیا کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ جلدی میں وہ پنسل بھی چھوڑ گیا جس سے اُس نے میز پر پڑے ہوئے تقریباً تمام کاغذات پر "پراپرٹی از تھفٹ" کی مہر ثبت کر دی تھی۔

یہ تھا میرا دوست بھگوان داس اور یہ تھے وہ خیالات جو بھوت بن کر یکایک اس کے سر پر سوار ہوگئے تھے۔ بہت جلد بھگوان داس جی اپنے مرکزِ ثقل سے اس حد تک ہٹے کہ انہوں نے اپنی تعلیم کو خیرباد کہہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے کہا "دیکھو بھگوان داس جو کچھ اس تم وقتاً فوقتاً کرتے رہے ہو اس کو میں نے کبھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا لیکن یہ حرکت جو تم اب کرنے والے ہو ایسی نہیں ہے کہ میں خاموش رہوں۔ اگر تم نے اس وقت اپنی تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا تو یاد رکھو زندگی بھر پچھتاؤ گے۔ یہ عمر پھر لوٹ کر نہیں آئے گی، نہ یہ مواقع جو آج تمہیں حاصل ہیں پھر میسر آئیں گے۔" اس پر وہ بولا "مجھے بی اے یا ایم اے کر کے کیا لینا ہے؟ حکومت کی نوکری تو کرنی نہیں ہے جو اپنی عمر اس طرح ضائع کروں۔" میں نے کہا "چلو یہی سہی، تمہیں حکومت کی نوکری نہیں کرنی ہے مگر تحصیلِ علم بذاتِ خود بھی تو کوئی چیز ہے۔ علم کی اہمیت اور ضرورت سے تو تم انکار نہیں کر سکتے۔" "علم کی اہمیت موجودہ حالات میں کچھ بھی نہیں ہے۔" اُس نے کہا "بس اتنا ہی بہت کافی ہے کہ ہم اردو اور انگریزی لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ اس سے زیادہ محض عیاشی ہے۔" "سبحان اللہ! کیا زرّیں خیالات ہیں!" میں نے کہا "تمہارے دماغ میں خنّاس سما گیا ہے۔ بھگوان داس اور کوئی بات نہیں ہے۔" لیکن اُس نے نہ کبھی میرے غصّے کی پروا کی تھی، نہ طنز و ملامت کی۔ چنانچہ حسبِ معمول اپنی کہے گیا۔ "کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنا ایک عیاشی ہے جو سرمایہ داروں کے لئے ہے نہ کہ اُن لوگوں کے لئے جو دنیا میں آزادی اور انصاف کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے سمجھ لیا کہ اس کا مرض حد سے گزر چکا ہے، اور اس کو کوئی سنجیدہ مشورہ دینا بالکل فضول ہے۔

اس نے کالج سے نام کٹایا اور بمبئی جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ اپنی اردو اور فارسی کی کل کتابیں مجھے بخش دیں۔ ماں کو لکھ دیا کہ میں مزید تعلیم حاصل کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں اور بمبئی جا رہا ہوں تاکہ مزدوروں میں رہ کر کوئی مفید کام کر سکوں۔ ماں بے چاری بے پڑھی لکھی دیہاتی عورت۔ وہ بیٹے کی اس عظیم الشان سیاسی بیداری کو کیا خاک سمجھتی اور کیا خاک اُس کی قدر کرتی اُسے تو اپنی زندگی بھر کی آرزوئیں ہی پامال ہوتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ ضلع رہتک کے کسی گاؤں میں ایک چھوٹی سی زمینداری سنبھالے بیٹھی تھی۔ مرحوم شوہر کی یاد اور اکلوتے بیٹے کے مستقبل کا تصور، یہی دو چیزیں اُس کی زندگی کا سہارا تھیں۔ اب جو بیٹے کے خوفناک ارادے کی خبر پائی تو بلبلا اُٹھی خط پر خط لکھنے شروع کئے۔ بھگوان داس کو سمجھایا بھی اور دھمکیاں بھی دیں۔ اپنے غصہ کے نتائج سے بھی آگاہ کیا اور اپنی محبت کا واسطہ بھی دلایا۔ مگر اس اللہ کے بندے پر کسی بات کا اثر نہ ہوا اُس نے ہر خط کے جواب میں یہی لکھا "والدین اور اولاد کی محبت سرمایہ دارانہ زندگی کا ایک ڈھکوسلا ہے

پہلو ہے میرے دل میں دنیا کے عوام کی محبت ہے اور میں اس محبت کے مقابلے میں ماں کی محبت کو ایک قطعی غیر اہم چیز سمجھتا ہوں" آخر میں تنگ آ کر ماں نے لکھ بھیجا، "اگر تم تعلیم ترک کر کے بمبئی گئے تو میں بھی اپنے دل پر پتھر رکھ لوں گی اور خرچ بھیجنا بند کر دوں گی" مگر یہ حضرت اپنے نئے خیالات کی ترنگ میں تھے۔ اُن پر مجاہدانہ سرفروشی کا جذبہ طاری تھا۔ انہوں نے ماں کی اس دھمکی کی ذرا بھی پروانہ کی اور بمبئی روانہ ہو گئے۔

اس بات کو مشکل سے چار مہینے گزرے ہوں گے کہ ایک دن صبح ہی صبح کیا دیکھتا ہوں کہ بھگوان داس جی تشریف لئے چلے آ رہے ہیں۔ قریب آئے تو دیکھا کہ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں، آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے ہیں جسم پر ایک پھٹی ہوئی قمیص ہے اور ایک میلا کچیلا نکر۔ "آئیے تشریف لائیے" میں نے کہا "آپ کا نام بھگوان داس ہے نا!" مگر وہ کسی چہل کے لئے تیار نہ تھا بے جان ہو کر کرسی پر گر پڑا اور بولا "میں بیمار ہوں اور بہت بھوکا ہوں۔ جلدی سے گرم دودھ منگواؤ"

ناشتے کے بعد جب میں اُس کی داستان سننے میں مصروف تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ اکیلا ہی نہیں آیا ہے بلکہ اپنے ساتھ کچھ خفیہ پولیس کے آدمی بھی لایا ہے۔ میں نے دل میں کہا یہ کم بخت کہیں میرے سر پر کوئی آفت نہ لائے۔ ایسے خطرناک آدمی سے دور رہنا بہتر ہے۔ دوستی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم بیٹھے بٹھائے اپنے آپ کو مصیبت میں پھنسائیں اور بے گناہ مارے جائیں! میں نے جلد سے جلد اُس سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی۔ اور تیسرے دن ٹکٹ دلا کر رہتک روانہ کر دیا۔

اب قدرتی طور پر تم یہ جاننا چاہو گے کہ بھگوان داس پر بمبئی میں کیا بیتی اور وہ کیوں وہاں سے اس قدر جلد واپس آ گیا۔ لیکن یہ ایک طویل داستان ہے جس کو اگر میں بیان کرنے بیٹھوں تو جن میاں! میرا یہ خط خط نہ رہے گا بلکہ ایک اچھا خاصا ناول بن جائے گا۔ نہایت مختصر طور پر صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ بمبئی پہنچ کر بھگوان داس کو ایسی ذہنی و جسمانی تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جو اس کے لئے بالکل نئی تھیں۔ بھلا کہاں ایک ناز و نعم کا پالا نوجوان اور کہاں سیاسی زندگی کے مصائب! ماں نے انتہائی خود داری کے باوجود روپیہ نہ بھیجا۔ اور اس سے اُن مصائب میں چند در چند اضافہ ہو گیا غرضکہ "دنیا کے عوام کی محبت" نے اچھی طرح اثر دکھایا۔ اور بھگوان داس جی کو ایسے سخت جھٹکے دیئے کہ دن میں تارے نظر آنے لگے۔ "آزادی، اور انصاف کی حکومت" قائم کرنے کا خیال ترک کر دیا۔ ماں کو لکھا "روپیہ بھیجو، ہم دہلی واپس جا کر دوبارہ کالج میں داخل ہو جائیں گے۔

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

یہ نہ سمجھنا تبن میاں! کہ بھگوان داس کی مصیبتیں یہاں ختم ہو گئیں یہ تو اُس کی بربادی کی محض ابتدا تھی تعلیمی زندگی کا ایک سال ضائع کرنے کے بعد جب دوبارہ کالج میں داخل ہونے کے لئے آیا تو پرنسپل نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ غریب نے بہتیرا سر پٹکا مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔ مجبوراً لاہور پہنچا۔ وہاں جس کالج میں بھی گیا۔ یہی جواب ملا کہ تھرڈ ایئر میں داخل کریں گے۔ اُس نے فورتھ ایئر سے پڑھنا چھوڑا تھا اس لئے خیال تھا کہ فورتھ ایئر ہی میں داخل مل جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا ایک سال کی بجائے دو سال ضائع ہوتے ہوئے نظر آئے۔ طبیعت تعلیم سے پہلے ہی بیزار ہو چکی تھی۔ ان نامساعد حالات سے دل اور بھی کھٹا ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مزید تعلیم کا خیال ہی چھوڑ دیا۔ اور ملازمت کرنے کی جی میں ٹھانی۔ مگر ایسے شخص کے لئے ملازمت کہاں! خفیہ پولیس نے اب تک پیچھا نہیں چھوڑا تھا، ملازمت بھلا کون دیتا! دو تین سال کی دوڑ دھوپ کے بعد مناسب روش یہی معلوم ہوئی کہ خاموشی کے ساتھ اپنے وطن چلے جائیں اور بیوہ ماں کی خدمت میں زندگی بسر کریں۔

چنانچہ اُس وقت سے برابر ہمارے دوست شری بھگوان داس جی مستقل طور پر اپنے گاؤں میں رہتے ہیں۔ سال میں دو تین پھیرے دہلی کے کرتے ہیں اور ہر پھیرے میں چند کتابیں سیاسیات کی یا "ہائی کلاس لٹریچر" کی خرید کر لے جاتے ہیں۔ مطالعے سے جو وقت بچتا ہے وہ خطوط لکھنے میں اور حقہ پینے میں صرف ہوتا ہے۔

اُن کا وہ پرائیویٹ پراپرٹی والا فلسفہ مدت ہوئی کہ دھواں بن کے اڑ گیا۔ اب اُن کے خیالات کا انداز کچھ اور ہے۔ دوسرے تیسرے مہینے مجھے خط لکھتے رہتے ہیں جس سے میں اُن کی ذہنی قلابازیوں کا اندازہ لگاتا رہتا ہوں۔ اس سلسلے میں اُن کا سب سے آخری خط جو مجھے دو ماہ قبل وصول ہوا تھا۔ خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اُس میں وہ لکھتے ہیں "میں تم سے ایک بات نہایت سنجیدگی کے ساتھ پوچھتا ہوں کیا زندگی کا مقصد حصولِ مسرت کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟ فرض کیجئے آپ نے دنیا میں رہ کر بڑے بڑے کام کئے۔ عزت بھی ملی اور نام آوری بھی ہوئی ایک دن آپ دنیا سے چل بسے۔ اب دنیا والے آپ کے نام کی مالا جپیں یا آپ کو غیر فانی بنانے کی کوشش میں مختلف مقامات پر آپ کے مجسمے نصب کریں تو آپ کو کسی بات سے کچھ سروکار نہیں۔ آپ تو چپکے چپکے سے کون جانے کہاں چل دیئے۔ مرنے کے بعد معلوم نہیں آپ کا کیا ہوا۔ پھر بتایئے کہ آپ کی وہ عمر بھر کی جد و جہد، تگ و دو اور جاں فشانی کس کام آئی۔ ہاں ایک چیز ہے جو کچھ معنی رکھتی ہے اور وہ ہے مینائے حیات کا بادۂ عشرت سے سرشار ہونا یعنی دل کھول کر پیٹ بھر کے پوری طرح ڈوب کر زندگی گزارنا۔ لیکن یہ محرومیت، جسم یا ذہن کو اذیت اور کوفت میں مبتلا کر کے ہی کیوں حاصل کی جائے؟ کسی شاہدِ رعنا کے آغوش میں کیا یہ چیز میسر نہیں آ سکتی؟ میں شعراء میں خیام کے سوا کسی کو نہیں مانتا۔ باقی سب مہمل بکتے ہیں۔ زندگی کا راز اگر کسی نے پایا تو وہ یہی دیوانۂ فرزانہ تھا..... میں اپنے چاروں طرف گلعذار بچے، زہرہ جبیں لڑکیاں، اور حسین و رعنا لڑکوں کو دیکھتا ہوں۔ کل یہ نازک پھول کملا جائیں گے۔ دوشیزائیں پوپلے منہ والی کھوسٹ بڑھیاں بن جائیں گی میرا ایک عزیز ہے۔ کیسا بانکا اور سجیلا جوان تھا وہ کبھی! آج دق میں مبتلا ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ موت کا بھیانک چنگل اُس کی شہ رگ کے قریب آ پہنچا ہے۔ یہ ہے زندگی کی حقیقت، حسن کا ضیاع، مسرت کا اختصار ــــــ یہ فطرت کے وہ قانون ہیں جن کی علتِ غائی آج تک کسی کی سمجھ میں نہ آ سکی۔ دنیا ایک ماتم خانہ ہے! زندگی جنازہ بدوش ہے! میں شعور چاہنے کے زندگی کا سب سے حقیق

مبتفر خیال کرتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فکرِ فردا اور غمِ دوش سے کچھ حاصل نہیں۔ کھاؤ، پیو اور مزے اڑاؤ! جب موت آئے تو اطمینان کے ساتھ جان دے دو، اس اطمینان کے ساتھ کہ ہم نے اپنی زندگی کے لمحاتِ گراں کو بد ذوقی اور بد توفیقی کی نذر کر کے برباد نہیں کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دنیا کے غریب! لیکن آپ کو اُن سے کیا ہمدردی! آپ کو اُن سے ہمدردی ہے! خوب! مگر اُن کو آپ کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ وہ جب چاہیں گے غاصبوں سے اپنا چھینا ہوا مال واپس لے لیں گے۔ ہمدردی منافقت کا دوسرا نام ہے! اخلاق! اچھا، یہ اخلاق اور اس کی ذریات کا تقاضا ہے؟ ہو گا! مگر میں اس فرسودہ اصطلاح سے بیزار ہوں۔ کس قدر لوچ اور سوفیانہ تخیل ہے! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

تم نے دیکھا ننّن میاں! یہ وہی شخص ہے جو کبھی تاج محل کو "اِم مورل" کہا کرتا تھا۔

۔ ۔ ۔ ۔ بھگوان داس کے حالات سے تم یہ بھی معلوم کر سکتے ہو کہ سیاسی کام ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جن میں اقتصادی خوشحالی اور معاشی اطمینان سب سے زیادہ اہم ہے۔ اگر تمہارے پاس یہ چیز نہیں ہے تو تم کبھی جنگِ آزادی کے سپاہی نہیں بن سکتے۔ اور میاں! سپاہی وپاہی بننے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے جس دن بھی ذرا سی بے عنوانی کا اظہار تمہاری طرف سے ہو گا۔ اسی دن جیل میں ٹھونس دیئے جاؤ گے۔ اب سال چھ مہینے تک پڑے سڑا کرو۔ بے اختیار یہی کہو گے کہ اس سے تو بھاڑ میں پڑے سڑتے رہتے تو بہتر ہوتا۔ اور یہ نہ سمجھنا کہ جیل میں آرام کے ساتھ گزرتی ہے اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ یہ محض کہنے کی باتیں ہیں کہ سیاسی قیدیوں کو بہت سی مراعات حاصل ہوتی ہیں اور وہ ترجیحی سلوک کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ جو سلوک معمولی قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ وہی سیاسی قیدیوں کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے۔ گاندھی اور جواہر لال کی بات دوسری ہے۔ تم جیسے آزادی کے سپاہیوں کو تو وہ ہتھکڑی پہنانے سے بھی نہیں چوکتے، لو، ایک قصہ سنو!

کان پور میں میں جن صاحب کے مکان میں رہتا تھا وہ چمڑے کی تجارت کرتے تھے۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بہت زیادہ مالدار تھے۔ مالدار ہونے کے علاوہ وہ اور بھی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ لیکن ان کا لڑکا نہایت پاجی تھا۔ مطیع اللہ نام۔ مگر اطاعت سے کوسوں دور! انتہائی کوشش کے باوجود کم بخت نے کچھ پڑھ کے نہیں دیا باپ نے روپیہ پانی کی طرح بہایا، اور جس اسکول میں وہ پڑھتا تھا اس میں ہزاروں روپیہ بطور امداد کے دے ڈالا۔ مگر وہ کسی طرح ہائی اسکول کے امتحان میں پاس نہ ہوا۔ جب عمر بہت زیادہ ہو گئی تو مجبوراً تعلیم ترک کرا دی گئی۔ اب اُسے لیڈری کا شوق چرایا۔ معلوم نہیں اُس کے دماغ میں سیاسی بیداری کے جراثیم کہاں سے آ گئے۔ غرضکہ قومی و ملکی کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ایک کپڑے کے مل میں اسٹرائک ہوئی تو آپ ماشاء اللہ اُن لوگوں میں سے تھے ۔ ۔ جو بڑے بڑے دعووں اور مشتعل انگیز تقریروں سے مزدوروں کو بہکاتے اور ورغلاتے ہیں اور اُن کو غلط راستے پر ڈال کر اُن کی مظلومیت میں مزید اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ نتیجہ جو ہونا تھا وہ ہوا۔ مع اپنے ساتھیوں کے دھر لئے گئے۔ پولیس نے بے تامل ہتکڑیاں ڈال دیں۔ انہوں نے بہت بھجر بھجر کی۔ مگر وہاں بھلا کون سنتا تھا۔ چار و ناچار سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ سب کو لاری میں ٹھونس دیا گیا اور لاری چل پڑی۔ لاری میں بیٹھتے ہی مطیع اللہ کو حاجت محسوس ہوئی۔ اُس نے پولیس افسر کو اپنی خواہش اور ارادے سے مطلع کیا۔ پولیس افسر نے اُس کی خواہش اور ارادے کو کمزور سمجھ کر اہمیت نہ دی، اور ڈانٹ کر کہا "ابھی نہیں، بیٹھے رہو!" چند منٹ مطیع اللہ نے صبر کیا۔ مگر خواہش بہت قوی اور ارادہ نہایت مضبوط تھا اس لئے زیادہ دیر تک صبر نہ کیا جا سکا۔ اُس نے پھر پولیس افسر کو یاد دہانی کرائی۔ وہ کمبخت نہایت ہی شقی القلب تھا۔ پھر ٹال گیا۔ مطیع اللہ نے کچھ دیر اور صبر کیا لیکن اب خواہش اور ارادے کی مضبوطی اس قدر شدید ہو گئی کہ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کرنا ناممکن معلوم ہوا۔ اُس نے تنگ آ کر پولیس افسر کو ایک ایسی دھمکی دی کہ وہ لاری روکنے پر مجبور ہو گیا۔ لاری جس جگہ رُکی وہ ایک غیر آباد سا مقام تھا۔ سڑک کے ایک طرف کچھ کچے پکے مکانات تھے اور دوسری طرف ایک وسیع میدان دور تک چلا گیا تھا۔ مطیع اللہ لاری سے اتر کر ایک پولیس مین کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا میدان کی جانب بھاگا۔ جب دونوں ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئے تو مطیع اللہ نے کہا، "ہتکڑی کھولو ـــــ جلدی!" "ہتکڑی تو میں نہیں کھول سکتا" پولیس مین نے کہا، "تمہارے پتلون کے بٹن کھولے دیتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

میں نے یہاں تک لکھا کہ ننّن میاں کا ساتواں خط ملا: "ہندوستان میں ستیہ گرہ شروع ہو چکی ہے اور میں تقریباً اس خط کے ساتھ ساتھ یہاں سے روانہ ہو رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اب میں اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں کہ ننّن میاں پر خاک ڈالوں اور تمام اردو دان طبقے کو اپنا مخاطب بنا کر کہوں:۔

لو ایک قصہ سُنو!

اس خط نما افسانے کی روانی قائم رکھنے کی خاطر ہم نے صاحبِ افسانہ کی خصوصیات کا مختصر جائزہ شروع ہی میں لے لیا تھا۔ اب چند باتیں اور بھی سوجھی ہیں لیکن جگہ کی کمی اور آپ کے بے کیف ہو جانے کے ڈر سے انہیں کسی آئندہ موقع کے لئے اٹھا رکھنا بہتر معلوم ہوتا ہے۔

صلاح الدین احمد

حصۂ نظم

۷۶ ڈرائنگ روم

(سانیٹ)

یہ سیبنزی ہے، یہ تاج محل، یہ کرشن ہیں اور یہ رادھا ہیں۔
یہ کوچ ہے، یہ پائپ ہے مرا، یہ ناول ہے، یہ رسالہ ہے
یہ ریڈیو ہے، یہ قمقمے ہیں، یہ میز ہے، یہ گلدستہ ہے
یہ گاندھی ہیں، ٹیگور ہیں یہ، یہ شاہنشہ، یہ ملکہ ہیں۔

—— ہر چیز کی بابت پوچھتی ہے جانے کتنی معصوم ہے یہ!
ہاں اس پہ رات کو سونے سے میٹھی میٹھی نیند آتی ہے
ہاں اس کے دبانے سے بجلی کی روشنی گُل ہو جاتی ہے
سمجھی کہ نہیں، یہ کمرہ ہے، ہاں میرا ڈرائنگ روم ہے یہ۔

—— اتنی جلدی مزدور عورت! آخر یہ گلی میں باہر کیلیا؟
لے دیر ہوئی، اب بھاگ بھی جا، بس اتنی محبت کافی ہے!
اس ملک کے بھوکے پیاسوں کو پیسے ہی کی حاجت کافی ہے!
اتنی ہنس مکھ خاموشی، اتنی مانوس نگاہیں کیوں؟

میں سوچ رہا ہوں کچھ بیٹھا پائپ کے دھوئیں کے بادل میں
میں چھپ سا گیا ہوں اک نازک تخئیل کے میلے آنچل میں

جامعہ جولائی ۱۹۴۱ء —— سلام مچھلی شہری

ڈرائنگ روم، ملاقات کا کمرہ —— انگریزی زبان میں ایک کہاوت ہے کہ آدھی دنیا نہیں جانتی کہ باقی آدھی دنیا کس حال میں ہے اور یہ سچ ہے، کہاں تو ایسے خلائق بھی موجود ہیں کہ ایک ہی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں سارا کنبہ قبیلہ کھانے پینے سونے جاگنے پر مجبور ہے اور کہیں ذرا ذرا سی بات کے لئے جدا جدا کھلے اور سجے سجائے کمرے مقرر ہیں۔ اس قسم کے مختلف ماحول انسانی ذہنیت کی کچھ اس ڈھب پر پرورش کرتے ہیں کہ جس سے نمایاں طبعی خصائص نشو و نما پا جاتے ہیں بلکہ زندگی کے متعلق انسان کے انداز نظر ہی میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس اختلاف، اس ضد کا اظہار اس نظم کے کرداروں سے نہایت لطیف انداز میں ہو رہا ہے۔

ہیروئن ایک مزدور عورت ہے جس کی زندگی میں اقتصادی بدحالی کی وجہ سے جسمانی آسودگی اور ذہنی فراغت معدوم ہے، ایک امیرانہ انداز میں سجا ہوا کمرہ اُس کے لئے ایک ایسی نئی دنیا ہے جس کی دلچسپیاں ختم ہونے میں ہی نہیں آتیں اور جس کی ہر شے سے نفسی طور پر جو تاثر پیدا ہوتا ہے۔ وہ اُسے ایک جنسی بے اختیاری پر مجبور کر دیتا ہے۔ (خواہ اصلاً یہ بے اختیاری زن کی بجائے زر کے مسئلے کی مرہونِ منت ہو) —— اور اس کے مقابل میں ہیرو ہے جس کی فراغت اور ہر شے سے بے نیازی کا اعلان اُس کا پائپ ہے۔ کمرے کی مختلف اشیا میں مزدور عورت کی غیر معمولی دلچسپی اس کے لئے ایک ہلکی سی حیرانی کا باعث ہے، ایک لطیف مذاح کا موجب، حالانکہ یہ ذرا سی ہنسی کی بات سوچنے والے کو ایک گہری المیّہ کا احساس دلا سکتی ہے اور فلسفی شاعر کو یہ کہنے پر اکسا سکتی ہے کہ ؎

زندگی کیا ہے قہقہہ
زندگی کیا ہے مرثیہ

ہیرو کے لئے شاید آرام کرسی پہ لیٹے ہوئے پائپ پینا اور من مانے دھیانوں کی لہروں میں ڈوب جانا ہی زندگی ہے، یہیں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ نظم محض واقعاتی چیز ہے یا اس میں کوئی نفسی پیچ موجود ہے۔ میرے خیال میں اپنی واقعاتی تفاصیل کے باوجود یہ نظم احساسِ تنہائی کا ایک اظہار ہے، بیداری کا ایک خواب۔ اس لئے میں اس کا قصہ یوں قائم کروں گا، ایک امیر نوجوان کہیں کسی مزدور عورت کو دیکھ پاتا ہے۔ شاید وہ اس کی اپنی کوٹھی ہی کے کسی حصے کی مرمت کے سلسلے میں آئی ہو۔ اور چونکہ اس کی جنسی اور نفسی زندگی اُس کے ظاہری حالات کو دیکھتے ہوئے کافی حد تک مطمئن سمجھی جا سکتی ہے۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ اُس کے ذہن میں اپنے آپ سے اس دور بہت دور کے ایک متضاد نسائی مرکز سے تخریب کے شعلے کے بھڑکنے کی کیفیت پیدا ہو گئی ہو۔ اور پھر جب وہ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تمباکو کے نشیلے دھوئیں کی لذت میں محو ہو تو دبی ہوئی خواہش اس نظم کے واقعے کی صورت میں نمودار ہوئی ہو۔ یا شاید کبھی یہ واقعہ اس کے ساتھ حقیقتاً گذرا ہو اور آج اسی کمرے میں بیٹھے ہوئے اُس کی یاد تازہ ہو گئی ہو کیونکہ آخری شعر اور خصوصاً اس کا دوسرا مصرعہ "میں چھپ سا گیا ہوں اک نازک تخئیل

کے میلے آنچل میں، ایک طرح کی نفسی تکمیل کا اظہار کر رہا ہے۔

فنّی لحاظ سے بھی اس نظم میں ایک سے زیادہ خوبیاں دکھائی دیتی ہیں مثلاً سانیٹ کے پہلے چار مصرعوں میں فن کا رنے نہ صرف منظر نگاری کا پورا پورا حق ادا کیا ہے بلکہ اگلے بند کے ساتھ ملا کر اس سے کردار نگاری میں بھی خوب مدد لی ہے۔

دوسرے بند میں "ملن اس پر رات کو سونے سے میٹھی میٹھی نیند آتی ہے" اور "ماں اس کے دبانے سے بجلی کی روشنی گل ہو جاتی ہے" —— ان مصرعوں سے جہاں ہیرو کی چالاک اور رُبہ کار فطرت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں ان کی اشلرتی لطافت بھی لائق ستائش ہے۔

تیسرے بند میں ایک مصرعے سے (اس ملک کے بھوکے پیاسوں کو پیسے ہی کی حاجت کافی ہے) ایک لمحے کے لئے یہ شک ہوتا ہے کہ کہیں یہ اصلاحی سُرگیت کی بے ساختگی میں تو حارج نہیں، کیونکہ ایسے واقعے کی صورت میں اپنی چند لمحوں کی ہمدم سے انسان، کوئی بھی انسان، خصوصاً ناز و نعم کا پلا ہوا دولت مند انسان سوچ کی ایسی ذہنی گہرائی کی بجائے جسمانی گہرائیوں کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے لیکن اس مصرعے سے اوپر کے اس خیال کو بھی تقویت ملتی ہے کہ یہ واقعہ یا تو بیداری کا خواب ہے یا ماضی کا افسانہ جو کمرے میں تلازم خیال کے عمل سے ہیرو کو یاد آ گیا ہے۔

سہر تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے
دھرتی ماں چھاتی سے لگالے

پچھم اُمڈے بادل کالے　　پورب پھیلے دھوئیں کے گالے
بلّم ہوئے سب آنکھوں والے　　کون بھلا اس کالی کو ٹالے
کھانڈا باجے میکیں بھالے　　ناگ کھڑے جوں جیبھ نکالے
توپیں کھول رہیں دھمالے　　تڑ تڑ تڑ تڑ گولی چالے
کٹ کٹ گرتے گورے کالے　　بہنے لاگے خون کے نالے
سارے کسان ہیں سارے گوالے　　سب مزدوری کرنے والے
آد انبر سے کون سنبھالے　　تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے

دھرتی ماں چھاتی سے لگالے

رین اندھیری بھرا ند ھیاری　　ساگر کالے دھرتی کالی
جنگل جھلسے جھُلس گئیں ڈالی　　ہر ہریالی کالی کالی
گرمیں توپ تو پھیلے لالی　　یہ لالی، خون سے پینے والی
کشتی تیریں دھوئیں، کالی　　توپن اور بن توپن والی
ساگر ہل گیا توپ وہ چالی　　ڈوبی ناؤ نہ ڈوبن والی
ڈوبن والوں نے کلی نکالی　　ناکوئی وارث ناکوئی والی
اِن ڈوبوں کو کون نکالے　　تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے

دھرتی ماں چھاتی سے لگالے

اس بادل کے پیچھے ماتا　　دِی کھے گہری روکھوں کی لالی
اس پر سندر انبر چھایا　　اس چھایا میں لال پھریرا
اس جھنڈے کے نیچے ماتا　　باجے ہے مزدوروں کا ڈنکا
نا کہیں کنگالی کا رونا　　نا کوئی بیری نا کوئی دکھیا
نا کہیں ساہوکاروں کا ڈاکا　　نا راجا خوں پینے والا
پھولوں جیسا سب کا چہرا　　ہر اک زندہ بوڑھا بچا
یہ بھی ہیں ماتا تیرے ہی پالے　　تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے

دھرتی ماں چھاتی سے لگالے

ہندستان لکھنؤ
۲۶ر جولائی ۱۹۴۲ء

مطلبی فرید آبادی

یہ نظم بھی اگرچہ اسی قسم کے اور ادب کی طرح بین الاقوامی سیاست ہی کی پیداوار ہے لیکن فنّی لحاظ سے اس میں ایک دو ایسی باتیں ہیں جو اسے محض پروپیگنڈے سے کہیں بلند کر دیتی ہیں، عام طور پر نثر کی تو بات ہی جدا ہے، نظم میں اشتراکی شعرا کبھی مزدور یا کسان، یا مزدور اور کسان کے سر پر سوار ہو کر اور کبھی اُسے اپنے سر پر سوار کر کے نہایت منجھی ہوئی صاف ستھری زبان، داور گاہے گاہے بہتر انداز بیان میں اُن خیالات کی وکالت کرتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ محض سوچ بچار کا نتیجہ ہو سکتے ہیں، جن میں انفرادی احساسات کو کم ہی دخل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ابتدا ہی میں اُس ادبی تخلیق میں ایک ایسا تکلف نمایاں ہو جاتا ہے جو کامیاب ترجمانی اور تاثر کے راستے میں ایک زبردست رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے یہ نظم خود ساختہ اثرات سے مبرا معلوم ہوتی ہے اول تو اس کی زبان ہی دیہاتی رکھی گئی ہے دیا ہے) دوسرے جنگ سے پیدا شدہ حالات کے متعلق جو معلومات اس میں درج ہیں وہ بھی آج کے ریڈیو کے دور میں ایک کسان کے علم کی بات معلوم ہوتی ہیں نیز ہمارے ملک کی پہلے سے زیادہ سیاسی بیداری اور مختلف سیاسی انجمنوں کے معاہدے کی بنا پر جو نظارۂ مستقبل دیہاتی شاعر کو جنگ کے مصائب کے دھندلکے میں دکھائی دے رہا ہے وہ بھی درست

---

[۱] موت [۲] زبان [۳] آن کر [۴] عرض، [۵] آسمان [۶] سفید [۷] کارزاری۔

معلوم ہوتا ہے "تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے، دھرتی ماں چھاتی سے لگالے"
ان مصرعوں میں "دھرتی" سے اپیل کی گئی ہے اور یہ بھی ایک کسان کے جذبات
اور روایات سے ہم آہنگ ہے۔ اور ان سب باتوں کے علاوہ ایک نکتہ اور بھی ہے
نیا یا ترقی پسند ادب (کم سے کم اُس کے اردو کے حامی مصنف اور شعراء) اکثر محض
ایسا مواد مختلف صورتوں میں ڈھالتے ہیں جو اردو ہی کی پرانی دورِ انحطاط کی شاعری
اور راشد الخیری اور نذر سجاد حیدر کے بعض ناولوں کی طرح محض اذیت پرستانہ
ادب بن کر ہی رہ جاتا ہے، اور ایک صالح ذہانت اُسے ایک نفسی مرض کی علامت تصور
کرنے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ اس نظم میں وہ بات نہیں ہے "خون کے نالے"
"توپیں" — "گولیاں" — اور تمام تاریک فضا یہ سب اُسی حد تک موجود ہیں
جس سے شاعر کو مستقبل کے خواب میں گریز کے لئے تحریک ہو سکے۔

اور اس خون خرابے کے بعد ذرا دم لینے کو فراق گورکھپوری کی ایک
غزل کے چند شعر دیکھئے جن کے متعلق ایک مصنف کی زبان میں کہا جا سکتا
ہے کہ "شعر کا مطالعہ نہیں کیا جا سکتا، شعر سے حظ اٹھایا جا سکتا ہے" —
لیکن اس کے باوجود یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ موجودہ غزل گو شعراء میں حسن و
عشق کی گوناگوں کیفیات کی ترجمانی کے لحاظ سے فراق کا درجہ کافی سے زیادہ
بلند ہے کیونکہ اُس کی پہنچ براہ راست ہوتی ہے، اور بیان کی سادگی احساس کے
خلوص سے مل کر ایک فوری لیکن گہرا اور دیرپا تاثر پیدا کرتی ہے۔

غزل (منتخب)

تو تھا یا کوئی تجھ سا تھا — میری راہ میں کون کھڑا تھا
کون بتائے عشق میں تیرے — دکھ کتنا تھا سکھ کتنا تھا
کیا دھرا سب سامنے آیا — میں پہلے سے دیکھ رہا تھا
وادی وادی جنگل جنگل — جیسے کوئی چلا جاتا تھا
میں بھی تھا سچا تم بھی تھے سچے — عشق میں سچ ہی کا رونا تھا
روتے روتے فراق ہجر میں
کوئی اکثر ہنس پڑتا تھا

اضطراب۔ جون ۱۹۴۱ء ——— فراق گورکھپوری

اور مختار صدیقی حسن و عشق ہی کی کیفیات میں ایک اور ماحول پیدا کر
رہا ہے۔

ادھوری کہانی

اپنی بھرپور جوانی کے نشے میں مخمور
لڑکھڑاتی ہوئی آئے گی کوئی البیلی۔
دیکھ کر شام کو کچھ اور قدم ڈولیں گے
سر سے ڈھلکے ہوئے آنچل سے ہٹتا ہوگا
کالے اُڑنے کے لئے خود کو نہ کیوں تولیں گے؟
سر کو ڈھکنے ہی میں کھل جائے گا جس دم سینہ
شام کہہ دیں گے "اُٹھی شے سے" یہ ہم بولیں گے
"تمقے سے یہ جلا رکھتی ہے میرے من میں
لاکھ اُٹھا اُٹھ کے پکارے نہ زباں کھولیں گے"
پھوٹ نکلیں گے جبیں پر جو حیا کے موتی
شام مچلیں گے کہ ہونٹوں سے اُنہیں رولیں گے
اور گھبرا کے یہ چاہے گی کہ واپس جائے،
وہ کہیں — "جاؤ تو یاں میری بلا کل آئے"،
سُن کے یہ اور بھی بڑھ جائے گی دل کی اُلجھن
شرم سے رُکنے پہ ہو جائے گی پانی پانی
لاج مجبور کرے گی کہ یہاں سے سٹکو
موج مچلے گی کہ ہے وقت کرو من بھانی
کشمکش میں کبھی چل دے گی، کبھی لوٹے گی
کچھ نہ ہوگا تو وہیں ہو کے بہت کھسیانی
کھسیانی کھسیانی کھسیانی
کھبا نوچے گی — "کوئی جائے مری جان سے دُور"
"آج آ کے یہاں کیا ہم پہ کچھ احسان جتانے آئے تھے؟
"کیوں آپ نے ناحق چھیڑا ہم کو، ہم تو نہانے آئے تھے"

ساقی افسانہ نمبر۔ جولائی ۱۹۴۱ء ——— مختار صدیقی

یہ نظم "ادھوری کہانی" کیوں ہے! — کیا اصل بات کو شاعر نے بیان
نہیں کیا۔ لیکن رادھے شیام کی کتھا ایک ایسا زندگی سے ملتا جلتا لامتناہی
لیکن قدم قدم پر مکمل افسانہ ہے جس کا ایک حصہ دوسرے ٹکڑے کا احساس اور
خیال دلاتا ہے۔ خواہ کسی جگہ سے دو ایک باتیں کہہ لی جائیں، وہ بنفسہٖ مکمل ہوتی
ہیں، لیکن اس کے باوجود ایک مچلتی ہوئی، سرسراتی ہوئی کیفیت۔ اس نظم کا
بھی یہی حال ہے۔ جمناتٹ کی رومانی دلچسپیاں ہر آن من موہنی ہیں۔ یہ بھی ایک
ایسا ہی لمحۂ گذراں ہے جس میں اگرچہ طرفین ایک دوسرے سے ملنے ہی کی توقع
میں یکجا ہو گئے ہیں لیکن ایک کی شوخی دوسرے کی گھبراہٹ کو بڑھا کر شرم کو اکسا
کر اشتیاق کی شدت کے سامنے (حسبِ معمول) ہار ماننے پر مجبور کر دیتی ہے
رادھے شیام کی کتھا میں شیام ایک مرکز ہے اور رادھا اور گوپیاں

اس کے گرد حرکت کرتے ہوئے نقطے۔ اس نظم کے تصور میں بھی شیام ایک ساکن
سی مورت محسوس ہوتے ہیں اور ہیروئن (جسے خواہ رادھا کہئے خواہ گوپیوں میں
میں سے کوئی گوپی) ایک کروٹیں لیتی ہوئی، مچلتی ہوئی مختلف احساسات کے
دباؤ سے جھلملاتی ہوئی تصویر۔ نیز کردار نگاری کے لحاظ سے شیام اور گوپی کا جو
نقشہ ذہن میں قائم ہوتا ہے وہ بھی روایت کے عین مطابق ہے۔

خیال کی درجہ بدرجہ نشو ونما بھی توجہ کے لائق ہے، گوپی جذبات
کے ہاتھوں مجبور ہو کر جمنا تٹ پر پہنچتی ہے، شیام کو دیکھ کر اس کی نسائیت
عود کر آتی ہے، وہ جھجک اٹھتی ہے، مرد کی موجودگی سے اُسے اپنے عورت
ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ سر سے آنچل ڈھلکا ہو یا نہ ڈھلکا ہو اُس کے
نفسِ غیر شعوری کو ڈھلکا ہوا آنچل درست کرنا ہے تاکہ دوسرے کو احساس
ہو کر اُسے احساس ہے اس بات کا کہ کوئی اور اب سامنے موجود ہے۔
لیکن گھبراہٹ میں دوپٹہ سر پر نہ رہے گا یا اگر سر پر درست ہو گیا تو سینے سے
ہٹ جائے گا۔ گھبراہٹ اور بڑھے گی، اور ماتھے پر لاج سے پسینہ چھوٹ
نکلے گا، اور بڑھتی ہوئی گھبراہٹ کو مٹانے کے لئے اُلٹے قدموں چل پڑے
گی۔ شیام یوں اس آمنے سامنے کا کچھ نتیجہ نہ نکلتے دیکھ کر ایک ایسی دھمکی
دیں گے جو یقیناً کارگر ثابت ہوگی (جاؤ تو یاں میری بلا کل آئے) اور پھر شرم
اور اشتیاق کی الجھن جاری ہوگی۔ آخر نسائی ذہن رکنے کا، ٹھہرنے کا ایک
بہانہ تلاش کرلے گا: "ہم تو نہانے آئے تھے" —— اس تمام قصے میں عورت
کی فطرت سے جس آگاہی کا ثبوت فن کار نے دیا ہے اور جن ہلکے اور گہرے
رنگوں کی باریکیوں میں وہ کھو گیا ہے وہ رادھے شیام کے بے شمار گیتوں
کی موجودگی کے باوجود قابلِ تعریف ہے، کیونکہ اُس کا ذہن مرکزی تصور اور
خیال پر اس شدت سے جما ہوا ہے کہ وہ حال کا باشندہ ہی نہیں رہا۔ وہ تو
یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہیں کہیں بندرابن میں جمنا کے کنارے جھاڑیوں یا کسی
پیڑ کی اوٹ سے یہ واقعہ دیکھ رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں بھی شاعر کی پہنچ کے
زاویے سے بہ جلد تطابق حاصل ہو جاتا ہے۔
فنی ۔۔۔ سے ایک اور بات پر بھی ہم کو غور کرنا ہے۔ تمام نظم ایک بحر
میں ہے فاع ۔۔۔ ملاتن فعلاتن فعلن —— لیکن آخری شعر میں بحر بدل جاتی
ہے۔ فعلن فعل ۔۔۔ فعلن فعلن فعلن فعلن —— کیا صوتی لحاظ سے یہ امتزاج
درست ہے ۔۔۔ نگی میں کوئی فرق تو نہیں آتا؟ اس لحاظ سے یہ نظم ایک تجربہ
بھی کہی جاسکتی

جنگل میں اتوار

نظم میں ایک تجربہ

پھیلے پھیلے، بکھرے بکھرے، لیٹے لیٹے جنگل ہیں
گھیرے گھیرے، ٹھہرے ٹھہرے، سوئے سوئے سلائے ہیں
بستے رستے بہتے بہتے، چھوٹے چھوٹے چشمے ہیں
چپکے چپکے، بھورے بھورے، سوئے سوئے رستے ہیں
آدھے آدھے، پورے پورے، تیکھے تیکھے کانٹے ہیں
تپتے تپتے، سہمے سہمے، دبکے دبکے ذرّے ہیں
چلتے چلتے، رکتے رکتے، تکتے تکتے کیڑے ہیں
اونچے اونچے، چھدرے چھدرے، موٹے موٹے ہٹنے ہیں
نیلے نیلے، پیلے پیلے، لمبے لمبے طوطے ہیں
اڑتے اڑتے، گاتے گاتے، ننھے ننھے پنچھی ہیں
جاتی جاتی، ہٹتی ہٹتی، کٹتی کٹتی ندی ہے
نیچے نیچے، پیارے پیارے، نیارے نیارے پودے ہیں
پتلی پتلی، چھوٹی چھوٹی، لمبی لمبی شاخیں ہیں
ایسے ایسے، ویسے ویسے، کیسے کیسے پتے ہیں
سوکھے سوکھے، پھیکے پھیکے، دبلے دبلے ڈنٹھل ہیں
بکھے بکھے، نکھرے نکھرے، مہکے مہکے غنچے ہیں
بھینی بھینی، میٹھی میٹھی، اڑتی اڑتی خوشبو ہے

لکھتی لکھتی، گھستی گھستی، تھکتی تھکتی پنسل ہے
سنتی سنتی، ہنستی ہنستی، گرتی گرتی محفل ہے

اوپر کی نظم "شیرازہ" میں ایک نثری ابتدائیہ کے ساتھ شائع ہوئی ہے
جس میں اس نظم کے دو پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلا تفریحی پہلو بڑے
چھوٹے دونوں کے لئے اور دوسرا تعلیمی پہلو صرف چھوٹوں کے لئے۔ یعنی
بچوں کے لئے یہ نظم نہ صرف دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے بلکہ ان کی لغت میں
اضافے کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔ میرے خیال میں ایک آدھ اور نقطۂ نظر سے
بھی اس نظم کو دیکھا جاسکتا ہے۔ مصرعوں کے آخر میں آپ باقاعدہ قافئے اکثر
موجود نہ پائیں گے۔ لیکن اس کمی کو مصرعوں کے شروع سے لے کر تقریباً آخر
تک کے یکساں الفاظ نے پورا کر رکھا ہے۔ اور اس لئے یہ نظم قدامت پرست
دماغ میں وہ عاری قسم کا تأثر نہ پیدا کرے گی جو آزاد نظم کے مطالعے سے اُسے

محسوس ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر ذہن کو نہایت احتیاط کے ساتھ مفہوم پر مرکوز نہ رکھا جائے تو خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ نظم محض الفاظ کا مجموعہ ہی معلوم ہونے لگے یعنی اس نظم اور دوسری کسی نظم میں ویسے ہی فرق کا تاثر محسوس ہو جیسے کسی عام کتاب اور ڈکشنری میں ہوتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نظم کے ہر مصرعے میں دائیں طرف سے یکساں قسم کے الفاظ (یا قوافی) کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قدیم انداز میں قوافی کا استعمال جہاں شعر کی موسیقی کے سلسلے میں آخری اور فیصلہ کن حربہ نہیں وہاں مفہوم میں ایک یکسانی اور مفہوم سے بربت بھی پیدا کر سکتا ہے۔

لیکن اس نظم کی یہ کیفیت نہیں بلکہ اس میں مفہوم باقاعدہ اور درست ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے ایک جنگل ہے جس میں سوئے سوئے سائے ہیں، رستے رستے چشمے ہیں، سونے سونے رستے ہیں۔ کانٹے، ذرّے، کیڑے، ٹہنے، طوطے، ر ددسرے، پنچھی، ندی، پودے، شاخیں، پتّے، ڈنٹھل، غنچے، اور پھر خوشبو ہے۔ جنگل کے یہ سب لوازم ایک خاص ترتیب سے پیش کئے گئے ہیں۔ پہلے جنگل ــــ ایک محیط تصوّر، پھر نگاہ کو زمین کی طرف لے جاتے ہوئے سائے، چشمے، رستے، کانٹے، ذرّے، کیڑے وغیرہ کا ذکر ہے، اب نظر اوپر کیجئے۔ ٹہنے، طوطے، پنچھی، اب پھر نیچے کی طرف دیکھئے۔ ندّی، پودے، اب اوپر نیچے جہاں جی چاہے دیکھئے، شاخیں، پتّے، ڈنٹھل، غنچے، اور اب کسی طرف نہ دیکھئے، آنکھیں بند کر لیجئے لیکن قوتِ شامہ پھر بھی آپ کو جنگل کا احساس دلائے گی کیونکہ جنگل میں "بھینی بھینی، بیٹھی، میٹھی، اُڑتی اُڑتی خوشبو ہے ــــ" اور پھر یہ طلسم ٹوٹے گا اور آپ دوستوں کی محفل میں بیٹھے اس نظم کے خوشگوار اثر کے ماتحت ہنس رہے ہوں گے۔

عنوان میں شاید "جنگل میں منگل" کی رعایت سے "اتوار" کی تبدیلی کی گئی ہے۔ یوں یہ نظم "جنگل میں ایک پک نِک" بن گئی ہے۔

میراجی

نقد و نظر

نئے رسالے

معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے بین الاقوامی حالات اردو صحافت اور ادب کی زندگی پر کچھ عجیب اُلجھے ہوئے انداز میں اثر کر رہے ہیں اس کی ایک مثال اس اظہارِ حقیقت سے بھی دی جاسکتی ہے کہ جہاں کاغذ کی گرانی اور کمیابی کا ذکر ہر اخبار اور رسالے کے صفحات پر نظر آتا ہے۔ وہیں نئے اخبارات اور رسائل کی اشاعت بھی زمانہ قبل از جنگ سے کچھ تھوڑی ہی کم ہوگی۔

چنانچہ دہلی سے

ماہنامۂ ادیب، "ادبی دنیا" کے سائز پر چونسٹھ صفحات کے حجم کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اب تک اس رسالے کے تین نمبر نکل چکے ہیں۔ اس کے ادارے میں حضرات محمد ارتضیٰ واحدی اور فصیح الدین احمد ایم اے کے نام موجود ہیں۔ مضامین نظم و نثر کسی خاص ڈھب پر منتخب نہیں کئے جاتے۔ بلکہ اس لحاظ سے اس کے ہر شمارے میں ایک ایسا تنوّع موجود ہے۔ جو زندگی کے ہیولیٰ سے ہم آہنگ ہے۔ تیسرے شمارے (بابت ماہ جولائی ۱۹۴۲ء) میں "ادیب کی پالیسی" کے عنوان سے ادارے نے ایک وضاحتی بیان شائع کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادیب کا کسی سیاسی یا مذہبی جماعت سے تعلق نہیں ہے — ادیب ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے ادیبوں کے مضامین اور کلام کو نہایت خوشی سے شائع کرے گا — البتہ ادیب میں ایسے مضامین ضرور شائع ہوں گے۔ جن میں ادبی بحث چھڑ جانے کے امکانات ہوں — ادیب صوبائی تعصب سے قطعی پاک رہے گا" — یہ پالیسی جہاں اپنی وسعت کے لحاظ سے قابلِ تعریف ہے۔ وہاں انفرادیت کی کمی کے لحاظ سے قابلِ اعتراض بھی کہی جاسکتی ہے بہرحال جس شان اور باقاعدگی سے یہ تین پرچے شائع ہوئے ہیں اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے کو سوچ سمجھ کر شائع کیا گیا ہے اور زمانے کے حوادث کا مقابلہ کرنے کی اس میں کافی سے زیادہ اہلیت ہے۔ ایک انفرادی راستہ تو آگے چل کر بھی معلوم کیا جاسکتا ہے۔ کاغذ کتابت اور طباعت کے لحاظ سے "ادیب" اردو کے بیشتر رسائل سے کہیں بلند ہے نیز اس میں لکھنے والوں کی تصاویر بھی شامل ہوتی ہیں۔ اُمید ہے کہ شائقین ادب اس مجلے کا خاطر خواہ استقبال کریں گے۔ چندہ سالانہ چھ روپے قیمت فی پرچہ آٹھ آنے ملنے کا پتہ دفتر "ادیب" چاندنی محل دہلی۔

معاصر ۔ یہ ماہنامہ دائرہ ادب بانکی پور پٹنہ کی لائقِ تحسین کوشش اور پٹنہ سے پہلا قابلِ ذکر اور سنجیدہ ادبی ترجمان ہے۔ اگرچہ اس مجلّے میں نظمیں اور افسانے بھی شریکِ اشاعت ہوتے رہتے ہیں لیکن اس کی ممتاز خصوصیت اس کے علمی اور تنقیدی مضامین ہیں۔ خصوصاً جناب کلیم الدین احمد کے مسلسل تنقیدی مضامین میں جس ہوشمندی کو اب تک برقرار رکھا گیا ہے۔ وہ ذاتیات پر اتر آنے والے بے اصول نام نہاد نقّادوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ ہر شمارے کا حجم ستّر صفحات کے قریب ہوتا ہے۔ لیکن بہت سے مسلسل مضامین کی اقساط انفرادی طور پر ہر جدا شمارے کی خوبیوں میں کمی پیدا کردیتی ہیں۔ اگر ہر شمارے میں ایک آدھ مضمون بالاقساط ہو اور باقی مکمل صورت میں تو شاید بہتر اثر پڑ سکے بہرحال مضامین کی قدر ہر صورت میں اس اداراتی بے سلیقگی سے بے نیاز ہے۔ جناب عظیم الدین احمد اس کے مدیر ہیں۔

کاغذ کتابت وغیرہ اچھی۔ چندہ سالانہ چار روپے فی پرچہ چھ آنے۔ ملنے کا پتہ۔ ماہ نامہ "معاصر" دائرۂ ادب بانکی پور پٹنہ۔

ہندوستانی ادب ۔ حیدرآباد دکن سے یہ نیا رسالہ بعض خاص مقاصد کو لے کر اٹھا ہے۔ اس کے مدیر جناب غلام محمد خاں ایم اے عثمانیہ ہیں۔ اس رسالے کا سب سے بڑا مقصد ہندوستانی ادب کو فروغ دینا ہے۔ لیکن زبان کے بارے میں یہ ایک خاص اصول کا پابند رہے گا۔ یعنی فارسی رسم الخط میں خالص اردو الفاظ کی تبلیغ کرے گا تاکہ ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان کی بجا خدمت ہو سکے۔ مضامین میں علم، ادب، سائنس، ہر شعبے کی چیزیں اس میں دکھائی دے سکتی ہیں۔ اور افسانوں کے علاوہ حصۂ نظم بھی موجود ہے۔ بنیادی طور پر یہ رسالہ حیدرآباد دکن کی جواں سال روحِ حیات کا ترجمان معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے کارکنان میں بھی جوانی کا جوش اور ولولہ موجود نظر آتا ہے۔ امید ہے کہ حیدرآباد کے دوسرے رسائل کے صف بہ صف یہ مجلہ بھی اپنے مقاصد کو پورا کرے گا اور ہر قدم ترقی ہی کی طرف اٹھائیگا۔ چندہ سالانہ چار روپے فی پرچہ ملنے کا پتہ دفتر ہندوستانی ادب

ایک اور اشارہ

کتب خانہ ادبی دنیا نے وعدہ کیا تھا کہ وقتاً فوقتاً اچھی کتابوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے چنی ہوئی کتابوں کی تازہ بتازہ فہرستیں ادبی دنیا میں شائع کی جائیں گی تاکہ ناظرین ادبی دنیا کو اپنے مقبول رسالے ہی کے ذریعے سے ہر قسم کی اچھی کتابیں بہ آسانی مہیا ہو سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے کی پہلی فہرست شائع ہو کر منظور خاطر ہو چکی ہے۔ اس دفعہ کتب خانہ ان فہرستوں کی دوسری قسط آپ کے پیش نظر کر رہا ہے۔ موجودہ فہرست میں التزاماً وہی کتابیں درج کی گئی ہیں جو خواتین اور بچوں کے لئے دلچسپ اور مفید ہو سکتی ہیں۔ حسبِ معمول اس انتخاب کی ضمانت بھی ادارہ ادبی دنیا کا نام ہے۔

مینجر کتب خانہ ادبی دنیا لاہور

نام کتاب و مصنف	قیمت
خواتین کے لئے	
ناول اور افسانے	
عورتوں کے افسانے۔ کوثر چاندپوری	۸عہ
کھٹے اور دیگر افسانے۔ حجاب امتیاز علی	۹عہ
خانم　مرزا عظیم بیگ چغتائی	للعہ
شریر بیوی　〃	۸عہ
شام زندگی　راشد الخیری	عہ
شب زندگی دو حصے　〃	عسہ
ماہ عجم　〃	۸عہ
شاہین و دراج　〃	۸/
لاشوں کا شہر۔ مسز عبدالقادر	۴عہ
نرملا　منشی پریم چند	۸عہ
یوسف نجمہ۔ عبدالحلیم شرر	۸عہ
بنات النعش۔ مولوی نذیر احمد مرحوم	۴عہ
یاسمین . . . مرزا محمد سعید	۸عہ
نظم	
آئینۂ حرم۔ محترمہ ز۔ خ۔ ش کی نظمیں	۶/
شمع خاموش نظمیں	۶/
آئینۂ جمال　〃	۱۲/
گیت مالا	۶/

نام کتاب و مصنف	قیمت
صنعت اور خانہ داری	
گلدستہ کروشیا۔ فاطمہ بیگم انور علی	۶
عصمتی کروشیا	۸عہر
بیوی کی تعلیم　خواجہ حسن نظامی	۴عہ
اولاد کی شادی　〃	عہ
مشرقی اور مغربی کھانے	۶
مذاقیہ کھانے	۶/
متفرق	
محبت نامے۔ مترجمہ پروفیسر رام سروپ کوشل	۷/
ادب زریں۔ حجاب امتیاز علی	۸/
نغماتِ موت　〃	۶/
بچوں کے لئے	
قصے کہانیاں	
ولائتی ننھی۔ راشد الخیری	۶/
دادا لال بجھکڑ　〃	۸/
بچوں کا انصاف (ڈراما)	۳/
مرغی اجمیر چلی۔ محترمہ رقیہ ریحانہ	۲/
نبیوں کے قصے	۵/

نام کتاب و مصنف	قیمت
تاریخ ہند کی کہانیاں	
پہلا حصہ	۳/
دوسرا حصہ	۵/
تفریح اور معلومات	
تعلیمی کھیل	۳/
سمندر کا عجائب خانہ	۸/
ایورسٹ کی کہانی	۳/
نظمیں	
بچوں کی نظمیں	۴/
بچوں کے اسمٰعیل	
مرتبہ سعید انصاری پرنسپل مدرسہ جامعہ	۱۵/
بچوں کی رباعیاں	۱/
بچوں کا علاج۔ یہ کتاب طب کی بہترین اور نہایت سہل اور آسان ادویات کا مجموعہ ہے اس کا ہر گھر میں ہونا ضروری ہے قیمت مجلد سنہری ۶ روپے مجلد	۴/
حکمت کے موتی (طب کے نایاب اور صحیح مجربات کا بہترین مجموعہ۔ اس کتاب کے پاس ہوتے ہوئے عمر بھر کسی حکیم و ڈاکٹر کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس میں ہر دوا سہل اور کم خرچ درج کی گئی ہے مجلد	۲:..

ملنے کا پتہ

مینجر کتب خانہ ادبی دنیا۔ دی مال۔ لاہور

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ اگست ۱۹۴۱ء

تصویر:۔ وزیر اعظم

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے۔ ممالک غیر سے دس شلنگ۔ قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر کمرشل پریس میکلیوڈ روڈ لاہور میں چھپ کر دفتر ادبی دنیا دیال لاہور سے شائع ہوا۔

دنیائے کاروبار

سبزہ زار کی ملکہ

چائے کی خوبیوں کے متعلق لوگوں نے جو اظہار خیالات کئے ہیں۔ اگر ان پر غور کیا جائے تو شاید ہی اس سے بڑھ کر کہیں کوئی کتاب دیکھنی ملے۔ جاپان کے ایک مشہور شاعر اور مضمون نگار اکاکورا کالوزو نے "چائے کی کتاب" تصنیف کی ہے جو ذیل میں درج ہے۔

چائے کا فلسفہ معمولی الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی خوبیوں کا اظہار تو مذہب اور انسانیت کے ساتھ منسلک ہے۔ جہاں کہ تمام تر نقطۂ خیال انسان اور قدرت کو ایک ساتھ وابستہ کرتا ہے۔ یہ حفظانِ صحت کا علم ہے۔ کیونکہ یہ صاف ستھرا رہنے کا رستہ بتاتا ہے۔ یہ علمِ اقتصادیات ہے۔ اس کی سادگی سے آرام ملتا ہے کٹھن اور گرانی اس کا شیوہ نہیں۔ علمِ جیومیٹری ہے کیونکہ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ دنیا میں رہ کر ہم اپنے ماحول کو کس طرح اپنے زاویہ نگاہ کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ یہ تو مشرقی جمہوریت کی روحانیت کا نقشہ ہے جو اس کے عاشق ہیں ان کے لوازمات امیرانہ ہیں۔

غیر لوگ یہ سن کر حیران ہوں گے اور شاید خیال کرنے لگیں کہ یہ بہت کچھ بے کار اور عبث ہے۔ وہ کہیں گے کہ چائے کی پیالی اور اتنا طوفان۔ لیکن جب ہم غور کرتے ہیں کہ انسان کی خوشیوں کا پیالہ کتنا چھوٹا ہے۔ خوشی کے مارے کس جلدی سے آنسوؤں کا پیالہ چھلکنے لگ جاتا ہے۔ ہماری نہ بجھنے والی پیاس کس قدر جلد اسے خشک کر دیتی ہے۔ اس چائے کی پیالی کے بنانے کے لئے اپنے آپ کو خطاوار نہ سمجھنا چاہیئے۔

انسان نے تو اس سے بڑھ کر بڑے کام کئے ہیں۔ محبت کے دیوتا کی پرستش میں تو ہم نے دل کھول کر قربانی کی ہے۔ ہم نے مریخ کی تعریف میں اس کا بڑا مجسمہ تیار کر دیا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم لوگ اپنے خیالات کو "سبزہ زار کی ملکہ" کی طرف رجوع نہ کریں، اور اس کے آغوش میں بیٹھ کر ہمدردی کی گرم نہر جو اس کے آستانے سے بہہ رہی ہے سرفراز نہ ہوں۔ ہاتھی دانت کی عمدہ پیالی میں مشک عنبری کے رنگ کا یہ عرق جو کا نفوسو کے ہونٹوں کو چھو چکا ہو۔ جس نے لاؤٹش کو مزہ چکھایا ہو اور سکیاموتی کی سانس کو معطر کر دیا ہو۔

موجودہ انسانیت کی بہشت دولت و ثروت حاصل کرنے کی جنگ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے۔ دنیا خیر اور برائی کے سائے میں اندھے کی طرح راستہ ٹٹول رہی ہے۔ علم برائی کے لئے خریدا جا رہا ہے۔ اچھائی کو محض فائدے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ مشرق اور مغرب جو خوفناک اژدہاؤں کی طرح دشمنی کے سمندر میں زندگی کا جوہر حاصل کرنے کے لئے بے کار غوطہ لگا رہے ہیں۔ لیکن ہم اپنے بڑے اثار کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس لئے اس اثنا میں آؤ ہم مل کر چائے پئیں۔ سہ پہر کی چمک بانسیروں کو روشن کر رہی ہے۔ خوشی سے چشمے اُبل رہے ہیں۔ اور پہاڑی درختوں کی صدا ہماری کیتلی میں سنائی دے رہی ہے۔

ہندوستانی فلمیات کا تاریخی واقعہ

منروا موویٹون کا تازہ ترین کارنامہ "سکندرِ اعظم" ہے۔ یہ کھیل نہ صرف سہراب مودی کا شاہکار ہے بلکہ منروا موویٹون اور ہندوستانی فلم کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت صرف اس کے تاریخی موضوع تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس سے پہلے کسی ہندوستانی فلمکار کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ اس قدر روپیہ صرف کر کے اس وسیع پیمانے پر امریکہ کی فلم کمپنیوں کے انداز پر صحیح معنوں میں ایک شاندار کھیل تیار کرے۔ ڈائرکٹر کے علاوہ ہندوستان کے ممتاز ترین اداکار بھی اس میں شامل ہیں۔ جن میں سے یہاں صرف پرتھوی راج اور بن مالا بی اے بی ٹی کا ذکر ہی کافی رہے گا۔ تمام فلمی حلقوں کو توقع یقین ہے کہ جس شان سے یہ کھیل پیش کیا گیا ہے۔ اسی آن سے اس کا استقبال بھی کیا جائے گا اور فلم کے شائق ہال سے سہراب مودی زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہوئے نکلیں گے۔

چترلوں کی داسی

اترے یکچرس کا یہ کھیل صرف اس نو آمد کمپنی کے نام کی بقا کا موجب ثابت ہوگا بلکہ وہ جو سکندرِ اعظم میں ہیروئن کے فرائض سے بہ عمدگی سبکدوش ہو چکی ہے اس میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھلاتی ہے۔ جاگیردار جو پڑدیسی کے ذریعے سے اپنے آپ کو ایک اچھا اداکار ثابت کر چکا ہے بلکہ میں ہری کی تعلیم سے بھی امتیاز کا مالک بنا ہے اس میں افسانے کے ولن کا کام خوبی سے کرتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر ہندوستان کی بلند پایہ اداکارہ درگا کھوٹے بھی اس کھیل میں یوں آئی ہے کہ زبان سے بے اختیار دو آید درست آید کا کلمہ نکلتا ہے۔

ہندوستان کے اکثر شہروں میں یہ کھیل مقبول ہو چکا ہے۔ اور لاہور کی باری بھی جلد آنے والی ہے۔

"ہرجائی"

بزمِ ادب

بنگال کے شاعر اور ادیب رابندر ناتھ ٹیگور کی موت جنگ کے اس ہنگامہ خیز زمانے میں بھی نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے ادبی حلقوں میں ہر کسی کی توجہ کو اپنی طرف کرنے والا سانحہ ہے۔ بڑے آدمیوں کی موت عموماً اس لئے اور بھی افسوسناک ہوتی ہے کہ ان کی ذات سے جو فائدے دنیا کو یا کم سے کم اُن کے اپنے ملک کو پہنچے ہوں۔ اُن میں توسیع کا امکان جاتا رہتا ہے لیکن ٹیگور کی موت پر غور کرتے ہوئے ہمیں اس کی زندگی کو نہیں بھولنا چاہیئے ٹیگور کی زندگی اپنے کارناموں اور اُن کے اثرات کے لحاظ سے ایک بھرپور زندگی ہے ـــــ ہر طرح سے کامیاب۔ اور جہاں اُس کی ابدی جدائی رنج کا باعث ہو سکتی ہے وہاں یہ تسکین بھی کچھ کم نہیں کہ اُس نے اپنی ذہانت کے صحیح استعمال سے اپنی حیات کے ہر لمحے کو اپنے اور اپنے گرد وپیش رہنے والے "دنیا کے وسیع گاؤں" کے باشندوں کے لئے مفید بنایا اور یہ اُس کی بلند ذہانت کا جوہر خداداد ہی تھا جس نے مغرب کے ایک آدمی کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ ہندوستان کو اس لئے سوراج ملنا چاہیئے کہ اسی ملک میں ٹیگور رہتا ہے۔

ہندو دیومالا میں وشنو جی پالنے والے دیوتا ہیں، زندگی کو ترقی دینا اور اس کی پرورش کے ذرائع میں نئے راستے نکالنا اُن کا کام ہے، چیتن دیو کے بعد سے بنگال میں وشنو مت کے اثرات روز افزوں ترقی پر رہے ہیں۔ چنانچہ ٹیگور نے بھی اپنی تمام زندگی میں اپنے عمل سے ظاہر کر دیا ہے کہ اُس کی ذات بھی دنیا میں وشنو جی ہی کے کام کو ترقی دینے کے لئے آئی تھی ـــــ ٹیگور اپنے ارادوں کی تکمیل میں کامیاب رہا، اس لحاظ سے ہم اُس کی موت کے بعد کہہ سکتے ہیں کہ رابندر ناتھ ٹھاکر کی جے! ـــــ لیکن اس کے ساتھ ہی مادرِ وطن کا ایک ممتاز سپوت بھی تھا، اور اس لحاظ سے بھارت ماتا کی جے پکارنا بھی ضروری ہے ـــــ بندے ماترم!

موجودہ شمارے میں ہر چیز کی کثرت ہے افسانے اور مضامین دونوں معمول سے نہ صرف تعداد میں زیادہ ہیں بلکہ اپنے تنوع اور دلچسپی کے لحاظ سے بھی نمایاں۔

راجندر سنگھ بیدی ذرا دیر سے آئے ہیں لیکن ایک کردار کے ایک خاص پہلو کا اچھوتا مطالعہ ساتھ لائے ہیں۔ ہم زندگی میں ہر قسم کی چھوٹی بڑی باتیں اور ہر قسم کے اہم اور غیر اہم واقعات دیکھتے ہیں لیکن چھوٹی باتیں اور غیر نمایاں واقعات عموماً نظر انداز ہو جاتے ہیں، اس کی داد فن کار کے مشاہدے کو پہنچتی ہے کہ وہ زندگی کے دبے ہوئے پہلو اجاگر کرے ہمارے خیال میں بیدی اس افسانے میں بہاؤ کے لحاظ سے اپنے پہلے سب افسانوں کو مات کر گیا ہے۔

مصنف نے یہ افسانہ پچھلے دنوں لاہور کی ممتاز ادبی انجمن حلقہ ارباب ذوق میں پڑھا تھا۔

محترمہ سلطانہ قاضیہ عورت کی حساس فطرت کو ایک دلکش انداز میں ظاہر کر رہی ہیں۔ "ادبی دنیا" میں یہ اُن کی پہلی چیز ہے۔ لیکن امید ہے کہ اُن کا فن اپنے ارتقائی منازل کو آئندہ بھی ہم سے ہم آہنگ بناتا رہے گا۔

"زندگی" ـــــ اس کے لکھنے والے بے حجابی کو پسند نہیں کرتے لیکن اُن کے بیان کی سادگی و پرکاری جلد ہی انہیں مجبور کر دے گی کہ وہ اپنی ذات کو بھی اسی طرح نمایاں کر دیں جیسے انہوں نے موجودہ کہانی میں زندگی کی بدلتی ہوئی کیفیات کو بے نقاب کیا ہے۔

پروفیسر منظور حسن عباسی نے اپنے مضمون "اردو ہندی یا کوئی اور زبان" میں نہایت سلجھی ہوئی باتیں کہی ہیں۔ خصوصاً آخری حصے میں انہوں نے اردو کی برتری کے جو دو ایک ثبوت پیش کئے ہیں اِن کی طرف اس سے پیشتر غالباً کسی نے توجہ نہیں کی۔ ہمارے خیال میں تو اردو کی ہمہ گیری کا سوال فیصلہ شدہ ہے لیکن اس کے باوجود آج کل کے پرچارک زمانے میں ہر لمحہ دلائل کی ضرورت رہتی ہے۔ اور زیرِ نظر مضمون ایک اچھا مجموعۂ دلائل ہے۔

کرشن چندر مختصر افسانے کے علاوہ انشائے لطیف کے میدان میں بھی یکساں آسانی کے ساتھ قلابازیاں لگاتا ہے۔ اس کا ثبوت کئی بار دیا جا چکا ہے لیکن زیرِ نظر شمارے میں نگار خانے پر ایک ایسا مضمون ہے جس میں فن کار کی لطافتِ بیان آخر تک یہ نہیں سمجھنے دیتی کہ وہ عریانی کا حامی ہے یا مخا

(۲)

چند روز ہوئے کہ محترمی حامد علی خاں سے اردو کی موجودہ شاعری کے بارے میں بات چیت ہو رہی تھی۔ اس گفتگو کے دوران میں انہوں نے ایک خیال ظاہر کیا کہ اردو شعر کے میدان میں جو گذشتہ تین چار سال پہلے ایک بے رنگی سی پیدا ہو گئی تھی وہ اب دور ہو چکی ہے۔ میرا بھی یہی خیال تھا — آج سے قریباً چار سال پہلے کا کچھ عرصہ تخلیق کے لحاظ سے اچھی نظموں کی پیداوار کے باوجود ایک خلا کا حکم رکھتا تھا۔ لیکن یک بیک ایک نئی زندگی کے آثار نمودار ہوئے۔ حفیظ جالندھری نے جو فنی تجربات بحر اور ہیئت کے لحاظ سے کئے اُن کا اثر بڑھ کر نہ صرف مختلف نئی صورتوں میں ظاہر ہوا بلکہ آزاد نظم کی حد تک یہ سلسلہ جا پہنچا۔ اختر شیرانی نے اردو کے شاعروں کو جنس کی فطری روش کے متعلق جو راستہ سجھایا اُس کے اثرات نے پھیل کر براہِ راست جنسی موضوعات کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی، جوش نے اقبال کی قومیت سے ہٹ کر جو انقلابی ترانہ گایا، اس کا اثر ترقی پسند نظریۂ ادب کے ساتھ مل کر ایک باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔ اور اس تمام ہنگامۂ تخلیق سے بہت سے نوجوان شاعر ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے نہ صرف اپنی انفرادیت کو پا لیا بلکہ اپنے اپنے رنگ میں نئی چیزیں پیش کرنے لگے، اور شاعری کا یہ تازہ ترین انقلاب محض موضوع یا ہیئت ہی کا انقلاب نہ تھا۔ اندرونی طور پر انداز بیان اور تشبیہات و استعارات میں بھی ایک زبردست تبدیلی رونما ہوئی۔ آزاد نظم کے حامیوں کے دوش بدوش بعض ایسے شاعر بھی نمایاں ہوئے جو ہیئت کے لحاظ سے قدیم ہونے کے باوجود اپنی دیگر تمام باتوں کی بنا پر ہر طرح سے جدید شاعر کہے جا سکتے ہیں۔

موجودہ شمارے میں شاد عارفی کی نظم "قالینی" ہی کو لیجئے۔ بظاہر تین تین شعروں کے باقاعدہ بند ہیں، ردیف اور قافئے سے چاق و چوبند۔ لیکن بیان میں ہر بات نئی معلوم ہوتی ہے۔ محاکات کے لحاظ سے اس کے بہت سے حصے دلکش ہیں خصوصاً آخری بند — پہلے بند میں جس نفاست سے فن کار نے غیر ضروری جزئیات سے پورا بنیادی منظر کھڑا کر دیا ہے وہ بھی توجہ کے لائق ہے۔ ہیرو کے سنجیدہ لیکن خوشگوار کردار پر "پوسٹروں میں اردو کی ڈگت سے جی بہلاتا ہوں اور "اس ساری میں سلوٹ، اُس سائے میں جھول نکالا جائے" — کے دو مصرعے ہی کافی سے زیادہ روشنی ڈالتے

شاہدے کے لحاظ سے اس ایک مصرعے کو دیکھئے "پلیٹ فارم کے پیچھے کوئی گھوڑے سے دوڑا آتا ہے"۔

محمود جالندھری نے اپنی نظم کا عنوان "انوکھا بیوپاری" رکھا ہے، لیکن نظم کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ "دنیا کا قدیم ترین بیوپار" ہے۔ شاد عارفی ہی کی طرح محمود بھی مشاہدے کا اچھا فن کار ہے۔ پہلے بند میں ایک ایجنٹ کا نقشہ جس چابکدستی سے کھینچا گیا ہے وہ حقیقت پرستی کی ایک بہت اچھی مثال ہے۔ اس کے علاوہ جس کمرے میں وہ پہنچتا ہے۔ اُس کے بیان کو پلنگ کے ساتھ "تیل صابن اور حمام" کا ذکر ایک تلخ حقیقت بنا دیتا ہے۔ تخیل کی پرواز نے بھی خوب خوب پہلو بدلے ہیں۔ "یہ سیڑھیاں ہیں کہ گیسوئے دوست کے بل ہیں" (اور اس سے نشے کی کیفیت بھی ظاہر ہوتی ہے) اور آخر میں "بہشت سبہ کار کے خدائے ذلیل" سے بھی خوب خیال آرائی کی گئی ہے۔

"یونہی" کا شاعر اس دفعہ ایک ہلکی پھلکی چیز لے کے آیا ہے۔ جس کی شوخی اپنے گفتگو کے انداز سے مکمل طور پر آخر تک ذہن کو شگفتہ رکھتی ہے۔ اردو کی جدید شاعری میں محض مکالمے کی نظمیں ابھی کم ہی لکھی گئی ہیں، خصوصاً ایسی نظمیں جن میں شروع سے آخر تک محض مکالمہ ہو اور ایسی نظموں کی مضمون آفرینی میں تازگی پیدا کرنا کچھ آسان کام نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے یہ نظم غور کے لائق ہے۔ ہاں، ایک بات اور، اگرچہ تمام باتیں ایک ہی شخص کی زبان سے ہیں لیکن دوسرے کردار کی بات چیت بھی بین السطور میں موجود ہے۔

"شام کو راستے پر" — شاعر کی نگاہوں میں ایک روزن ہے جس سے نکلتی ہوئی روشنی اس کی تخیل کو تحریک دیتی ہے۔ اُسے روزن کے پار کوئی مرد اور عورت نظر آتے ہیں اور اس خیال سے اُسے آپ بیتی یاد آ جاتی ہے، اور وہ ناکامی بھی جس کی وجہ سے اب "ایک گھنگھور سکوں، ایک کڑی تنہائی" اُس کا "اندوختہ ہے" — محبت میں ناکامی کا باعث اُس کی اپنی کمزوریاں تھیں اور بے بسی، اور وہ اِن کو دوسروں کے پردے میں یاد کرتا ہے۔ ناکامی کی تلخی کے اثر سے وہ اس قدر دل برداشتہ ہے کہ اب یہ بھی نہیں چاہتا کہ خیال میں بھی اپنی ہستی کو اپنے عکس ماضی سے تطابق پاتا دیکھے چنانچہ شروع سے آخر تک گریز کی کیفیت چھائی ہوئی ہے۔

میراجی

ٹیگور کی موت

آن لگا پھر بان، پجاری! اب ہے کس کی باری؟
جیون ایسی چنچل ناری
پل میں آئے، پل میں جائے، پھر بھی جی کو بھائے۔
رہے اسی کا دھیان، پجاری! آن لگا پھر بان

جوگی، گیانی پورب والا۔ تیرے دم سے جگ اُجیالا
پھیلا ہے آکاش، چندر جوت اب ڈوبی
سارا جگ اندھیارا
نور ہوا ہلکان، پجاری! آن لگا پھر بان۔

تُم اوتار تھے وشنو جی کے گُن اور گیان تمہیں سے سیکھے
تم نے چھپائی صورت اپنی پھلواری کے رنگ ہیں پھیکے
بن، بستی اور پربت چھوڑے، امرت پیکے،
سُر بدلے ہیں گان کلی کے
اب ہے اور ہی تان، پجاری! آن لگا پھر بان

تم ٹھاکر، ہم داس تمہارے ہم چاکر، کب پاس ہمارے
سکھ کا دارو، تُم تو سدھارے
دُکھ میں ہے سنتان، پجاری! آن لگا پھر بان

تم نے سجائی پریم آرتی مل کر گائیں سارے بھارتی
چمکا ہندوستان
تمہاری شان، ہماری آن
بان سے کیوں حیران، پجاری دکھ سکھ ایک سمان

میراجی

آئینۂ عالم

ہند چینی کی داستانِ غلامی

فرانسیسی ہند چینی کی جغرافیائی حیثیت نے اسے سیام اور ملایا کے لئے مسلسل خطرے کا موجب بنا رکھا ہے۔ کیونکہ ان دونوں ممالک کے ساتھ اس کی سرحدیں ملتی ہیں۔ اگرچہ ملایا کے معاملے میں یہ خطرہ کسی قدر کم ہو گیا ہے تاہم آج ان دونوں ممالک کے لئے یہ خطرہ اس لئے بھی بڑھ گیا ہے کہ جاپان نے جو مشرق میں ہٹلر کے نقش قدم پر چل کر اپنا علیحدہ نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعض نہایت اہم بحری، ہوائی اور فوجی اڈے حاصل کر لئے ہیں۔ اور وہاں اپنی فوجیں۔ ہوائی جہاز اور بحری بیڑہ بھیج دیا ہے

ہند چینی کی سرزمین شروع سے ہی کشت و خون کا مرکز بنی رہی ہے۔ ہندوستان کی طرح یہاں بھی کئی قومیں آئیں اور حکمرانی کر کے چلی گئیں یا وہیں کی خاک میں مدفون ہوئیں۔ اہل ہند چینی کی رگوں میں کئی اقوام کا خون ہے۔ سب سے پہلے ستان آئے۔ اس کے بعد چینیوں نے یلغار کی۔ پھر سیام والوں نے اس خطۂ زمین کو اپنی تگ و تاز کا مرکز بنایا۔ ازاں بعد تبتی ساناہی ہندوستانی برمنی۔ ملایانی اور پھر کرن اور آخر میں فرانسیسیوں نے یہاں یلغار کی۔ نہ جانے ہند چینی کی خاک میں اور کتنی اقوام کا خون ہوگا لیکن مشہور اقوام صرف یہی ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

ہند چینی میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہیں جن میں کمبوڈیا، لاؤس، ٹان کین، انام اور کوچین چائنا کی ریاستیں قابل ذکر ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کوچین چائنا کے ابتدائی باشندے کمبوڈین تھے۔ بعد میں کیرنوں کی غلامی میں آ گئے اور کیرن ان میں جذب ہو کر رہ گئے۔ کیرن نسلی طور پر دور سے چینیوں کے رشتہ دار تھے۔

انام کی تاریخ دو سو سال قبل از مسیح سے شروع ہوتی ہے۔ اس وقت انام کے باشندے گاؤ-چی کہلاتے تھے۔ لیکن اصل واقعات کی ابتداء "لی خاندان" سے شروع ہوئی۔ کیونکہ اسی خاندان کے زمانے میں فرانسیسیوں نے ہند چینی میں دلچسپی لینا شروع کی۔ بات یوں ہوئی کہ انام کی چین کے ساتھ جنگ شروع ہو گئی۔ جب انام نے دیکھا کہ شکست ہو جائے گی تو اس نے چین کی سرپرستی قبول کر لی۔ اس زمانے میں فرانس نے سیام میں ایک مذہبی مشن بھیجا۔ گویا ہند چینی کی بدنصیبی کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔

اس کے ایک سو سال بعد خاندان لی اور نگین میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ جس کے نتیجے کے طور پر نگین خاندان کا شاہزادہ بھاگ کر سیام میں چلا گیا۔ وہاں اس کی ملاقات ایک فرانسیسی پادری سے ہوئی۔ یہ پادری ایک شاطر سیاست دان بھی تھا۔ جب شہزادے نے اسے اپنے درد کی داستان سنائی تو پادری نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ فرانس جائے اور وہاں حکومت کے سامنے اپنا معاملہ پیش کر دے۔ شہزادہ پادری کی باتوں میں آ گیا اور فرانس چلا گیا۔ وہاں لوئی شانزدہم سے ملا اور ایک معاہدہ لکھا جس کی رو سے وہ فرانس کی سرپرستی میں انام کا شہنشاہ بن گیا۔ شہزادے نے اس کے بدلے میں فرانس کو خلیج توریں اور جزیرہ پولو کنڈور پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی۔

اب شہزادہ انام کا بادشاہ تھا۔ اور فرانسیسیوں کی جائز و ناجائز مداخلت کو برداشت کر رہا تھا لیکن اس کے جانشینوں نے فرانسیسیوں کے خلاف کھلم کھلا نفرت کا اظہار شروع کر دیا اور یہ نفرت کئی پادریوں کے قتل کا باعث بنی۔ واقعات یونہی ترقی کرتے گئے اور طرفین ایک دوسرے کے شدید مخالف ہوتے گئے۔ آخر سنہ ۱۸۵۹ء میں امیر البحر ریگلٹ ڈی جینولی نے

خلیج ٹونرین میں اپنی افواج اتار دیں اور ایک شہر پر قبضہ کر لیا۔ اسی سال اُس نے کیپ سینٹ جیکس سے نو میل گذار کر سیگاؤں پر بھی حملہ کر دیا۔ اور ۱۸۶۱ء میں یہاں فرانسیسی فوجوں کی اچھی خاصی تعداد اکٹھی ہو گئی ۱۸۶۲ء میں دونوں ممالک کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے ہند چینی نے سیگاؤں میتھو، اور بی ان ہو۔ فرانس کے حوالے کر دیئے اور اس سے پانچ سال بعد امیرالبحر ڈی لا، گرینڈری نے دن ہی لانگ، چاؤ ڈک اور ہنین کا الحاق بھی کر لیا گویا اس طرح ایک طرح سے سارا ہند چینی فرانس کی غلامی میں آگیا۔ کیونکہ یہ مقام اتنے اہم ہیں کہ ان پر قبضہ سارے ہند چینی پر قبضہ کرنے کے مترادف ہے۔

یہ ہے ہند چینی کی فرانس کی غلامی میں آنے کی داستان اور اب جاپان نے جس طرح اس ملک پر اقتدار حاصل کیا ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

رُوس میں کھیلوں کی ہر دلعزیزی

اگر آپ کو کسی روسی شہر میں جانے کا اتفاق ہو تو شہر کے باہر ایک طرف ایک نہایت خوشنما جگہ نظر آئے گی۔ جسے پہلی نظر دیکھنے سے ہی معلوم ہو جائے گا کہ اس کی تیاری میں خاص محنت سے کام لیا گیا ہے۔ یہاں نوجوان روسی فٹ بال کھیلتے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہ نظارہ روس کے کسی ایک شہر ہی میں نظر نہیں آئے گا بلکہ کم و بیش تمام شہر یہ منظر پیش کریں گے۔ اسی ایک مثال سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ روس میں جنگ سے پہلے قومی صحت کا معیار بلند کرنے کے لئے کتنی کوشش ہو رہی تھی۔

اور صرف حکومت ہی کھیلوں کو فروغ دینے کے لئے کوشاں نہیں تھی بلکہ عوام میں بھی یہ احساس بیدار ہو چکا ہے کہ قومی ترقی کے لئے جسمانی صحت کا ہونا از حد ضروری ہے۔ یہ حالت زار کے زمانے میں نہیں تھی۔ اُس زمانے میں جب دیگر اقوام کھیلوں کے میدان میں بڑھ رہی تھیں۔ روس کے باشندے دن رات کارخانوں میں کام کر کے اور تھوڑی بہت روزی کما کر زندگی کے دن پورے کر رہے تھے، اور حکومت بھی اس قومی ضرورت سے بالکل غافل تھی۔ یہی حالت کسانوں کی تھی۔

شروع شروع میں جب یہاں اشتراکی نظام قائم ہوا تو حکومت نے کھیلوں کو فروغ دینے کی ضرورت بھی محسوس کی اور لوگوں میں کھیلوں کو ہر دلعزیز بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ صدیوں کے طلسم خواب کو توڑنے کے لئے بھی ایک مدت چاہیئے۔ یہی صورت کم و بیش یہاں بھی پیش آئی اور ۱۹۲۶ء تک یہ تحریک صرف ابتدائی مراحل طے کرتی رہی

۱۹۲۹ء کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ اس سال کے شروع میں اس وسیع و عریض ملک میں صرف سات لاکھ اٹھاون ہزار نفوس مختلف ورزشی اداروں میں تعلیم پا رہے تھے۔ آج کل اُن کی تعداد ایک کروڑ نفوس تک پہنچ چکی ہے۔ جس میں مرد۔ عورت اور بچے سبھی شامل ہیں ۱۹۲۶ء تک حکومت صرف ایک کروڑ ساٹھ لاکھ روبلز سالانہ کھیلوں کی ترویج کے لئے منظور کیا کرتی تھی۔ اس کے بعد جوں جوں عوام میں یہ تحریک مقبول ہوتی گئی۔ حکومت بھی بجٹ میں اضافہ کرتی گئی۔ آخر ۱۹۳۶ء میں کھیلوں کا سالانہ بجٹ پچاس کروڑ روبلز تک پہنچ گیا۔

۱۹۳۵ء تک حکومت نے کھیلوں کے میدان سٹیڈیم وغیرہ کی تعمیر میں پچاس کروڑ روبلز صرف کئے۔ اس وقت روس میں۔ ساٹھ بڑے بڑے سٹیڈیم۔ ساڑھے تین سو چھوٹے سٹیڈیم۔ ساڑھے چھ ہزار کھیلوں کے میدان اڑھائی ہزار اسکیٹنگ کے میدان تین سو تیراکی کے تالاب۔ اڑھائی ہزار نشانہ بازی کی مشق کے میدان۔ بیس موٹر سائیکلوں کی دوڑ کے میدان اور ایک سو سائیکلوں کی دوڑ کے لئے میدان موجود ہیں۔ یہ تو وہ میدان ہیں جو حکومت نے بنوائے ہیں اس کے علاوہ ایسے بھی بہت سے میدان ہیں جو بعض لوگوں اور اداروں نے خود تعمیر کرائے ہیں۔

پچھلے دنوں ماسکو کے قریب ایک نہایت عالی شان سٹیڈیم بنایا گیا ہے جسے روس میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اس سٹیڈیم میں ایک لاکھ پانچ ہزار افراد بیک وقت کھیل سکیں گے۔ اس سٹیڈیم سے ملحقہ کئی میدان، تربیت گاہیں۔ ہال اور جمنیزیم بھی بنائے گئے ہیں۔ جہاں بیک وقت کئی لاکھ نفوس ورزش کر سکیں گے۔

چونکہ لوگوں میں روز بروز کھیلوں کا شوق زیادہ ہو رہا ہے۔ اس لئے اس امر کی از حد ضرورت تھی کہ لوگوں کے لئے تربیت یافتہ ماہرینِ ورزش بھی مہیا کئے جائیں۔ اس لئے ماسکو، لینن گراڈ۔ کراکو اور باکو میں نہایت عالی شان تربیت گاہیں کھولی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ پچیس دیگر شہروں میں بھی تربیت گاہیں کھولی گئی ہیں۔ جن میں کئی ہزار طلبا تعلیم پا رہے ہیں۔ یہاں طلبا سے کوئی فیس نہیں لی جاتی جب طالب علم پوری تعلیم حاصل کر لیتے ہیں تو ان کو جسمانی ترقی کا رہنما تصور کیا جاتا ہے۔ بڑی تربیت گاہوں میں جن کی حیثیت یونیورسٹیوں کی ہے تعلیم کا عرصہ پانچ سال ہے اور چھوٹی تربیت گاہوں میں جو کالج کہلاتی ہیں دو سال تک رہنا پڑتا ہے۔ یہ تربیت گاہیں اس وقت تک بیس ہزار ورزش گاہیں بنا چکی ہیں۔

فٹ بال، والی بال، ٹینس، ہوا بازی، سکیٹنگ وغیرہ روسیوں میں بہت مقبول ہے، اور یوں مختلف قسم کے پچاس کھیل یہاں رائج ہیں۔ ماسکو میں ٹینس کا بہت رواج ہے مثلاً ۱۹۲۶ء میں وہاں تین سو ٹینس کے کھلاڑی تھے، اور اس کے دس سال بعد ۱۹۳۶ء میں ان کی تعداد بارہ ہزار ہو گئی۔

ماسکو میں ہر سال کھیلوں کا ایک نہایت عظیم الشان اجتماع ہوتا ہے جس میں سوائے پیشہ ور کھلاڑیوں کے تمام لوگ صرف تھوڑا سا چندہ دے کر شمولیت کر سکتے ہیں اور اس چندے کے ذریعے سے جو رقم جمع ہوتی ہے اُسے کھیلوں کو فروغ دینے پر خرچ کیا جاتا ہے۔ یہاں پیشہ ور کھلاڑیوں کو اس واسطے اجازت نہیں دی جاتی کہ اُن کی موجودگی سے عام کھلاڑیوں کے لئے انعام حاصل کرنے کا موقعہ نہیں رہتا۔

اس موقعہ پر سٹالن، مولوٹوف، وارشلوف اور دیگر روسی رہنما بھی موجود ہوتے ہیں۔ غرضیکہ روس کی اشتراکی حکومت ہر ممکن کوشش کر رہی ہے کہ کھیلوں کو فروغ دے اور قومی صحت کا معیار بلند کرے۔ یہ صرف اس کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں کھیلوں کے بہت سے ریکارڈ روسیوں نے لے رکھے ہیں۔

روس میں شہسواری کا شوق بھی عام ہو رہا ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ شہسواری کے ایک مقابلے میں ترکمان شہسواروں نے سنٹرل ایشیا کے ایک شہر اشق آباد سے ماسکو تک سفر کیا۔ ان دونوں شہروں میں چھ ہزار دو سو میل کا فاصلہ ہے۔ اسی طرح سائیکلوں کی دوڑ میں چند روسی نوجوانوں نے سولہ ہزار میل کا سفر کیا اور چند سکیٹنگ کے ماہر روس کے مشرقی حصے سے سکیٹ کرتے ہوئے ماسکو تک آئے اور اس طرح چھ ہزار تین سو میل کا فاصلہ برف پر طے کیا۔

کھیلوں کی ہر دلعزیزی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ روسیوں کا قد اوسطاً ۱ء۵ ۷ انچ، وزن ۵ پونڈ اور چھاتی ۱ انچ بڑھ گئی ہے ـــــ ! اب ان حالات کے مدِنظر ذرا مادرِ وطن ہندوستان پر غور کیجئے !

تابش صدیقی

راہی

پھر رہا ہے کوئی گم کردہ منزل راہی
شوقِ آوارگی و ذوقِ جنوں کو لے کر
ہستیِ تیرہ کو تابندہ بنانے کے لئے
جا رہا ہے کہیں کھوئے ہوئے ویرانوں میں

صبح کا راگ بیاباں نے سنایا اُس کو
اس کے کانوں کو نہیں تابِ سماعت کچھ بھی
بس وہ افسردہ ارادوں کو لئے جاتا ہے
تیرہ و تار محبت کے شبستانوں میں

شام کے وقت دھندلکے نے جمایا ڈیرا
ہر طرف ایک خموشی ہی خموشی چھائی
لیکن اس وقت بھی اک غمزدہ بےبال ہی
ڈھونڈتا پھرتا ہے منزل کو بیابانوں میں

رات آئی تو ستاروں کی سجی محفلِ خاص
ہر ستارہ کسی بےخواب کا دل ہے گویا
ایک راہی ہے جواں سب سے سوا ہے بیتاب
پھر رہا ہے جو مقدر کے سیہ خانوں میں

جگر قریشی

انوکھا بیوپاری

بچی ہوئی بھی ذرا حلق میں انڈیل تو لوں
چلوں گا ساتھ ترے دیکھنے تری فردوس
مگر یہ تیری گھنی اور بٹی ہوئی مونچھیں،
کھچے کھچے سے خد و خال سرخ سرخ آنکھیں،
بہی ہوئی تری ٹھوڑی پہ پان کی لالی،
تری پھٹی ہوئی لنگی کا سرنگوں طرہ،
یہ تیرے ٹخنوں سے اونچی گلی سڑی شلوار،
دبی ہوئی ترے ہونٹوں میں "لمپ" کی سگریٹ،
اور اس سے اٹھتے دھوئیں کے بڑے بڑے حلقے،
ڈرا رہے ہیں، مجھے روکتے بھی ہیں لیکن
چلوں گا ساتھ ترے دیکھنے تری فردوس،
بچی ہوئی بھی ذرا حلق میں انڈیل تو لوں۔

الجھ گئی ہے مری سانس مرے سینے میں
یہ سیڑھیاں ہیں کہ گیسوئے دوست کے بل ہیں،
سجا ہوا سا یہ کمرہ ہے خواب گاہِ جمیل،
شکن سے پاک ہے رنگیں پلنگ کی چادر،
پڑے ہیں کونے میں کیوں تیل، صابن اور حمام،
میں سوچتا ہوں بیک وقت ایک ہی کمرہ
نشاط گاہ بھی ہے اور غسل خانہ بھی،
مہک رہا ہے ہر اک گوشہ عنبریں ہے فضا
الجھ گئی ہے مری سانس میرے سینے میں
یہ سیڑھیاں تھیں کہ گیسوئے دوست کے بل تھے؟

یہ کیا کہا کہ اٹھنی تجھے ابھی دے دوں؟
مطالبہ یہ ترا دل کو ناگوار نہیں
گراں نہیں تری جنت میں داخلے کا صلہ

میں ہو چلا تھا ترے انتظار سے بیزار
چلا گیا تھا کہاں چھوڑ کر مجھے تنہا؟
ترے جلو میں یہ سب کون ہیں بتا تو سہی!
مجھے کن آنکھوں سے اس طرح مسکرا کے نہ دیکھ
مری نگاہ میں جچتا نہیں ہے تیرا مال
یہ مانتا ہوں کہ عمر اس کی بیس سال کی ہے
مگر پسند نہیں مجھ کو خد و خال اس کے
یہ دوسری نہیں — یہ بھی مجھے پسند نہیں
کمر ہے اس کی خمِ مے سے بھی عریض و طویل
یہ تیسری؟ نہیں اس سے وہ دو ہی اچھی تھیں
کھٹک رہی ہے نگاہوں میں ناک چپٹی سی
سن اے بہشتِ سیہ کار کے خدائے ذلیل!!
مری طرف نہ یوں تیور چڑھا چڑھا کر دیکھ
مرے گناہ کے قابل نہیں تری حوریں
بتا کے دام بہت کم، نہ دے مجھے لالچ
میں تیرے اس کرمِ بیکراں سے باز آیا۔

مخمور جالندھری

اُردُو ہندی یا کوئی اور زبان؟

جب سے اردو ہندی کے سوال نے ایک رقیبانہ کشمکش کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اس وقت سے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک تیسری زبان کو معرضِ وجود میں لایا جائے اور سے ہندوستان کی مشترکہ زبان قرار دیا جائے تاکہ حامیانِ اردو اور ہندی کی متنازع ذہنیتوں کو دوسری جانب منعطف کیا جاسکے اور یہ اختلاف جاتا رہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تانہ خیال بھی ایک نئے اختلاف کی بنیاد ڈالنے کے سوا کچھ سودمند ثابت نہ ہُوا۔ درحقیقت اردو زبان کی موجودگی میں ہندوستان کے لئے ایک نئی مشترکہ زبان کی ضرورت کا حقیقی احساس فی الواقع معدوم ہے کیونکہ "ضرورت" جسے ایجاد کی ماں" کہتے ہیں مشکلات کے اُس شدید احساس کا نام ہے جو کسی شے کے موجود نہ ہونے سے از خود پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس احساس کا خاصہ ہے کہ اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو انسان کی تمام امکانی کوششیں اس چیز کو حاصل کرنے کے لئے مصروفِ عمل ہو جاتی ہیں۔ پس اگر دراصل ہندوستان کسی نئی مشترکہ زبان کی ضرورت کو محسوس کرتا تو یقیناً وہ نئی زبان اپنی ہستی کے بہت سے منازل طے کر چکی ہوتی اور بے چاری اردو دھلی کے کسی گوشے میں دم توڑ رہی ہوتی۔ نئی زبان کی ضرورت اب تک محض منطقی دلائل سے ثابت کی گئی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے مغربی ممالک میں اسی قسم کے ایک احساس نے "سپرانٹو" کا وجود دنیا کے سامنے پیش کردیا تھا۔ اس نئی زبان کی ساخت و تدوین میں ان تمام خصوصیات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا تھا جو ایک مشترکہ زبان میں تصور کی جا سکتی ہیں۔ سلاست و روانی اور سہولتِ تعلیم و تعلّم کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈال کر یہ زبان تیار ہوئی۔ اور باوجود اس کے کہ ان ممالک میں زاویہ ملے نگاہ کا وہ اختلاف موجود نہ تھا جو بدقسمت ہندوستان میں ہے تاہم اس زبان نے نہ کسی یورپی زبان کی جگہ لی اور نہ وہ مرتبہ حاصل کیا۔ اور نہ وہ کوشش بارآور ہوئی۔ جو اس زبان کے لئے عمل میں لائی گئی تھی۔ اس کا سبب صرف یہی ہے کہ حقیقی معنوں میں اسپرانٹو کی ضرورت ہی نہ تھی یعنی فرانسیسی اور انگریزی زبانوں کی موجودگی میں نئی زبان کا تصور چنداں بھی جاذبِ نگاہ نہ ثابت ہوسکا حالانکہ مغربی ممالک کی یہ دونوں زبانیں عموم و اشتراک کی ان خصوصیات کی اتنی حامل نہیں ہیں جتنی کہ ہماری اردو زبان ہے۔

اب اس سے پہلے کہ اردو زبان کی ان صلاحیتوں پر روشنی ڈالی جائے جن کی وجہ سے ہم اس کو مشترکہ ہندوستانی زبان قرار دے سکتے ہیں مناسب یہ ہے کہ تنازعۂ اردو ہندی پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

اردو ہندی میں اصل ما بہ الامتیاز صرف رسم الخط کو سمجھا جاتا ہے یعنی ہم جس چیز کو بخط نسخ لکھیں وہ اردو ہے اور جسے ناگری طرزِ تحریر میں لکھا جائے وہ ہندی ہے اس کے ساتھ اردو ہندی میں باہم ایک حقیقت امتیاز یہ بھی ہے کہ عام طور پر اردو وہ زبان ہے۔ جس میں فارسی و عربی کے الفاظ زیادہ استعمال کئے گئے ہوں۔ اور ہندی وہ جس میں سنسکرت اور برج بھاشا کے الفاظ زیادہ ہوں۔ مثلاً "محمود نے ایک کتاب خریدی" اردو ہے۔ اور "سوہن نے ایک پستک مول لی" ہندی۔ لیکن اگر پہلا فقرہ ہندی رسم الخط میں لکھ دیا جائے اور دوسرا اس طرح اردو میں ہو تو ان دونوں کی ماہیت بدل جائے گی صرف اتنا تغیر ضرور ہوگا کہ خریدی کو ہندی والے کھریدی لکھیں گے اور بس۔ دیکھئے بابا تلسی داس کی راماین ہندی میں ہے اس کا یہ فقرہ "تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات" صرف اس لئے ہندی ہے کہ اس کا رسم الخط ناگری ہے۔ ورنہ "غریب تلسی داس کی بات کوئی نہیں پوچھتا۔" اچھا خاصا اردو زبان کا فقرہ ہے مروجہ اردو زبان کے تمام مصادر اور ان کے مشتقات جن پر جملوں کی ساخت منحصر اور جن سے فی الواقع کوئی زبان بنتی ہے وہی ہیں جن کو ہم ہندی کہتے ہیں مثلاً آنا۔ جانا۔ کھانا۔ دیکھنا۔ لینا دینا وغیرہ۔ اسی طرح لکھے جائیں تو ہم اردو کہیں گے اور ناگری رسم الخط میں یعنی "जाना" "खाना" وغیرہ اس طرح لکھیں تو ہندی کہنے لگتے ہیں۔ اہلِ تحقیق کے نزدیک خالص اردو کے الفاظ کی چند قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جو ہندی کے ساتھ

کسی دوسری زبان کے الفاظ سے مخلوط ہو کر بنے جیسے یاد کرنا۔ غم کھانا۔ جان لینا۔ دل دینا وغیرہ دوسرے وہ جن کی اصل کسی اور زبان کی ہے اور اس میں تصرف کر کے اردو میں مستعمل ہوئے۔ مثلاً شرم فارسی لفظ ہے اس سے شرمانا یا بدل عربی ہے اس سے بدلنا۔ بنالیا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ ایک لفظ کسی اور زبان کا اردو میں استعمال کیا جائے لیکن اس کے معنیٔ اصلی کو بالکل ترک کر کے ایک نئے معنوں میں منتقل ہو۔ مثلاً رومال خالص فارسی لفظ ہے لیکن جس معنوں میں ہم اسے استعمال کرتے ہیں کبھی اہلِ فارس ان معنوں میں نہیں بولتے بلکہ اس کی بجائے روپاک یا دستمال کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اس طرح ایک چوتھی قسم ان محاورات زبان و طرقِ استعمالِ الفاظ و مشتقات کی ہے جن کو ہم اردو زبان میں غیر زبان سے محض ترجمہ کر کے استعمال کرتے ہیں حقیقتہً ان محاورات کی کوئی اصل ہماری زبانِ اردو میں موجود نہیں ہوتی۔ لیکن اب وہ بھی ہماری زبان کے مخصوص محاورات میں شامل ہو چکے ہیں۔ مثلاً کپڑے سے باہر ہونا۔ از جامہ بیروں شدن کا لفظی ترجمہ ہے۔ دل دینا اور غم کھانا دل دادن و غم خوردن کا ترجمہ ہے۔ پانی پانی ہونا۔ آب آب شدن کا ترجمہ ہے۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ یہ خالص اردو زبان کے الفاظ بھی جب ہندی خط میں لکھے جاتے ہیں تو ان کو ہندی کہا جاتا ہے۔ پس دراصل دونوں زبانوں میں یہی ایک شے مابہ الامتیاز تھی لیکن بعد میں امتیازی خدوخال کو نمایاں کرنے کے لئے ایسی ان تمام تحریروں میں جن کا رسم الخط ہندی ہو۔ برج بھاشا۔ پنجابی اور سنسکرت کے الفاظ کی بھرمار کر دی گئی۔ اور اب اسے ہندی کہا جانے لگا۔ ورنہ کچھ عرصہ پیشتر "ہندی" کسی زبان کا نام نہ تھا۔ چونکہ یہ لفظ ہندی خود اپنی ساخت و اشتقاق کے اعتبار سے خالص فارسی یا عربی کا لفظ ہے اور اس کے نام میں وہی اشد ضد تنافی موجود ہے جو حامیانِ ہندی اردو میں خیال کرتے ہیں جو لوگ ہندی کی حمایت میں سرگرم ہیں درحقیقت ان کا مقصد ہندی کو ہندوستان کی زبانِ عمومی قرار دیئے جانے سے زیادہ ہندی زبان کے ذریعے سے ہندوؤں کے کلچر اور ان کی روایات کا محفوظ رکھنا ہے۔ اصولی طور پر ہندوستان کے مسئلہ اشتراکِ لسانی کو حل کرنا فی الجملہ ان کے پیش نظر نہیں ہے۔ اسی طرح غالباً حامیانِ اردو کی ایک خاص جماعت بھی اس مقصد کو پس پشت ڈال کر اردو زبان کو اسلامی تہذیب و روایات کے تحفظ کا آلہ کار بنانا چاہتی ہے۔ حالانکہ یقیناً اردو زبان کے معرضِ وجود میں آنے کا مقصد محض اہلِ ہند کا اشتراکِ لسانی تھا جس کا سب سے پہلا فائدہ معاشری سہولیات کا حاصل ہونا اور اس کے ضمن میں مختلف اقوام و مذاہب کے اشخاص میں ایک

صورتِ یگانگت و خلوص و اتحاد کی بنیاد کا قائم ہو جانا ہے اور بس۔

اردو زبان کے بعض اشتہارات اس جملہ پر ختم ہوتے ہیں:۔

"سب دوستوں سے درخواست ہے کہ اس موقع پر تشریف لاکر فائدہ اٹھائیں"۔

لیکن حامیٔ ہندی اس جملے کو یوں لکھتا ہے۔

"سرب سجنوں سے نویدن ہے کہ اس سمے پر کرتارتھ ہو کر لابھ اٹھائیں"۔

اور خاص قسم کا حامی اردو یوں کہے گا۔

"جمیع احباب سے استدعا ہے کہ اس تقریب پر تشریف ارزانی فرما کر مستفید ہوں"۔ ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ معاشری سہولیت یا مقصدِ اشتراک ان دونوں جماعتوں میں سے کسی کے پیش نظر نہیں ہے۔ ہم نہ تو عام طور پر سرب۔ سجن۔ نویدن۔ سمے۔ کرتارتھ۔ لابھ کے الفاظ بولتے ہیں۔ اور نہ جمیع۔ استدعا۔ ارزانی۔ مستفید وغیرہ ہمارے روزمرہ میں داخل ہیں۔ ان الفاظ کے استعمال کا مقصد صرف یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ الفاظ سنسکرت و عربی کے رواج پا جائیں ہمیں دونوں خیال کے اشخاص کی ان کوششوں پر نکتہ چینی کا حق نہیں ہے لیکن نصب العین کی تعیین میں پردہ پوشی کرنا ضرور قابلِ مذمت ہے۔ وہ عربی و سنسکرت کو فروغ دینے کے لئے جو طریق چاہیں کام میں لائیں لیکن اپنی خالص عربی یا سنسکرت کے قالب میں ڈھلی ہوئی اردو زبان کو ہندوستان کی مشترکہ زبان قرار دینے کا خیال چھوڑ دیں۔ کیونکہ یہ صلاحیت صرف اردو میں ہے جس کی زمین برج بھاشا اور گل بوٹے سارے جہان کی زبانوں سے حاصل کئے گئے ہیں۔

اردو زبان کی سب سے پہلی صلاحیت اسے زبانِ مشترکہ قرار دیئے جانے کی یہ ہے کہ اس زبان کی پیدائش اسی اشتراکِ لسانی کے سبب۔ یہ احساسِ ضرورت سے ازخود ظہور میں آئی۔ جیسے "ایجاد کی ماں" کہتے ہیں۔ اردو شاہجہاں کے نام سے اس کا منسوب ہونا بقول مولانا آزاد محض اس نیک دل بادشاہ کا خیال تھا۔ ورنہ اردو اپنی بنیادی حیثیت میں اس سے پہلے ہی موجود تھی۔ اور وہ بنیادی حیثیت وہی غیر زبانوں کا ہندوستان کی مختلف بھاشاؤں میں مختلط ہو جانا ہے۔ مولانا موصوف نے اپنی کتاب آبِ حیات کے مقدمے میں اس اختلاط کی متعدد نمایاں مثالیں دی ہیں۔ اور آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

"جو نظم و نثر کی مثالیں بیان ہوئیں ان سے یہ خیال کو وسعت دے کر [illegible] روایات [illegible] ادب میں آچکا ہے اور باقی ذرا سی توجہ سے لایا جاسکتا ہے۔"

کہہ سکتے ہو کہ جس وقت سے مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہوگا۔ اس وقت سے ان کی زبان نے یہاں کی زبان پر اثر شروع کر دیا ہوگا چند کوی کا کلام مل گیا اس میں الفاظ موجود ہیں۔ محمود کے وقت کی نظم یا نثر مل جائے تو اس میں بھی ضرور ہوں گے۔ بیان ہائے مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو کچھ اس میں ہوا کسی کی تحریک یا ارادے سے نہیں ہوا بلکہ زبان مذکور کی طبیعت ایسی ملنسار واقع ہوئی ہے کہ ہر زبان سے مل جل جاتی ہے۔ سنسکرت آئی۔ اس سے مل گئی۔ عربی فارسی آئی اسے بسم اللہ خیر مقدم کہا۔ اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہ دے رہی ہے گویا اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔"

دیباچۂ آبحیات

اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ اردو کی بنیاد محض قدرتی اسباب کے ماتحت بے ارادہ اپنے آپ پڑ گئی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایجادِ اشیا کے قدرتی اسباب صناعی کوششوں کے مقابلے میں ہمیشہ غالب رہتے ہیں۔ اردو زبان کے قبولِ عام اور روز افزوں ترقی کا بھی یہی باعث ہے کہ یہ زبان وقت کی مانگ کو پورا کرتی چلی آ رہی ہے۔ ہندی یا کسی اور مشترکہ زبان کی ضرورت کا سوال ہی ابھی حل نہیں ہوا۔ اس کے وجود میں آنے کا وقت نہ معلوم کب ہوگا۔ نئی زبان جب کبھی پیدا ہوتی ہے اس میں خاصیتِ عموم و اشتراک لازمی طور پر موجود ہوتی ہے۔ اور جب تک کوئی خاص زبان ترقی کرتی رہے اور اس کے بولنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی رہے اس وقت تک یہی سمجھنا چاہئے کہ اس زبان نے اب تک اپنے جوہرِ اصلی کو معدوم نہیں کیا۔ بلکہ اس میں آب و تاب زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

معاشرتی سہولیات کے پیشِ نظر جب کوئی زبان ہم ایجاد کرنی چاہیں تو ضرور ہے کہ رائج الوقت مختلف زبانوں کے الفاظ و تراکیب اور مختلف زبان بولنے والوں کی معاشرتی و تمدنی خصوصیات کا پورا پورا خیال رکھیں۔ یہ "قطعاً" ناممکن ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان کوئی ایسی زبان ہو جس کو اردو انگریزی۔ بھاشا۔ فارسی۔ عربی۔ پنجابی۔ بنگالی۔ گجراتی مرہٹی وغیرہ جتنی بولیاں ہندوستان میں بولی جاتی ہیں ان سب سے کوئی تعلق نہ ہو بلکہ برعکس اس کے ہندوستان کی مشترکہ زبان وہی ہو سکتی ہے جس میں ان تمام زبانوں کی کیفیت کچھ اس خوبی کے ساتھ ہو کہ گویا وہ اسی زبان کے الفاظ و محاورات ہیں۔ لیکن اس اصل کو مدِ نظر رکھ کر جب کوئی زبان معرضِ وجود میں آئے گی تو غالباً اس کا نام "اردو" کے سوا کچھ اور نہ ہوگا۔ کیونکہ اردو سے زیادہ کوئی اور زبان اس خصوصیت کی بدرجہ اتم حامل نہیں ہے۔ مولانا آزاد نے ایک نواب زادے کی گفتگو اپنی کتاب میں نقل کی ہے جو بالکل بے تکلف اور دوستانہ باتیں ہیں۔ لیکن اس میں بھی۔ ترکی۔ پرتگالی۔ اطالی۔ پنجابی۔ فارسی۔ عربی۔ ملائی۔ تامل گجراتی۔ برج بھاشا۔ تلنگو۔ امریکی۔ عبرانی۔ یونانی الفاظ صرف چند سطروں میں موجود ہیں۔ اور تعجب یہ ہے کہ یہ تمام بدیشی الفاظ زبان میں کچھ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ گویا اسی ملک کے روزمرہ میں داخل تھے۔ چند سطریں ہم اس عبارت سے یہاں نقل کرتے ہیں۔

> "آغا کی پنشن لینے کل کچہری گیا تھا۔ ڈپٹی صاحب کے کمرے کے
> (ترکی) (انگریزی) (اطالوی)
> آگے کچھ قرقی کا مال نیلام ہو رہا تھا۔ کمریاں کوٹ اور واسکٹیں
> (دمعاشی) (عربی) (پرتگال)
> نئی تھیں۔ کنستر اور گلاس بھی ولایتی تھے۔ کرسیاں میزیں چقیں
> (تعلیم ودی)
> باریک خوش رنگ تھیں۔ میں نے کہا چلو کوئی ڈھب کی چیز
> (فارسی) (پنجابی)
> ہو۔ تو لے لیں۔ منجھلے آغا بولے جانے بھی دو۔ جس مال نے
>
> مالک سے دغا کی ہم سے کیا وفا کرے گا ......؟

اسی طرح اس عام فہم اردو عبارت کو دیکھئے جس کے تمام خط کشیدہ الفاظ ہندوستان کی کسی زبان سے تعلق نہیں رکھتے۔ لیکن کس طرح اردو زبان کا جزو بنے ہوئے ہیں۔

"منشی جی نے جیب سے عینک نکالی۔ قلم پر خط لگا دوات کا امتحان کر رقعہ لکھنے بیٹھے۔ ذرا صورتِ شریف ملاحظہ ہو۔ چپاتی سے گال چمچہ سی بڑی بڑی آنکھیں۔ سر مبارک طباق کی طرح چکنا اور صاف، لحاف اوڑھے ہوئے کرسی پر بیٹھے ہیں منہ سے حقہ کی منہال لگی ہوئی ہے چلم کا کنارہ۔ ٹوٹا ہوا سرپوش اور دستپناہ نیچے کے ساتھ ایک زنجیر سے لٹک رہا ہے۔ ایک کش لیتے ہیں اور پھر دو حرف لکھ لیتے ہیں۔ طبیعت کے وہمی مزاج کے جھلے معلوم ہوتے ہیں۔ چہرے سے سنجیدگی ٹپکتی ہے۔ گو عمر بڑی ہے۔ لیکن گلے سیب کی طرح سرخ ہیں۔ کیوں نہ ہو رجواڑوں میں نوکری کی ہے۔ پستہ بادام انار انگور گھی کھانڈ اچار۔ غرض مودی خانے کا تمام سامان ان کے سپرد تھا ایک حصہ سرکار میں جاتا تو دو حصے ان کے کام آتا۔"

ظاہر ہے کہ اردو کے سوا دنیا کی کسی اور زبان میں یہ صلاحیتِ اشتراک و عموم موجود نہیں۔ عبارت بالا میں بکثرت الفاظ ایسے موجود ہیں۔ جن کی جگہ ہندوستان کی قدیم بھاشا یا سنسکرت کا لفظ استعمال ہو ہی نہیں سکتا اگر حامیان اردو کا موجودہ رجحان اس کی کوشش بھی کرے تو وہ زبان ایک

متعین کرہ جائے گی نہ وہ ہندی ہی کہلائے گی اور نہ اردو رہ جائے گی۔ مثلاً عینک قلم۔ خط۔ دوات۔ صورت۔ چپاتی۔ چمچہ۔ طباق۔ لحاف۔ کرسی۔ حقہ سرپوش۔ نیچہ گش۔ چہو۔ سیب۔ پستہ۔ اچار وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن کی جگہ بھاشا کا کوئی لفظ استعمال کرکے عبارت کو پھر پڑھیے تو خاک کسی کی سمجھ میں نہ آئے گا۔ اس خصوصیت نے اردو زبان کو ہندوستان کے ہر گوشے میں پہنچا دیا ہے خواہ کہیں چلے جائیے۔ ہر جگہ اس زبان کو سمجھنے والے کافی اشخاص موجود ملیں گے اور اگر کوئی نہ ہو تب بھی اس زبان کی قوتِ افہام و تفہیم کی سہولیت ایک حد تک اس کے بولنے والے کا مقصد ضرور ظاہر کر دے گی۔ زبانِ مشترکہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہونی چاہیئے۔ اور وہ اردو میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

ایک مشترکہ زبان کی دوسری خصوصیت سہولتِ قرات و کتابت ہے اور غالباً اردو زبان سے زیادہ پڑھنے اور لکھنے کے لئے آسان اس وقت دنیا کے پردے پر کوئی دوسری زبان نہیں ہے۔ ہم اردو املا کی صحت میں جو مشکلات اس وقت محسوس کر رہے ہیں وہ اصلی اردو زبان میں نہیں ہیں بلکہ زیادہ تر ان مشکلات کا باعث زبان اردو کی وہ قطع و برید ہے جو حامیانِ ہندی اور نام نہاد حامیانِ اردو نے کرنی شروع کر دی ہے۔ عربی فارسی اور سنسکرت و انگریزی وغیرہ کے غیر متعلق اور غیر مانوس الفاظ کی کثرت نے اردو کی تحریر کو مشکل بنا دیا ہے۔ اگر یہی عمل مثلاً ہندی یا کسی اور زبان کے ساتھ کیا جائے تو شاید وہ اس جبر و ستم کی اس قدر متحمل نہ ہو سکے گی جتنی اردو زبان ہے کہ باوجود ان تصرفات کے اردو کا لکھنا اتنا مشکل نہیں ہوا جتنا کہ دوسری کسی اور بھاشا کا ایسی صورت میں مشکل ہو جاتا۔ کسی زبان کی سہولیتِ نوشت و خواند کا عام طور پر یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ اس کے سیکھنے میں کم وقت صرف کرنا پڑے۔ لیکن میرے خیال میں سہولت اس کا نام ہے کہ سیکھنے کے بعد لکھنا اور پڑھنا آسان ہو جائے یعنی سیکھنے میں خواہ کچھ زیادہ وقت صرف ہو لیکن سیکھنے کے بعد پھر لکھنا پڑھنا بہ سہولت ممکن ہو۔ اس معیار پر بھی اردو زبان پوری پوری صلاحیت ایک مشترکہ زبان بننے کی رکھتی ہے۔ چنانچہ دیکھو پہلا حرف (ا) محض ایک کھڑی لکیر ہے اردو کی رقیب زبان ہندی کا یہی حرف ایک خط مستقیم چار خطوط عمودی اور ایک خط منحنی پر مشتمل ہے جس کی شکل یہ ہے आ

اسی طرح (ب) محض ایک سیدھی لکیر ہے جس کے نیچے ایک نقطہ ہوتا ہے ہندی میں اس کے مقابل کا حرف "ب" ایک خط مستقیم اور ایک خط عمودی ایک دائرہ اور ایک خط کرزی پر مشتمل ہے پس اگر ایک لفظ مثلاً "اب" (अब) لکھنا ہو تو اردو نویس محض ایک کھڑی اور ایک ٹیڑھی لکیر اور نقطہ لگا کر فارغ ہو جائے گا۔ لیکن ہندی نویس کو گیارہ سیدھی لکیریں ایک دائرہ اور ایک نصف دائرہ بنانا پڑے گا تب جا کر ایک نہایت چھوٹا لفظ لکھا جا سکے گا۔ اردو زبان کے مشکل سے مشکل حروف (کہ وہ بھی حقیقتہً اردو زبان کے نہیں ہیں) ط۔ ظ۔ ص۔ ض۔ ع۔ غ۔ ف بھی ہندی کے آسان ترین حروف سے بھی زیادہ سہل التحریر ہیں۔ علاوہ اس کے یہ حروف جب الفاظ میں مخلوط ہو کر لکھے جاتے ہیں تو ان کی پوری صورت میں بہت زیادہ تخفیف کر دی جاتی ہے مثلاً ج کو اگر ب کے ساتھ ملا کر لکھنا ہو تو جیم کا سارا دائرہ غائب ہو کر صرف سر باقی رہتا ہے جیسے "جب" اور اگر جب کے ساتھ کوئی اور حرف مثلاً "ر" ملانا چاہیں تو ب کا سارا وجود سکڑ کر صرف ایک شوشے کی شکل اختیار کرے گا۔ مثلاً جبر بعض خوش نویس اس شوشے کو بھی حذف کر کے جبر لکھتے ہیں۔ حروف کی شکلوں کا مختلف صورتِ تراکیب میں متغیر ہونا بیشک زبان سیکھنے والے کے لئے ایک ایسی دشواری کا باعث ہے جو ہندی زبان میں نہیں کیونکہ وہاں تمام حروف بعض استثنا کے ساتھ اپنی پوری شکل میں ہی لکھے جاتے ہیں لیکن سیکھ لینے کے بعد جتنی آسانی اور پھرتی سے اردو لکھی جا سکتی ہے۔ وہ بات ہندوستان کی مروجہ زبانوں میں سے کسی کو بھی میسر نہیں۔ انگریزی کا حال اس سے بھی بدتر ہے کہ وہاں حرکاتِ حروف کا کام مستقل حروف سے لیا جاتا ہے۔ مثلاً جب کا تلفظ رومن میں ادا کرنا چاہیں تو اردو ہندی کی طرح دو حروف سے کام نہیں چلے گا بلکہ تین حروف (JAB) لکھنے ہوں گے اور لکھنے میں قلم کو اس سے بھی زیادہ موڑنا توڑنا پڑے گا۔ جتنا ہندی میں پڑا تھا۔ غیر زبانوں سے آئے ہوئے بعض الفاظ اردو میں بیشک ایسے ہیں جن میں ایک حرف لکھا جاتا ہے اور پڑھا نہیں جاتا مثلاً خواہش کا (واؤ) لیکن باوجود اس کے لفظ خواہش کی تحریر اردو میں اس سے سہل ہے جتنی کہ ہندی یا کسی اور ہندوستانی زبان میں ہوتی۔ علاوہ اس کے اس قسم کے الفاظ اتنے تھوڑے ہیں جن کا ذکر فضول ہے پس بہر حال جہاں تک نفس تحریر کا تعلق ہے اردو زبان تمام رائج الوقت زبانوں میں سب سے زیادہ سہل ہے کیونکہ جس طرح لکھنا سہل ہے اسی طرح پڑھنا سہل ہے کیونکہ الفاظ جو حروف سے مل کر بنے ہیں جس قدر چھوٹے اور مختصر ہوں گے۔ اسی قدر ان کا پڑھنا آسان تر ہوگا اردو خواں کے سامنے ہر لفظ کا آغاز اور انتہا بیک وقت نگاہ کے سامنے اس لئے آتے ہیں کہ الفاظ اردو رسم تحریر میں دور تک نہیں پھیلنے پاتے۔ چنانچہ جس عبارت کو ہم اردو میں ایک سطر کے اندر

لکھ دیتے ہیں۔ اسی کو اگر ہندی میں لکھا جائے تو غالباً دو سطروں سے کم لکھا جانا ممکن نہ ہوگا۔ پھر ظاہر ہے کہ اردو پڑھنے والی نگاہ اگر ایک سطر کو عبور کر گئی تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس نے ہندی کی دو سطروں کو عبور کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی کا بڑے سے بڑا فاضل اردو نویس کے مقابلے میں نہ جلدی لکھ سکتا ہے نہ اس لکھے کو ایسی جلدی پڑھ سکتا ہے۔ اردو زبان کا بھی انگریزی کی تقلید میں ایک طریق مختصر نویسی ایجاد ہوا ہے لیکن وہ اصل زبان سے کچھ زیادہ مختصر نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ رواج نہ پا سکا۔ کیونکہ اردو زبان کے زود نویس بے تکلف ایک سنجیدہ مقرر کی تقریر کو قلمبند کر سکتے ہیں، لیکن ہندی یا کسی دوسری زبان میں یہ عمل قطعاً ناممکن ہے بلکہ یہ بات دنیا بھر کی کسی ایسی زبان میں موجود نہیں جس کو اشتراک عموم اور معاشری سہولیات کے پیش نظر ایجاد کیا گیا ہو۔ نوشت و خواند کی سہولت کا ایک سب سے ضروری اور اہم پہلو یہ ہے کہ اس زبان میں کسی عبارت کو خواہ وہ کسی زبان کی ہو صحیح لکھنا اور اس کا صحیح پڑھا جانا بسہولت ممکن ہو سکے اور یہ جبھی ممکن ہے کہ زبان کے حروفِ تہجی کی تعداد تمام جہان کی زبانوں کے حروفِ تہجی پر مشتمل ہو یعنی حروفِ تہجی کا زیادہ سے زیادہ ہونا بھی ایک زبان کی صلاحیتِ اشتراک و عموم کا سب سے بڑا ثبوت ہے فارسی و عربی کی زبانیں ہندوستان کے ڈ۔ ٹ۔ ڑ۔ بھ۔ پھ یا ایران کے گ۔ ژ۔ چ۔ پ وغیرہ حروف کے تلفظ سے قاصر ہیں۔ اسی طرح انگریزی یا فرانسیسی اور جرمنی زبانیں۔ ط۔ ث۔ ق۔ ع اور ح وغیرہ کو کسی صورت ادا نہیں کر سکتیں۔ ہندی زبان نہ فارسی کا ژ بول سکتی ہے اور نہ ث۔ ح۔ خ۔ ذ۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ع۔ غ۔ ف۔ ق کا تلفظ ادا کرنے پر قادر ہے۔ دیکھئے یہ بولی ہمارے روزمرہ میں داخل ہے۔

"صبح کو پو پھٹتے ہی خادم نے حقہ تازہ کیا اور چلم بھر کر سامنے لا رکھا۔ اتنے میں حکیم صاحب تشریف لائے۔ عجیب و غریب ذکر چھیڑ دیئے پھر مجھ پر نظر ڈالی اور بولے کہ مجھے ایک ضروری بات کہنی ہے۔ اگر اس میں آپ نے مدد کی تو بڑا ثواب ہوگا۔ میں نے کہا ہر طرح سے حاضر ہوں۔" اب اس عبارت کو نہ عربی زبان کے حروفِ تہجی ادا کر سکتے ہیں نہ فارسی کے نہ انگریزی یا کسی اور ایک زبان کے۔ ہندی میں اگر اس کو لکھنا چاہیں تو اس میں خادم کو کھادم عجیب و غریب کو اجیب و گریب ذکر کو جکر ضروری کو جروری اور نظر کو نجر ہی تلفظ کرنا پڑے گا۔ کیونکہ مثلاً الفاظ تازہ۔ ذکر۔ ضروری۔ نظر اور حاضر میں جہاں حرف ج کا استعمال کریں گے اس کے نیچے ایک[1] نقطہ بھی لگا دیا تو بھی ظاہر ہے کہ صرف ز۔ ض۔ ظ۔ وغیرہ کا تلفظی امتیاز محض اس ایک نقطہ سے کیوں کر پیدا ہوگا۔ جو لوگ اس زبان کے مالک ہیں جن کے یہ الفاظ ہیں اُن کے نزدیک ظ کو ز۔ ض یا ذ کی طرح سے تلفظ کرنا ایسا ہی مکروہ ہے جیسے جیم سے تلفظ کرنا ہمیں بُرا معلوم ہوتا ہے پس زبان اردو اس لحاظ سے تو مشکل ہے کہ اس کے حروفِ تہجی میں اس درجہ تنوع اور امتیاز روا رکھا گیا ہے لیکن اس لحاظ سے کس قدر سہل ہے کہ ہم بے تکلف ہر زبان کی عبارت اپنی زبان میں نقل کر سکتے ہیں بشرطیکہ بجائے جلدی سیکھنے کے کسی قدر دیر میں سیکھیں۔

حروفِ تہجی کی زیادتی ذخیرۂ الفاظ کی زیادتی کا بھی باعث ہوتی ہے۔ اس لئے اردو زبان میں مختلف اقوام کے علوم و فنون کی اصطلاحات اور ان کی معاشری و تمدنی ضروریات سے متعلق الفاظ و محاورات کی بھی کھپت ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ روز بروز ہماری اردو زبان میں علوم و فنون کا ایک قابل قدر ذخیرہ فراہم موجود ہوتا جاتا ہے۔ ظاہر ہے غیر زبانوں کے الفاظ و محاورات جب کسی زبان میں داخل ہوتے ہیں بلکہ اپنے اہل زبان کے استعارات و تشبیہات و محاورات اور ضرب الامثال نیز ان ضرب الامثال کی متعلقہ روایات اور مخصوص مذہبی یا قومی افسانے بھی ساتھ لاتے ہیں۔ اب دیکھئے مسیحا نفسی۔ فرعون بے سامان۔ میاں مجنوں۔ غالب کا مصرعہ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا۔ حاتم کی قبر پر لات مارنا وغیرہ بے شمار محاورات ایسے ہیں جن کے الفاظ میں ان ممالک کے افسانے مندرج ہیں جہاں سے وہ آئے۔ اسی طرح انگریزوں نے ہندوستان میں دخل پایا تو لاٹ صاحب بن جانا۔ ناڑی کی بندوق۔ واقعات کا فوٹو کھینچ دینا۔ لال جھنڈی دکھانا رجمی باز رکھنا) یہ سب محاورات واقعات و احوال زمانہ کی مختصر تاریخیں بن بن کر اردو ادبیات میں جگہ پا گئے ہیں۔ اور روز بروز زیادہ دخل پاتے جا رہے ہیں۔ یہ تمام خصوصیات اس کا بین ثبوت ہیں کہ اردو زبان ہی ایک مشترکہ ہندوستانی زبان قرار پانے کی مستحق ہے علامات و آثار اردو کے عام حسن قبولی کے ساتھ مل کر ہمیں امید دلاتے ہیں کہ عجب نہیں ہندوستان کی قسمت کے ساتھ ہندوستان کی مشترکہ زبان اردو کا ستارۂ اقبال اور بھی بلند ہو اور یہ زبان دنیا کی علمی زبانوں میں ایک عالی مرتبہ حاصل کر سکے۔

(پروفیسر منظور احسن عباسی)

[1] ج

ایک نظم اور ایک غزل

یک لمحۂ غنیمت

توڑ دے !
اِس طلسمِ خامشی کو توڑ دے
دیکھ تو حدِ نگاہ غرب سے
تیرگی موت کا
اِک ہجوم بے کراں
زندگی کے کارناموں پر دھندلکا چھوڑتا
بڑھ رہا ہے برقِ رفتاری سے مشرق کی طرف۔
توڑ دے !
اِس طلسمِ خامشی کو توڑ دے
کیا خبر ہم آج کے بعد اب کہیں
مل سکیں گے یا نہیں
جانبِ مغرب تو دیکھ !
زندگی مٹتی چلی جاتی ہے اک مرگھٹ —— چِتا!
آگ اور بارود کے شعلوں میں گھر کر ایک ڈھیر
ہو رہی ہے راکھ کا،
توڑ دے،
یہ طلسمِ خامشی!
کیا خبر ہے آج سے پھر ہم کہیں
مل سکیں گے یا نہیں،
آج کے دن کو غنیمت جان کر
جنبشِ لب یا نگاہِ شوق سے
اِس طلسمِ خامشی کو توڑ دے !

ع۔ ق۔ جاوید

غزل

دل و جاں پہ حکمراں ہیں وہ نظر نہ آنے والے
یہ خبر نہیں کہاں ہیں وہ نظر نہ آنے والے

بھلا اپنی ہی نظر کو کوئی کس طرح سے دیکھے
کہ نظر میں بھی نہاں ہیں وہ نظر نہ آنے والے

نظر آ رہا ہے جو کچھ وہ مثال ہے بدن کی
مگر اس بدن کی جاں ہیں وہ نظر نہ آنے والے

وہ جہاں میں ہر کہیں ہیں پہ کسی جگہ نہیں ہیں
کہ مکین لامکاں ہیں وہ نظر نہ آنے والے

اگر اُن کے دیکھنے کی نہیں تاب ہی کسی کو
تو بہت ہی مہرباں ہیں وہ نظر نہ آنے والے

دمِ جستجو خبر بھی نہ ہوئی یہ کارواں کو
کہ دلیلِ کارواں ہیں وہ نظر نہ آنے والے

یہ جو ربطِ باہمی ہے سبب اس کا بھی یہی ہے
کہ ہمارے درمیاں ہیں وہ نظر نہ آنے والے

کوئی مانے یا نہ مانے ہیں گھرے ہوئے سب اُن سے
کہ محیطِ دو جہاں ہیں وہ نظر نہ آنے والے

اسدؔ اُن کو دیکھنا ہے تو کرا یئے دل کو زندہ
دلِ زندہ پر عیاں ہیں وہ نظر نہ آنے والے

اسد ملتانی

اکیس سال ایک عورت کے ساتھ وابستہ
اس کے دماغ نے ابھی تک قبول
تھا کہ وہ امرت سر کے بازاروں
ف جاتی ہوئی دکھائی دیتی
ہمیشہ کی طرح کہے
نال کہا ہے۔
الہڑی میا،

رنڈوا

سے بڑا قصور یہ تھا کہ وہ رنڈوا تھا۔ اُس نے اس بلا سے بچنے کے لئے جد و جہد کی بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ وہ دن کو دپ میں مارا مارا ہسپتال کے ٹی بی وارڈ سے لے کر سوادِ شہر میں مزنک سینکڑوں مرتبہ آیا اور گیا حتیٰ کہ راستہ بھر کے کنکروں کی نے وقوع اسے حفظ ہو گئی۔ لیکن اتنی ان تھک کوششوں کے باوجود وہ رنڈوا ہو گیا۔ اس بات کا، اس الزام کا اس کے پاس ایک ہی جواب تھا — رنڈوا ہو گیا، ہونا جو تھا۔ کیونکہ کسی اور بات سے محلے کے لوگوں کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ سب یہی کہتے تھے تم نے اس کے لئے کوشش بھی تو نہیں کی۔ اگر تم نے ذرا بھی تندہی سے کام لیا ہوتا تو وہ یقیناً بچ جاتی۔

اپنی تندہی کو یا تو وہ خود جانتا تھا یا ڈاکٹر پال جس کے مکان کا اُس نے دن میں کئی کئی مرتبہ طواف کیا اور جو ایک دائمی بیمار اور چھائیوں اور مہاسوں والی عورت سے مستقبل کے رنڈوے کے لگاؤ کو تعجب کی نگاہ سے دیکھتا اور کہتا — اُسے مرنے کیوں نہیں دیتا، سالا . . . . اور جب لوگ رنڈوے پر بیوی کی جانب سے بے پروائی اور بے وفائی کا الزام لگاتے تو وہ چاہتا کہ وہ شہر کے سب سے مشہور کرسچان ڈاکٹر پال کا نام بطور گواہ کے پیش کر دے . . . . . لیکن ڈاکٹر پال ایم ڈی ایک مصروف آدمی تھا اُسے کہاں فرصت تھی کہ اپنے مطب سے وقت نکال کر عدالتِ عوام کے کٹہرے میں محض اس بات کی گواہی دینے کے لئے آتا کہ رنڈوا در اصل بہت باوفا خاوند رہا ہے۔

اور اب رنڈوے نے بابو محلہ کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن شادی شدہ لوگوں کے اس محلے میں کسی نے اُسے مکان دینا گوارا نہ کیا۔ سب یہی کہتے تھے کہ تم رنڈوے ہو۔ رنڈووں کا کیا اعتبار!

وہ آسانی سے محلے میں رہ سکتا تھا۔ جہاں وہ اپنی بیوی کے ساتھ بیس اکیس برس سے رہتا آیا تھا اور جہاں اس کی بیوی نے تمام عورتوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے مراسم پیدا کئے۔ اور جہاں کی تمام عورتیں اُس کی خوش خلقی اور نیک سیرت کی دلدادہ تھیں لیکن یہی بات تو اُس کے لئے وبالِ جان ہو گئی۔ اگر اُس کی بیوی ایک خوش خلق اور خندہ پیشانی والی عورت نہ ہوتی تو محلے بھر کی عورتیں کہتیں۔ اچھا ہُوا جو وہ مر گئی۔ محلے کی عورتوں سے بات بات پر جھگڑا کرتی تھی۔ اپنے مرد کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ لیکن اب مرنے والی کے حُسنِ سلوک کی وجہ ہی سے لوگ رنڈوے کو مطعون کرتے تھے کہ اُس نے بیمار بیوی کی حسبِ دلخواہ پرواہ نہیں کی۔

حقیقت یہ تھی کہ اُسے مرنے والی سے محبت تھی۔ عام خاوندوں کی طرح وہ بھی رویا تھا لیکن کچھ دیر رونے کے بعد وہ یکایک چپ ہو گیا۔ اور بیوی کی موت کا غم اسے کھانے لگا۔ وہ جی بھر کر رو لیتا۔ یادگار کے طور پر اُس کھاٹ پر سر ٹیک لیتا جس پر مرنے والی سویا کرتی تھی تو نہ صرف اس کے دل پر سے ایک بوجھ سا اتر جاتا بلکہ محلے بھر کی عورتوں کی تسلی بھی ہو جاتی اور ملاں جس کا خاوند ہفتے میں سات راتیں باہر سویا کرتا تھا کہتی — آہ! رکمن کی ماں۔ اگر میرا خاوند میرے مرنے پر اس سے آدھا بھی روئے تو میں آج، ابھی اسی وقت زمین سے برابر ہونے کو تیار ہوں . . . . . اور پھر رنڈوا اس صورت میں ساری عمر کے لئے سبکدوش ہو جاتا۔ لیکن بات در حقیقت یہ تھی کہ وہ اس حادثے کو یاد کرنے اور نہ کرنے کے درمیان لٹکتا رہا اور . . . . زندگی بھر لٹکتا ہی رہا۔

عورتوں کی محلے میں جو نام نہاد برادری تھی اس کا خیال تھا کہ رنڈوا اپنی بیوی کی وفات پر صرف اس لئے نہیں رویا کہ وہ مشکو مہترانی کو بھی جان سے چاہتا تھا۔ وہ ہر روز دن نکلنے سے پہلے اور دن چھپنے کے بعد رنڈوے کے مکان پر سے گملا اٹھانے آیا کرتی تھی۔ اور رنڈوا اُسے ہر قسم کی غلاظت اٹھانے پر مجبور کیا کرتا تھا۔ اول تو مشکو خود ہی رنڈوے کے ہاں صفائی کا خاص خیال رکھتی تھی اور اپنے خاوند کی پنشن کے متعلق گھنٹوں سوال کیا کرتی۔ اس کا خاوند تین چار یا پانچ پادیگرز سے ریٹائر ہوا تھا اور اپنے چھوٹے بھائی کو جواچ کیسا تو جینے کی حد سے تجاوز ہوتے دیکھ کر دریا میں کود مرا تھا۔

شاید معاملہ اس حد تک نہ پہنچتا اگر رنڈوے میں علی الاعلان یہ کہنے کی جرأت ہوتی کہ میں عورتوں کے اس فضول، بے معنی ٹریبونل کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔ عورتیں چند منٹ تک جھک کر چپ ہو جاتیں لیکن

اس نے سوچ لیا کہ اس محلے میں رہنا ہے تو اسی کے مطابق رہنا ہے اور میں نے آج تک کسی کو ناراض نہیں کیا تو بیوی کے مرجانے پر کیوں کسی کو ناراض کروں لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کے بچاؤ کی کوئی صورت ہو جاتی اگر اس کا بارہ سالہ لڑکا حرامزدگی نہ کرتا۔

بات یوں ہوئی کہ ہندو عقیدے کے مطابق رنڈوے نے جیسے بر اپنی بیوی کے پھول چنے اور مروجہ طریقے کے مطابق اسے کنکھل سے گنگا مائی کے چرنوں میں بہانے کے لئے لے گیا۔ مرحومہ اپنے پیچھے وہی ایک بارہ سالہ لڑکا اور دو توام بچیاں چھوڑ گئی تھی۔ بچیاں تو کم سنی کے باعث اپنی ماں کی موت کے غم کو سمجھنے سے قاصر تھیں ان کے لئے تو ماں کی موت یہی تھی کہ جہاں انہیں ہر روز صبح اٹھتے ہی ایک دیکھا بھالا چہرہ دکھائی دیا کرتا تھا اب گھورتے اور اپنے آپ رحم کھاتے ہوئے اجنبیوں سے سابقہ پڑتا تھا لیکن اس صورت میں وہ اپنی ماں کو اس کی حقیقی موت سے ڈیڑھ ماہ پہلے ہی مار چکی تھیں ان دنوں جبکہ ان کی ماں ٹی بی وارڈ میں داخل ہونے کے لئے اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھتی اور نگاہ واپسیں اپنے سرمایہ حیات پر ڈالتی ہوئی رخصت ہوئی تھی۔ اب دونوں توام بچیوں کو روتے روتے دھوپ میں چیونٹیوں کے بلوں پر سو جانے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ان کے کام و دہن کو دہی اور شکر کا چٹخارہ بھول سا گیا تھا جسے مرنے والی صبح اٹھتے ہی اُن کے لئے تیار رکھا کرتی تھی.....

رنڈوے نے ان دونوں چھوکریوں کو محلے کی ایک رحم دل بیوہ کے سپرد کیا اور بڑے چھوکرے کو لے کر ہردوار روانہ ہوا۔

رنڈوے کے پاس ہردوار جانے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ وہ تو کب کے مرنے والی کی بیماری پر ختم ہو چکے تھے۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ اپنی بیوی کی آخری خواہش کہ اُس کی ہڈیاں جو ساری عمر آگ میں پھنکتی رہی ہیں، گنگا کے برفانی پانی میں بہا دی جائیں، پوری نہ کر سکا لیکن اس نے سوچا کہ اگر مرنے والی کے پھول بہانے کے لئے وہ اُدھار لے، ہردوار پہنچ کر کرایہ کے علاوہ وہاں پنڈتوں سے اپنی چمڑی کھنچوائے اور پھر عمر کا بقیہ حصہ ادھار سے سبکدوش ہونے کی فکر میں گھلتا رہے تو یقیناً مرنے والی کی روح کو صدمہ ہوگا۔ چنانچہ اس نے ہردوار جانے کی بجائے چپکے سے مرنے والی کے پھول دریائے بیاس میں بہا دیئے۔

بیاس میں پھول بہانے کے بعد وہ امرت سر پہنچا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ایک آدھ دن اسی شہر میں گذار دے تاکہ واپسی پر لوگوں کا یہی خیال ہو کہ وہ ہردوار ہو آیا ہے۔ چنانچہ وہ لڑکا اپنے بیٹے کے ساتھ امرت سر کے بازاروں میں گھومنے لگا۔ بیس اکیس سال ایک عورت کے ساتھ وابستہ رہنے کے بعد ایکا ایکی رنڈوا ہو جانے کو اس کے دماغ نے ابھی تک قبول نہیں کیا تھا۔ اُسے تو یہ بھی نہیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ امرت سر کے بازاروں میں گھوم رہا ہے۔ اُسے ہر گلی اپنے محلے، اپنے گھر کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی اور معاً اسے خیال یہی آتا تھا کہ گھر پہنچتے ہی اُس کی بیوی ہمیشہ کی طرح کہے گی۔ شرتی کے بابو! دیکھا تم نے؟ آج تمہارے لالہ نے مجھے چھنال کہا ہے۔ بانٹے کچھ بتاشے و تلاشے۔ بیٹے ہوئے اور ماں کو چھنال کہا۔ ارے گوری میا، بس رکھ لے تو اب، میں تو یہی مانگتی ہوں تجھ سے......

اس وقت وہ سوچا کرتا تھا کہ شرتی کی ماں "تمہارے لالہ" کیوں کہتی ہے۔ گویا وہ لالہ میرا ہے۔ اُس کا کچھ نہیں۔ اور پھر اس کی شکایت میں ایک یہ خواہش، خوشی کی ایک لہر پوشیدہ ہوتی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ اس کا لالہ اپنی پیاری ماں کو چھنال کہے!...... عجب عورت تھی۔ اور انہی باتوں کی وجہ سے رنڈوا سخت تنہائی محسوس کرتا تھا۔ اگرچہ اس کا بیٹا ساتھ تھا تاہم اُسے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے دنیا نے یک لخت اُسے چھوڑ دیا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ امرت سر کے بازاروں میں سے بھاگ جائے۔ دنیا کے بازاروں سے بھاگ جائے اور شمشان کے دروازے پر کھڑا ہو کر اس راستے کو تلاش کرے جس پر کہ اُس کی بیوی گئی تھی۔ رات کو اُسے کہکشاں میں اُس کے پاؤں کے نشان ملتے۔ اور دن کو سینکڑوں ہزاروں آوازوں میں اس کی آواز، میٹھی، مترنم، آہستہ آہستہ سنائی دیتی — شرتی کے بابو.... تمہارے لالہ نے...... شرتی کے بابو آج تمہاری بٹو چھوٹی ہے کل بڑی ہو جائے گی...... اے جی، میں کہتی ہوں...... اور پھر وہ کہتا "اے رانی، تم نے جھٹ سے دو چھوکریاں جن دی ہیں۔ شرتی ایک ہی جنے اور وہ بھی...... کیوں رانی . شرتی کے بابو! — وہ اِدھر اُدھر دیکھتی اور کہتی — تم ہی نے دیئے ہیں نا۔ پلے ہیں یا شیر کے بچے۔ اور رنڈوے کو ان تمام آوازوں، تمام نظاروں سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بڑا سا ہوائی جہاز کسی دلدل والے جنگل میں ٹکرا گیا ہے۔ اور اس کے ٹوٹے ہوئے ڈھانچے میں سینکڑوں، ہزاروں سلاخیں، درختوں کی بے تحاشا ٹہنیوں میں الجھ کر قائمہ، منفرجہ، وغیرہ ہر قسم کے زاویئے بنا رہی ہیں۔ اور اس ڈھانچے کے نیچے انجن ابھی دھیما دھیما سلگ رہا ہے یا سب کچھ اُسے اس فلم کا آخری حصہ دکھائی دیتا جو طوفان کے منظر پر ختم ہو رہی ہو۔ اور اس طوفان میں کوئی نحیف و ناتواں پکارتا ہوا جا رہا ہو۔ رانی! ...... تم کہاں ہو! میرے

لاٹو سے شرتی کی ماں ــــــ رانی ۔

اس وقت رنڈوا ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ایک سمت کو جا رہا تھا۔ وہ گرنا ہی چاہتا تھا کہ اُسے اپنے کانوں میں ایک گھنٹی کی آواز گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔

وہ گھنٹی کی آواز نہ تو کسی شاعر کے قافلے کی صدائے جرس تھی اور نہ صوفی لوگوں کی وہ بانگِ درا جو انسان کے اندر سے پیدا ہوتی ہے اور جسے سنتے ہوئے انسان مقامِ حق پر پہنچ جاتا ہے۔ بلکہ وہ ایک عام گھنٹی کی آواز تھی جو سینما والے اپنے اشتہار بانٹتے ہوئے بجاتے ہیں۔ رنڈوا بڑے غور سے اس آواز کو سننے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ شہر کے ایک سینما میں کھیل "گل بکاولی" لگا ہوا ہے۔ گل بکاولی دیکھنے کا خیال ایک تیزی سے اُس کے ذہن میں نمودار ہوا۔ وہ اس دنیا سے جو کہ آناً فاناً اُس کے ارد گرد پیدا ہو گئی تھی بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس بات کا تو سوال ہی نہ تھا کہ ایسا فعل کرتے ہوئے اسے بیوی سے محبت تھی یا نہیں۔ بلکہ کوئی زخم تھا جس پر مرہم رکھنے کے لئے اُس نے سینما کا رُخ کیا۔ اگر کوئی زخم نہ ہوتا غم ہی نہ ہوتا تو شاید گل بکاولی دیکھنے کا خیال اس شدت سے اس کے ذہن میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ وہ سیدھا اپنے راستے پر چلتا جاتا اور شام کے قریب کسی ویشنو بھوجن شالہ میں کھانا کھا کر گورو کی نگری میں دربار صاحب کے کسی بُنگے میں پڑ کر چپکے سے رات گزار دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ کیونکہ اس کا دل غم واندوہ سے تقریباً ہلکان ہو چکا تھا۔

لیکن رنڈوے کا غم گل بکاولی سے زیادہ تھا۔ دس گل بکاولیوں سے زیادہ۔ بیس سے زیادہ۔ تاج الملوک کی ریشہ دوانیوں میں اس کا دل اُلجھ نہ سکا۔ بکاولی کی حرکتیں اُسے محض اس لئے بُری لگیں کہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اور جب تاج الملوک کے باپ کو بصارت ملی تو رنڈوے کو یوں محسوس ہوا جیسے سب دنیا اندھی ہو گئی ہے۔ وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹھکا اور سوچنے لگا۔ کیا اُس کا تاج الملوک بھی زندگی میں اُس کے لئے بصارت لائے گا۔ اس کے بعد پردۂ سیمیں پر دریا کے بہاؤ کا بہت اچھا منظر آیا۔ لیکن رنڈوے کی آنکھیں سب سین سینری سے بے نیاز ہو گئی تھیں۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا۔ اُس کے سر میں سخت درد تھا۔ تین سال پہلے اس نے سنگ جانی کی کانوں میں ایک مزدور کو کوئلے میں بیلچہ مارتے دیکھا تھا۔ وہ منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا اور اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے سر کے کوئلوں میں کوئی زور سے بیلچہ مار رہا ہے اور جب وہ سینما سے باہر نکلا تو مسکرانے لگا اور سوچنے لگا کہ وہ آخر سینما دیکھنے کیوں چلا گیا تھا۔ وہ خود بھی اپنے جذبات کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے یا ہزار نالوں کا نچوڑ جو کہ ہزار آتشہ ہو کر مسکراہٹ بن گیا ہے اور اس بات کا اس کے اپنے پاس کوئی جواب نہ تھا کہ وہ سینما دیکھنے کے لئے کیوں چلا گیا تھا فقط اسے اتنا محسوس ہوا کہ اُس نے کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ اور یہ خیال وزنی ہوتا ہوا کسی نہ گھُلنے والی چیز کی طرح آہستہ آہستہ دل کی تہ میں بیٹھنے لگا۔ سیسے کی قسم کے اس خیال سے بچنے کیلئے رنڈوے نے کوشش کی کہ اگر گُل بکاوَلی میں کوئی اخلاق آموز نکتہ ہو تو اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس قسم کا تجربہ اس نے زندگی میں بہت مرتبہ کیا تھا جب کبھی وہ اپنے آپ کو مصیبت میں گھرا ہوا پاتا تو عموماً ایک مذہبی کتاب کو اٹھا کر کھولا کرتا۔۔۔ یونہی، کسی صفحے سے۔ اُسے یقین ہوتا تھا کہ اُس پر ضرور کوئی ایسی ہدایت لکھی ہو گی جسے پا کر وہ سیدھے راستے پر چل سکے گا۔ اور وہ تحریر ہمیشہ اُس کے حسبِ حال ہوا کرتی تھی، اور اسے پڑھ کر وہ یک گونہ مطمئن ہو جاتا تھا مثلاً ایک دفعہ جب اس کی کتابوں کی دُکان جل گئی تھی، اور دوسرے بیوپار کے لئے اس نے اپنے ارادے کو بہت کمزور پایا تھا تو اُس نے کتاب کھول کر پڑھی لکھا تھا ــــ "جب بار بار عہد کرنے پر بھی ہم اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہوتے تو اس شخص کا کیا حال ہو گا جو یا تو کسی چیز کا قصد ہی نہیں کرتا یا بلطل یقین کے ساتھ اپنے راستے میں بڑھنا چاہتا ہے۔" اور رنڈوے نے اسے کتنا حسبِ حال پایا تھا۔ اور اپنی ہر ناکامی کا الزام اپنی غیر مستقل مزاجی پر تھوپ کر مطمئن ہو گیا تھا۔ اس کے دل سے اس تجزیہ نفس کو دیکھ کر ایک ٹیس دُور ہو گئی تھی۔ خدا جانے وہ بات حسبِ حال تھی یا نہیں لیکن مذہبی کتابوں میں ہر بات حسب حال ہوتی ہے اور جب کبھی وہ دوراہے پر پہنچ کر رہبری کے لئے اس کی طرف رجوع کرتا تو وہ اُسے ہمیشہ ٹھیک راستے پر لگاتی تھی۔ اس کے باوجود جب وہ دُکھی رہتا تو اس کے خیال کے مطابق قصور اس کے ایمان کا ہوتا۔

اور اپنی بیوی کی موت کے بعد رنڈوے نے اپنی دو معصوم بچیوں کو اپنے سامنے بیٹھے دیکھا تو وہ بہت پریشان ہوا کیونکہ وہ رو نہیں رہی تھیں۔ وہ عورتوں کو اپنے ارد گرد روتے دیکھ کر گھبرا اٹھی تھیں۔ گھر میں سینہ کوٹنے اور باضابطہ بین کی وجہ سے ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ شہر سے آئی ہوئی رشتہ دار عورتیں مریضہ کی چارپائی، مریضہ کے برتن، مریضہ کی تمام ان چیزوں کو جن سے کہ وہ زندگی بھر دابستہ رہی تھی، اور جو اسے اپنی جان

سے بھی زیادہ عزیز تھیں اور جو چیزیں اُس نے اپنے مفلوک الحال خاوند کی عزبت کے باوجود بنائی تھیں اٹھا اٹھا کر باہر پھینک رہی تھیں ۔ اس وقت رنڈھے کا دل ڈوب گیا تھا ۔ وہ رو نہ سکا ، اُس کا غم رونے سے کہیں زیادہ تھا اور مالاں کہتی تھی ، دشمن کی ماں ! مردوے کی آنکھ میں ایک آنسو بھی نہیں ، تمام مرد ایک ہی سے ہوتے ہیں ۔ دشمن کی ماں ! یہ تو جی سے چاہتا تھا کہ کب چھٹی ملے ۔ اور کب یہ مشکو کے ساتھ گلچھرے اڑائے ۔ اور رنڈوے کو یوں محسوس ہوتا تھا ۔ جیسے اُن چارپائیوں ، اُن برتنوں کے ساتھ اُسے بھی ایلومنیم کا ایک پچکا ہوا ناکارہ برتن سمجھ کر باہر پھینک دیا گیا ہے اور اُس کے بچوں کو بھی ۔ لوگ اصرار کرنے لگے کہ بڑا پلنگ ، گیارہ برتن ، ایک کامدار جوتا ایک شال اور ایک کوئی یونہی چھوٹا سا زیور خاندانی پروہت کو دان کیا جائے ۔ اس وقت اس کا ذہن کہہ رہا تھا کہ تم رنڈوے نہیں ہو لیکن مالاں ، تھانیدار کی بیوی محلے کی سب عورتیں ، دنیا کے تمام مرد اس کے اردگرد پکار پکار کر کہہ رہے ہیں ۔ ایسے کمبخت ! تم رنڈوے ہو گئے ہو ۔ تمہیں ایک عورت کی نعمت سے محروم کر دئیے گئے ہو ۔ تم دنیا کے سامنے روسیاہ ہو تم مر کیوں نہ گئے ۔ حالانکہ تمہاری بیوی موت کی آغوش میں سو چکی ہے ۔ تمہیں چاہیئے تھا کہ زہر کھا لیتے ۔ وحشیوں کا وہ رواج کتنا اچھا ہے کہ وہ خاوند کے مرجانے پر بیوی کو اور بیوی کے مر جانے پر خاوند کو اس کے ساتھ غار میں دھکیل دیتے ہیں ۔ ایک کو دوسرے کے بعد جینے کا کوئی حق نہیں ہے اور اُس وقت سخت اضطراب میں رنڈوے نے پھر کتاب کی طرف رجوع کیا تھا ۔ اور پھر حسبِ حال الہام ہوا تھا ۔

گل بکاؤلی کا قصہ ختم ہوا بوجھ ہلکا ہونے کی بجائے بڑھ گیا اور اس غم کو اور بوجھل بنانے کے لئے خفت بھی شامل ہو گئی ۔ بنگلے میں سوتے ہوئے اُسے تمام رات اپنی حماقت کا خیال آتا رہا اور وہ سوچنے لگا کہ بیوی کی موت کے چھٹے روز اس کا سینما دیکھنا کس حد تک جائز ہے ۔ اگر وہ اکیلا ہوتا تو کہہ دیتا ۔ جائز ہے ، بالکل جائز ہے ۔ اس میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہو جاتا اور وہ کپڑے پھاڑ کر بنگلے سے باہر بھاگ جاتا ۔ مگر اخلاق کے سب مجموں نے اُسے روکے رکھا اور برابر کہتے رہے تم نے بُرا کیا ۔ لیکن ایک خیال تھا جو اس کے دل میں بار بار اُٹھتا تھا اور وہ یہ تھا کہ اگر اُس کا بارہ برس کا بیٹا ساتھ نہ ہوتا اور وہ دنیاوی اقدار کے مطابق اپنا غم ہلکا کرنے کے لئے شراب کے چند گھونٹ پی لیتا اور کسی طوائف کے ہاں رات گذار دیتا تو کیا اخلاقی تعزیرات کے مطابق وہ واجب التعزیر تھا ۔

رات کے پچھلے پہر وہ ہڑبڑا کر اُٹھا ۔ اور بولا ـــــ تو ثواب کی حدود کہاں سے شروع ہوتی ہیں ؟ ...... اس وقت بچے کی آنکھ بھی کھل گئی ۔ اُس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا ، باجی ! دربار صاحب کی حدود گھنٹہ گھر سے شروع ہوتی ہیں ۔ لیکن آپ کو اس وقت تانگہ نہیں ملے گا ..... چپ رہ کتے کے پلے ، سوچا ، ثواب کی حدود گھنٹہ گھر سے شروع ہوتی ہیں ۔ تانگہ نہیں ملے گا ۔ اور دن بھر کی دماغی اُلجھن اور شب کی ذہنی کشمکش کا حاصل یہی تھا کہ گل بکاؤلی کے ہیرو کی طرح کیا شراب و شباب میرے غم کو ہلکا کرنے کی بجائے بڑھا نہیں دیں گے ؟

رنڈوا امرت سر میں ایک دن گذارنے کے بعد لوٹ آیا ۔ اُس کے بیٹے نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی کہ وہ مرنے والے کے پھول گنگا جل میں بہانے کی بجائے بیاس میں پھینک کر چلے آئے ہیں ۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اُسے اس راز کے اخفا کے لئے تاکید نہیں کی گئی تھی ۔ باپ اور بیٹا دونوں مل کر جھوٹ بولتے رہے ۔ اور کہتے رہے پانڈوں نے ہمارا سو روپے کے قریب دان کروا دیا ۔ اور انہوں نے ہمارے خاندان کا شجرہ بالکل ٹھیک سنایا لیکن سینما کے متعلق چونکہ لڑکے کو اخفا کی ہدایت کی گئی تھی ۔ اس لئے اُسے اس وقت تک چین نصیب نہ ہوا جب تک کہ اُس نے یہ بات کسی کو کہہ نہ ڈالی ......

اور اس کے بعد رنڈوے کے لئے زندگی دوبھر ہو گئی ۔ وہ شخص جو اپنی موت کے چھٹے روز تفریح گاہ میں جا سکتا ہے اس کے متعلق یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اُسے مرنے والی سے محبت تھی ۔

اس کے بعد بھی مشکو مہترانی آتی رہی ۔ دراصل وہ بہت ہمدرد عورت تھی چونکہ وہ خود بیوہ تھی اس لئے وہ ایک رنڈوے کے تاثرات کو جان کر خوش ہوتی تھی ۔ اور آنسو بہاتی تھی ۔ وہ رنڈوے کی دکھتی رگوں کو طرح طرح سے چھیڑتی ۔ چند دن کے بعد رنڈوے نے اسے مزید تاثرات بتانے سے انکار کر دیا لیکن وہ عموماً فرش پر جمتے ہوئے صابن کو چھیلنے کے لئے کھڑی ہو جاتی اور اپنے آپ کہنے لگتی ـــ مالکن ، خدا اُسے بہشت نصیب کرے ۔ وہ تو ایک بہت اچھی عورت تھی بابو جی ، میں جھوٹ نہیں کہتی اس کا نام لئے تو آج بھوکے کو روٹی ملے ۔ اُس نے کبھی کوئی دن تیوہار نہیں جانے دیا جبکہ میرے پلے میں ترچادلی نہیں باندھ دی ۔

لیکن ایسی باتوں کا رنڈوا تجزیہ کر لیا کرتا تھا اِن باتوں کے باوجود اس نے بھنگن کو اٹھنی ماہانہ سے زیادہ نہیں دیا اور وہ ہمیشہ یہی کوشش کرتا رہا کہ مشکو کو اپنے ہاں زیادہ دیر تک روکے ۔ لیکن جہاں اُسے تجزیے کی ضرورت تھی ، وہاں وہ تجزیہ نہ کر سکا اور جہاں تجزیے کی ضرورت نہ تھی وہاں وہ اخلاق

کی حدود سے گذر گیا۔ جہاں اُس بھنگن کو دو چار گالیاں دے کر نکال دینا سماجی نقطۂ نگاہ سے کوئی مخربِ اخلاق بات نہ تھی وہاں اس نے اخلاق کا دامن تھام لیا اور یہ باتیں محض اس وجہ سے ہوئیں کہ وہ رنڈوا تھا۔ کبھی کبھی وہ معمولی باتوں پر سیخ پا ہو جاتا اور کبھی شدید باتوں کے سامنے مکمل طور پر مستغنی۔ کبھی اُس کے دماغی قوائے یک لخت تن جاتے اور کبھی اختلال کی حد تک اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیتے وہ مفید و غیر مفید میں امتیاز کرنے سے قاصر تھا۔۔۔۔۔۔ اس کی بچیوں کے سامنے سے کوّے روٹی اٹھا کر لے جاتے تھے۔ لیکن کوئی کوّوں کو منع نہ کرتا۔ نہ کوئی عورت رحم کھا کر اُن کے روکھے بالوں میں تیل ڈالتی۔ اُن کے بال لمبی لیکھوں اور پلکیں چمجوؤں سے سفید ہو رہے تھے۔ رنڈوا کئی دفعہ اُن کے لئے ماں بننے کی کوشش کرتا۔ وہ اپنی بیوی کی طرح ردلی کو گوگو کے نام سے پکارتا ـــــ گوگو کھائے گا بیٹا، میرا اپنا مُنّا گوگو کھائے گا۔۔۔۔ لیکن اسے فوراً ہی محسوس ہوتا کہ وہ گوگو کا لفظ اُس بے ساختگی سے، اُس محبت سے ادا نہیں کر سکا۔ اُس وقت وہ پیار کی بجائے دونوں کی معمولی سی ضد پر بھی ایک چپت لگا دیتا۔ اور اِن دونوں جب کبھی وہ محلّہ میں نکلتا تو ہمیشہ اُسے دائیں یا بائیں طرف سے آوازیں آتیں۔ یہی ہے وہ رنڈوا ـــــ جس نے اپنی بیوی کی مرنے کے چھٹے روز تھیئٹر دیکھا تھا، یہی ہے۔ وہ رنڈوا جس نے۔۔۔۔

رنڈوے نے اپنے آپ کو مدافعت کے لئے بہت کمزور پایا۔ ایک رات لوگوں کے طعن و تشنیع سے تنگ آکر اس نے چپکے سے مکان چھوڑ دیا اور اپنی دونوں تو مند بچیوں کو کنگلوں پہ اٹھائے اور کرایہ کے ایک چھکڑے پر سامان لادے وہ شہر کے کسی اور کونے میں جگہ پانے کے لئے چل دیا۔ رات اس نے کمیٹی کے باغات میں کاٹی اور صبح وہ کرنیل گنج میں بدرو کے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں مذبح کے قریب دو کوٹھڑیاں خالی تھیں۔ اور اُن کوٹھڑیوں کے پڑوس میں چنڈال رہتے تھے جو کہ مویشیوں کے ہسپتال میں مرنے والے اور ذبح خانے میں ذبح کئے جانے والے جانوروں کی آنتیں سکھا کر کمانوں اور دھاجوں کے لئے تار بنایا کرتے تھے۔ اور جب اُن کے گھروں کی طرف سے بُو اُڈ کر جاتی تو ناک سڑ جاتی۔ لیکن سوائے اس جگہ کے رنڈوے کو کوئی باعزت جگہ نہ مل سکی رنڈوا ایک نوع سے بدرو کے کنارے پہ رہنے سے خوشی محسوس کرتا تھا۔ کیونکہ بدرو میں شہر بھر کی تلچھٹ آتی تھی اور وہ بھی اپنے آپ کو تلچھٹ سمجھنے لگا تھا۔ لیکن وہ اُن آنتوں کی بدبو برداشت نہ کر سکا جو ہر روز صبح اٹھتے ہی اُس کے دماغ میں آیا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی معاشرت نے اُسے بچپن سے ہی گائے کی عزت کرنا سکھایا تھا۔ لیکن اتنے مصائب کے باوجود وہ گائے کا احترام کرنے سے باز نہ رہ سکا۔ اور جب گئے کا گوشت اُس کی نظروں کے سامنے سے گذرتا تو اُسے نہایت شدت سے محسوس ہوتا کہ وہ رنڈوا ہو گیا ہے۔ لیکن اس تہمت نے کرنیل گنج تک رنڈوے کا پیچھا کیا۔ اور ایک دن اُس نے پڑوس کے بوچڑ کی بیوی سے وہی سینکڑوں مرتبہ دہرائے گئے الفاظ سُنے ـــــ یہ وہی رنڈوا ہے جس نے اپنی بیوی کے مرنے کے چوتھے روز ہی سینما دیکھا تھا

رنڈوے کا اس محلّے کو چھوڑ کر اس سے زیادہ خوفناک قعرِ مذلت میں گرنا ممکن ہی نہیں تھا وہ کبھی کبھی دروازے پر بیٹھ کر سوچنے لگتا ـــــ انسانیت نے ترقی کیا کی ہے ـــ بس یہی، کہ اُس کا ہر فرد چوڑا ہے پر ہر روز اُس کی طرف دیکھ کر یہی کہے ـــــ یہی ہے وہ مرد جس نے اپنی بیوی کے چھٹے روز سینما دیکھ لیا تھا۔ ایک قسم کی سستی کی رسم سماج نے ابھی تک روا رکھی ہے۔ انسان نے کچھ بھی ترقی نہیں کی۔ وہ ننگے پن سے گرا اور اس نے لبادہ بنایا اور لبادے سے پندرہ ہزار برس کے عرصے میں اس نے مکلّف کالروں والی قمیص تیار کی ہے۔ اور ابھی تک وہ اتنی ترقی نہیں کر سکا کہ تمام کپڑے اُتار پھینکے۔ وہ آزاد محبت کر کے دوسرے دائمی رنڈاپے سے آزاد ہو جائے۔ اُسے اتنی بھی شخصی آزادی نہیں کہ وہ خودکشی کر لے۔ مذہبی کتاب کو پھر کھولنے پر اُسے احساس ہوا کہ کتاب پر ایک کڑی تنقید کی جا سکتی ہے۔

بیوی کی موت کے چار ماہ کے اندر اندر وہ اپنی زندگی کو بے کار اور بے مصرف سمجھنے لگا اور اس ذہنی کوفت اسی سخت تنہائی سے بچنے کے لئے ایک عورت کی پناہ ضروری تھی۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ در اصل اُسے اپنی عمر کے تقاضے کے مطابق کسی عورت سے وابستہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور پھر اس کی بیوی کو مرے فقط چار ماہ ہی تو ہوئے ہیں لوگ کیا کہیں گے۔ دیکھا ہم نہ کہتے تھے کہ اس شخص کو اپنی بیوی سے ذرا بھی محبت نہیں تھی یا وہ اس بات کا منتظر تھا کہ کب اُس کی اچھی بھلی بیوی مرے۔

اُس کی آنکھوں کے سامنے کل بھاڈلی کا کھیل پھر گیا اور سوچنے لگا کہ دوسری شادی اگر اس کے معاملے میں ممکن بھی ہو جائے تو کیا اُس کی طبیعت کا اضمحلال دور ہو جائے گا۔ ان دنوں اسے ایک فسٹ کلاس مجسٹریٹ کی کچہری میں پیادے کی آسامی مل گئی۔ بیوہ عورتیں اپنے بچوں کی جائداد کے لئے وراثت کی سندیں حاصل کرنے آتیں تو وہ اِن سے بے تحاشا روپے اینٹھا کرتا۔ مرد دیوانی میں اُس کے سامنے خراب ہوا کرتے اور وہ اُن سے کثرت سے رشوت لیا کرتا۔ اور ایسا کرتے ہوئے اُسے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا کہ وہ بھی کبھی انسان تھا۔ وہ صاحب کے بنگلے میں آڑوؤں کی چھاؤں تلے صاحب کی ٹانگیں دبا دبا کر بہت سے کام نکال لیا کرتا اس چار پانچ ماہ کے عرصے میں اس نے لوگوں

کی خوب اچھی طرح سے کھال ادھیڑی۔ اُسے روپیہ پاکر اتنی خوشی نہیں ہوتی تھی جتنی روپے چھین کر ہوتی۔ روپے ہاتھ میں آنے سے پہلے اُسے روپوں کی خواہش ہوتی اور جب لوگوں کے ہاتھ سے نکل کر وہ اُس کے اپنے ہاتھوں میں چلے آتے تو اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ روپے اب ٹھیکری ہو گئے ہیں لیکن وہ ان ٹھیکریوں کو بھی لوگوں کو ادھار کے طور پر دینے لگا۔ اور زیادہ سے زیادہ سود لگانے لگا۔

ان دنوں اس کی اپنی سالی سے خط و کتابت تھی۔ اس کی سالی تیس پینتیس برس کی ایک چھوڑی ہوئی عورت تھی، اور رنڈوا اُسے اپنے گھر میں ڈال کر اپنے آپ سے انصاف کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اگر روپے اس کے ہاتھ میں ٹھیکری ہو جاتے تھے تو وہ سوچتا کیا بڑھاپے میں ایک نوجوان عورت اُس کے ساتھ وابستہ ہو کر اپنی جوانی نہیں کھو بیٹھے گی!

اچھا ہوا کہ رنڈوے کو اس ذہنی کشمکش میں خودکشی کی حد تک شخصی آزادی حاصل کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ وہ معمولی سا بیمار رہا، سردی لگی اور مر گیا۔ مرنے میں اسے بہت دقت پیش نہ آئی۔ صرف دو ایک تکلیف دہ ہچکیاں آئیں اور وہ مر گیا ـــــ مر گیا!

رنڈوے کا مر جانا بھی کوئی سانحہ ہے! لے دے کر صرف یہی بات تکلیف دہ تھی کہ دو بچیاں رہ گئی تھیں جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا یا دوسری بات یہ تھی کہ محلے کے لوگ پوچھتے تھے۔ رنڈوا مر گیا؟ سچ مچ مر گیا! ـــــ حالانکہ اس کے مرنے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔

رنڈوے نے کافی پیسے چھوڑے اور مرنے کے بعد جب اُس کے بوسیدہ ٹرنک کی تلاشی لی گئی تو اُس میں چند عشقیہ خطوط نکلے جو مرنے والے نے اپنی سالی کے نام لکھے تھے اور پوسٹ نہیں کئے تھے۔ اور جن میں گڑگڑا کر شادی کے لئے استدعا کی تھی۔ اس ضمن میں بھی رنڈوے سے ایک لغزش ہوئی۔ وہی عام لغوی لغزش ـــــ وہ اپنے خط جلا سکتا تھا۔ لیکن خدا جانے اسے اپنے خط کیوں عزیز تھے۔ اس کے علاوہ اگر وہ ذرا بھی احتیاط سے کام لیتا تو خطوط کے اوپر تاریخ نہ دیتا یا انہیں پوسٹ کر دیتا۔ لیکن گل بکاولی کا قصہ دہرانے کی ہمت نہ اس نے انہیں وہیں رکھ دیا تھا اور لوگوں کو پتہ چل گیا کہ رنڈوا اپنی سالی پر نگاہ رکھتا تھا۔

رنڈوے کے بیٹے نے کتاب کی راکھ پر زندگی سے ایک افسانہ تعمیر کیا۔ اور اس کا نام رکھا ـــــ "گل بکاولی" اور جب وہ اپنے آپ کو بہت بڑا تاج الملوک تصور کرتا تو لوگوں کے سامنے شور مچانے لگتا ـــــ میرا باپ بے قصور آدمی تھا" ـــــ لوگ اسے جنونی سمجھ کر ہنس دیا کرتے۔ اور جب کبھی وہ بازار میں نکلتا تو لوگ اس کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہتے۔ "یہ اُسی رنڈوے کا بیٹا ہے جس کے نفس کی آگ بیوی کی موت کے چھ ماہ کے اندر اندر ہی بھڑک اٹھی تھی۔"

راجندر سنگھ بیدی

غزل بہ طرزِ قدیم

کچھ اُس کی نگاہوں کا انداز جو پائے ہے
دل ہستیٔ فانی کو کچھ بھول سا جائے ہے

ہر تیرِ نظر اُس کا افلاک کو ڈھائے ہے
رہ رہ کے ابھارے ہے رہ رہ کے مٹائے ہے

دنیا کو محبت سے واعظ جو ڈرائے ہے
یہ بات لگائے ہے یا بات بنائے ہے

ذرّوں کو سلائے ہے تاروں کو جگائے ہے
کچھ دھیمے سُروں میں وہ جب راتوں کو گائے ہے

یہ وحشتِ دل کیا ہے اک طُرفہ معمّہ ہے
سو طرح اجاڑے ہے سو طرح بسائے ہے

گو جذبِ نظر اُس کا ہے اپنی جگہ لیکن
کیا جانئے کس جانب کھینچے لئے جائے ہے

رنگ اس کے تغافل کا پہلے سے بھی ہے بڑھ کر
لیکن دلِ دیوانہ کب ہوش میں آئے ہے

فرقت کے برابر ہے اس شوخ کا ملنا بھی
ایسے میں کوئی خود کو کھوئے ہے یا پائے ہے

کیا حسن کی فطرت بھی بدلے ہے کہیں اے دل
کیوں باز نہ آئے ہے کیوں جان کھپائے ہے

نیرنگِ ستم اُس کا کس طرح بیاں کیجے
کچھ بھول بھی جائے ہے کچھ یاد بھی آئے ہے

ہستی کی شبستاں میں یہ کون چراغِ دل
اس طرح جلائے ہے اس طرح بجھائے ہے

یہ دردِ محبت ہے آپ اپنی دوا ناداں
رونا ہو کہ ہنسنا ہو کچھ کام بھی آئے ہے

خود سوچ لے کیا ہوگا اس سوچ کا دھیان آنا
یاد اُس کی بھلاتے ہی جب جی پہ بن آئے ہے

میخانے کی ہستی بھی ہے آج اک افسانہ
ساقی مجھے آنکھوں سے وہ جام پلائے ہے

ہے ہوش کا نسخہ بھی مٹھی میں چھپا اُس کی
جو آنکھ زمانے کو دیوانہ بنائے ہے

احساس یہ ہوتا ہے اکثر شبِ فرقت میں
جس طرح کوئی چپکے سے پاس بلائے ہے

اُٹھ جاتی ہیں وہ آنکھیں کچھ یوں دلِ غمگیں پر
رہ رہ کے کوئی جیسے رُوٹھے کو منائے ہے

یہ پردۂ سازِ غم یہ نقش و نگارِ دل
کیا کیا نہ سنائے ہے کیا کیا نہ دکھائے ہے

منزل ہی نہیں کرتا وقتِ گذراں دم بھر
یہ صبحِ ازل ہی سے کیا قافلہ جائے ہے

جس راہ میں اے واعظ سوچ ہے اک اک قدم
سنتے ہیں وہی رستہ میخانے کو جائے ہے

اقرارِ خطا کیا ہو اور عذرِ خطا کیا ہو
وہ جرمِ محبت بھی کب دھیان میں لائے ہے

لے کٹ گئی آج آخر یہ زندگیٔ فانی
اے دوست، خدا حافظ، کچھ نیند سی آئے ہے

وہ جا بھی چکا کب کا وہ بھول چکا کب کا
دل ہے کہ فراقؔ اب تک دامن کو پکڑے ہے

فراقؔ گورکھپوری

دو غزلیں

تھی اُمیدوں کی وہ دولت بھی مرے پاس اک دن
لے گئی لوٹ کے قسمت سے جسے یاس اِک دن

اپنی خوں گشتہ تمنّا سے کروں گا میں عشق
اِس طرح پائے گی تسکین مری پیاس اِک دن

عمرِ رفتہ سے میں جذبات کی مانگوں گا بھیک
رنگ لائے گا مری روح کا افلاس اِک دن

اب میں ہر وقت یہ محسوس کیا کرتا ہوں
مار ڈالے گی مجھے شدّتِ احساس اِک دن

نگہِ لطف سے تو کیوں ہے ہراساں اختر؟
آ ہی جائے گی یہ آفت بھی تجھے راس اک دن

(۲)

شبِ تار! تیری خموشی کے قرباں بتا آمد آمد ہے کس رشکِ مہ کی
یہ بزمِ فلک کیوں سجائی گئی ہے؟ یہ تاروں کا چھڑکاؤ کیوں ہو رہا ہے؟

خوشی غم سے بہتر ہے یا غم سے بدتر، یقیناً ہے یہ بحث دلچسپ، لیکن
جب اِک جنس بازار ہی میں نہیں ہے تو اُس جنس کا بھاؤ کیوں ہو رہا ہے؟

اگر تو نے اختر محبت نہیں کی تو کم بخت! اس حال کو کیسے پہنچا؟
یہ سینے میں ناسور کیسے ہیں تیرے یہ دل میں ترے گھاؤ کیوں ہو رہا ہے؟

اختر انصاری

ست نجا

الہ آباد کو صرف صوبۂ متحدہ ہی کے اکثر شہروں پر نہیں بلکہ ہندوستان کے بعض صوبوں پر بھی زمانۂ قدیم سے بوجوہ چند فوقیت حاصل ہے۔ پھر لطف یہ کہ جملہ مختلف امتیازی خصوصیات میں مشکل ہی سے کوئی اس کا شریک وسہیم نظر آئے گا۔ مذہبی، تاریخی، انقلابی حتیٰ کہ ادبی حیثیت میں بھی اس کی انفرادیت بلا مبالغہ اپنی آپ نظیر ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ مولانا صفیؔ لکھنوی نے اس کی شانِ ادبیت کا بدیں الفاظ اعتراف کیا تھا۔

ع۔ حضرتِ اکبر لسان العصر کا مسکن ہے یہ

آئیے آج ہم آپ کا ایک اور قابلِ قدر ہستی سے تعارف کرا دیں جس کی بابت حضرتِ نوحِ ناروی مدظلہ العالی یوں رطب اللسان ہیں:-

"...... اگرچہ جانؔ صاحب آج دنیا میں موجود نہیں مگر ان کی جگہ ایک ایسا ریختی کہنے والا اب موجود ہے جسے میں جانؔ صاحب سے کسی طرح کم نہیں سمجھتا بلکہ چند وجوہ سے ..... زیادہ جانتا ہوں۔ لکھنؤ میں بیٹھ کر خوش حالی اور فارغ البالی کے ساتھ اگر کسی نے اپنا کمال دکھایا تو کیا کمال ہے۔ تعریف تو فی الحقیقت اُس کی ہے جو الہ آباد میں پیدا ہوا جس کی نشو و نما دہلی اور لکھنؤ میں ہوئی اور اُس نے ملازمت و فکرِ معاش میں ہر وقت مبتلا رہ کر ایسے ایسے اشعار کہے جن کا جواب محال نہیں (تو؟) مشکل ضرور ہے۔

....

میں نے اکثر مقامی مشاعروں میں جناب نثار حسین خاں صاحب شیداؔ الہ آبادی کو پڑھتے دیکھا ...... بہت کچھ جانچنے پرکھنے کا موقعہ ملا۔ تبادلۂ خیالات کی نوبت آئی۔ خوب خوب شعر و سخن کے متعلق گفتگو رہی۔ اتنے تجربے کے بعد میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تحقیقاتِ الفاظ و محاورہ کے ساتھ ساتھ جس رنگ کے یہ کہنے والے ہیں تمام ہندوستان میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ کوئی شعر ایسا کبھی سننے میں نہیں آیا جس میں ایک نہ ایک بات نہ رہی ہو ......"

(درسالۂ رہنمائے تعلیم لاہور بابت ماہ مارچ ۱۹۳۷ء)

حضرتِ شیداؔ کا پہلا دیوان "آرسی" چھپ کر ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ چکا ہے۔ اُس کے متعلق کچھ کہنا ہمارے لئے تحصیلِ حاصل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ سخن شناس اہلِ قلم برابر اُس کے جلوے دکھلاتے رہتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں جناب تسکینؔ عابدی صاحب نے ادبی دنیا میں بہ شرطِ فرصت اظہارِ رائے کا وعدہ فرمایا ہے۔ انشاء اللہ آج نہیں تو کل ضرور وہ بھی کچھ نہ کچھ حوالۂ قلم کریں گے۔ نیز یہ کہ ہماری اس خامہ فرسائی کا باعث بھی یہی حضرت ہیں آپ کا کہنا ہے کہ:-

"ریختی اردو شاعری کی ایک بڑی اچھی صنف ہے اس سے نہ صرف ہماری گھریلو زبان اور ہماری عورتوں کے محاورے، اصطلاحات، تشبیہات وغیرہ محفوظ ہو جاتے ہیں بلکہ اردو زبان کا وہ تفوق بھی ظاہر ہو جاتا ہے جو دوسری تمام دنیا کی زبانوں پر اردو کو حاصل ہے یعنی یہ کہ اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو مردوں کی الگ اور عورتوں کی جدا ہے۔ اِس نسوانی مردانی زبان کے اختلاف کو کوئی اور زبان نہیں پہنچ سکتی۔ سنسکرت، عربی، فارسی، انگریزی زبانوں میں سوائے ضمیروں کے اختلاف کے اور کوئی اختلاف نسوانی اور مردانی زبان کے متعلق نظر نہیں آتا۔ یہ فخر اردو ہی کو حاصل ہے کہ اس میں مردانہ زبان، محاورے، اصطلاحات و تشبیہات الگ ہیں اور زنانہ الگ۔ ایسی حالت میں اس یادگار لسانی نمونے کو "نا اپنی زبان کی جڑیں کھوکھلی کرنا ہے"۔

(درسالہ ادبی دنیا بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۰ء بعنوان بیگم کی ریختی)

بے شک تسکین صاحب کا ارشاد واجب الاذعان ہے۔ بندہ بھی اسی کے زیر اثر یہ چند اشعار حضرت رشید کے جو وقتاً فوقتاً مشاعروں میں سنتا آیا ہے حاضر کئے دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

جو پوچھا آہ کیا ہوتی ہے دادی؟
تو بھر مٹی ہوا میں راکھ اڑا دی!

کہیں ایسا نہ ہو کہ ناظرین اس شعر پر سوال دیگر جواب دیگر کا الزام لگائیں بادی النظر میں یہ شعر ہے بھی ایسا ہی۔ اس کی سماعت پر میرے بھی کان کھڑے ہوئے تھے۔ مگر فوراً ہی میر تقی میر کا یہ شعر زبان پر آگیا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا۔

یہاں ثباتِ گل بقدر یک تبسم ہے۔ اور رشید کے یہاں آہ لاکھ کا گھر خاک کرنے والی یعنی مٹھی بھر دل کو جلا کر راکھ کر دینے اور ہوا میں رائگاں کر دینے والی ہے سبحان اللہ سبحان اللہ۔

ہندوستانی پھوٹ کے نتائج اظہر من الشمس ہیں۔ رشید اس پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:۔

بیگم یہ گھرا جڑا سمجھو! اب اللہ ہی والی ہے
آدھے گانوں جو ہولی ہے تو آدھے گانوں دیوالی ہے

دوسرا مصرع ضرب المثل ہے۔

کل شہر ہوا جاتا ہے جنگل بھائی بھائی کو کھاتا ہے
یہ بھیڑیے وہ ہیں بی نانی ایک ایک کو نگلے جاتا ہے

ایک اور کہاوت سنئے:۔

شیدا اُسے داو گے جو داب نہیں سہتی
چھپک ہوئی یا کسبی بے نکلے نہیں رہتی

ماں کے پیٹ میں جس خون سے بچے کی پرورش ہوتی ہے۔ اور کسبی بچپن سے جو تعلیم پاتی ہے ان کا اقتضائے فطری یہی ہے کہ بے نکلے نہ رہیں:۔

رنڈی محلوں میں نہیں تھمتی کبھی
دوب پتھر پر نہیں جمتی کبھی

پھر فرماتے ہیں:۔

آنگن میں آؤ بھابی بڑا دن یہیں منائیں
میمیں تو کیک کھائیں گی ہم دھوپ بھی نہ کھائیں!

دسمبر کی پچیس تاریخ ہے جاڑوں کا یہ عالم ہے کہ

صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

فرنگی دنیا کے ساتھ نادار ہندوستانی بھی اس خوشی میں ملیا میٹ ہوا ہے۔ پیٹ خالی سہی مگر بڑے صاحب کی ڈالی بھرپور اہتمام کے ساتھ گھر سے جا چکی ہے۔ جس کے سنگار اور رکھ رکھاؤ میں چوبیس کی شام سے گھر کی بیویوں کو پچیس کی صبح تک کسی پہلو چین نہیں ملا ہے، اب اس دلہن کو رخصت کر کے سانس لینے کا موقع پایا ہے تو نسوانی دل یہ سوچ کر کہ آخر ایک عورت میم ہے ایک عورت ہم لیکن ہمیں شکم سے سوکھی روکھی روٹی کا ٹکڑا بھی میسر نہیں اور اُسے ہماری گاڑھی کمائی کے حرام کیک حلال ہیں۔ رشک عورت کی گھٹی میں پڑا ہے۔ ذرا سی ٹھیس میں یہ شیشہ چور ہو جاتا ہے۔ اور بے ساختہ پکار اُٹھتی ہے:۔

آنگن میں آؤ بھابی بڑا دن یہیں منائیں
میمیں تو کیک کھائیں گی ہم دھوپ بھی نہ کھائیں

"ہم دھوپ بھی نہ کھائیں" جن جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے وہ دل ہلا دینے والے جذبات ہیں۔

نسوانی دنیا میں نند بھاوج، دیورانی، جٹھانی، سمدھن سمدھن کے رشتے مردوں کے لئے ایسے محیر العقول ہیں کہ کوئی ٹاکی فلم بھی ان کے مقابلے میں اتنے دل خوش کن یا عبرت انگیز نظارے نہیں پیش کر سکتی۔ قدیم ریختی گویوں کے یہاں یہ لطائف سرے سے مفقود ہیں۔ البتہ شیدا نے ان پر ہر حیثیت سے روشنی ڈالی ہے اور پردۂ خفا سے منظر عام پر لے آئے ہیں:۔

کیوں پھیر کے منہ بیٹھیں نہ بی نند ادھر سے
اس پھول کو میں دیکھتی ہوں پاک نظر سے

طربیہ پہلو (بھاوج کی زبان سے):۔

مری نند ہی عیش کی اصل ہیں — یہی عاشقوں کی شبِ وصل ہیں
کوئی کیا جانے نند کے ٹھسّے — میں ہی واقف ہوں اس کی نس نس سے

لطفِ قافیہ مزید برآں۔

سانولے نندوئی گوری نند پر — ٹاٹ میں زربفت کا پیوند ہے

نادر تشبیہات

یہ کلوٹی نند یوں ڈولے کے پوری طور ہے — کالی کوئل کے بھی منہ پر آج دھوئیں کا لگا ہے

طربیہ پہلو (نند کی زبان سے):۔

عشق پر ٹوٹا اور مہندی کا بھلے بھالی کیا — چاند کا دھبا مٹایا حسن کو زخمی کیا
بڑھا بچہ کو ڈاکر کٹ جو ہے سو چل ڈبے میں — بھلی اس کا حال کھلے کا تبھر کے گھل ڈبے میں

ڈوانٹ کر بشواز بھابی تن گئیں — آدمی سے للّی گھوڑی بن گئیں

بھابی نہ کھاؤ ٹھنڈے غصّہ اُتار دو — اپنا قصور را و ڈھ لو جاڑے گزار دو

چھونا نہ بھابی شیشے کی ہیں پھوٹ جائیں گی — بھیّا ذرا سی ٹھیس میں یہ ٹوٹ جائیں گی

بھابی اب زیور کہاں اس کال میں — ڈھونڈ ننتے ہیں کھی کے چھلّے ڈال میں

یہ ہیں دکھیاری زمانے کی ماری شریف بی بی کے جذبات کہ دل پکڑ کر ڈالیں:۔ ع جن پہ بیتی ہو یہ وہی جانیں

نہ کھیلوں گی بھابی سے ابن دھوپ چھاؤں — ہماری ہی بلّی ہمیں سے یہ میاؤں

مسہری سے اٹھیں ڈالا ڈیرا بھابی نہانے کا — نگوڑی چارپائی ہے کہ پردہ غسل خانے کا

گل کھلا کر صحن میں بھابی کی آہیں تھم گئیں — کاسنی کے پھول بن کر کیاریوں میں جم گئیں

کہوں گی کچھ تو کہو گی کرو نہ بات بڑی — کبھی کے دن بڑے بھابی کبھی کی رات بڑی

روغنی تم اُلٹا اوڑھیں آپی — ایسی کچّی نہیں بڑی بھابی

اکبر کی طرح شیدا بھی پردے کے بڑے حامی ہیں اور کیوں نہ ہوں کہ اس کے بُرے نتائج اُن سے زیادہ ان کی نگاہوں کے سامنے موجود ہیں

بے حیائی کی ہوائیں محلوں میں آنے لگیں — بیگمیں باغوں میں سبزہ روندنے جانے لگیں

بندی سے آگے غیر کے جایا نہ جائے گا — اندھے کو آئینہ تو دکھایا نہ جائے گا

بن ٹھن کے نہ چمکا کرو مردوں کی سبھائیں — قندیل جلا کر نہیں رکھتے ہیں ہوائیں

آج دُپٹے کے سرک کل برقعہ سارا ننگا — ستر گز کی پگڑی باندھی پھر بھی سر ننگے کا ننگا

نتائج:۔

پریاں سائے کی کلب گھر سے جو پھیرا لیں گی — کیپٹی باغ کی جھاڑی میں بسیرا لیں گی

پردہ عورت کا پھٹا جاتا ہے — رنگ غیرت کا کٹا جاتا ہے

پردے والی کی راہ مشکل ہے — باہر اس کا نباہ مشکل ہے

ہندوستان میں عورت کی کوئی ہستی نہیں سمجھی جاتی۔ وہ تو میکے کی خادمہ اور سسرال کی کنیز ہے۔ لیکن شیدا اس کے خلاف یوں احتجاج کرتے ہیں:۔

مرو عورتوں کا گلا تم نہ ٹیپو — یہ مٹی کی دیوار سونے سے لیپو

وہ عورت کو ایک برکت خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں:۔

جا بسی عورت جہاں جنت وہ کونا ہو گیا — ہاتھ مٹی میں اگر ڈالا تو سونا ہو گیا

عورت ہی کی زبان سے اُس کا مرتبہ یوں ظاہر کرتے ہیں:۔

بیٹی ابو البشر کی ہوں یک جہاں پاکباز ہوں — بچّوں کی ذمہ دار ہوں میں مرد کی جانماز ہوں

سمدھنوں کی نوک جھوک:۔

بالا کی بیٹی کو سمدھن سیج دی — اوہی گاڑی بھر کے نیکی بھیج دی

دولت، خوشی، آرام آنی اور فانی ہیں:۔

دولت نگوڑی کیا جمے ساجھے کا کھیت ہے — یہ دودھ کا ہے جھاگ تو دریا کی ریت ہے

اس کو اتاری اور اُسے دیوار پھاندنی — آرام ایک چھاؤں خوشی ایک چاندنی

ریختی میں تلمیحات کا بہت کم موقع ہے۔ ذرا سی چوک میں ریختی غزل ہو کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً جان صاحب کہتے ہیں:۔

دکھاتا رنگ زمانے کے اوہی کیا کیا ہے — مرا کلام بھی جمشید کا پیالہ ہے

مگر شیدا اس خوبی سے اشارہ کر جاتے ہیں کہ سننے والا منہ تاکتا رہ جاتا ہے۔ مثلاً

نہ جانے مجھکے شمع پر قاضی جی کیوں — موئی جل گئی ساری داڑھی ہی بھسم سے (داڑھی)

یاد کیجئے وہ گلزار دبستان والا لطیفہ کہ رات کا وقت ہے قاضی صاحب مصروفِ مطالعہ ہیں کسی صفحے پر تحریر پاتے ہیں کہ جس شخص کی داڑھی لمبی ہوتی ہے۔ وہ بے وقوف ہوتا ہے۔ ہاتھ سے کتاب رکھ دیتے ہیں۔ ریش مبارک پر مشکوک نگاہ ڈالتے ہیں تو وہ ضرورت سے زیادہ دراز نظر آتی ہے ادھر اُدھر قینچی تلاش کرتے ہیں۔ مگر وہ وہاں کہاں! ذرا سے سکوت کے بعد محاسن شریف کو یک مشت و دو انگشت کے انداز سے مٹھی میں تھام کر شمع پر جھک جاتے ہیں۔ ایک بجلی سی آنکھوں میں کوند جاتی ہے اور ہاتھ اس آنچ سے سہم کر جدا ہو جاتا ہے اور چشم زدن میں چار ابرو کا صفایا ہو جاتا ہے۔

یوں تو شیدا کا کلام از سرتاپا گوناگوں شاعرانہ نکات کے ساتھ اپنے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی ندرت بالعموم رکھتا ہے۔ لیکن ان کی تشبیہات کچھ اس انداز کی ہوتی ہیں کہ سامعین کو از خود رفتہ کر دیتی ہیں۔ دیکھئے ایک انگریزی تہذیب کا مارا عمر کے دورِ انحطاط میں اپنے جھرّیلے چہرے کی صفائی میں بااسباب و آلاتِ جدیدہ منہمک ہے۔ اور ہمارا ریختی گو اس ہیئت کذائی کی مکمل شبیہہ اس طرح تیار کر دیتا ہے کہ بال بال ملا لیجئے کہیں فرق نہ پائیے گا:۔

ڈبو کر جھرّیوں کو پھین میں داڑھی بناتا ہے
نیا دھوبی ہے یہ کٹھری میں بھی صابن لگاتا ہے

جھرّیلے چہرے کو کٹھری سے جو مشابہت تام ہے اُس کا احساس ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، اس سے لطف اندوز ہونا تو کچھ مذاقِ سلیم ہی کا حصہ ہے

ایسے ہی دو شعر اور حاضر ہیں:۔

بڑے بوڑھوں سے مل کر آبرو چھوٹے بڑھاتے ہیں
یہ وہ گھوڑے ہیں جن سے ہنس موتی چگنے آتے ہیں
مری قسمت کی ہر لذت موئی اس سوت نے چکھی
خدا جانے اُڑے گی کب یہ دسترخوان کی مکھی
رشمر بنا جو ایک پا تو ایک یزید ہو گیا
مجھ کو اُٹھے تھے مارنے ہاتھ شہید ہو گیا

شمر و یزید و شہید مراثی میں ہمیشہ سے یک جا چلے آتے ہیں۔ مگر اُن میں اور شیدا کے پیش کردہ تشبیہی و تلمیحی شمر و یزید و شہید ایک مرقع صد ندرت ہیں۔ دیکھئے "مجھ کو اٹھے تھے مارنے" کا بلیغ فقرہ اس امر کی ترجمانی کر رہا ہے کہ کسی کمزور دبے خطا ہستی (عورت!) پر ہاتھ اٹھانا انتہائے ظلم کا ارتکاب ہے اور انتہائے جور پر "غضب الٰہی" کا نازل ہونا یقینی و لازمی، وہی نسوانی عقیدہ! اس لئے وہی دو لُنج پاؤں جو ظالم کو مظلومہ تک پہنچانے کا سہارا تھے۔ وہی مغلوب الغضب ہو کر لڑکھڑا گئے۔ میاں کو وہ پٹخان بتائی کہ "ہاتھ شہید ہو گیا"۔ اب اس شہید ہونے کی بھی توجیہہ سُن لیجئے۔ اس وقت لاکھ دشمن سہی مگر پھر شوہر ہے۔ ہندوستانی شوہر پرست بیوی کی زبان کے لئے "ہاتھ ٹوٹ گیا" کہنا قطعاً ناممکن ہے۔ وہ ایسے بدشگونی کے الفاظ ہرگز ادا نہیں کر سکتی۔ یوں تو مچھلی کے بھی پتّا ہوتا ہے اظہارِ حقیقت ان لفظوں میں کرتی ہے "ہاتھ شہید ہو گیا"۔

شیدا کے چار دیوان ہیں۔ پہلا "آرسی" اس میں نرم گرم ہر طرح کا کلام ہے اور یہ شائع ہو گیا ہے جیسا کہ ہم اسی مضمون میں کہیں لکھ آئے ہیں۔ دوسرا مصحف ہے یہ جملہ ریختیانہ صفات سے مملو اور عریانی سے پاک ہے۔ اور یہی پاکیزگی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ نیز آرسی مصحف مستورات کی اُس رسم کا نام ہے جس میں شادی کے موقع پر قرآن پاک اور آئینہ دولہا دلھن کو دکھایا جاتا ہے۔ اس لئے یہ الفاظ نسوانی دنیا میں لازم و ملزوم ہیں۔ تیسرا دیوان گرم مسالا ہے۔ اس میں آنکھیں بند کر لی ہیں اور منہ کھول دیا ہے۔ یہ مسالا سے وزنی مضامین کا مجموعہ ہے۔ چوتھا دیوان ست سنجا یعنی سات ملے جو برباں کئے ہوئے اور باہم ملے ہوئے ہوں۔ (ف سطرنج سرمایہ زبان ارمغان جلال لکھنوی)۔ شیدا کی اصطلاح میں:-

ہر اک شعر میں اک نرالا مزا ہے
یہ دیوانی ہانڈی ہے یا ست سنجا ہے

مندرجۂ بالا تمام اشعار اسی ست سنجے کے ہیں جو حضرت شیدا مرحوم مشاعروں میں بطور غیر طرح پڑھا کرتے ہیں۔ اس دیوان کا ہر شعر فرد اور مقفّٰی ہے۔

افسوس کہ شیدا سا نادر الوجود نادرہ گفتار اُستاد جس کا ہر لفظ ایک داستانِ عبرت اور درسِ غیرت ہے اپنے کمال (ریختی) کی بدولت اُس پردۂ گمنامی میں پڑا ہے کہ کوئی اُس کا پُرساں نہیں اور وہ اس کس مپرسی میں بھی زندہ دل نظر آتا ہے۔ میں تو جب دیکھتا ہوں بے ساختہ میرے مُنہ سے نکل جاتا ہے۔

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

(مولوی) محمد عمر

شہر کا چاند

چندرماں! کیا ہے جو ہے آج ترا چہرہ اُداس؟
کیوں ٹپکتا ہے جبیں سے تری ہر لحظہ ہراس؟

تیرے انوار میں اشکوں کی جھلک کیسی ہے؟
تیری کرنوں میں یہ آہوں کی کھٹک کیسی ہے؟

جگمگا اٹھتی تھی جس سے یہ فضائے مغموم
تیرے لب پر ہے وہ کیوں اذنِ تبسم معدوم؟

پھوٹتا ہے جو کلائی سے حسیں بیوہ کی
وہی ویران تبسم ہے نظر میں تیری

کیوں گرفتارِ الم ہے ترا معصوم شباب؟
چرخ کھائی ہوئی کیوں ہے ترے ساغر میں شراب؟

قمقمے برق کے شاید نہیں اب تجھ کو پسند
جن پہ قابو نہیں پاتی تری کرنوں کی کمند

جو مٹانے پہ ہیں دنیا سے حکومت تیری
جن کی آنکھوں میں چمکتی ہے بغاوت کی ہنسی

جن کے جھرمٹ میں کبھی تیرا بھی روشن چہرہ
قمقمہ برق کا بن جاتا ہے اک دھندلا سا

ہے شکایت تجھے دیوسار مکانوں سے بھی
تھام لیتے ہیں جو اوپر ہی کو دولت تیری

تنگ گلیوں کی یہ دھنستی ہوئی تاریک جبیں
تیرے انوار کی نزہت سے جو واقف ہی نہیں

اُف یہ ہنگامے کہ محشر کی صدائے قم ہیں
جن کی چیخوں میں ترے مست ترانے گم ہیں

یہ گھٹائیں سی اڑتی ہوئی انسانوں کی
جنگ "ٹرموڑ" پہ یہ چھلتے ہوئے شانوں کی

غول یہ اندھے فقیروں کا دکانوں کے قریب
جن کی روحوں کو بہاریں نہ ہوئیں تیری نصیب

قہقہے، اشک، سسکتی ہوئی آہوں کا ہجوم
بوجھ سے جھکے ہوئے چوک پہ راہوں کا ہجوم

کتنا بے کیف یہاں ہے ترا جامِ رنگیں
کوئی سنتا ہی نہیں تیرا پیامِ رنگیں

ماہِ غمگیں وہ کہاں ہے ترا دلکش منظر
میں نے دیکھا ہے جو پھیلے ہوئے میدانوں پر

گاؤں میں آ کے تو ہو جاتا ہے کتنا مسرور
تیری خوشیوں سے نظر آتی ہے دنیا معمور

میں نے دیکھی ہیں بہاریں تری اُن پیڑوں پر
جن کی شاخوں سے لپٹ جاتا ہے تو رہ رہ کر

دشت میں یا کسی سنسان سے ویرانے میں
کوئی دیکھے تجھے فطرت کے چلو خانے میں

یہ سڑک، روشنی بجلی کی، یہ اُونچے ایواں
تجھ کو بھاتا نہیں اک آنکھ عروجِ انساں

ڈر یہ ہے توڑ دے اک روز نہ سرکش انساں
تیری ہستی سے جو وابستہ ہے دلکش رُوماں

ذہنِ انساں پہ ضیا بار کسی دن ہوگی
پردۂ بُعد میں پوشیدہ حقیقت تیری

چلتے جادو نہیں چل سکتے نہ اب جھوٹے فریب
جب بڑھا علم تو لبریز ہوا جامِ شکیب

تجھ پہ اتریں گے فلک سیر مشینوں کے قدم
تجھ کو آباد کرے گا یہی ابنِ آدم

کر کے دنیا پہ ترا رازِ حقیقت عریاں
روند ڈالے گا ترے حسن کے رنگین ایواں

چندرماں! کیا ہے جو ہے آج ترا چہرہ اداس
کیوں ٹپکتا ہے جبیں سے تری ہر لحظہ ہراس؟

طفیل احمد خاں سلطانپوری

زندگی

۱۹۲۳ء کے عام ہیضہ نے بیوی کی جان لے کر سعادت علی کے لئے اُن کی اپنی زندگی جنجال بنادی۔ سات سال کا ایک بیٹا ماں کو گھر میں ہر جگہ ڈھونڈتا پھرا کرتا۔ کوٹھری میں پلنگ کے اوپر جھانکتا۔ برآمدہ میں نگاہیں ڈالتا۔ صحن میں چاروں طرف آنکھیں پھراتا۔ جب کہیں ماں نظر نہ آتی تو باپ سے بندھی ہوئی آواز میں پوچھتا "اماں حکیم کے سے کب آویں گی" اور فوراً ہاتھ پر نکلے ہوئے دانے کے دُکھنے کا بہانہ کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔

میر سعادت علی ہنٹور سے کوئی پانچ میل کے فاصلہ پر سیدوں کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔ کسی زمانے میں پایہ کے زمیندار تھے اطراف میں عالی خاندانی اور دولت کے باعث نام تھا۔ مگر تمام سادات کی طرح ان پر بھی کشتی کا زمانہ گذر رہا تھا۔ چالیس روپے سال کی آمدنی کی ایک ٹکوا بھر زمین۔ جدی گھر۔ ایک آم کا باغ۔ اور گاؤں کے چراگاہ اور تالاب وغیرہ میں کچھ حصہ یہ کُل کائنات تھی جو یادرفتہ کی وحشت سے ان کو گاؤں میں روکے ہوئے تھی۔ بیوی کا مرنا تھا کہ گویا صبر کی حد آگئی۔ سُونا گھر۔ بچے کے بین۔ بیوہ بہن دل جلانے کو سامنے موجود۔ آخر ایک روز طے کر ہی لیا کہ اس مصیبت کی زندگی سے بھاگ کر کہیں اور ہی قسمت آزمائی کریں۔

ایک منگل کی سہ پہر کو دن تاریخ نیک دیکھ کر عزم سفر کر لیا۔ بہن کو خرچ بھیجتے رہنے کی ڈھارس دی۔ بچے سے بُلا لینے کا وعدہ کیا اور خود پردیس سدھار گئے عمر بھر کی مصیبت کی ماری بہن کیا سمجھاتی اور کیا نہ سمجھاتی۔ خاموشی سے چھ دن ڈاکیہ کے انتظار میں کاٹتی۔ جب جمعہ کو خط آتا کسی سے پڑھواتی۔ اپنے پیرن کی خیریت پا کر دل ٹھنڈا کرتی اور پھر اگلے خط کا انتظار شروع کر دیتی۔

سید صاحب کے بیٹے وجاہت نے دو چار دن تو باپ کو بہت یاد کیا پہلا خط آنے پر خوب اچھلا کودا۔ ساتھیوں میں بڑے فخر کے ساتھ پردیس سے باپ کے خط کے آنے کو بیان کرتا پھرا لیکن کچھ ہی دنوں میں اس عالم تنہائی کا عادی ہو کر گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ ہر اچھے بُرے میں شامل ہونے لگا۔

انسانی جوہر مصیبت میں زیادہ نکھرتا ہے۔ خاندان میں تعلیم و تعلّم کی روایات نسلاً بعد نسلٍ چلی آرہی تھیں۔ سیّد صاحب کی بہن کو بھتیجے کا اس طرح برباد ہونا کب گوارا ہو سکتا تھا۔ جاڑے آگئے تھے۔ ایک دن سیر بھر جَو کے بدلے نیا گڑ لا کر مسجد کے مولوی کے سامنے وجاہت کی بسم اللہ کرادی۔ روز صبح ہوتے ہی کہتی "وجّو لے اُٹھ کلمہ پڑھ۔ مُنہ ہاتھ دھولے۔ باسی ٹکڑا کھا کے یہ دودھ کی ایک دھار پی لے اور اپنا بستہ لے کے مدرسے چلا جا" ہر فاضل وقت میں وجاہت کو علم کی برتری کی ان گنت روائتیں سنانا۔ عالموں کے کارنامے بتانا اور لکھنے پڑھنے اور علم حاصل کرنے کے فضائل سے آگاہ کرنا۔ بس اس پھوپھی کا یہی مشغلہ ہو گیا تھا جس میں وہ اپنی بپتا کے دن گذار رہی تھی۔

لائق پھوپھی کی نگرانی میں وجاہت کو جانفشانی کی وہ عادت پڑ گئی اور پڑھنے کا ایسا چسکا لگ گیا کہ اس نے چند ہی مہینوں کے بعد ضد کر کے ہنٹور کے تحصیلی مدرسے میں داخلہ لے لیا۔ پانچ میل کا فاصلہ روز کا آنا جانا۔ آٹھ نو سال کی عمر اس پر کبھی گھر میں کھانے کو آدھا ہی پیٹ اور کبھی بالکل ندارد۔ مگر مستقل مزاج پھوپھی کا پالا ہوا مستقل مزاج بچہ ساری مصیبتوں کو جھیلتا پڑھتا چلا گیا۔

لیکن مصیبت تنہا کب آتی ہے! ادھر یہ دونوں نہ معلوم اپنے دلوں میں کیا کیا منصوبے باندھے قابل تقلید عزم و ثبات کے ساتھ سعادتیں اور سختیاں جھیلتے پر بسر کر رہے تھے اور اپنی تمام مسرت جمعہ کے روز آنے والے خط پر مرکوز کئے بیٹھے تھے کہ اُدھر سے پہلے تو اس خط کے آنے میں دیر شروع ہوئی۔ درمیانی وقفوں کی طوالت بڑھتی گئی یہاں تک کہ ایک بار خط آنا یکسر بند ہی ہو گیا۔ خدا معلوم بھائی پر کیا گذری۔ لیکن بہن کی آنکھوں کے سامنے اندھیری آگئی۔ پھر بھی وہ اپنے بھتیجے کا خیال رکھتی اور خواہ خود کو کھانا ملے یا نہ ملے اپنے وجّو کو ضرور ناشتہ کرا کے مدرسے روانہ کر دیتی اور پھر قوت شبینہ حاصل کرنے کے لئے کسی کا پیسنا پکڑنا لینے نکل جاتی۔

(۲)

ہنٹور میں وجاہت کی ایک رشتہ کی خالہ اور خالو رہتے تھے۔ خالو

سلہ ایک مونہہ

برائے نام زمینداری کے ساتھ قصبے کے ایک اچھے رئیس کے یہاں بچوں کو تعلیم دیتے تھے۔ دراصل تعلیم کا تو بہانہ ہی تھا۔ تھے وہ ان کے ہر معاملے میں دخیل یعنی اچھے خاصے داروغہ ہو رہے تھے۔ سید، شریف، با اخلاق، وضعدار، پرانے معیار کے مطابق تعلیم یافتہ اور اپنی خاندانی شرافت کو ہر نہج سے نباہنے والا آدمی تھا ایک روز وجاہت کو سنٹور میں دیکھ کر بہت متعجب ہوئے۔ حال معلوم کیا۔ بہت محبت کا اظہار کیا۔ گھر لے گئے۔ خالہ نے دیکھتے ہی بلائیں لیں اور اپنی بڑی بہن کو یاد کر کے رونے لگی۔ ان کی چھ سال کی لڑکی حمیدہ پہلے تو اپنی ماں کو روتا دیکھ کر حیران ہوئی لیکن تھوڑی دیر میں جب کہ سب لوگ گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ اس نے بھی وجاہت کو اچھی طرح دیکھا اور جیسے ہی آنکھیں ملیں کرتے کا دامن دانت میں دبا کر بھاگ گئی۔ اب تو خالہ خالو کے یہاں وجاہت کا جانا معمول ہو گیا۔ ہر چوتھے پانچویں دن جانا اور ایک گھنٹہ بیٹھنا۔ کھیلنا کودنا اور واپس آ جانا۔ پھوپھی سے کہہ کر کبھی بنیا گڑ کبھی دھان کی کھیلیں کبھی جھیل یا تالاب سے نکالے ہوئے نیلوفر کے پھول یا کسیرو۔ غرض مختلف چیزیں خالہ کے یہاں لے جاتا رہتا۔ خالہ بھی وجاہت کے یہاں اسی طرح موقع بہ موقع چیزیں بھیجتی رہتی تھیں۔

دو سال گزر گئے۔ وجاہت کی محنت کا شہرہ اردگرد کے عزیزوں میں ہوا تو ایک رشتہ کے بھائی نے جو عرصے سے ترکِ وطن کر کے لکھنؤ چلے گئے تھے اپنے پاس بغرض تعلیم بلا لیا۔ مالی حالت اس خاندان کی بھی قابلِ رشک نہ تھی لیکن وجاہت کو ہم سن بھتیجے بھتیجیاں ملے جو سب تعلیم میں منہمک تھے اور پڑھنے کو موقع اور وقت ہاتھ آ گیا۔ اس نے نہایت شکر کے ساتھ اس دور افتادہ پردیس میں زندگی شروع کر دی۔ پانچ سال متواتر اول نمبر کامیاب ہو کر تمام خاندان کے لڑکوں میں ممتاز ہو گیا۔ دورانِ تعلیم میں بھی وجاہت نہ پھوپھی کو بھولا نہ خالہ خالو کو۔ پانچ روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا اس میں سے تین روپے فیس کے ادا کر کے دو روپے ہر مہینے پھوپھی کو بھیج دیتا اور خالہ اور خلیروں سے بھی خط کے ذریعے تعلقات قائم رکھتا۔

باپ نے چھ سات سال سے خط و کتابت بند ہی کر لی تھی۔ جس کی وجہ سے پھوپھی الگ تباہ تھی اور خود وجاہت کے دل میں علاوہ ایک مستقل خلش۔ ایک شدید رنج اور امید کی آمیزش قائم ہو کر رہ گئی تھی۔ جس کے باعث کبھی تو باپ کا خیال کر کے کہ نہ معلوم وہ کہاں اور کس حالت میں ہوں گے یا اگر خدانخواستہ مر گئے تو خدا معلوم کس عالمِ غربت میں موت واقع ہوئی ہو گی وہ بے چارہ آٹھ آٹھ آنسو رو پڑتا۔ اور کبھی یہ سوچ کر کہ باپ زندہ ضرور ہوں گے اور ایک نہ ایک دن وہ ضرور ان سے ملے گا اور ان کی ضعیف العمری میں خدمت کا موقع پا کر ابدی مسرت کا حقدار بن سکے گا۔ اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو جاتی اور اس کے تمام ارادوں میں ایک جوش پیدا ہو جاتا اور پھر آناً فاناً اس کے خیالات میں ذرا سی قنوطی لہر دوڑ جاتی تو وہ مجسمۂ یاس بن جاتا اور اس کا دل ہر محنت سے اچاٹ ہو جاتا۔

باپ کے لاپتہ ہونے سے وجاہت ایک مجموعۂ اضداد بن گیا تھا۔ گھڑی میں ہنس دیتا اور امید و رجا کے جوش میں ململا اٹھتا اور گھڑی میں ایسا خاموش ہوتا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کے وعظ و پند سے بھی اس کے خیالات میں بلندی پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ اسی کش مکش میں غریب نے لاکھ جتن کر ڈالے مگر باپ کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔

قسمت کسی کی پھوٹے تو یوں۔ سنہ ۳۱ء میں ایک طرف تو وہ رشتہ دار جس کے سہارے پر پھوپھی گاؤں میں پڑی تھی خنازیر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر لقمۂ اجل ہوئے۔ دوسری طرف لکھنؤ والے بھائی جنت کو سدھار گئے۔ وجاہت نے ایف اے میں داخلہ لیا ہی تھا کہ لکھنؤ والے بھائی کی موت پر جو ان کا گھر تتر بتر ہوا تو اس پر یہ نئی مصیبت آن پڑی کہ ادھر تو خود بے گھر ادھر پھوپھی گاؤں میں بالکل بے وارث و تنہا۔ ناچار یہ طے کرنا پڑا کہ تعلیم کے ساتھ ہی چھوٹے بچوں کے پڑھانے کا کام کرتا رہے تاکہ کچھ تنخواہ حاصل ہو جائے اور پھوپھی کو اپنے پاس بلا کر رکھ کے بی اے تک کی تعلیم حاصل کر سکے۔

(۳)

ایک دن وجاہت ایف اے کے آخری سال کا ششماہی امتحان ختم کر کے گھر آیا ہی تھا کہ ڈاکیہ نے پکار کر خط دیا۔ کھولا تو خالہ کے پاس سے آیا تھا۔ پھوپھی کے نام تھا۔ زور زور سے پڑھنے لگا۔

"میری بہینا۔ دعا سلام قبول کرو۔ اللہ خوشیاں دیکھنا نصیب کرے تم جانو ہو کہ وجاہت کے خالو کو دنیا چھوڑے مہینا اوپر سال بھر ہو گیا۔ ایسی حالت میں جبکہ ہمارے سر پر سوائے اللہ کے کوئی نہیں ایسی چُپ اچھی نہیں۔ بہینا جو باجی کے کہے کی لاج رکھو اور ہماری حمیدہ کو لینے کا خیال ہو تو جلدی ہی کر دو کیونکہ ہم ایسی مصیبت میں زیادہ دیر تک نہیں رک سکتے۔ اب تمہارا وجاہت ماشاءاللہ سیانا ہو گیا ہے اور سنا ہے کہ بارہ درجے پڑھ چکا ہے اب کاہے کا سوچ ہے۔ جواب جلد دینا۔"

وجاہت ہکا بکا خط کو ادھر ادھر سے دیکھ ہی رہا تھا کہ اس کی پھوپھی بولیں:

"تجھے پیاسی کو لکھ رہی ہے۔ وہ جو تیری ماں تیری منگنی حمیدہ سے کر گئی تھی سچ تو کہے ہے علیکری کی منگنی ہے۔ زبان ہو چکی ہے اور اب بس [illegible] ہے

جس پر وہ اپنی کو بٹھائے رکھیں۔ کوئی باپ تھوڑا ہی بیٹھا ہے جو کسی چیز کا انتظار ہو اب تو بس لڑکی ایک گھر سے اٹھ دوسرے کو چلی جاوے گی۔ نہ کچھ لینا نہ کچھ دینا اگر ہم کر لائے تو گھر کی عزت گھر ہی میں رہے گی اور اپنی بات پوری ہو جاوے گی"

پھوپھی کیا سے کیا کہتی چلی جا رہی تھیں لیکن وجاہت کو کچھ خبر نہ تھی۔ حمیدہ کا اس کی منگیتر ہونا اس کے لئے بالکل انوکھی چیز تھی۔ وہ مبہوت تھا۔ خط نے اس کو ایک گہری خاموشی میں ڈال دیا۔ تعجب کی زیادتی سے اسے اس مستور مسرت کا جو اس کے قلب پر غیر شعوری طریقے پر چھائی چلی جا رہی تھی قطعاً احساس تک نہ ہو سکا۔ اس کی نظروں کے سامنے گزشتہ واقعات کا ایک تانتا بندھ گیا۔ اسکول سے واپسی پر خالہ کے یہاں جانا۔ کبھی کبھی حمیدہ کا سبق سننا۔ جاڑوں میں اپنے گاؤں سے مدرسے جاتے ہوئے حمیدہ کے لئے نیلوفر کے پھول یا سنگھاڑے توڑنا۔ دیوالی میں دھان کی کھیلیں اور ایکھ کے دلوں میں گنوں کی گڈیاں لے جانا۔ غرضکہ مناظر کا ایک سلسلہ تھا جو اس کے حافظہ میں پوشیدہ پڑا ہوا تھا اور جس پر یکایک جلا ہوتی چلی جا رہی تھی۔ یاد آنے والے واقعات کا ایک تموج تھا جس کا زیر و بم لکتا ہی نہ تھا۔ باریک سے باریک جزئی تفصیلات سیلاب کی مانند اس کے دماغ میں حاضر ہو گئیں۔ اسی حیرانی میں اس نے ایک مرتبہ کوشش کی کہ وہ نظروں کے سامنے تمام مناظر کے ایک بارگی آنے کے بجائے صرف حمیدہ کی شکل و صورت کا خاکہ اپنے ذہن میں بنائے لیکن ہجوم تصاویر نے اس امر کو بالکل غیر ممکن کر دیا تھا۔ جب اس کشمکش میں کچھ بن نہ پڑا تو وہ خواہ مخواہ اپنی پھوپھی کو آواز دے بیٹھا "عمہ" اور ان کے جواب دینے پر بالکل سراسیمہ ہو کر بولا "کچھ نہیں، میں یہی دیکھ رہا تھا کہ آپ کیا سوچ رہی ہیں"۔

پھوپھی وجاہت کے سکوت کو تہی دستی کے فکر پر محمول کرتی ہوئی بولیں "یہ سوچتی کیا۔ خاتوں میں آج تک بھی کسی کو شادی بیاہ کی سوجھی ہے ہم آپ پردیس میں پڑے ہیں۔ پر تیری خالہ بھی مجبور رہے۔ تو ہی بتا کیا ہوگا؟"

جواب کون دے!۔ وجاہت کو پھر خیالات نے زبردست غوطہ دے دیا تھا اور وہ نہ معلوم کہاں پہنچ چکا تھا۔ پھوپھی کے دوبارہ توجہ دلانے پر وہ چونک کر بولا۔

"میں شادی وادی ابھی نہیں کر سکتا۔ اس سے کیا فائدہ کہ اپنے ساتھ دوسرے کو بھی مصیبت میں داخل کر لیا جائے"۔

"بچے! اور شادی کے کون سے دن آویں گے بیٹھے سال کو گزرے بھی برس ہو گئیں۔ کیا بڑھاپے میں شادی ہوگی! وہ گئی مصیبت تو اگر لونڈا یہاں آ گئی تو تیری خالہ کو ٹکی ہو جاوے گی۔ اس کا تو وہ کا سا تھ ہے سچ پوچھے

میں تو کہوں ہوں کہ اب کی بقر عید کے مہینے میں کوئی نیک دن تاریخ دیکھ کر مقرر ہو جاوے تو خدا تیرا بھلا کرے۔ اچھا ہی ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ جمعہ پندرہ جمعہ بائیس آج ہفتہ تئیس تاریخ ہے۔ مہینہ بند ہونے کے سات دن اور ہیں۔ اب کی پہلی سے تو تجھے مرزا صاحب کے یہاں سے پندرہ روپیہ کے بجائے بیس ملا کریں گے۔ یہ پانچ روپے ماہوار تو بہو کی قسمت کا سمجھ لے۔ بس یہی کافی ہوں گے"۔

محوِ فکر وجاہت خاموشی سے تمام گفتگو سنتا رہا اور چونکہ شام کے ٹیوشن کا وقت قریب تھا اس لئے جلدی سے تیار ہو کر بغیر کوئی فیصلہ کن جواب دیئے ہوئے چلا گیا۔ اُدھر پھوپھی نے شادی کا پورا خیالی سامان تیار کر لیا۔ یہاں تک کہ قبل اس کے کہ وجاہت رات کو پڑھا کر واپس آئے شادی کا مکمل پروگرام بن چکا تھا۔

اس ہونے والی شادی کے جوشِ مسرت نے پھوپھی کے تمام افعال و حرکات میں ایک ولولہ پیدا کر دیا تھا جس کی وجہ سے نہ صرف روزمرہ کا کام جلد انجام پا گیا بلکہ اس عمر رسیدہ بڑھیا کی پامال امیدیں پھر سے تازہ و شاداب ہو گئیں۔ دوسری جانب وجاہت بھی باوجود مبہوت و متعجب ہونے کے اپنی طبیعت میں ایک نامعلوم جوش محسوس کر رہا تھا۔ اس کے تمام جسم میں ایک مستور ولولہ موجزن تھا جو اس کو زمین سے اٹھا کر آسمان کی طرف بلند کر رہا تھا۔ آج وجاہت نے اپنے طالب علموں کو پڑھانے میں ایک عجیب چاشنی سی محسوس کی۔ اس کو زندگی جو اب تک یکسر یاس و افلاس سے معمور نظر آئی تھی، سرور و بہجت کی وادی معلوم ہونے لگی۔ اس کے کل خیالات غیر شعوری مسرت سے لبریز تھے۔

حسبِ معمول وجاہت دونوں جگہ پڑھانے سے فارغ ہو کر رات کے نو بجے گھر واپس آیا۔ پھوپھی کھانے اور نماز سے فارغ ہو کر اپنے بستر پر بیٹھی تھیں برابر میں کھٹولے پر عبدل جلاہے کا لڑکا جس کو وہ اپنے ساتھ لیتی آئی تھیں سو رہا تھا۔ چوکی پر کھانا نکلا ہوا ڈھکا رکھا تھا۔ حالانکہ آج پھوپھی نے واقعی کھانا معمول سے بدرجہا زیادہ دلچسپی سے پکایا تھا اور برتنوں کی صفائی میں بھی روز سے زیادہ احتیاط کا خیال رکھا تھا۔ لیکن وجاہت کو آج کھانے میں جو ذائقہ علاوہ اس حد سے کہیں گزرا ہوا تھا جس کو بہ احتیاط باورچیوں کے مشاق ہاتھ پیدا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ درحقیقت وہ صرف کھانے کا ذائقہ نہ تھا جو اس وقت وجاہت کے خیالات کو جذب کر رہا تھا۔ وجاہت کی تخئیل ایک نئی دنیا بسا رہی تھی اور وہ کھانا کھاتے وقت ہمہ تن اس دنیا کی سیر سے متمتع ہو رہا تھا۔

جن،

کھانے کے درمیان ہی میں پھوپھی نے وجاہت کے سامنے وہ کل تدبیر پیش کردی جو انہوں نے وجاہت کی ساڑھے تین گھنٹے کی غیر حاضری میں اس کی شادی کے لئے تیار کی تھی۔

"دیکھ میرے بچے میں نے خوب حساب کر لیا ہے۔ تین سو روپیہ کا انتظام جو اللہ نے چاہا تو جلدی ہی ہو جاوے گا۔ وہ یوں کہ اسّی روپے میں تو ابھی بھوپ سنگھ جاٹ ہماری بھینس اور کٹیا جو میں آبادرزی کو دے آئی ہوں لینے کو کہہ رہا تھا۔ اور ساٹھ روپے آٹھ شیشم کے پیڑوں کے جو تیار کھڑے ہیں اور پچاس روپے ان دس سرس گولر اور نیم کے پیڑوں کے بلدیو لکڑہارے نے بھیا ضمیر کی زبانی کہلوائے تھے تو یہ کتنے ہو گئے۔ پچاس اور پچاس اور دس ہوئے دس اوپر سو۔ اور اسّی بھینس والے کل ہو گئے نوّے اوپر سو یعنی دس کم دو سو۔ اب رہی دس اوپر سو کی کسر تو اگر تو بھیا ضمیر سے کہے تو وہ ضرور کوئی انتظام کرا دیں گے۔"

"انتظام کیا کہیں بغیر باغ یا زمین رکھے تھوڑا ہی کچھ مل سکتا ہے۔"

"تو بھی کیا ہے۔ کوئی باغ یا زمین کا نام لینا ایسا حرام تھوڑا ہی ہے۔ جب پڑھ لکھ کر نوکر ہو جائیے سب واپس لے لیجئے۔"

(۴)

غرضکہ باوجود وجاہت کی اس تدبیر پر نیم خاموشی کے شادی کے کل انتظامات عام رسم و رواج کے مطابق، گو بہت اقل قلیل پیمانہ پر ہی سہی تکمیل کو پہنچ گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو بھینس اور درخت بکے۔ دوسری طرف آم کا ڈیڑھ سو درختوں کا باغ رہن ہو گیا اور چونکہ ضرورت کے وقت لگائے ہوئے حساب کے مطابق قیمتیں کسی چیز سے بھی حاصل نہ ہو سکیں اس لئے کمی کو پورا کرنے کے لئے وجاہت کا جدی گھر بھی ایک معمولی رقم کے عوض بیع الوفا کر دیا گیا۔ وجاہت سر پر آتے ہوئے فائنل امتحان کی تیاری میں مصروف تھا اور اس کی ماں برابر پھوپھی اس کی شادی کے انتظامات میں۔ ۱۶ جون کی سہ پہر کو ایف اے کا نتیجہ شائع ہوا اور اسی لئے شام کو نکاح کی محفل میں شریک ہونے والے اعزا و احباب اس کو اوّل نمبر کامیاب ہونے کی مبارکباد بھی دے رہے تھے۔

گرمیوں کی چھٹیوں کے اختتام پر اعزازی وظیفہ کی امید اور کسی دوسرے قابل اختیار کام کے نہ ہونے نے وجاہت کو بی اے کلاس میں داخلہ لینے پر مجبور کر دیا۔ وظیفہ تعلیمی خرچ بھر کے لئے کافی تھا۔ حساباً چھ روپے مہینہ کی بچت ہوتی تھی جو اس قرض حسنہ کی ادائیگی میں منہا ہو جاتی تھی جو وجاہت نے کالج میں داخلہ لینے اور ضروری کتابیں وغیرہ مہیا کرنے کے لئے اپنے سابق کالج کے ایک مشفق استاد سے حاصل کر لیا تھا۔ چنانچہ قوت روزانہ کے لئے اس کو پھر شغل قدیم کسب معاش کی طرف توجہ کرنا لازمی تھا اور اس مرتبہ نہ صرف وہ خود اور پھوپھی بلکہ اس کی رفیقۂ حیات بھی افراد خانہ میں شامل تھی۔ نتیجۃً اخراجات بھی بڑھ گئے تھے۔ مہینے تک وہ ایک کرائے کے مکان میں رہتا رہا اور ان پچیس روپوں کے سہارے پر جو اس کو دو جگہ پڑھانے کے عوض ہر ماہ ملتے تھے نہایت کفایت و عسرت کی حالت میں اپنے تعلیمی مشاغل میں منہمک رہا۔ بعض مرتبہ جب جماعت میں کسی مضمون کے متعلق ضروری کتابوں کے نام بتائے جاتے تاکہ طالب علم ان کو خرید کر اپنے طور پر پڑھیں اور اس مضمون میں امتحانات کے لئے تیار رہوں تو وجاہت گھر آ کر نہایت احتیاط سے آئندہ ماہ کی آمدنی اور خرچ کا حساب بار بار لگاتا اور کوشش کرتا کہ کسی طرح اگلی مرتبہ اس کتاب بھر قیمت بچائے تو اس کو خرید کر اپنی علمی بھوک کو پورا کرے۔ لیکن اس کو اکثر و بیشتر نیا مہینہ آنے پر مایوسی ہی ہوتی کیونکہ اس کی قلیل آمدنی میں جو اس کی اور اس کے متعلقین کی ادنیٰ ضروریات زندگی کے لئے بھی نہایت تنگی سے کافی ہو سکتی تھی اتنی گنجائش کہاں سے آتی کہ کتابوں کی خرید ممکن ہو سکے۔

پھر بھی وجاہت نے دو ایک بار کبھی روزانہ کے دودھ میں ناغہ کر کے اور کبھی گھی کے روپیوں میں دھیلی آٹھ آنے کی کمی کر کے کچھ کفایت کر ہی لی اور کم از کم وہ کتابیں جن کے بغیر اس کی تعلیم آگے نہ بڑھ سکتی تھی وقتاً فوقتاً مہیا کر لیں۔ جب وہ کلاس میں فارغ البال والدین کے لڑکوں کے ہاتھوں میں وہ کتابیں دیکھتا جن کے نام استادوں نے وہی ایک روز پہلے بتلائے تھے اور جن کو خریدنے کے لئے وہ صرف حساب ہی لگا کر رہ گیا تھا تو وہ اپنی زبوں حالی پہ رو پڑتا۔ اس کا قلب اس کو ملامت کرتا کہ ایسی حالت میں پڑھنے کی کوشش کرنا بے سود ہے وہ سوچتا کہ تعلیم بھی امراء اور رؤسا کے لئے ہے۔ وہ اپنے دل کو مسوس کر رہ جاتا اور گھنٹوں اسی فکر میں ڈوبا رہتا کہ اگر اس فقر و محرومیت کی تعلیم کے بجائے وہ پڑھنے کے نام سے دامن چھڑا لے تو شاید زیادہ اطمینان و مسرت سے ہمکنار ہو سکے گا۔ تھوڑی ہی دیر میں پروفیسروں کے لکچر، کلاس کے انہماک اور ہم جماعتوں کی گفتگو سے اس کے خیالات کا رُخ بدل جاتا اور وہ بدستور اپنے مشاغل میں محو ہو جاتا۔

(۵)

وجاہت کے لکھنؤ والے رشتہ کے بھائی کا بڑا لڑکا ایک فنی ملازمت پر مامور ہو کر دہلی آ گیا تھا۔ وہ وجاہت کا بہت خیال رکھتا تھا۔ ایک دن روپے پیسے سے بھی مدد کرتا اور خطوط کے ذریعہ ہمت افزائی میں تو اس نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ وجاہت سے اس شفقت و توجہ کا جواب غمگساری و اخلاص کی کشمکش ہی میں کیسے ممکن تھا تاہم وہ اپنے اس کریم النفس بھتیجے کے [illegible] کا جواب

دے دیا کرتا اور یہ احتیاط کرتا کہ اگر خود سے کبھی خط لکھتا تو اس میں اپنی عسرت کا کوئی ذکر کنایتہً بھی نہ کرتا۔

ایک روز وجاہت کا بھتیجا دہلی میں مزید دفروخت کے لئے نکلا صدر بازار سے پان رستی والوں کی دُکانوں کی طرف مڑا ہی تھا کہ دیکھتا کیا ہے کہ وجاہت سامنے سے تانگے پر گزرا فوراً پکارا۔ وجاہت بھی دیکھتے ہی اُتر پڑا۔

"ہائیں چچا آپ یہاں کیسے اور وہ بھی بغیر اطلاع کئے"۔

"آنے کی غرض بعد میں بتاؤں گا۔ مجھے تمہارا بنگلہ ملا ہی نہیں۔ اور پھر جس سلسلے میں آیا ہوں اس کا تعلق زیادہ تر دہلی سے ہے۔ جہاں میں ٹھیرا ہوں۔ تم جانتے ہو وہ خاں صاحب...... یہاں سکریٹریٹ میں ملازم ہیں۔ وہ تو تم سے خوب واقف ہیں"۔

"لیکن یہ تو ٹھیک نہیں کہ آپ دہلی آئیں اور غیر کے یہاں ٹھیریں"۔

"غیر وہ بھی نہیں۔ میرا کچھ سسرالی رشتہ ہوتا ہے وہ بھی ہنڈور کے ہیں"۔

"اُسے ہاں خوب یاد دلایا۔ اس سسرالی رشتے سے چچی کی طبیعت اب کیسی ہے۔ اور ہاں اس تانگے کو رخصت کر دیں۔ اے میاں تانگے والے یہ اپنے پیسے لو اور چلتے بنو"۔

"پیسے میں دیئے دیتا ہوں۔ مجھ کو معلوم بھی ہے کیا دینا ہے"۔

"یہ نہیں ہوسکتا تانگے والا جب روپے میں سے باقی دام واپس کرے گا مجھ کو بھی معلوم ہو جائے گا اس نے کیا لیا۔ آپ تو چچی کی خیریت سنایئے۔ اور اسی تانگے پر گھر کیوں نہ چلے چلیں۔ میرا بازار کا کام بھی ختم ہو چکا ہے"۔

تانگے پر بیٹھنے کے بعد۔

"ہاں تو چچی جان کی خیریت۔ ان کی طرف سے بڑا انتشار رہتا ہے"۔

"خیریت کیا سناؤں تنگ آگیا اس بیماری سے۔ جب سے وہ لڑکی پیدا ہوئی ہے ان کے بدن کو گھن لگ گیا۔ حکیم تو کہتے ہیں کہ آنتوں کی دق ہو گئی ہے لیکن ماسٹر...... تم تو خوب جانتے ہو ان کو، تم کو اکثر یاد کیا کرتے ہیں وہ غرض ان کی رائے سے آیورویدک علاج شروع کیا ہے۔ سنکھ بھی بتائی ہے۔ مرکب دوائیں سفوف کی مانند دی جاتی ہیں۔ دہی کا استعمال بکثرت ہے۔ بخار تو یقیناً کم ہے۔ صرف صبح ہوتے کچھ حرارت ہو جاتی ہے۔ باقی وقت میں نارمل سے بھی کم رہتی ہے۔ نقاہت اس قدر ہے کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ اور دست بہ اکثر آتے ہیں۔ شیر دست تو شاید اس لئے ہیں کہ دہی بکثرت کھایا جاتا ہے۔ اس سفید بیکر وری میں پاخانہ میں دیر دیر تک بیٹھنے سے پیروں پر ورم بھی ہوگیا ہے۔ سارے جسم میں بے حد خارش ہے۔ مگر خشک"۔

بھتیجے نے مایوسی کو چہرے پر نمودار نہ ہونے دینے کی کوشش کرتے ہوئے اطمینان دلایا کہ!

"ارے تب تو جمع خاطر رکھئے۔ انشاء اللہ صحت ہو جائے گی۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں۔ اطباء کے نزدیک بہت سی بیماریوں کی ضامن ہے اور ویسے بھی وید لوگ معدے کے علاج میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ خداوند کریم صحت دے گا۔ اچھا آپ کا آنا کیسے ہوا؟"

"جن صاحب کے یہاں میں ٹھیرا ہوں انہوں نے ایک درخواست دلوادی تھی۔ مجھے شخصی معائنے کے لئے بلایا گیا ہے"۔

تانگہ بنگلے کے سامنے رُکا اور دونوں اتر کر برآمدے میں بیٹھ گئے۔ وجاہت نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"میں تو کل تم کو اس حلقے میں تلاش کر گیا مار ڈھونڈتے ڈھونڈتے مر مٹا کہیں پتہ ہی نہ چلا۔ یہ یاد نہیں سڑک کون سی تھی"۔

"یہ دیکھئے اس کا نام لکھنؤ روڈ ہے۔ آپ کسی اور سڑک پر مثلاً الہ آباد روڈ یا کہیں اور تلاش کرتے رہے ہوں گے"۔

"کیا یہاں ہر شہر کے نام پر سڑکیں ہیں کیا ہر شخص کو اسی کے وطن کے نام کی سڑک پر مکان دیا جاتا ہے"؟

ہنستے ہوئے۔ "نہیں۔ مکان تو خالی ہونے کے حساب سے ملتے ہیں"۔

"پھر سڑکوں کے نام شہروں پر کیوں رکھے گئے ہیں"۔

"مجھ کو بھی ٹھیک نہیں معلوم۔ شاید جب تمام مشہور شخصیتوں کی فہرست ختم ہوگئی تو سڑکوں کے نام بڑے بڑے شہروں پر رکھ دیئے گئے۔ یہ طریقہ محض نمبر لگا لینے کے طریقے سے پھر بھی اچھا ہے۔ کیونکہ سڑک نمبر ۴۳ کہنے کے بجائے لکھنؤ روڈ کہنا بہر نوع زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے"۔

"ٹھیک ہے۔ اور ہاں بھئی میں تم کو ایک خوشخبری سناؤں۔ بابا یعنی والد کا پتہ لگ گیا ہے۔ وہ الہ آباد کے ضلع میں رالہ ایک قصبہ ہے۔ وہاں ایک رئیس صاحب کے یہاں عرصہ سے ملازم ہیں۔ اسی ہفتے میں حامد علی صاحب جو بلی کالج والے وہاں جائیں گے اور ان کو لے کر آئیں گے یا اگر موقع ملا یعنی تمہاری چچی کی حالت قابل اطمینان ہوئی تو میں خود یہ سعادت حاصل کروں گا۔ ابھی خفیہ ہی پتہ چلا ہے اور بہت ممکن ہے کہ بابا اپنے کو مستور رکھنا ہی پسند کریں۔ اس لئے ہم سب کا خیال ہے کہ نہایت احتیاط سے قدم اٹھایا جائے"۔

بہرحال ایک طویل نشست کے بعد وجاہت رخصت ہو کر اپنی جائے قیام پر پہنچا۔ دوسرے دن معائنہ تھا۔ چند ہی امیدوار بلائے گئے تھے جن

ہیں وجاہت کا نمبر چوتھا تھا۔ اعلیٰ افسروں کے سامنے پیش ہونے کا وجاہت کے لئے یہ پہلا ہی موقع تھا۔ وہ بہت ششش وپنج میں تھا کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے لیکن اس کی قوتِ تقریر اچھی تھی۔ چنانچہ اس کا ثبوت اس نے معلسے میں بھی دیا۔

دو دن وجاہت اور بضرورت دہلی میں رُکا۔ اور تیسرے روز اس کو سرکاری پروانہ پہنچا کہ اس کا تقرر ناگ پور سنٹرل خفیہ پولیس آفس میں کر دیا گیا ہے اور اس کو ہدایت کی گئی تھی کہ پندرہ یوم کے اندر وہ ملازمت پر حاضر ہو جائے حصولِ ملازمت کی اس پہلی ہی کوشش میں خلافِ توقع کامیابی پر وجاہت غایت درجہ مسرور و کامران تھا۔ وہ دہلی سے نہایت خوش و خرّم تحفہائے تبریک ہمراہ لئے قلبی طمانیت کے ساتھ رخصت ہوا۔ اسے یقین تھا کہ اُس کا پُرہیبت افلاس آخر کار اب ختم ہو جائے گا۔ اور وہ بھی اُس آسائش وآرام سے متمتع ہو سکے گا جس سے گردشِ زمانہ نے اب تک اس کو محروم رکھا تھا۔ علاوہ بریں والد کے بل جانے کی خبر سے اس کو ایک نئی مسرّت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے قلب میں طفلانہ محبت بیدار ہو رہی تھی۔ اور وہ احساس کر رہا تھا کہ اس کی ترقی کو دیکھ کر خوش ہونے والا باپ عنقریب اس سے ملے گا۔ اس نے اپنے ذہن میں باپ کی ملتفت نگاہوں کی تصویر بنائی اور یہ سوچنے لگا کہ وہ کس طرح ایک ثودبانہ سلام کر کے ان کے سینے سے چمٹ جائے گا۔ سفر بھر وہ ان مسرّتوں کے وفور سے کانپتا رہا۔ یہاں تک کہ صبح چھ بجے کے قریب اکسپریس نے اس کو لکھنؤ پہنچا دیا۔

گلی کی ابتدا پر اس نے تانگے پر سے اپنا سامان اُتار کر ایک کہار کے سر پر رکھا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے قدم زیادہ کانپنے لگے۔ کچھ دیر کے لئے وہ اپنی بیوی کی طرف سے بھی مطمئن ہو گیا۔ کیونکہ کیا اس کے بھتیجے نے اس سے یہ نہیں کہہ دیا تھا کہ ویدک طریقہ سنگرہنی کے علاج میں بے نظیر ہے۔ آئندہ کی آسودہ زندگی کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ یکایک اس کا مکان سامنے نظر آیا۔ دروازے پر متعدد حضرات جمع تھے۔ اول تو اس کا دل دھک سے ہوا۔ لیکن جوشِ خیالات نے کسی اندیشے کو اس کے دماغ پر اثر انداز نہ ہونے دیا۔ وہ خرّم ومسرور کانپتے پیروں سے بڑھتا رہا۔ ایک مرتبہ اس نے جیب میں سے پروانۂ ملازمت نکال کر پھر پڑھا اور گویا یقین کر لیا کہ اس میں واقعی اس کو ملازمت عطا کی گئی تھی۔ پروانہ جیب میں احتیاط سے رکھ کر وہ پھر آگے چل پڑا۔ دفعتہً اس کے کانوں کو گھر سے گریہ وزاری کا ایک شور سنائی دیا۔ اور فوراً ہی ایک زنانہ جنازہ برآمد ہوا ... وجاہت کو دیکھ لیا

ایک رشتہ کے بھائی نے دوڑ کر سر پیٹتے ہوئے خبر دی کہ رات کو بھابی نے انتقال کیا۔ وجاہت کے قلب پر گویا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ جنازہ کے پیچھے وجاہت کے والد موجود تھے جو رات ہی اپنی بہو کے انتقال سے صرف ساڑھے چار گھنٹے پیشتر پہنچے تھے۔ لوگوں نے جنازے کو زمین پر منزل دی اور غمزدہ بیٹے کو مدت کے بچھڑے باپ سے ملایا۔ باپ نے ایک آہ سرد کے ساتھ اپنے جواں سال اور نیک نام بیٹے کو سینے سے چمٹا لیا۔ وجاہت باپ کی گود میں رو رہا تھا اور سعادت علی خاں تصوّر کی آنکھوں سے بہو کے جنازے کے ساتھ بیوی کا جنازہ بھی دیکھ رہے تھے۔

"اَن پڑھ دیہاتی"

واپسی

کچھ تو میل نے میری ضد میں اپنی چال گھٹالی ہے
جانے والی پارسلوں کی ہر دفتی پڑھ ڈالی ہے
پھر بھی چہرے پر سرخی ہے دل اُلجھن سے خالی ہے

کچھ اسٹیشن پر پہلے سے آکر آفت ڈھالی ہے
ہری دوار کے میلے کی تصویر سے آنکھ لڑالی ہے
آج سفر سے وہ طنّازہ واپس آنے والی ہے

پوسٹروں میں اردو کی درگت سے جی بہلاتا ہوں
بید کی نوک سے خالی پیکٹ کا سینہ برماتا ہوں
ریلوے آفس کے گھنٹے کی سوئی مُڑ ن پاتا ہوں

پے در پے سگریٹ بجھتا ہے پے در پے سلگاتا ہوں
پلیٹ فارم کے اِس کونے سے اُس کونے تک جاتا ہوں
بیتابی کی ساعت ساعت مجھ کو ستانے والی ہے

سوچا، اس بے کل فرصت پر نظم کا پرتو ڈالا جائے
جلتے پھرتے جلووں کی تنقید میں صدمہ ٹالا جائے
میٹھی میٹھی ہوکوں میں تلخی کا روگ نہ پالا جائے

"دل خوش کن" زحمت کا تاثر شعر کے اندر ڈھالا جائے
اِس ساری میں سلوٹ۔ اُس سائے میں جھول نکالا جائے
جب "دِقّت" کی حد ہو جائے، سمجھو جانے والی ہے

گئی تھی وہ..... تو یہ قطامہ گاڑی وقت پہ آئی تھی
بھول رہا ہوں گارڈ نے جھنڈی کس گوشے سے دکھائی تھی
مشرق سے آتی دیکھی مغرب کو جاتی پائی تھی

بات کا موقع مل جانا اتنی بھی نہ ٹھیکی کھائی تھی
یاد نہیں آتا چلنے سے پہلے وسل بجائی تھی
اب جو اُسے لاتی ہے تو کچھوے کو شرمانے والی ہے

ہلکا سا جھٹکا کھا کر سگنل کا بازو جھول پڑا

دُور درختوں میں بل کھاتے دھوئیں کا بادل عما اُٹھا

اٹھو سنبھلو "گاڑی آئی" شور اٹھا، چرچا پھیلا سنجیدہ طبعوں کا تاثل بے صبری نے لوٹ لیا
عجلت کا چنچل کیلے کے چھلکے پر پڑ کر رپٹا گھبراہٹ صد رنگ نقابیں رخ سے ہٹانے والی ہے

ہیبت ناک انجن اک لَے کے ساتھ گرجتا آتا ہے آس پاس کے کھیتوں کا دل خوف سے دہلا جاتا ہے
پلیٹ فارم کے نیچے کوئی گھوڑے سے دوڑا تا ہے یا پُل کے گرڈر پر کوئی پیہم ضرب لگاتا ہے
شوقِ نظارہ نے یہ کہا کس دھن میں وقت گنواتا ہے؟ چونک پڑا میں اور دیکھا کھڑکی پہ وہ آنے والی ہے

چہرے پر آثارِ سفر کے جیسے کیفِ صبوحی کش بکھری آڑی مانگ جبیں سے کان کی لو تک سنبل وش
نیند کے ماتے ابرو کے آغوش میں بندی اُف اُف عش عش! آنکھوں کی ہلکی سرخی پر تشنہ جام و مینا غش
ہنستے ہونٹوں کی شیرینی بوسۂ لب کو دامن کش سر کی ہر ہر جنبش اپنے پاس بلانے والی ہے

والد کی جانب یہ اشارہ تاڑ نہ جائیں۔ دُور رہو مجھ سے مخاطب چھوٹے بھائی کو دھمکی۔ ٹھہرو ٹھہرو
میری طرف نظریں لیکن نوکر کو حکم۔ سہارا دو ماما کی "لالچ" پہ کنایہ خط لانے لے جانے کو
آ کے برابر دبی زباں سے یہ فقرہ۔ آج آنا تو
شادؔ بس اب خاموش کہ دنیا نظر لگانے والی ہے

شاد عارفی

شعر

خاک کا اک ڈھیر دیکھا صبح جائے میت پر جلتا تھا مدت سے شاد لات جل کر رہ گیا

مہر

ننگا رہنے پر

پرسوں بے کاروں کے کلب میں ایک چیک جنٹلمین سے ملاقات ہوگئی۔ یہ چیک عریانیت کی تحریک کا حامی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے جیسا کہ عریانیت پسندوں کا عام قاعدہ ہے ایک عمدہ بریڈ فورٹ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور منہ میں ایک قیمتی سگار دبا رکھا تھا۔ عریانیت کے اصولوں کی تشریح کرتے ہوئے کہنے لگا۔ خوبصورتی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک خوبصورتی وہ ہے جو خدا پیدا کرتا ہے۔ اور دوسری وہ جو درزی عطا کرتا ہے۔ انسان کا ناشکرا پن دیکھو کہ حسن خداداد کو چھوڑ کر درزی کی مصنوعی خوبصورتی کا سہارا تلاش کرتا ہے۔

چیک جنٹلمین دیر تک عریانیت کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ تو پچھلے چند ہفتوں سے میں عریانیت پسندوں کے متعلق کتابیں پڑھ رہا تھا۔ اور اس دلچسپ تحریک کے متعلق واقفیت حاصل کر رہا تھا۔ اس ملاقات سے رہی سہی کسر پوری ہوگئی۔ اور میں عریانیت پر ایمان لے آیا۔ اسے ایک روحانی انقلاب سمجھئے، جسمانی نہیں۔ کیونکہ جسم تو ایک فروعی و ناپائیدار سی شے ہے اصل چیز تو روح ہے۔ اور وہ بھی ایک ہندوستانی کی روح۔

لیکن میرے اکثر احباب جن کا نفسیاتی ماحول قرون وسطیٰ سے آگے نہیں بڑھ سکا میرے اس نئے عقیدے کو شبہ کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور اکثر [illegible] کیوں صاحب آپ کو ننگا رہنے میں کیا فائدہ نظر آتا ہے۔ یہ سوال کرتے وقت اول تو وہ یہ دیکھتے ہی نہیں کہ میں کپڑے کیوں پہنے ہوں۔ اور اگر خود کپڑے پہنتا ہوں تو دوسروں کو کپڑے اتارنے کی تلقین کیوں کرتا ہوں۔ کیا اس میں میری شریر طبیعت کو کوئی دخل ہے۔ لیکن بحث کے شوق نے اکثر احباب کو اس قدر اندھا کر دیا ہوتا ہے کہ وہ میرے جسم پر کپڑے نہیں دیکھ سکتے اور مجھے عریانیت کی حمایت کرتے ہوئے دیکھ کر فوراً سوال کر دیتے ہیں کیوں صاحب آپ کو ننگا رہنے میں کیا فائدہ نظر آتا ہے۔

اور میں اپنی سیاہ شیروانی ــــ میرے پاس ایک ہی ہے۔ وہ موقع پر استعمال کرتا ہوں۔ مشاعرے میں نظم پڑھتے وقت، مفت سینما دیکھتے وقت، میں اپنی سیاہ شیروانی کے بٹن بند کرتے ہوئے نہایت اطمینان سے جواب دیتا ہوں۔ جی ــــ میں تو ننگا رہنے میں کوئی فائدہ نہیں دیکھتا۔ "آپ" وہ چلا کر کہتے ہیں۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ــــ"

جی ہاں آپ بلاشبہ غلطی پر ہیں۔ میں دلجمعی سے جواب دیتا ہوں۔ یہ میں نے نہیں کہا ہے کہ میں ننگا رہنے میں کوئی فائدہ دیکھتا ہوں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میں ننگا رہنے والوں کی حمایت ضرور کرتا ہوں۔

"تو پھر آپ گھبرا کر پوچھتے ہیں۔ آپ کا منشا کیا ہے میں بالکل نہیں سمجھ سکا"

"کیسے سمجھ سکو گے" میں جواب دیتا ہوں۔ ذرا سوچئے تو سہی آپ لوگ اس دور مہاجنی کے پرستار ہیں۔ آپ کے دل و دماغ پر اسی چیز کا تسلط ہے۔ مہاجنی نظام کی بنیاد "فائدہ" ہے۔ اگر کسی چیز میں فائدہ ہے تو وہ اچھی ورنہ بری۔ اگر صنعت چلائی جاتی ہے تو فائدے کے لئے۔ خیرات کی جاتی ہے تو وہ بھی فائدے کے لئے۔ ہمارا نام ہوگا۔ اخباروں میں شہرت ہوگی۔ ہماری ساکھ بنے گی۔ ساکھ کے ساتھ تجارت اور تجارت سے فائدہ۔ بس یہاں ہر چیز کی کسوٹی فائدہ ہے۔ آپ یقین مانئے، عریانیت پسندوں کے کامیاب ہو جانے پر حکومت سب سے پہلے جو کام کرے گی۔ وہ یہ ہے کہ اس لفظ "فائدہ" کو لغت سے خارج کر دے گی۔

حیرت ہے کہ ہم لوگ ہر چیز کو اس زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اس میں فائدہ ہے؟ کوئی فائدہ ہے؟ کتنا فائدہ ہے؟ کس کا فائدہ ہے۔؟ کیونکہ فائدہ ہے! نتیجہ یہ ہے کہ ہم اس فائدے کے چکر میں پڑ کر خوشی کو گنوا بیٹھے ہیں اس لئے کہ آخر خوش رہنے میں فائدہ ہی کیا ہے۔ مسرت ایک بے فائدہ اور بے اختیاری سا جذبہ ہے۔ اور مہاجنی کے اندھے چکر میں پڑ کر ہم یہ بھی نہیں سوچ سکتے کہ دنیا میں ایسی کتنی ہی بے فائدہ چیزیں ہیں۔ جو ہماری زندگی کا جزو عظیم ہیں اور آخر ان بے فائدہ باتوں کے سوچنے سے کیا حاصل۔ یہی وقت اگر کوک شاستر بیچنے یا نفیس نفیس ریشمی ساڑھیاں فروخت کرنے پر صرف کیا جائے۔ تو کتنا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ بے شک۔ بے شک آپ فائدہ حاصل کیجئے۔ یونہی ننگا رہنے کی بے فائدہ تحریک پر بے فائدہ بحث کرنے سے کیا فائدہ۔۔۔۔۔؟

اور میرے دوست غصے میں آ کر کہتے ہیں۔ آپ نے تو یونہی اس فائدے کے لفظ سے ــــ کھینچا تانی شروع کر دی۔ ہم نے تو یونہی سرسری طور پر پوچھا تھا کہ آخر ہم ننگے کیوں رہیں۔

اور میں اپنے دوست سے پوچھتا ہوں کہ آخر ہم ننگے کیوں نہ رہیں اور مجھ سے اگر صاف صاف پوچھتے ہو تو اس تحریک سے میری ہمدردی کا باعث وہ نفرت اور غصہ ہے جو مجھے اپنے درزی کے خلاف ہے میں ننگا رہنا اس لئے پسند کرتا ہوں کہ میں اپنے درزی کے بل ادا کرتے کرتے تنگ آ گیا ہوں۔ گو مجھے اس امر کا بھی احساس ہے کہ اسے ہمیں انسان بنانے میں کافی محنت اور مشقت کرنی پڑتی ہے۔ ذرا میری اس سیاہ شیروانی کی طرف دیکھئے کتنی اچھی سلی ہے۔ اگر میں اسے نہ پہنے ہوئے ہوں تو مجھے کون انسان کہے گا اور کون مجھے مشاعرے میں گھسنے دے گا۔ دراصل آپ لوگ بات کی تہہ تک نہیں پہنچتے یا شاید پہنچنا ہی نہیں چاہتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک غیر شعوری اضطراری خوف آپ کو ہر وقت دبائے رکھتا ہے۔ آپ کے دل و دماغ پر ہر وقت مسلط رہتا ہے۔ اور وہ خوف یہ ہے کہ مبادا کوئی آپ کو حیوان کہہ دے۔ دوسرے دوپایوں یا چوپایوں کی طرح آپ بھی ننگے ہی پیدا ہوئے۔ مدتوں ننگے رہے پھر کھیل ہی کھیل میں درختوں کی چھال اوڑھ لی۔ جس طرح جنگل کے بندروں نے ایک بار کھیل ہی کھیل میں غریب سوداگر کی ٹوپیاں لوٹ کر اپنے سروں پر رکھ لی تھیں اور آج یہ حالت ہے کہ پاؤں کے ٹخنوں تک کو جرابوں میں چھپا دیا ہے۔ مبادا انہیں ننگا دیکھ کر کوئی جانور کہہ دے۔ اور حقیقت پر سے نقاب اٹھ جائے۔ بس یہی خوف و ہراس ہر وقت آپ کی روحوں کو اسیر اور آپ کے جسموں کو کپڑوں کا غلام بنائے رکھتا ہے۔ غریب ڈارون کی مخالفت بھی اسی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور ننگے رہنے والوں پر جو پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔ اُن کی اساس بھی یہی خوف ہے۔ ہائیں! کیا ہم جانور ہیں! کیا ہم حیوان ہیں! کیا ہم بندر کی ایک ارتقائی منزل ہیں!

مجھے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے سے انکار نہیں لیکن میں اسے غلط سمجھتا ہوں کہ اگر ہم کپڑے نہ پہنیں تو اشرف المخلوقات نہیں رہیں گے۔ انسان اور حیوان میں جہاں بہت قریب کا تعلق ہے۔ وہاں بہت سی باتوں میں فرق بھی ہے۔ لیکن یہ فرق کپڑے نہیں جیسا کہ عام لوگ خیال کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں ہمارے مغربی بھائی بھی شامل ہیں۔ یہاں مجھے ان میم صاحب کی مذبوحی حرکات یاد آتی ہیں۔ جو اپنے کتوں، بلیوں اور میناؤں کو کوٹ۔ فراک اور کانوں میں بالیاں پہنا کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ عام کتے۔ بلیاں۔ مینائیں نہیں بلکہ ان سے الگ تھلگ اور انسانوں سے ملتی جلتی کوئی دوسری نسل ہے اور آج کل تو ان کپڑوں کا رواج اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ہر شخص اعلیٰ سے اعلیٰ اور مکلف سے مکلف لباس پہن کر گویا انسانیت کی معراج تک پہنچنا چاہتا ہے۔ کتنی مضحکہ خیز حالت ہے۔ یہ صریح دھوکا نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر میں گاڑھے کا تہمد باندھ کر بازار سودا سلف لینے جاؤں تو مجھے کوئی دو پیسے کا ادھار دینے کا روادار نہیں لیکن اگر "فوق البھڑک" کپڑے پہن کر نکلوں تو دکاندار خوشی سے بیسیوں روپے کا ادھار کر لیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں کسی مشاعرے میں ننگا چلا جاؤں تو خبطی اور سودائی سمجھ کر ہال سے باہر نکال دیا جاؤں گا۔ لیکن اگر یہی سیاہ شیروانی زیب تن ہو تو پھر دیکھئے مشاعرے کے منتظم کس طرح جھک جھک کر سلام کرتے ہیں آئیے صاحب آئیے ادھر تشریف لائیے۔ آگے آئیے۔ اس کرسی پر بیٹھئے۔ وہ وہ خاطریں ہوتی ہیں کہ میں دیکھ دیکھ کر دل میں کڑھتا ہوں اور سوچتا ہوں یا اللہ۔ شاعر میں ہوں، یا میری شیروانی۔

بعض سیدھے سادے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کپڑے انسان کی خوبصورتی کو بڑھاتے ہیں۔ یہاں میں وہ شعر نہیں دھرانا چاہتا جس کا مطلب یہ ہے کہ "چاند گہنوں کے بغیر بہت بھلا معلوم ہوتا ہے" لیکن میں یہ بات ضرور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ان سیدھے سادے لوگوں کا خیال بالکل غلط ہے کپڑے دراصل اس لئے پہنے جاتے ہیں کہ لوگ اپنی بدصورتی کو چھپا سکیں جس طرح روحانی بدصورتی کو لوگ خیرات سے ڈھانپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح جسمانی بدصورتی کو چھپانے کے لئے خوشنما پوشاکیں پہنی جاتی ہیں "فوق البھڑک" اچکنیں اور ساڑھیاں پہنی جاتی ہیں تاکہ بیمار جسم کی بیمار جلد پر نگاہ نہ پڑ سکے۔ چہرے پر غازہ۔ تاکہ رخساروں کی زردی ڈھک جائے۔ لبوں پر سرخی۔ تاکہ بیمار خشک اور روکھے لب کسی کو متنفر نہ کر دیں۔ یہ کپڑے تو دھوکے کی ٹٹی ہیں اگر آپ لوگ واقعی صحت ور ہیں۔ اور خوبصورت جسموں کے مالک ہیں۔ تو اس کو چھپا کر لمبی ساڑھیوں، یا اچکنوں میں چھپانے سے کیا حاصل۔ گلاب کی رعنائی یا دلکشی اس میں ہے کہ وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہنستا رہے۔ اور اپنے حسن خداداد کے جلووں سے اس دنیا کو روشن کرتا ہے ...... گلاب کی کلی چنبیلی کا پھول۔ آسمان کی نیلاہٹ۔ شفق کا حسن۔ اگر ان تمام چیزوں کو کپڑوں کی ضرورت نہیں تو کیا صرف انسانی حسن کو کپڑوں کی حاجت ہے۔ کیا وہ سچ مچ اس قدر گندہ۔ بوسیدہ اور مفلوک الحال ہو چکا ہے کہ اسے اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کے لئے کپڑوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

میں کئی ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں، جو یوں تو عریانیت کے پرستار نظر آتے ہیں لیکن باطن میں عریانیت سے بہت ڈرتے ہیں اور اکثر چپکے چپکے ان لفظوں میں اپنی کمزوری کا اقبال کر لیتے ہیں "بھئی عریانیت ہے تو اچھی چیز۔ لیکن در اصل بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے آپ کو ننگا دیکھ کر شرم سی محسوس ہوتی ہے۔" اور یہ شرم بالکل ٹھیک ہے، اور حالات کے مطابق۔ کیونکہ انسان کی سرشت میں بدی اب اتنا گھر کر چکی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عریاں دیکھنا مطلق پسند نہیں کرتا۔ چوری کرتے وقت شرم محسوس نہیں ہوتی۔ دھوکا دیتے وقت شرم محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن کپڑے اتارنے پر ضرور شرم محسوس ہوتی ہے۔ اور شاید یہ ہے بھی سچ۔ کیونکہ اب انسانی شرم کے لئے کپڑوں کے سوا اور کونسی جگہ رہ گئی ہے۔ جہاں اسے پناہ دی جا سکے۔ بزرگوں سے سنا کرتے تھے۔ کہ انسان کی شرم اس کے دل میں اس کی آنکھوں میں رہتی ہے۔ اب لے دے کے صرف کپڑوں میں رہ گئی ہے اور پھر اگر یہ کپڑے بھی اتار لئے گئے تو وہ اسے کہاں رکھے گا۔ شاید موقع پا کر سستے بھاؤ بیچ ہی دے آخر جہاں جنس دور ٹھہرا آج کل

فلسفۂ عریانیت میں جس چیز نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ وہ ہے اس کی ٹھوس، بنیادی سچائی۔ اس امر سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ خدا نے ہم سب کو ننگا پیدا کیا لیکن ہم لوگ اپنے عریاں حسن سے آہستہ آہستہ متنفر ہوتے گئے اور اسے کپڑوں میں چھپانے لگے گیہوں، شیطان یا حوا نے آدم کو اتنا گمراہ نہیں کیا جتنا کپڑوں نے۔ کپڑے انسانی صعوبتوں کا منبع ہیں۔ اگر انسان کپڑے پہننا چھوڑ دے تو دنیا میں آج آشتی اور مساوات کا دور دورہ ہو جائے۔ بنی نوع انسان کی سب تکالیف دور ہو جائیں۔ نہ جنگیں ہوں نہ چھوت کی بیماریاں، نہ درزی۔ بس ہر طرف چین ہی چین ہو۔ اسمبلی کے ارکین پارلیمنٹ میں سوت کی شعاؤں پر بحث کرنے کی بجائے الٹرا وائلٹ شعاؤں پر غور کیا کریں گے۔ انڈین نیشنل کانگرس سوراج سوراج پکارنا چھوڑ دے گی۔ کیونکہ اس وقت ہر شخص (خارجی طور پر ہی) ایک چھوٹا موٹا مہاتما گاندھی بن چکا ہوگا۔ ہندوستان کے "ننگے کروڑوں آدمیوں" کا سوال۔ سوال نہ ہوگا۔ بلکہ ایک حل یعنی ایک ایسی طے شدہ بات جس پر مزید غور کی ضرورت نہ ہوگی۔

اب اس خوبصورت تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے، کہنے کو تو یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ دنیا میں عریانیت پسند اقلیت میں ہیں۔ انہیں نہ صرف درزیوں کا مقابلہ کرنا ہے بلکہ ان تمام جماعتوں کا بھی۔ جو ابھی کپڑے پہنتی ہیں اور سوتے جاگتے چلتے پھرتے۔ نہاتے دھوتے۔ عشق کرتے۔ غرضکہ ہر وقت فیشن کے مطابق کپڑوں میں ملبوس رہتی ہیں۔ ان کے علاوہ وہ لوگ بھی ہیں جو بظاہر نیم برہنہ حالت میں رہتے ہیں۔ لیکن ہر لمحہ کپڑوں کی آرزو میں جیتے ہیں۔ یہ اوسط درجے کے نیم برہنہ لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ انہیں تحریکِ عریانی کا حامی نہیں۔ دشمن سمجھنا چاہئے۔ عریانیت پسندوں کو ان تمام منظم و مقتدر جماعتوں کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ اور کپڑوں کے ظلم سے دنیا کو نجات دلانا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اس دنیا میں سچے اشتراکی صرف ننگے رہنے والوں کی جماعت میں پائے جاتے ہیں۔ نازیوں سے پہلے جرمنی میں اشتراکیت اور عریانیت کی تحریکیں بہت زوروں پر تھیں۔ ہٹلر نے آتے ہی موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا۔ اور دونوں تحریکوں کو فوراً دبا دیا۔ ہمیں بھی وہی کرنا چاہیئے جو ہٹلر نے کیا یعنی اشتراکیت اور عریانیت کو ایک ہی تحریک سمجھنا چاہئے۔

ہمارے جنت نشان میں تو عریانیت کی تحریک بہت پرانی ہے اور صدیوں سے چلی آتی ہے۔ ہندوستان میں کروڑوں آدمی ننگے رہتے ہیں لاکھوں گھرانے ایسے ہیں۔ جہاں سارے کنبے میں عورتوں کے پاس صرف ایک صرف ہی دھوتی ہے جسے وہ باری باری گھر سے باہر کام کاج کرنے کے استعمال میں لاتی ہیں۔ مرد۔ عورتیں۔ بچے۔ عادتاً یا ضرورتاً ننگے رہتے ہیں اور ساری عمر اس چمڑی میں گذار دیتے ہیں جس کے ساتھ وہ ماں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اس کی وجہ نہ ان کی غربت ہے نہ انگریزی راج کی برکت۔ بلکہ محض قانونِ قدرت۔ ان کے علاوہ ہندوستان میں ایک بہت چھوٹی سی اقلیت ہے جس نے ہزارہا سال سے عریانیت کی شمع کو اپنے علم و فضل سے فروزاں کر رکھا ہے۔ میرا اشارہ ناگوں کی طرف ہے۔ ننگے وہ بہادر، بے غرض اور فقیر لوگ ہیں۔ جو اکثر کنبھ کے میلے پر دکھائی دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی پاکیزہ روایات اور بے مثل قربانی سے ہندوستان میں عریانیت کی تحریک کو اس کی تمام سچائی اور خوبصورتی کے ساتھ زندہ رکھا ہے۔ جب تک ان لوگوں کا دم باقی ہے۔ اس تحریک کے مٹ جانے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ یہ تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ہندوستان میں لاکھوں کروڑوں ننگے رہتے ہیں لیکن یہ لوگ ناگوں کی طرح اس تحریک کی بنیادی صداقت سے واقف نہیں۔ اور شاید یہ لوگ ہر لحظہ یہی دعا کرتے رہتے ہیں۔ کہ انہیں اور کپڑے ملیں تو یہ اپنے بال بچوں اور بیویوں کے جسموں کو کپڑوں سے ڈھک سکیں۔ ان لوگوں کی ذہنیت خطرناک طور پر رجعتی اور بورژوائی ہے۔ ضرورت اس امر کی نہیں کہ ان لوگوں کو کپڑے مہیا کئے جائیں۔ بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں کپڑوں کے مضرات سے آگاہ کیا جائے۔ اس کے لئے

لگاتار پروپیگنڈے کی ضرورت ہے۔

مقامِ شکر ہے کہ ہندوستان کے رہنماؤں کی توجہ اب اس طرف منعطف ہوتی جا رہی ہے۔ پچھلے دنوں مہاراجہ آف جام نگر (مرحوم) نے ایک نہایت شاندار سولے رئیم (SOLARIUM) جام نگر میں تعمیر کرایا۔ اسی طرح بمبئی کے لکھ پتیوں نے بھی ننگا رہنے کا ایک کلب قائم کیا ہے۔ یہ ہے وہ سچی مساوات جسے صرف کوئی ننگا رہنے والا ہی دوبارہ زندہ کر سکتا ہے اور مجھے تو عریانیت کا مستقبل اور اس لئے انسان کا مستقبل بہت شاندار نظر آتا ہے — اور میں تو باطن کی آنکھ سے وہ زمانہ دیکھ رہا ہوں کہ جب ننگے رہنے والے اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ جب اس دنیا میں ایک ننگا انقلاب آئے گا۔ ایک برہنہ طوفان جو ہر قسم کے کپڑوں کو (ان میں سوتی۔ اونی۔ ریشمی اور جاپانی، ہر قسم کے کپڑے شامل ہیں) خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا۔ اور سب انسان قدرت کے حضور میں ننگے کھڑے ہوں گے اور دنیا مکمل مساوات۔ مکمل آزادی اور مکمل امن حاصل کرے گی۔

کرشن چندر

رباعی

لو آ گئی پھر آ گئی برسات کی رات
ہمیں وہ جنوں خیز روایات کی رات
لیکن اے شومیٔ نصیب ایسی شب
[illegible] ہے مختصر اب رات کی رات

عبدالعزیز فطرت

گھٹائیں

جھوم جھوم کر آئی گھٹائیں

آئی گھٹائیں چھائی گھٹائیں — ڈوب گئیں مستی میں فضائیں
کس کو پکاریں، کس کو بلائیں — جھرنوں کی مخمور صدائیں
موجِ صبا کی بے باکی سے — کلیاں سمٹیں اور شرمائیں
اُلھڑ بوندوں کی تالوں پر — دریا ناچیں، پربت گائیں

جھوم جھوم کر آئی گھٹائیں

آئی گھٹائیں، تم بھی آؤ — غم کے عقدے کو سلجھاؤ
اُمیدیں سر پھوڑ رہی ہیں — اُمیدوں کو کچھ سمجھاؤ
یا اُمیدوں کا خوں کر دو — یا اُمیدوں کو بر لاؤ
کب تک حسرت کا منہ دیکھیں — کب تک دل کے ناز اُٹھائیں

جھوم جھوم کر آئی گھٹائیں

غم کا غم کھانا کیا معنی — بات کا افسانہ کیا معنی
جوشِ جنوں کے گمراہوں کو — رہ پر لے آنا کیا معنی
دل وحشی ہے دیوانہ ہے — دل کو سمجھانا کیا معنی
سمجھائیں کیا دل کو باقی — دل سمجھے تو کچھ سمجھائیں

جھوم جھوم کر آئی گھٹائیں

باقی صدیقی

پتے میں ایشیا میرٹھ (یو پی) لکھنا نہایت ضروری ہے

ماہنامہ "ایشیا" میرٹھ کا مکاتیب نمبر

ہندوستان کے مشاہیر ادب اور مشہور ہستیوں کے خطوط کا غیر فانی مجموعہ

مرتبہ ساغر نظامی

اردو میں اس قسم کی کوئی مستند اور اعلیٰ کتاب اس وقت تک شائع نہیں ہوئی جس میں ترتیب اور لطیف حواشی کے ساتھ ملک کی مشہور ہستیوں کے سیاسی، علمی، ادبی، شعری اور اسالیبی خطوط بہ یک وقت جمع کر دیئے گئے ہوں۔ ایشیا نے اپنا تازہ نمبر "مکاتیب نمبر" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یوں تو ہر لفظ جو کسی زبان سے نکلتا یا قلم سے لکھا جاتا ہے اپنے موضوع پر کم و بیش روشنی ڈالتا ہے لیکن خطوط اور خاص کر وہ خطوط جو بڑے آدمیوں کی طرف سے اپنے بے تکلف احباب کو لکھے جاتے ہیں۔ زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں ان کی طبیعت کی گہرائیوں اور حالات و واقعات کی اصلیتوں کا راز فاش ہوتا ہے جو سماجی رکھ رکھاؤ اور ادبی رسوم و تکلفات کی متحمل نہیں ہو سکیں۔

یہ نمبر کتابی صورت میں $\frac{22\times18}{8}$ سائز کے ۴۰۰ صفحات پر شائع ہوا ہے اس جنگ کے زمانہ میں نہایت بہتر چھپائی، نفیس سپید کاغذ، شاندار ٹرق، جدت نواز گرد پوش۔

مکاتیب نمبر کے چند مکتوب نگار

پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر سید محمود، جے بی کرپلانی، خواجہ حسن نظامی، ڈاکٹر عبدالحق، رشید احمد صدیقی، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، حکیم آزاد انصاری، ڈاکٹر اشرف، اختر شیرانی، مانی جائسی، ارشد تھانوی، تاجور نجیب آبادی، شوکت تھانوی، حسرت موہانی، مجاز لکھنوی، ڈاکٹر تاثیر، سہابی ایم اے، آنند نرائن ملا، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی، احسن مارہروی، ڈاکٹر قاری، نیاز فتحپوری، ماہر القادری، عرش ملسیانی، الطاف مشہدی، ثاقب کانپوری، سید ضامن علی ایم اے، عسکری طباطبائی، فراق گورکھپوری، عبدالباری آسی، امین حزیں سیالکوٹی، فرید آبادی، حامد اللہ افسر ایم اے، سید عابد علی ایم اے، سر شاہ سلیمان مرحوم، بیرسٹر مسعود، بشیر احمد بی اے آکسن، منشی احمد سوز لکھنوی، بیما، منظر تھانوی، مجنوں گورکھپوری، نیاز فتحپوری، سہیل عظیم آبادی، غرضکہ ہندوستان کا کوئی مشہور ادیب یا شاعر ایسا نہیں جس کے ایک آدھ خط اس نمبر میں نہ رل جائیں۔ خطوط کے علاوہ خطوط پر دو شاہکار نظمیں، اور چند علمی و تنقیدی مقالے جو مکتوب نگاری سے تعلق رکھتے ہیں اس مجموعے میں ہیں جنھوں نے اس کی اہمیت کو اور بھی بڑھا دیا ہے قیمت فی جلد عہ مع محصول جو حضرات ایشیا کی مستقل خریداری فرمائیں گے وہ اسے مفت حاصل کر سکتے ہیں قیمت ایشیا میرٹھ سالانہ (للعہ)

مینیجر رسالہ "ایشیا" ادبی مرکز، میرٹھ

اپنی زندگی کا بیمہ

جیوپیٹر جنرل انشورنس کمپنی لمیٹڈ

میں کرائیے

جس کا شمار ہندوستان کے بڑے بڑے اداروں میں ہوتا ہے

ہیڈ آفس بمبئی

منظور شدہ سرمایہ	دو کروڑ روپے
فروخت شدہ سرمایہ	ایک کروڑ پچاس لاکھ روپے
ادا شدہ سرمایہ	تئیس لاکھ چوہتر ہزار آٹھ سو روپے
آمدنی زائد از	بہتر لاکھ روپے

ایجنٹوں اور انسپکٹروں کے کام کے لئے ہمارے بیمہ زندگی کے شعبے کے لئے معقول شرائط پر چند دوستوں کی ضرورت ہے۔

آر این شرما لائف سکرٹری دی جیوپیٹر جنرل انشورنس کمپنی لمیٹڈ (پنجاب برانچ) سر گنگا رام بلڈنگس پوسٹ بکس نمبر ۲۰۷، ۲۲ دی مال لاہور

ٹیوشن کی ضرورت ہے

یو پی کے ایک ایسے شاعر اور ادیب کے لئے جو اردو میں ادیب سے لیکر ادیب فاضل، اور فارسی میں منشی سے لے کر منشی فاضل تک بحسن و خوبی تعلیم دینے کے علاوہ لکھنو، دہلی، کی بہترین زبان داں کے متعلق پوری واقفیت بہم پہنچا سکتے ہیں مضمون نگاری، شعر گوئی اور ہر قسم کے ادبی مشورے دینے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

اگر اس زریں موقع سے تشنہ کامانِ ادب فائدہ اٹھانا چاہیں تو مندرجہ ذیل پتہ سے خط و کتابت کریں۔

ح۔ معرفت دفتر رسالہ ادبی دنیا۔ لاہور

یونہی

کہو! اک بات کہوں؟ ـــــ کوئی سُنے گا تو نہیں؟
تم سُنو گی؟ ـــــ ارے ہاں تم تو سُنو گی ـــــ لیکن
سوچ لو، سُن کے بُرا تو نہیں مانو گی اسے؟
تم بُرا مانو گی؟ ـــــ میں جانتا ہوں ـــــ جانتا ہوں ـــــ
خیر! لو، آؤ، سُنو ـــــ آؤ قریب آ جاؤ،
کوئی آ جائے گا؟ ـــــ آئے گا تو پھر کیا ہو گا!
پھر سہی، پھر سہی، جاؤ کوئی آ جائے گا ـــــ
اب کہوں؟ سوچ لو! میں تم سے کہے دیتا ہوں!
نہیں مانو گی؟ ـــــ نہیں مانو گی تم؟ ـــــ مان بھی جاؤ،
کیوں ـــــ مجھے اپنی قسم دیتی ہو؟ ـــــ ٹھہرو ٹھہرو ـــــ
چھیڑتا ہوں؟ ـــــ تمہیں میں چھیڑتا ہوں؟ ـــــ خوب چہ خوب ـــــ
اچھا ـــــ تو آؤ، سنو، ـــــ تم تو نہیں مانو گی،
مانو گی؟ ـــــ اچھا ـــــ کہے دیتا ہوں ـــــ میں نے کل رات
دل میں سوچا تھا کہ اب تم سے نہیں بولوں گا ـــــ

یوسف ظفر

نفیری کی صدا

اسے نفیری کی صدا کچھ اپنی ہی ہمنوا معلوم ہوتی تھی۔ مگر اس کو فوراً یاد آگیا کہ وہ اس سے مختلف چیز کا پیغام دے رہی تھی۔ وہ طنز آمیز ہنسی کے ساتھ ہنس پڑی۔ بہت دیر سے اپنے بستر پر ساکت لیٹی ہوئی تھی اور وہ اب بھی ٹکٹکی باندھے چھت کی طرف دیکھ رہی تھی جو بڑھتے ہوئے اندھیرے کے باعث اس کی نظر سے رفتہ رفتہ غائب ہو گئی۔ نفیری کی آواز کے ساتھ اس کے دل میں درد سا اٹھا۔ ساتھ میں اور باجوں کی آوازیں بھی آنی شروع ہو گئیں یہ سڑک کی آوازیں تھیں جو اس کے چھوٹے سے کمرے کے کوٹھے میں کچھ شور و غل پیدا کر دیتیں اور اس پر بغیر کچھ خاص اثر کئے ختم ہو جاتیں۔ نیچے سے سینکڑوں ارتھیاں رام نام ست ہے کی اونچی نیچی آوازوں کے درمیان گذر جاتیں جب نیچے سے کوئی جنازہ گذرتا تو وہ اپنے ہی خیال میں بول اٹھتی " کیسی خوش نصیب ہستی ہے "۔ مگر فوراً ہی اس کے دل میں ایک نامعلوم سا خوف پیدا ہو جاتا۔ اور وہ اپنے خیالات کو ٹالنے کی کوشش کرتی۔ وہ ان سب چیزوں کی عادی ہو چکی تھی۔ مگر اس وقت باجے کی قریب آتی ہوئی آواز اس کے دل میں کچھ گدگدی سی کر رہی تھی —— کچھ باسی خیالات، کچھ مردہ حسرتیں!

باجے کی آوازیں قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے اندھیرے کوٹھے میں سڑک والی کھڑکی کی درزوں سے چھن کر گیس کے ہنڈوں کی روشنی بھی آنی شروع ہو گئی۔ یوں روشنی آتی جیسے غم اور مصیبت کی حالت میں ایک خیالی خوشی کا خیال۔ مدھم اندھیرا ہی اندھیرا۔ روشنی آکر گذر جاتی تھی مگر اس پر کیا اثر کرتی!۔۔۔ باجے اور قہقہوں کی آوازیں بالکل کوٹھے کے نیچے معلوم ہونے لگیں۔ وہ اٹھی اور ایک نامعلوم کشش کے ماتحت کھڑکی کی طرف بڑھی۔ زنجیر پر اس کے ہاتھ پڑے اور اس کو کئی سال پہلے کا واقع یاد آگیا جبکہ اس نے اسی طرح دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کھڑکی کی زنجیر کھول کر ایک برات دیکھی تھی۔ مگر فرق یہ اتنا تھا کہ تب ارمان زندہ تھے اور خوف و ہراس کے درمیان پل رہے تھے۔ اور اب وہ حسرتوں میں تبدیل ہو کر ایک مصیبت بن چکے تھے۔ اس نے سوچا کہ پھر اپنے پلنگ پر واپس چلی جائے۔ مگر ایک نامعلوم شوق نے اس کو مجبور کر دیا کہ وہ دیکھے کہ آج کس کی قربانی ہو رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کو کھول کر دیکھنا شروع کیا۔ نیچے ایک برات تھی! —— ایک برات!

بینڈ بج رہا تھا۔ براتی اچھے کپڑے پہنے۔ ہنستے مسکراتے، خوش خوش ساتھ تھے۔ اس نے باجا بجانے والوں کے چہروں کو غور سے دیکھا۔ کیا وہ اپنی خوشی کے لئے باجہ بجا رہے تھے۔ یا اس لئے کہ ان کو اس کی اجرت ملے گی۔ اجرت! بڑی چیز ہے! اجرت دے کر یوں خوشی کا اظہار مول لیا جا رہا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر حقارت آمیز مسکراہٹ آگئی —— برات کا جلوس آہستہ آہستہ چلنا شروع ہوا۔ مختلف راگ گاتے ہوئے باجے والوں کے گروہ گذر گئے۔ اب کے نفیری بجانے والا زرق برق پوشاک پہنے ہوئے اس کی نظروں کے سامنے آیا۔ اس کے پیچھے اس نے گھوڑے پر سوار دولہا کو دیکھا۔ اس کو کپکپی سی محسوس ہوئی۔ دولہا کے آگے نفیری اس کو کچھ اعلان کرتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس اعلان کو کچھ وہی سمجھ سکتی تھی جس پر سب کچھ گذر چکا تھا۔ اس کو نفیری کی صدا اپنی ہی کہانی دہراتی ہوئی معلوم ہوئی۔ بعض لوگوں کو کہانی کی طرح واقعات پیش آجاتے ہیں اور بعض کی زندگی ہی افسانہ ہوتی ہے۔ کیا نفیری کی صدا دولہا کے کردار کی ترجمان نہ تھی! نفیری والا سانس لینے کے لئے رک گیا ..... یہ دولہا اس کو ایک بھونرے کی شکل میں نظر آیا جو ایک نوخیز کلی کے اوپر منڈلا رہا ہو۔ وہ اس کلی کو کس چاہت سے اپنی مملکت بنانے کے لئے کوشاں رہ چکا تھا۔ وہ کامیاب واپس آرہا تھا۔ یہ اس کو صاف نظر آیا کہ مستقبل قریب میں وہ اس کا رس چوس لے گا۔ کلی کھل کر پھول ہو جائے گی۔ وہ ممکن ہے کچھ دن اور اس پر منڈلائے۔ اور پھر اس کو ہر باد مخالف کا مقابلہ کرنے کے لئے تنہا چھوڑ کر خود تازہ رس کی تلاش میں چلا جائے —— نفیری پھر شروع ہو گئی۔ اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

اس کو اپنی شادی کا واقعہ یاد آگیا۔ ایک دن وہ بھی اسی طرح ......

لے جائی گئی تھی اور سسرال میں اس کا خیر مقدم اس گانے کے ساتھ ہوا تھا۔ بنا جیت لا یاری انار کی کلی!

حقیقتاً وہ جیتی ہوئی تھی اس لئے نہیں کہ وہ کسی مقابلے میں ہار گئی تھی، بلکہ اس لئے کہ وہ اس طبقے سے تعلق رکھتی تھی جس کو ہمیشہ ہر چیز میں جیتنے کے بعد بھی ہارنا پڑتا ہے۔ دوسروں کا دباؤ اور غلامی جس کو زندگی کی طرح ودیعت کی گئی ہے ــــــ سسرال میں کاٹے ہوئے دن! آہ! وہ کانپ اٹھی! اس نے پہلے سنا تھا کہ اس کی صورت "اچھی نمکین" ہے۔ مگر دولہا نے اپنی بھونڈی صورت کو نظر انداز کرکے کہہ دیا تھا کہ وہ بدصورت ہے۔ وہ اپنے کو حسین کیسے بناتی! شوہر کے رفتہ رفتہ بدلتے ہوئے تیور! سسرال والوں کا برتاؤ! اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس کو اپنی ساس کا ایک جملہ یاد آگیا جو وہ اپنی پڑوسن سے کہہ رہی تھی کہ "دولہا کو دلہن پسند نہیں آئی" وہ رفتہ رفتہ سب کی نظروں میں حقیر اور ذلیل ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سب واقعات جو انتہائی تکلیف دہ تھے مگر جن کی یاد اتنی بار آ چکی تھی کہ اب ان میں مزید تکلیف پہنچانے کی اہمیت باقی نہیں رہی تھی، سوکن کا تقابل۔ ...... اس ظلم کے خلاف کون زبان ہلا سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے لئے مذہب کا بہانہ موجود تھا۔ مگر اس کے لئے ناممکن تھا کہ طلاق لے کر بھی اپنا پیچھا چھڑا لے۔ آخر وہ طلاق لے کر بھی کیا کرتی؟ اماں باپ کب تک کفالت کرتے! بھاوجیں! الاماں ...... اس میں خود کسی کام کی قابلیت نہیں تھی علاوہ بریں مطلقہ سماج کی خوفناک آوازوں کا وہ کس طرح مقابلہ کرتی؟ اس نے بے کسی سے اپنے سر کو جھٹکا دیا ...... کیا وہ آزاد ہونے کی کوشش کر رہی تھی! ــــ اس کو یاد آگیا کس طرح اس کی مصیبتوں میں اضافہ کرنے کے لئے ایک بچہ اور آگیا تھا۔ اس نے نامعلوم کتنی تکلیفیں اس کو دنیا میں لانے کے لئے اٹھائیں اور اس کے باپ نے صرف تفریح کی تھی۔ سب تکلیفیں اس نے برداشت کیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ دائی کو گھبرا کر روتی تھی مگر اس کو تسلی دینے والا کوئی نہ تھا۔

بچے کی پیدائش کے بعد ہزار دقت سے اُس نے اس کو پالا۔ مگر وہ خوش تھی اس لئے کہ اب وہ اس سے محبت کرتی تھی اور دنیا میں اس کو اور صرف اس کو اپنا کہہ سکتی تھی۔ صرف کسی کو اپنا کہنا اور سمجھنا ہی کتنا سکون کا باعث ہے! ــــ بچہ اس کی بڑھتی ہوئی محبت کے ساتھ بڑھتا گیا۔

یکے بعد دیگرے سب گذرے ہوئے واقعات اس کے ذہن میں آئے اور چلے گئے۔ اس کو یاد آیا کہ اس کی سب سے بڑی شکایت اپنے شوہر کے خلاف یہ تھی کہ اس نے اس کو پنجرے میں تو بند کر دیا تھا مگر اس سے کھیلنا چھوڑ دیا تھا۔ کیا عورت کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ مرد کا کھلونا بنی رہے! ...... پھر اس کے ماں باپ کی اس کے شوہر سے لڑائی۔ شوہر کا جل کر اس کو ستانا۔ باپ کی بے وقت موت۔ اس کا جلن میں آکر ایک دن بچے کو اٹھا کر لے جانا۔ وہ اس کی اس سے سب سے پہلی دوبدو لڑائی وہ اس کا بھوکی شیرنی کی طرح اپنے بچے کو واپس لینے کی کوشش کرنا۔ مگر بچے کا بچھڑنا سب کا اس کو تسلی دینا کہ بچہ باپ کا ہوتا ہے، باپ کا حق ہے کہ اس کو لے جائے۔ اس کے سر میں چکر سے آنے لگے۔ وہ آگے نہ سوچ سکی ...... اس کا سینہ غم سے جلنے لگا ...... نیچے دولہا کا گھوڑا آگے بڑھ چکا تھا اور اس کے پیچھے دلہن کی پالکی تھی۔ اس کے خیال نے اس کے اندر سرخ کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا جس کی قربانی دی جا رہی تھی۔ اس کے زیور گویا اُس کی پابندیوں اور ذمہ داریوں کے نشان ہیں جو اس کو سر اٹھانے کی بھی مہلت نہیں دیں گے۔ اس کی آرائش وہ دیوانوں کی طرح ہنس پڑی! یہ آرائش! اس لئے کہ بھونرے کو زیادہ سے زیادہ دیر تک اپنے اوپر منڈلاتا رکھے۔ دلہن کی پالکی بھی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ بے خیالی میں اُس کے گلے سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ سامنے سے دلہن کا جہیز نکلنا شروع ہوا۔ وہ کانپ اُٹھی۔ ممکن ہے کہ یہ دلہن بھی اس کی طرح اپنے جہیز کے ساتھ اپنے ماں باپ کا آرام و سکون بھی لئے جا رہی ہو اور ان کے رہنے کو اب ایک بھی مکان باقی نہ رہا ہو۔ اُف!

نیچے سے مبارکباد کی صدائیں آ رہی تھیں۔ دولہا کو مبارکباد دی جا رہی تھی۔ کیا اس لئے کہ اس کو مشق ستم کے لئے ایک نشانہ مل گیا تھا؟ کھلونا! ــــ وہ اپنے اندر غم و غصہ کی آگ کو بھڑکتے ہوئے محسوس کرنے لگی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اس دلہن کو پالکی سے نکال لائے جو ہر قدم پر قربان گاہ کے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا سُرخ جوڑا اس کو ارتھی کا کفن معلوم ہو رہا تھا۔ اسے اتار پھینکے۔ اس کے زیوروں کو توڑ ڈالے اور اس کو بتا دے کہ یہ اس کی شادی نہیں بلکہ اس کے جذبات کی موت ہے! ...... مگر پھر اس کے خیالات کا سلسلہ رُک گیا! انسانیت کا حق عورت سے اس وقت ہی چھین لیا جاتا ہے۔ جبکہ وہ عورت کے قالب میں جنم لیتی ہے۔ اور وہ سوچتی رہی، بے کار، بے معنی خیال اُسے آتے رہے۔ برات اور آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ قربانی کا جلوس! وہ اپنے خیالات میں کھو گئی۔ برات جا چکی۔ اس کے سوئے ہوئے خیالات

جاگ اٹھے۔ پہلے صرف اپنا درد تھا۔ مگر اب وہ نئی دلہن کا درد بھی اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی۔ ہنڈولں کی روشنی بھی کم ہوتے ہوتے غائب ہوگئی تھی۔ وہ پھر اندھیرے میں رہ گئی —— دور سے تاشے اور باجوں کی آواز مدھم سروں میں آرہی تھی —— پھر نفیری کی ہلکی صدا —— اس کو یوں محسوس ہوا جیسے دلہن ہچکیاں بھر بھر کر رو رہی ہے۔ وہ اپنے بستر پر واپس آکر لیٹ گئی۔ اب اس کو معلوم ہوا کہ کیسل نفیری کی صدا اُسے اپنی ہمنوا معلوم ہو رہی تھی!

سلطانہ قاضیہ

رباعی

نغمگاں سے طرب بلند کر کے آئی
ہنگامے دوچند کر کے آئی
ہنگامۂ تپش کر کے خاموش
فریاد کہ بیکس دل دردمند کر کے آئی

سعید احمد اعجازی

شعر

فضائے عشق کی مغموم خامشی میں اے جابرؔ
اجل کی چیخ کو جانا سرودِ زندگی میں نے

جابر علی جابرؔ

جوان ہونے سے کچھ پہلے

بہت سادہ طبیعت، بھولی بھالی
کہ جیسے بن کھلی کلیوں کی ڈالی

جبیں سچی خوشی کا آشیانہ
تبسم میں مسرت کا فسانہ

زمانے کی ہوا سے بے خبر ہے
نظر معصوم، دل معصوم تر ہے

کنول کے پھول کی مانند سادہ
حیا فطرت، زیادہ سے زیادہ

حنا سے پاک ہیں شفاف پورے
ذرا کچھ سرخ ہیں آنکھوں کے ڈورے

نگاہیں مطمئن، چہرہ ہے مسرور
یہ عالم ہے، پشیماں ہے نہ مغرور

ابھی تک مسکراہٹ بے سبب ہے
ابھی دل کی انگیٹھی گرم کب ہے؟

ابھی انگڑائی ہے جذبے سے خالی
ابھی آزاد ہے ہونٹوں کی لالی

ابھی کوئی پریشانی نہیں ہے
نظر مانوس حیرانی نہیں ہے

تمناؤں کی پابندی نہیں ہے
مسرت میں کوئی ساجھی نہیں ہے

بناوٹ سے نہیں اس کو سروکار
کہ وہ فطرت کے گلشن کی ہے پھلوار

پریشاں زلف، صدری ململی ہے
دوپٹے کی کناری مڑ گئی ہے

گریباں کے بٹن ٹوٹے ہوئے ہیں
جبیں پر بال کچھ چھوٹے ہوئے ہیں

گرہ دیتی ہے الجھے گیسوؤں میں
کھٹکتی ہے کبھی ناخن کی کوریں

مجسم سادگی ہی سادگی ہے
سراپا زندگی ہی زندگی ہے

کلی اب پھول بنتی جا رہی ہے
دبے پاؤں جوانی آ رہی ہے

نگاہوں میں بہت مبہم اشارات
زباں پر جیسے بے سمجھی ہوئی بات

جوانی اک قیامت لا رہی ہے
بڑی ہی سخت منزل آ رہی ہے

ابھی درد محبت راز میں ہے
جوانی منزل آغاز میں ہے

ماہر القادری

بزدل

فرنٹیئر میل فرّاٹے بھرتی جا رہی تھی چج چج چڑاخ، کھچا کھچ کھڑ کھڑ کھڑاخ جنوری کا پہلا ہفتہ اور پھر رات کا وقت سردی پورے جوبن پر تھی اور اس پر مصیبت یہ کہ چند گرم مزاج مسافروں نے کھڑکیوں کے پٹ بالکل کھول رکھے تھے۔ جیسے گرمی کے مارے ان کا دم گھٹا جا رہا ہو۔ پہلے تو میں خاموش بیٹھا رہا۔ لیکن جب سردی بالکل ناقابل برداشت ہو گئی تو پاس ہی بیٹھے ہوئے ایک بنگالی بابو سے جرأت کرتے ہوئے پوچھ ہی بیٹھا "کیوں صاحب اگر میں اس کھڑکی کا شیشہ چڑھا دوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ؟"

"آئیں سیسہ ؟" وہ شیشہ پر زور دیتے ہوئے بولے "کیا کہتے ہو بابو۔ سارا چوبیس آدمی کا ڈبہ اور بیٹھا ہے پچاس سے اوپر۔ ہمارا دم گھٹے گا"

"حضرت بیٹھے ہوئے تو صرف سات آٹھ ہیں۔ باقی تو نیند کے مزے لے رہے ہیں" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور چپ ہو کر بیٹھ رہا۔ دل میں سوچا کہ اگر ان کی جگہ کوئی پنجابی ہوتے تو ضرور میرا کہنا مان لیتے یا کم از کم اتنا روکھا پھیکا جواب تو نہ دیتے۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک پنجابی صاحب شیر ببر کی طرح انگڑائیاں لیتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ آپ تین گھنٹے سے کھڑکی کے باہر پاؤں لٹکائے دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہے تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر انھوں نے بھی تھوڑا سا جواب دے دیا تو بہت سُبکی ہو گی۔ دل کڑا کر کے ان کو بھی اسی انداز میں مخاطب کیا "اگر آپ کو کوئی شکایت نہ ہو تو یہ کھڑکی بند کر دوں؟ دیکھئے نا میرے ساتھ ایک زنانہ سواری ہیں انھیں ذرا سردی محسوس ہوتی ہے۔"

پنجابی صاحب جو ابھی تک دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملنے میں مصروف تھے چونک کر بولے "زنانہ سواری ؟ کہاں ہے وہ زنانہ سواری؟" پھر آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے "مجھے تو کوئی نظر نہیں آتی!" "اچھا اچھا، وہ بادامی ساڑھی والی ہیں آپ کے ساتھ۔ ہاں صاحب! آپ کو کھڑکی ضرور بند کر دینی چاہیئے۔ لائیے میں خود ہی کر دوں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات تھی پہلے کیوں نہ بتلا دیا مجھے۔ چہ!"

دل میں آئی کہ اُٹھ کر بچہ جی کے ایسا گھونسا رسید کروں جو یاد ہی کریں تہذیب کے تقاضے سے "شکریہ" کہہ کر خاموش ہو رہا۔

"اب اور کتنی دُور جانا ہے" شکیلہ نے اس انداز میں پوچھا گویا وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو۔

ابھی بہت دیر ہے۔ اگر تم چاہو تو اطمینان سے سو سکتی ہو۔ مجھے تو کم بخت نیند ہی نہیں آتی۔ ورنہ کبھی کا سو جاتا۔ دیکھو تم اب سو جاؤ۔ یہ لو میرے اوورکوٹ کو تو تم بناؤ تکیہ اور اس بکس پہ اپنے پاؤں رکھ لو۔ اچھا ٹھہرو بکس پر اٹیچی کیس رکھ کر ذرا اسے اونچا کر دوں۔ اب ٹھیک ہے نا ؟" میں نے اٹیچی کیس رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کچھ نہ کریں۔ میں ٹھیک ہوں۔ مجھے نیند ونیند نہیں آتی" یہ کہہ کر شکیلہ پھر سامنے کی طرف دیکھنے میں مشغول ہو گئی۔ میں نے کوشش کی کہ معلوم کروں اسے باہر کیا نظر آ رہا ہے لیکن شیشے میں سوائے اپنی شکل کے کچھ نظر نہ آیا۔ جب سے ہم گاڑی میں بیٹھے تھے۔ وہ اسی طرح اپنے سامنے کی کھڑکی پر ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی تھی۔ بالکل ساکت اور خاموش۔ اپنے موجودہ ماحول سے بالکل بے نیاز۔ وہ کسی خیالی دنیا میں محو پرواز تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو ؟" میں نے قدرے جھجک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں" اس نے ایسے لہجے میں کہا۔ گویا بات کو وہ بہت جلد ختم کر دینا چاہتی ہو۔

"نہیں تم کچھ سوچ ضرور رہی ہو" میں نے دانستہ بات کو طول دینے کی خاطر کہا۔

"آخر یہ سب کس لئے ؟" شکیلہ نے نیم شکایت آمیز اور نیم ناصحانہ انداز میں پوچھا۔

"تم کیا کہہ رہی ہو شکیلہ" جذبات پر قابو پاتے ہوئے میں نے کہا۔

اس سوال کا جواب ایک طویل خاموشی تھی جس کو توڑنے کی مجھ کو

جرأت نہ ہوئی۔

"یہ کس کا بکس ہے؟" اس نے اوپر کی سیٹ پر رکھے ہوئے ایک چمڑے کے بکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا جو دھیرے دھیرے ڈھلکتا آ رہا تھا۔ "اِسے ذرا پیچھے کر دیں آپ؟"

"یہ بکس تو میرا۔ میرا مطلب ہے اپنا ہے شکیلہ"۔ اور پھر دبی زبان سے منہ اور قریب کر کے میں نے کہا "ذرا آہستہ بولو۔ کوئی سن لے گا تو کیا خیال کرے گا۔ دیکھو نا۔ وہ بڑا صندوق۔ یہ دونوں چمڑے کے بکس اور یہ دونوں اٹیچی کیس ہمارے ہیں۔ اگر میں سو جاتا۔ اور کوئی مسافر انھیں اٹھا کر لے جاتا تو تمھیں کیا خبر ہوتی؟" آخری بات معلوم نہیں شکیلہ کی سمجھ میں آئی یا نہیں لیکن وہ مسکرا دی۔ وہی موتی سے چمک دار دانت! اور کالی کالی چمکیلی آنکھیں۔

کوئی چھ بجے کے قریب سونے والے کروٹیں بدلنے لگے۔ پھر ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی تھوڑی ہی دیر میں اٹھ بیٹھے۔ سب کے اٹھنے کا انداز تقریباً ایک ہی سا تھا۔ پہلے دو ایک انگڑائیاں۔ پھر جماہیاں اور پھر منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ اس کے بعد اپنے ہمراہیوں کو دیکھتے لیکن اس میں ذرا سا اختلاف تھا۔ بعض ایک چھچھلتی ہوئی نظر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب کو دیکھ جاتے اور بعض حضرات اس قدر مبصرانہ انداز سے لوگوں کا جائزہ لیتے جیسے قصائی بکرا لیتے وقت یا دلہن کی نندیں پہلی دفعہ اس کا گھونگھٹ اٹھاتے وقت ایک ہی نگاہ میں ہر بات جان لینا چاہتی ہیں۔ غرضیکہ سب مسافر اٹھ بیٹھے۔ مہندی رنگی ڈاڑھیاں اٹھیں۔ کالی ڈاڑھیاں اٹھیں عینکوں کے شیشے صاف ہوئے۔ نیلے۔ کالے برقعے حرکت میں آئے۔ ساڑھیاں چمکیں۔ لہنگے لہرائے۔ طرّے بلند ہوئے۔

بڑی توند والے اٹھے۔ دبلے پتلے اٹھے۔ کالے اٹھے۔ گورے اٹھے بڑے اٹھے چھوٹے اٹھے۔ چوڑیوں کی جھنکار۔ بندوں کی چمک۔ سگریٹ کے کش۔ حقے کی گڑ گڑ۔ گاڑی کی چھکا چھک۔ جس ڈبے میں ایک مُردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ اب زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ جو پہلے ایک قبرستان دکھائی دیتا تھا۔ جہاں گاڑی کی آواز کی جگہ سوتے ہوئے لوگوں کی خرخر خراٹے نے لے لی تھی۔ اب ایک اچھی خاصی چھوٹی سی پر رونق بستی معلوم دینے لگی۔

"اخبار لو گی؟"

"اخبار!" اس نے [illegible] کر بولی۔ گویا کسی نے زور سے گھونسہ مار دیا ہو۔

"ہاں ہاں اخبار۔ کوئی انگریزی کا پرچہ لوں یا وہی تمھارے انقلاب۔ احسان۔ زمیندار۔"

"آپ نے اگر پڑھنا ہو تو خرید لیں۔ میرا دل نہیں چاہتا۔"

"کوئی رسالہ وغیرہ خرید لو۔"

"ہوں"، کر کے وہ خاموش ہو گئی جس کا مطلب میں یہ سمجھا کہ آپ خاموش رہیے۔ پریشان نہ کریں۔

تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی بولی "کب آئے گا اسٹیشن ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"خدارا آہستہ سے بولو۔ اب جس سٹیشن پر گاڑی ٹھیرے گی۔ بس وہیں ہمارا ٹکٹ ختم ہوتا ہے۔" اس کا ہاتھ دباتے ہوئے میں نے جواب دیا۔ اور اسباب یکجا کرنے میں مشغول ہو گیا۔

"دیکھئے نا کیا بجا ہے اب؟"

"کوئی پونے سات کا وقت ہے۔ تو تمھاری گھڑی ٹھہر گئی کیا؟"

"ہاں میں اسے شاید چابی دینا بھول گئی۔"

اسٹیشن آیا۔ گاڑی رکی جب میں اترنے لگا تو وہی پنجابی صاحب ہی ہی کرتے بڑے مشفقانہ لہجے میں فرمانے لگے۔ "اچھا یہ بات ہے واہ صاحب واہ۔ خیر چیز اچھی ہے۔ اب تو گرمی ہی گرمی ہے۔" یہ کہہ کر اس فاتحانہ انداز سے ایک طویل قہقہہ لگایا۔ گویا ایک بہت ہی کارآمد راز دریافت کیا ہے جس کا اجر یقینی ہے۔ اور بہت گراں قدر انعام کی صورت میں۔

پلیٹ فارم پر ہر شخص ہمیں ایسے گھور کر دیکھتا جیسے کسی گم شدہ بچے کا باپ بھیڑ میں اس کی تلاش کرتا ہوا ہر بچے کو دیکھتا ہو۔

بابو کو ٹکٹ دے کر باہر آئے۔ ایک تانگے پر سامان رکھ کر اسے کسی اچھے سے ہوٹل میں جانے کو کہا۔

ہوٹل کا مالک بہت عاجزی سے پیش آتے ہوئے بولا "ہاں صاحب! آپ اس ہوٹل کو ضرور پسند فرمائیں گے۔ نئے شادی شدہ جوڑے سبھی یہاں آتے ہیں۔ یہ جگہ بھی تو بہت اچھی ہے۔ میں اپنے منہ میاں مٹھو بننا نہیں چاہتا لیکن یہ واقعہ ہے۔ ذرا سیر سپاٹے کی خاطر غالباً آپ آئے ہیں۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔ بہت خوب۔"

"یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ آپ یہ بتائیے۔ کوئی ایسا کمرہ نہیں علیحدہ واقع ہو میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔"

[illegible] سمجھتا ہوا [illegible] سب [illegible]

ں مجبوری ہے ایسا کمرہ
یہی خواہش ظاہر کیا کرتے ہیں لیکن کیا عرض کروں ایک مارواڑی صاحب ٹھہرے
پہلی منزل میں ہے تو سہی لیکن اس میں پرسوں سے
ہوئے ہیں۔ وہ بھی آپ کی طرح ۔۔۔۔" میں نے دانستہ بات
"پھر اوپر کی منزل میں کوئی کمرہ ہو تو بتاؤ"
کاٹتے ہوئے کہا۔
"ہاں تیسری منزل میں ایک کمرہ ہے۔ اس کے بھی دائیں بائیں کمرے
خالی پڑے ہیں" ہوٹل والا بولا۔

اس نوک جھونک کے بعد آخر اس تیسری منزل والے کمرے میں سامان رکھوا دیا۔ شکیلہ اتنی دیر بالکل خموش رہی تھی لیکن اب میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ بولنے کی بہت کوشش کر رہی ہے۔ بولنا چاہتی تھی لیکن پھر ضبط سے کام لے کر چپ ہو جاتی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے جذبات کو اس طرح اندر ہی اندر کچل دے۔

"شکیلہ پیاری ناشتے کے لئے کیا پسند کرو گی؟"

"مجھے بھوک نہیں" کتنا مختصر سا جواب لیکن کتنا پُر معنی!

"تمھیں ہو کیا گیا؟ دیکھو اچھی لڑکیاں کبھی ایسا نہیں کرتیں" میں خود اپنے جذبات سے کھیل رہا تھا۔

"ہم نے اچھا نہیں کیا۔ اس سے پہلے ہمیں بہت کچھ سوچ لینا چاہئے تھا کسی بیماری کا صرف ایک ہی علاج تو نہیں ہوا کرتا" سامنے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"اوہو۔ اچھا یہ بات ہے تو اب تک تم صرف یہ سوچ رہی تھیں کتنی پگلی ہو تم۔ چھوڑو اس بات کو۔ اچھا بتاؤ ناشتے کے لئے کیا منگاتیں؟ بھئی دیکھو اب ضرور بتاؤ" چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے میں نے کہا۔

"گھر کا ہر فرد جاگ پڑا ہوگا۔ سلمیٰ روتی پھر رہی ہوگی۔ میری اماں محلے والوں کو کیا منہ دکھائیں گی۔ آج بارات ۔۔۔۔۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ الفاظ اس کے ہونٹوں پر کانپ رہے تھے۔

"یہی تو باتیں ہیں جو مجھے پسند نہیں۔ یہ بوڑھیوں کی طرح باتیں کرنا تم نے کہاں سے سیکھ لیا۔ کوئی اور بات کرو۔ وہی میٹھی میٹھی باتیں" دیوار میں لگے شیشے میں مجھے اپنے چہرے کا عکس پھیکا نظر آ رہا تھا۔

"ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے گھر سے آئے ہوئے صدیاں گزر گئیں" ... ہوئے بولی۔

"بس اتنے میں ہی گھبرا گئیں ابھی تو ابتدا ہے" اس کے پاس بیٹھے ہوئے میں نے کہا۔

"کتنے اچھے تھے وہ دن تم نیچے اپنے گھر میں پڑھا کرتے اور میں اپنے کوٹھے کی دیوار پر آ جاتی۔ تمھاری نظریں خود بخود کسی زبردست طاقت کے زیر اثر اوپر اٹھ جاتیں اور ہمارے کوٹھے کی دیوار پر پیوست ہو جاتیں۔ میں سلمیٰ سے سوال کرتی اور تم کتاب زور زور سے پڑھنے کے بہانے انگریزی میں جواب دیتے۔ وہ دن یاد ہے تمھیں جب سلمیٰ کے ربڑ کے گھوڑے میں میں نے خط چھپا دیا تھا۔ اور پھر تم نے اس کے بازو پر سیاہی سے انگریزی میں میرا نام لکھ دیا۔ اگر اباجی دیکھ لیتے تو؟"

"مجھے سب یاد ہے شکیلہ میری جان" میں نے اور نزدیک ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب تمھاری شادی کی تاریخ پکی ہوئی تھی۔ اور تم نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے میرا دیا ہوا نیلا رومال ہلاتے ہوئے اپنے خط واپس مانگے تھے۔ کیسے بھول سکتا ہوں ان الوداع کہی تھی اور ا... باتوں کو؟"

"کاش ہماری ساری عمر اسی طرح گزر جاتی۔ سہانے خواب کی طرح کیا ہم نے یہ اچھا کیا؟" ... ہوئے کہا۔

"قطعی" میں نے زور دیتے ہوئے کہا "ہم نے سماج اور سوسائٹی کے منہ پر جو تمانچہ مارا ہے ہم نے علانیہ بغاوت کی ہے۔ اور ہم ثابت قدم رہ کر انشاءاللہ کامیاب ہوں گے۔ قدرت نے ایک ساتھ دھڑکنے والے دو دل پیدا کئے ہیں تو یہ سماج کے خونی بھیڑئیے انھیں کبھی جدا نہیں کر سکتے ہمیں استقلال اور ہمت سے کام لینا چاہئے۔ ہم صرف اپنے لئے ہی نہیں بلکہ ان ہزاروں مجروح دلوں کے لئے بھی لڑ رہے ہیں جو ہر روز رسم و رواج اور جھوٹی شرم و حیا کی بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں۔ کتنی نوجوان آرزوئیں معصوم تمنائیں۔ آنسوؤں کی دھاریں بہ جاتی ہیں؟"

"لیکن ہم کریں گے کیا؟" شکیلہ نے مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہی تو کہہ رہا ہوں۔ ہم ان کو سبق سکھائیں گے تاکہ ان کو پھر دو آنے والی نسلوں پر ہم ایک بہت بڑا احسان کر رہے ہیں شکیلہ؟ کیا تمھیں اس بات کا احساس ہے؟ دو دلوں کے ملاپ میں مخل ہونے کی جرأت نہ ہو۔" ... تو کیا اسی ہوٹل میں ہم رہے جائیں ... اس بلیلہ نے کسی قدر ...

"خدا کارساز ہے۔ اگر وہ ہماری مدد نہ کرے گا تو اور کون کریگا؟ ہمارے تمہارے جیسے بندے اُسے روز تھوڑی ملتے ہیں۔ قانون دانوں کی گرفت میں ہم آ نہیں سکتے۔ عدالت میں کہہ دینا مرضی سے گئی تھی۔ تم کون سی بچہ ہو۔"

"میں سمجھتی ہوں یہ سب لفظی باتیں ہیں۔ میری سمجھ سے باہر۔ آخر کیا تدبیر سوچی ہے تم نے؟" شکیلہ نے رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ سوال واقعی بہت مشکل تھا۔

"پھر وہی باتیں۔ خدا دینے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ اس بات کی تم فکر نہ کرو۔" یہ لفظ میں نے کہے نہیں بلکہ اُگل دیئے۔

"سماج کو ہم کیا سمجھائیں گے۔ ہم نے کوئی نئی بات تو کی نہیں۔ نہ جانے کتنے گھر روز اجڑتے ہیں لیکن سماج تو ویسے کا ویسا ہی ہے۔"

نشتر کی طرح یہ الفاظ میرے دل میں کھُب گئے۔

"شکیلہ یہ باتیں پھر کریں گے۔" میں نے مصالحت آمیز لہجے میں کہا۔ "اب تم ناشتہ کرلو۔ اور میں ذرا شہر تک ہو آؤں۔"

* * * * * *

درختوں کے سائے اس وقت لمبے ہو رہے ہیں۔ میں ابھی تک ہوٹل واپس نہیں گیا۔ شکیلہ سچ کہتی تھی۔ میں تو ایک غریب بے کار شخص ہوں۔ مجھے عشق و محبت سے کیا واسطہ۔ مجھے تو روٹی چاہیئے پیٹ کے لئے دو وقت روٹی۔

کیا میں بزدل ہوں؟

شفقت علی ٹپیالوی بی۔ اے

شام کو راستے پر

رات کے عکسِ تخیل سے ملاقات ہو جس کا مقصود
کبھی دروازے سے آتا ہے، کبھی کھڑکی سے،
اور ہر بار نئے بھیس میں در آتا ہے۔
اُس کو اک شخص سمجھنا تو مناسب ہی نہیں،
وہ تصوّر میں مرے عکس ہے ہر شخص کا، ہر انساں کا،
کبھی بھر لیتا ہے اک بھولی سی محبوبۂ ناداں کا بہروپ، کبھی
ایک چالاک، جہاں دیدہ و بے باک ستمگر بن کر
دھوکا دینے کے لئے آتا ہے، بہکاتا ہے،
اور جب وقت گذر جائے تو چھپ جاتا ہے۔

مری آنکھوں میں مگر چھایا ہے بادل بن کر
ایک دیوار کا روزن، اُسی روزن سے نکل کر کرنیں
مری آنکھوں سے لپٹتی ہیں؛ —— مچل اُٹھتی ہیں
آرزوئیں دلِ غم دیدہ کے آسودہ نہاں خانے سے،
اور میں سوچتا ہوں نور کے اِس پردے میں
کون بے باک ہے اور بھولی سی محبوبہ کون؟

سوچ کو روک ہے دیوار کی، وہ کیسے چلے،
کیسے جا پہنچے کسی خلوتِ محبوب کے مخمور صنم خانے میں؟
وہ صنم خانہ جہاں بیٹھے ہیں دو بُت —— خاموش،
اور نگاہوں سے ہر اک بات کہے جاتے ہیں،
ذہن کو اُن کے دھندلکے نے بنا لیا ہے اک ایسا عکاس
جو فقط اپنے ہی من مانے مناظر کو گرفتار کرے،
میں کھڑا دیکھتا ہوں، سوچتا ہوں جب دونوں
چھوڑ کر دل کے صنم خانے کو گھر جائیں گے،
صحن میں تلخ حقیقت کو کھڑا پائیں گے،
ایک سوچے گا مری جیب، یہ دنیا، یہ سماج،
ایک دیکھے گا وہاں اور ہی تیاری ہے،

مجھ کو اُلجھن ہے یہ کیوں، میں تو نہیں ہوں موجود
رات کی خلوتِ محبوب کے مخمور صنم خانے میں،
مری آنکھوں کو نظر آتا ہے روزن کا دُھواں
اور دل کہتا ہے یہ دُودِ دلِ سوختہ ہے،

ایک گھنگھور سکوں، ایک کڑی تنہائی
مرا اندوختہ ہے،
مجھ کو کچھ فکر نہیں، آج یہ دنیا مٹ جائے،
مجھ کچھ فکر نہیں، آج یہ بےکار سماج
اپنی پابندی سے دم گھٹ کے فسانہ بن جائے،
مری آنکھوں میں تو مرکوز ہے روزن کا سماں!
اپنی ہستی کو تباہی سے بچانے کے لئے
میں اسی روزنِ بےرنگ میں گھس جاؤں گا،
لیکن ایسے تو وہی بُت نہ کہیں بن جاؤں
جو نگاہوں سے ہر اک بات کہے جاتا ہے
چھوڑ کر جس کو صنم خانے کی محجوب فضا
گھر کے بےباک، المناک سیہ خانے میں
آرزوؤں پہ ستم دیکھنا ہے، گھلنا ہے،
میں تو روزن میں نہیں جاؤں گا، دنیا مٹ جائے
اور دم گھٹ کے فسانہ بن جائے
سنگدل، خون سُکھاتی ہوئی بیکار سماج،
میں تو اک دھیان کی کروٹ لے کر
عشق کے طائرِ آوارہ کا بہروپ بھروں گا پل میں،
اور چلا جاؤں گا اُس جنگل میں
جس میں تُو چھوڑ کے اک قلبِ فسردہ کو اکیلے، چل دی،
راستہ مجھ کو نظر آئے نہ آئے، پھر کیا،
اَن گِنَت پیڑوں کے میناروں کو
میں تو چھوتا ہی چلا جاؤں گا،
اور پھر ختم نہ ہوگی یہ تلاش،
جستجو روزنِ دیوار کی مرہون نہیں ہو سکتی،
میں ہوں آزاد — مجھے فکر نہیں ہے کوئی،
ایک گھنگھور سکوں، ایک کڑی تنہائی
مرا اندوختہ ہے۔

میراجی

شعر

زمانہ بڑے غور سے سُن رہا تھا — ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

ثاقب

دنیائے ادب

حصۂ نظم

ادارہ معذرت خواہ ہے کہ اس دفعہ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر نثر کا جائزہ شاملِ اشاعت نہیں ہو سکا۔ (ادارہ)

"دنیا رنگ رنگیلی" ـــــ ایک فلمی گیت کی ٹیپ ہے۔ اور یہ کچھ صرف اُس دنیا کے متعلق ہی صحیح نہیں جس میں ہم مستقل طور پر رہتے بستے ہیں بلکہ شعر کی اُس دنیا کے بارے میں بھی اتنا ہی درست ہے جس میں ہمارا گذر کبھی کبھی ہوتا ہے ـــــ لیکن شعر کی ذہنی دنیا بھی تو زندگی کی مادی دنیا ہی کا عکس ہے اس لئے ان دونوں کو الگ الگ کیوں کیا جائے؟ ـــــ چنانچہ فلمی گیت لکھنے والے کی ہمنوائی کرتے ہوئے ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ "دنیا رنگ رنگیلی بابا دنیا رنگ رنگیلی" اور غور کیجئے تو دنیا کی یہ رنگا رنگ خصوصیت کسی فلم کے بدلتے ہوئے مناظر سے مماثلت رکھتی ہے۔ کم سے کم اس مہینے جائزے کی نظمیں ایک سے ایک الگ انداز کی تصویروں کا بھاؤ لئے ہوئے ہیں مثلاً دھیان جمائیے کہ بدلتے ہوئے سین چلے آرہے ہیں اور اچانک ....

کسی گاؤں کے قریب ایک ندی کے کنارے چند دوست سیر سپاٹے کی غرض سے جمع ہیں ـــــ یہ ایک ساکن تصویر ہے لیکن ہر کسی کی "انفرادی" مصروفیت اس کے سکون میں حرکت پیدا کرتی ہے، منوہر نہا رہا ہے فیض مچھلی کے شکار میں محو ہے، احمد حسن سٹوو تیار کر رہا ہے، اندر ناتھ ہنڈیا کے مواد کی دیکھ بھال میں لگا ہے، شوکت اپنے مسخرے پن کا ثبوت دے رہا ہے اور نسیم عظمت اور محبوب اُس کے اظہارِ فن سے محظوظ ہو رہے ہیں، اظہارِ فن میں گوربچن سنگھ بھی ڈھولک سنبھالے کسی سے کم نہیں ـــــ اور شبنم تجمل اور بچن بھی کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں، یا کچھ نہیں کر رہے ـــــ اور ان سب سے الگ یا ان کے ساتھ ہی کہیں مخمور جالندھری بھی بیٹھا ہوا تمام منظر کو ذہن میں جمانے کی کوشش میں ہے! شاید اس پک نک کی دلکشی پر نظم لکھنے کا ارادہ اُس کے دل میں جاگا ہے۔ لیکن نظم میں وہ صرف اس اجتماع کا نقشہ ہی نہیں کھینچتا بلکہ ان افراد کی بعض طبعی خصوصیات کا بیان بھی کرتا ہے۔ اندر ناتھ اور احمد حسن دوستوں کی خدمت کرنے والے دوست ہیں سب کی پیٹ پوجا کے دھندے میں مصروف۔ فیض احمد شاید "تنہائی پسند" ہے! سب سے الگ بنسی ہاتھ میں تھامے، خاموش بیٹھا ہے۔ منوہر "خوش رو" ہے ـــــ شاید اسی لئے یہاں آکر بھی اُسے رکھ رکھاؤ کی فکر ہے اور وہ نہانے دھونے میں مصروف ہے۔ باقی ساتھی ایک طرح سے اس تصویر کی فضائے بعید کے کردار ہیں لیکن شاعر کی افتادِ طبع پر منوہر کی خوش روئی اور اندر ناتھ کی خوش رنگی کا اظہار کچھ روشنی ڈالتا ہے۔ ہاں، گوربچن سنگھ اگرچہ خاموش ڈھولک بجانے میں مصروف ہے لیکن اُس کی زندہ دلی، شگفتگی، زندگی کا اظہار اُس کی ہر تھاپ سے ہو رہا ہے۔ اور زندہ دلی ہی کا ایک خوش کن مرقع یہ نظم ہے جس میں گاؤں کا مریل کتا، صابن چور کوا، اور گراموفون کی سانولی کامن بالا جہاں حقیقت پرستی کی نمائندگی کر رہی ہے۔ وہاں بیان کی دوسری خوبیاں بھی موجود ہیں۔ "ہنستے ہنستے ہوگئی ہیں کچھ کلاہیں سر پہ کج" ـــــ اور گوربچن سنگھ کی تھاپ کیسی ہے ـــــ "جیسے گونجے تھان سے چھوٹے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپ"۔

اب نظم دیکھئے:ـ

پک نک

گا رہی ہے سانولی کامنؔ گراموفون پر
کُل رہا ہے جسم ندی میں منوہر جھوم کر
مچھلیوں کی تاک میں ڈالے ہوئے بنسی کی ڈور
دُھن رہا ہے دور سے سر فیض احمد شاہزور
بھر رہا ہے نیل کے چولھے میں پھونک احمد حسن
کر رہا ہے صاف اندر ناتھ مرغے کا بدن
نیم کے سائے میں پکے آم ہیں رکھے ہوئے
پیڑ پر کوّے جھپٹنے کو ہیں پر تولے ہوئے

گاؤں کا مریل سا کتا آ گیا ہے سونگھتا
تازہ مکھن کی لپٹ اور خون تازہ مرغ کا

کر رہا ہے رقص شوکت بھر کے رقاصہ کا روپ
جس کو گھیرے میں لئے ہیں نیم عظمت اور بھوپ

قہقہوں میں گھل رہی ہے بادلوں کی گھن گرج
ہنستے ہنستے ہو گئی ہیں کچھ کلاہیں سر پہ کج

دے رہا ہے گو زیجن سنگھ اس طرح ڈھولک پہ تھاپ
جیسے گونجے تھان سے چھوٹے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپ

تاش بکھرے سے ادھوری بازیوں کے ہیں نشاں
آج ان بے کار کھیلوں کی فرصت ہے کہاں

دفعتاً خوش رو منوہر زور سے چلا اٹھا
"دیکھیہ صاحب کی بتاؤ کون اٹھا کر لے گیا!"

ایک کونے پر نگاہیں شب چرن کی جا پڑیں
سب کے ہونٹوں ہنسی کی بجلیاں لہرا گئیں

شرم کے مارے منوہر یک بیک چپ ہو گیا
اتنے میں دور ایک کونے سے دوبارہ شور اٹھا

اس دفعہ شور آفریں خوش رنگ اندرنا تھ تھا
"اُرے تجمل، ارے بچن! دوڑو کہ مرغا پک گیا"

اتنا سننا تھا کہ بزم رقص برہم ہو گئی
ٹوٹ کر یہ فوج بے ترتیب کھانے پر گری

کوئی ٹھنڈا اور کوئی سب سے زیادہ کھا گیا
کوئی خالی ہاتھ ہی ان سب کا منہ تکتا رہا

کشمکش سی تھی مگر شکوہ سرا کوئی نہ تھا
مسکراہٹ تھی لبوں پر اور گلا کوئی نہ تھا

جن میں ہوں اس رنگ کے نغمے، محبت اور اُلم
ایسے لمحے آدمی کی زندگانی میں ہیں کم

ساقی۔ اگست ۱۹۴۱ء **محمود جالندھری**

نظم کا سین بدلتا ہے۔
نقاد معارفی بھی ایک تصویر پیش کر رہا ہے لیکن اس تصویر میں نمایاں افراد صرف دو ہیں، اس کے باوجود یہ اجتماع کی نمائندگی کر رہی ہے۔ عنوان ہی دیکھئے۔

دسہرا اشنان

اے شاد آج صبح زمانے کے واسطے — پُروا سنک رہی تھی سلانے کے واسطے
یہ نظم آئی مجھ کو جگانے کے واسطے

چادر نسیم منظر فطرت نے کھینچ لی — آنکھوں سے نیند سبز کی عادت نے کھینچ لی
بستر جُھپاسمٹ کے اٹھانے کے واسطے

بے اختیار اٹھ کے چلا ہیں کدھر اُدھر — دیوانہ وار اٹھ کے چلا ہیں کدھر اُدھر
جاتی ہے وہ جدھر سے نہانے کے واسطے

اُس پل نے جس پہ پل کے گزرتے ہیں راستے — دریا عبور کر کے بکھرتے ہیں راستے
روکا ہے "اُس" کی راہ دکھانے کے واسطے

چلتا ہوا ہجوم ہے سیلاب بکم خروش — آنکھوں میں کیف عزم پرستش زباں خموش
جیون کو ترتا ہیں سجانے کے واسطے

حسن نظر نواز بھی جنس فضول بھی — شمشاد نونہال بھی بوڑھے ببول بھی
انجام کشت عمر بنانے کے واسطے

دس بیس اُن میں آنکھ مچولی کے رات دن — چھ سات جھیکنے ہاتھ نہ آنے کے سال دن
دو چار منتظر چھوٹے جانے کے واسطے

مندر کے روبرو دیر پرستانِ خوش خرام — ہے جس میں پیش پیش مری شوخی کلام
کوشش میں اپنی جان جتانے کے واسطے

اب پاس آ چکی ہے یہ تمثیل کہکشاں — اب مجھ کو چھانٹنا ہے یہ انبوہ مہوشاں
میری نظر سے لطف اٹھانے کے واسطے

سر ڈھک سے لئے گئے تو ہوئیں بال درست — سینوں پہ سلوٹوں کو پریشاں قبا ئیں چست
ہر "کوندنی" پہ ہاتھ گھمانے کے واسطے

گھٹنوں کو جھول دے کے چھپائی ہیں پنڈلیاں — پھر بھی نظر نواز ہی ساق غزل فشاں
مضمون بے پناہ بچھانے کے واسطے ۔

جس کے لبوں پہ شرح تبسم وہ "مثنوی" — جس کی جبیں پہ قشقہ ابہام بے رخی
کہتی ہے مجھ سے گھاٹ پہ آنے کے واسطے

وہ گھاٹ جس کا ریت ہیں فرش انجمن — وہ پاٹ جس کے گیت محبت پہ نغمہ زن
وہ جھاؤ "میل جول چھپانے کے واسطے

وہ نادرہ گئی جو کنارے پہ لوٹ کے — ریتی پہ دب چکی ہے جوانی سی چھوٹ کے
کافی ہے ولولوں میں بہانے کے واسطے

. . . .

جھربیریوں کی آڑ میں میلے کی حد سے دور — پہنچا ہوں اس امید میں آئے گی وہ ضرور

کھو جائے گی کہیں مجھے پانے کے واسطے

پلٹے گی جب کہے گی سبھوں سے کہ تھک گئی
میلے کی بھیڑ بھاڑ میں رستہ بہک گئی

چہرہ اداس بات بنانے کے واسطے

وہ طرزِ گفتگو کہ بہانہ نہ کھل سکے
مژگاں پہ وہ نمی کہ بناوٹ نہ دھل سکے

شبہوں کو سو یقین دلانے کے واسطے

. . . .

جالے لگے ہوئے ہیں ابھی آستین پہ
رفتار سست سست نگاہیں زمین پر

پہنچی وہ یا نہیں، یہ بتانے کے واسطے۔

ساقی، اگست ۱۹۴۱ء ———— تاآدعارفی

پہلے بند کی ردیف کا استعمال ہر بند میں آخر تک قائم ہے جس نے اگرچہ نظم میں ایک چوکھٹے کی سی باقاعدگی پیدا کر دی ہے۔ لیکن اس کی پابندی سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا ہر کسی کا کام نہیں۔ شاعر مفہوم کی ترجمانی میں یا تصویر کے بیان میں بے روک نہیں چلتا مبادا کہیں فن کی بات میں اصل سے تطابق نہ رہے۔ اسی لئے "چلتا ہوا ہجوم" —— طوفان بے پایاں نہیں ہے بلکہ "سیلابِ کم خروش" ہے۔

"اس پل نے جس پہ مل کے گذرتے ہیں راستے" دریا عبور کر کے بکھرتے ہیں راستے" ان مصرعوں کو دیکھئے نہ صرف ایک بے حد بکھرا ہوا منظر دو سطروں میں آ گیا ہے بلکہ راستوں میں بھی گویا جان پڑ گئی ہے۔ بیان کی یہ خوبی ایک اور بند میں ایک نئی صورت اختیار کر لیتی ہے جس کی جدت پڑھنے والے کے لبوں پر ایک تبسم پیدا کر سکتی ہے۔ "بتانِ حشر خرام" کا جو جھرمٹ شاعر کی نگاہوں میں آتا ہے اس میں عمر کا تنوع جلوہ گر ہے۔ دس بیس بچیاں ہیں لیکن شاعر کی نظر میں وہ بچیاں نہیں بلکہ "آنکھ مچولی کے رات دن" ہیں۔ چھ سات ایسی ہیں جو بچیاں تو نہیں لیکن الھڑ ہیں۔ انہیں احساس نوعی تو ہے لیکن ان کی آرزوئیں ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہو پائیں۔ یہ ابھی "چھپ کے ہاتھ نہ آنے کے سال و سن" سے گذر رہی ہیں، اور دو چار ایسی بھی ہیں جو "چھوئے جانے کے واسطے منتظر" ہیں —— انہی میں شاعر کی "شوخیٔ کلام" بھی ہے۔

منظر آغاز میں بڑی متانت کے ساتھ یوں کہئے کہ ایک نقطے سے شروع ہوتا ہے اور پھر یہ نقطہ پھیلتا پھیلتا "پل کے رستوں تک" ایک غیر معین تسلسل اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس غیر معین شکل میں ایک لمحہ صنم پرستانِ خوش خرام کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور اس مجمع کا جزو یا آخری بھی شاعر کی "شوخیٔ کلام" تک پہنچتے پہنچتے ایک چھوٹا سا دلکش نقطہ بنا دیتا ہے۔ اب یہاں سے یہ نقطہ پھیل کر متعدد خطوط کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کوئی خط جھول دیتے ہوئے ٹخنوں سے ہوتا ہوا چھپی ہوئی پنڈلیوں تک جا پہنچتا ہے، کوئی خط شوخیٔ کلام کے "قشقۂ ابہام بے خودی" کو جا چھوتا ہے، کوئی خط گھاٹ اور پھر "جھاؤ" کی خبر لاتا ہے، اور پھر یہ خطوط بھی گویا آپس میں الجھ جاتے ہیں، جب یہ الجھن مٹتی ہے تو پھر ایک نقطہ ہی ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ یہ نقطہ ایک فرد ہے جس کی رفتار سست ہے اور جس کی نگاہیں زمین کی طرف مرکوز اور اس کی یہ دونوں کیفیتیں ہی اس کے دل کی خوب خوب ترجمانی کر رہی ہیں۔

اسی آخری بند میں آستین پر لگے ہوئے جالے نہ صرف لمبے کی خوبی کے حامل ہیں بلکہ فن کے گہرے مشاہدے کے ساتھ ساتھ نظم کے ہیرو کی کامیابی کا اشارہ کرتے ہوئے ذہن کو خلوت کے دل پسند حالات کی طرف بھی مائل کر دیتے ہیں اور ذہن سوچنے لگتا ہے کہ ان جھاڑیوں میں جن کی ٹہنیاں لکڑی کے "تانے بانے" سنبھالے رہتی ہیں کیا ہوا ہوگا، کیا نہ ہوا ہوگا۔

فلم کا سین پھر بدلتا ہے۔ لیکن اس دفعہ تصویر محدود نہیں ہے۔ ایک ایک نقطے سے چل کر ایک ایسا خط بناتی ہے جو اگرچہ انجام تک نمایاں رہتا ہے مگر انجام کے بعد بھی نظم کی اشاعت اس خط کو ایک دھندلی سی لکیر بنا دیتی ہے۔

تعاقب

پردۂ سیمیں تھی سنما ہال کا نکھری سحر
ایکٹرس کی طرح غازہ مل کے نکلی تھی سحر

اک حسینہ بجلیوں کے آنکھ میں خرمن لئے
آ رہی تھی ساتھ اپنے مغربی فیشن لئے

یوں بھرے شانے تھے ریشم کے تلے ابھرے ہوئے
طشتری میں سیب جیسے صاف کر رکھے ہوئے

پنڈلیاں یوں غوطہ زن تھیں جال کے سیلاب میں
مچھلیوں کا رقص جیسے زندہ گرداب میں

گدگدے گھٹنے، تھرکتی ران تختی گول گول
نعمتِ نایاب دل کو رہے تھے مفت مول

دیکھتے ہی اس کو رقصاں خون رگوں میں جم گیا
مجھ کو شک گذرا جہاں پیما زمانہ تھم گیا

کھینچ کر اس کے تعاقب میں مجھے دل لے چلا
دہر سے بیگانہ، نظاروں سے غافل بے محابا

خواب سے چونکا تو میں تنہا اک اسٹیشن پہ تھا
ہر طرف سے آ رہی تھی چھپنے والوں کی صدا

تھال تھے سستی مٹھائی کے نخاس کبھی سو تر
گر رہی تھی مکھیوں کی فوج جن پر ٹوٹ کر

ریل کے محدود ڈبے اس طرح لبریز تھے
بند ہوں ڈربوں میں جیسے مرغیوں کے قافلے

وہ تپش تھی جسم پر چپکے ہوئے تھے پیرہن
بھیگی بھیگی ساریوں میں برق افشاں تھے بدن

ایک ڈبے میں تھا دیہاتی کے حقے کا دھواں
پاس وہ سکھ ناک پہ رکھے ہوئے تھے رومال

کوئلے سے چند بچوں کی تھیں آنکھیں لال لال گھورتے تھے کچھ پھلوں کو بہر ہی تھی منہ رال

اس کے جیسی اور بھی شمعیں تھیں لیکن وہ نہ تھی

اس کی ہم رنگ اور بھی شکلیں تھیں لیکن وہ نہ تھی

کیا خبر تھی یوں مجھے آوارہ سر کر جائے گی آنکھ کے رستے اُتر کر دل میں گھر کر جائے گی

آج تک اس کے تعاقب میں پریشاں ہے نظر آج تک میرے خیالوں میں ہے اس کی رہگذر

اتنی تسکین ہے وہ عشوہ گر جہاں بھی جائے گی

عالمگیر اگست ۱۹۴۱ء مڑ کے دیکھے گی تو مجھ کو اپنے پیچھے پائے گی،

نظم میں شاعر کا مرکزِ نظر کوئی مغربی عورت ہے جس کا اظہار پہلے ہی شعر میں پردہ "سیمیں" "سینا ہال" اور "ایکٹرس" کے ذریعے سے بالواسطہ طور پر ہو رہا ہے اور آگے چل کر ایک نہایت نفیس تشبیہ میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ "یوں بھرے شانے تھے ریشم کے تلے ابھرے ہوئے۔ طشتری میں سیب جیسے ڈھانپ کر رکھے ہوئے" تشبیہ کے لحاظ سے ایک اور شعر بھی خوب ہے۔ "ریل کے محدود ڈبے اس طرح لبریز تھے۔ بند ہوں ڈربوں میں جیسے مرغیوں کے قافلے" سستی مٹھائی کے تھال، اُن پر ٹوٹتی ہوئی مکھیوں کی فوج، پسینے سے چپکے ہوئے پیرہن، دیہاتی کے حقے کا دھواں، ناک پر انگلیاں رکھے ہوئے دو سکھ — یہ سب باتیں جہاں شاعر کے گہرے مشاہدے کی دلیل ہیں وہاں اس کے خیفت پرستانہ رجحان کی ترجمانی بھی کر رہے ہیں لیکن آخری شعر، خصوصاً اس شعر کا آخری مصرعہ شاعر کے ذہن پر زیرِ نظر مغربی عورت کے تاثر کی گہرائی اور شدت کے ساتھ تمام نظم کو ایک تخیلی رنگ بھی دے دیتا ہے۔ یہیں سے خیال آتا ہے کہ عنوان (تعاقب) — کیا اسی مفہوم کو، اس ذہنی تعاقب کو ظاہر کرتا ہے!

— شروع میں شاعر کہتا ہے "کھینچ کر اُس کے تعاقب میں مجھے دل لے چلا" — اور پھر "خواب سے چونکا تو میں تنہا اک اسٹیشن پر تھا" — اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شہر سے یا اسٹیشن کے قریب سے اُس عورت کا پیچھا کرتا ہوا اسٹیشن پر آ پہنچا ہے لیکن دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ ہے "آ رہی تھی ساتھ اپنے مغربی فیشن لئے" — اس میں "آ رہی" سے خیال گذرتا ہے کہ شاعر کہیں (ممکن ہے پلیٹ فارم پر) کھڑا ہے اور اچانک کسی مغربی حسینہ کو آتے دیکھتا ہے — بہر حال یہ تعاقب کہیں سے شروع ہوا ہو، آخر میں جا کر اس کو فن کار نے جو ایک گونج کی سی کیفیت دی ہے وہ بہت خوب ہے۔

نظم کا سین پھر بدلتا ہے۔ اب کی بار ایک تصویر نہیں بلکہ کئی تصویریں مل کر سامنے آتی ہیں جن کی باہمی آمیزش سے ایک پوری کہانی، پریم کہانی تیار

ہو جاتی ہے۔ یا دفن بخیر اس کہانی کے سنانے والا اردو کی جدید شاعری کا سب سے بڑا عشقیہ فن کار اختر شیرانی ہے۔

ننھا قاصد

ترا ننھا سا قاصد جو ترے خطلے کے آتا تھا، نہ تھا معلوم اُسے کس طرز کے پیغام لاتا تھا

سمجھ سکتا نہ تھا وہ خط میں کیسے راز پنہاں ہیں حروفِ سادہ میں کس حشر کے انداز پنہاں ہیں

اُسے کیا علم ان نیلے لفافوں میں چھپا کیا ہے کسی بیہوش کلاں کے بھیجنے سے مدعا کیا ہے

تو مجھ کو خیال آتا تھا اکثر اُس زمانے میں کہ اُس کی حیرتِ طفلی ہے کیوں گم ہاں میں فسانے میں

وہ باایں کمسنی کیا یہ نہ دل میں سوچتا ہو گا کہ باجی نے ہماری اپنے خط میں کیا لکھا ہو گا

اور آخر وہ اسی کو نامہ لکھ کر بھیجتی کیوں ہے کبھی بھیجا تو بھیجا لیکن اکثر بھیجتی کیوں ہے

وہ پہلے سے زیادہ بھائی کو کیوں پیار کرتی ہے لفافہ دے کے لطفِ خاص کا اظہار کرتی ہے

پھر ایسے اجنبی پر اُس کی باجی مہرباں کیوں ہیں اگر ہیں بھی تو گھر والوں سے یہ باتیں نہاں کیوں ہیں

اور اُس کے شبہ کی اس سے بھی تو تائید ہوتی ہے چھپا کر خط کو دے جانے کی کیوں تاکید ہوتی ہے!

یہ نو خیز اجنبی جانے کہاں سے اکثر آتا ہے جب آتا ہے تو باجی کی طرح خط لکھ کے لاتا ہے

عزیزوں کی طرح یہ کیوں مکاں میں آ نہیں سکتا جب اُس سے پوچھتا ہے وہ اسے سمجھا نہیں سکتا

کھلونے دے کے اس کو مسکرا دیتا ہے وہ اکثر اور اک ہلکا سا تھپڑ بھی لگا دیتا ہے وہ اکثر

ترے قاصد کے بیا افکار دل کو گدگداتے تھے اور اپنے بھولپن سے میرے جذبوں کو ہنساتے تھے

نہیں موقوف انہی ایام پر جب بھی خیال آیا تصور تیرے بعد اُس کا بھی نقشہ سامنے لایا

مگر آج اس طرح دیکھا ہے وہ نقشِ حسیں میں نے کہ رکھ دی خاکِ حیرت پر محبت کی جبیں میں نے

وہی ننھا سا قاصد نوجواں ہو کر ملا مجھ کو زمانے کے تغیر نے پریشاں کر دیا مجھ کو

جنونِ ابتدائے عشق نے کروٹ سی بدلی دل میں پس از مدت یہ لیلیٰ آ گئی پھر اپنے محمل میں

ترے قاصد سے ملتے وقت مجھ کو شرم آتی تھی مگر اس کی نگاہوں میں شرارت مسکراتی تھی

شرارت کا یہ نظارہ مری حیرت کا ساماں تھا کہ اس پردے کے اندر تیرا رازِ عشق عریاں تھا۔

شاہکار رحمان اور جولائی ۱۹۴۱ء اختر شیرانی

میرا اور مومن کے بعد اختر شیرانی ہی محبت کا ایک ایسا شاعر ہے جس

کی نگاہوں کا مرکز ہمیشہ ایک پردہ نشین نازنین ہوتی ہے، چنانچہ غزل کا ایک شعر ہے

آنکھوں نے ذرّے ذرّے پہ سجدے لٹائے ہیں
کیا جانے جا چھپی مری پردہ نشیں کہاں! (اختر شیرانی)

کیا یہ پنہاں حسن سے شاعر کی رغبت اصل موضوعِ شعر کو لوگوں سے چھپانے کی غیر شعوری نفسی کوشش ہے یا وہی فطری رجحان جس نے شاعر کو اردو شاعری کی روایتی غیر فطری باتوں سے برگشتہ کیا تھا۔ اس صورت میں نمودار ہوا ہے کہ وہ مرکزِ نظر کے انتخاب میں بھی اپنے ہی سماجی حلقے کے کسی فرد کی طرف رجوع کرتا ہے ۔۔۔ معلوم نہیں حقیقت کیا ہے، ذہن جو جی چاہے فیصلہ کرے۔ ہمیں اس وقت ننھے قاصد کی خوبیوں سے غرض ہے۔

نظم کا عرصہ ایک لمحہ ہے، وہ ایک لمحہ جس میں شاعر ایک ایسے نوجوان سے دو چار ہوتا ہے جو اپنے بچپن میں ایک داستانِ محبت کا غیر ارادی کردار تھا۔ اور اسی ایک لمحے کا ردِ عمل شاعر کے ذہن کو آنکھ جھپکتے میں "یادِ ایام کا افسانہ" سنا دیتا ہے۔ نظم کا یہ پیچ ایک مستزاد دلچسپی پیدا کر دیتا ہے کہ تحریک کا سبب آخر میں ہے لیکن کلام کا آغاز کسی اور ہی نقطے سے شروع ہوتا ہے۔

قصہ سیدھا سادا اسباد رہبیان میں بھی اختر شیرانی کی عام مزین زبان سے ہٹ کر ایک سادہ زبان نمایاں ہے۔ کیا یہ سادگی "ننھے قاصد" کی طفلانہ طبیعت کا عکس ہے یا فن کار اپنی ارتقائی منزلوں میں بڑھتے ہوئے اب عمر کی سنجیدہ سادگی کی طرف آتا جا رہا ہے، ۔۔۔ یہ نکتہ بھی سوچنے کے لائق ہے۔

نفسیات کے لحاظ سے دو باتیں اہم ہیں۔ ایک بچے کی ذہنیت اور دوسرے چھپ چھپا کر عشق کرنے والے نوجوان مرد اور عورت کے ذہنی عمل کا مطالعہ جو فن کار کے گہرے مشاہدے (یا تجربے؟) کی دلیل ہے۔

"وہ اسی کو نامہ لکھ کر بھیجتی کیوں ہے" اور "اکثر بھیجتی کیوں ہے"۔۔۔ "عزیزوں کی طرح یہ کیوں مکاں میں آ نہیں سکتا"۔۔۔ "گھر والوں سے یہ باتیں نہاں کیوں ہیں؟"۔۔۔ یہ سب باتیں بچے کی نفسیات کے عین مطابق ہیں۔ "وہ پہلے سے زیادہ بھائی کو کیوں پیار کرتی ہے، لفافہ دے کے لطفِ خاص کا اظہار کرتی ہے" ۔۔۔ "چھپا کر خط کو لے جانے کی کیوں تاکید ہوتی ہے"۔۔۔ محبت میں ایک دوشیزہ کی بے ساختہ پرکاری کا اظہار ان ٹکڑوں سے ہو رہا ہے ۔۔۔ نوجوان کے کردار پر صرف دو ہی باتیں کافی روشنی ڈال رہی ہیں "کھلونے دے کے مسکرا دیتا ہے" اور دلگی میں پیار سے "ہلکا سا تھپڑ بھی لگا دیتا ہے"۔

نفسیاتی لحاظ سے ایک اور بات بھی بہت قابلِ تعریف ہے۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ "ننھے قاصد" اور عاشق نوجوان کی ذہنی نشو و نما کا لحاظ بھی فن کار نے رکھا ہے۔ اصل قصے کے کئی سال بعد جب ہیرو اور "قاصد" کا آمنا سامنا ہوتا ہے تو عاشق کو "شرم آتی ہے" شاید اسے یہ خیال آتا ہے کہ اگر اب اسے وہ باتیں یاد ہوں گی تو یہ دل میں ان جوانی کی حماقتوں کے متعلق نہ جانے کیا رائے زنی کرتا ہوگا ۔۔۔ اور ننھے قاصد کی "نگاہوں میں شرارت" ہے ۔۔۔ شاید اسے وہ باتیں یاد آ گئی ہیں اور وہ دل ہی دل میں اس یاد سے مزے لے رہا ہے، شاید یہ "شرارت" اس کی طبعی شوخی پر مبنی ہے اور اسے بچپن کی وہ باتیں زندگی کے دوسرے جھمیلوں میں یاد نہیں رہیں۔ وہ انہیں بھول چکا ہے ۔۔۔ لیکن ہم اس نظم کو نہیں بھول سکتے۔ اس کی شگفتگی ہر لحظہ تازہ رہنے والی ہے۔ اور اگرچہ اس میں قانون اور مذہب کے لحاظ سے شاید بعض اصولوں کی خلاف ورزی کا بیان ہو لیکن یہ بے راہی بھی بہت پیاری ہے، اس میں ایک معصومیت ہے۔

ننھا قاصد بدل گیا، اس کی پردہ نشین باجی نہ جانے کن پردوں میں کھو گئی خط لکھ کر لانے والا نوجوان بدل گیا، ۔۔۔ ہم بھی کب تک ایک نقطے پر بیٹھے رہیں۔ "ننھے قاصد" اور اختر شیرانی کے تاثر کو دل میں لئے ہوئے ہم بھی پہلو بدلتے ہیں۔ اور ہمارے شعری فلم کا سین بھی بدلتا ہے۔

اس دفعہ قیوم نظر ہمیں ایک انوکھا منظر دکھاتا ہے، حقیقتاً یہ منظر انوکھا نہیں، انسانی زندگی کی تاریخ میں "ہمت بلند تھی مگر افتاد دیکھنا" یا "غمِ آرزو" جس کا سبب "میرے شوق کی بلندی" اور "مری ہمتوں کی پستی" ہوا کرتا ہے کوئی آج ہی کی بات نہیں ہے۔

معلوم نہیں شاعر اس بازار میں کیونکر پہنچا ہے۔ تحریکِ شعری بظاہر یوں ہوتی ہے کہ شاعر اپنے کسی دوست کو ایک ایسی جگہ دیکھ پاتا ہے جہاں اسے امید نہ تھی کہ اس کے ایسے کردار کا انسان پہنچ سکتا ہے۔ لیکن کیا یہ شاعر کا دوست ہے جس نے "بے حسی کی بیڑیاں پہنی ہیں" یا "خود شاعر اپنی ہی بات کہہ رہا ہے۔ تیسرے بند کے آخری مصرعے میں "غمِ دوست" کے کیا معنی ہیں، کیا یہ "دوست" شاعر کی محبوبہ ہے یا وہ مرد دوست جس کے زوال سے وہ متاثر ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں یہ دوست شاعر کا مرد دوست ہے محبوبہ نہیں۔ کیونکہ اسی بند کے پہلے دو مصرعوں سے (آسماں کی حسین بلندی سے، اڑ کے آیا کثیف خاک پہ کون) جس انداز کا غم ظاہر ہے وہ مرکزِ تاثر کے خارجی ہونے پر دلالت کرتا ہے ۔۔۔ یہ الجھن اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ نظم کے شروع سے آخر تک شاعر کا مخاطب ایک شخص نہیں ہے۔ بعض باتیں وہ اپنے آپ

سے کہتا ہے، بعض اپنے دوست سے، بعض غیر مرئی چیزوں سے اور بعض کسی سے بھی نہیں، — چنانچہ چوتھے بند میں "ترے تخیل نے" — کس کے تخیل نے؟ — آخر میں — "تری تہذیب" — کس کی تہذیب! — یہ تخاطب کی تبدیلیاں اور ابہام اس واضح نظم کو بھی مشکل بنا دیتے ہیں — ایک بات واضح ہے شروع سے آخر تک شاعر کے ذہن پر ایک سنگین تلخی طاری و ساری ہے۔ اور اس کا اظہار پہلے ہی مصرعے سے ہو جاتا ہے۔ "چند چاندی کے سرد سکوں میں" — اس مصرعے میں "چند" اور "سرد" کا صوتی تناؤ "سکوں" کی تشدید، اور "چ" اور "س" کی دہری موجودگی، یہ سب باتیں اس تلخی اور تندی کو ظاہر کر رہی ہیں جو شاعر کے ذہن میں موجود ہے۔

اور اب آپ بھی بسر کیجیے ......

اُس بازار میں ایک شام

چند چاندی کے سرد سکوں میں گرمیٔ حسن بک رہی ہے یہاں
اے غمِ عشق دیکھ بھول نہیں

نغمۂ تُرد کا بنات سرور کاسۂ زر میں ڈھالتی ہے شام
اور کیا اس میں دلکشی ہے، نہ پوچھ

آسماں کی حسین بلندی سے اڑ کے آیا کثیف خاک پہ کون
اے غمِ دوست دیکھ بھول نہیں

پھینک کر پر ترے تخیل نے بیڑیاں بے حسی کی پہنی ہیں
اور کیا شے قبول کی ہے نہ پوچھ

معصیت کی یہ زہد پاش بہار بن رہی ہے نشاطِ دیدہ و گوش
اے غمِ زیست دیکھ بھول نہیں

تیری تہذیب کے سیاہ نقوش انتہائے کمال کا ہیں مآل
اور کیا ذوقِ زندگی ہے، نہ پوچھ

"اَدبِ لطیف" لاہور — قیوم نظر

ہیئت کے لحاظ سے بھی اس نظم پر غور کرنا چاہیے۔ اب تک جہاں کہیں میں نے بند کا ذکر کیا ہے تو تین مصرعوں کا ایک بند سمجھتے ہوئے مثلث کا مفہوم قائم رکھا ہے لیکن اس نظم کے بند حقیقت میں مثلث کے بند نہیں ہیں۔ اگر "اور کیا اس میں دلکشی ہے نہ پوچھ — اور کیا شے قبول کی ہے نہ پوچھ" — "اور کیا ذوقِ زندگی ہے نہ پوچھ" — ان تین مصرعوں کے ردیف اور قافیے کو بھلا دیا جائے تو یہ ایک ایسی نظم معرا بن جائے گی جو محض مثلث کے طور پر لکھنے کی وجہ سے مثلث کی ہیئت کا اظہار کر رہی ہو لیکن مذکورہ بالا مصرعوں کی بنا پر اس کے تین بند بن جاتے ہیں — "بھول نہیں" والے مصرعے اگرچہ قافیہ نہیں رکھتے پھر بھی ہیئت کی باقاعدگی میں معاون ضرور ہیں۔ اس کے علاوہ جن مصرعوں کے آخر میں ردیف قافیہ کچھ بھی موجود نہیں ان کے بھی آخری الفاظ ایک غیر شعوری احساسِ قوافی ضرور دلاتے ہیں اور اس سے بھی موسیقی میں مدد ملتی ہے۔ مثلاً یہاں، سرور، شام، خاک پہ کون، پہنی ہیں، گوش، نقوش، مآل — یہ سب الفاظ ایسے ہیں جن کے بہت سے قافیے ہماری زبان میں موجود ہیں اور ہمارے ذہنوں میں ان کا اثر ان الفاظ کو دیکھ کر (یا سن کر) اُن غیر موجود قوافی کا ایک دبا ہوا احساس ہو سکتا ہے یعنی یہ توقع ہوتی ہے کہ یہ قافیہ آگے آئے گا لیکن جب وہ قافیہ آگے چل کر نہیں آتا تو احساسِ قوافی کو ناامیدی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ذہن اگلے مصرعے کے مفہوم کی طرف زیادہ تندہی سے راغب ہو جاتا ہے۔

میراجی

رباعی

دیکھی جو تری مست نگاہی ساقی
کیا کیا نہ طبیعت مری چاہی ساقی
پینا ہی گیا بادۂ صافی کے بعد
جلتی ہی رہی دل کی سیاہی ساقی!

سعید احمد اعجاز

نقد و نظر

آبگینے

از

اختر انصاری

پیٹ پوجا کا خیال ذہنِ انسانی کا سب سے پہلا خیال ہے، دوسرا خیال جنسی تسکین کا ہے۔ اور زندگی کے باقی سب معاملات ان دونوں باتوں کے بعد کا قضیہ ہیں۔ چنانچہ ادب میں کہ آغازِ عالم سے زندگی کا ترجمان چلا آیا ہے سب سے پہلے ابتدائی انسان نے محبت ہی کی شاعری کو موضوعِ سخن بنایا کہا جا سکتا ہے کہ ادب و شعر کی ابتدائی صورت مذہبی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن ہمیں نہیں بھولنا چاہئے کہ مذہب کی ابتدائی صورت بھی جنسی حیثیت رکھتی ہے۔

اگر ہم محض محبت کے نغمہ خواں تلاش کرنے لگیں تو پہلا نمایاں نام یونان کی شاعرہ سیفو کا نظر آئے گا۔ اور اس کے بعد اگرچہ ہر ملک و قوم میں کوئی نہ کوئی مجنوں صفت اس بنیادی جذبۂ انسانی کے تانے بانے میں الجھا ہوا دکھائی دے گا لیکن ظاہر ہے کہ وہ والہانہ خود رفتگی جو خالص عشقیہ شاعری کی اولین خصوصیت ہے — وہ عالمِ جذب ہر ملک یا قوم کے افراد کے بس کی بات نہیں۔ محبت ایک ایسا جذبہ ہے کہ فرصت اور فراغت کا طالب۔ ابتدائی تاریخ انسانی کشمکشِ حیات کی گوناگوں کیفیتوں سے بھری پڑی ہے۔ فراغت اور فرصت شہر، شہری اور شہریت کے بعد کی چیز ہے۔ چنانچہ قدیم تاریخ میں سب سے پہلے ہمیں یونان کے فارغ البال زمانے میں سیفو نظر آتی ہے۔ اتنی دور سمندر پار جانے کی کیا ضرورت ہے، اپنے ہندوستان ہی کو لیجئے، قدیم سنسکرت ادب عشقیہ شاعری کے لحاظ سے جس کیف و لذت کا علمبردار ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اور قدیم ہندوستان کے سنسکرت شاعر امارو کی عشقیہ شاعری تو ایک دنیا سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ یہیں سے ایک دلچسپ بات یاد آتی ہے کہ روایت ہے وہ روح جو امارو کے جسم میں تھی اپنے پہلے سو جنموں میں عورت کے جسم میں ظاہر ہوئی تھی۔ اس روایت کی تخلیق کا باعث وہ بلند اہلیت تھی جس پر امارو محبت کے مختلف پہلوؤں کے اظہار میں قادر تھا۔ ہم میر تقی کے بارے میں کہ اب تک اردو میں محبت کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اس کی الم پسندی اور سوز و گداز جو اس کے کلام میں اثر کا باعث بنتا ہے ایک اور ہی سرچشمے کا ممنون تھا نیز اردو میں غزل کی بعض روایات نے دیر تک اکثر شعرا کو اُن کی متنوع ذہانت کے باوجود محبت کے موضوع تک ہی محدود رہنے پر مجبور رکھا۔ ہاں، غزل کی ترقی اور نظم کی آمد کے بعد بعض فن کاروں کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ یا تو محبت کے موضوع کو ہی ترک کر دیں کہ اب زمانہ بعض نئی باتوں کا مطالبہ کر رہا ہے۔ یا نئی ہیئت نیا اندازِ بیان اور نیا زاویۂ نگاہ تلاش کریں: تاکہ اس ازلی اور ابدی "دماغ کے خلل" میں زمانے کے مطابق لوگوں کو کوئی دلچسپی محسوس ہو سکے۔ اور میرا خیال ہے کہ جس طرح قدیم سنسکرت ادب میں امارو کی شاعری نے پہلی بار اس حقیقت کو منوایا کہ صرف محبت ہی کو شاعری کا بنیادی موضوع بنا کر گوناگوں نغمے چھیڑے جا سکتے ہیں، اُس طرح اردو کی موجودہ شاعری میں اختر انصاری نے اپنے شعری عمل سے اس نظریے کی تائید کی ہے۔

اختر انصاری کا پہلا مجموعہ کلام "نغمۂ روح" تھا جس میں ابھی اُسے غزل اور اُس کے دوسرے اثرات سے قطعی طور پر رہائی نہیں حاصل ہو چکی تھی۔ "آبگینے" اُس کا دوسرا مجموعہ ہے جو تمام تر قطعات پر مشتمل ہے۔ یہ سب قطعات ایک ہی تحریکِ شعری سے پیدا ہوئے ہیں، محبت سے، لیکن جو مختلف پہلو اس ایک تان میں فن کار نے پیدا کئے ہیں اُن پر ایک سرسری نظر ڈالنا ہی آج کی صحبت کا مقصد ہے۔

اپنے ایک مضمون میں میں نے امارو کے متعلق لکھتے ہوئے کہا تھا کہ ایک بند کی محدود وسعت میں محبت کے کسی احساس کو مکمل طور پر بیان کرنا ایسی شاعری کا مقصود ہے لیکن احساسات کی ایسی نقاشی کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ اس میں چند مختصر لفظوں اور نپے تلے فقروں میں ایک

احساس کی شدت اور ایک جذبے کے تاثر کی ترجمانی کرنا ہوتی ہے۔
لیکن آج کل کی شاعری میں جو تجزیاتی عنصر ہے وہ اس میں موجود نہیں ہوتا
—— اختر انصاری کے قطعات پر بھی یہ بات کافی سے زیادہ حد تک صحیح
اُترتی ہے لیکن ان قطعات کی روحِ رواں پر غور کرنے اور اس سے لطف
اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس مجموعے کے کردار دل
کا پھیلتا سا مطالعہ کر لیا جائے۔ بظاہر یہ فقرہ آپ کے ذہن میں اس کتاب
کے تصور کو انسانوی رنگ دے سکتا ہے۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو اس
کتاب میں اس کی افسانے یا مثنوی سے مختلف صورت کے باوجود
ایک کہانی ہے، ایک داستانِ محبت جس کا ہیرو ایک غیر معمولی حساس
اور نفاست پسند شاعر ہے، لیکن وہ محض ایک جذباتی انسان ہی نہیں،
ایک فن کار بھی ہے۔ اس کی فن کاری کا ثبوت تو ہم آگے چل کر تلاش کریں گے۔
سب سے پہلے اس پریم کہانی کے ہیرو کے خصائص طبعی کو جان لینا
چاہیئے۔ ہیرو ایک جوان ہے، جوانی ہی اُس کے لئے اس نغمہ خوانی کا سبب
بن رہی ہے۔ پکارتا ہے "یہ مری دکھ بھری جوانی کی" اس نوجوان کا ذہنی ماحول
بالواسطہ یوں ظاہر ہوتا ہے "ہوا تھی ٹھنڈی ٹھنڈی، چاندنی تھی اور دریا تھا"
—— اس تصویر میں اگر ہم گاہے گاہے پھواروں کی سازِ زندگی کو بھی شامل
کر لیں تو وہ تمام بنیادی اسباب ظاہر ہو جاتے ہیں جن سے ہیرو متاثر
ہوتا ہے۔ اُس کے دل کی الم پسندی اس کے ہر ہر لفظ پر چھائی ہوئی ہے بلکہ
اُسے ایک طرح سے اذیت میں ہی دلکشی محسوس ہوتی ہے۔

بہارِ غم

عنوان ہی کو دیکھیئے۔ آگے سے

اُجڑی دنیا کو بسایا ہے ذرا دیکھو تو
غم کی محفل کو سجایا ہے ذرا دیکھو تو
چشم گریاں، دل پُر خون، جگر زخم آلود
میں نے اک باغ لگایا ہے ذرا دیکھو تو

گویا ایک طرح سے اس ہیرو کی اذیت پرستی اردو کے قدیم شعراء کی
اذیت پرستی سے مماثل ہے فرق صرف اس کی انفرادیت اور اندازِ بیان کا ہے
ہاں ایک بات کا خیال رہنا چاہیئے، اس کے الم میں صرف اُس کی داخلی کیفیات
ہی محرک نہیں ہیں: خارجی باتیں بھی اس کو جلا دیتی ہیں۔

۱۔ رقص

تہ و بالا ہے زندگی کا نظام — وجد کرتی ہے کائنات تمام

پاؤں کی لرزشیں یہ کہتی ہیں — دیکھنے والے اپنے آپ کو تھام

۲۔ رقاصہ

کر دیا حافظے میں حشر بپا — اور ماضی میں زندگی بھر دی
انگلیوں کو فضا میں لہرا کر — تو نے اک داستاں رقم کر دی

اور اس سے بھی زیادہ واضح الم پسندی دیکھئے۔

۳۔ رقص

یہ ساغرِ غم کی گردش ہے، صہبائے طرب کا دور نہیں یہ
کیا خوب نیا انداز ہے یہ، کیا خوب نرالا طور ہے یہ
فریاد بھی ہے یہ نغمہ بھی، یہ شعر بھی ہے افسانہ بھی
یہ رقص نہیں، یہ رقص نہیں، کچھ اور ہے یہ کچھ اور ہے یہ

نغمے کا بھی یہی حال ہے۔ گیت بھی مسرت کی بجائے دکھ درد ہی
کو تحریک دیتا ہے۔

دور سے گانے والی

تجھ کو کیا معلوم بھیگی رات میں — ہلکے ہلکے سرد جھونکوں کی لپک
تیری شعلہ آفریں آواز سے — مل کے بن جاتی ہے کیندے کی کپک

اور یہ بات کچھ انہی دو فنونِ لطیفہ پر مرکوز نہیں، فن تعمیر بھی بجائے
اپنے نفسی حسن کے اپنے روایتی حُسن سے اُسے غمناک بناتا ہے۔

تاج

(چاندنی رات میں)

چاندنی رات کا سماں، تاج کا منظرِ جمیل
چھائی ہوئی ہیں مستیاں کیفیتوں کا دور ہے
قلزمِ نور چاندنی، کشتیِ نور تاج گنج
نور میں نور مل گیا، تاج نہیں کچھ اور ہے

یہ کچھ اندھیرا سا کیا ہے؛ وہی غم کا اُجالا، وہی درد و اذیت کو تحریک
دینے والی چاندنی جس میں اب ایک الم ناک حکایۂ محبت کی بھی ہلکی سی آمیزش
ہے۔ چاندنی اور اس کے تاثرات اس نوجوان کے ذہنی ماحول میں ایک
خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

چاندنی رات

فضا ہے نور کی بارش سے سیم گوں اس وقت
جہانِ مست پہ طاری ہے اک سکوں اس وقت

نہ چھیڑ درد جدائی کی داستاں اے دل!
تجھے خبر نہیں ہیں کس کے پاس ہوں اس وقت

لیکن یہ نور کسی اور ہی نور کا عکس معلوم ہوتا ہے جسے شاعر اپنی گرفت میں لانے سے قاصر ہے۔ اس بے بسی کا اظہار ایک اور ہی پردے میں کرتا ہے

چاندنی

اس روپہلی شراب نور ہی سے — کاش میں جام شعر بھر سکتا
اے شب مہ کے نشتر جلوہ! — کاش میں تم کو نظم کر سکتا

اور ذیل کے قطعے میں تو وہ چاندنی کے تاثر کے سلسلے میں اپنی کمزوری کا مکمل اور واضح اظہار کر دیتا ہے۔

چاندنی راتیں

ہمیشہ جاگتے ہی جاگتے سحر کر دی
کبھی ہنسا کبھی آہیں بھریں کبھی رویا
بنا کے چاند کو اپنا گواہ کہتا ہوں
میں آج تک شب مہتاب میں نہیں سویا

لیکن مناظر فطرت سے یوں متاثر ہونا کچھ چاندنی پر ہی موقوف نہیں۔ ہر منظر فطرت اس کو متاثر کرتا ہے۔ پورب پچھم اتر دکن کی کوئی قید نہیں۔ چنانچہ یہ دو قطعے دیکھئے

ہندوستان کی راتیں

کس قدر آن بان کی راتیں — اک جداگانہ شان کی راتیں
تیرہ و تار اور پُر اسرار — آہ! ہندوستان کی راتیں

اور

ایک یاد

بیٹھے رہنا وہ آگ سلگائے — سلسلہ دیر تک وہ باتوں کا
دل محزوں کو یاد ہے اب تک — سوز لندن کی سرد راتوں کا

پہلے قطعے میں "تیرہ و تار اور پُر اسرار" اور دوسرے قطعے میں صرف لفظ "سوز" اپنی بلاغت کے لئے لائق ستائش ہے۔ شاید مناظر فطرت سے یہ بے حد متاثر ہونا ہی ہے جس کی وجہ سے اس کی تشبیہات میں بھی بعض احساسات مناظر فطرت کی لغت میں ڈھل جاتے ہیں۔

میرا رونا غم جدائی میں
بھری برسات جیسے جنگل کی

سرشاری محبت

اس طرح قلب میں پنہاں ہے تصور تیرا
جس طرح چاند گھٹاؤں میں چھپا ہوتا ہے
سینہ معمور ہے یوں تیری حسیں یادوں سے
آسماں جیسے ستاروں سے بھرا ہوتا ہے

اس سے بھی واضح ایک اور مقام دیکھئے:۔

دھوپ اور مینہہ

ہلکی ہلکی پھوار کے دوران میں — دفعتہً سورج جو بے پردہ ہوا
میں نے یہ جانا کہ وحشت میں کوئی — روتے روتے کھلکھلا کر ہنس پڑا

لیکن تاثرات کا یہ سب جھمیلا کیوں ہے؟ وہ کون مرکز نظر ہے جس کے حسن کی یاد نے اس نوجوان کو "شب بہار میں رونے کی عادت" پہ اُمل کیا ہے۔ تمام قطعات میں تین جگہ ہمیں اس سلسلے میں کچھ اشارات ملتے ہیں۔

۱۔ تاثر اولیں

کسی خیال میں مدہوش جا رہا تھا میں
اندھیری رات تھی، تاریکیوں کی بارش تھی
نکل گئی کوئی دوشیزہ دل کو چھوتی ہوئی
یہ میرے ساز جوانی کی پہلی لرزش تھی

۲۔ ایک شام

جا رہا تھا میں سر جھکائے ہوئے
گذری اک ماہرو برابر سے
بھر کے اپنی نظر میں کچھ کرنیں
اُس نے سینے میں ڈال دیں میرے

۳۔ عالم نشاط

ایک کافر ادا کو دیکھا ہے — پُر شکن زلف پُر فسوں آنکھیں
آج پھر لطف آ رہا ہے مجھے — داغ کے شعر گنگنانے میں

ان قطعات کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ پہلے دو قطعوں میں تو ایک ہی مرکز نظر دو مختلف موقعوں پر موجود ہے۔ لیکن تیسرے قطعے کی عورت کوئی "ادا" بھی ہو سکتی ہے۔ داغ کے اشعار میں میر تقی کی طرح کسی گہرے جذبۂ محبت کا اظہار نہیں ہے اس لئے وہ عورت جسے دیکھ کر داغ کے شعر ذہن میں آ جائیں۔ ہمارے ہیرو کے گہرے احساس سے متعلق نہیں ہو سکتی۔

ہاں، ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا ہیرو کو کبھی اپنی محبوبہ سے ملنا میّسر بھی ہُوا یا وہ عورت اُس کی زندگی میں ایک چھچھلتی ہوئی، سرسراتی ہوئی لیکن ایک گہری کیفیت ہی بنی رہی۔ اس سلسلے میں بھی بعض قطعے ہماری رہنمائی کر رہے ہیں۔ پہلے تو ایک نجی قسم کا منظر ہی کسی خلوت کی چغلی کھا رہا ہے۔

خواب ناز

ایک تصویر کھینچ دی گویا — کیفِ صہبائے ارغوانی کی
کیوں نہ مستی چھلک اٹھے رخ سے — نیند اور نیند بھی جوانی کی

لیکن ممکن ہے کہ یہ حصولِ لذّت الفاظی ہو اور صرف آنکھ کی حد تک ہی پہنچ کر رہ گیا ہو۔

ملاقات

یہ ملاقات لوٹ لیتی ہے — عشق کی گھات لُوٹ لیتی ہے
کر لو اختر گواہ تاروں کو — آج کی رات لُوٹ لیتی ہے

لیکن ابھی پریم کی برکھا کے آثار نظر نہیں آتے۔ ذرا ٹھہریئے۔

لمحۂ زرّیں

وہ اس وقت یہ کہہ رہی ہے کہ "اختر!
تجھے اپنے دل کے سوا اور کیا دوں؟"
اگر وقت پر حکمرانی ہو میری
تو اِس لمحے کو میں ابد تک بڑھا دوں

لیکن یہ بھی تمہید تکمیل تمنا ہی ہے۔ یعنی "بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے"—— ذیل کا قطعہ "پہنچ" کی حد کی طرف کچھ اشارے کر رہا ہے۔

محبت کی راتیں

گوشۂ باغ کی ملاقاتیں — اور رازونیاز کی باتیں
اے دل! ارماں رہ نہ جائے کوئی — پھر نہ ہوں گی نصیب یہ راتیں

آخری مصرعے میں آئندہ کی محرومی کے بارے میں جو پیشگوئی شامل ہے۔ اس سے کہ ذہن مانی افسانہ طرازی کی جا سکتی ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہمارا ہیرو اپنے عشق میں اول تو کامیاب نہیں۔ اگر کبھی کامرانی تک اس کا قدم پہنچا بھی تو وہ ایک دو دن کی بات تھی یا ہیرو کی چاندنی سے والہانہ رغبت کی بنا پر یوں کہئے کہ وہ "بجوگ" "چار دن کی چاندنی" تھی البتہ اس محرومی کے اسباب پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ پہلی وجہ تو شاعر کی طبعی الم پرستی ہے۔ کیونکہ انگریزی کی مثل کے مطابق کوئی غمزدہ دل کسی حسینہ کو نہیں جیت سکتا؛ دوسری وجہ اُس کے کردار کی وہ نسائیت بھی ہے جس کا لغوی اظہار ذیل کے اشعار میں موجود ہے۔

۱- خدا کی مار سلگتی ہوئی جوانی پر
۲- دیگر، لوٹ لی یہ فراغت کی دنیا
محبت نے، اس پہ خدا کی پڑے مار
۳- خدا رکھے جواں ہے آرزو میری ابھی اختر
۴- جل رہا ہوں تمہاری جان سے دُور

اوپر کی چار مثالوں کی طرح اکثر جگہ نسائی محاورات یا کم سے کم نسائی اندازِ بیان موجود ہے۔ اب خواہ ہیرو کے جذبۂ محبت کی نفسی نزاکت کو اس کی تاویل میں پیش کیا جائے خواہ اُس طبعی نسائیت پر محمول کیا جائے جو اکثر نوجوانوں کو محبت میں کامیاب نہیں ہونے دیتی۔ خیر اس پہلو کی اس سے زیادہ جراحی مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ اس لئے اب محبت کے متعلق ہیرو کے اندازِ نظر سے واقف ہُوا جائے۔

۱- محسوس کر رہا ہوں میں جینے کی تلخیاں
شاید مجھے کسی سے محبت نہیں رہی

گویا محبت زندگی کے مصائب کا احساس مٹا دیتی ہے۔

۲- وداعِ شباب

جوانی اور جوانی کی اُمنگیں — ہُوا وہ سارا کاروبار اب ختم
محبت ختم، ختم ارمان و حسرت — اذیت ختم، راحت ختم، سب ختم

گویا محبت ایک میٹھا درد ہے۔ یا عظمت اللہ کے الفاظ میں "ایک خلش سی، ایک چبھن سی جس میں مزا بھی آتا ہے"—— راحت اور مسرّت کا یہی تعلق گذشتہ پچیس سال میں جنسی نفسیات کے ماہرین کا خاص موضوعِ بحث رہا ہے، لیکن اوپر کا اندازِ نظر کسی حد تک جذباتی ہے۔ ذیل کا خیال مادّیت کی طرف مائل ہے،

۳- جسے میں محبت سمجھتا رہا
شباب اور فرصت کی سازش تھی وہ

اور اب محبت کے متعلق ایک شاعرانہ بات بھی سُن لیجئے۔

۴- محبت

محبت ہے اک خوشنما شوخ کانٹا
جو چبھتا ہے آنکھوں کے پردوں میں پہلے

وہ پھر بیٹھ جاتا ہے دل کی رگوں میں
خلش اول اور بعد میں درد بن کے

ذیل کے قطعے میں بھی ایک ذاتی رنج کے علاوہ محبت کو تقاضائے شباب کہا گیا ہے۔

شباب رفتہ

میں پھر آنکھوں سے جوئے خوں بہالوں
میں کرلوں دل کو پھر حسرت سے پامال
مگر اختر کہاں سے لاؤں اب میں
وہ اپنی عمر کا بائیسواں سال۔

لیکن یہ بائیسواں سال انگریزی زبان کے "ٹوائینڈ ٹونینٹی" کا عکس ہے۔ ہماری روایات تو "برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن" کہتی ہیں۔

ہاں جو المناک تاریکی شروع سے آخر تک ان قطعات پر چھائی ہوئی ہے اس میں ایک مریضانہ کیفیت ہے۔ اگر جگہ جگہ چاندنی کے تصورات نہ ہوتے تو یہ داستان کا باب اور وسیع ہوجاتا۔ عموماً شاعر کا لہجہ مایوسی کا ہے مثلاً

بیزاری

بہت سہہ چکا ہیں یہ مہلک اذیت   یہ زہر ہلاہل بہت پی چکا ہیں
بس اب موت دے دے مجھے میرے معبود   بہت جی چکا ہیں بہت جی چکا ہیں

لیکن یہ برگشتہ دلی قدیم واسوخت کی ایسی نہیں ہے، اس کی کیفیت یکسر مریضانہ تھی۔ اس میں ایک فطری جز ایسا ہے جو اس کے ناگوار اجزا کے تاثر کو کسی حد تک کم کردیتا ہے۔ اور یہیں سے خیال آتا ہے کہ جدید نفسیات کے لحاظ سے بھی ان شعری ٹکڑوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً بعض جگہ دبی ہوئی خواہش جنسی عجیب لغوی جامہ پہن کر ظاہر ہوتی ہے۔

نیند میں ہیں اہل دنیا اور میں
شب کی معشوقہ سے ہم آغوش ہوں

بعض جگہ خواب بیداری ہی تسکین کا باعث بنتا ہے۔ لیکن یہ نیند کا خواب بھی ہوسکتا ہے۔

ایک خواب

حسن کو بے حجاب دیکھا ہے   عشق کو کامیاب دیکھا ہے
اس کے زانو پہ میرا سر ہے اُف   کیسا جانسوز خواب دیکھا ہے

یہاں ایک اور نکتہ بھی یاد رکھنا چاہئے۔ اس بند میں خواب کے قطعے کی نوعیت اپنے مرکز نظر کے سلسلے میں ہیرو کی فطری اور جسمانی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔ یہ بات بھی اس کے تمام رونے پیٹنے کو ہماری نگاہوں میں واجب قرار دے دیتی ہے۔ اور اس کی خلوت پرستی، الم پسندی، اور اس کے انتشار نفس کا باعث صحیح ذریعہ تسکین کی عدم موجودگی ٹھہرتی ہے، اور یہ صورت ہمیں صحت مندانہ معلوم ہوتی ہے۔

بعض جگہ جدید نفسیات کے لحاظ سے دبی ہوئی نوعی خواہشات کے متعلق واضح اشارے ملتے ہیں۔

۱۔ کیوں اُڑا جاتا ہوں سوئے آسماں
کیا کوئی ٹوٹا ہوا تارا ہوں میں

۲۔ نہیں میں رہنے والا اس زمیں کا
مرا مسکن ہے اختر بادلوں میں

بلکہ شعر و شاعری سے بھی اسے اسی قسم کا لطف محسوس ہوتا ہے۔

ٹیگور کی شاعری

جب دھیمے سروں میں گاتا ہوں ٹیگور کی شیریں نظم کوئی
اس وقت مجھے محسوس یہ ہوتا ہے کہ تخیل کیفیتیں
تخیل فضاؤں میں ہو کے چھائی ہیں جہان بستان پہ
بستاں میں پڑا ہے اک جھولا اور جھول رہا ہوں میں اس میں

ظاہر ہے کہ ماہرین نفسیات کی نظر میں پرواز اور جھولے کا ذکر کیا معنی رکھتا ہے۔

یہ تو تھیں "روحانی" لحاظ سے ان قطعات کے متعلق چند باتیں۔ اب فنی لحاظ سے بھی ایک نظر دیکھ لیا جائے۔

جہاں میر تقی کا سوز و گداز ان اشعار میں اکثر دکھائی دیتا ہے وہاں اس کی طرح تخلص کا استعمال بھی دلچسپ ہوتا ہے۔

۱۔ میں اختر نہیں ہوں میں اختر نہیں ہوں
اور ۲۔ دوستو اہم کو اب اختر نہ کہو

مفہوم کا دھندلکا بعض دفعہ اس غیر مادی قسم کی فضا کو اور بھی لطف بنادیتا ہے جس کی ترجمانی شاعر مستقل طور پر کر رہا ہے۔

رقاصہ

کردیا حافظے میں حشر بپا   اور ماضی میں زندگی بھردی
انگلیوں کو فضا میں لہرا کر   تو نے اک داستاں رقم کردی

یہ گویا ساز کے تار کی ایک ایسی لرزش ہے جس کی بلیغ گونج سے ہم من مانی باتیں سوچ سکتے ہیں۔

مہتاب

آسماں کے ہاتھ میں ہے اک ستار
پڑ رہی ہے مست نغموں کی پھوار
آہ! ان نغمات سے ہے مرتعش
سازِ دل کا کوئی نامعلوم تار

یہاں بھی وہی دھندلکا قائم ہے۔ لرزتا ہوا، ذہن کو اپنی لطیف موجوں پہ کہیں دور ـــــ لے جاتا ہوا!

اندازِ بیان کی خوبیاں بھی اکثر ہمیں دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً ذیل کے قطعے میں مذکورہ بالا دھندلکا ایک واضح اشاریت کی صورت اختیار کر لیتا ہے

گزشتہ رات

چاند کے پاس اک ستارہ تھا — میں نے دیکھا تو اشک بہنے لگے
کوئی مجھ سا نہ ہو تمنائی — ایسی حسرت خدا کسی کو نہ دے

اگرچہ اصل بات واضح ہے لیکن کہنے کا انداز اس میں ابہام کی جھلک پیدا کر رہا ہے۔

گفتگو کا لہجہ بھی اکثر انداز بیان میں ایک انفرادیت پیدا کر دیتا ہے۔

۱۔ شب کو روتا ہوں کیوں بتاؤں کیا
غالباً یہ بھی ایک عادت ہے

. . . .

۲۔ نہ میرا سوزِ غم اس میں نہ میرا جوش طرب
مری تصویر نہیں، یہ مری تصویر نہیں!

بعض جگہ تصویر کشی بھی خوب ہے مثلاً

۱۔ کوئی جنگل میں گا رہا ہے گیت
دھیمی آواز دکھ بھرا لہجہ۔

اور ۲۔ اٹھی ہے درد کی مانند کالی کالی گھٹا،

پہلی مثال میں دوسرا مصرعہ اس جنگل میں گانے والے کی آواز کے صحیح زیر و بم کا احساس ہمیں دلاتا ہے، اور اسی سے ذہن صورت حال کی گرفت کر لیتا ہے، دوسری مثال میں رفتہ رفتہ بڑھنے کا ایک تواتر پیدا ہے، نیز درد اور گھٹا کی سیاہی کی مماثلت بھی ترجمانی میں اچھی معاون ہے۔ ایک آدھ جگہ مسکراہٹ کا ہلکا سا شائبہ پیدا ہوتا ہے۔

آنکھیں کھلی ہیں تاروں کی، بیدار ہے فضا
[illegible]

بات کا انداز بہت سے نام سجھاتا ہے!

بعض جگہ متقدمین کے کلام کی گونج بھی پائی جاتی ہے۔

تجھے خبر نہیں او غم سے بے خبر! اس وقت
ترے پڑوس میں اک غم نصیب روتا ہے

اس موضوع پر میرتقی کا غالباً ایک ہی شعر آخری لفظ ہے۔

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

غالب کا ایک شعر ہے "ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی" ـــــ اسی کی ایک گونج ذیل میں ہے۔

بے خودی

اب کہاں ہوں کہاں نہیں ہوں میں — جس جگہ ہوں وہاں نہیں ہوں میں
کون آواز دے رہا ہے مجھے — کوئی کہہ دو یہاں نہیں ہوں میں

فرانس کے ادیب وکٹر ہیوگو کا ایک فقرہ ہے "اے موسم بہار! تو میرا خط ہے جسے میں نے اس کے نام لکھا ہے"۔ اور اس کتاب میں ایک قطعہ ہے۔

موسم بہار

رموز قلب رقم ہیں بہار کے رخ پر — جو نقش ہے اثرِ خامۂ محبت ہے
تجھے بھی علم ہے اے موسم بہار کہ تو — کسی کے نام مرا نامۂ محبت ہے

"آبگینے" ایک ایسے نوجوان شاعر کی ناکام محبت کا فسانہ ہے جو حقیقت کو افسانے سے ہم آہنگ نہ پا کر الم پرست بن گیا ہے۔ چنانچہ

تم تمہیں چاہتے ہیں تم ہم کو — بس فسانوں ہی میں یہ ہوتا ہے۔

اور ـــــ جو عشق پاتے ہیں کثرت سے ہم کتابوں میں
وہ واقعات کی دنیا میں کیوں نہیں ملتا؟

آج کل بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ عام لوگوں کی طرح محبت سے متعلق شعرا کا انداز نظر بھی مدلل اور مائل بہ مادیت ہوتا جا رہا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اعتدال ہی حیات پرور خصوصیت ہے، اس لئے اختر انصاری کے قطعے اس لحاظ سے بھی پڑھنے کے لائق ہیں کہ وہ ہمیں دو اور دو چار قسم کی دنیا میں ایک آدھ لمحوں کے لئے جذبات پرست بنا سکتے ہیں۔

کاغذ کتابت اور طباعت اچھی ہے کتاب مجلد ہے اور اوپر ایک جاذب نظر گرد پوش بھی موجود ہے۔ ہاں ترتیب کے سلیقے کے لحاظ سے فہرست کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

حجم سوا سو صفحات قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ مکتبہ اردو لاہور۔

"م"

سوزِ ناتمام

(دوسرا ایڈیشن)

عاشق بٹالوی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ

اس کا پہلا ایڈیشن دس ماہ کی قلیل مدت میں ختم ہو گیا۔ اہلِ ذوق کے اصرار پر دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے جو پہلے ایڈیشن کے تمام افسانوں کے علاوہ پروفیسر حمید احمد خاں ایم اے کے ایک مبسوط مقدمے پر مشتمل ہے

ایک رائے

عاشق صاحب نے حیاتِ بشری کے نشیب و فراز اور معاشرتی کشمکش کے فلسفوں کو جس خوبی سے ادا کیا ہے اُس کی داد نہ دینا ایک جرم ہے۔

(خواجہ) حسن نظامی

سحرِ فرانس

جو فرانس کے افسانہ نگار گائی دموپساں کے بائیس دلکش افسانوں کا مجموعہ ہے

جس کا ترجمہ طاہر قریشی بی اے بی ٹی نے کیا ہے۔ تعارف جناب عاشق بٹالوی بی اے ایل ایل بی نے سپردِ قلم کیا ہے۔ اور موپساں کی افسانہ نگاری پر ایک مبسوط محققانہ مقالہ حضرت شاہد احمد بی اے آنرز ایڈیٹر ماہنامہ ساقی دہلی کے قلم کا رہینِ منت ہے

اعلیٰ درجے کی کتابت و طباعت دلکش سرورق۔ خوشنما جلد ضخامت سوا تین سو صفحات۔ ظاہری و باطنی محاسن سے آراستہ کتاب میں مصنف و مترجم کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے (۱ر۴)

علاوہ ازیں افسانے

فردوسِ خیال ۱۲ر، پریم تیسی حصہ اول و دوم ۱۲ر۔ نظارے ۱ر۔ منٹو کے افسانے ۱۲ر۔ دانہ و دام ۱۲ر۔ باسی پھول ۱۲ر۔ شعلے ۱ر۔ چغتائی کے افسانے ۱۲ر۔ صنوبر کے سائے ۱ر۔ میری ناتمام محبت ۱۲ر۔ طلسمِ خیال ۱۲ر۔ اندھی دنیا ۱ر۔ چھ ہال ۱ر۔ لبِ پردہ ۱۲ر۔ سازِ فطرت ۱۲ر۔ محبت اور نفرت ۱۲ر۔ ہیبت ناک افسانے ۱۲ر

سب کتابیں ملنے کا پتہ

مینیجر کتب خانہ ادبی دنیا دی مال۔ لاہور

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۱ء

جلد ۱۹ — نمبر ۹

تصویر: بارش کے بعد

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ۔ ممالک غیر سے دس شلنگ ۔ قیمت فی پرچہ آٹھ آنے ۸/

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپا اور دفتر ادبی دنیا بال لاہور سے شائع ہوا ۔

دنیائے کاروبار

اورینٹیل گورنمنٹ سکیورٹی لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ

کی سالانہ رپورٹ

ہمارے پیشِ نظر اس وقت اورینٹیل انشورنس کمپنی کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۴۰ء ہے جس میں پالیسی ہولڈر اور نقد زر وغیرہ کے اعداد و شمار سے کمپنی کی زندگی کے مختلف شعبوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ صاحبِ صدر سر پرشوتم داس ٹھاکر داس سی۔آئی۔ای کی وہ تقریر جو انہوں نے کمپنی کے چھیاسٹھویں مجلسِ عام میں بروز ۲۸ مئی ۱۹۴۱ء بمبئی میں کی۔ اس تقریر سے پتہ چلتا ہے کہ سال گذشتہ میں ۱،۳۵،۷۶۴ لوگوں نے مبلغ ۹،۴۹ لاکھ روپیہ کا بیمہ کرایا جو سال ۱۹۳۹ء کے مقابلے میں ۱۰،۴۲۰ بیموں اور ۲۴ لاکھ روپے کے اعتبار سے کم ہے۔ صاحبِ موصوف نے فرمایا کہ حالاتِ حاضرہ کا لحاظ رکھتے ہوئے یقیناً سال گذشتہ کی کارگزاری بہت حد تک تسلی بخش ہے۔

سال گذشتہ میں ۱۹۴۰ء میں احمد آباد اور پونا میں پچھلے سالوں کی نسبت دُگنے کے قریب لوگوں نے بیمہ کرایا۔

۱۹۳۹ء میں سالانہ پریمیم کی آمدنی ۳۶۵ لاکھ تھی اس سال ۸ لاکھ کے اضافے سے کل رقم مبلغ ۳۷۳ لاکھ ہو چکی ہے۔

کمپنی کو سال گذشتہ میں مبلغ ۶ لاکھ کا فائدہ ہوا۔ اموات کی صورت میں جو مطالبات ہوئے ان کی رقم ۶۷½ لاکھ تک جا پہنچی اور وہ رقم جو سن بلوغ پر پہنچنے کی بعد طلب کی گئی ۸۵½ لاکھ کے قریب تھیں جو سال سابق کے اعتبار سے ۱½ لاکھ روپے کم ہیں۔

سر پرشوتم داس ٹھاکر داس نے فرمایا! "مجھے تعجب ہے کہ پچھلے دو سالوں میں بیموں کی تعداد پہلے کی بہ نسبت کم ہو گئی ہے ہونا تو یوں چاہئے تھا کہ جنگ اور موت کے خطرے کی وجہ سے بیشتر لوگ زندگی کا بیمہ کراتے۔ مگر معاملہ اس کے برعکس ہے۔

مندرجہ ذیل اصحاب سال ۱۹۴۱-۴۲ء کے لئے کمپنی کے ڈائرکٹر منتخب ہوئے۔

۱۔ سر پرشوتم داس ٹھاکر داس نائٹ۔

۲۔ سر کیکا بھائی پریم چند نائٹ

۳۔ سر حبیب اللہ مہر علی بھنیوٹی نائٹ

کمپنی کے آڈیٹران کے طور پر میسرز بلیمو ریا اینڈ کمپنی اور میسرز چند بھائی اینڈ جیسو بھائی کا تقرر ہوا۔

سرولین

سب والدین کی یہ ہمیشہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو تندرست ہنس مکھ اور خوش و خرم دیکھیں۔ معمولی سی کھانسی یا زکام کا اگر فوراً علاج نہ کیا جائے تو بڑھتے بڑھتے یہ ایک خطرناک صورت اختیار کر جاتا ہے اور جسم انسانی کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیتا ہے۔

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کھانسی اور زکام عام ہے لوگ اس سے غفلت برتتے ہیں اور کئی ایک متعدی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بازار میں یوں تو سینکڑوں ادویات کھانسی۔ زکام اور پھیپھڑوں کی تکالیف کے متعلق فروخت ہوتی ہیں لیکن سرولین روچے ان سب سے بہترین ہے۔ یہ کھانسی زکام اور پھیپھڑوں کی جملہ تکالیف کا تیر بہدف علاج ہے جو آج سے چالیس سال قبل سوئٹزرلینڈ کی شہرہ آفاق لائبریری میں دریافت کی گئی تھی۔ اس وقت سے لے کر آج تک ڈاکٹر صاحبان نے اسے پھیپھڑوں کے امراض کے لئے اسے بہترین دوائی تسلیم کیا ہے۔

سکندر

موصولہ اطلاعات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کئی ہزار سال سے سکندر کی روح اب پھر فلمی سٹیج پر اپنے کارناموں کو نہایت شان سے پیش کر رہی ہے۔ فلم کیا ہے ایک اولوالعزم شہنشاہ کی یاد تازہ ہے۔

فضل الٰہی ایڈورٹائزمنٹ منیجر

روز مرّہ کا ایک ضروری واقعہ

بال بچوں کی تسلی کے لئے
چائے

جس وقت آپ کا شوہر اپنے کام سے اور
آپ کے لڑکے اسکول سے واپس آئیں۔ اُس لمحہ
آپ کو چائے بنانے میں معروف ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ اس طرح آپ اپنے گھر میں
روزانہ چائے کی مجلس قائم کرتے ہیں۔ جو کہ گھریلو خوشی کی انتہا ہے۔ آپ یقین کیجئے کہ
یہ خوش کن واقعہ جس طرح آپ کے گھر میں ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے گھروں میں بھی ہوتا ہے۔

آؤ ہم ہندوستانی چائے پئیں

چائے کس طرح تیار کرنی چاہیئے۔ تازہ پانی اُبال لیجئے۔ اور پھر ایک
صاف برتن کو ذرا گرم کر کے اس میں ہر شخص کے لئے ایک ایک چمچہ ہندوستانی چائے
کا ڈال دیجئے اور ایک چمچہ فالتو ڈال لیجئے۔ جونہیں پانی اُبلنے لگے اس کو چائے والے
برتن میں ڈال دیجئے۔ اور پانچ منٹ تک ڈھکا رہنے دیجئے۔ بعدازاں دودھ
اور کھانڈ ملا کر پیالیوں میں ڈال کر استعمال کیجئے۔

بارش کے بعد

یادِ رفتگاں

یادِ چغتائی

عظیم بیگ چغتائی ۲۰ اگست ۱۹۴۱ء کو ہم سے رخصت ہوئے۔

سلطنتِ مغلیہ کے بعد پہلے تو سیاسی زوال اور پھر احیائے قومی کی تگ و دو نے اہلِ وطن کو عموماً اور اہلِ قلم کو خصوصاً کچھ اس قدر سنجیدہ بنا دیا کہ اردو کا جدید ادب دیر تک یوں کہیے کہ ہنسنا بھول ہی گیا۔ مغربی اثرات کے ماتحت ترقی کی نئی راہیں تو کھلیں، لیکن اردو ادب میں قہقہہ اس وقت تک باقاعدگی کے ساتھ نمایاں نہ ہوا جب تک کہ چغتائی نے اپنے زعفران زار کے ساتھ لوگوں کے دلوں کو اپنانا نہ شروع کر دیا۔ اردو مذاح نگاری کی اب تک جو ترقی یافتہ صورت ہمارے پیش نظر ہے اُس کی آبیاری میں چغتائی اولین رہنماؤں میں سب سے ممتاز درجہ رکھتا ہے کیونکہ اس کی تخلیقات کی ترجمانی کا دائرہ وسیع تر ہے۔

پنجاب میں چغتائی سب سے پہلے اپنے ایک مضمون "انگوٹھی کی مصیبت" کے ساتھ نمودار ہوا (یہ مضمون بعد کو جا کر اس کی کتاب "شریر بیوی" کا ایک باب ٹھہرا) — اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف افسانہ نگاری میں ایک ایسی شگفتگی نظر آنے لگی، جس کی تقلید مذاح نگاری میں ایک صحت مند اضافے کا باعث بنی۔

اچھے فن کاروں کی طرح چغتائی کی اپنی زندگی قریباً ہمیشہ کشمکشِ زیست اور ناسازئ طبع کی شکار رہی۔ لیکن شاید وہ اپنی طبعی ہمت سے کام لیتے ہوئے گریز کے طور پر ہمیشہ ہنسی کی طرف ہی رجوع ہوا اور یوں نہ صرف خود کسی حد تک ہنستا رہا بلکہ اوروں کو بھی ہنساتا رہا۔ کیا معلوم اردو خواں طبقے کے کتنے افراد کے غم کا دارو چغتائی کی تصانیف بنتی رہیں۔

لیکن صرف یہ ہنسنا ہنسانا ہی چغتائی کی زندگی کا کارنامہ نہیں ہے۔ معاشری لحاظ سے بھی وہ ایک مصلح اور جدید فرد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس سلسلے میں پردے کے متعلق جو کتابیں اُس نے لکھیں وہ اُس کے شگفتہ اور صحت مند اندازِ نظر کی ترجمان ہیں۔

چغتائی کی مذاح نگاری ترجمانی کی وسعت کے لحاظ سے صرف بین الصوباتی اردو ہی کی مرہون نہیں بلکہ بعض دوسری ذیلی زبانوں میں بھی اُس کے مضامین ترجمے کی صورت میں شائع ہوئے اور اس لحاظ سے ہندی چغتائی کے احسان کو کبھی نہ بھولے گی۔

چغتائی اپنی زندگی میں ناموافق حالات کے باوجود ہمیں ہنساتا رہا۔

اب ہم اُسے روتے ہیں!

یادِ فانی

چغتائی کے بعد ۲۷ اگست کے روز شوکت علی خاں فانی بدایونی بھی اُن سے جا ملے۔

فانی کے کلام میں موضوع کے انتخاب کا اشارہ اُس کے تخلص ہی میں موجود ہے، لیکن غزل گوئی میں جس یاس اور غم کی ترجمانی اُس نے کی۔ اُس میں ایک بلندی ہے، ایک ایسی ہی ازلی اور ابدی بلندی جو فنا کے عمل میں بھی محسوس ہوتی ہے۔

غالب کے بعد سنجیدہ غزل میں سب سے نمایاں فن کار فانی ہی نظر آتا تھا، اور غالب ہی کی طرح جہاں اُس کے کلام کی خوبیوں میں اُس کی ذہانت اور شخصیت کو بہت حد تک دخل تھا وہاں دنیا کے ذاتی تجربات — تلخ حقائق نے بھی اس نشو و نما میں معتد بہ حصہ لیا تھا۔ ایک فرق ہے کہ غالب کی قنوطیت میں بسا اوقات طنز کی تلخی شامل ہو جاتی تھی، مگر فانی کی یاس پسندی ہمیشہ خالص یاس پسندی ہی رہی، شاید یہی وجہ تھی کہ حالی کے بعد کی اردو شاعری میں "میر و میرزا" کا صحیح امتزاج اگر کہیں نظر آتا ہے تو وہ فانی ہی کا کلام ہے، اُس میں یاس کی تلخی کے ساتھ ہی ساتھ نغمے کی شیرینی بھی ہے۔ اور اس پہلو سے شیلے کی کہاوت کہ ہمارے سب سے میٹھے گیت سب سے زیادہ دُکھ والے ہوتے ہیں فانی کی زندگی اور کلام پر پوری اترتی ہے۔

سنجیدگی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ فانی اپنے کلام میں باقی رہے گا، لیکن جذباتی کیفیت وداعِ فانی پر ہماری زبان کا ایک فقرہ دہرانے کو کہتی ہے۔ — "اردو کے ذریعے انہوں نے بہتوں کو رُلایا، اردو اُن کو جتنا بھی روئے کم ہے" — اللہ بس!

"م"

یادِ رفتگاں

یادِ چغتائی

عظیم بیگ چغتائی ۲۰ اگست ۱۹۴۱ء کو ہم سے رخصت ہوئے۔

سلطنتِ مغلیہ کے بعد پہلے تو سیاسی زوال اور پھر احیائے قومی کی تگ و دو نے اہلِ وطن کو عموماً اور اہلِ قلم کو خصوصاً کچھ اس قدر سنجیدہ بنا دیا کہ اردو کا جدید ادب دیر تک یوں کہیے کہ ہنسنا بھول ہی گیا۔ مغربی اثرات کے ماتحت ترقی کی نئی راہیں تو کھلیں، لیکن اردو ادب میں قہقہہ اس وقت تک باقاعدگی کے ساتھ نمایاں نہ ہوا جب تک کہ چغتائی نے اپنے زعفران زار کے ساتھ لوگوں کے دلوں کو اپنانا نہ شروع کر دیا۔ اردو مذاح نگاری کی اب تک جو ترقی یافتہ صورت ہمارے پیشِ نظر ہے اُس کی آبیاری میں چغتائی اولین رہنماؤں میں سب سے ممتاز درجہ رکھتا ہے کیونکہ اس کی تخلیقات کی ترجمانی کا دائرہ وسیع تر ہے۔

پنجاب میں چغتائی سب سے پہلے اپنے ایک مضمون "انگوٹھی کی مصیبت" کے ساتھ نمودار ہوا (یہ مضمون بعد کو جا کر اس کی کتاب شریر بیوی کا ایک باب ٹھہرا) — اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف افسانہ نگاری میں ایک ایسی شگفتگی نظر آنے لگی، جس کی تقلید مذاح نگاری میں ایک صحت مند اضافے کا باعث بنی۔

اچھے فن کاروں کی طرح چغتائی کی اپنی زندگی قریباً ہمیشہ کشمکشِ زیست اور ناسازیِ طبع کی شکار رہی لیکن شاید وہ اپنی طبعی ہمت سے کام لیتے ہوئے گریز کے طور پر ہمیشہ ہنسی کی طرف ہی رجوع ہوا اور یوں نہ صرف خود کسی حد تک ہنستا رہا بلکہ اوروں کو بھی ہنساتا رہا۔ کیا معلوم اردو خواں طبقے کے کتنے افراد کے غم کا دارو چغتائی کی تصانیف بنتی رہیں۔

لیکن صرف یہ ہنسنا ہنسانا ہی چغتائی کی زندگی کا کارنامہ نہیں ہے۔ معاشری لحاظ سے بھی وہ ایک مصلح اور جدید فرد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس سلسلے میں پردے کے متعلق جو کتابیں اُس نے لکھیں وہ اُس کے شگفتہ اور صحت مند اندازِ نظر کی ترجمان ہیں۔

چغتائی کی مذاح نگاری ترجمانی کی وسعت کے لحاظ سے صرف بین الصوبجاتی اردو ہی کی مرہون نہیں بلکہ بعض دوسری دیسی زبانوں میں بھی اُس کے مضامین ترجموں کی صورت میں شائع ہوئے اور اس لحاظ سے ہندی چغتائی کے احسان کو کبھی نہ بھولے گی۔

چغتائی اپنی زندگی میں ناموافق حالات کے باوجود ہمیں ہنساتا رہا۔ اب ہم اُسے روتے ہیں!

یادِ فانی

چغتائی کے بعد ۲۷ اگست کے روز شوکت علی خاں فانی بدایونی بھی اُن سے جا ملے۔

فانی کے کلام میں موضوع کے انتخاب کا اشارہ اُس کے تخلص ہی میں موجود ہے، لیکن غزل گوئی میں جس یاس اور غم کی ترجمانی اُس نے کی۔ اُس میں ایک بلندی ہے، ایک ایسی ہی ازلی اور ابدی بلندی جو فنا کے عمل میں بھی محسوس ہوتی ہے۔

غالب کے بعد سنجیدہ غزل میں سب سے نمایاں فن کار فانی ہی نظر آتا تھا۔ اور غالب ہی کی طرح جہاں اُس کے کلام کی خوبیوں میں اُس کی ذہانت اور شخصیت کو بہت حد تک دخل تھا، وہاں دنیا کے ذاتی تجربات — تلخ حقائق نے بھی اس نشو و نما میں معتد بہ حصہ لیا تھا۔ ایک فرق ہے کہ غالب کی قنوطیت میں بسا اوقات طنز کی تلخی شامل ہو جاتی تھی۔ مگر فانی کی یاس پسندی ہمیشہ خالص یاس پسندی ہی رہی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ حالی کے بعد کی اردو شاعری میں "میر و میرزا کا صحیح امتزاج اگر کہیں نظر آتا ہے تو وہ فانی ہی کا کلام ہے۔" اُس میں یاس کی تلخی کے ساتھ ہی ساتھ نغمے کی شیرینی بھی ہے۔ اور اس پہلو سے شیلے کی کہاوت کہ ہمارے سب سے میٹھے گیت سب سے زیادہ دُکھ والے ہوتے ہیں فانی کی زندگی اور کلام پر پوری اترتی ہے۔

سنجیدگی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ فانی اپنے کلام میں باقی رہے گا، لیکن جذباتی کیفیت "وداعِ فانی" پر ہماری زبان کا ایک فقرہ دہرانے کو کہتی ہے — "اردو کے ذریعے انہوں نے بہتوں کو رُلایا، اردو اُن کو جتنا بھی روئے کم ہے" — اللہ بس!

"م"

بزمِ ادب

(۱)

حصّۂ نثری رنگارنگی اس دفعہ زندگی کے تنوّع سے ہم آہنگ ہے۔ چنانچہ افسانوں میں خصوصاً آپ معمول سے زیادہ اختلافِ مناظر پائیں گے۔ ایک طرف اختر انصاری اپنی نکھری ہوئی، گھلی گھلی زبان میں ایک بھولا بسرا واقعہ بیان کر رہے ہیں۔ ایک خام جوانی کی نفسیات کا خوب جائزہ لیا ہے۔ اور ان تاثرات کو ایک ایسے پلاٹ کے تانے بانے میں سمویا ہے جو کافی حد تک انگریزی کی "گھوسٹ سٹوری" (روحوں کے افسانے) کا تاثر پیدا کرتا ہے۔ نوجوانی کی اُس مقبول دعا اور زندگی کی دوسری دعاؤں کا تضاد ایک ایسا زاویہ ہے جو ایک ہلکی پھلکی چیز میں سنجیدگی کی گہرائی پیدا کر دیتا ہے ـــــ معلوم نہیں یہ واقعہ جگ بیتی ہے کہ آپ بیتی ـــــ لیکن

ممتاز مفتی شاید جگ بیتی کو آپ بیتی کے دلکش ملبوس میں ظاہر کر رہا ہے۔ یہاں خام ذہن کی نفسیات کو دخل نہیں، بڑوں کی باتیں ہیں۔ اور ان بڑوں میں ایک دو کردار تو چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ خان صاحب اور بجنوری ملازم ننھے کے علاوہ "انار" کا کردار بھی اگرچہ بظاہر خاموش سا ہے لیکن اصلاً بولتا ہوا ـــــ اور پھر معاشری لحاظ سے جگہ جگہ جو طنز موجود ہے وہ سیدھی سادی کہانی کے لطف میں پیچ پیدا کرتے ہوئے لطف کو دوبالا کر رہی ہے ـــــ اور اس لطف میں کہانی کا پس منظر بھی تمام نقوش سے ہم آہنگ ہے بلکہ ان کو روشن کرتا ہے۔

شبیر حسین رضوی کا مرکز "طیارچی" ہے ـــــ موجودہ جنگ نے طیارے اور طیارچی کو ہماری زندگی میں نمایاں کر دیا ہے، لیکن غالباً یہ پہلا افسانہ براہ راست اس موضوع سے متعلق ہے۔ جس میں افسانہ نگار نے حسبِ معمول پلاٹ کے پیچ اور مکالمے کی شگفتگی کو برقرار رکھا ہے۔

یہ تو تھے خالص مختصر افسانے۔ مگر شیر محمد اختر مختصر افسانے کی اُس خاص صنف کو پیش کر رہا ہے، جو بیک وقت افسانہ بھی ہوتی ہے اور انشائے لطیف بھی، چنانچہ "افسانے کا پلاٹ" جہاں ایک کہانی کی طرح واقعات کو اپنے پہلو میں لئے ہوئے ہے وہاں ایک مضمون کی طرح خیالات اور تاثرات کا حامل بھی ہے۔ اس انداز کی چیزیں ابھی اردو میں کم ہی لکھی گئی ہیں لیکن ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے ہمارے افسانہ نگار خود بخود اس طرف مائل ہو رہے ہیں اور کہانی کو محض دل بہلاوے سے ہٹا کر فکر انگیزی کی طرف لا رہے ہیں۔

افسانوں کی بات ختم ہوئی۔ اب مضامین کو لیجئے۔

سنجیدہ فرضی خطوط کا ادب دوسری زندہ زبانوں میں وافر طور پر موجود ہے۔ اردو میں ابھی اس کی کمی ہے۔ لیکن اس کمی کو ڈاکٹر باقر پنجاب کے مختلف رسائل میں پورا کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر باقر کے یہ خطوط سیاسیات، اقتصادیات معاشیات وغیرہ مختلف علوم سے متعلق ہوتے ہیں۔ لیکن اندازِ بیان شگفتہ اور ہلکا پھلکا، جس میں جگہ جگہ ان کی طنز نگاری سوچنے والے دماغوں کو نہ صرف متحرک کر دیتی ہے بلکہ چٹ پٹا بھی بنا دیتی ہے۔ اور اس پر ان کی ادبی چاشنی ایک اضافہ ہے ـــــ یہ مضمون حال سے تعلق رکھتا ہے بلکہ مستقبل کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ لیکن

دیوندر ستیارتھی ہمیں اپنے "دیس کے گیتوں" سے ایک ایسے دُور کے ماضی میں لے جاتا ہے۔ جو محض تاریخی لحاظ سے ماضی ہے احساسات اور تجربات کے لحاظ سے اس کی حیثیت زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے، اور پھر حیوانِ مطلق کی باتوں کا تطابق جس سادگی سے حیوانِ ناطق پہ کیا گیا ہے، وہ بھی قابلِ غور ہے۔

ستیارتھی کا یہ بین العلوی مضمون اس کے تازہ مجموعے "میں ہوں خانہ بدوش" میں بھی شامل ہے، جہاں اسی طرح کے اور مضامین بھی دل و دماغ کی ضیافت کو موجود ہیں۔

(۲)

زیرِ نظر شمارے میں جگن ناتھ آزاد کا ایک شعر ہے ؎

ابھی آغاز ہی اک طرفہ معمّا ہے مجھے منکشف مجھ پہ ہو کیونکر مرا انجام ہنوز

اس شعر میں ضمیر "مجھے" کا مرجع اردو شاعری بھی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اس کے ارتقائی منازل میں بہت سی باتوں پر اس شعر کو چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن موجودہ اردو شاعری کے ماہ بماہ بڑھتے ہوئے قدم اس کے مفہوم سے ہم آہنگ ہیں۔ البتہ ہمارے موجودہ خصوصاً نوجوان شعرا کا کلام صرف تنگ نظر اور عیب بیں لوگوں ہی کے لئے ایک "طرفہ معمّہ" ہے "جو..." [illegible]

جمے ہوئے قدموں والے اس اُفق کو اس "انجام" کو صاف طور پر نہ سہی ایک دھندلکے ہی میں ضرور دیکھ رہے ہیں۔ جو مستقبل کی تاریخ ادبِ اُردو آئندہ نسلوں پر منکشف" کرے گی۔ گذشتہ شمارے کی بعض نظموں پر ایک ایسے کُند ذہن بچّے نے کچھ غیر مدلّل اعتراضات کئے ہیں جس کے بارے میں گئے سے گئے مہینے حلقۂ نظم کی بزمِ ادب میں وضاحت کی گئی تھی۔ ادب و شعر صرف فنّی نقطۂ نظر ہی سے قابلِ اعتراض ہو سکتے ہیں۔ خیال پر کوئی روک نہیں لگائی جا سکتی۔ اور اس سلسلے میں اجنبیت جرم نہیں بلکہ واقعہ کہی جا سکتی ہے۔ جس کی اہمیت اگر سمجھ میں نہ آئی ہو تو اجنبیت کو دور کرنے کی کم سے کم کوشش کی جا سکتی ہے مگر ظاہر ہے کہ کوشش کے لئے شکتی کی ضرورت ہے اور شکتی بازار میں نہیں بکتی۔ اس لئے آئیے جب تک ہم میں شکتی ہے ہم زندگی کی ہر بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

شاعر ہر ملک کے گیت گانے والے ہیں۔ ماہر القادری پپیہے سے من کی باتوں کے بارے میں کچھ کہہ رہا ہے۔ لیکن اُس کے گیت میں پپیہے کے کردار کی موجودگی نے ایک تخصیص پیدا کر دی ہے ایک حد بنا دی ہے۔ اس کے مقابل میں قیوم نظر کے گیت کی حیثیت اگرچہ داخلی کی نسبت خارجی زیادہ ہے۔ پھر بھی اُس میں تصوّرات کا پھیلاؤ آخری مصرع تک پہنچتے پر ایک مرکز سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ ع "ٹوٹے ہیں سب سپنے جھوٹے" یہی مصرع ایک خارجی چیز کو داخلی بنا دیتا ہے۔ فنّی لحاظ سے گیت کی موسیقی ہیئت کی پابندی کے باوجود متنوّع ہے

رفعت ہاشمی کی نظم "گاؤں کی رات" میں عنوان کے تصوّر کے پھیلاؤ کے باوجود ایک حد بندی ہے۔

داسی اور دیوداسی میں شاعر نے اپنے آپ کو ایک انوکھے نسائی پردے میں چھپا دیا ہے۔ یہ پردہ اس لئے اور بھی گہرا ہے کہ نظم کا ماحول دُور کے ماضی سے متعلق ہے۔ بحر کا ٹھہراؤ اور الفاظ اور محاورات کی تراش مندر کے ماحول سے ہم آہنگ ہے۔ لیکن الفاظ کے پردوں کے پار ناز و نیاز کا جو گداز موجود ہے اس کا اظہار نظم کو دوبارہ پڑھنے ہی سے ہو سکتا ہے ـــــ ایک بات اور دُوسرے بند کی زمین اس نظم کو غزل بناتی بناتی رہ گئی۔

جس حلقۂ بندگی کی وضاحت مختار صدیقی نے اپنے رجحان کے مطابق کی ہے اُسی کا ایک اور ترجمان اختر الایمان ہے۔ "داسی اور دیوداسی" کا شاعر اظہارِ نفس کے لئے ایک نسائی پیکر کا مرہون ہے لیکن اختر الایمان جسم سے ہٹ کر صرف ایک "نقشِ پا" سے تحریک لیتا ہے۔ "یہ نیم خواب گھاس پر اداس اداس نقشِ پا" ـــــ یہ مصرعہ جہاں مفہوم کے لحاظ سے تصور کو روشن کر دیتا ہے وہاں ترجمانی کے نقطۂ نظر سے الفاظ کی آواز کے لحاظ سے بھی قابلِ غور ہے۔

یہ نظم خالص شاعری کی ذیل میں آتی ہے خیال کا محرک صرف نقشِ پا ہے لیکن اس کو دیکھتے ہوئے شاعر کا ذہن جس لمبے رستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اسی کا سفر ہمارے لئے بھی خیال انگیز ہے۔

لیکن عدم ایک اور ہی رستے پر چل رہا ہے۔ یہ رستہ حقایق سے لبریز ہے۔ اور بہت سے نوجوانوں کی آپ بیتی۔

روشن دین تنویر کی دو نظمیں آپ بیتی بھی ہیں اور جگ بیتی بھی۔ "پھولوں کی وادی" آپ بیتی ہے۔ اور "ملّاح کی لاش" جگ بیتی۔ "پھول ہی پھول ہیں اس وادی میں، پھول ہی پھول ہیں تا حدِ نظر، پھول ہی پھول ہوں اس وادی میں" ان مصرعوں میں الفاظ کا تواتر منظر کے علاوہ شاعر کی ذہنی کیفیت کا بھی ترجمان ہے۔ فن کار نے ایک بیج کے ذریعے سے اپنے ماضی کے بھوت کو جو ایک غیر مرئی چیز ہے۔ پھولوں کی وادی کی صورت دے دی ہے۔ جو بظاہر ایک مرئی تصویر بن جاتی ہے۔ بیانیہ خصوصیت کے باوجود یہ نظم صرف ایک ذہنی کیفیت ہے۔ ایک سرسراتی ہوئی پھیلتی ہوئی سی کیفیت جس سے شاعر کو اکثر دوچار ہونا پڑتا ہے، ایک بیتے ہوئے اچھے دنوں کی یاد جو ایک بھوت بن کر، اُس کی موجودہ الم ناک زندگی میں کبھی کبھی یوں کہیئے کہ اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ "یہ تو ہے بھوت میرے ماضی کا، راستہ جس نے مرا روکا ہے" نظم کا یہ آخری شعر پہلے کے تمام شگفتہ تاثر میں ایک فکر انگیز سنجیدگی پیدا کر دیتا ہے۔

ملّاح کی لاش میں ہم سے دُور کا منظر ہے۔ دھرتی کے کنارے کا منظر ہے، ساحل کا منظر ہے۔ لیکن سوچ آتی ہے کہ کیا یہ ملّاح جس سے شاعر مخاطب ہے۔ اُس کی اپنی ہی ذات تو نہیں۔

تنویر کی یہ دونوں نظمیں جرمن شاعر ہائنے کی بعض نظموں کی طرح مافوق الفطرت کیفیات کے مطالعے ہیں۔

میراجی

آئینۂ عالم

ایران کا حسرت ناک انجام

ایران آج سے تیس چالیس سال پیشتر بالکل ان ہی حالات میں گرفتار تھا جن سے ترکی کو دوچار ہونا پڑا لیکن ان دونوں ممالک کو خدا نے دو ایسے رہنما دے دیئے جنھوں نے اپنی اولوالعزمی اور تن دہی سے اپنی قوم کو کم از کم اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا۔ یہ دو رہنما اتاترک اور رضا شاہ پہلوی تھے لیکن ان میں سے ایک نے اپنی توجہ صرف اپنی قوم کی معاشرتی اور تمدنی اصلاحات کی طرف رکھی اور فوجی طاقت بڑھانے کی طرف زیادہ توجہ نہ دی جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے کہ وہ خواب جو اس نے ایران کے متعلق دیکھا تھا تشنۂ تکمیل رہا۔ اور اسے اپنی آنکھوں سے ان حالات کو دیکھنا پڑا جنھیں کوئی محبِ وطن نہیں دیکھ سکتا لیکن سیاسی لحاظ سے اپنی کارگزاریوں میں ناکامی کے باوجود رضا شاہ پہلوی کو ہم ایران کا مصطفےٰ کمال کہہ سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی کہ دونوں کی زندگی کے ابتدائی حالات ایک دوسرے سے کافی مشابہت رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے بھی کہ دونوں اپنے اپنے ملک میں اپنے مذہب کی عظمتِ رفتہ کی یاد زندہ کرنے کے لئے مصروفِ عمل تھے۔

رضا شاہ پہلوی قوم پرست ہیں۔ اور انھوں نے سارے ایران کو قوم پرستی کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ اپنے خیالات پھیلانے کے لئے انھوں نے ایران میں قومی تحریک بھی شروع کی تھی جو بہت کامیاب ہوئی اور ان کے اقتدار کے قیام کا باعث بنی۔ ان کی خدمات کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ ایران کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہ سنبھالتے تو آج ایران نے اتنی ترقی بھی نہ کی ہوتی جتنی کہ کر چکا ہے۔ ایران کے شہروں میں زندگی کی وہ گہما گہمی نہ ہوتی جو نظر آ رہی ہے مصطفےٰ کمال کی طرح وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ ایران اگر بالکل مغربی رنگ میں نہیں تو کم از کم ظاہری طور پر رنگا جائے جس کا ثبوت ایرانیوں کے لباس میں نمایاں تبدیلی — بے حجابی اور مغربی وضع کی عمارتوں سے مل سکتا ہے

رضا شاہ نے یہ اصلاحات رفتہ رفتہ نافذ کیں اس لیے ایران کی وہ حالت نہ ہوئی جس سے افغانستان کو سامنا کرنا پڑا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ رضا شاہ تعلیم سے بالکل نابلد ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا دورِ حکومت ایران کے لئے بہترین دورِ حکومت ثابت ہوتا اگر موجودہ حالات رونما نہ ہوتے۔

آپ کا اصلی نام مرزا رضا خاں ہے۔ اور آپ علاقہ دماوند میں ایک غریب کسان کے ہاں سنہ ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے لیکن تین سال کی عمر میں ہی باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا جس کے بعد آپ کی والدہ طہران آ گئیں۔ اور جن مشکل حالات میں رضا خاں نے وہاں پرورش پائی وہ تعلیم کے حصول میں حائل رہے جوان ہو کر آپ فارسی کاسک فوجی دستے میں سپاہی بھرتی ہوئے۔ اس دستے کو جرأت و بہادری میں نمایاں مقام حاصل تھا اور اسے روسیوں نے تیار کیا تھا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں رضا شاہ فوج میں افسر بن گئے۔ اسی طرح ترقی کرتے کرتے آپ اس دستے کے جب اسے جنگ عظیم کے بعد مکمل ڈویژن بنا دیا گیا تو جرنیل ہو گئے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں آپ نے طہران کی طرف پیش قدمی کی اور وزارت کا تختہ الٹ دیا۔ اور دوسری وزارت قائم کی جس میں وزارت جنگ اور سپہ سالاری کا عہدہ آپ نے خود اپنے لئے رکھا۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں آپ وزیر اعظم بن گئے۔ اور ۱۹۲۴ء میں ملک میں جمہوری حکومت قائم کرنے کی کوشش کی لیکن فرقہ شیعہ کی مخالفت کی وجہ سے کامیاب نہ ہوئے لیکن عرصے کے بعد آپ نے شیعوں کو اپنا حامی بنا لیا۔ اور پارلیمنٹ سے مطالبہ کیا کہ ایران کے بادشاہ احمد شاہ کو جو اس وقت پیرس میں بغرض سیاحت مقیم تھے حکومت کے سامنے ذمہ دار نہ سمجھا جائے بلکہ ان کی ذات کو سمجھا جائے۔ پارلیمنٹ اس پر رضامند ہو گئی۔

سنہ ۱۹۲۵ء کے آخر میں آپ تخت ایران پر جلوہ افروز ہوئے اور بادشاہ

بن گئے۔

۱۹۳۸ء میں آپ نے اپنے بیٹے کی شادی شاہ فاروق والیٔ مصر کی ہمشیر شہزادی فوزیہ سے کی اور اس طرح ایران اور مصر کو محبت اور اخوت کے رشتے میں باندھا۔ ۱۹۳۹ء میں ایران کے قصر سعدآباد میں اسلامی طاقتوں کا معاہدۂ سعدآباد ہوا جس کے رو سے اسلامی ممالک کی تمدنی معاشرتی اور اقتصادی ترقی کا پروگرام تیار کیا گیا تھا۔ واضح رہے یہ معاہدہ فوجی حیثیت نہیں رکھتا۔

ایران سولہ سترہ سال سے آپ کے ماتحت امن و امان اور خوش حالی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ حالات اس قدر پُرسکون آ رہے تھے کہ ایسا گمان ہوتا تھا کہ یہ جنگ بھی ایران پر اثر انداز نہ ہو گی۔ لیکن اچانک آج سے تین ماہ قبل رائٹر نے خبریں بھیجنا شروع کر دیں کہ ایران میں جرمن جاسوس حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں اور ان کی اس سازش میں بعض ایرانی زعما بھی شریک ہیں۔ ایران نے اس خبر کی تردید کر دی لیکن اس قسم کی اندیشہ ناک خبریں برابر آتی رہیں۔ ادھر برطانیہ نے ایران کو نوٹ بھیجا کہ وہ جرمنوں کی سازشوں سے اپنے ملک کو بچائے ورنہ نازی اسے بھی دیگر کمزور ممالک کی طرح اپنا غلام بنا لیں گے۔ معلوم ہوتا ہے اس نوٹ کا جواب شاہ ایران نے سخت الفاظ میں دیا تھا جس کی وجہ سے برطانیہ اور روس نے ایران میں اپنی فوجیں داخل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور یک لخت ایران پر تین طرف سے حملہ کیا گیا۔ ایران میں اتنی طاقت نہ تھی کہ دنیا کی دو بڑی طاقتوں کا مقابلہ کرتا۔ اس لئے روس اور برطانیہ کی فوجیں بہت جلد آگے بڑھتی گئیں۔ آخر ایران نے صلح کی پیش کش کی۔ پرانی وزارت تبدیل ہو گئی اور علی فروغی نے نئی وزارت بنا کر صلح کر لی لیکن جن شرائط پر صلح ہوئی۔ ان میں بڑی بڑی شرائط یہ تھیں کہ ایران کے محوری باشندوں کو برطانیہ کے حوالے کر دیا جائے۔ ان کے قونصل خانے بند کر دیئے جائیں۔ اور برطانیہ کی فوجیں تیل کے بعض علاقوں میں مقیم رہیں اور جب حالات اجازت دیں تو فوجیں واپس بلالی جائیں۔ نیز ایران کا اندرونی انتظام ایرانی حکومت کے ہاتھ میں رہے۔

صلح کے ساتھ حالات پھر پُرسکون ہو گئے۔ ہندوستان کے اخبارات نے اس واقعہ کے متعلق جو کچھ لکھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے لیکن مسلمانوں پر اس واقعہ کا بہت برا اثر ہوا۔ ابھی ایران کے معاہدۂ صلح کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ شاہ رضا شاہ پہلوی اپنے بیٹے کے حق میں دستبردار ہو کر اصفہان چلے گئے۔ ان کی دست برداری کے کیا وجوہ ہیں یہ شاید آئندہ واقعات سے معلوم ہو سکے لیکن جو کچھ رائٹر نے ہمیں بتایا اس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی اپنے بادشاہ کے خلاف مدت سے بھرے بیٹھے تھے اور اسے تخت سے علحدہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ عوام میں ہر دلعزیز نہیں تھا۔ علاوہ ازیں وہ جرمنوں کا دوست تھا لہذا عوام نے بغاوت کی اور مطالبہ کیا کہ ملک میں آئینی حکومت قائم کی جائے۔ چونکہ بادشاہ کو یہ منظور نہ تھا۔ اس لئے وہ اپنے بڑے بیٹے کے حق میں تخت سے دست بردار ہو گئے۔ حیرت ہے کہ اگر رضا شاہ پہلوی عوام میں اتنے غیر ہر دلعزیز تھے تو کیا وجہ ہے کہ رائٹر نے اس کی خبر آج سے چند سال پیشتر نہ بھیجی۔ کیا اس وقت طہران میں اس کا کوئی نمائندہ نہیں تھا جو حالات کا صحیح طور پر مطالعہ کر سکتا۔ اور اگر ایسی حالت تھی تو اس کے متعلق یہ سکوت "چہ معنی" دارد۔

آخر ایران کے "غیر ہر دل عزیز بادشاہ" تخت سے علحدہ ہو گئے۔ اور ان کے بجائے محمد رضا شاہ پور تخت نشین ہوئے۔ نئے بادشاہ کی عمر اس وقت صرف بائیس سال ہے۔ انھوں نے سوئزرلینڈ سے تعلیم پائی ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ وہ آئینی طور پر حکومت کریں گے۔

ایران کے متعلق تازہ ترین خبروں سے معلوم ہوا ہے کہ ایرانی پارلیمنٹ سابق بادشاہ پر غداری کے جرم میں مقدمہ چلانا چاہتی ہے۔ خدا جانے اب آئندہ حالات کس طرح پلٹا کھائیں لیکن جس طرح ایران کی آزادی ختم ہوئی ہے اس کی مثال تاریخ میں کم ملے گی۔ اور پھر اس وقت میں جب کہ مسٹر چرچل اور صدر روزویلٹ اُطلانتک کا اعلان کر چکے ہیں ———— !

تابش صدیقی

شعر

شبِ فرقت بسر نہیں ہوتی
نہیں ہوتی سحر، نہیں ہوتی

(امراؤ جان ادا) مرزا رسوا

غزل

آ رہے ہیں مجھے پیغام پہ پیغام ہنوز
پائے جاتا ہے دل انعام پہ انعام ہنوز

کون پوچھے ترے گلزار کا دستور ہے کیا
سب ہیں آزاد مگر میں ہوں تہِ دام ہنوز

ابھی آغاز ہی اک طرفہ معمّہ ہے مجھے
منکشف مجھ پہ ہو کیونکر مرا انجام ہنوز

بارہا جس کو ہوا سامنا نومیدی کا
مرے سینے میں وہی ہے ہوسِ خام ہنوز

اپنی قسمت ہی سے شکوہ ہے مجھے اے ساقی
ترے میخانے میں خالی ہے مرا جام ہنوز

ایک مدت سے ہے گو جلوہ ترا خواب و خیال
ہے مرا دیدۂ حیراں بہ لبِ بام ہنوز

عالمِ دل کے شب و روز تو ویران ہوئے
دیدۂ شوق میں پھرتے ہیں وہ ایام ہنوز

ایک ہی یاد شب و روز ہے دل میں بیتاب
ایک ہی نام ہے لب پر سحر و شام ہنوز

ذکر خلوت کدۂ دل میں ابھی تک ہے وہی
دل کی تسکین کا باعث ہے وہی نام ہنوز

راہ دشوار تو ہے آبلہ پائی کے سبب
شوق سے اٹھتا ہے لیکن مرا ہر گام ہنوز

گرچہ آوارہ و سرگشتہ ہے مدت سے مگر
دلِ آزاد ہے مقصود میں ناکام ہنوز

جگن ناتھ آزاد

ایک گیت

پھر جاگے گُل بوٹے

سورج چمکا، چشمے پھُوٹے

جھرنا بھونرا مینا شاما

پھر جاگے گُل بوٹے

سوئی ہوئی تھی ندّی جاگی

جاگے چمن کے پرلے راگی

اُن کے میت نہ اُن سے چھوٹے

پھر جاگے گُل بوٹے

پھر گذری شام آئی

اُجلے چاند نے لی انگڑائی

بیتے دِنوں کا سرکتا آنچل

پھر گذری شام آئی

تیر چھُپا ہے گھاؤ ہے گہرا

بدلے ہوئے موسم کا لہرا

جھوٹے ہیں سب سپنے جھوٹے

پھر جاگے گُل بوٹے

قیّوم نظر

ہرنی

"آوائے مالسکھلم ستن درجمنگات
ماں منیج ملگوزِک یابی کرُ دُ پرسادم
ادّیا پی گھاس کول گرسنان بھگیو
من مارگ دی کتن پرستینومدی آ!"

آرے او شکاری! تھنوں کے علاوہ میرے سارے جسم سے مانس لے کر مجھے چھوڑ دے۔ اتنا رحم کر، میرا بیٹا، جو ابھی گھاس نہیں کھاتا، میری راہ دیکھ رہا ہوگا! —— یوں ایک سنسکرت شاعر نے جس کا نام تاریخ کو یاد نہیں، کسی شکاری کے جال میں پھنسی ہوئی ایک ہرنی کی دردانگیز پکار اپنے ایک شلوک میں قلم بند کی تھی۔

مجھے یہ کہنے کی جرأت ہوتی ہے کہ یہ گمنام شاعر، جس نے بظاہر ماں کے بنیادی پیار کا نمونہ پیش کیا تھا، اپنے وقت کے سماجی نظام سے غیر مطمئن ہو چکا تھا۔ یہ ہرنی کون تھی؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہرنی کے روپ میں اُس نے اپنے وقت کی غریب مخلوق کو پیش کیا تھا۔ بھوکے بیٹے کا واسطہ دے کر ہرنی نے شکاری کے دل میں رحم کے جذبے کو ابھارنا چاہا تھا۔ یقیناً شکاری نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا ہوگا جو بے درد سرمایہ دار اکثر صدیوں سے روا رکھتا آیا ہے۔

خصوصاً اس زمانے میں جبکہ ادب زندگی کی حقیقتوں سے پرے جا رہا تھا، جبکہ ادیب عوام میں مل جل کر نہیں بلکہ اُن سے الگ تھلگ کسی سردار یا راجہ کی سرپرستی میں زندگی بسر کرتا تھا، جبکہ عوام کی بھوک، بڑھتی ہوئی غریبی اور صدیوں کی غلامی کی طرف سے آنکھیں بند کر کے وہ اپنے سرپرست کی طبیعت بہلانے تک ہی اپنی تحریر کا حلقہ سمجھتا تھا، ہرنی کی یہ پکار سُنی اَن سُنی کر دی گئی ہوگی۔

شاعری کی زبان جذباتی فضا میں جنم لیتی ہے۔ لفظوں میں ایک قسم کا ناچ سا پیدا ہو جانا قدرتی بات ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی لفظ کا ذاتی مطلب دب جائے اور وہ شاعر کے وجدانی ماحول میں ایک نیا ہی مطلب پا لے۔ اِس گمنام سنسکرت شاعر کا یہ شلوک سادگی اور خلوص کا ترجمان ہے۔ اور اس سادہ لباس میں اُس نے اپنے جذبے کی حرکت، بے چینی اور کسک کو ہم تک ٹھیک ٹھیک پہنچا دیا ہے۔

ہمارے دیہاتی گیتوں میں ہرنی کی پکار نہ جانے کتنی صدیوں سے گونج رہی ہے۔ گاؤں کوا یسی بستی نہ جانئے۔ جہاں ایک سی عورتیں اور ایک سے مرد کسی نہ کسی طرح ملتی جلتی زندگی کے دن کاٹ کر چلتے بنتے ہیں مصیبت میں سارا گاؤں مل کر روتا ہے، مل کر کروٹ بدلتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بھوک اور غریبی مٹ جائے اور کھوئی ہوئی آزادی پھر نصیب ہو۔ ان تحریکی لمحوں میں ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے جس کے مطابق صرف قسمت پر شاکر رہنے کا مسئلہ پھیکا پڑنے لگتا ہے اور یہ خیال بھی کہ امیری اور غریبی کی حدیں ہمیشہ یوں ہی بنی رہیں گی سمٹنا شروع ہو جاتا ہے۔

پہلے ایک بنگالی گیت سنئے:-

"ہرینی گھاس کھائے
شکاری تا مشا پائے
آچمبی نے ماری لو شیلیر گھا
توکھون ہرینی بولے رے ——
کی شیل ماری لی بھائی تیر انداز رے!"

—— ہرنی گھاس چر رہی ہے۔ شکاری نشانہ باندھ رہا ہے۔ اچانک (اُس نے) تیکھے تیر سے (ہرنی کو) گھائل کر دیا۔ تب ہرنی کہتی ہے —— کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تو نے، او بھائی تیرانداز!

"بو نیر ہرینی آمی
کار دو ہار نا ہیں دہاری
رکت مانس آمار جگتیر ویری رے

کی شیل ماری ملی بھائی تیر انداز رے!"

"میں جنگل کی ہرنی ہوں کسی سے کچھ اُدھار نہیں لیتی۔ میرا لہو اور ماس دنیا کا دشمن (ہو گیا) ہے کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تو نے، او بھائی تیر انداز!"

"تور جلار جول نہ کھائی
تور بلیر گھاس نہ کھائی
بنا دوشے بد جیلی آنار پران رہے
کی شیل ماری ملی بھائی تیر انداز رے!"

"تیرے تالاب کا پانی پیا ہے نہ تیرے کھیت میں گھاس چرنے گئی ہوں۔ بغیر قصور ہی میری جان لے لی ہے! کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تو نے، او بھائی تیر انداز!"

"نہ کھاؤ آئی لام چھاؤ آسے دودھ
نہ دیکھی لام تار چیند رمُوکھ
نہ کہی لام سینہد سیر کتھارے
کی شیل ماری لی بھائی تیر انداز رے!"

"نہ جی بھر کر دودھ پلایا اپنے بچے کو، نہ جی بھر دیکھ پائی اُس کا چاند سا مکھڑا۔ نہ جی بھر اُس سے پیار کی باتیں کر پائی۔ کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تو نے، او بھائی تیر انداز!"

"مری تاتے دُوکھ نائیں
کِنتو رے شکاری بھائی
اُوپر دیو تار کا چھے کی دِبے جواب رے؟
کی شیل ماری لی بھائی تیر انداز رے!"

"میں مر رہی ہوں، اس کا مجھے دکھ نہیں لیکن اے شکاری بھائی! اوپر دیوتاؤں کے روبرو کیا جواب دے گا؟ کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تو نے او بھائی تیر انداز!"

"جو کھون شِشُو مور کھائے چلے
کاندی بے ماں ماں بلے
تار ڈاک دیو تار بُوکے نشچیہ باجی بے رے
کی شیل ماری لی بھائی تیر انداز رے!"

"جب میرا بچہ بھوک سے تڑپ اُٹھے گا۔ "ماں! ماں!" کہہ کر روئے گا۔ اُس کی پکار دیوتاؤں کے دلوں میں گونج اٹھے گی۔ کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تو نے، او بھائی تیر انداز!"

"شِنگیر شنگی را بھائی!
کوئی او ہر بنار بٹھائیں
دُودھیر شِشُو راکھی تے جتنے رے!
کی شیل ماری لی بھائی تیر انداز رے!"

"او میرے ساتھیو اور بھائیو! (میرے) ہرن سے کہنا کہ وہ دودھ پیتے بچے کو جتن سے پالے پوسے۔ کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تو نے او بھائی تیر انداز!"

"جنمیر منو دیکھا شُنا
بلو تارے آر ہو بے نا
پُھرائی لو شکل شادھ شکاری بانے رے
کی شیل ماری لی بھائی تیر انداز رے!"

"جنم بھر درشن اور بات چیت اب پھر نہ ہو گی۔ اُسے بتا دینا (لواب) خاتمہ ہوا سب اُمنگوں کا کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تو نے او بھائی تیر انداز!"

"کون نہ کالا رے
اے شیل گردی لو رے؟
تار جش ہوک ہر جش رے
کی شیل ماری لی بھائی تیر انداز رے!"

"کس لوہار نے بنایا تھا یہ تیر؟ اس کا خاندان بغیر اولاد کے ہی مٹ جائے، کیسے تیکھے تیر سے تو نے مجھے گھائل کر دیا ہے، او بھائی تیر انداز!"

مجھے یہ گیت بہت پسند ہے۔ کسانوں کی زندہ اور روشن شاعری کا، جو ہندوستان کے ہر صوبے میں صدیوں سے گونج رہی ہے۔ یہ ایک اچھوتا نمونہ ہے۔ ہرنی کے بول بہت جچے تلے ہیں۔ شکاری، جو اُسے گھائل کر دیتا ہے، کچھ جواب نہیں دیتا۔ ہرنی اسے طنزاً "او بھائی تیر انداز!" کہہ کر شرمندہ کرتی چلی گئی ہے۔ ہرنی کی زبان نہیں بولتی، دل بولتا ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ تیر بنانے والا لوہار کچھ کم ظلم نہیں کرتا۔ گیت کے آخری بند میں ہرنی اپنا سارا غصہ اُسی پر نکالتی ہے۔

صحیح بات تو یہ ہے کہ ہرنی کی پکار میں عوام کی آپ بیتی گونج اُٹھی ہے۔

---

[1] ۱۹۰۵ء میں درگا داس لاہڑی نے "بانگالیر گان" (بنگالی گیت) نام کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا۔ اس کتاب کا ایک باب ہے "رکشر کورگان" (رانبڑھ شاعر کے گیت) اسی میں اس گیت کو جگہ دی گئی۔ یہ گیت ترپُورا سے ملا تھا۔

مجھے یاد ہے ایک کسان نے کہا تھا "میری بیٹا گھائل ہرنی کی بیٹا ہے اور جب تک ہم کسانوں کا مانس ہرنی کے مانس کی طرح لذیذ رہے گا۔ زمیندار بابو ہم پر یہ تیر چلانے سے باز نہیں آئے گا۔"

دوسرا گیت اُراؤں لوگوں کا ہے جو چھوٹا ناگ پور میں آباد ہیں۔

۱۔ "ایکا ترتی ہرنی ہرچا؟
ماٹھا مولی نوں راہچا۔"
پورب ترتی ہرنی ہرچا
ماٹھا مولی نوں راہچا۔

۲۔ ایکا ترتی سکاریس ہرچیس؟
ہرنی تیر فی نوچیس
پچھم ترتی سکاریس ہرچیس
ہرنی تیر تی نوچیس۔

۳۔ سکاریس گالو چیس
ہرنی ہی پو چھرین نوچیس
ہرنی کا بونگا گیرا
ہائے ادین ابثوندا دکھو نجا۔"

"(۱) کس طرف سے ہرنی آئی؟ وہ آم کے پیڑ تلے کھڑی ہے، پورب کی طرف سے ہرنی آئی۔ وہ آم کے پیڑ تلے کھڑی ہے۔ (۲) کس طرف سے شکاری آیا؟ اُس نے ہرنی کے تیر مارا، پچھم کی طرف سے شکاری آیا۔ اس نے ہرنی کے تیر مارا (۳) شکاری نے ہرنی کی دُم پر تیر مارا۔ ہرنی بھاگ گئی۔ ہائے! اُسے کتنا دکھ ہوا۔"

یہ گیت کرما ناچ کا ہے۔ ہر ایک بند کی دوسری اور چوتھی سطر دوبار گائی جاتی ہے۔ انتہا درجے کی خوشی میں اُراؤں لڑکے اور لڑکیاں اپنے قومی ناچ میں شریک ہوتے ہیں مگر یہ ضروری نہیں کہ اُن کے سب کے سب کرما گیت خوشی کے ترجمان ہوں۔ کتنے ہی گیتوں میں، جیسا کہ اس گیت میں بھی ہے، وہ اپنی مصیبتوں کے سیدھے سادے مگر تاثیر میں ڈوبے ہوئے جذبات بیان کرتے ہیں جن پر اُن کے اپنے لہو کے داغ دیکھے جا سکتے ہیں۔

تیسرا گیت راجپوتانے سے ملا ہے۔

"مرگے بنا مرگی ایکلڑی!
مرگو چھوڑ گیو بن کھنڈ مائیں مرگی نے ایکلڑی۔
ہرگے نے ڈھونڈن مرگی نیسری
ڈھونڈیو ڈھونڈیو بن کھنڈ چھان
مرگے بنا مرگی ایکلڑی
مرگو چھوڑ گیو بن کھنڈ مائیں مرگی نے ایکلڑی!"

"ہرن کے بغیر ہرنی تنہا ہے۔ اس جنگل میں ہرن ہرنی کو تنہا چھوڑ گیا۔ ہرنی ہرن کی تلاش میں نکلی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے سارا جنگل چھان مارا۔ ہرن کے بغیر ہرنی اکیلی ہے۔ اس جنگل میں ہرن ہرنی کو اکیلے چھوڑ گیا!

"کٹھیں نہ لادھیو ظلمی مرگو
ڈھونڈیا ڈھونڈیا ران کمان
مرگے بنا مرگی ایکلڑی
مرگو چھوڑ گیو بن کھنڈ مائیں مرگی نے ایکلڑی!"

"کہیں نہ ملا وہ ظالم ہرن۔ بار بار اُس نے وہ جنگل بیابان چھان مارا ہرن کے بغیر ہرنی اکیلی ہے۔ ہرن اس جنگل میں ہرنی کو اکیلے چھوڑ گیا!

"ڈھونڈت ڈھونڈت مرگی تھک گئی۔
ب کے آنکھیاں آنسو جان،
مرگے بنا مرگی ایکلڑی۔
مرگو چھوڑ گیو بن کھنڈ مائیں مرگی نے ایکلڑی!"

"ڈھونڈتی ڈھونڈتی ہرنی تھک گئی۔ آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ ہرن کے بغیر ہرنی اکیلی ہے۔ ہرن اس جنگل میں ہرنی کو اکیلے چھوڑ گیا!

کھائے تیر دالو مرگی ڈھے پڑی
کوئی یو دکھ سہیو نہ جائے۔
مرگے بنا مرگی ایکلڑی
مرگو چھوڑ گیو بن کھنڈ مائیں مرگی نے ایکلڑی!"

"چکر کھا کر ہرنی گر پڑی۔ یہ دکھ برداشت نہیں ہوتا۔ ہرن کے بغیر ہرنی اکیلی ہے۔ ہرن اس جنگل میں ہرنی کو اکیلے چھوڑ گیا۔

کون جانے ہرن کہاں چلا گیا تھا؟ ضرور اُسے کسی شکاری نے مار ڈالا ہوگا۔ شروع سے اخیر تک یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہرنی دراصل کوئی گاؤں کی عورت ہے۔

چوتھا گیت پنجاب کا ہے ——

"نہ ماریں میرے ہرن نوں ساڈی ہستی ہو جاؤ دار۔
مار وے راجیا ہرنیاں بھاویں لکھ دو لکھ بھاویں چار!"

"میرے ہرن کو نہ مارنا۔ ہماری قطار سونی جائے گی۔ راجہ! ہم

برہنوں کو مارلے، ایک دو چاہے چار۔

یہ گیت نامکمل ہے۔ یہ ہرنیاں راجپوتانے کی "ہرنی" کی بہنیں ہی تو ہیں۔ یہ گیت مصیبت زدہ لوگوں کے آنسوؤں سے پیدا ہوتے ہیں ان میں ایک اپنی ہی قسم کا سوز ہے جس کا تعلق دل سے ہے اور جو ساری فضا میں سما جاتا ہے۔

پانچواں گیت بندھیل کھنڈ (وسط ہند) کا ہے۔

"موئے مارلے جاؤ ہمائے ہرنے جن مارو!

چریں پیلے کے کھیت ہمائے ہرنے جن مارو!

کون دِس کے ہو گئے سکاری، کون دس کے ہو گئے بہیلیا؟

کون دس کو جاؤ ہمائے ہرنے جن مارو!

اگم دسا کے ہیں گے سکاری پچھم دسا کے ہیں گے بہیلیا،

پورب دسا کو جائیں ہمائے ہرنے جن مارو!

کاسے کی ڈوری کاسے کی تاتیں؟

کاسے کی ڈوری لگاؤ ہمائے ہرنے جن مارو!

لوہے کی کھنٹیاں تانت کی تانیں۔

ریشم کی ڈوری لگائیں، ہمائے ہرنے جن مارو!

مجھے مارلے جاؤ۔ ہمارے ہرن کو نہ مارو۔ ہم تو اپنے پیلے کے کھیت میں چرتے ہیں۔ ہمارے ہرن کو نہ مارو کس سمت کے شکاری ہو؟ کس سمت کے بہیلیا[۵] ہو؟ کس سمت کو جا رہے ہو؟ ہمارے ہرن کو نہ مارو۔ آگے کی سمت کے شکاری ہو پچھم کے بہیلیا ہو۔ پورب کی طرف جا رہے ہو۔ ہمارے ہرن کو نہ مارو۔ کس چیز کی کھونٹیاں ہیں؟ کس چیز کی تانتیں ہیں؟ ہمارے ہرن کو نہ مارو۔ لوہے کی کھونٹیاں ہیں آنت کی تانتیں ہیں۔ ہمارے ہرن کو مت مارو،

چھٹا گیت بھی بندھیل کھنڈ کا ہے۔

اُرے پاہردی! مان لے میری بات

پاہردی! مان لے میری بات

جب میں پاہردی پھانسی روپی

چونسٹھ کھُنٹیاں گاڑیں

ہرنی کُود بغل بھئی ٹھاڑی

ہرن کو بیدھو پاؤں

رام جی! ہرن کو بیدھو پاؤں!

"ارے شکاری! میری بات مان لے۔ شکاری میری بات مان لے جب شکاری نے پھندا لگایا (اُسی نے) چونسٹھ کھونٹیاں گاڑیں، ہے رام! چونسٹھ کھونٹیاں گاڑیں ہرنی کود کر ایک طرف کو جا کھڑی ہوئی۔ ہرن کا پاؤں پھنس گیا او بھگوان! ہرن کا پاؤں پھنس گیا۔

"ٹھاڑی ہرنیا جو سمجھا رئی ——

سنو پاہردی بات

موئے مار میرو پیا کے چھوڑ دے

ہوئیں نہ چونسٹھ رانڈ

پاہردی! ہوئیں نہ چونسٹھ رانڈ!"

ہرنی کھڑی ہوئی یہ سمجھا رہی ہے —— او شکاری! میری بات سُن۔ مجھے مار ڈال۔ میرے پیا کو چھوڑ دے تاکہ ہم چونسٹھ (ہرنیاں) رانڈ ہونے سے بچ جائیں۔ او شکاری! چونسٹھ (ہرنیاں) رانڈ ہونے سے بچ جائیں۔

"ٹھاڑی ہرنیا آنسو ڈھارے۔

سُن ہرنا موری بات

تم تو بیدھے جا پھندا ایں۔

میرو کون حال؟

ہرنا! میرو کون حال؟"

ہرنی کھڑی ہوئی آنسو گرا رہی ہے —— او ہرن! میری بات سُن تُو تو اس پھندے میں پھنس گیا۔ میرا کیا حال ہوگا؟ او ہرن! میرا کیا حال ہوگا؟

"ٹھاڑو ہرنا جو سمجھا ریو

سُنو ہرنیا بات ——

باکے گھر کو خرچ بڑھانو

بیچ کھان دے ماس

ہرنیا! بیچ کھان دے ماس!"

ہرن کھڑا ہوا یہ سمجھا رہا ہے۔ ہرنی! میری بات سُن۔ اُس کے گھر کا خرچ بڑھ گیا ہے۔ اُسے میرا مانس بیچ کر گذارا کر لینے دے ہرنی! اُسے میرا مانس بیچ کر گزارا کر لینے دے!

"اِتنی سُن کے چلے پاہردی

پھانسی ڈاری کاٹ

ٹھاڑی ہرنیا آنسو ڈھارے ——

[۵] بہیلیا: شکاری

جوڑی ملائی بھگوان

پاہردی! جوڑی ملائی بھگوان!

" اتنی بات سن کر شکاری آگے بڑھا۔ اس نے پھندا کاٹ ڈالا۔ ہرنی آنسو گرا رہی ہے۔ (کہتی ہے)، بھگوان نے (پھر سے) جوڑی ملا دی۔ شکاری! پھر سے جوڑی ملا دی!

یہ وہ گیت ہیں جن میں عہدِ ماضی کی تصویریں محفوظ ہیں۔ ماضی بھی ایک آئینہ ہے جس میں ہم انسانی سیرت کی ارتقائی حالتوں کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ اس کے بغیر یہ فیصلہ کرنا کہ ہم اب تک کہاں پہنچے ہیں، ممکن نہیں۔

جنہوں نے بُدھ مت کی "جاتک" کہانیوں کا مطالعہ کیا ہے انہیں "سون مگ جاتک[1]" کی یاد آگئی ہوگی۔ کہانی بتلاتی ہے کہ ایک بار کسی پچھلے جنم میں مہاتما بدھ ایک سنہرے ہرن کے روپ میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک دن کسی شکاری نے جال لگایا۔ باقی سب ہرنیاں اور ہرن بھاگ کھڑے ہوئے مگر ٹولی کا سردار یعنی وہ سنہرا ہرن خود جال میں پھنس گیا —— اُس کی رفیقۂ حیات دوڑی ہوئی آئی۔ بولی "تیرے بغیر اب میں کیسے زندگی کے دن گزاروں گی؟" ہرن بولا "میں بہت زور لگا چکا کہ پھندے سے چھوٹ جاؤں مگر تانت میرے پاؤں میں دھنستی چلی جا رہی ہے۔" ہرنی کہنے لگی "فکر نہ کرو میں تمہیں بچالوں گی"۔ پھر جب شکاری نزدیک آتا دکھائی دیا، وہ بولی "شکاری! مجھے تم خوشی سے مار ڈالو لیکن میرے سنہرے ہرن کو چھوڑ دو ... یا دھرتی پر پتوں کا بستر بچھا دو جس پر ہم گر پڑیں۔ میان سے تلوار نکال کر پہلے میری گردن کاٹ لو، پھر میرے خاوند کی!" شکاری چکر میں پڑ گیا۔ سوچنے لگا آدمی بھی یوں اپنے آقا کے لئے جان دینے سے کترا جاتا ہے .... اور تعجب تو یہ ہے کہ یہ ہرنی انسان کی زبان بول رہی ہے۔ شکاری نے ہرن کو آزاد کر دیا ہرن نے خوش ہو کر اُسے ایک لعل دیا جو کہ اُسے چراگاہ میں پڑا ہوا ملا تھا۔ اور جیسے اُس نے اپنے گھر میں چھپا رکھا تھا۔ اس نے شکاری کو یہ تلقین کی کہ وہ اس سے اپنے بیوی بچوں کی پرورش کرے اور شکار کا پیشہ چھوڑ دے۔

ممکن ہے "جاتک" کہانی کی پیروی میں ہی بندھیلکھنڈ کے کسانوں نے اپنے ان دونوں گیتوں کی تخلیق کی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود جاتک کہانی نے دیہاتی گیتوں کی پیروی کی ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ بندھیلکھنڈ ی گیتوں کی زبان بہت پرانی معلوم نہیں ہوتی۔ گیتوں کے جذبات ان کی زبان سے کہیں زیادہ پرانے ہوتے ہیں۔ کیونکہ وقت کے ساتھ پرانے گیتوں کی زبان بدلتی رہتی ہے۔ جاتک کہانیوں کے متعلق بعض عالم یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ وہ شروع میں عام دیہاتی کہانیاں تھیں اور گیتوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جو ان کہانیوں میں پروئے ہوئے ہیں۔ دیہاتی گیتوں سے لئے گئے تھے۔

ساتواں گیت کوندھ لوگوں کا ہے جو کہ گنسور او دے گری (مدراس پریزیڈنسی) میں آباد ہیں ——

"ایڑا اینوں گوڑی ریدی گنا، او پلا مبا گٹاتی!

او پلا مبا گٹاتی، او پلا مبا گٹاتی!

آنز گوسا تانگی ڈیگا نائیں، او پلا مبا گٹاتی!

گاڑیگی سولاتی ای، او پلا مبا گٹاتی!

ایڑا اینوں گوڑی ریدی گنا، او پلا مبا گٹاتی!"

شکاری! تم مجھ پر تیر چلاؤ گے؟ شکاری، او شکاری! جنگل میں دوڑتی ہوئی شکاری، میں گھاس چرودں گی، ارے او شکاری! شکاری، کیا تم مجھ پر تیر چلاؤ گے؟

آ تو نائیں میڈا آنا نائیں ہی نے اَدنے ترے ای مل!

ایڑا اینوں گوڑی دی دی گنا او پلا مبا گٹاتی!

آنوں ٹارڈا تانی کوری، او پلا مبا گٹاتی!

اینوں نلں گی ہتجادی گنا او پلا مبا گٹاتی؟

اپنے بچے کو ساتھ لئے اِدھر اُدھر گھوموں گی۔ شکاری! تو مجھ پر تیر چلائے گا؟ مجھ ہرنی پر تیر چلائے گا، ارے او شکاری؟ مجھے تیر سے مار ڈالے گا، او شکاری! میں دھرتی پر سو جاؤں گی، او شکاری! مجھے کھا جائے گا کیا، ارے او شکاری!

جذبات و احساسات کی کہانی، جو لوگوں کے نسل در نسل چلے آنے والے گیتوں میں پائی جاتی ہے، سطحی امتیازات سے بہت کم متاثر ہوتی ہے زبانیں الگ الگ ہیں۔ بات کہنے کا ڈھنگ بھی مختلف ہے مگر الگ تھلگ علاقوں کی ذہنی یگانگت صاف ظاہر ہے۔ مصیبت کی ماری کوندھ عورت بھی خود کو اُس ہرنی سے تشبیہہ دیتی ہے جو بے قصور ہی شکاری کے تیر سے گھائل ہو کر ہمیشہ کی نیند سو جاتی ہے اور اس کے بعد شکاری اُس کے جسم کا ماس خود کھائے یا کسی کو کھلائے اِس سے ہرنی کی موت میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ہاں، موت سے پہلے ہرنی کے دل میں یوں سوالات کا اُٹھنا اس کی بیدار مغزی کا ثبوت ہے۔

آٹھواں گیت یوپی کے دیہات میں گایا جاتا ہے۔

[1] دیکھئے "سون مگ جاتک" جو کہ کیمبرج یونیورسٹی پریس کی شائع کردہ The Jataka کتاب ۵، نمبر ۳۹ میں ہے گی پروفیسر ای۔ بی۔ کیول نے یہ کہانیاں بڑی محنت سے مرتب کی ہیں۔

۱۔ چھاپک پیڑ چھیولیا

تو پت دن گہہ بر

ارے رلا تھی ترنٹھاڑھی ہرنیاں

ت من اتی ان منی ہو!

۲۔ چرتے چرت ہرنواں

تو ہرنی سے پوں چھئی ہو۔

ہرنی کی تو رچرنا بھران

کی پانی بن مرجھی اُدہو!

۳۔ نہیں مور چرنا بھران

نہ پانی بن مرجھی اداس ہو۔

ہرنیا! آج راجہ جی کے چھٹی

تو ہیں ماری ڈرین ہو!،

۴۔ مچیے بیٹھی کوشیلا رانی

ہرنی ارج کرئی ہو ـــ

رانی! مسوداتو سجھ میں رسوئیاں

کھلریا ہمیں دیتی اُد!

۵۔ پیڑ واسے ٹنگ بی کھلریا

ت من سمجھا اُب ہو۔

رانی! پھیری پھیری دیکھ بی کھلریا

جنک ہرنیا جیتی ہو!،

۶۔ جاہُو ہرنی گھر اپنے

کھلریا نا ہیں دیبی ہو

ہرنی! کھلری ک کھنجڑی مڑھیبئی

تہ راما مور کھیل ہیں ہو!

۷۔ جب جب باجئی کھنجڑیا

سبد سُنی اُن کئی ہو

ہرنی ٹھاڑھی ڈھنکولیا کے نیچے

ہرن ک بسورئی ہو!

(۱) ڈھاک کا چھوٹا سا پیڑ ہے ایک گھنے پتوں سے لہلہاتا ہوا۔ اُس کے نیچے ایک ہرنی کھڑی ہے سرام! اس کا من بہت اداس ہے۔

(۲) چرتے چرتے ہرن نے پوچھا: ہرنی! چراگاہ سوکھ گئی ہے کیا؟ یا پانی کے بغیر مرجھا گیا ہے (تیرا من)؟

(۳) نہ میری چراگاہ سوکھی ہے نہ پانی کے بغیر مرجھایا ہے (میرا من)۔ ہرن! آج راجہ کے (بیٹے کی) چھٹی ہے۔ آج (راجہ کے شکاری)، تجھے مار ڈالیں گے،

(۴) رانی کوشلیا مچیا پر بیٹھی ہے۔ ہرنی عرض کر رہی ہے ـــ رانی! (میرے ہرن کا) مانس تو تمہاری رسوئی میں پک رہا ہے (ہرن کی) کھال مجھے دلوا دو۔

(۵) یہ کھال میں پیڑ سے ٹانگ دوں گی۔ گھوم پھر کر اُسے، دیکھا کروں گی۔ رانی! دیکھ دیکھ کر اپنے من کو سمجھاؤں گی جیسے ہرن جیتا ہو!

(۶) ہرنی! جا اپنے گھر کو چلی جا۔ یہ کھال میں نہ دوں گی۔ اس سے تو ڈفلی مڑھاؤں گی (میرا) رام اس سے کھیلا کرے گا۔

(۷) جب جب ڈفلی بجتی ہے (اُس کی) آواز سُن کر ہرنی کان کھڑے کر لیتی ہے۔ ڈھاک کے نیچے کھڑی ہو کر ہرنی ہرن کی یاد میں کھو جاتی ہے!

یہ چھوٹا سا گیت المیہ شاعری کے کسی بھی شاہکار سے ٹکر کھا سکتا ہے اسے "سوہر" گیتوں کی برادری میں جگہ ملی ہے۔ بیٹے کے جنم کی خوشی میں یہ کیوں گایا جاتا ہے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بہت ممکن ہے کہ گلی محلے کی عورتیں خوشی کی مستی میں اس گیت کے غمناک پہلو کی طرف توجہ نہ دیتی ہوں۔ مگر کوئی عورت تو ایسی بھی ہوتی ہوگی، جسے ہرن کی دردانگیز کہانی میں اپنی زندگی کا سارا غم نظر آجاتا ہوگا۔

کوشلیا اور رام کے نام اس گیت میں کیوں پروئے گئے ہیں۔ اس کی تشریح آسان نہیں۔ تاریخی ناموں کو عام گھریلو زندگی کی دھرتی پر لا بٹھانے کا رجحان بہت پرانا معلوم ہوتا ہے۔ دیہات میں گھر گھر ساس اور سسر میں کوشلیا اور دشرتھ کا تصور کیا گیا ہے۔ پھر ہر ماں اپنے بچے میں رام کی تصویر دیکھ لے، یہ کوئی اَن ہونی بات نہیں۔ ہر صوبے میں گھریلو زندگی کے گیتوں میں رام، سیتا اور لکشمن تو کسانوں کی زندگی میں بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ مگر اس گیت میں بے رحم عورت کے روپ میں کوشلیا کا تصور ایک نامناسب رجحان کا ترجمان ہے۔

پنڈت رام نریش ترپاٹھی نے لکھا ہے ـــ "ہرنی ہرن کی کھال اس لئے مانگتی تھی کہ وہ اُسے دیکھ دیکھ کر دل کو ڈھارس دے گی اور ہرن جیتا ہے، اس وہم کو سچ سمجھ کر ایک فرضی سکھ محسوس کرے گی۔ کتنی ہی ایسی عورتیں ہیں، جو اپنے مرحوم خاوند یا بیٹے کی چیزیں بڑی حفاظت سے رکھ چھوڑتی ہیں۔ اور

ا؎ ایک قسم کی پیڑھی۔

تنہائی میں انہیں دیکھ دیکھ کر ایک خاص قسم کا سُکھ محسوس کیا کرتی ہیں۔ آخر ہرن کی کھال کی کھنجری بنی۔ کھنجری جب بجتی تھی، تب اُس کی آواز سے ہرنی کے دل میں محبت کی کہانی جاگ اُٹھتی تھی . . . . گیت کی ہرنی کی خاموش تڑپ انسان کے دل کو ہلا دینے والی ہے۔ یہاں ہرنی کے بہلانے سے کسی عورت نے اپنی ہی تصویر لاکر کھڑی کر دی ہے۔"[سلے]

نواں گیت بھی یو۔پی کا ہے ــــــ

یہ بھی "سوہر" گیت ہے۔ پھر ایک بار ہم ایک ہرنی کا من اُداس پاتے ہیں سیتا گربھوتی ہے۔ آج سیتا کے بیٹا ہوگا۔ اس خوشی میں ہرنی کے پیارے رفیقِ حیات کو لکشمن ڈھونڈنے آئے گا۔ اور راجا کا شکاری ہرن کو مار ڈالے گا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ہرنی کوشلیا کے پاس جاکر ہرن کی جان بخشوا لینی ہے۔ یہاں کوشلیا کی زبان سے جو لفظ کہلوائے گئے ہیں، ہمدردی اور خلوص سے لبریز ہیں ــــــ

چھوٹ موٹ پیڑ دا ڈھیکو لیا

ت پتوا رے لہالہی ہو۔

راماتا ہاتر ٹھاڑھی ہرنیا

ہرن باٹ جوہتی ہو۔"

'چھوٹا موٹا ڈھاک کا ایک پیڑ ہے۔ وہ پتّوں سے لہلہا رہا ہے۔ ہے رام! اُس کے نیچے ہرنی کھڑی ہے۔ وہ ہرن کی راہ دیکھ رہی ہے۔

'بن ہیں سے نکلے لا ہرنیا

ت ہرنی سے پوچھے ہو ــــــ

'ہرنی! کاہے تور بدن ملین

کاہے منہ پی ار ہو؟'

'جنگل سے ہرن نکلا۔ اُس نے ہرنی سے پوچھا ــــــ ہرنی کس لئے تیرا چہرہ اداس اور پیلا پڑ گیا ہے؟

"گئی لوں ہیں راجہ کے داریا

ت بتیا سُن آئی لیں ہو۔

پیارے آجو چھوٹے راجا ک بہیلیا

ہرن مروتی ہیں ہو!"

"راجہ کے دروازے پر گئی تھی، وہاں سے بات چیت سُن آئی ہوں پیارے! آج چھوٹے راجہ اپنے شکاری سے ہرن کو مروا ڈالیں گے!

"کیئی جے بگیا لگوُلے؟

[سلے] کونیا کومدی ڈگرم گیت"

کیئی رے آئے ڈھنڈے ہو؟

ہرنی کے کر دھنیا گربھ سے

ہرن مروا دلے ہو؟"

'کس نے باغ لگوایا؟ کون (مجھے) ڈھونڈنے آیا؟ ہرنی! کس کی جوان بیوی گربھوتی ہے کہ ہرن کو مروا دیں گے؟

"دشرتھ بگیا لگولیں

لکھن آئے ڈھونڈلے ہو!

پیارے رگھوبر دھنیا گربھ سے

ہرن مروا دے ہو"

'دشرتھ نے باغ لگوایا۔ لکشمن (تجھے) ڈھونڈنے آیا۔ پیارے! رام چندر کی جوان بیوی گربھوتی ہے (اُسی کے لئے) ہرن کو مروا ڈالیں گے'

"کر جوڑی ہرنی عرج کرے۔

سُن کوشلیا رانی ہو!

رانی سیتا کے ہوئی ہیں نندلال

ہم ہی کچھ دی ہیب ہو"

'ہاتھ جوڑ کر ہرنی عرض کر رہی ہے ــــــ سُنو، کوشلیا رانی! آج رانی سیتا کے بیٹا ہوگا۔ مجھے کچھ دو۔'

"سونوا مڑھی لوں دُہو سنگوا

بھوجنوا تِل چاؤر ہو

ہرنی بھگتوا جودھیا کے راج

نسھے بن بیچ رہو ہو!"

'سونے سے مڑھاؤں گی (تیرے ہرن کے) دونوں سینگ! کھانے کو دوں گی، تل اور چاول۔ ایودھیا کے راج (کا) سکھ بھوگ، ہرنی! اور بے فکر ہوکر جنگل میں گھوم پھر'

ہرن بچ گیا یہی کافی ہے۔ ہرن کے سینگ سچ مچ سونے سے مڑھائے گئے تھے یا نہیں، اس کی ہمیں پروا نہیں۔ ایک گہرا احساس جو کوشلیا کے لفظوں میں موجود ہے، ہمیں یہ یقین دلاتا ہے کہ زندگی میں رحم اور ہمدردی نے اپنی جگہ بالکل ہی گنوا نہیں دی۔ کمینگی اور تنگدلی کا گھیرا تو ہے۔ مگر زندگی کے کیچڑ سے بھی ایک کنول کھِل اٹھتا ہے، جس کی خوشبو سے آدمی کی زندگی میں ایک احترام، ایک بلند پایہ جذبہ، جس سے متاثر ہوکر ہم تمام جانداروں کے درمیان ایک خاص قسم کی یگانگت محسوس کرتے

ہیں یہ بیدار ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کے مختلف صوبوں کی دیہاتی زبانوں کا اضافی مطالعہ بہت اہم ہے۔ اُن صوبوں میں بھی، جہاں ہندو آبادی زیادہ ہے یا جہاں کی زبانوں میں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں، کتنے ہی فارسی اور عربی الفاظ بھی موجود ہیں۔ بار بار مجھے یہ محسوس ہوا ہے کہ زبان کے متعلق ہمارا تعصب سرے سے سطحی اور بناوٹی ہے۔ لوگ یہ دیکھ کر کسی لفظ کا استعمال نہیں کرتے کہ اُس کا حسب نسب، جنم استھان یا مذہب کیا ہے، بلکہ ہر لفظ اُن کی زبان پر اُسی طرح آتا ہے، جیسے دھرتی پر کوئی پودا اُگتا ہے

تلاش کرنے پر ہرنی کے گیت دوسری زبانوں میں بھی مل جائیں گے ..... ہندوستان کے طول و عرض میں ہرنی کی پکار گونج رہی ہے، مگر سوال تو یہ ہے کیا ہمارا وطن یوں ہی بیکس رہے گا؟ کیا ہماری قوم یوں ہی مُنہ بسورتی رہے گی؟ "شکاری بھائی" کب تک اس کا پیچھا کرتا رہے گا؟ کب ناچے گی ہرنی خوشی میں آکر؟ ......

دیوندر ستیارتھی

[illegible]

[illegible] لکھنوی

گاؤں کی رات

چار سو جلوہ فگن خاموش ظلمت کے چراغ
وحشتِ ادراکِ غم سے سینۂ انجم میں داغ
زلفِ شب مارِ سیہ کی طرح سرتاپا غضب
ہاں مگر سلطانِ صحرا بوم کا دل باغ باغ
آہ! یہ بستی ہے یا تاریک زندانِ مہیب
ستمِ قاتل سے جہاں بھرپور ہستی کا ایاغ
اک بلائے ناگہانی ذرّہ ذرّہ کو محیط
اُلفتِ کرب و بلا زیبائشِ حُسنِ فراغ
دولتِ گم گشتگی ہر کاروانِ عقل و ہوش
شعلہ ساماں منزلِ حُسن و محبت بے سراغ
ہر فغانِ نیم شب اک شعلۂ مینا نشیں
کیوں نہ ہو صد چاک شاعر کا دلِ وحشی دماغ

رفعت ہاشمی

ایک غزل اور ایک نظم

غزل

پیمانۂ حیات کو بھرتا چلا گیا
میں کام عمر بھر یہی کرتا چلا گیا

رکھی نہ جب کوئی خلش و خندہ سے غرض
مثلِ صبا چمن سے گذرتا چلا گیا

خونِ دل و جگر سے لیا کام رنگ کا
کب نقشِ زیست یونہی اُبھرتا چلا گیا

جب اُس کے روبرو رہا آئینۂ جمال
دل مثلِ زلفِ یار سنورتا چلا گیا

اک اک قدم کے اُٹھنے سے کٹتا گیا سفر
جینے کے ساتھ ساتھ ہی مرتا چلا گیا

ہیں بے نیازِ سُود و زیاں عشق باز یاں
میری یہی تھی جیت کہ ہرتا چلا گیا

آخر میں سمجھ ہی گیا زندگی کا راز
جب ہر ادائے ناز پہ مرتا چلا گیا

امینِ حزیں

انتظار

شفق کے نور سے روشن ہے کہسار اب بھی
کھڑا ہے سامنے وادی میں اک چنار اب بھی
اُسی سرور سے بہتے ہیں کوہ کے چشمے
سنہری چاند سے راتوں کو کیف بار اب بھی
سحر کو ار لیتے ہیں اب بھی کسان کے نغمے
شرارِ شب سے چمکتے ہیں رہگزار اب بھی
وہی پہاڑ پہ ریوڑ بھری چراگاہیں
وہی طیور سے آباد شاخسار اب بھی
چناری اب بھی رواں ہے اُسی ترنم سے
بکھیرتی ہیں فضائیں وہی خمار اب بھی
اُسی حیات پہ قائم ہے جھیل کا منظر
حریم کوہ میں بستا ہے اک دیار اب بھی
کسی پہاڑی حسینہ کے انتظار میں یاں
سنہری رات کو آتا ہے اک سوار اب بھی

. . . .

رہینِ دردِ محبت رہے شباب کے دن
تمام روح کی دنیا ہے سوگوار اب بھی
تری حیات میں ملتے تھے اس چٹان پہ ہم
اِسی مقام پہ کرتا ہوں انتظار اب بھی

فضل حسین کیفی

دُعا

دن رات دعائیں مانگتا ہوں مگر بے کار! منتریں پڑھتا ہوں اور دامن پھیلا پھیلا کر خدا کے سامنے گڑگڑاتا ہوں، لیکن سب بے سود۔

آرزوئیں پامال ہیں اور تمنائیں ناکام! زندگی محرومیوں اور بے نصیبیوں کی ایک داستان ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتی "دعا" نے "اثر" کے ساتھ ایک مستقل دشمنی ٹھان رکھی ہے۔

پھر یہ نہیں کہ کبھی دعا قبول ہی نہیں ہوئی۔ ہوئی ہے اور بارہا ہوئی ہے۔ اور ایک دفعہ تو ایسی ہوئی ہے کہ ..... بس اب کیا کہوں! خدا کی شان بڑی ہے! وہ چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اُس کی رحمت جوش میں آجائے تو بگڑے کام خود بخود بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ اُسی کا ابرِ کرم تھا جس نے ایک دفعہ میری بیکسانہ دعاؤں پر اثر کی بارشیں کر دی تھیں، اور عاجزانہ التجاؤں پر قبول و پذیرائی کے دروازے کھول دیئے تھے۔ میں اپنے معبود کی اُس بے پایاں بندہ نوازی کو عمر بھر دل سے نہیں بھلا سکوں گا۔

میں اُس وقت تیرہ چودہ سال کا ایک نحیف، کمزور اور ناتجربہ کار لڑکا تھا۔ اس عمر کے لڑکے عام طور پر اچھے خاصے ہوشیار ہوتے ہیں لیکن میں ایسا نہ تھا۔ دسویں جماعت میں پڑھتا تھا اور سب سے اچھا طالب علم خیال کیا جاتا تھا۔ مگر وہ ہوشیاری اور عیاری جس کو ذرا نرم لفظوں میں دنیاوی سوجھ بوجھ کہہ سکتے ہیں۔ مجھ میں نام کو بھی نہ تھی۔ اس کی وجہ کچھ تو میری وہ فطری سادہ لوحی تھی جس نے اب تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا ہے، اور کچھ وہ حالات جن کے ماتحت میں نے تربیت پائی تھی۔ میں (بقول کسی کے) بھونرے میں پلا تھا۔ زندگی کے تیرہ چودہ سال گھر کی چار دیواری کے اندر گزار دیئے تھے۔ الٰہ آباد کے صرف دو چار محلوں اور بازاروں سے واقف تھا۔ بہادر گنج میں رہتا تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ دارا گنج کہاں ہے اور لوکر گنج کدھر ہے۔ پڑوس میں رہنے والے لڑکوں سے ملنے جلنے کی اجازت نہ تھی۔ نہ اسکول کے ساتھیوں کے ساتھ کہیں آجا سکتا تھا۔ غرضکہ میری دنیا بہت محدود تھی اور اس محدود دنیا کے باہر جو لامحدود دنیا ادھر سے اُدھر تک پھیلی ہوئی تھی، اُس سے میں بالکل بیگانہ تھا۔ اگر کبھی بھولے بھٹکے گھر سے ذرا دُور نکل جاتا تو ایک نامعلوم سی ہیبت دل پر طاری ہو جاتی اور سڑک پر چلنے والا ہر شخص ایک ہوّا معلوم ہوتا۔

تو یہ تھا میں اُس وقت جب میری عمر تیرہ چودہ سال کی تھی۔ اس سے کوئی دو سال پہلے، یعنی جب میں گیارہ بارہ برس کا تھا اور آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا، تو ایک مرتبہ اپنے نانا کے ساتھ بنارس گیا جہاں میری ایک بیوہ خالہ رہتی تھیں۔ اُن کو مرے ہوئے اب دس سال سے اوپر ہوتے ہیں، لیکن میرے دماغ کے کسی گوشے میں اُن کی آنکھوں سے مسلسل ٹپکنے والے آنسوؤں کا منظر اب بھی ایک دردناک یاد بن کر محفوظ ہے۔ یعنی اُن کی آنکھوں کو ہمیشہ آنسوؤں سے تر دیکھا۔ وہ رونے کی اس قدر عادی ہو چکی تھیں کہ مجھ سے بات کریں تو محض احساس محبت سے بھی اُن کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ میں نانا کے ساتھ بنارس گیا تھا وہ مجھے بنارس پہنچا کر کہیں اور جگہ چلے گئے اور چند روز بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ میں بنارس سے الٰہ آباد واپس کس کے ساتھ جاؤں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس وقت جب یہ مسئلہ درپیش تھا۔ خالہ نے میری بلائیں لیں اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "میرا لعل اب آٹھویں درجے میں آگیا ہے۔ دو برس بعد سوال پاس کرے گا۔ پھر الٰہ آباد سے اکیلا بنارس آجایا کرے گا۔"

لیکن میں نے دسواں درجہ پاس کرنے سے چند ماہ قبل ہی اپنے آپ کو الٰہ آباد سے بنارس اور بنارس سے الٰہ آباد تک تنہا سفر کرنے کے قابل محسوس کیا۔ اسکول میں پانچ چھ دن کی چھٹی ہوئی تو اماں کی خوشامد کر کے خالہ کے ہاں جانے کی اجازت حاصل کر ہی لی۔

اماں نے چلتے وقت مجھے چھ روپے دیئے —— چار روپے دونوں طرف کا کرایہ اور دو روپے اوپری خرچ کے لئے۔ گھر سے اسٹیشن جاتے ہوئے راستے میں میں نے طے کیا کہ یہ دو روپے صاف بچا لاؤں گا اور الٰہ آباد آکر ایک عمدہ سا بٹنوں کا سیٹ خرید دوں گا۔ اسٹیشن پہنچا تو معلوم ہوا کہ گاڑی کی روانگی میں ابھی بہت دیر ہے۔ گھر سے کھانا کھا کر چلا تھا۔ "ٹی اسٹال" پر کیک اور انڈے مجسم دعوتِ کام و دہن بنے ہوئے رکھے تھے سان کو دیکھتے ہی بھوک لگ آئی۔

بٹنوں کے سِٹ کا خیال نہ رہا۔ سیدھا سٹال پر گیا اور چائے کی ایک پیالی طلب کی۔ کیک اور انڈے کے متعلق یہ تو میں طے کر چکا تھا کہ ان دونوں میں سے صرف ایک چیز کھاؤں گا۔ مگر ابھی یہ فیصلہ کرنا باقی تھا کہ کون سی چیز کھائی جائے۔ میں اِس سلسلے میں اپنے دل سے مشورہ کر ہی رہا تھا کہ سٹال والے نے کہا، "کچھ کھائیے گا صاحب؟ کیک؟ پیسٹری؟ انڈا؟"

میں نے جواب دیا، "ہاں ایک انڈا اور ایک کیک کا ٹکڑا۔"

اُس نے ایک پرچ میں ایک اُبلے ہوئے انڈے کی قاشیں اور دوسری میں کیک کے تین چار ٹکڑے رکھ کر دونوں پرچیں میرے سامنے رکھ دیں۔ میں نے اتنا کب مانگا تھا؟ اب اس سے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ بھئی ہمیں کیک کا صرف ایک ٹکڑا چاہیئے۔ بڑی ذلت کی بات ہوگی۔ غرض کہ کیک کے سب ٹکڑے کھانے پڑے۔ اور ایمان کی بات یہ ہے کہ اُن کے کھانے میں بڑا لطف آیا، اتنا کہ مجھے سٹال والے سے کوئی شکایت نہ رہی۔ اِس ناشتے کی قیمت مجھے تقریباً آٹھ آنے دینی پڑی۔

سٹال سے رخصت ہوتے ہوئے میں نے اپنے دل میں کہا "بٹنوں کا سٹ تو ڈیڑھ روپے میں بھی خریدا جا سکتا ہے۔ اب میں ایک پیسہ خرچ نہیں کروں گا اور اس رقم کو بالکل محفوظ رکھوں گا۔"

روانگی کا وقت قریب آیا تو گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ پلیٹ فارم پر خوانچے والوں کا ہجوم شروع ہوا۔ ایک مٹھائی والے کی ٹوکری میں گلاب جامنیں نظر پڑیں۔ شیرے میں تر اور نہایت سُرخ! جیسے دہکتے ہوئے انگارے! دیکھتے ہی منہ میں پانی بھر آیا۔ مٹھائی والے کو بلانا بھی نہیں پڑا۔ وہ میری للچائی ہوئی نظروں کو دیکھ کر خود ہی میری طرف آ گیا۔

"کچھ مٹھائی دوں میاں؟"

"ہاں، کیا کیا چیز ہے؟"

"بالوشاہی ــــ قلاقند ــــ امرتی ــــ گلاب جامن ــــ اندرسے کی گولیاں ــــ"

"اچھا، گلاب جامن دو۔"

"کتنی دوں؟ سیر بھر؟"

"نہیں، پاؤ بھر دے دو۔"

میرا ارادہ تھا کہ صرف ایک آنے کی لوں گا لیکن اُس نے سیر بھر کہا تو مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آئی کہ نہیں، ایک آنے کی دو۔ ناچار پاؤ بھر مانگ لی۔ سیر بھر چیز کے مقابلے میں پاؤ بھر کچھ ایسی زیادہ کم اور حقیر نہیں ہوتی!

گلاب جامنوں کو مزے لے لے کر کھایا اور اُس کے بعد اپنی حماقت پر افسوس کرنے لگا۔

راستے میں بڑے زور کی پیاس معلوم ہوئی۔ ایک اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو پانی کی جستجو میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ایک شخص مسافروں کو اوک سے ٹھنڈا جل پلا رہا تھا۔ میرے لئے اوک سے پینا ناممکن تھا۔ گلاس بھی نہیں تھا کہ اُس میں لے کر پی لیتا۔ اتنے میں ایک سوڈے برف والا تیزی کے ساتھ جاتا ہوا دکھائی دیا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے اُس کو آواز دی اور وہ قریب آیا تو اس سے کہا "ایک بوتل کھول کر لاؤ۔"

"کون سی؟" اُس نے سوال کیا۔

مجھے لیمینڈ اور جنجر دو نام آتے تھے۔ سوچ رہا تھا ان دونوں میں سے کون سا نام لوں کہ اُس نے کہا۔ "ونٹو؟"

میں نے کہا، "ہاں، وہی!"

پینے کے بعد میں نے ایک چونّی اُس کو دی۔ خیال تھا کہ یہ ڈھائی آنے واپس کرے گا، لیکن اُس نے کہا، "دو آنے اور دیجئے!" حجت کرنا میرے لئے باعثِ شرم تھا، اس لئے بلا تأمل جیب سے دونّی نکال کر اس کو دے دی۔

باقی تمام سفر اپنے اوپر لعنت بھیجنے میں صرف ہوا۔

بنارس پہنچا ہوں تو دو روپے میں سے ایک روپے کا صفایا ہو چکا تھا۔ میں نے حسرت کے ساتھ بٹنوں کے اُس سِٹ کو یاد کیا جو اب میری دسترس سے بہت دُور تھا۔ لیکن پھر اپنے آپ کو سنبھالا اور عزم کیا کہ اب جو ایک روپیہ باقی ہے اُس میں سے ایک کوڑی خرچ نہیں کروں گا، اِدالہ آباد پہنچ کر کچھ دنوں تک پیسے جمع کروں گا، اور پھر جب دوبارہ اپنے پاس دو روپے اکٹھے ہو جائیں گے۔ تو ایک عمدہ سا بٹنوں کا سِٹ خریدوں گا۔

لیکن میں اس عزم کو نباہنے میں کامیاب نہ ہوا۔ دو ہی دن کے اندر وہ ایک روپیہ میری جیب سے نکل کر بنارس کے سوداگروں کی متاع بن گیا۔

اب میرے پاس بنارس سے الہ آباد تک کا ٹکٹ خریدنے کے لئے دو روپے تھے۔ اُن کو میں کسی صورت سے خرچ نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ وہاں تک بالکل کوئی چیز نہیں خریدی۔ نہ خریدنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ جب جیب میں پیسے تھے تو وہ اچھلتے تھے اور قدم قدم پر کچھ نہ کچھ خریدنے کو جی چاہتا تھا۔ اب جیبیں خالی تھیں تو جی بھی نہ چاہتا تھا۔ غرضکہ دو دن نہایت سکون کے ساتھ گزرے مگر تیسرے دن صبح یہ خیال آیا کہ بنارس سے چلتے وقت خالہ بھی تو مجھے کچھ دیں گی۔ یہ میرے دل کی آواز تھی جو مجھے بہکا کر غلط راستے پر ڈالنا چاہتی تھی۔ میں نے اس کے جواب میں کہا "ضروری نہیں کہ وہ مجھے کچھ دیں۔ ممکن ہے

دیں، ممکن ہے نہ دیں۔" دل نے کہا "نہیں، ضرور دیں گی۔ تمہاری اماں تو کبھی کسی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹنے دیتیں۔ روپوں کے علاوہ کپڑا لتّا بھی دیتی ہیں۔"

میں نے کہا "اماں کی بات دوسری ہے۔ وہ ایک بیرسٹر کی بیوی ہیں اور اُن کے دو بیٹے لاٹ صاحب کے دفتر میں ملازم ہیں۔ خالہ بے چاری بیوہ ہیں، اُن کے چار جوان بیٹے مر چکے ہیں اور پانچواں اپاہج ہے۔ وہ محلّے کی بچیوں کو پڑھا کر دو وقت کی روٹی کھاتی ہیں۔ اُن کے پاس اتنا کہاں کہ وہ مجھے کچھ دیں۔" دل نے کہا "نہیں، وہ ضرور تمہیں کچھ نہ کچھ دیں گی۔ دو روپے نہیں تو ایک روپیہ تو ضرور ہی دیں گی۔ تمہارے پاس کرائے کے جو دو روپے ہیں ان میں سے ایک روپیہ تم بے دھڑک خرچ کر سکتے ہو۔" میں نے کہا "خرچ تو میں کر لوں، اور میرا جی بھی یہی چاہتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر خالہ نے کچھ نہ دیا تو؟ پھر میں کیا کروں گا؟ بنارس سے الہ آباد تک کیسے پہنچوں گا؟" دل نے یقین دلایا "وہ دیں گی، کم سے کم ایک روپیہ تو ضرور ہی دیں گی۔"

یہ کشمکش جاری ہی تھی کہ گلی میں سے ایک چاٹ والا آواز آئی "چاٹ! دہی بڑے کی چاٹ!"

میں نے اپنے دل کے مشورے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

پھر ظاہر ہے کہ جب ایک دفعہ روپیہ بھنا لیا گیا تو چونسٹھ پیسوں میں سے ایک پیسے کا بھی بچنا ناممکن تھا۔ آدمی چھت پر سے گرتا ہے تو زمین پر آ کر ہی دم لیتا ہے۔

چھ دن کے قیام کے بعد میں بنارس سے رخصت ہونے لگا تو میری جیب میں صرف ایک روپیہ تھا۔ چلتے وقت خالہ نے مجھے گلے لگایا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگیں "میرا لعل اتنے دنوں کے بعد آیا اور میں اُسے کوئی اچھی چیز بھی تو نہیں کھلا سکی ـــــ میرے پاس رکھا ہی کیا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگیں اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ زمین میرے قدموں کے نیچے سے نکل گئی۔

گھر سے اسٹیشن تک کا راستہ اس طرح طے کیا جس طرح ایک مجرم قید خانے کی کوٹھڑی سے پھانسی کے تختے تک کا راستہ طے کرتا ہے۔ اُس وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس بھری دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے، میں بالکل تنہا اور بے یار و مددگار رہ گیا ہوں، میرے ماں باپ مر چکے ہیں اور عزیز و اقارب سب ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔

اسٹیشن پہنچ کر بنارس سے الہ آباد تک کا آدھا ٹکٹ لیا۔ اس کے علاوہ اور صورت بھی کیا تھی!

اور اُس وقت میرے دل سے ایک دعا نکلی: "معبود! میرے حال پر رحم کر۔ میری بے چارگی اور بے بسی پر ترس کھا۔ میں اس وقت بڑی مصیبت میں ہوں۔ اس مصیبت کو تو ہی ٹال سکتا ہے۔" اس کے بعد میں نے نظریں آسمان کی طرف اٹھائیں اور اپنے آپ کو خدا سے قریب تر محسوس کرتے ہوئے کہا: "اللہ میاں! میں اب پانچوں وقت کی نماز پڑھا کروں گا۔ کبھی بھول کر بھی قضا نہیں کروں گا۔ اور بغیر وضو کے بھی کبھی نہیں پڑھوں گا۔ میں پکا وعدہ کرتا ہوں۔ اللہ میاں! آئندہ ہرگز کوئی گناہ نہ کروں گا۔ اگر کوئی گناہ کروں تو تم اسی وقت مجھے جان سے مار ڈالنا۔ بس اس وقت مجھے بچا لو۔ مجھ سے کوئی ٹکٹ نہ مانگے، اور اگر مانگے تو مجھے بارہ سال سے زیادہ کا نہ سمجھے!......"

اسی طرح دعا مانگتا، خدا کے سامنے گڑگڑاتا اور خوف کے مارے تھر تھر کانپتا پلیٹ فارم تک پہنچ گیا۔ شاید میری دعا قبول ہو رہی تھی، کیونکہ گیٹ پر مجھ سے کسی نے ٹکٹ نہ مانگا۔ گاڑی تیار تھی۔ ایک بالکل خالی ڈبہ نظر آیا۔ اُسی میں بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ خالی ڈبے میں ٹکٹ چیکر کے آنے کا امکان بہت کم ہے۔ بہت دیر تک اس ڈبے کے ایک کونے میں چوروں کی طرح سہما ہوا بیٹھا رہا۔ اور بار بار خدا سے التجا کرتا رہا: "اس وقت مجھے بچا لو اللہ میاں! میں پکا وعدہ کرتا ہوں آئندہ ہرگز کوئی گناہ نہ کروں گا، کبھی بغیر وضو کے نماز نہیں پڑھوں گا....."

یکایک چار یا پانچ آدمی ڈبے میں داخل ہوئے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، حالانکہ وہ سب کے سب بے ضرر مسافر تھے اور اُن میں سے ایک بھی ٹکٹ چیکر نہ تھا۔ مگر عجیب قسم کے لوگ تھے وہ! صورتوں سے بالکل وحشی اور جنگلی معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے قد نہایت لمبے تھے اور جسم نہایت چوڑے چکلے! آنکھیں ڈراؤنی اور چہرے سیاہ! میلی میلی شلواریں اور بھدّے بھدّے کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ وہ غالباً سندھ یا پنجاب کے کسی علاقے کے لوگ تھے، کیونکہ جب انہوں نے بیٹھ کر باتیں کرنی شروع کیں تو اُن کی زبان اردو نہ تھی۔ وہ بہت کم بولتے تھے مگر جب بولتے تھے تو چاروں پانچوں بیک وقت بول اٹھتے تھے، اور اُس کے بعد پھر کچھ دیر کے لئے بالکل خاموش ہو جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے مٹّی کی ایک ہانڈی میں بہت سے کنکر اور روڑے بھر لئے ہیں اور وقتاً فوقتاً اُسے دونوں ہاتھوں میں لے کر زور سے ہلا دیتا ہے۔

گارڈ نے سیٹی دی اور گاڑی روانہ ہوئی۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اطمینان کا سانس لوں، ایک ٹکٹ چیکر چلتی گاڑی پر سوار ہو کر ڈبے میں آن موجود ہوا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری جان نکل گئی!

وہ سیدھا میرے پاس آیا اور بولا "ٹکٹ!"

میں نے کہا، "میرا ٹکٹ میری اماں کے پاس ہے۔ وہ زنانے درجے میں ہیں"۔ خدا کی جناب میں میری دعا قبول ہو رہی تھی جبھی تو اتنا اچھا جواب خود بخود میری زبان پر آگیا۔

اس نے ذرا سخت نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر پوچھا "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"الٰہ آباد!" میں نے جواب دیا۔

"اچھا!" اُس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس "اچھا" کا مطلب صاف طور پر یہ تھا: "گھبراؤ نہیں صاحبزادے! الٰہ آباد کے اسٹیشن پر تمہاری خبر لوں گا۔"

پھر وہ پلٹ کر ان چاروں پانچوں کے پاس گیا۔ جو وحشیوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، اُس نے ٹکٹ کے لئے اُن کی طرف ہاتھ بڑھایا، مگر وہ بدستور ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔

"ٹکٹ لاؤ"! اُس نے نہایت تند لہجے میں کہا۔

انہوں نے حد سے زیادہ بھدی اردو میں جواب دیا جس کا خلاصہ یہ تھا: "ہم میں سے وہ شخص جس کے پاس ہم سب کے ٹکٹ ہیں پانی پینے گیا تھا۔ گاڑی یکایک روانہ ہوگئی اور وہ بھاگ کر کسی دوسرے ڈبے میں بیٹھ گیا۔"

ٹکٹ چیکر نے اُن کی بات کا یقین نہیں کیا۔ اُس نے غصّے میں آکر اُن کے خلاف نہایت سخت الفاظ استعمال کئے، اور جب اچھی طرح اپنے غصے کا اظہار کر چکا تو وہیں اُن کے پاس جم کر بیٹھ گیا۔ تاکہ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رُکے تو دوبارہ اُن سے ٹکٹ کا مطالبہ کرے۔ وہ وہاں بیٹھا ہوا اپنی قہر آلود نظروں سے ہر دو تین منٹ کے بعد اُن کی طرف دیکھتا تھا۔ مگر وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر بدستور ایک دوسرے کو وحشیوں کی طرح گھورنے میں مصروف تھے۔

گاڑی تیزی کے ساتھ اڑی چلی جا رہی تھی، اور میری دعا عرش کی جانب محوِ پرواز تھی "آج مجھے بچا لو اللہ میاں! میں آئندہ پانچوں وقت کی نماز پڑھا کروں گا۔ کبھی بھول کر بھی قضا نہیں کروں گا۔ اور بغیر وضو کے کبھی نہیں پڑھوں گا۔ میں تمہارا بہت ہی فرمانبردار بندہ ہوں اللہ میاں!......"

گاڑی ایک اسٹیشن پر پہنچ کر ٹھہر گئی۔ ٹکٹ چیکر نے بغیر اپنی جگہ سے اُٹھے ہوئے اُن وحشیوں پر ایک کڑی نظر ڈالی جواب اور بھی زیادہ خوفناک انداز میں ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ پھر اُس نے گرج کر کہا "کہاں ہے وہ تمہارا ساتھی؟ بلاؤ اُسے اور ٹکٹ دکھاؤ۔"

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ صرف ایک دوسرے کو اپنی لال لال آنکھوں سے دیکھتے رہے۔

ٹکٹ چیکر آگ بگولا ہوگیا، اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر انتہائی غضبناک لہجے میں بولا، "بدمعاش کہیں کے! میں تمہیں پولیس کے حوالے کردوں گا میں تمہیں جیل بھجوا دوں گا۔ ٹھہر تو جاؤ۔ تم نے سمجھا کیا ہے!" اور اسی طرح غصّے کی آگ برساتا ہوا گاڑی سے اُتر گیا۔

میں ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگا۔ "اب پولیس آئے گی"، میں نے اپنے دل میں کہا، "اور ان سب کے ساتھ میں بھی پکڑا جاؤں گا۔ اُف، خدا کی پناہ! اللہ میاں! رحم کرو۔ مجھے بچا لو۔ میں تمہارا بہت ہی فرماں بردار بندہ ہوں۔ آج مجھے بچا لو میں عمر بھر کوئی گناہ نہیں کروں گا۔....."

اور وہ بدمعاش جنہوں نے ٹکٹ چیکر کو غصہ دلا کر میری مصیبت میں اضافہ کیا تھا اُسی طرح خون آلود نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ البتہ کنکروں سے بھری ہوئی ہانڈی کو کبھی کبھی زور سے ہلا دیا جاتا تھا۔

گارڈ نے سیٹی دی، اور ہمیں ہمارے ڈبے کے سامنے آکر ہری لالٹین دکھائی۔ مگر قبل اس کے کہ گاڑی رینگنا شروع کرے ٹکٹ چیکر واپس آگیا۔ وہ تنہا تھا ـــــ اس کے ساتھ کوئی پولیس کا آدمی نہ تھا۔

اس نے بیٹھتے ہی اپنے غضب ناک لہجے میں بولنا شروع کیا۔ "میں آج تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ سمجھے تم؟ بدمعاشو! ڈاکوؤ! تم نے مذاق سمجھا ہے! میں تمہیں ٹھیک کر دوں گا! حرام زادے کہیں کے! بدمعاش!...."

گاڑی رات کی تاریکی کو چیرتی ہوئی تیزی کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ ٹکٹ چیکر کی زبان بھی اسی قدر تیزی کے ساتھ چل رہی تھی ـــ بے ٹکٹ مسافروں کی شرر بار آنکھیں اور میری عاجزانہ دعائیں غیر معمولی شدت کے ساتھ مصروفِ عمل تھیں۔

کنکروں سے بھری ہانڈی ایک دفعہ بہت زور کے ساتھ ہلی۔ ابھی میں اس جھنکار کو سمجھنے کی کوشش کر رہی رہا تھا کہ ان چاروں پانچوں آدمیوں میں سے ایک شخص یکایک اپنی جگہ سے اٹھا۔ کوئی چمکدار چیز بجلی کی طرح فضا میں لہرائی اور ٹکٹ چیکر کے سینے میں پیوست ہوگئی۔ دوسرے لمحے میں وہ سب کے سب اُس پر پل پڑے۔ انہوں نے اس کو ہاتھوں میں اٹھایا اور کھڑکی کے راستے سے باہر پھینک دیا۔

وہ تھوڑی دیر تک خاموشی کے ساتھ کھڑے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر اکبارگی سب کی نظریں میرے اوپر جم گئیں۔ میں اپنی اُس

وقت کی حالت کو بیان نہیں کر سکتا۔ مگر اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُن چند لمحوں میں میں احساس سے بالکل عاری ہو گیا تھا، کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو میں لازمی طور پر خوف اور وحشت کے احساس سے مر گیا ہوتا۔

وہ سب میرے قریب آئے، اور اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کر مجھ سے کہا، "تم کہاں جاتے ہو؟"

مجھ میں بولنے کی طاقت نہ تھی، مگر منہ سے کسی نہ کسی طرح "الہ آباد" کا لفظ نکل ہی گیا۔

وہ تقریباً ایک لمحہ مجھے گھورتا رہا۔ پھر بولا، "تم کسی کو یہ بات بولو گے؟"

"نہیں، میں کسی سے نہیں کہوں گا" میں نے نہایت عاجزی کے ساتھ جواب دیا۔

"اگر تم کسی کو بولے تو۔۔۔"

"نہیں —— نہیں —— میں کسی سے نہیں کہوں گا" میں نے اُسے یقین دلایا۔

وہ پھر تقریباً ایک لمحہ مجھے گھورتا رہا۔ اُس کے بعد وہ سب کے سب میرے پاس سے چلے گئے اور اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئے۔

اور تب مجھے اپنی حالت کا احساس ہوا۔ میرا دل اس طرح دھڑک رہا تھا گویا سینے کی دیواروں کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ سارا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں اس حالت میں اپنی دعاؤں کو بالکل بھول چکا تھا (دعاؤں کی اب ضرورت بھی نہ تھی)

اسٹیشن آیا اور گاڑی رُکی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اب ٹکٹ چیکر اپنی نیلے رنگ کی وردی پہنے ہوئے نظر آئے گا اور اچھل کر ڈبے میں آن موجود ہو گا۔ لیکن فوراً خیال آیا کہ ٹکٹ چیکر اب کہاں! وہ تو یہاں سے دُور، جنگل کے سناٹے اور رات کی تاریکی میں ریل کی پٹڑی کے برابر کہیں پڑا ہو گا۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ ٹکٹ چیکر نہ آیا اور گاڑی پھر چل پڑی۔

تھوڑی دیر میں الہ آباد کا اسٹیشن آیا۔ میں اپنی جگہ سے سہما ہوا اُٹھا اور چاہا کہ اُن خونی درندوں سے نظر ملائے بغیر ڈبے سے نکل جاؤں جو اب پھر مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ مگر وہ بھی میرے ساتھ ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے اور میں نے پلیٹ فارم پر آ کر گیٹ کا رخ کیا تو میرے پیچھے پیچھے ہو لئے۔

گیٹ میں سے گزرتے وقت میں نے اپنا ٹکٹ جیب سے نکالا۔ ریل کے ہولناک واقعے کے بعد میں اس کو بھول ہی گیا تھا۔ مجھے یہ بات بالکل یاد نہیں رہی تھی کہ میرے پاس صرف آدھا ٹکٹ ہے اور مجھ سے پورے ٹکٹ کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

میں نے ٹکٹ گیٹ پر کھڑے ہوئے ٹکٹ کلکٹر کو دیا، اور ٹکٹ دے کر آگے بڑھ جانے کی بجائے اُس کا منہ تکنے لگا۔ اُس نے ٹکٹ کو دیکھا۔ اور پھر مجھے دیکھا۔ سر سے پاؤں تک ایک نظر ڈالنے کے بعد اُس نے مجھے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

"یہ آدھا ٹکٹ کیوں ہے؟" اُس نے سوال کیا۔

"میرا تو آدھا ہی ٹکٹ لگتا ہے" میں نے کہا۔

"نہیں، تمہارا پورا ٹکٹ لگے گا۔ آدھے ٹکٹ کے دام دو۔"

قبل اس کے میں ٹکٹ کلکٹر سے کچھ اور کہوں، وہی شخص جس نے ریل میں خون کیا تھا آگے بڑھا اور اپنی جیب سے روپے نکالتے ہوئے بولا۔ "آدھا ٹکٹ کا دام کتنا ہو گا؟"

ایک دوسرے ٹکٹ کلکٹر نے نصف ٹکٹ کی قیمت اور شاید اُس کے ساتھ کچھ تاوان بھی وصول کیا، اور ایک رسید کاٹ کر اُس کو دی۔ پھر میرے خونی محسن نے اپنی جیب سے ایک ٹکٹ نکالا، گیٹ پر کھڑے ہوئے ٹکٹ کلکٹر کو دیا، اور مجھے ہاتھ سے پکڑے ہوئے پھرتی کے ساتھ اسٹیشن سے باہر آ گیا۔

باہر آ کر وہ مجھ سے علیحدہ ہو گیا۔ میں نے ایک تانگہ خالی دیکھا اور جلدی سے اُس پر بیٹھ گیا۔

وہ دور سے کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ میں بھی کنکھیوں سے اُس کو دیکھتا رہا۔

وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔ مجھے بے انتہا تھکن محسوس ہوئی —— جسمانی اور دماغی تھکن! میں تانگے کی سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔

اور پھر مجھے اُس دعا کا خیال آیا جو چند گھنٹے پیشتر میں نے خدا سے کی تھی

میری دعا قبول ہو گئی تھی!

معبودِ حقیقی نے میری فریاد کو سن لیا تھا۔ اس نے میری عاجزانہ التجاؤں پر قبول و پذیرائی کے دروازے کھول دیئے تھے۔

اور اب؟ اب یہ حال ہے کہ دن رات دعائیں مانگتا ہوں مگر بے کار! نمازیں پڑھتا ہوں، اور دامن پھیلا پھیلا کر خدا کے سامنے گڑگڑاتا ہوں، لیکن سب بے سُود! آرزوئیں باطل ہیں اور تمنائیں ناکام! زندگی محرومیوں اور بے نصیبیوں کی ایک داستان ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتی۔ "دعا" نے اختر کے ساتھ ایک مستقل دشمنی ٹھان رکھی ہے!

اختر انصاری

داسی اور دیوداسی

دیوداسی بنی یک جنبشِ لب سے داسی

یعنی وہ چھوکری جو ناچتی ہے مندر میں
گھورتی رہتی ہے جس کو کوئی بےحِس مورت

جس کی ہر لغزشِ پا کو کوئی پتھرائی نظر
داد دیتی ہو، مگر داد ہو بیدادِ صفت

جس کے قامت کے لچکنے میں جوانی ڈھل جائے
اور ہو ڈھل کے قیامت کی دلیلِ قربت

وہ جوانی جو ہو مورت سے تھرک کر طالب
بند آغوش میں ہو جیسے کلی کی نکہت

جس کا لہرا کے بدک جانا ہو دل کا نوحہ
روتی حسرت سے تبسّم کی کرے جو خلقت

یہ صفات اس کو ملیں جو کہ تھی دل کی باسی

جس کی ہر بات میں تھی رنج و محن سے رخصت
جس کی پیشانی پہ ہنس ہنس کے سحر بیٹھ گئی

جس کی نظریں تھیں کہ ہنستی ہوئی مے کی لہریں
جس کی پلکیں تھیں کہ مے بار نظر بیٹھ گئی

جس کے رخسار پہ مُمن ہونے کا دھوکا کھا کر
ناگن اک اُتری مگر تھام کے سر بیٹھ گئی

جس کی چاہت سے وہ خاموش محبت اُنگی
ہالہ بن نکلی تو پھر گردِ قمر بیٹھ گئی

جس کے ہر ناز پہ ہو جاتے تھے صدقے قرباں
چاندنی جو تھی مگر آپ کے گھر بیٹھ گئی

اس کے سینے پہ کیا طعنے نے زخم کاری
بھینچ کے آغوشِ تمنا میں جو مچلی، ہاری

مختار صدیقی

آپ بیتی

شاید آپ یہ سمجھتے ہوں کہ آپ بیتی اس واقعہ کو کہتے ہیں جو اپنی ذات پر بیتے۔ پہلے میرا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ آپ بیتی ایک ایسا واقعہ ہے جو آپ ہی آپ آپ کے علم کے بغیر آپ کی رضامندی کے بغیر آپ کی خواہش کے بغیر آپ پر بیتنے کا فیصلہ کرلے اور بیت جائے۔ اور آپ کو قطعی سمجھ نہ آئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ یا کچھ ہو بھی رہا ہے یا نہیں۔ اور پھر دفعتہً آپ پر انکشاف ہو کہ جو کچھ ہوا چاہتا تھا وہ ہو چکا۔ اور آپ کی اپنی ذات پر ہوا۔ نیز اس کی اہمیت کا احساس بھی آپ کو ہونے لگا۔

اگرچہ وہ واقعہ مجھ پر بیتا تھا۔ لیکن میں اُس کے وقوع سے قطعی بے خبر تھا گویا میں اُس مریض کی طرح تھا جسے کلوروفارم سنگھا کر لٹا دیا گیا ہو۔

یہ ناگہانی اُفتاد ایک بیوی تھی۔ میری بیوی۔ میری منکوحہ بیوی۔ اگر پانچ منٹ پہلے مجھ سے کوئی بیوی کی بات کرتا تو میں اُسے پاگل سمجھ کر ہنس دیتا۔ لیکن اب۔ اب وہ میرے سامنے چوکی پر برقعے میں لپٹی ہوئی [illegible]ی سی بنی بیٹھی تھی اور میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس اجنبی سی میلی سی [illegible]ی کو کیا کروں۔ اور یہ تمام واقعہ صرف اس لئے ہوا کہ مجھے اناروں سے محبت تھی۔ میرا مطلب ہے وہ انار جو کھائے جاتے ہیں۔

اس واقعے کی ذمہ داری زیادہ تر چار اصحاب پر عاید ہوتی ہے مسجد کا مُلّا جس کی بغل میں میں رہتا تھا۔ اُس صحت افزا بستی کا میونسپل کمشنر قربان علی میرا بجنوری نوکر ننھا اور ـــــ وہ میری ہونے والی بیوی اور ان کے علاوہ شاموچیٹنی کی اک اُلٹی ہوئی بوتل۔

اُس واقعہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا [illegible] سکتا ہے کہ اُس کے وقوع کے لئے سب سے پہلے نگونی کے معلق پُل کو ٹوٹنا پڑا اور سرکار اس کی مرمت کے لئے چار ہزار روپیہ کی منظوری پر مجبور ہوئی اور تعمیر کا کام ایک ایسے انجنیئر کے سپرد کیا گیا جس کا ایمان تھا کہ بیاہے ہوئے سب اوورسیئر نکمے ہوتے ہیں۔ قصہ کوتاہ اس سلسلے میں دو ماہ کے لئے مجھے نگونی جانا پڑا۔

نگونی ہمالیہ میں ایک اونچے ڈھلان پر آباد ہے جہاں چیل کے درخت اور اُن کے لمبے لمبے سایوں میں تپ دق کے سینی ٹوریم بکثرت ملتے ہیں۔ جہاں یا تو آٹھ آنے ایک روپیہ ماہوار کرایہ کے مکانات ملتے ہیں یا تیس چالیس روپے والی کوٹھیاں۔ آٹھ آنے ماہوار پر جو مکان مجھے ملا۔ وہ ایک گہری کھاڑی کے کنارے پر واقع تھا۔ پتھر کی پانچ فٹ اونچی چار دیواری پر سلیٹوں کی محرابی چھت تھی۔ ایک پہلو میں ایک چھوٹا سا کٹھڑکی نما دروازہ مکان میں جانے آنے کا واحد راستہ تھا۔

اُس مکان کے متعلق تین باتیں بہت دلچسپ تھیں۔ ایک تو بکری بن کر داخل ہونا۔ دوسرے چارپائی پر پڑے پڑے یاد رکھنے کی کوشش [illegible] کہ کھڑے ہوئے تو سر پھوٹ جائے گا اور تیسرے بھولنے کی کوشش کہ اس کمرے کے چاروں کونوں میں کیسے کیسے کیڑے مکوڑے رینگ رہے ہیں تو صاحب دو ایک ہی دن میں مجھ پر یہ واضح ہو گیا کہ اگر اُسی مکان میں رہائش رہی تو نگونی کے متعلق پل کو تعمیر کرنے کے لئے کسی اور سب اوورسیئر کی خدمات کی ضرورت پڑے گی۔ معلوم ہوتا ہے اُن دو ایک دنوں میں میری شکل وصورت میں نمایاں تبدیلی ہوگئی۔ ورنہ خان صاحب کو کیا پڑی تھی کہ وہ مجھ پر ترس کھاتے۔ بلکہ انہیں یہ معلوم ہی کیسے ہوتا کہ میں اک دکھی مسافر ہوں۔ اللہ ان کا بھلا کرے۔ انہوں نے میرے لئے ایک ایسا کمرہ خالی کروادیا جس میں سونے کے علاوہ اٹھنا بیٹھنا بھی ممکن تھا۔ وہ کمرا ملّی کی مسجد سے ملحق تھا اور وہ مسجد اور کمرا خان صاحب نے خود بنوائے تھے۔ اس کے بعد حسنِ اتفاق سے مجھے وہ بجنوری نوکر ننھا مل گیا جس کا سابقہ مالک تپ دق سے مر چکا تھا۔ اس سے پہلے نہ تو مجھے کسی ایسے کمرے میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا جو مسجد سے ملحق ہو اور مسجد کے نام [illegible] وقف ہو اور نہ کسی باتونی بجنوری سے سابقہ پڑا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں ہنسی خوشی رہنے لگا اور نگونی کے معلق پل کی مرمت ہونے لگی اور مجھے یہ خیال بھی نہ آیا کہ [illegible] الوکھی آپ بیتی کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

دو ایک دن کے بعد خان صاحب آئے۔ وہ مسکرا رہے تھے۔

ہی ہیں کہ پہاڑوں میں مکانات یہاں وہاں نیچے اوپر ایک دوسرے سے ہٹ کر ہوتے ہیں اور مکانوں کی چار دیواریاں ہوتی ہی نہیں اور ہر جگہ سے ایک نہ ایک پگ ڈنڈی یہاں سے وہاں چلی جاتی ہے میرے کمرے سے بھی ایک ایسی ہی پگڈنڈی رے صاحب کی کوٹھی تک چلی گئی تھی۔ اسی راستے انار مسٹر رے تک آیا جایا کرتی تھی۔ ایک دن صبح سویرے جب وہ مسٹر رے کی کوٹھی سے آ رہی تھی تو غالباً اس شوق کے مارے کہ دیکھوں تو یہ سستے اناروں کا متوالا کس حال میں ہے وہ میرے دروازے کے پاس ٹھہر گئی اور درزوں سے جھانکنے لگی۔

اس دوران میں کہیں ملا صاحب جو اذان دینے چبوترے پر چڑھے تو انہوں نے انار کو وہاں کھڑے دیکھ لیا پھر کیا تھا۔ انہوں نے ایک ہنگامہ مچا دیا اور کئی من گھڑت چشم دید واقعات سنا دیئے۔ دوپہر تک انہیں ان باتوں پر خود بھی یقین ہو چکا تھا۔ اور اس حد تک کہ جمعہ کی نماز میں مسجد کے پہلو میں حرام کاری کا مسئلہ خطبے میں لے بیٹھے۔ اور اپنی چشم دید باتیں بطور مثال پیش کرنے لگے۔ جن میں میری اور انار کی مثال پیش پیش تھی۔ اُس روز خاں صاحب تو وہاں تھے نہیں اس لئے مسجد میں یہ قرار پایا کہ میرے افسر یعنی انجنیر صاحب کو مل کر مجھے معطل کر دیا جائے اور اگر انجنیر صاحب نہ سنیں تو قربان علی سے کہہ سن کر نگوٹی کی میونسپل حدود سے مجھے باہر نکال دیا جائے۔

اگرچہ اس روز سارے شہر میں اس بات کا چرچا تھا لیکن ایک میں تھا۔ جو قطعی بے خبر رہا۔ البتہ یہ میں نے ضرور دیکھا کہ لوگ میری طرف دیکھ دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا رہے ہیں۔ چند ایک نے تو طنزاً کچھ نہ کچھ انار کے متعلق کہا اور اس قدر زور سے کہا کہ میں سن سکوں۔ دو ایک نے کان پر ہاتھ رکھ کر گانا شروع کیا "سو ہنے دانے نے اناراں دے، عاشق ایوں پھرتے نے جیویں کتے نے بزاراں دے"۔ دو ایک مرتبہ میں یہ سن کر ٹھٹکا لیکن پھر خیال آیا کہ بھلا اُن ٹکے ٹکے بکنے والے اناروں کے متعلق کوئی کیا طعنہ دے گا۔ اس لئے حسب معمول جھومتا ہوا اپنے گھر تک آ پہنچا۔ گھر آیا تو دیکھا کہ اناروں کی پلیٹ خالی پڑی ہے۔ میں نے ننھے کو آواز دی "میاں دو انار تو لے آنا ——— سُنا تم نے!"

اس روز اُس کے لمبوترے چہرے پر خوف سا طاری تھا۔ کہنے لگا "بابو جی ——— آپ کو معلوم ہے ..... !" میں نے اُس کی گھبراہٹ کو دیکھ کر یا شاید اس خیال پر کہ اِدھر اُدھر کی کوئی فضول بات نہ چھیڑ بیٹھے۔ میں نے کہا "ننھے میاں۔ معلوم معلوم سب کچھ ہے ہمیں۔ صرف ہمارے انار ختم ہو گئے ہیں۔ لپک کر دو انار لے آؤ" پہلے اُس نے ٹھٹھک کر میری طرف دیکھا اور پھر گھبرا کر کہنے لگا "لیکن بابو جی اس بڈھے دکندار سے تو نہ لاؤں گا میں"۔ اُسے یوں گھبرائے ہوئے دیکھ کر حسب عادت میں ہنس پڑا

جانے کون سی معمولی سی بات پر پریشان ہو رہا تھا میں نے ازراہ مذاق کہا "ارے میاں کیا نہیں جانتے ہم سبھی کچھ جانتے ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ آج جمعہ ہے اور تم ننھے میاں ہو اور ہم ہم ہیں۔ اور ہمارے انار ختم ہو گئے ہیں۔ بس تم دوڑ کر انار لے آؤ" یہ سن کر وہ مایوس سا ہو گیا لیکن اس کی آنکھیں یوں ناچنے لگیں۔ گویا وہ اس مایوسی کا متمنی تھا۔ کہنے لگا "تو صاحب وہاں سے لے آؤں۔ اس اوپر والے بازار سے"۔ "چاہے قندھار سے لاؤ لیکن لے آؤ" میں نے لاپروائی سے جواب دیا اور وہ مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔

اتفاق سے اس وقت انار اپنے دروازے میں کھڑی تھی ننھے کو جاتے دیکھ کر اُس نے اُسے گھر بلا لیا اور پوچھنے لگی "کہاں جا رہے ہو ننھے؟" "انار لینے اور کہاں؟" ننھے نے تن کر جواب دیا۔ "ابھی انار کھانے کا شوق نہیں گیا" وہ بولی۔ ننھے میاں بھی اس انار کے دانے کو دیکھ کر چہکے۔ اور اپنی ڈینگ مارتے ہوئے لگے اپنے آقا کی تعریف کرنے "ابھی ہمارے بابو صاحب کو سمجھا کیا ہے انہوں نے۔ بڑے آئے ہیں شہر بدر کرنے والے۔ واہ" "لیکن انہیں معلوم بھی ہے" وہ بولی "لو یہ اور سنو" ننھے نے جواب دیا "کیا نہیں معلوم انہیں؟ سب کچھ معلوم ہے۔ پر وہ کیا پروا کرتے ہیں۔ ان باتوں کی؟" "سچ" وہ بولی۔ "ہاں ہاں اور نہیں تو کیا جھوٹ"؟ اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ آواز مدھم ہو گئی۔ "ننھے واقعی انہیں میرا خیال ہے"؟ "اور تو کیا ویسے ہی تمہارا صبح شام پیٹ میں انار دانہ بھرتے رہتے ہیں" اُس نے جواب دیا۔

یہ جواب سُن کر وہ بے تابانہ پوچھنے لگی "لیکن وہ مجھ سے ملتے کیوں نہیں"؟ اس بات پر ننھا گھبرا گیا۔ اب کیا جواب دے۔ اپنے آقا کی عزت کا سوال درپیش تھا۔ وہ آقا جو اس کا اپنا آقا تھا۔ لیکن آخر وہ مجبوری تھا۔ کمبخت کو ایسی سوجھی کہ بس حد ہی کر دی۔ ایک پراسرار انداز میں منہ پر انگلی رکھ کر بولا "اس میں بھی اک بھید ہے"۔ اُس کے اس فرضی خود ساختہ بھید نے انار کے دل میں ایک اور چنگاری سلگا دی۔ ایک تو وہ بے نیاز نوجوان۔ اور دوسرے ایک دلچسپ بھید بس یوں سمجھ لیجئے کہ اُس آپ بیتی کی آخری کڑی بھی مہیا ہو گئی۔

اگلے دن مجھے صاحب نے بلا بھیجا۔ کہنے لگے "ول ول بابو۔ ٹم مسجد کے پاس رہتا ہے"؟ "جی صاحب مسجد کے پاس"۔ "ول۔ ٹم نے مسجد کو ناپاغ کیا۔ مطلب یہ کہ مسجد کو بُرا کیا ٹم نے"۔ "مسجد کو بُرا کیا" اُن کا عجیب سا سوال تھا۔ میں نے جواب دیا "صاحب میں نے تو کبھی مسجد میں قدم بھی نہیں رکھا" "شاباش شاباش۔ ول رائٹ۔ دیکھو مسجد کو بالکل بُرا نہ کرو سمجھا نہیں ہم رپورٹ کرے گا"۔ مجھے صاحب سے جان چھوٹی تو میں سوچنے لگا کہ اس قلندر کو آج سوجھی کیا

کہ مسجد کو ناپاک کرنے کا قصد لے بیٹھا ـــــ پھر خیال آیا کہ بھئی۔ آج دو گھونٹ زیادہ پی لی ہوگی۔ بے چارا ہضم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس خیال سے مجھے تسلی سی ہوگئی۔ اور میں گھر جا کر اطمینان سے سو رہا۔

انجنیئر صاحب سے مایوس ہو کر وہ قربان علی سے ملے۔ قربان علی ایک صاحبِ ذوق جوان تھے۔ گورا چٹا جسم اور چھیڑ دینے والی آنکھیں۔ ہنس کر کہنے لگے "بھائی جب تک محلے میں ایک قابلِ فروخت انار ہے لوگ خریدیں گے۔ بس جھگڑا ختم۔ بلکہ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ وہ مسٹر سے اور گپتا کی بجائے ایک مسلمان کے گھر آتی جاتی ہے۔ ارے میاں۔ باپ کو کوئی اعتراض نہیں۔ وہ خود بھی یہی چاہتی ہے۔ پھر اس میں ہمارا تمہارا کیا نقصان۔ باقی رہا مسجد کے ساتھ کا قضیہ، مان لیا کہ وہ دلبر سب اوورسیئر مسجد کے ملحقہ کمرے میں رہتا ہے لیکن وہ بھی تو مسجد کے پڑوس میں رہتی ہے۔ اُسے کیوں نہیں نکالتے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری"۔

اس وقت تقریباً نو بجے ہوں گے۔ وہ سب مسجد کے باہر جوگان میں کھڑے بحث کر رہے تھے۔ انار بھی دروازے کی درزوں سے لگی کھڑی تھی اور یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ عین اس وقت حسبِ معمول میں بھی پُل پر جاتے ہوئے وہاں سے گزرا۔ میں نے دور سے قربان علی کو دیکھا اور ایک السلام علیکم پھینک کر اپنی طبعی بے نیازی سے آگے چل پڑا۔ مجھے مطلقاً یہ خیال نہ آیا کہ اس وقت وہ سب وہاں کھڑے کیا کر رہے تھے۔ اور مجھے دیکھ کر سب خاموش کیوں ہوگئے تھے اور ملا کی لنگڑی ٹانگ گھڑی کے پنڈولم کی طرح کیوں ہل رہی تھی۔ میں نے دو ایک قدم اٹھائے تھے کہ قربان علی نے آواز دی۔ "سب اوورسیئر صاحب! ذرا بات تو سنئے"۔ "فرمائیے"۔ میں نے سوٹی گھماتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کی اس معاملے میں کیا رائے ہے"؟ "کس معاملے میں"؟ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

اُن کی آنکھیں ناچنے لگیں۔ کہنے لگے "یعنی۔ ... تو یوں سمجھ لیجے ـــــ میرا مطلب ہے فرض کر لیجے کہ ایک خوبصورت لڑکی ہے۔ اُسے اعتراض نہیں۔ اس کے باپ کو اعتراض نہیں۔ اگر لوگوں کے پاس آتی جاتی ہے، لوگوں کو بھی اعتراض نہیں تو صاحب اگر کسی مسلمان کے پاس آنے جانے لگے ـــــ تو آپ کو کوئی اعتراض ہوگا"؟ "مجھے"؟ میں نے کہا۔ "مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے"۔

"صاف صاف کیوں نہیں کہتے آپ"؟ ملا نے اپنی لنگڑی ٹانگ کو جھلاتے ہوئے کہا۔ "کہہ تو رہا ہوں" وہ بولے۔ اور پھر مسکرا کر کہنے لگے "کیا یہ سچ ہے کہ آپ انار خریدتے ہیں"۔ "انار"؟ میں نے حیرانی سے کہا۔ "ہاں ضرور خریدتا ہوں۔ کیوں نہ خریدوں"۔ اس بات پر مجمع پر موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ غصے میں بھرا ہوا تو میں تھا ہی۔ انہیں خاموش دیکھا تو سلام علیکم کہہ کر پل کی طرف چل پڑا۔ اور سوچنے لگا کہ یہ کیا بکھیڑا ہے۔ چار ایک قدم کے بعد میں نے ایک بلند قہقہے کی آواز سنی۔ قربان علی کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ "بہت دلیر نوجوان ہے خدا کی قسم تم اسی سلوک کے لائق ہو"۔ اور وہ پھر ہنسنے لگا۔

اس روز قربان علی کی باتیں سن کر ملا کی لنگڑی ٹانگ جھولتی ہوئی دیکھ کر اور دوسروں کی سرگوشیاں سُن کر شاید میں یہ سمجھ لیتا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ شاید مجھے یہ بھی سوجھتی کہ اُن ٹکے ٹکے بکنے والے اناروں کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے جسے انار کہا جا سکے اور اُس نرالے انار کی خریداری مجھ پر بھی تھوپی جا سکتی ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں جب پورے دو ماہ کے بعد گھر جانے کا خیال دل میں سما رہا ہو۔ جب انار کلی اور مال روڈ کا نقشہ آنکھوں میں پھر رہا ہو۔ جب دفتر کے وسیع کمرے کی خوش گپیاں کانوں کو سنائی دے رہی ہوں۔ جب کوئی ملازم خوش اسلوبی سے اپنا کام سرانجام دینے کے بعد ترقی کے خواب دیکھ رہا ہو۔ یعنی جب کوئی مستقبل میں کھویا ہوا ہو تو حال دھندلا پڑ جاتا ہے اور ایسی ویسی باتوں پر دھیان دینا ناممکن ہو جاتا ہے اسی سے اُس روز میرے لئے ان عام روزمرہ کی تفصیلات کے متعلق کچھ سوچنا قطعی ناممکن تھا۔ گنگوئی کا پل مکمل ہو کر معلق کر دیا گیا تھا۔ اور اگلے روز میں واپس لاہور جا رہا تھا۔ اس لئے قربان علی کی وہ خوبصورت لڑکی اور وہ دلیر نوجوان میرے لئے چنداں دلچسپ نہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں سیٹی بجاتا چھڑی گھماتا، جاگتے میں لاہور کے خواب دیکھتا ہوا پل پر جا پہنچا۔

دوسرے دن جب میں اپنا سامان باندھ رہا تھا۔ خاں صاحب اور قربان علی کمرے میں داخل ہوئے۔ خاں صاحب کا سیندھوری چہرہ خوشی سے پھول رہا تھا۔ اور آنکھیں گویا تھی ہی نہیں یعنی ٹماٹو چٹنی کی بوتل مزے میں چھلک رہی تھی۔ وہ کہنے لگے۔ ارے واہ میاں کیا کہنے ہیں تمہارے۔ تم نے وہ کر دکھایا جو بڑے بڑے رئیس نہ کر سکے۔ شیر آپ ہی پنجرے میں بند ہونا چاہتا ہے۔ پہلے تو اُن کی بے معنی باتیں سُن کر مجھے غصہ سا آیا لیکن پھر انہیں ہنستے دیکھ کر میں بھی ہنس دیا۔

وہ بولے۔ میاں اب تو وہ خود چاہتی ہے۔ پھر دیر کس بات کی بس آج ہی ہو جائے یہ نیک کام ہے بھی تو وہ انار کا دانہ"۔ "ہیں؟ انار کا دانہ"! میں نے گھبرا کر

میرے مُنہ سے نکل گیا" کون انار کا دانہ؟" ہی ہی ہی ہی" وہ قہقہہ مار کر ہنسے" تمہارا من بھاتا انار ہی ہا ہا ہا ہا"

نہ جانے کیوں اُس وقت مجھے وہ ٹماٹو کی چھلکتی ہوئی بوتل کڑوی سی لگی۔

جی میں آیا کہ ان دونوں اصحاب کو دروازے سے باہر دھکیل دوں لیکن پھر خیال آیا کہ نگوئی میں میرا آخری دن ہے۔ جاتے ہوئے لوگوں سے بگاڑ ۔۔۔ میں خاموش ہو رہا۔

قربان علی خاں صاحب سے کہنے لگے" میں سمجھاتا ہوں انہیں" لیکن خاں صاحب ہنستے ہوئے چلائے" واہ میرے شیر نگوئی کا شیر" قربان علی بولے" سب سے اور سیر صاحب بات یہ ہے کہ ۔۔۔ کہ یعنی فرض کیجئے کہ ایک حسین لڑکی ہے"۔

فرض کر لیجئے! میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ کیوں فرض کر لیں ہم۔ ہم نے تو کوئی حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی وہاں۔ پھر فرض کرنے کا مطلب "فرض کر لو۔ گویا میں طالب علم تھا اور وہ ریاضی کا پروفیسر۔ لیکن اتفاقاً میری نگاہ گھڑی پر جا پڑی۔ لاری چھوٹنے میں صرف پانچ گھنٹے باقی تھے" تو صاحب جان چھڑانے کے لئے میں نے جی کہہ دیا۔ اس پر وہ بولے" ہاں تو اُس کا باپ اُسے بیچتا ہے اور وہ بخوشی بکتی ہے"۔ تو میں کیا کروں۔ میں نے سوچا۔ میں کوئی دلال ہوں کہ ان باتوں سے واسطہ رکھوں ۔۔۔ لیکن جی میرے منہ سے خواہ مخواہ نکل گیا۔

"حسن کا یہ عالم ہے کہ سارا علاقہ اس پر مرتا ہے"۔ بڑا مرے" میں نے سوچا"۔ کئی لوگوں نے پیغام بھیجے۔ بڑے بڑے رئیسوں نے لیکن اُس نے کسی کا بھی نہ پسند نہ کیا" "ہوں" میں نے غصہ و بلتے ہوئے جواب دیا۔

وہ کہنے لگے" تو صاحب اسی محلّے میں ایک نوجوان آ بسا۔ اور اس لڑکی سے محبت کرنے لگا۔ ہی ہی ہی ہی۔ ٹماٹو چٹنی کی بوتل چھلکی، کیسے نہ ہوتا عاشق؟ ادھر جوانی اُدھر حسن اور خدا کی قسم وہ انار کا دانہ اور یہ انار کا دیوانہ۔ ہا ہا ہا ہا۔ جب دوشنگرنی گال ابھرا بھر کر آپ کو گدگدائیں۔ وہ آنکھیں مداری کے روپے کی طرح کبھی گم اور کبھی ظاہر ہوں تو چاہے آپ غصے سے بھرے بیٹھے ہوں۔ آپ کے لئے ہنسی کو ضبط کرنا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہو جائے گا۔ میں بھی ہنس پڑا۔ قربان علی صاحب بولے ہاں تو۔ دونوں کا ملنا نہ ہو جاتا ہے۔ رات کو ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ لوگ آوازے کستے ہیں لیکن وہ دلیر نوجوان کسی کی پروا نہیں کرتا۔

"شیر شیر" خاں صاحب چلانے لگے۔

"ٹھیک" میں نے بھی بے سوچے سمجھے کہہ دیا۔

"اب وہ لڑکی" قربان علی بولے" اس نوجوان سے بیاہ کرنا چاہتی ہے۔ یعنی صرف وہی نوجوان اس کو اس گناہگارانہ زندگی سے بچا سکتا ہے۔ سوچئے اور سیر صاحب۔ ذرا سوچئے۔ آج تک اُس نے نہ جانے کیسے بڑے بڑے آدمیوں کے پیغام رد کئے ہوں گے۔ بڑے بڑے رئیسوں کو اُس سے محبت تھی لیکن وہ ان سب کو الّو بنا کر ٹھکرا دیتی تھی۔ لیکن اب اب وہ خود اُس نوجوان سے بیاہ کرنا چاہتی ہے"۔

اس کے بعد وہ دفعتہً خاموش ہو گئے۔ اس گہری خاموشی اور ان دونوں کی معنی خیز نگاہوں سے میں کچھ گھبرا سا گیا۔ تو پھر" میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھ کر پوچھا۔

"پھر! ہا ہا ہا ہی ہی"۔ دوشنگرنی تو دوں میں ایک آنکھوں کا جوڑا چیونٹیوں کی طرح رینگنے لگا۔

"میرا مطلب ہے" قربان علی بولا" میرا مطلب ہے آپ کی اس معاملے میں کیا رائے ہے؟"

"میری رائے۔ میری رائے کا اس بات سے واسطہ؟"

"کیوں نہیں" خانصاحب بولے" سب کام تمہاری رائے سے کیا جائے گا"۔

"لیکن رائے کا مطلب؟ لڑکا راضی لڑکی راضی۔ رائے؟" عجیب معاملہ تھا۔ بے ڈھنگ بکھیڑا۔

"میرا مطلب ہے اُن کی شادی کے متعلق" قربان علی نے کہا۔

"لڑکے کو فوراً شادی کر لینی چاہیئے میرا مطلب ہے یعنی اگر اس نوجوان کی جگہ میں ہوتا تو فوراً بیاہ کر لیتا"

"واہ واہ۔ واہ واہ" خاں صاحب چیخنے لگے" تم سے یہی توقع تھی واہ رے میرے شیر!"

قربان علی آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرائے۔ "اور پھر ابھی آئے ہم۔" کہہ کر خاں صاحب کا ہاتھ پکڑ باہر نکل گئے۔

اُن کے جانے کے بعد میں نے اطمینان کا سانس لیا اور لاحول پڑھ کر بستر باندھنے لگا۔ لاحول تو پڑھنا ہی تھا۔ ایسی بے معنی باتیں میں نے کبھی نہ سنی تھیں۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ ایک قافلے کی صورت میں لوٹے۔ قربان علی، خاں صاحب۔ وہ لنگڑا مُلّا۔ دو ایک نوجوان محلے دار اور ایک برقعہ پوش عورت اندر آ کر دھپ سے بے تکلفی سے اس چٹائی پر بیٹھ گئے جو کمرے میں بچھی ہوئی تھی۔ انہیں

اس طرح آتے دیکھ کر مجھے از سرِ نو غصہ آ گیا۔ جی میں آیا کہ سب کو باہر نکال کر دروازہ بند کر لوں لیکن ـــــــ اتنے لوگوں کو اپنے گھر سے نکالنا ذرا دل گردے کا کام ہے سا در میں۔ خیر چھوڑیے اس بات کو۔ اپنی بے بسی محسوس کر کے مقابیں نے خاموش رہنا تو درکنار اُن کی آمد پر دلچسپی محسوس کرنے کا جواز پیدا کر لیا۔ جانے کون ہے وہ دلیر نوجوان جس کا تذکرہ کر رہے تھے وہ۔ اُدھر وہ لنگڑا ملا نکاح کی رسم ادا کر رہا تھا اور ادھر میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ کہ دیکھیں تو وہ دلیر نوجوان کون ہے۔ انہیں نوجوانوں میں سے کوئی ایک ہو گا۔

جب ایجاب قبول کا وقت آیا اور ملا نے آنکھوں میں مسکرا کر پوچھا بابو جی آپ کو فلاں کی بیٹی اور فلاں کی پوتی کو اپنی زوجیت میں لینا قبول ہے تو میرے کان کھڑے ہوئے۔ دیکھیں وہ نوجوان کون ہے ـــــ

عین اسی وقت خاں صاحب کھی کھی کھی کر کے ہنسے۔ "عجب تماشا ہے"۔ وہ بولے۔ لڑکی دل سے چاہتی ہے لڑکا تیار ہے۔ تو اس سوال کا مطلب۔ ہا ہا ہا ہا"۔ اُس ٹماٹو چٹنی کی چھلکتی ہوئی بوتل سے ایسے چھینٹے اڑے کہ تمام صاحبان ہنسنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ لنگڑا ملا بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ بس پھر کیا تھا۔ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ بابو جی آپ کو مبارک ہو۔ خدا آپ کو اس نیک کام کا صلہ دے۔ مبارک ہو۔ اس وقت مجھے ہوش آیا اور معلوم ہوا کہ وہ نوجوان میں ہی تھا اور وہ میرے نکاح کی رسم ادا ہو رہی تھی اور وہ برقعہ پوش میری ہی بیوی تھی۔ غصے سے میرا منہ لال ہو گیا لیکن اپنا منہ لال کرنے کے سوا اب اور میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ نکاح کی رسم ادا ہو چکی تھی۔ خاموش رہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

"صاحبان" خاں صاحب بولے "دعا کیجیے کہ خدا کرے ان کی باہمی محبت یونہی قائم رہے اور یہ پھولیں پھلیں"۔ آمین! وہ سب چیخنے لگے خاں صاحب بولے "لڑکی کی طرف سے جہیز کے لئے میں ایک ہزار روپے کی حقیر رقم پیش کرتا ہوں۔ چھن سے ایک تھیلی میرے سامنے آ گری"۔ مرحبا خاں صاحب زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے وہ سب چلے گئے۔ صرف خاں صاحب، میں اور وہ رہ گئے۔

خاں صاحب نے جھک کر میرے کان میں کہا "مبارک ہو انار اب تمہاری ہے"۔ "انار" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ انہوں نے مسکرا کر اُس برقعہ پوش کی طرف اشارہ کیا۔ اور خود باہر نکل گئے۔ غصے سے میں پاگل ہوا جا رہا تھا لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ اور وہ کمبخت برقعے میں لپٹی ہوئی چوکی پر گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس اجنبی سی میلی سی گٹھڑی کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر کھاڑی میں پھینک دوں اور خود کہیں بھاگ جاؤں وہ لاری جس میں مجھے جانا تھا۔ انارکلی اور مال روڈ سب باتیں میرے ذہن سے نکل چکی تھیں اور میں غضب میں آ کر اس میلی سی گٹھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ معاً اُس نے برقعہ اٹھایا۔ رنگوں کا ایک طوفان اٹھا۔ دو کالی کالی آنکھوں نے میری طرف دیکھا۔ ایک لطیف مسکراہٹ کمرے میں تیرنے لگی۔ کمرے میں جو رنگین تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں کالے نیلے دھبے سے دکھائی دینے لگیں۔ میرے ہاتھ سے ٹائم ٹیبل چھٹ کر زمین پر گر گیا۔

مجھے پاگلوں کی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورتے ہوئے دیکھ کر وہ مسکرانے لگی اور پھر اُس نے شرما کر منہ پھیر لیا۔ نہ جانے اس وقت ننھا کہاں سے آ ٹپکا۔ اس کا منہ مسکراہٹوں سے لدا ہوا تھا۔ آنکھیں ناچ رہی تھیں "مبارک ہو۔ بابو جی" اُس نے چوری چوری انار کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر مجھ سے کہنے لگا "انار کھائیے بابو جی۔ یہ لیجئے" اُس نے اُس پلیٹ کو میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ جس میں انار کے دانے پڑے تھے "انار کھائیے"۔ اس نے دہرایا! در پیشتر اس کے کہ میں دو دانے اٹھاتا پلیٹ میرے سامنے سے اٹھا کر "کھائیے بھی نا" یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر بھاگ گیا۔ انار نے میری طرف دیکھ اور مسکراتے ہوئے نگاہیں جھکا لیں۔

ممتاز مفتی

شعر

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

فانی بدایونی

نقشِ پا

یہ نیم خواب گھاس پر اُداس اُداس نقشِ پا
کچل رہا ہے شبنمی لباس کی حیات کو
وہ موتیوں کی بارشیں ہوا میں جذب ہو گئیں
جو خاکدانِ تیرہ پر برس رہی تھیں رات کو

یہ رہروانِ زندگی خبر نہیں کہاں گئے
وہ کونسا جہان ہے ازل نہیں ابد نہیں!
دراز سے دراز تر ہیں حلقہ ہائے روز و شب
یہ کس مقام پر ہوں میں کہ بندشوں کی حد نہیں!

ہے مرکزِ نگاہ پر چٹان سی کھڑی ہوئی
اُدھر چٹان سے پرے وسیع تر ہے تیرگی
اسے پھلانگ بھی گیا تو اُس طرف خبر نہیں
عدم خراب تر ملے نہ موت ہو نہ زندگی!

ہزار بار چاہتا ہوں بندشوں کو توڑ دوں
مگر یہ آہنی رسن یہ حلقہ ہائے بندگی
لپٹ گئے ہیں پاؤں سے لہو میں جذب ہو چکے
میں نقشِ پائے عمر ہوں فریب خوردۂ خوشی۔

کوئی نیا افق نہیں جہاں نظر نہ آ سکیں
یہ زرد زرد صورتیں یہ ہڈیوں کے جوڑ سے
فضا کے بازوؤں میں کاش اتنی تاب آ سکے
دکھا سکیں وہ عہدِ نو ہی زندگی کے موڑ سے!

اختر الایمان

ایک خط

(اپنے لندنی دوست کے نام)

یہ آواز تم تک بہت دیر سے پہنچتی ہے لیکن تمہارا تقاضا ہے کہ یہ راز تم تک ضرور پہنچائی جائے۔ حالات بدستور ہیں سا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہندوستان ابھی صدیوں تک کروٹ نہیں لے گا۔ میں نے ریڈیو پر سنا ہٹلر کہہ رہا تھا۔ "تاریخ میں پہلی مرتبہ تمام جرمن قوم خدائے قدوس کے سامنے حاضر ہو کر التجا کر رہی ہے کہ وہ اُسے "تنازع للبقا" میں مدد دے" اس نے یہ بھی کہا تھا "اِس وقت جب کہ منشائے ایزدی قوموں کی قیمت کو جانچ رہا ہے۔ جرمن سپاہی عدالت ایزدی میں حاضر ہے، تمام تصویروں میں جوش و خروش کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ یہ چیز یہاں نایاب ہے تم سُن کر ہنسو گے ہمارا ایک قومی لیڈر ایک دن سٹیج پر کئی ہزار کتابی کیڑوں کے سامنے کہہ رہا تھا کہ اگر اُس کے سامنے اقبال کا کلام اور پاکستان کی حکومت پیش کی جائے اور کہا جائے کہ وہ اپنے لئے ان میں سے ایک چیز انتخاب کرے تو وہ اقبال کے کلام کو پاکستان پر ترجیح دے گا۔ جذبہ نہایت ارفع تھا اور تم اقبالی ہونے کی وجہ سے یہ بات سن کر کرسی سے اچھل پڑے ہو گے لیکن جانتے ہو اِس قومی لیڈر نے اقبال کا کس قدر مطالعہ کیا تھا؟ اس نے اس مجمعے میں اقبال کا ایک مصرعہ یوں پڑھا تھا۔

چین و عرب رہے، ہمارا ہندوستاں

اور صرف یہی لنگڑا مصرعہ پڑھا تھا۔ بس اسی سے اندازہ لگا لو کہ پاکستان کو اقبال کے کلام کے عوض ٹھکرانے والوں کے جذبات کس قدر صداقت پر مبنی ہیں۔ خیر یہ تو اد بی لطیفہ ہے تم حسب معمول کہہ دو گے سب لوگ عرض تو نہیں جلتے۔ ہندوستان کا چہیتا گویا سہگل بھی تو غالب کے اشعار کے ساتھ بدسلوکی کیا کرتا ہے لیکن یہاں لغزش شاعری تک ہی محدود نہ تھی مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس تھا۔ ہندی مسلم کی قسمت پر سوچ بچار کے لئے لاکھوں آدمیوں کا ایک پریشان انبوہ ہر روز منٹو پارک میں تین دن جمع ہوتا رہا۔ لیکن قائدوں کی سست رفتاری کا یہ عالم تھا کہ نو سال قبل جس خیال کو وضاحت سے اقبال مرحوم نے پیش کیا تھا اور پانچ چھ سال سے ہم تم کیمبرج، آکسفورڈ اور لندن میں جس کا ڈھنڈورا پیٹتے رہے ہیں۔ اسی خیال کو زبانی اس پریشان ہجوم کے سامنے ۱۹۴۰ء میں پیش کر دیا گیا اور کسی خدا کے بندے نے اُن سے یہ نہ کہا کہ قبلہ اب اس خیال کو خیالی دنیا سے نکال کر کچھ عملی شکل بھی اس کی مرتب کریں۔ پاکستان کا تخیل موجود ہے لیکن ابھی تک وہ قوتیں بروئے کار نہیں آئیں جو مخلصانہ طور پر اس کی تحصیل کے لئے سرگرم عمل ہو جائیں۔ ہندی مسلمان صحیح قیادت کے نہ ہونے کی وجہ سے ایک طرف ہندو ہمسائے سے خائف ہے اور دوسری طرف فرنگی آقا سے مرعوب ہے۔ اور نہیں سمجھتا کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ بلِس مجھ سے ملنے آئی تو اُس نے ہماری سرگرمیوں پر عجب انداز میں تبصرہ کیا۔ کہنے لگی "لندن میں تم ہمیں اسلامیات اور اسلامی سیاست پر اس قدر واضح انداز میں لکچر دیتے تھے کہ ہمیں تمہارا قائل ہونا ہی پڑتا تھا لیکن یہاں آ کر اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے وہ تو سب مضحکہ خیز ہے۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ "تمہیں کون چیز یہاں کی اسلامی سیاست میں مضحکہ خیز نظر آتی ہے۔"

کہنے لگی "یہی ایک پاکستان کا قصہ لے لو۔ تم مسلمان تو بچوں کی طرح ہو ملک کے مختلف حصوں کو اسی طرح سمجھتے ہو جیسے انار کلی میں کسی دکان پر کھلونے پڑے ہوئے ہوں۔ اور بغیر سوچے سمجھے مچل رہے ہو کہ یہ کھلونا بھی تم لو گے وہ کھلونا بھی تم لو گے۔ یہ مانا کہ کھلونے تمہیں پسند ہیں لیکن بہر حال یہ کھلونے تمہارے نہیں اور اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ہونے چاہئیں تو پہلے تو تمہیں یہ معین کرنا چاہئے کہ کون کون سے کھلونے تمہارے ہونے چاہئیں اور پھر ذرا اپنی جیب ٹٹولو کہ اِن کھلونوں کی قیمت ادا کرنے کے لئے دام بھی پاس ہیں یا نہیں۔ ملک صرف اتنا کہہ دینے سے اپنائے نہیں جا سکتے کہ وہ تمہارے ہیں۔ ہم نے تم سے بھیک مانگ کر ہندوستان حاصل نہیں کیا تھا جو ہم بھیک مانگنے پر

تمہیں واپس کر دیں، اور اس کا جو حصہ تمہیں پسند ہو وہی واپس کر دیں۔ سب سے پہلے تمہیں ہم کو یقین دلانا ہوگا کہ فلاں فلاں حصہ درحقیقت تمہارا ہے اور اُس کے بعد یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تم اس کو حاصل کرسکنے کے اہل ہو۔

میں نے کہا، فلس یہ تو ممکن ہے کہ ہم عنقریب تم پر یہ ثابت کر دیں کہ فلاں فلاں حصہ بالکل اسی طرح ہمارا ہے جس طرح سوڈیٹن لینڈ جرمنوں کا ہوگیا ہے۔ لیکن یہ کیسے ثابت کرنا ممکن ہوگا کہ ہم اُس کو حاصل کرسکنے کے اہل ہیں؟

فلس بولی، یہی تو مسئلے کا اہم حصہ ہے۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ کھلونوں کی قیمت ادا کرنے کے لئے کھرے سکے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ یہ سکے قوم کا وہ خونِ عزیز ہوتا ہے جو فتح کی دیوی کے قدموں پر بہایا جاتا ہے۔ اس قربانی میں بڑے چھوٹے اور بوڑھے بچے کی تمیز نہیں کی جاتی۔ سب آدمی ہیر ہینلائین (Herr Henlein) کی طرح خوش قسمت نہیں ہوتے کہ بیس سال تک صرف بیلچوں سے پریڈ کرنے کے بعد رات کی رات میں سوڈیٹن لینڈ پر قبضہ کرلیں۔ فنلینڈ کی طرف دیکھو محض ملک کا ایک حصہ محفوظ رکھنے کے لئے انہوں نے دیکھتے دیکھتے پندرہ بیس ہزار آدمی قربان کر دیئے ہیں۔ اس کے برعکس اپنی حالت کا جائزہ لو۔ اول تو تمہارے قائدین بیک وقت مختلف سمتوں میں کھڑے ہو کر مختلف آوازوں سے چلا رہے ہوتے ہیں۔ - -

- - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - قوموں کی موت و حیات کی کشمکش میں چند سو، چند ہزار بلکہ لاکھوں جانوں کا تلف ہو جانا ایک بالکل قدرتی امر ہے۔ اور جو قوم اس راز کو نہیں سمجھتی اُس کے لئے سربلندی مقدر نہیں کی گئی۔ تم سے تو سرحد کے قبائلی ہی بہتر انسان ہیں۔ ہر روز اُن کے جتھے گھروں سے شادیانے بجاتے ہوئے نکلتے ہیں۔ شام کو ہماری فوجوں سے نبرد آزمائی کرتے ہیں اور کافی طور پر مسلح نہ ہونے کی وجہ سے اُن میں سے کئی مر جاتے ہیں لیکن جب کوئی جتھا مالِ غنیمت لے کر واپس پہنچتا ہے تو دف و بگل کی آوازوں سے پہاڑیوں کے دامن گونج اُٹھتے ہیں اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ اُسی رات کو انہی قبائلیوں کے ڈیروں میں کئی نوعمر لڑکیاں بیوہ ہوگئی ہیں اور کئی بچے یتیم رہ گئے ہیں۔ جتھے سے واپس آنے سے کامیاب افراد اور مشین گنوں اور سنگینوں سے اُلجھ کر ختم ہو جانے والے شہیدوں کے لئے یکساں طور پر خوشی منائی جاتی ہے۔ میں تو جب ان خبروں کو پڑھتی ہوں تو مجھے اقبال کے وہ شعر یاد آجاتے ہیں جن کا ترجمہ تم نے ہمیں لندن میں سنایا تھا۔

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
ہے مگر فرصتِ کردار نفس یا دو نفس
عوضِ یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز

میں تو سمجھتی ہوں سرحدیوں سے بہتر اقبال کے فلسفۂ حیات کو کسی نے نہیں سمجھا اور یا یہ کہ اقبال نے قبائلیوں کی زندگی سے بہتر اور کسی زندگی کو نہیں سمجھا۔ تم لوگ تو ابھی تک پریشان بھیڑوں کا ہجوم ہو جو لٹھ لگنے سے گھبرا کر بھاگنے لگتا ہے اور بندوق کی آواز سن کر سہم جاتا ہے۔

فلس تو یہ کہہ کر چل دی اور میں سوچتا رہا کہ ان غیر ملکیوں اور بالخصوص آزاد ملکوں کے باشندوں کا نظریۂ حیات ہم سے کس قدر مختلف ہے۔

ان انگلستان میں یہ سب کچھ ممکن ہے۔ وہاں تم جبری بھرتی سے انکار کرسکتے ہو۔ ہاؤس آف کامنز کی دلچسپ بحث میں نے بھی پڑھی تھی اور یہ دیکھ کر متعجب نہیں ہوا تھا کہ حکومت نے ایک کامنر کے سوال کے جواب میں اعتراف کرلیا ہے کہ فرنگی اپنی سرزمین پر گورے اور کالے سے یکساں سلوک کرنے پر مجبور ہے اگر گورا یہ کہہ کر بھرتی ہونے سے انکار کرسکتا ہے کہ اُس کا ضمیر جنگ کرنے پر اُسے ملامت کرتا ہے تو کالے کو بھی یہ حق ہے کہ وہ بھرتی ہونے سے حسبِ خواہش انکار کر دے۔ لیکن ان کالوں کی یہ خوش قسمتی ہے کہ وہ فرنگی کی اپنی زمین پر بس رہے ہیں۔ کالوں سے چھینی ہوئی فرنگی کی زمین یعنی اس غلام آباد میں آزادہ روی کے ان حقوق سے ہر ایک کالا محروم کر دیا گیا ہے۔ تم وہاں بھرتی ہونے سے انکار کر رہے ہو لیکن یہاں کالے بھرتی ہونے کے لئے ترس رہے ہیں اور انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔ کالوں کے خون کی ارزانی ضرب المثل ہے۔ لیکن یہاں تو یہ قصہ ہے کہ اب اس خون کو خریدنے کے لئے کوئی تیار ہی نہیں۔ - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - -

- - - - کالوں کا خون کوئی اتنی اہم چیز نہیں جس کی حفاظت کے لئے ہندوستانی اپنے آپ کو تیار کرلیں۔ میں جب عراق کے مختلف مدارس میں گیا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ادنیٰ جماعت سے لے

اعلیٰ جماعت کے طلبہ تک سب فوجی لباس میں ملبوس تھے۔ بغدا دمیں ایک معلّم سے میں نے اس کی وجہ دریافت کی۔ بولا۔

"اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے ہم جہاد کی سپرٹ کو بچپن ہی سے بچّوں کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے طلبہ کے لباس میں تلوار اور بندوق شامل نہیں لیکن فوجی لباس سے بھی ایک خاص نفسیاتی اثر پڑتا ہے اور وہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فوجی تنظیم اور یک جہتی کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اور جب وہ اعلیٰ مدارج میں پہنچتے ہیں تو ہم انہیں بندوق اور تلوار بھی دے دیتے ہیں۔ اور تجربے سے ہم پر یہ واضح ہوا ہے کہ فوجی تنظیم کے بغیر مدارس میں پڑھتے ہوئے بچّوں کی بہ نسبت وہ بچّے جلد اور بہتر سپاہی بنتے ہیں جو فوجی نظام والے مدارس سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔

میں نے پوچھا۔ لیکن آپ فوجی تنظیم اور فوجی نظام پر اس قدر مصر کیوں ہیں؟ مدارس کا منتہائے مقصد صرف یہی تو نہیں ہوتا۔

اس پر بغدادی معلّم کچھ جھلا گیا کہنے لگا "ہاں گاندھی کے ملک میں بسنے والوں کا مقصدِ حیات ہم سے ضرور مختلف ہوگا لیکن اسلامی حکومت کے مدارس کا نظام تو صرف فوجی ہو سکتا ہے، اگر شیر دنیا میں روباہ بازی کے لئے پیدا نہیں کیا گیا، اگر بھینسے کو سینگ اس لئے نہیں دئے گئے کہ وہ اُن کو کٹوا کر گدھا بن جائے اور اگر شاہین کو پنجے اس لئے نہیں دئے گئے کہ وہ اُن کو توڑ کر چڑیوں میں مل جائے تو مسلمان کو بھی جہاد کی تعلیم اس لئے نہیں دی گئی کہ وہ ظلم وستم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ اور جب آپ جہاد کے قائل ہیں تو پھر آپ فوجی تنظیم کے کس طرح منکر ہو سکتے ہیں۔ فوجی تنظیم کے بغیر جہاد ممکن ہی کس طرح ہے۔ آپ دیکھتے نہیں جن قوموں سے فوجی تنظیم ختم ہو چکی ہے وہ ظلم وستم کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کرنے کے قابل نہیں رہے یہی حال اُس مسلمان کا ہے جو اپنے بچّوں کو فارسی، عربی، انگریزی اور دوسری زبانوں کے علاوہ کئی علوم وفنون کی تعلیم تو دیتا ہے لیکن انہیں جہاد کی تعلیم نہیں دیتا اور انہیں جہاد کے لئے تیار نہیں کرتا۔ جہاد کا یہ مفہوم نہیں کہ تم خواہ مخواہ لوگوں سے اُلجھتے پھرو۔ یہ فرنگی کی تعبیر ہے۔ جہاد نام ہے حق و باطل میں کشمکش کے وقت حق کے نام پر جان لٹا دینے کا۔ لیکن اگر تم سرے سے جہاد ہی کے قابل نہیں تو حق و باطل کی تمیز کیوں کرنا چاہو گے۔ تم خود ہی کہو غلامی کی زندگی میں تم دن میں کئی مرتبہ اُس حق کا اعلان کر سکتے ہو۔ جس کو تم حق سمجھتے ہو۔ جہاد کی سپرٹ سے بیگانگی نے تمہیں حق پرستی کی سپرٹ سے بیگانہ بنا دیا ہے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے بچے سکول سے وہ جسم لے کر باہر نکلیں جو حق و باطل کی تمیز کرتے وقت اپنے ضمیر کو اس لئے کچل کر رکھ دے کہ وہ باطل سے نبرد آزمائی نہیں کر سکتا۔ ضمیر کے بغیر کھوکھلے جسموں سے ابوبکر اور حسین پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ دنیا میں یزیدوں کی کمی نہیں۔ حق کو قائم رکھنے کے لئے حسین پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ تبھی ہو سکتا ہے جب تم جہاد کے قابل ہوا در فوجی تنظیم پیدا کرلو۔

سنا تم نے بغدادی مدرّس کا نظریۂ تعلیم ہم سے کس قدر مختلف ہے۔ میں نے یہی نظریہ اپنے کالج کے سامنے پیش کیا تو ایک کہنہ مشق استاد بولے:۔

"باز صاحب آپ کیا کرتے ہیں مسلمان بچّے بادشاہوں کی اولاد ہیں آپ ان کو کوچوانوں کی وردی پہنانا چاہتے ہیں"۔

مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہہ دیا "قبلہ ممکن ہے بہت سے بچے بادشاہوں کی اولاد ہی ہوں۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے ان بچوں اور ان کے باپ داداؤں کو کوچوانوں کی وردی پہننے والے فرنگی سے کم ازکم سوا سو سال سے جوتے پڑ رہے ہیں"۔

اس پر پروفیسر موصوف جھلا کر خاموش ہو گئے۔ اور خاموش ہونے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ نہ اُن کے پاس بندوق تھی نہ میرے پاس پستول تھا کہ ہم باتوں کے علاوہ لاتوں سے بھی ایک دوسرے کا بھوت نکال سکتے۔ یہ بے بسی یہاں عام ہے اور دوسرے ملکوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے یاد ہے جس دن ہم تم دونوں پارلیمنٹ سٹریٹ لندن میں لیبران رزانس کا صدر (Lehman) کا جلوس دیکھ رہے تھے تو سپاہی کے منع کرنے کے باوجود ایک نوجوان لڑکی اپنی جگہ سے دو تین بار ہل گئی تھی اور آخری مرتبہ جب سپاہی نے درشتی سے اُسے روکا تو وہ سپاہی کے ایک تھپڑ لگا کر آگے چل دی تھی اور سپاہی متبسم ہو کر صرف یہ کہہ کر چپ ہو گیا تھا۔

Lady they teach you manners at School

(خاتون تمہیں سکول میں اطوار سکھائے جاتے ہیں)

جانتے ہو یہاں کیا ہوتا ہے۔ ایک جہاد سے نابلد نوجوان دیوالی کے ہجوم میں انار کلی میں پھنس گیا تھا۔ ایک تھانیدار دونوں ہاتھوں سے اُسے پیچھے کی طرف دھکیل رہا تھا اور اس بیچارے نے مجبور ہو کر کہہ دیا۔ تھانیدار صاحب اب دیوار کے پار تو نہیں جا سکتا، اس پر افسر کی آنکھوں میں

خون اتر آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نوجوان نے اُس کے باپ کو قتل کر دیا ہے اور وہ ابھی اس کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ اور اُس نے بغیر سوچے سمجھے نوجوان کو اس قدر زد و کوب کیا کہ اُس کا سر چکرانے لگا۔ وہ غنیمت ہے کہ چند لوگوں نے اُسے بچا لیا ورنہ افسر ایک سپاہی کو حکم دے چکا تھا کہ نوجوان کو فلاں فلاں دفعہ کے ماتحت ہتھکڑی لگا لو۔ کہو اگر یہ حالات ہوں تو ضمیر کی آواز کس قدر بلند کی جا سکتی ہے! اور اُس شریف آدمی کو کیا کہو گے جو ڈھنڈورچی سے ناگوار ڈھنڈورا سُن کر محض اس لئے خاموش ہو جاتا ہے کہ اُس پر اعتراض کرنا حکومت کے اقتدار کی تحقیر کے مترادف ہے، اس میں ہنسنے کی کونسی بات ہے؟ حامد (یہی ہمایوں کے مدیر) انارکلی سے گزر رہے تھے۔ دو ڈھنڈورچی ڈرامائی انداز میں لوگوں کو متنبہ کر رہے تھے کہ فسادات کے سلسلے میں عوام کو مظاہرے کرنے والے اجتماعات سے دور رہنا چاہیئے کیونکہ ایسے موقعوں پر حکومت گولی چلانے پر مجبور ہو جایا کرتی ہے۔ جانتے ہو۔ یہ ڈھنڈورا سُن کر حامد نے کیا اثر قبول کیا۔ اُسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے عوام کو حکومت چوہے سمجھتی ہے اور گولی کی تلی سے ڈرا کر خائف کرنا چاہتی ہے۔ چونکہ حامد ہمیشہ اپنے آپ کو عوام کا ایک جزو سمجھتے ہیں (یہ میری ذاتی اطلاع ہے) اس لئے انہیں اس ڈھنڈورے کو سُن کر بہت طیش آیا۔ لیکن اس طیش کا سلسلہ صرف طیش آنے تک ہی محدود تھا۔ بغدادی سکولوں میں تعلیم نہ پانے والا ہنستا ہندوستانی مسلمان اپنے جذبات کی تلخی سے اپنے دل و دماغ کو گداز نہ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ کیونکہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

ہاں ہم ملّی درسگاہ میں کام کرتے ہیں۔ تم بے قرار ہو کہ ملّت کے تحفظ و بقا کے لئے ہم طلبہ میں جذبات پیدا کرنے کے علاوہ عملی تدابیر کی نشر و اشاعت کیوں نہیں کرتے۔ کاش تم بھی ایک دن یہاں طالب علم کی حیثیت سے آئے ہوتے تاکہ تمہیں معلوم ہو سکتا کہ ملّی درسگاہوں میں ملّت کا مفہوم کیا رہ گیا ہے۔ دو سو طلبہ میرے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نے برسبیل تذکرہ عَبْدُالْمُطَّلِب کا تلفظ پوچھا تو صرف ایک لڑکے کو تلفظ معلوم تھا اور مزید استفسار پر اُس نے بھی یہ کہہ دیا کہ عبدالمطلب محمدؐ کے چچا تھے (در حقیقت دادا تھے)۔ کہو جس ملّی درسگاہ میں نوجوانوں کی جہالت کا یہ عالم ہو وہاں کون کون سے پہاڑوں کو کھود کر جوئے شیر لائی جائے۔ میری فہمائش پر ایک طالب علم نے نہایت غصے کی حالت میں مجھ سے کہہ دیا "آپ ہمیں ہماری جہالت پر تو کوستے ہیں لیکن قصور کس کا ہے؟ ہمارے ماں باپ تو بارہ سال سے ہمیں ملّی درسگاہوں میں بھیج رہے ہیں لیکن ملّت کے معلّموں کو یہ کبھی احساس بھی نہیں ہوا کہ کتابوں کو رٹانے کے سوا ان کی تربیت کرنا بھی ضروری ہے۔ آپ لوگوں کو اپنے ذاتی دھندوں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ آپ نصاب کی تدریس کے علاوہ کسی اور طرف بھی توجہ کر سکیں"۔

اس پر ایک اور طالب علم بظاہر میری برأت کے لئے کھڑا ہوا لیکن اُس نے مظلومیّت کا بھانڈا پھوڑ کر رکھ دیا۔ بولا "صاحب آپ اساتذہ کو بھی ناحق کوستے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ گذشتہ بارہ سال آپ نے ملّی درسگاہوں میں گذارے ہیں لیکن آپ اس امر کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ یہ ملّی درسگاہیں ملّت کے اُن غمخواروں کے ہاتھوں میں ہیں جنہوں نے اپنی مجلسوں کو ذاتی اغراض کے لئے میدانِ پیکار بنا رکھا ہے۔ ملّی درسگاہوں کا فرضِ اوّلین ملّت کے نوجوانوں کو وہ تعلیم دینا تھا جو انہیں مفید انسان بننے میں مدد دیتی لیکن یہ تو تب ممکن تھا جب ملّت کے نام نہاد بہی خواہوں کے دل بھی اس جذبے سے معمور ہوتے۔ اور وہ اساتذہ کو اس کام کے لئے آمادہ اور مجبور کرتے لیکن یہاں تو سارا کام ہی دُکانداری کا سلسلہ ہے۔ ہمارے اساتذہ صرف کارندوں کا کام دے رہے ہیں۔ اگر بکری اچھی ہو جائے یعنی طالب علم زیادہ داخل ہوں اور نتیجہ اچھا نکل آئے تو مالک خوش کساد بازاری ہو تو مالک ناراض۔ بھلا جن درسگاہوں میں عین حیات صرف طلبہ کی تعداد اور امتحان کا نتیجہ رہ گیا ہو وہاں ملّت کے افراد کی تربیت کیا ہو سکتی ہے۔ اور پھر یہ بیچارے استاد ہیں ہی کس شمار میں۔ اگر طلبہ منافقانہ تعلیم کی وجہ سے ان کی تپلونیں نہیں اتار لیتے تو انہیں یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کوئی قومی کارکن پیچھے سے ان کا کوٹ پکڑ کر درسگاہ سے باہر نہ نکال دے۔ اساتذہ کا کام خودی اور خودداری کی تعلیم دینا .... ہے لیکن جو جہلا کی تعریض و تادیب کے بعد طلبہ کے سامنے آئیں اُن کے پاؤں خود لڑکھڑا رہے ہوتے ہیں وہ ہم کو ادب و احترام سے کس طرح آشنا کر سکتے ہیں .....،

بات بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے لڑکے کو خاموش کرا دیا۔ لیکن ایک عرصے تک اُن حقائق پر غور کرتا رہا جو ان طالب علموں کے پیشِ نظر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ شہنشاہیت کے اثرات سرکاری اداروں سے گذر کر نہ صرف ملّی اور قومی درسگاہوں تک پہنچ چکے ہیں بلکہ اُن پر قابض ہو چکے ہیں یہاں تک کہ شہنشاہی استبداد کے جابرانہ مظاہروں کی جو مثالیں ملّی اداروں میں نظر آتی ہیں۔ وہ سرکاری اداروں میں بھی نظر نہیں آتیں۔ کیونکہ شہنشاہی استبداد اپنا وقار قائم رکھنے کے لئے بسا اوقات کمینہ پن سے محترز رہتا ہے۔ لیکن غلاموں کے اداروں میں جب

شہنشاہیت کی تمثیل سٹیج کی جاتی ہے تو اس ڈرامے کے افراد غلامانہ ذہنیت کی وجہ سے سفلہ پن اور رذالت کے زینے سے آخری سیڑھی تک نیچے اُتر آتے ہیں۔

ہم مسلمانانِ افرنگی مآب چشمۂ کوثر بجویند از سراب
بے خبر از سرِ دین اند این ہمہ اہلِ کین اند اہلِ کین اند این ہمہ
کرگساں را رسم و آئینِ دیگر است
سطوتِ پروازِ شاہین دیگر است

اقبال

دو قطعات

محمد باقر

لطفِ تبسم سے مناظر نکھرا نکھرا سا جہاں
اُجلے اُجلے ہیں روپ میں نکھری ہوئی سی زندگی
چاندنی کے روپ میں روپہلی بجلیاں
کوندتی ہیں ذرّے ذرّے میں روپہلی بجلیاں
اپنی آنکھوں میں لئے بیٹھا ہوں میں ان کی ہنسی

عکسِ خام ہے مداوائے خلشِ بے اندمال
ہر تمنا ہی ہے مضمحل سی چھائی ہوئی
ہر تمنا مضمحل ہے آ جانے کا حال
ایسے لمحوں میں کسی کی یاد آ جاتی ہے دھندلائی ہوئی
بن کے شکل چھا جاتی ہے

سحر رام پوری

خلل

(ایک ذہنی تصوّر)

کس محبت سے نظر بھر کے ہے دیکھا تو نے
آہ تو کون ہے اے راہ میں جانے والی
راہ کو غیرتِ فردوس بنانے والی
میرے احساس کے تاروں کو ہلانے والی

مجھ کو عجلت ہے کہ دفتر کو روانہ ہوں میں
مری رگ رگ میں تو کس وقت اُتر آئی ہے
حادثہ کیسا مری راہ میں تو لائی ہے
بن کے سیماب مری روح میں لہرائی ہے

اب میں دفتر کو چلوں یا ترا جوبن دیکھوں
اے مری راہ کی رنگین رکاوٹ کچھ بول
اور بھی دیکھ، گرہ دل کی ذرا اور بھی کھول
مسکراہٹ سے مری روح کے پردوں کو ٹٹول

آہ مجبور ہوں، تو چل میں یہیں ٹھہروں گا
تیرے مہکے ہوئے گیسو مری قسمت میں کہاں
تیرے ہنستے ہوئے ابرو مری قسمت میں کہاں
ترے انفاس کی خوشبو مری قسمت میں کہاں

میں پجاری ہوں، فقط دور سے دیکھوں گا تجھے
جب تک آنکھوں سے نہ اوجھل ہو ترا جسم حسیں،
جب تک آتا ہے نظر تیرا لباس رنگیں
موڑ وہ دور کا جب تک کہ تو مڑ جاتی نہیں

لیکن اے جانِ نظر کیوں نہ ترے ساتھ چلوں
وقت پر آ گئے بھی دفتر کو میں کب جاتا ہوں
راہ کے ایسے ہی حالات سے دب جاتا ہوں
دیکھ کر چاند سے ہر چہرے کی چھب جاتا ہوں

بعض اوقات تو رستے میں ہی رہ جاتا ہوں
آگے جاتا ہوا پیچھے کو پلٹ آتا ہوں

عدم

افسانے کا پلاٹ

ماں نے کل ہی مجھے کہا۔ "بیٹا تم دن رات بیٹھے لکھتے رہتے ہو اور کہتے ہو کہ میرے افسانے اچھے اچھے رسالوں میں چھپتے ہیں مگر آج تک تمہیں کچھ ملا بھی؟ ـــــ دس پندرہ اگر اور آجایا کریں تو تمہارے بال بچوں کے اخراجات ہی چل نکلیں۔"

میں جواب دینے کو ہی تھا کہ ابا جان حقے کا کش لگاتے ہوئے بولے "اسے دے گا بھی کون!ـــ لیکن فنکار کی محنت چند سکوں سے ادا نہیں ہوسکتی۔" پھر وہ ایک کہانی سنانے لگے۔ ایک مصور کسی بادشاہ کے دربار میں اپنی ایک تصویر لے کر گیا ـــ بادشاہ اس شاہ کار کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے اشرفیوں کی ایک تھیلی مصور کو انعام میں دینے کا حکم دیا ـــ مگر مصور نے وہ تصویر بادشاہ کے ہاتھ سے چھین کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ مصور دربار سے لوٹ آیا ـــ لوٹتے ہوئے اس نے ایک سرد آہ بھری اور کہا۔ میں زر و مال کا بھوکا نہ تھا۔ تصویر کی قیمت ڈال کر میری محنت برباد کر دی گئی۔ میں تو بادشاہ کے منہ سے تصویر کی تعریف سننے کا خواہشمند تھا مگر ـــ"

بادشاہ کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ خود اس کی تلاش میں نکلا۔ اس نے مصور کو ڈھونڈھ لیا مگر اس حالت میں کہ اس کی لاش محل کے باہر پڑی تھی اور تصویر کا ایک پرزہ وہ سینے سے لگائے ہوئے تھا ـــ" ابا جان نے پھر ایک لمبا کش لگایا۔ مجھے آج پہلی بار معلوم ہوا کہ ابا مجھے محض خبطی ہی نہیں سمجھتے ـــ گھر کا سارا انتظام اماں جان کو کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے انہوں نے میری کاوشوں کے نتیجہ کو مادی رنگ میں دیکھنا چاہا اور ابا جان ـــ وہ عملی طور پر زندگی سے الگ ہو چکے ہیں۔ اس لئے انہیں چند چاندی کے مزید سکوں کے آجانے سے چنداں خوشی نہیں ہوتی۔ وہ تو اس سے زیادہ خوش ہیں کہ ان کا بیٹا ایک فن کار ہے۔

خیالات کی پرواز اکثر اقتصادیات کے دھندلے بادلوں میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ میرے لئے یہ تجربہ کوئی نیا نہیں بعض دفعہ اس دھند میں پھنس کر خیال آتا ہے کہ اس سے تو گھاس کاٹتے تو اچھا تھا۔ ایک بہت بڑے ادیب تو پنواڑی بننے تک تو مجبور ہو گئے تھے لیکن خدا بھلا کرے آل انڈیا ریڈیو کا کہ بچ گئے۔ مگر ادب کے شہ پارے بیچنے سے بھی تو مجھے دکھ ہوتا ہے بعض بڑے بڑے ادیب اسی پر گذارہ کرتے ہیں۔ یہاں کا حق الخدمت نہیں بلکہ محض بسر اوقات کا ذریعہ ہے لیکن پھر بھی جب کوئی کہتا ہے کہ فلاں صاحب نے آٹھ دس روپے لے کر اپنا افسانہ دیا تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا افسانہ دس روپے کی مالیت کا تھا۔ افسانہ ـــ جگر پارہ، انمول موتی، فن کار کی شخصیت کا آئینہ دار۔ ایک ایک لفظ اگر جواہرات اور موتیوں سے تولا جائے تو بھی اُس کی قیمت ادا نہیں ہوسکتی ـــ اور پھر جب خود فنکار اس خرید و فروخت کا اعلان اپنے مضامین میں کریں تو مجھے شرم آتی ہے۔ روح بک سکتی ہے؟ جذبات کی قیمت ڈالی جاسکتی ہے؟ اور ـــ اور شخصیت کے پرزے چند پیسوں میں خریدے جاسکتے ہیں؟ مگر ہوتا ایسا ہی ہے اور علی الاعلان ہوتا ہے ـــ فن کا بیچنا میرے نزدیک گناہ ہے کفرانِ نعمت،

میرے لئے ادب ایک سرور ہے جسے میں خود زندگی دے کر حاصل کرتا ہوں۔ میری زندگی ہی ادب ہے۔ میں دفتر میں اتنے سالوں کی ملازمت کے بعد بھی معمولی تنخواہ کا کلرک ہوں اور یہی کی وجہ میری موجودہ حالت ہے میرا دماغ تخیل کی سرزمین میں کسی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ وہ بلندیوں کی طرف اُڑ رہا ہوتا ہے مگر میرے ہاتھ کاغذ پر چند "دفتری" فقرات لکھنے میں مصروف ـــ اس بلندی اور پستی کا نتیجہ میری "سروس بک" پر موجود ہے "تنبیہہ" "بلیک مارک"، موقوفی اور برطرفی کی دھمکیاں اور آخری بات یہ ہے کہ تنخواہ ترقی معکوس کی طرف مائل ہے۔ بیوی بچے، والدین، ان کی مالی بدحالی، میری پریشانی اور صحت کی خرابی۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود جب میں چند سطور لکھ لیتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا میں خود خالق ہوں ـــ اپنے افسانوں کے کرداروں کا خالق ـــ ایک دوست نے میرے ایک افسانے کے متعلق مجھے لکھا۔ "مجھے آغا خیرو (میرا ایک کردار) اپنی رشک بھری زندگی کے باوجود بے چارہ نظر آتا ہے اور مجھے اس کی بے چارگی پر اس سے بہت ہمدردی ہے" ـــ

میری مخلوق سے مجھے ہمدردی ہے ـــــ مگر خدا کی مخلوق ـــــ اُن سے اُسے کہاں ہمدردی۔

میں خالق ہوں ـــــ کرداروں کی تخلیق کے لئے رات دن سرگرداں رہتا ہوں۔ خدا کی مخلوق میرا خام مواد ہے۔ میں اُن کے دلوں میں جھانکتا ہوں اور وہاں سے اپنے کرداروں کے لئے زندگی لاتا ہوں۔ اس کے باوجود بعض دفعہ خود میری زندگی بے کیف ہو جاتی ہے۔ بھوک کا بھکاری خود میرا روپ لے لیتا ہے۔ میں بھوک کے کرب و بلا میں مبتلا ہو جاتا ہوں ـــــ بلکتے ہوئے بچے جو ماں کی چھاتیوں میں دودھ نہ پا کر تڑپتے ہیں وہ خود میرے بچے بن جاتے ہیں۔ اُن کی ماں اگر اس حالت میں بھی باہر نکلے تو کسی زردار کی ہوس کا شکار بن سکتی ہے۔ جب مجھے اس کا خیال آتا ہے تو اپنی بیوی ـــــ اوہ! ـــــ یہی میری زندگی ہے اور میرے کردار یہی زندگی لے کر صفحۂ قرطاس پر آتے ہیں۔ ـــــ اور پھر میں اپنے ان کرداروں کو دنیا کی نعمتوں سے مالا مال بھی کر دیتا ہوں۔ اُن کے لئے عیش و عشرت کے دروازے کھول دیتا ہوں ـــــ اور جب وہ اُن نعمتوں سے متمتع ہو جاتے ہیں جن کے لئے وہ ترستے تھے اور جن کے نہ ملنے کی وجہ سے وہ بغاوت پر آمادہ ہوئے تھے تو میں پھر ردِ عمل کا تماشا کرتا ہوں ـــــ میں خدا کی طرح انہیں "سرکشی میں سرگرداں" نہیں چھوڑ دیتا بلکہ ان سے ہمدردی کرتا ہوں۔ خود ہی ہمدردی نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو بھی اُن سے ہمدردی کرنے پر مجبور کرتا ہوں۔ بھلا خالق اپنی ایسی مخلوق کو چند سکوں کے عوض بیچ سکتا ہے؟ ـــــ

"آج شام کو چائے ساتھ پئیں گے" عزیز کا رقعہ ملا۔ عزیز اور محبت خاں میرے ان دوستوں میں سے ہیں جو مجھے ایک فن کار سمجھ کر نوازتے ہیں ـــــ ذاتی طور پر وہ اس زمیندار طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جن کی زمینوں کی پیمائش کے لئے محکمۂ مال نے علیحدہ عملہ رکھا ہوتا ہے۔ انہیں اس زمانے میں بھی اپنی جاگیرداری اور غیر منصفانہ تقسیمِ زمین پر فخر ہے اور اب بھی ان حقوق کو اپنا خاندانی حق اور وجہِ تفاخر سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود مجھ ایسے "خراباتی" سے انہیں حسنِ ظن ہے ـــــ ہاں تو میں وقت پر اُن کے ہاں موجود تھا۔ اپنے ایک نوجوان رئیس اور زمیندار کی آمد کے سلسلے میں یہ دعوت تھی۔ اپنے اور معززِ مہمان کے حسبِ حال دعوت بہت زیادہ پُر تکلف تھی۔

گفتگو کا موضوع چائے، مٹھائی، پیسٹری، کیک اور پھل سے نکلتا ہوا سیاسیات کے بار دلق باغ میں جا پہنچا۔ جہاں سے پھر گریز کیا گیا ـــــ اب ہم سرحد کی زندگی میں داخل ہو چکے تھے۔ ہماری محفل میں آج کا مہمان ایک وجیہہ، خوبصورت اور سرو قد نوجوان تھا۔ اس کا بارعب اور حسین چہرہ، خوبصورت مونچھیں، سڈول جسم، سفید و سُرخ رنگ اور بھر پور جوانی ـــــ شباب اپنے جوبن پر ـــــ اپنے گاؤں کا مالک۔ ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا تھا ہمارا معزز مہمان رائفل اور پستول سے مسلح اپنے خادموں کی ایک پوری فوج کے ساتھ مورچے سے حملہ آوروں پر فائر کر رہا تھا۔ کئی ڈاکو زخمی ہو کر گر گئے ـــــ مگر اس وقت وہ کرسی پر دراز بڑے مزے سے چائے کی پیالی لبوں سے لگائے مسکرا رہا تھا۔ سفید اور خوبصورت ہاتھ، کلائی پر سونے کی گھڑی ـــــ یہی ہاتھ رائفل کے "گھوڑے" پر پیغامِ اجل بن جاتے ہیں حسین ہاتھ اور کئی طریق سے موت کا پیغام لاتے ہیں ـــــ

مہمان اب میزبان نواز بن گیا۔ عزیز، محبت خاں اور میں تینوں کو سیر کی دعوت دی گئی۔ میزبان کی کار موجود تھی۔ اور ہم کار میں تھے۔

تن ڈھانکنے کو کھدر کی ایک دھوتی اور معمولی کرتہ کافی ہے۔ لیکن لباس کی موجودہ شکل اُس ابتدائی شکل سے کس قدر مختلف ہے۔ پہلے محض ضرورت تھی اور اب نمائش، ہماری زندگی میں ہمارے افعال کا بیشتر حصہ خود نمائی کا مرہونِ منت ہی ہوتا ہے۔ لباس کی نمائش کا مظاہرہ ہر روز مال، میکلوڈ روڈ، نسبت روڈ، لارنس گارڈن اور خدا جانے کہاں کہاں ہوتا ہے ہماری جمالیاتی تسکین میں بھی یہی نمائش زیادہ حصہ لیتی ہے۔ ورنہ حسنِ محض تو ان دیکھے ہی فنا ہو جاتا ہے۔

ہم بھی متمنی تھے کہ کوئی ہمیں دیکھے ـــــ پیادہ پا جوتیاں چٹخارتے ہوئے تو لوگ ہمیں ہر روز دیکھتے ہیں۔ بعض دفعہ تو ستم ظریفوں نے حد کر دی تانگے پر خود سوار ہیں، جگہ نہیں، سواریاں پوری ہیں۔ مگر راستے میں مل گئے تو زور سے آواز دی۔ "جمیل صاحب! آئیے تشریف لائیے"۔ "شکریہ" ہم نے اکثر شرمسار ہو کر جواب دیا۔ اُن کی خود نمائی ہمیں شرمندہ کرنے کے لئے تھی۔ مگر اس پر بس نہیں ہوتا۔ "آئیے نا! کہاں جا رہے ہیں آپ؟" ـــــ "سیر کو۔ ذرا شملہ پہاڑی تک ۔ ۔ ۔ ۔"

"خوب۔ خوب! مجھے تو اچھرے جانا ہے"۔

حد ہو گئی! تانگہ سواریوں سے بھر پور ہے۔ ہمیں دعوت دی جا رہی ہے پھر آپ اچھرہ جا رہے ہیں۔ حالانکہ ہمارا وہاں جانا ناممکن ہے۔ کہاں اچھرہ اور کہاں ہم۔

لیکن آج ہم چاہتے ہیں کہ کوئی ہمیں بھی دیکھے۔ تانگہ پر سوار ہم نے

والو! ہم موٹر میں سوار ہیں ٹیکسی کی موٹر یا کرائے کا تانگہ نہیں بلکہ ایک معزز دوست کی کار میں۔ جسے ہم جہاں چاہیں لے جاسکتے ہیں تمہاری طرح نہیں کہ اچھرے تک تانگہ گیا اور بس ——— مگر آج ہمارے جانثار خدا لبنہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ انور روز کہتا تھا کہ میں باقاعدہ لارنس؛ جاتا ہوں۔ سکندر مونٹ کے گرد چکر کاٹتا ہوں سلیم نے تو منٹگمری ہال کے سامنے دھرنا مار کر بیٹھنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ وہ ساقِ سیمیں کے مشاہدے کا مشتاق تھا ——— امجد تو کاسمو پالیٹن کلب کا "چوکیدار" تھا۔ وہ عشق کے معاملے میں خود بھی ہمہ گیر نظریے کا پابند تھا۔ اور اسے ہی ہندوستان کی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتا تھا۔ قیوم کرکٹ کا کھلاڑی تھا۔ وہ شام کے بعد کافی دیر تک جمخانہ کے کلب میں ٹھہرا رہتا لیکن آج یہ سارے کہاں گئے ——— اُن کی وہ پابندی اوقات کدھر گئی اور اسمبلی چیمبر کے گرد طواف کرنے والے نعیم بھی آج غائب تھے۔ جو آنے والے اسمبلی انتخابات کے لئے اپنے آپ کو ایک امیدوار خیال کرتے تھے اور حفظِ تقدم کے طور پر اسمبلی چیمبر کے گرد گھوم کر تقریر کی مشق کیا کرتے تھے۔

میکلوڈ روڈ۔ ایبٹ روڈ۔ منٹگمری روڈ اور مال سے ہوتے ہوئے ہم لارنس گارڈن میں تھے۔ شام کا اندھیرا، درختوں کے سایوں سے اور بھی تاریک ہو رہا تھا۔ اس میں بجلی کے قمقموں کی مدھم روشنی، شفاف سڑک جس پر ہماری موٹر جا رہی تھی۔ ہم باغ کے چکر کاٹ رہے تھے۔ کار آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ بڑی سڑک پر ہم روانہ ہوئے ——— ایک تانگہ ہمارے آگے چلا جا رہا تھا۔ اس میں ایک نوجوان عورت اور ایک مرد بیٹھے تھے۔ سیاہ رنگ کی باریک ساری میں ایک "مرمر کی ناگن" بیٹھی تھی۔ غازہ اور سرخی چہرے کو اور بھی جلا دے رہے تھے۔ نوجوان کار کو دیکھ کر اپنی جگہ پر پہلو بدلنے لگا۔ شاید اُسے اپنا کمتری کا احساس ہو رہا تھا۔ کار کی بتی کی روشنی نے ان دونوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا ——— آنکھیں چندھیا گئیں۔ تانگے پر حُسن یوں رسوا ہوتا پھرے ——— موٹر کے سامنے تانگے کی حیثیت ہی کیا ہے؟

"کاسمو پالیٹن کلب کے پاس سے ہم گزر رہے تھے۔ سبزہ زار کو بجلی کے قمقموں نے روشن کر رکھا تھا۔ بجلی کے پنکھے چل رہے تھے۔ کرسیوں پر مختلف حصوں میں مختلف قسم کے لوگ بیٹھے تھے۔ کہیں مرد اور عورتیں، کہیں صرف مرد، کہیں صرف عورتیں۔ جہاں صرف عورتیں تھیں وہ تھیں ادھیڑ عمر کی، ورنہ جوانی کو خودنمائی کی حرص زیادہ ہوتی ہے۔ سفید وردی پہنے کمر اور سر پر پٹی باندھے سبک رفتار "بوائز" بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ کاسمو پالیٹن کلب ——— خالص ہندوستانی کلب ہے۔ مگر نقل انگریزی کلب کی، ہر بات ویسی ہی شام کو ٹینس اور شام کے بعد اکل و شرب کے وہی طریقے جو انگریزی کلبوں میں ہوتے ہیں ——— یہ وہ طبقہ ہے جسے ہندوستان میں پیدا ہونے پر افسوس ہے

جمخانہ کے گرد گھومتی ہوئی کار منٹگمری ہال کے قریب آکر رُکی منٹگمری ہال ایک انگریزی کلب ہے۔ لارنس باغ کے شروع ہوتے ہی یہ کلب واقع ہے۔ جہاں ہندوستانی کو ممبر نہیں بنایا جاتا۔ اس کے تمام ممبر امپیریل سروس کے افسر ہوتے ہیں۔ حکومت کی باگ ڈور ان کے ہی ہاتھوں میں ہے۔ ہندوستان کی زمین سونا اگلتی ہے اس سونے سے "منٹگمری کلب" چلتے ہیں اور اس کے بعد سونا اگلنے والی زمین کی حالت کا نظارہ میونسپلٹی کے باغوں کی سیر کرنے سے ہوتا ہے جہاں ہندوستان کے باشندے سبز سبز گھاس کے "مخملیں" فرش پر دن بھر بھیک مانگنے کے بعد خوش خرام ہوتے ہیں۔ انہیں باغات میں ان کے بچے پیدا ہوتے ہیں اور گوبر کے کیڑوں کی طرح جلد جلد بڑھتے ہیں ——— لو تو ہماری موٹر وہاں آکر رُکی ——— فوجی بینڈ بج رہا تھا تاکہ پینے والوں کو اور سرور آتا ہے فاتح قوم ہمیشہ بینڈ بجاتی مفتوح ملک میں داخل ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے یادگار کے طور پر یہاں بینڈ بجتا ہے ———

"باغ کے تاریک کونوں میں حسن کی روشنی ملے گی"۔ ہم میں سے کسی نے کہا۔ ہم پیدل سفر کر رہے تھے۔ ہم نے تاریک کونوں کا رُخ کیا؛ اُن کا خیال درست نکلا۔ باغ کے منتظمین کتنے سمجھ دار تھے انہوں نے ہر ایسے تاریک کونے میں ایک بنچ بچھا دی تھی، خمیدہ درختوں کے جھنڈ میں جہاں رات اور بھی تاریک معلوم ہوتی تھی ——— ان تاریکیوں میں کتنی روشنیاں نمودار ہوتیں ——— بے تاب اور منتظر نگاہیں انہیں تاریکیوں میں کسی نرگسی کو ڈھونڈ نکالتیں۔ خاموشی میں گفتگو، زبان سے نہیں بلکہ ہاتھوں اور لبوں سے کی جاتی ہزار ارمان بھرے دل اور تاریکی ——— ہمارے قہقہے اکثر کے ارمانوں میں حارج ہوتے رہے

ہوٹل کے ایک کمرے میں ہم چاروں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ شام کا مہمان اب میزبان تھا۔ بھنا ہوا مرغ اور کوفتوں کی طشتریاں ہمارے سامنے رکھی تھیں۔ ہم سادہ غذا کھا رہے تھے۔ بے تکلف ہو کر حیاتین معلوم کر کے علم طب نے بنی نوع انسان پر بڑا احسان کیا۔ سادہ غذا میں حیاتین کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے امیر لوگ اب سادہ غذا کھانے لگے ہیں۔ اس کا اثر ان کی صحت پر بھی اچھا ہوتا ہے
میں نے کہیں پڑھا تھا کہ کھانا کھاتے وقت زور زور سے ہنسنا کھانے کو

ہضم کر دیتا ہے۔ ہم مزے لے لے کر کھاتے اور خوب کھل کھلا کر ہنستے رہے۔ حکما کا قول ہے کہ جینا کھانے کے لئے نہیں بلکہ کھانا جینے کے لئے ہے اور ہنسی جینے میں مدد دیتی ہے۔

سونے کے کمرے میں دو چارپائیاں تھیں۔ گر سونے والا ایک ــــ اس کی طرف اشارہ کئے جانے پر جواب ایک سرد آہ میں ملا ــــ جوانی میں دوسری خالی چارپائی کا خیال بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔

لالٹین کی مدھم اور بدبودار روشنی میں بیوی بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی روز کی طرح دال اور چاول موجود تھے۔ پاس ہی بچے گرمی کی وجہ سے تڑپ رہے تھے، بیوی اُن کو تھپکیاں دے رہی تھی،

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا"

"کیوں کہیں سے کھا آئے ہیں آپ"؟

نہیں ــــ" مجھے سچ بولتے ہوئے شرم محسوس ہوتی۔

میرے ساتھ والی چارپائی خالی تو نہیں تھی گر اس پر ایک کی بجائے کئی سو رہے تھے۔ لاہور میں جگہ کی قلت کے باعث بچوں کے لئے علٰحدہ علٰحدہ چارپائیوں کا انتظام مشکل سے ہی ہو سکتا ــــ میزبان کو جس کی حسرت تھی وہ مجھے میسر ــــ گر اس حسرت سے بدتر حالت میں، کاش میں بھی ایک آہ سرد بھر سکتا"ــــ

بھادوں کا مہینہ ہے۔ کئی دنوں سے بارش نہیں ہوئی۔ ہوا بند ہے حبس اتنا کہ خدا کی پناہ۔ بچے بے چین، جگہ تنگ، ایسے میں نیند کہاں"ــــ میرا دماغ خیالات کے ہجوم سے پر ہو گیا میں سوچنے لگا۔ شام کی پر لطف صحبت بار بار یاد آ رہی تھی، مگر اب ــــ میرا سر چکرانے لگا۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہونے لگا گویا میں مجسم افسانہ بن گیا ہوں۔ میرا رُواں رُواں افسانوں کا پلاٹ ہے۔ خیالات کا ہر دھچکا گویا افسانے کا نکتہ عروج تھا۔ میں سوچتا ہی گیا....

لالٹین کی مدھم روشنی میں میری پنسل کاغذ پر کار کی رفتار سے زیادہ تیزی سے چل رہی تھی ــــ ایک، دو، تین ــــ دس، میں نے دس افسانوں کے پلاٹ سوچ لئے تھے۔ میرا دماغ ابھی تک موٹر کی برق رفتاری کے ہمراہ تھا حسن، عشق، رومان، قدرت کی فیاضیاں، تہذیب دشمن، ارتقا ــــ کیا باقی رہ گیا تھا۔ میرے ان افسانوں کی تکمیل کے بعد مجھ پر یہ طعنہ نہ رہے گا کہ میں ہمیشہ زندگی کا تاریک پہلو ہی پیش کرتا ہوں۔ اب تو میں روشن پہلو دیکھ رہا تھا ــــ

"میں نے کہا جی" اُ کوئی مجھے پنکھے سے ہوا کر رہا تھا۔ "اماں نے کل ٹھیک تو کہا تھا آپ افسانوں کی قیمت کیوں نہیں لیتے"؟

"اونہہ! بیہودہ!" میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتی۔" میں ابھی تک یادداشت لکھ رہا تھا۔

"پرویز ننگے پاؤں سے ننگا ہے۔ آج اس کا پاؤں زخمی ہو گیا ہے۔ دن بھر درد سے چلاتا رہا"ــــ

پرویز میرا لاڈلا بچہ ــــ ننگا ہے ــــ درد سے دن بھر چلاتا رہا ــــ میں کیا لکھ رہا تھا ــــ قدرت کی فیاضیاں، رومان، تہذیب کا ارتقا ــــ گر میں فنکار ہوں۔ آرٹ کی قیمت نہیں ڈالی جا سکتی ــــ مگر انسان تو آرٹ سے زیادہ قیمتی ہے ــــ درد، میرا بچہ"ــــ مجھے لالٹین کی روشنی گھومتی ہوئی دکھائی دینے لگی ــــ میرا سر پھر چکرانے لگا۔ بیوی میرے منہ کی طرف تک رہی تھی۔

"لیکن میرا اـــ صوـــ ل ــــ میں، میں ــــ اچھا ــــ یہ افسانہ ــــ معاوضہ ــــ" لالٹین میں تیل کم رہ گیا تھا بتی مدھم ہوتی جا رہی تھی۔

شیر محمد اختر

بیداری

مشاہدات سے بالا ہیں جو، چھپا ہوں میں
تخیلات کی دنیا بسا رہا ہوں میں
مجسم بیداریاں خواب دیکھ لیں وہ
بجھا دو شمعِ حقیقت کہ سو گیا ہوں میں

سعید احمد اعجاز

ایک غزل اور ایک گیت

غزل

بفیضِ پنجۂ گُل جامہ تا رتار ہُوا
مرے جنوں کا سبب جلوۂ بہار ہُوا

بصد شکستِ تمنا بھی تھا متاعِ شوق
وہ دل جو نذرِ ستم ہائے روزگار ہُوا

رضائے دوست مری بندگی پہ ہے موقوف
یہ اختیار بصد جبر اختیار ہُوا

فریبِ شوق ہی تکمیلِ شوق ہے شاید!
یقینِ وعدہ نہ تھا پھر بھی انتظار ہُوا

نمودِ حسن ہے کیا! خندہ ہائے جیبِ گُل،
غرض جنوں سے کچھ اندازۂ بہار ہُوا

خودی سے حاصلِ عرفانِ بےخودی ساقی!
وہ ہوشیار نہیں ہے جو ہوشیار ہُوا

نویدِ شوق سہی اور درد سے تابشؔ
وہ ایک بار ہُوا یا ہزار بار ہُوا۔

محمد مسعود الحسن تابشؔ دہلوی

گیت

من کی باتیں بول
پپیہے! من کی باتیں بول

ڈوب گئے آکاش کے تارے
نیند سے جاگے پنچھی سارے
پھوٹے ہیں کرنوں کے دھارے
اک ہم ہیں برہا کے مارے۔ دل ہے ڈانوا ڈول
پپیہے! من کی باتیں بول

برکھا رُت کا روپ نرالا
اُجلی پھواریں بادل کالا
بجلی کا کوندا متوالا
ٹوٹ گئی بوندوں کی مالا تُو بھی موتی رول
پپیہے! من کی باتیں بول

مست گھٹا کی دیکھی چھل بل
دھرتی ہے پانی کی چھاگل
کھلتی کلیاں، اُٹھتی کونپل
کتنی سندر، کتنی کومل۔ اب تو آنکھیں کھول
پپیہے! من کی باتیں بول

رومان

مشہور افسانہ نگار اور شاعر ریوَنل نے رسالہ زمین پر پھینک دیا۔ سیمی براؤن جو ایک مشہور فرم کا گماشتہ تھا اور جو کھڑکی کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ حیرت سے اُچھل پڑا۔

"کیا ہے ریبو؟" اُس نے آگے کو جھکتے ہوئے پوچھا۔ "کسی نافہم نقاد نے تمہارے مضامین پر دست درازیاں کی ہیں کیا؟"

"اب اس دنیا سے رومان اُٹھ گیا۔ رومان کی موت واقع ہو گئی۔ رومان انگیز دورِ زندگی ختم ہو گیا۔ افسوس!" ریوَنل نے آہستہ آہستہ کہا۔ جب ریوَنل آہستہ بولتا تو وہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ اور متین معلوم ہوتا۔ اس نے رسالے کو پھر اٹھا لیا اور ورق اُلٹنے لگا۔

"دیکھو سیمی، بیٹا تم جیسا کور دماغ بھی سمجھ لے گا۔" اُس نے سنجیدگی سے کہا "یہ ملک کا ایک معتدر جریدہ ہے۔ چوٹی کے شاعروں کے رنگین کلام اور نامور مصنفین کے شاہکار اس میں شائع ہوا کرتے تھے — اور اب اس اشاعت کو دیکھو — دورانِ جنگ میں جنگی جہازوں میں کوئلہ جھونکنے کے طریقوں پر ایک طویل مضمون — بال اسٹریٹ کلب کے لئے نئے ممبر بنانے کی تجویز، عشق، عاشقی اور کورٹ شپ کے اصولوں پر ایک لمبی کہانی، بیچ پر ایک معرکۃ الآرا نظم، دسی بچھ جس پر پریسیڈنٹ کا نشانہ چوک گیا تھا غرضکہ یہی ہیں اس اشاعت کی چند نمایاں سرخیاں اور بس — اور ہاں آخر میں پورے ستر صفحے کا اڈیٹوریل جس میں خود اپنے ہی کارناموں اور اس رسالے کی عام مقبولیت کی ڈینگ ماری گئی ہے۔ سیمی اب تم ہی بتلاؤ کہ اس میں رومان کا کوئی بھی عنصر ہے نہیں نہیں۔ میں سچ کہتا ہوں یہ تمام مضامین بلکہ خود یہ رسالہ رومان کا قاتل اور رومانی زندگی کا دشمن ہے"۔

کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب چمڑے کی آرام کرسی پر سیمی لیٹا ہوا تھا۔ وہ بھورے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ اُس کے جسم کا رنگ اُن چار سگریٹوں کے تمباکو کے رنگ سے مل جاتا تھا جو اُس کی صدری کی جیب سے باہر جھانک رہے تھے ہلکے بادامی رنگ کے اُس کے جوتے تھے، خاکی موزے اور آسمانی رنگ کی قمیص اُس پر برف کی طرح سفید اور اٹھا ہوا کالر۔ کالر پر ایک سیاہ تتلی آ کر بیٹھ گئی تھی۔

سیمی کے چہرے میں کوئی بھی خاص یا غیر معمولی بات نہ تھی — گول تھا۔ بھلا معلوم ہوتا تھا اور گلابی رنگ کا تھا۔ اُس کے دل اور اُس کی نگاہوں میں رومانوں کے لئے کوئی بھی جگہ نہ تھی۔

ریوَنل کے اس کمرے کی کھڑکی کہن سال درختوں والے ایک پُرانے باغ میں کھلتی تھی۔ یہ کمرہ دوسری منزل پر تھا اور اُس کا مکان اینٹ کی بلند دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ دیوار کے اُس جانب اُس کے مکان کے عین مقابل ایک پرانی عمارت تھی جو قریب قریب پیسٹر پتوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا کہ زمانہ قدیم کا کوئی قلعہ ہو گا۔ اس میں ایک بوڑھا رہتا تھا جسے اس کہنہ عمارت سے بے حد محبت تھی اور وہ کسی بھی قیمت پر اسے اپنے سے جدا کرنے پر تیار نہ ہوتا تھا — اتنی پرانی عمارت کا بس اسی قدر رومان تھا!

ہفتے میں کوئی دو تین بار سیمی ریوَنل کے مکان پر دکھائی دیتا تھا۔ وہ ریوَنل کے خاص مصاحبوں میں سے تھا۔ اُس کے آباؤ اجداد اہلِ دَول اصحاب عزت گذرے تھے لیکن اُس کے کاروبار نے اُسے تباہ و برباد کر دیا تھا اور اب وہ ایک فرم کا ادنیٰ گماشتہ تھا۔ رومان کی موت پر وہ ایک آنسو بھی گرانے پر تیار نہ ہوتا تھا۔ ریوَنل کے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب چمڑے کی کرسی پر بیٹھنا اُسے بہت بھاتا تھا اور ریوَنل کو بھی اُس کی صحبت پسند آتی تھی۔ وہ اس کی لمبی چوڑی مگر بے معنی باتوں کو پسند کرتا تھا۔ اُسے اُس پر کافی اعتماد اور بھروسہ تھا اور وہ اپنے دل کا بوجھ اُس پر اتار سکتا تھا۔

"میں بتاؤں کہ آج تم اس رسالے پر اس قدر برہم کیوں ہو رہے ہو؟" سیمی نے مسکراتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے نے تمہارے کسی مضمون یا نظم کو شائع نہیں کیا اور یہی تمہاری خفگی کا باعث ہے۔ کیوں ہے نا یہی بات"

"نہیں نہیں تمہارا یہ گمان قطعی غلط ہے۔ یہ دیکھو اسی اشاعت میں میری ایک دلچسپ نظم شائع ہوئی ہے کہو تو پڑھ کر سنا دوں!"

"اچھا تو سناؤ" ابھی ابھی سیمی نے کھڑکی کے باہر دھندلیں کا بادل اُڑتا دیکھا تھا اسی جانب دیکھ رہا تھا۔

ریبونل "ہرکولیس" سے بڑا نہیں تھا کوئی بھی، نہ ہے۔ کمزوریاں ہر انسان میں موجود ہیں۔ اُس میں بھی تھیں۔" اُس نے رسالے میں اپنی نظم بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا۔

"بھئی۔ یہ تو بہت ہی خوب نظم ہے" سیمی نے داد دیتے ہوئے کہا۔

"پانچ بند ابھی اور ہیں" ریبونل نے انتہائی اطمینان کے لہجے میں کہا۔ "ہر بند کے بعد کچھ وقفہ ضروری ہے۔"

"ہاں۔ ہاں۔ تو وہ بقیہ بند بھی پڑھ ڈالو۔ میرے کہنے کا یہ مطلب کب تھا کہ تم اب آگے نہ پڑھو۔ اور تم تو جانتے ہی ہو کہ نظمیں نہ تو مجھے پسند ہیں اور نہ میں زیادہ سمجھتا ہی ہوں۔ خیر وہ بھی پڑھ ڈالو۔"

ریبونل نے لمبی سانس کی اور رسالہ زمین پر گرا دیا۔

"ٹھیک ہے" سیمی نے خوشی سے چلاتے ہوئے کہا "اب کسی اور وقت سنوں گا۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔ پانچ بجے میں نے ایک شخص سے ملنے کا وعدہ کیا ہے۔"

درختوں کے درمیان سے اُس پرانی عمارت کی ایک کھڑکی صاف نظر آتی تھی۔ ریبونل نے دیکھا کہ اُس کھڑکی میں جو سفید کپڑے لہرا رہے ہیں۔ اُن میں رومان اور رومان انگیز شعریت کی دیوی چھپی ہوئی ہے۔ ریبونل نے جب اُسے پہلی بار دیکھا تو وہ شبنم کی طرح نئی اور پاک تھی اور انگور کے بیلوں جیسی نازک۔ وہ کھڑکی پر کھڑی ایک شہزادی کی طرح باغ کی فرحت بخش ہوا سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ شاعروں کے تخیل کے رنگ برنگی پھولوں کے ہر پھول سے زیادہ وہ خوبصورت تھی۔

رومان کے دلدادہ ریبونل کی تو دنیا ہی بدل گئی۔ اُسے یہ محسوس ہونے لگا کہ اُس کے مکان کے نیچے سے گزرنے والی گاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ اب محبت کے کیف آفرین نغموں میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اخبار فروخت کرنے والے لڑکوں کی کرخت صدائیں کوئل کی دلکش کوک بن گئی ہیں ——— اور وہ خود ایک نائٹ ہے جو تلوار۔ تھیلا اور بانسری لے کر اُس مجسمۂ حسن و خوبی کی طرف مائل ہو گیا ہے۔

رومان اسی طرح اکثر اینٹ اور پتھروں میں جھلک اٹھتا ہے۔

شام کے چار بجے ریبونل نے پھر باغ کے اُس پار دیکھا۔ اُسے کھلی ہوئی کھڑکی پر چار گملے رکھے ہوئے نظر آئے جن میں گلاب کے بڑے بڑے پھول کھلے ہوئے تھے۔ وہ انہیں دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ پھر آئی اور آکر اُن پھولوں پر جھک گئی گلاب کے سرخ پھول اُس کے رخساروں کے مقابل پھیکے معلوم ہونے لگے وہ ریبونل کی کھڑکی کی جانب دیکھنے لگی لیکن ریبونل سے آنکھیں چار ہوتے ہی وہ دوڑ کر اندر چلی گئی۔ کھڑکی پر صرف گلاب ہی رہ گئے۔

"یقیناً ان گلاب کے گملوں کا وہاں رکھا جانا کوئی مطلب رکھتا ہے اور ضرور یہ کوئی خفیہ اشارہ ہے"۔ ریبونل نے اپنے تئیں سوچا "اس میں کچھ نہ کچھ راز ضرور ہے۔ ممکن ہے اُس نے اس کی "چار گلاب" کے عنوان کی مشہور نظم پڑھی ہو اور اس نظم نے اس کے دل میں جگہ کر لی ہو۔ اور یہ چار گملے اُسی کا جواب ہوں۔ اُسے ضرور علم ہوگا کہ ملک کا مشہور و معروف شاعر ریبونل اُس کے مقابل والی عمارت میں رہتا ہے۔ رسالوں میں اُس نے میری تصویریں بھی ضرور ہی دیکھی ہوں گی۔ اُف۔ یہ رومان بھرے پیغام جوان گملوں کے ذریعہ مجھے دیئے جا رہے ہیں۔ یونہی بے مصرف نہ جائیں گے۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں محبت کا جواب محبت سے دل کھول کر ضرور دوں گا۔ ریبونل نے دیکھا کہ ان چار گملوں کے پاس ایک اور چھوٹا گملا بھی ہے۔ اُس نے دوربین نکالی اور کھڑکی کے پردوں کی آڑ لے کر دیکھا ——— مٹر کا پودا تھا!

الماری سے اُس نے وہ کتاب نکالی جس میں پھولوں اور پھلوں کے ذریعے کلام کرنے کے طریقے اور خفیہ اشارے درج تھے۔

مٹر! ——— ملاقات ہوگی" ——— اوہ۔ میرا خیال بالکل درست تھا۔ رومان کبھی بھی ادھورا نہیں رہ سکتا۔ جب وہ آتا ہے تو اسی طرح اور انہیں چیزوں کے ساتھ آتا ہے۔" ریبونل مسکرا پڑا۔ عاشق مسکراتا ہے جب وہ اپنے تئیں فتحیاب سمجھتا ہے لیکن عورت کی مسکراہٹ اس کی فتحیابی کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ مرد کی جنگ ختم ہو جاتی ہے۔ عورت کی جنگ شروع ہوتی ہے۔ "آہ۔ اُسے مخاطب کرنے کے لئے کھڑکی پر چار گلاب رکھنے کا خیال کس قدر دلکش اور دلچسپ ہے۔ اُف۔ کس قدر عقلمند ہے وہ ——— اب تو ملاقات یقینی ہے!"

ریبونل انہیں خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی ——— "شاید سیمی براؤن ہوگا" ریبونل نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سیمی کے اندر داخل ہوتے ہی ریبونل مسکرا دیا۔ اس زبردست انقلاب سے سیمی بے خبر نہ رہ سکا۔ وہ حیرت سے ریبونل کی طرف دیکھنے لگا۔

سیمی کھڑکی کے قریب اپنی جگہ پر چلا گیا۔ باغ کے اُس پار وہ کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے گھڑی دیکھی اور فوراً ہی چھڑی اور ٹوپی اُٹھالی ——— چار بج کر بیس منٹ ہو گئے۔ "اُف" اُس نے زیر لب کہا "میں اب نہیں رک سکتا۔ دوست مجھے معاف کرنا۔ مجھے معاف کرنا۔ مجھے ساڑھے چار بجے ایک شخص سے

ملنا ہے۔" "تو پھر تم یہاں آئے ہی کیوں تھے؟" ریونل نے مسکراتے ہوئے کہا "میں تو سمجھا تھا تم اپنے وقت کا باقاعدہ حساب رکھتے ہو گے۔" سیمی جو دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا دفعتاً رک گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ ہلکے گلابی سے سرخ ہو گیا "تم جاننا ہی چاہتے ہو تو لو سنو، میں اگر اس وقت یہاں نہ آتا تو مجھے یہ معلوم ہی نہ ہو سکتا کہ مجھے اس سے ساڑھے چار بجے ملنا ہے۔ وہ سامنے پرانی عمارت دیکھتے ہو اس میں ایک بوڑھا رہتا ہے اور اس کی خوبصورت آنکھوں اور سنہرے بالوں والی لڑکی بھی۔ مجھے اس سے محبت ہے اور وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے لیکن وہ بوڑھا مجھے پسند نہیں کرتا اور لڑکی کو مجھ سے ملنے نہیں دیتا لیکن اس سے ہوتا ہی کیا ہے۔ وہ اسے گھر میں بند تھوڑا ہی کر سکتا ہے۔ دیکھو ایڈنا کی کھڑکی یہاں سے صاف دکھلائی دیتی ہے۔ جب وہ باہر جاتی ہے تو مجھے اشارے دے جاتی ہے۔ آج وہ ساڑھے چار بجے مجھے ملے گی۔ مجھے یہ راز تم سے پہلے ہی کہہ دینا چاہئے تھا لیکن میں جانتا تھا کہ تم ......!"

"کیسے اشارہ پاتے ہو تم؟" ہلکی مسکراہٹ سے ریونل نے پوچھا۔

"گلاب!" سیمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آج چار گلاب رکھے ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے "بلیک اسٹریٹ میں چار بجے"۔"

"لیکن مٹر کا، کا کیا مطلب ہے؟" رومان کی اڑتی ہوئی چادر کو پکڑتے ہوئے ریونل نے دریافت کرنے کی ہمت کی۔

"ساڑھے!" سیمی نے باہر جاتے ہوئے کہا "اچھا اب کل ملوں گا!"

(ترجمہ از انگریزی)

سید منظر کاظمی

شعر

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

میر تقی

دو نظمیں

ملّاح کی لاش

مچھلیاں سب پکڑنے دُور گئے
تیری کشتی لرزتی ہے تنہا
اُٹھ کہ دریا بُلا رہا ہے تجھے
تو کنارے پہ یوں پڑا ہے کیا

تیرے ہمراہیوں نے پانی میں
دیکھ وہ کتنے جال ڈالے ہیں
جیسے جذبات نوجوانی میں
تُند، تیکھے، بلند بھالے ہیں

کیا تو یہ سوچتا ہے اے ملّاح؛
تو بھی صرف اک غریب مچھلی ہے
اور کیا اور کیا ہے اے ملّاح؟
تو بھی اک بدنصیب مچھلی ہے

کوئی مچھلی پکڑنے والا ہے
آج جس نے پکڑ لیا ہے تجھے
کتنا مضبوط جال ڈالا ہے
کتنا کس کر جکڑ لیا ہے تجھے!

پھولوں کی وادی

پھول ہی پھول ہیں اس وادی میں۔
پھول ہی پھول ہیں تا حدِ نظر
اے خداوندِ گل و لالہ تجھے
مری دلجوئی ہے کیوں مدِ نظر؟

پھول ہی پھول ہیں اس وادی میں
کیا مرے واسطے یہ محفل ہے؟
ایک ہی لمحہ فقط ایک ہی پل
کیا مجھے عیش کا حق حاصل ہے؟

پھول ہی پھول ہیں کیا پھول ہی پھول!
خواب سا پھولوں کی اک وادی کا!
میں نے جو باغ کبھی سوچا تھا
کیا یہی باغ ہے وہ شادی کا؟

پھول ہی پھول ہوں اس وادی میں
ہو نہیں سکتا فقط دھوکا ہے
یہ تو ہے بھوت مرے مرضی کا
راستہ جس نے مرا روکا ہے

روشن دین تنویرؔ

طیّارچی

ثریا نے کھڑکی کے پٹ کھول دیے اور باہر کی طرف دیکھنے لگی — زمین سے آسمان تک گہری اور غلیظ تاریکی کا ایک سیلاب امنڈ رہا تھا — سیاہ گھٹائیں فضا میں منڈلا رہی تھیں — حدِ نظر تک سیاہی ہی سیاہی نظر آتی تھی۔ پائیں باغ کے چھوٹے بڑے درخت — سڑک کے دونوں جانب بنگلوں کی قطاریں۔ بنگلوں کے درمیان کی اونچی نیچی زمین۔ ہر چیز سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی — جیسے کوئی سوگوار مجمع خاموش اور بے حس و حرکت کسی ماتمی جلوس کا منتظر ہو۔

کبھی کبھی کوئی موٹر ادھر سے گذر کر چشم زدن کے لئے سکوت اور تاریکی کے اس طلسم کو توڑ دیتا تھا۔ ہارن کی آواز خاموش فضا میں بلند ہو کر غائب ہو جاتی تھی — درختوں کی چوٹیوں پر موٹر کے برقی لیمپ کی روشنی دوڑتی ہوئی گذر جاتی تھی۔ جیسے کسی غم نصیب کے دل میں کسی بھولے ہوئے واقعہ کی یاد مسرت کی لہر دوڑا دے۔ پائیں باغ کی دیوار پر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد روشنی نمودار ہوتی — گھٹتی۔ بڑھتی سمٹتی اور غائب ہو جاتی تھی۔

دیر تک ثریا اس منظر کو دیکھتی رہی — وہ محسوس کر رہی تھی کہ میں اس ماحول کا ایک جزو ہوں جس کے غیر متوقع خلا نے اُن فتنوں کو دفعتہً جگا دیا تھا جو عرصے سے تحت الشعور کی تاریک گہرائیوں میں محوِ خواب تھے۔ ثریا ان کو پھر اپنے دل میں دفن کر دینا چاہتی تھی یعنی مردہ امیدوں کا گلا گھونٹ دینا چاہتی تھی۔ جنہوں نے زندہ ہو کر کروٹیں لینا شروع کر دیا تھا اس لئے کہ زمانے کی رفتار کو پلٹ دینا اس کے لئے ممکن نہ تھا — لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی۔ خیالات ضمیر کی گرفت سے آزاد ہو کر عہد ماضی کے اس خوشگوار دور کی طرف جا رہے تھے۔ جب وہ آزاد تھی — اور اپنی زندگی کی بازی لگا کر ہار نہ چکی تھی — خیالات کی اس کشمکش سے گھبرا کر اس نے کھڑکی بند کر دی اور میز کے قریب آ کر اسٹول پر بیٹھ گئی۔

آئینے کی صاف و شفاف سطح پر حسن و شباب کا ایک دلکش مرقع نظر آنے لگا۔ کندنی رنگ۔ کتابی چہرہ نشۂ شباب میں ڈوبی ہوئی رسیلی آنکھیں جن میں دلی جذبات کے سوگوار جلوے تڑپ رہے تھے۔ باریک اور دلکش ساخت کے مرجانی ہونٹ — قدرت کے حسین ترین سانچے میں ڈھلے ہوئے گداز بازو جو شانوں تک برہنہ تھے۔ لمبی صراحی دار گردن جس نے اُس کے حُسن میں شاہی وقار اور دبدبہ پیدا کر دیا تھا۔ شانوں پر بکھری ہوئی چمکدار سیاہ زلفیں جن کی بعض آوارہ لٹیں گردن اور رخساروں پر لپٹ گئی تھیں۔

خود بخود بلا کسی ظاہری سبب کے ثریا کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ جیسے کسی گہرے زخم کے ٹانکے ٹوٹ گئے ہوں۔ باریک اور برف کی طرح سرد انگلیاں رینگ رینگ کر دل میں چٹکیاں لینے لگیں۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے — اس کی نگاہیں اُٹھیں اور ایک تصویر پر جم گئیں جو آئینے کے قریب سنہرے فریم میں رکھی ہوئی تھی — ثریا کے رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی دوڑ گئی — آنکھیں غصے سے چمکنے لگیں — تصویر کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کا تبسم تھا جس کو وہ کبھی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ ابرو کھنچ کر مل گئے تھے۔ ہونٹوں پر طنز آمیز مسکراہٹ کے آثار تھے — جیسے وہ اس کا اور اس کے ساتھ ساری کائنات کا دل ہی دل میں مذاق اُڑا رہا ہو — بالکل اسی طرح رشید اس کو مسکرا مسکرا کر دیکھا کرتا تھا۔ جب وہ ڈرائنگ روم میں سوزن کاری کا سامان لے کر اس کے قریب بیٹھی ہوتی تھی...... وہ محسوس کرتی تھی کہ صیاد خوبصورت پرندے کو پنجرے میں قید کر کے اپنی کامیابی پر خوش ہو رہا ہے۔

عموماً ایسے معاملات میں صنفِ نازک کی منطق بالکل الٹی ہوا کرتی ہے۔ لیکن ثریا کو اس امر میں امتیازی خصوصیت حاصل تھی۔ اُس کی عادت تھی کہ اپنی غلطی کو دوسرے کے سر تھوپ کر خود اپنی مظلومیت پر آنسو بہانے لگے۔ چنانچہ ایک عرصے سے اس کو یہ خیال بے چین کر رہا تھا کہ

رشید نے اس کے ساتھ شادی کرکے اس کو بہت بڑا فریب دیا ہے۔ وجہ صرف اتنی تھی کہ ازدواجی زندگی کے متعلق جو رنگین خواب اس نے دوشیزگی کے زمانے میں دیکھے تھے۔ وہ حقیقت کے میزان پر پورے نہ اترے۔

اس کے مزاج کی برہمی لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی تھی، آخر وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی —— پورے چار سال شادی کو ہو چکے تھے —— اس دوران میں ان میں ایک دفعہ بھی ان بن نہ ہوئی۔ بظاہر دونوں انتہائی مسرت اور ہم آہنگی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے —— لیکن ثریا خوش نہ تھی۔ —— وہ اپنے دل میں ایک خلا سی محسوس کرتی تھی —— ایک مبہم اور پر اسرار پیاس۔ جو اس کو ہر وقت بے چین رکھتی تھی —— رشید اس کا پجاری تھا، اس پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں جوشِ مسرت سے چمک اٹھتی تھیں —— ہونٹوں پر مسکراہٹ لہرانے لگتی تھی۔ باتیں کرتے وقت اس کا لہجہ نرم اور جذباتِ محبت کی بے قراریوں سے گرانبار ہو جاتا تھا۔ اور جب کچہری جاتے وقت وہ برابر کھڑی ہو کر اس کی ٹائی میں گرہ لگاتی تھی تو رشید کے بازو اس کے گرد حائل ہو جاتے اور دیر تک وہ اس قید سے آزاد نہ ہو سکتی تھی —— یہ سب کچھ تھا لیکن وہ اور رشید ایک نہ ہو سکے تھے —— وہ اب تک اس کے لئے ایک معمہ تھا —— شروع شروع میں اس نے کوشش کی کہ اپنی اور رشید کی ہستی کو ایک دوسرے میں سمو کر ایک کر دے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ رشید بدستور معمہ بنا رہا۔ آسمان کے بلند ترین مرکز پر جھلملانے والا ایک ستارہ۔ رسائی سے باہر۔ دلکش، شوق انگیز۔ مگر بعید از فہم اسرار سے لبریز —— وہ اس کو سمجھنا چاہتی تھی —— اور ناکام ہو کر جھلا اٹھتی تھی۔

رشید ایک خاموش طبیعت کا انسان تھا۔ جوش و خروش سے بالکل معرا —— مسکراتا تھا مگر اس کی مسکراہٹ کبھی قہقہوں میں تبدیل نہ ہوتی تھی —— محبت کرتا تھا مگر اس کی محبت میں اضطراب اور بے قراری کا نام تک نہ تھا۔ وہ خوش ہو یا ناخوش بولنے میں اس کی آواز کبھی بلند نہ ہوتی تھی۔ انتہائی حالتوں میں بھی اس کے غصے کی نمود کبھی طنز آمیز گفتگو کی حد سے نہ بڑھتی تھی ثریا اکثر سوچا کرتی تھی کہ وہ ایسے سمندر کے مانند ہے جس کی دلفریب اور پرسکون سطح کے نیچے ہولناک گہرائیاں پوشیدہ ہوں —— اور خود ثریا برق و باراں کے مثل تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر آپے سے باہر ہو جاتی تھی اس کی زندگی قہقہوں۔ آنسوؤں۔ محرومیوں اور مسرتوں کا ایک دلکش مجموعہ تھی اس کی رگ رگ میں زندگی کی طوفانی موج دوڑتی پھرتی تھی۔

اکثر تنہائی میں ثریا کو یہ خیال پریشان کرتا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن کیوں نہیں۔ ناولیں پڑھ پڑھ کر اس نے ازدواجی زندگی کا جو نقشہ اپنے لئے تیار کیا تھا اس کی تمام ظاہری دلفریبیاں میسّر تھیں۔ رشید آئی۔ سی ایس تھا۔ ایک بڑے شہر کا سٹی مجسٹریٹ ہونے کی وجہ سے افسرانِ اعلیٰ کی صف میں جگہ پاتا تھا۔ وہ خود شہر کے اعلیٰ طبقے میں ہر دلعزیز تھی۔ کوئی دعوت کامیاب نہ سمجھی جاتی تھی جس میں وہ موجود نہ ہو۔ جہاں پہنچ جاتی تھی لوگ سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے۔ جو اس کی ملاقات کا شرف رکھتے تھے اس کے گرد پروانہ وار جمع رہتے تھے —— جو اتنے خوش نصیب نہ تھے وہ تعارف کی امید میں تھوڑے فاصلے پر کھڑے اس کی بذلہ سنجیوں پر دور سے ہنستے اور جب وہ ان کی طرف نگاہِ غلط انداز سے دیکھ لیتی تھی تو ادب کے ساتھ جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ کئی دفعہ ہز ایکسیلنسی گورنر کی دعوت میں بھی شریک ہو چکی تھی، اور ایک دفعہ ان سے باتیں بھی کی تھیں —— بڑے بڑے حکام کی بیویاں دعوت کے موقعے پر اس سے مشورہ کرتی تھیں اور میزبانی کا ہنر سیکھتی تھیں۔ کنواری لڑکیاں اس کی رفتار و گفتار کو انتہائی شوق کے ساتھ نقل کرتی تھیں۔

یہی وہ زندگی تھی جس کے خواب اس نے دیکھے تھے اور جن کی تکمیل کے لئے اس نے رشید کے ساتھ شادی کی تھی۔ تاہم وہ خوش نہ تھی۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس وسیع اور عظیم الشان دنیا میں بالکل تنہا ہے۔ اجنبی مجمع میں گھری ہوئی —— بخلاف اس کے اگر اس کی شادی جمیل کے ساتھ ......

ثریا دفعتہً چونک پڑی۔ رشید خوابگاہ کے دروازے پر کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا!۔

"یہ فرش کی پیمائش کیوں ہو رہی ہے! کوئی خاص وجہ ہے؟" اس نے اندر آکر دریافت کیا اور ٹوپی اتار کر ایک کوچ پر پھینک دی۔

"کچھ نہیں —— دل گھبرا رہا تھا" ثریا نے ٹوپی کو سلیقے سے میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا "آج آپ کو اتنی دیر کیوں ہو گئی؟"

"تو کیا بے قراری میرے ہی فراق میں تھی؟"

"میں نے تو یہ نہیں کہا"

"میں سمجھا شاید ....."

"خدا نہ کرے"

"ثریا!"

"جی"

"آج مزاج کیوں برہم ہے؟ کوئی غریب بڈھے خرانٹ افسروں کے ساتھ سر کھپا کر تھکا ماندہ گھر واپس آئے تو اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے ——— نہ آؤ بھگت۔ نہ دلجوئی"؟

"تو پھر میں کیا کروں آپ تو آتے ہی جلی کٹی سنانے لگے"۔

"ٹھیک — حسب معمول میری ہی غلطی نکلی۔ خیر جانے دو، معافی مانگتا ہوں۔ آؤ اب صلح ہو جائے"۔

"یہ کہہ کر رشید نے ثریا کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا اور کوچ پر اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔

"کتنی جلدی گُصّہ" (غصہ) آجاتا ہے میری ثریا کو" اس نے ثریا کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا وہ حسب عادت مسکرا رہا تھا — اپنے مخصوص طنز آمیز انداز میں — ثریا کی نظریں جھک گئیں۔ رخسار تمتا اُٹھے۔ سارے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

"صیاد پنجرے میں پرندے کو دیکھ دیکھ کر ملکیت کے غرور سے مسکرا رہا ہے"۔ ثریا نے سوچا اور سوچتے ہی اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی لیکن اس نے رشید کے ہاتھوں کو اپنے چہرے سے ہٹایا نہیں۔ ——— یہاں تک کہ ان کے ہونٹ باہم پیوست ہو گئے۔

"اور ہاں۔ یہ تو بتاؤ تمہارے مہمان صاحب کب آرہے ہیں"۔ رشید نے ثریا کے چہرے کو اپنی گرفت سے رہا کرتے ہوئے پوچھا۔ "خط میں کوئی تاریخ بھی لکھی تھی"؟

"کل گیارہ بجے کی ٹرین سے آجائیں گے" ثریا نے جواب دیا۔

"ان کے قیام کا انتظام کر دیا"؟

"ہاں، انتظام کون سا کرنا تھا۔ ڈرائنگ روم کے برابر والے کمرے میں رہیں گے۔ ایک ہفتہ تو رہنا ہی ہے"۔

"بس"؟

"ہاں ——— لڑائی پر جانے کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ زیادہ نہیں ٹھہر سکتے"۔

"اوہ! ٹھیک ہے۔ ان کو تو شاہی کمیشن مل چکا ہے۔ طیارچی ہیں نا"؟

"جی"

سلسلۂ گفتگو یہیں تک پہنچا تھا کہ دیوار کی گھڑی نے گیارہ بجانا شروع کیا۔ رشید نے اٹھ کر شیروانی اتاری اور ہاتھ بڑھا کر بجلی کا بٹن دبا دیا ——— کمرے میں تاریکی چھا گئی۔

(۲)

"ثریا! میرا آنا تم کو ناگوار تو نہیں ہوا"؟

"ناگوار؟ یہ کیسے"؟

"مجھے آنا نہیں چاہئے تھا ——— اب ہمارے اور تمہارے راستے الگ الگ ہیں لیکن لڑائی پر جانے سے قبل میں ایک دفعہ تم کو دیکھ لینا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں پلٹ کر آنا ہو یا نہ ہو"۔

"خوب کیا جو تم چلے آئے۔ نہ آتے تو مجھے شکایت رہتی"۔

ثریا نے ظاہری سکون کے ساتھ جواب دیا لیکن دل پر برچھیاں چل رہی تھیں ——— چاہتی تھی کہ جمیل کے شانے پر سر رکھ کر خوب روئے اور اس طرح اس کو جنگ پر جانے سے روک لے۔

"شکریہ!" جمیل نے جواب دیا اور خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

"یہ لڑائی پر جانے کا خبط تم پر کیوں سوار ہوا ——— کسی نے روکا نہیں"؟

"کون روکتا ثریا"؟

اب ثریا کے خاموش ہونے کی باری تھی ——— اس نے گھبرا کر جمیل کے چہرے سے اپنی نگاہیں ہٹا لیں اور سر جھکا کر ناخنوں کے پور چبانے لگی ——— وہ محسوس کر رہی تھی کہ جمیل کی نگاہیں اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی ہیں۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ نبضیں تیز ہو گئیں ——— ایسا نہ ہو کہ وہ اس کے اصلی جذبات کا راز معلوم کرے۔

"اگر اس کو معلوم ہو گیا تو؟" اس نے سوچنا شروع کیا۔ وہ خوش ہوگا... ....یا...... میری حالت پر افسوس کرے گا!...... ایسا تو نہیں کہ ....وہ....."

ثریا کانپ اٹھی ——— کیسا خوفناک خیال تھا اور کس قدر ذلیل.... جمیل نیکی کا فرشتہ ہے وہ کبھی ایسی بات نہیں کر سکتا جو اس کو نہ کرنا چاہئے" اُس نے اپنے دل کو سمجھایا۔

"جمیل، لکھنؤ کے بعد تو اس شہر میں تمہارا دل کیا لگے گا" اس نے دفعتہً خاموشی سے متوحش ہو کر کہا۔

"مجھے شہر سے......"

"ہاں۔ ہاں" ثریا جمیل کے جواب کو تاڑ کر بول اٹھی "میرا مطلب یہ تھا کہ یہاں شہر ہے تو نام کو بھی نہیں۔ کوئی بازار بھی اچھا نہیں۔ یہی اس طرف سول لائنز میں

کسی قدر رونق رہتی ہے؟"

جمیل سمجھ گیا تھا کہ ثریّا ذاتیات کے ذکر سے دُور رہنا چاہتی ہے لہذا اسٹیشن سے آتے وقت اُس نے جو کچھ دیکھا اس پر اظہار خیال کرنے لگا۔ ثریّا نے اطمینان کی سانس لی اور احسانمند نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر جوش و انہماک کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہوگئی۔

لیکن ابھی چند ہی منٹ گذرے تھے کہ اس کو یہ فضول گفتگو ناگوار گزرنے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ جمیل کچھ اپنا حال بیان کرے۔ اس کے دن کیوں کر گزرتے ہیں۔ کیا مشاغل ہیں۔ کن لوگوں سے ربط ضبط ہے۔ اور اگر اسی سلسلے میں گزری ہوئی باتوں کی طرف اشارے کنائے بھی ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں —— لیکن دل ڈرتا تھا۔

"خیر چھوڑیں ڈالو اس شہر کو۔ یہ بتاؤ کہ زبیدہ تو اچھی ہے —— مجھ کو یاد کرتی ہے یا نہیں؟" اُس نے دفعتہً پوچھا۔

جمیل سراسیمہ ہو کر اِدھر اُدھر نگاہیں چُرانے لگا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کے گھر والے اس کے سامنے اس خیال سے کہ اس کو صدمہ نہ ہو، ثریّا کا ذکر نہ کرتے تھے۔ خصوصاً اس کی چھوٹی بہن زبیدہ تو بھول کر بھی اس کا نام نہ لیتی تھی۔

"کیوں بولتے کیوں نہیں، کیا زبیدہ مجھ کو یاد نہیں کرتی؟" ثریا نے بضد ہو کر پوچھا۔

"یاد تو ضرور کرتی ہوگی مگر میرے سامنے نہیں" جمیل نے جواب دیا۔

"اوہ!" ثریّا نے کہا اور خاموش ہوگئی۔ اس کا چہرہ احساسِ خجالت سے سرخ ہوگیا تھا۔

جمیل اس کی طرف دیکھ کر جوشِ الفت سے بے قرار ہوگیا۔ وہ جانتا تھا کہ ثریّا کا دل بہت نازک ہے۔ پہلے کا زمانہ ہوتا تو اب تک اُس نے لاکھوں شکائتیں کر ڈالی ہوتیں —— اور زبیدہ سے لڑنے پر تیار ہو جاتی۔ لیکن اب حالات بدل چکے تھے —— وہ اس ظاہری سرد مہری کی شکایت بھی نہیں کر سکتی تھی، اس لئے کہ رشتۂ الفت اُس نے خود توڑا تھا۔

"ثریّا!" اس نے ایسی آواز میں پکارا جو کانپ رہی تھی لیکن ثریّا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ناراض نہ ہو ثریا" اس نے جوشِ الفت میں ثریّا کا ہاتھ پکڑ کر کہنا شروع کیا "میں نے کسی کو منع نہیں کیا —— بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ کوئی تمہاری باتیں کرے ..... تمہاری شرارتیں۔ لڑائیاں۔ روٹھنا۔ منانا۔ بیان کرے لیکن گھر والے چونکہ میرے دل کا راز جانتے ہیں اس لئے میرے سامنے تمہارا ذکر نہیں کرتے۔ یوں آپس میں ضرور تمہارا ذکر کرتے ہوں گے —— بھلا تم کو کون بھول سکتا ہے"۔

آہستہ آہستہ ثریّا نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا —— اور سمٹ کر بیٹھ گئی —— اس کی غزالی آنکھوں میں اشک بھر آئے تھے —— ہونٹ کانپ رہے تھے —— قریب تھا کہ رو پڑے۔ لیکن بڑی کوشش سے ضبط کیا۔ جمیل اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ اور گو ثریّا کی یہ غمگین تصویر اس کے دل کے ٹکڑے کئے دیتی تھی تاہم اس نے اپنی دل کی گہرائیوں میں مسّرت اور انبساط کو آہستہ آہستہ رینگتے پایا۔ ثریّا کو اس کا رنج تھا کہ جمیل اور اس کے گھر والے اب اس کا ذکر نہیں کرتے —— یہ بات اس کی خوشی کے لئے کم نہ تھی۔

کیا ثریا کے دل کے کسی گوشے میں اب بھی اس کی محبت چھپی ہوئی ہے؟ ..... کیا وہ اب بھی اس کو وہی اپنا جمیل سمجھتی ہے؟

دونوں اپنے اپنے خیالات میں ڈوبے خاموش بیٹھے تھے کہ خانساماں نے آکر کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔ دونوں خاموشی کے ساتھ اُٹھے اور بغیر ایک دوسرے کی طرف دیکھے ہوئے خانساماں کے ساتھ چلے گئے۔

اسی روز سہ پہر کے وقت ثریا اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی سوچ رہی تھی —— اس کا دل اس ہنگامہ خیز انکشاف کے اثر سے تھرا رہا تھا۔ اُس کو اب بھی جمیل سے ویسی ہی محبت ہے جیسی پہلے تھی —— ورنہ کیوں جمیل کی آواز سُنتے ہی اُس کی روح مائل بہ رقص ہو جاتی —— کیوں اُس کے قرب سے اُس کا دل دھڑکنے لگتا اور اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہی مغلوبیت اور سپردگی کی کیفیت طاری ہو جاتی؟ رشید بھی اس سے محبت کرتا تھا —— اور ہر ممکن طریقے سے خاطر داری اور دلجوئی کرتا تھا۔ اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا —— لیکن اس کی ان باتوں کا اس پر کوئی خاص اثر نہ ہوتا تھا —— بلکہ کبھی کبھی تو وہ چڑ جایا کرتی تھی۔ مگر جمیل کی زبان سے اپنا نام سُن کر اس کا دل جوشِ مسّرت سے لرزنے لگتا تھا۔

دفعتہً ثریّا کا دل بیٹھ گیا —— وہ جمیل سے محبت کرتی تھی اور اپنی زندگی ہمیشہ کے لئے رشید کے ساتھ وابستہ کر چکی تھی! —— آج پہلی دفعہ اس کو معلوم ہوا کہ اس کا دل جس چیز کی ہر وقت جستجو کیا کرتا تھا وہ کیا ہے —— وہ چیز اس کو مل سکتی تھی —— مل رہی تھی —— لیکن اس نے خود قبول نہیں کیا ..... اس کے ہونٹوں پر زہر خند کے آثار پیدا ہوگئے ——

آنکھوں میں موتی کی طرح اشکوں کے قطرے چمکنے لگے ـــــ تقدیر کا یہ بھی کیا خوب طنز تھا کہ اُس نے اپنی زندگی خود اپنے ہاتھوں برباد کی ـــــ وہ جانتی تھی کہ ایک آئی سی۔ایس کے ساتھ شادی ہونے پر اس کو وہ سب کچھ مل جائے گا جو وہ چاہتی تھی ـــــ مجلسی زندگی ـــــ شہرت ـــــ ہر دلعزیزی ـــــ عزت اور اثر ـــــ اسی لئے اس کی زبان سے رشید کی نسبت کا ذکر سنتے ہی اس نے شرم سے گردن جھکا کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تھا...... وہ جمیل کی محبت کو ایک کھیل سمجھتی تھی ـــــ یا ـــــ بیکاری کا ایک دلچسپ مشغلہ ـــــ واقعات نے بتا دیا کہ محبت صرف ایک دفعہ ہوتی ہے ـــــ مگر۔افسوس اس وقت جب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا

خود بخود اس کو جمیل پر غصہ آنے لگا ـــــ وہ مرد تھا۔اور عمر اور تجربے میں اس سے زیادہ ـــــ اس کو لازم تھا کہ اس کی رہبری کرتا ـــــ اور اس کو رشید کے ساتھ شادی کرنے سے باز رکھتا ـــــ

"اگر وہ زور دیتا تو ممکن نہ تھا کہ میں اس کو مایوس کر سکتی"۔ اس نے سوچا "لوگ کیا کیا نہیں کرتے۔ زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔سوسو ترکیبیں کرتے ہیں اور بعض تو زبردستی پر اتر آتے ہیں اور اپنی محبوبہ کو مجبور کر کے زبردستی شادی کر لیتے ہیں ـــــ اگر جمیل کو واقعی مجھ سے محبت ہوتی...... لیکن اُس نے اب تک شادی کیوں نہیں کی ـــــ تجرد پسند کیوں ہو گیا ہے؟..... محبت تھی ضرور مگر کمزور.....!"

ثریا کی نظروں میں جمیل کے ساتھ اپنی وہ آخری ملاقات پھرنے لگی جب اس نے رشید کے ساتھ اپنی نسبت کا ذکر کیا تھا۔

وہ چائے کی ضیافت کے بعد جمیل کو خانہ باغ میں لے گئی تھی ـــــ دیر تک دونوں خاموش پہلو بہ پہلو ٹہلتے رہے۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتی تھی" دفعتہً ثریا نے جمیل سے کہا۔

جمیل ٹھہر کر اس کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھنے لگا کہ وہ شرما گئی اور نگاہیں موڑ کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔

"میں جانتا ہوں جو کچھ تم کہنا چاہتی ہو" ثریا نے جمیل کو کہتے ہوئے سُنا۔

"کیا!" اُس نے پوچھا اور جھک کر ایک پھول توڑنے لگی ـــــ اس کا دل خود بخود دھڑکنے لگا تھا۔

"یہی کہ ہماری شادی کب ہو گی" جمیل نے جواب دیا

ثریا کانپ اُٹھی۔رہی سہی ہمت نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ دل ڈوبنے لگا چہرہ زرد ہو گیا ـــــ جمیل اس کی یہ متغیر حالت دیکھ کر گھبرا گیا

اُس نے اپنا بازو پھیلا کر اس کو سنبھال لیا اور انتہائی نرمی اور پیار کے لہجے میں پوچھا

"کیا ہے ثریا! یہ کیا حالت ہے؟"

"میں تھک گئی ہوں جمیل" ثریا نے نیم باز آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے کہیں لے چل کر بٹھا دو"۔

آہستہ آہستہ، محبت اور نرمی کے ساتھ اس کے گرد اپنا بازو حائل کئے ہوئے ـــــ جمیل نے اس کو لے جا کر ایک بنچ پر بٹھا دیا اور خود بھی قریب ہی بیٹھ گیا۔

"ثریا اگر تم کو وہ بات کہنے میں دکھ ہوتا ہے تو نہ کہو" اس نے جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "میں انتظار کر سکتا ہوں"۔

"نہیں جمیل" ثریا نے نحیف آواز میں جواب دیا "کہنا ہی پڑے گا ـــــ میری شادی ہو رہی ہے!"

"کیا!"

"ہاں ـــــ بات چیت طے ہو چکی ہے!"

خاموشی ـــــ جمیل بے حس و حرکت ایک لاش کی طرح اپنے مقام پر بیٹھا رہا ـــــ ثریا دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اُس کا منہ دیکھ رہی تھی ـــــ اور نظروں ہی نظروں میں رحم کی درخواست کر رہی تھی۔

"کس کے ساتھ؟" جمیل نے چند منٹ کے بعد پوچھا ـــــ اُف اُس کی آواز کیسی بھیانک اور ڈراؤنی تھی! جیسے رات کے وقت کسی تیرہ و تاریک مقبرے کی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی باز گشت!

"کوئی رشید صاحب ہیں" ثریا نے نیچی نظروں سے جواب دیا۔ "حال ہی میں آئی سی۔ایس پاس کر کے ولایت سے واپس آئے ہیں"۔

"تم کو یہ رشتہ پسند ہے؟"

"میری سنتا کون ہے ـــــ کسی نے بھولے سے بھی نہ پوچھا پہلے ہی سب کچھ طے کر لیا!"

"کسی کے طے کر لینے سے شادی نہیں ہو سکتی ـــــ یہ بتاؤ تم کو یہ رشتہ پسند ہے یا نہیں؟"

"میں والدین کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی"۔

پھر خاموشی ـــــ ثریا سر جھکائے زمین کی طرف دیکھ رہی تھی ـــــ لیکن وہ جانتی تھی کہ جمیل کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں ـــــ وہ اس کے راز کو معلوم کرنا چاہتا تھا۔

"ثریا!" اچانک جمیل نے مہرِ سکوت کو توڑ کر کہا۔

ثریا نے گردن اٹھا کر جمیل کی طرف دیکھا اور دم بخود رہ گئی —— ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جمیل کئی برس کی طویل علالت سے لاغر ہوگیا ہے —— چہرے پر خون کی ایک چھینٹ بھی نظر نہ آتی تھی —— آنکھوں سے یاس ٹپک رہی تھی —— کسی غیر مرئی ہاتھ نے ثریا کا دل اپنے آہنی پنجے میں زور سے مسل دیا ——

"اور ہم نے جو خواب...." جمیل نے کہنا شروع کیا تھا کہ ثریا نے بے چین ہو کر اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"جمیل مجھ پر رحم کرو —— میں والدین کے حکم سے مجبور ہوں۔ اُن کو دکھ دے کر اپنی تعلیم کو بدنام نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے بھول جاؤ۔"

"اچھی بات ہے ثریا —— تمہاری یہ آخری ضد بھی پوری کروں گا۔" جمیل نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر جواب دیا "میں تم کو بھول جانے کی کوشش کروں گا —— لیکن اگر نہ بھول سکا تو...."

"تو؟" ثریا نے سہم کر پوچھا۔

"وقت آنے پر خود معلوم ہو جائے گا۔"

یہ تمام واقعات متحرک تصاویر کی طرح ثریا کے دماغ سے گذر رہے تھے —— اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی —— مستقبل کی بھیانک، اجاڑ اور بے کیف تصویر اس کی نظروں میں پھرنے لگی۔ منزل کس قدر دور تھی —— خیال کی رسائی سے باہر —— نگاہوں سے اوجھل —— اور راستہ کیسا —— سنسان —— تھکا دینے والی یکسانیت سے گھبرا ہوا۔ اس کا دل کانپ اٹھا۔

"نہ معلوم ابھی زندگی کے کتنے سال باقی ہوں" اس نے سوچنا شروع کیا "یہ طویل مدت کیونکر بسر ہوگی؟.... مکر و فریب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ کب تک قائم رہے گا۔ مجھے خوش رہنا ہوگا —— دل روئے گا اور ہونٹ ہنسیں گے طبیعت زندگی سے اُچاٹ ہوگی —— لیکن دعوتوں، جلسوں —— اور پارٹیوں میں شریک ہونا ہوگا.... اف!"

"کیوں؟" دفعتہً اس کے دل نے پوچھا اور سینے میں بغاوت کی چنگاریاں سلگ اٹھیں۔ "کیوں؟"

اس کے اِرد گِرد ہر طرف مسرت اور شادمانی تھی —— ہر شخص خوش اور مطمئن تھا —— پھر وہ کیوں اس عام شادمانی سے محروم رہے؟ وہ کیوں اپنی زندگی کو محرومی اور غم کی نذر کرے؟ صرف اس لئے کہ اس نے فیصلے میں غلطی کی تھی؟ —— کیا اس غلطی کی تلافی نہیں ہو سکتی؟ غلطی کس سے نہیں ہوتی؟ —— پھر کیا سب اس غلطی کی پاداش میں ساری عمر زندہ درگور رہتے ہیں؟.... کیا غلطی کی تلافی کرنا ہر انسان کا فرض نہیں ہے؟..... محبت اور مسرت کے علاوہ اس دنیا میں رکھا ہی کیا ہے؟

—— ہر شے ایک فریب ہے۔ ہر چیز ایک دھوکا۔ غیر مستقل —— بن بن کر بگڑ جانے والی شکلیں —— ترقی، تہذیب، اخلاق، مذہب، قانون، علم و فن..... ان تمام چیزوں کا مقصد کیا ہے؟ —— مسرت۔ زندگی کیا ہے؟ —— مسرت کی جستجو —— پھر وہ ایک غلطی کے باعث مسرت سے ہمیشہ کے لئے کیوں محروم ہو جائے!

کیوں؟

ثریا اٹھ کر بیٹھ گئی —— آنچل سے آنسو خشک کئے —— وہ بیشک اپنی غلطی کی تلافی کرے گی اُس نے اپنے دل میں فیصلہ کیا —— لیکن جب اس کے امکانات اور تفصیلات کا جائزہ لیا تو روح لرز اٹھی۔

"کبھی نہیں! کبھی نہیں!" اس نے اپنے ضمیر کی تسکین کے لئے بلند آواز میں کہا۔

وہ انہیں خیالات میں اُلجھی ہوئی تھی کہ نیچے ڈرائنگ روم سے رشید کی آواز آئی —— وہ جمیل سے باتیں کر رہا تھا —— رشید اور جمیل؟ یہ سمجھ کر کہ رشید اور جمیل چار مہینے کے لئے باہر سے پلٹ آئے ہیں ثریا اپنے مقام سے اٹھی۔ بال اور کپڑے درست کئے۔ سرد پانی سے چہرے کو خوب دھو کر پاؤڈر لگایا اور ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ پیدا کر کے خراماں خراماں نیچے اُتر گئی۔

(۳)

سورج غروب ہو چکا تھا —— ثریا اور جمیل بالاخانے کی چھت پر پہلو بہ پہلو بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شام کے تاریک سائے رینگتے ہوئے آئے اور ان کو اپنے پردے میں چھپا لیا —— خنک ہوا کے ہلکے ہلکے خوشگوار جھونکے باغ سے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو چرا لائے اور اُن کے گرد کی فضا کو معطر کر دیا —— دور کسی بنگلے میں ریڈیو پر ستار بج رہا تھا —— جس کے درد بھرے نغمے ان کے دلوں کو گدگدا گدگدا کر عجیب پُر آزار اور نشاط انگیز لہریں اٹھانے لگے —— ان کی زبانیں خود بخود رک گئیں، دل بولنے لگے —— اپنی پُر اسرار نہ سنائی دینے والی آواز میں۔ شوق و

محبت کی برقی لہریں ایک دل سے اٹھ کر دوسرے دل میں جانے لگیں۔ ایک ہلکے ہلکے نشے کی سی غنودگی طاری ہوگئی وہ اس خاموشی میں ایک دوسرے کی گھبرائی، اُلجھتی اور لرزتی ہوئی سانسوں کو سُن رہے تھے۔ بے خبری میں، نہ معلوم کب اور کیونکر ثریا کا ہاتھ رینگتا ہوا بڑھا اور جمیل کے گرم گرم مضبوط ہاتھ میں قید ہوگیا ــــ ہاتھوں میں قوت گویائی نہیں لیکن اُن کے ہاتھ کانپ کانپ کر۔ پھیل پھیل کر سمٹ سمٹ کر، کچھ کہہ رہے تھے ــــ کچھ سُن رہے تھے۔

تاریکی اور گہری ہوگئی۔ نیلگوں آسمان پر ایک ستارہ ٹوٹا اور ایک آتشیں خط کھینچتا ہوا غائب ہوگیا ــــ ان کے جھکے ہوئے سروں کے اوپر سے کوئی طائر سَن سَن کرتا ہوا نکل گیا ــــ ستار کی آواز اب بھی ان کے دلوں میں ہلچل مچا رہی تھی۔

ثریا کو اپنے داہنے رخسار پر گرم گرم سانس مَس ہوتی محسوس ہوئی ــــ اس کو نیند سی آنے لگی۔ دل پگھلا جا رہا تھا۔ جسم کی قوت سلب ہو رہی تھی ــــ ہاتھ پیر ڈھیلے ہوئے جا رہے تھے ــــ اگر زندگی کا کچھ ثبوت ملتا تھا تو اس کی اکھڑی ہوئی سانسوں سے۔

جمیل کے قیام کو چار روز گذر چکے تھے ــــ وہ عقل و خرد کے مشوروں کے خلاف اس عرصے میں اس کی محبت کو مشتعل کرکے اس کی آنچ سے اپنے دل میں گرمی پہنچا رہی تھی۔ وہ آگ کے ساتھ کھیل رہی تھی ــــ دہکتے ہوئے آتشکدے کے گرد چکّر لگا رہی تھی ــــ گر دامن سمیٹے ہوئے۔ اس کے شعلوں سے بچتی ہوئی، تاکہ مستقبل کی روح فرسا تنہائیوں میں اس پُرنشاط ہفتے کی یاد سے اپنا دل بہلا سکے۔ جیسے بعض نیم وحشی قبیلے اپنے پیر کو مار ڈالتے ہیں تاکہ بعد میں اُس کی قبر کو پوج سکیں۔

دفعتہً سامنے کے کھمبے پر دوڑتی ہوئی روشنی دکھائی دی۔ اور اس کے ساتھ ہی کسی کے موٹر کی آواز خاموش فضا کا دامن چاک کرتی ہوئی بلند ہوگئی ــــ ثریا اور جمیل دونوں ایک ساتھ چونک پڑے اور اپنا اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"بڑی دیر ہوگئی"۔ ثریا نے اپنی خفت اور سراسیمگی کو چھپاتے ہوئے کہا "صاحب آ گئے ہوں گے ــــ نیچے چلنا چاہیے"

"تم جاؤ، میں یہیں بیٹھوں گا"

"نہیں ــــ چلو"

"نہیں"

ثریا اُٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی ــــ "کیا جمیل میرے جانے سے ناراض ہے؟" اس نے سوچا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی ــــ لیکن چہرہ پرچھائیں کی طرح دھندلا معلوم ہو رہا تھا ــــ چند منٹ پس وپیش کرنے کے بعد وہ چُپ چاپ چلی گئی۔

رشید ڈرائنگ روم میں ایک کوچ پر نیم دراز تھا۔ پیر فرش پر تھے اور آنکھیں چھت سے لگی ہوئی تھیں۔ ثریا کی آہٹ پاکر اُٹھ بیٹھا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ شاید جمیل صاحب کے ساتھ تم بھی لڑائی پر چلی گئیں ــــ" رشید نے نیم باز آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

وہی خون کو کھولا دینے والی طنز آمیز مسکراہٹ۔ وہی کاہلی کے رنگ میں ڈوبا ہوا انداز گفتگو! ثریا جل بھُن کر کباب ہوگئی ــــ دل چاہتا تھا کہ کوئی ایسا جواب دے جس کو سُن کر رشید تلملا اُٹھے۔ لیکن ضبط کر گئی۔ دل کا چور اس کو رشید کی خوشامد اور دلجوئی پر مجبور کر رہا تھا۔

"اچھی رہی ــــ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" اُس نے ایسے دلفریب تبسم کے ساتھ کہا جو خاص موقعوں کے لئے مخصوص تھا "غائب تو خود تھے ــــ اور الزام مجھ کو دیا جا رہا ہے"۔

"یہی تو ہوتا ہے دنیا میں" رشید نے سیگرٹ ہونٹوں میں دبا کر جواب دیا "اپنی بلا دوسرے کے سر ٹالنے ہی میں خوشی کا راز پنہاں ہے ــــ جب تک انسان اپنے منہ کا بالٹو کا دینا نہیں سیکھتا اس کو خوشی نصیب نہیں ہوتی"۔

"خیر مُعمّے بیان کرکے اصل بات نہ ٹالئے" ثریا نے اس کے قریب بیٹھ کر کہا "بتائیے آپ کہاں غائب تھے کچہری ہے جس جگہ بیٹھ کے پی لی وہی میخانہ بنے! ــــ اور ہاں یہ تمہارے مہمان صاحب گئے؟ چھت پر چھتری لے کر چاندنی کی مشق تو نہیں کر رہے ہیں"؟

ثریا حیران تھی کہ رشید آج کیسی باتیں کر رہا ہے ــــ وہ اپنی عادت کے خلاف جمیل کا مذاق اڑا رہا تھا اس کی نگاہوں کے سامنے وہ بڑی بڑی آنکھیں چمکنے لگیں جو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چھپی ہوئی سب کچھ دیکھ رہی ہوں ــــ

"جی نہیں ــــ آپ کی طرح پولیس کے اشارے پر بے گناہوں کو سزا دینے کے لئے تعزیرات ہند پڑھ رہے ہیں"۔

قہقہہ!

چار سال کی ازدواجی زندگی میں آج پہلی دفعہ رشید قہقہہ لگا کر ہنس رہا تھا۔ پسلیوں کو دونوں ہاتھوں سے دبائے ہوئے ـــــ ثریا تلملا اٹھی۔ جیسے اچانک کسی نے اُسے تازیانہ مار دیا ہو۔

"کیسی ستم ظریف ہے تقدیر" رشید نے ہنسی کو بہ مشکل ضبط کرتے ہوئے کہا "میں بے گناہوں کو تو سزا دے سکتا ہوں ـــــ لیکن گناہگاروں کو گناہگار بھی نہیں کہہ سکتا"!

"اُس کا کیا مطلب؟" ثریا نے چونک کر پوچھا۔

"مطلب تو مجھے خود نہیں معلوم ثریا" رشید نے دفعتہً سنجیدہ بن کر جواب دیا "آج میں کچھ دیوانہ سا ہو رہا ہوں"!

"مجھے بھی یہی شک تھا" ثریا نے جل کر کہا

"یہ شک یقین سے بدل جائے گا اگر تم سنو کہ میں نے آج کیا کیا ہے"۔

"کیا؟"

"کچہری جاتے وقت میں نے تمہاری امّی کے نام تار بھیجا کہ فوراً چلی آویں"۔

"کیا!"

"سچ"

"لیکن یہ کس لئے۔ ان کے بلانے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"کوئی ضرورت نہیں۔ بس یہی دیوانگی۔ . . . میں سمجھا کہ شاید جمیل صاحب کو دیکھ کر تم کو اپنا میکا یاد آگیا ہو"!

"شکریہ"! ثریا نے قاتلانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا "اِدھر دو ایک روز سے آپ میرا بہت خیال رکھنے لگے ہیں"۔

"ہاں ـــــ پولیس کے اشارے سے"! رشید نے مسکرا کر جواب دیا اور چھت کی طرف منہ اٹھا کر سگرٹ کے دھوئیں سے چھلے بنانے لگا ـــــ

اگر ممکن ہوتا تو ثریا اس وقت اس کا گلا گھونٹ دیتی۔ لیکن مجبوراً دانت پیس کر رہ گئی ـــــ اور رشید کے پاس سے اٹھ کر دوسری کوچ پر بیٹھ گئی۔

"آئیے جمیل" رشید نے جمیل کو اندر آتے دیکھ کر کہا "کہئے کتنے تارے توڑ لیے"۔

"جی! تارے؟" جمیل نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہی ثریا کہہ رہی تھیں کہ آپ چھت پر تارے توڑ رہے ہیں"۔ رشید نے جواب دیا۔

"میں کہہ رہی تھی؟" ثریا نے جوش غضب میں اچھل کر رشید سے پوچھا اور اس کی طرف خونخوار آنکھوں سے دیکھنے لگی

"تو یہ غلطی ہوئی" رشید نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا "تم نے نہیں پولیس نے اشارہ کیا تھا"!

"بھاڑ میں جائے آپ کی پولیس" ـــــ اور آپ کو کیا کہوں"! ثریا نے غصے سے بے قابو ہو کر کہا۔

"مجھ پر کسی طیارچی کا بم گرے" رشید نے چھت کی طرف دیکھ کر کہا

ثریا بجلی کی طرح کڑک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

(۴)

رات کو دیر تک نیند نہ آنے کی وجہ سے ثریا کی آنکھ سویرے نہ کھل سکی، آٹھ بج رہے تھے جب وہ نہا دھو کر ناشتہ کے کمرے میں آئی اور ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی امّی بیٹھی ہوئی رشید اور جمیل کو جنگ کے متعلق اپنے قیمتی خیالات سے مستفید فرما رہی تھیں۔ ثریا نے بڑھ کر ان کو تسلیم کی اور ایک طرف بیٹھ گئی۔

"جیتی رہو بیٹی" انہوں نے بشاش ہو کر کہا "اچھی تو ہو ـــــ کیوں مجھ بڑھیا کو بیٹھے بٹھائے پریشان کر دیا۔ اللہ رکھے رشید کے ساتھ خود چلی آئی ہوتیں اب میں سفر کی تکلیف برداشت کرنے کے قابل نہیں ـــــ وہ اور دن تھے جب میں جج صاحب (ثریا کے والد) کے ساتھ عرب۔ ایران۔ مصر اور معلوم نہیں کہاں کہاں کا سفر کیا کرتی تھی ـــــ اب تو اُٹھنا بیٹھنا مشکل ہو گیا ہے اور خدا کی مار ہو۔ تمہارے یہاں کی گاڑی پر ـــــ جہاں رُک جاتی تھی چلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ یہ پردہ تم نے کب لیا ـــــ بہت اچھا ہے"۔

ثریا نے مناسب جواب دے کر چائے بنانا شروع کی۔ رشید اور جمیل نے جنگ کا ذکر چھیڑ کر ثریا کی امّی کو اپنی طرف مخاطب کر لیا۔

گو ثریا کی والدہ نے سفر میں رات بھر نہ سو سکنے کی کم از کم ڈیڑھ سو دفعہ شکایت کی ہو گی لیکن سارا دن ایک منٹ کے لئے بھی پلک نہ جھپکائی اور سائے کی طرح ثریا کے ساتھ ساتھ لگی رہیں۔ ثریا کے دل میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہو رہے تھے۔ لیکن اُس نے اُن کی طرف توجہ نہ کی اور دل کو یہی سمجھاتی رہی کہ یہ سب ممتا کا کرشمہ ہے۔ اسی خیال سے اُس نے ماں کی طرف توجہ اور دلداری اور زیادہ کر دی ـــــ سارا دن اُن کا دل بہلانے اور آرام پہنچانے کی ترکیبیں کرتی رہی۔

شام کے وقت جب رشید اپنے کلب چلا جا چکا تھا ثریا نے جمیل کے ساتھ موٹر پر تفریح کے لئے جانے کا ارادہ ظاہر کیا — اس کی والدہ بھی فوراً چلنے کے لئے تیار ہوگئیں اور خوش ہو کر بولیں۔

"ہاں بیٹی چلو — تمہارا شہر بھی دیکھ لیں۔ رشید کہتا تھا شام کے وقت یہاں بڑی چہل پہل رہتی ہے۔"

"اے ہے امّی" ثریا نے جواب دیا "یہ چہل پہل کیا خاک ہوگی — گنوار اور وحش تو بستے ہیں یہاں — آدمی کی صورت ہی نہیں دکھائی دیتی۔"

"تو چلو شہر کے باہر تھوڑی دیر تازہ ہوا میں تفریح ہو جائے گی۔"

"ہاں چلیئے" ثریا نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا اور جمیل کی طرف مایوس نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ امّی اس کے کہنے سے پیشتر ہی تیار تھیں فوراً اٹھ کر کھڑی ہوگئیں — جمیل متفکر — سر جھکائے ہوئے پیچھے پیچھے چلا۔

"کیا سائے کی طرح ساتھ رہنے کا کوئی خاص مطلب ہے؟" وہ سوچ رہا تھا۔ "یہ اچانک رشید کا ان کو تار دے کر بلانا اور ان کا ہر وقت ثریا کے درمیان حائل رہنا . . . . !"

باقی تین روز اسی طرح گذر گئے — ثریا اور جمیل اپنے شکوک کی وجہ سے خود بھی محتاط ہو گئے تھے۔ زیادہ تر الگ الگ رہتے — اور اگر یک جا بیٹھتے بھی تو سب کے ساتھ — اس کے علاوہ ثریا کی والدہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ ہر وقت لگی رہتی۔

تیسرے روز شام کی ٹرین سے جمیل لکھنو واپس چلا گیا — رشید ایک اچھے میزبان کی طرح اس کو خود اپنی موٹر پر بٹھا کر اسٹیشن تک پہنچانے گیا۔ ثریا بھی ان کے ساتھ جاتی مگر عین وقت پر اس کی "امّی" کو اختلاج قلب کے دورے پڑنے لگے۔ اور اس وقت تک حالت نہ سنبھلی جب تک ٹرین کا وقت گذر نہیں گیا۔

ثریا ماں کے سرہانے خاموش بیٹھی ہوئی تھی — آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ ہونٹ کانپ کانپ کر اس طوفانِ جذبات کی خبر دے رہے تھے جو اس وقت اس کے دل کی دنیا کو زیر و زبر کر رہا تھا — تاہم اس غم کی خوفناک تاریکی میں مسرت اور طمانیت کی ایک ہلکی سی کرن کبھی کبھی چمک جاتی تھی — دل کا بار کچھ ہلکا ہو گیا تھا — تذبذب اور الجھن سے آزاد ہو کر اب اس نے اپنے غم کو سینے سے لگا رکھا تھا۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے جب وہ اپنی ماں کو سلا کر خواب گاہ میں گئی۔ رشید ایک طرف بیٹھا ہوا ناول پڑھ رہا تھا۔ اس نے ثریا کی آہٹ پا کر نظر اٹھائی اور پھر پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

ثریا سنگار میز کے قریب دیر تک کھڑی رہی۔ اس کو رشید پر بے انتہا غصہ آ رہا تھا۔ اس لئے کہ رشید نے اس کی ماں کو اس پر جاسوس کی طرح مسلّط کر کے اس کی توہین کی تھی — اور اس سے زیادہ اس کے مہمان جمیل کی — ایک شریف اور تعلیم یافتہ خاتون اور ایک معزز مرد کی اس سے زیادہ اور کیا توہین کی جا سکتی تھی؟ لیکن یہ توہین ایسی تھی جس کا وہ خود ذکر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"خدا کی مار اس گھڑی پر" اس نے سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کے لئے دیوار کی گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا "ابھی سے گیارہ بجا دیئے — آپ کی گھڑی میں کیا وقت ہے؟"

"میری گھڑی پر بھی خدا کی مار ہے" رشید نے جواب دیا "اس نے سوا گیارہ بجا دیئے۔"

ثریا ہنس پڑی — لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا دل بھر آیا — آنکھوں سے گرم آنسوؤں کا چشمہ ابلنے لگا — وہ دفعتہً کس قدر چھوٹی ہو گئی تھی۔ کیسی کمزور اور بے بس — اس نے ہاتھ بڑھا کر بجلی بجھا دی۔ اور سنگار میز کے قریب اسٹول پر بیٹھ گئی۔ دونوں بازو میز پر پھیلا کر ان کے حلقے میں اپنا چہرہ چھپا لیا اور بچوں کی طرح سسک سسک کر رونے لگی۔

تاریکی میں دو ہاتھ بلند ہو کر اس کے شانوں پر آہستگی اور نرمی کے ساتھ گرے

"چھوڑیئے مجھے" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا لیکن اپنے چھڑانے کی خود کوئی کوشش نہ کی۔

"ثریا!" رشید نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "شہر میں ایک جگہ ہندو مسلم فساد ہونے والا تھا۔ دونوں جماعتیں سنجیدہ اور شریف لوگوں پر مشتمل تھیں۔ لڑائی سے بچنا چاہتی تھیں لیکن اشتعال روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے حفظ ماتقدم کے لئے وہاں پولیس کا بہت سخت پہرہ لگا دیا — اس طرح فساد ٹل گیا۔ اب دونوں جماعتیں میری تعریف کر رہی ہیں۔ اور دونوں فساد کے ٹل جانے پر خوش ہیں۔ اس لئے کہ وہ واقعی لڑنا نہ چاہتے تھے۔"

ثریا نے جواب دینے کے بجائے اس کے شانے پر سر رکھ دیا۔

رشید طیار رچی نہ سہی ایک لائق مجسٹریٹ ضرور تھا۔

شبیر حسین رضوی

دھوبی کا گھاٹ

جس شخص کے ملبوس کی قسمت میں لکھی ہے
کرنوں کی تمازت
رشک آتا ہے مجھ کو
اُس پر۔

کیوں صرف اچھوتا،
انجان ، انوکھا
اک خواب ہے خلوت!
کیوں صرف تصوّر
بہلاتا ہے مجھ کو؟

کیوں صبحِ شبِ عیش کا جھونکا
بن کر
رخسار کی بے نام اذیت
سہلاتا ہے مجھ کو!
کیوں خواب فسوں گر کی قبا چاک نہیں ہے؟
کیوں گیسوئے پیچیدہ درقصاں
نمناک نہیں ہے
اشکِ دلِ خوں سے؟
کیوں لمس کی حسرت کے جنوں سے
ملتی نہیں مجھ کو
بے قید رہائی؟

ملبوس پہ کرنوں کی تمازت
ہے دامِ نظر کا۔

اور صبحِ شبِ عیش کو گیسو کا مہکتا ہوا جھونکا
مرہونِ سحر کا
ہوتا ہی نہیں ہے۔

کیوں دھوئے نہ پیراہنِ آلودہ کے دھبے
مخمورِ مسرّت؟
کرنوں کی تمازت
بن جائے نہ کیوں رنگِ شبِ عیش کا اک عکسِ مسلسل؟

مجبورِ اذیت!
تو مان لے، اس عکس کا منظر
دیتا ہے تجھے جامِ جمشید کی سی لذّت،
کیوں سوچ رہا ہے
جوٹھا ہے یہ پیالہ؟
کیا آج زمانے میں کہیں دیکھی ہے تو نے
دوشیزہ مسرّت؟

پھیلے ہوئے ملبوس پہ کرنوں کی تمازت
ہے زیست کے گیسو کی حرارت،
اِس شخص کو پیراہنِ آلودہ کے دھونے ہی سے روزی
ملتی ہے جہاں میں
تو اس پہ نظر کر۔

میراجی

دنیائے ادب

نئی سوزمیں، نئے موضوع نئے اندازِ بیان —— شاعری میں ان سب کی آمد ضرورت کی پابند ہے۔ ابتدائی انسان کی ضروریات محدود تھیں، اس لئے اس کی شاعری بھی محدود رستوں ہی پر گامزن ہوئی۔ یا یوں کہئے کہ اُس کی نظر اپنی محدود ضروریات کے دائرے میں شعریت کی تلاش کر سکی۔ پیٹ بھر کر اپنی ہمدم کے ساتھ فراغت سے لطف اندوز ہونا، پیٹ بھرنے کے لئے خوراک کی فراہمی اور ڈر —— مظاہرِ فطرت سے ڈرنا، اپنے ہم جنس دشمنوں سے ڈرنا، بس یہی موضوعاتِ سخن تھے۔ اشتہا اور خوف کے دو متوازی خطوط کا درمیانی فاصلہ ابتدائی انسان کی شاعری ہے۔ جوں جوں ارتقائی منازل طے ہوتی گئیں اور تہذیب و تمدن کی الجھنوں سے انسان کو واسطہ پڑا توں توں اُس کے تخیّل کا ستارہ چمک کر اپنی اڑتی ہوئی گرد سے خیال کے آسمان میں ایک کہکشاں بناتا گیا۔ تہذیب و تمدن کی آمد نے نہ صرف احساس و جذبات میں ایک غیر محدود تنوع پیدا کر دیا بلکہ ہر قسم کے احساس و جذبات کی ادبی تسکین کے بعد ذہن ہر طرح کے فطری اور غیر فطری رستوں پر گامزن ہونے پر یہ سوچنے لگا کہ اب کونسے نقطے کو منزلِ مقصود بنایا جائے۔ اور شاید یہیں سے متخیلہ کی ابتدا ہوئی۔

ذیل میں راجہ مہدی علی خاں کی دو نظمیں بھی تخیّل کی ایسی ہی پرواز ہیں۔ شاعر کا ذہن شاید اپنے گردوپیش کے حقیقت افروز ماحول سے تنگ آ کر ایک معکوس انداز میں گریز کی کیفیت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔

اصلاً یہ نظمیں طنز ہیں معاشرت پر، پرانے خیالوں کو نیچا دکھانے کے لئے فن کار نے ایک نیا اور اونچا رستہ چُنا ہے۔ دونوں نظمیں بظاہر منظر ہیں مرقعے، لیکن اس حُسنِ تصویریت سے احساس اور خیال کو بھی حرکت ہوتی ہے۔ پہلے نظمیں دیکھ لیجئے۔

جنّت کی سیر

جنّت کی دیوار پہ چڑھ کر
میں اور شیطاں دیکھ رہے تھے
جنّت کے پُرکیف نظارے،
ہر سو، ہر جانب پھیلے تھے،
دودھ کی جھیل کے پاس اک مُلّا
چورن کے اک پیڑ کے نیچے
حلوے کے اک ڈھیر پہ بیٹھا
سر کو جھکائے اونگھ رہا تھا۔

ملاقات

کھٹ! کھٹ! کھٹ
جنّت کا دروازہ کھولو!
مولانا!
دیکھنے والا کوئی نہیں
آدھی رات ہے مولانا
کھٹ! کھٹ! کھٹ!
ہاں ہاں میں شیطاں ہوں بیشک
آپ کا خدمت گار پُرانا
مولانا!
کھٹ! کھٹ! کھٹ!
چوری چوری
آپ کے پاؤں
رات کو دابنے آیا ہوں۔
جنّت کا دروازہ کھولو —— مولانا!

ادبِ لطیف ستمبر ۱۹۴۰ء — راجہ مہدی علیخاں

جنت کی سیر کا ماحول پھیلا ہوا ہے۔ اس تصویر میں دائیں بائیں، آگے پیچھے گردوپیش سب ہی کچھ ہیں اور جہاں دودھ کی جھیل، آغوشِ حسیں، پُرکیف نظارے —— ان چیزوں سے جنّت کے تصور میں وہ نرمی پیدا کی گئی ہے جو ذاتی طور پر ہمارے تحت الشعور میں موجود ہے وہاں چورن کے پیڑ اور حلوے کے ڈھیر سے طنزیہ تاثر کو ابھارا گیا ہے اور یہ ابھار اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ جب ہمیں پہلے ہی دو مصرعوں میں معلوم ہو جاتا ہے کہ راجہ مہدی علی خاں اور شیطان دونو

مذنک سکول کی یاد آجاتی ہے اور مُلا سکول کا نامعقول مدرس اور شاعر اور شیطان دو شریر طالب علم بن جاتے ہیں۔

دوسری نظم ملاقات نفسی لحاظ سے زیادہ پیچیدہ ہے جنت کے عام تصور میں روایت کی رُو سے نیک بندوں کی خدمت کرنے والے از اغلمان اور حوریں ہوں گی۔ لیکن شاعر کی نظر میں مولانا، خواہ یہ مولانا کوئی مُلا ہو یا کوئی ریاکار لیڈر، نیک بندہ نہیں ہے۔ ایک ناپسندیدہ فرد ہے۔ جو اس دنیا میں شیطانی افعال کا ہی مرتکب ہوتا رہا اور اسی لئے اب شاعر اُسے ایک خیالی جنت میں پہنچا کر شیطان کو اس کے دروازے پر لا کھڑا کرتا ہے نظم کی طنز کو "خدمت گار پرانا" کے دو الفاظ ہی اچھی طرح نمایاں کر دیتے ہیں "چوری چوری آدھی رات ہے" اور "کھٹ کھٹ، کھٹ" کا صوتی تاثر یہ تینوں چیزیں مل کر ماحول کی تخلیق اور ترجمانی میں معاون بنتی ہیں۔

مافوق الفطرت تخیل کے یہ دو مطالعے راجہ مہدی علی خاں کی شگفتہ تخلیق ہیں۔

اور ذیل کی دو تضمینیں اسد ملتانی کی ذہانت کا اظہار کر رہی ہیں جن پر کچھ کہنا لاحاصل ہے کہ سیدھی سادی لطف اٹھانے کی بات ہیں

ریڈیو

(شیخ ناسخ سے معذرت کے ساتھ)

ہے ریڈیو حضورِ معلّےٰ کے سامنے — یا زہرہ نغمہ زن ہے ثریا کے سامنے

بالکل بجا ہے ساتھ اگر یہ بھی ہم کہیں — بے جان بولتا ہے مسیحا کے سامنے

(حکیم مومن سے معذرت کے ساتھ)

ریڈیو ہو تو گوشۂ خلوت — خامشی آشنا نہیں ہوتا

یہ مرے پاس ہوتا ہے گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ہمایوں ستمبر ۱۹۴۲ء — اسد ملتانی

بہاؤ اور تکرار کے لحاظ سے آزاد انصاری اپنے کلام میں عموماً ایک اچھا فن کار ثابت ہوتا ہے۔ ذیل کی نظم "عشق خود اعتماد" میں نہ صرف تکرار کی دلچسپی موجود ہے بلکہ بہاؤ کا زور بھی پوری طرح نمایاں ہے نظم کے مصرعوں میں نثر کے فقروں کی سی سادگی تاثر میں اضافہ کرتی ہے۔ لیکن اس مجموعی تاثر کو حاصل کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ اس کے لئے الفاظ پر ایک غیر معمولی قدرت ضروری ہے ہیئت کی پابندی اور قدامت کے باوجود موضوع کے لحاظ سے یہ نظم نیا رنگ رکھتی ہے۔ جس عاشق کا کردار اس میں پیش کیا گیا ہے وہ ہماری شاعری کے پہلے پرانے روایتی عاشق سے کہیں مختلف ہے، بلکہ ہماری جدید شاعری میں بھی خال خال ہی دکھائی دے سکتا ہے۔ اس نظم کا عاشق جذبات کے دھارے میں بہہ نہیں سکتا۔ وہ ایک چٹان کی مانند ہے۔ اگر نباتات کو کسی بیل کو ضرورت ہو تو وہ اس چٹان سے لپٹ جائے۔ یہ اپنی خودداری میں کسی طرح کا فرق نہ آنے دے گی۔ مرد اور عورت کی مساوات کے لحاظ سے یہ نظم ایک انتہائی صورت ہمارے پیش نظر کرتی ہے اور جو لوگ سمجھتے ہیں کہ مرد اور عورت کی مساوات شاید شعریت کی قاتل ثابت ہو۔ انہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ شعریت کی تلاش اور اُس کا حصول فن کار کے زورِ طبیعت پر منحصر ہے۔ اور زورِ طبیعت کے لحاظ سے آزاد انصاری ہمیشہ ایک کامیاب شاعر رہا ہے۔

عشق خود اعتماد

کوئی قدرِ مذاقِ بے وفائی کر نہیں سکتا — کوئی ناآشنا سے آشنائی کر نہیں سکتا

اگر واقع میں اب تم سوئے ضبطِ جور مائل ہو — تو میں اس ضبط کی ہمت فزائی کر نہیں سکتا

اگر واقع میں اب تم جبر کی منطق کے قائل ہو — تو میں اس جہل کی مدحت سرائی کر نہیں سکتا

اگر یہ سچ ہے تم نازانِ کارِ بے وفائی ہو — تو یہ بالکل غلط میں بے وفائی کر نہیں سکتا

اگر یہ سچ ہے تم آمادۂ بے اعتنائی ہو — تو پھر یہ جھوٹ ہیں بے اعتنائی کر نہیں سکتا

اگر تم قصدِ کارِ کج ادائی کرنے والے ہو — تو کیا میں عزمِ کارِ کج ادائی کر نہیں سکتا

اگر تم مجھ سے جی بھر کر رکھائی کرنے والے ہو — تو کیا میں تم سے کچھ بڑھ کر رکھائی کر نہیں سکتا

اگر تم عازمِ ناآشنائی ہونے والے ہو — تو کیا میں تم سے ترکِ آشنائی کر نہیں سکتا

اگر تم ساعیٔ باہم جدائی ہونے والے ہو — تو کیا میں سبقتِ باہم جدائی کر نہیں سکتا

اگر تم پیکرِ جنگ آزمائی بن کے آئے ہو — تو کیا میں ہمتِ جنگ آزمائی کر نہیں سکتا

اگر تم دشمنِ صلح و صفائی بن کے آئے ہو — تو کیا میں نفیٔ ہر صلح و صفائی کر نہیں سکتا

اگر اب تم ڈھٹائی ہی کی مجھ سے ٹھان بیٹھے ہو — تو میں کیوں چپ رہوں کیا ڈھٹائی کر نہیں سکتا

اگر اب تم لڑائی ہی کی مجھ سے ٹھان بیٹھے ہو — تو میں کیوں طرح دوں کیا میں لڑائی کر نہیں سکتا

میں اصنامِ حسیں کے ناز اٹھانے کو تو حاضر ہوں — پر اُن کی چوکھٹوں پر جبہ سائی کر نہیں سکتا

میں اہلِ حُسن کی قیمت بڑھانے کو تو حاضر ہوں — پر اُن کے وصل کی خاطر گدائی کر نہیں سکتا

اگر میں فرض کر لوں، قید و بندِ غم مقدر ہے — تو کیا میں کوئی تدبیر رہائی کر نہیں سکتا

اگر میں مان لوں ہمیرا مقدر نارسا تر ہے   تو کیا میں کچھ علاجِ نارسائی کر نہیں سکتا

اگر کوئی مرا مشکل کشا بننے سے منکر ہے   تو کیا میں اپنی خود مشکل کشائی کر نہیں سکتا
اگر کوئی مرا حاجت روا بننے سے قاصر ہے   تو کیا میں اپنی خود حاجت روائی کر نہیں سکتا

مری ہمت، مجھے خود ناخدا بننا سکھائے گی   بلا سے کوئی میری ناخدائی کر نہیں سکتا
مری منزل مجھے خود ڈھونڈ کر اپنا پتا دے گی   بلا سے کوئی میری رہنمائی کر نہیں سکتا

جہاں آزاد اب میرا نیازِ عشق فائز ہے
وہاں کوئی عزازیل دلربائی کر نہیں سکتا۔

ہمایوں اگست ۱۹۴۲ء ——— حکیم آزاد انصاری

خیالاتِ پریشاں

دیودارو ں کے تُرش رُو پتے   جھڑ کے پیوندِ خاک ہو بھی چکے
جھیل کی لٹ چکی ہے شادابی   کب سے میداں میں پہنچی مرغابی
ہر طرف نرم برف جمنے لگی   سربرآوردہ ندی تھمنے لگی
چیختی ہے ہوا گذرتی ہوئی
کوہساروں کے پار اترتی ہوئی
میں ہوں اور اک بسیط تنہائی   بے کراں لامحیط تنہائی
راہ بھولا ہوا ہوں منزل کی   کیا کہوں کیا ہے کیفیت دل کی
اشک آنکھوں سے بہتے جاتے ہیں   کتنے افسانے کہتے جاتے ہیں
سانس رکتا ہے لڑکھڑاتا ہوں
ذرّے ذرّے سے خوف کھاتا ہوں
ایک شفّاف ٹکڑا بادل کا   یا کوئی پرزہ نوری آنچل کا
دُور افق کے قریب لہرایا   آرزوؤں نے دام پھیلایا
میں نے چاہا کہ اپنی بات کہوں   ہوسکے گر تو اس کے ساتھ چلوں
میری رفتار برق دار نہ تھی
اور اُسے تابِ انتظار نہ تھی
برف کے اک وسیع میداں پر   اب کھڑا ہوں شکستہ حال و جگر
راستہ ہے نہ رہنما کوئی   میرے پہلو سے گم ہے سایہ بھی
شام کی زردی آئی جاتی ہے   مردنی بن کے چھائی جاتی ہے

دم بخود ہے ہوا سسکتی ہوئی
روح ہے یا بہارِ رفتہ کی

آتالیق اگست ۱۹۴۱ء   قیوم نظر

آریہ جب پہلے پہل ہندوستان میں پہنچے تو انہیں دو چیزوں سے سابقہ پڑا، جنگل اور جنگلی۔ جنگلیوں کو تو انہوں نے مار بھگایا، اور وہ ملک کے دُور افتادہ حصّوں میں جا چھپے، لیکن جنگل کے جادو سے بچ نکلنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ نہ صرف اُن کی تہذیب کا گہوارہ جنگل ہی بنے بلکہ ان کے تمام بنیادی خیالات کی نشو و نما جنگلوں کی تنہائی اور گہرائی میں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے خیالات میں کسی جنگل کے اتھاہ ساگر کے ایسا عمق پایا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ زندگی کا ڈھب بدلا، گاؤں بنے، بڑھ کر قصبے بن گئے۔ قصبے پھلے پھولے اور شہروں کے آثار نظر آنے لگے اور پھر تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے یہ دور دراز سے آئے ہوئے باشندے مناظرِ فطرت سے دور ہوتے گئے۔ لیکن نسلی تجربے کے لحاظ سے اب بھی وہ تاثرات جو انہیں جنگلوں میں حاصل ہوئے ان کے نفس لاشعور میں موجود ہیں۔ یہ نسلی تجربات اب بھی ادب کے ذریعے سے ظاہر ہوتے ہیں قیوم نظر کی اوپر کی نظم شاید ایک ایسا ہی نسلی تجربہ ہے۔ اس میں جنگل کا بیان جس انداز سے کیا گیا ہے اُس سے یوں محسوس ہوتا ہے گویا شہر، شہری اور ستر کوئی چیز ہی نہیں، آبادیاں عنقا کی حیثیت رکھتی ہیں۔

آریاؤں کو جنگل کے مختلف جلووں میں جو ہم آہنگی انسانی احساسات سے محسوس ہوئی ہوگی، اُس کا عکس بھی اس نظم میں موجود ہے۔ بظاہر اس میں ہر منظرِ فطرت محض بیانیہ معلوم ہوتا ہے لیکن ہر خارجی چیز کی کچھ نہ کچھ داخلی اہمیت بھی ہے، بادل کا شفاف ٹکڑا ـــ صرف بادل کا ٹکڑا ہی نہیں ہے۔ اور یہی حال غیر شاداب جھیل، چیختے ہوئے گذرتی ہوئی ہوا، (آخر میں سسکتی ہوئی دم بخود ہوا) سربرآوردہ ندی، میدان میں پہنچی ہوئی مرغابی، دیودار اور ترش رو پتوں کا ہے۔ یہ سب کسی ناٹک کے کردار ہیں۔ اور ان کے ساتھ ـــ خوف دلاتے ہوئے ذرّے، شام کی زردی، نرم برف، اور بسیط تنہائی ـــ یہ سب کچھ ان کرداروں کے (یا شاعر کے) دل کی کیفیت کی ترجمانی کو موجود ہیں۔

اردو کے جدید شعراء میں بہت کم شاعر ایسے ہیں جو اپنی نظموں میں ایک گہری فضا کی تخلیق کی طرف توجہ دیتے ہیں، اس نظم میں جو اس کی ایک اپنی نفسی کیفیت یا فضا تیار ہو جاتی ہے وہ بھی غور کے لائق ہے، وہی فضا ہمیں فن کار کے دل کی کیفیت کا صحیح احساس دلاتی ہے۔

ـــ میں لفظ 'پرزہ' بے معنی لیکن اور گرد وغیرہ کو قابلِ ترک نہیں سمجھتا۔   آزاد انصاری

نقد و نظر

غالب کی زندگی اور غزلیں (انگریزی)

از عبداللہ انور بیگ ایم۔اے۔ایم۔او۔ایل۔ایل۔بی۔ایڈوکیٹ لاہور
ناشران :۔ اردو اکیڈمی لوہاری دروازہ لاہور۔ سائز ۲۰ انگریزی مجلد مصور
قیمت ـــــ درج نہیں ہے۔

یہ کتاب بزبان انگریزی ہے ـــــ دیباچہ میں مصنف لکھتا ہے

(ترجمہ)

اس زمانے میں جب کہ دنیا کی طاقتیں مختلف باشندگان کرۂ ارض میں سمجھوتے کے لئے شدت سے کام کر رہی ہیں۔ ادب اور انسانی خیال کی ترقی کا مطالعہ اتنا ہی سبق آموز ہے جتنا کہ پُرلطف ...... دنیائے ادب کی نظم کی کتابیں " انسانیات " کے طالب علم کے لئے بہترین مواقع فراہم کرتی ہیں۔ نیز انسان کی فطرت اور روحانیت کے مطالعے کا مقصد بھی پورا ہو سکتا ہے ":

اس کے بعد مصنف کو افسوس ہے کہ (ترجمہ) " مشرقی ادیبوں نے ادبیاتِ عالم میں اپنا جائز مرتبہ نہیں پایا فقط اس لئے کہ ان کی کاوشیں مغربی قوموں کے سامنے پیش نہ کی جاسکیں "۔ چنانچہ اس بے انصافی کی دادرسی کی غرض سے یہ کتاب وجود میں لائی گئی۔ غالب پر ہاتھ صاف کرنے کی وجہ مصنف یوں بیان کرتا ہے :۔

(ترجمہ)

" غالب آخری مغل شہنشاہ کے عہد میں اردو کا شاعر اعظم تھا ....
اپنے کلام کے انسانی پہلو کے لئے اسے بالخصوص پسند کیا گیا ہے،
اگرچہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ زندگی کے بارے میں شاعر (غالب)
ایک مایوسانہ نظریہ رکھتا ہے اور اس کی شاعری اشیا کی
دوبارہ تشکیل میں خال خال ہی مدد کرتی ہے۔ خاص طور پر اس وقت
جب کہ اہل ہند انقلاب اور تعمیر نو کی فکر میں ہیں۔ مگر جہاں تک
اس کے فن ـــــ بلاغت، عمیق نظری، اظہار کی پاکیزگی اور
انوکھے نظریہ حیات ـــــ کا تعلق ہے شاعر نے کمال کی
بلندی حاصل کی ہے (!) جو یقیناً ایک عرصے تک باعث
کشش رہے گی "۔

اس انوکھے دیباچے اور غالب کی شاعری پر اس عجیب و غریب " انسانیاتی " تنقید کے بعد اخبار سول ملٹری گزٹ لاہور کے ایک انگریز ایڈیٹر مسٹر جے۔ بی روم کی لکھی ہوئی ایک مختصر تمہید ہے۔ روم صاحب تمہید کو حسب ذیل طریق سے شروع کرتے ہیں :۔ (ترجمہ)

" مسٹر عبداللہ انور بیگ کو تعارف کی حاجت نہیں، مگر کسی وجہ
سے جس کو وہ خود ہی بہتر جانتے ہیں انھوں نے مجھے اپنی کتاب
(" غالب کی زندگی اور غزلیں ") کی تمہید لکھنے کو کہا ہے۔ میں
اردو سے ایک ادیب کی طرح نہیں بلکہ فقط ایک جرنلسٹ کی
حیثیت سے واقف ہوں۔ اسی قدر جس قدر کہ ایک ایسے شخص
سے توقع کی جاسکتی ہے جس نے اپنی زندگی کے کئی سال ہندوستان
میں گزارے ہوں "۔

اور اس کے بعد زیادہ تر مصنف کی تعریف کے پل باندھے گئے ہیں اور ترجمے کی خوبی کو سراہا گیا ہے۔ مگر اردو شاعری کے متعلق روم صاحب کی صاف گوئی ان سب پر غالب ہے !

اصل کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک میں غالب کی زندگی کے حالات درج ہیں اور دوسرے میں کلام کا کہیں کہیں سے ترجمہ۔ پہلے حصہ میں کوئی بات قابل ذکر نہیں ہے اور چونکہ مصنف کی انگریزی دانی سے یہاں کوئی واسطہ نہیں۔ اس لئے اس حصے پر کچھ لکھنا بے سود ہے۔ دوسرا حصہ نہ صرف غور طلب اور بحث طلب ہے۔ بلکہ استعداد عامہ کو ایسی دعوتِ تحریف ہے کہ اس پر جتنا کچھ لکھا جائے کم ہوگا کیونکہ یہی حصہ کتاب کا اہم حصہ ہے۔ اور اسی سے مسٹر عبداللہ انور بیگ ایم۔اے۔ایم۔او۔ایل۔بی ایڈوکیٹ لاہور کے علمی جوہر ایسے کھلتے ہیں اور ادبی کمالات کچھ اس طرح چمک اٹھتے ہیں کہ ہوش و خرد کے طوطے اڑ جاتے ہیں !

غالب اردو زبان کا ایک عظیم الشان اور عالی وقار شاعر ہے۔ اس کا

رتبہ کسی طرح شیکسپیئر گوئٹے ہورلیس اور ورجل سے کم نہیں۔ مگر جہاں ادبائے عالم کی صفِ اوّل میں غالب کا شمار ہے وہاں یہ امر بھی مسلم ہے کہ اغلاق ابہام اور مشکل پسندی غالب کی شاعری کے ویسے ہی اہم عنصر ہیں جیسے بعض دیگر شعرائے عالم مثلاً بلیک میرڈیتھ کیٹس۔ شیلے۔ ملارمے وغیرہ کی شاعری کے اور اس کی شرح آسان نہیں۔ غالب ہی اردو زبان کا ایک ایسا شاعر ہے جس کا کلام شارحین کی عزت افزائی سے دو بالا ہو گیا ہے۔ اکثر غالب کے کلام کی شرح ناممکن سی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس کی جیتر کاری کثرت سے "مجموعہ نگاری" کی طرف مائل ہوتی ہے جس میں نقالی یا تفصیلی نقاشی کی میناکاری نہیں ہوتی بلکہ ادنیٰ تصاویر کو مہارت اور اعلےٰ درجے کی فن کاری کے ذریعے یک جا کر کے یا بذریعہ اشارات ایک بسیط اور بلند اجمالی تصویر کی تخلیق کی جاتی ہے۔ واقعے کے بیان پر اکتفا کی بجائے غالب کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کیفیات اور حسیات کی تصاویر سے واقعے کو پیدا کیا جائے اسی لئے ایسے اشعار کی شرح نہیں کی جا سکتی اور اسی لئے محض لغوی حیثیت پر توجہ مرکوز کرنے سے شعر مہمل نظر آنے لگتا ہے۔

جن باتوں پر غالب کے کلام کے عیوب و محاسن منحصر ہیں ان میں سب سے اہم اس کی فارسی اور مشکل پسندی کے علاوہ محاورات کا جا اور بے جا استعمال ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے ترجمہ ناممکن اگر نہیں تو اتنا دشوار ضرور ہے کہ ایک اچھے خاصے ادیب کی دسترس سے باہر ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کا مترجم ایک جوہر شناس ہی ہو سکتا ہے۔ ایسا جوہر شناس جسے نہ صرف اردو اور فارسی زبانوں کے محاورات صنائع لفظی۔ رعایات۔ تراکیب اور بندشوں پر عبور ہو بلکہ جو انگریزی یا کسی اور زبان پر بھی اس قدر حاوی ہو کہ متذکرہ خصوصیات کو اس زبان میں ہم وصف طریقوں سے نبھا سکے۔ ورنہ وہی حشر ہوگا جو اردو کی ایک مشہور مثل "بندر کے ہاتھ استرا" کے ساتھ ازلی طور پر منسوب ہے!

اس کے بعد تنقید ایک اور مشہور مثل پر ختم کی جا سکتی ہے:—

"کیا جانے زعفران کا بھاؤ" — ! اور اب مترجم صاحب کے ترجموں کی بہار ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ غالب کے کلام کی قسمت کیسے چمکائی گئی ہے!

(۱) آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے

صفحہ

Cognizance may spread its net of hearing t[illegible] ny extent

مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

The Phoenix is the object of our Universe of thought

مرحبا کیا سلیس ترجمہ ہے! 'مدعا عنقا' ہونے کی کیا خوب تفسیر ہے! اس کے بعد جو یہ کہیے کہ 'مدعا عنقا' ہونا ایک محاورہ ہے۔ اور عالمِ تقریر کے معنی انداز بیان ہیں اس پر تین حرف ورنہ ایک ہفت زبان کیونکر انھیں نظر انداز کر سکتا تھا!

(۲) بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا

صفحہ ۸۴

O Ghalib! Whereas even in captivity I have my feet on fire

موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

The ring of my chain is a hair that hath seen fire

ہفت زبانی کا یہ ایک زبردست شاہکار ہے کہ 'آتش زیر پا' بمعنی "پیر کے نیچے آگ" "آتش دیدہ" بمطلب "آگ کو دیکھے ہوئے" اور 'حلقہ' برائے "چھلا" استعمال ہوئے ہیں۔

(۳) لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز

صفحہ ۸۵

Still I am learning lessons in the school of the grief
of the heart,

لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

But it is only this that (raft) went and (bud) was.

ہفت زبانی کا یہ بھی ایک نادر کرشمہ ہے! 'ہنوز' کو لفظ "تاہم" سے خوب بدلا ہے 'رفت' و 'بود' کا کیا بلیغ ترجمہ فرمایا ہے۔ اور 'گیا' اور 'تھا' کے ترجمے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی۔ شاید بیچارے غالب نے انھیں بے وجہ استعمال کر دیا ہوگا!

(۴) سادگی و پُرکاری بے خودی و ہشیاری

صفحہ ۸۶

Simplicity, Skilfulness, ecstacy and wakefulness,

حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

Beauty in its Languor, has been found testing the (lover's) daring.

فاضل مترجم نے کیا خوب اس شعر کا مطلب سمجھا اور سمجھایا ہے۔

'پرکاری' کو جناب "ہنرمندی" کہتے ہیں اور 'بے خودی' کو 'وجد' ——— 'ہشیاری' کو "بیداری" ——— اور 'تغافل' کو "خمار آلود کاہلی"! اور سخن دانی یہیں نہیں ختم ہوتی ہے 'جرأت آزما پایا' کو جناب "پرکھتے ہوئے پایا گیا" سمجھتے ہیں! انتہائے کمال یہ ہے کہ خطوط وحدانی میں اپنی طرف سے 'عاشق' کے لفظ کا اضافہ کر کے مصرع کو چار چاند لگا دیئے ہیں ——— اس کا تو ذکر ہی فضول ہے کہ پہلے مصرع میں جو حروفِ عطف ہیں ان کا ترجمے میں کہیں پتہ نہیں۔ اس شعر کا جو مطلب اس ترجمے سے نکلتا ہے۔ وہ یہ ہے:-

سادگی۔ ہنرمندی۔ وجد اور بیداری

حسن اپنی خمار آلود کاہلی سے عاشق کے حوصلے کو پرکھتا ہوا پایا گیا۔

فاضل مترجم کی شان میں گستاخی کی کسے جرأت ہو سکتی ہے جو یہ کہے کہ مصرع اولیٰ میں جو متضاد صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان کی موجودگی میں حسن کی تغافل شعاری ایک جرأت آزما کام ہے خالہ جی کا گھر نہیں۔ مگر ہم نے حسن کو اس معاملہ میں بھی یکتا پایا ریا یہ کہ بہ یک وقت ان سب صفات کا مظاہرہ کرنا حسن کے لیئے اپنی جرارت کی آزمائش تھی!

(۵) غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل

صفحہ ۸۶

The bud is going to blossom again; today we saw,

خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

Our heart turned into blood—having lost it, found it.

"دل" کا جو فاضل مترجم نے "خون میں تبدیل ہو گیا" کہہ کر خون کیا ہے اسے جانے دیجیئے۔ مگر یہ "Having lost it, found it" کیا بلا ہے؟ انگریزی زبان کی کونسی ترکیب اور کونسا محاورہ ہے۔ خواہ ترجمہ صحیح بھی مان لیا جائے!

(۶) عرض کیجیئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں

صفحہ ۸۸

Where am I to present the heat of the essence of t ht

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

With the mere thought of wildness, the Sahara

صحرا' گیا' تمامتر راکھ ہو گیا ہے! یہ ترجمہ فاضل مترجم کی غمازی کرتا ہے۔ ترجمہ کچھ اس طرح کیا گیا ہے:-

عرض کیجیے	Am I to present
جوہر	of the essence
اندیشہ	thought
گرمی	heat
کہاں	where
کچھ خیال	mere thoght
وحشت	wildness (!)
صحرا	the Sahara
جل گیا	has become all ashes (!)

دیکھا آپ نے ترجمہ کرنے کا کیا گر ہے۔ اور یہ کس قدر آسان کام ہے!

(۷) گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب

صفحہ ۹۵

Although I am mad, but why should I be deceived by (my) friend?

آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

She holds hidden in her sleeve a dagger, openly a lance in her hand.

کس نفاست سے مارِ آستین کو معشوق بنا دیا گیا ہے۔ اور معانی کے لحاظ سے تو انگریزی ترجمے پر غور ہی نہ کیجیئے!

(۸) فنا تعلیم درس بے خودی ہوں اس زمانے سے

صفحہ ۸

I have been t ght mortality by the teachings of selflessness since—

کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر

Majnun was writing "L–A" on the wall of the school.

لام۔ الف کا ترجمہ "L – A" کیا تیر بہدف کا حکم رکھتا ہے! اور انگریز تو اس "L – A" کو خوب سمجھ جائیں گے!

(۹) سلطنت دست بدست آئی ہے

صفحہ ۱۲۴

Kingdom has passed from hand to hand

جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

The Cup of wine is not the ring of Jamshed

یہ ایک ہفت زبان ہی کا حصہ ہو سکتا ہے کہ 'خاتم' کا ترجمہ "انگشتری" یا "چھلا" کرے۔ عربی نوازی کی داد عرض ہے!

(۱۰) بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر

صفحہ ۱۴۹ In futility passes life, even if it be that of Khizr

حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

His Holiness would also say tomorrow, "What did we do?

اس شعر میں مترجم معراج کمال کو پہنچ گیا ہے 'حضرت' آپ کی زبان میں "ہز ہولی نس" —— یعنی پاپائے روم وغیرہ —— کو کہتے ہیں! اور "What did we do" کی فصاحت اور بلاغت کو کیا کہئے۔

(۱۱)

صفحہ ۱۷۲ ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر

Faith is checking me, while Infidelity is pulling me

کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

The Kaaba is behind me, the Ecclesia is before me

اس آگے پیچھے اور کھینچ تان سے کیا لطف پیدا کر دیا ہے!

"چکنگ می —— پلنگ می" مارکہ انگریزی اور اس فصیح بلیغ اور بامحاورہ ترجمے کی مثال ایک اور مشہور انگریزی داں ہندوستانی کے قول سے ملتی ہے۔ یہ بزرگ دکان دار تھے اور ایک انگریز گاہک کو آپ یہ کہنا چاہتے تھے کہ "لینا ہو تو لو۔ ورنہ نہ لو" چنانچہ ارشاد گرامی ہوا کہ "ٹیک ٹیک۔ نو ٹیک، نو ٹیک"

یعنی —— "Take, take —no take, no take"!

سارے ترجمے اسی دل فریب انداز میں اور ان ہی خوبیوں سے مزین ہیں! یہ دو چار مثالیں مُشتے نمونہ از خروارے کا حکم رکھتی ہیں۔

اردو ادب پر اس سے بڑھ کر ظلم آج تک نہ ہوا تھا۔ آج تک کسی کو جرأت نہ ہوئی تھی کہ وہ خواہ مخواہ تصنیف اور تالیف کے گھمنڈ میں آکر اردو شاعری کے شہ پاروں کا یوں ستیاناس کرے جیسا اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ فاضل مترجم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اردو لغت ابھی صفحۂ وجود سے ناپید نہیں ہوئی ہے۔ اور بازار میں غالب کے کلام پر عمدہ سے عمدہ اور ارزاں سے ارزاں شرحیں موجود ہیں جن سے استفادہ کر کے ایک نااہل بھی غلطیوں سے بچ سکتا ہے۔ فاضل مترجم کا فرض تھا کہ ترجمے سے پہلے اردو لغت سے کسی قدر آشنائی پیدا کر لیتا اور اگر سب نہیں تو کم از کم ایک شرح تو ضرور دیکھ لیتا۔ اگر فاضل مترجم یہ نہ کر سکتا تھا یا وہ اپنے آپ کو لغت اور شرح سے بالاتر یا بے نیاز سمجھتا ہے تو اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ بے وجہ اردو ادب کو بدنام کرے۔ خواہ وہ کتنا ہی متبحر عالم ہو اور تصنیف و تالیف کے جواز میں اس کے پاس کتنی ہی ڈگریاں ہوں۔ اور وہ غالب کے علاوہ اردو کے دوسرے شعرا کو بھی انگریزی زبان میں "استادِ امامِ دین" بنانے پر تُلا بیٹھا ہو۔

ناشران کو بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ جس متاعِ دل بہا کی بدولت وہ روٹی کھاتے ہیں اس کی خدمت ان کا فرض ہے اور اس سے دشمنی کر کے یا اس کو شدید نقصان پہنچا کر وہ اپنی کمائی کسی طرح حلال نہیں کر سکتے۔

اخیر میں اردو کے ادبی حلقوں بالخصوص انجمن ترقی اردو دہلی سے استدعا ہے کہ وہ جلد از جلد اردو ادب کی اس تکلیف دہ حق تلفی کے تدارک کا سامان کریں۔ مہمل ترجموں کا رواج پڑ گیا تو کوئی تعجب نہیں کہ دوسرے ممالک میں جو اردو کی رہی سہی قدر ہے۔ اور بدیسیوں کو اردو سے جو تھوڑی بہت دلچسپی ہے۔ وہ سب جاتی رہے گی۔ اردو ادیبوں کو ان کا جائز مرتبہ دلانا تو رہا الگ۔

جمیل احمد ناخدا

شعر

[illegible]

فہرستِ مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۱ء

جلد ۱۹ نمبر ۱۰

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک و روی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ قیمت فی پرچہ آٹھ آنے ۸ر

[illegible] پرنٹر [illegible] ادبی دنیا لاہور سے شائع ہوا

ایک اور اشارہ

کتب خانہ ادبی دنیا نے وعدہ کیا تھا کہ وقتاً فوقتاً اچھی کتابوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے چنی ہوئی کتابوں کی تازہ بتازہ فہرستیں ادبی دنیا میں شائع کی جائیں گی" تاکہ ناظرین ادبی دنیا کو اپنے مقبول رسالے ہی کے ذریعے سے ہر قسم کی اچھی کتابیں بہ آسانی مہیا ہو سکیں چنانچہ اس سلسلے کی پہلی فہرست شائع ہو کر مقبول خاطر ہو چکی ہے۔ اس دفعہ کتب خانہ ان فہرستوں کی دوسری قسط آپ کے پیش نظر کر رہا ہے۔ موجودہ فہرست میں التزاماً وہی کتابیں درج کی گئی ہیں جو خواتین اور بچوں کے لئے دلچسپ اور مفید ہو سکتی ہیں حسب معمول اس انتخاب کی ضمانت ادارہ ادبی دنیا کا نام ہے۔

مینیجر کتب خانہ ادبی دنیا لاہور

نام کتاب و مصنف	قیمت
خواتین کے لئے	
ناول اور افسانے	
عورتوں کے افسانے۔ کوثر چاندپوری	بہر
گھر اور دیگر افسانے۔ حجاب امتیاز علی	۸عہر
خانم۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی	للعہر
شریر بیوی "	۸بہ
شام زندگی راشد الخیری	عہر
شب زندگی دو حصے "	عہر
ماہ عجم "	۸عہر
شاہین و دراج "	۸ر
لاشوں کا شہر مسز عبد القادر	۴عہر
نرملا " منشی پریم چند	۸عہر
یوسف نجمہ۔ عبد الحلیم شرر	۸عہر
بنات النعش۔ مولوی نذیر احمد مرحوم	۴عہر
یاسمین۔ مرزا محمد سعید	۸عہر
نظم	
آئینہ حرم۔ محترمہ زخ ش کی نظمیں	۴ر
شمع خاموش (نظمیں)	۴ر

نام کتاب و مصنف	قیمت
آئینہ جمال نظمیں	۱۲ار
گیت مالا	۶ر
صنعت اور خانہ	
گلدستہ کروشیا۔ فاطمہ بیگم انور علی	۶
عصمتی کروشیا	۸ہر
بیوی کی تعلیم۔ خواجہ حسن نظامی	۸ہر
اولاد کی شادی	عہر
مشرقی اور مغربی کھانے	۶
مذاقیہ کھانے	۶ر
متفرق	
محبت نامے۔ مترجمہ پروفیسر رام سروپ کوشل	۷ر
ادب زریں۔ حجاب امتیاز علی	۸ر
نغمات موت	۶ر
بچوں کے لئے	
قصے کہانیاں	
ولایتی نتھی راشد الخیری	۶ر
دادا لال بجھکڑ "	۸ر
بچوں کا انصاف (ڈراما)	۳ر
مرغی اجیر چلی۔ محترمہ رقیہ ریحانہ	۲ر

نام کتاب و مصنف	قیمت
نبیول کے قصے	۵ر
تاریخ ہند کی کہانیاں	
پہلا حصہ	۳ر
دوسرا حصہ	۵ر
تفریح اور معلومات	
تعلیمی کھیل	۳ر
سمندر کا عجائب خانہ	۸ر
ایورسٹ کی کہانی	۳ر
نظمیں	
بچوں کی نظمیں	۴ر
بچوں کے اسمٰعیل	
مرتبہ سعید انصاری پرنسپل مدرسہ جامعہ	۵ر
بچوں کی رباعیاں	ار
بچوں کا علاج مجلد ۶ر	۴ر

ان کے علاوہ ہر ایک قسم کی کتابیں ہمارے کتب خانے سے بارعایت مل سکتی ہیں۔

مینیجر کتب خانہ ادبی دنیا دی مال روڈ۔ لاہور

دُنیائے فلم

ایک رات

توقع کی جاتی ہے کہ شالی مار پکچرز کی اولین پیشکش "ایک رات" جو شری ساؤنڈ سٹوڈیوز دادر بمبئی میں تیار کی جا رہی ہے دسمبر کے اوائل تک مکمل ہو جائے گی۔ پروڈیوسر ڈبلیو۔ زیڈ احمد آج کل اس کے اندرونی مناظر کی شوٹنگ میں بڑی سرگرمی کے ساتھ مصروف ہیں۔

چند دن کی بات ہے کہ پروڈیوسر ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد نے ایک اخباری نمایندے کو اپنی اولیں پیش کش سے متعلق بیان دیتے ہوئے کہا کہ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ میں اپنی فلم میں ایک نیا چہرہ پیش کر رہا ہوں مگر "ایک رات" ایک غیر معمولی چیز ثابت ہوگی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کا موضوع بھی بالکل مختلف ہوگا

فلم کے نئے چہرے نینا کے متعلق جب ان سے استفسار کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ نینا میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ایک اسٹار میں ہونی چاہئیں یقیناً وہ مستقبل قریب میں ایک اسٹار کی حیثیت سے پردہ سکرین پر ظاہر ہوگی۔ ڈرامے کے متعلق وہ حیرت انگیز صلاحیت رکھتی ہے وہ تمام اشارات کو فوراً سمجھ لیتی ہے اور ان کے مطابق پر اثر انداز میں ایکٹنگ کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسے ایک بہت احتیاط طلب اور مشکل رول دیا گیا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ وہ پہلی فلم ہی میں اسٹار ثابت ہو جائے گی۔

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ دنیائے فلم میں ڈبلیو۔ زیڈ احمد سب سے نوعمر پروڈیوسر ہیں۔ گذشتہ سالوں میں فلم انڈسٹری کے متعلق جو تجربات اور معلومات آپ نے حاصل کی ہیں۔ ان سے بڑے بڑے ڈائرکٹر بھی محروم ہیں۔

کالج کے زمانے میں آپ کو فن ڈراما کے متعلق خاص معلومات حاصل تھیں اور پھر جب آپ نے متعدد نگار خانوں میں عملی حصہ لیا تو آپ کو وہ تمام خصوصیات حاصل ہو گئیں جو ایک فرسٹ کلاس ڈائرکٹر میں موجود ہونا چاہئیں۔ آپ کی پہلی فلم کا بڑی بیتابی کے ساتھ انتظار کیا جا رہا ہے کیونکہ امید ہے آپ کی ذہانت دنیائے فلم میں ایسے نئے تصورات اور نئی نئی خصوصیات پیدا کرے گی جن سے ہماری صنعت اب تک محروم ہے۔ آپ کی جرأت آزما ذات آج کل نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

پر اسرار نینا کے علاوہ پروڈیوسر احمد نے اپنی فلم کے لئے مشہور ستارہ ... کی خدمات بھی حاصل کر لی ہیں۔

اداکاروں میں پرتھوی راج سب سے ممتاز ہے۔ کاسٹ میں مبارک گلاب۔ کے آین سنگھ۔ یوسف سلیمان۔ ایچ پرکاش اور راج کماری کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور یہ تمام اداکار کسی مزید تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ مشہور تجربہ کار ماہر موسیقی ایس کے پال موسیقی کے انچارج ہیں۔

سکندر کی عظیم الشان کامیابی

دو ہزار سال کا طویل عرصہ پورس اور سکندر کی تاریخی کہانی کی اہمیت پر معمولی سا پردہ بھی نہیں ڈال سکا۔ "سکندر" اس کہانی کی متحرک تصویر ہے۔ منروا کا یہ شاہکار تاریخ ہند کے اس زریں دور کی جھلک پیش کرتا ہے۔ جب ہندوستان کی عظمت و بزرگی تمام عالم کے لئے قابل رشک تھی۔ کس طرح سکندر ایران کی چھاتی میں یونانی شہنشاہیت کا جھنڈا گاڑ کر ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ ایسا جان پڑتا تھا گویا ایک عظیم سیلاب چھوٹی بڑی سلطنتوں کو اپنی رو میں بہاتا ہوا بڑھا چلا آرہا ہے۔ کس طرح سکندر اور پورس میدان جنگ میں نبرد آزما ہوئے، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دو پہاڑ آپس میں ٹکرا رہے ہیں کس طرح جنگ کے بعد سکندر اور پورس فاتح اور جنگی قیدی کی حیثیت سے ملے اور دوسرے ہی لمحہ سکندر کہہ رہا تھا "دیوتاؤں کی قسم ہم نے آج تک آپ جیسا بہادر نہیں دیکھا ہم آپ کو دوست بنائیں گے۔" انہی واقعات کے گرد منروا کے تاریخی شاہکار "سکندر" کی کہانی گھوم رہی ہے۔ جسے ڈائرکٹر سہراب مودی نے صناعی کا بہترین نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔ سہراب مودی کی ڈائرکشن، رستم بھروچہ کے سیٹنگز، پنڈت سدرشن کی کہانی اور پرتھوی راج، ونمالا، مینا، صادق علی، شیلا، ظہور راجہ، لالہ یعقوب، کے این سنگھ اور گجنند روغیرہ اداکاران فن "سکندر" کی ہزاروں میں سے صرف چند خصوصیات ہیں پرتھوی راج سکندر کا پارٹ ادا کر رہے ہیں اور ان ہزاروں اصحاب کا جنہوں نے گذشتہ کئی روز میں سکندر دیکھا ہے یہ کہنا ہے کہ یہ پارٹ پرتھوی راج کے علاوہ کوئی دوسرا اداکار شاید ہی اس کامیابی سے ادا کر سکتا۔ سہراب مودی خود مہاراجہ پورس کا کردار پیش کر رہے ہیں۔ سب اصحاب اس بات پر متفق ہیں کہ سہراب مودی کی کیفیت موجود ہے۔ لیکن محبت... میں بیک وقت تین سیناؤں... سے آخر تک چھایا ہوا ہے۔ لگاتار دل میں ایک گدگدی

شی تمہارے ساتھ نبھانا ہوگا

۱۰۰

بشر علی صدیقی ماضی کے ایک

بزمِ ادب

انسانی زندگی کی کہانی آج کل (موجودہ صدی میں) یوں کہئے کہ لمحہ بہ لمحہ پہلو بدل رہی ہے اور ہماری نظروں میں نئی سے نئی صورتیں لا رہی ہے اس حیرت انگیز اور دلچسپ انقلاب میں سب سے زیادہ تین موضوعات کو دخل ہے — اقتصادیات، سیاسیات اور جنسیات۔ ہم اگر غور سے دیکھیں تو دنیا کا ہر مسئلہ ان تین عنوانات سے رہائی نہیں پا سکتا۔

از بسکہ ادب زندگی کا ترجمان ہے اس لئے اردو ادب کو بھی گذشتہ پانسال کے عرصے میں بہت سے جلد جلد بدلتے ہوئے ارتقائی منازل سے واسطہ رہا ہے۔ سب سے نمایاں تبدیلی جو مجھے دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا لٹریچر ایک طیارے کی سی رفتار کے ساتھ بڑے بوڑھوں کا دامن چھڑا کر نوجوانوں کے ہاتھوں میں آپہنچا ہے۔ اُن نوجوانوں کے ہاتھوں میں جن کے دل خواہ یک قطرۂ خون کے حامل ہوں لیکن جن کے دماغ ہمہ وقت زندگی کی سیمابی لرزش کا اظہار کر رہا ہے، تڑپ رہا ہے۔

نوجوان لکھنے والوں کی اکثریت کی مثال سانپوں کی سی ہے۔ ادب کے جنگل میں بلوں سے برآمد ہوتے ہی یہ آبادی کی طرف چل نکلے ہیں، ڈسنا ان کا کام ہے لیکن کبھی پھنکار کر ...! تریہ کبھی ڈگ ... لاٹھی بھی شکار لاٹھی لئے سامنے ہو لیتا ہے، ...... اور کبھی جب کا ... سے ڈستے ہیں تو کاٹا پانی نہیں مانگتا۔

لیکن یہ گوناگوں اثرات افسانے اور شاعری ہی کی اصناف میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ زیرِ نظر شمارے کے افسانوں کو دیکھئے۔

گئو ہتیا کا مصنف (شمشیر سنگھ نرولا) ادبی دنیا کی محفل میں پہلی بار شریک ہوا ہے، لیکن ایک آن سے؛ — مہاتما گاندھی اور اُس کے چیلے کا قصہ ابھی کچھ زیادہ پرانا نہیں ہوا جسے زہریلا کرکے موت سے بدتر زندگی سے رہائی دلائی گئی تھی لیکن گئو ہتیا کا ہیرو ہندوستان ملک کے ایک بڑے لیڈر سے ٹکا نہیں کھا سکتا۔ اُس کی حیثیت گاؤں میں ایک بے حقیقت مصلح کی ہے۔ اور اُس کا زہریلا ہی حسنِ اتفاق سے کارِ خیر ثابت ہوتا ہے۔ یہ واردات ہے کہ اس کہانی کا سب سے اہم پہلو انسانی کردار نہیں ہیں بلکہ پس منظر میں بھوک سے رفتہ رفتہ مرتی گائیں، اُن کی زندگی کو اجیرن بناتے ہوئے کوتے، زمین پر اُن کی موت کے منتظر کتے اور فضا میں منڈلاتے ہوئے گدھ — یہ سب جیتے جاگتے زندہ کردار ہیں اگرچہ گاؤں کے جاہل اور ظالم رہنے والے بھی ان کووں، کتوں اور گدھوں سے مماثلت رکھتے ہیں — شمشیر سنگھ تفصیلات کا ماہر معلوم ہوتا ہے۔ تفصیلات پر افسانے کی گہرائی کا بار ڈالنے سے کُلی تاثر میں ڈھیل پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن گئو ہتیا میں پس منظر اپنے حقیقت پرستانہ جزئیات کی تندی اور تلخی کو کچھ اس شدت کے ساتھ نمایاں کئے ہوئے ہے کہ تمام افسانہ زندگی کی ایک متحرک تصویر نظر آنے لگتا ہے۔

گئو ہتیا میں ایک شہری گاؤں میں پہنچتا ہے۔ اس کے برعکس زندہ ... سیٹھ کی کہانی "ڈھائی گز سُتلی" میں ایک دیہاتی شہر میں آتا ہے عدالت کے فیصلے سے پہلے ایک سیدھے سادے انسان کی ذہنی کشمکش کا جو مطالعہ افسانہ نگار نے کیا ہے، وہی کہانی کا مرکز ہے۔ اور اُسی مرکز پر استعارے کی ڈھائی گز سُتلی جھولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

سلطانہ قاضیہ کی کہانی "بےغیرت" میں شہر کے لوگ شہر ہی میں نظر آتے ہیں ... مختصر افسانہ کہی جا سکتی ہے۔ ایک بے حد معمولی سے واقعے پر قصے کے تمام ڈھانچے کی بنیاد (رکھ) ... سے ... اور قانون کے بڑے پہلو کو اُجاگر کیا ہے۔

لیکن ان تین کہانیوں کو پڑھنے کے بعد زندگی ایک بیزار کر دینے والی کیفیات کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔ اس تاثر کی سنجیدگی کو دور کرنے کے لئے اسعد گیلانی کا "ردِ عمل" اور ظفر واسطی کا "ناکردہ گناہ" دیکھئے۔ اسعد گیلانی ایک ہلکے پھلکے انداز میں جوانی کی بعض کیفیات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اور ظفر واسطی کے افسانے میں اگرچہ نتیجتاً المناک کیفیت موجود ہے لیکن محبت کی کسک کا احساس جو شروع سے آخر تک چھایا ہوا ہے، لگاتار دل میں ایک گدگدی سی پیدا کرتا ہے ... ساتھ نبھانا ہوگا

... بشر علی صدیقی ماضی کے ایک

ادبی دیو کا جائزہ لے رہا ہے۔ محترمہ ح۔ عبداللہ درمیانی زمانے کے ایک معمار کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ اور مسعود احمد قریشی غالبؔ کے پس منظر سے چلتے ہوئے اقبال اور جوشؔ کی باتیں کر رہا ہے جو اگرچہ حال کے انسان ہیں لیکن جنہیں مستقبل کے مینار بھی کہا جا سکتا ہے۔

(۲)

حالیؔ کا ایک شعر ہے ؎

ہو چکے حالیؔ غزلخوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نوجوان شاعر حالیؔ کے باقی کلام کو بھول گئے ہیں۔ صرف یہ ایک شعر ہی انہیں یاد رہا ہے۔ اور اسی کی بنا پر انہوں نے نظموں کا ایک نیا سنسار بسایا ہے۔ اگرچہ اُن کی حیثیت ایک "چور" کی سی ہے کیونکہ یہ بزرگوں ہی کا اثاثہ ہے جس کے بل پر انہیں حیاتِ تازہ کی نوید ملی ہے۔ یہ مانا کہ اس اکہری لہر میں کئی رنگ موجود ہیں۔ ش۔ م۔ اقبال نودارد ہے لیکن کسی جانے پہچانے دائف کی طرح اپنے ماضی کو ایک اشاریہ انداز میں بے نقاب کئے جا رہا ہے۔ انور قریشی شعر کی ایک قدیم صنف ساقی نامے کی دلکشی میں کھو گیا ہے۔ لیکن بعض جگہ اس نے نئے سُر بھی لگائے ہیں۔ ع۔ ق جاویدؔ ایک جذبے کے ماتحت تین زمانوں کی راگنی گا رہا ہے۔ اور انجم رومانی شاعری میں مصوّری کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ تمؔ اور علی حسین جعفری ٹیگور کی براہِ راست ترجمانی کر رہے ہیں۔

لیکن تخت سنگھ شانتی نکیتن والی نرم و نازک اور گداز کیفیات کو اپنے موسیقانہ انداز میں ڈھال رہا ہے "ایک نیا سنسار" میں اکثر جگہ ایک ہی لفظ کا دوبارہ استعمال آواز کی ایک کیفیت پیدا کرتا ہے "جگ مگ، جگ مگ" "جھل مل جھل مل" "سندر سندر" "میٹھی میٹھی" "چپکے چپکے" "نیلے نیلے" — نظم کی ردیف صیغۂ مستقبل کے یقین کو اپنے میں نہ رکھتے ہوئے بھی اعتماد پیدا کر رہی ہے۔

شریف کنجاہی محبت کی اس تخیّلی فضا سے دُور ہے۔ اُس کی نظر سماجی اور گھریلو زندگی کی اُلجھنوں پر پڑتی ہے۔ اس کے کرداروں میں سے دو شادی شدہ ہیں اور ممکن ہے کہ تیسرا کردار بھی یعنی وہ عورت جو صورت دکھانا چاہتی ہے اور پھر بھی گھونگٹ نکالتی ہے شادی شدہ ہو۔ عورت کے دل کا چور ہے جس کا اظہار اس نے کیا ہے۔

یہ سب کچھ کہہ رہی ہے، یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ سب باتیں کہنے کی فرصت نہیں کیونکر ملی۔ ہمیں تو نفسیاتی لحاظ سے اس بات پر غور کرنا ہے کہ اس نظم میں مرد کا کردار خارجی حیثیت رکھتا ہے یا داخلی۔ بیان میں بہت سی باتیں عورت کی نفسیات کے عین مطابق ہیں۔ خصوصاً "ایسی ویسی تو کوئی بات نہیں" — ایسی ویسی بات کو عورت ایسے ہی انداز سے ظاہر کر سکتی ہے۔

یادش بخیر سعید احمد اعجازؔ نے دیر کے بعد صورت دکھائی ہے لیکن معمول کے مطابق اس دفعہ بھی اس کی ننھی ننھی نظمیں اپنی نازک خیالی اور نزاکتِ احساس کا اظہار کر رہی ہیں۔ اکثر نظموں میں ایک مختصر لمحے کا ذکر ہے۔ اور ہیئت کا اختصار اس لحاظ سے بھی ایک ہم آہنگی پیدا کر رہا ہے "شبنم کی موت" میں تشبیہ بہت اچھی ہے۔ موت پر انسان غور کرتا ہے گویا اُوپر سے اُسے دیکھتا ہے۔ اور نشیب کو دیکھنے کا بھی یہی انداز ہوتا ہے۔ پھر "گہرا گہرا سا نشیب" میں "سا" کا دھندلکا موت کے دھندلکے سے تطابق رکھتا ہے۔ "ہم سفر" میں نظم کے مفہوم کے ساتھ عنوان کا پیچ مستزاد دلچسپی کا حامل ہے۔

"زندگی" کا شاعر وہی یوسف ظفرؔ ہے جو کبھی "یونہی" نظم لکھ دیتا ہے اور کبھی کسی اور طرح۔ موجودہ نظم کسی اور طرح لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بات کا بتنگڑ بنانا اس فنکار کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس نظم میں بھی بات ذرا سی ہے۔ ایک بہت دیر تک صاف نہ کیا ہوا کمرہ لیکن اُس کمرے میں شعلہ اکیلا داخل نہیں ہوتا۔ تیسرے بند میں "تو نہیں سمجھی" اور "پھر تو نہیں جانتی" کے ٹکڑے ایک نسائی پیکر کے غماز ہیں۔ یہ نسائی پیکر کون ہے اس کا سراغ ہمیں اُس بھبو کا جھنتی کے روشن ذرّوں میں ملتا ہے جسے دیکھ کر شاعر کے ذہن میں نظامِ شمسی اور دوسری تخلیقی باتوں کا خیال آتا ہے۔ استعارے کے لحاظ سے تخلیق کے موضوع کی طرف نہ صرف کواڑوں کی درزوں درزوں میں سے نکلتی ہوئی، اُسی میں جاتی ہوئی بھبوکا جھنتی ہے بلکہ بعض اور باتیں بھی اس طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ایک اور بات۔ کیا وہ نسائی پیکر شاعر کی بیوی ہے یا محبوبہ؟ پہلے بند میں "آغوش میں لینے کے لئے" "پیچھے چلا آتا" دوسرے بند میں "دوشیزہ پیکر" "بند میں خاموش کواڑ" تیسرے بند میں "باریک ململ" اور آخری بند میں "انہیں ذرّوں میں ملا چاہتا ہوں" — یہ سب اشارے براہِ راست یا بالواسطہ یہی ظاہر کرتے ہیں کہ ابھی شادی نہیں ہوئی — شاید کچھ دنوں میں ہو جائے۔

میراجی

ایک نیا سنسار

جھوٹی ہے سب جگ کی مایا، اس جھوٹی مایا کو تج کر
ایک اچھوتے، کومل سپنوں کا سنسار بسانا ہوگا

ڈوبتے سورج کی زرّیں لالی میں کسی بادل کے کنارے
جھلمل جھلمل کرتے تاروں کا اک محل بنانا ہوگا

جگمگ جگمگ کرتے ہیروں سے گھر کے دوارے کو سجا کر
اک دن پریتم کو بیکنٹھ سے اپنے پاس بلانا ہوگا

بھر دینا ہوگا اس رنگیں رستے کو کومل پھولوں سے
جس ان جانے، ان دیکھے رستے سے اُن کو آنا ہوگا

اوس کی اُجلی اور منوہر بوندوں کو کرنوں میں پروکر
ایک بہت ہی سُندر سُندر ہار اُن کو پہنانا ہوگا

اور آکاش کے نیلے نیلے ساگر کی لہروں پر اُن کو
چاند کی ننھی سی ناؤ میں اپنے ساتھ بٹھانا ہوگا

ڈال کر اُن کی کالی کالی مست آنکھوں میں اپنی آنکھیں
گھنٹوں تکتے رہنا ہوگا، رہ رہ کر مُسکانا ہوگا

چُپکے چُپکے کرنی ہوں گی پریم کی میٹھی میٹھی باتیں
لاج کے سارے بندھن توڑ کر اُن سے گھل مل جانا ہوگا

پریت کے پیارے گیت سُنا کر میٹھے میٹھے مدھر سُروں میں
اُن کے نازک نازک دل پر جادو بن کے چھانا ہوگا

پونچھ کے اُن کے نرمل آنسو اپنی ساری کے آنچل سے
ہونٹوں سے میٹھی بانی کا امرت رس ٹپکانا ہوگا

اپنے کو اُن کی مسکاتی آتما کے پرکاش میں کھو کر
موت اور جیون کی اَن سُلجھی اُلجھن کو سُلجھانا ہوگا

لپٹا کر اِن کومل کومل سپنوں کو اپنے ہردے سے
اُن کی پیاری یاد کا مرتے دم تک ساتھ نبھانا ہوگا

تخت سنگھ

چور

آپ کی بیوی سہیلی ہیں مری
اور انہیں ملنے کو آجاتی ہوں،
میں کوئی آپ کی خاطر تو نہیں آتی ہوں،
ورنہ گھونگھٹ نہ نکالوں ہرگز۔
— "پھر میں کیوں تکتی ہوں آنچل میں سے"؟
بس یونہی، آپ اسے جو سمجھیں۔
آخر آنکھیں جو ہوئیں۔
ایسی ویسی تو کوئی بات نہیں،
بلکہ میں آپ سے شرماتی ہوں
آپ کو یاد نہیں کیا؟ — اُس دن
میں نقاب الٹے ہوئے
یہ سمجھتے ہوئے آپ آج نہیں ہیں گھر پہ
— (دل کو دانستہ یہ دھوکا دیتے)۔
بے جھجک ڈیوڑھی سے دالان میں آپہنچی تھی،
سامنے آپ کو یک لخت جو دیکھا تو رُکی،
اُنہیں قدموں پہ رُکی — جیسے پلٹ جاؤں گی۔
اور چل دیتی ہیں اُلٹے قدموں
آپ کی بیوی بلاتیں نہ اگر
میں کوئی آپ کی خاطر تو نہیں آئی تھی
یہ مگر سچ ہے کہ جب آپ کے گھر آتی ہوں
آپ اس وقت اگر گھر پہ نہ ہوں
بیشتر بیٹھی ہی رہتی ہوں میں باتیں کرتی،
ظاہرا آپ کے لوٹ آنے کا دھیان آتا نہیں،
پھر بھی میں آپ کی خاطر تو نہیں آتی ہوں،
آپ کی بیوی سہیلی ہیں مری
میں انہیں ملنے کو آجاتی ہوں۔

شریف کنجاہی

غالب، اقبال اور جوش کا فردا

نہ جانے حضرتِ انسان کا خمیر کس خاکِ رنگا رنگ سے اٹھایا گیا کہ اس کی سرشت معجون مرکب یا مرکب مجہول ہو کر رہ گئی۔ میرے خیال میں تو ہنگامۂ تخلیق ایک سازش تھی جس میں معلوم نہیں اس ناپیدا خلیفہ کے کونسے ناکردہ گناہوں کی سزا دینے کی ٹھانی گئی۔ وہ تو خیر گذری کہ سازش کے چند ممبروں میں ذاتیات کی بنا پر کچھ جھگڑا ہو گیا اور ایک محدودسی پارٹی کو سزا کا نشانہ بنا لیا گیا۔ اپنوں کی غداری سے خدا کو اس شکار سے کچھ انس سا ہو گیا اور اس طرح پھیلائے ہوئے جال کے چند بند ڈھیلے ہو گئے ورنہ وہاں تو کوئی کسر نہ تھی۔ ہاں تو سزا دینے کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ انسان کو مجموعۂ اضداد بنا کر عجیب و غریب خواہشات کے فریب بھرے طلسم میں تمام عمر آوارہ رہنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ چنانچہ ان طلسمات میں سے ایک ماضی حال اور مستقبل کا تکڑم بھی ہے۔

چنانچہ ایک طرف تو انسان کی ماضی پرستی کا یہ حال ہے کہ بڑے بوڑھے نئی پود کے ہر جرأت آمیز قدم پر "آہ ہمارا پاک سادہ زمانہ" کی مسرت بھری سرد سانسوں کے ساتھ ماضی کی عظمت اور بڑائی کا رونا روتے ہیں۔ نوعِ انسانی کی متفقہ ماضی پرستی کو دیکھتے ہوئے ایک فلسفی کو کہنا پڑا کہ "ہم میں سے ہر ایک اس دنیا میں اپنے موزوں وقت سے ایک سو سال بعد پیدا ہوتا ہے"۔ دوسری طرف اس کی حال مستی یہاں تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ ایک لمحۂ موجود کی حقیر سی خوشی یا غم ربائی کی خاطر جھوٹ، دغا بازی، ریاکاری اور قتل و غارت سے بھی نہیں چوکتا۔ وہ اس حال کی خاطر بہشت کی دلکش زندگی یا آواگون کی صورت میں دوسری بہتر زندگی کی بھی پروا نہیں کرتا۔ پھر مستقبل کی جھکتی آس! بس یوں سمجھ لیجئے کہ مستقبل کی ان دیکھی، ان جانی اور "شاید" کے کہرے میں گھری ہوئی ممکنات پر ماضی اور حال سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ وہ کم سمجھ اور ضدی طبیعتوں کی مانند نقد کی بجائے نسیہ ادھار پر جان دیتا ہے۔ ایک مبہم سی امید پر اپنی تمام زندگی مصیبتوں میں گذار دیتا ہے۔ آج، لوگوں کے طعن و تشنیع اور نازیبا فقرے سنتا رہتا ہے اور جیتا جاتا ہے تاکہ "کل" لوگ اسے عزت اور بڑائی سے یاد کریں۔ اور ہاں، یہ بہشت، سورگ، اور یزدان بھی اسی فریبِ مستقبل کا ایک جلوہ تو نہیں؟

اور جب یہ جذبات بغیر کسی استثنا کے تمام لوگوں پر حاوی ہیں تو ادیب ان سے کیونکر بچ سکتے تھے۔ ان حساس دلوں میں یہ جذبات اور بھی شدت اختیار کر گئے۔ پھر بھی ایک بھاری اکثریت ہمیشہ ان ادیبوں کی رہی ہے جو ماضی پرستی کے رسمی راستے پر ہی چلتے رہے کیونکہ یہاں جرأت وغیرہ درکار نہیں تھی۔ اور ہمارے ادیب تو ماشاءاللہ تھے ہی..... خیر جانے دو۔ ہاں تو اس حقیقت کے باوجود کہ سوائے ان معدودے چند ہستیوں کے جو رہبری اور فرداگری پر مامور ہوتی ہیں ہر ادیب اپنے آج اور صرف آج کا ترجمان ہوتا ہے، دیر تک کسی اردو شاعر کو یہ توفیق نصیب نہ ہوئی کہ اس سچائی کو دیکھ سکے۔ اور بیان کر سکے۔ اس انکشاف سے ہمیں حیرت آمیز افسوس ہوتا ہے جس سے ہمیں بچانے کے لئے صرف نظیر آگے بڑھتا ہے۔

شاعرِ فردا ہونے کی آرزو ہزاروں دلوں میں رہی ہو گی اور وہیں ختم ہو گئی ہو گی۔ ہاں تین بڑے شاعروں نے اس آرزو کو ایک دعوے کی صورت میں انسانی عدالت کے سامنے پیش کیا اور یہ مجدد حضرات غالب اقبال اور جوش ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا دعوے واقعات کی کسوٹی پر کہاں تک پورا اترتا ہے اور دیانتدارانہ تنقید کے وار کہاں تک برداشت کرتا ہوا زندہ رہ سکتا ہے۔ پہلے غالب کو لیجئے۔ یہاں ہمیں ایک طائرانہ نظر غالب کے ماحول پر ڈال لینی چاہئے۔ اگر آپ غدر کے اسباب اور نتائج پر غور کریں تو اس زمانے کی حالت عیاں ہو جائے گی۔ غدر ایک فوجی بغاوت نہ تھی بلکہ ایک گرتی ہوئی قوم یا صحیح تر الفاظ میں ایک مٹتے ہوئے نظام کی جانکنی کی کشمکش اور آخری ہچکی تھی۔ اس کی ناکامی کے اسباب بھی اس کی تحریک میں ہی پنہاں تھے۔ ایک ایسا نظام زندگی کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا جو اپنی ضرورت کھو چکا تھا۔ وہ حالات اور طاقتیں جو اس کی قدرتی نشوونما کے لئے ممد و معاون ثابت ہو سکتی تھیں اور جن کو قابو میں رکھنے اور ہم آہنگی سے چلانے کے لئے یہ نظام وجود میں آیا تھا ختم ہو چکی

تھیں۔ ان کی جگہ نئے نئے مسائل لے رہے تھے۔ اس غدر کو جاگیرداروں کی بغاوت کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ مگر جاگیردارانہ نظام تمام سوسائٹی پر حاوی تھا۔ اس لئے یہ بغاوت کسی فرقے کی نہیں بلکہ ملک و قوم کا ابھار تھا۔ غدر کی ناکامی کے بعد سوسائٹی ایک طویل اور غیر معین عرصے کے لئے بغیر کسی نظام کے رہ گئی اور اس کے مختلف اجزائے ترکیبی اسے مختلف سمتوں میں کھینچنے لگے۔ جو لوگ اس نظام کے ماتحت بلندی پر تھے وہی اس کے نیچے آنے کے بعد پستی میں جا گرے۔ غالب ان میں سے ایک تھا اور چونکہ قلعۂ معلّٰی اور ابوظفر کے وابستگان میں سے تھا لہٰذا قدرتی طور پر اس تبدیلی نے اس پر ایک گہرا اثر چھوڑا۔ گو خوش قسمتی سے چند فارغ البال دوستوں کی نوازشوں سے کسی نہ کسی طرح وضع داری کو نباہتا چلا گیا، ورنہ رہ ہی کیا گیا تھا۔ خود بھی زمانہ شناس تھا۔ نئی سرکار کی مدح سرائی شروع کر دی، کلکتے تک دوڑا بھاگا، قصیدے لکھے، سفارشیں کرائیں اور کچھ نہ کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر بھی وہ پہلی سی بات کہاں! اس زمانے کے خطوط سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس تبدیلی کو اُس نے کس شدت سے محسوس کیا۔ یہ تو ہوئے ذاتی حالات۔ اب سوسائٹی کی سنئے۔ ہر طرف ایک جمود اور سکون طاری تھا یہ کوئی انقلاب فرانس تو تھا نہیں کہ کامیابی تو کیا ناکامی کے بعد بھی اپنے اصولوں کی ندرت اور طاقت کے بل پر عالم میں تہلکہ مچا دیتا۔ یہ تو ایک گرتی ہوئی کھوکھلی دیوار کو سنبھالنے کی بیدلانہ اور ناکام کوشش تھی اور بس۔ چنانچہ دو ڈھائی سو سال کی [illegible] بے مجلسی تگ و دو کے بعد سوسائٹی پر ایک تھکن طاری ہو گئی، پرانی شان و شوکت آنسوؤں کا سرمایہ بن کر رہ گئی۔ طبیعتیں عمل سے بھاگنے لگیں۔ چوٹ کی شدت سے حواس مختل ہو گئے اور چوٹ کی نوعیت اور اُس کے اثرات کو سمجھنے کی اہلیت بھی نہ رہی۔ زیاں کا احساس تک نہ ہوا۔ مختصراً بے چینی اور بے اطمینانی کی جگہ ایک بے پرواہ سکون اور جمود نے لے لی۔

غالب نے اس تبدیلی کو سمجھنے کی کوشش کی، سمجھا، سمجھانے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب رہا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے حال کی واقعاتی صورت میں سوسائٹی کو دیکھا اور بیان کیا۔ یہی وہ بات تھی جسے اُس کے ماضی پرست ہمعصر ذوق وغیرہ نہ سمجھ سکے۔ غالب کا فلسفۂ زندگی، عاشقانہ مضامین اور خاص طور پر وہ بیانیہ نظم جس میں اُس نے مجلسِ شب کے استعارے میں اپنے زمانے کی حالت کی بہترین تصویر کشی کی ہے۔ یہ سب حال کے گرد گھوم رہے ہیں۔ یہ سب ایک ہی تصویر کے مختلف مگر ہم آہنگ رُخ ہیں اور پھر اس نظم کا آخری شعر ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

مغلیہ سلطنت کی بربادی کا مکمل مرثیہ ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر غالب اپنے امروز کا ترجمان ہے تو پھر اس کے شاعرِ فردا ہونے کے دعوے کی کیا حقیقت ہے جس کا اُس نے جابجا اظہار کیا ہے۔ مثلاً ع

غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد

یا "میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں" یا "آئیں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن" اور "شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن" وغیرہ وغیرہ۔ ایک دوسرے کی تردید کرتی ہوئی ان دو باتوں سے لوگ گھبرائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر تاثیر کو بھی دعوئے فردا کی تردید کی ضرورت پیش آئی اور انہوں نے لکھا کہ ہر بڑے شاعر کی طرح غالب بھی اپنے امروز کا ترجمان تھا لیکن یہ سب تکلیف فردا کی ہیئت کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ غالب نے شاعرِ فردا ہونے کا دعوے ان معنوں میں کبھی بھی نہیں کیا کہ مستقبل کے نظام کی ترتیب میں اس کا ہاتھ ہوگا یا وہ فردا کا ترجمان ہے۔ اس زمانے میں یہ تصور کرنا کہ کل کو زمانے کی کیا حالت ہوگی۔ کون کون سی نئی طاقتیں مستقبل کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کریں گی۔ کون کونسے نئے مسائل پیدا ہوں گے اور ان کا کیا حل ہوگا بالکل ناممکن بات تھی۔ غالب نے فردا کو سمجھنے یا اس کی تصویر کھینچنے کی کوئی ناکام کوشش نہیں کی۔ وہ آدم تھا۔ آدم گر نہیں تھا۔ چغتائی کے بڑے بڑے دعووں کے باوجود میں غالب کو ایک پیامی شاعر نہیں مان سکتا۔ اس نے سسکتی ہوئی انسانیت کی تصویر کشی تو کی لیکن کوئی علاج تجویز نہیں کیا۔ آپ کہیں گے کہ پھر اُس نے شاعرِ فردا ہونے کا دعوے کیوں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اُس نے کبھی یہ دعوے کیا ہی نہیں۔ حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ اس نے خود کو شاعرِ فردا کہہ کر شاعرِ امروز ہونا بیان کیا ہے۔ غالب جس فردا کی طرف اشارہ کر رہا ہے وہ میرا اور آپ کا ماضی، غالب کا حال اور اس کے ہمعصروں کا مستقبل ہے۔ بظاہر یہ بات مہمل سی معلوم ہوتی۔ لیکن ہے حقیقت۔ بات یہ تھی کہ غالب تو حال کو اپنے کلام میں جذب کر رہا تھا اور اس کے ہمعصر ماضی کے تصورات میں زندگی گزار رہے تھے۔ وہ غالب کی اس جدت کی داد نہ دے سکتے تھے لہٰذا غالب ان سے بیزار تھا۔ وہ اس کی بات سمجھنے کے لئے تیار نہ تھے جبھی اُسے کہنا پڑا:۔

دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

لیکن غالب اُن کی اس روش سے گھبرایا نہیں۔ اُسے اپنی عظمت پر اعتماد تھا۔ اس نے عوام کے اس رجحان کو "نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا" کی للکار سے شکست دینا چاہی لیکن بے سود۔ تب اُس جدت پسند نے خود کو شاعرِ

فردا کہنا شروع کیا۔ اس نے سوچا کہ جب میرے زمانے کے لوگ میرو میرزا پر جان دے رہے ہیں تو اسی اصول کے ماتحت ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا جب ماضی پرستی کا رجحان لوگوں کو میرے زمانے پر جان چھڑکنے کے لئے مجبور کرے گا۔ اور چونکہ میں اپنے زمانے کا سب سے بڑا ترجمان ہوں اس لئے وہ لازماً میری قدر کریں گے۔ اس نتیجے کی طرف قحط خریداری کی ترکیب صاف اشارہ کر رہی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی اور شخص بھی واقعات کو دیکھتے ہوئے دلائل کے اس سلسلہ سے کس طرح بچ نکلتا اور غالب کا یہ خیال صحیح بھی ثابت ہوا جس کی مثال غالب پرستی کا یہ زمانہ ہے۔ میں فردا کی اس تشریح کو غالب کے ایک شعر کی سند پر ختم کرتا ہوں۔ اپنے ہمعصروں سے کہتا ہے ؎

توا ے کہ محو سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

اب رہا اقبال۔ اس نے بھی پورے زور کے ساتھ اور غیر مبہم لفظوں میں شاعر فردا ہونے کا دعوے کیا۔ اس نے للکار کر کہا۔

"من نوائے شاعرِ فردا ستم"

اور پھر

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے — عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

لیکن کیا اقبال اپنے حال کا ترجمان نہیں۔ اگر ہے تو اس دعوے کے کیا معنی۔ اقبال شاعر امروز ہے لیکن اس کے امروز اور غالب کے امروز میں بہت فرق ہے۔ اقبال کا امروز فردا کی تمہید ہے اور بس۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ ستاون والی چوٹ کا احساس قوم کو پوری طرح ہو چکا ہے۔ وہ شدتِ درد سے کراہ رہی ہے۔ تابناک ماضی اور تاریک حال مستقبل کو شاندار بنانے پر اکسا رہے ہیں۔ نئے نظام کی خوبیاں اور برائیاں عملی طور پر عیاں ہو چکی ہیں۔ برائیاں چھوڑی جا رہی ہیں اور خوبیاں قبول کی جا رہی ہیں۔ ہر دل میں تڑپ ہے اور ہر شخص اپنی بساط کے مطابق تلاش اور جستجو پر مائل ہے۔ گو قوم ابھی تک اسی پست گڑھے میں پڑی ہے۔ لیکن بلندی پر چڑھنے کی تیاریاں اور سامان مکمل ہو چکے ہیں۔ صرف ایک مکمل رہنما کی ضرورت تھی۔ وہ اقبال نے پوری کر دی۔ وہ نوعِ انسانی کی بقا اور مشرق کی بلندیوں کی نوید دے کر آیا۔ پہلے اس نے بانگِ درا سے سوتوں کو جگایا اور زنگ دور پر مائل کیا۔ پھر بالِ جبریل سے بلندیوں کا پیغام دیا۔ اس کے بعد ضربِ کلیم سے انہیں عمل پر مجبور کیا اور آخر میں ارمغانِ حجاز کی صورت میں کامیابیوں کی نوید اور تحفہ لایا۔ وہ ادب برائے حیات پر سختی سے قائم ہے۔ اس کا ہر ہر لفظ ایک خاص مقصد کا حامل ہے۔ وہ ایک پیامی شاعر ہے۔ زمانہ گر بھی اور آدم گر بھی۔ اس کی نظر آنے والے حوادث کی طرف لگی ہے۔ وہ ماضی اور حال کی طرف اس لئے دیکھتا ہے کہ ان دونوں کی مدد سے، ماضی سے بلندیوں کی تمنا لے کر اور حال میں سرگرمِ عمل رہتے ہوئے اپنے مستقبل کو شاندار بنائے۔ وہ حال کی مختلف مصروفِ عمل طاقتوں کے عناصر کا پیغمبرانہ مشاہدہ کرتا ہے بعض طاقتوں کو مدد دے کر ابھارتا ہے اور اس طرح اپنی مرضی کے مطابق مستقبل کی بنیاد رکھتا ہے۔ اس نے ماضی کے کھنڈروں اور حال کی بنیاد پر فردا کی عظیم الشان عمارت تیار کی۔ اس نے حال کو خودی جیسی کارآمد طاقتیں بخشیں۔ صرف اس لئے کہ فردا کی تعمیر مکمل ہو سکے۔ اور پھر "آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں"۔ والی نظم میں تو اس نے اس عمارت کی ایک مکمل تصویر بھی کھینچ دی اور لطف یہ کہ بعد کے واقعات اسے صحیح ثابت کر رہے ہیں۔

اقبال نے جزوی اور فروعی، مکانی اور زمانی مسائل پر بھی بحث کی ہے لیکن صرف اسی حد تک جہاں تک یہ بنیادی مسائل کے حل میں رکاوٹ ڈالتے ہیں یا معاون ثابت ہوتے ہیں لیکن اس کا حقیقی میدان دنیا کے بنیادی اور دوامی مسائل کی رزمگاہ ہے۔ وہ حال کا شاعر اس لئے ہے کہ اس نے مستقبل کی عمارت کا نقشہ کھینچنے کے لئے حال کے مختلف رنگوں اور نمونوں کا جائزہ لیا۔ گو اس جائزے میں ہی اس کی نگاہ تیز حال کی تمام وسعتوں پر چھا گئی۔ ہنگامی واقعات جو ظفر علی خاں کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں صرف دلیل یا مثال کے طور پر ہی اس کی توجہ کو کھینچ سکتے ہیں۔ وہ امروز میں محصور نہیں بلکہ اس پر چھایا ہوا ہے۔ وہ اگر کوئی سبق دیتا ہے تو یہ کہ ع

طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہیں فسانہ

وہ حقیقی معنوں میں فردا کا صورت گر اور ترجمان ہے۔

جوش کو بھی شاعر فردا ہونے کا دعوے ہے۔ وہ صاف الفاظ میں کہتا ہے ؎

سمجھ میں آئے گا اک عمر کے بعد — میں جو کچھ ہمنشیں سمجھا رہا ہوں

اور پھر کہتا ہے ؎

اے لمحۂ موجود ادب سے پیش آ — آئندہ زمانے کی امانت ہوں میں

اس کے بعد کہتا ہے ؎

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا — آگے کئی صدیوں ہے ترانہ اپنا

جوش کا یہ دعوے بہت حد تک غالب کے دعوے سے ملتا جلتا ہے۔ اسے بھی غالب کی طرح ناقدری کا شکوہ ہے۔ اسے گلہ ہے کہ اس

زمانے کے لوگ اُسے سمجھ نہیں رہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتا ہے۔

قدرداں کون ہے زمانے میں — علم و فن کی ہے سرد بازاری
بے خبر سو رہی ہے اک دنیا — منفعل ہے ہماری بیداری
اس تلاطم میں ہم ادیبوں کی — کیا ضرورت تھی ایزد باری

لیکن بیسویں صدی میں جب ماضی پرستی مٹتی جا رہی ہے اور لوگوں کی توجہ حال پر مبذول ہے، ایک خیالی ناقدری کی بنا پر شاعرِ فردا ہونے کا دعوے کرنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ بالفرضِ محال اگر جوشؔ کی قرار واقعی قدر نہیں ہو رہی تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ مستقبل میں یہ کمی نہ رہے گی۔

اگر ہم جوشؔ کی شاعری کا تجزیہ کریں تو اُس میں دو رنگ بہت شوخ ہوں گے یعنی شبابیات اور نعرۂ انقلاب۔ جوش نے اپنی شاعری ترجمانِ شباب کی حیثیت سے شروع کی۔ اس کی وہ مدھ بھری تانیں ؎

سمجھے گا اُس کا درد کون شورشِ کائنات میں — تو نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں

یا

ادھر تھی لرزشِ صہبا اُدھر خرامِ نگار — نرالی بحث چھڑی تھی نیا مقابلہ تھا

آج بھی کانوں میں گونج رہی ہیں۔ اس کے جلد ہی بعد جوشؔ ایک ریفارمر کی حیثیت میں سامنے آتا ہے۔ ملوکیت اور سرمایہ داری کا دشمن اور آزادی اور غریبوں کا حامی۔ اس حیثیت سے وہ عموماً ہنگامی مسائل کی طرف زیادہ توجہ دیتا ہے۔ اغلباً جوش کا دعوے فردا پہلی حیثیت سے نہیں بلکہ دوسری حیثیت سے ہے اور بہت حد تک توجہ کے قابل۔ جب تک یہ مسائل انسانی ترقی کی راہ میں حائل رہیں گے اور ان پر سوچ بچار کرنے اور انہیں حل کرنے کی ضرورت پیش آتی رہے گی، جوشؔ ادب میں زندہ رہے گا۔ لیکن جب اِن مسائل کے حل کی ضرورت نہ رہے گی۔ اُس وقت جوشؔ کی انقلابی یا "مقصدی" شاعری بھی ختم ہو جائے گی کیونکہ اس میں اپنے مفید عنصر کے علاوہ اور کوئی بڑی دلچسپی نہیں ہے۔ جوشؔ کی یہ شاعری مقابلتہً پھیکی اور کچھ غیر شاعرانہ سی ہے۔ اس میں شعریت کا جمالیاتی جز وبہت کم ہے جو اُس کی شبابی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ جب ان مسائل میں دلچسپی نہ رہے گی تو اس کی کار آمد حیثیت ختم ہو جائے گی اور اس چیز کو چھوڑتے ہوئے یہ اس قدر قیمتی نہیں کہ اسے ضرور ہی زندہ رکھا جائے۔ بعض اوقات تو جوشؔ کی انقلابی نظموں اور کامریڈوں، کی جذباتی تقریروں میں بہت تھوڑا فرق رہ جاتا ہے اور پھر ان مسائل کی بنا پر بھی شاعرِ فردا ہونے کا دعوے کمزور ہے میرے خیال میں تو جوشؔ سب سے بڑا ترجمانِ حال ہے۔ اُسے چاہے سمجھا جا رہا ہو یا نہیں لیکن جس قدر اس کی ضرورت آج ہے کل نہیں ہو سکتی۔ کیا یہ مسائل آج بھی اتنے شدید نہیں ہیں جتنے کل ہو سکتے ہیں۔ پھر آج سے بیزاری کیوں!

ہاں البتہ جوشؔ کی شبابی شاعری میں چند ایسے وجدانی عناصر ضرور ہیں جن کی بنا پر دنیا جوشؔ کو آسانی سے نہیں بھلا سکے گی۔ گو انقلابی جوش دنیا کے لئے زیادہ مفید ہے لیکن شبابی جوش کو کھوتے ہوئے دل دُکھتا ہے۔

آخر میں میں اتنا کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ایک پیامی شاعر کے لئے مستقبل میں اپنی جگہ مخصوص کرنا سخت مشکل کام ہے۔ کیونکہ اُس کے زندہ رہنے کا انحصار اُس کے پیام کی جامعیت اور ضرورت پر منحصر ہے اور دنیا کچھ اس تیزی سے بدل رہی ہے کہ پُرانے مسائل جلد ہی فرسودہ ہو کر مٹ جاتے ہیں اور اُن کی جگہ نت نئے مسائل لے رہے ہیں جن کی پیش بینی نہایت مشکل ہے۔ لہٰذا یہ دیکھنا باقی ہے کہ گردشِ روزگار ان دعووں کو کہاں تک قبول کرتی ہے۔

مسعود احمد قریشی

اثرِ خواب

میں پھرا کرتا ہوں شاموں کے دھندلکوں میں اُداس اِدھر
جب فضاؤں میں بچھے ہوتے ہیں غمگیں سائے۔

حال و آئندہ مرے ذہن سے ہٹ جاتے ہیں
اور ماضی کا طلسم ہمہ گیر
میرے احساس پہ چھا جاتا ہے۔

انہیں شاموں کے دھندلکوں میں کہیں
منتشر ہیں مرے رومانوں کے آثارِ حسیں
قہقہوں، آنسوؤں اور نغموں میں،
اور اُن آثار کی شاداب رسیلی یادیں
میرے احساس میں آسودہ ہیں لذت بن کر
اُنہیں یادوں کی ہوس
مجھے شاموں کے دھندلکوں میں لئے پھرتی ہے
میری تخئیل کو لے جاتی ہے دُور — اور کہیں
حال و آئندہ مرے ذہن سے ہٹ جاتے ہیں
میری تخئیل کسی طائرِ مضطر کی طرح
تیرتی جاتی ہے تیزی سے اُڑی جاتی ہے۔
اور اِس وسعتِ آفاق کی نیلاہٹ میں
کسی خوابوں کے جزیرے میں پہنچ جاتی ہے۔

گذری شاموں کے وہ لمحاتِ طویل
ایک پر کیف معیت میں گذاری ہوئی راتیں، — دن بھی
دیدۂ روح میں خاموش سمٹ آتے ہیں
وہ فسوں خیز تمناؤں کے ہنگامِ جمیل
قہقہوں آنسوؤں اور نغموں میں۔
جن پہ اب چھایا ہے خوابوں کا سا موہوم اثر
اور میں سوچتا ہوں۔
یہ کہیں میری تمناؤں کے دھوکے ہی نہ ہوں۔

ہاں یونہی شام کے وقت
جب فضاؤں میں بچھے ہوتے ہیں غمگیں سائے
میں پھرا کرتا ہوں آوارہ تخئیل کی طرح
دور کی نہر کے خاموش درخت
سطحِ افلاک پہ دھبے سے نظر آتے ہیں۔
اور پتّوں میں سسکتی سی ہوا۔
آہیں بھرتی ہے جواں مرگ تمناؤں پر۔

ش م اقبال

گئوہتیا

جب سیتل پرشاد ایک دیہاتی یکّے میں ہچکولے کھاتا اپنے گاؤں کے قریب پہنچا تو اُسے ایک بھوکی تھکی ماندی شام گاؤں کی طرف رینگتی دکھائی دی۔ وہاں کے لاغر نیم جان بے حواس کتّے بڑے مایوس اور بے دھڑک طریقے سے اُس پر بھونک رہے تھے

وہ یکّے سے اتر پڑا۔ آگے سڑک پر ایک بہت بڑا گڑھا جماہی لے رہا تھا۔ اور یکّا آگے نہیں جا سکتا تھا۔ وہ سڑک ہندوستان کی بیشتر سڑکوں کی طرح فٹ دو دو فٹ گہری ریت اور مٹی کا ناہموار، دشوار گذار راستہ تھی جو برسات میں کیچڑ اور دلدل کی اچھی خاصی بدررو بن جاتی تھی۔ ان ریت مٹی اور کیچڑ کی خندقوں نے ہی ہندوستانی دیہات کو دنیا کے مدوجزر سے علیحدہ کر کے وہاں کی زندگی کو صدیوں سے ساکت اور غیر متبدل بنایا ہوا ہے۔

سیتل نے پھلانگ کر گڑھا پار کیا اور اپنے گرد سے بھورے بال اور کپڑے جھاڑتا ہوا اور بار بار کھنگار کر مٹی سے اٹے ہوئے سینے اور حلق کو صاف کرتا گاؤں کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ روشنی سے ڈرے سہمے درختوں سے لٹکی ہوئی چمگادڑوں نے سرمئی فضا کے دُھول سے بھرے دھندلکے میں تیریاں اور ڈبکیاں لگانا شروع کر دیا تھا۔ مٹی کی بنی ہوئی گز دو گز اونچی مٹیالی جھونپڑیوں میں سے سلگتے ہوئے اُپلوں کا بے جان دھواں بڑی سستی سے آسمان کی طرف کر دیں لے رہا تھا۔ غیر مانوس بعید الفہم خیالات ننھی ننھی سرسراہٹوں کی طرح سیتل کے دماغ میں رینگ رینگ کر اُسے پریشان کر رہے تھے۔

چرواہے بھی سوکھی سہمی بھوکی گایوں کو جنگل میں سے واپس لا رہے تھے۔ جسے وہ لوگ جنگل کہتے تھے وہ بغیر درخت بغیر جھاڑی بغیر سائے کے بنجر بیابان خشک چٹیل زمین تھی جس پر برسات میں تھوڑی سی گھاس اُگ آتی اور ایک دو مہینوں میں ہی ختم ہو جاتی۔ اُس کے بعد تمام گلّہ پیاس اور خشکی سے پھٹی ہوئی زمین کی دراڑوں میں اور مٹی اور سونگے کے ٹیلوں کے نیچے گھاس کی پتیاں یا چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تلاش کرتا پھرتا اور جتنی انہیں اس خوراک سے قوت میسر ہوتی اس سے زیادہ اُس کی تلاش میں خرچ ہو جاتی۔ اُن کی مدھم پُر قناعت آنکھوں کی گہری تہوں پر صدیوں کی بھوک چھپی ہوئی تھی۔ اُن میں سے بہت سی گائیں صرف ڈھلپنجے ہی تھیں جن کی بے ڈھب ہڈیاں پتلی بے گوشت کی چمڑی میں سے بہت بھیانک اور گھناؤنے طریق سے جھانک رہی تھیں۔ اُن میں سے تقریباً تمام کے جسموں میں گھر کئے ہوئے زخم اور ناسور انہیں بیزار کر رہے تھے اور ان پر مکھیوں کے ہجوم بھنبھنا رہے تھے۔ ان گاؤں والوں نے کبھی بھی اپنے مویشیوں کے لئے کوئی چارہ نہیں بویا تھا۔ اُن کے اپنے اناج کے لئے ہی زمین کافی نہیں تھی۔ عموماً ان گائیوں کی کوئی پروا نہ کی جاتی تھی کیونکہ ان میں سے بہت سی کٹی برس ہوئے پاؤ آدھ پاؤ دودھ دے کر سوکھ چکی تھیں۔ یہ ہندوستان کی عام گائیں تھیں۔

چند بچھڑے گلّے سے ہم قدم نہ رہ سکتے ہوئے اپنی ننھی ننھی کانپتی ہوئی ٹانگوں سے اُن کے پیچھے پیچھے لڑکھڑا رہے تھے۔ اُن کی سوکھی پتلی نرم ٹانگیں بڑی مشکل سے آگے کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ رات کو بھی انہیں جھونپڑیوں سے باہر نکال دیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ اپنی ماؤں کا دودھ چوس کر اس پاؤ ڈیڑھ پاؤ دودھ کی دولت کو اور بھی کم نہ کر دیں۔ بھوک جنگل میں گھومنے کی تکان یا رات کی سردی کی وجہ سے جب وہ اس زندگی کی تکلیفوں سے نجات حاصل کر لیتے تو اُن کی چمڑی کو اُدھیڑ کر اس میں گھاس پھوس بھر دیا جاتا ٹانگوں کے نیچے چار چھڑیاں لگا دی جاتیں اور اُسے دودھ دوہتے وقت گائے کے آگے کھڑا کر دیا جاتا تاکہ وہ مامتا سے مجبور ہو کر دودھ دیتی رہے۔

اِن سب سے پیچھے سب سے بوڑھی گائے لرزتی ڈگمگاتی۔ لڑکھڑاتی آہستہ آہستہ گاؤں کی طرف بڑھے جا رہی تھی۔ بھورا کسیلا رنگ۔ مریل دُبلی ٹانگیں۔ سکڑی بھچی ہوئی دُکھتی آنکھیں جن کے اوپر ڈھیلے بوڑھے پپوٹے کناروں کے قریب سے پُراسرار مگر سنجیدہ طور پر اوپر کی طرف اُٹھے ہوئے تھے۔ جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہو۔ اُس کی ہڈیاں بڑی سنگدلی سے بے گوشت کی چمڑی کو چیر کر باہر نکل رہی تھیں۔ ہر ایک اُبھری ہوئی ہڈی کے کنارے دوسری اُبھری ہوئی ہڈیوں کے سائے میں سے بڑے دردناک طریقے سے جھانک رہے تھے۔ اس کے جسم پر بھی بہت سے زخم پھوڑے اور پھنسیاں تھیں اور

ایک کوا اُس کی کوھلے کی ہڈی پر بیٹھا ایک گہرے زخم میں چونچ مار رہا تھا۔ ایک اور کوا کائیں کائیں کرتا ہوا اِردگرد منڈلا رہا تھا۔ چرواہوں کے اُسے تیز چلانے کے لئے بار بار مروڑنے سے اُس کی دم کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی اس لئے وہ اس کی مدد سے کوّے کو اڑانے میں ناکام ہو رہی تھی سیتل اس بوڑھی گائے کی طرف بڑھا۔ درد سے اُس کی بھوری پلکیں پھڑپھڑا رہی تھیں اور دانت کچکچا رہے تھے اُس نے اپنے پپوٹوں کو اوپر اٹھایا اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے سیتل کی طرف دیکھنے لگی۔ سیتل نے مٹی کی دو مٹھیاں بھر کر اُس کے زخموں پر بکھیر دیں اور جلد جلد گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔

مائی شنکری بھی اس وقت گاؤں میں داخل ہو رہی تھی۔ دو سال ہوئے جب وہ ہردوار کنبھ کے میلے پر گنگا اشنان کے لئے گئی ہوئی تھی تو اُس کا نوجوان اکلوتا لڑکا پاگل کتے کے کاٹنے سے مر گیا تھا۔ رات کو اردگرد کے اُجاڑ بیابان سے گیدڑ گاؤں میں آ جاتے اور ساری رات ان کی گاؤں کے آوارہ کتوں سے لڑنے کی آوازیں سنائی دیتی رہتیں۔ کئی دفعہ پاگل گیدڑ کتوں کو کاٹ جاتے اور ہر سال دو تین درجن آدمی عورتیں بچے ان دیوانے کتوں کی مہربانی کا شکار ہو جاتے۔ ان بیمار، نیم مردہ فاقہ زدہ کتوں کو مروایا نہ جا سکتا تھا۔ بڑی کوشش کے باوجود سیتل گاؤں والوں کو سمجھانے میں ناکامیاب رہا تھا۔ کیونکہ وہ جیو ہنیا کے پاپ کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتے تھے اور جیسے کہ وہ کہا کرتے تھے مرتے کو مارے بڑی سرکار۔

بیٹے کی موت مائی شنکری کے لئے بہت صبر آزما ثابت ہوئی۔ وہ پاگل سی ہو گئی تھی۔ جب کبھی عورتوں کو پنگھٹ کی طرف پانی بھرنے جاتے دیکھتی تو دمے کی کھانسی سے اٹکتی ہوئی آواز میں چلانے لگ جاتی۔ بہنو بیٹیو اپنے بچوں کو گھر اکیلے مت چھوڑ جاؤ۔ گایوں سے پوچھتی پھرتی کہ وہ اپنے بچھڑوں کو اکیلے چھوڑ کر کہاں جا رہی ہیں۔ سارا سارا دن اجاڑ بیابان میں چڑیوں کے پیچھے لڑکھڑاتی پھرتی اور ان سے التجا کرتی کہ وہ اپنے بچوں کو اکیلے چھوڑ کر نہ جائیں۔ اُس کے سر کے بال جھڑ چکے تھے۔ اس کا مرجھایا اور سکڑا ہوا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ اُس کی کالی پرچھائیوں میں چھپی ہوئی غیر متحرک آنکھیں اپنے حلقوں میں ڈگر ڈگر کرتی رہتی تھیں۔ اس کے لبوں کے کونے بڑے اجیرن طریقے سے نیچے کی طرف لٹک رہے تھے۔ سیتل کو دیکھ کر ہمیشہ مائی شنکری کے پھٹے ہوئے سوکھے لبوں میں مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی لکیر کھچ جاتی لیکن اُسے یہ مرجھائی ہوئی مسکراہٹ آنسوؤں کو روکنے کی ایک کوشش معلوم ہوتی۔

گاؤں کے شروع میں ہی ٹھاکر دوارا تھا جس کے سامنے مولسری کے درخت کے نیچے چارپائی پر وہاں کا زمیندار بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا اُس کے حواری اور خوشامدی اردگرد بیٹھے چرس اور گانجہ کے دم لگا رہے تھے اور حسب معمول بے معنی اور لغو باتیں کر رہے تھے۔ ٹھاکر دوارے کی پکی دیواریں ناقوس اور سنکھ کی پُرشور آوازوں سے گونج رہی تھیں۔ شام کی آرتی ہو رہی تھی اور مندر کے پجاری گلا پھاڑ پھاڑ کر اوم جے جگدیش ہرے چلا رہے تھے۔ مندر کی پچھلی طرف بوڑھا بڑ کا درخت کمر جھکائے کھڑا تھا اور اُس کے نیچے مندر کے بزبل ناکارہ سانڈ زمین پر لیٹے مٹی سے اپنے جسم رگڑ رہے تھے۔ جب کبھی کسی نے سر پر آئی بلا کے لئے اُپائے کرنا ہوتا یا ایشور سے کوئی سفارش کرنا ہوتی تو مندر کو ایک بیل دان کرنے کا وعدہ کرتا اور اپنی مراد پوری ہو جانے پر سستے سے سستا بیل لا کر مندر پر چڑھا دیتا اور وہ بیمار کمزور بیل گاؤں کی گایوں کی نسل کو خراب کرتے پھرتے۔ اب سیتل علی گڑھ سے ایک اچھی نسل کے بیل کا انتظام کر کے آرہا تھا جسے پرسوں گنیش چودس کے تہوار پر وہاں کے "ڈیری فارم" والوں نے گاؤں کی گایوں کو بیاہنے کے لئے لانا تھا۔

جب سیتل ٹھاکر دوارے سے آگے بڑھا مندر کے کوئیں پر چند عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ اُس نے ان عورتوں کے پیلے، جوانی کی صحت سے ناآشنا چہروں کی طرف دیکھا۔ ان کو دیکھ کر ہمیشہ اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی اور وہ سوچنے لگ جاتا کہ اِن بدنصیب عورتوں کے لئے کبھی جوانی آتی ہی نہیں۔ بچپن اور پھر لڑکپن کے بعد ہی بڑھاپا آجاتا ہے۔ اور اکثر اس سے پہلے ہی موت آ لیتی ہے۔

کوئیں کی چرخی کی کھڑ کھڑ۔ ڈول کا دھڑام سے کوئیں میں گرنے کا دھماکا اور پھر اس کے اوپر کھینچے جانے کی چوں چوں اب اس کے لئے مانوس آوازیں بن چکی تھیں۔ حسبِ معمول پانی بھرنے والی عورت ایک ٹانگ کو کوئیں میں بڑھا کر اپنے میلے کچیلے اکوہ پیر سے رسّے کو چرخی کے اوپر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈول کے شکستہ پیندے میں کئی سوراخ تھے اور اوپر نکلنے تک اس کا پانی آدھے سے کم رہ جاتا تھا۔ اس وقت پنڈت بانکے بہاری بھی کوئیں کے چبوترے پر چوکڑی مارے بیٹھا اشنان کر رہا تھا۔ غالباً اس پر کسی نیچ جاتی والے کا سایہ پڑ گیا تھا۔ اُس نے جنیؤ کو کان سے لٹکایا ہوا تھا۔ ایک گانٹھ والی لمبی موٹی چوٹی اس کی گردن تک لٹک رہی تھی۔ بھیگ جانے کی وجہ سے اُس کی پتلی دھوتی کا عدم وجود برابر تھا۔

آدھی درجن کے قریب چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیاں جو اپنی ماؤں کے ساتھ کوئیں تک آئے تھے ایک دوسرے کے کرتوں کا پچھلا حصہ پکڑے چھک چھک کرتے ہوئے ریل گاڑی کھیل رہے تھے۔ ان کے قریب ہی دو لڑکے

گیلی مٹی کی تیلی تہ والی پیالیاں بنا کر انہیں زمین پر زور زور سے اُلٹا پھینک کر پٹاخے چلا رہے تھے۔ ایک پانچ چھ سال کی لڑکی گائے بھینسوں کے پانی پینے والے حوض میں ڈبکیاں لگا رہی تھی۔ چند اور لڑکے بکریوں کی سوکھی ہوئی مینگنیں اکٹھی کر کے ایک دوسرے پر اڑا رہے تھے۔

سینل کا گھر گاؤں کے دوسرے کنارے پر تھا۔ تکان کی وجہ سے اس کی رفتار معمول سے کم تھی۔ راستے میں دھنئے کی جھونپڑی میں جو دھوئیں سے بھری ہوئی تھی اُس کی بیوی چولھے میں سلگتے ہوئے ایندھن میں زور زور سے پھونکیں مار رہی تھی۔ اُس سے اگلی جھونپڑی میں کسی نے اُڑد کی دال کے چھلکے بغیر دیکھے ہی باہر پھینکے، جو سب اُس پر گرے۔ وہ سٹپٹا کر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ چند و سامنے والی جھونپڑی کے ساتھ پیشاب کر کے بڑی بے احتیاطی سے اُدھر اُدھر تھوکتا ہوا اُسے "رام رام" کہہ کر قریب سے گذر گیا۔ منگل کی بیوی ایک کالی بوتل میں سے جس کی گردن پر کارک کی بجائے بھٹے کا دانوں سے خالی ڈنٹھل لگا ہوا تھا۔ سرسوں کا تیل نکال کر اپنی بیٹی کی لمبے لمبے بالوں میں چھپی ہوئی کھوپڑی میں رگڑ رہی تھی۔ ان کے او پطاق میں ایک دیا جل رہا تھا۔ قریب ہی اس کی بہو اُپلوں کے لئے گوبر سنوار رہی تھی۔

منگت رام کی دوکان جو اُس کے گھر کے قریب ہی تھی بند ہو چکی تھی لیکن بہت سے کتے اس کی دکان کے آگے گرے ہوئے دودھ کے خالی سکوروں اور دہی جلیبی کے پتے چاٹ رہے تھے اور ایک دوسرے پر بھیانک دردناک طریق سے بھونک رہے تھے۔ سینل کو دیکھ کر انہوں نے بھونکنا اور لڑنا بند کر دیا۔ کئی کتے اپنی اگلی ایک ٹانگ اٹھا کر اُدھڑی ہوئی چمڑی پر کھجلی کرنے لگ گئے۔ کئی تھوتھنی پر بھنبھناتی مکھیوں پر منہ مارنے لگے۔ ایک کتا دُم ٹانگوں میں دبا کر بیٹھ گیا۔ ان کتوں کی سرخ بے بال چمڑی خارش پھڑیوں۔ زخموں اور بے نام بیماریوں سے گل چکی تھی اور اُن میں سے سوکھی فاقہ زدہ ہڈیاں ایسے جھانک رہی تھی جیسے کوئی مظلوم ظالم کی طرف دیکھ رہا ہو۔ یہ کتے دوزخ کے گناہگار انسانوں کی ملعون پرچھائیوں کی طرح اپنے وحشت ناک کوڑھی جسم کو ادھر اُدھر رینگتے سارا دن گلیوں میں غلاظت چاٹتے پھرتے اور اپنی غیر جیوانی خشمگیں آنکھوں سے ہر ایک کو گھورتے رہتے اور شام کو بلا ناغہ اس دُکان کے آگے آ اکٹھے ہوتے اور ساری رات لڑائی اور عف عف سے ہڑبونگ مچائے رکھتے۔

منگت رام کی دوکان کی بائیں طرف بہیڑے کے درخت کے نیچے ایک سیاہ داغوں والی سپید گائے لیٹی ہوئی تھی۔ ڈیڑھ سال ہوا جب منگت رام کی ماں مرنے لگی تو اُس نے گئودان کی خواہش ظاہر کی تاکہ موت کے بعد اُسے ایک گائے میسر ہو جائے جس کی دُم پکڑ کر وہ اس دنیا اور اُس دنیا کا درمیانی سمندر پار کر سکے۔ وہ فوراً ہی شہر جا کر گئوشالہ سے یہ گائے خرید لایا۔ پھوکا کرنے سے وہ کئی برس ہوئے خشک ہو چکی تھی۔ اُس کی ٹانگوں کے نچلے حصے بھی کٹے ہوئے تھے جنہیں غالباً کاٹ کر کسی دوسری گائے کی ٹانگوں سے پیوند کر دیا گیا تھا تاکہ وہ ایک غیر قدرتی عجوبہ بن کر نمائش کے لئے زیادہ متبرک ہو جائے۔ اس وجہ سے منگت رام کو یہ گائے بہت سستے داموں مل گئی تھی۔ براہمن کو رسمی طور پر دان کرنے کے بعد یہ گائے یہاں لا کر لٹا دی گئی اور یہاں وہ درخت سے گرے ہوئے پتے کھا کر زندہ رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پچھلے دو ہفتوں سے اس گائے کی گردن پر چھڑی چپٹی ہوئی تھی جو اب بہت پھیل چکی تھی اور اس کو گائے کے دل تک پہنچنے میں ابھی چھ سات روز اور باقی تھے۔ جب جیسا کہ منگت رام کہتا تھا وہ قدرتی موت مر جائے گی۔ سینل اس کے لئے شہر سے مرہم لایا تھا۔ اس کے قریب جا کر پھڑیاں ٹٹول ٹٹول کر وہ اُن پر مرہم لگانے لگا۔

جب سینل گھر پہنچا تو ابھی تک اُسے مہمل غیر مانوس ناقابلِ فہم خیالات اپنا تعاقب کرتے معلوم دے رہے تھے۔ پچھلے چند مہینوں کی یادیں دائرہ نما سلسلے بن کر اُس کی آنکھوں کے آگے پھیلنے سکڑنے لگیں۔

اُسے اِس گاؤں میں آئے پانچ مہینے ہو چکے تھے۔ جب وہ کالج میں پڑھا کرتا تھا تو سوچا کرتا تھا کہ ہندوستان میں سات لاکھ گاؤں ہیں اگر سات لاکھ ہندوستانی نوجوان ان کی بہتری اور بہبودی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیں۔ تو دس ہی سال میں اس بدنصیب ملک کی کایا پلٹی جا سکتی ہے۔ وہ ایک ایسا ہی نوجوان بننا چاہتا تھا۔ کالج کی تعلیم کے بعد وہ اس گاؤں میں جو باندار ریلوے اسٹیشن سے بائیس میل جنوب غرب کی طرف تھا تین بیگھ زمین خرید کر آباد ہو گیا۔

گاؤں کی حالت اُس کے اندازے سے بھی خراب نکلی۔ یہ گاؤں ہندوستان کے باقی دیہات کی ہی طرح کیچڑ، مٹی اور گوبر کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی بے ڈھب جھونپڑیوں کا ایک جمگھٹا تھا۔ جھونپڑیوں کو بنانے کے لئے مٹی ایک ہی جگہ سے کھودی گئی تھی جہاں ایک بہت بڑا گڑھا نکل آیا تھا۔ جو برسات میں بارش کی وجہ سے اچھا خاصہ جوہڑ بن جاتا۔ آہستہ آہستہ سوکھ کر اس کا پانی گاڑھا ہوتا جاتا۔ مویشی اُسی میں نہاتے۔ گاؤں کے بیچ جاتیوں کے

لوگ اُسی سے پینے اور نہانے کے لئے پانی لیتے اور اُسی میں سے برتن اور کپڑے صاف کرتے۔ گاؤں کا تمام گندہ پانی اسی میں آ شامل ہوتا۔ اس جوہڑ پر ہر موسم میں مچھروں کی چھاؤنیاں لگی رہتی تھیں جو راتوں میں لوگوں کو ایک پل بھی چین نہ لینے دیتے۔ ہر سال درجنوں جانیں ملیریا کا شکار ہو جاتیں اور موسمی بخار کا ایک آدھ حملہ ہر ایک کو مہینوں کے لئے نکما ضرور بنا جاتا۔ سال دو سال بعد چیچک اور ہیضہ بھی رہی سہی کسر پوری کر جاتے۔

جھونپڑیاں بالکل کچی بنی ہوئی تھیں۔ پوال سے ڈھانپی ہوئی مٹی کیچڑ کی بے جان دیواریں۔ بارش ذرا زیادہ ہوتی تو یہ دیواریں بیٹھ جاتیں۔ نہیں تو چھتیں ضرور ٹپکنے لگتیں اور لوگ اپنی ٹوٹی پھوٹی چارپائیوں کو چھت سے ٹپکتے پانی سے بچنے کے لئے ایک کونے سے دوسرے کونے میں گھسیٹتے پھرتے جاڑے کی راتیں یہ نیم برہنہ لوگ اُپلوں کے الاؤ کے اِرد گرد سُکڑ سمٹ کر گزار دیتے اور جب مئی اور جون میں آندھیاں اور جھکڑ چلتے تو پوال کی ہلکی چھتیں اُڑ کر کئی کئی میل دور جا گرتیں اور وہ بغیر کسی پناہ کے رہ جاتے۔ جھونپڑیوں میں کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا۔ چولھے کا دھواں اندر ہی چکر کاٹتا رہتا۔ لالٹین تو کیا مٹی کے تیل کے معمولی سے لیمپ بھی اُن کی قسمت میں نہیں تھے۔ کڑوے تیل کے دیئے کی مدھم لو سے نکلی ہوئی کالی سینپولیاں ہوا کو ڈس ڈس کر زہریلا بنایا کرتی تھیں۔ کسی بھی گھر میں پاخانہ نہ تھا۔ بچے گلیوں میں ہی بیٹھ لیتے اور مرد عورتیں باہر کھیتوں میں چلے جاتے۔ اِس گندگی اور غلاظت کی وجہ سے کروڑوں مکھیاں ٹڈے، کیڑے اور دیگر حشرات الارض آ نا کہرام مچائے ہوئے تھے کہ جینا دو بھر تھا۔ ہر طرف گندگی اور بدبو تھی اور لوگوں کے دلوں میں اس سے بھی بڑھ کر متعفن جہالت پڑی سڑ رہی تھی۔

گاؤں میں آتے ہی سیتل وہاں کے سدھار میں تن دہی سے مشغول ہو گیا۔ بچوں کے لئے پاٹھ شالہ کھولی۔ اچھوتوں کے لئے پانی کا پمپ لگوایا۔ گلیوں میں موریاں کھدوائیں اور گندے پانی کو جوہڑ کی بجائے کھیتوں کی طرف لے جانے کا انتظام کیا۔ فصل کے اچھے بیج منگوائے۔ گاؤں پرانے شکستہ لکڑی کے ہل مشکل سے زمین کرید ہی سکتے تھے۔ اُس نے کسانوں کے باری باری استعمال کے لئے ایک درجن بڑھیا ہل بنوائے اور گاؤں کی زندگی کے ہر پہلو کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اُسے اس کام میں بہت مشکلیں پیش آ رہی تھیں لیکن وہ کسی کی خوشی یا ناراضی کا خیال کئے بغیر اپنی دُھن میں لگا ہوا تھا۔

گاؤں کا سب سے پیچیدہ مسئلہ وہاں کی گائیں تھیں۔ ایک سو سترہ گائے گلے میں سے ایک سو سے زائد تو سوکھی تھیں۔ باقی صرف پاؤ ڈیڑھ پاؤ دودھ دیتی تھیں جو گاؤں والوں کی ضرورت کے لئے ناکافی تھا۔ رات کو یہ گائیں فصلیں خراب کرتی پھرتیں اور دن باہر اُجاڑ میں گھاس کی پتیوں کی تلاش میں گزار دیتیں ان کے چارے کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ سیتل نے لوگوں کو چارہ بونے کی ترغیب دی اور خود مصری کلوور کی بیج یا گھاس منگوا کر اپنی زمین میں بوئی۔ وہ ہتھرس سے ایک دس سیر دودھ دینے والی گائے بھی خرید لایا تھا۔ جس سے اپنے سکول کے بچوں کو دودھ پلایا کرتا تھا۔ اور گاؤں کی گایوں کی نسل کو بہتر بنانے کی بھی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

اگلی صبح منہ اندھیرے سیتل اردگرد کے دیہات میں لوگوں کو کہنے چلا گیا کہ اُس سے اگلے دن گائیں بیاہنے کے لئے لے آئیں۔ جب وہ شام کو لوٹا تو سارے دن کے سفر سے تھک کر چور ہو چکا تھا اور اُس کے قدم بمشکل اُٹھ رہے تھے۔

اسی طرح چرواہے گایوں کی دُمیں مروڑتے ان کی پیٹھ پہ چھڑیاں برساتے گاؤں میں داخل ہو رہے تھے اور اسی طرح وہ بوڑھی بھوری گائے اُن کے پیچھے پیچھے لڑکھڑاتی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھی جا رہی تھی۔ وہ آج معمول سے زیادہ تھکی ہوئی معلوم ہو رہی تھی غالباً آج کی باہمی کشمکش میں اُسے کچھ بھی میسر نہ ہو سکا تھا۔ یکایک وہ کھڑی ہو گئی اور گردن اوپر اٹھا کر حسرت بھری آنکھوں سے گرد کے بادل میں چھپے ہوئے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگ گئی۔ اس کی ٹانگیں جواب دے چکی تھیں۔ وہ زمین پر لیٹ گئی اور آوارہ گرد گھومتے کتے اُسے گرتا دیکھ کر دوڑتے دوڑتے اس کے قریب آ گئے۔ وہ یہ دیکھ کر کہ اس کا آخری وقت آ پہنچا ہے زور زور سے بھونکنے لگے۔ اُن کے بھونکنے کی آواز سُن کر گاؤں کے اور بہت سے کتے اُدھر آ گئے اور اپنی پُر اشتیاق تھوتھنیوں سے اُسے سونگھنے اور اپنی خشک زبانوں سے چاٹنے لگے۔ اُن کے وحشت ناک جبڑوں میں پانی بھر آیا تھا اور ان کی بھوکی پسلیاں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ گائے نے اپنا سر اوپر اٹھا کر ایک دو دفعہ اِدھر اُدھر ہلایا اور پھر بے بس ہو کر زمین پر رکھ دیا۔ اُس کا مُنہ کھلا ہوا تھا جس میں سے زبان باہر لٹک آئی تھی۔

کتے بھونکتے چیختے غراتے ہانپتے ننگے وحشی تیکھے دانتوں کو نکالے اپنی شدید ضرورت سے مجبور اُس کی بوٹیاں نوچنے لگے۔

سیتل بھی اتنی دیر میں وہاں پہنچ چکا تھا۔ گائے ہانپ رہی تھی اور اپنی آنکھوں کی بھیگی ہوئی خلاؤں میں سے کتوں کو گھور رہی تھی۔ سیتل کو دیکھ کر کتے ڈرتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ سوائے ایک کُتیا کے جس کی نیلی پرچھاؤں میں گھری ہوئی

آنکھوں سے کئی ننھی ننھی جانیں بھوک سے کلبلاتی ہوئی جھانک رہی تھیں دوسرے کتے ڈگمگا رہے تھے لیکن اس نے ماستا سے عبور رہو کر بڑی بےباکی سے آگے لپک کر گائے کے منہ میں سے لٹکتی ہوئی زبان کو نوچ لیا۔

گائے تڑپنے لگی۔ اُس کے ڈیلے باہر اُبھر آئے ان میں نفرت اور غصہ جھلک رہا تھا۔ اس کی لیکھوں سے بھری ہوئی بھوری پلکیں پھڑپھڑانے لگیں۔ اُس کے نتھنے پھول گئے اور چند لمحوں ہی میں وہ اپنے جسم کے دُکھوں سے آزاد ہو گئی۔

سیتل کا رواں رواں کانپنے لگا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ ایک تلخ گھناؤنی اُلجھن سے اس کا دماغ چکرانے لگا۔ اُس سے وہاں کھڑا نہ ہوا گیا۔ راستے میں اُسے کُتیا کی آنکھوں میں بھوک سے تڑپتی ہوئی ننھی ننھی جانیں، پچپچڑی زدہ، سپید گلے کی موت کا انتظار۔ اُس کی کٹی ہوئی ٹانگیں۔ بھوری گائے کے زخموں میں چونچ مارتے ہوئے کوّے —— ان کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بہت سی بھیانک ملول زخمی آوازیں اپنے دلگیر شور سے اُس کے کانوں کے پردے کچکا رہی تھیں۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر سیتل نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دیا سلائی جلائی ٹیبل لیمپ روشن کیا اور آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ اُس کے ذہن میں بے شمار مختلف قسم کے خیالات بڑی تیزی سے ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے تھے۔ نیم غنودگی کی حالت میں اُس کی آنکھوں کی پتلیوں کے آگے گاؤں کی تمام گائیں گھومنے لگیں۔ مریل سوکھی ہوئی گایوں کی اُبھری ہوئی ہڈیوں کے درمیانی گڑھے یکا یک اُسے بہت گہرے اور تاریک معلوم ہونے لگے جن میں بے انتہا لوگ ٹھوکریں کھا کر گرتے جا رہے تھے۔ گایوں کی بھری کی ننگی پسلیاں لمبی لمبی تیز چھریاں بن کر اُس کے جسم کو چیرنے لگ گئیں۔

سیتل نے ٹیبل لیمپ کی مدھم لَو کی طرف دیکھا وہ اُس کی کانپتی ہوئی ٹھوڑی کی طرف دیکھ رہی تھی اور اُس کے ہیجانی خیالات اور جذبات کا بڑے غور سے معائنہ کر رہی تھی۔ اپنے ماحول سے نفرت کا احساس اُس پر غالب ہوتا جا رہا تھا۔ اپنے آپ پر ملامت کے مکروہ خیالات اس کے جسم پر رینگنے لگے۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی نسوں میں خون کی جگہ زہر بھر دیا گیا ہے۔ اور کھوپڑی میں کڑوا دھواں ہو اور وہ ایک کھاری سمندر کو شہد کی ایک دو بوندیں ڈال کر میٹھا کرنے کی طفلانہ کوشش کر رہا ہے۔ اُس کے بعد وہ لیمپ کے شعلے کو بڑے انہماک سے دیکھنے لگا۔ یاد اُسے کہہ رہا تھا کہ شہر ہی وہ کھیوں

کے چھتے ہوتے ہیں جن میں تہذیب اور تمدن کا شہد پیدا ہوتا ہے۔ اور جب تک ہندوستان کے کم از کم آدھے گاؤں اکٹھے کر کے شہر نہیں بنا دیئے جاتے۔ تب تک یہ جہالت دور نہیں ہوگی اور ترقی ایک خواب ہی رہے گی۔ اس کے بہت عرصہ بعد تک وہ اپنی اُبھری ہوئی متحیر آنکھوں سے لیمپ کو دیکھتا رہا۔ اُس کے دماغ سے عجیب غیر مانوس خیالات اور تصوّرات کے بخارات اُٹھ رہے تھے۔ کبھی کبھی ذہن پر بے بسی کا سکون سا چھا جاتا۔ لیکن اُسے اس سکون کے حلے خیالات کی بمباری سے بھی زیادہ پریشان کر دیتے۔

اچانک ستیل کو یوں محسوس ہوا کہ یہ مختلف خیالات اُس کے بھیجے میں رینگ رہے ہیں جیسے گلے سڑے امرودوں میں سفید سفید کیڑے۔ وہ سٹپٹا کر کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور کن پٹیاں رگڑنے اور سر جھٹکنے لگا۔

گاؤں میں داخل ہوتے گیدڑوں کی ہو ہو ہپ ہپ۔ کتوں کی دردناک عف عف سوّروں کی چیخیں۔ مچھروں کی بھنبھناہٹ اُلّوؤں کی ہوک اور دوسری سینکڑوں قسم کی ناقابلِ فہم اور پُرشور آوازیں اُس کے کانوں میں کھلبلی کرنے لگیں۔ یہ سب آوازیں اُسے خدا سے موت کے لئے دعائیں معلوم ہو رہی تھیں۔ اُسے مُردے قبروں سے نکل کر اس دنیا کو چھوڑ کر کسی اور پُرسکون جگہ کی تلاش کرتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ کھڑکی کے باہر ہوا درختوں کو زور زور سے جھٹکے دے رہی تھی۔ اُن کے پتوں کی سرسراہٹ سے سیتل کو یوں محسوس ہونے لگا کہ پرندوں کے بے شمار جھرمٹ کسی دوسری دنیا کی طرف اُڑے جا رہے ہیں۔ کتوں کی عف عف اُسے موت کے لئے ایک بے بس خواہش معلوم دینے لگی۔ اُس کا اپنا دل بھی موت کے لئے للچانے لگا۔ اُس کے جسم میں سوئیاں سی چُبھ رہی تھیں۔ اُسے محسوس ہونے لگا کہ ایسے خیالات اور تصوّرات کا فوارہ اُس کے دل میں پھوٹ پڑا ہے جنہیں اُس کی فطرت سے کوئی نسبت نہیں اور یہ اجنبی بے رحم خیالات اُس پر غالب ہوتے جا رہے ہیں اور اس کے ہاتھوں کو ایک ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔

سیتل نے ایک زہریلا سفوف نکال کر آٹے میں گھول دیا اور اُسے لے کر مکان سے باہر کتوں کی آوازوں کی طرف چلنے لگا۔ اُسے ایک بے نام کشش ان کی طرف کھینچتی جا رہی تھی۔ آسمان کی نیلی مٹیالی خاموشی میں ننھے ننھے بادل راستہ بھول کر اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ اندھیرے کی گہری دھاریاں اپنی مدھم غمگین آنکھوں سے اُس کی طرف مشکوک نگاہوں سے تک رہی تھیں۔ جوہڑ کے گندے متعفن پانی کی تہ میں ننھے معصوم ستارے

کانپ رہے تھے۔ وہ منگت رام کی دکان کے قریب پہنچا۔ تمام کتے سپید گائے کے اردگرد بھونک رہے تھے۔ اُن کے دانتوں میں ایک نئی چمک تھی۔ اُس نے اضطراری طور پر بے بسی کے ساتھ جیسے کسی بیرونی قوت کے دباؤ سے اُس زہریلے آٹے کو کتوں کے آگے ڈال دیا۔ وہ لپ لپ اُسے چاٹنے لگ گئے سیتل کے آجانے کے بعد چھپڑی کی ستائی بھوکی گائے نے بھی رینگ رینگ کر اُسے چاٹ لیا۔

اگلی صبح جب سیتل بیدار ہوا تو رات کی نیم خوابی کے نقوش ابھی اُس کے ذہن سے پوری طرح نہیں مٹے تھے۔ جب وہ نہا کر کپڑے بدل کر مکان سے باہر نکلا تو اُس نے دیکھا کہ کتوں کے علاوہ سپید گائے بھی اُس کی رات کی پریشان حیات کا شکار ہو چکی ہے۔ گاؤں کے آدمی آپس میں کانا پھوسی کر رہے تھے اور سب اُسے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

مندر کے اردگرد مختلف چیزیں بیچنے والے اپنا اپنا سامان سجا رہے تھے اور گاؤں کے چھوکرے اِدھر اُدھر کھیل یا تماشا دیکھ رہے تھے ان میں سے بہت سے "ہندوستانی چلئے" والوں کے اسٹال کے پیچھے سولہ بگھی کھیلنے کے لئے ٹھیکریوں سے زمین پر لکیریں کھینچ رہے تھے۔ اُن کے قریب دو لڑکے سگرٹ کی خالی ڈبی میں سے نکلے ہوئے چاندی نما ورق کے لئے لڑ جھگڑ رہے تھے۔ ایک بڈھے براہمن کے قریب جو مالا کنٹھے جنیو، گنگا جلیاں فروخت کر رہا تھا۔ دو سات آٹھ سال کے لڑکے دیا سلائی کے بکسوں میں سے نکلی ہوئی ڈبیوں کو دھاگا باندھ ٹیلیفون بنائے ہیلو ہیلو کر رہے تھے۔ چار آنے میں فوٹو اتارنے والے فوٹو گرافر کے خوبصورت محل اور باغیچے والے پردے کا بہت سے لوگ معائنہ کر رہے تھے۔ اردگرد کے دیہات کے لوگ بھی میلہ دیکھنے کو آنے لگے تھے۔

اتنے عرصے میں علی گڈھ ڈیری فارم کے ملازم بھی سانڈھ لے کر آ گئے اور لوگ اِس کے اردگرد اکٹھے ہونے شروع ہوئے۔ سیتل اس بیل کو گاؤں کی دوسری طرف جوہڑ کے پار جہاں گائیں اکٹھی کی ہوئی تھیں لے جانے کے لئے مجمع کو ایک طرف کرنے لگا۔ لوگوں نے اتنا موٹا اور تندرست بیل پہلی دفعہ دیکھا تھا وہ بھی اُس کے پیچھے ہو لئے۔ گاؤں کے لڑکے اُسے حسب عادت منع کرنے کے باوجود چھیڑنے لگ گئے۔ ٹھاکر کیرت سنگھ کا لڑکا اُس کی دُم پکڑ کر مروڑنے لگا۔ بیل درد کو برداشت نہ کر سکا اور اپنی دُم چھڑانے کے لئے اس نے ٹھاکر کیرت سنگھ کے لڑکے پر سینگوں سے حملہ کیا۔ بیل بھیڑ سے گھبرا گیا تھا۔ دُم چھڑا کر وہ لوگوں کے جمگھٹے میں سے بھاگ نکلا۔ لوگ بھی اُس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگے۔ زمیندار کے لڑکے کو چوٹ لگی تھی، یہ دیکھ کر اس کے آدمی بیل کو لاٹھیوں اور چھڑیوں سے پیٹنے لگے۔ بیل نے خود حفاظتی میں چند اور آدمیوں کو چوٹیں لگائیں جس سے لوگوں کا غصہ اور بھی بھڑک اُٹھا۔ انہوں نے بیل کو اتنے ظالمانہ طور پر پیٹا کہ اُس کی پیٹھ خون سے سُرخ ہو گئی اور وہ زمین پر گر پڑا۔ سیتل سے لوگ ناراض تھے ہی۔ بیل کو بچانے کی کوشش میں وہ بھی اتنا پیٹا گیا کہ نیم جان ہو کر گر پڑا۔ ڈیری کے ملازم جن کو خود کم و بیش چوٹیں آئی تھیں ان دونوں کو ایک بیل گاڑی میں ڈال کر شہر کی طرف لے گئے۔ مندر کے ایک براہمن نے بیل گاڑی میں بے ہوش پڑے ہوئے سیتل کی طرف آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھا ایشور نے گئو ہتیا کے پاپ کی کتنی جلدی سزا دی"۔

گاؤں میں گئو ہتیا ہوئی تھی اس لئے پجاریوں نے گنیش چودس کا تہوار منانے سے انکار کر دیا۔ شام کو ٹھاکر دوارے میں اس مہا پاپ کے پرائشچت کے لئے تدبیریں سوچنے کے لئے پنچایت ہوئی۔ ایک تو ایک سو ایک من گھی کا ہون ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ مندر کے پجاری دیسی گھی کے پیسے وصول کر کے اور بناسپتی گھی جلا کر کافی نفع حاصل کر لیتے تھے۔ دوسرے گئو دان بھی لازمی تھا۔ ان پجاریوں کی نظر سیتل کی دس سیر دودھ دینے والی گائے پر تھی۔ اس کے علاوہ وشنو سہاسر نام کا منتر۔ ویدک منتر اور درگا پاٹھ کا منو رماں دیہی ایتادی منتر کا سوا لاکھ دفعہ جاپ بھی ہونا تھا ہردوار سے گنگا جل لا کر گاؤں میں چھڑکوانے پر انہوں نے دو سو روپیہ اور گنوا دیئے آخر بہت منت سماجت کے بعد ایک سو روپیہ پر فیصلہ ہوا جس میں سے آدھے زمیندار نے دینے کا وعدہ کیا۔ ہون گئو دان اور دوسری رسومات کا چار دن بعد اماوس کے روز مہورت نکلا۔

ٹھاکر کیرت سنگھ نے سیتل کی گائے اپنے پاس منگوا لی اور گاؤں والوں نے بھی دو دن میں پچاس روپے اکٹھے کر کے دے دیئے۔ تیسرے دن ٹھاکر کیرت سنگھ سیتل کی گائے کو شہر لے گیا اور اُسے بوچڑ خانے میں اٹھاسی روپے میں بیچ دیا اور پھر گئوشالہ کا رُخ کیا۔ گئوشالہ کے دروازے کے باہر کرشن جی کی تصویر تھی۔ نیلے رنگ کے کرشن مراری سپید صحت مند بشاش گایوں کو بنسری بجا کر مست کر رہے تھے۔ اور گئوشالہ کے اندر وہی بھوکی سوکھی موت کا انتظار کرتی ہوئی گائیں تھیں۔ وہاں سے ٹھاکر جی نے ایک سوکھی مریل گائے جیسی کہ گاؤں میں پہلے ہی بہت سی تھیں تیس روپے کو

خریدی اس کے بعد بازار سے پانچ روپے کے بتاشے لئے اور باقی ستر روپے سنبھال گاؤں لوٹ آئے۔

اگلی صبح ٹھاکر دوارہ خوب سجا ہوا تھا۔ آم اور نیم کے پتوں کی جھنڈیاں اس کے چاروں طرف لگی ہوئی تھیں۔ دروازے پر کیلے کے پیڑوں کے ستون کھڑے کئے ہوئے تھے اور دیواروں میں کھجور کے چوڑے چوڑے پتے میخوں کی مدد سے گاڑے ہوئے تھے۔ اندر گیری سے جابجا گنیش کا نشان بنا ہوا تھا۔ سنگ مرمر کے فرش کو پوتر بنانے کے لئے اُس پر گائے کے گوبر کا لیپ کیا ہوا تھا۔ کرشن جی کی مورتی پر چندر کلا کا سنہری مکٹ جو خاص خاص موقعوں پر باہر نکالا جاتا تھا لگا ہوا تھا۔

ہون کے بعد ٹھاکر کیرت سنگھ نے گئے منگوا بھیجی۔ اس کا سارا جسم گیری سے رنگا ہوا تھا اور اس پر لگائے ہوئے چاندی کے سفید ورق بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ اس کے سینگوں پر کناری اور مالی لپٹی ہوئی تھی اُس نے تمام لوگوں کا ہاتھ چھوا کر گائے براہمنوں کو دے دی۔ وہ سبتل کی گئے کی بجائے اس نئی گائے کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ بہت سٹپٹائے جھنجھلائے۔ لیکن خاموشی کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ ٹھاکر جی نے پچاس روپے اپنی گرہ سے نکال اور پچاس گاؤں والوں کے ڈال ایک سو روپے پجاری کے ہاتھ میں پکڑا دئے۔ بتاشوں کا پرشاد لوگوں میں بانٹا اور پھر باقی کے بیس رُپے بھی نکال کر اُسی پجاری کے ہاتھ میں تھما دیئے اور بڑے فیاضانہ انداز میں کہا "پنڈت جی یہ لو بیس روپے اور پوجا پاٹھ خوب اچھی طرح کرانا کوئی کسر نہ رہ جائے"

وحشی

گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں

اس طرح لیٹے ہوئے تھے خانقاہوں کے جنوں پر در کھنڈر

یاس کے سائے تلے سستا رہی ہوں جس طرح

حسرتِ ناکام کی در دآفریں بے نابیاں!

ہر طرف بکھری پڑی تھیں شورآلودہ سی اینٹیں اور بوڑھی ہڈیاں۔

—— وقت کے موہوم پاؤں کے نقوش

اک طرف دو دیو پیکر "جھر جھرائے" دن کھڑے

سر ملائے کر رہے تھے جانے کیا سرگوشیاں؟

اور پہن کر کھڑکھڑاتی ٹہنیوں کی جھانجھنیں

جابجا منڈلا رہے تھے گرد پیکر گردباد،

جیسے بچوں کے خیال آباد میں

ہوں الف لیلہ کے جادو کے محلّوں کے ستوں لہرا رہے!

تن برہنہ، بال ریچھوں کی طرح،

اور اک انداز استغنا لئے!

اس طرح اک ڈھیر پر بیٹھا تھا وہ

جس طرح مردار کھا کر اونگھتا سا گدھ کوئی؛

ٹھنٹھناتا جا رہا تھا شورہ آلودہ سی اینٹوں کو وہ اک ہڈی سے بہم

—— بے خبر ہر بات سے!

انجم رومانی

شمشیر سنگھ نرولا

شعر

ہو چکے حالیؔ غزلخوانی کے دن

راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

حالیؔ

ساقی نامہ

"سبو میں بادہ ہے پہلو میں اک نگارِ لطیف
کہو جھکے مرے قدموں پہ عالمِ ایجاد!" جوشؔ

پلا ساقیا مجھ کو آبِ نشاط
کہ روشن ہے پھر آج دل کی رباط

تو سارنگ کی آج تانیں اٹھا
جوانی کی ساری اٹھانیں اٹھا

پھر اک بت سے وعدے کی ہے پخت و پز
دکھا ساقیا جلوۂ دخترِ رز

تو بادہ صفت آج کھنچ جا ذرا
خود آغوشِ نغمہ میں بھنچ جا ذرا

مغنی اٹھا آج طاؤس و چنگ
ذرا چھیڑ لمبے سُروں میں ملنگ

تو سانچے میں نغمے کے ڈھل کر نکل
نکھر کر، سنور کر، سنبھل کر نکل!

بجا کوئی شے حسبِ موسم بجا
ملا آج مدھم سے پنچم ملا

چھنا چھن وہ چھاگل کی جھنکار ہو
کہ سویا ہوا چاند بیدار ہو —

نہیں جوگ سے کوئی اب مجھ کو کام
کہ ہجراں کا قصہ ہوا ہے تمام

اٹھا اس طرح نیچی نیچی نگاہ
کہ غیرت سے ڈوبے مہِ چار دہ!

تصدق ہے زہرہ پہ پرویں آج
سلیماں کے گھر میں ہے بلقیس آج

ذرا مجھ پہ تیکھی نگاہیں تو ڈال
گلے میں تخیل کی باہیں تو ڈال!

وفورِ طرب میں ترانہ چلے
مغنی! ذرا اب شہانہ چلے

ہو دھرپد کہ ٹھمری کہ ہو دادرا
مغنی! کوئی رقص کی شے ذرا

پلا ساقیا بادۂ لعل رنگ
میسر ہے اک لعبتِ شوخ و شنگ

درت سے بھی آگے بڑھا تال کو
بدل دے نظامِ مہ و سال کو

سبو میں جمالِ مئے ارغواں
یہ نشے کے لہرے، یہ انگڑائیاں

اٹھے مہوشِ برق پا رقص کر
انا البرق کہہ اور ذرا رقص کر

یہ بادہ کہ آتش بھڑکنے لگے
یہ نغمہ کہ چھاتی دھڑکنے لگے!

سمٹ ذرّے ذرّے میں کافر شباب
الٹ دے اداؤں کے رخ سے نقاب

دھواں آتشِ مے سے اٹھتا ہوا
یہ زلفوں کے نیچے رخِ دلربا

ہو ڈوبا ہوا رقص میں انگ انگ
انوکھی نرت ہو نرالی ترنگ!

ہو زلفوں پہ افشاں کا کیسے بیاں
سمندر میں تاروں کا جیسے سماں

کبھی کھیل دیپک کی تو آگ سے
[illegible] کبھی راگ سے

یہ سیندور ہے مانگ میں جو بھرا
ہے عنبر کی کشتی میں کندن بھرا

یہ تشبیہہ دوں ہوں اگر ہوش میں
ہے رادھا کنہیا کی آغوش میں

یہ ترشی ہوئی صندلیں سی جبیں
نہیں جس کو گہنے کی حاجت نہیں

لگے ہیں یہاں حسن کو چار چاند
نہ ملنے بھلا رخ سے کیوں ماہ چاند

کٹورا سی آنکھوں میں شوخی بھری
کہ اتری ہے شیشے میں نیلم پری!

نگاہوں میں مستی گئی راہ بھول
کہ کرنوں نے گھیرا ہے نرگس کا پھول

یہ بیباکیاں اور یہ شرم و حجاب
لجاتی چنبیلی پہ ہنستا گلاب

ہیں لب رقص کا جادہ منجمد
کہ ترشا ہوا ہے یاقوت منجمد!

یہ سینے پہ دو قمقمے نور کے
ثمر ہیں کسی نخل بلور کے

خدا سے محبت کے پیغامبر
انہی سے تو ثابت ہے شق القمر

یہ ریشم کا جمپر یہ پتلی کمر
رگ گل سے الجھی ردائے سحر

یہ اٹھر پنا کمسنی، نازکی،
یہ ڈھلکی ہوئی ساڑی انداز کی

اچھلنا یہ ساڑی کا ٹھوکر کے ساتھ
یہ مہندی بھرے گورے گورے سے ہاتھ

نہ ہے رقص کا اور نہ بادہ کا ہوش
نہ اپنی ہیں آنکھیں نہ اپنے ہیں گوش

خدارا گھٹا دے ذرا تھاپ کو
میں آپے میں کر لوں ذرا آپ کو

مغنی! بجا دھیرے دھیرے بہاگ
کہ قابو میں آئے دل بے قرار!

ہے پہلو میں میرے وہ من موہنی
سنا دے مجھے آج تو سوہنی!

مرادوں کی گھڑیاں، سماں بر محل
مغنی! کوئی چھیڑ میری غزل!

جو گریہ سے رنگ حنا نہ ملا
کہیں کیا کہ الفت میں کیا نہ ملا

نصیبوں کا لکھا غم دو جہاں
غم عشق کو اک بہانہ ملا!

ہوئے حسن کے عشق کے امتحاں
بھلے کو مخالف زمانہ ملا

بتوں کی جدائی رہی عمر بھر
ہمیں تو کہیں بھی خدا نہ ملا

میسر ہوئیں عشق کی شہرتیں
تخلص کا کیا ہے، ملا نہ ملا!

مغنی! بس اب ہوش سے کام لے
مرے ہاتھ سے بادہ و جام لے

نہیں مجھ کو پینے کی حاجت نہیں!
نہیں مجھ کو جینے کی فرصت نہیں!

انور قریشی

ظفر علی خاں کی شاعری

اردو شعرا کے تذکرہ نگاروں میں سے بیشتر نے مولانا ظفر علی خاں کی شاعری کے ساتھ انصاف کو روا نہیں رکھا۔ اور بالالتزام اُن کی پُرعظمت شخصیت اور زندہ کر دینے والی شاعری کو نظرانداز کرتے رہے۔ شاید ہمارے تذکرہ نگاروں کی یہ فروگذاشت ذاتی اسباب کی بنا پر ہو۔ یا کسی گروہ بندی اور خطہ کے تعصب کی وجہ سے انہوں نے فراخ دلی اور غیر جانبداری کا ثبوت نہیں دیا۔ اگر بعض مصنفین نے ذکر بھی کیا ہے تو صرف رواروی میں چند سطور لکھ دیں

تاریخ ادب اردو کے مصنف نے تو ان کی شاعری کو سرے سے ہی نظرانداز کر دیا۔ البتہ نثر کے متعلق کچھ مجمل سے اشارے ضرور کئے ہیں۔ جس کو غنیمت خیال کرنا چاہئے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے شعر الہند میں بقیہ تمام چھوٹے موٹے شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن مولانا کے ذکر سے بھی اعراض کیا ہے۔ حالانکہ مولانا کی سیاسی، ادبی اور صحافتی زندگی سے وہ بخوبی واقف تھے۔ مرزا اعجاز حسین ایم اے نے اپنی تصنیف مختصر تاریخ ادب اردو میں مولانا ظفر علی خاں کے کلام پر کچھ تنقید کی ہے۔ لیکن یہ کتاب مختصر ہے۔ اس لئے ہمارے شاعر کے سارے خدوخال نمایاں نہیں ہوتے۔

ظفر علی خاں کے نام سے صرف پنجاب ہی آشنا نہیں۔ بلکہ ہمالیہ سے راس کماری تک اور خلیج بنگالہ سے بحیرۂ عرب تک خواص و عام میں ان کو شہرت حاصل ہے بعض انہیں فن صحافت کا بے مثل امام سمجھتے ہیں۔ جن کی صحافت کی گنگا سے سینکڑوں نہروں نے فائدہ حاصل کیا۔ بعض انہیں سیاسی لیڈر کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔ اہل پنجاب تو ان کی پرجوش نظموں کے شیدا ہیں۔ غرض وہ ایک ایسے شخص ہیں۔ جو ہر فن میں یکتا ہیں۔ ان کی نثاری اور شاعری صحافت، علمی کتابوں کے ترجمے، سیاسی اور اسلامی شاعری اور خطابت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ ان تمام شعبوں میں ظفر علی خاں اگر معاصرین میں یگانہ ہوں۔ تو کم از کم ممتاز ترین افراد میں سے ضرور سمجھے جاتے ہیں۔

زمانے نے ظفر علی خاں سے جو تغافل برتا۔ اس کا افسوس ہے ہمارے موجودہ ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اس ناانصافی کی تلافی کرتے ہوئے ظفر علی خاں کی شاعری کا جائزہ لیں۔

مولانا عہد تداخل کے شاعر ہیں یعنی یہ اس وقت کے شاعر ہیں جبکہ قدیم اور نئی طرز کا آپس میں تصادم تھا۔ ادب۔ معاشرت بلکہ ساری زندگی میں ایک کشاکش کا عالم تھا۔ درحقیقت ان کا کلام ہندوستان کی قومی بیداری کی چہل سالہ تاریخ ہے۔ گذشتہ چالیس برس میں ہندوستان میں جو تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ یا جس قدر اہم سیاسی واقعات اور حوادث رونما ہوتے رہے۔ ظفر علی خاں کی شاعری ان کا ایک منظوم خلاصہ ہے۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ طرابلس، بلقان، اور ترکی وغیرہ میں بھی اقوام یورپ نے پس پردہ جو فتنہ انگیزیاں کیں۔ بہارستان ان سب کو بے نقاب کرتی ہے۔ یہ اُن حسیات کا مجموعہ ہے۔ جو بیدار دل ہندوستانی مسلمانوں کی سیرت کو اس دور میں نمایاں کرتے ہیں۔

مولانا وزیر آباد کے ایک گاؤں کرم آباد کے رہنے والے ہیں۔ ان کے والد کا نام مولوی سراج الدین تھا۔ ابتدائی تعلیم لاہور میں حاصل کی۔ پھر علیگڈھ کالج میں داخل ہوئے وہاں سے بی اے کی ڈگری لے کر نکلے۔ ایامِ کالج میں مقررین کی یونین میں نام پایا۔ جس کی وجہ سے کالج میں ان کی شہرت ہو گئی۔ پروفیسر اور طلبہ ہمیشہ انہیں عزت کی نظروں سے دیکھتے رہے علیگڈھ کالج کے تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے وہ سرسید سے متاثر ہوئے لیکن اس کے باوجود ان کے سیاسی عقاید اور نظریئے سرسید سے بالکل الگ رہے۔

بی اے کے بعد ظفر علی خاں کو حیدرآباد میں ایک معزز عہدہ مل گیا۔ یعنی ولی عہد ریاست میر عثمان علی خاں (موجودہ نظام) کے اتالیق مقرر ہو گئے لیکن مولانا نے ہمیشہ عزتِ نفس اور خودداری کا ثبوت دیا۔ درباری زندگی کے باوجود بھی کبھی کسی کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا۔ چنانچہ وہاں ان کا گذارہ نہ ہو سکا۔ اور انہیں بہت جلد حیدرآباد سے نکلنا پڑا۔ قیام

حیدرآباد کے زمانے میں مسٹر واکر (ریزیڈنٹ) سے اختلاف پیدا ہوگیا چنانچہ واکرنامہ (جو ایک ہجویہ نظم ہے) اس دور کی یادگار ہے۔ حیدرآباد کے زمانے میں "رودِ موسیٰ" کے نام سے بھی ایک نظم لکھی۔ جو اردو شاعری میں خاص وقعت سے دیکھے جانے کے لائق ہے۔ اس دور میں ان کے مضامین اور نظمیں مخزن میں شائع ہوتی رہیں اور ان کے قلم سے نکلے ہوئے ناولوں کے ترجمے (مثلاً رینالڈز کے مسٹریز آف لندن کا پہلا حصہ، میری کوریلی کا ایک ناول کپلنگ کی جنگل بک سے ایک کہانی وغیرہ) کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

حیدرآباد سے چلے آنے کے بعد مولانا کی زندگی کا سیاسی دور شروع ہوتا ہے۔ ان کے والد مولوی سراج الدین "زمیندار" شائع کرتے تھے یہ پنجاب کے ابتدائی اخباروں میں سے تھا۔ اب مولانا نے خود اس کی ادارت شروع کی۔ اور "زمیندار" کو سیاست کا ترجمان بنادیا۔ اپنی خوبیوں اور دلکشی کے باعث "زمیندار" اس درجہ مقبول عام بن گیا کہ لوگ علی الصبح مولانا محمد علی کے کامریڈ کی طرح "آمدِ زمیندار" کا بھی انتظار کرنے لگے۔

ظفر علی خاں کی نظم و نثر سے لوگوں کے دلوں میں اسلام اور آزادی کی آگ بھڑک اٹھی۔ خواص تو خیر اس سے حظ اٹھاتے ہی تھے۔ لیکن عوام کے کان اور دل بھی اس سے کم لذت گیر نہ ہوتے۔ سنہ ۱۸۵۷ء کی بسمل سا تڑپ اور بیباکانہ جوش کے بعد شاید پہلی دفعہ لوگ بلقان اور طرابلس کے واقعات سے اس انداز میں متاثر ہوئے تھے۔ لیکن اس ذوق کی تربیت اور اس سوز کی پیدائش میں "زمیندار" اور بانیٔ "زمیندار" کا حصہ اغلب تھا۔ سرسید نے جو دارُوئے بے ہوشی پلا کر آدھی صدی تک مسلمانوں کو ہمبود کی نیند سلا دیا تھا۔ اب لوگ اس سے بیدار ہو رہے تھے۔ یقیناً اس بیداری کے پیدا کرنے میں مولانا ابوالکلام اور علی برادران کے ساتھ مولانا ظفر علی خاں برابر کے شریک ہیں۔

قوم کی شمع مردہ پر "زمیندار" نے پروانگی اختیار کر لی۔ ایک بجھی ہوئی اور مری ہوئی قومیت کے لئے ماتم گسار رہنا آسان کام نہ تھا۔ پے بہ پے ضبطیاں اور قرقیاں ہوئیں لیکن ظفر علی خاں کی ہمت میں فرق نہیں آیا۔ نقصان پر نقصان اٹھاتے رہے۔ لیکن اپنے مسلک سے نہ ہٹے۔ ضبطی کے بعد پھر وہی آزادی کا راگ! وہی اسلامی نغمے! مغربی تہذیب کی دھجیاں بکھیرتے رہے۔

ہنگامۂ مغرب میں اخبار کا جبری التوا ہوگیا۔ لیکن مولانا کے دل میں عشق رسول اور آزادیٔ وطن کی جو آگ سلگ چکی تھی۔ وہ کب بجھ سکتی تھی۔ صیاد سے اجازت مانگی گئی کہ فریاد کی اجازت نہیں تو کیا گانا بھی منع ہے۔ سیاسیات کا دروازہ بند کرکے ادب کی دکان کھول لی۔ چنانچہ زمیندار کی جگہ "ستارۂ صبح" کا اجراء کیا۔ اس میں کھلم کھلا شکوہ سنجی ممکن نہ تھی۔ لیکن ادبی مضامین کے ضمن میں ہی آزادیٔ افکار کی نئی نئی راہیں کھولیں۔ ندی کی طغیانی عارضی بند باندھ کر نہیں رک سکتی۔ تحریک خلافت میں قوم کو پھر اپنے آتش نوا شاعر اور اخبار نویس کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۰ء میں پھر زمیندار کا اجراء ہوا۔ مولانا شروع ہی سے اتحادِ اسلام تحریک کے لیڈر رہے۔ لیکن جب جنگ عظیم کے بعد ترکی کے حصے بخرے ہوگئے تو ہندوستان میں سنہ ۱۹۱۹ء میں تحریکِ خلافت شروع ہوئی۔ جس کے متعدد اور پرجوش لیڈروں میں شامل ہوگئے۔ اور ہندو مسلم اتحاد کے زمانے میں دوسرے لیڈروں کے ساتھ کانگرس میں آگئے۔ آپ احرارِ اسلام کے بانیوں میں سے ہیں لیکن وہاں بھی کچھ اختلاف پیدا ہوگیا۔ اس لئے اتحادِ ملت کے نام سے الگ ایک جماعت قائم کی۔ لیکن اب کچھ مدت سے مسلم لیگ کے پرجوش کارکن ہیں۔ افسوس ہے کہ انہیں وہ پرانی لیڈری کا اعزاز حاصل نہیں رہا۔ اور اب نسبتاً گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ان کی شاعری کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے (۱) سیاسیات (۲) اسلامیات (۳) ذاتیات (۴) جذبات فطرت (۵) مناظرِ قدرت

لیکن ان کی شاعری کی سب سے اہم صنف سیاسیات ہے۔ اس پر انہوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ جس سے ان کے خیالات اور عام نقطۂ نظر کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ان کی شاعری کا یہ حصہ ہندوستان کی بیداری کی مؤثر تاریخ ہے۔ وہ ہر واقعہ کو مؤثر رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ جسے پڑھ کر آج بھی دلوں میں جوش کا طوفان پیدا ہوتا ہے۔ وہ اکثر نہایت معمولی واقعات کو نظم کرتے ہیں جن کی حیثیت محض ضمنی اور ہنگامی ہوتی ہے۔ لیکن ان واقعات سے جو نتیجہ نکالتے ہیں۔ وہ ان کے خاص سیاسی پیغام کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ اس طریقِ کار کا کمزور پہلو یہ ہے کہ اثر دیرپا نہیں ہوتا بلکہ مقامی اور عارضی بن کر رہ جاتا ہے۔ اور یہی چیز ان کی بعض سیاسی نظموں کو ناپائدار بنادیتی ہے لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ اس سے بعض فراموش شدہ کڑیاں ہمیں ملتی ہیں۔ جو شاید دوسری صورت میں فراموش ہوکر رہ جاتیں۔ اور اسی لئے ان کی نظمیں انہیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی کیونکہ دنیا میں بعض واقعات بظاہر معمولی ہوتے ہیں لیکن کون جانتا ہے کہ ان کا اثر آئندہ تاریخ پر کس قدر گہرا ہوگا۔ ان معمولی واقعات سے ہم

قومی نفسیات کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔ ظفر علی خاں اپنی نظموں سے وہی کام لیتے ہیں جو اہلِ عرب اپنی رجز سے لیتے تھے۔ جس سے مردہ دلوں کے پہلو میں سرد سے سرد دل بھی تڑپ اٹھتا تھا۔ اور اس میں وہ جوش پیدا ہوتا تھا کہ وہ اولوالعزمانہ میدان میں بڑھ کر مشکل سے مشکل قلعوں کو بھی مفتوح کر لیتے تھے۔ ان کے کلام کی کھیتی کو ندیوں کا مختلف پانی سیراب کرتا ہے۔ ایران، طرابلس، بلقان، حادثۂ کانپور۔ تحریک خلافت، جنگ یونان، شدھی سنگٹھن، احرار غرضکہ ہر تحریک اور ہر ہنگامے میں ظفر علی خاں کا اسلامی دل درد سے لبریز ہو جاتا ہے اور اس کے جذبات فراوان نالے بن کر نکلتے ہیں۔

سیاسی مخالفت کے ضمن میں مغربی تہذیب کی مخالفت بھی آ ہی جاتی ہے، پردہ، یورپ کا دعوائے مساوات، یورپ کا نظریۂ حکومت وغیرہ کے مضامین پر ان کی نگاہ بے دھڑک پڑتی ہے۔ ان نظموں میں وہ اکبر سے ملتے جلتے ہیں۔ اکبر اور ظفر علی خاں دونوں تہذیبِ نو کے مخالف ہیں۔ لیکن دونوں کا پیرایۂ بیان مختلف ہے۔ دونوں کی پھبتی کا انداز جدا ہے۔ لسان العصر کے ہاں ظرافت کی چاشنی زیادہ ہے۔ اور ظفر علی خاں کے ہاں طنزیہ تلخی۔ اکبر کی تنقیدِ معاشرت کی نظمیں بہ نسبت ظفر علی کے زیادہ دلچسپ اور گہری معلومات کا پتہ دیتی ہیں۔ اور چونکہ ظرافت کی چاشنی ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس لئے جو کہتے ہیں۔ وہ بھی تلخ معلوم نہیں ہوتا۔ ظفر علی خاں کی تنقید کو پڑھ کر اکثر مخالف کے متعلق گہری نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

ظفر علی خاں نے جو کچھ تہذیب مغرب کے متعلق لکھا ہے۔ وہ سیاست کے تابع ہے۔ تاہم بعض نظمیں اپنے اندر ایک جوش اور اثر رکھتی ہیں قانونِ وفنت میں فرماتے ہیں۔

حق گوئی نہ کر اظہار کہ قانون یہی ہے　　فرماتی ہے سرکار کہ قانون یہی ہے
خود محتسبِ وقت ہے اک مدہلانوش　　مے سے نہ کر انکار کہ قانون یہی ہے

ذیل کے شعر میں ایک داستانِ غم مضمر ہے۔ اور ہندو مسلم اتحاد کی لرزشِ مختصر کی یاد دلاتی ہے۔

کیڑوں کی طرح پیٹ کے بل رینگ کر ان کو
شکریہ کے دے تار کہ قانون یہی ہے

اسلامیات

اسلام سے ان کو سچا عشق ہے۔ جس کی بڑی علامت یہ ہے کہ آپ کو رسول اللہ صلعم سے فریفتگی ہے۔ ان کی زبان سے بے اختیار اس تاجدار یثرب کا ذکر نکل ہی پڑتا ہے۔ ان کا قلم جھوم جاتا ہے۔ اشعار کیا ہیں گویا سجدہ ہائے عقیدت! ان کی نعتیں اقبال کے ہم پلہ ہیں اور شاید خاقانی کے برابر، ذیل کے اشعار کو پڑھئے اور اندازہ کر لیجئے۔

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں
جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں
ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی بوبکر و عمر عثمان و علی
ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبی کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

اور دیکھئے:۔

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہیں تو ہو　　ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمہیں تو ہو
پھوٹا جو سینۂ شبِ تارِ الست سے　　اُس نورِ اولیں کا اجالا تمہیں تو ہو
رہ رہ کے لے رہا ہے جو پہلو میں چٹکیاں　　وہ درد دل میں کر گئے پیدا تمہیں تو ہو
جلتے ہیں جبرئیل کے پر جس مقام پر　　اس کی حقیقتوں کے شناسا تمہیں تو ہو
سب کچھ تمہارے واسطے پیدا کیا گیا　　سب غائتوں کی غائتِ اولیٰ تمہیں تو ہو
جو ماسوا کی حد سے بھی آگے گذر گیا　　وہ راہِ نورد جادۂ اسریٰ تمہیں تو ہو
گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے　　اے تاجدار یثرب و بطحا تمہیں تو ہو
دنیا میں رحمتِ دو جہاں اور کون ہے　　جس کی نہیں نظیر وہ تنہا تمہیں تو ہو

. . . .

علی گڑھ کالج کے طلبہ ہمیشہ علمائے ہند کے اثر سے بے بہرہ رہے لیکن ظفر علی خاں نے باوجود تربیت یافتۂ علی گڑھ ہونے کے علمائے ہند کا اسلامی اور مذہبی اثر قبول کیا۔ اور اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ یہ خدا کی توحید کے قائل ہیں۔ اور ایک سچے مسلمان کی طرح ہمیشہ خوشی اور غم میں خدا ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ دنیا اور دنیا والوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا ان کی خودداری کے خلاف ہے۔ وہ خود ہمتی اور شجاعت کی تلقین کرتے ہیں۔ اور اپنی قوتِ بازو اور عمل صالح کے ذریعے سے فتح حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ان کے کلام میں عشقِ رسول کا جذبہ بے حد نمایاں ہے۔ ان کی نعت سوز و گداز سے بھری ہوئی ہے۔ نعت کیا ہے گویا غزل۔ صرف فرق یہ ہے کہ غزل گو اپنے اس عشق کا اظہار کرتا ہے جس میں ہوس کا شائبہ بھی موجود ہو۔ لیکن ان کا محبوب وہ ہے جو عام انسانوں سے بلند ہے۔ جسے خدا کا محبوب ہونے کا شرف حاصل ہے۔ چونکہ ان کی نعت اور مناجات ان کے دلی جذبات کا آئینہ ہے۔ اس لئے اس میں اثر، سوز، لذت سبھی خصوصیات موجود ہیں۔ نذرِ عقیدت میں رسول اکرم کو مخاطب کرتے ہیں۔ شعر دیکھئے:۔

اے کہ آرائش ہماری داستاں کی تجھ سے ہے　　اے کہ افزائش ہما رے عزو شاں کی تجھ سے ہے
تیرے آب و رنگ سے رنگیں ہے ایران کا چمن　　جلوہ ریزی گلشن ہندوستاں کی تجھ سے ہے

. . . .

اتمامِ نور والی نعت سراپا غزل معلوم ہوتی ہے۔ دو تین شعر ملاحظہ کیجئے:۔

میں جس شراب تیز سے سرشار　　مجھ کو پھر وہ بادہ پلایا نہ جائے گا

میں جس نوائے تلخ سے مدہوش تھا کبھی ؛ کیا مجھ کو پھر وہ نغمہ سنایا نہ جائے گا

مسلمانوں کی حالت پر آبدیدہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنی روایات سے غافل ہو رہے ہیں اور سراپا غیر کی تقلید کر رہے ہیں۔ لیکن وہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے دعائیں نہیں مانگتے۔ بلکہ ان کی دعا مسلمانانِ عالم کے لئے ہے۔

شبلی کی طرح ظفر علی خاں بھی اسلامی تاریخی واقعات کو نظم کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔ اور بعض دفعہ تو ان دونوں کی تاریخی نظمیں ایک ہی بحر اور قافیئے میں ہوتی ہیں۔ اور اس درجہ ہمرنگ کہ سننے والا امتیاز نہیں کر سکتا ان کی اسلامی تاریخ کے واقعات کو پڑھ کر اسلامی تعلیم مذہب اور شاہانِ اسلام کی عظمت کا سکہ دلوں پر بیٹھ جاتا ہے۔ اور اسلامی برتری کا نقش تازہ ہو جاتا ہے۔ اسلامی تاریخ کے وہ واقعات جو انہوں نے منظوم کئے ہیں۔ ان میں سے بعض کا جواب ساری اردو شاعری میں نہیں۔ سرنگاپٹم میں سلطان ٹیپو کی شجاعت اور جانثاری کا ذکر کس پر جوش انداز میں ہوتا ہے۔

اے سرنگاپٹم! اے گنجِ شہیدانِ کرام ؛ آخری وقت میں اسلام کی غیرت کی نمود
کہیں سوتے میں نہ کروٹ یہ مجاہد بدلے ؛ اب بھی اس خوف سے ہیں لرزہ براندام حسود

پھر فرماتے ہیں کہ سلطان کا آخری قول ہمیں نہ بھولے گا۔

شیرا چھا ہے جسے مہلت یک روزہ ملی
یا وہ گیدڑ جسے بخشا گیا صد سالہ خلود

اسی طرح عشقِ رسول والی نظم میں زید کا واقعہ بیان کیا ہے۔ شانِ اورنگزیب، فسطاط، فاطمہ کا انجام بھی اثر کے لحاظ سے بے نظیر ہیں۔ ان کے نعتیہ کلام میں سلاست، روانی، شستگی، وارفتگی، جوش و گداز وہ سب کچھ ہے جو غزل کا خاصہ ہے۔ مولانا اگر غزل گو ہوتے تو یقیناً ان کا کلام حسرت کی طرح مقبول ہوتا۔ کیونکہ ان کی بعض نظمیں تغزل کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

ذاتیات: ظفر علی خاں کی سیرت کا ایک شاندار پہلو ہے۔ وہ ہمیشہ جوہرِ قابل کی تربیت کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سے لوگوں کے ذوق کو سراہا اور اُن کی شخصیتوں کو بلندی بخشی۔ علی الخصوص صحافت کے میدان میں ان کا وجود ایک سرچشمہ فیض ثابت ہوا ہے وہ بہت نیک دل واقع ہوئے ہیں اور اپنے معاصرین کی خوبیوں کے اعتراف سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ خواہ اُن سے کوئی چشمک ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ سیاسی حریفوں سے انتقام لینے سے وہ کبھی باز نہیں آئے جیسا کہ اُن کی بعض نظموں سے ظاہر ہے۔ ان کے کلام میں ہجو اور طنز کا حلقہ غالب ہے۔ مذہبی اور معاشرتی مضامین بھی ہجو اور طنز سے خالی نہیں، تہذیبِ مغرب، ہند کے لبرل سیاستدان، سرکار پرست علما، علی برادران پیغمبر قادیان خاص طور پر ان کے تیروں کا نشانہ بنتے رہے۔

ان کے ہاں جذبات فطرت اور مناظرِ قدرت کی بھی کمی نہیں۔ مگر زندگی میں دوسرے موضوعات نے فرصت نہیں دی۔ اس لئے اس طرف کم توجہ کی۔ پھر بھی جو کچھ کہا ہے لائقِ تحسین ہے۔ سیرِ کہسار، سہانا وقت، ندی کا راگ، ان کی منظر کشی کے مرقعے ہیں۔ سیرِ کہسار کے دو شعر

گذاری ہیں نئے تابستاں کی زمت کوہساروں میں ؛ دل افروز آبشاروں میں دل آرا مرغزاروں میں
ہم آغوشِ صبا تھی نکہتِ گل کی سیہ مستی ؛ جنوں پرور تھے نغمے طائروں کے شاخساروں میں

ان کے مرثیئے اور نوحے بھی سوز و درد سے معمور ہیں لیکن ان کی تعداد چار پانچ سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ اپنے والد ماجد سراج الدین احمد خاں کا مرثیہ کہا ہے۔ داغ مرحوم، اکبر خاں حبیب نو علیہ الرحمۃ کا مرثیہ بھی بہارستان میں موجود ہے۔

ان کی شاعری کا ذاتی اور سیاسی حصہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بعض معمولی واقعات کو نظم کیا ہے۔ ذاتیات میں بعض معمولی درجے کے لوگوں کو منہ لگایا ہے۔ بڑے حریفوں کو جب کبھی منہ لگایا اکثر برسرِ باطل۔ اب ان کی شاعری اپنا کام کر چکی۔ اب یہ موضوع مردہ ہو چکے ہیں۔ اور موجودہ طبائع ان سے کم لذت اندوز ہو سکتی ہیں۔

لیکن ان کا نعتیہ کلام، جذباتی نظمیں، اور شبلیانہ کلام، اردو شاعری میں ہمیشہ زندہ رہےگا۔ اسلام کی بیداری کے ترانوں میں اقبال کے ہم پلہ معلوم ہوتے ہیں۔ جب تک مسلمان کے دل میں ماضی کا احساس زندہ ہے۔ ان کے یہ ترانے لہو کو گرماتے رہیں گے۔

ظفر علی خاں قافیہ اور بدیہہ گوئی کے امام ہیں۔ اور قافیہ میں شاید ان سے کوئی بھی آگے نہیں بڑھ سکا۔ وہ قافیہ پر قدرت کے معاملے میں انشا اور ذوق کے ہم پلہ ہیں اور موجودہ دور کے شاعروں میں لسان العصر کے لگ بھگ ہیں۔ ان کی بدیہہ گوئی ضرب المثل ہے۔ وہ محض فرمائش پر ارتجالاً بیسیوں اشعار کہہ سکتے ہیں

مولانا کے کلام میں محاسن ظاہری بھی کم نہیں۔ خاقانی کی طرح وہ بعید اور نادر تشبیہوں اور تلمیحوں کو استعمال کرتے ہیں۔ قرآن شریف کی آیات اور حدیث کی تضمین اس خوبی سے کرتے ہیں کہ اردو شاعری میں اس کی نظیر ملنی محال ہے ان کے کلام میں گہری فارسیت اور عربیت پائی جاتی ہے۔ جس کا حظ صرف

وہ صاحبِ ذوق اٹھا سکتے ہیں جو عربی اور فارسی کی شیرینی سے لذّت یاب ہوں۔
ذیل کے اشعار میں آیاتِ قرآنی کو کس خوبی سے کھپایا گیا ہے۔

یہ وہ شب ہے کہ مسلم کو ملی دنیا بھی اور دیں بھی | وہ تدبیر قُم فَاَنذِر کی اور یہ تفسیر مِنَ الْاَدنیٰ
اسی دِن کہ مسجد میں جب اگلے دن نظام آئے | تو قدسی یہ پکار اُٹھے کہ سُبحَانَ الَّذِی اَسریٰ

....

اسی طرح کے سینکڑوں اشعار مولانا کی "بہارستان" میں موجود ہیں۔ جن میں شعرائے فارسی کے اشعار سے تضمین کی گئی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ظفر علی خاں کا کلام زیادہ مقبول کیوں نہیں ہوا۔ اِس کے کئی وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ انہوں نے عوام کو اپنا مخاطب بنایا۔ عوام کو شاعری کی باریکیوں کا صحیح ذوق نہیں ہوتا۔ (دوئم) خواص سے وہ ہمیشہ برسرِ پیکار رہے۔ اور اُن کے متعلق ہجو یہ اور طنزیہ نظمیں لکھتے رہے (سوئم) ان کے خیالات کا کوئی ایک مرکز نہیں۔ ان کی سیاسی متلوّن مزاجی کا اثر گہرے طور پر ان کی شاعری پر پڑتا رہا۔ (چہارم) ان کی سیاسی شاعری متانت سے معرا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعری ان کا واحد مشغلہ نہیں بلکہ ان کی سخنوری صحافت، سیاست اور لیڈری کی محکوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین تغیرِ حالات سے بدلتے رہتے ہیں اور ان کے سارے کلام میں کوئی یک رنگ فلسفہ موجود نہیں۔

بایں ہمہ ظفر علی خاں کا کلام فراموش کر دینے کے قابل نہیں۔ اُن کی نعتیں ان کی روایاتِ اسلام، ان کے منظریہ مرقعے، ان کے بعض چیدہ چیدہ سیاسی شکوے اس لائق ہیں کہ ہمیشہ ہمیشہ زندہ رکھے جائیں۔ وہ شمع اجالا، الا والی نظم یا نعت اردو ادب کا گراں بہا موتی ہے، شان اورنگزیب کا طمطراق دامنِ قیامت سے وابستہ رہے گا۔ سرنگاپٹم کا مینار تا ابد سربفلک رہے گا۔

مولانا کا کلام شہر آشوبِ اسلام کا درجہ رکھتا ہے۔ ہم مغربیت کے اس قدر دلدادہ ہو چکے ہیں کہ اب مذہب کی کشتی بھی اسی طوفانی بحر میں ہچکولے کھا رہی ہے اس لئے اب وقت ہے کہ اقبال، ظفر علی خاں، اکبر اور حالی کے نغموں سے اہلِ کشتی کو پھر سے بیدار کیا جائے۔ ان کا سنجیدہ کلام اسلامی تصوّر کے احیائے نو کا باعث ہو گا۔

اگر آج ظفر علی خاں اپنی اصلی اور قدرتی سیاست سے ہٹ گئے ہیں تو کیا مضائقہ۔ ہمارے ظفر علی خاں جو بہارستان میں اپنے اصلی خدوخال سمیت جلوہ گر ہیں۔ زندہ ہیں۔ دنیا جئے یا مرے۔ ظفر علی خاں شاعری کے بہارستان میں ہمیشہ سرسبز و شاداب رہیں گے۔

ب۔ ح۔ سید عبداللہ

بہانے

(۱)

ڈراتی ہیں بن بن کے آندھی ہوائیں
بھیانک ہوئی جا رہی ہیں فضائیں
برسنے کو سر پر کھڑی ہیں گھٹائیں
خدا کی قسم آپ ہی اب بتائیں
کہ ساون منانے
میں آؤں تو کیونکر

(۲)

یہ مانا کہ نکھری ہوئی چاندنی ہے
ہر اک سمت چھائی ہوئی خامشی ہے
فلک سو گیا ہے زمیں سو گئی ہے
ابھی تک مگر خادمہ جاگتی ہے
محبت جتانے
میں آؤں تو کیونکر

(۳)

مرا وعدہ اب تک مجھے دلنشیں ہے
جدائی میں ہر ہر نفس آتشیں ہے
مگر کوئی ملنے کی صورت نہیں ہے
ستارہ سہیل بھی بیٹھی یہیں ہے
نگاہیں بچھانے
میں آؤں تو کیونکر

(۴)

بلائی گئی ہوں مجھے بھی خبر ہے
مگر دیکھتی ہوں یہ رہ پُر خطر ہے
زمانے کی نیرنگیوں پر نظر ہے
محبت نہ رسوا ہو یہ بھی تو ڈر ہے
کروں کیا بہانے
میں آؤں تو کیونکر

(۵)

یہ سچ ہے ملاقات کو چشم نم ہے
دلِ منتظر مضطرب دمبدم ہے
مگر اپنی مجبوریوں کی قسم ہے
اُمیدیں بر آئیں یہ امید کم ہے
علی کو منانے
میں آؤں تو کیونکر

علی احمد

ڈھائی گز سُتلی

وہ قتل کے مقدمے میں ماخوذ تھا اور آج اُس کے مقدمے کا فیصلہ سنایا جانا تھا۔

عدالت کے کمرے کے ایک کونے میں وہ صمٌ بکمٌ دست و پا بجولاں دو سپاہیوں کی حراست میں بیٹھا تھا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ کب جج اس کا نام بلائے اور فیصلہ سنائے۔ ویسے تو فیصلہ اُسے پہلے ہی معلوم تھا۔ —— پھانسی یا عمر قید! —— لیکن پھر بھی دل میں ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید......

اس "شاید" کی کسک سے اُس کے کاٹھ کے سے چہرے پر خون کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ ہوائی قلعے بنانے لگا۔

اگر اب وہ بچ گیا تو...... تو ایک بار پھر وہ زندگی کے مہاساگر کی لہروں میں ایک لہر بن کر کشمکش —— کی کوشش کرے گا۔ شاید وہ اپنی کھوئی ہوئی زمین پھر سے حاصل کر سکے اور اپنی جھونپڑی بھی ساہوکار کے پنجے سے چھڑا سکے۔ لیکن اگر زمین اور جھونپڑی نہ بھی ملی۔ تو کیا ہے؟ آزاد فضا تو ہوگی۔ وہ اپنے بازوؤں کے بل پر اپنی بیوی اور بچوں کی پرداخت کر سکے گا۔ مریاں کے لئے وہ کسی نہ کسی طرح اچھے اچھے کپڑے بنوا ہی لے گا۔ خوبصورت کپڑے بھی تو خوبصورت جسم پر ہی زیب دیتے ہیں۔ اس کی مریاں کو کیسے سجیں گے نئے اور اچھے کپڑے! بھلا گاؤں بھر میں اس جیسی لڑکی ہی کب تھی۔ مریاں! میری مریاں......

ایک سپاہی نے ہتھکڑی کی زنجیر کھینچی اور وہ ستاروں کی دنیا سے زمین کی دنیا پر آرہا۔

آنکھیں ملتے ہوئے اُس نے کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس کے سامنے ایک سُرخ رنگ کی سخت لکڑی کی بنچ پر مرجھائی ہوئی کلیوں کی طرح غمگین اور کسی عظیم الشان عمارت کے کھنڈرات کی طرح شکستہ ایک متوسط عمر کی عورت پتھرائی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے پہلو میں ایک طرف ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکی ادھ کھلی کونپل کی طرح اس کے ساتھ چمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ اور دوسری طرف ایک چار پانچ سال کا لڑکا بلبلا رہا تھا۔ یہ اُس کی بیوی تھی۔ اور اُس کے بچے۔

اُنہیں دیکھ کر اُس نے آنکھیں دوسری طرف پھیر لیں۔

کیا یہی تھی وہ مریاں کی ماں جس کے ساتھ اُس نے پندرہ برس پہلے شادی کی تھی۔ اُس وقت تو وہ ایسی نہ تھی۔ تب تو اُس کی رگ رگ میں شوخی بھری ہوئی تھی۔ اور اُس کی آنکھوں میں گویا ایک مستی تھی جو ایک سپیرے کی بین کی طرح بےشمار سانپوں کو حساس کر کے انہیں اپنی طرف کھینچ لیتی تھیں۔ اُس وقت اُس کے گالوں پر یہ جھُرّیاں تو نہ تھیں تب تو وہ کھیت کے تازہ توڑے ہوئے ٹماٹر کی طرح سرخ اور نرم تھے۔ اور اُس کا جسم جاپانی ریشم کی طرح ملائم۔ باہیں سڈول اور اُس کا قد کیکر کے درخت کی طرح سیدھا تھا۔ اور اب.....

اُس نے ایک دفعہ نگاہیں اٹھا کر اُس کی طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن ہمّت نہ پڑی۔

اور اب؟ اب کیا رہ گیا تھا! جیسے سیلاب سے کوئی گاؤں بہہ جائے۔ گاؤں کے سب مویشی۔ گھروندے اور زر و دولت پانی کی تہہ میں چلے جائیں۔ اور سیلاب ختم جانے کے بعد صرف چٹیل زمین ہی باقی رہ جائے۔ پانی سے بھیگی ہوئی ناہموار و دلدل..... لیکن ابھی سیلاب بھی تو نہ تھما تھا۔ کاش "وہ دلدل" ہی بچ جائے وہ محنت اور مشقت سے اُسے پھر گلزار بنا دے گا۔ عورت بھی تو آخر زمین کی طرح ہے۔ اُسے جتنا سیراب کیا جائے اتنی ہی سرسبز ہوتی ہے۔

شاید سیلاب تھم جائے اور اُس کی "زمین" بچ سکے۔

"لیکن" اُس نے گردن ہلاتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

کتنا اچھا ہوتا۔ اگر آج سے پندرہ برس پہلے مریاں کی ماں نے اس سے شادی سے انکار کر دیا ہوتا۔ پھر۔ آج اُس کی یہ حالت تو نہ ہوتی لیکن شدنی ہو کر رہتی ہے۔ اُس وقت وہ انکار کر ہی کیسے سکتی تھی؟ اُسے اُس سے محبت تھی۔ گاؤں میں اور بھی تو کئی لڑکوں کی آنکھیں اُس پر تھیں۔ لیکن اُس نے صرف اُس ہی کو پسند کیا۔ وہ گاؤں کا مکھ جو تھا۔ پانچ چھ کو وہ ایسے ہی پچھاڑ سکتا تھا۔ جب وہ نیم کے درخت کے تلے اکھاڑے میں ڈنڑ پیلتا تھا تو اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں

سندر کی اصلی مچھلیوں کی طرح تیرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اب نہ معلوم وہ مچھلیاں کون سے سمندر کے گہرے پانی میں غائب ہو کر رہ گئی تھیں۔

اُس نے ہتھکڑی کی جھنکار سے اپنے بازو کو چھوا اور پھر جیسے ڈرتے ہوئے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

آج سے پندرہ برس پیشتر وہ ان بازوؤں کے بل پر دور دور کے گاؤں میں مشہور تھا۔ اُسے وہ واقعہ اب تک یاد ہے جب برسات میں غلّے سے لدی ہوئی ایک گاڑی کیچڑ میں پھنس گئی تھی اور بیلوں کی انتہائی کوششوں کے باوجود کیچڑ سے نہ نکلتی تھی تو اُس نے گاڑی کے نیچے لیٹ کر گاڑی کو اپنی پیٹھ پر اٹھا لیا تھا۔ اس کے تھوڑا ہی عرصہ بعد جب سات آٹھ ڈاکو لاٹھیوں اور خنجروں سے مسلّح اُس کے گاؤں میں وارد ہوئے تھے اور جب گاؤں کے سب جوانمرد انہیں دیکھ کر گھروں میں جا چھپے تھے تو اُس نے اکیلے ہی لاٹھی پکڑ کر سب ڈاکوؤں کو مار بھگایا تھا۔ تب تو اُسے سرکار کی طرف سے انعام بھی ملا تھا۔ اور گاؤں بھر میں اُس کی دھاک جم گئی تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی جو اُس کے آگے آنکھ اُٹھا سکے۔ گاؤں کی سب کنواریاں اُس پر جان دیتی تھیں۔ سب کی آنکھ اُسی پر تھی۔ لیکن اُس نے صرف مریاں کی ماں کو ہی پسند کیا۔ ویسے تو وہ جسے بھی چاہتا۔ اُس کی ہو سکتی تھی۔ لیکن مریاں کی ماں آخر مریاں کی ماں تھی!

اُس کے باپ نے کس دھوم سے اُس کی شادی رچائی تھی۔ تھا تو وہ ایک معمولی پانچ ایکڑ کا زمیندار ہی۔ لیکن تھا آن والا۔ اُس نے قرض اٹھا کر اُس کی شادی کی تھی لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ یہی قرض اس کے بیٹے کی جان کا لاگو ہو جائے گا۔

جب اس کی شادی ہوگئی تھی تو گاؤں کے سب بوڑھے اور بوڑھیاں اکثر کہا کرتی تھیں کہ ایسا جوڑا انہوں نے عمر بھر کہیں نہیں دیکھا۔ اور یہ بات کتنی سچ تھی۔

ان دنوں وہ کتنا خوش تھا۔ گاؤں میں شاید ہی کوئی اور اتنا خوش ہو۔ اس طرح خوشی کے دن آنکھ جھپکتے بیت گئے۔ ایک سال بعد مریاں پیدا ہوئی کتنی پیاری لڑکی تھی۔ خرگوش کی طرح سفید اور نرم۔ اُس کے بچپن کے اشاروں اور چھوٹی چھوٹی حرکتوں سے اس کے دل میں ایک عجیب قسم کی گدگدی ہوتی تھی۔ مریاں کو خوش کرنے کے لئے وہ اکثر بندر کی طرح ناچا کرتا تھا مریاں کے لئے اُس نے اپنی ماں سے کئی بار جھڑکیاں سہی تھیں۔

مریاں کے پیدا ہوتے ہی اس کا دادا مر گیا تھا۔ گاؤں والے کہتے تھے کہ مریاں نہایت بدشگون لڑکی ہے۔ یہ اس خاندان پر اور بھی کئی مصیبتیں نازل کرے گی۔ اور چھ ماہ بعد جب مریاں کی دادی بھی اپنے مالک کے ساتھ ہی قبر میں سلا دی گئی تو لوگوں کی زبانیں اور بھی لمبی ہو گئیں۔ آخر سچ تو کسی نے کہا ہے کہ گاؤں کے لوگ جاہل ہوتے ہیں۔ بھلا مریاں کے پیدا ہونے یا نہ ہونے سے شدنی کبھی ٹل سکتی تھی۔ اگر مریاں پیدا نہ ہوتی تو کیا اس کے باپ یا اُس کی ماں کی جان بچ جاتی۔ اور کیا مریاں کے پیدا نہ ہونے سے وہ اس مقدمے کی زد سے بچ سکتا تھا۔ مریاں کو پیدا ہوئے بھی تو آج چودہ برس بیت گئے۔ کیا اُس کی نحوست نے چودہ برس بعد ہی اثر کرنا تھا! اس طرح سے تو اس کا باپ بھی منحوس تھا۔ نہ وہ قرض لیتا اور نہ یہ بات ہوتی۔ مریاں کی ماں بھی منحوس تھی نہ اُس کی شادی ہوتی نہ مریاں پیدا ہوتی۔ ان بوڑھوں کی باتیں بھی سمجھ میں نہیں آتیں کبھی تو کہتے ہیں کہ خدا کی رضا کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہلتا اور کبھی ہر حادثے کو کسی منحوس شخص یا منحوس واقعے سے وابستہ کرتے ہیں۔ اگر ان کی یہ بات مان لی جائے تو ہر انسان منحوس ہے خود اُس کے پیدا ہونے پر گاؤں میں وہ قحط پڑا تھا جس کی مثال نہیں ملتی اور گاؤں کا نمبردار بھی تو انہیں دنوں پیدا ہوا تھا تو کیا خدا سب کو منحوس ہی پیدا کرتا ہے! یہ کیسے ہو سکتا ہے! لوگ بکتے ہیں۔ میری مریاں بے قصور ہے۔ میری مریاں منحوس نہیں۔ لوگ پاگل ہیں۔

وہ اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر چلا اُٹھا۔ "لوگ پاگل ہیں"۔

سپاہی نے گھورتے ہوئے اُس کی ہتھکڑی کی زنجیر کو کھینچتے ہوئے کہا "چُپ رہو"۔

مریاں کو منحوس کہتے ہیں! بھلا چاند بھی کبھی منحوس ہو سکتا ہے۔ مریاں تو دن بدن چاند کی طرح بڑھ رہی تھی۔ اس نے بھی مریاں کے لئے دن رات ایک کر دیئے تھے کمین کو بھی کھیت سے علیحدہ کر دیا تھا تاکہ اُس کی مزدوری بچ جائے اور مریاں کے لئے شہر سے کھلونے اور نئے نئے کپڑے آ سکیں۔ یہی کچھ ربڑ کے غبارے۔ دبانے سے چڑیا کی طرح بولنے والی میم اور چابی دے کر چلنے والی موٹر وغیرہ۔ مریاں ان کھلونوں کو دیکھ کر کتنا خوش ہوا کرتی تھی۔ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتی تھی۔ اور جب ربڑ کے غبارے کو اپنے دونوں ننھے منے ہاتھوں سے پکڑ کر ڈگمگاتے ہوئے پاؤں سے چلنے کی کوشش کرتی ہوئی گر پڑتی۔ اور غبارہ پھٹ جاتا تو وہ دونوں ہاتھوں کو اُلٹ کر اس طرح بیٹھ جاتی تھی جیسے کوئی بھوکی بڑھیا جس کے ہاتھ سے کوا روٹی چھین کر لے گیا ہو۔

یہ سوچتے ہوئے اُس کی آنکھیں بھر آئیں اور آنسوؤں کے ایک دو قطرے چھلک کر ہتھکڑی کے سخت فولاد پر گر پڑے۔

مریاں کے لئے تو وہ شہر سے اور بھی کئی غبارے لے آتا لیکن ساہوکار اُسے جونک کی طرح چمٹا ہوا تھا۔ ہر سال فصل کے موقع پر اُسے کچھ نہ کچھ رقم

بچا کر ساہوکار کو ادا کرنی ہوتی تھی تاکہ اس کے باپ کا لیا ہوا قرض اتر جائے۔ لیکن قرض تھا کہ کم ہی نہ ہوتا تھا۔ بلکہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ نہ معلوم ہر سال کی ادائیگی اس لالہ کی توند کے کون سے حصّے میں پہلی جاتی تھی۔ ہر سال وہ اُس سے یہی الفاظ سنتا تھا "تمہارے ذمے اتنا سود ہوگیا ہے اور اصل رقم ابھی وہیں کھڑی ہے تمہارے باپ کا لحاظ ہے ورنہ اب تک ...... خیر جلد ہی کوئی انتظام کر دو نہیں تو....."

آٹھ سال تک وہ اس قدر مشقت کی زندگی بسر کرتا رہا۔ اُسے اچھی طرح یاد ہے کہ ہر سال وہ ساہوکار کو بیس روپے ادا کیا کرتا تھا۔ اور اُسے یہ بھی یاد ہے کہ اس کے باپ نے کل ساڑھے بارہ بیسی قرض لئے تھے۔ اور اب پندرہ برس بعد بھی اُسے ساڑھے بارہ بیسی قرض ادا کرنا تھا۔ نہ معلوم کس طرح۔ ان ساہوکاروں کا حساب بھی نرالا ہے۔

آٹھ سال کے بعد مریاں کا بھائی پیدا ہوا۔ اگر مریاں چاند تھی تو یہ تارا تھا۔ اُس کی پیدائش پر اُس نے سمجھا کہ اُس کے بھاگ جاگ اُٹھے بیٹا ہی تو بوڑھے کی لاٹھی ہوتا ہے۔ اور کون جانے کہ یہ لاٹھی کتنی مضبوط ہوتی لیکن جب لاٹھی پکڑنے والا ہی نہ رہے گا تو کس کام کی یہ لاٹھی۔ اُس کے نہ رہنے سے شاید اس لاٹھی کو شروع سے ہی گھن لگ جائے یا ممکن ہے کہ اس پتلی سی بانس کی تیلی کو آندھی کا کوئی تند جھونکا ابھی سے اکھاڑ پھینکے۔ ہاں ممکن ہے اور بہت ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔

آٹھ سال کے بعد مریاں کا بھائی پیدا ہوا۔ گھر کا خرچ اور بھی بڑھ گیا۔ آخر کھانا تو سب نے تھا ہی۔ پیٹ باندھ کر کون بیٹھتا۔ ساہوکار کی سالانہ ادائیگی رُک گئی۔ ساہوکار کو جب کچھ نہ ملا تو وہ دانت دکھانے لگا۔ ہر سال فصل کے موقع پر اُسے دھمکیاں دیتا تھا لیکن وہ بھی تو مجبور تھا۔ ساہوکار کو کہاں سے دیتا۔ بیوی اور بچوں کا پیٹ کیسے کاٹتا۔ آخر پانچ ایکڑ زمین ہی تو تھی۔ اور اوپر سے جنگ کے دن۔ ان دنوں تو پیٹ پالنا بھی مشکل ہے۔

پانچ سال تک ساہوکار کو کچھ نہ ملا۔

اس دوران میں مریاں چودہ سال کی ہوگئی تھی۔ گویا اُس کے گھر میں پورا چاند نکل آیا تھا۔ مریاں بھی اپنی ماں کی طرح الھڑ تھی۔ اُس پر بھی گاؤں کے سب نوجوانوں کی آنکھیں تھیں۔ نمبردار کا لڑکا تو خاص طور پر اُس کے آگے پیچھے پھرتا تھا۔ لیکن وہ اپنی چاند سی مریاں کو کسی کو کیوں سونپتا۔ وہ تو ہمیشہ اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتا تھا۔ نمبردار کا لڑکا تھا تو ہوا کرے۔ مقدمے کے بعد تو اُس نے مریاں کی ماں کی بات تک نہ پوچھی تھی۔ مطلبی اور خود غرض! خود نمبردار بھی تو ایسا ہی تھا حانو کے مرنے کے بعد اُس نے اُس کی نوجوان بیوہ کی زندگی خراب کر دی۔ اور جب وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی تو نمبردار نے بھی آنکھیں پھیر لیں اب گاؤں والے اُسے پگلی کہتے ہیں اور کبھی کبھی اپنے بچے ہوئے ٹکڑے اُسے کھانے کے لئے بھی دے دیتے ہیں۔ مریاں نے ایسے باپ کے بیٹے کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔

پانچ سال بعد وہ دن اُسے اچھی طرح یاد تھا جب ساہوکار اُس کے گھر آیا تھا۔ اور اُسی وقت قرضہ بے باق کرنے کے لئے کہتا تھا۔ پہلے تو اُس نے بہت دھمکیاں دی تھیں لیکن بعد میں میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا تھا۔ اتنے میں مریاں پانی کا گھڑا اٹھائے دالان میں سے گذری تھی۔ اُسے دیکھ کر ساہوکار زیر لب مسکرایا تھا۔ وہ آہستہ سے کہتا تھا "سب قرضہ خود بخود بے باق ہو جائے گا۔ مگر ایک بار اِسے ہمارے ہاں بھیج دو بلکہ اگر کہو تو ......"

اُسے یاد ہے کہ یہ سُن کر اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا اور ساہوکار نے ابھی فقرہ مکمل بھی نہ کیا تھا کہ اُس نے اُسے گردن سے پکڑ کر اپنی پوری طاقت سے ایک گھونسا رسید کیا تھا۔ اور ساہوکار ایک ہی ضرب کھا کر زمین پر آ رہا تھا۔ اُس نے غصّے میں اُسے دالان سے باہر پھینک دیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد گاؤں کا چوکیدار، نمبردار اور کئی لوگ اُس کے گھر میں گھس آئے تھے اور کہتے تھے کہ اس نے ساہوکار کا خون کیا ہے۔ اب اُسے کیا معلوم تھا کہ ساہوکاروں کی جان اتنی ہی کمزور ہوتی ہے اور وہ ایک گھونسے سے مر جاتے ہیں۔ اور اُس نے بھی تو یونہی نہ مارا تھا۔ بلکہ پہل تو ساہوکار نے ہی کی تھی۔ وہ آج تک حیران ہے کہ یہ الفاظ کہنے کی اُسے جرأت کیسے ہوئی اگر وہ اُس کا گھر چھین لیتا۔ یا اُس کی زمین پر زبردستی قبضہ کر لیتا تو اُسے ہرگز اس قدر غصّہ نہ آتا۔ لیکن اُس نے مریاں کی طرف آنکھ اُٹھائی تھی۔ کیا اس کی پیاری مریاں اُس ربڑ کے غبارے کی طرح پھولی ہوئی توند والے ساہوکار.....

یہ سوچ کر اُس کی آنکھوں میں ایک بار پھر خون اتر آیا۔ اُس کی مٹھیاں خود بخود بھنچ گئیں۔ اور وہ اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ لیکن جب سامنے عدالت، ایک طرف اس کی بیوی اور بچے اور دوسری طرف سپاہیوں پر نگاہ پڑی تو وہ درخت سے ٹوٹی ہوئی ایک ٹہنی کی طرح دھم سے فرش پر گر پڑا۔

اب اُس کی آنکھوں کے سامنے نمبردار، چوکیدار، پولیس، اُس کی روتی ہوئی بیوی اور بلکتے ہوئے بچوں کی تصویریں پھرنے لگیں جب اُسے پولیس ہتھکڑی لگا کر جیل لے گئی تھی تو روتے روتے مریاں کی آنکھیں سُوج گئی تھیں۔ اور اس کے بعد کسی کو کیا معلوم کہ اُس نے کس طرح دن کاٹے ہوں۔ کتنی دُبلی ہو رہی ہے میری بچی مریاں.....

اُس نے مریاں کی طرف دیکھتے ہوئے دل میں کہا۔

جب وہ حوالات میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ تو مریاں کی ماں نے انتہائی کوشش کی تھی کہ پولیس اُس پر مقدمہ نہ بنائے۔ اُس نے اپنے زیورات تک بیچ کر پولیس کو دے دیئے تھے۔ لیکن پولیس نے آخر مقدمہ بنا ہی دیا تھا۔ مقابلہ بھی تو ساہوکار سے تھا۔ نہ جانے انہوں نے پولیس کو کتنا چڑھاوا چڑھایا ہو۔ لیکن مریاں کی ماں ان باتوں کو کیا سمجھے بے چاری سیدھی سادی گاؤں کی عورت۔ اُس نے تو اپنے گاؤں سے کبھی قدم بھی باہر نہ رکھا تھا۔

اور اب مقدمہ لڑنے کا بار بھی مریاں کی ماں کے سر پر ہی تھا۔ خدا جانے اس نے کس کس کی منت کر کے چالیس پچاس روپے اکٹھے کئے اور وکیل کو دیئے۔ لیکن وکیل تو پھر بھی سیدھے منہ بات نہ کرتا تھا۔ پچاس روپے تو اُسے صرف ایک دن مقدمہ لڑنے کے لئے درکار تھے۔ عجیب لوگ ہیں یہ وکیل بھی! خود غرض۔ ظالم اور بے رحم کوئی مرے یا جئے انہیں اس بات کی پروا نہیں انہیں تو صرف روپے سے غرض ہے۔ اُن کے آگے اگر ایک طرف کسی کا خون نکال کر رکھ دیا جائے اور دوسری طرف کچھ سنہری چمکتے ہوئے لوٹ تو وہ لوٹوں کو جیب میں رکھ لیں گے اور خون کے برتن کو اپنے چمکتے ہوئے بوٹ کی ٹھوکر سے نیچے گرا دیں گے اور پھر بھی کہیں گے۔ "بے وقوف گنوار دیہاتی نے بوٹ خراب کر دیا ہے۔ اب بوٹ کے دام تیرا باپ دے گا"!

لیکن مقدمے کی پیروی کرنی تھی۔ مریاں کی ماں کو غرض تھی۔ اُسے امید تھی کہ ان چند روپوں کے عوض وہ ان وکیلوں کے ذریعے انصاف کو خرید سکے گی۔ اُس نے باپ دادا کی پانچ ایکڑ کی زمین کا ٹکڑا بیچ ڈالا۔ کسان کے لئے زمین کو بیچنا اپنے گھر کو آگ لگا دینے کے مترادف ہے مریاں کی ماں نے اس کے گھر کو آگ لگا دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر گھر کا مالک آ گیا تو گھر پھر بن جائے گا اور اگر گھر کا مالک ہی نہ رہا تو وہ گھر کس کام کا۔ اُس نے مریاں کی ماں کو لاکھ سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ ایک نہ سنتی تھی۔ اُس نے زمین بیچ ڈالی۔ اور وکیل کی جیب گرم کر دی۔

اس کے بعد وکیل گویا ایک فرشتہ بن گیا تھا۔ کتنی امیدیں دلاتا تھا کہتا تھا کہ وہ صاف بچ جائے گا اور اس کا کوئی بال بھی بیکا نہ کر سکے گا۔ لیکن آج فیصلے کے دن جب اُس کی زندگی آخری مرحلے پر تھی۔ اُس نے شکل بھی تو نہیں دکھائی۔ اب بھلا وہ کیوں آئے گا۔ زمین بکی تو مریاں کی ماں کی۔ پھانسی لگے گی تو اُسے۔ اُس کے گھر تو گھی کے چراغ جلتے ہیں۔ اُس کی بیوی اور بچے تو آزاد پرندوں کی طرح چہچہا رہے ہیں۔ اُسے کسی سے کیا سروکار۔

اُس نے حاکم عدالت کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھا کہ وہ اُسے بلائے اور اُسے اس ذہنی کشمکش سے نجات دلائے۔ لیکن جج مشین کی طرح اپنے کام میں مصروف تھا۔ اُسے اس بات کا احساس بھی نہ تھا کہ کوئی اپنی زندگی کا آخری فیصلہ اُس کے منہ سے سننے کے لئے بے چین ہے۔

اُس نے ہتھکڑی سے جکڑے ہوئے ہاتھ اٹھا کر ایک انگڑائی لی اور سوچنے لگا۔

یہ جج بھی اُس کے گاؤں کی آٹا پیسنے والی مشین کی طرح ہے۔ یہ اپنے کاغذی فیصلوں سے ہر وقت قانون کو پیستا رہتا ہے۔ اور یہ قانون بھی ایک عجیب چیز ہے۔ کہتے ہیں۔ اس سے انصاف ہوتا ہے۔ نہ معلوم ان لوگوں کے نزدیک انصاف کے کیا معنی ہیں۔ بھلا اگر کوئی ایمانداری سے سوچے تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اُس کے جرم کا بدلہ اُس کی بیوی اور بچوں سے بھی لیا جائے۔ اگر اُس نے ساہوکار کا قتل کیا تھا تو اُسے بھی اسی وقت پھانسی پر چڑھا دیا جاتا۔ یا گولی سے اُڑا دیا جاتا۔ یہ قانون کا ڈھونگ رچانے کے کیا معنی۔ یہ وکیل۔ یہ عدالت۔ یہ پولیس۔ یہ جیل کی کالی کوٹھڑی — یہ سب کس لئے۔ کیا یہ سب اُس کی زمین اور اُس کی عورت کے زیور کھا جانے کے لئے چالیس تھیں! ایک ساہوکار کی موت پر ایک خاندان کو مٹا دینا کہاں کا انصاف ہے اُس کی بیوی اور بچوں کو گداگر بنا کر سڑک پر چھوڑ دینا کہاں کا عدل ہے۔ لیکن ہاں! اب سمجھا اگر یہ قانون کا ڈھونگ نہ رچایا جاتا تو وکیل کہاں سے کھاتا۔ پولیس کو چڑھاوے کہاں سے چڑھتے۔ عدالتوں کی تنخواہیں کہاں سے ملتیں۔ تو کیا ان سب کو پالنے کی ذمہ داری صرف اسی پر ہے۔ ایک پانچ ایکڑ کے معمولی کسان پر۔ کیا وہی ان سب کا رازق ہے لوگ تو کہتے ہیں کہ خدا سب کا رازق ہے۔ اب کہاں ہے خدا۔ کیا یہی اُس کی خدائی ہے اور یہی اُس کا انصاف۔

اُس کی دنیا تو اب ختم ہو چکی تھی۔ اُسے تو رسّی سے لٹکنے سے پہلے ہی پھانسی مل چکی تھی۔ عمر قید؟ عمر قید ہو گئی تو کیا۔ قبر اور جیل کی کوٹھڑی میں بھلا فرق ہی کیا ہے۔ بلکہ قبر میں تسکین تو حاصل ہو جاتی ہے۔ اور پھر اس کے لئے تو دونوں ایک برابر ہیں۔ عمر قید ہو یا پھانسی۔ مریاں کے لئے مریاں کی ماں کے لئے اور اپنے ننھے بیٹے کے لئے تو وہ دونوں صورتوں میں ایک لاش سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ دونوں صورتوں میں اُس کی بیوی اور بچے سڑک کے بھکاری بنیں گے اور وہ ان کے لئے کچھ نہ کر سکے گا۔ کچھ نہیں۔ وہ اُن کے لئے کچھ نہ کر سکے گا۔ اس کی بیوی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس کے بچے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مریاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سڑک۔

اس کے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ اُس کے دماغ میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اس کے جسم میں سوئیاں چبھنے لگیں۔ اور اسی حالت میں اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بالوں کو پکڑ لیا۔

عدالت کے چپڑاسی نے اس کا نام پکارا۔

سپاہیوں نے اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اس طرح اٹھایا جیسے کوئی لاش ہے اور عدالت کے سامنے لے گئے۔

نریندر ناتھ سیٹھ

تھرے رنگ، اکھری لہر

ماضی

اسی اک سوچ میں ہو جاتے تھے دن رات تمام
چشم پُر آب لئے
دل بےتاب لئے
عشق کے ساز کی مضراب لئے
میرے غم خانے میں بکھرائے ہوئے دوش پہ بال
آئے گی بھی نہیں؟

حال

اسی اک سوچ میں ہو جاتے ہیں دن رات تمام
کہ کبھی میرے خزاں دیدہ الم خانے میں
مسکراتی ہوئی جاں بخش بہار
اپنے دامن میں لئے خواب کی جنت کا قرار
آئے گی بھی کہ نہیں؟

مستقبل

اسی اک سوچ میں سب عمر گزر جائے گی
مرے ظلمتکدے میں نور مسرت کی کرن
لے کے پیغام یقین
یعنی اک وہم حسین
آئے گی بھی کہ نہیں؟

ع۔ ق۔ جاوید

یاد

ٹوٹے ہوئے تنکوں کا بناتا ہوں شبستاں
شاید کہ بیابان میں رہ جائے مری یاد
تا موسم نغمہ میں ترنم سے کے پچکاری
گلزار کی آزاد بہاروں کے لوازاد
اس رہ پہ کبھی مل کے کسی شام کو آئیں
جب آئے کہیں حسن مقدس کی نہیں یاد
اور گیت کے مسرور تبسم کے اثر سے
حیرت سے کریں وادئ غمگین کو آزاد
عبرت کا نشاں ہوں مرے مٹتے ہوئے نغمات
فردا کی فغاں ہو مرے امروز کی رُوداد

. . . . . .

امڈے ہوئے طوفان حوادث کے دنوں میں
اک چیخ سے سوتوں کو جگا دے مری فریاد
اور دیکھ سکے آنکھ سے تقدیر جہاں ہیں
اک گنبد سرکش پہ رواں تیشۂ فرہاد

فضل حسین کیفی

غزل

جو رویا ہے پھر ہنسا نہیں ہے
ایسا تو کبھی ہُوا نہیں ہے

انسان کی زندگی، نہ پوچھو
کیا کہیئے کہ کیا ہے کیا نہیں ہے

تھے عشق کا مُدّعا کبھی تم
اب کوئی بھی مدعا نہیں ہے

تم دل سے جدا ہو، ہم نے مانا
دل تم سے مگر جُدا نہیں ہے

مرنے پر نہیں ہے کوئی قابو
جینے کا کچھ آسرا نہیں ہے

انکارِ جفا جفا ہے لیکن
اقرارِ وفا وفا نہیں ہے

آنا ہے تو اب حریمِ دل میں
آجاؤ کہ دوسرا نہیں ہے

کچھ اپنے لئے بھی ہو تو جانیں
ہونے کو جہاں میں کیا نہیں ہے

دل عشق کی داد چاہتا ہے
اس درد کی کچھ دوا نہیں ہے

رونے سے ہوا یہ آج ظاہر
آنسو کوئی کام کا نہیں ہے

افسانہ مری تباہیوں کا
کچھ سرسری واقعہ نہیں ہے

سمجھا ہے یہ واقعاتِ غم سے
ہر انتہا انتہا نہیں ہے

آغازِ الم پہ ہنس رہا ہوں
انجام کا کچھ پتا نہیں ہے

جو شوق کی کشمکش نہ سمجھے
وہ رہنما رہنما نہیں ہے

چلئے گا ذرا سنبھل کے کوکبؔ
آسان رہِ وفا نہیں ہے

کوکبؔ شادانی

بے غیرت

اُس کے اور میرے درمیان کانٹے حائل تھے! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اُس تک نہیں پہنچ سکتی ہیں نے بہ مشکل شاخوں کو اِدھر اُدھر کیا۔ ان کے نوکیلے کانٹے میری باریک ساڑی میں پھنس گئے۔ خود میں بھی ان کانٹوں سے محفوظ نہ رہ سکی۔ تاہم میرا ہاتھ پھول تک پہنچ ہی گیا۔ یہ پھول اتنے کانٹوں کے درمیان پل رہا تھا!

..... ! قریب ہی سڑک پر کسی کے قہقہہ لگانے کی آواز آئی۔ وہ ہنسی جس میں خوشی کی جھلک تک معلوم نہ ہوتی تھی۔ بیچ میں درختوں کے آجانے سے سڑک صاف نظر نہیں آتی تھی۔ ایک آواز آئی۔ "تو تو ایسا خوش ہے جیسے سسرال جا رہا ہو!؟"

دوسری آواز نے کہا۔ "بے غیرت ہے بے غیرت! جگی پیتے پیتے عمر گذر گئی ..... مگر جب دیکھو"۔ ایک اور آواز بولتی ہوئی سنائی دی۔ "جمعدار جی، میں جانا چاہوں یا نہ چاہوں ــــ آپ ہی میری خاطر کرنے کے لئے لے جا رہے ہیں"۔ اور پھر وہی خشک ہنسی! آواز اگرچہ خشک موٹی اور بھاری سی تھی۔ مگر میرے کانوں کو کچھ آشنا سی لگی۔ سڑ سے کسی کو مارنے کی آواز آئی پھر "مار ڈالا ــــ مار ڈالا" کی صدا! میں نے بے چینی سے اپنی الجھی ہوئی ساری کو چھڑانے کی کوشش کی۔

"لے ہم تو یہ خاطر کرتے ہیں! ــ اور خاطر کریں۔؟ یہ لے! اور لے"۔

"ہائے۔ ہائے! ہائے! اب نہیں کہوں گا معاف کر دو! معاف کر دو۔ جمعدار"۔

"ہوں، معاف کر دو۔ ہم تو تجھے جیسے تیری نانی کے گھر لے جا رہے تھے"!

"ہاں معاف کر دو جمعدار! ــــ" وہی خشک قہقہہ!

اس کی ہڈیاں بھی چور چور کر ڈالو۔ تب بھی اس بے شرم کی ہنسی بند نہ ہوگی ــــ ارے! بیٹھ کیوں گیا؟ کھڑا ہو نا!"

"ارے بھئی، یاد نہیں۔ مہینہ بھر بھی تو نہیں گذرا جب جیلر صاحب نے اس کمبخت کو ہنسنے ہی پر مارتے مارتے بے ہوش کر دیا تھا ــــ مگر اس بے غیرت کی ہنسی ہوش میں آتے ہی شروع ہو گئی تھی ــــ

"کیوں رے بدمعاش! تجھے دنیا میں کسی چیز سے بھی غیرت آتی ہے!"

جواب ایک قہقہے نے دیا۔ وہی قہقہہ جس میں آواز تھی لیکن اثر نہ تھا۔

"اچھا کھڑا ہو اور چل! ــــ کبھی پھر خاطر کی جائے"۔

"یہ بے غیرت تو ایسا ہے کہ اگر پیٹتے پیٹتے اس کی ہڈی اور چمڑا بھی الگ الگ کر دیا جائے تو اس سؤر پر اثر نہ ہوگا"!

"آپ بازار میں ہتھکڑیاں پہن کر ایسے اکڑ اکڑ کے چلتے ہیں کہ کیا کوئی میونسپلٹی کا ممبر الیکشن جیتنے کے بعد جلوس میں چلتا ہوگا!"

"ابے کھڑا ہوتا ہے یا نہیں!؟"

وہی خشک ہنسی"۔ اچھا تو جمعدار مجھے اٹھا کر ہی رہو گے۔ لو میں کھڑا ہوا"۔

"کھڑے ہو رہے ہیں! دیکھا ین نہ بڑے لاٹ صاحب کے بچے"۔

پھر وہی ہنسی۔ "اب جمعدار، ہم لاٹ۔ بلکہ لاٹ کے بھی باوا۔ ہم کیا کسی سے ڈرتے ہیں؟ اوں، یہ ہتکڑیاں! ان کی اصل ہی کیا ہے! ڈر ہی کیا ہے؟ شرمائے وہ جس نے شرم کی ہو! ..... ہم! ہم ....!"

"ابے چلتا ہے یا نہیں! کبھی اور ماروں"؟ پھر پٹنے کی آواز آئی۔

"ارے جمعدار" وہی قہقہہ "میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی پڑی ہے۔ اور تمہارے میں ڈنڈا ہے ..... ذرا میرے ہاتھ کھولو تو تمہاری ساری اکڑ فوں نکال دوں! ــ بڑے آئے مارنے والے"!

سڑ سڑ پٹنے کی آواز آئی۔ میں ابھی تک اپنی ساڑی کو کانٹوں سے آزاد نہیں کر سکی تھی۔

وہی خشک آواز جس کو قہقہے کی بہ نسبت چیخ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

"ــــ لے مارلے! آئے ہیں بڑے مارنے والے! کوتوال کی

لائیں کھانی بھول گئے ...... سڑ سڑ کی آوازیں برابر آرہی تھیں۔

اُسی بھیانی ہوئی آواز نے پھر کہنا شروع کیا۔

"لے جتنا دل چاہے مار لے۔ جان ہی تو نکال لے گا! .....

بھتنے پر ہاتھ اُٹھاتے ہو! .... بڑے مرد بنے ہیں! ــــ وہ تو رات میں بے ہوش تھا تو پکڑ لیا۔ ورنہ اب کے تو ایسے چنے چبواتا کہ یاد کرتے بیٹا!"

"وہی قہقہہ ــــ

میں جلدی سے جھاڑی سے الگ ہو کر سڑک کی طرف بڑھی کہ دیکھوں یہ کون لوگ ہیں۔ باغ کی دیوار کے اوپر سے دیکھا کہ کچھ فاصلہ پر دو سپاہی غصے سے کھڑے زبان سے گالیاں دیتے ہوئے ہاتھوں سے ڈنڈے بلا رہے ہیں اور ایک آدمی ان کے غصے سے بے نیاز سڑک کے بیچ میں بیٹھا ہنس رہا ہے وہ پھر ہنسا۔ "مارو نا! رک کیوں گئے؟ بے فکری سے مارو ــــ میرے ہاتھ تو بندھے ہوئے ہیں ــــ"

ایک سپاہی غصے سے تھر تھراتے ہوئے بولا "چاہے مجھے پھانسی ہی ہو جائے ــــ مگر تجھے تو جان سے مار ڈالوں گا ــــ"

دوسرے سپاہی نے زور سے ڈنڈا رسید کرتے ہوئے کہا "کھڑا ہو! جلدی چل۔ ہم کوئی تیرے باوا کے نوکر ہیں؟ سیدھا سیدھا چل!"

"دیکھو۔ میں تو خود ہی چل رہا تھا۔ تم ہی نے بے فائدہ مارا ــــ اب تو میں چلتا نہیں۔" اُس کی نہ بند ہونے والی قہقہہ نما آواز پھر بلند ہوئی۔ ــــ "اپنی سسر کو اٹھا کر لے جاؤ۔" یہ جملہ پورا کر کے وہ پھر قہقہہ لگا بیٹھا۔

میرا دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب دھڑک دھڑک کر بند ہو جائے گا۔ اس کی صورت کچھ دیکھی ہوئی سی یاد پڑتی تھی!

سپاہیوں نے پہلے اس کے ڈنڈے مارے اور پھر ان دونوں نے اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر گھسیٹنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بالکل میرے سامنے سڑک پر آکر رک گئے۔ وہ اب بھی ہنس رہا تھا!

ایک سپاہی نے ڈنڈا اس کے سر پر مارا۔ خون نکلنے لگا۔ غیر ارادی طور پر میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کو پکڑنا بھی چاہا۔ منہ بند بھی کیا۔ مگر ــــ مگر چیخ انہوں نے سن لی۔ وہ لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے!

اس کی تلخ ہنسی بند ہو گئی۔ میں نے اس کو پہچان لیا!

"ارے کلو! ــــ تو نے اپنی یہ کیا حالت بنا لی؟" میں نے یوں ہی بے وقوفوں کا سا سوال کر ڈالا۔

"تم اس کو اتنی بے دردی سے کیوں مار رہے ہو؟"

"حضور اُٹھتا ہی نہیں ــــ"

"اس گدھے نے دق کر مارا!" دوسرے سپاہی نے جملہ مکمل کر دیا۔

کلو کچھ شرما سا گیا۔ بالکل اس ہی طرح جب اس کی ماں اس کو میرے سامنے کچھ شرارت کرنے پر مارا کرتی تھی۔ اور کہا کرتی تھی "میں بی بی کو منع کر دوں گی کہ تجھے اپنے ساتھ نہ کھلایا کریں ــــ" وہ میری انا تھی۔ اس کو یہ حق حاصل تھا کہ مجھے جس کے ساتھ دل چاہے کھیلنے دے اور جس سے دل چاہے منع کر دے ...... وہ آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ اپنے ہتکڑیوں سے جکڑے ہوئے ہاتھوں کو مجھ سے چھپا لے۔

اُس نے مجھ سے کچھ کہنا چاہا۔ مگر پھر خود ہی چپ ہو گیا اور بغیر نظر اٹھائے آگے، سپاہیوں سے بھی آگے چل دیا۔ اس کے قہقہے بند ہو گئے تھے۔ میں اس کو اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک کہ اور چیزیں میرے اور اس کے درمیان حائل نہ ہو گئیں۔ وہ سر جھکائے خاموش چلا جا رہا تھا!

سلطانہ قاضیہ

ٹیگور کے دو گیت

زندگی

نئے رنگ میں، نئے ڈھنگ سے آؤ، نت نئے رنگ میں آؤ۔

نت نئی سگندھ کو لاؤ

نت گیتوں میں گھل جاؤ

نت نئے رنگ میں آؤ، نت نئے ڈھنگ سے آؤ۔

نت نئی پون میں لہراؤ، نت دل کا سکھ بن جاؤ۔

نت نئے رنگ میں آؤ، نت نئے ڈھنگ سے،

سکھ سے بوجھل میرے نین

آؤ بن کر ان کا چین

آنکھوں میں بس جاؤ، نت نئے رنگ میں آؤ۔

تم دیا رُوپ

تم شانتی دھوپ

تم دل کے سکھ ہیں، دل کے دکھ ہیں

دونوں بھیس بھر لاؤ، نت نئے رنگ میں آؤ،

جیون کے ہر کام میں آؤ۔

آخری پل کے دام میں آؤ

گھونگٹ پٹ کو گراؤ اور جوبن رُوپ دکھاؤ۔

نت نئے رنگ میں، نئے ڈھنگ سے، نئے رنگ میں آؤ،

نت گیتوں میں گھل جاؤ

"م"

موت

ٹوٹے، بندھن ٹوٹ گئے،

رات کے سپنے چھوٹ گئے

ٹوٹے بندھن، ٹوٹ گئے۔

روح نہیں ہے بندھن میں

آیا میں جگ کے آنگن میں

سارے سپنے دل کے کنول کے پھوٹ پڑے، لو پھوٹ گئے

ٹوٹے، بندھن ٹوٹ گئے۔

صبح کی کرنیں بام فلک سے

مجھ تک ہیں سب ہاتھ بڑھائے

در زنداں کے ٹوٹ گئے

فتح کے نغمے پھوٹ گئے

ٹوٹے، بندھن ٹوٹ گئے

علی حسین جعفری

ردِّ عمل

دروازے پر انگلیوں سے گت لگ گئی اور کوئی آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔

"کون ہے" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ میں سمجھا شاید ہوٹل کا چھوکرا ہے گت رُک گئی۔ گنگناہٹ بند ہوگئی۔

میں نے کرسی پر لیٹ کر اوندھے رکھے ہوئے رسالے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

دروازے پر پھر انگلیاں چلنے لگیں اور پھر کوئی بھنبھنانے لگا۔

"کون ہے" میں نے پیار سے کہا۔ میں سمجھا شاید پڑوسن کی لڑکی زینب ہے۔ گت رُک گئی۔ گنگناہٹ بند ہوگئی۔

میں نے رسالہ ہاتھ میں اٹھا لیا۔

دروازے پر پھر انگلیاں چلنے لگیں۔ کوئی پھر گنگنانے لگا۔

"اوہ تم ہو فہیم! یار تم بھی عجیب آدمی ہو۔ میں سمجھا شاید وہ تھی زینو۔ تم جلتے ہی ہو اسے" میں نے اُٹھ کر چٹخنی کھولتے ہوئے کہا۔

اور دو سرخ اوڑھنیوں والے سر اندر جھانکنے لگے۔

"ارے! تو.... تو.... سروری۔ تو کہاں اس وقت آ گئی۔ تو سکول گئی تھی نا۔ کیا سکول سے بھاگ آئی!"

اوڑھنیوں کے پیچھے دانت نظر آنے لگے۔

"دانت نکالتی ہو۔ بتلاتی کیوں نہیں" میں اب بڑا بھائی بن چکا تھا۔

اوڑھنیوں کی آڑ میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا گیا۔

"اندر کیوں نہیں آتی" میں نے نئے چہرے کو بالکل نظر انداز کر رکھا تھا سروری مسکراتی ہوئی اندر چلی آئی اور کتابیں میز پر رکھ دیں

"آ جاؤ نا فہمی تم بھی اندر!" اور ایک سکڑا ہوا جسم بغل میں کتابیں دبائے اندر داخل ہوا۔

"بھائی آج ہمارے سکول میں چھٹی ہو گئی" سروری نے ذرا متانت اور لجاجت سے کہا۔

"کس بات کی چھٹی!"

"سکول کمیٹی کے ایک ممبر صاحب انتقال کر گئے۔ ہے نا فہمی!" سروری نے تصدیق چاہی۔ مگر وہاں ہنسی کے لئے دوپٹہ منہ میں دبا لیا گیا۔

"کمبخت تو خواہ مخواہ اپنی چھٹی کے لئے کسی بے چارے کی جان لے رہی ہے۔ بتاؤ تو کون تھے وہ ممبر صاحب!"

"میں ان کا نام بھول گئی!"

"اچھا تو میں ابھی جا کر ٹیلیفون پر پوچھتا ہوں" میں یونہی کرسی پر کروٹ بدل کر بوٹوں کے تسمے ٹٹولنے لگا۔

اوڑھنی کے پیچھے والے چہرے پر اضطراب دوڑ گیا۔

کاپی کی آڑ میں کچھ باتیں ایک دوسرے کے کان میں پھونکی گئیں۔ پھر سروری آہستہ آہستہ میرے پاس آ کر کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی اور پھر کایک میرے گلے میں باہیں ڈال کر کہنے لگی۔

"اچھا میں بتاؤں ہی بتاؤں!"

"پھر بتاتی کیوں نہیں"! میں نے شان قائم رکھتے ہوئے کہا۔

"اماں آج ماسی کے ہاں گئی ہیں نا! اس لئے میں آج فہمی کے ساتھ چھٹی لے کر آ گئی۔ ہمارے سکول کی نمائش کے لئے استانی نے مجھے ایک بیل کاڑھنے کے لئے دی ہے اور فہمی کو موتیوں کی چھوٹی سی ٹوکری بنانی ہے!"

"آنے دو اماں کو میں بتا دوں گا" میں نے ایک پھیکی سی آخری بھبکی دی۔

"نا بھائی وہ بگڑیں گی۔ میں تمہیں رومال پر نام کاڑھ دوں گی!"

"میرے دوست زینو کا بھی نام کاڑھ دے گی!"

"ہاں"

"ضرور!"

"ضرور!"

"لیکن بھائی تمہارے دوست کا نام تو لڑکیوں کا سا ہے۔ زینو! ہمارے سکول میں تو جس لڑکی کا نام زینب ہو۔ اسے بگاڑ کر زینو کہہ دیتے ہیں!"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بے خیالی میں کسی کا ہاتھ زخم پر جا لگے۔ میں نے بات بدل دی۔

"اچھا تو یہ تمہاری سہیلی ہیں فہمی! ان کا نام بھی کچھ بگڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ان کا اصلی نام کیا ہے؟"

"فہمیدہ"!

"ارے ہم تو اپنے دوستوں کے نام بھی کچھ اس طرح بگاڑتے ہیں کہ لڑکیوں کے نام ہی معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست ہیں فہیم۔ انہیں ہم سب فہمی کہتے ہیں!" میرا دل چاہا کاش کہ یہ صحیح ہوتا اور ہم فہیم کو فہمی ہی کہا کرتے۔

فہمی کی باریک اوڑھنی کا چہرے کا حصہ سرخ سے سرخ تر ہو گیا۔

اور تھوڑی دیر میں چٹائی پر موتیوں کی ڈھیری لگ گئی۔ رنگ برنگ کے کاڑھنے کے دھاگے ریلوں پر لپٹے ہوئے اِدھر اُدھر نظر آنے لگے۔ سرخ موتی بیر بہوٹیوں کی طرح چٹائی پر اِدھر اُدھر لڑھکنے لگے اور دو لڑکیاں ہاتھ میں سوئی دھاگا لئے چٹائی پر ننگے سر بیٹھی اپنے اپنے کام میں مصروف تھیں۔ اوڑھنیاں کہیں پڑی تھیں، کتابیں کہیں، اور وہ کہیں۔

مجھے فہمی کی محویت اور یہ بے تکلفی دیکھ کر تعجب ہوا آخر وہ ایک سکول کی لڑکی تھی۔ اور جب میں نے چائے منگائی تو ان دونوں نے پی۔ اس نے ذرا بھی تکلف ظاہر نہ کیا۔ اور جب فہمی کی انگلی میں سوئی چبھ گئی تو اس نے مجھ سے ہی اس پر پٹی بندھوالی۔ اس نے ذرا بھی غیریت نہ برتی۔

شام کو جب وہ اماں کے آنے سے پہلے پہلے گھر جانے لگی تو مجھے سلام کیا اور مسکرا کر کہنے لگی "میں بھی آپ کے دوست زینو کے لئے آپ کو ایک رومال کاڑھ دوں گی"۔ اس نے بھولے پن سے کہا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی میرے زخم پر آیوڈین لگا کر پھونک رہا ہو۔ وہ بے چاری کیا جانے، یہ تو میں بھی جانتا تھا لیکن زخم آخر زخم ہی ہوتا ہے۔

نمائش میں جب استانی نے اُن کی تعریف کی تو اُن کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں نے بھی انہیں مبارک باد کے ساتھ وہ سب کچھ انعام میں دے دیا جو میری جیب میں تھا۔ اتوار کے دن دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کے بعد بھی اگر کچھ جیب میں بچ جائے تو بڑی خوش نصیبی ہوتی ہے۔

سروری اور فہمیدہ نے بھی مجھے دو رومال کاڑھ کر دئیے۔ لیکن میں نے ایک پر اپنا نام اور دوسرے پر فہمی کا نام کاڑھوالیا۔ انہیں کہہ دیا کہ زینو کہیں گیا ہوا ہے۔ اس لئے میرے دوست فہیم جنہیں ہم فہمی کہتے ہیں ان کے لئے کاڑھ دو!

دل ہی تو ہے۔

فہمیدہ سروری کی بہت گہری سہیلی تھی۔ دونوں اکثر اپنی اسباقی مشکلات مجھ سے حل کروالیا کرتی تھیں۔ فہمیدہ ہمارے ہاں اکثر آنے جانے لگی تھی۔ اماں اس سے بہت محبت کرتیں۔ وہ ہم میں کچھ اس طرح گھل مل گئی تھی کہ وہ ہمارے خاندان کی ہی فرد معلوم ہوتی۔ میں انہیں اکثر سیر کے لئے لے جایا کرتا تھا۔ اور وہ میرے ساتھ سیر میں خوش بھی رہتیں۔ کیونکہ ان کی ہر کرید کا جواب مفصل طور پر دے دیا کرتا تھا۔

زینو میں بہت سی باتیں پیدا ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ ذرا مجھے کالی نظر آنے لگی تھی۔ وہ ذرا بھینگی بھی تھی۔ کچھ کچھ موٹی بھی تھی۔ قد بھی اس کا بہت لمبا تھا۔ یہ سب باتیں مختلف اوقات میں میں اماں کی زبانی سن چکا تھا۔ جن کا ذکر وہ میرے سامنے خاص طور پر یونہی کر دیا کرتی تھیں اور میں بھی ان باتوں کو دہرا کر انہیں یقین دلایا کرتا تھا اور ان کے خیال کے مطابق اس کی بدصورتی کو محسوس کرتا تھا۔ حالانکہ میں نے تو کبھی ان باتوں کو محسوس نہ کیا تھا۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ نقائص واقعی اس میں تھے یا کم از کم ان نقائص کی جڑ اس میں ضرور تھی۔ مبلغے کی ذمہ دار اپنی اولاد کی محافظ مامتا ہوتی ہے۔

زینو کے والد کچھ دنوں بعد مکان تبدیل کر کے چلے گئے۔ زینو کے چلے جانے پر مجھے اتنا رنج بھی تو نہ ہوا جتنا ایک بار اس کے لئے خریدے ہوئے ریشمی رومال کے گم ہو جانے پر ہوا تھا۔ جس پر اس کا نام بھی سروری نے کاڑھا ہوا تھا۔ اب اماں بھی مجھے زینو کی بدصورتی کا یقین دلانے کی ضرورت نہیں سمجھتی تھیں۔

دن گزرتے گئے۔ موسم بدلتے گئے۔ حالات بدلتے گئے۔ خیالات بدلتے گئے۔ کھیتوں میں مختلف موسموں میں مختلف فصلیں بوئی جاتی ہیں۔ پھر موسم بدلنے پر یا حالات بدلنے پر کاٹ لی جاتی ہیں۔ جوانوں کے دلوں میں مختلف اوقات میں مختلف آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں اور مختلف اوقات میں ناکام یا کامیاب ہو کر ختم ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ نئی آرزوئیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ زندگی یونہی بسر ہوتی ہے۔ انسان یونہی جیتا ہے۔

اگر اس کا مجھے پہلے احساس ہوتا تو مجھے اپنے سے بھی نفرت سی محسوس ہوتی۔ بھلا یہ بھی کبھی ممکن ہے لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ جب پہلی بار میں نے زینو کی بجائے فہمی کا نام رومال پر کاڑھوالیا تو اس وقت کوئی ننھی سی آرزو پیدا ہو چکی تھی۔ اگرچہ ابھی وہ آرزو بے زبان تھی۔ پھر جب میں نے زینو کے نقائص کو محسوس کیا تو یہ آرزو پہلی آرزو پر اس طرح چھا چکی تھی جس طرح ایک درخت پر دوسرا

اُگ آنے والا درخت چھا جاتا ہے۔ میں نے اس وقت بھی محسوس نہ کیا یا ذرا تساہل سے کام لیا۔ پھر جب زینو کے چلے جانے پر مجھے بالکل افسوس نہ ہُوا تو میں نے یہ محسوس کرنے کی تکلیف ہی گوارا نہ کی کہ ایک مردہ آرزو کے مزار سے دوسری آرزو جھانک رہی تھی۔ لیکن اب تو میں بے بس تھا حالات کو بدلنا تھا۔ بدل گئے۔ خیالات کو بدلنا تھا۔ بدل گئے۔ میں کیا کرتا جب کہ فہمی پہلے سے زیادہ حسین ہوتی جا رہی تھی اور اس کا کیا علاج کہ زینو کی جگہ فہمی نے لے لی تھی۔

سروری اور فہمی کا امتحان قریب تھا اور وہ کتابوں کے قریب تر ہو کر میرے قریب ترین ہو گئی تھیں۔ یہ میرا فرض تھا کہ انہیں امتحان کے لئے تیار کراتا۔ فہمی کے طرزِ عمل سے صاف ظاہر تھا کہ ان کے امتحان کی تیاری کے دوران میں اپنے جس امتحان کی میں تیاری کر رہا تھا۔ اس کا نتیجہ میرے حسبِ منشا ہوگا۔

یکم اپریل سے ان کا امتحان شروع تھا۔ اکتیس مارچ کو طالب علم کتابوں پر آخری حملہ کرتے ہیں۔ اس لئے یہ ذرا دیر پا ہوتا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ رات کے بارہ ایک بجے تک وہ جاگتی رہیں گی۔ وہ اکٹھی ہی مطالعہ کیا کرتی تھیں وہ جانتی تھیں کہ آج میں نے ایک بجے تک جاگنے کا ارادہ کر کے ان پر بڑا احسان کیا تھا تاکہ ان کی تمام اسباقی مشکلات حل کرا سکوں اور میں جانتا تھا کہ ایک طالب علم تو اس کتے کی بھی عزت کرے گا جس کے ذریعے اسے سوالات کے حل اور امتحان میں کامیابی کی امید ہو۔

آج دن بھر میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب میں فہمی سے کہوں گا پیاری فہمی! مجھے تم بہت بھلی معلوم ہوتی ہو۔ بہت پیاری معلوم ہوتی ہو۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ اور پھر چند ایک عشقیہ اشعار پڑھوں گا تو وہ مرعوب ہو جائے گی۔ میری عزت تو پہلے ہی کرتی ہے۔ لیکن اس کی باتوں سے اُس کی بے باکی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مجھے چاہتی ہے۔ پھر وہ آہستہ سے سر جھکائے ہوئے کہے گی۔ "مجھے بھی آپ سے محبت ہے" تو میں کہوں گا "مجھے آپ نہ کہو 'تم' کہو۔ وہ کہے گی۔ "مجھے تم سے محبت ہے"۔ ان الفاظ میں کتنی لطافت ہو گی۔ کتنی شیرینی ہو گی۔ میں دس گھنٹے پہلے ہی محسوس کر رہا تھا۔

اور رات کے سناٹے میں گیارہ بجے جب گھر میں سب سو چکے تھے اور ہم تینوں ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ میں نے سروری سے چائے گرم کرنے کے لئے کہا تو وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ تقریر کے الفاظ میرے دماغ میں گونجنے لگے۔ اب وہ ابل پڑنا چاہتے تھے۔ میرا نتیجہ ابھی ظاہر ہونے والا تھا اور میرا حال بالکل اس طالب علم کی طرح تھا جس کے سامنے نتیجے کا بورڈ لٹکا ہُوا ہو اور وہ جلدی جلدی اپنا نمبر تلاش کر رہا ہو۔ میرا سانس جلد جلد چلنے لگا۔ میں الفاظ کے سیلاب کے سامنے ہونٹوں کا بند باندھے ہوئے تھا۔ مگر سیلاب تھا کہ امڈا چلا آ رہا تھا۔ الفاظ میرے ذہن میں یوں گونج رہے تھے جیسے کوئی بیٹھا میرے دماغ میں زور زور سے چلا رہا ہو "مجھے تم سے محبت ہے! مجھے تم سے عشق ہے!! پیاری فہمی! میری فہمی!!" میں بے تاب ہو گیا۔ برداشت نہ کر سکا۔ میں نے عجیب سی آواز میں کہا۔

"فہمی!" میں اپنی آواز خود نہ پہچان سکا۔

"کیا ہے بھائی!" فہمی نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

مجھے یقین نہ آیا۔

میں نے پھر کہا "فہمی!"

"کچھ کہو گے بھی بھائی جان" فہمی نے بھولے پن سے کہا۔

"بھائی" ہمیل کررائی کے پلستر کی طرح میرے دماغ پر چپک گیا۔

اب میں اُسے کیا کہتا۔

وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اسے کیا معلوم کہ میں اس امتحان میں جس کی میں نے اتنی مدت سے تیاری کی تھی فیل ہو چکا تھا۔

مجھے خیال آیا زینو کتنی حسین تھی۔ کون آنکھوں والا اسے کالی اور بھینگی کہے گا۔

اسعد گیلانی

زندگی

میز پر، کرسی پہ، چھت پر جالے
در و دیوار پہ اِک گردِ سکوت،
آئینہ ماند ہے اُس کی حیرت
دامنِ خاک میں پوشیدہ ہے۔
فرش پر سہمی ہوئی خاموشی
میرے قدموں کی صدا سے اُٹھی۔
کس قدر صاف ہیں قدموں کے نشاں
جو مرے پیچھے چلے آتے ہیں۔
اس قدر گرد کہاں سے آئی؟
میز پر میری کتابوں کو تو دیکھ
نام بھی اِن کے نہیں پڑھ سکتا،
اِن پہ چمٹے ہوئے بے حس جالے۔
اُف! دریچے کا وہ پردہ لرزا
اور اک گرد کا طوفاں اُٹھا
مجھ کو آغوش میں لینے کے لئے۔

(۲)

سامنے دوسرے دروازے میں
دیکھ! ملتے ہیں جہاں دونوں کواڑ
ایک معصوم سی، چھوٹی سی ہے درز
جیسے ملتے ہوئے ہونٹوں کے خطوط۔
انہیں ہونٹوں سے چھنی آتی ہے
ایک خاموش سی دوشیزہ لکیر،
ایک آہن کی بھبھوکا چھپتی،
ایک جلتی ہوئی قندیل کی لَو
جس سے کمرے کی فضائے سادہ
ایک بے رنگ سا افسانہ بنی
خاکِ پروانہ نہیں اس لَو میں
ذرّے ہیں رقص کناں، چرخ زناں
ہر طرف بند ہیں خاموش کواڑ
اور پھر کمرے کی اس گرد کو دیکھ!

(۳)

تو نہیں سمجھی! — یہی درز تو ہے
جس سے چھنتے ہوئے ذرّات کا نور
فرش پر، میز پہ، دیواروں پر
ایک پردہ سا بچھا دیتا ہے۔
یہ زمیں اور نظامِ شمسی

انہیں ذرّات کا اک پرتو ہے
تو نہیں جانتی ! — یہ نرم سی خاک
یہی باریک ، ملائم ذرّے
کٹ کے سورج سے یہاں پہنچے ہیں
کرۂ ارض کی ترکیبِ وجود
ان کی خاموش اداکاری ہے
انہیں ذرّوں کا تصوّر ہے جہاں
انہیں ذرّوں سے بنی ہے دنیا
یہی تقدیرِ دوعالم ذرّے
جانے طے کر کے مسافت کتنی
میرے اس کمرے میں آ پہنچے ہیں

(۴)

گرد کا ڈھیر ہے ساری دنیا
ہر طرف گرد کے دَل بادل ہیں
میں یہاں سانس نہیں لے سکتا
دیکھ ! وہ پردۂ در لہرایا
درز کے ذرّوں نے لی انگڑائی
اور اک گرد کا طوفاں اٹھا
مجھ کو آغوش میں لینے کے لئے
تھام لے مجھ کو ، مجھے روک ، کہیں
انہیں ذرّوں میں ملا چاہتا ہوں۔

یوسف ظفر

ناکردہ گناہ

رہ رہ کر وہی خیال آتے ہیں۔

آج دن بھر بڑے زور کی بارش ہوتی رہی۔ مہینوں کی پیاسی زمین نے خوب جی کھول کر پانی پیا۔ بارش کی شدت دیکھ کر مجھے اپنی روح کی تشنگی یاد آنے لگی۔ لیکن میری روح کبھی سیراب نہیں ہوسکتی۔ اور اب میری روح کو سیراب کرے بھی کون۔ ساقی کو تو میں نے بڑی بے دردی سے گلا گھونٹ گھونٹ کر مار ڈالا ——— پھر وہی باتیں! ہاں تو خوب بارش ہوئی اور عرصے کے بعد جو بارش ہوئی تو اس خوشی میں درختوں نے آسمان نے زمین نے مکانوں نے۔ غرضکہ ہر چیز نے نیا لباس تبدیل کرلیا ہے۔ ہر چیز کیسی پیاری معلوم ہوتی ہے چاند نے بھی آج نیا سنہری لباس تبدیل کیا ہے ——— اُف کس قدر حسین رات ہے۔ حسین اور خاموش ——— خاموش اور حسین! ایک دفعہ پہلے بھی میں نے ایسی ہی حسین رات دیکھی تھی ——— نہیں نہیں یہ رات اُس کا مقابلہ نہیں کرسکتی وہ رات میری زندگی کی حسین ترین رات تھی۔ اب کوئی رات اُتنی حسین نہیں ہوسکتی ہاں البتہ کچھ باتوں میں یہ رات اُس سے مشابہ ضرور ہے۔ اُس رات بھی بارش نے درختوں کو آسمان کو اور زمین کو غسل دے کر نئے جوڑے پہنائے تھے۔ اُس رات بھی چاند اپنے سنہری لباس میں دولہا کی طرح آراستہ ہو کر نکلا تھا۔ اُس رات بھی چاند کے جلو میں بادلوں کی برات تھی!

بھائی جان کی شادی تھی۔ بارات کے آدمی کھانا کھا کر اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ بھائی جان کو ایک پُر تکلف کمرے میں لٹا دیا تھا۔ میں لڑکی والوں کی طرف سے انتظام کرتا پھر رہا تھا۔ شادی ہمارے ایک بہت ہی قریبی رشتہ دار کے یہاں تھی۔ اس لئے میں نے لڑکی والوں کی جانب سے خود کو کام کرنے کے لئے پیش کر دیا تھا۔ نہ میں بھائی صاحب کے ساتھ بیاہنے گیا تھا اور نہ دوسرے دن بہو کو وداع کرا کے ان کے ساتھ آیا۔ میں صبح ہی سے ماموں صاحب کے یہاں چلا گیا تھا اور انتظامات میں ان کا خوب ہاتھ بٹا رہا تھا۔ کام کے سلسلے میں مجھے بار بار مکان کے اندر جانا پڑتا تھا۔ ماموں جی باہر مردانے میں بیٹھے حکم دے رہے تھے اور میں اُن کے حکموں کی تعمیل کرتا تھا کبھی ان میں اور ممانی میں پیغام بر کے فرائض انجام دیتا جو ممانی کہتیں وہ آکر ماموں کو بتاتا اور جو ماموں جواب دیتے وہ جا کر ممانی سے کہتا۔ غرضکہ مجھے بار بار زنانخانے میں جانا ہوتا تھا۔ منور کو میں نے دیکھا تو پہلے بھی کئی مرتبہ تھا لیکن اس روز وہ بہن کی شادی میں کچھ ایسی بن رہی تھی کہ کیا کہوں ——— وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ ہر کام کے مشورے میں شامل ہوتی تھی اس لئے مجھے سارا دن اُس سے بھی براہ راست یا ممانی کی معرفت باتیں کرنی پڑیں۔ شام ہوئی تو بڑے زور کی گھٹا آگئی اور وہ چھاجوں مینہ برسا کہ ہم تنگ آکر بارش بند ہونے کی دعائیں مانگنے لگے اور جب بارش تھم گئی تو عجیب پر لطف سماں ہوگیا اور ایک ایسی بات بھی ہوگئی جس سے مجھے اور منور کو اور زیادہ ملنے اور باتیں کرنے کا موقع ملنے لگا۔ ممانی کسی کام سے باہر نکلیں تو اُن کا پاؤں پھسل گیا۔ بے چاری بری طرح گریں۔ عورتوں نے ہاتھوں ہاتھ اٹھا کر انہیں کمرے میں پہنچایا اور اب جو کچھ انہیں کہنا ہو وہ منور سے کہیں منور مجھے آکر بتائے اور میں اگر خود کرسکتا ہوں تو فوراً وہ کام کر دوں نہیں تو ماموں جی کی خدمت میں عرض کروں۔ بارات وغیرہ سے فارغ ہو کر اندر کھانا بھجوایا اور جو جو منور مجھے ہدائتیں دیتی رہی اُس پر عمل کرتا رہا۔ پھر بعض عورتوں کے لئے ان کے گھر جانے کا انتظام کرنا تھا۔ ان سب کاموں میں ہمیں یہ دیکھنے کا وقت ہی نہیں ملا کہ رات کیسی حسین ہے اور چودھویں کا چاند نئے کپڑے پہن کر شادی میں شریک ہونے آیا ہے۔ پھر اتفاق ایسا ہوا کہ ممانی کو ایک دورہ پڑ گیا جو اکثر انہیں پڑتا تھا۔ منور گھبرائی ہوئی آئی اور مجھ سے کہا کہ جلدی سے ڈاکٹر کو بلا کر لاؤ۔

جب ڈاکٹر دوا دے کر گیا تو ایک بج چکا تھا۔ مہمان عورتیں کچھ اپنے گھر چلی گئی تھیں اور کچھ اپنے اپنے بستروں میں لیٹی نیند کے مزے لے رہی تھیں نانی دو ایک اور رشتہ دار عورتیں، منور اور میں ممانی کے پلنگ کے قریب بیٹھے تھے کہ نانی نے کمال مادرانہ شفقت سے کہا۔

"بشیر تُو نے کھانا بھی کھایا؟"

"نہیں نانی اماں ——— لیکن ابھی جلدی بھی کیا ہے۔ ممانی کو آرام ہو جائے گا تو کھا لوں گا"

"منور جاؤ بھائی کو کھانا کھلاؤ۔ بے چارہ صبح سے ایک ٹانگ کے بل

پھر رہا ہے"۔

منور نے نانی کے حکم پر میری طرف ایک نظر دیکھا۔ پھر نگاہ نیچی کر کے چپ چاپ اٹھی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں نے اس کے بدلے میں نانی جان کی طرف دیکھا اور چپ چاپ منور کے پیچھے چل دیا۔

منور نے مجھے کھانا نکال کر دیا اور خود پانی لینے چلی گئی۔ پانی لے کر آئی تو بولی۔

"ارے ـــــ ابھی تم نے شروع ہی نہیں کیا۔ کھاؤ!"

اور پھر

"کھاؤ نا!"

میں نے کہا "تم بھی آؤ!"

کہنے لگی "نہیں میرا کھانا مناسب نہیں۔ تم کھاؤ میں بعد میں کھا لوں گی"۔

"تو میں بھی نہیں کھاتا"

"میں کہہ رہی ہوں تم کھاؤ میں بعد میں کھا لوں گی"۔

میں کچھ نہیں بولا اسی طرح بیٹھا رہا تو اس نے پھر کہا

"کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا"

"کہے گا کیا۔ یہی کہ بہن بھائی ایک ساتھ کھانا کھا رہے تھے اور یہ کوئی گناہ نہیں"۔

"تم ہو بڑے شریر!"

اُسے کچھ اور جواب بن نہ پڑا۔ آ کر میرے ساتھ کھانے بیٹھ گئی۔

اُس کی نظریں کھانے پر تھیں اور میری اُس کے خوبصورت چہرے پر۔ سنہری چاندنی میں اُس کا سنہری چہرہ اور زیادہ سنہری ہو گیا تھا۔

میں نے کہا۔

"ایک بات کہوں منور ـــــ برا تو نہ مانو گی"؟

"باتیں نہ کرو۔ جلدی جلدی کھانا کھا لو۔ اماں جان کی طبیعت اب خبر نہیں کیسی ہو"۔

"دورے کا زور تو پہلے ہی کم ہو گیا تھا اور اب ڈاکٹر دوا دے کر گیا ہے خدا کرے گا تو بالکل آرام ہو جائے گا"

اور اُس نے کہا۔

"ہاں میں نے سنا تھا کہ تمہیں زردہ بہت مرغوب ہے۔ کہو تو اور نکال لاؤں"۔

"نہیں نہیں زردے کی ضرورت نہیں۔ کیا کہہ رہا تھا میں؟ ایک بات کہوں منور برا تو نہ مانو گی"؟

اُس نے کچھ جواب نہ دیا۔

میں نے کہا۔

"منور! تمہیں مجھ پر اتنا بھی اعتماد نہیں کیا میں خدا نہ کرے کوئی ایسی ویسی بات کہتا"۔

"ایسی ویسی بات نہ تھی تو تمہیں میری ناراضی کا خیال ہی کیوں آیا"؟

اس مرتبہ میں چپ ہو گیا۔ واقعی اُس نے درست کہا تھا۔ اگر بات ایسی ویسی نہ تھی تو اُس میں اُس کی ناراضی کا خیال ہی نہ آنا چاہیئے تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے پھر کہا۔

"منور ـــــ"

اُس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ہماری آنکھیں ملیں میں نے پھر کہا۔

"منور ـــــ"

"کچھ فرمایئے بھی!"

میں نے کہا۔

"آج کیسی اچھی رات ہے"۔

جواب دینے کی بجائے وہ نظریں اٹھا کر چاند کی طرف دیکھنے لگی۔ اور اُس کی یہ ادا میرے دل میں کھُب ہی تو گئی۔ میں نے بے خود سا ہو کر پھر کہا۔

"آج کیسی حسین رات ہے منور!"

"ہاں ہے تو سہی" اُس نے اُسی طرح چاند پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

"تمہاری موجودگی نے اسے اور بھی زیادہ حسین بنا دیا ہے"۔

اس نے نیچی نظر کر کے کہا۔

"میری موجودگی نے یا تمہاری!"

"منو! او منور!" نانی جان کی آواز آئی۔

اور منور جلدی سے تولئے سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی بھاگ گئی۔

. . . .

اس واقعے کو دو برس گذر گئے۔

بھائی جان کے ایک لڑکا ہوا اور چل بسا۔ پھر ایک لڑکی ہوئی، اور اس مرتبہ اُن کی بیوی چل بسیں۔ یہ دو برس میرے لئے عجیب قسم کی روحانی مسرتوں میں بسر ہوئے۔ منور خیالوں میں بسی رہی۔ کالج میں میرے دو ہی شغل تھے کتابوں کا مطالعہ اور منور کی یاد۔ منور کی یاد اور کتابوں کا مطالعہ۔ ساری عمر

میں کبھی ماموں کو خط نہ لکھتا تھا لیکن بھائی کی شادی والی رات کے بعد سے میں نے انہیں خط لکھنے شروع کر دیئے اور پھر مسلسل لکھتا رہا۔ اور انہوں نے بھی کبھی جواب میں کوتاہی نہیں کی۔ اُن کا خط پڑھ کر مجھے کتنی خوشی ہوتی تھی اب کیا بیان کروں۔ خط میں کہیں نہ کہیں منّور کا ذکر ضرور ہوتا تھا اور اُس کے ذکر کے لئے تو میں انہیں خط لکھتا تھا۔ ایک مرتبہ ماموں گھر سے کہیں باہر گئے ہوئے تھے تو منّور اور بھابی نے میرے خط کا جواب دیا۔ بھابی نے لکھنا شروع کیا اور آدھا لکھ کر چھوڑ دیا۔ باقی نصف منّور نے ختم کیا۔ میں نے منّور کے لکھے ہوئے حصے کو کئی بار پڑھا۔ کیسے بے ساختہ جملے تھے اور اُن میں نادانستہ طور پر وہ اپنے دل کی کیفیت بیان کر گئی تھی۔ اور یہ کیفیت معلوم کرنے کے لئے میں بہت بیتاب تھا۔

بھابی کی موت کے بعد پھر بھائی جان کی شادی کا سوال پیش آیا۔ کئی لڑکیوں کے نام لئے گئے اور مسترد کر دیئے گئے۔ ایک روز میں اور وہ سیر کو گئے تھے کہ واپسی میں انہوں نے اچانک مجھ سے پوچھا۔

"بشیر کیا تجھے منّور سے کوئی خاص محبت ہے؟"

مجھے اُن کے سوال سے سخت حیرت ہوئی۔

میں نے دبی زبان سے کہا۔

"خاص محبت کیا؟ —— بس ایسی ہی ہے جیسی کہ ماموں زاد بہن سے ہوتی ہے۔"

میرے جواب سے شاید اُن کی تسلّی نہیں ہوئی۔ کہنے لگے۔

"خوب سوچ کر بتا۔"

میں سوچنے لگا کہ کیا بات ہے۔ انہیں میری کس بات سے شبہ ہوا کہ میں منّور سے خاص محبت کرتا ہوں۔ پہلے تو جی میں آیا کہ اصل بات بتا دوں پھر یہ سمجھ کر کہ بڑے بھائی کے سامنے محبت کا اعتراف بے ادبی میں داخل ہو گا خاموش ہو رہا۔

انہوں نے پھر کہا۔

"بے تکلف بتا دے۔ کسی قسم کی شرم یا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا

میں عرض کر چکا ہوں کہ بس ایسی ہی محبت ہے جیسی کہ ماموں زاد بہن سے ہوتی ہے۔"

اُس کے بعد راستے میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔

لیکن مجھے دھڑکا سا لگا رہا۔ رات کو چارپائی پر لیٹ کر بھی یہی سوچتا رہا۔

کہ بھائی جان نے یہ کیوں پوچھا۔ آخر اُن کا مطلب کیا تھا۔ سوچتا رہا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آسکی۔

یہی سوچ رہا تھا کہ بھائی جان اور والدہ کی باتوں نے میری توجہ اپنی طرف منعطف کر لی۔ وہ شاید یہ سمجھ رہے تھے کہ میں سو گیا ہوں۔

بھائی بولے

"آج شام میں نے بشیر سے پوچھ لیا ہے وہ کہتا ہے کہ اُسے منّور سے کوئی خاص محبت نہیں۔"

اماں نے جواب دیا

"شاید اُس نے تمہارے لحاظ سے انکار کر دیا ہو ورنہ میرے خیال میں تو وہ منّور کو خط لکھتا رہا ہے۔ یہاں کا خط ناغہ ہو جائے تو ہو جائے۔ لیکن اُن کے یہاں ہر ہفتہ ضرور خط آتا تھا۔"

بھائی نے کہا

"نہیں میں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ بالکل بے تکلّف بتاؤ۔ اور خط تو وہ ماموں کو لکھتا تھا۔ ممتاز نے اس کے کئی خط پڑھے تھے۔ ان میں تو منّور کا ذکر تک بھی نہ ہوتا تھا۔ وہی کالج کے قصّے اور بس!"

اماں بولیں

"ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن میں تو یہی سمجھتی ہوں —— اور منّور بھی ہر وقت بشیر ہی کی باتیں کرتی رہتی ہے۔"

بھائی بولے

"اماں آپ یہ خیال نہیں کرتیں کہ کوئی اور لڑکی آئی تو میری سعدیہ رُل جائے گی۔ منّور کو جتنی محبّت سعدیہ سے ہو گی کسی اور کو نہیں ہو سکتی۔"

اماں نے گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا میں کل بھائی سے ذکر کر دوں گی۔"

کچھ دیر کے بعد وہ دونوں تو سو گئے لیکن مجھے نیند نہیں آئی۔ تمام رات پڑا کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا کہ اے خدا یہ کیا ہو رہا ہے۔ سعدیہ کے آرام کے خیال کے لئے میری زندگی کیوں تباہ کی جا رہی ہے۔ لیکن اس میں کسی کی کیا خطا۔ بھائی نے کل پوچھا تو میں نے اعتراف کیوں نہ کر لیا۔ ساری خطا میری ہی ہے۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ دوسرے دن اماں سے صاف صاف کہہ دوں گا۔

لیکن جب کہنے لگا تو صرف اتنا کہہ سکا۔

"اماں یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ منّور منسوب تو مجھ سے کی گئی تھی

گو یہ بھی درست ہے کہ اس بات کی کوئی رسم ادا نہیں کی گئی لیکن آخر آپ لوگوں کے دلوں میں یہی خیال تھا اور آپ اُس کی شادی کر دیں بھائی جان سے۔"

شام کو بھائی جان نے سیر میں پھر ذکر چھیڑ دیا۔

"بشیر یہ ہے تو شرم کی بات میں بڑا بھائی ہو کر ایسی باتیں کروں۔ لیکن میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں ——— مجھے منوّر سے بہت زیادہ اُنس ہے اور اس لئے میں چاہتا ہوں کہ وہ میرے عقد میں آجائے اور پھر سعدیہ کا بھی خیال ہے اور کل تم کہہ چکے ہو کہ تمہیں اُس سے کوئی خاص محبت نہیں ہے۔"

جی میں آیا کہ کہوں

"بھائی جان میں شرم کی وجہ سے نہ بتا سکا ورنہ منوّر سے جتنی محبت مجھے ہے آپ کو نہیں ہو سکتی اور پھر منوّر بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ آپ کو پسند نہیں کر سکتی۔ وہ نہایت نازک مزاج لڑکی ہے اور آپ فوج کے اکھڑ افسر۔"

لیکن میں کچھ نہ کہہ سکا۔

اُنہوں نے پھر کہا۔

"اگر تجھے اس سے محبت ہے تو صاف کہہ دے۔ ورنہ صرف اس بات کا خیال کرنا کوئی عقلمندی نہیں کہ سب کا خیال تم سے شادی کرنے کا تھا۔ ہم تمہیں اُس سے ہزار درجے اچھی بہو لا دیں گے۔ اور ابھی تمہاری شادی بھی تو نہیں کرنی۔ ابھی تکمیلِ تعلیم کے لئے تمہیں ولایت جانا ہے اور منوّر ماشاء اللہ جوان ہو گئی ہے۔"

وہ کہتے رہے اور میں سنتا رہا۔ ہاں میں سنتا رہا۔ اور وہ کہتے رہے۔ طرح طرح سے انہوں نے اپنے حق جتائے اور اپنی فضیلت بیان فرمائی۔ اور بالآخر میں نے کہہ دیا کہ آپ شوق سے اُس سے شادی کر لیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ زبان سے تو میں نے انہیں اس کی اجازت دے دی تھی لیکن دل میں چالیس سوچ رہا تھا کہ جن سے ان کی خواہش کو پورا نہ ہونے دوں۔ آہ کاش میں اُس وقت اُن سے کہہ دیتا کہ مجھے منوّر سے اچھی بیوی نہیں چاہیئے میں دنیا میں صرف منوّر کی رفاقت چاہتا ہوں۔ اور بس۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو خیر نہیں میں کیا کر بیٹھوں گا۔ لیکن اب سوچتا ہوں کہ اگر میں یہ سب کچھ کہہ دیتا تو کیا وہ اپنے اس خیال سے باز آجاتے۔ یہ بات تو اُن کے کیریکٹر میں داخل ہے کہ جس چیز کو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اُسے حاصل ہی کر کے چھوڑتے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ میں ممانی اور ماموں سے کہہ کر انکار کرا دوں گا۔ لیکن میں ابھی اُن کے پاس جانے بھی نہ پایا تھا کہ بھائی جان اماں کو لے کر رات ہی کو پہنچ گئے۔ آخر ان لوگوں کو کیا انکار ہو سکتا تھا۔

دوسرے دن مجھے منوّر کا خط ملا۔ خط کیا تھا کاغذ کے ایک چھوٹے سے پرزے پر دو چار پریشان سے جملے لکھے تھے۔ "میں لڑکی ہوں اس معاملے میں میرا زبان ہلانا اگر دن زدنی قرار دیا جائے گا۔ لیکن آپ تو مرد ہیں آپ کو کس بات کا خوف ہے۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ خاموش کیوں ہیں"!

مجھے پہلے ہی بہت زیادہ رنج ہو رہا تھا۔ منوّر کے خط سے اُس میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔ لیکن صرف رنج کرنے سے کیا حاصل۔ جب کہ رنج کی وجہ کو دُور کرنے کی کوشش نہ کی جائے اور کوشش کرنے کے میں بالکل ناقابل تھا۔ اوّل تو اس کا وقت گذر چکا تھا۔ دوسرے میں انتہا سے زیادہ شرمیلا تھا۔ اماں کے سامنے بھی منوّر کا ذکر کرتے ہوئے مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسا کہ دل آکر حلق میں اٹک گیا ہو۔ اور بھائی جان سے تو میں کہتا ہی کیا۔ بہرحال مجھے اس بات پر ناراضگی کا اظہار ضرور کرنا تھا۔ لہٰذا دوسرے دن گو ابھی کالج کھلنے میں تین ہفتے باقی تھے میں محنت کرنے کے بہانے منوّر کو اُس کے غم میں تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔

ہوسٹل میں بھی دل نہ لگا۔ گو چند ایک طالب علم وہاں مجھ سے پہلے موجود تھے لیکن ان کی صحبت بھی میرے دل کا بار ہلکا نہ کر سکی۔ میں چاہتا تھا کہ منوّر کو بھول جاؤں لیکن قدرت کی اس ستم ظریفی کا کیا کرتا کہ جتنا میں اسے بھولنے کی کوشش کرتا تھا۔ اتنی ہی زیادہ شدّت کے ساتھ وہ مجھے یاد آنے لگتی تھی۔ بھائی کی شادی کے بعد سے میں نے ماموں کو خط لکھنے شروع کئے تھے۔ اور بھائی کی منگنی کے بعد ختم کر دیئے۔ ان کے دو ایک خط بھی آئے جن میں منوّر کی ناسازیٔ طبع کا ذکر بھی تھا لیکن میں نے جواب نہیں دیا۔ اب میں اُن کے خطوں میں منوّر کا ذکر پڑھنا نہ چاہتا تھا۔ لیکن شاید میں خود کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ورنہ منوّر کا ذکر میرے لئے بہترین خوشی کا باعث تھا۔

کالج کھلنے پر ممکن تھا کہ لڑکوں کی چہل پہل سے میرا غم کچھ کم ہو جاتا مگر عین جس دن کالج کھلا۔ اُس دن منوّر کا خط آگیا۔ اُس نے میری خاموشی پر اظہارِ افسوس کیا تھا اور لکھا تھا کہ جو کچھ ہو گیا ہے۔ اُس میں میری کیا خطا ہے۔ پھر آپ مجھ سے ناراض کیوں ہو گئے جو اپنی خیریت کی خبر سے بھی محروم رکھنے لگے۔ میں دل سے چاہتی ہوں کہ ایسا نہ ہو لیکن مجبور انسان کو مشیت کے آگے دم مارنے کی اجازت ہی کہاں ہے۔ اس کا خط پڑھ کر دل کا رہا سہا اطمینان بھی جاتا رہا۔ میں نے لاہور آتے ہی پرنسپل صاحب سے ایک خط ولایت لکھوا دیا تھا کہ وہ مجھے کالج میں لے لیں۔ یہ خط میں نے ہوائی جہاز سے بھیجا تھا۔ میں دعائیں مانگنے لگا کہ وہ داخل ہونے کی اجازت دے دیں۔ منوّر کا خط پڑھنے کے بعد میں اُس سے اتنا دُور چلا جانا چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے مایوس ہو کر میرا خیال چھوڑ بیٹھے اور خوش رہنے لگے۔ خدا خدا

کہ کے ولایت سے جواب آیا اور آیا بھی حسب منشا۔

میں نے فوراً ابا جی اور بھائی جان کو تار دے دیئے کہ میں نے ولایت داخلے کے لئے عرضی بھیجی تھی وہ منظور ہو گئی ہے۔ میں گھر جا رہا ہوں آپ بھی پہنچئے اور کچھ اسی مضمون کا ایک تار والدہ کو بھی دے دیا۔

جہاز روانہ ہونے میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا میں نے تھامس کک اینڈ سنز کے یہاں ایک جگہ ریزرو کرا لی اور دو ایک دن اور لاہور ہی میں گذار دیئے میرا ارادہ وطن میں صرف ایک ہی دن ٹھہرنے کا تھا۔

گھر پہنچا تو والد۔ بھائی جان تشریف لا چکے تھے۔ اور خلاف معمول بہت زیادہ رونق تھی۔ والدہ نے بتایا کہ تمہاری وجہ سے ہم نے منور کا بیاہ جلدی لے لیا ہے۔ وہ تو ابھی راضی نہ ہوتے تھے۔ منور بھی کچھ دنوں سے بیمار سی ہے لیکن میں نے کہا کہ پھر خبر نہیں میرا بشیر کب آئے۔ میں اُس کے سامنے ہی بیاہ کر دوں گی

انہوں نے ایسا کہا تو تھا اپنی مامتا کی وجہ سے لیکن نادانستہ طور پر میرے لئے ایک اور مصیبت کھڑی کر دی تھی۔ میں نے گھبرا کر کہا کہ میں کل رات کی گاڑی سے چلا جاؤں گا"۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ کالے کوسوں دور سمندر پار جا رہے ہو اور میرے پاس چند دن بھی نہ ٹھہرو"۔

دوسرا دن بڑی مصروفیتوں کا دن تھا۔ سفر کا سامان درست کرنا۔ عزیز و اقارب سے رخصت ہونا۔ اور یہ تو میں فیصلہ ہی نہ کر سکا تھا کہ آیا ممانی کے یہاں بھی جاؤں یا نہ جاؤں۔

اماں کو اس بات کا بڑا رنج تھا کہ میں بہت جلد جا رہا ہوں اور وہ تو مجھے بھیجنا ہی نہ چاہتی تھیں اور پھر یہ کہ میں بھائی کی شادی ہوئے بغیر جا رہا تھا۔

شام تک میں یہی تجویزیں سوچتا رہا کہ کسی طرح ممانی ہی ہمارے یہاں آ کر مل جائیں۔ در اصل میں منور کے سامنے نہ ہونا چاہتا تھا۔ گو دل میں ایک آگ سی لگ رہی تھی کہ جاتے جاتے تو اُسے ایک نظر دیکھ جاؤں لیکن پھر اُس کے خطوں کا خیال آتا تھا اور اس کی شکایت کا خیال آ جاتا تھا۔ یہ درست تھا کہ وہ زبان سے کچھ نہ کہتی۔ لیکن اُس کی نظریں شکوہ و شکایت سے مملو نظریں برداشت کرنے کی طاقت کس میں تھی۔ گاڑی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ والدہ اس بات پر بضد تھیں کہ میں کم سے کم دو دن اور اُن کے پاس ٹھہروں۔ آخر والد نے انہیں سمجھایا تو وہ راضی ہوئیں۔ اور ادھر والد نے مجھ سے فرمایا کہ آج شام کی بجائے کل صبح کو چلے جانا۔ میں چپ ہو گیا۔ اُن کے ارشاد کے آگے میں کبھی دم نہ مارتا تھا اور انہوں نے کبھی ایسی بات ہی نہیں کہی تھی جس میں انکار کرنے کی گنجائش ہوتی۔ جانے کے متعلق فیصلہ ہُوا تو بہن نے پوچھا کہ ممانی کو بھی مل آئے۔ میں نے کہا "نہیں" کہنے لگیں "وہ اپنے دل میں کیا کہیں گی کہ بشیر سب رشتہ داروں سے مل کر گئے۔ اگر نہیں آئے تو ہمارے ہی یہاں نہیں آئے" میں نے کہا "اب رات تو ہونے والی ہے وہ خود یہاں آ جائیں گی"۔

"یہ بھی کہیں ہوتا ہے ——— اور یوں تو سبھی عورتیں آ جائیں"۔

کچھ دیر کے بعد پھر بولیں

"اور ممانی تو آ جائیں گی لیکن منور ———"

منور کا نام سن کر میرے سارے بدن میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ میں نے انہیں گہری تیز نظروں سے دیکھا کہ یہ کیا کہہ رہی ہیں اسے مجھے یاد آیا کہ ابھی ابھی ممانی کی خادمہ آئی تھی وہ تو مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔

بہن کی بات کا یہ اثر ہُوا کہ میں مغرب کی نماز کے بعد ماموں کے یہاں چلا ہی گیا۔ ممانی جانماز پر بیٹھی دعا مانگ رہی تھیں اور منور اُن سے کچھ فاصلے پر کرسی پر بیٹھی کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی۔ میں نے ممانی کو سلام کیا تو انہوں نے اٹھ کر مجھے گلے سے لگا لیا اور خیریت سے واپس آنے کی دعائیں دینے لگیں۔ منور میری آواز سن کر ایک دم کھڑی ہو گئی اور اسی طرح ہماری طرف پشت کئے کھڑی رہی۔ ممانی نے کہا۔

"یوں پیٹھ موڑ کر کیوں کھڑی ہو گئی۔ یہاں آ ——— بھائی ملنے آیا ہے"۔

منور نیچی نظر کئے نہایت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی آئی اور آ کر ممانی کے قریب نماز کی چوکی پر بیٹھ گئی۔

ممانی سمندر کی باتیں کرتی رہیں۔ وہ ماموں کے ساتھ کچھ دنوں کراچی رہ آئی تھیں۔ لیکن منور کچھ نہیں بولی۔ میں بھی بہت کم بولا بس ممانی باتیں کرتی رہیں۔ میں ہُنکارے دیتا رہا اور منور خاموش بیٹھی رہی۔ زمین پر نظریں جمائے اُس کے ہاتھ میں "کہکشاں" کا تازہ پرچہ تھا جس میں میرا افسانہ "مایوس" نکلا تھا۔

پھر ممانی کو خبر نہیں کیا سوجھی کہ اچانک باتوں کا رُخ بدل دیا۔

"بشیر ——— ہماری منور کو جانے کیا ہو گیا۔ روز بروز سوکھتی جاتی ہے نہ کسی سے بولتی ہے نہ ہنستی ہے سارا دن رسالے پڑھتی رہتی ہے یا قرآن"

میں نے کہا۔

"انہیں اتنا زیادہ مطالعہ نہ کرنا چاہئے اور آپ نے انہیں کہیں کہیں کو نہیں دکھایا؟"

"دکھایا کیا! نہ ... نہ لیا یہ باتیں بڑے بھائی کی منسوبہ سے کہنی جائز نہیں ہے"۔

پن طبیعت پہ جبر کیا۔ وہاں ٹھہرنا بھی خطرہ سے خالی نہ تھا۔

"آپ انہیں لے کر کسی پہاڑ پر چلی جائیے وہاں ان کی طبیعت درست ہو جائے گی"۔

"اس کے ابا نے بھی یہی کہا تھا۔ مگر یہ کہتی ہے کہ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے"۔

مامی نے منور کی بیماری کا ذکر چھیڑ کر گویا میری دُکھتی ہوئی رگ چھیڑ دی۔ میں اُن کی زبانی منور کی کیفیت معلوم کر کے بے تاب ہی تو ہو گیا۔ جی میں آیا کہ اُٹھ کر چلا آؤں یہ سب باتیں میری برداشت سے باہر تھیں۔ منور گردن جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گی۔ حامد مامی اس کی بیماری کا ذکر کر رہی تھیں۔ ایسی بیماری کا ذکر جسے میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اور خود میرا دل بھرا آتا تھا۔ مجھے اپنے اور منور کے درمیان ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور پھر جدائی کے سال بھی پہاڑ بن بن کر سامنے آ رہے تھے۔

ذرا دیر ہم تینوں خاموش بیٹھے تھے کہ نانی کی آواز آئی۔

"بہو — اے بہو! تم تو کبھی گھر کا کام کاج نہ سنبھالو گی۔ آخر میں کب تک تمہارے باورچی خانے کا انتظام کرتی رہوں گی۔ ابھی تمہاری نماز ہی ختم نہیں ہوئی"۔

مامی ہنستی ہوئی اٹھیں اور بولیں۔

"میں آ رہی ہوں اماں۔ بشیر آ گیا تھا۔ ذرا دیر اس کے پاس بیٹھ گئی تھی"

اور پھر مجھ سے کہنے لگیں۔

"میں ابھی آئی۔ چلے نہ جانا"۔

وہ چلی گئیں تو ہمیں اور مشکل پیش آئی۔ اب مجھے براہِ راست منور سے بات کرنی تھی اور سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہوں۔ یوں کہنے کو تو بہت سی باتیں تھیں۔ جو میں کہنی چاہتا تھا۔ لیکن جذبات کی اتنی فراوانی تھی کہ میرے ہوش بجا نہ تھے۔ آخر بولا۔

"منور ———"

اُس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو اور زیادہ نمایاں ہو گئے۔

میں نے نیچی نظر کر کے کہا، مجھے اُس سے آنکھیں ملانے کی تاب نہیں تھی، "تم ناراض ہو گی کہ میں نے تمہارے خطوں کا کیا کہنا چاہتا ہوں۔ اور مجبوری

"مجبوری؟ مجبوری چیز تو ضرور ہوتی ہے مگر کمزور انسان کے لئے"

"میں بھی ایک کمزور انسان ہوں" مجھے کچھ اور جواب بن نہ پڑا۔

"آپ ولایت کیوں جا رہے ہیں؟"

اس کے سوال پر میں نے نظر جو اُٹھائی تو دیکھا کہ وہ میری ہی طرف دیکھ رہی ہے۔ ہماری آنکھیں ملیں اور پھر ہم دونوں نے ایک ساتھ نیچی نگاہیں کر لیں۔

اُس نے کہا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ اتنی جلدی ولایت کیوں جا رہے ہیں"۔

"اس لئے کہ میں تمہیں بھول جانا چاہتا ہوں"۔

بے سوچے سمجھے میری زبان سے یہ جملہ نکل گیا۔ منور نے میری طرف ایسی رحم طلب نظروں سے دیکھا کہ آج تک وہ نظریں یاد آ کر مجھے پہروں تڑپاتی ہیں۔

"آپ مجھے بھول جانا کیوں چاہتے ہیں؟"

"اور کیا کروں۔ ان حالات میں اور کیا کروں؟"

کچھ دیر پھر خاموشی چھائی رہی۔ جی چاہتا تھا کہ وہاں سے اُٹھ کر بھاگ آؤں مجھ سے منور کا غمگین چہرہ اور اشک آلود آنکھیں نہ دیکھی جاتی تھیں۔ وہ بڑے درد انگیز لہجے میں بولی۔

"آپ جانتے ہیں کہ میرے بھائی کوئی نہیں۔ میرا مطلب سگے بھائی سے ہے۔ تو کیا آپ میری اس کمی کو پورا نہیں کر سکتے۔ اگر کر سکتے ہیں تو ولایت نہ جائیے۔ میں آپ کو ہر وقت اپنے پاس دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں ہر وقت آپ کی باتیں سننا چاہتی ہوں، میں ہر وقت ———"

ابھی منور اپنی بات ختم کرنے نہ پائی تھی کہ نانی آ گئیں۔ منور کی باتوں کا مجھ پر اتنا اثر تھا کہ نانی کو سلام کرنے کا خیال ہی نہیں آیا اور اُن کی تعظیم کے لئے کرسی پر سے اٹھنا بھی یاد نہ رہا۔ وہ سیدھی میرے پاس آئیں اور آ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"کس سوچ میں بیٹھے ہو بیٹا بشیر؟"

میں ایک دم کھڑا ہو گیا۔ میں نے دیکھا منور مجھ سے پہلے کھڑی تھی۔ نانی کے کہنے سے منور خادمہ کو کھانا لانے کے متعلق ہدایتیں دینے چلی گئی۔

میں نے کہا

"مجھے تو اجازت دیجئے نانی اماں۔ ابھی کچھ سامانِ سفر درست کرنا ہے"۔

"کیوں۔ کب جا رہے ہو؟"

"کل"

"کل! منور کی شادی میں شریک نہ ہوگے"۔

"جہاز دس تاریخ کو روانہ ہو رہا ہے"۔

کچھ دیر کے بعد منور آئی اور بولی۔

"چلئے۔ دادی اماں کھانا تیار ہے"۔

اور نانی بولیں

"آؤ بشیر!"

میں اپنی تو کیا کہوں۔ منور بے حد غمگین تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ کھانے میں شریک نہ ہوتی اور اس نے کہا بھی کہ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ لیکن نانی جان نے فرمایا کہ تھوڑا سا کھانا ضرور کھاؤ اور سر میں تو درد ہونا ہی ہوا سارے دن کتابیں جو پڑھتی رہتی ہو۔

ہم نے ابھی کھانا شروع ہی کیا تھا کہ بھائی جان آگئے۔

منور انہیں دیکھتے ہی ایک طرف کو سمٹ کر بیٹھ گئی۔

وہ بولے

"بشیر تو یہاں روٹی کھانے بیٹھ گیا وہاں ہم سب لوگ تیرا انتظار کر رہے ہیں"۔

نانی نے کہا

"میں نے اسے روک لیا تھا۔ آؤ تم بھی ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ"۔

"وہاں ابا جان انتظار میں بیٹھے ہیں"۔

"انہیں خبر بھیج دیتے ہیں" نانی نے کہا

لیکن بھائی جان نہیں مانے۔

اُن کے آنے سے منور کی طبیعت اور زیادہ پریشان سی ہوگئی۔

بھائی جان چلے بھی گئے پھر بھی وہ یونہی بیٹھی رہی۔ نانی جان بولیں۔

"آؤ منور تم الگ ہو کر کیوں بیٹھ گئیں"۔

اُن کے فرمانے سے وہ دوبارہ شامل ہو گئی مگر اس نے برائے نام ہی چند لقمے کھائے۔ بھوک مجھے بھی نہیں رہی تھی لیکن نانی اور نانی کے اصرار پر میں اُن کا ساتھ دیتا رہا۔

کھانا کھانے کے بعد منور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نانی اور نانی جان کے پاس بیٹھا بڑی دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اس امید میں بیٹھا رہا کہ شاید منور آ کر ہماری باتوں میں شامل ہو جائے۔ لیکن وہ نہیں آئی۔ آخر میں اُٹھا اور اُن سے رخصت ہو کر چلنے لگا۔ اور چلتے چلتے میں نے کہا

"منور کے سر کا درد خبر نہیں اب کیسا ہے"۔

نانی جان نے کہا۔

"وہ دوسرے کمرے میں ہے دیکھتے جاؤ نا اور تم اُس سے رخصت بھی تو نہیں ہوئے"۔

میں نے نانی کی طرف تشکر آمیز نظروں سے دیکھا اور منور کے کمرے میں چلا گیا۔

وہ نصف کرسی پر بیٹھی تھی اور نصف میز پر پڑی تھی۔ میں دبے پاؤں گیا اور جا کر اُس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ وہ اسی طرح پڑی رہی۔ میں نے کہا "منور!"

اُس نے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر ہوائیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔

میں نے کہا

"کیا سر میں بہت زیادہ درد ہے۔ اسپرین کیوں نہیں کھا لیتیں؟"

وہ کھڑی ہو گئی اور بے اختیار اُس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے

اُس کے آنسو دیکھ کر میں بھی آنسو ضبط نہ کر سکا۔ جہاں مجھ میں اور بہت سی کمزوریاں ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ میں کسی کو روتا نہیں دیکھ سکتا۔ دوسرے کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرے بھی آنسو بھر آتے ہیں اور پھر منور کے آنسو دیکھ کر تو میں ضبط کر ہی نہ سکتا تھا۔

دو چار منٹ ہم خاموش آنسو بہاتے رہے۔ پھر مجھے اچانک موقع کی نزاکت کا احساس ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"منور میں جا رہا ہوں میں تم سے رخصت ہونے آیا تھا"۔

"جسے انسان بھولنا چاہتا ہو کیا اُس سے رخصت ہونے کی بھی ضرورت ہوتی ہے؟"

اُس کے اس فقرے نے میرے تن بدن میں آگ سی لگا دی۔ جی میں آیا کہ اُس سے لپٹ جاؤں اور کہوں میں تمہیں نہیں بھول سکتا۔ میں تمہیں بھولنا نہیں چاہتا۔ میں خود کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ میں اس میں کامیاب نہ ہو سکوں گا۔ منور تم میری زندگی پر اس طرح چھا گئی ہو کہ اب میں کہیں بھی جاؤں تمہاری یاد میرے ساتھ ہوگی۔ اب میں کہیں بھی رہوں تمہارا تصور میرے ہمراہ ہوگا۔

لیکن پھر خیال آیا کہ کیا یہ باتیں بڑے بھائی کی منسوبہ سے کہنی جائز ہیں لہٰذا میں نے اپنی طبیعت پر جبر کیا۔ وہاں ٹھہرنا بھی خطرہ سے خالی نہ تھا۔

میری طبیعت قابو سے باہر ہوئی جا رہی تھی۔ مجھے خوف پیدا ہو گیا تھا کہ کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکل جائے جس سے منوّر کا رہا سہا صبر و سکون بھی ختم ہو جائے۔ میں نے کہا

"منوّر! کیا کسی سگی بہن کو بھائی کے جانے پر اتنا رنج ہوتا ہے جتنا کہ تم کر رہی ہو؟"

منوّر نے ایک دم نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اُس کی نظریں بجلیاں تھیں جنہوں نے میرے ضبط و صبر کو جلا کر خاک کر دیا۔ میں بے خود اور مجبور ہو کر اپنی محبت کا اعتراف کرنے ہی والا تھا کہ نانی جان آ گئیں۔ اور آتے ہی بولیں۔

"منوّر بیٹا اب کیسی طبیعت ہے؟"

اور پھر مجھ سے

"بشیر بیٹا خط لکھتے رہنا"

"ضرور لکھوں گا نانی اماں"۔

....

دوسرے دن میں صبح ہی صبح روانہ ہو گیا۔ ماموں جی بھی دوسرے شہر سے منوّر کی شادی کا سامان خرید کر آ گئے تھے۔ وہ بھی اسٹیشن پر آئے اور شکایت کرنے لگے کہ تم شادی میں شریک نہیں ہو گے۔ مجھے اس کی شکایت رہے گی۔ سب کو اپنی اپنی شکایت کی پڑی تھی جو میرے دل پر گذر رہی تھی۔ اُسے کوئی نہ جانتا تھا۔ ماموں سے یہ نہ ہو سکا کہ بھائی جان کے لئے رشتہ کرنے سے انکار کر دیتے ایک لڑکی تو وہ انہیں دے ہی چکے تھے اب یہ کیا ضروری تھا کہ دوسری لڑکی کی شادی بھی انہیں سے کی جائے۔

سفر کی مجھے کوئی بات یاد نہیں البتّہ اتنا ضرور یاد ہے کہ ہر وقت منوّر کا تصوّر آنکھوں میں پھرتا رہتا تھا۔ ہر وقت منوّر یاد آتی رہتی تھی۔ صبح ہو یا شام دن ہو یا رات ہر لمحہ منوّر ہر لحظہ منوّر —— میرے دل پر میری زندگی پر اور میری روح پر منوّر اس طرح چھا گئی تھی کہ ہر طرف منوّر ہی منوّر دکھائی دیتی تھی۔ منوّر ہی سنائی دیتی تھی اور منوّر ہی محسوس ہوتی تھی۔ خوابوں میں بھی منوّر خیالوں میں بھی منوّر۔ غرضکہ کوئی لمحہ ایسا نہ تھا کہ منوّر کی صورت نظروں سے غائب ہو جاتی ہو۔

میں ولایت اس لئے جا رہا تھا کہ وہاں جا کر منوّر کو بھول جاؤں گا۔ وہاں کوئی بات ایسی نہ ہو گی جو مجھے منوّر کی یاد دلا سکے لیکن سفر ہی میں میری ایسی حالت ہو گئی کہ واپس آنے کے لئے منوّر کو ایک نظر دیکھنے کے لئے تڑپنے لگا۔ سوچنے لگا کہ کسی بندرگاہ پر اتر کر دوسرے جہاز سے واپس چلا جاؤں اور اپنے اسی کالج میں داخل ہو جاؤں۔ جب میرا ابھی سے یہ حال ہو گیا ہے تو لندن پہنچ کر خدا جانے کیا ہو گا لیکن واپس آنے میں بھی تو اس درد کا علاج نہ تھا۔ واپس آنے کا تو یہ مطلب تھا کہ میں منوّر کو بھائی جان کے سپرد ہوتے دیکھوں اور پھر ان کے فوجی اکھڑپن سے منوّر کی نازک مزاجی چور چور ہوتے بھی دیکھوں اور چپ بھی رہوں۔

جوں توں کر کے لندن پہنچا۔ یہاں پہنچ کر مجھے ابّا اور بہن کا خط ملا۔ ابّا جی نے خیریت کی خبر لکھی تھی اور مجھے تاکید کی تھی کہ میں ہمیشہ انہیں ہر ہفتہ ہوائی ڈاک سے خط لکھتا رہوں لیکن بہن نے ستم ڈھایا تھا۔ بھائی جان کی شادی کی ایک ایک بات کو تفصیل سے لکھا تھا۔ گو اُن کی دوسری شادی تھی لیکن پھر بھی پہلی شادی کی طرح چاؤ چوچلوں سے بیاہ کیا گیا تھا بہن کے خط کے اس حصّے کو میں نے بڑے درد سے پڑھا جس میں وداع ہونے کے حالات لکھے تھے۔ انہوں نے تحریر کیا تھا کہ منوّر بڑے درد سے روتی ہوئی وداع ہوئی اور یہ کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کسی لڑکی کو رخصتی کے وقت اس طرح درد و کرب سے روتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔

....

وقت گذرتا گیا۔ نئی جگہ کی چہل پہل، کالج کی مصروفیتیں اور نئے لوگوں سے تعلقات ان سب باتوں نے آہستہ آہستہ منوّر کی جدائی کی مصیبت کو برداشت کرنے میں بڑی مدد دی۔ لیکن بہن متواتر خط لکھتی رہیں جس میں وہ کسی نہ کسی طرح منوّر کا ذکر کرتی رہتیں اور اس طرح میرے دل میں منوّر کی یاد تازہ ہو جاتی۔ لیکن اس کی یاد میں اب پہلی سی شدّت باقی نہ رہی تھی۔ اب وہ مجھے یاد آتی تو سہی مگر اس طرح جیسے کوئی بھولا ہوا خواب یاد آتا ہے۔ اُسے دیکھنے کی میرے دل میں خواہش تو پیدا ہوتی لیکن یہ خواہش اتنی زبردست نہ ہوتی کہ اس کے مقابلے میں میں اپنے دوسرے مقاصد کو بھول جاتا۔ میری زندگی بالکل بدل چکی تھی۔ ہندوستان میں ساتھ پڑھنے والی لڑکیوں سے کبھی میں نے بات نہ کی تھی اور وہ بھی لڑکوں سے کچھ کھچی کھچی رہتی تھیں لیکن یہاں کا باوا آدم ہی نرالا تھا۔ ہر وقت لڑکیاں ہمیں گھیرے رہتی تھیں۔ کالج میں جائیں تو لڑکیاں۔ بازار میں جائیں تو لڑکیاں۔ تھیئٹر میں جائیں تو لڑکیاں۔ سیر کو جائیں تو لڑکیاں۔ غرضکہ کہیں بھی جائیں لڑکیاں پہلے سے موجود اور دلکش تبسّم اور سامع نواز آواز سے استقبال کرنے کے لئے آمادہ۔

گو میں منوّر کو بالکل نہیں بھولا تھا لیکن مصلحتاً میں نے کبھی کسی خط میں اُس کا ذکر نہیں کیا۔ بھائی کے خط تک میں کبھی اُسے سلام نہیں لکھا۔ میں چاہتا تھا کہ منوّر مجھے بالکل بھول جائے۔ بہن کو جواب لکھتے ہوئے بھی میں منوّر کا ذکر

کرنے سے احتراز کرتا لیکن وہ اُس کا ذکر کرنے سے باز نہ آتی تھیں لکھتیں منّور تو
بس آپ ہی کا ذکر کرتی رہتی ہے۔ اب بھائی کالج میں پڑھ رہے ہوں گے۔
اب بھائی کھیل رہے ہوں گے۔ اب بھائی سو رہے ہوں گے۔ کیا آپ منّور سے
ناراض ہیں پھر اُس کا سلام قبول کیوں نہیں کرتے۔ میں نے کتنی دفعہ آپ کو
اُس کا سلام لکھا لیکن آپ نے کبھی جواب نہیں دیا۔ آپ کے خط کو منّور کئی کئی
دفعہ پڑھتی ہے اور ایک ایک واقعہ سے دلچسپی لیتی ہے۔ لیکن جب اُس میں
اُس کے لئے نہ دعا ہوتی ہے نہ سلام تو خاموش ہو جاتی ہے۔ اُس وقت
اُس کی صورت دیکھ کر مجھے آپ پر بڑا غصہ آتا ہے کہ آپ کو کیا ہو گیا۔ آپ اُسے
دعا یا سلام کیوں نہیں لکھتے اور بچّے بچّے کا نام لکھ کر دعا لکھی ہوتی ہے۔ ایک
ایک بزرگ کی خدمت میں سلام عرض کرنے کی فرمائش ہوتی ہے۔ لیکن منّور نے
ایسا کیا قصور کیا ہے کہ اس کا نام تک نہیں ہوتا۔

بہن کے خط پڑھ کر میں مسکرا پڑتا گو دل میں ایک درد سا محسوس
ہوتا۔ جیسا کہ بہن کوکین کا انجکشن کر کے اپریشن کر رہی ہوں۔ اور دو تعنوں کے بعد
مجھے تکلیف کے جھٹکے سے محسوس ہوتے ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اپنے
کسی خط میں منور کا نہ کبھی ذکر کیا اور نہ کبھی اُسے سلام لکھا۔

پھر بہن کے خطوں نے ایک اور رُخ بدلا۔ وہ منّور کی بیماری کا ذکر
کرنے لگیں۔ پہلے لکھا وہ کمزور ہو گئی ہے۔ پھر لکھا کہ اُسے کئی روز سے بخار
ہے۔ پھر لکھا کہ وہ بخار تو اتر گیا تھا لیکن اب اُسے دوسرے تیسرے دن حرارت
ہو جاتی ہے۔ پھر لکھا کہ اب اُسے چوبیس گھنٹے بخار کی حرارت رہنے لگی۔ اُس
کی بیماری کی خبریں پڑھ کر میں اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکا۔ میں اُس کی بیماری سے
بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے بہن اور بھائی جان کو لکھا کہ اُس کا علاج
باقاعدہ کرائیے اور کسی پہاڑ پر لے کر چلے جائیے۔ روپے کا خیال نہ کیجئے۔
آپ چاہیں تو مجھے خرچ نہ بھیجئے۔ میں آپ کے روپوں کے بغیر بھی گذارا کر لوں گا
مجھے خود روپے کمانے کے طریقے آ گئے ہیں۔ گو کچھ تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی لیکن
کچھ پروا نہیں مگر اُس کے علاج معالجے میں ذرا بھی کوتاہی نہ کیجئے۔ اور اسی
قسم کے مضمون کا ایک خط ماموں کو بھی لکھا۔

ایک دفعہ پھر منّور میری زندگی پر چھا گئی۔ ہر وقت نظر کے سامنے پھرتی
رہتی لیکن کچھ ناراض ناراض سی معلوم ہوتی۔ تصور میں آتی تو مسکرانے کی بجائے
رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگتی۔ خواب میں دکھائی دیتی تو منہ سے
کچھ نہ بولتی۔ میں بڑی بے تابی سے اپنے خطوں کی راہ دیکھنے لگا۔ سب سے پہلے
بہن کا خط آیا۔ لفافہ پھاڑا تو اس میں سے منّور کا خط نکلا۔ سخت تعجب ہوا۔ لفافے
کا پتہ ایک مرتبہ اور دیکھا تو پتہ بہن ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔

منّور نے لکھا تھا۔

بھائی بشیر! آپ کو سلام لکھنے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ جب سے آپ
ولایت گئے ہیں کبھی میرا سلام قبول نہیں کیا۔ اور خط لکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا
خط سے آپ کو میری یاد آئے گی اور میری یاد آپ کی طبیعت کو ناگوار گذرے
گی۔ لیکن میری بیماری کا حال پڑھ کر آپ نے ایک دم جو تین خط لکھے تو اس سے
مجھ کو کچھ کچھ یقین ہو چلا ہے کہ آپ کے دل میں میرے لئے کچھ ہمدردی ضرور
موجود ہے۔ لیکن اب آپ کی ہمدردی بھی مجھے کچھ فائدہ نہ پہنچا سکے گی۔ مرض
کا تیسرا درجہ آ پہنچا ہے اور وہ وقت دور نہیں کہ ــــــ آہ کاش مرنے سے
پہلے میں اپنے عزیز از جان بھائی کو ایک نظر دیکھ سکتی۔ میں نے آپ کو طاہرہ
سے کئی مرتبہ لکھوایا کہ اپنی ایک تصویر بھیج دیجئے لیکن آپ نے نہیں بھیجی۔ جس
رات آپ ہم سے رخصت ہونے آئے تھے اُس رات سے میں نے ہمیشہ
آپ کو اپنے سگے بھائی کے برابر سمجھا اور یہی سمجھ کر میں آپ کو سلام لکھواتی رہی
آپ کا ذکر طاہرہ سے کرتی رہی۔ آپ کے وہ خط پڑھتی رہی جو طاہرہ کے نام
آتے تھے۔ لیکن آپ نے مجھے طاہرہ کے برابر نہیں سمجھا ورنہ آپ میرے ذکر
سے اتنے نہ بچتے۔ خیر اب ان شکایتوں کا موقع نہیں۔

میں اپنی زندگی پر اور بیماری پر غور کرتی ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ میری زندگی کو موت کی اس حد تک پہنچا دینے میں آپ دونوں بھائیوں کا
برابر کا ہاتھ ہے اور آپ کا شاید زیادہ ہے۔ اگر آپ ذرا بھی زبان ہلا دیتے
تو شاید میرا یہ حسرتناک انجام نہ ہوتا۔ لیکن آپ میری پھانسی کا حکم صادر کر کے ولایت
بھاگ گئے۔ پھانسی کا حکم دیا تھا تو مجھے دار کے تختے پر چڑھتے ہوئے بھی تو
دیکھا ہوتا۔ لیکن آپ میں اتنی طاقت کہاں تھی۔ آپ کی موجودگی میں شاید
آپ کی اس سزا کو ہنسی خوشی برداشت کرنے میں کامیاب ہو جاتی۔ آپ کا
قرب ہی مجھے کچھ سے کچھ بنا دیتا۔

یہ خط میں بے سوچے سمجھے نہیں لکھ رہی ہوں۔ میں نے پہلے خوب
سوچا ہے جب کہیں جا کر آج لکھنے لگی ہوں۔ ورنہ میں پہلے بھی آپ کو خط لکھ
سکتی تھی۔ لیکن اُس وقت تک مجھے زندگی کی امید تھی۔ اب یہ اُمید بھی میرا
ساتھ چھوڑ گئی۔

خط لکھنے بیٹھی ہوں تو یہ بھی کیوں نہ لکھ دوں کہ آپ کے بھائی صاحب
کو نہ سعدیہ کے رلنے کا خیال تھا اور نہ مجھ سے کوئی محبت تھی۔ وہ مجھ سے
انتقام لینا چاہتے تھے لہذا انہوں نے انتقام لے لیا ہے۔ لیکن مجھے ان سے

کوئی شکایت نہیں۔ ایک روز وہ آپا جان پر کسی معمولی سی بات پر ناراض ہو رہے تھے۔ وہ بے چاری خاموش بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں میں بھی اتفاق سے آپ کے یہاں گئی ہوئی تھی۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا میں نے آپ کے بھائی صاحب کو دو ایک کھری کھری سنا دیں۔ بس پھر کیا تھا آپے سے باہر ہو گئے۔ مجھ پر بھی ہاتھ اٹھا کر آئے۔ میں نے کہا دیکھیے اپنی جگہ کھڑے رہیئے۔ میں ممتاز نہیں ہوں۔ اُس وقت تو وہ ضبط کر گئے لیکن پھر بھی اتنا ضرور کہا کہ میں تجھے کسی دن اس کا مزا ضرور چکھاؤں گا۔

بشیر میں سوچتی ہوں کہ عورت کو خدا نے اتنا مجبور کیوں بنایا ہے لیکن نہیں خدا نے تو برابر کے حقوق دیئے تھے۔ خود غرض مردوں نے سوسائٹی کا جامہ پہن کر عورتوں سے اُن کی ساری آزادی اور حقوق چھین لئے اور عورت ایسی مجبور ہو کر رہ گئی ہے ــــ عورت کی مجبوریاں ــــ خدا کی پناہ۔ میں عورت کے بستر پر پڑی موت کی گھڑیاں گن رہی ہوں اور آپ کے بھائی جان دوسری شادی رچانے کی فکر میں ہیں۔

بشیر اگر آپ مجھے بچانا چاہتے ہیں تو فوراً چلے آیئے۔ اگر میں نہ بھی بچی تو بھی میری چارپائی کے قریب بیٹھے ہوں گے اور میں ــــ

اگر آپ کو اپنی بیمار اور مایوس بہن کی زندگی پیاری ہے تو فوراً ہوائی جہاز سے روانہ ہو جایئے۔

اُس کا خط پڑھ کر مجھے اتنا رنج ہوا کہ بیان سے باہر ہے لیکن رنج کی اتنی فراوانی کے باوجود نہ میں نے اُس کے خط کا جواب لکھا اور نہ خود جانے کا ارادہ کیا۔

....

اُف کس قدر حسین رات ہے حسین اور خاموش، خاموش اور حسین! ایک دفعہ پہلے بھی میں نے ایسی ہی حسین رات دیکھی تھی۔ نہیں یہ رات اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی وہ رات میری زندگی کی حسین ترین رات تھی۔ ہاں البتہ کچھ باتوں میں یہ رات اُس سے مشابہ ضرور ہے ــــ

ہاں تو یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر میری زندگی کا کیا مقصد تھا مجھے دنیا میں بھیج کر قدرت مجھ سے کیا کام لینا چاہتی تھی اور آیا جو کچھ میں نے کیا وہ عین مشیّت کی خواہش کے مطابق تھا یا اس کے خلاف۔ اپنی ساری زندگی پر نظر ڈالنے سے مجھے صرف ایک بات بہت زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے کہ میں نے رفتہ رفتہ ایک دوست کی ایک عزیز ترین دوست کی جان کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اور اگر میری زندگی کا یہی مقصد تھا تو لعنت ہے میری زندگی پر، لعنت ہے اس مقصد پر اور لعنت ہے خود مجھ پر۔

ظفر واسطی

ایک عورت کا گیت

نیلے منڈل کے یہ تارے
دھیان کی موج میں ایک ہیں سارے

دکھ کے دن، سکھ ساتھ کی راتیں — دور کا دھیان، اور پاس کی باتیں
کیسا ہے یہ تانا بانا؟ — کیسی ہیں یہ جیتیں ماتیں؛
کوئی جیتے کوئی ہارے،
دھیان کی موج میں ایک ہیں سارے

(۲)
پہلے دل کہتا تھا مچل کر، — رنگ لائیں گے ہم بھی اُبل کر
دیکھ لی اب جیون کی بازی — سوچ رہا ہے ہاتھوں کو مل کر
ڈوبی ناؤ کو کون اُبھارے؟
دھیان کی موج میں ایک ہیں سارے

(۳)
پیچھے پڑی ہے راہ اکیلی — منزل آئی، بوجھی پہیلی
گیان گمبھیت کی تان رسیلی — جیسے ناری نئی نویلی
گن اوگن سب جی سے بسارے
دھیان کی موج میں ایک ہیں سارے

(۴)
ایک سے دوسرا پائے اُجالا، — اندھیارا بھی لائے اُجالا،
آنکھ موند کر دیکھ لے مورکھ، — رات کے ساتھ میں آئے اُجالا
سب ہیں سپنے نیارے نیارے
دھیان کی موج میں ایک ہیں سارے

میراجی

دنیائے ادب

گئے تین سالوں سے اردو شاعری میں ایک زبردست اچھلے شعری کے آثار دکھائی دے رہے ہیں، ــــ یہ انقلاب شعر کی ہیئت اور موضوع دونوں سے تعلق رکھتا ہے، ــــ زندگی میں نوعِ انسانی نت نئے مسائل سے دوچار ہوتی چلی جارہی ہے اور اس لئے اچھوتے موضوع کی کمی تو کبھی پیدا ہی نہیں ہوسکتی، یہ اور بات ہے کہ بعض افراد کنوئیں میں مینڈک بن کر ٹراتے رہیں، لیکن ہیئت کی تبدیلی کا تعلق محض نئی زندگی ہی سے نہیں بلکہ نئی زندگی کے ڈھب سے ہے۔ بدلتی ہوئی روحیں نئے خیالات سوچ سکتی ہیں، یہ فطری ہے، لیکن بدلتے ہوئے جسم ہی نئی شکلوں کی تخلیق کا باعث بن سکتے ہیں، اسمٰعیل میرٹھی اور عبدالحلیم شرر کے زمانے میں ابھی کوٹ پتلون اور ٹوپ نے لوگوں کے ظاہر کو بدلنا شروع ہی کیا تھا اس لئے ادب میں ان کی متعارف کرائی ہوئی اشکال مقبول نہ ہوسکیں ــ ــ مگر رفتہ رفتہ ہمارے جسموں پر کوٹ ہی کوٹ، پتلونیں ہی پتلونیں اور ٹوپ ہی ٹوپ دکھائی دینے لگے، ــــ اور ن۔ م۔ راشد آیا اور پھر کئی اور نمودار ہوئے اور نہ صرف آزاد نظم رائج ہوئی بلکہ اسمٰعیل میرٹھی کی ناتمام کوشش اور آزاد نظم کی متقدم ہیئت یعنی بے قافیہ یا معرا ہیئت بھی رواج پانے لگی ــ یہ تو بھی ظاہر کی بات۔ باطن میں اکبر الہ آبادی کے احتجاج کے باوجود اسکول، کالج، تعلیم نسواں اور سینما نے مل کر ہمارا روحانی نقشہ ہی بدل دیا اور ہم نئی اخلاقی قدروں سے آشنا ہوئے۔ فرد اور سماج کی اس تجدید کے خلاف جو احتجاج ہوا وہ کچھ اکبر الہ آبادی سے مختص نہیں ہے، ہر شہر میں کئی اکبر نظر آئے۔ اور جب امرودوں کی فصل نہ رہی تو نہال ہو گئے، اکبر ایک بلند فن کار تھا اس لئے اس کے امرود اپنے چٹ پٹے ذائقے سے مزا دے گئے، اس کے ایسے پیرو جو فن کار بھی نہ تھے پکنے سے پہلے ہی شاخ سے گرتے گئے لیکن ہر موسم میں ان کی تجدید ہوتی رہی، قدامت کے پرستار اپنی ذہنی تربیت اور نشوونما کے باعث نئی باتوں سے محفوظ نہیں ہوسکتے اور اس لئے وہ ایک حاسدانہ جذبے کے ماتحت نہیں چاہتے کہ اور لوگ بھی ان باتوں سے لطف اٹھائیں۔ لیکن حالی اسمٰعیل شرر اور اقبال نے جو بیج بوئے عظمت اللہ اور بجنوری نے جنہیں سینچا، حفیظ، اختر شیرانی اور جوش نے جنہیں پروان چڑھایا وہ آج ایک لہلہاتی ہریاول کی صورت میں ہر طرف دکھائی دے رہا ہے۔

ذیل کی نظم کا شاعر بظاہر ایک جذباتی سی بات کہہ رہا ہے لیکن اصل میں یہ نظم ایک طنز ہے اُن شعراء پر جو شعر کو رہا کارانہ طور پر اپنی زندگی میں ایک "سبا سی چال" بنا لیتے ہیں۔

شعروشاعری

طبع موزوں کے لئے کم تو نہیں ہیں یہ سوال
کیسے اشعار کہوں، اُن کی زمیں کیسی ہو،
کون سی بحر ہے موزوں مرے نغموں کے لئے
کیسے الفاظ خیالات کے مظہر ہوں گے،
سوچتا ہوں کہ گراں تو نہیں گذرے گی یہ بحر
فاعلاتن فعلاتن فعلاتن، فعلن
بیشتر جس میں تخیل مرا ڈھل جاتا ہے!

چاہتا ہوں کہ بیاں میں ہو لطافت ایسی
کہ اُسے پڑھتے ہی اک کیف سا محسوس کریں
وہ غزل خواں جنہیں اندازِ کہن بھاتا ہے،
رقص کرتے ہوئے الفاظ ہوں جن کے گھیرے
ذہن میں حلقے بناتے ہوئے پرواز کریں،
میری تخئیل میں جادو کا اثر ہو پیدا
میرے انداز میں مہکے ہوئے نغمے ہوں نہاں
جو سماعت میں اُترتے ہی قیامت ڈھائیں

چاہتا ہوں کہ تصور میں تخیل کی جھلک
ایک دنیا نئی تخلیق کرے دنیا میں
ان خیالات کی الجھن میں گرفتار رہوں میں
میری خواہش ہے کہ میں راہ کروں ہر دل میں
اور لوگوں کے لئے شاعرِ فن کار بنوں

(۲)

سوچنا یوں تو بھلا ہے مگر ایسی کیا سوچ
جس سے بیدار نہ ہو جو ہر ذاتی اپنا
ہیچ ہے غیر مقفّٰی و مقفّٰی کا خیال
مجھ کو کیا اس سے کہ شعروں میں مرا ذوقِ نظر
ہے وہی جو مجھے ممتاز کرے دنیا میں
کیا مجھے اپنے خیالوں کے ادا کرنے کو
اُسی رفتار سے چلنا ہے کہ جس سے اب تک
دھیرے دھیرے مرے ہم عصر چلے جاتے ہیں؟
کیا مجھے شہرت و عزّت کے لئے جینا ہے؟
داخل فرضِ ترنم بھی ہے شاعر کے لئے؟
گرد آلودہ جبیں اور گریباں صد چاک
شاعری کے لئے کیا یہ بھی ضروری ہوگا؟
اپنے اشعار کو لوگوں کی نظر سے دیکھوں!
یہ نہیں ہوگا، نہیں ہوگا، نہیں ہو سکتا!
میں مداری تو نہیں ہوں کہ پٹاری لے کر
کھیل دکھلاتا پھروں شعبدہ بازوں کی طرح،
میں تو خود اپنا پیمبر ہوں کہ میرے نغمے
میرے احساس کی تصویر ہوا کرتے ہیں،
میرے شعلے تو مری روح کی آوازیں ہیں
کتنی کم ظرفیٔ فطرت ہے مری سوچ، کہ میں
اپنے اشعار کو لوگوں کی نظر سے دیکھوں،
فاعلاتن فعلاتن سے غرض کیا مجھ کو،
قافیہ کیا، میری تخئیل کو کوئی طاقت
پا بجولاں نہیں کر سکتی غلاموں کی طرح
کون کہتا ہے کہ اشعار ہیں میرے الفاظ،
یہ تو اک خام خیالی ہے جہاں والوں کی
میں تو جو سنتا ہوں نظروں سے تری کہتا ہوں
یہ الگ بات ہے مفعول فعولن فعلن
یا فعولن فعلاتن میں بیاں ہو جائے۔

ہمایوں، اکتوبر ۴۱ء — یوسف ظفر

انسان میں آغاز ہی سے اپنے خیالات کو تشبیہ اور استعارے کی صورت میں ڈھالنے کا رجحان رہا ہے —— اور اس رجحان کو اس کا حافظہ اور تجربہ اور بھی پختہ بناتا رہا ہے۔ اسی لئے انسانی ذہن اب بھی کچھ اس انداز کے عمل کی طرف مائل ہے کہ پھیلے ہوئے کھیت کو دیکھ کر اسے بچھا ہوا بستر یاد آ سکتا ہے۔ سوکھا ہوا پیڑ اس کے دل میں بڑھاپے کا خیال لا سکتا ہے دھرتی کے سینے میں گڑا ہوا، کھڑا ہوا مینار..... اور رفتہ رفتہ یہ مشابہت یہ مماثلت اس کے تخیل میں اصل کی جگہ لے لیتی ہے اور یاد مانوس ہو کر تشبیہ کو استعارہ بنا دیتی ہے —— یہ تو تھی انسان کی بات، لیکن شاعر اِن رجحانات کا اور بھی زیادہ معمول ہے۔ وہ اگر کسی اُڑتی ہوئی تیتری کو دیکھ لے تو اس کے دل میں کسی متلوّن مزاج عورت کی یاد جاگ اٹھتی ہے، جو شوخ ہو، چنچل —— ہرجائی، جسے ایک جگہ قرار ہی نہ آسکے، —— اور اگر شاعر کچھ دیر تک اُس تیتری کو دیکھتا رہے یا اُس کی حیثیت پر غور کرنے لگے تو ساتھ ہی ساتھ اُس کے ذہنی پس منظر میں اس عورت کا تصوّر بھی متحرک رہتا ہے، —— اور رفتہ رفتہ کئی اور باتیں بھی ملتی جلتی نکل آتی ہیں۔ —— تیتری کو دیکھ کر پہلے اس کی دلکشی، اُس کے حُسن کا خیال آتا ہے پھر اُس کے اضطراب، اُس کی ہرجائیت کا، یوں شاعر کا موضوع "حُسنِ آوارہ" بن جاتا ہے اور پھر استعارہ مکمل صورت میں ایک نظم کی تخلیق کا باعث بنتا ہے۔ نظم ذیل میں درج ہے۔

حُسنِ آوارہ

اُڑ رہی ہے تیتری　　یا ہوائے دلبری
نازک و نحیف سی　　نوبرو لطیف سی
گھر نہ بار ہے کوئی　　اور نہ اپنی شے کوئی

بس جدھر نکل گئی، نکل گئی
اُڑ رہی ہے، اُڑ رہی ہے تیتری

ہر خوشی کو چھوڑ کر　　زندگی کے موڑ پر
باغ و راغ کاٹتی　　آب جُو کو چاٹتی
بوئے گُل سے جھومتی　　خار و خس کو چومتی

جس طرح بھی جی سکے ہے جی رہی
اُڑ رہی ہے، اُڑ رہی ہے تیتری

ایک بے دماغ نے کہنہ سال زاغ نے
زورِ حرص و آز میں شورِ برگ و ساز میں
اُس کو جب مسل دیا دلکشی کا پھل دیا
آہ بھی نہ بدنصیب کر سکی،
اُڑ رہی ہے اُڑ رہی ہے تیتری

اب وہ کس لئے مرے! شہد جمع کیوں کرے!
سونگھتی ہے پھول کو زرنگار بھول کو
پھر اُسے لتاڑ کر بال و پر کو جھاڑ کر
ڈھونڈتی ہے مسکرا کے اور ہی،
اُڑ رہی اُڑ رہی ہے تیتری

ساقی نومبر ۱۹۴۱ء قیوم نظر

اوپر کی نظم میں تیتری اور حُسنِ آوارہ کا استعارہ ہی ایک دلکش نکتہ نہیں ہے چار مختصر بند کی اس چھوٹی سی نظم میں دنیا کے قدیم ترین پیشے کی ایک فن کار کی مکمل سوانح عمری یہاں ہمیں نظر آتی ہے، جس کے بنیادی کردار ایک تیتری اور ایک بوڑھے کوّے کی صورت میں موجود ہیں۔ ایک فاحشہ عورت اور ایک عیاش مرد — دونوں انسان ہیں، لیکن اُن کے احساس و جذبات بے حد مختلف، دونوں خود غرض ہیں، دونوں کو اپنی اپنی دھن ہے اور یوں وہ ہم نوع نہیں ہیں — شاید اسی لئے استعارے میں دونوں کا جنس نوعی لحاظ سے مختلف ہے۔

نظم میں الفاظ اور بعض دوسری بیانیہ باتیں واقعے یا سانحے کے ناگوار پہلو کو کسی حد تک چھپائے ہوئے ہیں۔ سانحہ گھناؤنا ہے، لیکن الفاظ نرم و نازک یا کم سے کم مفہوم کے لحاظ سے اُن کے تصورات اور متعلقات ناپسندیدہ نہیں ہیں۔ یہ بھی وہی کرداروں سے ملتا جلتا تضاد ہے لیکن تضاد سے زیادہ حقیقت بھی، کیونکہ ہر روز — ہر لمحے ہماری نگاہوں میں ایسی باتیں آتی ہیں لیکن ہمیں غیر مانوس، ناپسندیدہ، ناگوار نہیں محسوس ہوتیں، ہمارے لئے وہ روز مرّہ کی چیزیں ہیں۔

ہر بند میں پہلے چھ مصرعے چھوٹے ہیں، آخری دو لمبے۔ پہلے دو مصرعوں سے ایک چھلبلی ہوئی سرسراتی ہوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے، ایک تیزی سی، ایک دو لمحوں کی بات — اور کون نہیں جانتا کہ حُسنِ آوارہ اور کہنہ سال زاغ کی زندگی میں ایسے واقعات بھی ایک دو لمحوں کی بات ہوا کرتے ہیں، ایک سرسراتی ہوئی چھلبلی ہوئی کیفیت، آخری دو مصرعوں کی لمبان پہلے چھ مصرعوں سے مل کر — ایک تکان کا اثر پیدا کرتی ہے، ظاہر ہے کہ ایسی زندگی میں رات کے معاملے کے بعد رات کا نتیجہ دن کو تکان ہی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے — ایک بات اور — یہ تیتری باغ و راغ "کاٹتی" اور "آب جو کو چاٹتی" ہے — گویا لا اُسندرا نہیں ہے، شہر کی پُر رونق سڑکوں یا قیصر باغ، لارنس باغ، چورنگی، اپالو اور گیسٹن میٹن روڈ وغیرہ کے مقامات پر دکھائی دیتی ہے۔

پروازِ جنوں

تنگ راہوں پہ اُٹھے جاتے ہیں میرے پاؤں
اور سرگوشیاں کرتا ہے یہ سارا گاؤں
ایک کہتا ہے "یہ دیوانہ کدھر جائے گا"
دوسرا کہتا ہے "تا حدِ نظر جائے گا،
"جی میں آئی تو اُفق سے بھی گذر جائے گا!
مگر کے بے چارہ کسی کھوہ میں مر جائے گا!"
میں رواں ہوں مگر ایک کھنڈر کی جانب
تشنہ لب جیسے بڑھے ساغرِ زر کی جانب

(۲)

شام پڑتے ہی وہ بستی سے نکل آتی ہے
سامنے اُجڑے ہوئے قصر میں چھپ جاتی ہے
بیٹھی ہوگی کسی دیوار کے سائے میں خموش
اپنی نوخیز جوانی کے نشے میں مدہوش
کیف آنکھوں میں، تمناؤں کا سینے میں خروش
عیشِ امروز کی دنیا میں نہ فردا ہے نہ دوش
سر پہ دوپٹہ سیاہ رنگ کا ڈالے ہوگی
اپنی اُڑتی ہوئی زلفوں کو سنبھالے ہوگی

(۳)

چاپ سنتے ہی مرے پاؤں کی، چونک اُٹھے گی
دلِ معصوم میں اک آگ سی ہونک اُٹھے گی
جب مجھے سامنے پائے گی تو شرمائے گی
سر جھکائے گی، لجائے گی، سمٹ جائے گی
میں بلاؤں گا تو پلکوں کو وہ جھپکائے گی
اور جس وقت بہم ہم کو ہنسی آئے گی

وہ یہ پوچھے گی "بھلا آپ یہاں کیوں آئے"؟
میں کہوں گا "یہ مرے بخت سے پوچھا جائے"

(۴)

اور ہو جائے گی جب دہر پہ مستی طاری
میرے پہلو میں سمٹ آئے گی میری پیاری
میں سناؤں گا اُسے درد بھرے افسانے
کیوں چھلک جاتے ہیں لبریز ہوں جو پیمانے
اپنے بن جاتے ہیں اک آن میں کیوں بیگانے
کیسے دیوانوں نے آباد کئے ویرانے
اور جب کھولوں گا ماحول و وراثت کے راز
تیز سانسوں میں بدل جائے گی اُس کی آواز

(۵)

ماند پڑ جائیں گے جب چرخ پہ تاروں کے ہجوم
پھیل جائیں گے پُر انوار غباروں کے ہجوم
بولے گی دھیرے سے رکھ کر میرے شانے پہ سر
"دل میں قوت ہو تو ماحول سے کیا خوف و خطر
"میں کسی اور کی ہو جاؤں تو تُف ہے مجھ پر
"مرے اس عہد کے ضامن ہیں مرے دیدۂ تر
"دہر کا خوف نہیں آپ اگر میرے ہیں۔
"آپ اِک آج نہیں۔ زندگی بھر میرے ہیں"

(۶)

یہ کھنڈر سے فصیلیں ہیں۔ مرے دل! خاموش
ہو نہ جائے وہ کہیں شرم کے مارے روپوش
لیکن افسوس یہ کیا سانحہ اب یاد آیا
اُس نے ماحول کے عفریت سے دھوکا کھایا۔
اُس نے مدت سے مجھے یاد نہیں فرمایا
مفت میں اُس نے مرا غنچۂ دل چٹکایا
بک گئی وہ تو کسی اونچے زمیندار کے ہاتھ
اور سونپا ہے مجھے تقدیرِ فسوں کار کے ہاتھ۔

ساقی نومبر ۱۹۴۱ء — احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی کی مندرجہ بالا تخلیق بظاہر ایک واقعاتی نظم ہے لیکن بباطن ایک ایسی مثنوی ہے، ایک ایسی کہانی جس میں قصے کے کئی پہلو موجود ہیں۔ بنیادی فسانہ پہلے اور آخری بند میں ختم ہو جاتا ہے پھر درمیان کے باقی چار بند کیوں؟ — پہلے بند میں ایک شخص، —— دیوانہ، بستی سے نکل کر کسی کھنڈر کی جانب جا رہا ہے، اور آخری بند میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہی دیوانہ اب کھنڈر کے قریب آکھڑا ہوا ہے لیکن آگے بڑھنے سے جھجک رہا ہے کیونکہ اُسے اپنا المناک فسانہ یاد آ گیا ہے —— یہ فسانہ جدائی کا فسانہ ہے اور درمیانی چار بند ملن کی حکایت بیان کر رہے ہیں —— ظاہراً یہ دوسری حکایت بھی اسی پہلے کردار سے تعلق رکھتی ہے، یعنی وہ اُجڑے ہوئے قصر کی طرف جاتے ہوئے اپنے دل میں بیتی باتوں کے نقوش تازہ کئے جا رہا ہے لیکن مجھے شک پیدا ہوتا ہے کہ یہ دو کردار ہیں جن کا اظہار فن کار نے بظاہر ایک کردار کے ذریعے سے کیا ہے۔ اس لئے میں اس نظم کا قصہ یوں بیان کروں گا:۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ احمد ندیم قاسمی، اس نظم کا شاعر کسی گاؤں میں جا پہنچا۔ اس شاعر کی ذہنیت رومانی تھی۔ اسی لئے جب اُس نے اس گاؤں میں ایک شام کسی دیوانے کو بستی سے باہر جاتے ہوئے دیکھا تو سوچ آئی کہ اس کی دیوانگی کا سبب کیا ہے، اور حقیقت پرستانہ رجحان اُسے آخری بند کی طرف لے گئے یعنی ممکن ہے اس کی محبوبہ کی شادی کسی زمیندار کے ساتھ ہو گئی ہو اور اب یہ اُس کے غم میں ہر بات سے بیگانہ ہو چکا ہے لیکن یہ سوچ کر ایک وجہ تو پیدا ہو گئی لیکن شاعر کے ذہن کو تسکین نہ ہوئی چونکہ دیوانے کا افسانہ اس کے ذہن میں تخلیق پا چکا تھا، اس لئے وہ جھٹ اُس کے ماضی کی طرف رجوع کر گیا، جو ممکن ہے کہ اس کا اپنا حال ہو، چوتھے بند میں شاعر کہتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ سے ملنے پر اُسے درد بھرے افسانے سنائے گا، نیز یہ بھی بتائے گا کہ کیونکر دیوانوں کے دم سے ویرانے آباد ہوا کرتے ہیں۔ میری افسانوی وضاحت کا جواز یہیں ہے۔ اس بند میں دیوانوں کا ذکر ہی یہ سراغ دیتا ہے کہ اس خوش قسمت نوجوان کے افسانۂ محبت سے پہلے کوئی ایسا واقعہ ہو چکا ہے جس میں کوئی محبت کا مارا بدقسمت فرطِ غم سے ہوش و خرد کھو بیٹھا تھا۔

اب سوال پیدا ہو گا کہ پہلے اور آخری بند میں بھی تو شاعر اپنے آپ ہی سے مخاطب ہے، اپنا ہی ذکر کر رہا ہے۔ اس کا جواب یہ ہو گا کہ فن کار کا ذہن نظم کے تخلیقی عمل میں دیوانے کی دیوانگی کا سبب تلاش کرتے

ہوئے اپنی اور اس دیوانے کی ذات کو جس سے اُسے ایک گونہ ہمدردی پیدا ہو گئی ہے آپس میں خلط ملط کر گیا ہے۔ اُسے تو صرف "عیشِ امروز" سے تعلق ہے جس میں "نہ فردا ہے نہ دوش" ——— اسی لئے وہ اپنے حال سے ایک غیر شخص کے "ماضی" کو اُلجھا دیتا ہے۔

فنی لحاظ سے بھی ایک دو باتیں توجّہ کے لائق ہیں بیان کے لحاظ سے ——— "وہ یہ پوچھے گی بھلا آپ یہاں کیوں آئے، میں کہوں گا یہ مجھے بخت سے پوچھا جائے" اور آخری بند میں "ہو نہ جائے وہ کہیں شرم کے مارے روپوش" کے علاوہ چوتھا بند تمام دکمال دیکھئے۔

یہ افسانہ گاؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس حقیقت کی طرف صرف تین لفظ اشارہ کر رہے ہیں "گاؤں، بستی اور زمیندار" ——— یہ کنائتی خوبی بھی قابلِ تعریف ہے۔

آخری بند میں "اس نے مدّت سے مجھے یاد نہیں فرمایا" ——— فرمایا کی وجہ سے اور "مفت میں اس نے مرا غنچۂ دل چٹکایا" ——— ویسے ہی نالتو معلوم ہوتے ہیں۔ ان دو مصرعوں کی ضرورت نہ تھی لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہ نظم پابند ہے اور ہر بند کو ہر دوسرے بند سے تطابق ضروری۔

پانچویں بند کا چھٹا مصرعہ ہے "میرے اس عہد کے ضامن ہیں مرے دیدۂ تر" ——— میں مرے کی بجائے اگر "یہ دو" ہوتا تو بہتر تھا۔ کیونکہ اس صورت میں نہ صرف تکرار اللفظی کا عیب دور ہو جاتا بلکہ معنوی لحاظ سے بہیر دمن بالکل قسم کھائی ہوئی محسوس ہوتی۔

میراجی

شعر

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب اس کو نہیں آتا، انہیں غصّہ نہیں آتا

اکبر الٰہ آبادی

نقد و نظر

کتاب العلم

انگریزی کے مشہور انشا پرداز آلڈس ہکسلے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ دنیا کے کسی موضوع پر کوئی مضمون لکھنا ہو تو کسی اچھے کتب خانے میں ایک گھنٹہ صرف کرنے سے یہ کام ہو سکتا ہے، گویا کسی کتب خانے میں پہنچ کر آلڈس ہکسلے اور اس کی قسم کے اور افراد بہت اطمینان محسوس کرتے ہیں کہ لو، اب کیا ہے، اب تو کام ہو جائے گا۔ لیکن میرا تجربہ اس سے مختلف ہے۔ کسی لائبریری کے دروازے میں قدم رکھتے ہی مجھ پر ایک ہیبت سی چھا جاتی ہے۔ ایک ایسا تاثر حیرانی کا پیدا ہوتا ہے جس سے شاید اُس انگریز فوجی افسر کو دوچار ہونا پڑا ہو۔ جو اتفاقاً شکار کرتے کرتے اجنتا کے غاروں پر جا پہنچا تھا۔ ان غاروں میں داخل ہوتے ہی ایک نئی دنیا انسان کے پیش نظر ہو جاتی ہے۔ کسی لائبریری میں قدم رکھنے پر مجھے بھی کچھ ایسا احساس ہوتا ہے۔ اسی کو ڈاکٹر تاثیر نے ایک نظم میں یوں بیان کیا ہے:۔

چھا جاتی ہے مجھ پر ہیبت۔ اللہ اللہ تیری قدرت!
گہری جھیلیں، اونچے اونچے پربت!
اللہ اللہ تیری قدرت۔

اور اگر کبھی کسی غیر معمولی طور پر اچھی کتاب سے میں دوچار ہو جاؤں تو وہ مجھے کسی اونچے پربت کا احساس دلاتی ہے۔ — انگریزی کتب خانوں میں ایک ایسا اونچا پربت ہر کسی نے دیکھا ہوگا — انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، لیکن اردو لائبریریاں اس ضروری چیز سے اب تک عاری تھیں۔ دس بارہ سال سے اوپر گذرے کہ مولوی حفظ الرحمٰن کی حفظ العلوم کے چرچے شروع ہوئے، اور ایک سرسراتی ہوئی کیفیت بن کر رہ گئے۔ ایک بار اور بھی کچھ اس قسم کا ذکر سنا لیکن وہ بھی تشنۂ تکمیل ہی رہا — گئے دنوں دکن سے بھی ایسی ہی ایک خبر کا اشتہار آیا، لیکن اچانک دو جوانمردانِ پنجاب نے کسی برق کی طرح اپنی محنت کا نتیجہ کتاب العلم کے جزو اوّل کی صورت میں لا پھینکا زیرِ نظر تالیف کتاب العلم کا جزو اوّل ہے۔ بڑی تقطیع کے ڈیڑھ سو صفحات اس کا حجم ہیں۔ اور یہ تمام مواد بلاکوں کے ذریعے سے شائع کیا گیا ہے جس سے نہ صرف پہلو بہ پہلو تصاویر کی اشاعت میں آسانی ہو گئی ہے۔ بلکہ لیتھو کے رعایتی اغلاط سے بھی چھٹکارا مل گیا ہے اور صوری حسن میں بھی اضافہ ہوا ہے —

اور ابھی اس قسم کے ننانوے (۹۹) جزو اور شائع کئے جائیں گے۔ تب کہیں جا کر یہ عظیم الشان کام تکمیل کو پہنچے گا — یہ تو ہوئیں چند ظاہری باتیں، معنوی لحاظ سے سب سے پہلی بات جو ہمیں نظر آتی ہے وہ اس کی ترتیب ہے۔ یہ ترتیب حروف تہجی کے بجائے موضوعی لحاظ سے کی گئی ہے اور حوالے کی آسانی کے لئے ہر جزو کے ساتھ ایک فہرست کا وعدہ بھی ہے موضوعی لحاظ سے ترتیب رکھنے کا فائدہ یہ نظر آتا ہے کہ بعض بھی ہر جزو ایک مکمل کتاب رہے گا۔ جزوِ اول مندرجۂ ذیل موضوعات پر حاوی ہے:

کائنات، معدنیات، حیاتیات، انسانیات، مُلکیات، کیمیا و طبیعیات، ایجادات، فنونِ لطیفہ، تاریخیات، زرعیات، ادبیات، نظریات، دینیات، نقصہ جات، شخصیات، استفسارات، میکانیکیات، تفریحات، صحتیات، اقتصادیات، — ان عنوانات کے ماتحت اکثر ایک دو اور بعض دفعہ زیادہ تعداد میں مستقل مضامین موجود ہیں۔ اسی ڈھب پر آئندہ اجزا کی تشکیل ہوگی، اور جب سو اجزا جن سے پانچ پانچ کی بیس جلدیں مرتب ہوں گی شائع ہو چکیں گے تو ایک مختصر اور جامع لائبریری ہر اُس شخص کے پاس موجود ہو جائے گی جو ابھی سے باقاعدگی کے ساتھ اس کے ہر جزو کو خریدنا شروع کر دے گا۔

اس کتاب کا زیادہ تر مواد مغربی مآخذ کا مرہون منّت ہے، اور اب تک محض دو جواں ہمّت حضرات کی توجہ سے تکمیل پایا ہے۔ یعنی میرزا محمد سعید بیگ اور محمد اسماعیل نعیم — اتنی بڑی اور جامع کتاب کی تمام تر تکمیل کا بار صرف دو حضرات کے سپرد نہ ہونا چاہیے۔ اُن دو انسانوں نے یہ کیا تھوڑا کام کیا ہے کہ اب تک جس کام کو ادارے نہ کر سکے، انہوں نے کر دکھایا ہمارے خیال میں آئندہ کے لئے دونوں مرتب اگر اپنی نگہداشت میں ہر موضوع کے لئے مختلف لکھنے والے ماہرین کو مقرر کر کے مزید تالیف کا کام ایک اداراتی تشکیل میں کریں تو اس سے نہ صرف ان کا بار ہلکا ہو جائے گا بلکہ ہر موضوع بہتر طور پر مکمّل ہو سکے گا۔ اس جزو اوّل کی قیمت تین روپے

بارہ آنے ہے۔ اور توقع ہے کہ تمام کتب خانے تمام سکول اور ہر امکانی اردو دان فرد اس کو خرید کر اس عظیم الشان کام میں مدیرانِ اعلیٰ کا ہاتھ بٹائے گا۔ ملنے کا پتہ:۔ ایسٹرن پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ لاہور

کمپنی کی حکومت مؤلفہ باری۔ ناشر:۔ مکتبہ اردو لاہور۔ دوسرا ایڈیشن قیمت دو روپے (۲ے)

مغلیہ زوال کے بعد سے لے کر غدر (۱۸۵۷ء) تک کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ کے طالب علم کے لئے ایک ایسی اہمیت رکھتا ہے جس کی تشنگی کو اب تک غیر ملکی زبانوں کی کتابیں ہی مٹا سکتی تھیں لیکن ظاہر ہے کہ اُن کتابوں میں خواہ اُن کے لکھنے والے کتنے ہی غیر جانبدار کیوں نہ ہوں۔ ہندوستانی نقطۂ نظر کا لحاظ خاطر خواہ طور پر نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ ذاتی طور پر راقم الحروف کی نظر سے آج تک صرف ایک کتاب، ایڈورڈ تھامسن کی تصویر کا دوسرا رُخ گذری ہے جسے لائق تحسین کہا جا سکتا ہے۔

اردو زبان میں اگرچہ مذکورہ بالا کتاب کا ترجمہ دیر ہوئی شائع ہو چکا ہے۔ لیکن ذاتی سوچ بچار کے بعد ایک خاص زاویۂ نگاہ سے اس ہنگامی زمانے کا جائزہ جس میں کمپنی کی حکومت ایک بڑھتے ہوئے ناسور کی طرح بھارت کے جسم پر قائم رہی سب سے پہلے اردو میں اُس پُرجوش اور نوجوان مصنف نے لیا ہے جو ادبی حلقوں میں باری کے مختصر نام سے مشہور رہے۔

زیرِ نظر کتاب کے متعلق تفصیل کے ساتھ کچھ کہنا لاحاصل ہے کیونکہ دو سال کی مختصر مدت میں اس حقیقت کے باوجود کہ تاریخ کتاب خریدنے والوں کی نظر میں ایک خشک موضوع ہے۔ اس کی دوسری اور پہلے سے زیادہ جامع اشاعت اس کی خوبیوں اور دلچسپی کی ضامن ہے۔ اُمید ہے کہ موجودہ اشاعت جہاں تاریخ کے موضوع میں نوجوانوں کے لئے دلچسپی پیدا کرنے کا باعث بنے گی وہاں اردو کے لکھنے والوں کو بھی اس قسم کے دوسرے اہم موضوعات کی طرف توجہ دلائے گی۔

میر محمد مومن از ڈاکٹر (سید) محی الدین قادری زور۔ ناشر ادارہ ادبیاتِ اردو، خیریت آباد۔ حیدر آباد (دکن) حجم تین سو گیارہ صفحات مجلد باتصویر قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ آپ انہی صفحات میں ڈاکٹر زور کی ایک نہایت اہم کتاب "محمد قلی قطب شاہ" کا ذکر پڑھ چکے ہیں جن لوگوں نے اس کتاب کو پڑھا ہوگا۔ اغلب ہے کہ اُن کے دل میں ایک سوال پیدا ہوا ہو:۔ محمد قلی قطب شاہ جن سماجی تمدنی اور علمی ادبی باتوں میں اپنے دورانِ حکومت میں دلچسپی لیتا رہا، اُن کے لئے اُس کے پاس وقت کہاں سے آیا، وہ اپنی شعر و شاعری اور رنگ رلیوں کے باوجود اپنے زمانۂ حکومت کو ایک پُرامن اور خوشحال عہد کیونکر بنا سکا۔ ڈاکٹر زور کی زیرِ نظر تالیف اسی بات کا جواب ہے میر محمد مومن محمد قلی قطب شاہ کا وزیر اعظم تھا اور یہ اُسی کے تدبّر اور حسنِ انتظام کا نتیجہ تھا کہ محمد قلی کا دور ایک مثالی زمانہ نظر آتا ہے۔ اس سے پیشتر جس طرح ہمیں محمد قلی کے حالات سے کوئی واقفیت نہ تھی اسی طرح اس کے لائق وزیر کے کارناموں کا بھی علم نہ تھا۔ ڈاکٹر زور نے اپنی روایتی تحقیق اور دلچسپ اندازِ بیان سے کام لیتے ہوئے بادشاہ کے بعد اُس کے لائق وزیر سے بھی ہمیں شناسا کیا ہے۔

جزیرۂ سخنوراں۔ از غلام عباس۔ ناشر۔ کتاب خانہ ہزار داستان ۲۴۔ بازار لین نئی دہلی قیمت ایک روپیہ۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔

آندرے موروا فرانسیسی زبان کا بلند پایہ ادیب ہے۔ کہنے کو تو مندرجہ بالا کتاب اُس کی ایک تصنیف کا چربہ ہے لیکن جس انداز سے اردو میں اُسے ڈھالا گیا ہے۔ اس سے ظفر عمر کی نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری کی یاد تازہ ہو جاتی ہے

شاعر اور ادیب اپنے انسانی جامے کے باوجود ایک ایسی مخلوق معلوم ہوتے ہیں جو کسی حد تک عجوبہ نظر آتی ہے۔ اور پھر اُردو زبان میں اُس دور کے شاعر جو لکیر کے فقیر بن کر ہی رہ گئے تھے اس لحاظ سے اور بھی عجیب ہیں۔ یہ کتاب ایسے ہی شعراء پر ایک کامیاب اور لطیف طنز ہے۔ مؤلف نے جس محنت اور بے ساختگی کے ساتھ شعراء کے مشاعرے اور دوسری کارگزاریوں کا ذکر کیا ہے وہ تعریف سے بالا ہے اور اس پر کتاب کی زبان ایک حیران کر دینے والا اضافہ کہ ایک پنجابی بھی ایسی صاف ستھری زبان لکھ سکتا ہے جسے دہلی اور لکھنؤ والے بھی کم سے کم گوارا تو ضرور کر لیں۔

فہرستِ مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء

جلد ۲　　نمبر ۱

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک و روی پی پانچ روپے۔ ممالک غیر سے دس شلنگ۔ قیمت فی پرچہ آٹھ آنے (۸؍)

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپا اور دفتر ادبی دنیا دہلی مال لاہور سے شائع ہوا

دنیائے فلم

خاندان

شمالی ہندوستان میں جتنی اردو فلمیں اب تک بنائی گئی ہیں بلاشک وشبہ کہا جاسکتا ہے کہ خاندان ان سب میں اچھی ہے۔ شمالی ہندوستان کی فلم انڈسٹری اب ان نقائص سے مبرا ہو رہی ہے جو اس کی ابتدا میں پائے جاتے تھے۔ جہاں تک خاندان کے افسانے کا تعلق ہے وہ کم وبیش اودھ کی تہذیب کا ترجمان ہے اور پلاٹ کے مختلف حصص کی نوعیت کے اعتبار سے معاشرت کا اصلاحی مقصد سامنے رکھتا ہے۔ ہندوستان کی قومی زندگی میں ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت ظاہر ہے۔ خاندان میں اس ضرورت کا احساس کرایا گیا ہے۔ مکالمے سید امتیاز علی صاحب تاج نے لکھے ہیں جو خاصے دلچسپ موثر اور شستہ ہیں۔ مناظر صدا بندی فوٹوگرافی سبھی لائق تحسین اور موسیقی جسے خزانچی کی شہرت رکھنے والے ماسٹر غلام حیدر نے مرتب کیا ہے۔ خاص طور پر بلند پایہ ہے۔

اداکاروں میں سے ابراہیم۔ غلام محمد۔ نورجہاں کا ایکٹنگ بہت اچھا ہے۔ اس فلم میں ایک دو خامیاں بھی نظر آئیں۔ مثلاً ابراہیم کے علاوہ باقی بیشتر اداکاروں کا تلفظ بہت حد تک قابلِ اصلاح ہے۔ اداکاروں کے انتخاب میں نورجہاں اور منور ملک کے علاوہ دوسرے انتخاب چنداں موزوں نہیں لیکن فلم بحیثیت مجموعی قابلِ دید ہے۔

"ایک رات"

مسٹر ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد "ایک رات" کی شوٹنگ کے آخری مراحل پر ہیں۔ موصولہ اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ ایک رات صحیح معنوں میں ایک بہترین سوشل پکچر ہوگی۔ اس میں پرتھوی راج۔ سنگمہ اور پرکاش تینوں نے ایک مشترکہ گیت گایا ہے۔ اور [illegible] ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش [illegible] ہے۔ ایک رات کا حقوق حاصل کرنے کے لئے ڈسٹری بیوٹروں میں مقابلے کی سپرٹ پائی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ ملک بھر کے تمام حصوں کے لئے ایک رات کے حقوق فروخت ہو چکے ہیں۔ ایک رات کی سٹار نینا انتہائی خوش اسلوبی سے اپنا پارٹ انجام دے رہی ہے۔ [illegible] دلکشی کے نقوش اور اس کی آواز کا سحر سیلولائیڈ پر کامیابی سے منتقل کئے جا رہے ہیں۔ نینا اس لمحے کا انتظار کر رہی ہے جب وہ اپنے بہترین [illegible] م کو پردہ [illegible] پر دیکھے گی۔

راجہ رانی

بیر اترتے پکچرس کی دوسری سوشل فلم ہے جو اس سے قبل چرلوں کی داستان جیسی پکچر تیار کر کے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ منروا ٹاکیز دہلی میں ۳ر اپریل سے اس کی نمائش شروع ہے اور خوب رش لے رہی ہے۔ اس تصویر سے پبلک کی غیر معمولی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پبلک اعلیٰ معیار کی تصاویر کی کس قدر بھوکی ہے۔ سکندر فلم کی ہیروئن ونمالا نے اس تصویر میں بھی ہیروئن کا پارٹ ادا کیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس تصویر میں ونمالا کا کام اس قدر بلند ہے کہ مشکل ہی سے دوسری ایکٹرسیں اس معیار کی اداکاری پیش کر سکتی ہیں۔

پربھات کے پڑوسی کی شہرت کے مالک مظہر خاں بھی اس تصویر میں ایک نہایت اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ دوسرے اداکاروں کا کام بھی بے حد ممتاز ہے تصویر کی خصوصیات [illegible] معیار کو دیکھتے ہوئے امید کی جاتی ہے کہ یہ تصویر شمالی ہند میں ایک نیا ریکارڈ قائم کرے گی۔

راجہ رانی کوئی خاص افسانہ نہیں ہے بلکہ روزمرہ کے خاندانی واقعاتِ زندگی کو ایک سلسلے میں مربوط کر دیا گیا ہے جس میں افسانوی رنگ کی جھلک تک نہیں۔ یہ شمالی ہند کے ہر متمدن خاندان کی گھریلو کہانی ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کے مصنف [illegible] ڈائرکٹر نے کسی نفسیاتی سکول میں تجرباتی اور عملی تعلیم پائی ہے جس کا پرتو ہر مقام پر نمایاں ہے۔

ایڈورٹائزنگ منیجر

بزم ادب

کاغذ کی نایابی نے ہماری اُن تمام کوششوں پر پانی پھیر کر رکھ دیا ہے جو ہم "ادبی دنیا" کی اشاعت کو وقت پر لانے کے لئے کر رہے تھے۔ ادبی دنیا کے سائز کا کاغذ مارکٹ میں کسی قیمت پر بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ اس لئے اب سائز ہی کو تبدیل کرنا پڑے گا۔ اور پھر شاید ہم اشاعت کی تاخیر کا ازالہ کر سکیں ہمارے بہت سے ناظرین اس تاخیر پر ہم سے ناراض ہیں اور بعض تو خریداری کا سلسلہ منقطع کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ کاش ہم انہیں کسی طرح اُن تکالیف کا ایک ہلکا سا اندازہ بھی کرا سکتے جو کاغذ کی فراہمی کے سلسلے میں ہمیں اٹھانی پڑ رہی ہیں۔ حالات پر ہمارا قابو نہیں۔ جنگ کے ناگوار اثرات شدید سے شدید تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ادبی دنیا کے ہر پرچے پر دوسرے پرچوں سے دُگنا تگنا کاغذ خرچ آتا ہے جسے ایک ایک رم کر کے فراہم کیا جاتا ہے۔ ہفتوں یہ سعیِ ناتمام جاری رہتی ہے۔ تب کہیں ایک پرچے کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ ہم اس ناگوار صورتِ حال سے عہدہ برا ہونے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ ناظرین کو کچھ عرصے کے لئے پرچہ دیر سے ملے گا لیکن یہ کبھی نہیں ہوگا کہ کوئی اشاعت درمیان میں سے غائب ہو جائے۔ امید ہے کہ آپ ہماری مجبوریوں کو مدِ نظر رکھ کر ہم سے پورا تعاون کریں گے۔ اور پرچے کی تاخیر کو کچھ عرصے کے لئے نظر انداز کر دیں گے۔

اس اشاعت میں حسن عسکری صاحب کا ایک نہایت کامیاب افسانہ "چائے کی پیالی" شامل ہے۔ عسکری حیرت انگیز طور پر ترقی کر رہا ہے۔ اور اُس کی تصویر بندی اسی انداز پر جاری رہی تو وہ دن دور نہیں جب اُسے اردو ادب میں وہی درجہ حاصل ہوگا جو مغربی ادبیات میں پراؤسٹ کو حاصل ہے۔ عسکری کی نمایاں خصوصیت اُس کی مسلسل اور مستقل تصویر بندی ہے اور اس خصوصیت میں ہمارے ہاں کا کوئی مصنف اُس کی ہمسری نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ تخیلات اور جذبات کو جس خوبی سے وہ احساسات میں منتقل کرتا ہے، وہ کچھ اسی کا حصہ ہے۔ "چائے کی پیالی" زبان و بیان کے لحاظ سے بھی ایک غیر معمولی چیز ہے اور اس کے عنوان کو جناب عسکری نے جس خوبی سے اپنے محبوب موضوع، عیسائی لڑکی کے کردار پر چسپاں کیا ہے اور جس انداز سے انہوں نے اس ننھی سی پیالی میں طوفان بپا کیا ہے۔ اُس کی داد کچھ اہلِ ذوق ہی دے سکتے ہیں۔

اردو ڈراما کے مختلف پہلوؤں پر سید بادشاہ حسین نے جن سیر حاصل اور جامع مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا ہے "اردو ڈرامے کی پیدائش" ان میں ایک قابلِ ذکر اور اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ سید صاحب کی دقتِ نظر اور عالمانہ استدلال اس قیمتی مضمون کی ہر ہر سطر سے عیاں ہے اور ہمیں امید ہے کہ اسے نہایت دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

راشد صاحب سے معذرت

ادبی دنیا کے پچھلے شمارے کے حصۂ نقد و نظر میں جناب ن م راشد کی تصنیف "ماورا" پر تبصرہ کے دوران میں "ماورا" کو خوشنویس کی غلطی اور سنگ ساز کی غفلت نے ایک نہیں بلکہ چار پانچ جگہ "ماورا" سے بنا دیا اور ہمیں پتہ اس وقت لگا جب پرچہ چھپ کر سامنے آگیا۔ اس فروگذاشت کا ہمیں بے حد افسوس ہے۔ امید ہے کہ راشد صاحب اس معذرت کو قبول فرمائیں گے۔

صلاح الدین احمد

آنکھیں

تری مسکراتی یہ تابندہ آنکھیں
ہے گہوارۂ دوشیزۂ صبحِ نَو کا
کہ آکاش کے دو ستاروں کا سنگم
بھٹکتے ہوئے جیسے دو نیلے شبنم

مجھے اڑنے دے ان کی اودی فضا میں
یہاں تک کہ ان وسعتوں سے گزر کر
میں ہو جاؤں گم ان کی گہرائیوں میں
روپہلی سنہری سی پرچھائیوں میں

علی احمد بی اے

دیہاتی لاری

"سولہ" بیٹھنے کا "حق" حاصل "تیس" مسافر۔ یہ کیا سوانگ بابو! اس قانون کی ہم نے رشوت دے کر توڑی ٹانگ
چھت پر۔ ایسے۔ اتنے بوجھے۔ انمل بے جوڑ۔ اوٹ پٹانگ
"بستر" "نقلی گھی کے پیپے" "شکر" "تمباکو" "بسکٹ"۔ "رانگ" جی ہاں! جتنے جانے والے آتے جائیں اتنی مانگ

چار کے چھ بجنے والے ہیں، چل کلو "اسٹارٹ" تو کر "موٹے" "آدھا" "راونڈ" لگا کر ہانپ گیا۔ ہٹ! دیکھ ادھر
لے یہ دو یہ دس یہ بارہ۔ آئیں! "کھٹ کھٹ گر گر گر"
ہنستا کیا ہے۔ شرط رہی کچھ۔ بند نہ ہو "پٹرول" اگر "پاگل پن ہے" بھروسہ کرنا "گھٹیا" "کاربوریٹر" پر

یہ "بے چارہ" "ٹھیک ہے! دو دن سے ہی "ٹکر "وسن ایل" تو پھر؟ "فلٹر" "گاڑھی" گاد میں بھر جانے سے بگاڑے کھیل تو پھر؟
"خوب صفائی کی تھی" جو نکلی میل کی "ریلا پیل" تو پھر؟
"کام چور" تو بھولا ہے "ٹنکی" میں بھرتا تیل تو پھر! پانی جس پر بند ہوا ہو۔ منڈھے چڑھے وہ بیل تو پھر؟

کلو تیلی کا بیٹا گھر سے لانے دوڑا اٹھکل چال لدے پھندے پنجرے کے اندر گھس آیا اخلاقی کال
"ہندو مسلم" جھگڑے نے دی موقع پا کر۔ ہڈی ڈال
ٹھہرے آگ بگولہ دونوں۔ تیور کڑوے۔ "آنکھیں لال" "بربر" "شامی" جوش میں آئے۔ "اکڑی" "اینٹھی" بھاجی۔ دال

عمامہ نے گھونسا تانا۔ پگڑی نے کی "گالی سر" جنسیاتی "درد و وظائف"۔ عضو باتی "نقد و نظر"
اس کا ہاتھ گریباں اس کا۔ اس کا جوتا اس کا سر
"ثالث" "سمعی صلح" ہیں "حیران" یہ "اسمٰعیل" وہ "ہٹلر" دونوں کے دونوں دلوانے دونوں کے دونوں "حق" پر

نہا لے دار کی صورت دیکھی۔ "بلوہ ختم" فضا خاموش "دمکو" کے جھاگوں کی صورت "سمٹا" "بیٹھا" قومی جوش
نتھنے سکڑے۔ چہرے اترے۔ کپڑے سنبھلے۔ آیا ہوش
کیا احباب "صوف و بریشم" کیا ارباب "کھدر پوش" ہیں ممنون سیاست دونوں ان کا جرم نہ ان کا "دوش"

شاد عارفی

چائے کی پیالی

حالانکہ وہ یہ دیکھنا تو چاہتی تھی کہ اس ایک سال کے دوران میں کون کون سی نئی دکانیں کھلی ہیں، کون کون سے پرانے چہرے ابھی تک نظر آتے ہیں، وہ گورا گورا سُنار کا لڑکا اب بھی دکان پر بیٹھا ہوا اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہتا ہے یا نہیں، سنگر کے ایجنٹ کے یہاں وہ ننھی سی سینے کی مشین ابھی تک سامنے رکھی ہے یا بک گئی۔ مگر جب تانگے والے نے شہر سے باہر باہر جانے والی سڑک پر تانگہ موڑا تو اُس نے کوئی احتجاج نہ کیا، بلکہ اپنی نگاہیں گھوڑے کی طرف پھیر لیں۔ وہ گزرتے ہوئے مکانوں پر دوسری نظر ڈال کر انہیں اتنی اہمیت ہی کیوں دے! وہ اس زبردست تحریص کا اتنی کامیابی سے مقابلہ کر سکنے پر خوش تھی، اور خود کو بڑا ہلکا اور سُبک محسوس کر رہی تھی جیسے وہ کسی بڑی آزمائش سے اپنے آپ کو صحیح و سالم نکال لائی ہو۔ اُس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا، اور سیٹ پر خوب کھُل کر بیٹھ گئی۔ بے شمار دوڑتی ہوئی لکیریں تانگے کے نیچے سے نکلی چلی جا رہی تھیں — بیچ مقدار اور ناچیز بلکہ مضحکہ خیز لکیریں — اور وہ بلندی پر بیٹھی ان کی سراسیمگی سے لُطف اُٹھا رہی تھی۔ اگر وہ بازار کے راستے سے جاتی تو گھوڑا گن گن کر قدم رکھتا، اور وہ کسی نہ کسی دکان کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتی۔ اتنی بات تو ضرور تھی کہ دُکاندار اُسے دیکھ کر چونک سے پڑتے، اُن کی نگاہیں دُور تک اُس کا پیچھا کرتیں، اور وہ سوچتے "اُفوہ، اب یہ کتنی شاندار ہو گئی ہے! اُس کے بال کیسے چمکیلے ہیں، اور کپڑے کتنے عمدہ ہیں!" مگر اُن کے دل میں تجسّس اور تحیّر کبھی نہ پیدا ہوتا، اور نہ اُن کی آنکھوں کی جھپک یہ پوچھتی "کون ہے بھئی یہ؟ کہیں باہر سے آئی معلوم ہوتی ہے"۔ اس کے خلاف اُن کا انداز تو کچھ سرپرستانہ ہوتا، اور اُن کے خیالات کچھ اس قسم کے ہوتے "بھئی، ہماری اس لڑکی نے تو خوب رنگ روپ نکالا ہے! شاباش! شاباش! جیسے اُس کے رنگ روپ نکالنے میں اُن کی کوششوں کو بھی دخل ہو، اور وہ اُس سے زیادہ اپنے آپ کو ایسی پُرتجمّل چیز کے حصول پر مبارکباد دے رہے ہوں۔ اُن کی ہلکی زیرِلب مسکراہٹ سے معلوم ہوتا کہ وہ یہ پوچھنے والے ہیں "کہو، اچھی تو رہیں؟ بہت دن میں دکھائی دی ہو"۔ یا پھر جیسے اُنہیں یہ توقع ہو کہ وہ اُن کی طرف شناسا نظروں سے دیکھ ہی تو لے گی۔ سڑک کے گڑھے تک یہ پروا نہ کرتے کہ وہ اب یہاں کے ... "مشن گرلس اسکول" میں نہیں پڑھتی جس پر دھندلے اردو حرفوں میں "لڑکیوں کا مدرسہ" لکھا رہتا ہے، بلکہ ایلن کے "کریسچین گرلس انسٹی ٹیوٹ" کی طالب علم ہے۔ اور نہ وہ اس پر خفیف ہوتے کہ وہ جھٹکے دے دے کر اُسے ہلائے ڈال رہے ہیں۔ وہ تو بس زمین پر پڑے پڑے گستاخانہ کہتے رہتے "ارے اب تم سے کیا ڈر۔ تم کوئی غیر تھوڑی ہو۔ مہینوں تم ادھر سے اسکول آتے جاتے گزرتی رہی ہو۔ نہ جانے کتنی بار تمھارے ٹھوکریں لگی ہیں۔ اور ایک دفعہ تو شاید تمہارے پیر میں موچ بھی آ گئی تھی"۔ بس بالکل اُس بسکٹ بنانے والے کی طرح جو اُسے دیکھ کر اپنے ہاتھوں اور چہرے سمیت کھڑا ہو جاتا اور کہتا "اوہ، یہ تو وہی ہے عیسائی کی —" اور دُکانوں کے چھجّوں اور پردوں کے سائے تو دونوں طرف سے اُسے گھیر لیتے، کھسکتے، رینگتے، گھسٹتے اس کے پیچھے پیچھے چلے آتے، اُس کے قدموں سے لپٹے جاتے، اُس کے جسم سے کہیں نہ کہیں چپک جانے کی کوشش کرتے، بے کسی کے لہجے میں، بھنچے ہوئے گلے سے کہتے، جیسے جان توڑ رہے ہوں "بس ایک لمحہ ٹھیر جاؤ ... بس ایک نظر ... اپنے پرانے سایوں کی طرف"۔ اور اُن کی یہ عاجزی اور منت سماجت بے کار نہ جاتی۔ اُس کے ڈھیلا پڑتے ہی وہ اُس کے دل میں گھُس آتے اور سینے میں ٹانگیں پھیلا کر سو جاتے، یہاں تک کہ اُس کا سر

ڈھاکاٹ جاتا، سانس ہلکا مگر بھاری بنتھر ہو جاتا، اور اُس پر کسل مندی طاری ہو جاتی جس میں بے چینی بھی شامل ہوتی لیکن تانگے والے کی صرف ایک اضطراری حرکت نے اُسے ان تمام سیپجی ہوئی، چپچپاتی اُلجھنوں اور جھنجٹوں سے بچا لیا تھا۔

وہ اب کتنی آزاد اور ہلکی پھلکی تھی، اُس کی شخصیت گھل کر دوسری چیزوں میں نہیں مل جا رہی تھی۔ وہ اپنا آپ تھی، صرف اور محض ——— مس ڈولی روبنسن ——— بغیر کسی جمع تفریق کے۔ گلابی فراک، سفید دوپٹہ، اور اونچی ایڑی کا کالا جوتا پہنے ہوئے، سفید چکنی پنڈلیاں تانگے پر مضبوطی سے جمی ہوئیں، کُہنی تکیے پر، شہرے بندے دونوں طرف جھُول جھُول کر چمکتے ہوئے، احتیاط سے سنے ہوئے کالے بال، اور پاؤڈر کی خوشبو۔ اگر کوئی اُسے "ڈولی!" کہہ کر پکار لیتا تو وہ تانگے پر پیر اکر کہتی "کیا فرمایا جناب نے؟ ڈولی؟ مگر، معاف کیجئے گا میں تو مس روبنسن ہوں، کرسچن گرلس انسٹی ٹیوٹ ایلی نگر کی ساتویں کلاس کی طالب علم اور میں موجود تو ہوں آپ کے سامنے۔ دیکھ لیجئے، بھلا میں ڈولی ہو سکتی ہوں؟"

اگر وہ محض مس روبنسن بننا چاہتی تھی تو یہاں بھی کوئی سایہ، کوئی سیڑھی، کوئی دہلیز کوئی گڑھا ایسا نہ تھا جو خواہ مخواہ ضد کئے چلا جاتا "مگر تم تو۔ ہم تو تمہیں مدتوں ڈولی کے نام سے جانتے رہے ہیں"۔ شہر کے باہر باہر جانے والی سڑک کی انفرادیت پسند کوٹھیاں اپنے آپ ہی بڑی خوددار، پُرتمکنت اور بے نیاز واقع ہوئی تھیں، وہ باہر کی طرف دیکھتی ہی نہ تھیں۔ اگر وہ اُس پر بڑی مہربان ہوتیں تو ذرا سا مسکرا کر کہہ دیتیں۔ "اچھا، تو آپ کا نام مس روبنسن ہے! جی، بہت خوب"۔ اِن کوٹھیوں کے مطالبوں سے تو وہ یوں آزاد ہو گئی، مگر دوپہر کا سورج تو عملی طور سے اُس کی مدد کر رہا تھا۔ ایک سخت گیر آقا کی طرح اُس نے اپنی نگاہِ گرم سے سارے سایوں کو گھیر گھیر کر سامنے سے بھگا دیا تھا، اور وہ سہم سہم کر دیواروں سے لپٹے جا رہے تھے۔ تیز دھوپ نے عمارتوں کو ایسی آنچ دی تھی کہ اُن کا رنگ ڈھنگ سب اڑ گیا تھا، اور اُن کے دل سے خود نمائی کے ولولے نکل چکے تھے۔ اب تو وہ جلی بھُنی کھڑی تھیں، جیسے کہہ رہی ہوں "چاہے دیکھو چاہے نہ دیکھو۔ جہنم میں جاؤ"۔ جہنم میں جاؤ! اُن کی چڑچڑاہٹ اور کوسنے بھی کتنے مضحکہ خیز تھے۔ تم روٹھے ہم چھوٹے! تانگے کے تختے پر اُس کے پیر کا دباؤ اُسے برابر یاد دلائے جا رہا تھا کہ اُسے ان گردوپیش کی چیزوں پر حاوی ہونے کا حق حاصل ہے کیونکہ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ مس روبنسن ہے جس کے بازو گول اور گداز ہیں اور آستینوں سے باہر نکلے ہوئے! اور پھر یہ بھی کچھ کم نہیں کہ وہ ایلی نگر سے آ رہی ہے جہاں شیشے کی طرح جھلکتی ہوئی کوٹھیاں ہیں، شاندار اسٹیشن اور فرحناک کمپنی باغ۔ اگر وہ یہاں کی عمارتوں کی طرف دیکھ رہی ہے تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ وہ اُس کے لئے جاذبِ نظر ہیں۔ اب کیا وہ آنکھیں بند کر لے! اگر وہ رشک و حسد سے پھُنکی جا رہی ہو تو خیر کر بھی لے۔

اب تک تو وہ اپنے آپ کو ہر قسم کے جادو سے بڑی صفائی کے ساتھ بچاتی لائی تھی، مگر جب وہ اڈے کے قریب کی منڈی میں پہنچی تو اُسے اپنی محبوب شخصیت کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ یہاں کے تربوزوں کے ڈھیروں، اناج کی گاڑیوں، اِکّوں، گھاس والیوں، مونچھوں والے کسانوں، گڑ کی جلیبیوں پر بھنکتے ہوئے تتیوں اور لوہے کی نہ کالنوں کی دوسرے شور و غل سے اوپر سنائی دینے والی ٹھنا ٹھن کے درمیان "مس روبنسن" ایک بے معنی سی بات ہو کر رہ گئی تھی۔ عجیب یا مضحکہ خیز نہیں ——— محض مہمل اور ناقابلِ توجہ جیسے مسٹر تربوز یا میڈم گاڑی۔ یہاں تو وہ محض ایک تانگے میں ایک لڑکی تھی ——— یا، رعایتاً، ایک عیسائی لڑکی۔ بس جیسے ایک اِکّے میں دو مرد، چار عورتیں، پانچ بچے یا گاڑی میں لگا ہوا ایک پہیہ۔ یا ڈھیر میں ایک تربوز۔ ہر چیز کی ہیئت متعین تھی، واضح، واضح، روشن، قطعی، پوری طرح اپنی لکیروں کے درمیان ——— نہ کہیں سے رنگ بہا ہُوا، نہ کہیں دھندلا۔ ہر چیز کی اپنی فردیت تھی ——— علیحدہ، ٹھوس، مستقل، اجری، اپنی جگہ پر مطمئن، مرنجاں مرنج۔ نہ تو وہ دوسروں کی شخصیت کا ایک حصہ دبا لینا چاہتی تھیں، اور نہ گڑگڑا کر التجائیں کرتی تھیں کہ انہیں کوئی اپنے اندر مدغم کرلے۔ بڑا غضب تو یہ تھا کہ وہ عداوت پر بھی آمادہ نہ تھیں۔ ڈھیر میں دبا ہوا تربوز بھی چین سے نیچے پڑا تھا، اور اُسے اوپر والے تربوز سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اور پھر اُن سب نے ایک دوسرے کی فردیت کا احترام کرنے کا کچھ ایسا سمجھوتا کر لیا تھا، اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ رہنے کی ایسی کوششیں ہو رہی تھیں کہ یہاں آتے ہی ہر چیز اپنا اختصاص اور ندرت کھو دیتی تھی ——— ایلی نگر کی مس روبنسن بھی۔ مس روبنسن کے لئے بھی اپنی شخصیت کو منوانے کی کوشش کرنا فضول اور غیر اہم بن گیا تھا۔ نمک کی کان میں آ کر نمک بن جانے کے خلاف مدافعت نہیں ہو سکتی تھی۔ ظاہر میں تو وہ یہاں کے بے ڈھنگے پن پر ہنس رہی تھی مگر مشکل تو یہی تھی کہ وہ اس سب سے بے زار نہیں تھی۔ اُس پر تو بس ایک مطمئن تعطل کی کیفیت طاری تھی۔

یوں تو منڈی اور اڈے کا تھوڑا سا درمیانی فاصلہ بھی کوئی بہت روح افزا نہ تھا؛ اپنا یہی ایک آدھ پانی اور سوڈا واٹر کی دُکان تھی، یا پھر درختوں کے نیچے نائی کے لڑکے اپنے بکسوں سے ٹیک لگائے، ایک دوسرے سے

بیٹھے گپ لڑا رہے تھے۔ مگر پھر بھی اُسے ایک قسم کی رہائی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا حسیاتی جمود ختم ہو گیا تھا اور اب وہ کم سے کم اپنا ردِ عمل تو متعین کر سکتی تھی۔ اس کا پیر ایک مرتبہ پھر تختے کو اسی طرح دبا رہا تھا۔ تکیہ پھر اس کی کہنی کے نیچے واپس آ گیا تھا، اور خود تانگہ بھی پہلے سے اونچا تھا۔ وہ یہ بتا سکتی تھی کہ سامنے والی دُکان کے گلاس میں سوڈا واٹر اس کے لئے ناقابلِ قبول ہے۔ وہ اس علم سے بھی لطف اندوز ہو سکتی تھی کہ پنواڑی کے لڑکے جو اُسے کن انکھیوں سے دیکھ رہے تھے اور زور زور سے بولنے لگے تھے، اُس کی آنکھوں اور رخساروں کو پھڑکا سکتے ہیں، اُس کے ہونٹوں کو مائل تبسم کر سکتے ہیں۔ مگر اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے ——— اتنا بھی نہیں جتنا سینما کے پردے پر نظر آنے والی ایکٹرس کا، کیونکہ وہاں تو وہ داد دے کر کم سے کم ایکٹرس کے گالوں کے گڑھوں پر سسکیاں بھرنے کا حق خرید لیتے ہیں مگر مس روبنس اپنے جادو کے اڑن کھٹولے میں اُن کے خیالوں تک کی پہنچ سے باہر تھی۔

لیکن فرحت کی یہ لہریں دیر پا ثابت نہ ہوئیں۔ اڈے پر پہنچتے ہی وہ گھڑگھڑاتے انجن، لاریوں کی قطاروں، موٹر کے ہارن کی آوازوں، اڈے والوں کی لڑائیوں اور لاریوں کے ایجنٹوں کی صداؤں کے نرغے میں پھنس گئی۔ یہ بات نہیں کہ ایلی نگر کی مجلّا و مصفّا اور پرسکون فضا میں رہنے کے بعد یہ شور و غوغا، یہ ہنگامہ رستاخیز اور یہ گرد کے بادل اُسے ناگوار گزر رہے ہوں، اور اُس نے دو ایک بار "فوہ! ... فوہ!" کرنے کے بعد منہ پر رومال رکھ لیا ہو۔ یہ چیزیں تو سب جانی پہچانی تھیں، اور اتنی معمولی اور بے ضرر معلوم ہو رہی تھیں جیسے وہ روز یہاں آتی رہی ہو۔ وہ پہلی ہی نظر میں پہچان گئی کہ وہ نیلے رنگ کی لاری جکھیڑے جاتی ہے، اور لال رنگ کی ٹیکم پور، اور وہ ٹوٹی ہوئی چھتری والا اکہ بہت سست چلتا ہے، اور وہ داڑھی والا آدمی چنگی کا منشی ہے۔ کوئی بھی چیز پُرعنا دنہ تھی، بلکہ اگر وہ چاہتی تو گرد و پیش کی ساری چیزیں بڑے فخر و مباہات کے ساتھ اُس کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار تھیں۔ مگر، نہ جانے کیوں، وہ مس روبنس کی شخصیت کو پھیلا کر اس ماحول پر مسلط کر دینے کے خیال سے ہی اپنے دل کو بیٹھتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اور نہ اُس سے یہ ہوتا تھا کہ ڈولی بن کر اپنے آپ کو ان چیزوں کی گود میں دے دے۔ وہ تو پہلو بدلے جا رہی تھی، سمٹتی تھی، سکڑتی تھی، طرح طرح سے اپنے بازو کو سامنے لاتی تھی جیسے کوئی وار روک رہی ہو کبھی تو یہ چاہتی تھی کہ تانگہ چلتا ہی رہے، چلتا ہی چلا جائے، اور کبھی یہ کہ بہت سے اگلے سامنے ہو جائیں، اور تانگہ رکا کھڑا رہے یہاں تک کہ شام ہو جائے اور وہ بغیر کسی کی نظر پڑے اپنی لاری میں بیٹھ جائے۔ اُس کی حالت بس بالکل اُس نوخیز لڑکی کی طرح تھی جو اپنی ماں کی نگاہوں سے اپنا پیٹ چھپائی پھرے، اور اگر کبھی ایسا حادثہ رونما ہو جائے تو گھنٹوں ہرنٹ کاٹتی رہے۔ وہ اپنے قصبے کی لاری کو جائے پناہ سمجھ کر اُس کی طرف بڑھ بھی رہی تھی، اور اُس کے خیال سے جھجک بھی رہی تھی، کیونکہ وہی تو سب سے زیادہ مانوس چیز تھی اور اُسی کی تو اُسے ذرا ذرا سی تفصیل یاد تھی۔ جب اُس کی اپنی لاری کے بجائے کہیں اور کی لاری سامنے آتی تھی تو اُسے خوشی ہوتی تھی کہ بلو تھوڑی دیر کو تو اور بلا ٹلی۔ مگر جب اُس کی لاری کے ایجنٹ نے تانگے کے قریب آ کر کہا "کہاں جانا ہے؟ ٹیکم پور؟" تو اُسے ایک گونہ تکلیف ہوئی ——— اس خیال سے کہ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے اُسے پہچانتا نہ ہو۔ اُس نے بڑی گلوگرفتہ آواز سے جواب دیا "ہاں .... نہیں۔ سعد آباد۔"

"وہ کھڑی ہے لاری آخر میں" ایجنٹ نے ایک اڈے کی طرف جاتے ہوئے کہا "وہ بھورے رنگ کی .... بس تیار ہے۔"

تانگہ رکنے سے پہلے ہی اس نے تانگے والے کو پیسے پکڑا دیئے اور جلدی سے نیچے کود پڑی۔ لاری میں دو ایک مسافر اندر کی طرف بیٹھے تھے اور ڈرائیور کھڑکی سے ٹیک لگائے، اسٹیئرنگ وہیل پر پیر رکھے سونے کی کوشش میں سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ پہلے تو ڈولی نے تکلفات کو بالائے طاق کر دینا چاہا۔ مگر ہونٹوں تک آتے آتے اُس کے لفظ بدل گئے۔ اُس نے مشکوک لہجے میں پوچھا جیسے اُسے ڈرائیور پر اعتماد نہ ہو۔ "کہاں جائے گی یہ لاری؟"

"سعد آباد" ڈرائیور نے سر پھیر کر جواب دیا۔

حالانکہ ڈرائیور کا رویہ ایسا تلطف آمیز نہ تھا، مگر اُس کی آواز سنتے ہی ڈولی کو ایسا معلوم ہوا جیسے سرد، سنسناتی ہوئی ہواؤں کے درمیان یکایک ایک کمرے نے آ کر اُسے چھپا لیا ہو۔ لاری کے انجن کا لمس تک اُس کے لئے اسمِ اعظم کی وہ تختی بن گیا تھا جو اُسے ہر قسم کے آسیبوں سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ اُس نے ڈرائیور کو اور ملائم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "کے بجے جائے گی لاری؟"

"لاری؟ .... یہی کوئی ڈھائی تین بجے۔"

"تو کے بجے؟ .... ٹھیک؟"

"ہاں .... بس تین بجے چل پڑے گی لاری۔"

وہ اپنی کوشش کے نتیجے کے بارے میں مذبذب تھی۔ وہ ایک لمحے نیچے دیکھنے کے بعد اُس نے پوچھا" اور اب کیا بجا ہوگا"۔

ڈرائیور نے سامنے کے شیشے، کھڑکی اور تیل کے ڈبوں کو ٹٹولنے کے بعد جواب دیا" کوئی ایک ہوگا"۔

گو یہ جواب کچھ بہت زیادہ تسلی بخش نہ تھا، مگر ڈوَلی نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا" اچھا ـــ"!

اب تک ڈرائیور کی غنودگی پر اُس کی مردانگی غالب آ چکی تھی، اور اُسے یہ بھی خیال آ گیا تھا کہ آخر پادری صاحب سے سلام دعا ہے ہی۔ اس لئے وہ اُٹھ بیٹھا، اور کلینر کو دو تین آوازیں دے کر ڈوَلی کا سامان اوپر رکھ دینے کے لئے کہا۔

سامان کی طرف سے تو وہ جلد ہی مطمئن ہو گئی، مگر جگہ کا مسئلہ ابھی درپیش تھا۔ وہ باہر ہی سے کھڑی کھڑی اندر کا جائزہ لے رہی تھی۔ پیچھے کی طرف ایک بڑھیا تنگ پائنچوں کا پاجامہ پہنے، پیر اوپر رکھے بیٹھی تھی، اور اپنے پوپلے منہ سے پان چبا رہی تھی۔ اُس کے سامنے کی سیٹ پر ایک آدمی جو اس کا بیٹا معلوم ہوتا تھا، بیٹھا ایک گٹھڑی کو ٹھیک کر رہا تھا۔ بیچ کے حصے میں، رجسٹروں کے ایک ڈھیر کے قریب، نکر پہنے ہوئے، چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا ایک جوان سا آدمی تھا جو گھبرا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد رومال میں بندھے ہوئے پھلوں کو جو اُس کے پاس رکھے تھے اور قریب کھسکا لیتا تھا۔ ڈوَلی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آخر کہاں بیٹھے، اور اِدھر اُدھر دھوپ اب ناقابلِ برداشت ہوئی جا رہی تھی۔ وہ بیچ کا دروازہ کھولنے والی ہی تھی کہ ڈرائیور نے سر اٹھا کر کہا" بیٹھو، اندر بیٹھو۔ بس اب چلے ہے لاری"۔

گو "بیٹھو" ذرا چونکا دینے والی بات تھی، مگر اُس کی آواز سن کر ڈوَلی کے دل میں یہ اُمید پیدا ہو گئی کہ آخری فیصلہ ڈرائیور پر چھوڑ دینے سے خود اُس کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے گا۔ اس لئے اُس نے ڈرائیور کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "ہاں۔ ..... اچھا ..... کہاں بیٹھوں"؟

"یہاں، آ جاؤ، بیچ کی سیٹ پہ" ڈرائیور کو فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی۔

"ہاں .... لیکن"۔ ڈوَلی نے ڈرتے ڈرتے اپیل کی" اگر آگے ـــ"

"آگے؟ ..... آگے تو جی، آج دروغا جی جا رہے ہیں۔ آگے تو اُن کی جگہ ہے"۔

مگر جب ڈوَلی اُسی طرح کھڑی رہی اور ہلی تک نہیں تو ڈرائیور نے ایک لمبی سی انگڑائی لی، اور کراہتا ہوا نیچے اتر آیا۔ "آ گے بیٹھو ہو"۔ اُس نے نصیحت آمیز انداز میں کہا۔ "بیٹھ جاؤ تمہیں کیا؟ وہ ہمارے سے چاہے کوئی بیٹھے۔ لیکن دروغا جی جا رہے ہیں آج"۔

ڈوَلی نے اندر بیٹھتے ہوئے اس طرح دروازہ بند کیا جیسے وہ اپنے مورچے کے لئے بالکل آخر تک مقاومت کرنے پر تُلی ہوئی ہو۔ گو گدا اتنا موٹا نہ تھا کہ سیٹ کی لکڑی کو اُسے تکلیف دینے سے روک سکے، مگر وہ حالات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اس لئے تیل کے ڈبوں کے درمیان جہاں تک ہو سکا اُس نے اپنی ٹانگیں پھیلا لیں، اور اپنے بدن سے گرمی نکالنے اور سانس ٹھیک کرنے لگی۔ کئی منٹ تک رومال سے ہوا کرنے کے بعد اُسے اتنا ہوش آیا کہ وہ کسی اور طرف متوجہ ہو سکے۔ جب اس نے یکایک یہ دیکھا کہ لاری میں دونوں طرف آئینے لگے ہوئے ہیں جن میں اُس کا چہرہ نظر آ رہا ہے تو اُسے بڑی حیرت ہوئی۔ مگر دوسری نگاہ نے حیرت کو گھبراہٹ میں تبدیل کر دیا۔ اُس کے بال جگہ جگہ سے نکلے ہوئے تھے۔ اور ارد گرد سے بھورے ہو گئے تھے۔ گرمی نے اُس کے چہرے کو تمتا دیا تھا اور وہ گرد آلود ہو رہا تھا۔ خشک پپڑیوں نے اُس کے ہونٹوں کی سرخی زائل کر دی تھی، اور اُس کی آنکھیں میلی اور متوحش تھیں۔ اُس نے تڑپ کر گھبراتے ہوئے رومال سے بالوں کو جھاڑا، زور زور سے چہرے کو رگڑا، اور بار بار ہونٹوں پہ زبان پھیری یہاں تک کہ وہ دانتوں سے چھل بھی گئے۔ آخر اُس نے جھنجلا کر آئینے کی طرف سے نگاہ پھیر لی اور باہر کی طرف دیکھنے لگی۔ برابر والی لاری پر مس کجن کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ ستاروں والی ہری ساڑھی، لمبے لمبے بُندے، پتلی سی ناک جس میں کیل چمک رہی تھی، سُرخ چہرہ، بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں۔ مگر یہ تصویر تو اُسے آئینے کی یاد دلائے دے رہی تھی۔ اس لئے اُس کی نگاہیں آگے بڑھ گئیں، اور وہ اپنی آنکھوں کے کونوں کو پلکوں سے بند کر کے تصویر کی طرف جانے سے روکنے لگی۔ لاریوں کی قطار کی قطار کھڑی تھی، مگر اُسے صرف اُن کے انجن اور ڈگار ہی نظر آ رہے تھے۔ سامنے دو اکے والوں نے ایک کسان کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے، اور اپنے اپنے اکّوں کی طرف کھینچ رہے تھے۔ دو ایک خوانچے والے، پانی پلانے والا اور چند کلینر جمع ہو گئے تھے اور آدھے ایک اِکّے والے کو شہ دے رہے تھے اور آدھے دوسرے کو۔ اخبار والا نانبائی کی دکان کے سامنے تخت پر کچھ تھکا سا بیٹھا تھا۔ وہیں برابر میں ایک آدمی بیٹھا سائیکل کی مرمت کر رہا تھا، اور اس کے گرد تین چار لوگ کھڑے جلدی کرنے کا تقاضا کر رہے تھے۔ اس کے بعد سڑک پر کنکروں کا ایک

اونچا سا ڈھیر تھا جس پر بالٹی رکھ کر ایک تانگے والا اپنے گھوڑے کو دانہ کھلا رہا تھا
سڑک کے پار ایک وسیع و عریض میدان تھا، خشک اور بالکل سفید، دھوپ کی
سختی کے باوجود مطمئن اور ساکن ـــ بے نیاز، جیسے کوئی معمر اور جہاں دیدہ رواقی
فلسفی۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ میدان سے ہلکے ہلکے غبار کا بادل اٹھتا تھا،
اور آہستہ آہستہ اوپر چڑھ جانے کے بعد نڈھال سا ہو کر کھیتوں میں کٹے
ہوئے گیہوں کے سنہرے انباروں کی طرف اڑتا چلا جاتا تھا۔ کھیتوں سے
کچھ دور آگے پیڑوں کی قطار تھی جن میں سے کسی گاؤں کی کچی دیواریں اور
چھپر دکھائی دے رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی عورت یا بچہ درختوں سے باہر نکل
آتا تھا، اور ایک آدھ منٹ تک نظر آنے کے بعد پھر غائب ہو جاتا تھا۔

وہ بہت دیر تک مکمل انہماک کے ساتھ سامنے دیکھتی رہی۔ اُس نے
محسوس کیا تھا کہ اُس کا جسم ایک نورانی اور لطیف مادے کی شکل میں تبدیل ہو کر
تفکرانہ انداز میں اُس میدان کی وسعتوں پر چھا گیا ہے جس کے دونوں کنارے
ہوا سے اڑتی ہوئی چادر کی طرح اوپر اُٹھے ہوئے ہیں اُسے یہ بھی معلوم ہوا تھا۔
جیسے اُس کی روح اپنے جسم کو وہیں چھپایا ہوا چھوڑ کر علٰحدہ ہو گئی ہو، اور ایک ننھی سی
ابابیل کی طرح کبھی تو ڈراؤنے خوابوں کے خوف و ہراس کے ساتھ اور کبھی
بہار کی شاموں کے سکون و بہجت کے ساتھ سارے میدان پر چپٹ چپاتی
پھر رہی ہو۔ ٹانگیں ہلا کر اور بازوؤں کو دونوں طرف پھیلا کر، سر کو کچھ تو اضمحلال اور
کچھ جذبۂ تسلیم و رضا کی سرشاری سے نیچے ڈھلکائے ہوئے، وہ بگولوں کے ساتھ
اوپر چڑھتی چلی گئی تھی۔ جو اُسے فضا میں معلق چھوڑ کر نیچے اُتر جاتے تھے، اور وہاں سے
آسمان کی متخیل نیلاہٹیں اُسے اپنے اندر کھینچ کر بے حس بنا دیتی تھیں۔ وہ ایک
آم کے پیڑ سے لگ کر گاؤں کی ایک کچی دیوار کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی تھی،
اُس نے آم کے پتوں کی تر و تازہ کر دینے والی خوشبو سونگھی تھی، فضا کی طراوت
اور خواب ناکی اُس کے جسم میں اتر گئی تھی، اور وہ کچی دیوار اُسے اپنی پرانی ہمجولی معلوم
ہونے لگی تھی۔

اسی لئے جب پیچھے دروازہ کھلنے کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ
کیا تو اُس کی نگاہیں بڑی ہچکچاہٹ کے بعد سامنے سے مڑیں۔ ایک اِکّے میں سے
دو تین عورتیں، بچّے اور کچھ مرد اُترے تھے، اور اُن کا سامان لاری پر رکھا جا رہا تھا۔
ڈولی کو پیچھے پھر کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس دوران میں پچھلے حصے میں چند آدمی
اور بیٹھ چکے تھے۔ اُن کے قریب ہی نیچے چاٹ والا اپنا خوانچہ لئے بیٹھا تھا جسے
دیکھتے ہی بچّوں نے پیسہ مانگنا شروع کر دیا تھا، اور اپنی ماؤں کو اوپر چڑھنے کی بھی
اجازت نہ دے رہے تھے۔ اب کچھ لاریاں قطار میں سے نکل کر تیل لینے کے لئے
پٹرول کے پمپ کے پاس جمع ہو رہی تھیں، اور اُن کے کلینرز زور زور سے آوازیں
لگا رہے تھے تاکہ چلتے چلتے بھی جتنے مسافر اور مل سکیں لے لیں۔ لاریوں کے
چلنے کی آوازیں سنتے سنتے اور اُن کی نقل و حرکت کو غیر دلچسپی سے دیکھتے دیکھتے
یکایک ڈولی کی نظر ایک مکان پر پڑی جو پٹرول کی دُکان کے قریب بن رہا تھا۔ اور
جس کی طرف اُس نے ابھی تک خیال کیا ہی نہیں تھا۔ پہلے یہاں خالی زمین پڑی
تھی جہاں کُتّے اپنی کھلاڑیوں سے گرد اُڑاتے رہتے تھے، اور کبھی کبھار کوئی خوانچے
والا سستانے کے لئے آ بیٹھتا تھا لیکن اب تو وہاں باڑیں لگی ہوئی تھیں اور
ایک نیا مکان بنا کھڑا تھا، بس چھت پوری ہونے کی کسر تھی۔ مکان کے اندر
اندھیرا سا تھا، اور اُس کی زمین ابھی سیلی ہوئی تھی۔ اس میں کچھ ایسی ہلکی ہلکی پُر کیف
اور ذہن کو کُند کر دینے والی خنکی تھی جو ڈولی کی ٹانگوں اور سینے میں سمائی جا رہی
تھی۔ اُس کے شانوں کو ڈھیلا اور خون کو سُست کئے دے رہی تھی۔ داہنی
طرف کچھ خوانچے والے بیٹھے تھے جنہیں دیکھ کر اسے خیال آیا کہ جب وہ گھر پہنچے
گی تو اُس کا چھوٹا بھائی فریڈی اس کا بستر کریلے گا، اُس کا ٹرنک کھولنے کو
بے تاب پھرے گا یہ دیکھنے کے لئے کہ بُوا اس کے واسطے کیا لائی ہیں، اور
جب وہ کچھ نہ پائے گا تو بہت مایوس ہو گا اور شاید مچلنے بھی لگے۔ لاری کے
آٹھ آنے اور سامان اٹھانے والے کے ایک آنے کے بعد بھی اُس کے پاس
چار آنے بچتے تھے۔ ایک آنہ برنیس کو خط لکھنے کے لئے بھی سہی، تین آنے میں
کچھ نہ کچھ لیا جا سکتا تھا۔ اس لئے وہ اُتر کر پھل والے کے پاس گئی، اور ایک
منٹ تک اُس کے ٹوکرے کو بے خیالی سے دیکھنے کے بعد پوچھا "سنترے
کیا حساب دیئے ہیں؟"

امیدوں سے بھرے ہوئے پھل والے نے کہا "پانچ پانچ پیسے
دے رکھے ہیں، میم صاحب"۔

"پانچ پیسے کا ایک؟"

"ہاں، پانچ پانچ پیسے بڑے میٹھے ہیں میم صاحب۔ لو چکھ کے دیکھو"

"نہیں، نہیں، رہنے دو" اُس نے تین آنے کو پانچ پیسے سے تقسیم
کرتے ہوئے کہا "تین تین پیسے نہیں؟"

"تین تین پیسے کی تو خرید بھی نہیں ہیں میم صاحب" پھل والے نے
اپنی باطل امیدوں کی اصلیت سے آگاہ ہو کر طنز سے کہا "لو کیلے لو۔ پانچ پیسے
کے دو دیے ہیں"۔

ڈولی اب بھی اپنی تقسیم کے نتیجے سے مطمئن نہ تھی۔ اُس نے آدھی مایوس
ہو کر پوچھا "کچھ کم نہیں کرو گے؟"

"کم بخت ابھی نہیں نہیں لینا بیٹا، لاؤ تھیلا میں چلوں" اور پھر پھل والے نے ایک گزرتے ہوئے کسان کو پکار کر کہا "لو چودھری، چوس لو رسیلے ہو رہے ہیں رسیلے"۔

یکایک اُس کے حلق میں ذرا سی ارڑ گئی، اور سانس لینے کی کوشش میں کن پٹیوں کی رگیں ابھر آئیں۔ اس کے شانے خود بخود کام کرنے والے مشینی آلات کی طرح نیچے جھک گئے۔ اور بازو سخت ہو کر سینے پر آ گئے۔ اُسے یہ معلوم ہونے لگا کہ جیسے وہ جگہ جہاں وہ کھڑی تھی، دفعتہً بلند ہو گئی ہے اور ساری دنیا کی نظریں اُس کی طرف اُٹھ گئی ہیں۔ اُس کا گلا صاف ہوتے ہی پیر اپنے آپ بسکٹ والے کی طرف مڑ گئے، اور اُس نے تین آنے پھینکتے ہوئے کہا۔ "بسکٹ"۔

"بسکٹ؟" یہ محض ایک لفظ بسکٹ والے کے لئے کسی قدر مبہم تھا اس نے پوچھا "بات آنے درجن والے کہ تین پیسے درجن والے۔؟"

"کوئی سے" ڈولی نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ اُس نے بغیر دیکھے تینوں بنڈل ہاتھ میں پکڑ لئے، اور تیز قدم اٹھاتی ہوئی اپنی جگہ پر واپس چلی گئی۔ مگر بیٹھنے کے بعد تو اُس کا دل اس تیزی سے دھڑ دھڑ کرنے لگا جیسے بس چل کے جانے والی ہو۔ ہر جھٹکے کے ساتھ دل تھوڑا سا نیچے کھسکتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی چھاتیاں بڑی بوجھل اور گرم ہو گئی تھیں اور اُن میں کوئی چیز اُبل رہی تھی۔ سنسنا رہی تھی۔ گول گول چکر لگا رہی تھی۔ ماتھے پر اور ناک کے نیچے پسینہ نکل آنے چلا جا رہا تھا جسے خشک کرنے کی کوشش میں اُس کا سانس بھاری ہو رہا تھا۔ بن کر اُس کے دل کی حالت کو اور بے قابو کئے دے رہا تھا۔ وہ جتنی بھی سکڑی ہوئی تھی اور دوپٹہ سر اور خون سے بھرے ہوئے گالوں پر کھینچ لیا۔ دوپٹے کے لمس میں تسکین تھی، دلاسا تھا، ہمدردی اور غمگساری تھی۔ شفقت اور محبت اور آخری وقت تک اُس کا ساتھ دینے اور حفاظت کرنے کا وعدہ۔ اس خیال سے دوپٹہ کیا چھوا تھا آگ پر پانی پڑا تھا۔ اس کا جسمانی اضطراب آہستہ آہستہ تھم تا گیا، اور چند ہی منٹ میں اُس کے خون اور سانس کی رفتار بالکل متوازن ہو گئی۔ مگر وہ ایسی گرانی اور تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی جیسے کئی دن کے بخار کے بعد

تھوڑی ہی دیر بے حرکت رہنے سے سیٹ کا تختہ اس کے چبھنا شروع ہو گیا۔ دو ایک جمائیاں لینے سے بھی اُس کی تسکین نہ ہوئی، اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ لمبی سی انگڑائی لے، یا ٹانگوں کو خوب تان کر پھیلا دے —— لاری کے فرش کی مخالفت کے باوجود۔ مگر لاری کے لوہے سے زور آزمانا اُس کی ٹانگوں کے بس کا نہ تھا۔ اور انگڑائی لینے میں یہ خدشہ تھا کہ اُس کا دوپٹہ پھسل جاتا۔ اور بازو اونچے اُٹھتے جہاں سب کی نظریں اُن پر پڑتیں۔ جب پہلو بدلنے سے کام نہ چلا تو اُس نے ڈرائیور کو پکار کر بلایا، اور وقت پوچھا۔

"اب چلے ہے" ڈرائیور نے کہا۔ "گھبراؤ کیوں ہو"۔

"مگر دیسے بجا کیا ہے؟"

"سوا دو بج رہے ہیں اب"۔

ابھی پورا ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اور یہاں بیٹھے بیٹھے اُس کی رانیں پتھر ہوئی جا رہی تھیں۔ پہلے تو وہ مارے کوفت کے اپنی سیٹ کی پشت پر ڈھلک گئی، مگر اسے جلدی ہی اندازہ ہو گیا کہ لاری والوں کے دعدے کرم کے قانون سے کسی طرح کم اٹل نہیں ہیں۔ اُس نے کسی البیلہ کی ہیروئن کی سی شان کے ساتھ اپنے آپ کو تن بتقدیر چھوڑ دیا، اور بسکٹوں کے بنڈلوں سے کھیل کھیل کر اپنا دل بہلانے لگی۔ اُس نے سوچا کہ وہ بسکٹوں کو بیٹھک میں چھپا دے گی اور پھر اندر چلی جائے گی۔ فریڈی اُسے دیکھتے ہی "ڈولی آیا، ڈولی آیا" چیختا دوڑے گا، اور آ کر اُس کی ٹانگوں سے لپٹ جائے گا۔ وہ پوچھے گا "ڈولی آیا کیا لائی ہو؟ دکھاؤ . . . . انگریزی مٹھائی لائی ہو؟ . . . . تم کہہ گئی تھیں!" جب اُسے سارے سامان کی تلاشی لے چکنے کے بعد بھی کچھ نہ ملے گا تو وہ ٹھُن ٹھُنانے لگے گا۔ وہ اُسے چھیڑ چھیڑ کر ہنستی رہے گی، یہاں تک کہ جب وہ بالکل ہی رو دے گا تو وہ چپکے سے ایک بنڈل چھپا کر لائے گی اور کہے گی "اچھا، آنکھیں بند کرو، دیکھو ہم تمہیں ایک چیز دیں"۔ فریڈی یقین نہیں کرے گا اور بڑی دیر کی بحث کے بعد آنکھیں بند کرے گا۔ اس کے ہاتھوں میں بسکٹوں کا بنڈل دے دے گی۔ جسے دیکھ کر فریڈی کا چہرہ مسکرا پڑے گا، اور وہ اُسے گود میں اٹھا کر خوب پیار کرے گی —— جب فریڈی بسکٹ کھانے لگے گا تو وہ اُس کے ہاتھ سے بسکٹ چھین لے گی اور کہے گی "ہم جب دیں گے بسکٹ جب تم ہمیں پیار کرو گے" فریڈی اپنے چھوٹے چھوٹے ہونٹ اُس کے گال سے لگا دے گا جیسے کوئی اوس سے بھیگا ہوا گلاب رکھ دیا۔ اُس کے جسم میں رس اترتا چلا جائے گا، اور وہ فریڈی کی ٹانگوں کو اپنے پیٹ پر بھینچ لے گی۔ اس کے گال پر فریڈی کا تھوک لگ جائے گا، مگر وہ اُسے صاف نہیں کرے گی بلکہ یوں ہی رہنے دے گی ——

اس طرح یہ تینوں بنڈل کم سے کم ایک ہفتے تو چلیں گے گو اُس نے جلدی میں پورے تین آنے پھینک دیئے تھے، مگر خیر ٹھیک ہے —— اب وہ نرس کو لفافے کے بجائے کارڈ بھیج دے گی۔ چلتے ہوئے نرس نے بڑا پکا وعدہ لیا تھا خط لکھنے کا۔ چونکہ وہ وعدہ کر آئی ہے اس لئے چھٹیوں بھر اُسے خط بھیجتی رہے گی —— لفافہ نہ سہی تو کارڈ تو ضرور . . . . مگر کارڈ پر لکھا ہی کتنا

جائے گا؟...... بہر حال وہ کوشش کرے گی کہ لفافہ بھیجے۔ کبھی کبھی وہ فریڈی کا پیسہ چھپا لیا کرے گی۔ مشن کے اشتہاروں کی ردی بیچ کر بھی کچھ پیسے جمع ہو سکتے ہیں اور جب پاپا تنخواہ لایا کریں گے تو وہ ایک دو آنے لے لیا کرے گی۔ اسی طرح جب ماما چماریوں کو بائبل سنا کر ناج لایا کریں گی تو کسی کسی دن وہ ان سے ناج لے لیا کرے گی، اور پاپا کے پاس پڑھنے والے لڑکوں میں سے کسی کو بازار بھیج کر اس کے پیسے منگوا لیا کرے گی..... وہ کم سے کم پندرہ دن میں ایک دفعہ تو ضرور خط بھیجے گی...... کل رات وہ اور برنس دونوں ڈیڑھ بجے تک ایک چارپائی پر لیٹی باتیں کرتی رہی تھیں۔ یہاں تک کہ ان کے پیر اور آنکھوں کے پپوٹے ٹھنڈک محسوس کرنے لگے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں باہیں ڈالے ہوئے تھیں، اور باتوں کے جوش میں بعض اوقات ان کے سینے مل جاتے تھے۔ ان کے تھوک نگلنے کی آواز بار بار ہوا میں گونجتی تھی، دونوں کے بازو جل رہے تھے، مگر ان کا مس کتنا راحت بخش تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ یہ بازو بس یوں ہی ملے رہیں، مگر بغیر کسی خاص سبب کے اسے کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی خفیہ کام کر رہی ہے اور ڈر ہے کہ لوگ کہیں دیکھ نہ لیں۔ اور پھر اس راحت کے احساس کی شدت بھی اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اس لئے اسے بار بار باہیں الگ کرنی پڑتی تھیں۔ اس رخصت کی رات برنس نے اپنے سارے راز جنہیں وہ ہمیشہ چھپاتی رہی تھی، ایک ایک کر کے بتا دیئے تھے۔ اس نے سنایا تھا کہ ایک دن جب سارا اسکول مل کر سینما گیا تھا تو ایک لڑکا جو اس کے پیچھے بیٹھا تھا۔ برابر اس کی طرف دیکھتا رہا تھا، برنس نے بھی چند مرتبہ مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا، اور اندھیرے میں اس نے ایک پھول برنس کی گود میں پھینک دیا تھا۔ لیکن برنس کی داستانوں میں سب سے زیادہ دلچسپ اس لڑکے کا قصہ تھا جو اسے چھٹیوں میں ملا تھا۔ وہ جب اپنے گھر گئی ہوئی تھی۔ یہ قصہ سنانے سے پہلے اس نے رکتی ہوئی آواز میں کہا تھا "ذرا اور قریب کھسک آؤ" برنس نے اپنا بازو مضبوطی سے اس کے گرد ڈال لیا تھا اور اس کی کمر تھپتھپاتی جاتی تھی۔ اس کا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا، اور جسم سے لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ لڑکے کا نام اس نے دیوی داس بتایا تھا جو اس کے بھائی کے ساتھ پڑھتا تھا، اور بڑا گورا اور خوبصورت تھا، اور ریشمی سوٹ پہن کر آیا کرتا تھا۔ دیوی داس کی خوش مزاجی نے اس کی مدافعت پر جلد قابو پا لیا تھا۔ جب اس کا بھائی ادھر ادھر ہوتا تو وہ اسے گود میں بٹھا لیتا تھا، اور خوب بھینچ بھینچ کر پیار کرتا تھا۔ "اور مہ" برنس نے اپنی ٹھوڑی سے سینے کی طرف اشارہ کر کے لفظ چباتے ہوئے کہا تھا "یہاں ہاتھ رکھے رہتا تھا"۔ قصہ سناتے سناتے برنس نے رک کر تکیے سے سر اٹھا لیا تھا، اور چند لمحے اس کی طرف دیکھتے رہنے اور آنکھیں جھپکانے کے بعد ملتجیانہ لہجے میں کہا تھا "ڈولی، ہم پیار کر لیں نہیں؟" اور اس کی خاموشی کو رضامندی پر محمول کرتے ہوئے اس نے اپنے گرم ہونٹ ایک طویل بوسے کے لئے اس کے گالوں پر رکھ دیے تھے۔ اس کے بوسے کے نیچے ڈولی کو ایسا اطمینان، بے فکری اور محفوظ ہونے کا احساس ہوا تھا جیسے چھوٹے سے کنگرو کو اپنی ماں کی تھیلی میں بیٹھ کر ـــــ قصے کے دوران میں اس نے اپنی ٹانگیں اکڑا اکڑا کر یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ برنس کی ٹانگوں سے دور ہیں، مگر اس کا سینہ ہر سانس کے ساتھ خود بخود آگے کھسکتا چلا گیا تھا ـــــ اس کے روکنے کے باوجود ـــــ اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹنے کے بعد بھی وہ کتنی دیر تک جاگتی رہی تھیں، اور بار بار چادروں سے ہاتھ اور منہ نکال کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ لیتی تھیں ـــــ چلنے سے پہلے وہ دونوں ساتھ ساتھ پھرتی رہی تھیں۔ اگر ان میں ذرا سا بھی فاصلہ ہو جاتا تھا تو ایسی کھنچن محسوس ہوتی تھی جیسے ان کے بدن جڑے ہوئے ہوں..... برنس کی آواز میں کیسی نرمی اور حسرت اور حلق میں گھٹے ہوئے آنسوؤں کی نمی تھی ـــــ برنس کی جدائی کی وجہ سے وہ آج بہت دیر تک اداس رہی تھی، خصوصاً ریل میں۔ وہ کھڑکی پر کہنی رکھے باہر دیکھتی رہی تھی۔ کھیت، جھاڑیاں، تار کے کھمبے، درخت قریب آنے کے بعد ناچتے ہوئے گھوم کر افق کی طرف نکلے چلے جاتے تھے، گویا وہ اسے ذرا سا دلاسا بھی دینے کو تیار نہیں ہیں۔ انہیں دیکھتے دیکھتے اس کے سینے اور گلے میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا تھا۔ بار بار اس کے سینے کے بیچوں بیچ کوئی چیز ٹھیری ہوئی محسوس ہوتی تھی جو اندر اترتی چلی جاتی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سر کھڑکی پر رکھ دے، اور نزع میں پھڑپھڑاتے ہوئے پرندے کی طرح اپنا سینہ دیوار کے تختے سے لگا دے، اور ساری دنیا سے غافل ہو جائے ـــــ جب وہ لال لال پل آیا تھا تو اسے ذرا ڈھارس بندھی تھی کہ اس نظارے سے اس کی افسردگی دور ہو جائے گی۔ مگر ان دیووں کی سی سرخ ٹانگوں سے جو اسے دریا کے نیلے نیلے اور چمکتے ہوئے پانیوں کو اچھی طرح دیکھنے نہ دیتی تھیں اور اس دھڑ دھڑ اور گھڑگھڑ سے وہ اتنی بیزار ہوئی تھی کہ اگر پل جلدی ختم نہ ہو جاتا تو وہ مارے وحشت کے رو دیتی...... اسے کچھ پتہ نہیں رہا تھا کہ باقی لڑکیاں کیا کر رہی ہیں۔ ہاں کبھی کبھی جولیا کی میٹھی ہوئی آواز، یا گریس کی چیخیں جیسے شاید لڑکیاں ہمیشہ کی طرح تنگ کر رہی تھیں، یا آئرین کا بلند قہقہہ ایک لمحے کے لئے اس کے وجود کے پگھلاؤ کو روک لیتا تھا ـــــ برنس تو اب تک

اپنے گھر بھی پہنچ لی ہو گی۔ وہ اپنے بھائی بہنوں سے باتوں میں مشغول ہو گی۔ جو اُس کے گرد جمع ہو رہے ہوں گے..... برنس دھوپ سے سفید پلیٹ فارم پر اتری ہو گی، اور اُس کے ہرے جوتوں کی ایڑیاں پتھروں پر کھٹ کھٹ بولی ہونگی...... اُس نے قلیوں کو پکار کر اپنا سامان اتارنے کے لئے کہا ہو گا۔ اسٹیشن آنے سے پہلے ہی.....

برنس کی گاڑی اسٹیشن کے قریب آ ہی رہی تھی کہ ڈرائیور نے پھر سے دروازہ کھول کر ڈولی کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی۔ لیکن کہیں سر اور ہاتھ ہلانے جُلانے کے بعد جا کر وہ یہ سمجھ سکی کہ حالات کا رُخ کیا ہے۔ لاری پوری بھر چکی تھی، اور اب ڈرائیور گاڑی چلانے کے لئے ہینڈل نکال رہا تھا۔ پیچھے سے کئی آوازیں آئیں۔ "لو بھئی، چلی تو کسی طرح!"

"کچھ معلوم بھی ہے؟" ڈرائیور نے کلینر کو ہینڈل دیتے ہوئے کہا۔ "پورے دس منٹ پہلے چھوڑ رہا ہوں"۔

لاری کا انجن بھر بھرانے لگا۔ ننھے ننھے چکر اس کے پیروں میں داخل ہوئے، اور گول گھومتے، ہلکی ہلکی چھلانگیں مارتے، اوپر چڑھتے چلے گئے، اور پنڈلیوں، رانوں، پیٹ، چھاتیوں، بغلوں، بازوؤں، کانوں اور انگلیوں کے پوروں میں پھیل گئے۔ اُس نے اپنے پیر سامنے کی لوہے کی چادر پر رکھ دیئے تاکہ اُس کے پیر اور جسم جھنانے لگیں۔ مگر ایک دفعہ چکروں کا ایسا زبردست ریلا آیا کہ وہ دھکا پیل میں آگے نہ بڑھ سکا، بلکہ پیٹ کے نچلے حصے میں اٹک کر اودھم مچانے لگا یہاں تک کہ ڈولی نے بجلی کی سی سُرعت سے پیر کھینچ لئے اور اپنے دونوں گھٹنے خوب کس کر ملا لئے۔ لاری اُسے ہلکے ہلکے جھکولے دیتی آگے بڑھی، مگر وہ ابھی رینگ رینگ کر ہی چل رہی تھی کہ پٹرول کے پمپ کے پاس پھر رُک گئی۔

"کیوں بھیّا" کسی نے پچھلے حصے سے پکارا۔ "کیا اور بٹھا دے رہے؟ یہاں پہلے ہی گھٹے جا رہے ہیں، مرے یاں"۔

مگر ڈرائیور نے اُسے ناقابلِ اعتنا سمجھتے ہوئے دروازہ کھولا، اور اتر کر پمپ والے سے دو گیلن تیل بھر دینے کے لئے کہا..... پمپ کے اُجلے صاف شیشے میں نقرئی سیّال اٹھلا اٹھلا کر اور ٹھمک ٹھمک کر اوپر چڑھنے لگا۔ سب سے زیادہ جو چیز ڈولی کو پسند آئی وہ چھوٹے چھوٹے بُلبلے تھے جو اُبلتے ہوئے شفاف تیل میں شریر پریوں کی طرح دوڑتے پھر رہے تھے۔ پٹرول کی بُو کے باوجود اُس نے سر نہیں پھرایا اور تیل کو چڑھتے اُترتے دیکھتی رہی تھی جس سے اُس کی طبیعت شگفتہ ہو گئی تھی، اور اُس کی ہنسلی کی ہڈیوں میں سرسراہٹ سی ہونے لگی تھی جو اُسے مسکرانے پر مجبور کر رہی تھی۔

لاری گزرتے ہوئے اِکّوں کو گرد کے بادلوں میں چھپاتی پھر روانہ ہوئی۔ ڈرائیور گاڑی کو ٹھیک رفتار پر لا رہا تھا جیسے ہی اُس کا ہاتھ کلچ پر پہنچتا تھا، ڈولی سانس کو حلق ہی میں روک کر، کسی گمنام اور مبہم توقع کے ساتھ اپنے سینے کو جو اس وقت انتظار، ارتعاش، کیف اور درد کی ملی جلی کیفیتوں کی شدت سے ایک کھنچاؤ اور اینٹھن محسوس کر رہا تھا، ہوا جس کی ہستی اُسے ٹھوس اور مرئی معلوم ہو رہی تھی، آگے جُھکا دیتی تھی ـــــ ایسی خود سپردگی اور یقین کے ساتھ جیسے کسی دیوی کے سامنے اپنے آپ کو بھینٹ چڑھا رہی ہو۔ اور جب کلچ کی چیخ ختم ہوتی تھی تو گویا وہ ایک گولی کی شکل اختیار کر کے اُس کی ران میں گھُس آتی تھی جسے وہ زور لگا کر وہیں کے وہیں روک لیتی تھی اور آگے نہ بڑھنے دیتی تھی، اور ساتھ ہی اپنی پنڈلیوں کے پٹھوں کو ایسی سختی سے اکڑاتی تھی جیسے اُن کے ڈھیلے پڑتے ہی اُس کی زندگی بھی گل کر بہہ جائے گی.....

سعد آباد کی سڑک پر مڑنے کے بعد لاری کی رفتار کینڈے پر آ گئی، اور اب ڈولی کے اعصاب کو کلچ کے زیر و بم کے ساتھ ہم آہنگ رہنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اِدھر سے اُدھر کھسک کھسک کر اس نے گدے کا ایک حصہ دریافت کر لیا جو نسبتاً نرم تھا اور جہاں سے اُس کی ٹانگیں پہلے سے زیادہ پھیل سکتی تھیں۔ دروازے کی طرف کا حصہ مدوّر تھا۔ ایسا گول کہ اُس کی کمر اُس میں بالکل ٹھیک آتی تھی۔ اُس نے اپنے جسم کو اس حلقے کی آغوش میں گرا دیا اور کھڑکی کو مضبوطی سے تھام لیا جیسے اُسے وہاں سے علیحدہ کر دیئے جانے کا خوف ہو۔ اگر لوگ دیکھ نہ رہے ہوتے تو شاید وہ اپنا گال بھی دیوار سے لگا دیتی۔ ہوا گرم تھی اور لاری کا دروازہ باہر سے جل رہا تھا، مگر اس کے باوجود اس کا اضمحلال کوسوں دور چلا گیا تھا۔ اپنے اعضاء کو آرام دینے کی خواہش ہی بجائے خود ایک منفرد اور مستقل کیف بن گئی تھی جس سے ہر ہر بند پورے شعور و ادراک کے ساتھ لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ہر ہر چیز میں اُسے روشنی، تازگی، دلچسپی، ندرت اور گرمیوں کی صبح کا سا تبسم نظر آ رہا تھا، جیسے کسی عجیب و غریب سرزمین میں ایک سیاح کو۔ اِس آرام کے لمحے میں وہ اپنی آنکھوں کو دُور دُور دوڑانا نہیں چاہتی تھی، بلکہ اپنی توجہ کو صرف سڑک کے کناروں تک محدود کئے ہوئے تھی۔ اور جب سڑک کا پہلا پتھر تک ایک فوری جادو کے زیر اثر دلفریب بن گیا ہو تو پھر کسی اور عجوبے کی تلاش میں آنکھوں کو سرگرداں کرنے سے کیا فائدہ! دھوپ سے چمکتی ہوئی سڑک سیدھی پھیلی ہوئی تھی، اور ایک ہمیشہ آگے بڑھتے ہوئے نقرئی ستارے پر ختم ہوتی تھی۔ سڑک کے کنارے درخت بھی تھے، مگر تیز دھوپ نے اُن کی آدھی شخصیت اُچک

اندر جذب کر لی تھی سلاری عجب پندار اور خود اعتمادی کے ساتھ بے نیازی سے چلی جا رہی تھی، اُس کی آواز دور سے سنتے ہی بیل گاڑیاں جلد جلد بالکل سڑک کے کنارے پر ہو جاتی تھیں، اور شہر سے لوٹتے ہوئے کسان ایسے گھبراتے تھے کہ بجائے الگ ہٹ جانے کے سڑک کے ایک طرف سے دوسری طرف بھاگنے لگتے تھے۔ لاری کی رفتار اور خصوصاً بیل گاڑیوں پر اُس کی فوقیت ڈوَلی کے دل میں رفعت کا احساس پیدا کر رہی تھی، اور اُسے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے مادے کی نجاست میں اُس کی آلودگی اور دوں کی بہ نسبت کم ہو گئی ہے۔ انجن کی بھنبھناہٹ نے اُسے دوسرے مسافروں کی گفتگو اور بحث و مباحثہ کی چیخ چاخ سے محفوظ کر دیا تھا، اس سے بھی زیادہ یہ کہ اِس تھرتھراہٹ نے اس کے گرد ایک ابتری حلقہ بُن دیا تھا۔ جہاں اس کے خیال کے مطابق، اُسے کوئی نہ دیکھ سکتا تھا، اور اس لئے پوری آزادی کے ساتھ اُس کے نتھنے پھول سکتے تھے، آنکھیں چمک سکتی تھیں، ہونٹ کھُل سکتے اور بند ہو سکتے تھے، اور چہرہ جو رنگ چاہے اختیار کر سکتا تھا۔ اپنے اس قلعہ بند گوشے میں سے وہ سڑک کے گذرتے ہوئے نظاروں کی سیر کر رہی تھی۔ وہ کئی ٹیلوں، مزاروں، کنوؤں اور باغوں سے اچھی طرح آشنا تھی، بلکہ بعض بعض درخت تک ایسے تھے جنہیں وہ پہچان سکتی تھی۔ رہٹ والے کنوئیں کو دیکھتے ہی اس نے بتا دیا تھا کہ اب اُس کے بعد کھجور کے پیڑ والا باغ آئے گا۔ شہر سے دو میل آگے کنجروں کا ایک تکیہ تھا جہاں کچھ مرد اور عورتیں بیٹھے سینکوں کے چھاج اور سرکیاں بنایا کرتے تھے اوّل تو ڈوَلی کو ان لوگوں کے بڑھے ہوئے بالوں اور وحشت ناک حُلیوں سے ہی کچھ کم دلچسپی نہ تھی، مگر دو دفعہ اُس نے یہاں ایک چھوٹے قد اور دُہرے بدن کی عورت دیکھی تھی جس کی بڑی بڑی پُرفن آنکھیں ہر وقت چاروں طرف گھومتی رہتی تھیں اور جس کی غیر معتدل چھاتیوں کی نظروں کو شرما دینے والی جنبشوں نے اُس پر موٹے موٹے حرفوں میں "نامناسب" اور "مشتبہ" لکھ دیا تھا، مگر جوان ہی اوصاف کے سبب سے قابلِ توجہ بن گئی تھی۔ ڈوَلی نے لاری سے سر نکال کر اُسے بار بار دیکھا تھا، اور آج بھی وہ اُسے کم سے کم ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی مگر جب لاری وہاں سے گزری تو تکیے کے باہر کوئی بھی نہ تھا، صرف تین بچے آپس میں لڑ رہے تھے۔ مگر ڈوَلی کو کوئی خاص مایوسی نہ ہوئی، اور وہ پھر سڑک کی نت نئی سیروں کی طرف متوجہ ہو گئی ....

لیکن صرف ایک چیز تھی جسے وہاں پانے کے لئے وہ پہلے سے تیار نہ تھی اور جسے وہاں پا کر اُسے تعجب ہوا۔ یہ ایک نیا اینٹوں کا بھٹہ تھا۔ چاروں طرف پکّی ہوئی اینٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، ایک بہت اونچی چمنی سے ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا، اور چند مزدور ٹوکریاں لئے ہوئے اِدھر اُدھر پھیر رہے تھے، مگر بھٹے کا رقبہ اتنا بڑا تھا کہ یہ جگہ پھر بھی بے طرح خالی خالی نظر آ رہی تھی ——— ایسے ہی اڈے پر ایک نیا مکان بن رہا تھا جس کی اینٹ اینٹ میں ایسی طمانیت بخش نمی تھی کہ ڈوَلی کا دل چاہ رہا تھا کہ اینٹوں پر ہاتھ رکھے رہے، سیلی ہوئی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو سونگھے، اور کونے میں کھڑے ہو کر وہاں کے ہلکے ہلکے اندھیرے کو اپنے کانوں میں سرگوشیاں کرتے ہوئے سُنے ——— اس مکان کی تری کی یاد اس کے خیال کو جاڑے کی اُن شاموں کی طرف لے گئی جب اسکول کے فیلڈ کے ہر طرف سے دھیما دھیما دھواں ہلکے ہلکے اُٹھ کر وہاں باقی بچی ہوئی لڑکیوں کو حلقے میں لے لیتا تھا، اور بیرونی دنیا سے اُن کا تعلق منقطع ہو جاتا تھا، اور اسکول انسانی آبادی سے کوسوں کے فاصلے پر کوئی یکہ و تنہا اور مسحور خطہ بن جاتا تھا، اور وہاں کی رہنے والیاں مقیّد شہزادیاں کھُلی ہوئی باہوں اور ٹانگوں پر جاڑے کی ٹھنڈک ایسے آ کر لگتی تھی جیسے کسی نے برفیلا ہاتھ رکھ دیا ہو) اور کندھے اور تھرتھرانے لگتے تھے۔ مگر موسم میں کچھ ایسی گم گشتگی اور اپنے آپ کو سپرد کر دینے کا تقاضا تھا کہ دو چار لڑکیاں جھوٹ موٹ کھیل میں مشغول باقی رہ جاتی تھیں۔ ایسے ہی وقت وہ نیلے سوٹ والا لڑکا اُدھر سے گزرتا تھا ——— جب تھوڑی دور سے بھی شکل اچھی طرح پہچاننے میں نہ آتی تھی۔ مگر وہ چہار دیواری سے جتنا ممکن تھا قریب ہو کر چلتا تھا، اور ڈوَلی کی طرف دیکھتا جاتا تھا تین دن کے اندر ہی ڈوَلی کو اُس کی نظروں کی سمت کے بارے میں کسی شبہے کی گنجائش نہ رہی تھی، اور وہ بھی اُس کے انتظار میں چہار دیواری کے قریب سے قریب ٹھیرے رہنے اور کم سے کم ایک بار اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ نہ جانے وہ اتنا اکیلا اکیلا کیوں معلوم ہوتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس کے ہمراہ کبھی کوئی ساتھی نہ دیکھا گیا ہو، بلکہ اُس کا چہرہ ہمیشہ کسی سوچ میں ڈوبا رہتا تھا۔ جب ڈوَلی کی نگاہیں اُس سے مل جاتی تھیں تو اُن آنکھوں کی پُرتفکر اُداسی ایک مختصر ترین لمحے کے لئے اُس کے دل میں بھی کسک پیدا کر دیتی تھی۔ .... نیلے کوٹ میں سے اُس کے گورے گورے ہاتھ باہر نکلے ہوئے کیسے اچھے معلوم ہوتے تھے، اور اُس کے چمکدار بالوں اور پُرمتانت چال کے تصور نے اُس کی کتنی راتوں کو مشغول رکھا تھا ——— وہ گرمیوں میں بھی آتا رہا تھا، اور جاڑوں کی دھندلاہٹ جانے کے بعد اب اُس کے ہونٹ بھی صاف نظر آنے لگے تھے جن سے اُس کے مزاج کی نرمی اور محبت اور اس کے دل کی حسرتناکی ٹپکتی تھی ——— وہ آج بھی یقیناً آئے گا، مگر میدان کو بالکل خالی پا کر بہت

مایوس ہوگا، وہ کس طرح پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہے گا، اور ہر لمحے اُس کی مایوسی
بڑھتی جائے گی۔ وہ دو تین دن برابر آئے گا، مگر آخر اُس کی اُمید بالکل ٹوٹ
جائے گی..... اس کے رنج کا خیال خود ڈولی کے دل میں بار بار ٹھونگیں سی
مار دیتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کاش وہ آج ٹھیر گئی ہوتی! جب وہ گزر رہا
ہوتا تو وہ کسی سے پکار کر کوئی ایسی بات کہتی جس سے یہ ظاہر ہو جاتا کہ وہ چھٹیوں
میں گھر جا رہی ہے، یا کوئی اور تدبیر اختیار کرتی۔ اس سے کم سے کم یہ تو ہوتا
کہ اس کو اتنی شدید مایوسی کا سامنا نہ کرنا پڑتا..... شاید وہ اُسے اپنی کوئی
یادگار دیتا۔ مثلاً وہ اپنا رومال یہاں دیوار کے اندر پھینک دیتا۔ یہ بھی
تو ممکن تھا کہ کوئی دیکھ نہ رہا ہوتا، اور وہ اُسے پکار کر کہتی "ذرا سنیئے.....
کیا آپ جانتے ہیں کہ میں کل چھٹیوں میں گھر جا رہی ہوں!" وہ اس سے زیادہ
کچھ نہ کہتی کیونکہ اُس کا چہرہ خود اُس سے کہیں زیادہ کہہ دیتا۔ وہ چار دیواری
کے باہر چلا آتا، اور دونوں کسی چیز پر بیٹھ جاتے۔ سڑک پر ایک راہگیر بھی نہ چل
رہا ہوتا۔ اور میٹرنیں وغیرہ سب اسکول کے اندر ہوتیں۔ وہ اُس کے کندھوں
کے گرد بانہیں ڈال لیتا، اور اُسے پیار کرتا..... مگر سینما میں تو اُس نے دیکھا
تھا کہ گالوں کے بجائے ہونٹوں کا بوسہ لیا جاتا ہے..... اس لئے فلم کی
ہیروئن کی طرح اُس کا چہرہ آہستہ آہستہ اوپر اُٹھتا اور سر پیچھے کو جھک جاتا،
وہ اس دعوت کو رد نہ کر سکتا، اور اُس کی ٹھوڑی اپنے انگوٹھے اور انگلی
سے پکڑ کر ایک لمحہ دیکھتے رہنے کے بعد اُس کے ہونٹوں پر ہلکے سے اپنے
ہونٹ رکھ دیتا فلمی ہیرو کی طرح اُس کے ہونٹ پتلے اور نرم ہوتے....
خود ڈولی اپنے جسم کو اُس سے جس قدر قریب ممکن تھا لگا دیتی، اور اپنے گوشت
میں اُس کے بدن کی گرمی داخل ہوتے ہوئے محسوس کرتی..... گرمیاں
یکا یک جاڑوں میں بدل جاتیں، اور ہر طرف سے دھواں اُٹھ کر انہیں دوسروں
کی نظروں سے محفوظ کر لیتا۔ گرمیوں کی شام کی واقعیت اور آنکھوں کو تکلیف
دینے والی عامیت اور خاکیت کی جگہ جاڑوں کی پراسراری، ابہام اور رومانیت
لے لیتی۔ شدہ شدہ تاریک ہوتے ہوئے لمحوں کی بے درد گریزپائی وہیں کی
وہیں جم کر رہ جاتی۔ وہ ایک دوسرے سے اپنا جسم لگائے ہوئے پیار کی باتیں
کرتے رہتے، کرتے رہتے۔ یہاں تک کہ اُن کی یکجائی کا ایک ایک لمحہ
ابدیت سے ہمکنار ہو جاتا..... بخارات کی طرح دھجی دھجی ہو کر اڑتے ہوئے
اندھیرے سے جدوجہد کرنے والے اکیلے ستارے کی روشنی میں وہ کتنے
معصوم، آمیزش و آلائش سے پاک اور مصفا و منزہ معلوم ہونے لگتے ——
جیسے آدم و حوا عرش بریں کے سائے میں اپنی ملاقات کے پہلے دن...

بہجت و مسرّت کی اس فراوان منظری کے ساتھ ساتھ ڈولی کے
تحت الشعور میں طرح طرح کے تہدید آمیز خدشے اور دغدغے جڑ پکڑ
رہے تھے۔ جب وہ اپنے تخیل کی سحر کاری سے اچھی طرح لطف اُٹھا چکی،
اور کسی بچی بچائی چیز کی کھوج میں ذرا سا رکی تو وہ فتنے اپنی کمین گاہ سے
باہر نکل آئے۔ یہ خیال اُسے بار بار ڈرائے دے رہا تھا کہ اگر کہیں ایسا ہوا کہ
چھٹیوں کے بعد وہ اُسے نظر نہ آیا تو—— ممکن ہے کہ وہ اس دوران میں
کہیں باہر چلا جائے، یا اتنی دور مکان لے لے کہ وہاں سے آنا مشکل ہو جائے
یا پھر کسی اور کی طرف متوجہ ہو جائے اور وہ نیلا سوٹ کسی اور سڑک پر نثار
آیا کرے۔ اور یہ بھی بالکل قرین قیاس ہے کہ اتنے دن تک نہ دیکھنے کے بعد
اُسے ڈولی پسند نہ رہے، اور وہ ایک غیر دلچسپ چیز کے پھیر میں آنا محض
حماقت سمجھنے لگے۔ اور کیا خبر کہ وہ شروع سے ہی ڈولی کو کوئی اہمیت
نہ دیتا ہو، اور محض تفنن طبع کے لئے اُس سے نظر بازی کیا کرتا رہا ہو، اور اب
اس مذاق سے اس کا دل بھر جائے...... اگر وہ نہ آیا تو ڈولی کی دُنیا
کیسی ویران ہو جائے گی۔ کھیل دیل میں اُس کا جی بالکل نہ لگے گا، وہ بار بار
سڑک کی طرف دیکھے گی، مگر ہر دفعہ اُس کی نگاہ کسی خوانچے والے یا کسی بڈھے
ٹہلنے والے سے ٹکرا کر واپس آ جایا کرے گی۔ چند دن تو وہ رات تک
ٹہل ٹہل کر انتظار کرے گی، مگر پھر اس کا دل انتظار سے رنجیدہ اور بیزار ہو جائے گا
کہ وہ سب سے پہلے واپس ہو جایا کرے گی۔ وہ جھنجلا جھنجلا کر اپنے ہونٹ
چبایا کرے گی، اور بولنا بالکل کم کر دے گی..... اُسے چاہئے تھا کہ
پہلے سے حفاظتی تدابیر اختیار کرتی تاکہ وہ کم سے کم اُسے یاد تو کر لیا کرتا۔
مثلاً وہ دیوار کے اس طرف کوئی چیز گرا دیتی، اور اُس سے دوستانہ مگر
انکسار کے لہجے میں کہتی "مہربانی سے ذرا اسے اُٹھا دیجئے!" جب وہ اُٹھا
کر دیتا تو وہ اُس کا مسکرا کر شکریہ ادا کرتی، اور وہاں سے ہٹنے سے پہلے
چند لمحے ٹھٹکی رہتی، اور کئی دفعہ متشکرانہ اُس کی طرف دیکھتی تب تو یقین
تھا کہ وہ اُس کے دل میں جگہ پا لیتی اور وہ چھٹیوں کے بعد بھی آنا نہ چھوڑتا
...... یا پھر کسی دن ہمت کر کے اور ساری دنیا سے مخالفت پر
کمر باندھ کے وہ اُسے روک لیتی اور پوچھتی "کیا آپ کو میں اچھی نہیں لگتی؟
کیا آپ کو میرا رنگ پسند نہیں ہے، یا میری شکل میں کوئی خرابی ہے؟ آخر
آپ اتنے الگ تھلگ اور بے پروا سے کیوں نکلے چلے جاتے ہیں؟
..... میں تو آپ کے خیال میں راتوں کو کتنی کتنی دیر تک جاگتی رہی
ہوں۔ یہاں تک کہ میرا سر مارے درد کے پھٹنے لگا ہے۔ کلاس میں بیٹھے بیٹھے

بھی میں آپ کے بارے میں سوچنے لگی ہوں، اور ٹیچر نے جو کچھ کہا اُس کا ایک لفظ بھی نہیں سُن سکی ہوں"۔ وہ خاموشی سے سنتا رہتا، اور آخر کہتا کہ ۔۔۔۔۔ مگر کون جانے کہ وہ کیا کہتا! ۔۔۔ یا پھر کسی دن ایسا ہوتا کہ دونوں کسی دن ساتھ بیٹھے ہوتے اور وہ اُس سے شرماتے ہوئے کہتی "آئیے، لَو، لائک، ہیٹ (LOVE, LIKE, HATE) کھیلیں ۔۔۔۔ میں سلیٹ کے ایک طرف کسی کا نام لکھ دوں گی اور آپ کو دکھاؤں گی نہیں، آپ دوسری طرف (LOVE یا LIKE یا HATE) لکھ دیجئے"۔ وہ پہلے اوروں کے نام لکھتی جن کے مقابلے میں وہ کبھی تو (Hate) لکھ دیتا اور کبھی (Like) اور جب وہ اُسے نام دکھاتی تو دونوں خوب قہقہے لگاتے۔ آخر میں وہ اپنا نام لکھتی، اور بے چینی سے اُس کے لکھنے کا انتظار کرنے لگتی۔ وہ سلیٹ پر LOVE لکھ دیتا، اور جب سلیٹ اُلٹی جاتی تو وہ ظاہر میں تو جھینپ کر مسکراتے ہوئے نیچے دیکھنے لگتی، مگر اُس کے دل میں خوشی کا دریا اُمنڈ آتا، اور آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگتے۔ اور پھر وہ ۔۔۔۔ مگر نہ جانے پھر وہ کیا کرتا! شرما کر بھاگ جاتا؟ یا اُس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیتا ۔۔۔ ممکن ہے کہ ڈولی کے کپڑے اُسے پسند نہ آئے ہوں ۔۔۔۔ کیسا اچھا ہو اگر چھٹیوں کے بعد جب وہ لڑکا اُدھر سے گزرے تو وہ امی کا ساریشمی فراک پہنے ہو ۔۔۔ سفید زمین پر چھوٹے چھوٹے سبز پھولوں والا، جس کے گریبان پر خوبصورت سی (Smock) بنی ہوئی تھی۔۔۔۔ امی نے بڑے فخر سے اپنا فراک سب کو دکھایا تھا، اور وہ اس کپڑے کی قیمت دو روپے گز بتا رہی تھی۔۔۔۔ دام گو بہت زیادہ ہیں ۔۔۔ مگر ایسا بھی کیا ہے ۔۔۔۔ جب وہ گھر پہنچے گی تو اُس کی ماما کہیں گی "ڈولی، دیکھو تمہاری آنٹی نے آگرے سے تمہیں فراک بھیجا ہے"۔ اور جب وہ فراک نکال کر لائیں گی تو وہ بالکل ویسا ہی ہوگا ۔۔۔ یا پھر وہ یوں کہیں گی "تمہارے پاپا دلّی گئے تھے۔ وہاں انہوں نے لکڑوں والے کی دکان پر فراک کا ایک کپڑا دیکھا۔ انہوں نے سوچا کہ ڈولی کے لئے لیتا چلوں۔ بڑا سستا مل گیا وہ۔ بس ایک فراک کا ہی تھا"۔ وہ ماما سے جگہ پوچھ کر بھاگی بھاگی جائے گی، اور کپڑا نکال کر دیکھے گی تو وہ وہی سبز پھولوں والا ہوگا ۔۔۔۔ وہ اپنے فراک کو بہترین وضع کا ترشوائے گی، اور گریبان پر سیپ کے نیلے بٹن لگوائے گی۔ جب وہ اُسے پہنے گی تو کیسی اچھی معلوم ہوگی۔ وہ اُس دن دوپٹہ بالکل نہ اوڑھے گی۔ اول تو ڈوپٹے سے گریبان کی ساری خوبصورتی چھپ جاتی ہے، دوسرے دوپٹہ کیا ہوتا ہے۔ عذابِ جان ہوتا ہے، ہر وقت سنبھالتے رہو، ہاتھ اِدھر اُدھر ہلاؤ تو پھنس جائے، مسلمان سے گننے لگتے ہیں دوپٹہ اوڑھ کر ۔۔۔۔

یہ اچھے قاعدے ہیں اسکول کے۔ باہر جاؤ تو ڈوپٹہ اوڑھ کر جاؤ، ساڑھی نہ پہنو، میٹرن کے بغیر کہیں نہ جاؤ ۔۔۔۔ وہ میٹرن ایک چڑیل ہے، ذرا سامنے سے کھسکنے نہیں دیتی۔ گرجا سے لوٹتے ہوئے کتنی مرتبہ اُس کا جی چاہا کہ کمپنی باغ کے اندر سے ہو کر چلے، مگر میٹرن نے ایک نہ مانا۔ اور کھیل کے میدان میں بھی ایسی کنسوئیاں لیتی پھرتی ہے جیسے چوری کی سازش ہو رہی ہو ۔۔۔۔ اور ہاں، ساڑھی پہننے میں بھلا کیا نقصان ہے؟ آخر گورنمنٹ گرلس ہائی سکول کی لڑکیاں بھی تو ہیں۔ وہ کیسی رنگ برنگی ساڑھیاں پہن کر جاتی ہیں لاری میں دس بجے ۔۔۔۔ یہاں صبح پانچ بجے ہی اٹھا کر بٹھا دیا جاتا ہے۔ اُٹھنے میں دیر کرو تو ایک چیخ پکار، آفت چاہے نیند کے مارے آنکھیں بند ہو رہی ہوں مگر چل کر ناشتے کی روٹی پکاؤ۔ یہ بھی تو نہیں کہ اس کے بدلے ایک ٹکیا ہی زیادہ مل جائے۔ وہاں تو اُلٹی میٹرن صاحبہ چلاتی ہوئی آئیں گی "اس مہینے میں گھی بہت خرچ ہوگیا۔ مجھے دکھا کر لیا کرو روز" اور پھر اوپر سے چھوٹی لڑکیوں کی ضدیں۔ "وہ لیں گے ہم، وہ بڑی ہے"۔ کام کے وقت تو پڑی سوتی رہیں، اور جب سب ناشتہ تیار ہوگیا تو چلیں نخرے کرتی وہ۔ یہ جی چاہتا ہے کہ بس دھکے دے اٹھا کے، اور کچھ نہ کرے۔ یہ سب ہنگامہ ختم ہو چکے تو پھر چلو اسکول۔ وہاں الگ مصیبت۔ سوال کیوں نہیں کئے؟ مضمون کیوں نہیں لکھا؟ دم مارنے کی مہلت ملے تو کہو کیا بھی جائے۔ پلنگ پر پڑ کے بھی تو چین نہیں ملتا، حکم ہے کہ دس بجے کے بعد کسی کی آواز نہ سُنائی دے ۔۔۔۔ اور ہاں، اسکول میں ایک گھنٹے کی چھٹی ملے تو چلو، کھانا پکاؤ۔ اتوار کا دن ہو تو بچیوں کی جوئیں دیکھو۔ میلے میلے اُلجھے ہوئے سر، جنہیں چھونے کو بھی جی نہ چاہے۔ بیٹھے کریل رہے ہیں۔ اُنہیں ۔۔۔۔ کسی دن سیر کو بھی جانا نصیب ہو جائے تو میم صاحب ساتھ، انگریزی بولنے کی مشق کراتی ہوئی۔ آگے آگے پکارتی چلتی ہیں "پلیز، کم ٹو می" (Please come to me) اور پھر لڑکیوں کی قطار اس فقرے کو دہراتی ہے۔ اگر میم صاحب نے سُن لیا کہ کسی لڑکی نے "کھم" کے بجائے "کم" کہا ہے تو بس اب اُس کے پیچھے ہیں، جب تک وہ بالکل صحیح انگریزی لہجے میں لفظ ادا نہ کرے اُس کا پیچھا چھوٹنا مشکل۔ یہ سیر کیا ہوئی مصیبت ہوئی۔ نہ کسی چیز کو دیکھ سکو نہ کچھ۔ بس قواعد سی کرتے جاؤ اور ایسے ہی واپس آجاؤ ۔۔۔۔ اُس کے مقابلے میں گورنمنٹ اسکول کی لڑکیاں ہیں۔ اپنا ٹھاٹھ سے دس بجے نکلتی ہیں لاری میں، جیسے کپڑے جی چاہتا ہے پہنتی ہیں۔ کوئی روک نہ ٹوک ۔۔۔۔ اگر وہ بھی گورنمنٹ اسکول میں ہوتی تو کیا مزا رہتا۔ وہ اطمینان سے سو سُلا کر اُٹھتی

اور اپنی گلابی ساڑھی پہن کر اسکول جایا کرتی۔ وہ اُس نیلی لاری کی کھڑکی سے لگ کر بیٹھتی، اور اُس کی کہنی باہر نکلی رہتی۔ اس کے بالوں کی ایک لٹ ہولے سے اُڑتی جاتی، اور ساری دنیا اُس کی نظروں کے نیچے سے کھسکتی رہتی..... مگر وہاں کی فیس کتنی زیادہ تھی۔ وہاں ساتویں کے پانچ روپے لئے جاتے تھے۔ حالانکہ یہاں وہ صرف چندے کے چار آنے دیتی تھی.... فیس زیادہ سہی، مگر اُس کا وہاں داخل ہو جانا کچھ ایسا ناممکن بھی نہ تھا..... گھر جا کر وہ بابا سے کہے گی کہ وہ گورنمنٹ گرلس ہائی سکول میں پڑھنا چاہتی ہے۔ بابا تھوڑے سے اصرار کے بعد راضی ہو جائیں گے۔ چھٹیاں ختم ہونے پر وہ اپنا سرٹیفکیٹ لینے اسکول جائے گی۔ وہاں اُسے امی ملے گی...... امی کتنا بنتی ہے۔ دیکھو تو زرد، دُبلی، پتلی، جیسے بھوکوں ماری بلی اور اپنے آپ کو خوبصورت سمجھتی ہے بھلا! اسٹیشن پر کیسا بن بن کر چل رہی تھی۔ ٹرین میں سے سر گزرتے ہوئے لڑکے کی طرف جھانک کر دیکھتی تھی جیسے وہ اس پر دیوانہ ہی تو ہو گیا ہے۔ وہ ہر وقت یہ دکھانے کی کوشش کرتی رہتی ہے کہ وہ بہت امیر ہے۔ اپنے کپڑے ہر ایک کو دکھائے گی، اُن کی قیمتیں بتائے گی، طرح طرح سے یہ جتلائے گی کہ وہ اسکول کی پوری فیس دیتی ہے اور سب دوسروں کی معاف ہے۔ اسٹیشن پر بھی جب دوسری لڑکیاں ملائی کا برف لے رہی تھیں تو وہ ہاتھ میں ریشمی رومال ہلاتی ہوئی اسٹال پر گئی تھی۔ اور ایسی آواز میں کیک اور لیمینیڈ مانگا تھا کہ سب سن لیں..... امی اُس سے پوچھے گی "سرٹیفکیٹ کیوں لے رہی ہو تم، ڈولی؟" وہ بڑے فخر سے جواب دے گی "میں تو اب گورنمنٹ اسکول میں جا رہی ہوں"! امی اُس کی طرف رشک سے دیکھتی رہ جائے گی، اور وہ وہاں سے کندھے اور سر اُٹھائے چلی آئے گی، اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھے گی۔ پھر وہ روز دس بجے نیلی لاری میں گورنمنٹ گرلس ہائی سکول جایا کرے گی۔ اور لڑکیوں کے ساتھ ہنستی بولتی، روز طرح طرح کی ساڑھیاں پہن کر ——— کپڑوں کا خیال آتے ہی اُسے یاد آیا کہ دراصل وہ سبز پھولوں والے فراک کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اُس نے ارادہ کر لیا کہ جب وہ پہلے پہل وہ فراک پہنے گی تو اُس دن نہا کر اچھی طرح بال بنائے گی، اُن میں گلاب کا پھول لگائے گی، چہرے پر سیل کھڑی رجو اُس کے یہاں بطور پاؤڈر کے استعمال ہوتی تھی) ملے گی، اور جوتے کو پالش سے خوب چمکائے گی۔ اُسی دن وہ اپنے چار آنے والے بُندے بھی نکالے گی جن میں اُودی گولیاں لگی ہوئی ہیں۔ پہلے وہ خود آئینہ دیکھ کر اطمینان کرے گی کہ وہ واقعی اچھی بھی معلوم ہوتی ہے یا نہیں۔ پھر وہ حمیدہ کے یہاں جائے گی۔ اُس کے باہر نکلتے ہی سارے دیکھنے والے حیران رہ جائیں گے راستے میں اُسے طاہر، ایوب اور دیپ چند ملیں گے۔ اُن کی یہ ہمت تو نہ ہو گی کہ اُس سے کچھ بولیں، مگر وہ ہمیشہ سے زیادہ تیز نظروں سے اُس کی طرف گھورنے لگیں گے، آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف اشارے کریں گے، اور اُن میں سے ہر ایک اپنے کوٹ کا کالر کھینچ کھینچ کر اور خواہ مخواہ انگریزی لفظ بول بول کر یہ دکھانے کی کوشش کرے گا کہ وہ دوسروں سے زیادہ فیشن ایبل اور پڑھا لکھا ہے۔ مگر وہ اُن کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے گی، اُس کی رفتار کی ہمواری میں کسی قسم کا فرق نہ پڑے گا، اور وہ بڑی متانت اور وقار کے ساتھ گزری چلی جائے گی۔ تاہم اُس کا دل بلّیوں اُچھل رہا ہو گا، اور اس کی آنکھوں کے پپوٹے پھڑپھڑانے لگیں گے۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ کو روک سکے گی۔ سقّے کی شبراتن بھی اُس وقت اپنا ٹاٹ کا پردہ اٹھائے جھانک رہی ہو گی۔ وہ بھی اُسے دیکھ کر بڑی متعجب ہو گی۔ وہ آہستہ سے پکارے گی "ڈولی!" اور ہاتھ کے اشارے سے اُسے بلائے گی۔ مگر ڈولی اُس کی طرف ذرا سا مسکرا دے گی، اور آگے بڑھتی چلی جائے گی۔ اور حمیدہ تو بالکل مبہوت رہ جائے گی۔ وہ ڈولی کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھے گی، اور اس کا نچلا ہونٹ لٹکا رہ جائے گا۔ وہ اپنے دوپٹے کو خوب پھیلا کر اچھی طرح نیچے کھینچ لے گی جیسے اپنے تنگ پائنچوں کے پاجامے کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اُس کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو جائے گی، اور وہ مارے رشک کے تھوڑی دیر تک کچھ نہ بول سکے گی۔ اُس کی اماں بھی مسکرا مسکرا کر اُس کی طرف دیکھیں گی، اور فقرہ چُست کرنے کی فکر میں کہیں گی "اُفوہ، آج تو بڑے ٹھاٹھ سے ہو، ڈولی!" پھر حمیدہ کی بھی زبان کھلے گی "ہاں، ڈولی، آج تو بہت ٹھاٹھ میں ہو!" وہ اُس دن حمیدہ کے ساتھ ساتھ نہ پھرے گی۔ اگر کہیں باورچی خانے وغیرہ میں اُس کے فراک پر دھبّہ لگ گیا تو؟ وہ بس ایک جگہ جا کر پلنگ پر بیٹھ جائے گی، اور تھوڑی ہی دیر میں چلی آئے گی یہ کہہ کر "اچھا، اب تم کام کرو گی۔ میں چلوں"..... وہ حمیدہ کو بتائے گی "اِسے بو کہتے ہیں"۔ وہ بہت سے نئے فیشنوں کا ذکر کرے گی، اور کئی انگریزی لفظ بولے گی۔ جنہیں سُن سُن کر حمیدہ بہت مرعوب ہو گی، اور شرم کے مارے اُن کا مطلب بھی نہ پوچھے گی، بلکہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرے گی کہ ہاں، وہ سب سمجھ رہی ہے ...... بالکل جاہل ہے حمیدہ بھی۔ پاؤڈر کو پوڈر کہتی ہے بھلا! رونگ تو آتی نہیں اُسے۔ اور یہ لوگ بنتے ہیں بہت وہ کہ ہم بہت بڑے زمیندار ہیں۔ کپڑے کو ذرا صاف نہیں رکھ سکتی۔ بس صبح پہنے اور شام کو میلے۔ اُس کے

کپڑے کتنے گندے رہتے ہیں، اور اُن میں سے پسینے کی بُو آتی رہتی ہے
بالوں کو تو بالکل جھاڑ رکھتی ہے۔ کبھی یہ بھی تو نہیں کرتی کہ ذرا بیٹھ کر اُن میں
کنگھی ہی کرے ...... شاید عید کے دن کچھ اچھے کپڑے پہنتی ہو تو پہنتی
ہو۔ اب کی عید کو اُس کا جی چاہا تھا کہ ذرا جا کر دیکھے کہ جمیلہ نے کیسے کپڑے
پہنے ہیں، مگر وہ اس خیال سے رُک گئی کہ کہیں اُسے ندیدہ نہ سمجھا جائے
...... اُس کے یہاں جمیلہ کے گھر سے سوّیاں آئی تھیں، اور اگلے دن
جب وہ گئی تھی تو جمیلہ نے کہا تھا "تم کل نہ آئیں۔ ہم تو تمہارا انتظار کرتے
رہے۔ آتیں تو ہم تمہاری دعوت کرتے" ..... جمیلہ کو یہ بھی نہیں معلوم
کہ ایسے کسی کے گھر بے بلائے نہیں جایا کرتے ...... وہ اب کے
کرسمس پر ضرور جمیلہ کی دعوت کرے گی، اور انگریزی میں رقعہ لکھے گی جسے
ترجمے کی کتاب میں سے نقل کیا جا سکتا ہے۔ رقعہ دیکھ کر جمیلہ کچھ نہ سمجھ سکے
گی، اور پوچھے گی "کیا ہے یہ؟" تب وہ اُسے مطلب سمجھائے گی .... مگر
جمیلہ کہیں باہر تو نکلتی نہیں ...... تو کیا ہے؟ وہ خود جمیلہ کے ابا سے
کہے گی کہ وہ اُسے جانے دیں، اُس کے کہنے سے وہ اجازت دے دیں
گے۔ پھر جمیلہ آئے گی رات کو، برقع میں لپٹی لپٹائی، سمٹتی ہوئی۔ وہ اُسے
کرسی پر بٹھلائے گی۔ جمیلہ کو میز پر بیٹھ کر کھانا عجیب معلوم ہوگا، اور وہ کچھ
سٹ پٹا سی جائے گی۔ جب جمیلہ پلاؤ کو ہاتھ سے کھانا شروع کرے
گی تو وہ جلدی سے اُس کی طرف چمچہ بڑھائے گی "لو، لو، چمچے سے کھاؤ۔"
جمیلہ بڑی شرمندہ ہوگی، اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے گی، وہ جمیلہ کو فلموں کے
قصے، اسکول کے کھیلوں کا حال، اور میم صاحب کی باتیں سنائے گی جو
اُسے پریوں کے ملک کی داستانیں معلوم ہوں گی جہاں کی سیر کا وہ خیال
تک نہیں کر سکتی۔ خصوصاً یہ سُن کر اُسے بڑی حیرت ہوگی کہ فلم دکھلانے سے
پہلے سینما میں اندھیرا کر دیا جاتا ہے ..... میز پر کیک دیکھ کر جمیلہ دل
میں تعجب کر رہی ہوگی کہ یہ کیا چیز ہے۔ آخر وہ خود ہی جمیلہ کی طرف کیک
بڑھاتے ہوئے کہے گی۔ "لو، کیک لو ..... یہ کیک ہے۔ انگریزی ہوتا ہے
یہ سارے انڈوں سے بناتے ہیں" وہ یہ بھی پوچھ لے گی "تم نے چاکلیٹ
کھائی ہے، جمیلہ؟ ..... انگریزی مٹھائی ہوتی ہے وہ ..... اِتنی بڑی بڑی
تختیاں سی ہوتی ہیں۔ بڑی مزیدار ہوتی ہے۔ ہمیں تو میم صاحب بانٹا کرتی
ہیں ......" وہ اُسے یہ بھی سنائے گی کہ ریل میں لڑکیاں کتنی ہنستی ہیں، گاتی
ہیں، مذاق کرتی ہیں، اور کیسا کیسا لطف رہتا ہے۔ جمیلہ للچا للچا کر رہ جائے
گی، اور کچھ کھسیانی سی ہنسنے لگے گی ..... وہ جمیلہ کو یہ بات بتلائے یا نہ بتائے
کہ اسٹیشن پر ایک لڑکا ———

ایک مٹھی ریت آکر اُس کے چہرے پر اس بُری طرح گرا کہ اُس
کی آنکھیں اور منہ کرکرانے لگے۔ ہوا بہت تیز ہو گئی تھی۔ اور درخت دیوانہ وار
ہل رہے تھے۔ آسمان گرد سے بالکل اٹ گیا تھا اور خالی کھیتوں میں دور
دور تک بگولوں نے اُٹھنے اور پھر گرنے کا سلسلہ باندھ رکھا تھا گویا انہوں
نے ایک دوسرے سے شرط بد رکھی تھی۔ برے کی طرح چکر بناتے ہوئے
اوپر چڑھنے کے باوجود اُن کے ناچ کو کسی قدر دلچسپی سے دیکھا جا سکتا تھا،
مگر نیچے گرنے میں اُن کی سستی، ٹھیراؤ، نیم رضامندی اور ہچکچاہٹ ناقابلِ
برداشت تھی۔ بعض دفعہ تو وہ ایسے معلّق ہو جاتے تھے گویا انہوں نے بالکل
ہمت ہار دی ہے اور اب بالکل آگے نہ بڑھیں گے۔ اُن کی کاہلی دیکھ دیکھ
کر ڈولی اپنے آپ سے تنگ ہوئی جا رہی تھی، اور اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ
شیشے پر مُکّا مارے یا کوئی ایسی ہی وحشیانہ حرکت کرے جس سے کم سے کم
یہ تو معلوم ہو کہ اُس کے اندر زندگی ہے۔ کھیت بالکل صاف پڑے تھے یا
صرف کہیں کہیں کھونٹیاں دکھائی دیتی تھیں۔ بعض جگہ خالی کھیتوں کے پار
تھوڑی سی گرد آلود ہریالی بھی زمین کے قریب قریب بچھی ہوئی نظر آتی تھی، خشک
اور زرد کا یہ میل گنجی چاند کی طرح ایسا گھناونا تھا کہ ڈولی کو کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا
جیسے یہ کھیت اُس کے پیٹ میں سے اُٹھ کر حلق میں اٹک گئے ہیں اور اُسے قے
سی آ رہی ہے۔ سڑک کے درخت اُس کی بائیں آنکھ کا نشانہ باندھ کر تیر
کی طرح اُڑتے ہوئے آتے تھے جیسے اُس کے دماغ کو توڑ کر پار ہو جائیں
گے، مگر جب وہ قریب پہنچتے تھے تو جلدی سے بچ کر نکل جاتے تھے۔
ڈولی اس پر بالکل تیار تھی کہ وہ اُس کا سر پھوڑ دیں، مگر اُس کے لئے یہ پُر
فریب مذاق بہت تکلیف دہ تھا۔ اُس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا، اور
آنکھوں میں پانی بھر بھر آتا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے ڈیلے جل رہے تھے۔
اور پلک جھپکانے سے بجائے تسکین کے اُلٹی چُبھن ہوتی تھی۔ پیچھے بیٹھنے
والے چیخ چیخ کر بے معنی بحثیں کر رہے تھے، اور اتنے لوگ ایک ساتھ
مل کر بول رہے تھے کہ لاری مینارِ بابل بن گئی تھی۔ ایک آدمی اپنی آواز
دوسروں سے بلند کرنے کی کوشش کر رہا تھا "ارے جناح، جناح .
..... جناح نے تو وہ کیا جو ..... چند آدمی "کسان ..... کسان ....."
کہہ کر اپنی بات شروع کرنے کا موقع ڈھونڈھ رہے تھے، مگر دوسرے
آدمی اُن کی بات کاٹ کر خود بھی "کسان ..... کسان ....." کہنا شروع
کر دیتے تھے۔ ڈولی ہزار کوشش کر رہی تھی کہ اس طرف سے کان بند

کر لے۔ مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی لفظ ضرور آ کر اُس کے مغز میں ڈھیلے کی طرح لگتا تھا۔ انجن نے الگ غوں غوں مچا رکھی تھی جس کی دُھن پر ٹکریں کھاتے کھاتے اس کا سر بالکل مفلوج ہو گیا تھا، اور گرا پڑ رہا تھا...... اُس سے پلک تو نہ جھپکائی جاتی تھی، مگر اُس کے پپوٹے اب ڈلوں کے کانٹوں کے عادی ہو چکے تھے۔ اُس نے ہر چہ بادا باد کہہ کر اپنی آنکھوں کو نیم باز چھوڑ دیا، اور بالکل بے حرکت ہو گئی۔ آنکھوں کا کھلا ہوا حصّہ پانی سے ڈھک گیا جس کی چیپک نے پلکوں کو نیچے کھینچ لیا، اور اُس کی آنکھیں آخر بند ہو گئیں...... نیند میں ہونے کے باوجود وہ انجن کی بھنبھناہٹ صاف سُن رہی تھی، مگر وہ اُس کے سونے میں مخل ہونے کے بجائے اُسے لوری دے رہی تھی اور دوسری مداخلتوں سے بچا رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ بہت تیزی سے آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے مگر اُس سے زیادہ اُسے زمان و مکاں کا کوئی شعور نہ تھا۔ وہ اپنا جسم تک کھو بیٹھی تھی، وہ کسی لطیف شئے میں بھی تبدیل نہ ہوئی تھی، بلکہ محض ایک شناخت، صرف ایک خیال ــــ "میں" ــــ باقی رہ گیا تھا۔ اُس کے چاروں طرف ایک بھوری تاریکی تھی جس میں کبھی کبھی پھیکی سی سفیدی کے دھبے دکھائی دے جاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہہ سکتی تھی کہ وہ انجن کی بھنبھناہٹ کے اندر سفر کر رہی ہے صرف ایک دفعہ اُسے سر کے بال اور پیشانی کا تھوڑا سا حصّہ نظر آیا تھا۔ جسے اُس نے پہچان لیا تھا کہ آرین کا ہے، مگر وہ ایک جھلک کے بعد ہی غائب ہو گیا تھا، اور اندھیرے کی روانی پھر اُسی طرح جاری ہو گئی تھی.......

لاری کے ایک دھچکے سے اُس کی آنکھ کھُلی۔ لاری ایک گاؤں کے پاس سے گزر رہی تھی۔ سڑک کے ایک طرف جھونپڑی کے سامنے ایک عورت گُٹّی کات رہی تھی، اور دوسری طرف کائی سے ڈھکا ہوا ایک تالاب تھا جس میں تین چار بھینسیں تیر رہی تھیں اور سر اُٹھا اُٹھا کر لاری کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔ بچے اپنا کھیل چھوڑ کر کھڑے ہو گئے تھے، اور انتظار کر رہے تھے کہ لاری آگے بڑھے تو اپنے گلے سے ہارن بجاتے ہوئے اُس کے پیچھے بھاگیں۔ ڈولی کا درد تو اب اچھا ہو گیا تھا، مگر سر بھاری تھا، اور آنکھیں نیند کی وجہ سے ابھی طرح کھُل نہیں رہی تھیں۔ اس کے علاوہ اُسے کچھ زکام سا بھی ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اُسے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اُس کا سر تو بالکل بے حس ہو گیا ہے اور اس کے بجائے تھوڑی کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔ اُس نے گردن اکڑا اکڑا کر انگڑائی لی، اور سڑک کے نظاروں میں دلچسپی لینے کی کوشش کرنے لگی تاکہ اُس کی گرانی کچھ دور ہو جائے۔ گاؤں سے تھوڑی دور آگے ایک بچہ روتا ہوا جا رہا تھا جو لاری کو دیکھ کر چُپ ہو گیا، اور اُس نے ننگی ٹانگوں پر سے اپنے کُرتے کا دامن سمیٹ کر ایک ہاتھ میں اُوپر اٹھا لیا، اور لاری کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک بیل گاڑی میں ایک عورت بیٹھی تھی جس نے اپنا زرد ڈوپٹہ دانتوں میں دبا رکھا تھا، اور جس کی ناک میں سونے کی کیل چمک رہی تھی۔ مگر ڈولی کو اُس کے پیلے پیلے دانت بالکل پسند نہ آئے، اور وہ لاری کے لیمپوں کی طرف دیکھنے لگی۔ لیمپ تو کچھ ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے لاری سے جُڑے ہوئے ہی نہیں ہیں۔ وہ تو گویا ہوا میں معلّق تھے اور ایک تعجب خیز ہم آہنگی کے ساتھ لاری کے آگے آگے بھاگ رہے تھے..... مگر ان چیزوں کے ساتھ وہ اپنی مصنوعی دلچسپی کو زیادہ دیر تک قایم نہ رکھ سکی، اور اُسے یقین ہو گیا کہ اپنا دل بہلانے کے لئے اُسے اپنے اندر ہی کوئی چیز تلاش کرنی پڑے گی۔ کچھ یادوں اور واقعوں کو رد کر دینے کے بعد اُسے خیال آیا کہ صرف "غزل الغزلات" ہی سے اُس کی کاربرآری ہو سکتی ہے جس سے اُس کا تعارف برنس نے کرایا تھا۔ ایک رات وہ بائبل لئے ہوئے اُس کے پاس آئی تھی، اور اور لجاتے ہوئے نیچی آواز میں اُس سے کہا تھا "تم نے یہ دیکھا ہے، ڈولی؟" اُس نے "غزل الغزلات" کا ایک صفحہ کھول کر اُس کے سامنے رکھ دیا تھا، اور اپنے آپ سیدھی بیٹھ کر مضطرب انداز میں دانتوں سے ناخون کاٹنے لگی تھی۔ اور جب ڈولی کو بھی اُس میں بہت مزا آیا تو وہ اپنی دریافت کی کامیابی پر بہت مسرور ہوئی تھی۔ اُن دونوں نے پوری "غزل الغزلات" کو کئی دفعہ ساتھ بیٹھ کر پڑھا تھا، اور ڈولی نے اکیلے میں بھی، یہاں تک کہ اُسے کئی مزیدار حصّے یاد ہو گئے تھے، اور اُس کے کتنے ہی ویران اور آزردہ لمحوں میں رنگینی کا سامان بن چکے تھے...... اُس دن کہ جب اُسے پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ وہ لڑکا اُس کی طرف دیکھتا ہوا چلتا ہے، وہ رات کو پلنگ پر لیٹی دیر تک ان حصّوں کو یاد کرتی رہی تھی، اُس نے اپنی رانیں خوب بھینچ لی تھیں، باہیں تکئے کے دونوں طرف پھیلا کر الٹی لیٹ گئی تھی، اور چھاتیوں کو پلنگ سے لگا کر سینے کی پوری قوت سے دبایا تھا جن کی ہلکی سی کسک میں اُسے انتہائی لطف ملا تھا...... ان ٹکڑوں کو یاد کرنے سے پہلے اُس نے ہر طرف سر گھما کر اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ کہیں لاری میں کوئی اُسے دیکھ تو نہیں رہا ــــ جیسے وہ اپنے بدن

کا کوئی حصہ عریاں کرنے والی ہو۔ اس کے بعد اُس نے آہستہ آہستہ ایک ایک دو دو جملے
دہرانے شروع کر دیئے تاکہ وہ ہر ایک سے پوری طرح فیضیاب ہو سکے۔
"...... ہماری ایک چھوٹی بہن ہے۔ ابھی اُس کی چھاتیاں نہیں اُٹھیں....
تیری [illegible] آہو بچے ہیں۔ تیری ناف گول پیالہ ہے.... وہ اپنے منہ
کے چوموں سے مجھے چومے ...... میرا محبوب جو رات بھر میری
چھاتیوں کے درمیان پڑا رہتا ہے ...... میرے محبوب کی آواز ہے
جو کھٹکھٹاتا ہے اور کہتا ہے میرے لئے دروازہ کھول، میری محبوبہ
میری پیاری! میری کبوتری! دیکھ تو خوب رُو ہے۔ دیکھ تو خوبصورت
...... اس کا بایاں ہاتھ میرے سر کے نیچے ہے اور اس کا دہنا ہاتھ مجھے
گلے سے لگاتا ہے ...... اس پر ڈولی کو یاد آیا کہ کرسمس کی چھٹیوں میں
جب ایک دن فریڈی کہانیاں سنتا سنتا اُس کے پاس سو گیا تھا تو وہ رات
بھر اُس کی گردن میں ہاتھ ڈالے رہا تھا۔ وہ خوب گرم رہی تھی، اور اُسے
بڑی گہری نیند آئی تھی۔ اس لئے اُس نے ارادہ کر لیا کہ اب کے چھٹیوں
پھر فریڈی کو اپنے پاس سلائے گی.... ایسے ہی جب ایک دفعہ
برنس اس کے ساتھ سوئی تھی تب بھی وہ نیند میں بالکل بے ہوش ہو گئی تھی۔
اگلے دن صبح کو عیسائیوں کا سالانہ جلوس نکلنے والا تھا جس کے لئے وہ
دن بھر کام کرتی رہی تھیں۔ وہ تھک کر چور ہو گئی تھیں، اور انہیں پھر صبح
سویرے اٹھنا تھا۔ برنس کا تو اتنا برا حال تھا کہ اس سے ہلا بھی نہ جاتا تھا
اس لئے وہ اپنے کمرے کو نہ گئی، بلکہ ڈولی کے ساتھ ہی سو رہی تھی۔
تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے حال سے بالکل غافل ہو گئیں۔ مگر پھر نہ جانے یہ
کیسے ہوا کہ اُن کی باہیں ایک دوسرے کے گلے میں پڑ گئیں اور ٹانگیں اُلجھ
گئیں.... صبح کو وہ تقریباً ایک ساتھ جاگیں اور انہیں اپنی کیفیت دیکھ
کر تعجب بھی ہوا۔ مگر اُن کے سینے مل رہے تھے، اور اُن کے گلگلے پن اور
نرماہٹ میں ایسی خاموش ہنسی تھی کہ وہ پندرہ منٹ تک ویسے ہی لیٹی ایک
دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں۔ اُٹھ جانے کے بعد بھی وہ شرما اور لجا نہیں رہی تھیں
بلکہ ایسی مطمئن تھیں جیسے کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہی نہ ہو.... وہ دونوں
جلوس کے ساتھ گئی تھیں۔ جلوس کتنا لمبا تھا! آگے آگے بڑے پادری صاحب
تھے، اُن کے بعد مرد، پھر عورتیں، پھر لڑکیاں، اور آخر میں پھر مرد وہ اور برنس
دونوں ایک لائن میں چل رہی تھیں، اور گانے کے بیچ میں چپکے چپکے باتیں
کرتی جاتی تھیں۔ سب ایک ساتھ مل کر گا رہے تھے، اور گانے کے ٹکڑے
لمبی لمبی سلاخوں کی طرح معلوم ہوتے تھے جن کے دو دو تین تین کے مجموعے
ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہوں اور مشین کی طرح اُٹھا اور گرا رہے ہوں
"...... ہاتھوں میں میخیں گاڑ کر سولی پہ چڑھا دیا ...... یسوع نے
تیرے واسطے اپنا لہو دیا ...... اور وہ بھجن بھی گایا گیا تھا۔ یشو یشو من
میں آجا، ہم کو بچا جا، پاک بنا جا ...... یہ گانا اسے اچھا تو معلوم ہوتا
ہے، مگر خود گاتے ہوئے بڑی شرم آتی ہے۔ اب یہ کوئی اچھی بات ہے کہ
سڑکوں پر سب کے سامنے گاتے پھرو! اُسی دن ایک بیٹھی ہوئی ناک والا لڑکا
جو ہاکی اسٹک لئے سائیکل پر جا رہا تھا جلوس کو دیکھ کر ہنس پڑا تھا، اور اُس کی
طرف شریر اور ندیدی آنکھوں سے دیکھنے لگا تھا۔ خصوصاً جب وہ اپنے
پانی میں سنے ہوئے چھوٹے چھوٹے دانت نکال کر ہنستا تھا تو اُسے اتنی
نفرت ہوئی تھی کہ اُس نے ڈوپٹہ سر اور چہرے پر کھینچ لیا تھا، اور بہت دیر تک
خاموش نیچی نظریں کئے ہوئے چلتی رہی تھی ...... ہاں یہی جلوس کے
دن بڑی خوش رہتی ہے۔ اُسے اپنے کپڑے اور خوبصورتی دکھانے کا موقع
مل جاتا ہے نا! گاتے ہوئے ہر طرف نظریں دوڑاتی رہتی ہے کہ لوگ اُسے
دیکھ رہے ہیں یا نہیں ...... اُس کے امیر ہونے کی وجہ سے لڑکیاں بھی
اُس کی چاپلوسی کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ مشن کا ولیم سنگھ بھی۔ آج بھی کہ
جب وہ ریل میں لڑکیوں کی نگرانی کے لئے بھیجا گیا تھا، وہ ایسی کی خوشامد میں
لگا رہا تھا اور دوں کو تو وہ گاڑی سے قدم باہر نکلنے پر بھی ٹوک دیتا تھا، مگر ایسی
سارے اسٹیشن پر گشت لگاتی پھر رہی تھی۔ اور وہ اُسے ایک لفظ نہ کہہ رہا
تھا ...... اور اب تو وہ اپنے آپ کو قابل بھی سمجھنے لگی ہے۔ آئرین نے
اُسے بتایا تھا کہ ایسی کو اب کے فرسٹ آنے کی امید ہے۔ کہیں آئی نہ ہو!
...... اب تک ہمیشہ ڈولی فرسٹ آتی رہی ہے، اور اس دفعہ تو مس
جونس نے اُسے اپنے گھر بُلا کر پڑھایا تھا ...... بہت ہی اچھی ہیں مس
جونس! اُن کا جوان ہنس مکھ چہرہ، اور اُس پر سنہری عینک، کتنا خوبصورت
معلوم ہوتا ہے۔ اور اُس پر تو وہ بہت ہی مہربان ہیں۔ سب سے زیادہ نمبر
اُسی کو دیتی ہیں، اور اُس سے بڑے نرم لہجے میں بات کرتی ہیں۔ امتحان
کے قریب بے چاریوں نے خود اُسے بلا کر پڑھایا تھا، اور اس سے کہہ دیا
تھا کہ اگلی کلاس میں وہ شروع سال سے ہی اُن کے پاس پڑھنے آیا کرے
ایک دن جب وہ اُن کے ہاں بیٹھی سوال نکال رہی تھی وہ اُس کے پیچھے آ
کھڑی ہوئی تھیں، اور اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتی اور بال ٹھیک کرتی رہی تھیں
...... جب وہ گلابی ساڑھی پہنتی ہیں تو ایسی خوبصورت معلوم ہوتی
ہیں کہ اُس کا جی چاہتا ہے ہلکے سے اُن کا گال چوم لے کتنی مرتبہ اُس کے

دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اُن سے کہہ دے کہ وہ اُن سے کتنی محبت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ انہیں اپنے سینے سے لگا لے اور اپنے بازوؤں میں لئے رہے مگر وہ ہر بار شرما شرما کر رہ گئی ہے اور اُن سے اپنے دل کا راز نہیں کہہ سکی ہے ...... ایک مرتبہ وہ اُسے اپنے ساتھ سینما بھی لے گئی تھیں۔ وہاں سے وہ کئی گانے بھی یاد کر لائی تھی ...... اب کیسے چھپو گے سلونے ساجنا اب کیسے چھپو گے ...... اُن کے ساتھ تو وہ چلی بھی گئی، ورنہ ویسے تو وہ سینما کے لئے ترستی ہی رہتی ہے۔ مگر کیا کرے، اسکول والے کم بخت ذرا نہیں نکلنے دیتے۔ ابھی سے "اچھوت کنیا" اور "ایکا" کی تعریف سن کر اس کا کیسا کیسا جی لوٹا ہے کہ کسی طرح اُسے بھی دیکھنے کو مل جائیں، مگر بس تڑپ تڑپ کر ہی رہ گئی ...... اب کے جب وہ چھٹیوں کے بعد لوٹے گی تو ضرور کوشش کرے گی کہ سینما جانا مل جائے ..... وہ مس جونس ہی سے کہے گی کہ وہ سینما دیکھنا چاہتی ہے ...... یا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دن وہ کلاس میں بیٹھی پڑھ رہی ہو، اور یکا یک اُس کے خالہ زاد بھائی جوزف سامنے آ کھڑے ہوں۔ وہ نیلا سوٹ پہنے ہوئے ہوں گے اور اُن کے سنہری عینک لگی ہو گی۔ لڑکیاں بھونچکا ہو ہو کر اُن کی طرف دیکھیں گی۔ اور یہ پوچھنے کی کوشش کریں گی کہ وہ کس سے ملنے آئے ہیں۔ جب وہ اُسے بلائیں گے تو سب لڑکیاں اُسے رشک کی نگاہوں سے دیکھیں گی، اور پھر پڑھنے سے اُن کا دل اُچاٹ ہو جائے گا۔ جب تک وہ کھڑے رہیں گے۔ وہ کن انکھیوں سے باہر دیکھتی رہیں گی۔ وہ اُس سے کہیں گے "ڈولی میں ابھی ابھی آ رہا ہوں۔ آج کل یہاں "اچھوت کنیا" ہو رہا ہے۔ ہمارے ساتھ چلو شام کو سینما"۔ وہ خوشی خوشی تیار ہو جائے گی، اور شام کو اپنی گلابی ساڑھی پہن کر اُن کے ساتھ سینما جائے گی .... جوزف بھائی کے سنہرے بال کیسے چمکتے ہیں، اور ان کے گورے رنگ پر نیلا سوٹ تو بہت ہی سجے گا ...... وہ سینما ہال میں بیٹھی اُن سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہو گی، اور اتنی خوش ہو گی کہ عمر بھر میں کبھی بھی نہ ہوئی ہو گی۔ وہ دیکھے گی کہ وہ گانا — بن کی چڑیا بن کے بن بن بولوں رے — جسے ابھی نے گا گا کر سارے اسکول میں پھیلا دیا ہے، کس موقع پر گایا جاتا ہے۔ گھنٹی بجے گی، اور ہال میں اندھیرا چھا جائے گا، اور پھر پردے پر .....

سامنے وہ سفید دھرم شالا نظر آ رہی تھی جس کے معنی تھے کہ اب گھر قریب آ گیا ہے۔ اس علم کے تقریباً ساتھ ہی ساتھ اُسے وہ نیا مکان زمین سے ابھرتا ہوا دکھائی دیا جو اُٹّے پر بن رہا تھا، اور اگلے جھٹکے میں وہ پورا زمین کے باہر نکل آیا۔ اس مکان کی نمی اور ٹھنڈک اب بھی باقی تھی، مگر اب اُس میں کچھ تمکنت، خود اختیاری، اور تفکر کا سکوت اور سنجیدگی آ گئی تھی۔ اب وہ خواہ مخواہ گُن گُن نہ کر رہا تھا، بلکہ اُس نے اپنے رازوں کو چھت کے اندھیرے میں کھینچ لیا تھا۔ یہ اندھیرا اب پہلے سے زیادہ گہرا اور پھیلا ہوا تھا، اور اس میں سے چھت بہت اونچی نظر آ رہی تھی۔ کونے میں کھڑے ہو کر خود سنسنانے لگنے کے بجائے اب ڈولی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنا سر اتنا اونچا کر دے کہ اندھیرا اُسے ڈھک لے ..... ڈولی نے اپنا اوپر کا جسم اٹھا کر لاری کے باہر پھینک دیا جو شیشے میں سے سورج کی کرن کی طرح آسانی سے نکل گیا، اور ڈولی کی طرف مُنہ کر کے ہوا میں کھڑا ہو گیا ...... وہ گویا نصف مجسمہ تھا، حالانکہ اُس کے رنگ میں سنگ مرمر کی سی درشتی نہ تھی، بلکہ اُس کے رنگ عین زندگی کے رنگ تھے۔ یہ مجسمہ بالکل عریاں تھا۔ یہ چہرہ تھا تو ڈولی کا ہی، مگر وہ کسی قدر لمبا ہو گیا تھا، خصوصاً اُس کی کن پٹیوں کے پاس کے حصے اب اتنے اُبھرے ہوئے نہ رہے تھے۔ چہرے کے خطوط میں اب وہ ہیجانی بے ترتیبی نہ تھی، بلکہ وہ ایک نورانی سوچ کے ساتھ میانہ وار اوپر سے نیچے آ رہے تھے۔ پیشانی بھی کشادہ تھی، اور اُس کی متین لمبی پلکیں نیچے جُھکی ہوئی تھیں اُس کی آنکھیں بھرے بھرے، صاف شفّاف سینے پر سے پھسلتی ہوئی، انتہائی سکون کے ساتھ دو سڈول شالوں کے درمیان چھاتیوں کو دیکھ رہی تھیں جو بے داغ، نرم گلابی رنگ کی، موزوں، متناسب، بے جھجک اور مطمئن تھیں۔ وہ آرزوؤں اور تمناؤں کی گدگدی سے پر جوش نہ تھیں، بلکہ سب سے اونچی ہو کر محض اپنی خوش کامی اور سیرابی کے احساس ہی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ اس مجسمے کے انداز میں آرام، قرار، جمالیاتی غور و فکر، اس سے مُنتج سرشاری، اور عبودیت تھی گویا وہ اس حقیقت کے بارے میں سوچ رہا ہو کہ "پختگی ہی سب کچھ ہے" .....

"RIPENESS IS ALL" — Shakespeare

اب اور زیادہ نشانیاں آنی شروع ہو گئی تھیں جو اُسے بتا رہی تھیں کہ گھر نزدیک تر آتا جا رہا ہے۔ اس تھوڑے سے وقت کو گزارنے کے لئے وہ یہ اندازہ لگانے لگی کہ اُس کے یہاں کیا ہو رہا ہے ...... شاید "ماما" گبرڈن کا سایہ پہنے جھاڑ دے رہی ہوں ..... شاید پاپا بازار سے بکرا لے کر آئے ہوں، اور ماما اُن پر بگڑ رہی ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ پھیلی ہوئی آواز میں آنٹی کی خوش نصیبی کا تذکرہ کر رہی ہوں، اور اس کے مقابلے میں اپنی ... . مگر ڈولی کو یہ گوارا نہ ہوا کہ ان چند باقی ماندہ لمحوں کو جو بہتر طریقے سے

بھی گزارے جاسکتے تھے، خیالات کی اس روش سے مکدر کرلے۔ چنانچہ اُس نے نئی زیل چڑھائی . . . . فریڈی اپنا نیلا نکر اور سرخ قمیص پہنے گیند سے کھیلتا پھر رہا ہوگا۔ وہ اُسے دیکھتے ہی چلا کر بھاگے گا، اور اُس کی ٹانگوں سے لپٹ جائے گا . . . . . پاپا ابھی دورے سے واپس آئے ہوں گے، اور سائیکل رکھ کر جوتا کھول رہے ہوں گے۔ "وہ پوچھیں گے"۔ ارے کون ہے؟" فریڈی دوڑ کر انہیں بتائے گا۔ "ڈولی بُو، آگئیں، پاپا!" وہ کہیں گے "تو آگئی، بیٹی ڈولی؟" اور وہ جواب دے گی "جی ہاں، پاپا"۔ . . . . ماما باورچی خانے میں اس کے لئے کوئی اچھی سی چیز تیار کررہی ہوں گی۔ آواز سُن کر وہ باہر آئیں گی اور کہیں گی "آگئیں لو ڈولی بھی! میں تو کہہ ہی رہی تھی کہ اب آتی ہوگی۔ تمہارے پاپا کہہ رہے تھے کہ نہیں، شام تک آئے گی۔ کئی دن سے یاد کر رہا تھا فریڈی تمہیں روز پوچھ لیتا تھا کہ اب ڈولی بوا کے آنے میں کے دن رہ گئے . . . . . اور آج تو وہ صبح سے ہی تیار پھر رہا تھا"۔ . . . . ماما سفید ساڑھی پہنے ہوں گی۔ وہ اُسے بتائیں گی کہ اُس کے پاپا اس کے لئے ایک چھوٹی سی سفید بلّی لائے ہیں جس کی اُسے بڑی خواہش تھی۔ . . . . .

سوچنے کو تو وہ سوچے چلی جارہی تھی، مگر ویسے اس کا دل دُھکڑ پُکڑ کررہا تھا، اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہے پھر بھی وہ اس آخری تنکے سے چپٹی ہوئی تھی، اور اسے چھوڑنا نہ چاہتی تھی ہر نئی جھونپڑی یا کنواں دیکھ کر اس کے دل پر چرکا سا لگتا تھا، اور اُس کے گلے کی رگیں چٹ چٹ بول رہی تھیں۔ وہ یہ خیال کرنا چاہتی تھی کہ ابھی تو گھر بہت دُور ہے، مگر اُسے اُس کے خلاف ناقابلِ تردید شہادتیں ملے چلی جارہی تھیں وہ اُمید کررہی تھی کہ لاری مجنونانہ جوش میں قصبے کے پاس سے نکلی چلی جائیگی اور پھر کبھی نہ رُکے گی، یا قصبہ خود پیچھے ہٹتا چلا جائے گا اور لاری اُسے کبھی نہ پکڑ سکے گی۔ مگر یہ علم اس کی جان نکالے لے رہا تھا کہ لاری کا چلنا تقدیر کی طرح اٹل اور ناگزیر ہے۔ وہ ہر قسم کے نتائج سے بے نیاز، رکاوٹوں کو توڑتی کنکروں کو کچلتی، بھاگی چلی جائے گی جیسے کوئی خود سر دیو، اور اُسے قصبے کے اڈّے پر لاکر کھڑا کرے گی جس کے سامنے وہی گڑھوں والی کنکر کی سڑک بچھی ہے جو اُس کے گھر کی طرف جاتی ہے۔ لاری اپنی بھنبھناہٹ پر خود ہی مست ہوکر تیز رفتاری سے چلی جارہی تھی، اور اُسے ڈولی کے جذبات کی مطلق پرواہ نہ تھی۔ ڈولی بےچاری تو درختوں سے بھی مدد نہ مانگ سکتی تھی، وہ تو پہلے ہی اس کے دشمن بنے ہوئے تھے، اور اُسے گھر کے قریب لائے جارہے تھے . . . . . آخر اُس نے ایک گہرا سا لمبا سانس لیا اور پانی کے ریلے کے سامنے اپنا سر جھکا دیا . . . . .

اڈے کے قریب پہنچ کر جب لاری کی رفتار کچھ کم ہوئی تو اُس کی اُمید پھر ذرا جاگی کہ شاید لاری اسی طرح رینگتی ہی رہے۔ ورنہ کم سے کم تھوڑا سا وقت تو اور لگ جائے۔ مگر جلد ہی کلچ ایک دُرشت کھڑکھڑ کے ساتھ بولا اور انجن رُک گیا۔ ڈولی کے کانوں میں خاموشی بھربھرانے لگی، اور اُسے یہ معلوم ہوا کہ جیسے دنیا ڈوبی جارہی ہے۔ سب لوگ لاری میں سے اُتر رہے تھے، مگر وہ ہلی تک نہیں۔ آخر جب ایک لڑکے نے آکر اُس سے پوچھا کہ "اجی سامان چلے گا؟" تو اُس نے ٹھنسے ہوئے گلے میں سے بڑی کوششوں کے بعد "ہاں" نکالا، اور پھر ہاتھ بڑھا کر اس طرح دروازہ کھولا۔ جیسے اب کوئی چارہ نہ رہا ہو، اور آخر کار اُس نے اپنے آپ کو گلوٹین کے تختے پر چڑھنے کے لئے راضی کرلیا ہو . . . . . .

لڑکا لاری کی چھت پر سے سامان اتر وا رہا تھا جس کے انتظار میں وہ سڑک کے اُس پار سب سے الگ کھڑی ہوگئی۔ اُس کا جسم اتنا بھاری ہوگیا تھا کہ ٹانگیں اچھی طرح بوجھ برداشت نہ کررہی تھیں۔ اُسے اُس خیال سے بےچینی ہورہی تھی کہ لوگ اُس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ درحقیقت ڈولی کو اس وقت اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی کہ وہ کیا کررہے ہیں کیا نہیں کررہے۔ وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ اُسے اُن کی حرکتوں کا احساس تک نہ رہے۔ اس لئے وہ افق کی طرف دیکھنے لگی۔ ہوا اب بالکل مدّھم ہوگئی تھی، اور درختوں کی ڈالیاں اپنی مرضی کے خلاف جبراً و قہراً سر سرائے جارہی تھیں۔ زمین کا غبار اُٹھ اُٹھ کر آسمان پر پھیل گیا تھا، اور اُس نے آسمان کو بالکل گدلا بنا دیا تھا۔ گرد کی اس عریض چادر پر سورج کی حیثیت ایک کسی قدر روشن داغ سے زیادہ نہ رہی تھی، اور اس سے باہر نکل آنے کی کوششوں میں وہ اُلٹا اور دھول میں اَٹا جارہا تھا۔ چند بنجر کھیتوں پر سے دھوپ ڈھل چکی تھی، اور وہ پھٹی آنکھوں سے ایسے تک رہے تھے جیسے کسی معتمد شخص نے اُن کے ساتھ دغا کی ہو، اور اب اُن میں گلے اور شکوے کی بھی خواہش باقی نہ رہی ہو . . . .

محمد حسن عسکری

سخنہائے ناگفتنی

حیات بھی نہ ہو معراجِ آسمان و زمیں
مرا وجود بھی میرا وجود ہے کہ نہیں

زماں مکاں کو بسا دینے والے اہلِ زمیں
نہ ٹھکنے والے ہوا میں عقاب اور شاہیں

جنہیں ازل سے نہ راس آئے آسمان و زمیں
بہت ہے ایسوں کو فردوس وعدہ کی تسکیں

مرے خیال میں تو کیا ہے یہ سوال نہیں
پہنچ نہ جائے گماں عشق کا بحدِ یقیں

جو بھولتیں بھی نہیں یاد بھی نہیں آتیں
تری نگاہ نے کیوں وہ کہانیاں نہ کہیں

لبِ نگار ہیں یا نغمۂ بہار کی لَو
سکوتِ ناز ہے یا کوئی مطلبِ رنگیں

اگر بدل نہ دیا آدمی نے دنیا کو
تو جان لو کہ یہاں آدمی کی خیر نہیں

شروعِ زندگیٔ عشق کا وہ پہلا خواب
تمہیں بھی بھول چکا ہے ہمیں بھی یاد نہیں

ہر انقلاب کے بعد آدمی سمجھتا ہے
کہ اس کے بعد نہ بھرے گی کروٹیں یہ زمیں

کریں گے حسن کو کیا بس میں عقل کے بندے
نظر میں جذب نہیں کچھ۔ دلوں میں درد نہیں

انہیں فضاؤں میں تو انقلاب پلتا ہے
زمیں بھی بپھری ہوئی سی فلک بھی چیں بجبیں

بس اک فسانہ یہ اندازِ عشق و شانِ جمال
بس ایک خوابِ پریشاں یہ شورش و تمکیں

بہت نہ بیکسیٔ عشق پر کوئی روئے
کہ حسن کا بھی زمانے میں کوئی دوست نہیں

نیا زمانہ نئی زندگی نئی دنیا
نئے سرے سے بنیں حُسن و عشق کے آئیں

ہر اک ابد کا مسافر[1] ہر ایک خانہ بدوش
سرِ دیارِ محبت کوئی مکاں نہ مکیں

ہیں اہلِ مرتبہ مائل بہ پستیٔ معکوس
ابھارتے ہیں زمانے کو چند خاک نشیں

سرے سے مٹ گئے نقش و نگارِ بزمِ جہاں
وہ حُسن و عشق کے ملنے کی صورتیں نہ رہیں

نہ پوچھ کس کا ہے اب سامنا محبت کو
بغل میں قلبِ حزیں ہے نہ شاہدِ رنگیں

اگر تلاش کریں کیا نہیں ہے دنیا میں
جز ایک زندگی کی طرح زندگی۔ کہ نہیں

نگاہِ ناز! تری کافری کو پا نہ سکے
ہزاروں قبلۂ ایماں ہزاروں کعبۂ دیں

یہ نرم و سخت کلامی کی بحث لاحاصل
دلِ غریب سے باتیں کسی کی اٹھ نہ سکیں

وہ حسن عالمِ نیرنگ کی جو ہو تصویر
نظر وہ، بات کو لے جائے جو کہیں سے کہیں

جنہیں سمجھتے تھے ہم دورِ جاوداں کے حریف
وہ دن تمام ہوئے اور وہ راتیں بیت گئیں

[1] انسان ابد کا مسافر ہے۔ بائرن

عمل تو وہ جو قضا و قدر کو بس میں کرے ۔۔۔ دعا تو وہ ہے کہ تقدیر بھی کہے آمیں
مسافرانِ رہِ عشق کا خدا حافظ ۔۔۔ نہ کوئی رہبرِ دنیا نہ کوئی رہبرِ دیں
مجھے بھی بے خبری تھی بوقت عہدِ وفا ۔۔۔ تمہیں بھی ہوش نہ تھا میں نے سچ کہا کہ نہیں
ہوئے وہ جلوہ نما بھی تو کیا سے کیا ہو کر ۔۔۔ پڑی نگاہ پریشاں بھی تو کہیں کی کہیں
اسی متاعِ محبت سے دل ہے مالا مال ۔۔۔ بس ایک دردِ نہاں اک غمِ نشاط آگیں
وہ جس نے اہلِ محبت کے ہوش اڑائے تھے ۔۔۔ نگاہِ ہوش ربا تھی نہ گیسوئے مشکیں
ہزار شکر کہ مایوس کر دیا تو نے ۔۔۔ یہ اور بات کہ تجھ سے بڑی امیدیں تھیں
الگ نہیں مری دنیا خبر ہے گو مجھ کو ۔۔۔ زمانہ اور بھلے آدمی کا ساتھ نہیں
جھپک جھپک سی گئی ہے بہارِ لالہ و گل ۔۔۔ مری نگاہ سے چنگاریاں سی کچھ جو اڑیں
چراغ دیر و دل ہے سوادِ منزلِ دوست ۔۔۔ یہ روشنی بھی دھواں بن کے اڑ نہ جائے کہیں
کچھ اور حسرتِ پس ماندگاں نہ بڑھ جائے ۔۔۔ جرس کی بانگ ہی کھوٹی کرے نہ راہ کہیں
خدا کے سامنے میرے قصور وار رہیں جو ۔۔۔ برابر ان سے نگاہیں مری نہیں ہوتیں
مزاجِ عشق کو لازم ہے اب بدل جانا ۔۔۔ کہ کچھ دنوں سے تو سنتے ہیں حسن بھی ہے حزیں
چہ خوش بود چوں برآید بیک کرشمہ دو کار ۔۔۔ بس اک نگاہ سے کر دے جہاں کو شاد و غمیں
پھل ان کے واسطے اتریں گے شاخِ طوبیٰ کے ۔۔۔ یہ اہلِ خلد ہیں ان کو پھلے گی کیا یہ زمیں
مجھے یہ فکر کہ جو بات ہو مدلّل ہو ۔۔۔ وہاں یہ حال کہ بس ہاں تو ہاں، نہیں تو نہیں
کہیں نہ عرش سے چھٹ کر کھجور میں اٹکیں ۔۔۔ ہیں جن کے ساتھ مہ و مہر و زہرہ و پرویں
تجھے بتائے اگر کوئی آنکھ والا ہو ۔۔۔ کہ یہ زمیں بھی چمکتا ستارہ ہے کہ نہیں
کبھی کبھی تو میں سوچا کیا ضرور اے دوست ۔۔۔ یہی کہ تجھ سے محبت کو کچھ امیدیں تھیں
نہ پوچھ عشق کی مجبوریاں کہاں تک ہیں ۔۔۔ ازل کے دن سے تو آزادیاں ہیں زیرِ نگیں
یونہی سا تھا کوئی جس نے مجھے مٹا ڈالا ۔۔۔ نہ کوئی نور کا پتلا نہ کوئی زہرہ جبیں
نگاہِ شاہدِ ہستی کی نیتیں ہیں کچھ اور ۔۔۔ یہ رنگ ہو تو کوئی کیا ہو شاد یا غمگیں
ہنر تو خیر ہنر عیب سے بھی جلتے ہیں ۔۔۔ فغاں کہ اہلِ زمانہ ہیں کس قدر کم بیں

تھی شہر شہر زمانے میں جن کی رسوائی
فراقؔ تھے وہی ناموسِ زندگی کے امیں

فراقؔ گورکھپوری

اٹھارہ آنے[1]

سورج ڈوبنے سے ذرا پہلے سیٹھ جی کے مکان کا دروازہ بڑے زور کے ساتھ کھٹکھٹایا گیا۔ گھر میں جتنے آدمی تھے ــــ سیٹھ جی، اُن کی بیوی، لڑکے لڑکیاں، نوکر چاکر، اور تین چار رشتے دار جو صبح سے اُن کے ہاں پناہ گزیں تھے ــــ سب کے کلیجے کانپنے لگے اور چہرے زرد پڑ گئے "مسلمان غنڈے آن پہنچے!" ــــ یہ خیال یک بیک ہر شخص کے دل پر چھا گیا۔

گذشتہ شام کو قصبے کے بنیوں اور قرب و جوار کے مسلمان دیہاتیوں کے درمیان غلّے کی خرید و فروخت پر کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ صبح تک اس معمولی جھڑپ نے ہندو مسلم فساد کی شکل اختیار کر لی۔ قصبے میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی، مگر صاحبِ زر طبقہ حسبِ معمول ہندوؤں پر مشتمل تھا۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ دولت مند مہاجنوں اور مالدار بنیوں کے لئے یہ وقت بہت ہی نازک تھا۔ اُن کو اپنی جان کی حفاظت کے علاوہ دھن دولت کی رکھوالی بھی کرنی تھی۔ سیٹھ جی قصبے کے سب سے بڑے رئیس تھے، اور درمیانی طبقے کے فاقہ کش مسلمانوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ اس لئے اور بھی کہ انہوں نے اپنی ساری دولت اِسی قصبے کے باشندوں کو لوٹ کھسوٹ کر جمع کی تھی۔ بیس سال پیشتر جب وہ اس قصبے میں ایک پھٹا ہوا کرتا اور ایک میلی کچیلی دھوتی پہنے ہوئے تن تنہا وارد ہوئے تھے تو اُس وقت اُن کی کل پونجی ایک خوانچہ تھا جس میں اٹھارہ آنے کا مال تھا۔ بہت دنوں تک وہ اِسی طرح گلیوں اور کوچوں میں گھوم پھر کر اپنا مال بیچتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک دوسرا کاروبار بھی شروع کر دیا یعنی کسی کو چار آنے ادھار دے دیئے، کسی کو آٹھ آنے، کسی کو ایک روپیہ کسی کو ڈیڑھ روپیہ۔ کچھ دنوں بعد وہ ایک دُکان پر بیٹھ کر اپنا مال بیچنے لگے۔ پھر یہ دُکان ایک صرافے میں تبدیل ہو گئی۔ سیٹھ جی نے زمینوں اور جائدادوں کو نیلام کرا کرا کے اپنی ملکیت بنانا شروع کیا، یہاں تک کہ قصبے کی قدرتی دولت کا ایک بہت بڑا حصہ اُن کے تصرف میں آ گیا۔ بیس سال کی مسلسل محنت اور پیہم جانفشانی کے بعد، اب وہ قصبے کے سب سے بڑے رئیس تھے۔ چنانچہ علی الصبح جب انہیں بلوے کی خبر ملی تو انہوں نے اپنے پختہ مکان کا پھاٹک اور دروازہ اندر سے مقفّل کرا لیا اور متعلقین و ملازمین سمیت اس قلعے میں محصور ہو کر بیٹھ گئے۔ دن بھر یہ لوگ خوف و ہراس میں مبتلا رہے، اور سہمی ہوئی دعاؤں کے ساتھ بھگوان کو یاد کرتے رہے۔ مگر جس بات کا اندیشہ تھا وہ ہو کر رہی یعنی شام ہونے سے پہلے مکان کا دروازہ بڑے زور کے ساتھ کھٹکھٹایا گیا۔ دستک کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ دروازے پر دو ایک آدمی نہیں بلکہ ایک پورا مجمع ہے۔ سب کے چہرے زرد ہو گئے اور کلیجے کانپنے لگے۔ ہر شخص نے اپنے دل میں یہی سوچا کہ مسلمان غنڈے آن پہنچے۔

تین نوکروں نے سارا دن چھت پر گزارا تھا۔ وہ اب بھی پتھروں اور اینٹوں کے ایک بہت بڑے انبار کے درمیان وہیں موجود تھے۔ انہوں نے منڈیر پر سے جھانک کر نیچے دیکھا۔ وہاں نہ مسلمان غنڈے تھے، نہ ہندو لفنگے، بلکہ پولیس کے تقریباً نصف درجن آدمی خاکی وردیاں اور لال پگڑیاں پہنے ہوئے دروازے کو شدت کے ساتھ پیٹنے میں مصروف تھے۔

سیٹھ جی کو معلوم ہوا کہ دروازے پر پولیس کے آدمی ہیں تو اُن کی جان میں جان آئی۔ بالائی منزل کے ایک کمرے سے سیٹھ جی کے بھتیجے نے اپنا گھٹا ہوا سر باہر نکالا اور دستک دینے والوں سے چند سوالات کئے۔ جواباً انہیں بتایا گیا کہ شہر سے کلکٹر صاحب نے پولیس کے حکام کو بھیجا ہے اور وہ سیٹھ جی سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔

اس معمولی تحقیق کے بعد دروازہ کھول دیا گیا۔ اور سیٹھ جی پولیس کے حکام کو بہت عزت کے ساتھ اندر لے گئے۔ حکام کی اس جماعت میں ایک انسپکٹر، ایک سب انسپکٹر، ایک ہیڈ کانسٹبل اور دو کانسٹبل تھے۔ انسپکٹر اور سب انسپکٹر دونوں اپنے اپنے جوتوں سمیت صاف ستھری چاندنی پر چڑھ گئے، اور گاؤ تکیے کی ٹیک لگا کر قالین پر بیٹھ گئے ہیڈ کانسٹبل بھی جوتا پہنے پہنے چاندنی پر جا بیٹھا۔ کانسٹبلوں نے البتہ ذرا تمیز اور انسانیت سے کام لیا۔ جوتا تو انہوں نے بھی نہیں اتارا، لیکن اتنا ضرور کیا کہ چاندنی پر بیٹھنے کی بجائے دروازے کے پاس ہی اُکڑوں بیٹھ گئے یعنی اس جگہ جہاں انسپکٹر، سب انسپکٹر اور ہیڈ کانسٹبل کو اپنے اپنے جُوتے اُتار دینے چاہیئے تھے۔

"فرمائیے کیا حکم ہے" سیٹھ جی نے تعظیماً ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

سیٹھ جی نے سب انسپکٹر صاحب کو اپنا مخاطب بنایا تھا۔ سب انسپکٹر صاحب نے انسپکٹر صاحب کی جانب دیکھا، اور انہوں نے کہنا شروع کیا۔ بات یہ ہے رائے صاحب! کہ بلوے کی اطلاع کلکٹر صاحب کو صبح سویرے ہی پہنچ گئی تھی اور ہم لوگ

---

[1] اس افسانے کی بنیاد ایک قصّہ ہے جو مختلف طریقوں سے لوگوں میں بہت مقبول ہے۔ منشی پریم چند نے بھی اسی بنیاد پر ایک افسانے کی تعمیر کی ہے لیکن چونکہ اپنا افسانہ لکھتے وقت مجھے منشی صاحب مرحوم کے افسانے کا علم نہ تھا اس لئے میں نے اپنا افسانہ ضائع کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اس میں شک نہیں کہ بنیادی پلاٹ ایک ہونے کے سبب سے دونوں افسانوں کی جزئیات میں کہیں کہیں ایسی مماثلت پیدا ہو گئی ہے جو خود میرے لئے حیرت کا باعث ہے (مصنّف)

راج پور سے فوراً بلا لئے گئے تھے۔ مگر کپتان صاحب نے حکم جاری نہیں کیا تھا۔ اس لئے ہمیں دیر ہوگئی...... یوں سمجھئے کہ...... اسے...... اسے...... دیوان جی! کپتان صاحب کا حکم کس وقت ملا ہے ہمیں؟"

"یہی کوئی چار ساڑھے چار بجے ملا ہے حضور!" ہیڈ کانسٹیبل نے پھرتی سے جواب دیا۔

"وہ حکم تو ہوگا تمہارے پاس؟" سب انسپکٹر صاحب نے ضمناً کہا۔ "لائے ہو اپنے ساتھ؟"

"جی ہاں حضور لایا ہوں — بستے میں ہے — باہر موٹر پر — حضور کہیں تو لاؤں"۔ یہ کہتے ہوئے دیوان جی اپنی جگہ سے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگے مگر سب انسپکٹر صاحب فوراً انسپکٹر صاحب کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اس لئے ان کی کوشش جہاں تھی وہیں ختم ہوگئی۔

انسپکٹر صاحب نے اپنے کلام کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "بس رائے صاحب! تو یہ سمجھئے کہ حکم ملتے ہی ہم فوراً روانہ ہوگئے۔ اگر حکم جلدی مل جاتا تو آپ کو دن بھر یہ پریشانی اُٹھانی نہ پڑتی......"

"بڑی کرپا — بڑی کرپا!" سیٹھ جی نے گھبراتے ہوئے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا "تو — تو — ہونہہ — ہونہہ —"

انسپکٹر صاحب نے سیٹھ جی کی گھبراہٹ اور اُلجھن کو تاڑ لیا اور بولے "تو کلکٹر صاحب کی مہربانی سے یہ انتظام ہوگیا ہے کہ قصبے کے سارے رئیس اپنا اپنا مال شہر پہنچا دیں اور خزانے میں جمع کرا دیں۔ ہم لوگ اسی غرض سے آئے ہیں۔ کوتوال صاحب نے کہا تھا کہ سب سے پہلے رائے صاحب کے ہاں جائیے گا"۔

سب انسپکٹر صاحب ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبلوں سے مخاطب ہوئے، "معلوم ہوتا ہے اس قصبے میں مسلمان غنڈوں کی تعداد بہت زیادہ ہے"۔

"کچھ نہ پوچھئے حضور!" دیوان جی نے کہا "ایک سے ایک چھٹا بدمعاش یہاں موجود ہے۔ بہت سے تو ایسے ہیں جو لمبی لمبی سزائیں کاٹ چکے ہیں......"

"یہ مسلمان تو سبھی غنڈے ہوتے ہیں سرکار!" ایک کانسٹیبل بولا، "بھلا مانس تو ان میں ایک آدھ ہی ہوتا ہے۔ ہر وقت لڑنے مرنے پر تیار رہتے ہیں......"

سیٹھ جی کے سوا تقریباً ہر شخص نے "مسلمان غنڈوں" کے غنڈے پن پر اظہارِ خیال کیا۔ سیٹھ جی کچھ فکرمند معلوم ہوتے تھے۔

مسلمان غنڈوں کو جی بھر کر گالیاں دے لینے کے بعد انسپکٹر صاحب اُن کی طرف متوجہ ہوئے۔ "تو رائے صاحب! ذرا جلدی کیجئے۔ ہمیں لالہ مول چند سے بھی ملنا ہے......"

"میں یہ کہتا تھا!" سیٹھ جی بولے "کہ آپ...... میرا مطلب ہے ٹھاکر رسال سنگھ نہیں آئے......" ٹھاکر رسال سنگھ قصبے کے تھانیدار کا نام تھا۔

"ابھی رائے صاحب!" انسپکٹر صاحب نے قدرے بیزار اور بے قرار ہو کر کہا، "ٹھاکر رسال سنگھ کو اتنی فرصت کہاں ہے! وہ اپنے انتظامات میں مصروف ہیں۔ کل سے بیسیوں قتل ہو چکے ہیں......"

سب انسپکٹر صاحب پھر ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبلوں سے مخاطب ہوئے "کیسے بُرے وقت ہوا ہے یہ بلوہ! ادھر تحصیلدار صاحب بیمار ہیں، اُدھر ایس، ڈی، او چھٹی پر ہے......"

دیوان جی نے ہاں میں ہاں ملائی، اور تھوڑی دیر تک بلوے کی ہولناکیوں اور انتظامات کی غیر تسلی بخش حالت پر گفتگو ہوتی رہی۔ سیٹھ جی نے اس گفتگو میں کوئی حصہ نہیں لیا، گو اُن کا بھتیجا اپنے گھٹنے ہوئے سر پر ہاتھ پھیر پھیر کر خوب باتیں ملاتا رہا۔

پھر یکایک سیٹھ جی بولے، "ایک بڑی مشکل ہے انسپکٹر صاحب! میں اب اس وقت گھر چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟ بلوے کا زمانہ ہے۔ ایسی حالت میں......"

انسپکٹر صاحب نے جلدی سے کہا، "تو آپ کو ایسا کون سا بہت دور جانا ہے۔ آدھ گھنٹے میں شہر پہنچ جائیے گا۔ وہاں آپ کو چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے......"

سب انسپکٹر صاحب بہت بے پروائی سے بولے "ہم لوگوں کو واپس تو آنا ہی ہے۔ آپ کو کار میں بٹھلاتے لائیں گے ہمیں تو کئی پھیرے کرنے ہیں۔ لالہ مول چند سے ملنا ہے، پنڈت سیتا رام سے ملنا ہے......"

"رات بھر کا چکر ہے حضور!" دیوان جی بولے۔

"رات بھر کا نہیں تو گیارہ بجے تک کا تو کام ہے ہی"، انسپکٹر صاحب نے کہا۔

سیٹھ جی مطمئن ہوگئے، اور چند رسمی اور غیر ضروری باتوں کے بعد "بڑی کرپا، بڑی کرپا!" کرتے ہوئے اندر گئے۔

تھوڑی دیر میں انہوں نے اپنی بیس سال کی کمائی باہر نکال کر رکھ دی —

جواہرات، سونے کے زیورات، چاندی کے ظروف، نوٹوں کی گڈیاں......

چیزوں کی فہرست بنانے لگے تو انسپکٹر صاحب نے کہا، "یہ کام تو آپ وہیں کیجئے گا۔ کلکٹر صاحب کے سامنے۔ اب یہاں زیادہ دیر کرنی مناسب نہیں"۔

سیٹھ جی مع اپنی بیس سال کی کمائی کے موٹر میں بیٹھ گئے اور موٹر روانہ ہوئی۔

"ذرا جلدی چلو بھئی!" انسپکٹر صاحب نے ڈرائیور سے کہا۔ "ابھی رائے صاحب کو واپس بھی لانا ہے"۔

"ہاں صاحب! سب انسپکٹر صاحب بولے "سیٹھ جی کو جلد سے جلد واپس گھر پہنچا دینا چاہیئے۔ بلوے کا زمانہ ہے۔ بال بچے پریشان ہوں گے"۔

"ابھی تو یہ کیجئے" انسپکٹر صاحب نے کہا، "بھلا کسی کی مجال ہے جو رائے صاحب کے بال بچوں کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لے آخر ہم کس لئے ہیں!"

"آپ کی دیا ہے انسپکٹر صاحب" سیٹھ جی نے ممنون ہو کر کہا "میں تو آپ کی دیا پایا ہوں"۔

"ابھی رائے صاحب!" انسپکٹر صاحب اچھل کر بولے "بھلا آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ہم تو آپ کے خادم ہیں۔ آپ کی خدمت بجا لانا ہمارا فرض ہے۔ اور پولیس کا سب سے پہلا کام تو آپ کے جان و مال کی حفاظت ہے۔ آپ اس قصبے کے سب سے بڑے رئیس ہیں آپ......"

"یہ سب بھگوان کی دیا ہے اور آپ کی دعاؤں کا اثر ہے" سیٹھ جی نے کہا، "ورنہ آپ جانتے ہیں کہ میں تو ایک غریب دیہاتی کا بیٹا ہوں۔ آج سے بیس سال پہلے میں اس قصبے میں اٹھارہ آنے لے کر آیا تھا۔ آج بھگوان کی دیا سے......"

"اٹھارہ آنے!" پولیس کے حکام نے بیک وقت حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"جی ہاں میں اٹھارہ آنے کا سودا لے کر اس قصبے میں آیا تھا۔ یہ سارا دھن اسی کی پیداوار ہے"۔

پولیس کے حکام نے تحسین و آفرین کے نعرے بلند کئے:۔

"خوب! بہت خوب!"

"کیا کہنا ہے سیٹھ جی! واہ واہ!"

"جی آپ اس کو اٹھارہ آنے کی پیداوار کیوں کہتے ہیں! اپنی محنت اور مشقت کی پیداوار کہئے!"

"بے شک! بے شک! یہ سیٹھ جی کی محنت اور ایمانداری کا پھل ہے!"

سیٹھ جی پھولے نہ سمائے۔ مزے میں آکر کہنے لگے، "آگے چل کر یہ سڑک جہاں ملتی ہے بس وہیں میرا گاؤں ہے آج سے بیس سال پہلے اٹھارہ آنے کا سودا اپنے ساتھ لے کر میں اپنے گاؤں سے چلا تھا اور اسی سڑک پر ہوتا ہوا قصبے میں داخل ہوا تھا......"

وہ اپنے مہاجنی سفر کی ابتدا کا قصہ بیان کر رہے تھے کہ اتنے میں کار سڑک کے اس موڑ پر پہنچ گئی جہاں اُن کا گاؤں واقع تھا۔

"ٹھہرو!" انسپکٹر صاحب نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

کار رُک گئی!

انسپکٹر صاحب نے کار سے اتر کر چاروں طرف ایک سرسری نظر ڈالی اور کہا،

"رائے صاحب! کس طرف ہے آپ کا گاؤں؟"

سیٹھ جی کار سے اُترے اور ہاتھ کے اشارے سے اپنا گاؤں بتانے لگے

"وہ —— وہ دیکھئے —— وہ جو درختوں کا ایک جھنڈ نظر آ رہا ہے......"

لیکن انسپکٹر صاحب نے درختوں کے جھنڈ کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نکالتے ہوئے بولے، "تو رائے صاحب! آپ اٹھارہ آنے اس جگہ سے لے کر روانہ ہوئے تھے؟"

"جی ہاں میں اٹھارہ آنے کا سودا لے کر اسی راستے سے قصبے میں......"

"تو یہ لیجئے اٹھارہ آنے حاضر ہیں!"

سیٹھ جی انسپکٹر صاحب کا منہ دیکھنے لگے۔

"لیجئے بھی۔ تکلف کیا ہے؟"

سیٹھ جی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

"لیجئے، رائے صاحب!" انسپکٹر صاحب نے اصرار کے ساتھ کہا، "اپنے اٹھارہ آنے واپس لیجئے۔ آپ تو اس رقم کو بہت بڑی دولت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ ایک دفعہ آپ نے ایسا کیا، اب ہماری خاطر سے ایک دفعہ اور سہی"۔ اور انہوں نے زبردستی سیٹھ جی کے ہاتھ میں پیسے دے دیئے۔

"اچھا اب بیس سال کے بعد ہم آپ سے پھر ملاقات کریں گے" یہ کہہ کر انسپکٹر صاحب کار میں بیٹھ گئے اور کار روانہ ہو گئی۔

سیٹھ جی کو ہوش آیا تو اُن کے چاروں طرف ایک خوفناک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس اندھیرے میں اُن کو دو چمکتی ہوئی چیزیں اپنی ہتھیلی پر نظر آئیں —— ایک روپیہ اور ایک دونی!

یہ شاید ایک دوسرے مہاجنی سفر کی ابتدا تھی!

اختر انصاری

شعر

دیکھو نہ جلیسل کو مٹاؤ

مٹ جائے گا نام عاشقی کا

"جلیل"

مچلتی گھڑیاں

گرمی کی سہانی راتوں میں جب چاند کا جادو چلتا ہے
ذرہ ذرہ، پتہ پتہ، چاندی کی شراب اگلتا ہے

جب دل کی سوتی دنیا کو کوئل کی کوک جگاتی ہے
کانوں میں امرت بھرتی ہے، سینوں میں آگ لگاتی ہے

جب عشق کا متوالا بھونرا اپنا دکھ درد سناتا ہے
پھولوں کے صدقے ہوتا ہے، کلیوں سے لپٹا جاتا ہے

جب ہجر کی چوٹیں کھا کھا کر کمبخت پپیہا روتا ہے
اور اپنے غم کے سمندر میں ساری دنیا کو ڈبوتا ہے

جب اونچے اونچے پیڑوں پر سرشار گھٹائیں جھکتی ہیں
جب تیزی سے چلنے والی بدمست ہوائیں رکتی ہیں

یہ مینہ کے قطرے قطرے سے نغمے کے جام چھلکتے ہیں
جب سوندھی سوندھی خوشبو سے تپتے ہوئے کھیت مہکتے ہیں

جب ننھی منی سی تتلی پیغامِ بہار سناتی ہے
معصوم نگاہوں کو اپنی خوش سے للچاتی ہے

جب ڈھاک کے پھولوں کی سرخی جنگل میں آگ لگاتی ہے
ٹکرا کے ہوا ان پھولوں سے سونے کے ورق برساتی ہے

جب بور کے تیروں کی نوکیں مچلے ہوئے دل برماتی ہیں
مخمور بسنت کی دیوی کو چونکا کر ہوش میں لاتی ہیں

جب کوہ کے متوالے جھرنے موجوں کے ستار بجاتے ہیں
خوش لحن پرندوں کو اپنے شیریں نغمے سکھلاتے ہیں

جب موروں کی فریادوں سے جنگل میں خموشی چھاتی ہے
اور ان کے رقص رنگیں سے جب قوس قزح شرماتی ہے

سورج کے عاشق زار کنول جب وصل کا مژدہ پاتے ہیں
چہروں پر رونق آتی ہے خوش ہوتے ہیں کھل جاتے ہیں

سبزہ کی گود کے چشموں میں جب بادۂ سیمیں بہتا ہے
کوثر کی یاد دلاتا ہے، جنت کے فسانے کہتا ہے

جب نیند کے متوالے تارے اپنی پلکیں جھپکاتے ہیں
اور بزم فلک سے اٹھ اٹھ کر خلوت میں سونے جاتے ہیں

جب سورج کی سیمیں کرنیں پھولوں کے بوسے لیتی ہیں
شب بھر کی جدائی کے غم کو اس طرح سے تسکین دیتی ہیں

جب لیلئے شب کی محفل میں جگنو سے چراغاں ہوتا ہے
تاریک فضاؤں کا منظر جب طور بداماں ہوتا ہے

شاعر کے دل کی بے تابی کچھ اور فزوں ہو جاتی ہے
مستی کی رنگیں وادی میں اس کی دنیا کھو جاتی ہے

مرزا عباس بیگ محشر

تعلیم اور آرٹ

ماہرین تعلیم کہتے ہیں تعلیم ایک آرٹ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آرٹ کی صحیح تعریف کیا ہے اور تعلیم آرٹ کیوں ہے۔ کسی تصور نصب العین یا مقصد کو ایک حسین شکل میں منضبط کر کے ترکیبی عناصر کو کامیابی کے ساتھ کام میں لانے کا نام آرٹ ہے۔ حسین شکل میں عناصر ترکیبی کو منضبط کرنے کا مقصد یہ ہے کہ فن کار اُن عناصر کو ضائع نہ ہونے دے۔ قوت عمل بے کار مصرف میں نہ لگے۔

آرٹ کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں وہ آرٹ جس کی بنیاد مجلسی افادیت پر ہو اور وہ آرٹ جس کی بنیاد عناصر فن کی نوعیت پر ہو۔ ہر آرٹ کا مدعا اور منشا ایک ہی ہوتا ہے یعنی حیاتِ انسانی کی تکمیل اور انسانیت کی فلاح و بہبودی اور خوشحالی کی ترقی۔ پس آرٹ وہی ہے جس سے مجلسی افادیت حاصل ہو۔ انسان ہر چیز کا آئینہ ہے اور اس پر ہر شے کا پرتو پڑتا ہے۔ خود اپنا پرتو بھی اس پر پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم نے آرٹ کی تقسیم میں مجلسی افادیت کے شمول کو لازمی سمجھا۔ رہا دوسرا امر اس کے متعلق صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آرٹ کا انحصار اس کے ترکیبی عناصر کی نوعیت پر بھی ہے۔ مواد یا عنصر جس سے آرٹ کی تخلیق و تکمیل ہوتی ہے در اصل کسی تصور یا مقصد کے انضباط کی شکل اور ذریعے کا دوسرا نام ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آرٹ بغیر عناصر کے پیدا نہیں ہو سکتا۔ پس عناصر کے وجود اور اُس کی نوعیت سے آرٹ کی اچھائی برائی صحت و عدم صحت متیقن ہوتی ہے۔ اس لئے تقسیم کے وقت آرٹ کے اس پہلو کو پیش نظر رکھنا بہتر کے لئے بے حد ضروری ہے۔

اب عناصر ترکیبی کی بحث کو لیجئے۔ آرٹ کے عناصر کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

غیر عضوی۔ عضوی۔ ماورائے عضوی۔ غیر عضوی عناصر میں ہمارے تمام مقاصد جامد اور ہر غیر ذی حیات چیز شامل ہے عضوی عناصر میں تمام ذی حیات اور ماورائے عضوی میں معاشرتی گروہ۔ اور مجلسی اکائی یا وحدت (سوشل یونٹ) شامل کی جا سکتی ہے۔ ہم نے آرٹ کی یہ تقسیم اس نہج پر کی ہے کہ سب سے زیادہ جس حصے میں کثرت پائی جاتی ہے پہلے اُسے ہی لے لیا ہے اور اُس کے بعد کمتر درجے کے حصوں کو لیا ہے

عضوی عناصر تمام حیات اور کائنات کو محیط ہیں اس لئے ہم اُن کو غیر عضوی عناصر سے زیادہ پیچیدہ سمجھتے ہیں۔ اور ماورائے عضوی عناصر عضوی عناصر سے بھی پیچیدہ ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ اصول اجتماعیت پر حاوی ہیں۔

غرض عناصر کی تقسیم کے اعتبار سے آرٹ کی تحدید کی گئی ہے۔ آسانی کے ساتھ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ آرٹ ان تین حصوں میں منقسم ہے نمبر ۱ وہ آرٹ جس کا تعلق اجسام سے ہو نمبر ۲ وہ آرٹ جس کا تعلق حیاتیات سے ہو نمبر ۳ وہ آرٹ جو اشتراک اور معاشرتِ انسانی سے بحث کرے۔

کوئی سائنس اور فن اُسی وقت ترقی کرتا ہے جب اُس کا عملی پہلو بار بار تجربے کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ اگر سائنس سہل اور آسان درجے میں رہ گیا اور تسلسل اور پیچیدگی پیدا نہ ہوئی تو اس کی افادیت بھی کمتر درجے کی ہوگی پس جن فنون کا تسلسل اور تجرباتی دور قائم نہیں ہوا، اُن کی افادیت بھی معمولی درجے کی ہے جن فنون کا تعلق عضوی عناصر سے ہے ان کا تجرباتی تسلسل بھی کم ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی افادیت بھی اس تناسب سے ہوتی ہے۔ وہ آرٹ جس کا تعلق حیوانیات اور فہم کائنات سے ہے۔ اجسامی عناصر کے فنون سے زیادہ پیچیدہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کا تجرباتی دور اور تسلسل بھی زیادہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان فنون سے انسان کو افادیت بھی زیادہ سے زیادہ حاصل ہوتی ہے لیکن سب سے زیادہ جس چیز کی افادیت معلوم ہوتی ہے وہ اجتماعیت و معاشرتی اشتراک سے تعلق رکھنے والے آرٹ کا ہے اور یہی وجہ ہے انسان اور سماج سے متعلق فنون بہت پیچیدہ ہیں اور ان کا تجربہ اور تسلسل بھی پیچ در پیچ ہے

فن کے عناصر ترکیبی جس قدر زیادہ قلیل الحصول ہوں گے اور جس قدر زیادہ مسلسل اور پیچیدہ ہوں گے اُسی قدر اُس کا استعمال اور فہم مشکل ہوگا۔ عضوی اور اجسامی عناصر سے تعلق رکھنے والے فنون غیر ذی روح اور سریع الفہم معاملات پر حاوی ہوتے ہیں۔ حیاتیات سے متعلق آرٹ زندہ اور جاندار اشیا سے بحث کرتے ہیں۔ مثلاً حیوانات و نباتات وغیرہ

اس آرٹ کے دو بڑے حصے ہیں۔ ایک کا تعلق پودوں اور درختوں سے ہے۔ دوسرے کا تعلق حیوانات سے ہے۔ باغبان اور کاشتکار کا کام اس آرٹسٹ کے کام سے زیادہ پیچیدہ ہے جس کا تعلق محض غیر ذی روح اشیاء سے ہے۔ مثلاً ایک باغبان زمین میں بیج ڈال کر بو دیتا ہے اور ضروری مواد فراہم کر دیتا ہے کہ شگوفہ پیدا ہو۔ لیکن وہ کسی طرح بھی دانے کو ایک دم پھوٹنے یا حسب مرضی پیدا ہونے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کا تعلق فطرت سے ہے۔ اُس کو جن عناصر سے کام لینا ہے بہت پیچیدہ اور دشوار حاصل ہیں۔ بخلاف اُس آرٹسٹ کے جو موسیقی کا ماہر ہے اور باجے کے عنصر اور گلے کی خوبی سے حسب مرضی ایک نتیجہ اور اثر پیدا کر سکتا ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں اُس کے قبضے اور تصرف میں ہوتی ہیں اور اس وجہ سے سہل الحصول ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ باغبان اور کاشتکار کا آرٹ انسان کے لئے جس قدر افادیت پیدا کرتا ہے وہ ایک موسیقی دان کے آرٹ سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اگر کاشتکار اناج نہ پیدا کرے تو انسان بھوکے مر جائیں لیکن اگر قوال اور گویّے گانا چھوڑ دیں تو انسان کی حیات کا رشتہ منقطع نہیں ہو سکتا۔ پس ایسی انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے پیچیدہ اور دشوار حاصل عناصر کے فنون زیادہ کام آتے ہیں۔

اس سلسلے میں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نباتات سے زیادہ پیچیدہ مسئلہ حیوانات کے علم کا ہے۔ عناصر فطرت میں حیوانات نباتات سے زیادہ پیچیدہ اور نا قابل فہم عنصر ہیں۔ جانوروں کو سدھانا ان کی عادتیں سمجھنا اور ان کو اپنے لئے مفید مطلب بنانا ان کی مضرتوں کو دور کرنا اور ان کی جسمانی اور دماغی حالتوں کو ایک ضابطے اور فہم کے ماتحت لا کر منضبط کرنا کھیت میں دانہ ڈال کر نیچر کے اثرات کا انتظار کرنے سے کہیں زیادہ پیچیدہ مسئلہ ہے۔ نباتات خود رو ہیں یا چند اصولوں کے ماتحت پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن جانوروں کے خصائل کو سمجھنا کہیں زیادہ پیچیدہ فن ہے۔ اس فن کا تعلق صرف بے جان عناصر اور اشیاء ہی سے نہیں ہے بلکہ روح۔ عادت۔ تصوّر اور ذہن کی اُفتاد کا سمجھنا بھی اس میں شامل ہے۔ اس لئے یہ معاملہ ذرا ٹیڑھی کھیر ہو جاتا ہے۔

جب جانوروں کو پالنے اور اُن کو تربیت دینے کا مسئلہ اس قدر پیچیدہ اور دشوار حاصل ہے تو سب سے بڑے حیوان یعنی حضرت انسان کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ کس قدر پیچیدہ ہوگا۔ اس کا اندازہ آسانی کے ساتھ لگایا جا سکتا ہے۔ انسان سب سے بڑا فطری عنصر یا مجموعۂ عناصر ہے۔ اسے سمجھنا اور ایک ضابطے کے ماتحت لانا جانوروں کی تربیت سے کہیں زیادہ دشوار ہے۔ انسان کی اپنی رُوح ہے۔ اپنی رائے ہے۔ اپنی فہم ہے۔ اپنے حیات ہیں اور اپنے جذبات ہیں۔ غرض انسان کو تعلیم دینے کا جو آرٹ ہے اُس کے عناصر بہت زیادہ مشکل ہیں۔ فنون لطیفہ کے عناصر کی طرح اس کے عناصر جامد نہیں ہوتے بلکہ حد درجہ متغیر اور انقلاب پذیر ہوتے ہیں۔ اس لئے اُن کا قابو میں رکھنا بھی بہت زیادہ مشکل امر ہے۔ یہ عناصر فن کار کے کام میں حائل بھی ہو جاتے ہیں۔ اُس کی ہمت افزائی بھی نہیں کرتے۔ ان میں فرصت و انبساط کی بھی کمی ہوتی ہے بلکہ انتشار و خلفشار بھی پیدا ہونے لگتا ہے۔

غرض یہ عناصر اس قدر پیچیدہ تجربات میں سے گذرتے ہیں کہ فن کار کی کامیابی میں رخنہ پڑتا ہے۔ اس فن (تعلیم) کے جاننے والے کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ اپنے معمول (شاگرد) کی جسمانی۔ دماغی اور کرداری خصوصیات جوہر اور پیدائشی کمالات کو اس قدر بلند کیا جائے اور اس درجہ مکمل کیا جائے کہ وہ ہر طرح بہترین مظہر فطرت بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حیاتیات کے ذیل میں آنے والے فنون میں تعلیم سب سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ فن ہے۔

فنون اجتماعیہ۔ حیاتیات سے بھی زیادہ پیچیدہ ہوتے ہیں یہاں ایک فن کار کو ایک ذات سے واسطہ نہیں پڑتا بلکہ ذاتوں اور ہستیوں کے مجموعے اور مجموعوں کے مجموعوں اور افراد کے گروہوں سے کام پڑتا ہے۔ سوسائٹی سماج یا معاشرت اقوام مذاہب و روایات تاریخ مزاج اور تصورات کی پیچ در پیچ وادیوں میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ فنون اجتماعیہ کا مقصد افراد کی ترقی و تربیت کے ذریعے سے افراد کے مجموعوں اور انسانی گروہوں کو ترقی دینا ہے۔ فنون اجتماعیہ انسانی اداروں کی تشکیل و تکمیل و ترقی کے کے کام میں آتے ہیں اور ان کے ذریعے سے فن سیاست دانی۔ علم حکمرانی و جہانبانی حکومت اور سیاست کی تدوین عمل میں آتی ہے تعلیم کا ایک حد تک یہ مقصد ہوتا ہے کہ طالب علم کے جسم، ذہن۔ اور کردار کو ایک معین نصب العین کے ماتحت منضبط و مرتب کیا جائے۔ اس حد تک فن تعلیم ایک حیاتی فن کی حیثیت رکھتا ہے لیکن تعلیم کا ایک مدعا یہ بھی ہوتا ہے کہ مدارس کے ذریعے اجتماعیت کا تجربہ کیا جائے۔ میل جول اور باہمی ارتباط کے نتائج کو طلبہ پر اثر انداز ہونے کا موقعہ دیا جائے۔

سکولوں کی تعلیم کے ذریعے اجتماعیت کے اثر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور اس وجہ سے فن تعلیم ایک وسیع اور ترقی یافتہ آرٹ کو بھی اپنے تجربے میں لاتا ہے اس لئے یہ فن اجتماعی فن بھی بن جاتا ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ فن تعلیم قدرے حیاتی فن ہے اور قدرے اجتماعی اور دونوں تجربات اور اثرات کے ذریعہ طلبہ کی ذہنی و جسمانی و کرداری تکمیل عمل میں آتی ہے اس لئے فن تعلیم تمام فنون کی "ماں" ہے۔

سید ابن حسن شارق

محرومی

میں کہتا ہوں تم سے اگر شام کو بھول کر بھی کسی نے کبھی کوئی دھندلا ستارہ نہ دیکھا تو اِس پر تعجب نہیں ہے، نہ ہوگا،
ازل سے اسی ڈھب کی پابند ہے شام کی ظاہرا بے ضرر، شوخ ناگن،
اُبھرتے ہوئے اور لچکتے ہوئے اور مچلتے ہوئے کہتی جاتی ہے — آؤ، مجھے دیکھو میں نے تمہارے لئے ایک رنگین محفل جمائی ہوئی ہے،
انوکھا سا ایوان ہے، ہر طرف جس میں پردے گرے ہیں، وہاں جو بھی ہو اُس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا،
نہیں اُس کے پردوں کی ایسے لچکتی چلی جاتی ہیں جیسے پھیلی ہوئی سطح دریا نے اُٹھ کر دھندلکے کی مانند پنہاں کیا ہو فضا کو نظر سے،
ذرا دیکھو — چھت پر لٹکتے ہیں فانوس، اپنی ہر اک نیم روشن کرن سے سجھاتے ہیں اک بھید کی بات کا گیت جس میں مسہری کے آغوش کی لرزشیں ہوں،
ستونوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ، رُکتا ہوا اور جھجکتا ہوا چور سا یہ یہی کہہ رہا ہے — وہ آئے، وہ آئے! . . . .
ابھی ایک پل میں، یونہی، جگمگانے لگے گا یہ ایوان یکسر،
ہر اک چیز کیسے قرینے سے رکھی ہوئی ہے،
میں کہتی ہوں مانو، چلو آؤ، محفل سجی ہے؛
تم آؤ تو گونج اُٹھے شہنائی، دالان میں آنے جانے کی آہٹ سے ہنگامہ پیدا ہو، لیکن مسہری کے آغوش کی لرزشوں میں تمہیں اِس کا احساس بھی ہونے پائے تو ذمّہ ہے میرا،
ازل سے اِسی ڈھب کی پابند ہے موجِ بے تاب، اس کو خبر بھی ہوگی کہ اک شاخِ نازک نے بے باک جھونکے سے ٹکرا کے آہیں بھری تھیں،
مگر میں یہ کہتا ہوں تم سے اگر شام کو بھول کر بھی کسی نے کبھی کوئی دھندلا ستارہ نہ دیکھا تو اس پر تعجب نہیں ہے،
ازل سے اسی ڈھب کی پابند ہے شام کی شوخ ناگن،
یہ ڈستی ہے، ڈستے ہوئے کہتی جاتی ہے — جاؤ اگر تم جھجکتے رہوگے تو ہر لمحہ یکساں روش سے گذر جائے گا اور تم دیکھتے ہی رہوگے اکیلے اکیلے،
نہیں دائیں بائیں، تمہیں سامنے کچھ دکھائی نہ دے گا، فقط سرد دیواریں ہنستی رہیں گی۔
مگر اُن کا ہنسنا بھی آہستہ آہستہ بیتے زمانے کی مانند اک دُور کی بات معلوم ہونے لگے گا،
دھندلکے میں ڈوبی ہوئی آنکھ دیکھے گی روزن سے — دور اک ستارہ نظر آ رہا ہے،
مگر چھت پہ فانوس کا کوئی جھولا نہ ہوگا،
شکستہ، قتادہ ستونوں کی مانند فرشِ حزیں پر تمہارا وہ سایہ تڑپتا رہے گا جسے یہ تمنّا تھی . . . . کہدوں تمنّا وہ کیا تھی؟
بس اب اپنی غمناک باتوں کو اپنے اُبھرتے ہوئے اور بدلتے ہوئے رنگ میں تو چھپا لے،
میں اب مانتا ہوں کہ تو نے روانی میں اپنی بہت دور روزن سے دھندلے ستارے بھی دیکھے ہیں لاکھوں،
میں اب مانتا ہوں مری آنکھ میں ایک آنسو چھلکتا چلا جا رہا ہے، ٹپکتا نہیں ہے،
میں اب مانتا ہوں مجھے دائیں بائیں، مجھے سامنے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے، فقط سرد دیواریں ہنستی چلی جا رہی ہیں،
میں اب مانتا ہوں کہ میں نے اُس ایوان کو آج تک اپنے خوابوں میں دیکھا ہے، لیکن

وہاں کوئی بھی چیز ایسے قرینے سے رکھی نہیں ہے۔
کہ جیسے بتایا ہے تو نے تری ایک رنگین محفل سجی ہے،
مسہری کے آغوش کی لرزشوں کا مجھے خواب بھی اب نہ آئے گا، — میں اپنے کانوں سے کیسے سنوں گا وہ شہنائی کی گونج، — سیندور کا سُرخ نغمہ، جسے سُن کے
دالان میں آنے جانے کی آہٹ سے ہنگامہ ہو جاتا ہے ایک پل کو،

میراجی

دنیائے ادب

زنجیر

گوشۂ زنجیر میں،
اک نئی جنبش ہویدا ہو چلی
سنگِ خارا ہی سہی، خارِ مغیلاں ہی سہی
دشمنِ جاں، دشمنِ جاں ہی سہی
یہ بھی تو شبنم نہیں،
یہ بھی تو مخمل نہیں، دیبا نہیں، ریشم نہیں!

ہر جگہ پھر سینۂ زنجیر میں
اک نیا ارماں، نئی امید پیدا ہو چلی
حجلۂ سیمیں سے تو بھی پیلۂ ریشم نکل
وہ حسیں اور دور افتادہ فرنگی عورتیں
تو نے جن کے حسنِ روز افزوں کی زینت کے لئے
سالہا بے دست و پا ہو کر بُنے ہیں تارہائے سیم و زر
اُن کے مردوں کے لئے بھی آج اک سنگیں جال
ہو سکے تو اپنے پیکر سے نکال

شکر ہے دنبالۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش، نئی لرزش ہویدا ہو چلی
کوہساروں، ریگزاروں سے ندا آنے لگی
ظلم پروردہ غلام! بھاگ جاؤ
پردۂ شبگیر میں اپنے سلاسل توڑ کر
چار سو چھائے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ
اور اس ہنگام باد آورد کو
حیلۂ شبخوں بناؤ!

ن م راشد

ادبِ لطیف •
سالنامہ جنوری ۱۹۴۲ء

راشد کی اس نظم میں ایک ایسے المناک مگر نہایت نفیس کنایوں اور استعاروں سے بیان کیا گیا ہے جو سالہا سال سے غلامی کی بے بسی اور مشقت میں زندگی بسر کر رہا ہو۔ نظم کے دوسرے اور تیسرے بند کا مفہوم نسبتاً آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے لیکن پہلا بند ذرا الجھن میں ڈال دینے والا ہے۔ دوسرے بند میں پیلۂ ریشم اور تیسرے بند میں اس ہنگام باد آورد کے معنی جلد ہی متعین ہو جاتے ہیں لیکن پہلے بند میں سنگ خارا، خار مغیلاں، دوست، وغیرہ کے استعارے ذرا مبہم دکھائی دیتے ہیں۔ اگر مفہوم کا تسلسل قائم کرنا چاہیں تو دوسرے بند کو پہلا اور پہلے کو دوسرا بند سمجھ کر پڑھنا چاہئے۔ یوں صرف دو تصور قائم ہو سکیں گے یعنی پہلی تصویر اپنے حجلۂ سیمیں میں مصروف مشقت پیلۂ ریشم کی اور شاعر اُسے باہر نکلنے کو کہتا ہے کیونکہ ہر جگہ سینۂ زنجیر میں اک نیا ارمان، نئی امید پیدا ہونے کو ہے، یہ پہلی تصویر سمٹی ہوئی ہے اور دوسری تصویر پھیلی ہوئی یعنی شاعر کی للکار کے اثر سے کوہساروں، ریگزاروں سے اس کی گونج پلٹ کر آرہی ہے گویا اس کی دعوتِ عمل کامیاب ثابت ہوئی ہے —— لیکن ان دو تصویروں کے تعین کی صورت میں درمیانی بند (جواب پہلا بند ہے) کچھ بے جا معلوم ہوگا نیز عنوان (زنجیر) اور اس کے متعلقات حشو محسوس ہوں گے۔ اس لئے اب ہم پھر نظم کی پہلی یعنی موجودہ صورت کی طرف آتے ہیں، شاعر کے ذہن میں ایک ملک کی غلامی کا تصور ہے، پابندی کا، اور وہ ملک اُسے ایک پابہ زنجیر ہستی معلوم ہوتا ہے ایک ایسی ہستی جس کی فعالیت محض اپنی غلامانہ مشقت تک محدود ہو کر رہ چکی ہے —— یہ غلامانہ مشقت، یہ کولھو کے بیل کی سی کیفیت اُس کے ذہن کو ریشم کے کیڑے کی طرف لے جاتی ہے اور اس غیبت کا ایک اور سبب یہ ہے کہ اس کے خیال میں اس غلام کی محنت اور مشقت کا تمام ثمرہ ایک دُور کے ملک میں وہاں کی عورتوں کی آسائش اور زینت میں صرف ہوتا ہے۔ —— غالباً عورتوں کا دھیان آتے ہی حجلۂ سیمیں، شبنم، مخمل، دیبا، ریشم، وغیرہ ایسے الفاظ اس کے ذہن میں آتے ہیں، —— غلام کا بنایا ہوا سامان عورتوں کی زینت کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ یہ خیال اس کے ذہن کو ریشم کے کیڑے کے ملک کی گذشتہ تاریخ کا ایک تلخ واقعہ یاد دلاتا ہے جب پیلۂ ریشم کو دست بریدہ بنا دیا گیا تھا، —— نیز بے دست و پا ہو کر اسی نسبت سے ہے، نیز اس نسبت سے بھی کہ پیلۂ ریشم بھی اپنے حجلۂ سیمیں کے اندر سمٹا سمٹایا بے دست و پا ہو رہا ہے۔

نظم کے تسلسل کو آسان صورت میں رکھنے کے لئے مصرعوں کی ترتیب یوں ہو گی۔

موجودہ شمار	مصرعوں کا مجوزہ شمار	موجودہ شمار	مصرعوں کا مجوزہ شمار
۱ ——	۸	۲ ——	۹

مصرعوں کا مجوزہ شمار	موجودہ شمار	مصرعوں کا مجوزہ شمار	موجودہ شمار
۳	۱۰	۹ سے ۱۳	۱۱ سے ۱۵
۴ سے ۸	۳ سے ۷	۱۴ سے ۱۵	۱ سے ۲

اور دوسرا بند موجودہ شمار کے لحاظ سے از ۱۶ تا ۲۳ ہوگا۔

لیکن اب بھی چار سے آٹھ کا مجوزہ اور تین سے سات کا موجودہ شمار واضح نہ ہو سکے گا اس کے لئے ذیل کا مکالمہ معاون ہو سکتا ہے۔

شاعر۔ ہر جگہ پھر سینۂ نخچیر میں اک نیا ارمان، نئی امید پیدا ہو چلی (اس لئے) حجلۂ سیمیں سے تو بھی پیلۂ ریشم! نکل!۔

پیلۂ ریشم۔ اس وقت اگر میں نے "جنبش" کی تو میں بالواسطہ (ت) کی مدد کروں گا جو اپنی بربریت اور ظلم اور سختی کے باعث سنگِ خارا ہیں۔

شاعر۔ سنگِ خارا ہیں تو سنگِ خارا ہی سہی۔

پیلۂ ریشم۔ نیز میں بالواسطہ (ج) کی مدد کروں گا جو اپنے عمل کی تیزی اور اپنے مظالم کی تندی کے باعث خارِ مغیلاں ہیں۔

شاعر۔ خارِ مغیلاں ہی سہی۔

پیلۂ ریشم۔ اس کے علاوہ یہ سنگِ خارا اور یہ خارِ مغیلاں (ا) سے دست و گریباں ہیں جو میرا دوست ہے۔

شاعر۔ دوست سے دست و گریباں ہیں تو اس کے باوجود اے پیلۂ ریشم! ـــ نکل! کیونکہ یہ دوست بھی تو سنگِ خارا اور خارِ مغیلاں ہی کی نوع سے ہے، یہ بھی تو شبنم نہیں، مخمل نہیں، دیبا نہیں، ریشم نہیں۔

اور یہاں پہنچ کر جب شاعر کے ذہن میں مخمل، دیبا، ریشم کا خیال آتا ہے تو اس کا ذہن پیلۂ ریشم کی گذشتہ تاریخ کی طرف رجوع ہوتا ہے اور وہ گریز کرتا ہے کہ اے کیڑے تو نے جن عورتوں کے لئے سالہا سال تارہائے سیم و زر بُنے ہیں اُن کے مردوں کے لئے بھی آج ایک جال بنا دے ـــ معلوم نہیں پیلۂ ریشم پر اس وعظ کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے لیکن شاعر کے ذہن میں یہ عکس پیدا ہوتا ہے کہ اب قیدی کی زنجیر جو ڈھیلی پڑی تھی، تن گئی ہے، کیونکہ اُس کے کھونٹے والے حصے میں (در بنالۂ زنجیر میں) نہ صرف جنبش بلکہ ایک لرزش پیدا ہو چلی ہے۔

یہاں اس کا بھی لحاظ رہے کہ جنبش کا وقفہ کم اور لرزش کا زیادہ ہوتا ہے، جنبش محض ایک حرکت ہے اور لرزش ایک متواتر حرکت۔ چنانچہ "لرزش" سے قیدی کی فعالیت کی بیداری کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی طرح کا ایک کنایہ دوسرے مصرعے (اک نئی جنبش ہویدا ہو چلی ہے) میں ہے "نئی" کیوں؟ ـــ اس لئے کہ پہلی جنبش غلامانہ مشقت کی مزدورت سے تھی، یہ دوسری جنبش نئی ہے، یہ غلامی کو دور کرنے کے لئے ایک نئی حرکت ہے۔

اپنے استعاروں اور کنایوں کی بنا پر شاعری کی یہ نظم ایک بلند درجہ رکھتی ہے، نیز سیاسی لحاظ سے غالباً راشد کی یہ پہلی خالص نظم ہے اگرچہ اس میں بھی فرنگی عورتوں اور اُن کے حسنِ روز افزوں کی زینت کا احساس اُس کی جنسی رغبت کی غمازی کرتا ہے، اور یہ خیال ہمارے دل میں لاتا ہے کہ شاید اس قسم کی عورتوں کے حصول میں ناکامی ہی شاعر کے لئے اس للکار کی تحریک کا باعث ہوئی ہو ـــ لیکن اگر یوں ہے بھی تو یہ نفسِ لاشعوری کی بات ہے۔

میرا جی

ایک اور اشارہ

کتب خانہ ادبی دنیا نے وعدہ کیا تھا کہ وقتاً فوقتاً اچھی کتابوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے چنی ہوئی کتابوں کی تازہ بتازہ فہرستیں ادبی دنیا میں شائع کی جائیں گی تاکہ ناظرینِ ادبی دنیا کو اپنے مقبول رسالے ہی کے ذریعے سے ہر قسم کی اچھی کتابیں بہ آسانی مہیا ہو سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے کی پہلی فہرست شائع ہو کر مقبولِ خاطر ہو چکی ہے۔ اس دفعہ کتب خانہ ان فہرستوں کی دوسری قسط آپ کے پیش کر رہا ہے۔ موجودہ فہرست میں التزاماً وہی کتابیں درج کی گئی ہیں جو خواتین اور بچوں کے لئے دلچسپ اور مفید ہو سکتی ہیں۔ حسبِ معمول اس انتخاب کی ضمانت بھی ادارہ ادبی دنیا کا نام ہے

مینجر کتب خانہ ادبی دنیا لاہور

نام کتاب و مصنف	قیمت
خواتین کے لئے	
ناول اور افسانے	
عورتوں کے افسانے۔ کوثر چاندپوری	۸عہ
تحفے اور دیگر افسانے۔ حجاب امتیاز علی	۸عہ
خانم . . . . مرزا عظیم بیگ چغتائی	للعہ
شریر بیوی "	۸عہ
شام زندگی۔ راشد الخیری	عہ
شب زندگی دو حصے "	عہ
ماہ عجم "	۸عہ
شاہین و دراج "	۸ر
لاشوں کا شہر۔ مسز عبد القادر	۴عہ
نرملا۔ منشی پریم چند	۸عہ
یوسف نجمہ۔ عبد الحلیم شرر	۸عہ
بنات النعش۔ مولوی نذیر احمد مرحوم	۴عہ
یاسمین۔ مرزا محمد سعید	۸عہ
نظم	
آئینہ حرم۔ محترمہ ز۔خ۔ش کی نظمیں	۶ر
شمع خاموش نظمیں	۶ر
آئینہ حباب "	۱۲ر

نام کتاب و مصنف	قیمت
صنعت اور خانہ داری	
گلدستہ کروشیا۔ فاطمہ بیگم انور علی	۶
عصمتی کروشیا	۸عہ
بیوی کی تعلیم۔ خواجہ حسن نظامی	۴عہ
اولاد کی شادی "	عہ
مشرقی اور مغربی کھانے	۶
مذاقیہ کھانے	۶ر
متفرق	
محبت نامے۔ مترجمہ پروفیسر رام سروپ کوشل	۷ر
ادب زریں۔ حجاب امتیاز علی	۸ر
نغمات موت "	۶ر
بچوں کے لئے	
قصے کہانیاں	
ولائتی ننھی راشد الخیری	۶ر
دادا لال بجھکڑ "	۸ر
بچوں کا انصاف (ڈراما)	۳ر
مرغی اجمیر چلی۔ محترمہ رفیعہ ریحانہ	۲ر
نبیوں کے قصے	۵ر
تاریخ ہند کی کہانیاں	.
پہلا حصہ ۳ر دوسرا حصہ	۵ر

نام کتاب و مصنف	قیمت
تفریح اور معلومات	
تعلیمی کھیل	۳ر
سمندر کا عجائب خانہ	۸ر
ایورسٹ کی کہانی	عہ
نظمیں	
بچوں کی نظمیں	۴ر
بچوں کے اسمٰعیل	
مرتبہ سعید انصاری پرنسپل مدرسہ جامعہ	۱۵ر
بچوں کی رباعیاں	۱ر
ڈرامے	
انار کلی امتیاز علی تاج	۴عہ
ریڈ ڈرامے۔ فضل حق قریشی	عہ
منتوش۔ حکیم احمد شجاع	۸ر
مینا "	۸ر
ہملٹ مترجمہ عنایت اللہ دہلوی	عہ
فاوسٹ گوئٹے	عہ
چند ڈرامے نور الٰہی محمد عمر	۸ر
چند ٹوپیاں "	۸ر

ملنے کا پتہ:۔ مینجر کتب خانہ ادبی دنیا۔ دی مال۔ لاہور

Regd. L. No. 2482 ISSUE FOR JANUARY 1942

Printed & Published by Salah-ud Din Ahmad at the Mercantile Press, Chamberlain Road, Lahore. The Title & Pictures printed at the Allied Press, The Mall, Lahore. Issued from the office of the Adabi Dunya Balkishen Building, The Mall, Lahore.